عنوانات

نیا دور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ حکومت اترپردیش ان سے بہرحال متفق ہو

جلد ۳۶ نمبر ۱

اپریل سنہ ۱۹۷۹ء

...: خورشید احمد

...ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

★

ہمیندر کمار

محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اترپردیش

...: اشوک در

سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ اینڈ اسٹیشنری یو۔پی
مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ
شائع کردہ محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ۔ اترپردیش

شمارہ: پچاس پیسے
سالانہ: پانچ روپے

سپرنٹنڈنٹ پبلیکیشن پبلک انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو۔پی۔ لکھنؤ

خط کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶۔ لکھنؤ

...ایڈیٹر نیا دور انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو۔پی لکھنؤ

نقد و تبصرہ

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا لازمی ہیں)

نام کتاب: **شہر غزل** مصنف: شاد فیض آبادی
صفحات: ۲۵۶ — قیمت — ۱۵ روپے
ملنے کا پتہ: مکتبہ دین و ادب امین الدولہ پارک لکھنؤ۔

شہر غزل، شاد فیض آبادی کا مجموعۂ کلام ہے۔ جو کتابت و طباعت اور تدوین و ترتیب کے اعتبار سے نہایت دیدہ زیب بقول شاد "مقدمہ، تعارف، تقریظ اور تبصرہ کی بیساکھیوں کے بغیر اتر پردیش اردو اکاڈمی کے جزوی مالی اشتراک سے پیش کیا گیا۔

شاد فیض آبادی حکیم ناطق لکھنوی جیسے مصلح زبان و ادب کہنہ مشق استاد کے شاگرد، ان کی صحبتوں کا فیض اٹھائے ہوئے اردو کے علمی و ادبی حلقوں میں متعارف خوش فکر شاعر ہیں...... غزلیں خوب کہتے ہیں اور بجا طور پر یہ دعوا کرتے ہیں۔ ؎

خون رگ احساس تری مانگ میں بھر کر — اے شہر غزل تجھ کو دلھن ہم نے بنایا

شہر غزل ان کی فکر و نظر کا آئینہ ہے ان کی غزلوں میں غم جاناں غم دوراں، گہرائی، تڑپ، معنی آفرینی۔ روانی و برجستگی اور تغزل کی پاکیزگی سب کچھ موجود ہے وہ فسانۂ دل بھی سناتے ہیں اور عوامی و انسانی مسائل سے بھی اچھی طرح واقف ہیں بڑی سے بڑی بات نہایت سادگی سے اشاروں میں کہہ جاتے ہیں جیسے ؎

اب تو ہمارے پاؤں کی زنجیر کاٹ دو
اب تو بہار آئے بہت دن گزر گئے

نئے دور کے چاند سورج سے پہلے
اندھیرے میں ہم لوگ مشعل رہے ہیں

شاد کی شاعری زبان و بیان کی خوبی، عمیق تجربات اور شدت احساس پر مبنی ہے جس میں روایتی غزل گوئی کا انداز بھی ہے اور جدید تجربوں کی آمیزش بھی۔ وہ نازک خیالات اور قلبی واردات کے بیان پر قدرت رکھتے ہیں۔ امید ہے یہ مجموعہ شرف قبولیت حاصل کرے گا

——— عرفانہ عباسی

نام کتاب: **تاریخ ادبیات تاجکستان**۔ مصنف: میرزی بیچکا
مترجم: کبیر احمد جائسی: ناشر: انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی
قیمت - ۱۳ روپے۔ صفحات - ۲۷۶۔

زیر نظر کتاب "تاریخ ادبیات تاجکستان"، یان ریپکا کی مشہور کتاب HISTORY OF PERSIAN LITERATURE کا ایک طویل باب ہے۔ اس مبسوط تاریخ کا یہ طویل باب میرزی بیچکا کا تحریر کردہ ہے۔ کبیر احمد جائسی نے اس کا اردو میں ترجمہ کر کے بڑی خدمت انجام دی ہے۔ اس کتاب میں تاجیک ادب کے ابتدائی دور سے لے کر دور حاضر تک کے سیاسی اور تہذیبی حالات کے پس منظر میں ترویج و ترقی کا جائزہ لیا گیا ہے۔ کتاب کے اہم ابواب میں تاجیکی ادب کا مطالعہ، سولہویں صدی عیسوی کے شعراء، روسی اقتدار کے اثرات، ۱۹۴۵ء سے آج تک ہیں۔ عالمی ادب اور خصوصاً فارسی شاعری سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ کتاب دلچسپ اور معلومات افزا ہے۔

فاضل مترجم نے یہ ترجمہ بہت صاف اور سادہ زبان میں کیا ہے۔ کتابت معمولی اور طباعت و کاغذ اوسط درجے کے ہیں۔

نام کتاب - **مطالعہ انارکلی** - مولف - ایس نجم الحسن انجم۔
سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ صفحات ۶۴ — قیمت: دو روپے پچاس پیسے۔
ناشر - نسیم بکڈپو۔ لاٹوش روڈ، لکھنؤ۔

امتیاز علی تاج کا مشہور ڈرامہ انارکلی اردو کے کئی نصابات میں داخل ہے۔ زیر نظر کتابچہ مطالعہ انارکلی، انارکلی کا ایک تنقیدی جائزہ ہے جس میں طلبا کی سہولت کے لئے اس موضوع پر ممکن سوالات کے مختصر جوابات کو قلم بند کر دیا گیا ہے۔ مولف نے شروع میں اردو ڈرامہ کی مختصر تاریخ بھی دی ہے جس سے کتاب کی افادیت میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔

——— ڈاکٹر ذکی کاکوروی

کتاب کا نام **لہر لہر پیاسی**، مصنف - اکرام الدین اکرم فاروقی
ضخامت - ۱۰۵ صفحات - قیمت: پندرہ روپے - پتہ
سینٹرل اسکول فتح گڑھ - یوپی

اپنی بات

ہمارے نئے وزیر اعلیٰ اتر پردیش شری بنارسی داس ایک جہاں دیدہ اور پُر وقار شخصیت کے مالک ہیں اور نظم و نسق کا ایک طویل تجربہ رکھتے ہیں۔ ان کا تعلق ضلع بلند شہر سے ہے جس کے ایک موضع اترا ولی میں ۸ جولائی ۱۹۱۲ء کو ان کی پیدائش ہوئی۔ وہ ابتدا ہی سے ایک عملی انسان رہے ہیں۔ وطن کی محبت کے ساتھ ساتھ یہ ان کی شخصیت کا عملی پہلو تھا جس نے انھیں جنگِ آزادی میں حصہ لینے پر مجبور کر دیا تھا۔ ۱۹۳۶ء میں بلند شہر کانگریس کمیٹی کے جنرل سکریٹری کے عہدے پر فائز ہوئے۔ اس کے بعد ۱۹۴۶ء اور ۱۹۵۸ء میں بلند شہر ضلع کانگریس کمیٹی کے صدر ہوئے۔ ۱۹۴۶ء ہی میں اتر پردیش کانگریس کمیٹی کی مجلس عاملہ کے ممبر رہے۔ پھر ۱۹۶۰ء اور ۱۹۶۹ء کے دوران اتر پردیش کانگریس کمیٹی کے جنرل سکریٹری ہوئے۔ ۳۰ برس تک کل ہند کانگریس کمیٹی کے ممبر بھی رہے۔ ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۳ء تک اتر پردیش کانگریس کمیٹی (تنظیم) کے صدر رہے۔ ۱۹۷۳ء ہی میں کل ہند کانگریس کمیٹی (تنظیم) کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر بھی رہے۔

یوپی اسمبلی کے لیے شری داس پہلی بار ۱۹۴۶ء میں منتخب ہوئے۔ اس کے بعد ۵۷-۱۹۵۲ء، ۶۷-۱۹۶۲ء اور ۶۸-۱۹۶۷ء کی مدت کے لیے آپ پھر اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ اس کے علاوہ اسمبلی کی استحقاق کمیٹی اور رولس کمیٹی کے ممبر بھی رہے۔ ۵۷-۱۹۵۲ء کے دوران پارلیمانی سکریٹری اور ۱۹۶۲ء کے دوران وزیر برائے پارلیمانی امور و امداد باہمی مقرر ہوئے۔

۱۹۷۲ء سے ۱۹۷۷ء تک راجیہ سبھا کے ممبر اور ۱۹۷۷ء کے دوران ۳۰ جون تک راجیہ سبھا کے قائم مقام چیرمین بھی رہے۔ جون ۱۹۷۷ء میں جنتا پارٹی کے ٹکٹ پر خورجہ حلقہ انتخاب سے یوپی اسمبلی کے لیے منتخب ہوئے اور اس کے بعد انھیں اسمبلی کا اسپیکر منتخب کر لیا گیا۔ اسپیکر کے عہدے سے استعفیٰ ۲۶ فروری ۱۹۷۹ء کو دیا اور یوپی جنتا مجلس لیجسلیچر پارٹی کا لیڈر منتخب ہونے کے بعد ۲۸ فروری کو وزیر اعلیٰ کے عہدے کا حلف لیا۔ شری داس مختلف جریدوں اور رسائل کے لیے مضامین وغیرہ بھی لکھتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک ہفتہ وار جریدہ "ہمارا سنگھرش" بھی انھوں نے نکالا تھا۔ تعلیم، صنعت اور صنعت و حرفت کے ساتھ ساتھ گیتا، گاندھیائی ادب اور فلسفے میں خصوصی دلچسپی رکھتے ہیں۔ فیصلہ کرنے اور اس کی عمل آوری کے سلسلے میں کسی طرح کے پس و پیش کو روا نہیں رکھتے۔ انتظامیہ سے متعلق امور میں کسی بھی سطح پر لاپرواہی، [illegible] اور تساہلی کو گوارا نہیں کر سکتے۔ اس اعتبار سے ایک بیدار مغز و مستعد ایڈمنسٹریٹر کی خصوصیات کے حامل ہیں۔ چنانچہ ان کی قیادت میں اتر پردیش ترقی کے راستے پر یقیناً زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھے گا اور اس ریاست کو ایک زیادہ چاق و چوبند اور چست انتظامیہ ملے گا۔ ادارہ نیا دور وزیر اعلیٰ کے عہدے پر شری بنارسی داس کا پرتپاک خیر مقدم کرتا ہے اور پُر خلوص مبارک باد کے ساتھ انھیں اپنی نیک تمنائیں پیش کرتا ہے۔

● اتر پردیش کے ۱۱ اضلاع چمولی، اتر کاشی، پتھورا گڑھ، ٹہری، پوڑی گڑھوال، الموڑہ، نینی تال، دہرہ دون، لکھنؤ، کانپور، اناؤ اور بارہ بنکی میں نشہ بندی پہلے ہی نافذ کی جا چکی ہے۔ اب اس سال (یکم اپریل ۱۹۷۹ء سے) مزید سات اضلاع بجنور، رام پور، بریلی، مراد آباد، سیتا پور، شاہجہاں پور اور ہردوئی میں بھی نشہ بندی نافذ کی جا رہی ہے۔ اس کے علاوہ ان مذہبی مقامات پر جہاں اب تک نشہ بندی کا نفاذ نہیں ہوا ہے، نشہ بندی نافذ کرنے کے سلسلے میں بھی حکومت سرگرمی سے غور کر رہی ہے۔ اس طرح آئندہ تین برسوں کے اندر مرحلہ وار تمام ریاست میں مکمل نشہ بندی نافذ کر دی جائے گی۔ اس کے باعث محاصل میں ہونے والے خسارے کی تلافی کے پیش نظر صنعتی الکوہل کی پیداوار بڑھانے کی غرض سے مناسب اقدامات بھی کیے جائیں گے۔ نشہ بندی کی تاریخ سے پانچ سال تک آبکاری محاصل کے سالانہ خسارے کا ۵۰ فیصد مرکزی حکومت پورا کرے گی۔

● اردو کی علمی اور ادبی دنیا کی مایہ ناز اور قد آور شخصیتیں ایک ایک کرکے اٹھتی جا رہی ہیں۔ گزشتہ ۲۱ فروری کو ممتاز محقق و نقاد ڈاکٹر یوسف حسین خاں بھی دہلی میں چل بسے لیکن علم و تحقیق کی جو شمع انھوں نے روشن کی تھی، وہ ہمیشہ ان کی یاد کو زندہ رکھے گی۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے جو مرحوم صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین کے چھوٹے بھائی تھے اپنی علمی زندگی کا آغاز فرانس میں کیا تھا جہاں قرون وسطیٰ کے تہذیبی اور تمدنی ماحول پر ان کی پہلی کتاب فرانسیسی زبان میں شائع ہوئی۔ بعد میں وہ بابائے اردو مولوی عبدالحق کے علمی کارناموں میں ایک معاون کی حیثیت سے شریک رہے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر کے عہدے پر بھی فائز رہے۔ مختلف علمی اور ادبی موضوعات پر انھوں نے بے شمار مضامین لکھے۔ اس کے علاوہ انھوں نے جو ۲۵ گراں قدر تصانیف اپنی یادگار کے طور پر چھوڑی ہیں ان میں ۱۳ کتابیں اردو میں، ایک فرانسیسی میں اور ۱۱ انگریزی میں ہیں۔ چنانچہ ان کا انتقال بلا تفریق زبان و ملک علم و تحقیق اور ادب کا ایک بڑا نقصان ہے جس پر ادارہ نیا دور اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔ خدا مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

——— ایڈیٹر

صدی کی پکار

نذیر بنارسی
نڈے کی حویلی
وارانسی

(رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر کی یاد میں)

کانگرس کا صدر اعلیٰ وہ خلافت کا امیں
شاہد جرأت ہے جس کی اب بھی لندن کی زمیں

غازی گفتار بھی تھا غازی کردار بھی
جو سپاہی بھی وطن کا تھا سپہ سالار بھی

چوٹ سہتے سہتے اس منزل پہ جا پہنچا تھا وہ
درد اٹھتا تھا کسی کو اور تڑپ جاتا تھا وہ

اس کا ہر مضموں ہے آئینہ دار زندگی
اس کے اک اک شعر میں اس کا شعار زندگی

ہند والوں کے لیے اس کا قلم گل بار تھا
ظالم انگریزوں کی خاطر ہند کی تلوار تھا

جس کا بھائی بن گیا تھا بھائی کی روح رواں
جس کی ماں سلجھا رہی تھی گیسوئے ہندوستاں

اس کی رودادِ جنوں آمادۂ تقریر ہے
آج منھ کھولے ہوئے ہر حلقۂ زنجیر ہے

نوجوانان وطن کو بل جب اس کا مل گیا
بوڑھے مالی کو بھی لاٹھی کا سہارا مل گیا

اتحاد ہندو مسلم کی وہ روشن مثال
روشنی میں جس کی چمکا تھا جواہر جیسا لال

بل اہنسا کا ملا اور زورِ بازوئے علی
تب جواں ہو کر کہیں تحریکِ آزادی چلی

ہند کا وہ شیر جو گرجا تھا انگلستان میں
آخری دم تک نہ آیا فرق جس کی آن میں

ایسا بھی اک بھارتی انگلینڈ کا مہمان تھا
بولنے میں جو اکیلا پورا ہندوستان تھا

آخری تقریر میں بازی لگا کر جان کی
بات لندن میں بھی رکھ لی اپنے ہندوستان کی

جوہر مردانگی مرد خدا دکھلا گیا
آئینہ ٹوٹا مگر اپنی جلا دکھلا گیا

دیکھ کر توحید کے فرزند کا رتبہ مبیں
کیوں نہ لیتی گود میں بیت المقدس کی زمیں

سر پہ تھا بارِ وطن بھی دین حق کا تاج بھی
قبلۂ اول گواہی دے رہا ہے آج بھی

آگ کے شعلے نکالے آہنی زنجیر سے
بیڑیاں پگھلا دیں جس نے گرمیٔ تقریر سے

یہ اس آزادی کے ہیرو کی صدی کی ہے پکار
آنے والی ہر صدی پہ ہوگا جس کا انحصار

دو جواب اس کا بتاؤ اس کی کیا تقصیر ہے
جس کا دامن سب نے تھاما وہ گریباں گیر ہے

داستاں اوروں کی تو تاریخ پوری کہہ گئی
اس کی رودادِ جنوں کیسے ادھوری رہ گئی

کیوں ہلال حریت اتنے برس بادل میں تھا
کیسے پیچھے رہ گیا وہ تو صف اول میں تھا

تم خطاواروں میں ہو ہم بھی خطا واروں میں ہیں
کون دے کس کو سزا سب تو گنہگاروں میں ہیں

منصور نعمانی ندوی
شبلی اکیڈمی - اعظم گڑھ -

اقبال طنز و مزاح کے آئینے میں

علامہ اقبال شاعرِ فطرت، شاعرِ انقلاب، ایک مبلغ، ایک فلسفی، اور ترجمانِ حقیقت کے عنوان سے شہرت کی معراج پر ہیں اور ان موضوعات پر ہزاروں صفحات رقم ہو چکے ہیں لیکن اقبال کے طنز و مزاح کا پہلو ابھی تشنہ ہے۔ اس پر بہت کم لوگوں نے توجہ دی ہے۔ اقبال کے اسی رخ پر کچھ روشنی ڈالنے کی کوشش ذیل میں کی گئی ہے۔

اقبال نے شاعری میں ایک انقلاب کو جنم دیا ہے۔ انھوں نے قدیم شاعرانہ ڈگر سے اپنے کو بچایا، کیونکہ ان کی شاعری ایک پیام تھی، ایک تحریک تھی، ایک انقلاب کی دعوت تھی۔ اس میں سنبل و ریحان، ہجر و وصال کی پارینہ داستانوں کا گذر کہاں ہو سکتا تھا۔ حالی نے اگرچہ اس کی طرح ڈالی تھی لیکن اقبال نے اس کو معراجِ کمال تک پہنچایا۔ انھوں نے پاکیزہ خیالات اعلا جذبات، قومی سیرت، انسانی مجد و شرف، صحیح ذوق طلب اور سیاسیات حاضرہ پر بے لاگ تنقید کا انداز اختیار کر کے شاعری کو زندۂ جاوید بنا دیا۔ مشہور نقاد و ادیب ماہر القادری نے بالکل صحیح لکھا ہے:

"اقبال نے شاعری کے زمین و آسمان بدل دیے۔ اب تک شاعری "واہ" اور زیادہ سے زیادہ "آہ" تھی لیکن اقبال نے شعر میں زندگی کو سمو کر خیال و فکر کا ایک نادر اور عجیب اسلوب پیش کیا، جس کی نظیر دنیائے شاعری میں مشکل سے ملے گی۔" (پیغام حق: لاہور مارچ ۱۹۴۱ء)

اقبال سے قبل اردو کی طنزیہ شاعری میں اکبر الہ آبادی شہرت کے نصف النہار پر تھے انھوں نے اس صنفِ شاعری میں اجتہادی رنگ کے خوب مظاہرے کیے۔ اقبال نے شروع میں اسی پیر دانا کا ہلکا رنگ اختیار کیا۔ اکبر کے رنگ کے ظریفانہ اشعار ملاحظہ کیجیے۔ انھوں نے سماج پر مزاحیہ تنقید کس انداز میں کی ہے: ؎

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی
قوم نے ڈھونڈھ لی فلاح کی راہ
یہ ڈرامہ دکھائے گا کیا سین
پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

ایک اور نمونہ دیکھیے:

تہذیب کے مریض کو گولی سے فائدہ
دفعِ مرض کے واسطے پل پیش کیجیے
تھے وہ بھی دن کہ خدمتِ استاد کے عوض
دل چاہتا تھا ہدیۂ دل پیش کیجیے
بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا پس از سبق
کہتا ہے ماسٹر سے کہ بل پیش کیجیے

لیکن رفتہ رفتہ اکبر کا رنگ ختم ہوتا گیا اور وہ اکبر سے کئی قدم آگے ہو گئے۔ انھوں نے طنز کو عالمگیر انسانی مسائل سے روشناس کرانے میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ لطیف و گہرا رنگ اپنا کر انھوں نے اس میں سنجیدگی و متانت کا اضافہ بھی کر دیا۔ ان سے

شاعری کی جڑیں گہری و مضبوط ہوگئیں۔ اقبال کے کلام کا مطالعہ کیجیے تو آپ کو سنجیدگی و ظرافت کا ایسا حسین امتزاج ملے گا جو بہت کم شاعروں کے حصہ میں آیا۔ یہی اقبال کی شاعری کا فن بھی ہے۔ اس کی مثال ان کی نظم "نصیحت" ہے۔ اس میں انہوں نے طنز کے لیے ایک نیا زاویہ منتخب کیا ہے: ؎

میں نے اقبال سے از راہ نصیحت یہ کہا
عامل روزہ ہے تو اور نہ پابند نماز
تو بھی ہے شیوۂ ارباب ریا میں کامل
دل میں لندن کی ہوس لب پہ ترے ذکر حجاز
جھوٹ بھی مصلحت آمیز ترا ہوتا ہے
ترا انداز تملق بھی سراپا اعجاز
ختم تقریر تری مدحت سرکار پہ ہے
فکر روشن ہے ترا موجد آئین نیاز
در حکام بھی ہے تجھ کو مقام محمود
پالیسی بھی تری پیچیدہ تر از زلف ایاز
اور لوگوں کی طرح تو بھی چھپا سکتا ہے
پردۂ خدمت دیں میں ہوس جاہ کا راز
نظر آجاتا ہے مسجد میں بھی تو عید کے دن
اثر وعظ سے ہوتی ہے طبیعت بھی گداز

ڈاکٹر وزیر آغا نے لکھا ہے:

"سنجیدگی و ظرافت کا یہ امتزاج اقبال کی شاعری کا امتیازی نشان ہے، وہ کہیں کھلکھلا کر نہیں ہنستے، لیکن ایک تبسم ریز لب کے ساتھ زندگی کی ناہمواریوں کو اجاگر کر کے چلے جاتے ہیں، خدا سے شکوہ کرتے وقت ابلیس اور انسان کی فطرت کی نقاب کشائی کرتے ہوئے۔ ملا کی سرشت پر چوٹ کرنے کے دوران وہ کہیں بھی ظرافت کو سستی جذباتیت کے حوالہ نہیں کرتے بلکہ ایک مفکر کے دھیمے تبسم کی رفاقت میں پیش کرتے اور حیرت انگیز طور پر کامیاب ہو جاتے ہیں۔"

(طنز و مزاح ص ۱۳۹)

فرقت کاکوروی اقبال اور اکبر کا موازنہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"اکبر اور اقبال کے طنز میں وہی فرق ہے جو ایک مفکر اور غیر مفکر کی طبیعتوں میں ہوتا ہے۔ اکبر کے یہاں تلخی اور نشتر ہے مگر اقبال کے طنز میں ایک مصلح درد مند کی اولوالعزمی ہے۔ اقبال کے طنز میں ہمدردی اور دلسوزی ہے، وہ بنیادی کمزوریوں کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ ان کے طنز میں پیام بھی ہے، مگر اکبر کے یہاں کوئی پیغام نہیں ملتا۔"

(اردو میں طنز و مزاح حصہ نظم ص ۶۱)

رموز بیخودی پر تبصرہ کرتے ہوئے سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے:

"یہ ناممکن ہے کہ جو مصرع ڈاکٹر اقبال کی زبان سے نکل جائے وہ تیر و نشتر بن کر سننے والوں کے جگر میں نہ اتر جائے۔"

(بحوالہ نقوش اقبال نمبر اول ص ۳۴۶)

اقبال نے اپنے طنز کا پہلا نشانہ اپنی قوم کو بنایا ہے۔ ان کی بدعملی، ناعاقبت اندیشی، رسوم و قیود کے التزام اور جذباتیت پر قوم کا ماتم کرتے ہیں، اس کے لیے زہر میں بجھے ہوئے تیر استعمال کرتے ہیں کہ خواب غفلت سے قوم مسلم بیدار ہو: ؎

رہ گئی رسم اذاں روح بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا، تلقین غزالی نہ رہی
زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی
آج کیا ہے؟ فقط اک مسئلۂ علم کلام

ہے کس کی یہ جرأت کہ مسلمان کو ٹوکے
حریت افکار کی نعمت ہے خداداد
چاہے تو کرے کعبہ کو آتش کدۂ پارس
چاہے تو کرے اس میں فرنگی صنم آباد
قرآن کو بازیچۂ اطفال بنا کر
چاہے تو خود اک تازہ شریعت کرے ایجاد

ہے مملکت ہند میں اک طرفہ تماشا
اسلام ہے محبوس مسلمان ہے آزاد

اقبال کے طنز کا دوسرا رخ مغربی تہذیب کی بے قیدیاں و بے اعتدالیاں ہیں وہ جب دیکھتے ہیں کہ جھوٹے نگوں کی صناعی سے آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی ہیں تو اس کی ہلاکت خیزیاں اور تباہ کاریاں بتاتے ہیں۔ اس کے لیے وہ نئی اصطلاحات کا بھی سہارا لیتے ہیں اور قوم کی اخلاقی حس کو بیدار کرنے کے لیے طنز کے زہر آلود تیر بھی چلاتے ہیں، کچھ اشعار دیکھئے:

میخانۂ یورپ کے انداز نرالے ہیں
لاتے ہیں سرور اول دیتے ہیں شراب آخر

مغربی تہذیب جو سطحی نظروں کے لیے فاتحانہ نظر آتی ہے نظر ہوشیار کے آگے اس کی شکست یوں عریاں ہے:

بیکاری و عریانی و میخواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات

فساد قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب
کہ اس کی مدنیت رہ سکی نہ عفیفت

وہ اب شیشۂ تہذیب حاضر ہے مے لا سے
مگر ساقی کے ہاتھوں میں نہیں پیمانۂ الاّ

اور یہ اہل کلیسا کا نظام تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

اٹھا کے پھینک دو باہر گلی میں
نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے

میاں نجار بھی چھیلے گئے ساتھ
نہایت تیز ہیں یورپ کے رندے

یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات

ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

آیا ہے مگر اس سے عقیدوں میں تزلزل
دنیا تو رہی طائر دیں کر گیا پرواز

اقبال کے طنز کا تیسرا رخ زندگی، کائنات اور مسائل کی طرف ہے اس کے لیے وہ رموز و نکات کا سہارا لیتے ہیں اس میں شوخی و بیباکی کے علاوہ طنز کے نشتر بھی پنہاں ہیں، حکمت، متانت، بصیرت کو ظرافت میں سمو کر وہ پیش کرتے ہیں تو وہ بلند پایہ طنز نگار معلوم ہوتے ہیں۔ "غلاموں کی نماز" کے عنوان سے انہوں نے جو کہا وہ کتنا حقیقت پر مبنی ہے:

کہا مجاہد ترکی نے مجھ سے بعد نماز
طویل سجدے ہیں کیوں اس قدر تمہارے امام

قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے
اس کو کیا جانیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام

اے مرد خدا تجھ کو وہ قوت نہیں حاصل
جا بیٹھ کسی غار میں اللہ کو کر یاد

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
بیچارہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

سینے میں رہے راز ملوکانہ تو بہتر
کرتے نہیں محکوم کو تیغوں سے کبھی زیر

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو
ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اسے پھیر

تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب
سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر

شیخ کو اقبال ہدف تنقید یوں بناتے ہیں:

کر سکتی ہے بے معرکہ جینے کی تلافی
اے شیخ حرم تیری مناجات سحر کیا؟

شیخ صاحب بھی پردے کے کوئی حامی نہیں
مفت میں کالج کے لڑکے ان سے بدظن ہو گئے

وعظ میں فرما دیا کل آپ نے یہ صاف صاف
پردہ آخر کس سے ہو جب مرد ہی زن ہو گئے

نونِ دقت کے لئے لڑتے ہیں شیخ جی
پوچھو تو وقف کے لئے جائیداد بھی ہے

ملوکیت کے بعد اقبال نے "ملائیت" اور "صوفیت" کو [نشانہ] بنایا، مگر اس سے اقبال کی مراد پیشہ ور، ریاکار اور جھوٹے اور نام نہاد صوفیوں سے ہے اور انہی کا خاکہ یوں اڑایا ہے

یہی شیخ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیمِ بوذرؓ و دلقِ اویسؓ و چادرِ زہراؓ

"باغی مرید" کے عنوان سے اقبال نے ان کے سدابہار دربار پر طنز کی یوں بارش کی ہے:

ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی
گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن
شہری ہو دہاتی ہو مسلماں ہے سادہ
مانندِ بتاں پجتے ہیں کعبے کے برہمن
نذرانہ نہیں سود ہے پیرانِ حرم کا
ہر خرقۂ سالوس کے اندر ہے مہاجن
میراث میں آئی ہے انھیں مسندِ ارشاد
زاغوں کے تصرف میں عقابوں کا نشیمن

میں جانتا ہوں انجام اس کا
جس معرکہ میں مُلّا ہو غازی

جس طرح پاپائیت عیسائی مذہب میں سنگِ گراں ثابت ہوئی۔ اسی طرح ایک زمانے سے پیشہ ورانہ خانقاہیت بھی خودی کی راہ میں حائل ہے، اقبال سے یہ دلدوز منظر دیکھا نہ گیا، انھوں نے یوں طنز کا وار کیا:

سکھا دیے ہیں اسے شیوۂ خانقہی
فقیہِ شہر کو صوفی نے کر دیا ہے خراب

دین و دنیا سے ناواقف مدارس کے اجارہ داروں سے بھی اقبال سخت نالاں تھے۔ انھوں نے ان کو بھی یوں نشانہ بنایا:

یہ بتانِ عصرِ حاضر کہ بنے ہیں مدرسوں میں
نہ ادائے کافرانہ، نہ تراشِ آزرانہ

شکایت ہے مجھے یا رب خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

حیا نہیں ہے زمانے کی آنکھ میں باقی
خدا کرے جو جوانی تری رہے بے داغ

★

رباعیات

باذل عباسی
معرفت علی مہدی نیشنل بک ٹرسٹ
گرین پارک۔ نئی دہلی

(۱)
کچھ درد کچھ آزار تو پیدا کر لو
غم کھانے کے معیار تو پیدا کر لو
آسان نہیں گردشِ دوراں سے نباہ
اک جذبۂ بیدار تو پیدا کر لو

(۲)
میں بزمِ غمِ عشق میں بیگانہ ہوں
سب بھول گئے جس کو وہ افسانہ ہوں
دیکھا نہ کسی نے بھی نظر بھر کے مجھے
کیا میں کوئی ٹوٹا ہوا پیمانہ ہوں

(۳)
افکار کو اعجاز بنا دیتا ہوں
اسرار کے پردوں کو اٹھا دیتا ہوں
ادراک کو نغمے کا سفینہ دے کر
الفاظ کے دریا میں بہا دیتا ہوں

(۴)
پیمانۂ احساس چھلک جاتا ہے
کانٹا سا مرے دل میں کھٹک جاتا ہے
کرتا ہے اگر غم کا مداوا کوئی
شعلوں کی طرح اور بھڑک جاتا ہے

حرمت الاکرام
رام باغ۔ مرزاپور (یو۔ پی)

اجنتا

اپسرائیں سو رہی ہیں پتھروں میں
رات جانے کتنی لمبی ہو گئی ہے!
روز افق ہوتا ہے روشن
پھینک دیتی ہے زمیں سینوں کی چادر
روز چلتی ہے نسیم اپنے سفر پر
کھول دیتی ہیں لہک کر آنکھ ندیاں
مسکرا پڑتا ہے سبزہ
جگمگا اٹھتے ہیں کہساروں کے سینے،
روز و شب کا یہ عمل
یہ مدھ بھرا — پیارا تسلسل
روشنی و تیرگی کے رمز کی تفسیر بھی ہے
ایسی اک تصویر بھی ہے
جس کی تفہیم اور الجھاتی ہے سعیِ فکر و فن کو
یہ تسلسل پیرہن کا روپ دیتا ہے کفن کو
قریہ قریہ روز سوتا جاگتا ہے
اجلی اجلی — دھندلی دھندلی ڈور میں الجھا ہوا سا
شام ہوتی ہے — سحر ہوتی ہے — کرنیں پھوٹتی ہیں
روشنی لکھتی ہے دھرتی کی کہانی
لیکن — ان مدہوش، بے سدھ اپسراؤں کو بتانے کیا ہوا ہے!
کون سی وہ صبح ہوگی
لائے گی جو ان کی پلکوں پر جمی بھاری چٹانیں کاٹنے والا اجالا
منتظر ہیں کن شعاعوں کی یہ بے سدھ اپسرائیں
ان کی خاطر کیا افق سے اور کوئی دوسرا سورج اگے گا

قیصر وارثی
۱۷۳/ع آریہ نگر، لکھنؤ ۴

اسلم لکھنوی کی یاد میں

(دوسری برسی کے موقع پر)

چل بسا دنیا سے وہ مردِ مجاہد چل بسا
جس کے دنیائے ادب پر سیکڑوں احسان تھے

پیکرِ خلق و مروت یعنی اسلم لکھنوی
صرف شاعر ہی نہیں تھے اک عظیم انسان تھے

آج ہر محفل میں ان کا ذکر ان کا سوگ ہے
کیوں کہ وہ ہر محفلِ شعر و سخن کی جان تھے

فیض پاتے تھے یہاں ان سے ہزاروں تشنہ کام
شہرِ علم و فن میں وہ اک چشمۂ فیضان تھے

ہے یہ اپنا یا پرایا کچھ غرض اس سے نہ تھی
لطف فرما وہ ہر اک پر ہر گھڑی ہر آن تھے

ہات پھیلانا روا سمجھا نہ شکوہ ہی کیا
اہلِ زر کے وہ نہ کچھ شرمندہ احسان تھے

اتنا کچھ ہوتے ہوئے بھی قدر دنیا نے نہ کی
خود بھی وہ بے مہریِ احباب پر حیران تھے

رفتہ رفتہ گل ہوئے جاتے ہیں اب سارے چراغ
کیسے کیسے لکھنؤ میں صاحبِ عرفان تھے

مشعلِ تہذیب و فن توقیرِ شہرِ لکھنؤ
یوں رہے دنیا میں وہ جیسے یہاں مہمان تھے

کسمپرسی، بے رخی، بے اعتنائی، بے بسی
مرگِ شاعر کے لیے کچھ کم نہ یہ سامان تھے

سید اختر الاسلام
۱۵۸، شاہ منقن میرٹھ۔

نظری اغلاط

علامہ اقبالؔ کے مغربی مداح ڈاکٹر آر۔ اے نکلسن نے ۱۹۲۰ء میں اقبالؔ کی مثنوی اسرارِ خودی کا ترجمہ کرتے وقت اس کے ایک مصرع ؎

صورتِ طفلاں زنے مرکب کنی۔

کے پڑھنے میں یہ غلطی کی تھی کہ حرف "ز" کو لفظ "نے" (بمعنی بانس) سے ملا کر "زنے" (بمعنی عورت) کر دیا تھا۔ اس غلطی کی نشان دہی سب سے پہلے خواجہ غلام السیدین نے کی تھی ۔۔۔ اسی طرح کی ایک لفظی غلطی کی نشان دہی یوسف اقبال (مدیر انصاری دہلی) نے سجاد ظہیر عرف بنے بھائی سے کی تھی۔ بنے بھائی نے ایک محفل نشاط میں حافظ شیرازیؒ کا یہ شعر ؎

فغاں کہ دانۂ انگور آب می سازند
ستارہ می شکنند آفتاب می سازند

پڑھا۔ یوسف اقبال نے ان سے کہا "آپ نے فغاں کہاں سے پڑھ لیا۔ ایسے تو سارا شعر مہمل ہو گیا"۔ بنے بھائی نے جواب دیا "میں نے ایک خاص نسخے میں پڑھا ہے اور اس پر تو میں شرح بھی لکھ چکا ہوں"۔ یوسف اقبال صاحب نے تب کہا تھا "دانۂ انگور کے آفتاب بن جانے پر یعنی اس ارتقائی عمل پر فریاد کرنے کا موقع کیا ہے۔ یہ تو قابل داد اور قابل تحسین عمل ہے"۔ بنے بھائی نے پوچھا "پھر یہاں کیا ہونا چاہیئے؟" یوسف اقبال نے برجستہ کہا تھا "مُغاں ہونا چاہیئے"۔ یعنی ساقی جو دانۂ انگور کو توڑ کر شراب بنا رہا ہے۔ یہاں غلطی یہ ہوئی کہ "م" کا شوشہ "ف" سے مشابہ ہو گیا"۔

دنیائے ادب میں یہ بھی بڑا عمدہ لطیفہ ہوا کہ علامہ شبلیؔ نعمانی نے کاتب کو اپنا مسودہ دیتے وقت اس پر "شبلیؔ نعمانی" لکھ دیا تھا جس کو کاتب نے مسلسل دو عدد لکھ مارا تھا۔ اسی قبیل کی چند دیگر غلطیاں بھی رواداری میں یا سہواً ہو جاتی ہیں مثلاً "اجنبی گندھا" کو "اجنبی گدھا"، "شور" کو "مشہور"، "پنجاب" کو "جناب"، "جیتا" کو "جیسا"، "خواب" کو "جواب"، "سبب" کو "سب"، "بدلنا" کو "بدکنا"، "متعدد" کو "مستعد"، "ٹھنک" کو "بھنک"، "تجزیہ" کو "تجربہ"، "کپڑے" کو "کیڑے" پڑھا اور لکھا جاتا ہے۔ عام قاری سے جو غلطیاں سرزد ہوتی ہیں ان کی پکڑ تو اس لیے نہیں ہو پاتی کیونکہ قاری چپکے سے پڑھ کر آگے بڑھ جاتا ہے لیکن جب یہ چیز ضبط تحریر میں آتی ہے تو اس وقت غلطیوں کی نشان دہی ہوتی ہے۔ ان غلطیوں کے ارتکاب کی وجہ سے عموماً کاتب یا مترجم اس لیے مطعون ہوتے ہیں کیونکہ وہ ان لفظوں کو قید کرتے ہیں۔

کبھی کبھی یہ غلطیاں جہاں باعث تفریح ہوتی ہیں وہیں ان کے نتائج خطرناک بھی ہوتے ہیں اور ان سے غلطی کرنے والے کی شخصیت پر حرف آتا ہے جیسے دیکھا جائے تو اس طرح کی نظری اغلاط فطری ہیں اور عموماً سب سے سرزد ہو سکتی ہیں۔ جیسا کہ علامہ شبلیؔ نے کلاڈیو ڈی ولڈوجی (ف ۱۵۵۵ء، ۱۴۹۲ء) کی مثال پیش کر کے سمجھایا ہے جس نے لاطینی اور

اطالوی زبان کا موازنہ کر کے بتایا ہے کہ الفاظ صرف عوام کی بولی ٹھولی اور روزمرّہ محاورے کے تحت نئی صورت اختیار کرتے ہیں، بلکہ پڑھے لکھوں کے ذریعہ بھی تغیر و تبدل کے عمل سے گزرتے ہیں تبدل و تغیر کا یہ عمل حسب معمول منضبط اور ناگزیر ہے یہ تبدیلیاں لوگوں کی تحریری عادتوں اور ادبی اثرات سے متاثر ہوتی ہیں۔ اسی لیے کبھی لہجہ میں بھونڈا پن، بھدا پن اور گنگنا پن آجاتا ہے۔ (شعر العجم)

اردو میں لب و لہجہ بھی غلطی کا محرک ہوتا ہے۔ کیونکہ اسی سے نظم و نثر میں غصّہ و خوشی، ہمدردی، رحم، نفرت اور رنج و الم کے جذبات کی عکاسی ہوتی ہے۔ اس کیفیتی انداز کی پرکھ پر لفظ فہمی کا دارومدار رہتا ہے۔ کیونکہ غصہ اور جھنجھلاہٹ کے وقت انسان میں اعصابی تناؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ اور یہ اعصابی تناؤ اس کو شرمندگی اور خجالت سے قریب کر دیتا ہے۔ اس سے الفاظ اور لفظ میں تصادم ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ ایک بے ربطی اور اس عبارت سے غیر متعلق حالتوں کے احیاء کی شکل میں برآمد ہوتا ہے۔ عبارت کو پڑھتے وقت تیزی اور آہستہ روی بھی خاص تاثر کا موجب ہوتی ہیں۔ مثلاً اس جملے کو لیجئے۔ ـــ "رو کو مت جانے دو" یہ جملہ مثبت اور منفی دونوں انداز میں استعمال ہو سکتا ہے۔ اب یہ سوال کہ اس جملہ میں کون سا لہجہ اختیار کیا جاتا ہے اس کا انحصار موڈ اور حالات پر ہوتا ہے۔

مولانا الطاف حسین حالی نے اس ضمن میں ایک بات کہی تھی کہ عمدہ الفاظ دلوں میں گھر کر جاتے ہیں۔ ایک مبتذل مضمون پاکیزہ الفاظ میں ادا ہونے سے قابل تحسین ہو سکتا ہے جس کی تصدیق شبلی صاحب کی اس مثال کے ذریعہ ہوتی ہے کہ گلستاں بوستاں میں جو مضامین اور خیالات ہیں، وہ اچھوتے اور نادر نہیں۔ لیکن الفاظ کی وضاحت، ترتیب و تناسب نے اس میں سحر پیدا کر دیا ہے۔ ان ہی مضامین یا خیالات کو معمولی الفاظ میں ادا کیا جائے تو سارا اثر جاتا رہے گا۔ کیوں کہ ہر لفظ اپنی ایک روایت رکھتا ہے۔ اس میں معنویت عبارت میں موجود دوسرے لفظوں کے ساتھ مل کر کسی خیال کا ابلاغ کرتی ہے۔ لفظوں میں علاحدگی سے کوئی مضمون پیدا نہیں ہوتا۔

شاید لفظوں کی اسی کیفیت سے متاثر ہو کر کرشن چندر نے کہا تھا۔ "الفاظ میں سختی سہ طرفی مکعبیت سے ہوتی ہے جس کے بغیر چٹان سے ٹکرایا نہیں جا سکتا۔ لہجہ میں گھن گرج بھی ہوتی ہے جو چٹان کے سینے کو لرزا دے۔ ان دونوں سے آہنگ بنتا ہے جو ایک خاص قسم کی موسیقی اور نغمگی پیدا کرتا ہے" جب کہ اسی ضمن میں شبلی صاحب کا کہنا تھا۔ "الفاظ اپنا ایک وجود رکھتے ہیں۔ ہر وجود کا ایک عمق ہوتا ہے یعنی لمبائی، چوڑائی، موٹائی، گہرائی ہوتی ہے۔ وہ ایک ہشت پہلو ہیرے کی طرح ہوتے ہیں۔"

بادی النظر میں کسی لفظ کو غلط معنی و مفہوم میں سمجھنے کے تین اسباب بتائے جاتے ہیں۔

۱۔ کم علمی۔

۲۔ زبان پر دسترس اور عبور نہ ہونا۔

۳۔ حاضر دماغ نہ ہونا۔ لیکن عملی طور پر چند دیگر اسباب کو بھی اس ضمن میں ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے۔

کم علمی سے مراد کم پڑھا لکھا ہونا مطلق نہیں ہے۔ کوئی آدمی کافی تعلیم یافتہ ہے مگر اس میں حسب موقع اور ضرورت لفظوں کو استعمال کرنے اور اپنے مطلب کی ترسیل کرنے کی طاقت کا سراسر فقدان ہے۔ اس کے برعکس جاہل اور چرب زبان مجمع فروش جو زبان و بیان کے لحاظ سے کم علم ہوتا ہے مگر اس کا طریقہ اظہار بہت دل نشیں اور موثر ہوتا ہے۔ یہ دل نشینی صرف اردو ہی کراتی ہے۔ کیونکہ اردو ایک لشکری زبان ہے اور جس طرح لشکر میں طرح طرح اور بھانت بھانت کے آدمی ہوتے ہیں اسی طرح اردو میں بھانت بھانت کی بولیوں کی اصطلاحات اس حد تک مستعمل ہیں جن کے استعمال سے ایک خاص شیرینی اور لطافت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور

یہی وجہ ہے کہ اردو میں ایک ہی لفظ سے مختلف معانی ومفاہیم مراد لیے جاتے ہیں۔ گویا اردو کی لفظی اصطلاحات ایسے کلیے اور حقیقت کی عکاسی و ترجمانی نہیں کرتی جس میں ایک لفظ کے ایک ہی مخصوص معنی مراد لیے جائیں۔

کم تعلیم یافتہ آدمی جس نے عربی، فارسی کا مطالعہ نہ کیا ہوا ان زبانوں کی اضافتی تراکیب سے ناواقف ہو اسے تو اپنی کم علمی کا احساس رہتا ہے۔ اس کے برعکس وہ آدمی جو ان زبانوں میں ماہر ہو اور اسے علم پر پوری طرح عبور حاصل ہو وہ بھی بعض دفعہ فاش غلطیاں کر جاتا ہے۔ کیونکہ اس کے ذہن میں الفاظ کا لامحدود ذخیرہ ہوتا ہے۔ الفاظ کے ساتھ ذہن چلتا ہے اور مفہوم سمجھتا جاتا ہے۔ الفاظ کی کثرت اس میں بے ترتیبی پیدا کر دیتی ہے۔

الفاظ کو صوتی پیکر بھی کہا گیا ہے۔ ان کی تخلیق آواز سے کی جاتی ہے۔ آواز صرف کانوں کو سنائی دیتی ہے۔ آنکھیں اس کے دیدار سے محروم رہتی ہیں۔ اس طرح لفظ فہمی اور نافہمی کا معاملہ حواس خمسہ کے تحت متعین ہوتا ہے۔ پھر الفاظ بھی کئی طرح کے ہوتے ہیں — سادہ، پیچیدہ، مرکب، منفرد، گنجلک — جن سے لغوی اغلاط ممکن العمل ہوتی ہیں۔ کیوں الفاظ سنتے ہی ان سے متعلق الفاظ کی طرف ذہن منتقل ہو جاتا ہے۔

اکثر ادق اور غیر مستعمل الفاظ کی ادائیگی بھی غلطی کا محرک ہوتی ہے کیونکہ نظریں ان الفاظ سے مانوس نہیں ہوتیں۔ ایسے ہی الفاظ طبیعت میں کرختگی پیدا کرتے ہیں اور نافہمی کے سبب انسان کا دل وقتی طور پر ان سے مکدر ہو جاتا ہے۔ یہی چیز طبیعت کی حاضری اور غیر حاضری یعنی موڈ کے اچھے یا برے ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ مشاہدہ گواہ ہے کہ جب طبیعت حاضر ہوتی ہے تو آدمی بنا کسی تکان کے بیدار رہتا ہے اور تب غلطیوں کا سرے سے امکان نہیں رہتا اس لیے دل و دماغ کی یکسانیت اور یکسوئی قلب بھی اس ضمن میں خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ چیزیں لگاتار استعمال میں آتے رہنے کی وجہ سے اپنا حسن، تازگی اور کشش کھو دیتی ہیں اور نظر ان میں کوئی رنگینی اور دل نشینی نہ دیکھ کر ان کے اوپر سے گزر جاتی ہے۔ ایسی صورت میں ان کا وجود اور عدم وجود دونوں برابر ہوتے ہیں۔

یہی وہ حالت ہوتی ہے جب شعور اور لاشعور کے درمیان تصادم ہوتا ہے۔ شعوری طور پر انسانی ذہن ہمہ وقت یکساں نہیں رہتا۔ کیفیات قلبی، تفکرات زمانہ، وقتی اور ہنگامی حالات اور طبیعت کی حاضری یا غیر حاضری پر ہی لفظ کی درستی اور نادرستی موقوف رہتی ہے۔

اعراب بھی لفظ فہمی اور نافہمی میں ایک خصوصی کردار ادا کرتے ہیں۔ اردو میں اعراب بالکل نہ لگائے جاتے ہوں ایسا تو ناممکن ہے۔ ایک نو آزمودہ کار کے لیے اعراب لگانا ضروری ہے جبکہ اچھے اردو داں کے لیے اعراب کی یہ قید بے کار ہو جاتی ہے کیونکہ وہ ایک ماہر تیراک کی طرح اپنی کشتی کھیتا ہے اور اس میں اصل لفظ پر اس کی گرفت ڈھیلی ہو جانے کے سبب لازمی طور سے ایک نیا لفظ وہاں از خود آجاتا ہے۔ اس سلسلے میں اردو کی یہ خوبی قابل تحسین ہے کہ اس میں بڑے سے بڑے تصور کا نقش ایک لفظ کے ذریعہ ظاہر کر دیا جاتا ہے۔ روانی کے ساتھ عبارت پڑھنے سے قاری، کاتب یا مترجم لفظوں کے کونے دیکھ دیکھ کر مطلب کی کوڑی پکڑتا چلتا ہے۔ نظر مانوس متبادل الفاظ کو ٹٹولتی پرکھتی آگے بڑھتی جاتی ہے۔ اس کی مثال گھوڑے جیسی ہوتی ہے جو چلتے وقت سوتا ہے۔ مگر ساکت ہو کر بیدار رہتا ہے۔ کام شروع کرتے وقت انسان کا دماغ حاضر اور بیدار رہتا ہے۔ پھر اس پر تکان غلبہ پا جاتی ہے۔ تب وہ جیسے تیسے اپنے موجودہ کام کی جلد سے جلد تکمیل کر لینا چاہتا ہے۔ یہی وہ لمحات ہوتے ہیں جب لفظ کچھ ہوتا ہے۔ نیز پڑھا اور سمجھا کچھ اور جاتا ہے۔ لکھا کچھ جاتا ہے

اگر آدمی صرف مطالعہ کی حد تک محدود رہے تو اس طرح کی نظری
غلطیاں سامنے نہیں آتیں۔ لیکن لکھتے وقت غلطیاں ضرور
سامنے آجاتی ہیں۔

اس ضمن میں احساسات بھی قابل غور ہوتے ہیں۔ احساسات
بچے میں بھی ہوتے ہیں۔ لیکن وہ اپنی خوشی اور غم الفاظ کے ذریعہ
نہیں بلکہ چہرے کے حرکات وسکنات سے ظاہر کرتا ہے۔ موجودہ
تعلیمی اداروں کے نصابوں میں احساسات کے ارتقا کی
جانب زیادہ دھیان نہیں دیا جاتا اس لیے کچھ غلطیاں اس
طرح بھی سرزد ہوجاتی ہیں۔ لیکن جن لوگوں کو احساسات کی
قدر وقیمت کا اندازہ اور علم ہے وہ مکالموں، مقابلوں،
مباحثوں کے ذریعہ اس شوق کو فزوں کرتے ہیں۔ فی البدیہہ
موضوع دے کر اس پر تقریر کرنے سے قوت گویائی، اور
اظہار کو تحریک ملتی ہے۔ اس معاملہ میں ماحول، مطالعہ
مشاہدہ اور سماجی ارتباط سے بھی مثبت اور منفی پہلو
ارتقا پذیر ہوتے ہیں۔ یہ سب تعلیم و تربیت کا جزو خاص ہوتے
ہیں۔ اس کی سب سے بڑی مثال گھما گھمی سے دی جا سکتی
ہے۔ پہلے ہائے ہوز اور دو چشمی ھ میں فرق روا نہ رکھا جاتا تھا
لیکن موجودہ املا نے ایک ہی قبیل کے دونوں حروف کے درمیان
حد فاصل کھینچ دی ہے۔ لفظ گھما گھمی حرف گھ (گ اور دو
چشمی ھ کا مرکب) سے صحیح ہے۔ لیکن اکثر ہائے ہوز سے لکھ دیا
جائے تو پڑھنے والا اس کو صوتی طور پر صحیح پڑھے گا۔ لیکن اردو
سے ناواقفیت ہونے کے سبب اسے اس طرح لکھا جانے
لگا کہ گہما گہمی ہوکر رہ گیا اسی طرح تعلیم و تربیت کے عدم
امتزاج کے سبب لفظ طاقت ور کو طاقتور پڑھ لیا جاتا ہے بوتیا
بہن کو سوتیا بہن لکھا جاتا ہے۔ اس طرح کی غلطیاں عام توجہ
بوجھ، طرز تحریر اور لفظوں کی ساخت کی بھی مرہون منت
ہوتی ہیں۔ خط شکست کی تعلیم پرانے لوگ اسی نقطۂ نظر سے
دلایا کرتے تھے تاکہ اس میں اشکال بہ طریقہ سے قاری اصلی
لفظ کی ماہئیت، درحقیقت سے پوری واقفیت حاصل کرلے۔

روشنائی کے ہلکے اور تیز ہونے اور لفظوں کے خفی و جلی ہونے
سے بھی غلطیاں سرزد ہوجاتی ہیں۔

علامہ شبلی نے صحیح فرمایا ہے کہ لفظ اور خیال میں کوئی
دقیق رہ گزر نہیں ہوتی۔ لفظوں میں خیال اور خیال میں الفاظ
پروئے جاتے ہیں۔ ابن خلدون نے معنی پر الفاظ کی برتری
کے بارے میں لکھا ہے کہ معنی ذہن انسانی میں پہلے سے
موجود ہوتے ہیں۔ الفاظ کے پیکر اس خیال کو اپنے قالب
میں ڈھال کر ان کا اعتراف کرا لیتے ہیں۔

دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک لفظ میں
کثیر النوع معنویت مخفی ہوتی ہے۔ اس سے ذہن، ادراک اور
شعور کی خفتہ اور بے دار قوتوں سے کام لینے کی تحریک عود کرتی
ہے اس ضمن میں قوت فیصلہ، متخیلہ اور قوت ارادی کا زیادہ
دخل رہتا ہے۔ یہ خوبی مسلسل ریاض اور لگاتار مشق سے
آتی ہے۔ جب لفظوں کے نقوش ذہن پر برابر پڑتے جاتے ہیں
اور ان کا وقتی انتخاب اور صحیح استعمال جاری رہتا ہے۔
اگر ایسا نہ ہوا تو وہیں غلطی کا امکان پیدا ہوجاتا ہے اس
کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اردو میں الفاظ زبان، مزاج اور
ماحول کی مطابقت کے ساتھ مخصوص معنی میں مستعمل ہوتے
ہیں۔ جیسے لفظ درد ہی کو لیں۔ اگر اس لفظ کو جسم کے کسی عضو
کی مطابقت میں استعمال کیا گیا ہے تب یہ مخصوص مطلب
ادا کرے گا کہ جسم کے فلاں حصہ میں درد یا بے چینی ہے لیکن
جب یہ لفظ اکیلا ہی استعمال کیا جاتا ہے تو اس کا
مطلب درد دل لیا جاتا ہے۔ مترجم یا کاتب لفظوں کو ایک بوجھ
سمجھ کر استعمال کرتا ہے۔ اس لیے اس پر ذہنی دباؤ اور
سختی قائم رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس روا روی اور بھاگم
بھاگ صورت حال میں لفظوں کے حسن کی طرف چنداں نظر
نہیں جاتی۔

علاوہ ازیں اردو میں جو رمز و کنایہ ہوتا ہے اس سے
لطف اندوز اسی وقت ہوا جا سکتا ہے جب ذہن پر کسی بھی

قسم کا بار نہ ہو۔ کیونکہ جہاں بھی ذہن پر ذرا بار ہوا لفظی نزاکت حسن و رعنائی اور شعریت کا خون ہو جاتا ہے۔

نظری اغلاط سے مفر کے لیے ضروری ہے کہ شعور اور لاشعور کی کشمکش ختم ہو اور ایسی صورت میں ممکن ہے جب ذہن بیدار اور ہوشیار رہے۔ یہی خردمندی بھی ہے۔ جسم کے تمام اعضاء میں دماغ ایک شہنشاہ کی طرح اپنا رول ادا کرتا ہے۔ جس کے حکم کی تعمیل کرنا سارے اعضاء اپنا فرض منصبی سمجھتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دماغ حاضر ہے مگر اس نے آنکھوں کو یہ حکم نہیں دیا کہ وہ کسی مخصوص طرز تحریر کا مشاہدہ کریں ذہن کا پردہ صاف نہیں کیا گیا۔ کانوں کو حکم نہیں ملا کہ وہ اپنی طاقت مجتمع رکھیں اور صحیح طور پر سنیں۔

اس ضمن میں جسمانی اضمحلال اور تکان بھی قابل غور ہیں جو لغزشِ فہمی کی بنیاد بن جاتے ہیں۔ نام نہاد طور پر آنکھیں دیکھنے کا عمل روا رکھتی ہیں۔ کان سننے کے لیے کھلے رہتے ہیں مگر دماغ اپنی تکان کے سبب کسی عضو کو حکم نہیں دے پاتا۔ کہ وہ خبردار اور بیدار رہے۔ اسی لیے جیسا راجا ویسی پرجا کے مصداق سب اعضاء لاپرواہی برتنے لگتے ہیں۔ اب صرف ہاتھ ہیں جو مشینی عمل میں مشغول رہتے ہیں لیکن ان کے عمل میں کتنی غلطیاں نکلتی ہیں، اسی پر کارکردگی اور قابلیت علمیت کا دارومدار رہتا ہے۔ اسی سے قوت ارادی مجروح ہوتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ایک قسم کا احساس کمتری بھی انسان میں پیدا ہو جاتا ہے جو شخصیت کے ارتقا کے سلسلے میں ضرر رساں ہوتا ہے۔

حرف آخر کے طور پر نظری اغلاط کے ضمن میں ایک پہلو یہ بھی قابل غور ہے کہ اکثر لوگ ایسی بے توجہی سے مضمون اور خطوط پڑھتے ہیں کہ جس بات کا ذکر مضمون یا خط میں ہوتا ہے وہ بار بار اسی کی وضاحت کے خواہش مند رہتے ہیں اور اس بات کو ذہن نشیں کرنے کی مطلق کوشش نہیں کرتے کہ مخاطب یا مصنف نے بھی کچھ سمع خراشی کی ہوگی۔

غزل

شاداب لکھنوی
اسٹیٹ فارمیسی مولان روڈ لکھنؤ

دیوانے کو دنیا سے سروکار نہیں ہے
ہشیار وہی ہے کہ جو ہشیار نہیں ہے

احباب بہت ہیں کوئی غمخوار نہیں ہے
دیوار تو ہے سایۂ دیوار نہیں ہے

تم ہی نہیں میں بھی ہوں اسیر غم ہستی
لیکن مری زنجیر میں جھنکار نہیں ہے

بازار محبت میں جو خود بک نہ گیا ہو
ایسا تو یہاں کوئی خریدار نہیں ہے

کیوں اپنی وفاؤں کا صلہ مانگ رہے ہو
لوگو یہ محبت کوئی بیوپار نہیں ہے

اب پھول لٹاتی ہیں بہاریں تو لٹائیں
دیوانے کے دامن میں کوئی تار نہیں ہے

اللہ اگر فتنۂ ساحل سے بچا لے
طوفان سے لڑنا کوئی دشوار نہیں ہے

یوں دل نہ مرا توڑیے بیکار سمجھ کے
ذرہ بھی کوئی خاک کا بیکار نہیں ہے

تحریر دلوں کے لیے نشتر نہ بناؤ
یارو یہ قلم ہے کوئی تلوار نہیں ہے

اس دور کے انساں کو ابھی اور جگاؤ
یہ خواب سے چونکا تو ہے بیدار نہیں ہے

معلوم یہ ہوتا ہے کہ میخانے میں جیسے
شاداب کے سوا کوئی گنہگار نہیں ہے

ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ

مرزا علی لطف اور لکھنؤ

مرزا علی لطف نے ۱۸۰۱ء میں تذکرۂ گلشنِ ہند لکھا[1]
عام طور پر ادبی حلقوں میں لطف کو ایک تذکرہ نگار کی حیثیت
سے جانا پہچانا جاتا ہے۔ جبکہ وہ میر و سودا کے عہد کے ایک
خوش گو اور اعلا پایہ کے شاعر بھی تھے۔ اب تک کسی نے لطف
کی شاعرانہ حیثیت متعین کرنے کی کوشش نہیں کی اور نہ
ہی ان کا دیوان ہنوز منظرِ عام پر آیا ہے۔ دیوانِ لطف کا
صرف ایک نسخہ دستیاب ہے جو کتب خانہ جامعہ عثمانیہ
حیدرآباد میں محفوظ ہے اس کے مطالعے سے بحیثیت شاعر
لطف کا مقام متعین کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

مرزا علی لطف کے آبا و اجداد کا تعلق ایران سے تھا۔
ان کے والد مرزا کاظم بیگ خان استرآباد کے رہنے والے
تھے اور نادر شاہ کی افواج کے ہمراہ ہندستان آئے تھے
نادر شاہ ہندستان سے ایران واپس چلا گیا لیکن مرزا کاظم بیگ
یہیں رہ پڑے۔ لطف نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ وہ (مرزا
کاظم بیگ) اپنے دیرینہ آشنا اور ہم وطن ابو المنصور خان صفدر
جنگ کی وساطت سے دربارِ شاہی میں باریاب ہوئے پلہ
نواب صفدر جنگ سے ان کے تعلقات ایران ہی سے تھے۔

مرزا کاظم بیگ خاں فارسی کے بلند پایہ شاعر تھے اور
ہجری تخلص کرتے تھے۔ صفدر جنگ اپنے ماموں برہان
الملک صوبہ دار اودھ (لکھنؤ) کے عہد صوبہ داری میں ترک
وطن کر کے ہندستان آ گئے تھے اور انھوں نے محمد شاہ کے
دربار میں رسوخ پیدا کر لیا تھا۔ برہان الملک نے اپنی بڑی
لڑکی صدر جہاں بیگم کا عقد اپنے بھانجے مرزا مقیم (نواب
صفدر جنگ) سے کیا۔ برہان الملک کے اولادِ نرینہ نہیں تھی
اس لئے ان کے انتقال کے بعد ان کے بھتیجے نثار جنگ (نثار
محمد) اور بھانجے مرزا مقیم (صفدر جنگ) نے عرضیاں محمد شاہ
کے دربار میں بھیجیں کہ برہان الملک کے وارث کی حیثیت
یعنی صوبہ داری اودھ کی خدمت پر ان کی مسند نشینی کی جائے
محمد شاہ نے نادر شاہ سے مشورہ کیا۔ نادر شاہ نے صفدر جنگ
کے حق میں فیصلہ کیا۔ چنانچہ صفدر جنگ صوبہ اودھ کی
صوبہ داری کے عہدے پر فائز ہوئے۔

بانیِ سلطنت اودھ نواب سعادت خاں برہان الملک
نے اپنی تمام تر توجہ سلطنت کے استحکام پر رکھی ان کے
جانشین صفدر جنگ بھی اسی کوشش میں لگے رہے۔ صفدر جنگ
کے بعد ان کے بیٹے شجاع الدولہ نے شعرا کی بڑی سرپرستی
کی۔ شجاع الدولہ کے بعد ان کے بیٹے نواب آصف الدولہ
تخت نشین ہوئے جو خود شاعر تھے اور آصف تخلص کرتے
تھے انھوں نے بھی شعرا کی بڑی سرپرستی کی۔ وہ اپنے دربار

---

[1] لطف مرزا علی۔ گلشنِ ہند (مرتبہ شبلی نعمانی۔ لاہور، ۱۹۰۶ء) ص ۱۴۶

مشاعرے منعقد کیا کرتے تھے جس میں ممتاز شعرا شریک ہوتے تھے۔

اس تمہید کے بعد میں اپنے موضوع پر آنا چاہتا ہوں لطف کی ابتدائی تعلیم و تربیت دہلی میں ہوئی۔ نادر شاہ کے حملوں کے بعد دہلی تباہ و برباد ہو گئی تو اکثر اہل کمال ترک وطن پر مجبور ہوئے۔ لطف نے اپنے تذکرہ گلشنِ ہند میں اپنے قیام دہلی اور ترک وطن کے بارے میں کچھ نہیں لکھا ہے۔ اس کے برعکس ان حالات پر کسی حد تک روشنی ڈالی ہے جن کی وجہ سے دہلی کے اکثر شعرا دہلی چھوڑنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اس زمانے میں دہلی کے حالات بہت خراب تھے ہر طرف بدامنی پھیلی ہوئی تھی۔ سلاطین مغلیہ بالکل کمزور ہو چکے تھے۔ شاہ عالم بادشاہ دہلی کی سلطنت کے بارے میں یہ ضرب المثل ہر خاص و عام کی زبان پر تھی "سلطنت شاہ عالم از دلی تا پالم"۔ جب بادشاہ کمزور ہو جاتا ہے تو امرا اور اعلا عہدے دار سازشوں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ یہی حال دہلی کے امرا اور اعلا عہدیداروں کا تھا۔ بادشاہ، امرا اور سلطنت کے اعلا عہدیداروں کی ان کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر انگریز اپنی قوت کو مستحکم کرنے کے لیے ریشہ دوانیوں میں مصروف تھے۔ ان ناگفتہ بہ حالات میں ہر خاص و عام پریشان تھا۔ ظاہر ہے کہ لطف بھی ان حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ غالباً انہی اسباب کی بنا پر لطف دہلی چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ اس زمانے میں لکھنؤ اور حیدرآباد دکن دو ہی ایسے مقامات تھے جو علم و فن دولت و ثروت اور اقتدار کے مرکز تھے۔ دہلی سے جو تباہ حال نکلتا وہ یا تو لکھنؤ پہنچ جاتا یا حیدرآباد کا رخ کرتا۔ لطف کے ترک وطن کی ایک وجہ یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ کم عمری میں ان کے والد کاظم بیگ خاں ہجری کا انتقال ہو گیا اور وہ بے سہارا ہو گئے۔

نواب آصف الدولہ نے قدیم خاندانی مراسم کی بنا پر لطف کو اپنے پاس بلا لیا اور اپنے زمرۂ ملازمین میں داخل کر کے گذر بسر کے لیے کچھ مشاہرہ مقرر کر دیا۔ اس قیاس کو لطف کے بیان سے تقویت پہونچتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"راقم آثم صغر سنی سے ملازموں میں اس آستانۂ دولت کے مع رسالہ سرفراز تھا اور افراطِ عنایت اور الطاف سے اس کے ہم چشموں میں اپنے مورد امتیاز تھا"۔[1]

لطف جب لکھنؤ پہنچے ہیں تو ان کی صغر سنی کا زمانہ تھا۔ لیکن ان کی تاریخ پیدائش کا ہمیں علم نہیں ہے۔ اس لیے یہ بات قطعی طور سے نہیں کہی جا سکتی کہ وہ کس سنہ میں دہلی سے لکھنؤ روانہ ہوئے۔ ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے قیاس آرائی سے کام لیتے ہوئے ایک تخمینہ سنہ ۱۱۸۷ھ (م ۱۷۷۳ء) متعین کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتی ہیں:

"لطف کا قیام دہلی میں واقعتاً کس سن تک رہا۔ اس کا حوالہ ہم کو کسی تذکرہ سے نہیں ملتا۔ اس سلسلے میں بھی واقعاتی شہادتوں سے مدد لے کر ان کے دہلی سے روانہ ہونے کے ایک تخمینی سنہ کا پتہ چلانا پڑتا ہے۔ یہ بات یقینی ہے کہ وہ سنہ ۱۱۸۷ھ (م ۱۷۷۳ء) تک دہلی میں مقیم رہے اور اس کے بعد وہ لکھنؤ گئے۔ ہمارے اس قیاس کی بنیاد خود لطف کے بعض بیانات ہیں۔ گلشن ہند میں انھوں نے اپنے زمانے کے بعض مشاہیر شعرا کے حالات جو دہلی سے لکھنؤ آئے ہیں لکھے ہیں۔ چنانچہ میر قمر الدین خاں منت کے حالات میں لکھتے ہیں کہ ۱۱۹۱ھ (م ۱۷۷۷ء) میں وہ دہلی سے لکھنؤ آئے۔ ظاہر ہے کہ اس سے پہلے لطف لکھنؤ آ چکے تھے۔ لیکن آخر وہ کس سنہ میں لکھنؤ آئے۔ اس کے مزید تعین میں ہم کو لطف کے اس بیان سے مدد ملتی ہے جس میں انھوں نے آصف الدولہ سے اپنے

---

[1] تذکرہ گلشن ہند (مرتبہ شبلی نعمانی لاہور ۱۹۰۶ء) ص ۱۴۔

توسل کا ذکر کیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان کے (لطف کے) دہلی سے نکلنے کے اسباب میں سے ایک سبب دہلی کی تباہی تھی۔ لیکن اس کا سب سے اہم سبب نواب آصف الدولہ سے ان کے خاندانی مراسم تھے۔ ان واقعات کے مدنظر ہم ان کے لکھنؤ جانے کا ایک تخمینی سنہ ۱۱۸۷ھ (م ۱۷۷۳ء) متعین کر سکتے ہیں۔" [1]

اس بیان سے یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ لطف کے لکھنؤ جانے کا تخمینی سنہ ۱۱۸۷ھ / ۱۷۷۳ء کیوں قرار دیا جائے۔ پیش کردہ شواہد سے صرف اتنی بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ وہ ۱۱۹۱ھ / ۱۷۷۷ء سے قبل لکھنؤ آ چکے تھے۔ کیوں کہ جب قمرالدین خاں منت لکھنؤ پہنچے تو لطف وہاں پہلے ہی سے موجود تھے۔

میر کے بیان میں لطف اپنے ۱۱۹۷ھ / ۱۷۸۳ء میں لکھنؤ میں قیام کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ چنانچہ لطف لکھتے ہیں:

"جب مرزا محمد رفیع سودا لکھنؤ میں اس دارِ فانی سے عالمِ فانی کو سدھارے تو میر مذکور شاہ جہاں آباد میں تھے۔ ۱۱۹۷ھ (م ۱۷۸۳ء) میں رایاتِ عزم اس صاحب لشکر مضامین تازہ کے حرکت میں آئے اور خود بدولت لکھنؤ میں تشریف لائے۔"

لطف نے لکھنؤ کا ادبی ماحول اور صحبتیں بھی دیکھی ہیں۔ دہلی کی تباہی کے بعد وہاں سے جن سربرآوردہ شعرا نے لکھنؤ کا رخ کیا ان میں سودا، میر، سوز، مصحفی، منت اور افسوس وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ یہ تمام شعرا لطف کے زمانے میں ان کے ہم عصر رہے ہیں۔ لطف کے خیال میں قصیدہ سودا پر ختم ہوا ہے۔ میر کو وہ غزل میں صدر نشین بارگاہِ سخندانی قرار دیتے ہیں۔ اکثر و بیشتر شعرا سے لطف کے گہرے مراسم بھی تھے۔ اردو شاعری کی بزم جو دہلی میں قائم تھی وہ لکھنؤ میں بھی قائم ہو گئی۔ ایک علاحدہ دبستانِ شاعری کا قیام عمل میں آیا جو دبستانِ لکھنؤ کے نام سے مشہور ہوا۔ سودا، میر، سوز، مصحفی، منت اور افسوس کی شاعری کی ابتدا تو دہلی سے ہوئی مگر ان سب کی شاعری کا عروج لکھنؤ میں ہوا۔ دہلی کے شعرا کے یہاں تصوف کے مسائل نظم ہوتے تھے۔ ان کا عشق حقیقی ہوتا تھا۔ لکھنؤ والوں نے عشقِ حقیقی کے بجائے عشقِ مجازی کو ترجیح دی۔ فارغ البالی ہونے کی وجہ سے لکھنؤ کے شعرا کے یہاں تعیش پسندی کا رنگ بھی نظر آنے لگا۔ میر اور سودا نے گو کہ دبستانِ دہلی کی مکمل نمائندگی کی مگر جو دوسرے شعرا دہلی سے لکھنؤ منتقل ہوئے تھے رفتہ رفتہ ان کی شاعری میں لکھنؤ کا رنگ غالب آنے لگا۔ لطف بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکے۔

مرزا علی لطف صغر سنی ہی سے نواب آصف الدولہ کی سرکار میں ملازم تھے۔ آصف الدولہ کے دربار میں لطف اپنا مقام رکھتے تھے۔ آصف الدولہ نے لطف کی بڑی سرپرستی کی۔ ان کی اس قدردانی کی بنا پر لطف کو "افراطِ عنایت" اور "الطاف" نصیب ہوا۔ عجیب اتفاق ہے کہ لطف کی سرپرستی آصف الدولہ نے کی۔ جب کہ لطف کے والد مرزا کاظم بیگ خاں ہجری کی سرپرستی نواب آصف الدولہ کے دادا نواب صفدر جنگ نے کی تھی۔ ان دیرینہ تعلقات کی بنا ہی پر لطف نے آصف الدولہ کے دورِ وزارت میں لکھنؤ میں قیام کیا۔

لکھنؤ میں لطف کے ۱۱۹۸ھ / ۱۷۸۴ء میں قیام کا ثبوت مرزا جواں بخت جہاندار شاہ ولی عہد شاہ عالم سے متعلق ان کے بیان میں ملتا ہے۔ اس سے قبل لکھا جا چکا ہے کہ شاہِ دہلی کمزور ہو چکا تھا اور امرا و اعلا عہدے دار سازشوں میں مصروف تھے۔ ولی عہد سلطنت جہاندار شاہ

[1] "حیاتِ لطف" (حیدرآباد دکن ۱۹۶۲ء) ص ۸

لاتؔ کی ناموافقت کی بنا پر نقل مقام کو ترجیح دی۔ لکھنؤ
ں سے قریب ہونے کے ساتھ ساتھ سلطنتِ دہلی کے
ود میں شامل تھا اور صوبۂ اودھ کا مستقر تھا۔ حاکم اودھ
زیرِ سلطنت" کہلاتا تھا۔ جہاندار شاہ کے نواب آصف الدولہ
ے دیرینہ تعلقات بھی تھے اس بنا پر وہ ۱۱۹۸ھ/۱۷۸۴ء
ں لکھنؤ پہنچے۔ نواب آصف الدولہ نے جہاندار شاہ کا
ں عہد سلطنت کی حیثیت سے بہت پرجوش استقبال
ا۔ حسب مراتب۔ آداب سے پیش آئے۔ گھنٹوں ہاتھ باندھے
جہاندار شاہ کے سامنے کھڑے رہتے تھے۔ یہ شرافت
ں مزاج تھی۔ جہاندار شاہ خود شاعر تھے۔ جہاندار تخلص
تے تھے۔ شعر و شاعری سے ان کو فطری لگاؤ تھا۔ لکھنؤ
نے کے بعد انھوں نے اپنے یہاں مشاعرے کی بنا ڈالی جو
ینے میں دو بار منعقد ہوتا تھا اور جس میں لکھنؤ کے سربرآوردہ
را شرکت کیا کرتے تھے۔ جہاندار شاہ ہر شاعر کے
ر پر اپنے چوبدار کو بھیج کر مشاعرے میں شرکت کی دعوت
ا کرتے تھے۔ چنانچہ لطفؔ کے گھر پر بھی چوبدار بھیج کر
نوں نے مشاعرے میں شرکت کی دعوت دی۔ جہاندار
اہ لطفؔ سے یا تو ان کے قیام دہلی کے زمانے سے
تف تھے یا انھوں نے لکھنؤ آنے کے بعد ان کی شہرت
ستی اور ان سے ملاقات کے خواہش مند ہوئے۔ اس
انے میں مشاعروں کی حالت بہت ابتر تھی، نوبت یہاں
ب پہنچی تھی کہ ایک شاعر دوسرے شاعر پر کیچڑ اچھالتا
تھا اور مناظرہ بازی کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ لطفؔ
سنجیدہ مزاج اور ستھرے ذوق کے مالک تھے اس لئے
ان باتوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے
اعرے میں شرکت سے معذوری ظاہر کرتے ہوئے معذرت
ا کہ وہ کسی اور دن خدمت میں حاضر ہو جائیں گے۔ جہاندار

شاہ نے لطفؔ کی معذرت کو قبول نہیں کیا، دوبارہ چوبدار کو بھیج کر کہلوایا کہ ان کا مشاعرے میں آنا ضروری ہے۔ مناظرہ بازی کا دستور ہمارے مشاعروں میں نہیں ہے۔ اس اصرار کے باوجود لطفؔ جہاندار شاہ کے مشاعرے میں جانے کا ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ لیکن نواب آصف الدولہ نے لطفؔ کو مجبور کیا کہ وہ مشاعرے میں ضرور شرکت کریں۔ لطفؔ لکھتے ہیں :

"غرض ایمار سے نواب آصف الدولہ مرحوم کے حاضر ہوا اور شرف سعادت ملازمت کا حاصل کیا۔ مگر غزلیں اس دن تفصیلات کے پڑھوائیں اور ہر شعر پر کیا کہوں کہ کیا کیا عنایتیں فرمائیں پھر اپنی طبع زاد سے بہت کچھ ارشاد فرمایا اور سامعین کو موردِ عنایت و امداد فرمایا۔"[1]

اس بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نواب آصف الدولہ کی ایما سے وہ جہاندار شاہ جہاندار کے دائرۂ ملازمت میں داخل ہوئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ میں لطفؔ کا قیام آصف الدولہ کی زندگی تک ہی رہا۔ اپنے مربیؔ و محسن کے انتقال کے بعد لطفؔ کا دل لکھنؤ سے اچاٹ ہو گیا۔ آصف الدولہ نے ۱۲۱۲ھ/۱۷۹۸ء میں انتقال کیا۔ ان کی وفات پر لطفؔ نے ایک پُر اثر قطعہ بھی کہا جو ان کے دلی جذبات کی صحیح عکاسی کرتا ہے۔ قطعہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے :

آصف الدولہ جب جہاں سے گزر گیا
ایک جہاں بے دل و دماغ ہوا
جام عمر اس کا بھرتے ہی لبریز
خلق کا عیش کا ایاغ ہوا
دشمنوں کا دل آتش غم سے
دوستوں سے زیادہ داغ ہوا

۱؎ گلشن ہند (مرتبہ شبلی نعمانی۔ لاہور ۱۹۰۶ء) ص ۲۔ ۲؎ گلشن ہند۔ ص ۲۔

سال تاریخ کا خیال کیے
خشک شعر و سخن کا باغ ہوا
بولے یوں دور کر کے پاے عناد
آج گلِ ہند کا چمن داغ ہوا[1]

۱۲۱۲

لطفؔ کے معاصر شاہ کمال کے تذکرہ مجمع الانتخاب سے پتہ چلتا ہے کہ شاہ کمال سنہ ۱۱۹۰ھ/۱۷۷۶ء تا ۱۲۱۴ھ/۱۸۰۰ء لکھنؤ میں مقیم رہے۔ لطفؔ سے ملاقات کا ذکر انھوں نے اپنے تذکرہ میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"این فقیر از لکھنؤ واقف چنانچہ یکبار بدولت خانہ مرزا صاحب معزالیہ (لطفؔ) بتقریب دیدن کبوتران میلہ بود کہ در قد و قامت تمام شہر اشتہار داشتند ہمراہ مرزا مغل شاگرد میاں جرأت صاحب نیز رفتہ ملاقات ساختہ بود۔ بعد ملاحظہ کبوتران یکدو گھڑی صحبت شعر و سخن ہم ماندہ بود[2]۔"

اس بیان سے ظاہر ہے کہ شاہ کمال جب سنہ ۱۸۰۰ء میں لکھنؤ سے حیدر آباد آئے تو لطفؔ لکھنؤ میں موجود تھے۔ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ لکھنؤ میں لطفؔ کو آرام اور اطمینان کی زندگی میسر ہوئی۔ مرفع الحالی کی وجہ سے اعلیٰ قسم کے کبوتر اُن کے پاس تھے جس کی شہرت سارے شہر میں تھی۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ لطفؔ کے پاس کمیاب نادر کبوتر تھے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا شوق ایک صاحبِ ثروت رئیس یا صاحبِ استطاعت شخص ہی کر سکتا تھا۔

نواب آصف الدولہ کے انتقال کے بعد غالباً لطفؔ کی ملازمت کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا جس کی وجہ سے وہ لکھنؤ چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ پروفیسر حامد حسن قادری نے لکھا ہے کہ:
"لطفؔ کو اساتذۂ سخن کے مقابلے میں اپنے ب
کی صورت لکھنؤ میں نظر نہ آئی[3]"

ہو سکتا ہے کہ لکھنؤ کا قیام ترک کرنے کی ایک و
یہ بھی رہی ہو کہ جہاندار شاہ کے تذکرے میں ہم دیکھتے
ہیں کہ لطفؔ نے مشاعروں سے کنارہ کشی اختیار کر
لی تھی۔ اپنے ایک شعر میں بھی انھوں نے اس جانب اشا
کیا ہے۔ ؎

شورِ زغن و زاغ یہی ہے جو چمن میں
تو نغمہ سرایانِ چمن یاں سے چلے ہم[4]

بہرحال یہ بات قطعی طور پر نہیں کہی جا سکتی کہ لطف
نے کتنے عرصہ تک لکھنؤ میں قیام کیا۔

●

---

[1] گلشنِ ہند (مرتبہ شبلی نعمانی۔ لاہور۔ ۱۹۰۶ء) ص ۱۵۔ [2] مجمع الانتخاب (قلمی مخزونہ سالار جنگ لائبریری) ص ۸۰۔
[3] داستانِ تاریخ اردو (آگرہ ۱۹۴۱ء) ص ۱۰۴ [4] دیوانِ لطفؔ (قلمی مخزونہ کتب خانہ جامعہ عثمانیہ) ص ۱۹

غزل

ڈاکٹر سلطان عباسی
۵۰، ڈاکٹر موتی لعل بوس روڈ۔ لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱

دل گرفتارِ جفائے صنم چند رہا
پھر بھی ہر چند خیالِ کرم چند رہا

دوریاں بڑھتی گئیں منزلِ مقصد نہ ملی
فاصلہ چند قدم تھا قدمِ چند رہا

ڈبڈبا اٹھیں تری یاد میں میری آنکھیں
شیشے میں ترا عکس دمِ چند رہا

زندگی اس کی ہے گنبد کی صداؤں کی طرح
ملے جو شخص اسیرِ درم چند رہا

طرزِ غالب کا تغزل میں نہیں کوئی جواب
کوئی بیکار اسیرِ قلم چند رہا

شفق شاہانی چشتی
۱۰۵ فلک منزل۔ نزد سنہری مسجد۔
نادان محل ۔ لکھنؤ

غزل

لہن کی طرح ہر اک شاخِ گل سنوار چلے
چلے چمن میں تو یوں بادِ نو بہار چلے

زہ تو جب ہے کہ جب بادِ نو بہار چلے
کھلائے پھول تو کانٹوں کو بھی سنوار چلے

جسے ہو ہم سے خلوص آئے سوئے دار چلے
ہم اک سرے سے جنوں دوستو پکار چلے

للہ ہے کیسی، سفر ختم ہی نہیں ہوتا
سحر ہوئی، کہ گدایانِ کوئے یار چلے

ب آئیں وہ تو ہمارا سلام کہہ دینا
لمیں گے حشر میں اے شامِ انتظار چلے

اب آئے بھی وہ ہمیں دیکھنے تو کیا آئے
گذارنا تھے جو لمحے وہ ہم گزار چلے

تجلیوں نے پکارا ہی تھا سرِ منزل
نیازمند لیے دل میں یادِ یار چلے

یہی ہے مست نگاہی کا احترام شفق
کہ دورِ جام چلے اور بار بار چلے

حیات وارثی
باغ انوار ۔ لکھنؤ ۳

مولانا محمد علی جوہر کے حضور

وطن کے پاسباں، وطن کے میرِ کارواں سلام
تو اپنے قول کو عمل سے جاوداں بنا گیا
دیارِ غیر میں بھی آفتاب بن کے چھا گیا
بھٹکنے والے قافلے کو روشنی دکھا گیا
وطن کے پاسباں، وطن کے میرِ کارواں سلام!

وطن سے نکلیں غیر یہ سوال عمر بھر رہا
ہو سربلند قوم یہ خیال عمر بھر رہا
غلام ہے وطن یہی ملال عمر بھر رہا
وطن کے پاسباں، وطن کے میرِ کارواں سلام!

ترے یقیں کا نور دل میں عزم بن کے ڈھل گیا
تری نوائے حق سے رنگِ میکدہ بدل گیا
بجھا ہوا تھا جو چراغ وہ چراغ جل گیا
وطن کے پاسباں، وطن کے میرِ کارواں سلام!

ترا وجود اتحاد کا حسین آئینہ
ترے عمل سے حل ہوا ہے زندگی کا مسئلہ
بڑھا دیا یقیں سے تو نے روشنی کا دائرہ
وطن کے پاسباں وطن کے میرِ کارواں سلام

کمالِ علم و فن کا تیرے "کامریڈ" نام تھا
"خلافت" عظمتِ بشر کا اک حسیں پیام تھا
خدا کا دوست اور مصطفےٰ کا تو غلام تھا
وطن کے پاسباں وطن کے میرِ کارواں سلام

ترا نشانِ پا ابھر کے سنگِ میل بن گیا
مہک رہی ہے اب بھی ان کے لمس سے رہِ وفا
ہیں رہنما کے منزلِ خلوص تیرے نقشِ پا
وطن کے پاسباں وطن کے میرِ کارواں سلام!

اشتیاق علوی۔ کاکوری کوٹھی۔ ۱۳۱
خیالی گنج کراسنگ لکھنؤ

میہر کا آدم خور تیندوا

ایک دلچسپ شکار کی کہانی

جبل پور کے قریب ریاست میہر کے راجکمار گووند سنگھ کی شکاری موٹر کار میں ہم چار شکاری چونے کے پہاڑوں سے گزر کر ایک پہاڑی کے دامن میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ یہاں آٹھ دس جھونپڑوں کی چھوٹی سی آبادی بھی ہے۔ ایک بوڑھا مگر توانا تندرست دیہاتی ہمارے پاس آیا اور رو رو کر بیان کیا کہ پچھلے دو تین مہینوں سے آدم خور تیندؤں نے ادھم مچا رکھا ہے، آدمی اور جانور مارے جا رہے ہیں۔ اس طرف ہفتہ بھر سے تیندوے اتنے ڈھیٹ ہو گئے ہیں کہ گاؤں کی گلیوں میں بے دھڑک چکر کاٹتے رہتے ہیں اور بیچ آبادی میں زور زور سے گرجتے ہیں جس سے یہاں کے آدمی اور مویشی اتنا سہمے ہوتے ہیں کہ بھوکے پیاسے گھروں میں بند ہیں۔ اگر مجبوراً گھر سے باہر نکلنا ہی پڑتا ہے تو ایک ساتھ کئی آدمی باہر نکلتے ہیں۔ ہم اپنے بچوں کو دور دوسرے گاؤں میں پہنچا آئے ہیں۔ بہت سہمے ہوئے انداز میں اس نے توہمات سے بھری تفصیلات بتائیں کہ یہ آدم خور تیندوا دراصل ایک انگریز سادھو ہے جو جب چاہتا ہے تیندوے کے بھیس میں آکر آدم خوری کرتا ہے۔ قرب و جوار کے گاؤں سے وہ سادھو انسانی شکل میں اناج اور نقدی وصول کرتا رہتا ہے اور جو اس کو نہ دے اس کو وہ دھمکاتا ہے اور جس کو وہ دھمکا دے اس کو کسی نہ کسی دن کوئی جانی نقصان ضرور ہو جاتا ہے۔ اس سادھو کا آشرم میل بھر دور سامنے پہاڑی پر ہے۔ اس دیہاتی کو ساتھ لے کر

ہم لوگ سادھو کے آشرم پر پہنچے۔ وہاں ایک سادھو نما گورے رنگ کا جٹا دھاری ننگے بدن دکھائی دیا جس کی عمر مشکل سے پچاس پچپن سال ہوگی۔ بہت خوبصورت بدن، چمکیلی تمتماتی آنکھیں، ایسا پھرتیلا انداز کہ اس کی بوٹی بوٹی پھڑک رہی تھی۔ فرّاٹے کے ساتھ انگریزی میں کہنے لگا کہ تم لوگ کیوں آئے ہو، کیا تم کو موت کھینچ لائی ہے۔ اگر شکاری ہو تو خبردار تیندوا نہ مارنا ورنہ تیندوا تم کو کھا جائے گا۔ راجکمار نے سادھو کو سمجھانا چاہا اور کہا کہ وہ وہم میں مبتلا کر کے بھولے بھالے دیہاتیوں کو ٹھگنا نہ... مگر سادھو برابر بحث کرتا رہا اور پھر اپنے آشرم میں گھس گیا۔

ہم لوگ واپس اپنے مقام پر پہنچے تو شام کے پانچ بجے تھے۔ ہم لوگوں نے رائفلیں لے کر اس آبادی کا معائنہ کیا۔ ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب گاؤں کی گلی کوچے میں تیندوؤں کے پیروں کے نشان پائے گئے جو یقیناً صبح اور رات کے تھے۔ اسی طرف سے ملحق پہاڑیوں اور گھاٹیوں کا معائنہ کر کے دس بجے رات میں ہم اپنے کیمپ پر واپس آئے۔ گاؤں کے باہر ایک گھنے درخت کے نیچے لکڑیوں کا الاؤ لگا کر تاپنے بیٹھ گئے۔ قریب میں ہماری موٹر کار کھڑی تھی جس میں کھانے پینے کا سامان بھی رکھا تھا۔ چھ سات آدمیوں کے کھانے کی میز لگی تھی اور دو پلنگوں کا بھی تھا۔ یہ اندازہ تو ہم کو ہو ہی چکا تھا کہ یہ سادھو شکار کے د... طرح طرح کی ڈرانے والی حرکتیں کر کے ہمارا شکار خراب کر دے

اس لیے رات کے اندھیروں میں اصلی تیندوے اور کھال اوڑھے تیندوے کے فرق کو گولی چلانے سے پہلے پرکھ لینا ہوگا۔ چونکہ رات بھر ہم کو جاگنا تھا اس لیے کھانا کھا کر دو ساتھی موٹر میں سونے چلے گئے میں اور راجکمار جاڑے پالے میں رائفلیں لیے الاؤ کے پاس چھوٹی چھوٹی کرسیوں پر بیٹھے بہت دھیمی آواز میں شکار کے طریقوں پر باتیں کر رہے تھے، اتنے میں گاؤں کے پورب سے تیندوے کے گرجنے کی آواز کوئی دو سو گز سے سنائی دی۔ ہم نے اپنے اپنے رائفلوں کو تول لیا اور زیادہ مستعد ہو کر آبادی کی گلیوں کا چکر لگایا اور آبادی کے اندر آنے والے خاص راستے کو جھاڑو سے اس لیے صاف کر دیا تاکہ جب کوئی جانور اس پر سے گزرے پیروں کے نشان بن جائیں۔ ہم ابھی واپس آ کر کرسیوں پر بیٹھے ہی تھے کہ تین سو گز پچھم سے تیندوے کے گرجنے کی آواز آئی۔ پھر شمال کی طرف سے آواز آئی۔ اب ہم کو یقین ہو گیا کہ تیندوے آبادی کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے رہے ہیں۔ ہمارے اعصاب اس وقت تناؤ شروع ہو گیا جب سادھو کی پہاڑی کی طرف سے تیندوے کی بھاری آواز آئی۔ ہم نے دونوں کرسیوں کا رخ آبادی کی طرف کر لیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تیندوے کی امکانی آمد کے راستوں کا نقشہ ذہن میں بنا لیا۔ اندھیرے میں گھورتے گھورتے آنکھیں تھک گئیں۔ کان، آنکھیں اور احساس کی ہر قوت ایک ہی طرف مرکوز تھی۔ ہم اسی الجھن میں تھے کہ ایسی صورت میں کیا کریں، کن کن ناکوں اور راستوں کا پہرہ سنبھالیں۔ اس سوچ بچار میں کافی وقت گزر گیا اور ہم کو یقین ہو گیا کہ تیندوے آبادی کے ارد گرد ہی ہوں گے۔ کتنی بدنامی ہوگی اگر آج رات بھی تیندوے نے کوئی واردات کر دی۔ ہم نے اپنے دونوں ساتھیوں کو جگا کر گاؤں کے باہر باہر لے جا کر دو الگ الگ راستوں پر چھپا کر بٹھا دیا اور میں راجکمار کے ساتھ گاؤں کی گلیوں کا چکر کاٹ رہا تھا کہ حیرت کی انتہا نہ رہی جب ہم نے دیکھا کہ پورب والے گلیارے کی طرف جھاڑی بہاری مٹی پر تیندوے کی تازی لائی صاف بنی تھی۔ ہمارے ہوش و حواس گم ہو گئے۔ اور عجیب قسم کا خوف محسوس ہونے لگا۔ چاروں طرف دیکھ کر ہم لوگ اس لاتی پر چلے اور اس وقت ہمارے رونگٹے کھڑے ہو گئے جب وہی لاتی ہمارے الاؤ اور ہماری کرسیوں کے بیس قدم تک آ کر موٹر کے پیچھے سے گزر گئی۔ گویا تیندوے نے ہمارا معائنہ کیا اور ہم کو چاپ تک نہیں ملی یا ہماری غیر موجودگی میں کرسیوں کے پاس سے معائنہ کرتا گزر گیا۔ لاتی سے اندازہ ہوتا تھا کہ پوری عمر کا بھاری بھرکم تیندوا تھا۔ ان دو ساتھیوں کے پاس جا کر پورا حال بیان کیا اور طے پایا کہ آدھی سے زیادہ رات تو گزر ہی چکی ہے کیوں نہ سادھو کے آشرم پر چل کر آہٹ لی جائے۔ ان دو شکاریوں کو پڑاؤ پر چھوڑ کر میں راجکمار کے ساتھ ہو لیا اور ہم آشرم کے پاس پہنچ گئے۔ آشرم پھوس کا بند چھپر تھا جس کا نکاس کانٹے دار ٹٹر سے بند تھا۔ گھپ اندھیرے میں ہم نے ٹٹر سے کان لگا کر آہٹ لی مگر کوئی آواز نہ ملی۔ سوراخ بنا کر ٹارچ سے دیکھا، آشرم خالی تھا۔ وہم کا بھید کچھ تو سلجھ گیا مگر دوسری الجھن کا احساس شروع ہوا کہ آدم خور تیندوے کے حلقے میں سادھو اتنا بے خوف اور بے باک کیوں ہے۔ ایک تو سادھو کی بے باکی سے بے چینی دوسرے آدم خور تیندوے کے ڈر نے ہمارے اعصاب کو ہلا دیا۔ خفیف سی آہٹ پر رائفل کی گرفت سخت ہو جاتی۔ دانت بجنے لگتے۔ ظاہر ہے آدم خور تیندوے کی عملداری میں زمین پر جھاڑیوں میں بیٹھنا ایک خطرناک کھیل تھا مگر سادھو کے پھیلائے وہم کو سمجھنے کے لیے میں اور راج کمار آشرم سے تھوڑا ہٹ کر ایک ایک پر میں بیٹھا اور دوسری پر راجکمار۔ یہ دونوں جھاڑیاں تھیں۔ جن میں ہم دونوں چھپ گئے۔ اب آئندہ پیش آنے والے واقعات کا انتظار شروع ہوا۔ ایک ایک منٹ پہاڑ تھا۔ ہر آہٹ پر اپنی ہی موت سے مقابلہ تھا۔ ایسی صورت میں کبھی اپنے ہی حواس پر سے اعتماد اٹھ جاتا تو کبھی اپنی ہی آنکھیں پتھرائی ہوئی محسوس ہوتیں۔ بار بار پلک جھپکا جھپکا کر تعین کرنا پڑتا کہ اپنی آنکھوں میں روشنی ہے۔ سردی کی شدت میں نتھنوں سے ناک جب بہہ کر ٹپک نکلتی تب

احساس ہو پاتا۔ انگلی سے رائفل کی لبلبی ٹٹولتے تو پتہ ہی نہ چلتا کہ وہ کہاں کھو گئی اور جب اس انگلی کو منہ میں رکھ کر کچھ گرم کر کے لبلبی پر جما لیتے تو یقین ہوتا کہ رائفل ہاتھوں میں ہے پھر بھی شک رہتا کہ بہ وقت ضرورت ہماری انگلی ضروری دباؤ لبلبی کو دے سکے گی۔ اسی کشمکش میں تھا کہ میرے سامنے آشرم جانے والی پگڈنڈی کی طرف چاپ سنائی دی۔ گھپ اندھیرے میں نشیب سے اچانک ابھرتے ہوئے انسان کا خاکہ نظر پڑا وہی سادھو مجھ سے دس قدم قریب سے گزرتا ہوا اپنے آشرم میں چلا گیا۔ اس کے ساتھ کوئی تیندوہ نہیں تھا مگر اس کی بغل میں ایک موٹا سا بنڈل بندھا ہوا دبا تھا آشرم پہنچ کر سادھو نے کوئی چراغ نہیں جلایا۔ آئندہ آدھے گھنٹے تک ہم کان لگائے رہے مگر کوئی آہٹ نہیں ملی۔ ہم لوگ آہستہ آہستہ جھاڑیوں سے نکل کر اپنے کیمپ پر چلے آئے اور کار کے اندر صبح کے جھٹپٹے میں سو گئے۔ دن چڑھے اٹھ کر یہی باتیں ہوتی رہیں کیا سادھو تیندوے کی بولی بولتا ہے۔ کیا کوئی تیندوا اس کا پالتو ہے جس کو اس نے آدم خوری سکھا رکھی ہے کہ جس کو وہ اشارہ کر دیتا ہے تیندوا اسے گویا اس کے مویشی کو مار دیتا ہے۔ ہم سب ساتھی سمجھ تو گئے ہی تھے کہ سادھو نے وہم کا جال پھیلا رکھا ہے مگر اپنی اپنی جگہ ہم میں سے ہر ایک دل ہی دل میں کچھ نہ کچھ ڈرتا ضرور تھا کیونکہ ہمارے ملک میں توہمات کے جال کو روحانیت کی طاقت سے جوڑ کر پیش کیا جاتا ہے۔ طے پایا کہ دو بکریاں باندھ کر بیٹھا جائے مگر وہاں کے دیہاتیوں نے صاف انکار کر دیا کہ وہ کسی کی امداد اس لیے نہیں کریں گے کہ سادھو کے خلاف کچھ کرنے میں ان کو اپنی موت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس لیے دور کے ایک گاؤں سے دو بکریاں منگا کر دوپہر کے تین بجے گاؤں کے دو اہم ناکوں پر باندھ دیں اور قریب کی جھاڑیوں میں دو شکاری چھپ کر بیٹھ گئے۔ شام ہو گئی۔ اندھیرا چھا گیا۔ چاروں طرف سے تیندوؤں کے بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ ہم سب چوکس اور تیار۔ رائفلیں سنبھالے۔ گھوڑے چڑھائے رات بھر جاگتے رہے مگر کوئی تیندوہ گاؤں میں نہیں آیا۔ یہ تحقیق خاصی اہم تھی۔ چونکہ آدم خور تیندوے کی کوئی پہچان ہم کو بتائی نہیں گئی تھی اور تیندوؤں کی تعداد بہت تھی اس لیے ہماری دشواریاں اور بھی بڑھ گئیں۔ دوران گفتگو دیہاتیوں نے بتایا کہ اس وقت تک تیندوے بیس آدمی اور لاتعداد مویشی ہلاک کر چکے ہیں۔ ہماری دلچسپی آدم خوروں کو مارنے کے لیے اور بڑھ گئی۔ اب تیسری دوپہر کو اور ہم میں سے دو شکاری آبادی کے ناکوں پر ایک ایک بکری باندھ کر بیٹھ گئے۔ میں اور راج کمار ایک بکری لے جا کر سادھو کے آشرم سے پانچ سو گز دور باندھ کر بہت چھپ کر جھاڑیوں میں بیٹھ گئے۔ آدمی اور تیندوے دونوں کی نظروں سے ہمیں چھپنا تھا۔ ڈر۔ خوف۔ ہیجان اور بے چینی کے ماحول میں اپنے حواس کو قابو میں رکھنا ایک ایسا کھیل تھا جو ہم دونوں کو کھیلنا تھا۔ تیندوے سے مقابلے کا تصور تو انوکھا نہیں تھا مگر سادھو سے اگر سامنا ہوا تو وہ کس نوعیت کا ہوگا یہ مسئلہ کافی بے چینی کا مرکز رہا۔ اسی حالت میں وقت اتنا گزر گیا کہ سورج غروب ہو گیا اور اندھیرے کا راج بڑھتا گیا۔ ٹھنڈک نے ہم کو جما دیا۔ گھاس اور پتوں پر اتنی نمی آ چکی تھی کہ چرمراہٹ کی آواز تک نہیں آتی تھی۔ اسی لیے ہمارے کانوں پر آہٹ محسوس کرنے کا بوجھ بڑھ گیا پھر بھی اس وقت تک کوئی خاص چاپ نہیں ملی۔ رات کے گیارہ بجے ایک جگر خراش انسانی چیخ کی آواز مجھ سے سو گز نشیب سے آتی سنائی دی کہ میں کانپ گیا مگر برداشت نہیں ہوا کہ بیٹھا رہوں۔ راج کمار کو اشارہ کر کے ہم دونوں اپنی اپنی جگہ سے بہت احتیاط سے نکلے۔ بڑی ہوشیاری سے اس جگہ پر پہنچ کر رائفل سیدھی کر کے ٹارچ ڈالی لیکن میری سانس حلق میں اٹک کر رہ گئی اور مارے ہیبت کے قدم رک گئے۔ دیکھا کہ ایک تیندوا انگریز سادھو کی گردن دبوچے اس کو زمین پر چھاپے پڑا ہے اور دوسرا تیندوا قریب کھڑا ہے۔ آدم خور پر پہلا فائر نہیں کیا کیونکہ اس کے نیچے سادھو دبا تھا۔ الگ کھڑے تیندوے پر فائر کر دیا۔ ۲۲۳ بور کی بھاری

(باقی صفحہ ۲۶ پر)

مضطرب نظامی
جوہری محلہ۔ لکھنؤ ۳

لنڈ

ورقِ زیست ہے، یا فرصتِ دوراں کی دھنک
ہے بدلتی ہوئی تاریخ میں لمحوں کی کسک

ارتقا تیری امانت ہے، محرک جادہ
اس لیے ذہن بھی تقلید پہ ہے آمادہ

ہے کبھی سیلِ سبک رو، تو کبھی سیلِ گراں
ڈھل چکی ہیں ترے لمحات میں کتنی صدیاں

موسمِ سرد بھی ہے، آتشِ سوزاں بھی ہے
ایک وقفہ ہے مگر حسنِ مہ و سال بھی ہے

حسنِ انفاس کی زد ہے کہ سنہری زنجیر
شرحِ تدبیر سے روشن ہوئی قسمت کی لکیر

ہر نئے خواب کی ترشی ہوئی تعبیر ہے تو
رنگ اڑ جاتے ہیں جس سے وہی تصویر ہے تو

وقت کے ساتھ بدلتی ہوئی قدروں کا نقیب
کبھی آئینۂ پورس میں سکندر کا نصیب

عہدِ پیغام بھی تحقیق کا گہوارہ ہے
کیفِ ابہام بھی تخلیق کا فوارہ ہے

شامِ ادراک کو آہنگِ سحر بخشا ہے
حلقۂ فکر کو بھی اذنِ سفر بخشا ہے

دورِ عشرت کو اگر غم کا کھلونا بخشا
دستِ غربت کو چمکتا ہوا سونا بخشا

مرتعش ہو تو عداوت کے دریچے کھل جائیں
ملتفت ہو تو گناہوں کی قبائیں دھل جائیں

ایک نقطہ ہے مگر نقطہ میں پھیلاؤ بھی ہے
موجِ طوفاں ہے مگر موج میں ٹھہراؤ بھی ہے

شیشۂ ندرت تو بھی ہے یہ عنوانِ نجات
آرزوئیں ہیں تری شانہ کشِ زلفِ حیات

راہیں، مستقبل و ماضی کا تغیر جیسے
ساعتیں، علمِ ریاضی کا تحیر جیسے

اک کلنڈر ہے کہ ہنگامۂ خاموش ہے تو
پیاس بھی، تشنہ بھی، یہ کون سا مے نوش ہے تو

سیف بجنوری
اسکول روڈ، بجنور (یو۔پی)

غزل

ترے کرم کو ترے التفات کو ترسے
مری حیات متاعِ حیات کو ترسے

میں وہ مسافرِ تنہا ہوں جو سرِ جادہ
سراغِ سمت و نشانِ جہات کو ترسے

یہ ہاتھ جنبشِ انگشت تک سے ہیں معذور
زباں ہے منہ میں مگر وہ بھی بات کو ترسے

نظر نے چھوڑ دیا ساتھ گھپ اندھیرا ہے
کہ دیکھنے کے لیے ہاتھ ہات کو ترسے

در و دریچہ تو کیا ہے شگاف تک بھی نہیں
اسیرِ شہرِ زمانہ نجات کو ترسے

ندیم میرا تعارف ہی کیا کہ ہوں میں بھی
وہ نقشِ آب جو اپنے ثبات کو ترسے

یہ دھوپ اب تو تمازت سمیٹ لے اپنی
کہ جسمِ سیف سکوں بخش رات کو ترسے

سعادت علی صدیقی (انچارج شعبۂ اردو)
ایم جی ایم کالج۔ سنبھل۔ مرادآباد

قومی یک جہتی کا علمبردار میلہ — نیزہ

ہندستان کی تاریخ میں تہواروں اور میلوں کو ہمیشہ اہمیت حاصل رہی ہے۔ یہاں زیادہ تر تہواروں اور میلوں کا پس منظر مذہبی ہے۔ اس مذہبی پس منظر کے علاوہ ان میلوں ٹھیلوں اور تہواروں کا ایک اور مقصد قلوب و اذہان کو فرحت و تازگی بخشنا بھی ہے۔ بیشتر تہوار اور میلے ایسے مواقع پر آکر پڑتے ہیں جب یا تو انسانی قلوب تکان سے بوجھل ہوتے ہیں اور اس تھکن اور کلفت کو دور کرنے کے لیے ہی وقت نکال کر ایسی تقریبات کا انعقاد کیا جاتا ہے یا پھر یہ ایسے موسم میں منعقد ہوتے ہیں، جب کھیتوں میں فصلیں تیار ہو چکی ہوتی ہیں گویا یہ تقریبات شکر اور مسرت کے ملے جلے جذبات کی ترجمان ہوتی ہیں۔

ان تہواروں اور میلوں کے مواقع پر منعقد ہونے والی تقریبات کا ایک اور پہلو یک جہتی کو فروغ دینا بھی ہے۔ یہ تقریبات مختلف عقائد اور مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان یکجہتی کو بڑھاوا دینے میں اہم رول ادا کرتی ہیں، ایسی ہی تقریبات میں سنبھل میں نہایت دھوم دھام سے منعقد ہونے والا میلہ "نیزہ" بھی ہے۔

'نیزہ' کے بارے میں گفتگو کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ سنبھل کے بارے میں بھی کچھ عرض کر دیا جائے۔ یہ شہر اس وقت ایک لاکھ کی آبادی پر مشتمل ہے اور اترپردیش کے ضلع مرادآباد کی ایک تحصیل ہے۔ اس کا شمار ہندستان کے قدیم ترین شہروں میں ہوتا ہے۔ اہل ہنود کی قدیم مذہبی کتابوں کے مطابق سنبھل کے وجود کا پتہ ست یگ، دواپر اور تریتا یگون میں بھی ملتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کسی زمانے میں یہ شہر پرتھوی راج چوہان کا پایہ تخت تھا۔ اسلامی عہد حکومت میں سات سلاطین کا نزول اجلال یہاں ہو چکا ہے۔ تاریخ فرشتہ کے مطابق شہنشاہ اکبر اعظم کے عہد حکومت میں اس کے چالیس پرگنہ تھے جن کی آمدنی ۴۹۱-۶۶۹۴ دام تھی۔ ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامے میں بھی سنبھل کا ذکر کیا ہے۔ ابن بطوطہ رقمطراز ہے "سنبھل کے علاقے میں بدایوں ایک شہر ہے"، اس کی شکستہ و ریختہ تاریخی عمارتیں آج بھی زبان عبرت سے اس کے شاندار ماضی کا پتہ دے رہی ہیں۔ حضرت شاہ حاتم علیہ الرحمۃ جن کو ابوحنیفہ ہند کہا جاتا تھا اور جو ملا عبدالقادر بدایونی کے استاد تھے اسی کی خاک میں آسودہ ہیں۔ بیر گوک ہر سنگار کی مصنوعات اور فیروز پور کا کیوڑا یہاں کی مشہور اشیاء ہیں۔

نیزہ کا میلہ شہر سے پانچ کیلو میٹر مشرق کی جانب موضع شہباز پور سورہ نگلا میں سوت ندی کے کنارے ہر سال چیت کے آخری عشرے کے منگل کو ہوتا ہے۔ اس سے ایک ہفتہ قبل اسی نام سے ایک میلہ پورن پور تحصیل امروہہ اور ایک ہفتہ بعد آنولہ ضلع بریلی میں منعقد ہوتا ہے۔ احسن التواریخ سنبھل کے مصنف غلام محمد شوق فریدی لکھتے ہیں:

"سنبھل میں نیزہ کا تہوار کچھ کم ایک ہزار سال کا ہے۔ ..... جس مقام کو اب گھماور کہتے ہیں پہلے یہ میلہ نیزہ کا وہاں ہوتا تھا لیکن جب وہاں کسی زمانہ میں لوٹ مار ہوئی تب سوت کے پار گھماور سے جنوب میں یہ میلہ بڑی آب و تاب اور اہل شہر و دیہات اور بیرونجات کے لوگوں کے ہجوم سے منگل

کے دن ہوتا ہے۔ بازار خوب دھوم سے لگتا ہے۔ ہر قسم کی اشیا فروخت ہوتی ہیں۔ یہ میلہ موضع شہباز پور کی آراضی میں ہوتا ہے۔ دوسرے دن بدھ کو باسی نیزہ حدودِ شہر میں محلہ چمن سرائے اور بریلی سرائے کے درمیان ہوتا ہے۔" (صفحہ ۵۴)

سنبھل میں نیزے کے دن کے تعین اور اعلان کا طریقہ یہ ہے کہ ہولی کے دوسرے دن شہر کے محلہ رائے ستی میں اہل ہنود کا ایک میلہ "دھجا" نہایت دھوم دھوم سے منایا جاتا ہے، اس میلے کے بعد آنے والے منگل کو کوتوالی کے روبرو ایک ڈھال (جھنڈا یا نشان) کھڑا کر دیا جاتا ہے اور آئندہ منگل سے میلۂ نیزہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ یہ میلہ اسلامی مہینوں کے بجائے ہندی مہینوں کے حساب سے منعقد ہوتا ہے منزل کے دن ہونے والے نیزہ کو تازی نیزہ کہتے ہیں۔ اس کے دوسرے دن شہر کے قلب میں ہونے والا نیزہ 'باسی' نیزہ کہلاتا ہے۔ شہر میں جتنی دھوم دھام اس دن ہوتی ہے سال بھر کسی اور دن دیکھنے میں نہیں آتی اور جتنی مٹھائی اس دن فروخت ہوتی ہے کسی اور موقع پر نہیں بکتی۔

اگرچہ یہ میلہ ہزار سال سے منایا جاتا ہے لیکن موجودہ زمانے میں یہ مذہب و ملت کے قیود سے آزاد ہو کر ہندو مسلم ملاپ اور قومی یک جہتی کا بہترین نمونہ بن گیا ہے۔

نیزہ کا میلہ جو بیک وقت تہوار بھی ہے اور میلہ بھی خصوصی اہمیت کا حامل ہے، ہر چند کہ اس کی تاریخی اور مذہبی اہمیت نہایت غیر واضح ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ میلہ اسی مقام پر منعقد ہوتا ہے، جہاں سید سالار مسعود غازیؒ نے جنگ کی تھی۔ ڈھالیں اور جھنڈے جنگ کی یادگار کے طور پر میلے میں نصب کیے جاتے ہیں، تین دن پہلے فاتحہ خوانی وغیرہ کی رسومات شروع ہو جاتی ہیں جن کا اختتام میلے میں ہوتا ہے اس مذہبی پس منظر کے ساتھ ساتھ اس میلے کی ثقافتی اور صنعتی اہمیت بھی کم نہیں ہے۔

ثقافت کے دائرے میں اس میلہ کی سب سے بڑی دین یک جہتی اور میل ملاپ ہے۔ ہندو اور مسلمان اسے بڑے شوق کے ساتھ مناتے ہیں۔ گھروں کی صفائی، لپائی، پتائی کی جاتی ہے نیزے سے دو دن پہلے یعنی اتوار کو شہر اور دیہات میں رات کو عام طور پر چاول پکتے ہیں اور دوشنبہ کو کڑھائی کا پکوان بنتا ہے۔ اتوار کو صحنکوں اور دوشنبہ کو کڑھائی کا دن کہا جاتا ہے۔ دیہات میں دونوں رسمیں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ اہل ہنود بھی ادا کرتے ہیں۔ اہل ہنود کی ایک قوم گڑھیا جو میاں سرائے اور اس کے قرب جوار میں آباد ہے اور جس کا پیشہ سنگھاڑوں کی کاشت، جال بننا، مچھلی پکڑنا، پالکی برداری اور اپلوں کا کاروبار کرنا ہے، اس میلہ کو اپنے تہوار کی طرح مناتے ہیں ان کی الگ ڈھال ہوتی ہے جس کو وہ مسلمانوں سے بھی زیادہ عقیدت کے ساتھ میلے میں لے جاتے ہیں۔ میلے کے قریبی مواضعات میں اہل ہنود کے گھروں میں بھی زبردست مہمانداری ہوتی ہے اور ان کے عزیز رشتہ دار دور دراز علاقوں سے میلہ دیکھنے آتے ہیں۔ سبھی فرقوں کی دکانیں لگتی ہیں دھوبی تمام شب اپنا مخصوص گیت "برہا" مقابلہ کی شکل میں گاتے ہیں۔ یہ گیت دیہاتی اور گنواری بولی میں ہوتا ہے گیت میں اردو کے الفاظ برائے نام استعمال کیے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے بچوں کی شادی کی نسبتیں بھی یہیں طے ہوتی ہیں۔ جگہ جگہ 'ڈھولا' گایا جاتا ہے۔ شیخ ڈفالی اس تہوار کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ اس میلے سے ان کا قومی رشتہ بھی وابستہ ہے نیزہ سے پہلی رات میں عقیدت مندوں کے گھروں پر اور میلے میں اپنے اپنے نشانات (جھنڈے) کے نیچے جنگ پر پوربی زبان میں راگ گاتے ہیں۔ اس راگ کو "سوہلا" کہا جاتا ہے۔ خانہ بدوش قبیلے جیسے، جگے، کنجڑ، ہنڈوے والے قلندر وغیرہ ہم چاہے کسی شہر میں مقیم ہوں میلے کے موقع پر سنبھل آکر اکٹھا ہو جاتے ہیں۔ کھیل تماشے، سرکس، کٹھ پتلیاں اور بازی گری سے میلے کی رونق دوبالا ہو جاتی ہے۔ رات کو میلے کے پاس ہی ایک باغ میں دیسی سنگیت کی محفل جمتی ہے جس میں سنگیت کی صرف ایک صنف "جوبولہ" ہی گائی جاتی ہے۔ دوسرے دن یہ محفل سنبھل کی قریبی بستی نوریوں سرائے میں بیٹھک کے نام

سے منعقد ہوتی ہے جس میں ہندو اور مسلمان گویئے اور سامعین حصہ لیتے ہیں - بدھ کو دو پہر سے قبل کہیں نہ کہیں بیل تانگوں (جسے بعض جگہ بیل گاڑی کہتے ہیں -) کی دوڑ کا مقابلہ ہوتا ہے۔ پہلے یہ مقابلہ محلہ سیف خاں سرائے میں ہوتا تھا - میلے کے دن سنبھل اور قرب وجوار میں اعزا، کے بچوں کو پیسے بانٹنے، نئے کپڑے پہننے - گھروں کو سجانے کا رواج عیدین سے بھی زیادہ ہے۔ خاص طور سے دیہات کے باشندے اس دن دھلا ہوا پرانا کپڑا پہننا پسند نہیں کرتے - ایک رسم تو ایسی ہے جس کی مثال شاید ہی کہیں ملے اور وہ یہ کہ اس دن ان لڑکیوں کو جن کی سال بھر کے اندر شادی ہوئی ہے، پھر سے دولھن بنا کر اور زیورات سے آراستہ کر کے اپنے اپنے گھروں میں بٹھا دیا جاتا ہے اور ہر دولھن کو دیکھنے کے لیے عورتوں کی آمد و رفت جاری رہتی ہے - ثقافتی اہمیت کی طرح اس میلے کی صنعتی اہمیت بھی ہے - اگر یہ کہا جائے کہ 'لال شکر' اور 'ڈھونڈ' کی صنعتیں اسی کی بدولت زندہ ہیں تو مبالغہ نہ ہوگا - سید سالار مسعود غازی کی نیاز چاولوں پر لال شکر ڈال کر دی جاتی ہے اور دیہات کا ہر کاشت کار سردیوں میں تھوڑی بہت لال شکر اسی غرض سے بناتا ہے کہ نیزہ کے موقع پر نیاز اور بجری کے لیے اس کی ضرورت ہوگی - اسی طرح ڈھونڈ ایک دیسی کپڑا ہوتا ہے جو گاڑھے یا کھدّر سے بھی ہلکا اور مچھر دانی کی جالی کی طرح ہوتا ہے، ہزارہا ڈھالیں اور جھنڈے جو کم سے کم ڈھائی گز اور زیادہ سے زیادہ بیس گز کے ہوتے ہیں، اس کپڑے سے تیار کیے جاتے ہیں - منّت مانے ہوئے بچوں کا لباس بھی اسی کپڑے کا ہوتا ہے - اس طرح ہزاروں گز کپڑا مصرف میں آجاتا ہے - مٹی کے برتنوں کی صنعت بھی اسی میلے کے ذریعے فروغ پاتی ہے - میلے میں برتنوں کا خاصا بڑا بازار لگتا ہے اور ہر قسم کے برتنوں کی کافی خرید و فروخت ہوتی ہے جنہیں پہلے سے مٹی کا کام کرنے والے اپنے کام میں مصروف ہو جاتے ہیں - حقّے کے نیچوں اور لاٹھی کی سامان کے بھی الگ الگ بازار ہوتے ہیں - اسی طرح گھریلو اور زراعت میں استعمال ہونے والی ہاتھوں کی بنی ہوئی لوہے کی اشیا، بچوں کے دیسی کھلونے اور دیگر اشیا بھی خوب فروخت ہوتی ہیں - ایک چیز ایسی بھی ہے جس کا بظاہر اس میلے سے کوئی تعلق نہیں مگر اس کی فروخت سب سے زیادہ ہوتی ہے اور وہ ہیں پلنگ اور سہری کے لیے لکڑی کے بنے ہوئے "پائے" ان کا بازار بھی الگ ہی ہوتا ہے ٹرکوں مال آتا ہے اور ہاتھوں ہاتھ بک جاتا ہے پایوں کی صنعت کو اس میلے سے بڑا فروغ حاصل ہوا ہے - اس طرح یہ میلہ قومی یک جہتی اور صنعت و حرفت کے فروغ کا اہم مرکز بن گیا ہے۔

تیندوا ۔۔۔ صفحہ ۲۲ کا بقیہ

گولی اس کے شولڈر بلیڈ پر لگی - تیندوا پانچ سات قدم تک لڑھکتا چلا گیا - اب آدم خور تیندوا بھاگا میری اور راج کمار کی گولی ایک آواز کے ساتھ پندرہ قدم سے اس کے لگی اور وہ بھی لڑھکتا ہوا دور جا گرا - میں دوڑ کر سادھو کے پاس پہنچا اور راجکمار زخمی آدم خور پر ٹارچ ڈالے دیکھتے رہے وہ آخری سانسیں لے رہا تھا۔ سادھو کی زبان اور دونوں آنکھیں باہر نکل آئی تھیں - گردن میں تیندوے کے دانت گہرائی تک اتر چکے تھے - گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی - سادھو کی دونوں مٹھیوں میں تیندوے کے بال تھے شاید بہادر سادھو تیندوے سے زور آزمائی کر چکا تھا - سادھو کا بدن گرم تھا، مگر دم نکل چکا تھا - ہم نے آشرم کی تلاشی لی تو انسانی کھوپڑیاں رکھی ملیں جو شاید وہم اور خوف کا ماحول پیدا کرنے کے لیے وہ استعمال کرتا ہو - کچھ خنجر ملے اور وہم کو پھیلانے والے کچھ مضامین ملے جو شاید سادھو کی تحریر ہوں گے - وہ معمہ پھر بھی حل نہ ہو سکا کہ ہمارے ہی شکار کے دوران سادھو کو تیندوے نے کیوں مارا مگر یہ بات بعد میں معلوم ہوئی کہ سادھو کی موت کے بعد سے اور تیندوے کے اس جوڑے کے مارے جانے کے بعد سے کوئی واقعہ تیندوؤں کی آدم خوری کا پھر نہیں سنا گیا - سادھو کی بغل میں وہ بنڈل کیا تھا - شاید انسانی کھوپڑی اور تیندوے کی کھال ہو جو تیندوے سے لڑائی کے وقت دور جھاڑی کے پاس پڑی ہوئی دوسرے دن ملی تھی -

ظفر برنی
ٹ آفس جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

دہلی کی تہذیبی روایات کا آخری چراغ

استاد رسا دہلوی

یں ۱۹۶۰ء میں دہلی آیا اور یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ یہاں سب سے
لے جس نے مجھے بیحد متاثر کیا وہ شخصیت تھی استاد رسا
لوی کی۔ استاد رسا دہلوی جو "استاد" کے لاحقہ کو اپنے
کا جزو لازمی سمجھتے تھے، اپنے دستخطوں میں بھی اس
لفظ کا استعمال نہیں بھولتے تھے۔ استاد رسا اس عالم آب
پاسے مدام رخصت ہو چکے ہیں لیکن ان کے چاہنے والوں کو
جانے کیوں ابھی تک یہ احساس ہوتا ہے کہ استاد رسا
ن جہانِ فانی سے رخصت نہیں ہوئے بلکہ ان کی گلفشانیِ
مقتار اور ان کا ساٹھ پاٹھا قسم کا جسم آج بھی ہماری نگاہوں
کے سامنے گھوم رہا ہے۔

ایمرجنسی سے پہلے دہلی کی جامع مسجد کی سیڑھیوں کے
یچے چھوٹی چھوٹی دکانوں، ہوٹلوں اور خوانچہ فروشوں کی
بھیڑ لگی ہوتی تھی۔ اس ہجوم کاروبار میں ایک معمولی سا ہوٹل
ہیر ہوٹل کے نام سے بھی تھا جس کو عام طور پر "چنڈو خانہ"
کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اس معمولی ہوٹل نے دہلی کے اردو
حلقوں میں غیر معمولی حیثیت حاصل کر لی تھی کیوں کہ یہاں
خاٹ پلیس کے انڈین کافی ہاؤس کی طرح دہلی کا اردو داں
طبقہ پابندی سے بیٹھا کرتا تھا۔ اس میں چھوٹے بڑے ادیب
شاعر، متشاعر قسم کے نوجوان، صحافی و سیاستداں اس
مستقل مزاجی کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے تھے گویا ان کو باہر کی
دنیا سے کوئی سروکار نہیں۔ اگر آپ کو کسی شاعر یا ادیب
کی تلاش ہوتی تو سیدھے یہاں پہنچ کر آپ اپنے مطلوبہ شخص

کو پا سکتے تھے۔ مولوی سمیع اللہ قاسمی کی دکان کے بعد شاعر یا ادیب
اسی ہوٹل سے برآمد ہوا کرتا تھا۔ جوش ملیح آبادی سے لے کر
گلزار دہلوی تک، منشی عبدالقدیر سے لے کر ڈاکٹر خلیق انجم
تک اور خان غازی کابلی سے لے کر امیر آغا قزلباش تک
اردو کے تمام مشاہیر کا میٹنگ سنٹر یہی "چنڈو خانہ" تھا۔
یہاں علمی و ادبی مباحث اور مقامی، قومی اور بین الاقوامی
سیاسی معاملات پر بھی بات چیت ہوتی تھی۔ کبھی کبھار یہ
گفتگو ناخوشگوار شکل اختیار کر لیتی تھی۔ لیکن تھانہ چوکی کی نوبت
نہیں آتی تھی بلکہ ادیبوں اور شاعروں کا فائر بریگیڈ موجود ہوتا
جس کی مساعی جمیلہ سے بات رفع دفع ہو جاتی تھی۔

شعرا کے اسی جمگھٹ میں ایک شاعر بھی تھا استاد رسا
دہلوی جو کہ حلیہ سے سرشار کے مزاحیہ کردار "خوجی" کا مثنیٰ
معلوم ہوتا تھا مگر اس میں بے پناہ صلاحیتیں موجود تھیں۔ اس کا
جسم بڑھاپے کے باوجود ٹھوس اور کسرتی لگتا تھا۔ اس کی
جسمانی دلکشی کا راز یہ تھا کہ اس نے جوانی کے دنوں میں فٹبال
کھیلا تھا۔ رفتار میں بلا کی تیزی تھی اور گفتار میں بھی تندی کا
احساس ہوا۔ حاضر جوابی میں استاد رسا کو وہ کمال حاصل تھا
کہ انشا اللہ خاں انشا یاد آ گئے۔ حقیقت میں وہ اس فن کے بادشاہ
تھے اور دہلی میں ہر شخص ان سے مقابلہ کرتے ہوئے کتراتا تھا اور
معرکہ آرائی کے آغاز میں ہی اپنی شکست قبول کر لیتا تھا۔
کسی شخص میں یہ ہمت نہیں تھی کہ وہ استاد کے برجستہ فقروں
اور لفظیات کے آگے ٹھہر سکے۔ مرنجاں مرنج قسم کی شخصیت

تھی استاد رسا دہلوی کی۔ اگر وہ اپنے مخاطب سے خوش ہوتے تو اپنی پلکیں بچھا دیتے لیکن غصہ کی حالت میں قہر و غضب بن کر نازل ہوتے تھے۔

استاد رسا دہلوی یوں تو اپنی زندگی کی ۶۵ بہاریں دیکھ چکے تھے لیکن ان کے چہرے مہرے سے کہیں اضمحلال ظاہر نہیں ہوتا تھا۔ سر پر منڈھی ہوئی ٹوپی اور منھ میں پان کی پیک۔ پان اتنی کثرت سے کھاتے تھے کہ ہمیشہ ان کی ڈاڑھی کے چند بال بھی اس پیک سے لالہ زار نظر آتے تھے۔ انگرکھا شیروانی، اٹنگا پائجامہ، ایک ہاتھ میں روایتی چھڑی اور بغل میں بیاض اور چند بوسیدہ فائلیں جن میں شاعروں اور متشاعروں کی اصلاح طلب غزلیں، مشاعرے کی تفصیلات، پرانے پوسٹروں کے نمونے، نئے پوسٹروں کے خاکے اور چندوں کی رسید بکیں، آنکھوں میں سرمئی ڈورے اور ان سب کے مجموعہ کا نام تھا استاد رسا دہلوی جو بذات خود ایک انجمن سے کم نہیں تھے جن میں دہلی کی تمام تہذیبی روایات یکجا ہوگئی تھیں۔

میں جب پہلی مرتبہ استاد سے "چینڈو خانہ" میں ملا جہاں یہ ملاقات خان غازی کابلی کے ذریعہ ہوئی تھی تو میں نے ان کے حلیہ سے یہ سمجھا کہ موصوف کسی مسجد کے پیش امام ہوں گے۔ لیکن گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا تو مجھے اندازہ ہوا کہ یہ تو کہنہ مشق شاعر ہیں اور ان کو زبان پر قدرتی عبور حاصل ہے۔ ان کا لہجہ خالص ٹکسالی اور دہلوی تھا جس میں محاوراتی گالیوں کی آمیزش بھی تھی۔ ان کے انداز گفتگو سے میر امن دہلوی کے "دہلوی روڑے" کی غمازی ہوتی تھی۔ استاد نے بیخود دہلوی سے فن شاعری میں تربیت حاصل کرنے کا دعویٰ کیا اور فرمایا کہ میں تو اپنے استاد کا "کفش بردار" ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ استاد رسا کو دہلی کی روایات و معاشرت، دہلی کی زبان و تاریخ، دہلی کے در و دیوار اور دہلی کے قدیم باشندوں سے والہانہ عشق تھا۔ وہ "دہلی" کی اصطلاح کو بھی دیوار دہلی کے حدود میں ہی رکھ کر سوچتے تھے۔ حتیٰ کہ باڑہ ہندو راؤ اور نظام الدین کے باشندوں کو بھی اپنی نگاہ میں "غیر دہلوی" تصور کرتے تھے۔

سیاق و سباق کو ملحوظ رکھ کر اور معنویت کا خیال رکھ کر اس انداز سے گالی دینا کہ مخاطب کو برا نہ لگے، استاد رسا کے روزمرہ مشاغل میں شامل تھا۔ انھوں نے اس فن پر جو ملکہ حاصل کیا تھا، وہ قابل تعریف تھا۔ شاید غالب کا محبوب بھی اتنے دلکش پیرائے میں گالی گلوج نہ کرتا ہوگا جتنا کہ استاد رسا کرتے تھے: ؎

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

اور حقیقت بھی یہی تھی کہ استاد کی گالیوں میں حاضر جوابی، فقرے بازی، دشنام طرازی، بذلہ سنجی اور لطافت بیان کا چٹخارہ محسوس ہوتا تھا۔ تعجب تو اس بات کا ہے کہ استاد یہ گالیاں مخاطب کے پیٹھ پیچھے نہیں بلکہ صاحب معاملہ کے منھ پر ہی دیا کرتے تھے اور سننے والا ان گالیوں سے بہت لطف اندوز ہوتا تھا۔

استاد رسا دہلوی نے داغ دہلوی کے شاگرد بیخود دہلوی کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ وہ اپنے استاد کی عزت و تکریم کرتے تھے اس کا ثبوت یہ ہے کہ استاد رسا نے اپنی زندگی کے آخری لمحات تک بیخود دہلوی کی یاد میں ہر سال پابندی کے ساتھ ایک "آل انڈیا مشاعرہ" منعقد کیا۔ اس مشاعرے کی خصوصیت یہ تھی کہ اس کے انعقاد کے قبل دو تین پوسٹر بڑے سائز میں شائع ہوتے تھے اور اس کے انعقاد کی ہمیشہ ایک ہی جگہ ہوتی تھی —— چوک سنگھاڑہ، جو کہ ہوٹل فلورا اور مکتبہ جامعہ کے سامنے واقع ہے۔ استاد اس مشاعرہ کی تیاریاں ۶ ماہ پہلے ہی سے شروع کر دیتے تھے اور دہلی کی سڑکوں پر رواں دواں نظر آتے تھے۔ ان کو سال بھر یہی دھن سوار رہتی تھی کہ مشاعرہ کامیاب ہو۔ اس کے لئے وہ اپنے تمام شاگردوں سے جن میں اکثر کارخانہ دار ہوتے تھے،

حسب توفیق چندہ وصول کرتے، کسی سے اشتہار اور پوسٹر کے لئے کاغذ خرید والتے، کسی سے کتابت مفت کرواتے اور کسی پر اس کی طباعت کا بوجھ ڈالتے تھے۔ آخر میں انھوں نے مشاعرہ میں شامل ہونے والے شعرا کو تمغات تقسیم کرنے کی بدعت شروع کر دی تھی اور اس کا بار بھی ان کے شاگردوں اور جاننے والوں کی جیبوں پر پڑتا تھا۔

ان کے مشاعروں کے پوسٹروں کی شان نرالی ہوتی تھی۔ اگر آپ قلعہ معلیٰ کے اطراف سے گذرے ہیں تو آپ کو یاد ہوگا کہ سال میں دو ایک بار دہلی کی دیواروں پر ایک بڑا پوسٹر چسپاں نظر آتا تھا جس کا عنوان ہوتا تھا — "مشاعرۂ یوم بیخود" یا "بڑا مشاعرہ" اس میں شریک ہونے والے شعرا کی فوج کے علاوہ جلی حروف میں یہ بھی درج ہوتا تھا کہ اس مشاعرہ کو آل انڈیا ریڈیو سے براڈ کاسٹ اور ٹیلی ویژن سے ٹیلی کاسٹ کیا جائے گا۔ ایک فقرہ یہ بھی ہوتا تھا کہ "مشاعرہ کی تاریخ کا انتظار کیجیے"۔ کچھ عرصہ کے بعد مفصل پوسٹر دہلی کی دیواروں پر چسپاں ہوتا تھا کہ فلاں تاریخ کو فلاں مقام پر مشاعرہ ہوگا اور فلاں فلاں شعرا اس میں کلام بلاغت نظام پیش کریں گے۔ اس میں بعض شاعروں کے ساتھ استاد اپنی طرف سے خطابات بھی جوڑ دیا کرتے تھے۔

مشاعرے میں استاد رسا کی حیثیت مرکزی کردار کی ہوتی تھی۔ میر مشاعرہ یا صدر مشاعرہ کوئی بھی ہو لیکن استاد رسا ہی مشاعرہ کی روح ہوتے تھے اور از اول تا آخر مشاعرہ پر چھائے رہتے تھے۔ جہاں کسی شاعر نے ڈھنگ کا شعر پڑھا تو استاد پھڑک اٹھتے تھے اور لپک کر اس شاعر کی عجیب انداز میں بلائیں لینا شروع کر دیتے تھے۔ جوش میں آکر اس کے گلے میں ہار ڈال دیتے تھے اور اگر شاعر ان کی توقع یا مزاج کے خلاف پڑھتا تو استاد اس شاعر کو برملا ٹوک دیتے تھے اور کہتے: "میاں کچھ اور پڑھو"۔

دہلی کالج کے طالب علموں سے استاد کی خوب نوک جھونک چلتی تھی لیکن استاد اسٹیج پر ہی بیٹھے بیٹھے ان نوجوانوں کو ڈانٹ پلاتے رہتے تھے۔ وہ جب دیکھتے کہ لڑکے بے قابو ہیں اور ان کے مشاعرہ کی فضا خراب کرنا چاہتے ہیں تو وہ غصہ میں اتنے بپھر جاتے تھے کہ مغلظات گالیاں سنانے لگتے تھے۔ اس پر لڑکے خاموش ہو جاتے تھے۔ اس مشاعرہ کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ استاد مشاعرہ کے دوران بیچ بیچ میں اناؤنسر کے اعلان کا انتظار کئے بغیر ہی اپنا کلام سناتے جاتے تھے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ادھر شاعر غزل سنا رہا ہے ادھر سامعین ہوٹنگ کر رہے ہیں۔ ایسی حالت میں استاد سے نہ رہا جاتا وہ کھڑے ہو جاتے اور شاعر کو روک کر مائک پر فقرے بازی، پھبتی بازی اور لطیفہ گوئی سے سامعین کا دل لبھانے لگتے۔ اس سے شاعر کا حوصلہ بڑھ جاتا اور سامعین اس کو توجہ سے سننے لگتے۔

استاد رسا کا شعری ذخیرہ بہت کم ہے۔ انھوں نے بہت کم کہا لیکن خوب کہا۔ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ انھوں نے اپنے کلام کو محفوظ رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی اور وہ اپنا کلام چھپوانے کے بھی قائل نہیں تھے۔ انھوں نے زبان و بیان کا وہی انداز ورثہ میں پایا تھا جو کہ دبستان داغ کا طرۂ امتیاز ہے۔ معاملہ بندی، سادگی و پرکاری، حسن و عشق اور سلاست و روانی ان کی شاعری کا وہ جوہر ہے جس پر ہر سننے والا سر دھنتا تھا۔ استاد رسا کے دو شعر ذہن میں محفوظ رہ گئے ہیں:

پیکر پیکار سے پیکار آدھی رہ گئی — ان کا غصہ کم ہوا ٹکرار آدھی ہو گئی
بال تم نے حضور کیا کھولے — سر منڈاتے ہی پڑ گئے اولے

ڈاکٹر ولی الحق انصاری
لامان - ۲۰ فرنگی محل لکھنؤ ۳

غزل

دہر ہے وہ انجمن جس میں ہے مذہب چراغ
اور بڑھے نور اگر مل کے جلیں سب چراغ

قیمتِ دل کیا ہے یہ تجھ کو بتاؤں میں کیا
تیرے لیے ٹھیکرا میرے لیے شب چراغ

اپنے لہو سے کیا ہم نے انھیں مشتعل
ہم نے دیا خونِ دل بجھنے لگے جب چراغ

بادِ مخالف کی زد پر ہیں دیے آس کے
دیکھیں تھمے کب ہوا، دیکھیں جلیں کب چراغ

ناؤ یہ میں کیا کروں آچکا ساحل پہ جب
کٹ گئی جب تیرہ شب کیا میں کروں اب چراغ

خانۂ آزادگاں رہ نہ سکا نور بن
شعلے فروزاں ہوئے جل نہ سکے جب چراغ

چھڑتا رہا سازِ غم انجمنِ زیست میں
جلتے رہے رات بھر خوں سے لبالب چراغ

سلسلۂ آرزو دیکھ نہ ٹوٹے کبھی
ہاں نہ بجھیں قبل از خاتمۂ شب چراغ

تیرہ نہ ہو اب ولی انجمنِ لکھنؤ
کوئی نہیں اور اگر تم ہی بنو اب چراغ

رشید انصاری
نمبر ۱۴۰-۴-۱۶
چنچل گوڑا (آم والی مسجد) حیدرآباد

آتشِ سیّال

(جرعۂ اول)

سرمستیوں کا لطف تھا عہدِ شباب میں
دن رات گویا ڈوبے ہوئے تھے شراب میں
کچھ امتیاز تھا نہ گناہ و ثواب میں
آنکھیں کھلیں تو اپنے کو پایا سراب میں
اب ہوش ہو گیا ہے ہمیں ترک کے بعد

(جرعۂ دوم)

اس شوق میں کچھ ایسے ہوئے ہم ذلیل و خوار
اٹھتا گیا زمانے کا ہم پر سے اعتبار
سمجھے نہ اونچ نیچ، ہوئے سب کے قرضدار
تنخواہ ساری لے گئے کم بخت سودخوار
بڑھنے لگی جو بے خودی، گھٹتا گیا وقار
دشنام مے فروش پہ آتا تھا ہم کو پیار
قربان جائیے ترے اے فضلِ کردگار
اب ہوش آگیا ہے ہمیں ترک کے بعد

(جرعۂ سوم)

میخانے میں دکھائی دیے ایسے باکمال
فن کے زوال پر جنھیں مطلق نہ تھا ملال
اور جن کے ساتھ بیٹھے تھے جاہل بصد جلال
ہم نے یہ دیکھ کر کیا اپنے سے خود سوال
اہلِ کمال کیوں ہوئے رندِ خراب حال؟
اب ہوش آگیا ہے ہمیں ترک کے بعد

(جرعۂ چہارم)

وہ دن بھی تھے پہنتے تھے کیا قیمتی لباس
عزت تھی، احتشام تھا، کیا تھا نہ اپنے پاس
اہل و عیال، سب کو تھی کیا کیا نہ ہم سے آس

لیکن طوافِ مے کدہ آیا نہ ہم کو راس
دولت لٹائی، عیش کیا ہم نے بے قیاس
آیا پھر انقلاب کہ کمزور تھی اساس
اب دیکھتے ہیں سب کو کہ ہیں ہم سے ناشناس
جو جان دینے والے تھے، آتے نہیں ہیں پاس
صد حیف میکشی میں ہوئے ہم نہ خود شناس
سڑکوں پہ ہم کو پایا ہے لوگوں نے بد حواس
اب ہوش آگیا ہے ہمیں ترک کے بعد

(جرعۂ پنجم)

اپنی گزر رہی تھی بصد احتشام و جاہ
اس مے کشی نے ہم کو دکھائی خراب راہ
با عقل و ہوش ہم نے کیا دخترِ رز سے بیاہ
اہل و عیال سے نہ رہی حیف ہم کو چاہ
حال اپنا ہو گیا ہے خدا کی قسم تباہ
پہلے ہر ایک بات پہ کہتے تھے لوگ واہ
اپنے نصیب میں فقط اب رہ گئی ہے آہ
بیوی نے کہہ دیا کہ "نہیں ہوگا اب نباہ"
اب ہوش آگیا ہے ہمیں ترک کے بعد

(جرعۂ ششم)

کہتے ہیں تجھ سے اک سخن پُر اثر رشید
صد شکر ہے کھلا ابھی توبہ کا در رشید
توفیق ہو خدا کی طرف سے اگر رشید
کرتا نہ سوئے میکدہ رخ عمر بھر رشید
زر دے کے ہم نے مول لیا دردِ سر رشید
اب ہوش آگیا ہے ہمیں ترک کے بعد

محمد اسحاق صدیقی
۵۔اے گوئن تالاب، لکھنؤ

انسانی سینگ

بچپن میں ایک کہانی سنی تھی، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک بادشاہ کے سر پر آہستہ آہستہ دو سینگ ابھر آئے۔ وہ شرم کے مارے اپنے سینگوں کو صافے میں چھپائے رکھتا تھا، لیکن بادشاہ کے حجام سے یہ بات چھپی نہ رہی۔ بادشاہ نے اپنے حجام کو توڑے روپے انعام میں دیے اور وعدہ لیا کہ وہ اس راز کو کسی پر ظاہر نہ کرے گا۔ ورنہ سر قلم کر دیا جائے گا۔ لیکن حجام پیٹ کا ہلکا تھا۔ جب اس کے لیے یہ راز چھپانا ناممکن ہو گیا تو ایک دن وہ جنگل میں نکل گیا اور ایک پیڑ سے لپٹ کر چپکے سے کہا: "راجہ کے دو سینگ ... راجہ کے دو سینگ"۔ اس کے بعد وہ چلا آیا اور اس کی بے چینی دور ہو گئی۔

کچھ عرصے کے بعد ایسا ہوا کہ وہ پیڑ سوکھ گیا اور اس کی لکڑی سے دو چیزیں بنائی گئیں، ایک تو سارنگی اور دوسرے طبلے کی جوڑی۔ جب یہ چیزیں سازندوں کے ذریعہ دربار میں پہنچیں اور بجائی گئیں تو سارنگی سے آواز نکلی: "راجہ کے دو سینگ ... راجہ کے دو سینگ"۔ مجیرے سے آواز آئی "کن نے کہا؟... ... کن نے کہا؟" طبلہ بولا۔ "ہجّن حجام نے ...... ہجّن حجام نے"۔

اگر آپ مذکورہ سازوں کی آوازیں پر دھیان دیں تو واقعی ان سے اسی طرح کی آوازیں نکلتی ہیں۔ لیکن راجہ کے سینگوں کی کیا حقیقت تھی؟ اس سوال پر غور کرنے کا موقع اس وقت ملا جب ایک عجیب و غریب خبر نظر سے گزری۔ یہ خبر بمبئی کے مشہور ہفتہ وار اخبار "بلٹز" مورخہ ۲۲ اکتوبر ۱۹۷۷ء کے اردو، ہندی اور انگریزی تینوں ایڈیشن میں شائع ہوئی تھی۔

آدمی کے آٹھ انچ لمبا سینگ

(نامہ نگار بلٹز)

"بغداد۔ عراق کے ایک گاؤں کے رہنے والے ۵۵ سالہ شیال تخابا کی کہانی الف لیلیٰ کی طرح عجیب و غریب ہے۔ وہ شادی شدہ ہے۔ لکڑی کاٹنا اور پانی بھرنا اس کا پیشہ ہے۔ ۱۹۷۴ء میں ایک دن اچانک اس کے سر میں درد ہوا اور جیسے جیسے دن گزرتے گئے، اس کے سر کا درد بڑھتا گیا۔ دیسی بدیسی کوئی دوا کارگر نہ ہوئی۔

اچانک ایک دن اس کے سر میں داہنی طرف ایک گانٹھ ابھر آئی اور رجان لیوا سر کا درد کافور ہو گیا۔ لیکن وہ گانٹھ دھیرے دھیرے موٹی اور سخت ہوتی گئی۔ پھر ایک دن اس گانٹھ کی جگہ لگ بھگ آٹھ انچ لمبا سینگ نکل آیا، جو مینڈھے کے سینگ کی طرح بل کھایا ہوا تھا۔

تخابا کا جینا دوبھر ہو گیا۔ لوگ اس پر طرح طرح کی پھبتیاں کسنے لگے۔ اسے طعنہ دیا جانے لگا کہ وہ انسان اور مینڈھے کی اولاد ہے۔ مقامی ڈاکٹر بھی حیران تھے۔ ان کے مشورے پر تخابا راجدھانی جا کر بڑے بڑے ڈاکٹروں سے ملا۔ کئی گھنٹوں کے آپریشن کے بعد وہ سینگ کاٹ کر الگ کر دیا گیا۔ اس طرح تخابا کو اس شرمناک علامت سے نجات ملی۔ اب یہ سینگ عراق کے

ایک عجائب گھر میں محفوظ ہے !!

بلٹز (انگریزی) کے صفحہ ۵ پر اس سینگ والے انسان کی تصویر بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ اس تصویر کو دیکھنے اور خبر کو پڑھنے کے بعد اس بارے میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ اس مضمون کے شروع میں میں نے جو کہانی لکھی ہے۔ وہ سرا سر فرضی نہیں ہے بلکہ انسان کے سر پر سینگ اگ آنا بالکل ممکن ہے۔ تاریخ میں بھی ایسے کئی انسانوں کی مثالیں موجود ہیں، جن کے سروں پر سینگ اُگ آئے تھے اور باوجود کاٹے جانے کے غائب نہ ہوئے بلکہ ہر بار اگ آئے اور سینگ والے مرد یا عورت کی زندگی تلخ کر دی۔

انسان کے سینگ جانوروں کے سینگوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ ان میں ہڈی نہیں ہوتی۔ یہ صرف چمڑے سے ڈھکے ہوئے گوشت کے لوتھڑے ہوتے ہیں اور ڈاکٹروں کے بیان کے مطابق وہ ایک خاص قسم کی کھال کی بیماری کے باعث ہمارے جسم میں کہیں بھی نکل سکتے ہیں۔ اس بیماری کا نام کارنو کوٹانیم (CORNU CUTANEUM) ہے۔

نیچے ہمارے ملک کے ایک ایسے آدمی کی تصویر دی جا رہی ہے، جس کی پیٹھ میں سینگ اگ آیا تھا۔ کاٹھیاواڑ کے بھاؤ

نگر راج کے سر تخت سنگھ جی اسپتال میں یہ سینگ ڈاکٹروں نے آپریشن کے ذریعہ نکالا تھا۔ اس سینگ کا گھیر ۶½ انچ اور لمبائی ۳½ انچ تھی۔

اب سے پچاس سال پہلے تبت کے لہاسہ شہر میں ایک ایسا آدمی تھا جس کی پیشانی پر تیرہ انچ لمبا سینگ تھا۔ اسی طرح ژو چنگ نامی چینی کے سر پر سامنے کی طرف نہیں بلکہ پیچھے ایک ایک فٹ لمبے دو سینگ تھے۔

افریقہ کے کافر قبیلے کے ایک شخص کے سر پر سامنے کی طرف دو لمبے سینگ ابھر آئے تھے اب سے تقریباً نصف صدی پہلے یہ شخص عیسائی ہو گیا اور عیسائی مبلغین کے ذریعہ لندن پہنچا جہاں اس کی نمائش کی گئی۔

ایڈنبرا یونیورسٹی کے عجائب خانہ تشریحات میں چار انسانی سینگ موجود ہیں، جو چار عورتوں کے سروں سے نکالے گئے تھے۔ ایک سینگ پر جو سات انچ لمبا ہے، خمیدہ

اور جھینگلیا کے برابر موٹا ہے۔ ایک کتبہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سینگ الزبیتھ لو (ELIZABETH LOW)

نامی پچاس سالہ عورت کے سر سے ۱۴ مئی ۱۶۷۱ء کو سرجن آرتھر تیمپل نے کاٹ کر نکالا تھا۔ یہ داہنے کان کے تین انچ اوپر سات سال سے اُگ رہا تھا۔ مزید تصدیق کے لیے اس پر ان پانچ گواہوں کے نام بھی لکھے ہیں، جو آپریشن کے وقت موجود تھے۔

اسی طرح انگلستان میں چیسٹر کے نزدیک ایک دوسری عورت مسز میری ڈیوس (MRS. MARY DAVIS) رہا کرتی تھی، جس نے ۷۴ سال کی عمر میں ۱۶۶۸ء میں وفات پائی۔ اسے ۲۸ سال کی عمر میں سر پر بدگوشت کی شکایت ہوئی، جسے لوگوں نے بہت کسا ہوا ہیٹ پہننے کا نتیجہ بتایا۔ اس بدگوشت سے تیس سال کے بعد ایک جوڑا جھریوں دار سینگوں کا نمودار ہوا، جو مینڈھے کے سینگوں سے مشابہ تھے۔ بعض دستاویزوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عورت نے تین بار اپنے سینگ بدلے۔ شروع میں صرف ایک سینگ تھا۔ جو لمبا اور جَو کے پیالے کی طرح نازک تھا۔ دوسرا پہلے سے موٹا تھا۔

ان کے گرنے کا زمانہ برابر نہ تھا۔ پہلا نکلنے کے تین سال بعد گر گیا اور دوسرا چار یا ساڑھے چار سال کا ہو کر گرا۔ تیسری دفعہ دو سینگ اُگے جو گر جانے سے ٹوٹ گئے۔ ایک انگریز لارڈ نے ان میں سے ایک کو حاصل کر کے فرانس کے بادشاہ کو قدرت کے سب سے بڑے عجوبے کے طور پر پیش کیا۔ دوسرا جو پہلے سے بڑا نو انچ لمبا اور گھیر میں دو انچ تھا لاپتہ ہو گیا۔

۱۷۹۱ء میں انگلستان میں ایسی دو عورتیں موجود تھیں جنھیں سینگ کے مرض کی شکایت تھی۔ ان میں سے ایک مسز لانس ڈیل (MRS. LONSDALE) ایک ۵۶ سالہ عورت لنکن شائر میں ہارن کیسل کی رہنے والی تھی۔ اس عورت کے سر کے بائیں جانب کان سے کچھ اوپر ایک رسولی ظاہر ہوئی، جو پانچ سال تک آہستہ آہستہ بڑھتی رہی، یہاں تک کہ مرغی کے انڈے کے برابر ہو گئی۔ پھر وہ پھوٹ گئی اور اس سے آہستہ آہستہ سرخ رنگ کے گوشت کا ابھار ظاہر ہوا، جو پہلے مٹر کے دانے کے برابر تھا۔ تقریباً تین مہینے میں وہ موٹا اور لمبا ہو گیا اور اس میں مینڈھے کے سینگ کی طرح خم پڑ گیا لیکن وہ اب بھی نرم تھا۔ بعد میں وہ سینگ کی طرح سخت ہونے لگا اور دو سال تین مہینے میں تقریباً پانچ انچ لمبا ہو گیا اس سے پیدا ہونے والے درد سے بیتاب ہو کر جنون کی حالت میں بےچاری عورت نے اسے توڑ ڈالنے کی کوشش کی اگرچہ وہ ٹوٹ گیا لیکن اس کی جڑیں بعد میں نکالی گئیں۔ اس کے بعد اس مقام پر ایک دوسرا سینگ اُگ آیا اور اس کے ساتھ کئی اور بھی سینگ تھے۔

مسز ایلن (MRS. ALLEN) ایک ادھیڑ عمر کی عورت لی سسٹر شائر میں رہتی تھی۔ اس عورت کو مشہور ڈاکٹر سرایورڈ ہوم (SIR EVERARD HOME) نے نومبر ۱۷۹۰ء میں دیکھا تھا۔ اس وقت اس کا سینگ جو پانچ انچ لمبا اور کافی بل کھایا ہوا تھا بظاہر بےترتیبی سے جمی ہوئی تہوں کا مجموعہ معلوم ہوتا تھا۔ مسز ایلن کو لندن لایا گیا، جہاں عجوبے کے طور پر اس کی نمائش کی گئی جس سے اس کے گاؤں کے لوگ بڑے ناراض ہوئے اور انھوں نے اس کے شوہر کو اسے واپس لانے پر مجبور کر دیا۔

برٹش میوزیم (لندن) میں ایک سینگ ہوا کرتا تھا، جو فریج نامی عورت کے سر سے نکالا گیا تھا۔ یہ بھی پہلے رسولی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ جب ڈاکٹر گرے (DR. GREY) نے اسے دیکھا تھا تو اس کی لمبائی گیارہ انچ اور گھیر ڈیڑھ انچ تھا۔

اس طرح کئی اور مثالیں سینگ والے انسانوں کی موجود ہیں لیکن وہ سب یکساں ہیں اس لیے انھیں نظر انداز کیا جاتا ہے۔

انسانوں کے بعد ان کہانیوں پر آئیے، جن میں دیوؤں کا سینگ دار ہونا ظاہر کیا جاتا ہے۔ غالباً سینگ والے دیوؤں کا تصور سینگ والے انسانوں ہی کو دیکھ کر پیدا ہوا ہوگا۔

اس سلسلے میں لفظ دیو کی حقیقت غور طلب ہے، جو سنسکرت میں بھی پایا جاتا ہے اور فارسی میں بھی۔ سنسکرت میں دیو (देव) کے معنی دیوتا کے ہیں۔ جیسے مہادیو۔ اس لفظ کا مادہ دِو (दिव्) ہے، جس کے معنی ہیں "چمکنا"۔ پہلے یہ لفظ اجرام فلکی یعنی چاند سورج، سیاروں اور ستاروں کے لیے استعمال کیا جاتا تھا کیونکہ قدیم آریہ لوگ انھیں کی پرستش کرتے تھے۔ (غالباً ہندی کا لفظ دِیا بمعنی "چراغ" دِو سے نکلا ہے اور عربی الفاظ ضیا دو ضو اور ضوا، اس دو. کی مختلف صورتیں ہیں، جن کے معنی ہیں نور کی روشنی یا محض روشنی، واضح ہو کہ عربی میں ضؔ کا تلفظ دؔ کی طرح کیا جاتا ہے) فارسی میں دیو کے معنی اس کے برعکس ہیں۔ یعنی وہ آدم خور مخلوق جس کا جسم انسان کا، سر پر دو سینگ اور منھ کے باہر اوپر نیچے چار دانت نکلے ہوتے ہیں۔ دیو اکثر پریوں یا حسین عورتوں پر عاشق ہو جاتے ہیں اور انھیں قیدی بنا کر رکھتے ہیں۔ گویا یہ وہی مخلوق ہے جسے سنسکرت اور ہندی ادب میں راکشش (राक्षस) کہا جاتا ہے۔ سنسکرت اور فارسی میں لفظ دیو کے معنوں کے تضاد کا سبب مذہبی اختلافات ہیں جو عہد قبل تاریخ میں ایرانی اور ہندی آریوں میں پیدا ہو گئے تھے، جس کے نتیجے میں ایرانیوں نے ہندی آریوں کے دیوتاؤں کو شیاطین کا درجہ دے دیا اور کثرت پرستی کی جگہ توحید یعنی ایک خدا کی پرستش کی طرف مائل ہو گئے اور اپنے خدا کو آہورا مازدا کہا جس کی آج بھی پارسی پرستش کرتے ہیں۔ (بعد میں قدیم ایرانی مثنویت یعنی دو قوتوں کی پرستش کرنے لگے، جن میں سے نور اور خیر کی قوت کو خدا کہتے ہیں اور تاریکی اور شر کو شیطان، ان کے نام بالترتیب یزداں اور اَہرمن ہیں)

زمانۂ قدیم میں دیوتاؤں کی ایک صفت ان کا سینگ دار ہونا ظاہر کیا جاتا تھا۔ نہ جانے یہ خیال کیسے پیدا ہوا۔ ہو سکتا ہے۔ ہلال یعنی نئے چاند (🌙) کی شکل سے یہ خیال پیدا ہوا ہو جو گائے یا بیل کے سینگوں سے مشابہ ہوتا ہے۔ رگ وید میں، جو ہندوؤں کا قدیم ترین مذہبی صحیفہ ہے، مختلف مقامات پر سوم (چاند) کے سینگوں کا ذکر اور آگ (اگنی) کے شعلوں کو سینگوں سے استعارہ کیا گیا ہے۔ اس طرح قدیم عراق کی مٹی کی مہروں پر دیوتاؤں کے سر پر سینگ دکھائے گئے ہیں۔

زمانۂ قدیم کے بادشاہ جو خود کو آسمانی دیوتاؤں کا ارضی نمائندہ سمجھتے تھے اپنے سر پر بیل کے سینگ لگاتے تھے۔

یونانی ریاست مقدونیہ کے حکمران مینڈھے کے سینگ استعمال کرتے تھے۔ چنانچہ چاندی کے ایک سکے پر جس کا زمانہ ۳۲۱ سے ۲۸۱ سال قبل مسیح کے درمیان ہے، سکندر اعظم کو مینڈھے کے سینگ لگائے دکھایا گیا ہے

غالباً اسی بنا پر اسے ذوالقرنین کا نام دیا گیا، جس کا اسلامی

اور چھنگلیا کے برابر موٹا ہے۔ ایک کتبہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سینگ الزبتھ لو (ELIZABETH LOW)

نامی پچاس سالہ عورت کے سر سے ۱۴ مئی ۱۷۱۶ء کو سر جان آربتھ نوٹ نے کاٹ کر نکالا تھا۔ یہ داہنے کان کے تین انچ اوپر سات سال سے اگ رہا تھا۔ مزید تصدیق کے لیے اس پر ان پانچ گواہوں کے نام بھی لکھے ہیں، جو آپریشن کے وقت موجود تھے۔

اسی طرح انگلستان میں چیسٹر کے نزدیک ایک دوسری عورت مسز میری ڈیوس (MRS. MARY DAVIS) رہا کرتی تھی، جس نے ۷۴ سال کی عمر میں ۱۶۶۸ء میں وفات پائی۔ اسے ۲۸ سال کی عمر میں سر پر بدگوشت کی شکایت ہوئی، جسے لوگوں نے بہت کسا ہوا ہیٹ پہننے کا نتیجہ بتایا۔ اس بدگوشت سے تیس سال کے بعد ایک جوڑا ابھرے ہوئے بل دار سینگوں کا نمودار ہوا، جو مینڈھے کے سینگوں سے مشابہ تھے۔ بعض دستاویزوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عورت نے تین بار اپنے سینگ بدلے۔ شروع میں صرف ایک سینگ تھا۔ جو لمبا اور مرغی کے پیالے کی طرح نازک تھا، دوسرا پہلے سے موٹا تھا۔ اس کے گرنے کا زمانہ برابر نہ تھا۔ پہلا نکلنے کے تین سال بعد گر گیا اور دوسرا چار یا ساڑھے چار سال کا ہو کر گرا۔ تیسری دفعہ دو سینگ اُگے جو گر جانے سے ٹوٹ گئے۔ ایک انگریز لارڈ نے ان میں سے ایک کو حاصل کر کے فرانس کے بادشاہ کو قدرت کے سب سے بڑے عجوبے کے طور پر پیش کیا۔ دوسرا جو پہلے سے بڑا نو انچ لمبا اور گھیر میں دو انچ تھا لاپتہ ہو گیا۔

۱۷۹۱ء میں انگلستان میں ایسی دو عورتیں موجود تھیں جنھیں سینگ کے مرض کی شکایت تھی۔ ان میں سے ایک مسز لانس ڈیل (MRS. LONSDALE) ایک ۵۶ سالہ عورت لنکن شائر میں ہارن کیسل کی رہنے والی تھی۔ اس عورت کے سر کے بائیں جانب کان سے کچھ اوپر ایک رسولی ظاہر ہوئی، جو پانچ سال تک آہستہ آہستہ بڑھتی رہی، یہاں تک کہ مرغی کے انڈے کے برابر ہو گئی۔ پھر وہ پھٹ گئی اور اس سے آہستہ آہستہ سرخ رنگ کے گوشت کا ابھار ظاہر ہوا، جو پہلے مٹر کے دانے کے برابر تھا۔ تقریباً تین مہینے میں وہ موٹا اور لمبا ہو گیا اور اس میں مینڈھے کے سینگ کی طرح خم پڑ گیا لیکن وہ اب بھی نرم تھا۔ بعد میں وہ سینگ کی طرح سخت ہونے لگا اور دو سال تین مہینے میں تقریباً پانچ انچ لمبا ہو گیا۔ اس سے پیدا ہونے والے درد سے بیتاب ہو کر جنون کی حالت میں بے بس عورت نے اسے توڑ ڈالنے کی کوشش کی اگرچہ وہ ٹوٹ گیا، اس کی جڑیں بعد میں نکالی گئیں۔ اس کے بعد اس مقام پر ایک دوسرا سینگ اُگ آیا اور اس کے ساتھ کئی اور بھی سینگ تھے۔

مسز ایلن (MRS. ALLEN) ایک ادھیڑ عمر کی عورت لیسٹر شائر میں رہتی تھی۔ اس عورت کو مشہور ڈاکٹر سر ایورڈ ہوم (SIR EVERARD HOME) نے نومبر ۱۷۹۰ء میں دیکھا تھا۔ اس وقت اس کا سینگ جو پانچ انچ لمبا اور کافی بل کھایا ہوا تھا بظاہر بے ترتیبی سے جمی ہوئی تہوں کا مجموعہ معلوم ہوتا تھا۔ مسز ایلن کو لندن لایا گیا، جہاں عجوبے کے طور پر اس کی نمائش کی گئی جس سے اس کے گاؤں کے لوگ بڑے ناراض ہوئے اور انھوں نے اس کے شوہر کو اسے واپس لانے پر مجبور کر دیا۔

برٹش میوزیم (لندن) میں ایک سینگ ہوا کرتا تھا، جو فریج نامی عورت کے سر سے نکالا گیا تھا۔ یہ بھی پہلے رسولی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ جب ڈاکٹر گرے (DR. GREY) نے اسے دیکھا تھا تو اس کی لمبائی گیارہ انچ اور گھیر ڈیڑھ انچ تھا۔

اس طرح کئی اور مثالیں سینگ والے انسانوں کی موجود ہیں لیکن وہ سب یکساں ہیں اس لیے انھیں نظر انداز کیا جاتا ہے۔

انسانوں کے بعد ان کہانیوں پر آئیے۔ جن میں دیوؤں کا سینگ دار ہونا ظاہر کیا جاتا ہے۔ غالباً سینگ والے دیوؤں کا تصور سینگ والے انسانوں ہی کو دیکھ کر پیدا ہوا ہوگا۔

اس سلسلے میں لفظ دیو کی حقیقت غور طلب ہے، جو سنسکرت میں بھی پایا جاتا ہے اور فارسی میں بھی۔ سنسکرت میں دیو (देव) کے معنی دیوتا کے ہیں۔ جیسے مہادیو۔ اس لفظ کا مادہ دِو (दिव्) ہے، جس کے معنی ہیں "چمکنا" پہلے یہ لفظ اجرام فلکی یعنی چاند سورج، سیاروں اور ستاروں کے لیے استعمال کیا جاتا تھا کیونکہ قدیم آریہ لوگ انھیں کی پرستش کرتے تھے (غالباً ہندی کا لفظ دِیا بمعنی "چراغ" دِو سے نکلا ہے اور عربی الفاظ ضیا، ضو اور ضیوا، اس دو کی مختلف صورتیں ہیں، جن کے معنی ہیں سورج کی روشنی یا محض روشنی، واضح ہو کہ عربی میں ض کا تلفظ دؕ کی طرح کیا جاتا ہے) فارسی میں دیو کے معنی اس کے برعکس ہیں یعنی وہ آدم خور مخلوق جس کا جسم انسان کا، سر پر دو سینگ اور منھ کے باہر اوپر نیچے چار دانت نکلے ہوتے ہیں۔ دیو اکثر پریوں یا حسین عورتوں پر عاشق ہو جاتے ہیں اور انھیں قیدی بنا کر رکھتے ہیں۔ گویا یہ وہی مخلوق ہے جسے سنسکرت اور ہندی ادب میں راکشش (राक्षस) کہا جاتا ہے۔ سنسکرت اور فارسی میں لفظ دیو کے معنوں کے تضاد کا سبب مذہبی اختلافات ہیں جو عہد قبل تاریخ میں ایرانی اور ہندی آریوں میں پیدا ہو گئے تھے، جس کے نتیجے میں ایرانیوں نے ہندی آریوں کے دیوتاؤں کو شیاطین کا درجہ دے دیا اور کثرت پرستی کی جگہ توحید یعنی ایک خدا کی پرستش کی طرف مائل ہو گئے اور اپنے خدا کو آہورا ماژدا کہا جس کی آج بھی پارسی پرستش کرتے ہیں۔ (بعد میں قدیم ایرانی مثنویت یعنی دو قوتوں کی پرستش کرنے لگے، جن میں سے نور اور خیر کی قوت کو خدا کہتے ہیں اور تاریکی اور شر کو شیطان، ان کے نام بالترتیب یزداں اور اہرمن ہیں)

زمانۂ قدیم میں دیوتاؤں کی ایک صفت ان کا سینگ دار ہونا ظاہر کیا جاتا تھا۔ نہ جانے یہ خیال کیسے پیدا ہوا۔ ہو سکتا ہے۔ ہلال یعنی نئے چاند (کی شکل سے یہ خیال پیدا ہوا ہو جو گائے یا بیل کے سینگوں سے مشابہ ہوتا ہے۔ رگ وید میں، جو ہندوؤں کا قدیم ترین مذہبی صحیفہ ہے، مختلف مقامات پر سوم (چاند) کے سینگوں کا ذکر اور آگ (اگنی) کے شعلوں کو سینگوں سے استعارہ کیا گیا ہے۔ اس طرح قدیم عراق کی مٹی کی مہروں پر دیوتاؤں کے سر پر سینگ دکھائے گئے ہیں۔

زمانۂ قدیم کے بادشاہ جو خود کو آسمانی دیوتاؤں کا ارضی نمائندہ سمجھتے تھے اپنے سر پر بیل کے سینگ لگاتے تھے۔ یونانی ریاست مقدونیہ کے حکمران مینڈھے کے سینگ استعمال کرتے تھے۔ چنانچہ چاندی کے ایک سکہ پر جس کا زمانہ ۳۲۱ سے ۲۸۱ سال قبل مسیح کے درمیان ہے، اسکندر اعظم کو مینڈھے کے سینگ لگائے دکھایا گیا ہے۔

غالباً اسی بنا پر اسے ذوالقرنین کا نام دیا گیا، جس کا اسلامی

روایات میں ذکر ہے۔ لفظ ذوالقرنین کے لغوی معنی ہیں۔ "دو سینگوں والا"۔

علامہ نیاز فتحپوری نے اپنی کتاب "من و یزداں" میں (جلد دوم صفحات ۲۱۸-۲۰۱) بڑی تفصیل کے ساتھ اس بادشاہ کے روایتی حالات لکھے ہیں اور یہ دکھانے کے بعد کہ جنوبی عرب ایران اور چین کے مختلف بادشاہ اس لقب کے دعوے دار ہو سکتے ہیں یقین۔ اصل ذوالقرنین عبارت ہے ایران کے بادشاہ دارا یوش اعظم (DARIUS THE GREAT) سے میرے خیال میں یہ تاویں سراسر غلط ہے خود سکندر کا نام اور مذکورہ سکہ اس دعوے کی تردید کرتا ہے۔

عربی میں لفظ قرن کے تین معنی ہیں (۱) سینگ (۲) گیسو (۳) طویل مدت۔ گویا سکندر ذوالقرنین، سکندر نامی وہ بادشاہ تھا (۱) جس کے سر پر دو سینگ تھے۔ (۲) جس کی پیشانی سے دو خوبصورت زلفیں لٹکتی تھیں (۳) اس نے دو صدیوں تک یا طویل عرصے تک حکومت کی۔ ان میں سے پہلا خیال صحیح ہے اور باقی تاویلیں ہیں۔ لفظ قرنین قرن کی جمع ہے جس کے معنی ہیں "سینگ" یہی لفظ لاطینی زبان میں کارنو (CORNU) ہے اور وہاں بھی اس کے یہی معنی ہیں انگریزی میں کارن (CORN) گٹھوں یا اس سخت کھال کو کہتے ہیں جو مسلسل رگڑ یا دباؤ کی وجہ سے پاؤں کی انگلیوں میں پیدا ہو جاتی ہے اور تکلیف دیتی ہے۔

سر پر سینگ لگانے کے رواج کا پتہ قدیم کے زمانے سے چلتا ہے۔ اس کا ثبوت یورپ کے بعض غاروں میں بنی ہوئی تصویریں ہیں۔ اس دور کے پرمیت جانوروں کے شکار کے سلسلے میں ٹونے ٹوٹکے سے کام لیتے تھے اور اس سلسلے میں جانوروں کی کھال اوڑھتے اور سر پر ان کے سینگ لگاتے تھے۔ بسا اوقات شکاری جانوروں کا بھیس بنا کر ان کے درمیان پہنچ جاتے تھے اور قریب سے شکار کر لیتے تھے۔

ہندستان میں بھی سر پر سینگ لگانے کا رواج رہا ہے۔ اس کا قدیم ترین ثبوت وادیٔ سندھ کی ایک مہر ہے۔ جس میں ایک دیوتا (غالباً شیوجی) کو سینگوں دار تاج پہنے دکھایا گیا ہے۔ بعض گونڈ قبائل آج بھی شادی اور دوسرے خوشی کے موقع پر سروں پر بیلوں کے سینگ لگا کر ناچتے ہیں ان کی تصویریں ڈاکٹر ویریر ایلون (VERRIER ELWIN) کی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

★

رضا امروہوی۔

بی۔ ٹی۔ ۲۴ جی پوائنٹ نئی دہلی

غزل

حیرت سے تک رہا ہے ہر اک آئینہ مجھے
دانش ورو! بتاؤ یہ کیا ہو گیا مجھے

احساس کرب اور بکھر کر جواں ہوا
جب وقت نے صلیب پہ لٹکا دیا مجھے

میں زندگی کی بھیڑ میں گم ہو کے رہ گیا
خلوت میں پھر رہا ہے کوئی ڈھونڈتا مجھے

اپنی نظر سے لوگ تجھے دیکھتے رہے
تیری نظر سے کاش کوئی دیکھتا مجھے

میں سو گیا ہوں صبح بنارس کی گود میں
شام اودھ خدا کے لیے بھول جا مجھے

پرچھائیوں نے ساتھ نہ چھوڑا تمام عمر
تو نے بنا کے چھوڑ دیا آئینہ مجھے

آؤں گا پھر کبھی میں تری خانقاہ میں
لیکن بلا رہا ہے ابھی میکدہ مجھے

میں اپنے آپ ہی سے ابھی اجنبی سا ہوں
سمجھے مت کوئی رند کوئی پارسا مجھے

سمجھوتہ بھی ضروری ہے حالات سے رضاؔ
میں نے خوشی سمجھ لیا جو غم ملا مجھے

اکرم فاروقی
سنٹرل اسکول فتح گڑھ

تم کو میرا چارہ گر کہتے ہیں لوگ
بات کتنی معتبر کہتے ہیں لوگ

آج بھی منزل سے اتنی دور ہوں
اب بھی صدیوں کا سفر کہتے ہیں لوگ

ان کے رخ پر اس طرح بکھری ہے زلف
مل گئے شام و سحر کہتے ہیں لوگ

میری غزلوں کا تخیل آپ ہیں
مان بھی جاؤ اگر کہتے ہیں لوگ

شب کے ہونٹوں پر تبسم کی جھلک
اشکِ انجم کو سحر کہتے ہیں لوگ

میری بربادی کا باعث آپ ہیں
میں نہیں کہتا مگر کہتے ہیں لوگ

جس کے خوابوں کی ہوئی اکرم شکست
اس کو دل کا ظفر کہتے ہیں لوگ

شاہد میر
لیکچرر گورنمنٹ کالج
بانسواڑہ (راجستھان)

رستہ نئے سفر کا ہے دشوار جا بہ جا
دریا قدم قدم ہیں تو کوہسار جا بہ جا

شبنم کے اشک سبزہ و گل پر بکھر گئے
بھیگا ہوا ہے صبح کا "اخبار" جا بہ جا

پہچان لیجیے مرے زخموں کو دیکھ کر
مجھ کو ملے ہیں مونس و غم خوار جا بہ جا

شاید کہ اب ہے وادیٔ سرو سمن قریب
آتے ہیں راستے میں نظر خار جا بہ جا

صحرا کی سمت جب بھی بڑھے ہیں مرے قدم
حائل ہوا ہے سایۂ دیوار جا بہ جا

باہر حصارِ شب سے نکل کر تو دیکھیے
بکھرے ہوئے ہیں صبح کے آثار جا بہ جا

آزر الہ آبادی
۱۰۰۔ کلے اسکوائر
لکھنؤ

دھوپ کی زحمت کون اٹھائے
لوگ چلے ہیں سائے سائے
بہرِ عیادت بھی تو نہ آئے
ایک سے نکلے اپنے پرائے
بات ہے کیا جل جائے نشیمن
اور گلوں تک آنچ نہ آئے
دل تھا ناداں عزقِ محبت
مشکل سے ہم سمجھا پائے
ساتھی ہیں سب وقت کے ساتھی
وقت پہ کوئی کام نہ آئے
محوِ ترقی ہے یوں دنیا
شام کے جیسے بڑھتے سائے
ہم پہ لگی ہے ساری تہمت
ان سے بھی کچھ پوچھا جائے
حسن کی فطرت بادِ مخالف
خود سے چھیڑے ہاتھ نہ آئے

لیلیٰ لکھنوی
کاشانۂ ذکیہ، ۲۲ گولہ گنج
لکھنؤ

(افسانہ)

مسعود صاحب کی ڈبڈبائی ہوئی مغموم آنکھیں، زندگی کے آلام زدہ سفر کی گرد سے نڈھال چہرہ اس بات کی گواہی دیتا تھا کہ وہ ایک ٹوٹے ہوئے شکست خوردہ انسان ہیں۔ قسمت نے ان کے ساتھ جو سفاکانہ سلوک کیا تھا اس کی علامتیں ان کے چہرے پر نمایاں تھیں۔ ضعیفی میں آنسوؤں کی شدت میں کمی آجاتی ہے۔ لیکن دل ہر وقت روتا رہتا ہے۔ زندگی بھر حالات سے جنگ کرنے والے، محض دوسروں کے لیے زندہ رہنے والے کیا زندوں میں شمار کیے جا سکتے ہیں؛ وہ تو محض زندہ رہنے کا الزام لیے زندہ تھے!

یہ کیسا عذاب الٰہی تھا کہ بوڑھا، ضعیف اور ناتواں باپ اپنے بیٹوں کی میت کو کاندھا دینے کے لیے بیٹھا رہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے تین بیٹے یکے بعد دیگرے اس دنیا سے اٹھ جائیں اور اسے دوسروں کے رحم و کرم پر اتنی بڑی دنیا میں تنہا سسکنے کے لیے چھوڑ دیں۔ خدا کا یہ کیسا انصاف تھا؟ کیسا روح فرسا امتحان تھا؟

انھوں نے تو اپنی زندگی میں بے پناہ نیکیاں کی تھیں۔ دوسروں کے غم کو اپنا غم سمجھا تھا۔ کبھی کسی کو تکلیف یا اذیت نہیں پہنچائی۔ ساری عمر خدمت خلق اور عبادت میں گزاری تھی۔ پھر یہ کس جرم کی سزا تھی؟ یہ کون سی آزمائش تھی؟ اس عمر میں جبکہ انھیں خود آرام اور سکون کی ضرورت تھی وہ راتوں کو سوتے سوتے اٹھ کر برہنہ پا گھر کے گوشے گوشے میں اپنے بیٹوں کا نام لے کر پکارتے پھرتے تھے اور پھر نڈھال ہو کر بچوں کی طرح سسکنے لگتے۔ لیکن رات کے مہیب اندھیروں میں انھیں تسلی دینے والا کوئی نہ ہوتا —!

گھر میں ان کے بڑے بیٹے سمیع کی بیوہ زبیدہ اور دو بچے شعیب اور رباب تھے جو یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھے۔ باوجود محبت اور شفقت کے مسعود صاحب اور ان کے درمیان عمر، نسلوں اور مذاق کا فاصلہ تھا۔ شعیب اور رباب عمر کی اس منزل میں تھے جس میں انسان کو زندگی کے ہر دکھ درد کو سہنے کا حوصلہ ہوتا ہے، لیکن ایک ضعیف شکست خوردہ انسان غموں سے نڈھال ہو کر بکھر جاتا ہے۔ گو کہ زبیدہ مسعود صاحب کی بے حد عزت اور احترام کرتی تھیں۔ شعیب اور رباب ان سے محبت کرتے تھے مگر اپنے اپنے انداز میں۔ جب تک وہ چھوٹے تھے ہر لمحہ دادا سے چمٹے رہتے۔ ہر لحظہ نت نئی شرارتیں کرتے رہتے لیکن دادا نے کبھی ان پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ یہ بچے تو ان کے مرحوم بیٹے سمیع کی نشانی تھے۔

لیکن جب بچے سمجھدار ہوئے، سن تمیز کو پہنچے تو وہ دادا کے سائے سے دور بھاگنے لگے۔ ان کے معیار کے لحاظ سے دادا بے حد دقیانوسی، غیر تعلیم یافتہ اور غیر مہذب تھے۔ کیونکہ وہ اپنے لباس کی طرف سے بھی لاپرواہ اور بیگانہ رہتے تھے۔ کئی کئی دن گزر جاتے اور وہ کثیف میلے کپڑے پہنے رہتے۔ جنھیں دیکھ کر ان کی شان کو ٹھیس لگتی تھی۔ خاص کر جب ان کے فیشن ایبل الٹرا ماڈرن احباب ملنے کے لیے آتے اور دادا برآمدے میں ٹہلتے نظر آتے تو انھیں بے انتہا ندامت ہوتی تھی۔ کبھی کبھی تو یہ بتانے سے بھی گریز کرتے تھے کہ یہ ہمارے دادا ہیں۔ ان کے دیکھتے ہی دیکھتے اب وہ اس قدر کمزور اور بوڑھے بھی ہو گئے تھے کہ چلنے میں ان کی ٹانگیں کانپتی تھیں۔ ان کی آنکھیں ہر وقت نم رہتی تھیں جیسے وہ سوتے اور جاگتے ہر وقت روتے رہتے ہیں۔ ان کا زرد کمھلایا ہوا چہرہ اور ان پر پڑی ہوئی جھریاں دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا گویا یہ چہرہ کسی مردہ انسان کا ہے۔ دادا کے وجود کو اس خوبصورت سے گھر میں ایک بوجھ سمجھا جانے لگا تھا جس کا کوئی مصرف نہیں تھا۔ دادا چاہتے تھے کہ بچے ان کے پاس زیادہ سے زیادہ وقت گزاریں۔ ان کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کریں لیکن بچے تھے کہ دادا سے کوسوں دور بھاگتے تھے۔ دن دن بھر وہ ان کی صورت دیکھنے اور آواز سننے کو ترستے رہتے، ان کے انتظار

میں وہ بےچین اور مضطرب ٹہلتے رہتے۔ یونیورسٹی سے ان کے آنے میں دیر ہو جاتی تو خوف و اندیشے انھیں گھیر لیتے اور وہ دیوانوں کی طرح گیٹ کو تکتے رہتے۔ شعیب اور رباب آتے بھی تو ان کی نگاہ سے بچتا کر چپکے سے کھانے کے کمرے میں گھس جاتے کہ کہیں دادا انھیں دیکھ نہ لیں ورنہ انھیں دادا کے پاس کچھ دیر مجبوراً بیٹھنا پڑ جائے گا اور وہ بےکیف اور تھکا دینے والی گفتگو شروع کر دیں گے۔ وہی گھسی پٹی نصیحتیں، فضول و فرسودہ سوالات جن کو سنتے سنتے ان کے کان پک گئے تھے۔ شعیب جھنجلا جاتا "کیا زندگی بھر آپ مجھ کو شیرخوار بچہ ہی سمجھتے رہیں گے؟ کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں چوڑیاں پہن کر گھر میں بیٹھ جاؤں؟" رباب منھ بنا کر کہتی "آپ جس زمانے کی باتیں کرتے ہیں وہ آپ کا زمانہ تھا ہمارا نہیں۔ ہمیں وقت کے ساتھ چلنا ہے۔ آپ کا دور اب ختم ہو چکا ہے۔"

دادا کا غمگین چہرہ اور بھی اداس ہو جاتا ــــ وہ ایک گہری سرد آہ بھر کر کہتے "ہاں وہ زمانہ ختم ہو گیا اور اس کے ساتھ وہ تہذیب و تمدن اور اعلا قدریں بھی۔" شعیب بیزاری سے کہتا۔

"اف آپ پرانی قدروں کو کلیجے سے لگائے بیٹھے ہیں جبکہ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے۔ سائنس نے کیسی حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ کیا کبھی آپ نے اپنے زمانے میں سوچا تھا کہ ایک دن انسان چاند کے اندر پہنچ کر وہاں کی تصویریں لائے گا؟"

دادا اسی اداس لہجے میں جواب دیتے:

"ہاں اس ترقی کے دور میں انسان چاند پر تو پہنچ گیا۔ لیکن زمین پر انسان آج بھی غربت، افلاس اور بھوک کا شکار ہے" اور شعیب کا پیمانۂ صبر لبریز ہو جاتا "اف دادا آپ کبھی نہیں سمجھیے گا کبھی نہیں" وہ انھیں تنہا چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلا جاتا اور دادا کی بےچینی میں اور اضافہ ہو جاتا۔ انھیں کبھی کبھی محسوس بھی ہوتا کہ وہ ہر ایک کے لیے بوجھ بن گئے ہیں اور اب زندگی کی کوئی شے ان کے لیے نہیں ہے۔ کوئی ایسا نہیں تھا جو ان کے بے پایاں خلوص و محبت اور ایثار کی قدر کرتا ان کی بات کا احترام کرتا ـــ لیکن اب اس عمر ضعیفی اور ناتوانی کے عالم میں وہ کس کے پاس جاتے؟ ویسے تو خدا نے انھیں سبھی کچھ دیا تھا عزت مرتبہ، اور تین بیٹے ـــ مگر وہ تو انھیں تڑپتا اور سسکتا چھوڑ کر چل بسے تھے اور اب وہ پوتے، پوتی اور بہو کے رحم و کرم پر زندگی کے دن گزار رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا گویا زندگی ان سے جنم جنم کے بدلے لے رہی ہو اور وہ ایک تماشائی کی حیثیت سے بیٹھے سب کچھ دیکھ اور سن رہے ہوں ــــ گھر میں آئے دن پارٹیاں ہوتی تھیں۔ شعیب اور رباب کے دوست آتے۔ ٹیپ ریکارڈ پر میوزک پوری آواز کے ساتھ بجتا۔ سارا گھر موسیقی اور قہقہوں سے گونج اٹھتا تو دادا کے زخموں کے ٹانکے ایک ایک کر کے ٹوٹ جاتے اور ان میں سے تازہ تازہ لہو رسنے لگتا۔ وہ دیکھتے شعیب کے دوستوں کے ساتھ رباب ناچ رہی ہے۔ اس کے جسم کا ایک ایک انگ بڑے ناز و انداز کے ساتھ تھرک رہا ہے۔

ان کا خون کھولنے لگتا اور چہرہ غصے سے سرخ ہو جاتا وہ لرزتے قدموں سے بہو کے کمرے میں جاتے اور گرجنے لگتے۔

"زبیدہ تم نے بچوں کو بہت آزادی دے رکھی ہے۔ رباب کا اس طرح جوان لڑکوں کے ساتھ ملنا جلنا اور بے حیائی سے ناچنا مجھے گوارا نہیں۔ جب تک میں زندہ ہوں اس گھر میں بے شرمی اور خرافات کے مظاہرے نہیں ہوں گے۔ آج کی نسل نے مغرب سے ان کی صرف برائیاں، بے حیائی اور آزادی کا بیجا استعمال سیکھا ہے۔ کیا یہی ہماری تہذیب ہے کہ ہمارے گھر کی کنواری بیٹیاں نیم عریاں لباس میں مردوں کے سامنے ناچیں، تھرکیں اور اپنے جسم کی نمائش کریں؟ میں مر جاؤں تو تم لوگ دل کھول کر یہ جشن منانا لیکن اپنے جیتے جی میں یہ نہیں ہونے دوں گا۔ تم لوگ میری نہیں سنو گے تو میں یہ گھر چھوڑ دوں گا۔"

زبیدہ کی زبان گنگ ہو گئی وہ ابا کو کس طرح سمجھاتی کہ ابا جان کو آپ ابھی تک بچہ سمجھ رہے ہیں اب وہ بچے نہیں ہیں بلکہ وہ قانوناً بالغ ہیں اور آج کے زمانے کی دین ہیں۔ ان کو سو سال پہلے کی دنیا میں لے جانا خیال خام ہے۔ پھر بھی ان کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے انھوں نے شعیب کو بلا کر دبی زبان سے

دادا کی ناراضگی کا اظہار کیا، تو شعیب نے برہمی سے کہا "صبح سے شام تک دادا ہمیں نصیحتیں کرتے رہتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ ہم عقل کا استعمال نہ کریں اور اندھی تقلید کرتے رہیں۔ بوڑھے اور مردہ دل انسانوں کی ذہنیت بھی بیمار ہوتی ہے۔ یہ بیمار، معذور اور اپاہج لوگ زندگی کی خوشیوں میں دیوار بن کر حائل ہو جاتے ہیں۔ آپ دادا سے صاف صاف کہہ دیجئے کہ وہ ہمارے معاملات میں خدا کے لیے مداخلت نہ کیا کریں اور انھیں اپنے کمرے میں خاموش بیٹھے رہنا چاہیئے اور اپنے خاتمہ بالخیر کا انتظار کرنا چاہیے۔

"شعیب للّٰہ ایسے الفاظ اپنے منھ سے نہ نکالو"

زبیدہ چیخ اٹھی — لیکن دادا نے شعیب کی گفتگو سن لی اور پھر اس دن کے بعد سے کسی نے دادا کے لبوں پر مہرِ خاموشی لگا دی، کسی نے انھیں کمرے سے باہر نکلتے نہیں دیکھا۔ اگر شعیب اور رباب خود سے ان کے کمرے میں آ جاتے تو وہ بڑی یاس و حسرت سے انھیں بھیگی بھیگی آنکھوں سے تکتے رہتے۔ ان کے کسی سوال پر صرف ہاں یا نہیں میں جواب دے کر چپ ہو جاتے۔ ایک دن دادا بے حال ہو گئے۔ ان کے سینے میں اس قیامت کا درد اٹھا کہ سارا جسم پسینے سے شرابور ہو گیا سانس رکنے لگی۔ آج دادا کی بے چینی دیکھ کر شعیب اور رباب کا بھی دل بھر آیا۔ سارا گھر ان کے گرد جمع ہو گیا، ہر ایک کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ دادا نے جب آنکھیں کھولیں تو بے حد محبت اور شفقت بھری نگاہوں سے بچوں کو دیکھا۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے انھیں اپنے سینے سے لگایا۔ آج ان کے آنسوؤں کی زبان گھر کا ہر فرد سمجھ رہا تھا۔ آج سارے گلے شکوے جو ان کے درمیان حائل ہو گئے تھے آن واحد میں مٹ گئے تھے اور ان کی جگہ محبت اور بیکراں خلوص نے لے لی تھی۔ لیکن اب اگر دادا خدا سے حیات کے چند لمحے مانگتے تو انھیں نہ ملتے۔ کیونکہ اب اس جہان سے ان کے رخصت ہونے کا وقت آ گیا تھا جس کا انھیں عرصۂ دراز سے انتظار تھا۔ وہ نمازیں رو رو کر لرزتے ہاتھوں کو بلند کر کے اسی لمحے کی دعائیں مانگتے تھے اور آج ان کی دعائیں قبول ہو گئی تھیں۔ آج برسوں بعد ان کے ویران اور افسردہ چہرے پر خوشی اور سکون کی لہریں رقص کر رہی تھیں۔ ان کے ہاتھوں کی گرفت جذبات کی فراوانی سے سخت ہو گئی پھر وہ آہستہ سے بمشکل رک رک کر بولے "شعیب میرے بیٹے! آج سے تم اس گھر کے نگہبان ہو۔ اپنے خاندان کی آن اور وقار کو ہمیشہ برقرار رکھنا۔ کل تک میں اس خاندان کی عزّت کی نگرانی کرتا رہا تھا اور اب یہ ذمہ داری میں تمھیں سونپ رہا ہوں اس کی حفاظت کرنا — خداوند کریم تمھیں ہمّت دے اور تمھاری مدد کرے"

شعیب نے آج زندگی میں پہلی بار محسوس کیا کہ دادا نے اپنی ساری زندگی ان سب کی بہبود اور بہتری کے لیے گزار دی۔ ان کا ہر فعل اس بات کا گواہ تھا کہ وہ محض انہی کے لیے زندہ رہے۔ ضعیفی اور خستگی کے عالم میں بھی وہ اپنے فرض اور ذمہ داریوں سے غافل نہیں ہوئے۔ شعیب نے فرطِ محبت سے ان کے چہرے پر اپنا چہرہ رکھ دیا جس طرح کبھی بچپن میں کھیلتے کھیلتے وہ دوڑ کر دادا سے لپٹ جایا کرتا تھا۔ شاید آج اس کے بچپن کا زمانہ کچھ لمحوں کے لیے لوٹ آیا تھا۔ وہ بلک بلک کر رو دیا "دادا ہمیں تنہا چھوڑ کے ہم آپ کی محبت کے بغیر کیسے رہیں گے؟" لیکن انھوں نے اس کے جواب میں کچھ نہیں کہا صرف اسے دیکھتے رہے جیسے انھیں جو کچھ کہنا تھا وہ انھوں نے کہہ دیا ہو — اب سوائے دعاؤں کے ان کے پاس اور کچھ باقی نہیں بچا تھا۔ اس سے قبل کہ ڈاکٹر آتا۔ ایک بار پھر ان کے سینے میں شدت کا درد اٹھا اور انھوں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ مرنے سے قبل جو فرض اور ذمہ داری انھوں نے شعیب کو سونپی تھی وہ اس سے روشناس ہو گیا تھا۔

اس کا سر اس عظیم ہستی کے روبرو جھک گیا جس نے آخری دم تک اپنے فرض کو نبھایا تھا اور اب شعیب ان کی جگہ اپنے خاندان کی لاج، عزّت اور وقار کا نگہبان تھا۔ دادا مرحوم کے آخری الفاظ اس کے کانوں میں اب بھی گونجتے رہتے ہیں۔

فضل حسنین
۱۳۳ سلطان پور بھاوا
الہ آباد

(مزاحیہ)

خواہ مخواہ کے ہمدرد

بیمار ہونا تو خیر مصیبت ہے ہی لیکن ایسی حالت میں عیادت کے لیے لوگوں کا آنا اس سے کہیں زیادہ پریشانی کی بات ہے اس کا تجربہ ہمیں اس بار کی بیماری میں ہوا۔ اس لیے اب ہم نے طے کر لیا ہے کہ اگر اب کبھی بیمار ہونے کا اتفاق ہوا تو کسی ایسے جنگل میں جا کر پناہ لیں گے جہاں کوئی ہماری عیادت کے لیے نہ آ سکے کہیں آپ ہمیں آدم بیزار قسم کا انسان تو نہیں تصور کر رہے ہیں؟ تو پہلے ہماری پوری بات سن لیجئے پھر آپ خود ہی سمجھ جائیں گے کہ ہم یوں ہی خواہ مخواہ نہیں بڑبڑا رہے ہیں۔

معمولی بخار کو تو ہم زیادہ لفٹ دیتے نہیں۔ آیا دو ایک دن رہا، اپنا چلا گیا لیکن اس بار کمبخت ٹائیفائڈ نے ایسا دبوچا کہ ہماری ساری بہادری دھری کی دھری رہ گئی اور ہم پورے اکیس دن بستر پر پڑے رہے۔ یوں چھوٹی موٹی مطلب دو ایک دن والی بیماری کی تو ہم کسی کو ہوا نہیں لگنے دیتے لیکن جب ہم ہفتوں لوگوں کی نظروں سے غائب رہے تو ہمارے خیر خواہوں کو تشویش ہوئی اور وہ ہماری تلاش میں نکل کھڑے ہوئے پہلے تو لوگ ہمیں پانے میں اس لیے ناکام رہے کہ ہم زیادہ تر اوقات میں باہر سے تالا بند کرائے رہتے تھے لیکن ایک دن باہر کی دنیا کا نظارہ کرنے کی غرض سے ہم نے اپنے بارجے سے جھانکا ہی تھا کہ ہماری چوری پکڑی گئی اور پھر نہ پوچھئے۔ خیر خواہوں کا جو تانتا بندھا تو وہ آج ختم ہوا نہ کل اور ہر آدمی کو فرداً فرداً ایک ہی بات بتانا کتنا مشکل کام ہے۔ کوئی ہمارے دل سے پوچھے۔ خیال آیا کیوں نہ اپنی بیماری کی تفصیل ٹیپ کرائیں اور اسے ہر وقت بجاتے رہیں۔ لیکن پھر سوچا اس سے کوئی فائدہ نہ ہوگا کیونکہ ٹیپ ہمیں خود بھی سننا پڑے گا اور بولنے سے بھی ہم بچ نہ پائیں گے۔ کیونکہ ٹیپ ریکارڈ لوگوں کے سوالوں کا جواب تو دے نہ سکے گا۔ اس موقع پر اگر ہماری بیگم ہوتیں تو شاید یہ فرض وہی انجام دے دیتیں لیکن انھیں تو ہم نے بیمار ہوتے ہی ان کے میکے بھیج دیا تھا کیونکہ پہلے تو بیگم ہماری تھوڑی بہت خدمت کر دیا کرتی تھیں لیکن پچھلے دنوں انھیں ایک حادثہ پیش آ گیا یعنی ہم صاحب اولاد ہو گئے اور تب سے ہمیں خود ہی بیگم کی زیادہ سے زیادہ خدمت کرنی پڑی لیکن ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں جبکہ ہم بستر پر تھے ان کی خدمت کیسے کر پاتے اور چونکہ یہ بیگم کا اور ہمارا ابھی پہلا بچہ تھا اس لیے بیگم نے اسے دلار میں اتنا چوپٹ کر دیا تھا کہ وہ ہر وقت گود میں رہنے کا عادی ہو گیا تھا۔ اسے گود سے مطلب تھا خواہ بیگم کی گود ہو یا ہماری اب ایسی حالت میں جبکہ ہم خود ہی محتاج ہو رہے تھے ہمارے لیے بچے کو ٹہلانا کیسے ممکن تھا۔ چنانچہ وہ احتجاج کے طور پر ہر وقت رینگتا رہتا اور پھر مجبوراً ہمیں بیگم سے درخواست کرنی ہی پڑی کہ وہ کچھ دنوں کے لیے میکے چلی جائیں اور اس میں شک نہیں کہ انھوں نے بڑی خندہ پیشانی سے ہماری درخواست منظور بھی کر لی اور اسی وقت بوریا بستر باندھنا شروع کر دیا۔ (بیگم واقعی ہمیں بہت چاہتی ہیں) اس طرح سے ہم ہر وقت کے ایک مستقل عذاب سے بچ گئے۔

ہمارا نوکر بیچارہ بھی شاید ہماری تکلیف نہ دیکھ سکا اور ہمارے بیمار پڑتے ہی بیچارہ خود بھی بیمار ہو کر گھر چلا گیا۔ ہمارے

کچھ وفادار دوست تھے جو ہماری تیمارداری کر سکتے تھے لیکن ان خواہ مخواہ کے ہمدردوں نے تو ہماری زندگی تلخ کر دی تھی ہمارا مکان پہلی منزل پر ہے یعنی دروازہ کھولنے کے لیے پورے سترہ زینے طے کرنے پڑتے ہیں۔ اس لیے دن میں تو ہم دروازہ کھلا ہی رکھتے لیکن ہمارے کچھ ہمدرد نو دس بجے رات کو بھی نازل ہونے سے نہ چوکتے۔ دروازے پر دستک ہوتی اور ہمارا دل دھک سے رہ جاتا۔ کچھ دیر سوچتے کہ شاید آنے والا جواب نہ پا کر لوٹ جائے۔ لیکن مجال تھی کہ وہ بغیر ہماری خیریت دریافت کیے واپس چلا جاتا۔ اب آپ خود سوچیے کہ اتنی رات کو پندرہ بیس دن کا بھوکا پیاسا انسان سترہ زینے طے کر کے نیچے دروازہ کھولنے جائے اور آنے والے خیر خواہ کو اوپر لائے۔ اس کی بکواس برداشت کرے پھر اسے "سی آف" کرنے یعنی دروازہ بند کرنے جائے۔ کبھی کبھی کوئی ہمدرد زیادہ جوش میں ہوتا تو دو چار موسمی لے آتا جس سے ہمارا اتنا خون بھی نہ بن پاتا جتنا کہ زینوں سے اترنے چڑھنے میں جل جاتا تھا اور صاحب یہ ہمدرد اتنی قابلیت جھاڑتے کہ حکیم لقمان بھی مات کھا جاتے اور لگتا جیسے یہ صاحب ٹائیفائڈ پر اتھارٹی ہیں۔ ایک صاحب تو تقریباً آدھے گھنٹے تک یرقان (پیلیا) پر تقریر کرتے رہے اور جب ہم نے عرض کیا کہ ہمیں یرقان نہیں ٹائیفائڈ ہے۔ تو انھوں نے جھٹ اپنی تقریر کا رخ ٹائیفائڈ کی طرف موڑ دیا اور ہماری جان نکل گئی کہ اب آدھے گھنٹے دوسری تقریر بھی برداشت کرنا پڑے گی۔ دشواری یہ تھی کہ وہ بولتے وقت سانس لینے کے بھی قائل نہ تھے اور ماشاء اللہ ان کی سانس بھی کافی تندرست تھی۔ ممکن ہے اپنے زمانے میں کبڈی کے چیمپین رہے ہوں چنانچہ انھیں ٹوکنے کے لیے کافی انتظار کرنا پڑتا اور اس وقت تک وہ کافی بھیجا چاٹ جاتے تھے۔ کچھ لوگ پرہیز کے سلسلے میں اپنی معلومات کا سکہ جمانے کی کوشش کرتے

اس پر ہم عرض کرتے کہ جب ہم موسمی کے علاوہ اور کچھ نہیں کھاتے پیتے تو پرہیز کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔ اس پر ایک صاحب نے فرمایا کہ صاحب آج کل موسمی بھی تو کئی قسم کی آتی ہے۔ وہ اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ ہم نے پوری جرأت سے کام لیتے ہوئے ان سے خاموش ہو جانے کی گزارش کر دی لیکن صاحب مجال تھی کہ وہ اپنی زبان بند کر لیتے اب وہ ہماری کمزوری پر تبصرہ کرنے لگے کہ ہم بالکل پیلے پڑ گئے ہیں۔ اس پر ہمیں بہت غصہ آیا۔ جی چاہا کہ کہہ دیں کہ ہم ہمیشہ کے گورے چٹے ہیں، تمھاری طرح کلوٹے تھوڑی ہی ہیں لیکن پھر دل پر جبر کر کے خاموش ہو رہے کہ بات بڑھانے سے کیا فائدہ۔ اور پھر ایک دن عاجز آ کر ہم اسپتال میں بھرتی ہو گئے۔

اب اخبار والوں کو بھی اپنی ہمدردی جتانے کا موقع مل گیا اور انھوں نے اپنا برادرانہ حق ادا کرتے ہوئے اس خبر کو کچھ زیادہ ہی بڑھا چڑھا کر چھاپ دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں بھی ہمارے ہمدردوں کا تانتا بندھ گیا اور ہمیں بے تحاشہ ذوق کا یہ شعر یاد آ گیا ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

مجبوراً ہمیں اپنے کمرے کے باہر "مریض سے ملنا سخت منع ہے" کی تختی لگوانا پڑی۔ جس کا خاطر خواہ نتیجہ بھی نکلا

اب خدا کے فضل سے ہم مکمل طور پر صحت یاب ہو چکے ہیں لیکن اب یہ فکر دامن گیر ہے کہ اسپتال سے چھوٹنے کے بعد خیر خواہوں کا جو سیلاب آئے گا اس سے ہم خود کو کہاں تک محفوظ رکھ سکیں گے۔ اس لیے دل چاہتا ہے کہ ہم اپنی بقیہ زندگی اسپتال کے اسی کمرے میں گزار دیں اور کمرے کے باہر تختی بھی بدستور لگی رہنے دیں۔ لیکن صاحب ایسی قسمت کہاں اسپتال بہرحال اسپتال ہے کوئی یتیم خانہ تو ہے نہیں

★

اُتّر پردیش شاہراہِ ترقی پر

کام کے عوض اناج اسکیمیں

حکومت ہند کی "کام کے عوض اناج اسکیم کے تحت گیہوں کے زائد ذخیرہ کا استعمال کر کے دیہی علاقوں میں روزگار کے مزید مواقع فراہم کرنے کے سلسلے میں گذشتہ سال سے ایک وسیع اسکیم بروئے کار لائی جا رہی ہے۔ ریاست میں مذکورہ اسکیم تعمیرات عامہ، آبپاشی، پنچایتی راج، اور جنگلات کے محکمے نیز انجینئرنگ سروس اور منڈی پریشدیں بروئے کار لا رہی ہیں۔

حکومت ہند کے فراہم کردہ اناج کا استعمال ریاستی حکومت کی زیر عمل منصوبہ جاتی اور غیر منصوبہ جاتی اسکیموں کی تکمیل کے سلسلے میں کیا جائے گا۔ ان اسکیموں کے تحت کام کرنے والے مزدوروں کو بطور اجرت جزوی یا کلی طور پر اناج دیا جائے گا یہ امداد، آبپاشی کی چھوٹی، درمیانہ اور بڑی اسکیموں، سیلاب کی روک تھام، باندھ، مٹی کے کام اور پانی کے تحفظ، شجرکاری اور سڑکوں کے تحفظ سے متعلق اسکیموں پر بھی دی جاتی ہے۔

"کام کے عوض اناج" اسکیم ریاست میں زور شور سے جاری ہے۔ دیہی علاقوں کی تیز رفتار ترقی کے سلسلے میں اس اسکیم سے عوام میں ایک نیا اعتماد پیدا ہوا ہے۔ اترپردیش نے اس کا بھرپور فائدہ اٹھا کر غریب باشندوں کو روزگار فراہم کیا اور دور افتادہ مواضعات کو خاص سڑکوں سے مربوط کرنے کے لیے سڑکوں کی تعمیر کا کام شروع کیا گیا۔

ریاستی محکمۂ تعمیرات عامہ کو مزدوروں میں اجرت کے طور پر تقسیم کرنے کے لیے گذشتہ سال ۱،۱۵۰ میٹرک ٹن اناج مفت حاصل ہوا۔ یہ اناج مرکزی حکومت سے مفت حاصل ہوا تھا۔ جس سے محکمے کو تقریباً دو کروڑ روپیہ کی بچت ہوئی۔ اس بچی ہوئی رقم کا استعمال کرنے کے لیے محکمہ نے دو اسکیمیں بنائیں۔

اناج اسکیم نمبر ۲ کے تحت ۶۰۰ (چھ سو) کیلومیٹر لمبے راستوں پر جہاں زمین اور مٹی دستیاب ہو سکی، مٹی کے کام، پلیوں کی تعمیر اور اینٹوں کا کھڑنجہ بچھانے کی منظوری دی گئی۔ ہر ضلع میں مربوط ترقیاتی اسکیم کے تحت آنے والے راستوں میں تقریباً ۱۰ کیلومیٹر راستوں کا انتخاب مقررہ کمیٹی کے ذریعہ مکمل ہو جانے پر کام شروع ہوا۔ اس اسکیم کی مجموعی تخمینی لاگت تین کروڑ ۶۰ لاکھ روپیہ تھی جس میں اناج کی لاگت بھی شامل تھی۔

سال ۱۹۷۷-۷۸ء میں اس اسکیم پر ۸۵ لاکھ روپیہ صرف ہوا تھا جس سے ۲۹۳ کیلومیٹر سڑک پر مٹی کا کام اور ۴۵ کیلومیٹر سڑک پر کھڑنجہ بچھانے کا کام کیا گیا تھا۔ سال ۱۹۷۸-۷۹ء میں اس اسکیم کے لیے ۲۰۰ لاکھ روپیہ کے مصارف مقرر کیے گئے ہیں جس کے مقابلے میں اس سال ۲۲۴ لاکھ ۵۶ ہزار روپیہ خرچ کرنے کی تجویز ہے۔ دسمبر ۱۹۷۸ء تک اس اسکیم پر ۸۰ لاکھ ۹۶ ہزار روپیہ خرچ ہوا جس سے ۱۶۹ کیلومیٹر سڑک پر مٹی کا کام اور ۱۷۶ کیلومیٹر سڑک پر کھڑنجہ بچھانے کا کام کیا گیا۔

اسی طرح اناج اسکیم نمبر ۲ کے تحت سال ۱۹۷۷-۷۸ء

میں مٹی کی سطح تک ایک کروڑ ۳۸ لاکھ روپیہ کی لاگت سے ۱۰۰۰ کیلومیٹر لمبی سڑکوں کی تعمیر کی منظوری دی گئی تھی۔ ہر ضلع میں جہاں مستقل یا عارضی طور سے زمین دستیاب تھی ۱۸۱ کیلومیٹر سڑکیں مٹی کے کام کے لیے منظور کی گئیں اور مزدوروں کو اجرت کے طور پر صرف اناج تقسیم کرنے کا اصول سامنے رکھا گیا۔ ہر ضلع میں سڑکوں کی منظوری کا کام کابینی کمیٹی نے پورا کیا۔ اس کے علاوہ کام کی رفتار ترقی کا جائزہ لینے کے لیے ایک دوسری کمیٹی بنائی گئی۔

سال ۷۸-۱۹۷۷ء میں اس اسکیم پر ۳۵ لاکھ روپیہ خرچ ہوا اور ۴۳۰ کیلومیٹر لمبے راستوں پر مٹی کا کام مکمل کیا گیا۔ سال ۷۹-۱۹۷۸ء کے لیے اس اسکیم کے تحت ۱۰۰ لاکھ روپیہ کے اخراجات کا تعین کیا گیا جس کے مقابلہ میں اس سال ۱۰۴ء۳۳ لاکھ روپیہ خرچ کرنے کی تجویز ہے۔ دسمبر ۱۹۷۸ء تک اس اسکیم پر ۹۸ء۲۵ لاکھ روپیہ خرچ کیا گیا جس سے ۲۰۴ کیلومیٹر سڑک پر مٹی کا کام مکمل ہوا۔

یہ دونوں اسکیمیں مارچ ۱۹۷۹ء تک مکمل کر لی جائیں گی۔
ان دونوں اناج اسکیموں پر سال ۷۸-۱۹۷۷ء میں مجموعی طور پر ۲ء۴۰ کروڑ روپیہ خرچ ہوا۔ محکمہ کو دو کروڑ روپیہ کی جو بچت ہوئی تھی اس میں سے ۱ء۴۰ کروڑ روپیہ نکال کر بقیہ ۶۰ لاکھ روپیہ میں ۵۰ لاکھ روپیہ پہلے سے منظور شدہ منصوبہ بندی کاموں پر ۱۰ لاکھ روپیہ سڑکوں کی نگہداشت کے کاموں پر خرچ کیا گیا۔ سال کے دوران سڑکوں کی تعمیر پر ہونے والے مصارف سے سال ۷۷-۱۹۷۶ء کے مقابلہ میں سال ۷۸-۱۹۷۷ء میں تقریباً ۶۵۰۰ زائد مزدوروں کو پورے سال روزگار ملا۔

مالیاتی سال رواں کے دوران حکومت نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ "کام کے عوض اناج اسکیم" کے تحت پیدا ہونے والے مزید کام کے مقابلے میں نئی کچی سڑکوں کی تعمیر کی جائے اور اس اسکیم کے تحت دیگر کاموں کے سلسلے میں بھی اناج کا استعمال کیا جائے۔ اس فیصلے کے بموجب ریاستی حکومت نے "اناج اسکیم نمبر ۴" کے تحت آٹھ کروڑ ۲۳ لاکھ ۷۰ ہزار روپیہ کی تخمینی لاگت سے، جس میں استعمال کیے جانے والے اناج کی لاگت بھی شامل ہے، ریاست کے پہاڑی علاقوں کو چھوڑ کر ۳۰۰۰ کیلومیٹر نئی کچی سڑکوں اور ان پر ضروری پلیوں کی تعمیر کی منظوری دی ہے۔

اس اسکیم کی عمل آوری کے سلسلے میں اناج کے علاوہ جو نقد اخراجات ہوں گے انھیں منظور شدہ منصوبہ جاتی اور غیر منصوبہ جاتی کاموں میں اناج کے استعمال سے دستیاب مزید بچت تک ہی محدود رکھا جائے گا۔ اس طرح جو بھی فاضل بچت ہوگی اس میں سے سب سے پہلے منظور شدہ کاموں کو مکمل کرنے پر اور اس کے بعد اس اسکیم پر خرچ کیا جائے گا۔ ان سڑکوں کی تعمیر میں مٹی کا کام جہاں تک ممکن ہوگا اناج کی شکل میں اجرت دے کر کرایا جائے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہر ضلع میں تقریباً ۶۰ کیلومیٹر لمبی سڑکوں کی تعمیر کی جائے گی۔

اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے ریاستی محکمہ تعمیرات عامہ نے اکتوبر سے کام شروع کر دیا ہے۔ اب تک ۲۴۶۵ کیلومیٹر راستوں کا انتخاب کیا جا چکا ہے۔ اس کام کے لیے ۲۲۵۰۰ میٹرک ٹن گیہوں الاٹ کر دیا گیا ہے۔ اندازہ ہے کہ محکمہ تعمیرات عامہ کی زیر عمل اسکیموں کے نتیجہ میں سال ۷۸-۱۹۷۷ء کے مقابلہ میں سال ۷۹-۱۹۷۸ء میں ۲۰۰۰۰ مزدوروں کو پورے سال روزگار ملے گا۔ اناج اسکیم ۴ کے تحت دسمبر ۱۹۷۸ء تک ۱۳۳۹۸ میٹرک ٹن اناج محکمہ کے مختلف ڈویژنوں کو مل چکا ہے اور ۱۲۸۰۰ میٹرک ٹن اناج تقسیم بھی کر دیا گیا ہے۔ اس کام میں آگرہ ڈویژن سب سے آگے ہے جہاں دسمبر ۱۹۷۸ء تک ۱۸۵۰ میٹرک ٹن گیہوں اجرت کے طور پر تقسیم کیا جا چکا ہے۔ صرف محکمہ تعمیرات میں تقریباً ۱۵ لاکھ انسانی یوم کے بقدر روزگار پیدا ہوگا

بے روزگاری کا مسئلہ حل کرنے کی راہ میں ایک اہم قدم ہوگا۔ اناج اسکیم نمبر ۴ کے تحت دسمبر ۱۹۷۸ء تک ۱۱۵ کیلومیٹر سڑکوں پر مٹی ڈالنے کا کام پورا کر لیا گیا ہے۔

کام کے عوض اناج اسکیم کے تحت منڈی سمیتوں نے دیہی رابطہ سڑکوں کا وسیع پروگرام شروع کیا۔ تقریباً ۳۰۰۰ کیلومیٹر رابطہ سڑکوں پر مٹی کا کام مکمل ہو گیا ہے اور بقیہ ۲۰۰۰ کیلومیٹر سڑکوں پر کام جاری ہے۔ ان راستوں پر ۲۹۰۲ پلیاں بنانے کے لیے منڈی پریشد کو دو کروڑ روپیہ دیا گیا ہے۔

حکومت ہند سے حاصل ہونے والے اناج کی وجہ سے دیہی علاقوں میں روزگار کے مزید مواقع پیدا کرنے اور مقامی اہمیت کے متعدد تعمیراتی کاموں کے لیے محکمہ دیہی ترقی نے ایک وسیع اسکیم تیار کی ہے۔ اس اسکیم کے تحت گزشتہ سال ریاست میں ۳۲۶۸۴ میٹرک ٹن گیہوں کے جس کی قیمت ..... ۳،۷۶ روپیہ ہے، استعمال کے ذریعہ ۵۸۱۹۵۰۰ انسانی یوم کے بقدر کام کیا گیا۔ اس طرح ۲۸۰۴ کیلومیٹر سڑک پر مٹی کا کام، ۱۳،۷۵ ہیکٹیئر زمین پر کی گھدائی، جنگل کاری اور شجر کاری کی گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ ٹیوب ویلوں اور نہروں کی نگہداشت، باندھوں کی مرمت اور عوامی مفاد کے دیگر کام کیے گئے۔

موجودہ مالیاتی سال میں بھی نومبر تک تقریباً ۵۸۶۰۰۰ روپے کی مالیت کا ۲۳۵۵۳ میٹرک ٹن گیہوں استعمال کیا جا چکا ہے۔ گزشتہ برسوں کے بقایا کاموں کے علاوہ ۶۰۰ کیلومیٹر سڑک پر مٹی کے کام، ۵۴۶ کیلومیٹر سڑک کے کنارے اینٹیں بچھانے، ۱۶۷۷۶ ہیکٹیئر زمین پر شجر کاری، ۲۹۱۹ ہیکٹیئر زمین پر جنگل کاری، نہروں، ٹیوب ویلوں نیز سروس روڈ کی نگہداشت کے نشانے مقرر کیے گئے ہیں۔ اس طرح ایک اندازے کے مطابق ۲ کروڑ ۲،۷ لاکھ انسانی یوم کے بقدر کام پیدا ہوگا۔

اس اسکیم کے تحت منڈی پریشد اور گاؤں سبھاؤں نے جو کچے کام کیے ہیں انھیں مستقل شکل دینے کی غرض سے پختہ کیا جائے گا تاکہ مٹی کا کام بے کار نہ ہو جائے اور اسے مستقل طور سے کار آمد بنایا جا سکے۔ ان کاموں کی تکمیل کے بعد اس سلسلے میں نگہداشت کی ذمہ داری منڈی پریشد اور گاؤں سبھاؤں پر ہوگی۔

اس کے علاوہ دیہی علاقوں کو خاص سڑکوں، منڈیوں، اسکولوں اور صدر مقاموں سے مربوط کرنے کی غرض سے سڑکوں کی توسیع کی جا رہی ہے۔ سڑکوں کی تعمیر کے کام کی رفتار تیز تر کی گئی ہے جو آئندہ برسوں میں مزید تیز ہوگی۔ اس طرح ان دیہی باشندوں کے جنھیں نظر انداز کیا جاتا رہا ہے خوش آئند خواب شرمندہ تعبیر ہو سکیں گے۔

★

معاونین نیا دور سے ایک گزارش

ادارہ نیا دور کے پاس مضامین اور شعری تخلیقات کی ایک کثیر تعداد منتظر اشاعت ہے۔ اس لیے فی الحال دو تین ماہ تک کسی غیر طلبیدہ مضمون یا شعری تخلیق کی اشاعت پر غور کرنا ہمارے لیے ممکن نہ ہوگا اور اس سلسلے میں کوئی خط و کتابت بھی نہیں کی جائے گی۔

— ادارہ

نقد و تبصرہ

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں)

نام کتاب — محاربۂ کابل و قندھار" سید ابوالحسن قیصر۔
ضخامت — ۲۵۶ صفحات قیمت — دس روپے

ناشر — سید ابوالحسن قیصر۔ قصبہ سانڈی ضلع ہردوئی۔

شاہ شجاع الملک کے دور حکومت میں جب کابل و قندھار میں بغاوت کے شعلے بھڑکنے لگے تو اس نے انگریزوں سے مدد مانگی جو اس وقت ایسٹ انڈیا کمپنی کی شکل میں پوری طرح ہندوستان کی سیاست میں دخیل ہو چکے تھے۔ انگریزوں نے شاہ شجاع کی درخواست منظور کی، بھرپور مدد دی، بے شمار روپیہ پانی کی طرح بہایا اور ہزاروں بے گناہوں کے خون سے کابل و قندھار کی سرزمین کو لالہ زار کر دیا۔ منشی عبدالملک جو ۱۸۳۹ء میں انگریزی سپاہ میں پرچہ نویس تھے، کابل و قندھار کے معرکوں میں شریک تھے۔ ان جنگوں کا حال انھوں نے فارسی زبان میں "محاربۂ کابل و قندھار" کے نام سے تحریر کیا ہے جو تاریخی اعتبار سے ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔

سید ابوالحسن صاحب قیصر نے جس خوبی سے محاربۂ کابل و قندھار کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے وہ قابل ستائش ہے، ۲۵۶ صفحات پر مشتمل پوری کتاب میں کہیں بھی ترجمے کا انداز نہیں جھلکتا ہے۔ بلکہ کہیں کہیں تو تحریر کی روانی اور شستہ انداز بیان کے سبب کتاب پر ترجمے کے بجائے تصنیف کا گمان ہونے لگتا ہے۔

زیر نظر کتاب قطعی تاریخی کتاب ہے لیکن مترجم کے تعارف کے طور پر ڈاکٹر سلیم اللہ صاحب سلیم کا جو مضمون شامل اشاعت کیا گیا ہے وہ کتاب کے مزاج سے قطعی میل نہیں کھاتا ہے۔ محاربۂ کابل و قندھار جیسی کتاب میں یہ مضمون بالکل ہی غیر متعلق اور عجیب سا لگتا ہے۔

بہر حال۔ زیر نظر کتاب جو اردو اکاڈمی کے مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے۔ یقیناً ایک اچھا اضافہ بھی ہے اور ستائش کی مستحق بھی۔

نام کتاب — لفظ و بیاں مصنف — مہدی پرتاب گڈھی
ضخامت — ۸۰ صفحات۔ قیمت — تین روپے۔

ناشر — بزم اردو ادب۔ پرتاب گڑھ۔

لفظ و بیاں، مہدی پرتاب گڑھی کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ مہدی صاحب پرتاب گڑھ کے ایک جواں سال و جواں فکر شاعر ہیں جو شعری ادب کی کلاسیکی روایات سے بھی واقف ہیں اور بدلتے ہوئے جدید رجحانات سے بھی روشناس ہیں۔ قدیم اور جدید کا یہ امتزاج ان کے شعروں میں جا بجا جھلکتا ہے۔

دھرتی پہ قدم رکھئے بہت سوچ سمجھ کر
بکھرے ہیں ہر اک گام پہ ٹوٹے ہوئے لمحات

کیوں مجھ کو بڑے غور سے وہ دیکھ رہا تھا
پہلے تو کبھی اس سے نہ تھی میری ملاقات

خود اپنے نام سے ملنا بھی اب نصیب نہیں
گھرا ہوا ہوں کچھ اس طرح سے خطابوں میں

آذری دل کی تراشے ہے تمنا کے صنم
وقت محمود ہے ڈھا دے نہ شوالے کیونکر

میں جس کے واسطے آنکھوں میں رات کاٹ آیا
وہ میرے واسطے کیوں جاگتا رہا ہوگا

ہنس لینے سے کیفیت غم کم تو نہ ہوگی
آنکھوں میں مگر درد کی شبنم تو نہ ہوگی۔

مندرجہ بالا اشعار "لفظ و بیاں" میں بکھرے ہوئے ہیں فکر کے جواہر پاروں میں سے چند ہیں اور اس بات کی غمازی کر رہے ہیں کہ مہدی پرتاب گڑھی سے خوب تر کی امید کی

جا سکتی ہے۔

نام کتاب — مرکز   مرتب — سرور عثمانی۔
قیمت — تین روپے۔ صفحات — ۸۰
ملنے کا پتہ — مرکز ادب۔ شمسی بلڈنگ۔ ایسٹ گاندھی میدان۔ گیا۔

مرکز بظاہر، بزم ادب گیا کی ادبی سرگرمیوں اور ادارے کے اغراض و مقاصد پر مبنی روداد ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ انتخاب، ترتیب، کتابت اور طباعت کے حسن نے اس مجلہ کو ایک خوبصورت ادبی رسالہ بنا دیا ہے۔ یہ سادہ سا لیکن خوبصورت اور جامع مجلہ اس بات کی علامت ہے کہ مرکز ادب گیا کے ذمہ داروں میں بے حد صلاحیت ہے۔

کیا ہی اچھا ہو اگر مرکز سال میں ایک بار کے بجائے ماہانہ یا سہ ماہی رسالے کی شکل میں نظر آنے لگے۔

— ساحر لکھنوی

کتاب کا نام۔ **شاعری** ۔ مصنف :۔ وقار خلیل ۔ صفحات : ۱۹۰
قیمت: سات روپے ۔ ملنے کا پتہ: اردو اکیڈمی بک ڈپو، اے سی۔ گارڈ۔ حیدرآباد ۲۸…۵۰۰

وقار خلیل حیدرآباد کے مخلص، سنجیدہ اور معتبر فن کار ہیں ان کے کلام میں جدت، رومانویت اور مہذب اقدار و روایات کا امتزاج ملتا ہے۔ انھوں نے زندگی سے نباہ کے کچھ ضابطے اور اصول وضع کیے ہیں جن کی نشاندہی کے لیے خود ان کے اشعار چراغ راہ ہیں۔ ان کی تمامتر افکار پر غالب ایک شجر سایہ دار کی طرح حاوی اور طاری ہیں گو باوقار صاحب اکتساب و تفکر کے اعتبار سے اس گروہ کے فرد ہیں جس کے پہلے شاعر غالب ہیں۔ پھر فیض وغیرہ یا آج کے کچھ اور عہد آفریں شعرا۔

جگہ جگہ زبان و بیان کی دلکشی، رنگینیٔ جذبات، طرز اظہار اور وقیع و وسیع تخیلات کی تہ نشینیاں ان کے مجموعے کی جان ہیں وہ غم کو کائناتی اور خوشی کو عارضی قرار دیتے ہیں۔ بلند حوصلگی اور شہزادگی کے انھیں آثار و قرائن کو سبب بناتے ہوئے ان کے چند اشعار منقول ذیل ہیں

سب ریت کی دیوار کا لیتے ہیں سہارا   کیا لوگ ہیں کیا ریت ہو کیا رسم فغاں ہے
آدمیت ابھی نٹ پاتھ پہ خوابیدہ ہے   اس کو محلوں میں نہیں چارہ گروں میں ڈھونڈو
تم کو دیکھا تو اک خیال آیا   وہ بھی کچھ یوں کہ تم سے اچھا تھا

مجموعے کی تزئین بڑی خوش اطواری سے انجام دی گئی ہے جا بجا غزلیں اور ان کے شانہ بہ شانہ اوراق میں ان کی بہترین نظمیں شامل ہیں نظموں کے حواشی موضوعات کے لحاظ سے مطالعے کی دعوت دیتے ہیں۔ یوں تو سبھی نظمیں درک نواز ہیں مگر نیا آدم (سانیٹ)، حمد۔ واسوخت۔ کن کا فلسفہ۔ وائیٹ کالر کے لوگ وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

تسنیم فاروقی (ریسرچ اسکالر لکھنؤ یونیورسٹی)

نام کتاب : **اقبال ٹیگور اور نذرل : تین شاعر۔ ایک مطالعہ**
مصنف : شانتی رنجن بھٹاچاریہ ۔ صفحات : ۱۷۶۔ قیمت : دس روپے ۔ ملنے کا پتہ : E ۱/۲-۱ اشوک نگر، ریجنٹ پارک کلکتہ ۴۰…۷۰۰۔

"اقبال، ٹیگور اور نذرل : تین شاعر۔ ایک مطالعہ" شانتی رنجن بھٹاچاریہ کی نئی تصنیف ہے۔ جس میں انھوں نے دو مختلف زبانوں کے تین فن کاروں کے افکار و خیالات کا ایک تقابلی تجزیہ پیش کیا ہے۔ جو دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ خاصی اہمیت کا حامل بھی ہے۔

بھٹاچاریہ صاحب نے اس میں اقبال کی جو تحریریں ان کے نظریات اور انداز فکر کی وضاحت کے سلسلے میں پیش کی ہیں، وہ ان لوگوں کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہیں جو اقبال کو کھینچ تان کر ترقی پسند اور اشتراکی ثابت کرنے پر تلے رہتے ہیں۔

بھٹاچاریہ صاحب اگر اس کتاب میں ان تینوں فن کاروں کی شاعری اور فن کے سلسلے میں بھی کچھ لکھتے تو یہ کتاب اور زیادہ اہمیت کی حامل ہو جاتی۔ اقبال کے شعری محاسن اور فنی خصوصیات پر تو ویسے ہی بہت کم لکھا گیا ہے اور اس کتاب میں بھی ان کے افکار و خیالات ہی کا جائزہ لیا گیا ہے۔ لیکن بہرحال مجموعی طور پر بھٹاچاریہ صاحب کی یہ تصنیف قابل قدر اور لائق ستائش ہے۔

—— شاہ نواز قریشی

★

"نیا دور" کی ایجنسیاں

نیا دور آپ کا محبوب رسالہ ہے۔ آپ درج ذیل ایجنسیوں سے حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کی توسیع اشاعت کے لیے خود بھی خریدار بنیے اور دوسروں کو بھی اسے خریدنے کی تلقین کیجیے۔

جاوید بک ڈپو۔ کالج روڈ، بڑا بازار
ہزاری باغ (بہار)

سمیع اللہ شفق۔ سب رنگ بکس
انجمن بلڈنگ، مین روڈ، رانچی (بہار)

جمال بک ڈپو۔ باری روڈ۔ گیا (بہار)

آزاد کتاب گھر۔ سابچی بازار جمشید پور (بہار)

اسلامیہ بک ڈپو۔ بک سیلر اینڈ نیوز پیپر ایجنٹ
نیو مارکٹ۔ تاتار پور۔ چوک، بھاگلپور سٹی ۔ ۸۱۲۰۰۲ (بہار)

شری رشید اختر پوسٹ باکس نمبر ۵۸، سی۔ ایم۔ پی۔ ایف،
دھنباد ۔ ۸۲۶۰۰۱ (بہار)

کمالیہ بک ڈپو۔ تاتار پور، بھاگلپور ۔ ۲ (بہار)

بک امپوریم۔ سبزی باغ، پٹنہ ۔ ۸۰۰۰۰۴ (بہار)

مسرز عبدالوحید بک سیلر۔ مین روڈ، رانچی
۸۳۴۰۰۱ (بہار)

جناب محمد نور الہدیٰ۔ منیجر مکتبہ اسلامی
لہریہ سرائے، دربھنگہ (بہار)

محمد سراج الدین صاحب۔ پان کی دکان،
محلہ مخدوم سرائے، سیوان، ۸۴۱۲۲۶ (بہار)

منہال بک ہاؤس۔ اسٹیشن روڈ، گنیش پیٹھ
چوک، ہبلی ۔ ۲۰ (کرناٹک)

مسز مکتبہ شرقیہ نیوز ایجنسی ابراہیم پورہ
بھوپال (ایم۔ پی)

عزیز بک سینٹر۔ انصار رسٹورنٹ، مل روڈ،
ناندیڑ (مہاراشٹرا)

جناب ایس۔ ایم۔ علی نیوز پیپر ایجنٹ
نئی بستی ٹیکا، ڈاکٹر امبیدکر روڈ، ناگپور (مہاراشٹرا)

حنیف بک ڈپو۔ مومن پورا، ناگپور (مہاراشٹرا)

یوتھ فیڈریشن۔ سنیما روڈ، ردولی ضلع بارہ بنکی ۵۴۱،

شمع بک اسٹال۔ چوک، گھنٹہ گھر، سبزی منڈی
الہ آباد ۔ ۳ (یو۔ پی)

عبدالحفیظ برق۔ ایجنٹ اخبارات و رسائل
جھوٹے والان، سہارن پور ۔ ۲۴۷۰۰۱ (یو، پی)

عارف علی صاحب۔ ۱۰ لطیف مارکیٹ
پوسٹ خیرآباد ضلع سیتاپور (یو، پی)

حاجی محمود حسن اینڈ سنس
جنرل مرچنٹ، چوک بازار، دیوبند، ضلع سہارن پور۔
۲۴۷۵۵۴ (یو، پی)

سنٹرل نیوز ایجنسی پرائیویٹ لمیٹڈ۔ ۲۳/۹۰
کناٹ سرکس، پوسٹ باکس نمبر ۳۷۴، نئی دہلی ۔ ۱۱۰۰۰۱

غوث بادشاہ، گوہر پریس اینڈ بک ڈپو،
۶۹۱ ٹریپلی کین ہائی روڈ، مدراس ۔ ۶۰۰۰۰۵

نظیر بک ڈپو، ۲۹ ٹریپلی کین ہائی روڈ،
مدراس ۔ ۶۰۰۰۰۵

✦

NAYA DAUR

گورنر اتر پردیش شری جی۔ ڈی۔ تپاسے ۲۸ فروری کو راج بھون میں نئے وزیر اعلیٰ شری بناری داس کو ان کے عہدے کا حلف دلا رہے ہیں

نیا دور
مئی ۱۹۷۹ء
۵۰ پیسے

عنوانات

نیا دور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ حکومت اتر پردیش ان سے بھی اتفاق ہو

جلد ۳۶ نمبر ۲

مئی ۱۹۷۹ء

ایڈیٹر: خورشید احمد

جوائنٹ ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

★

ناشر: ہمیندر کمار

ڈائرکٹر اطلاعات و رابطہ عامہ اتر پردیش

پرنٹر: اشوک در

سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ واسٹیشنری یوپی

مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے

زر سالانہ: پانچ روپے

خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶، لکھنؤ

اپنی بات

اتر پردیش زندگی کے مختلف شعبوں میں ترقی کی شاہراہ پر تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہا ہے مثلاً اگر بجلی کے زمرے کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ریاست میں بجلی کی مجموعی پیداواری صلاحیت جو ۷۸-۱۹۷۷ء میں ۲۹۸۲ میگاواٹ تھی اب بڑھ کر ۳۱۸۲ میگاواٹ ہو گئی ہے۔ اسی طرح مختلف ضلعوں اور شہروں میں درمیانہ آمدنی والے اور سماج کے کمزور نیز پسماندہ طبقوں کے لیے تعمیر مکانات کے کام میں بھی تیزی آئی ہے۔ ریاستی حکومت نے درمیانہ آمدنی والے طبقہ کے لیے تعمیر مکانات اسکیم کے تحت ۲۵ مکانات کی تعمیر کے لیے زندگی بیمہ کارپوریشن سے حاصل شدہ قرض میں سے کانپور ڈیولپمنٹ اتھارٹی کو ۴۰۰۸۰۰ روپے کا قرض منظور کیا ہے۔ اس کے علاوہ پانچ قبائلی بلاکوں یعنی چکراتا اور کالسی (دہرہ دون) جونپور (ٹہری گڑھوال) اور پرولا نیز نوگاؤں (اترکاشی) میں قبائل مندرجہ فہرست کے لوگوں کے لیے مکانات تعمیر کرنے کی غرض سے مالیاتی سالِ رواں کے دوران دو لاکھ روپے کی مالی امداد اور ۱۰ لاکھ روپے کی غیر مکرر مالی امداد ریاستی حکومت نے منظور کی ہے۔ اس طرح سماج کے کمزور طبقوں کے لیے تعمیر مکانات کی امدادی اسکیم کے تحت موجودہ مالیاتی سال کے دوران رائے بریلی ترقیاتی اتھارٹی رائے بریلی کو بھی ایک لاکھ روپے کی رقم حکومت نے منظور کی ہے۔

امداد باہمی زمرے کا تجزیہ کیا جائے تو وہاں بھی ترقیاتی سرگرمیوں کی تیز رفتاری نمایاں ہے۔ اتر پردیش امداد باہمی بینک نے چھوٹے اور مارجنل کسانوں کو زرعی ساز و سامان آلات، آبپاشی کے چھوٹے وسائل نیز معاون پیشوں مثلاً نگہداشت مویشیان، مرغبانی، گوبر گیس پلانٹوں وغیرہ کے لیے ۸۰ء۴ کروڑ روپے کے درمیانہ مدتی قرضے منظور کیے ہیں۔ یہ قرض مکرر سرمایہ امدادی پروگرام کے تحت ریاست کے ۲۶ اضلاع کے چھوٹے اور مارجنل کسانوں کو فراہم کیا گیا ہے تاکہ ان کی معاشی حالت بہتر بنائی جا سکے اور ان کے لیے روزگار کے نئے مواقع پیدا کیے جا سکیں۔ ان اضلاع میں چھوٹے اور مارجنل کسانوں کے ۹۴۳، ۲۲۶ خاندانوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ ان میں سے ۲۶۶۰۰۰ خاندان امداد باہمی کے دائرہ عمل میں آتے ہیں جن میں توقع ہے کہ ۸۰ فیصد اس پروگرام سے مستفیض ہوں گے۔ صد فی صد خاندانوں کو امداد باہمی کے دائرہ عمل میں لانے کے لیے کوششیں کی جا رہی ہیں انھیں درمیانہ مدتی قرض اس غرض سے فراہم کیا جا رہا ہے کہ وہ حصے خرید کر امداد باہمی انجمنوں کے ممبر بن جائیں۔

اتر پردیش کے محکمۂ امداد باہمی نے اس سال امداد باہمی اداروں کے ذریعہ خریف کی فصل کے لیے ۵۶ء۵۵ کروڑ روپے کی مالیت کی ایک لاکھ ۵ میٹرک ٹن کیمیاوی کھاد تقسیم کرنے کا نشانہ مقرر کیا ہے جو اب تک خریف کے دوران تقسیم شدہ کھاد کی سب سے بڑی مقدار ہے۔ کیمیاوی کھاد کی بہ تقسیم اور کسانوں کی سہولت کے پیش نظر امداد باہمی کیمیاوی کھاد فروخت مرکزوں کی تعداد ۴۳۰۰ سے بڑھا کر ۵۲۵۰ کی جا رہی ہے۔ ہر ترقیاتی بلاک میں کم سے کم پچھ کیمیاوی کھاد فروخت مرکز قائم کیے جا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ آئندہ دو سال کے اندر ریاست میں پنچایتی سطح کی تمام ۱۰۴۲۱ امداد باہمی انجمنوں کے گنیز گشا دیہی گوداموں کی تعمیر مکمل ہو جائے گی تاکہ کسانوں کو باقاعدہ ضروری سہولتیں مہیا کی جا سکیں۔ ۰۰ دو سے زیادہ کثیر مقصدی دیہی گوداموں کی تعمیر کا کام پورا بھی ہو گیا ہے۔

● اتر پردیش اردو اکیڈمی نے نیشنل بک ٹرسٹ کے تعاون سے لکھنؤ کی قیصر باغ بارہ دری میں اردو کتابوں کے ایک قومی میلے کا اہتمام کیا جو ۲۰ اپریل سے ۲۶ اپریل ۱۹۷۹ء تک جاری رہا۔ میلے کا افتتاح اتر پردیش کے وزیر قومی یک جہتی شری ایچ۔ کے سریتوا نے کیا۔ اپنی نوعیت کے اس منفرد میلے میں ہندستان کے مختلف پبلشروں نے اپنے اسٹال لگائے تھے جن پر مختلف علوم و فنون کی اردو کتابوں کی موجودگی سے یہ حقیقت اور روشن ہو گئی کہ اردو میں محض شعری مجموعے، ناول اور افسانے ہی نہیں شائع ہو رہے ہیں بلکہ سائنس، ٹیکنالوجی اور دیگر موضوعات پر بھی اہم کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ اردو کے سلسلے میں ایک خوش آیند بات ہے۔ لیکن بہر حال اردو اکیڈمی کو اردو کتابوں کی ریڈرشپ زیادہ سے زیادہ بڑھانے کی راہیں بھی تلاش کرنا ہوں گی ـــ ہفتہ بھر کے اس میلے کے دوران اردو پبلشروں کی ایک کانفرنس بھی ہوئی جس میں پبلشروں کے مسائل اور دشواریوں پر غور و خوض ہوا۔ اس کے علاوہ ان لائبریریوں کی ایک کانفرنس بھی منعقد ہوئی جنھیں یوپی اردو اکیڈمی اردو کتابوں اور اخبارات و رسائل کی خریداری کے لیے مالی امداد دیتی ہے۔ ایک سمینار اردو کے ادبی رسالوں کے مسائل پر بھی ہوا جس میں ۲۵ مدیران شریک ہوئے۔ جنھوں نے ادبی رسالوں کے مسائل پر کھل کر بحث کی۔ ان کانفرنسوں اور سمینار کی روشنی میں جو کام شروع ہو گا اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانا بھی ضروری ہے۔ تبھی ان کانفرنسوں اور سمینار کی افادیت عملی شکل میں سامنے آئے گی۔ اردو کے فروغ اور اس کی ترقی و توسیع کے لیے اردو اکیڈمی کی یہ سرگرمیاں اور اس کے منصوبے بلاشبہ طرح بار آور ہوں گے۔ ان رنگا رنگ پروگراموں کے انعقاد پر ادارہ نیا دور اردو اکیڈمی کو مبارک باد پیش کرتا ہے۔

ـــ ایڈیٹر

ش پرتاپگڈھی
م وارڈ - پرتاب گڑھ

غزل

مشتعل ہیں برق پاروں کو نہ جانے کیا ہوا
اے زمیں تیرے ستاروں کو نہ جانے کیا ہوا

گھوم پھر کر اپنے ہی اپنوں میں رہ جانے لگے
چشمِ ساقی کے اشاروں کو نہ جانے کیا ہوا

رات بھر تو یہ مری دلداریاں کرتے رہے
صبح ہوتے ہی ستاروں کو نہ جانے کیا ہوا

دور تھے تو کیسے دلکش، کتنے دل آویز تھے
پاس آتے ہی کناروں کو نہ جانے کیا ہوا

شیشہ و ساغر ہیں خالی رند بیٹھے ہیں بجھے
میکدہ! تیری بہاروں کو نہ جانے کیا ہوا

دل تو کیا نظریں تک ان سے مطمئن ہوتی نہیں
صحنِ گلشن کے نظاروں کو نہ جانے کیا ہوا

اب کہیں ذوقِ جنوں کو کوئی شہ ملتی نہیں
حسنِ کافر کے اشاروں کو نہ جانے کیا ہوا

ایک اک غنچہ ترستا ہے قبائے رنگ کو
اور ہیں ساکت، بہاروں کو نہ جانے کیا ہوا

کل جو پردہ ڈال دیتے تھے بیانِ درد پہ
نازش آج ان استعاروں کو نہ جانے کیا ہوا

مرزا جعفر حسین
بدری ناتھ روڈ۔ گولہ گنج۔ لکھنؤ

صفی لکھنوی

کچھ یادیں

دبستان لکھنؤ کی بزم شعر و ادب میں مولانا سید علی نقی صفی عظیم ترین مرتبت کے مالک تھے۔ ان کے فنکارانہ کمالات اور ان کی ادبی خدمات کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کا ایسا کوئی دوسرا شاعر و ادیب پیدا نہیں ہوا۔ وہ ہر نہج سے باکمال تھے۔ مبدا فیاض نے ان کو اعلا صلاحیتوں سے سرفراز کیا تھا اور ایک ایسے خاندان میں آنکھیں کھولی تھیں جہاں علم و فضل کا چرچا رہتا تھا۔ ایک ایسے ماحول میں پروان چڑھے جو لکھنؤ کی اعلا معاشرت کا بہترین نمونہ تھا۔ سن شعور کو پہنچے تو ایسے حالات سامنے آئے جب اودھ کی تہذیب دم توڑ رہی تھی اور دوسری اقتدار حاصل کرنے پر آمادہ تھی۔ انھوں نے شعوری طور پر رنگ زمانہ کا مطالعہ کیا اور پرانی قدروں کو نئے سانچوں میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ قدیم روایات میں ہر اچھی چیز کو گلے سے لگائے رہے اور جدید رجحانات میں جہاں جہاں حسن و خوبی نظر آئی اس کو بھی شعوری طور پر قبول کرنے میں کبھی کوئی کمی نہیں کی۔ ان کا یہی کردار ان کی نوے برس کی طویل زندگی پر ہمیشہ تاباں و درخشاں رہا تھا۔ ادبی مذاق اتنا اچھا پایا تھا کہ ابتدائے مشق سخن ہی کے زمانہ سے اردو شاعری کے مذاق کو بلند کرنے کی فکر دامنگیر ہوگئی تھی اس سلسلے میں ان کی مساعی جمیلہ ہماری شاعری پر ایک ایسا احسان ہیں جن کو تاریخ کبھی مسخ نہیں کر سکے گی۔

صفی نے جب ہوش سنبھالا تھا تو لکھنؤ کے در و دیوار شعر و سخن میں سرشار تھے لیکن مذاق سخن بہت پست تھا۔ شاعری درباری تعیش پرستی سے پوری طرح متاثر ہو چکی تھی۔ فکر و فن لب و رخسار کی رنگینیوں میں مبتلا اور کاکل و زلف کے پیچ و خم میں اسیر تھے۔ اس رنگ سخن کے خلاف ایک نیا رجحان ابھر رہا تھا۔ کئی جلیل القدر ہستیاں اس لغو شاعرانہ والی شاعری سے گھبرا چکی تھیں۔ اودھ پنچ اخبار صحت مند مسلک کی طرف رہنمائی کر رہا تھا۔ اب صفی نے میدان غزل میں قدم رکھا۔ ان کی نظر بلندی تخیل اور معنی آفرینی کی دلدادہ مگر پھر بھی اس جدید طرز کی ترویج کے لیے ایک منظم تحریک کی ضرورت تھی چنانچہ مولانا صفی نے جوانمردی کے ساتھ قدم آگے بڑھایا اور دائرہ ادبیہ کے نام سے ایک انجمن کی تشکیل کر ڈالی۔ اس انجمن کے ارکان اور اس تحریک کے روح رواں سجاد حسین ایڈیٹر اودھ پنچ، شیخ ممتاز حسین عثمانی، مرزا محمد ہادی رسوا، پیارے صاحب رشید، مرزا کاظم حسین محشر، ابر اور بعض دیگر ممتاز شعرا اور ادیب تھے۔ صفی کی سرگردگی میں اس دائرہ ادبیہ کا کام کامیابی کے ساتھ آگے بڑھتا رہا اور ہر قدم پر ان کے مخصوص رفیق ان ہی کے چھوٹے بھائی سید مقبول حسین ظریف تھے۔ جو اپنے بڑے بھائی کے شاگرد بھی تھے۔ کہا جاتا ہے کہ صفی اپنے بھائی کے کلام پر اصلاح دیتے تھے اور عند الضرورت غزلیں خود ہی نظم کر کے ان کے حوالے کر دیتے تھے۔ یہ واقعہ بجائے خود یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ صفی کو ظرافت میں بھی پورا پورا کمال حاصل تھا۔

دائرہ ادبیہ کے مقصد کو آگے بڑھانے کے لیے جدید طرز فکر کے شاعروں کی ضرورت تھی۔ چنانچہ انجمن معیار ادب معرض وجود میں آئی۔ اس انجمن کے بانیوں میں بھی صفی مرحوم تھے اور

ابر انُس کے صدر منتخب ہوتے رہے تھے - رفتہ رفتہ اس
ے ارکان میں اکثریت غزل کے قدیم رنگ اور پرانی شاعری
ں میں اصلاح پر آمادہ ہوگئی تھی - اسی غرض کے پیشِ نظر انجمن
ہب کے مشاعرے ہوا کرتے تھے - ان مشاعروں میں صفی اور
ے بلند پایہ شعرا فکر و فن کی اعلا مثالیں اپنے کلام میں پیش
تھے اور ساتھ ہی ساتھ صفی نے ظریف کو آمادہ کر لیا تھا کہ
یانہ انداز میں اور طنزیہ رنگ میں قدیم تخئیل کے عیوب کو
ں تاکہ دوسرے شعرا اس سے سبق آموز ہوں - ظریف کی
اس رنگ کو اپنانے میں قدرتی طور پر موزوں تھی اس لیے
بنا سکے بٹھا دینے میں زحمت نہیں ہوئی اور ان کا یہ ظریفانہ
ی کے ساتھ شوخ سے شوخ تر ہوتا گیا تھا - انھوں نے صرف
ن ہی نہیں بدلوایا بلکہ اپنے اسی طنزیہ طرزِ خطابت کے وسیلہ
ی کو بہت سے معائب سے پاک کرایا تھا اور بہت سی بُری
کو اگر یک لخت دور نہیں کر سکے تھے تو بڑی حد تک کم ضرور
تھا - ہر مشاعرہ میں دونوں بھائی ایک ساتھ جاتے تھے اور
بھی ایک ساتھ ہوتی تھی - ظریف کے تمام ابتدائی کلام
ی کا مشورہ شامل ہوتا تھا اور جا بجا اصلاح بھی دے دیا
تھے - صفی کی معرکۃ الآرا غزلوں کے مطلعے عموماً حاصلِ غزل
تھے - یہی طرز ظریف کے کلام کا بھی تھا - ایک مدت تک
جاتا تھا کہ وہ مطلعے صفی مرحوم کہہ دیا کرتے تھے -
ر منزلِ اصلاح میں دونوں بھائیوں کی جد و جہد مشترک
ی - ظریف یقیناً اپنے فن میں کمال رکھتے تھے اور ان کو ظریفانہ
ں بڑی قدرت حاصل تھی لیکن اس کمال اور اس قدرت
ہ کے مشورے چار چاند لگا دیتے تھے - اس ضمن میں ایک واقعہ
دگار رہے گا - ایک زمانہ میں لکھنؤ والے عربی اور فارسی کے
دہ گرویدہ ہو گئے تھے کہ غیر محل اور نامناسب مواقع پر بھی وہی
نے لگے تھے - بزاز کے یہاں شادی کا کپڑا خریدتے تو یہ فقرہ
ے ادا کرتے کہ جامۂ عروسی بلاتلاوسہ ظاہری درکار ہے " گھوڑی
ھر خریدتے تو لبن خالص بلا انضمام ماء طلب کرتے تھے -

ایسی بکثرت مثالیں حافظہ میں ہیں جن کو بخوفِ طوالت حذف کر کے صرف یہ واقعہ بیان کر دینا مقصود ہے کہ ایک بار مشاعرہ کا رقعہ اس طرح شائع ہوا کہ اس میں تاریخ و مقام اور وقت نیز مصرعِ طرح کے علاوہ کوئی لفظ اردو کا نہ تھا - اب ان بھائیوں کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا - ظریف نے عربی اور فارسی الفاظ پر مشتمل دو غزلیں کہیں اور مشاعرہ میں ایک کہار کے کاندھے پر بہنگی رکھوا کر ہمراہ لیتے گئے - کہار کے چہرہ پر بڑی گھنی اور لمبی مصنوعی داڑھی اور جسم پر عبا و قبا پہنا دی تھی اور بہنگی میں دونوں طرف کتابیں بھر دی تھیں - کہار کو یہ ہدایت دی تھی کہ جب ان کے سامنے شمع آئے اور وہ اس کو آواز دیں تو وہ بلا لحاظ کہ کس نام سے پکارا جاتا ہے دوڑ کر آئے اور بہنگی ان کے سامنے رکھ کر واپس چلا جائے - مقامِ مشاعرہ سے متصل ایک چھتنار درخت تھا جس کے نیچے کہار بٹھا دیا گیا اور حاضرین کو اس کا پتہ بھی نہیں چل سکا تھا - ظریف کے پڑھنے کی باری آئی تو انھوں نے آواز دی " ابو القوامیس " ! کہار نے اپنا فرض انجام دیا - حاضرین گھبرا گئے - ظریف نے فرمایا کہ مشاعرہ کے رقعہ کو پڑھنے اور سمجھنے میں مجھے اتنی کتابوں سے مدد لینا پڑی تھی - میں نے انھیں الفاظ میں اشعار نظم کیے ہیں لہٰذا آپ حضرات کو معنی سمجھنے میں دشواری ہو تو یہ لغتیں حاضر ہیں - یہ دونوں غزلیں عربی اور فارسی الفاظ کی اردو لفظوں کے ساتھ ترکیب ظریف کا ادبی کارنامہ تھا -

متذکرہ بالا صرف چند واقعات و حالات یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ صفی مرحوم نے اردو شاعری کو پستی و زبوں حالی سے بلند کر کے فکر و فن کی رفعتوں تک پہنچانے اور اردو زبان کو عربی و فارسی کی بلا ضرورت اور ثقیل و مغلق آمیزش سے پاک و صاف کرنے میں گراں قدر خدمات انجام دی تھیں - حقیقت امر تو یہ ہے کہ انھوں نے اپنی ساری زندگی اردو زبان و ادب کی خدمت کے لیے وقف کر دی تھی - یہی وجہ تھی کہ حالات کا رُخ دیکھ کر اپنی عمر کے آخری برسوں میں وہ بہت مایوس ہو گئے تھے - اور انتقال کے دو برس قبل ان کے دل کی گہرائیوں سے یہ آوازیں آنے لگی تھیں :

فکر میں اس کے مٹانے کی ہر اک جم غفیر

سخت دشوار ہے اردو کی بقا میرے بعد
خالص اردوے معلی ہے صفی جس کا نام
یہ زبان اب نہ رہے گی بخدا میرے بعد

ظاہر ہے کہ ایسے پرستار زبان و ادب نیز اتنے مستند جلیل القدر شاعر کے کلام پر تبصرہ کرنا خود دستائی ہی قرار پائے گی لہٰذا اس مقام پر صرف اتنا ہی کہہ دینا کافی ہوگا کہ شاعری کی کوئی صنف ایسی نہیں ہے جس میں صفی نے مشق سخن نہ کی ہو اور کلام کے بہتر سے بہتر نمونے نہ چھوڑے ہوں۔ اس مقام پر ان کے کلام سے صرف غزلیات، قصائد اور منظر نگاری سے متعلق کچھ مثالیں پیش کی جاتی ہیں جن کو مشتے نمونہ از خروارے سمجھنا چاہیے۔ اردو شاعری کی اساس غزل ہے لہٰذا پہلے غزلیات کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں: ۔

جا کے جب تازہ مزاروں پہ چراغاں کرنا
ایک ٹوٹی ہوئی تربت پہ بھی احساں کرنا

خلاف وضع ہے اے دل ادھر جانا ادھر جانا
یہیں کچھ کھا کے سو رہنا اسی چوکھٹ پہ مر جانا

وضع صفی نہ پوچھو اک رند پارسا تھا
لب پر صنم صنم تھا دل میں خدا خدا تھا

اے چراغ قبر تیرا منتظر ہے دیر سے
کوئی جھونکا اس طرف بھی اے نسیم کوے دوست

کیا پوچھتے ہو درد کہاں ہے کہاں نہیں
رکھا ہے تم نے ہاتھ جہاں پر وہاں نہیں

شیشوں کی طرح ٹوٹے تو بہ سر میخانہ
ساقی پھر اسی کُن سے اک لغزش مستانہ

کیا رند بلا کش کا سرمایۂ میخانہ
دھرا ہوا اک شیشہ رستا ہوا پیمانہ

اک اک سے الجھتا ہے اپنا ہو کہ بیگانہ
پوچھو نہ روش دل کی دیوانہ تو دیوانہ

کل ہم آئینہ میں رُخ کی جھریاں دیکھا کیے
کاروانِ عمرِ رفتہ کے نشاں دیکھا کیے

زور ہی کیا تھا جفاے باغباں دیکھا کیے
آشیاں اجڑا کیا ہم ناتواں دیکھا کیے

ملتے ہی آنکھ دل پہ قیامت گزر گئی
جادو بھری نگاہ صفی کام کر گئی

پھری ہیں یوں پتلیاں شب غم کہ شام ہی سے سحر ہوئی ہے
مگر نہ آنا تھا وہ نہ آئے ادھر کی دنیا ادھر ہوئی ہے

فارسی زبان میں قصائد کی بہتات ملتی ہے۔ فن بلاغت کے تمام خصوصیات بڑے بڑے التزام سے قصیدوں میں پائے جاتے ہیں۔ خاقانی اس صنف کلام کا بادشاہ تھا اس کے قصائد میں اشعار کی تعداد سیکڑوں تک پہونچتی ہے۔ یہ قصیدے زیادہ تر بہاریہ اور پر مغز ہوتے تھے۔ بےشمار قصائد بادشاہوں اور رئیسوں کی مدح میں ہیں۔ عرفی غالباً وہ پہلا شاعر تھا جس نے تعلی کے حدود سے علحدہ ہو کر بڑی سنجیدگی سے اپنی اور اپنے بزرگوں کی تعریف کی ہے۔ اردو میں بھی شاعروں نے اچھے اچھے قصیدے کہے تھے۔ ذوق اور سودا کے قصائد آج بھی اپنا جواب نہیں رکھتے۔ اس صنف شاعری کے آخری دور میں صفی مرحوم نے قصیدہ گوئی میں بھی بہترین شاہکار پیش کیے تھے۔ لیکن ان کا کوئی قصیدہ اغلباً کسی رئیس کی مدح میں نہیں ہے۔ انھوں نے جو کچھ طبع آزمائی کی وہ سب نعت و منقبت تک محدود تھی۔ اس زمانہ میں آئمہ اطہار کی تاریخہائے ولادت پر قصیدہ خوانی کی محفلیں ہوا کرتی تھیں۔ صفی مرحوم نے انھیں موقعوں پر قصیدے کہے اور ایسی ہی محفلوں میں پڑھے بھی تھے۔ ان قصیدہ خوانی کی محفلوں میں دو مقامات پر مجھے شرکت کرنے کی سعادت حاصل ہوا کرتی تھی جن میں ایک مقتدر محفل فیض آباد میں ۱۳ رجب کو ہوتی تھی جس میں بہتر سے بہتر قصیدے سننے میں آتے تھے۔ اور دوسرا اچھا اجتماع رکسواڑہ ضلع پرتاب گڑھ میں تیسری شعبان کو ہوتا تھا۔ صفی مرحوم ان دونوں صحبتوں میں قصیدے پڑھتے تھے اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کے قصیدے دونوں مقامات پر اپنا آپ جواب ہوتے تھے۔ ۱۳ رجب کو حضرت علی کی مدح میں اور تیسری شعبان کو امام حسین کی شان میں قصائد کہتے اور پڑھتے تھے۔

ہ خوانی کی یہ تمام محفلیں دونوں مقامات پر طرحی ہوتی تھیں۔
ے یہ سب فنکار اپنی اپنی ساری زور آزمائیاں ختم کر دیتے تھے۔
مختصر مضمون میں بہت سی مثالیں اور متعدد شاعروں کا کلام
ا کرنا ممکن نہیں البتہ فیض آباد کے مقاصدوں سے صرف دو
پیش کرنے پر اکتفا کی جاتی ہے۔ ان دونوں موقعوں پر صفیؔ
ا مد مقابل کوئی دوسرا استاد نہیں ہو سکا تھا۔ پہلی قصیدہ
کی محفل میں انھوں نے اپنا قصیدہ مخمس کی شکل میں پیش کیا
س کا مطلع یہ تھا :۔

خیال زلف و رخ میں اُف وہ برہمی نظام کی
تجلیاں وہ برق کی وہ تیرگی غمام کی
ہ سرگزشت پوچھیے مریض تلخ کام کی
شب فراق کیا بتائیں کس طرح تمام کی
ہزار بار صبح کی ہزار بار شام کی

مخمس کا یہ بند منقبت میں ملاحظہ ہو :۔

وہ خشک جو کی روٹیاں غذائے خاص شاہ دیں
جناں کی نعمتوں پہ تھی غرضکہ فوقِ لے گئیں
فرشتے آسمان سے کھنچ آئے جانب زمیں
خدا کے شیر سچ بتا یہی سبب تھا یا نہیں
ملائکہ پسند تھی مہک ترے طعام کی

دوسری زیر نظر قصیدہ خوانی کی محفل میں ایک ایسی
ح میں طبع آزمائیاں کی گئی تھیں جس زمین میں عرفیؔ اور سوداؔ
ت قبل خامہ فرسائیاں کر چکے تھے۔ عرفیؔ کا لامیہ قصیدہ فارسی
اپنا جواب نہیں رکھتا اور سوداؔ کا اردو قصیدہ فنی شاہکار سمجھا
ا تھا۔ اس محفل میں جتنے شاعروں کے کلام سنے تھے سب ہی نے
ران غزل میں جولانیاں دکھائی تھیں۔ البتہ صفیؔ کا ایک ایسا
م تھا جس میں قصیدے کی تمام خوبیاں اور خصوصیات پوری
ی کے ساتھ موجود تھیں۔ افسوس ہے کہ جتنے اشعار محفل سے
نظر میں لے کر اٹھا تھا ان میں قریب قریب سب ہی محو ہو چکے
۔ معدودے چند یاد ہیں ان میں سے چار اشعار تشبیب کے
درج ذیل ہیں :۔

پیچ در پیچ ہے شیرازۂ اسباب و علل
رازِ ہستی ہے عجب عقدۂ مالاینحل
روح بے جسم کے نا قابل ادراک عقول
جسم بے روح کے ہم معنی لفظ مہمل
لاکھ سمجھائیں تناسخ کے عقائد والے
کچھ سمجھ میں مگر آتے نہیں یہ پھیر بدل

کارگاہ ہستی کا تذکرہ کرتے کرتے موجودات میں احساس برتری
کی اس طرح ترجمانی فرماتے ہیں :

قطرہ قطرہ ہمہ تن جوش انا البحر میں غرق
ذرہ ذرہ مئے پندار انا الطور میں حل

صفیؔ مرحوم قدیم لکھنؤ کلچر کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ درباری تہذیب
و آداب سے جس طرح کما حقہ واقفیت تھی اسی طرح محلوں والے
بیگماتی رسم و رواج بھی نظروں پر چڑھے ہوئے تھے۔ اسی ہمہ دانی
کی بدولت حسب ذیل شعر مقام منقبت میں ان کے قلم سے جس
بے ساختگی کے ساتھ نکل گیا تھا وہ دوسروں کے لیے کد و کاوش
کے باوجود کبھی ممکن نہیں ہو سکا۔ حضرت علیؓ کی ولادت کے تذکرہ
میں روسائے لکھنؤ کے یہاں کے زچہ خانہ والی ایک رسم یاد
آتی ہے اور صفیؔ یہ فرماتے ہیں :۔

فاطمہ بنت اسد دیکھ رہی ہیں تارے
گود میں چاند کا ٹکڑا ہے گلے کی ہیکل

کہنا پڑتا ہے کہ اپنے ہم عصروں میں صفیؔ کا کوئی مد مقابل قصیدہ گوئی
میں بھی نہیں تھا۔ ان کے شاگرد عزیز لکھنوی کو لکھنؤ والے فن
قصیدہ گوئی میں استاد تسلیم کرتے تھے۔ یہ سچ ہے کہ وہ بھی ایک
اچھے قصیدہ گو تھے لیکن صفیؔ کی ایسی قدرت گویائی اور بلند و نازک
خیالی ان کے یہاں بھی نہیں تھی۔

منظر نگاری کے اعلا شاہکار صفیؔ کی ان نظموں میں ملتے ہیں
جو انھوں نے مسدس کی صنف میں کہی تھیں اور تقریباً ہر
سال ضمیمہ لخت جگر کے نام سے شائع ہوئی تھیں اور اب

مجموعی طور پر کتابی شکل میں بھی طبع ہو چکی ہیں۔ آل انڈیا شیعہ سوشل کانفرنس کے سالانہ اجلاسوں میں ہر سال ایک نیا مسدس تصنیف کر کے وہ پڑھا کرتے تھے۔ پہلا مسدس لخت جگر کے نام سے موسوم کیا تھا اور اس کے بعد ہر سال اسی کا ضمیمہ کہا جاتا تھا جس مقام پر اجلاس عام منعقد ہوتا تھا اس کی مختصر تاریخ اور وہاں کی منظر نگاری اس مسدس میں ہوتی تھی اور ساری نظم کا منشا سماج کی اصلاح ہوتا تھا۔ ایک زمانہ میں اس کانفرنس کے معرکۃ الآرا اجلاس ہوا کرتے تھے اور صفی کا "لخت جگر" کارروائیوں میں انہماک اور جوش پیدا کر دیتا تھا۔ مقامی حالات کی عکاسی و منظر نگاری مقامی لوگوں کے لیے بڑی وجد آفریں ہوتی تھی۔ بنارس کے اجلاس میں صبح بنارس بہت اچھی نظم کہی تھی۔ دریا کے کنارے اشنان کا سماں نظم کرتے ہوئے ایک بیت یہ کہہ دی تھی:

زیب و زینت سے وہ بالا شان محبوبی ہوئی
ساریاں قوس قزح کے رنگ میں ڈوبی ہوئی

اسی طرح جون پور کے اجلاس میں جونپور کے شاہی قلعہ کی تباہی کا حال بیان کرتے ہوئے یہ بیت پڑھ دی تھی کہ

ڈھب بتاتا ہے کہ چوٹوں سے بدن سب چور ہے
قلعہ کہتا ہے کنواں دل کا مرے ناسور ہے

بنارس میں متذکرہ بالا بیت پر مجمع جھومنے لگا تھا لیکن جونپور میں متعلقہ بیت سن کر حاضرین کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے تھے۔ ایسی مثالیں بے شمار و لاتعداد لخت جگر کے ضمیموں میں ملتی ہیں جن کو بالاختصار بھی پیش کرنا ممکن نہیں ہے پھر بھی مثال کے طور پر دو بند اس مسدس سے پیش کیے جاتے ہیں جو انھوں نے کانفرنس کے اجلاس منعقدہ بمبئی میں پڑھے تھے۔ تخاطب بمبئی سے ہے۔

ہر دو جانب کوہساروں کا تسلسل تا بہ دور
اور ان کے بیچ میں تو صورت بین السطور
اپنے سنگیں بازوؤں پر تجھ کو دیتا ہے غرور
روک دیتے ہیں جو طوفانی تموج کا عبور
دل ہے لبریز محبت آ گیا جب جوش میں
لے لیا بحر عرب کو حلقۂ آغوش میں

بے گماں ہندوستاں کا صدر دروازہ ہے تو
بلکہ رخسار عروس ہند کا غازہ ہے تو
اپنی آب و تاب سے ہر دم تر و تازہ ہے تو
ایک رنگا رنگ مجموعے کا شیرازہ ہے تو
آ کے جو صحبت میں بیٹھا کام کا جی ہو گیا
تیری چوکھٹ جس نے چھو لی نصف حاجی ہو گیا

اردو زبان کو نکھارنے، اردو شاعری کو اعلا مرتبت بنانے اور لکھنؤ کے مشاعروں میں روح تازہ پھونکنے کے ساتھ صفی نے مشاعروں اور مقاصدوں وغیرہ میں اپنا کلام پڑھنے اور سنانے کے لیے اپنی ایک مخصوص طرز بھی نکال لی تھی۔ اس زمانہ میں بالکل سادہ طریقہ سے اشعار اور غزلیں پڑھی جاتی تھیں ــــ ہر پڑھنے والے کا اپنا ایک مخصوص طرز تھا۔ محشر مرحوم فقروں اور الفاظ کو توڑ توڑ کر شعر سناتے تھے۔ عزیز مرحوم کے لب و لہجہ پر قرأت اور عربیت چھائی رہتی تھی۔ بعض اساتذہ کا پڑھنا اور روِ دنا ایک نوعیت کا تھا۔ انھیں فنکاروں میں کلیم بھی تھے جو زبان اور بیان کی خوبیوں سے علیحدہ ہو کر اپنے اشعار میں اپنے مخصوص تشکل و شباہت والے جسم کے حرکات و سکنات سے وزن پیدا کر دیتے تھے۔ لیکن صفی کی وہ پہلی ذات تھی جس نے ترنم سے پڑھنے کا طرز ایجاد کیا تھا لیکن ان کے یہاں بھی حسن صوت تھا غنائیت قطعاً نہیں تھی۔ ان کا پڑھنا خواص و عوام سب ہی کو مرغوب تھا اور اپنی اس خوبی کا ان کو خود بھی احساس تھا۔ وہ غنائیت سے علاحدہ رہ کر لحن سے اپنا کلام پڑھتے تھے اور سننے والوں کو اپنے کلام اور پڑھنے کے طرز سے مسحور کر لیتے تھے۔ اپنے پڑھنے کے بارے میں ایک بار خود انھوں نے یہ فرمایا تھا جو حرف بہ حرف صحیح تھا:

یہ حسن صوت گو مرغوب ہے طرز غزل خوانی
نہ لیکن یوں کہ سمجھیں اک معنی نکتہ داں مجھ کو

(بقیہ صفحہ ۳۶ پر)

فضا ابن فیضی
مئوناتھ بھنجن (یوپی)

غزل

کیا کہیں تجھ سے، جو نفعِ رائگاں ہم کو ملا
آگ کی بستی میں تنکوں کا مکاں ہم کو ملا

خوش نما لگتی ہے ان آنکھوں میں کاجل کی لکیر
مطمئن ہیں ہم کہ خوابوں کا دھواں ہم کو ملا

لمحہ لمحہ ہو رہے ہیں خرچ کیا رکھیں حساب
سود کہہ کر، زندگی بھر کا زیاں ہم کو ملا

دوسروں کو کیا خبر، ہر سانس ہے گفتارِ درد
یعنی اک خاموش آہنگِ فغاں ہم کو ملا

کوچہ، رنگِ حنا ہو یا دیارِ بوئے گل
ہر جگہ اپنے بکھرنے کا نشاں ہم کو ملا

ہم ہیں سر سے پاؤں تک سوکھے ہوئے کھیتوں کی پیاس
کن سلگتے بادلوں کا سائباں ہم کو ملا

ہر نفس اک تیر پہلو میں ترازو ہی سہی
کم نہیں اتنا، نصیبِ آہ وزاں ہم کو ملا

آئنے کے سامنے کیا آئنہ رکھتا کوئی
مصلحت اس کی، شعورِ ناتواں ہم کو ملا

اپنی پوری زندگی ہم نے لگا دی داؤ پر
فن کا یہ سودا نہ کچھ اتنا گراں ہم کو ملا

ہم سے پوچھو خاک بر سر آگہی کا ماجرا
کیا کہیں تم سے، زمیں پر آسماں ہم کو ملا

ہم فضاؔ سہتے رہے لفظ و معانی کا عذاب
نکتہ چیں ٹھہرا وہی، جو نکتہ داں ہم کو ملا

بدیع الزماں اعظمی
۱۴۳ - کرمی ٹولہ - اعظم گڑھ

مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم

سرزمین اعظم گڑھ ہمیشہ سے علم و دانش کا گہوارہ رہی ہے۔ خواہ وہ مولانا فاروق چریاکوٹی کا دیار ہو یا علامہ شبلی نعمانی کا، خواہ وہ مئو مبارک پور کا خطہ ہو یا سرائے میر کا۔ عربی، فارسی سنسکرت اردو اور ہندی کے کتنے ہی نامور عالم، پنڈت، ادیب اور شاعر آسمان ادب پر مہر و ماہ اور سہیل بن کر چمکے۔ یہیں کے معدن علم و ادب نے علامہ شبلی نعمانی کے بعد دنیائے ادب کو جو تابناک ہیرا دیا وہ مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم کی شکل میں تھا۔

دارالمصنفین (شبلی اکاڈمی) جن ارکان ثلاثہ سے عبارت تھی اُن میں ایک مولانا عبدالسلام بھی تھے۔ موصوف تصنیف و تالیف میں، شعر و شاعری میں، اسلوب نگارش میں، سادگی اور نیک نفسی میں حتیٰ کہ شان خط میں بھی اپنے استاد علامہ شبلی نعمانی کے صحیح جانشین تھے۔ آپ بھی اپنی گراں قدر تصانیف کی بدولت علم و فضل کے آسمان پر نیّر تاباں بن کر چمکے۔ اقبال سہیل مرحوم نے ٹھیک ہی کہا ہے:۔

اس خطۂ اعظم گڑھ پہ مگر فیضانِ تجلّی ہے یکسر
جو ذرّہ یہاں سے اٹھتا ہے وہ نیّرِ اعظم ہوتا ہے

مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم دارالمصنفین اعظم گڑھ کے ایک اہم ستون تھے۔ آپ نے اپنی قابل قدر تصنیفات کی بدولت شبلی اکاڈمی کو شہرت دوام کا مالک بنا دیا۔ وہ عالم بھی تھے اور ادیب بھی انشا پرداز بھی تھے اور تنقید نگار بھی، مورخ بھی تھے اور سیرت نگار بھی، شاعر بھی تھے اور فن شاعری کے رموز و اسرار سے وا کار بھی۔ مولانا شاہ معین الدین احمد سابق ناظم شبلی اکاڈمی کا کہ ہے کہ مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم ادب و انشا میں نہایہ ممتاز تھے اور علامہ شبلی نعمانی کی یہ وراثت ان کے حصہ میں آئی تھی۔ چمنستان ادب میں ان کا قلم بڑا سبک خرام تھا۔

مولانا عبدالسلام ۱۸۸۳ء میں علامہ شبلی نعمانی کے مو موضع بندول سے ایک میل بجانب شمال واقع موضع علاؤال پٹی میں پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم گھر کے مکتب میں پا کے بعد کانپور، آگرہ اور چشمۂ رحمت غازی پور میں تعلیم حا کی۔ ۱۹۰۶ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخلہ لیا۔ سنہ میں جب وہ وہاں سے فارغ التحصیل ہوئے تو علامہ شبلی نعـ نے انھیں جوہر قابل سمجھ کر وہیں پر عربی ادب کا استاد مقرر کر ۱۹۰۶ء میں ان کا پہلا مضمون "تناسخ" پر الندوہ میں شـ ہوا۔ یہ مضمون علامہ شبلی نعمانی کو اتنا پسند آیا کہ بطور حوصـ افزائی پانچ روپے انعام دے کر انھیں الندوہ کا نا ایڈیٹر اور پھر ایڈیٹر مقرر کر دیا۔ علامہ شبلی نعمانی کی دور نگاہوں نے مولانا عبدالسلام کے جوہر کو بھانپ لیا تھا اور ا کے متعلق یہ پیشین گوئی بھی کی تھی کہ وہ آگے چل کر ایک اچھے مـ ہوں گے۔ استاد کی یہ پیشین گوئی اپنے شاگرد رشید کے متعـ حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی۔

مولانا عبدالسلام ندوی ۱۹۱۲ء میں مولانا ابوالکلام آزاد کی
عوت پر کلکتے چلے گئے اور 'الہلال' کے ایڈیٹوریل بورڈ میں شامل
ہو گئے۔ دسمبر ۱۹۱۴ء میں جب اعظم گڑھ میں دارالمصنفین قائم کیا
یا تو وہ وہاں سے چلے آئے اور دارالمصنفین سے اپنا ناطہ جوڑ کر
از یست پیکر وفا بنے رہے۔ وہ شبلی اکاڈمی کے رکن اعظم بھی
تھے اور مولانا سید سلیمان ندوی کے دست راست بھی۔

مولانا طبعاً تہائی پسند تھے اور گوشہ نشین تھے۔ نام و نمود کی خواہش
تھی نہ شہرت کی تمنا مگر اپنی تصانیف کی بدولت ابدی شہرت کے مالک
ن بیٹھے۔ شبلی اکاڈمی کے ایک حجرہ میں رہ کر ۴۴ سال کی مدت کاٹ
ی۔ ہمہ وقت سوچتے رہتے تھے اور جب لکھنے بیٹھتے تو قلم برداشتہ
لکھتے تھے۔ اُن کا ذوق مطالعہ بہت معیاری تھا۔ اکثر لیٹ کر مطالعہ
یا کرتے تھے۔ ایک دفعہ مجھ سے فرمایا جانتے ہو 'چھوٹی جنت' کسے
ہتے ہیں۔ میں نے نفی میں جواب دیا کہنے لگے جاڑے کا موسم ہو مسہری
پر دبیز مگر نرم گدا ہو اور اس پر سفید چادر بچھی ہوئی ہو، ریشمی لحاف
جو عطر میں بسا ہوا ہو، نفیس پیچوان ہو اور چلم میں لکھنؤ کا خوشبودار
میرہ ہو، پیچوان کی نگالی ہاتھ میں ہو، سینہ پر کوئی اچھی کتاب کھلی
ہوئی ہو اور ورق الٹنے کے لیے ایک خادم موجود ہو۔ یہ ہے چھوٹی
جنت!

مولانا کی تصنیفی زندگی تقریباً پچاس سال کی ہے۔ مذہبیات
سے لے کر شعر و ادب تک ہر موضوع پر لکھنے کی یکساں قدرت تھی۔
ان کی تحریر کی سب سے بڑی خوبی اس کی سلاست اور پاکیزگی ہے،
لطف یہ کہ اس میں ادبی چاشنی کے ساتھ ساتھ فکری گہرائی بھی
پائی جاتی ہے۔ مولانا نے دو درجن سے زائد تصانیف چھوڑی ہیں
ان میں سے خاص خاص یہ ہیں :-

اسوۂ صحابہ (۲ جلدیں) اسوۂ صحابیات، سیرت
عمر بن عبدالعزیز، سیرت امام رازی، حکمائے اسلام
(دو جلدیں) تاریخ اخلاق اسلامی، القضا فی الاسلام،
انقلاب الامم، ابن خلدون، اقبال کامل، شعر الہند
(دو جلدیں)، مقالات عبدالسلام۔ سیرت النبی، اور حیات
شبلی، کی تالیف میں بھی ان کا حصہ تھا جس کے معترف خود سید
سلیمان ندوی صاحب ہیں۔

سیرت صحابہ کے لکھنے میں چونکہ مولانا نے پہل کی تھی اس لیے
بجا طور پر وہ اس راہ کے راہ نما کہے جا سکتے ہیں۔ تاریخ و سیر
کی کتابوں کے علاوہ تنقید نگاری میں بھی مولانا کی انشا پردازی
کے جوہر بدرجہ اتم نمایاں ہیں۔ 'اقبال کامل' اور 'مقالات عبدالسلام'
کے متعلق سابق ناظم شبلی اکاڈمی۔ قمطراز ہیں کہ 'اقبال کامل اقبالیات
کے ہر پہلو پر حاوی ہے۔ جن معلومات کے لیے ہزاروں صفحات کی
ورق گردانی کرنی پڑتی ہے وہ 'اقبال کامل' میں ایک جگہ مل
جاتی ہیں۔ ان کے مقالات کا خاص موضوع شعر و ادب ہے جس
کے وہ نکتہ سنج ناقد بھی تھے اور مورخ بھی۔

مولانا کو شعر و ادب سے فطری لگاؤ تھا اور اس پر ان کی
نظر بہت گہری تھی۔ چنانچہ انھوں نے اپنے استاد علامہ شبلی نعمانی
کی شعر العجم کے طرز پر شعر الہند تحریر کی۔ اس کی دونوں
جلدیں اردو شاعری کی تنقید میں اہم درجہ رکھتی ہیں۔ شعر و شاعری
سے مولانا مرحوم کی دلچسپی کے بارے میں شبلی اکاڈمی کے موجودہ ناظم
جناب صباح الدین عبدالرحمن صاحب کے خیالات ملاحظہ ہوں۔
وہ لکھتے ہیں :-

"مولانا عبدالسلام مرحوم جب اردو شعر و شاعری پر لکھنے
بیٹھتے تو ان کا قلم طاؤس کی طرح رقص کرنے لگتا۔ ان کی
شعر الہند اردو زبان کی ایک مایہ ناز تصنیف ہے اور
یہ اس صف میں رکھے جانے کے لائق ہے جہاں آب حیات
مقدمہ شعر و شاعری اور شعر العجم رکھی جاتی ہیں۔
اگرچہ شعر الہند پر تنقید و تنقیص کی چنگاریاں برابر برسائی
جاتی رہی تھیں لیکن اس کے باوجود مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں
کہ یہ چمنستان اردو کا ایک سدا بہار پھول ہے"

جناب ڈاکٹر خورشید نعمانی ردولوی اپنی تصنیف 'دارالمصنفین
کی ادبی خدمات' میں لکھتے ہیں کہ اردو تنقید میں شعر الہند کا ایک
تاریخی مقام ہے۔ اور جب بھی اردو شاعری کی تاریخ کا ذکر آتا ہے

تو شعرا الہند کو ایک تاریخی سنگ میل کی حیثیت دی جاتی ہے۔ اُن کا یہ بھی خیال ہے کہ انگریزی ادب کے مصنفین میں مولانا عبدالسلام مرحوم کا مقابلہ گولڈ اسمتھ سے کیا جاسکتا ہے۔ جن کے متعلق یہ کہا جاتا تھا کہ:۔

"HE WRITES LIKE AN ANGEL AND SPEAKS LIKE A POOR PAUL."

یہی قول مولانا موصوف پر بھی بالکل صادق آتا ہے۔

اعظم گڑھ ہمیشہ سے شعر و شاعری کا مرکز رہا ہے۔ علامہ اقبال سہیل اور مرزا احسان احمد بیگ کے ذوق سخن کی وجہ سے شعری نشستوں کا ماہانہ انعقاد ہوا کرتا تھا جن میں دیگر شعرا کے علاوہ مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی اور جگر مرادآبادی خصوصیت کے ساتھ شریک ہوتے تھے اور سامعین کو اپنے اپنے کلام سے محظوظ کرتے رہتے تھے۔ مولانا سید سلیمان ندوی کے دو اشعار بطور تبرک پیش کیے جاتے ہیں۔ اس شعر کو تو شاعر مشرق ڈاکٹر محمد اقبال نے خاص طور پر پسند کیا تھا جس کا اظہار موصوف نے بذریعہ خط کیا تھا:

ہزار بار مجھے لے گیا ہے مقتل میں
وہ ایک قطرۂ خوں جو رگِ گلو میں ہے

اور یہ شعر تو بیت الغزل کا درجہ رکھتا ہے:

دہن میں تیغ کے اب بھی ہے تشنگی باقی
عجیب لذتِ پنہاں مرے لہو میں ہے

مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم شمیم تخلص فرماتے تھے۔ صرف چند غزلیں ان کی یادگار ہیں۔ انھیں تصنیف و تالیف سے اتنی فرصت کہاں تھی کہ وہ قافیہ اور ردیف کے جھمیلوں میں پڑتے۔ چونکہ وہ محقق فن تھے اور محاسن شعری سے بخوبی واقف تھے اس لیے ان کے اشعار فن تنقید کی کسوٹی پر پورے اترتے تھے۔ طوالت کے خیال سے موصوف کی صرف تین غزلوں کے تین تین اشعار پیش کیے جاتے ہیں جو سلاست و روانی کا مکمل نمونہ ہیں۔ آپ انھیں ملاحظہ فرمائیں:۔

کر دے بے خود سنگھا کے زلف کی بُو   چھین لے آج مجھ کو تو مجھ سے
یاد اس چشمِ مست کی آئی   چھین لو ساغر و سبو مجھ سے
ہیں اشارے یہ موجِ مے کے شمیم   کر بھی لو آج تم وضو مجھ سے

بجھے دل کا چراغ اے شمع رو آج   جلا دے اپنے روئے آتشیں سے
چھپے چوری جو کچھ کرنا ہو زاہد   کھلا راز اس کا اک گوشہ نشیں سے
تری انگڑائیاں کہتی ہیں مجھ سے   تجھے کچھ ملنے والا ہے کہیں سے

جہاں دیکھتے ہیں جدھر دیکھتے ہیں   فقط اک فریبِ نظر دیکھتے ہیں
اشارہ جو پائیں تو تم کو بھی دیکھیں   ابھی تو تمھاری نظر دیکھتے ہیں
نظرباز بن کر شمیم اس گلی میں   تماشائے اہلِ نظر دیکھتے ہیں

(اس گلی کا اشارہ قارئین خود اپنے ذوقِ نظر کی بنا پر کر سکتے ہیں)

انھیں شعری نشستوں کی بدولت حضرت جگر مرادآبادی نے اپنا مقام اعظم گڑھ جیسی سرزمین شعر و ادب پر پیدا کر لیا۔ مرزا احسان احمد بیگ نے جگر پر ایک مضمون بعنوان 'اہالیان دلی و لکھنؤ کے لیے ایک خوان ادب' لکھ کر حضرت جگر کو ارباب ذوق سے متعارف کرایا۔ اور داغ جگر پر ایک بسیط تعارفی مقدمہ لکھ کر حضرت جگر کو دنیائے شاعری کے آسمان پر پہنچا دیا۔ اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جگر کو جگر بنانے میں اعظم گڑھ کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔

شعر و شاعری کی جو شمع اس وقت روشن کی گئی تھی اسے آج بھی 'ایوان ادب' اعظم گڑھ زندہ کیے ہوئے ہے مگر وہ بات کہاں مدن کی سی۔ اب نہ وہ لوگ ہیں اور نہ اُن جیسے قادر الکلام شاعر۔

مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم کے دو تفریحی مشاغل تھے۔ ایک تو شام کے وقت دو تین میل ٹہلنا اور دوسرا پھولوں کا رقص دیکھنا اور ان سے زیر لب باتیں کرنا۔ مولانا مرحوم روزانہ شام کے وقت ٹہلنے کے عادی تھے۔ وہ پھولدار شیروانی میں ملبوس داہنے ہاتھ میں چھڑی لیے اور بائیں ہاتھ کی انگلیوں کو مونچھوں پر رکھے ہوئے

نکل جاتے تھے۔ وہ کھلی فضا کے بجائے بازار اور آبادی میں ٹہلنا زیادہ پسند کرتے تھے۔ میلوں ٹھیلوں میں ضرور جاتے اور وہاں کی چٹپٹی چیزیں ضرور کھاتے۔ راہ میں ملنے والوں سے سلام وکلام کرنے میں کبھی تو سبقت کر بیٹھتے اور کبھی کسی خیال میں گم سلام کا جواب تک نہ دیتے تھے۔

مولانا پھولوں کے عاشق تھے۔ گلاب ان کا پسندیدہ پھول تھا۔ نماز فجر کے بعد گلاب کی کیاریوں کے پاس کھڑے ہو کر ان کا رقص دیکھتے۔ کھلے ہوئے گلاب کی خوشبو سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اس کی دلآویز رنگت، اس کی نازک پنکھڑیوں کی رعنائی، زیبائی اور چاک دامانی کو دیکھ کر ان کے ذہن میں شاید وہی خیالات آتے رہے ہوں گے جن کی ترجمانی حضرت ریاض خیرآبادی کے اس شعر سے ہوتی ہے:

گل مرقع ہے ترے چاک گریبانوں کا
شکل معشوق کی انداز ہے دیوانوں کا

مولانا عبدالسلام مرحوم نے اپنے استاد کے خواب کو پورا کر کے ایک کامیاب مصنف بن کر بالآخر ۴ اکتوبر ۱۹۵۶ء کو داعی اجل کو لبیک کہا۔ وہ اپنے استاد علامہ شبلی نعمانی کے مزار کے قریب ہی سپرد خاک ہوئے۔ عالم ارواح میں مرحوم کو اپنے استاد کی قدم بوسی کا شرف حاصل ہوا ہوگا۔ شاگرد کے شاندار کارناموں کو جان کر استاد کو فخر بھی ہوا ہوگا اور اپنی پیشین گوئی کی صداقت پر روحانی مسرت بھی حاصل ہوئی ہوگی۔

★

صفی لکھنوی ——— صفحہ ۸ کا بقیہ

تصنع سے پوری طرح اجتناب کی یہ وجہ بھی تھی کہ وہ متشرع بزرگ تھے۔ مولانا سید علی نقی صفی نے مذہبی ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں اور [illegible] پائی تھی اس لیے ان کا متشرع ہونا فطری بات تھی۔ لیکن ان کے خیال و عمل کا دامن کبھی عصبیت و تنگ نظری سے آلودہ نہیں ہوا۔ مذہبیت نے ان میں وسیع النظری اور بلند کرداری کے جوہر فراہم کیے اور اعلا تعلیم نے ان خصوصیات کو اور زیادہ درخشاں کر دیا تھا۔ جیسا انتہا درجہ بردبار اور منکسر المزاج انسان تھے مزاج میں شگفتگی تھی اور سخت سے سخت مشتعل کرنے والے حالات میں بھی ان کی جبیں پر کبھی شکن نہیں آتی تھی۔ تکلیف دہ حالات میں اور ناقابل برداشت کلمات کو سن کر بھی سکوت سے کام لیتے تھے۔ طبیعت میں بہت سادگی تھی اور ذہن بھی فقیرانہ تھا۔ ان کے قدردانوں میں بڑے بڑے صاحبان دولت و ثروت تھے لیکن انھوں نے کبھی کسی کے آگے دست سوال دراز نہیں کیا یہاں تک کہ مہاراجہ سر محمد علی محمد خاں والی محمود آباد کا ایسا پرستار ہوتے ہوئے بھی ان کا کلیات تو در کنار کوئی دیوان تک نہیں چھپ سکا۔ مہاراجہ کی فرمائش اور اصرار پر سات مجموعے مرتب کر لیے تھے اور ہر مجموعہ صحیفۃ الغزل، صحیفۃ القصائد، صحیفۃ الاعداد وغیرہ وغیرہ کے نام سے موسوم کر کے مکمل کر لیا تھا لیکن ان کو طباعت و اشاعت کی خاطر مہاراجہ کے حضور پیش کرنے کی وہ کبھی جسارت نہ کر سکے اور وہ سارا سرمایہ نامرادی کی نذر ہو گیا۔

★

نہال رضوی
کشمیری محلہ۔ لکھنؤ

غزل

دوست برتاؤ کیا کرتے ہیں دشمن کی طرح
ہاتھ الجھتے ہیں گریبان سے دامن کی طرح

بے رخی کا تری افسانہ کہا کرتی ہیں
میری آنکھیں کبھی شبنم کبھی ساون کی طرح

ہائے وہ لوگ جو ہیں فکر نشیمن میں تباہ
ہم نشیمن میں ہیں محروم نشیمن کی طرح

جب سے بدلا ہے توجہ کا تمھاری انداز
زندگی ہے مری ٹوٹے ہوے بندھن کی طرح

کچھ دنوں سے مہ و انجم کی ضیائیں اے دوست
میرے گھر کیوں نہیں آتیں ترے آنگن کی طرح

اس کو کیا کہیے محبت کی کرامت کے سوا
ان کی آنکھوں میں نمی ہے مرے دامن کی طرح

کبھی زنجیر محبت کی پہناتی ہے وہ زلف
کبھی ڈس لیتی ہے بپھری ہوئی ناگن کی طرح

جب بھی پھیلی ہے تری حسنِ تبسم کی شمیم
مہک اٹھی ہے فضا خندۂ سوسن کی طرح

عزت نفس بھی اس دور ترقی میں نہال
لوگ بیچ آتے ہیں ٹوٹے ہوے برتن کی طرح

فرحت جہاں
۱۱/۳۴ ساؤتھ ٹی ٹی نگر بھوپال

کرشن چندر ــــ رومانویت اور حقیقت کا سنگم

رومانویت اور حقیقت کو ایک دوسرے کی ضد کہا جاتا ہے، اگر رومانویت سنہری ہے تو حقیقت کا رنگ سیاہ ہوتا ہے۔ رومانویت فطرت سے رغبت، داخلیت آراستہ دپُرشکوہ پس منظر، تصور کے غلبے، حزن و فراریت، آزادی کی جستجو، قرون وسطیٰ میں دلچسپی، آراستگی و زیبائش اور توہم پرستی کا نام ہے تو حقیقت پسندی ایک مستقل پیش کش ہے اشکال کی۔ اس کا رجحان امارت سے افلاس کی طرف، حسن سے بدصورتی کی طرف، ہیئت اور حسین انداز بیان کے بجائے خیال اور مضمون کی طرف، جذبہ کے بجائے فکر کی طرف، پریوں اور گلفام کے بجائے پتھر کوٹنے والی اور کام کرنے والی عورت کی طرف ہوتا ہے۔

اردو ادب کا ابتدائی دور بھی رومانی داستانوں سے مزین و منقش ہے۔ اس دور کا ادب پری، ہمزاد، موکل، تخت سلیمانی، سرمہ کی سلائیاں اسم اعظم جیسی چیزوں سے پُر تھا۔ جو آنکھوں سے اوجھل تھیں۔ اور ایسے واقعات جن کا ہونا حقیقی دنیا میں ممکن نہ تھا لیکن قارئین کو ان پر پورا پورا اعتقاد تھا، ادب میں جگہ جگہ رونما ہوتے تھے جن میں تحیر کے ساتھ ساتھ حزن والم، جدائی و مفارقت کے آنسو اور حیرت انگیز داستان کی خصوصیت ہوتی تھی۔ گویا داستان حقیقی زندگی کے کرب و اذیت سے فرار کا بہترین اور خوبصورت ذریعہ تھی۔

لیکن جیسے جیسے زندگی میں سائنٹفک نظریات داخل ہوتے گئے قارئین کی پسند اور ناپسند اور مزاج میں بھی تبدیلی آتی گئی۔ میر امن کی باغ و بہار اور سرور کی فسانۂ عجائب لوگوں کو ایک دفتر بے معنی نظر آنے لگیں۔ جن، پریاں، موکل اور جادوگر فہم و ادراک سے بالاتر نظر آنے لگے۔ لیکن اس کے باوجود اردو ادب کے بازار میں رومانویت کا سکہ چلنا بند نہ ہوا حقیقت سے دور ماورائیت کی فضاؤں میں اب بھی رنگ و نور نظر آتا تھا اور غیر ارضی حسن میں زیادہ دلکشی نظر آتی تھی۔ حجاب امتیاز علی، ڈاکٹر بجنوری، سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتحپوری اور مجنوں گورکھپوری رومانویت سے پُر کہانیاں لکھ رہے تھے۔ رومانوی کہانیوں پر صنوبر کی شاخیں اپنا سایہ کئے رہتی تھیں تاکہ زندگی کی دھوپ اور تمازت سے احساس کو محفوظ رکھا جا سکے۔

۱۹۳۵ء میں اردو ادب نے انقلاب کا دہل بجا دیا اور ایک نئی تحریک کا آغاز کیا جو ترقی پسند تحریک کے نام سے موسوم ہوئی۔ یہ تحریک اردو ادب میں ایک نئے انقلاب کا پیغام لائی، جس نے زبردست کارنامہ انجام دیا۔ ادب کو رومانویت کی ماورائی فضاؤں سے نکال کر، ہیئت اور آرائش کی محفلوں سے اٹھا کر، پرانی قدروں اور روایتوں کو پس پشت ڈال کر زندگی کی تلخ حقیقتوں، کرب و اذیت، بھوک، روٹی، ظلم، اور جنس کو ادب کے صفحات پر بکھیر دیا۔ سماجی رشتوں کو استوار کیا، سماج کی بے چینی، اضطراب اور کشمکش کو موضوع بنایا فراریت، کھوکھلی رومانویت، تخیل پرستی، سطحیت، ہیئت پرستی کے بجائے سائنس کی روشنی میں حقیقت پسندی، سامراج دشمنی اور آزادی کے

کرشن چندر کے ابتدائی افسانوں پر رومانویت کا غلبہ کچھ زیادہ تھا۔ اس وقت انھیں زندگی سے زیادہ تخیل کو آراستہ کرنے کا خیال تھا چنانچہ اس دور کے کرداروں میں جذباتیت ہوتی تھی، ان کرداروں کو زندگی کی ناآسودگیوں کا شکوہ تو ضرور تھا لیکن جدوجہد کرنے کی ہمت نہ تھی، ولولہ نہ تھا۔ ان میں درد و حزن کا پہلو زیادہ تھا۔ "طلسم خیال" کی کہانیوں میں رومانوی فضا زیادہ نظر آتی ہے لیکن ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک نے زور پکڑا تو کرشن چندر کے فن میں بھی ایک موڑ آیا اور انھوں نے اس خیال کی تائید کی کہ "ہر ادیب اشتراکیت کا کھلم کھلا پروپیگنڈہ کرے"۔ لیکن اپنے رومانوی نقطہ نظر اور فطری تقاضہ کے زیر اثر حقیقت کی تلخی میں انھوں نے رومانویت کے عنصر کو بھی شامل کر لیا۔ لیکن کرشن چندر کی رومانویت زندگی سے گریز اور فراریت کا نام نہیں ہے نہ ہی اس کا یہ مفہوم ہے کہ زندگی کی تلخیوں سے آنکھ چرا کر تخیل کی آغوش میں پناہ لی جائے نہ ہی وہ فن برائے فن کے قائل ہیں بلکہ فن کو زندگی کی اصلاح کا ذریعہ بھی بنانا چاہتے ہیں۔

کرشن چندر کی رومانویت ان کے افسانوں کے پس منظر اور حسین انداز بیان پر مشتمل ہے۔ کرشن چندر نے فن اور زندگی کا بہت گہرائی سے مطالعہ اور مشاہدہ کیا ہے۔ اسکی حقیقتوں اور نزاکتوں کو بخوبی سمجھا اور محسوس کیا ہے بات دراصل یہ ہے کہ وہ فطرتاً حسن پرست تھے اور ان کی نگاہ جمال آشنا تھی۔ وہ ہر حسین چیز کے شیدائی اور عاشق تھے چاہے حسن کسی بھی انداز میں نظر آئے۔ ان کے احساس میں ارتعاش پیدا کر دیتا تھا جس طرح مضراب کی چوٹ سے ساز میں سے نغمہ نکلتا ہے اسی طرح حسن کی مضراب جب کرشن چندر کے ساز دل پر پڑتی ہے تو اس میں سے دلکش نغمے نثر کی شکل میں نکلنے لگتے ہیں بقول ریوتی سرن شرما:

"خوبصورت خیال ہو، خوبصورت تصویر ہو، خوبصورت ابتدا ہو، خوبصورت انجام ہو، خوبصورت لفظ ہو، خوبصورت تشبیہ ہو اور تو اور بدصورتی کا بھی کوئی خوبصورت پہلو ہو، پہلو نہ سہی اظہار ہی ہو۔ کرشن چندر اور اس کا جمالیاتی انسان ان کی طرف مائل ہوں گے اور ایسی شدت سے مائل ہوں گے جیسے عاشق اپنی محبوبہ کی طرف ہوتے ہیں۔"

اس ارض و سما میں حسن چاروں طرف بکھرا ہوا ہے۔ قدم قدم پر فطرت کے حسین و دلنشیں نظارے دعوت نظارہ دیتے ہیں لیکن حسن کے مشاہدے کے لیے نگاہ کا جمال آشنا ہونا بھی ضروری ہے حسن نگاہ میں ہوتا ہے۔ یہ کہاوت صحیح نظر آتی ہے کہ جیسی نظر ویسے نظارے۔ اگر نگاہ میں حسن نہ ہو تو کتنے ہی مظاہر منظر کے سامنے سے گذر جائیں جستیاتی نظام میں ارتعاش کی خفیف سی لہر بھی نہ اٹھے گی لیکن کرشن چندر کے احساس کی عطر بیزیاں کیسی کیسی رعنائیاں اور دلربائیاں تلاش کر لیتی ہیں۔ مثلاً یہ سطریں ملاحظہ کیجیے۔

"یہ چنبیلی کی خوشبو دیکھئے۔ کیسی کم عمر نوخیز چھریرے بدن والی، نازک کمر والی خوشبو ہے۔"

کرشن چندر کو کچھ مخصوص چیزوں ہی میں حسن نظر نہیں آتا بلکہ نازک بدن خوش ادا ہرنیوں اور کلغیوں والے جنگلی مرغوں یا درختوں کو چھیڑتی ہوئی ہوا میں بھی حسن نظر آتا ہے۔

کرشن چندر نے اگر گرتے ہوئے آبشار، مسکراتے ہوئے پھولوں، کشمیر کی بلند پہاڑیوں، برف پوش وادیوں، خوبانیوں کے جھنڈ، میدانوں میں کھلتے ہوئے لالہ زار اور یوکلپٹس کی ہلتی ہوئی ڈالیوں کا تذکرہ کیا ہے تو سماج کی فرسودہ اور کہنہ روایات منفی رجحانات، بے اطمینانی، انتشار، بھوک، بے چینی، ظلم، آہوں اور سسکیوں کا بھی ذکر کیا ہے اور انسان کی بے رحمی، بربریت اور ظالمانہ فطرت کو بے نقاب کر دیا ہے۔ انھوں نے سماج کی فرسودہ روایات کے خلاف آواز اٹھائی اور انسان دوستی پر زور دیا۔ انھوں نے عام انسان کی ہر دھڑکن کو اس کی امیدوں اور معصوم آرزوؤں کو اس کے کرب اذیت اور آنسوؤں کو اس کے خوف کو اپنی کہانیوں

کا موضوع بنایا۔ زندگی کے تلخ حقائق پر ان کی نگاہ بہت گہری تھی اور بڑے سلیقہ اور شعور کے ساتھ وہ ان حقائق کی عکاسی کرتے ہیں۔ انسانی فطرت کے موڑ پیچ و خم شرافت اور رذالت کی بھرپور تصویر کشی میں ان کو کوئی پس و پیش نہیں ہوتا۔ قاری کو زندگی کی تلخیوں، سماجی کشمکش اور سرمایہ دارانہ ظلم و ستم کا احساس دلانا وہ اپنا فرض سمجھتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ کہانی کی فضا میں رومانویت برقرار رکھنا بھی ضروری سمجھتے ہیں کرشن چندر نے جام بلوری میں جو شراب انڈیلی اس کو پی کر قاری بدمست، مدہوش اور بے راہ رو نہیں ہوتا بلکہ کچھ نہ کچھ کرنے کی تڑپ اس کو بے چین کر دیتی ہے۔ وہ پریم چند کے کسان کی طرح قسمت پر صابر و شاکر ہو کر بیٹھ نہیں رہتا بلکہ اس میں جوشش امنگ اور ایک ولولہ پیدا ہو جاتا ہے۔ فرسودہ سماج کے خلاف جد و جہد، فرسودہ ضوابط سے انحراف اور تفریق برتنے والے نظام کو بدل دینے کی تڑپ پیدا ہو جاتی ہے۔

زندگی مکمل طور پر طربیہ ہے نہ حزنیہ۔ شاخ گل اگر باد صبا کے جھونکوں میں خوشی سے لچکتی ہے تو آفتاب کی کرن مژدہ سوگواری بھی سناتی ہے۔ کچھ اسی طرح غم و الم کے بادلوں میں امید کی روشنی بھی کہیں جگمگاتی رہتی ہے جس طرح خزاں کی ویرانی بہار کی آمد کا پیغام دیتی ہے۔ زندگی تلخ سہی اذیتوں سے لبریز سہی، لیکن اگر اس درد میں مسرت کا تھوڑا سا احساس بھی شامل کر دیا جائے تو قنوطیت نہیں پیدا ہونے پاتی ہے۔ کرشن چندر کی یہی خوبی ہے کہ وہ دکھ درد میں بھی لبوں پر مسکراہٹ لے آتے ہیں اور حقیقت کی تمازت میں رومانویت کی لطافت اور نزاکت ڈھونڈ لیتے ہیں۔

"اس کی نیلی آنکھوں کی حزیں موہنی، اس کے لبوں کی پتلی خمیدہ مسکراہٹ جیسے پہلے دن کے چاند کا سیمیں کنارہ، اس میں ایسی پاکیزگی تھی جو مرتے ہوئے بیماروں کے دلوں پر تسکین کا پھاہا رکھتی تھی ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ مسکراہٹ سب کچھ سمجھتی ہے سب کچھ جانتی ہے جیسے ساری کائنات کے دکھ درد کا بار اپنے نازک قوس پر اٹھائے ہوئے ہے کہ بیچین اسے دیکھتے ہی اپنے درد میں کمی محسوس کرتا اسے معلوم ہوتا گویا وہ کرب انگیز طوفانی لہریں جو اس کے پیٹ اور دھڑ میں تڑپ رہی ہیں اب مدھم اور ہلکی ہوتی جا رہی ہیں"

کرشن چندر کی کہانیاں پڑھ کر کچھ ایسا لگتا ہے گویا....

ان کا فن اس عورت کی طرح ہے جس میں حسن صورت بھی ہے اور حسن سیرت بھی۔ یعنی اس میں دونوں گن موجود ہیں۔ گویا موضوع اور مواد کی گہرائی اور وسعت کے ساتھ ساتھ انداز بیاں بھی بہت دلکش اور دل آویز ہے جس کی اثر آفرینی سے انکار کی گنجائش نہیں۔ اور پھر زندگی کی ہر بامعنی حرکت احساسات کا پیچ و خم دل کی دھڑکنوں کا زیر و بم ان کے قلم میں رچ بس کر صفحۂ قرطاس پر بکھرا ہے۔ تخیل اور مشاہدہ سے ان کی تخلیقی صلاحیتوں اور شعور کو غذا ملی ہے۔ ایک رنگا رنگ افق پر انھوں نے کمند پھینکی اور زندگی کے ان گنت موضوعات اور کیفیات سے ذہنی اور جذباتی رشتہ جوڑا ان کا یہ عمل ان کے مشاہدہ کی گہرائی، مطالعہ کی وسعت اور تخیل کی بلندی کا ثبوت ہے پھر لفظوں کی تراش خراش، حسین الفاظ کا اجتماع، طنز و مزاح کی آمیزش، فطرت کا پھیلا ہوا حسن اور اس کے ساتھ ساتھ انسان کی سنگدلی، حیوانیت اور بربریت کی بھرپور عکاسی ان کی کہانیوں میں ملتی ہے۔ اس طرح ان کی تخلیقات رومان اور حقیقت کا بڑا خوبصورت امتزاج بن گئی ہیں۔ کچھ ایسی آراستگی اور مشاطگی سے انھوں نے افسانہ کے بکھرے گیسوؤں کو سنوارا ہے اور اس کے حسن کو رونق بخشی ہے کہ شعوری کوشش اور صناعی کے باوجود اس طرح کی بے ساختگی اور سادگی کہیں نظر نہیں آتی جس طرح دوشیزہ کی بے نیازی میں آرائش جمال کی ایک ادا ہوتی ہے۔

★

ڈاکٹر ابو محمد سحر
۲۹- مالویہ نگر
بھوپال-۳

غزل

فقط جنوں ہی نہیں آگہی کی بستی ہے
ذرا سنبھل کے چلو شاعری کی بستی ہے

شبِ سیاہ نہیں ہے مآلِ بے خوابی
مری نگاہ میں اک روشنی کی بستی ہے

نگر ہے چاند کا گھنگھور بادلوں کے پرے
اندھیری رات میں اک چاندنی کی بستی ہے

خوشی کے دیس کی حد ہے کسی کے ملنے تک
پھر اس کے بعد تو افسردگی کی بستی ہے

ہمارے گرد ہے تنہائیوں کا ایک حصار
یہاں نہ بات کرو خامشی کی بستی ہے

نہ پاسِ درد، نہ مہر و وفا نہ حسنِ خلوص
خطا معاف! یہی آدمی کی بستی ہے

دیارِ حسن میں آؤ تو ذوقِ فن لے کر
مقامِ رقص ہے یہ راگنی کی بستی ہے

جمالِ یار ہے اک شہرِ رنگ و نورِ سحر
نگاہِ ناز ہے یا سرخوشی کی بستی ہے

جوہر نظامی
درگاہ پٹنہ ۶

خوابِ سحر

چاندنی سے تھی منور چرخ کی روشن جبیں
ہنس رہے تھے بال بکھرائے گلستاں میں حسیں
ہنس رہا تھا میری آنکھوں میں جہانِ رنگ و بو
باغ کی دوشیزگی کو تھی کسی کی جستجو
تھیں در و دیوار پر چھائی ہوئی رنگینیاں
چاندنی میں بے تحاشا گا رہی تھیں ندیاں
گا رہے تھے جنگلوں میں مطربانِ لالہ زار
بہہ رہے تھے کوہ کے دامن سے رنگیں آبشار
صبح کی دوشیزہ آ کر رات پر چھانے لگی
چاند کے نغماتِ آخر کی صدا آنے لگی
دہر پر چھانے لگیں انوار کی پرچھائیاں
خواب کو شانِ جہاں لینے لگی انگڑائیاں
روح کی تابندگی کا راگ دل کے ساز پر
چھیڑ کر روشن کیے خفتہ چراغِ بام و در
یک بیک بہنے لگیں پھر ندیاں جذبات کی
پھر بھڑک اٹھی فسردہ آگ محسوسات کی
پھر کسی کی جستجو میں دل مرا کھونے لگا
اور کچھ ممکن نہ تھا تو بے سبب رونے لگا
اے خیالِ حسن تو نے ہائے یہ کیا کر دیا
دولتِ احساسِ غم سے میرے دل کو بھر دیا
سوز بن کر شام کے کافر اندھیروں میں بھی آ
ساز بن کر صبح کی پُرنور کرنوں میں بھی آ

شوکت عثمان
ترجمہ۔ ایس۔ ایم۔ حیات
تامل ناڈو پبلک سروس کمیشن
ماؤنٹ روڈ۔ مدراس ۲...

(ایک بنگلہ کہانی)

نئی زندگی

اس جگہ گومتی یکایک بل کھاتی ہوئی ترچھی مڑ کر پھر سیدھے راستے پر بہنے لگی ہے۔ ایک طرف سیلاب کی روک تھام کے لئے باندھ بنا دیا گیا۔ چوڑا سا باندھ کسی مرد آہن کے دیو ہیکل ہاتھ کی طرح دور دراز کے کھیت کھلیان اور بستیوں تک پھیلا ہوا ہے دوسری جانب دکھائی دینے والی افق کی لکیر شاید اس شجاع اور دلیر کی بھینچی ہوئی مٹھی ہے۔ جو ڈھلتے سورج کی کرنوں سے شفق گوں ہو گئی ہے یا کسی مصمم ارادہ یا ناقابل شکست فیصلہ کی سختی کے باعث سرخ ہو گئی ہے۔ گومتی اسے ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھ رہی ہے۔ وہ کسی کے انتظار میں بے چین اور مضطرب نظر آ رہی ہے۔ ندی کی ہلکورے کھاتی ہوئی موجیں اس کے احساسات کو توڑتی مروڑتی ہوئی ابل رہی ہیں۔ موقعہ پا کر طوفانی بادلوں نے گومتی کے ٹھیک اوپر اپنا سائبان سا تان دیا ہے۔ خلاؤں میں پرواز کرتے ہوئے عقاب اس عجیب منظر میں مزید رنگ بھر رہے تھے اور گومتی کی سطح پر بہتی ہوئی چھوٹی چھوٹی کشتیاں، تجارتی اسٹیمر اور قرب و جوار کے بھری گھاٹ اس منظر میں گھل مل گئے تھے۔ یکایک گومتی پھولنے لگی۔

"گومتی، سالی اٹھیا گئی ہے!"

کشتی سے فراز علی کی آواز سنائی دی۔

وہ کشتی پر مضبوطی سے پتوار پکڑے ہوشیار ہو گیا گیارہ برس کا معصوم بچہ عکاس بھی صورت حال کی سنجیدگی کو سمجھ کر باپ کا ہاتھ بٹانے میں جی جان سے لگ گیا تھا۔ آسمان کی چڑھی ہوئی تیوری دیکھ کر فراز علی کئی خدشات کا شکار ہو گیا تھا۔

آندھی پانی کے آثار صاف عیاں تھے کچھ ہی عرصہ میں گومتی کی سطح گھنے بادلوں کے سائے سے سیاہ ہو گئی تھی ڈوبتے سورج کا کہیں نام و نشان بھی نہ تھا۔ فراز علی کو لہروں میں بہتے ہوئے ایک زمانہ گزر گیا تھا۔ وہ بہت آسانی سے ہر موسم کے تیور بھانپ لیتا تھا۔ کشتی کی چھاؤنی تلے بجھی ہوئی انگیٹھی میں آگ کی چنگاریاں کہیں دبی پڑی تھیں۔ اخیر پھونک پھونک کر اس نے بیڑی سلگائی اور کش لینے لگا۔ اس کے تھکے ہوئے بدن میں تازگی آ گئی۔ آج مچھلی ملنے کی کوئی امید نہ رہی۔ پانی کے تند و تیز بہاؤ سے ندی کے کنارے کی گیلی مٹی کھسک رہی تھی۔ وہ دانت پیستا ہوا گرجا۔ "سالی! بے حیا!! بے شرم!!!" — پانی کا چڑھاؤ اٹھنے لگا۔ عکاس پتوار چلاتے چلاتے پسینہ میں شرابور ہو گیا تھا۔ فراز نے بیٹے کا حوصلہ بڑھایا — "شاباش! خوب چلانا سیکھ گیا ہے تو!" عکاس اپنی تمام تر قوت کے ساتھ پتوار چلا رہا تھا اس کے بازوؤں کی حرکت قابل دید تھی۔ مخالف رخ پر بہاؤ کے باعث ناتجربہ کار عکاس کی سانسیں پھول گئیں۔

خوف کے عالم میں اس کے منھ سے نکل پڑا۔ ابا جان!

فراز علی تاڑ گیا کہ عکاس اس کے ہاتھ میں پتوار دے کر خود ڈانڈ کی رسی پکڑنا چاہتا ہے لیکن پانی کے اس تیز

بہاؤ میں اس سے رتی بھی تو نہ سنبھلے گی۔

"سالی بھڑک گئی ہے آج!" فراز علی برابر بکتا رہا۔ گومتی سے اس کا کچھ ایسا ہی رشتہ جڑ گیا تھا۔ گٹھیلے بدن اور لمبے قد کا گبرو جوان، فراز علی شکل و صورت سے کسی سمندری جانور جیسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے دریا سے اس کا قریبی رشتہ استوار ہو چکا ہے۔ کوئی اسے غور سے دیکھے تو بات سمجھ میں آجائے گی۔ صحت مند مردانہ چہرہ، انگارے جیسی آنکھیں، جب وہ اپنے ماہر ہاتھوں سے کشتی کو ہوا کے مخالف رخ میں ٹھیلنے لگتا ہے تو اس کے گٹھیلے جسم پر کئی مچھلیاں سی ابھر آتی ہیں اور کسی فوج کے جفاکش سپہ سالار کا جیسا جوش خروش اس میں نظر آتا ہے لیکن آج طوفانی ہوا کا ایک جھونکا اس تندی اور تیزی کے ساتھ آگیا تھا کہ ایک لمحہ کے لیے وہ بھی بے قابو ہو گیا۔ دانت میں کر اس نے کشتی کی رسی کھینچ لی اور اسے پوری طاقت سے پکڑے رہا۔ عکاس بھی طوفان کا مقابلہ جواں مردی سے کرتا رہا۔

"بچوا ذرا آہستہ سے ڈانڈ مارنا۔"

"کاہے کو۔ باجان؟"

"یہیں پر ہمارے باپ دادا کا مکان تھا۔ اور بڑے چچا کی قبر بھی یہیں کہیں تھی۔!"

"چچا کی؟"

"ہاں! تو انھیں نہیں جانتا، وہ اپنے زمانے کے مشہور مچھیرے تھے۔ اور ایک اچھے تیراک بھی۔ لوگ انھیں سمندری گھوڑا کہتے تھے۔"

"پھر ___؟"

"ارے ارے رے! پھر کیا؟"

فراز علی نے عجیب انداز سے مسکراتے ہوئے اپنے بیٹے سے کہا:

"ایسا ہی طوفانی موسم تھا۔ چچا جان کشتی پر مچھلی کا شکار کر رہے تھے۔ گومتی سالی پاگل ہو گئی تھی۔ بے چارے ڈوب گئے۔!"

خوف سے عکاس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔

"کیوں رے کچھو ندر! ڈر گیا کیا؟ اپنے میں کوئی ایسا ویسا مچھیرا نہیں! گومتی سالی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی!" فراز کہتا جا رہا تھا۔

"ابا جان!" ___ مایوسی کے عالم میں عکاس یکایک چیخ اٹھا اس کی پتوار دلدلی مٹی میں دھنس گئی تھی۔

فراز علی نے کمر سے رسی کس کر باندھ لی اور بہت مشکل سے پتوار کو دلدلی مٹی سے نکال لیا۔ عکاس پیچھے سے اسے پکڑے رہا۔ طوفانی بادل جنگلی درندوں کے جھنڈ کی طرح دھاڑتے ہوئے چلے آرہے تھے۔ نیچے گومتی بل کھا رہی تھی۔ عکاس سانس روکے کشتی چلا رہا تھا۔ تھوڑی ہی دور پر ندی کنارے باندھ کے قریب نظر آنے والے چھوٹے سے گاؤں میں فراز علی اور کئی مچھیروں کی جھونپڑیاں ہیں۔ پھوس کی جھونپڑیاں گوبر سے لیپے پوتے آنگن، کیلے کے درخت اور مچان پر جھکی ہوئی کدو کی بیل نظر آرہی ہے۔ فراز علی کی جھونپڑی کے آنگن میں ایک پالتو طوطے کا پنجرہ جھول رہا ہے۔ ایک اچھی کھاٹ، بید کی بٹی ہوئی چٹائی کا ٹکا، رتھ یاترا کے میلے میں خریدے گئے چینی مٹی کے برتن اور پیوند لگے ہوئے بستر بھی نظر آرہے تھے۔ بظاہر تو وہ مطمئن اور خوشحال نظر آتا تھا لیکن شام گئے گھر لوٹتا تو چراغ بتی جلانے والی بیوی کو نہ پا کر اس کا دل یکایک سہم جاتا۔ بے چاری پچھلے سال ہیضہ کا شکار ہو گئی تھی۔ جب فراز علی کشتی لے کر ندی میں بہت دور تک نکل جاتا اس وقت اس کی بیوی کیلے کے درخت کی آڑ سے پلکیں جھپکائے بغیر اسے دیکھتی رہتی۔ اس کی یاد آتے ہی فراز علی یکایک دکھی اور مغموم ہو جاتا۔ گومتی اس بستی کی اہم ندی ہے۔ شہر سے آئے ہوئے اوورسیر بابو کتنی بار اسے سمجھا چکے ہیں۔ "دیکھو! آخری بار کہے دیتا ہوں۔ باندھ کے قریب رہنا اچھا نہیں۔ گومتی کا کیا بھروسہ! کہیں باندھ میں شگاف پڑ گیا تو پل بھر میں یہ بستی پانی میں ڈوب جائے گی۔ ہاں! پوری بستی ڈوب جائے گی۔!"

نیک دل اور بھولا بھالا فراز علی کسی وسوسے اور تشکک کے بغیر کہتا "اے بابو! مچھیرے کی زندگی بھی ایسے مو ... گومتی سے محبت ہوتی گواے ہے۔ تیوڑ نے کو طبیعت نہیں ہوت ہے۔"

پڑوس والے تالیاں پیٹتے اور ہنس کر کہتے "مٹھو میاں گومتی پر جان دے بیٹھے ہیں۔ سگائی بھی کر لو یار! جا بی لو گزرے کافی دن ہو چکے ہیں۔ اب دیر کاہے کی؟"

اور یہ بابو اس کی سادگی پر ترس کھاتے ہوئے چلے گئے اور فراز علی گومتی کے کنارے ہی پڑا رہ گیا۔

آندھی اور پانی کے طوفان نے زور پکڑا۔ گومتی طغیانی پر تھی۔ کشتی موجوں کے بہاؤ میں ہچکولے کھانے لگی تھی۔

"ابا جان! اب تو ار پکڑو۔ مجھ سے نہیں سنبھلتی!" عکاس نے خوف و ہراس کے عالم میں کہا۔

فراز علی نے بات ان سنی کر دی۔ وہ آگے کی سوچ رہا تھا۔ اس نے دیکھا سرخ اور سیاہ بادل نیچے تک جھک رہے ہیں۔ آثار بتا رہے تھے کہ ساری رات طوفانی بارش ہو گی۔ آندھی چلے گی۔ کنارہ ابھی کافی دور تھا۔ باپ بیٹے سب کچھ بھول کر ناؤ کھے رہے تھے۔ بپھری ہوئی گومتی ان پر قہقہے لگا رہی تھی۔

"ابا جان — جلدی تو ار پکڑ و — مجھ سے بالکل نہیں سنبھلتی۔"

عکاس کے ہاتھ سے تو ار چھوٹ رہی تھی۔ فراز علی نے جلدی سے تو ار پکڑ لی۔ عکاس دوڑ کر اپنے باپ کی جگہ رسی لے کر بیٹھ گیا۔ ان کی کشتی بپھری ہوئی لہروں پر تین چار چکر کھا کر الٹے رخ میں بہنے لگی۔

"ابے پیچھے سے رسی پکڑ کر کھینچ!"

فراز علی پریشانی کے عالم میں چیخنے لگا۔ جواب میں عکاس بھی سراسیمگی اور پریشانی کے عالم میں چیخنے لگا۔ "ابھی کنارے پر لگاتا ہوں۔ گومتی کی ایسی کی تیسی! — ابا جان! سنبھل کے!"

عکاس کا چہرہ تمتما اٹھا۔

آخر کار کشتی صحیح رخ پر مڑی۔

فراز علی پوری طاقت سے کشتی چلانے لگا۔

لیکن طوفان کی رفتار بھی کہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ گومتی پر طوفانی اور تباہ کن ہوائیں جگہ کاٹنے لگی تھیں۔

"ارے سالی چھنال! سوانگ رچانے کا یہی موقع ملا؟ کو! کیا سمجھتی ہے اپنے کو؟ میں بزدل ہوں؟ ساتھ میں بچوا ہوتا تو میں کب کا تیر کر پار ہو گیا ہوتا!"

فراز علی گومتی کو برابر گالیاں سناتا جا رہا تھا۔

عکاس نے اندازے سے مسافت ناپنے کی کوشش کی۔ لیکن بے سود۔ منزل کا نام و نشان کہیں نظر نہ آیا۔ طوفان کے غضبناک اور تباہ کن رقص میں سمتوں کا تعین کرنا ناممکن تھا۔ راستوں کے سارے نشانات مٹ گئے تھے۔ فراز علی اپنی تمام طاقت کو مجتمع کر کے اپنے موا ... پر ڈٹا رہا۔ زوردار تھپیڑوں سے بچنے کے لیے جیسے ہی اس نے سر پر بانس کا ٹوکرا رکھا، تیز ہوا کے جھونکے سے وہ پانی میں چھپ سے جا گرا۔

"اڑا لے سالی! جوانی میں آ دے اڑا لے۔ ... کا ہے! چھوڑنی ہے۔ خصم کھانی!"

عکاس اپنے باپ کے گرم مزاج سے بخوبی واقف تھا۔ چپ چاپ کنارے پر نظریں جمائے کھڑا رہا۔ جانی پہچانی زمین کا کوئی خط یا کوئی پیڑ پودا دور تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ پاس ہی کہیں کڑک کر بجلی گری۔ عکاس کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ لیکن فراز علی نے ایک پل جھپکنے والی روشنی میں نہ جانے کیسے اپنی بستی کا نشان پا لیا۔ وہ سرخوشی کے عالم میں چیخ اٹھا۔ "وہ دیکھو بچوا! مچھیروں کی بستی!" فراز علی اچھل کر بیٹے کی پشت ٹھونکنے لگا۔ مبہوت سے کھڑے عکاس نے دیکھا گومتی کی ... مدھومانی موجیں اس کے گرد کے آنگن میں طوفانی رقص کر رہی ہیں۔ اس کا دل چاہا کشتی سے چھلانگ لگا دے۔ فراز علی اسے پکڑے رہا۔ کچھ ہی دیر میں ان کو

کشتی مگرمچھ کی طرح آگے بڑھتی ہوئی گھر کی دہلیز تک پہنچ گئی۔ عکاس کشتی سے کود پڑا۔ پیچھے پیچھے مچھلی پکڑنے کا خالی جال اٹھائے فراز علی بھاری قدموں سے نیچے اترا۔ آج کا کاروبار بند رہا۔ طوفان کی وجہ سے جال پانی میں پھینک ہی نہ سکا۔ اب دونوں کے دل میں گھر لوٹنے کی فکر تھی۔ اب پیٹ میں بھڑک اٹھنے والی آگ کو بجھانے کی فکر تھی۔ عکاس جب تک مٹی کے تیل کا دیا جلا چکا تھا۔ ٹھنڈ کی وجہ سے اس کے ہاتھ پیر سرد ہو گئے تھے۔ اب کپکپی چھوٹنے لگی تھی اور اوڑھنے کو کچھ گیلے چیتھڑے کھونٹی پر لٹک رہے تھے۔ فراز علی بھی ٹھٹھر رہا تھا۔ ادھ کھلی آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔ "انگیٹھی سلگا لے بچوا۔ ہانڈی میں پاؤ بھر چاول کا بھات بن جائے کیوں؟"

"نہیں با جان! ابھی رہنے دو۔ کل فجر کو پکا لینا!"

وہ گیلی چٹائی پر سکڑ کر لیٹ گیا۔ فراز علی مٹھی بھر چنے لے کر بیٹھ کر چباتا رہا۔ اور تھکے ہارے باپ بیٹے مایوس اور لاچار بیٹھے رہے۔ دروازے کے باہر ڈیوڑھی پر گومتی غضبناک اور شوریدہ ہو رہی تھی۔ اندھیرے میں متواتر کچھ گرنے ٹوٹنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ صورت حال کی دہشت سے دونوں تھرتھرا گئے۔ یکایک پانی میں کسی بھاری چیز کے گرنے کی آواز آئی۔ عکاس پیلا زرد ہو کر آنگن میں آگیا۔

"با جان! کیلے کا درخت گر گیا ہے۔ نکلو تو سہی!" ــــ عکاس نے کہا۔

اندھیرے میں فراز علی کی نگاہیں گیدڑ کی آنکھوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ وہ دبے پاؤں باہر نکلا۔ سمجھ گیا کہ ڈیوڑھی سے بندھی ہوئی کشتی کو گومتی ہڑپ کر جانے پر تلی ہوئی ہے۔ طوفانی ہوائیں پھر پھر کر اس پر وار کر رہی تھیں۔ جھاگ دار پانی کی تند و تیز دھار دیکھ کر وہ کانپ اٹھا۔ پھر بھی وہ سہمے ہوئے عکاس کا حوصلہ بندھا رہا تھا۔

"فکر مت کر۔ رات بھر میں کچھ ناہی ہونے کا۔ اور ہاں فجر ہوتے ہی بچے محلے چلے جائیں گے۔"

"تو ڈونگی کا کیا ہوگا؟ اندر کھینچ لاؤں؟"

"اب نہیں دیکھتا نہیں، باہر دالان پہ کتنی سب کیچڑ ہے۔ پیر پھنس جاویں گے۔"

دونوں دبک کر اندر گھس گئے۔ فراز علی کونے میں رکھی ہوئی لکڑیوں کو غور سے دیکھنے لگا۔ رات کاٹنے کے واسطے مچان بنانے کے لئے کافی تھیں۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ پانی کا بہاؤ اسی طرف ہے۔ رات بھر میں سیلاب کا بہاؤ تھمنے والا نہیں۔ مچان پر چڑھ جانا ہی دانشمندی کا تقاضا تھا۔ طوفانی ہواؤں کے جھونکوں سے بانس چرچر چرمرا رہے تھے۔ جن کے سہارے ان کی جھونپڑی کھڑی تھی۔

"گومتی سالی خون کی پیاسی ہو گئی ہے با!"

باپ کے بگڑتے ہوئے تیور دیکھ کر عکاس سمجھ گیا کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔ گومتی برابر خوفناک ہوتی جا رہی تھی۔ وہ چپ چاپ اپنے باپ کے ساتھ مچان باندھنے لگا۔ بھوک پیاس اور تھکن کو دونوں بھول گئے تھے۔ ان کی آنکھیں گومتی پر جمی ہوئی تھیں۔ طرح طرح کی وحشتناک اور ہیبت ناک آوازیں انہیں سنائی دے رہی تھیں۔ کب اور کس طرف کیا ٹوٹ رہا ہے یہ جاننا مشکل ہو گیا تھا۔ باپ بیٹے کی انتھک محنت سے ڈیڑھ گھنٹے میں اچھا خاصا مچان بن گیا۔

"چڑھ جا جلدی سے بچوا۔ سالی پہنچ گئی!"

بیٹے کو اوپر چڑھاتے ہوئے فراز علی نے کہا اور خود بھی ایک جست میں مچان پر چڑھ گیا۔ تبھی دونوں کو حیرت و استعجاب میں ڈالتی ہوئی گومتی اپنی تمام تر قوت کے ساتھ اندر گھس پڑی۔ آنگن کی کھونٹی ایک طرف ہلنے لگی۔ کچھ ہی دن پہلے عکاس نے جھونپڑی کی دیوار میں گڑائی تھی۔ جیسی وہ اب تک گڑی تھی۔ عکاس پر غنودگی کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ وہ اونگھنے لگا۔ اچانک فراز علی کی ہراساں نگاہیں پانی کے دھار میں بہے چلے جاتے ہوئے چوٹے کی طرف پڑیں اور وہ چیخنے لگا۔ "وہ گئی! ــ کھٹیا ــ ارے وہ دری ــــ وہ مچھلی کا جال ــ واہ ری گومتی! سالی آج دنیا کو نگل کر ہی دم لے گی!" فراز علی بڑبڑاتا رہا۔

پھر مچان کو بھی جھٹکے سے محسوس ہونے لگے۔

"ابا جان مچان ٹوٹ رہا ہے۔!"

عکاس پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"چپ بے بزدل۔! مچھیرے کا بیٹا اور پانی سے ڈر!"

حالانکہ وہ خود بھی ڈر گیا تھا۔ پھر بھی اس کا دماغ پوری طرح قابو میں تھا۔ اس نے اندازہ لگایا کہ ایک گھنٹے میں گومتی مچان تک پہنچ جائے گی! گومتی کا یہ جوار اس نے آج تک نہیں دیکھا تھا۔ ایسی تباہی اس نے کبھی نہیں دیکھی۔ اس نے سوچا ابھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔ باندھ یہاں سے کچھ ہی فاصلے پر ہے۔ آندھی کا دباؤ گھٹ رہا ہے۔ موقعہ ہاتھ سے جانے نہ پائے اس نے عکاس سے کہا۔ "چل بے چل یہاں خطرہ ہے اب یہاں اور ٹھہرنا سمجھ داری نہیں!"

"کہاں جانا ہے؟"۔ عکاس پھر رونے لگا۔ اس کے آگے پیچھے اوپر نیچے سمندر ہی سمندر لہریں مار رہا تھا۔

"سنبھل کر تیرنا۔ سیدھے باندھ تک پہنچنا ہے۔!" فراز نے سمجھایا۔

عکاس باپ کی بات سمجھ گیا۔ دونوں احتیاط کے ساتھ مچان سے نیچے اتر آئے۔ پانی فراز علی کے گلے تک تھا۔ وہ ایک لمحہ کے لئے ٹھٹھک گیا۔ کچھ سوچ کر کھونٹی میں لٹکے طوطے کے پنجرے کو سر پر اٹھا لیا۔ طوطا بری طرح چھٹپٹا رہا تھا۔ عکاس نے چاول کی پوٹلی پشت سے باندھ لی۔ دونوں تیرتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ اپنی جھونپڑی چھوڑ کر جانے کے خیال سے ہی فراز علی کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ اچھا ہی ہوا بیوی پہلے ہی چل بسی ورنہ آج ـــــ اس سے آگے وہ نہ سوچ سکا۔ دونوں گھپ اندھیرے میں اوجھل ہو گئے۔

"ابا جان!"

"ڈر کا ہے کا۔ میرا شانہ پکڑ لے۔ ذرا مضبوطی سے۔ راستہ جانا پہچانا ہے۔"

فراز علی بیٹے کی ڈھارس بندھاتے ہوئے ہوشیاری سے تیر رہا تھا۔ عکاس اس کے پیچھے پیچھے بہتا چلا جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں وہ باندھ کے قریب پہنچ گئے۔ اب وہ بالکل نڈھال ہو چکے تھے۔ باپ بیٹے کیڑے مکوڑوں کی طرح رینگتے ہوئے باندھ کے اوپر چڑھ گئے۔ عکاس کا انگوچھا اور فراز علی کی لنگی پانی میں بری طرح بھیگ کر ان کے جسموں سے چپک گئی تھی۔ ٹھنڈی ہوا کے تھپیڑے ان کے بدن میں تیر کی طرح چبھ رہے تھے۔ فراز علی نے جلدی سے بھیگی لنگی اتار ڈالی اور بن مانس کی طرح بالکل ننگا باندھ کے اوپر بیٹھ گیا۔ عکاس چونک کر اپنی پگڑی اچھالتے ہوئے بولا۔ "ابا جان! کم سے کم یہ لپیٹ لو!"

"ہی۔ ہی۔ ہی!" فراز علی دانت نکالے ہنسنے لگا

"بچوا! آ یہاں پر آرام سے بیٹھ!"

"نئیں ـ نئیں بیٹھوں گا!"

"کیوں بے؟"

"یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

"کہاں جائے گا؟"

"شہر!"

"کھائے گا کیا؟"

"چوری کروں گا، ڈاکہ ڈالوں گا۔ جو جی میں آئے"

"ابے نامرد! بزدل!! یہ کہتے ہوئے شرم نہیں آتی"

"اونہہ! شرم کا ہے کی۔ کیا تمھیں شرم آ رہی ہے!

ـــــ"

بولتے کیوں نہیں؟ کیا آدمی یوں رہتے ہیں؟ پانی میں کلبلاتے سانپ بچھو کی طرح؟"

فراز علی کو جیسے پہلی بار اپنی حالت کا احساس ہوا۔ اپنے ننگ دھڑنگ جسم پر انگوچھا لپیٹتے ہوئے وہ بھرائی آواز میں بولا ـــ "اچھا سن! بیٹھ تو سہی! گھبرا مت، صبح ہوتے ہی ہم یہ گاؤں چھوڑ کر چل دیں گے کشتی مہاجن کو لوٹا دیں گا اور ہم سٹیشن چلے جائیں گے۔"

(باقی ص ۳۶ پر)

یہ اعظم اور وزیر مالیات شری چرن سنگھ گذشتہ ۸ر مارچ کو نئی دہلی میں زرعی ترقی کے بین اقوامی فنڈ
کے صدر جناب عبدالمحسن الصدوری سے مصافحہ کرتے ہوئے

ب وزیر اعظم اور وزیر دفاع شری جگ جیون رام گذشتہ ۱۸ر اپریل کو ایر مارشل ٹی۔ ایف برار ایر آفیسر کمانڈنگ ان چیف سنٹرل ایر کمانڈ کو
اسکواڈرن آف ایر۔ بمبار" کی ٹرافی پیش کر رہے ہیں تصویر میں ہوائی فوج کے سربراہ ایر مارشل آئی۔ ایچ لطیف بھی (دائیں جانب) نظر آ رہے ہیں۔

گورنر اترپردیش شری جی۔ ڈی تپاسے ۳؍اپریل کو آگرہ یونی ورسٹی کے کانووکیشن کے موقع پر سب سے زیادہ گولڈ میڈل حاصل کرنے والی کماری دیپا گکڑ کو میڈل دیتے ہوئے
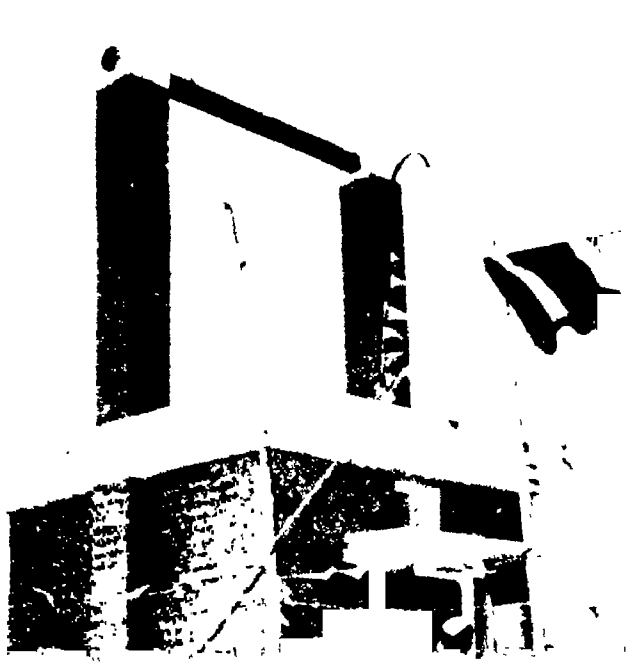
ی بنارسی داس گزشتہ ۱۸ر مارچ کو انفارمیشن سنٹر لکھنؤ میں بھارتیہ بال ساہتیہ اکاڈمی کے
منعقد کردہ ایک جلسے کو خطاب کرتے ہوئے

وزیر اعلا شری بنارسی داس گزشتہ ۳ر مارچ کو فیڈرل جمہوریۂ جرمنی کے سفیر شری ڈرکس سے موگفتگو ہیں

وزیر اعلا شری رام نریش یادو
شتہ ۷ر اپریل کو موضع کھوریہا
۵) میں محکمۂ آبپاشی کے نصب کردہ
ویل کا افتتاح کر رہے ہیں۔

وزیر اعلا شری بنارسی داس گزشتہ ۲۴ مارچ کو شاہجہاں پور میں مجاہدین آزادی
کی کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے

وزیر اعلا شری بنارسی داس گزشتہ یکم مارچ کو اتر پردیش اردو اکاڈمی لکھنؤ تشریف لے گئے تھے
وہاں انھوں نے اکاڈمی کی لائبریری کا بھی معائنہ کیا یہ تصویر اسی موقع کی ہے تصویر میں چیرمین اردو اکاڈمی
ڈاکٹر محمد حسن اور اردو اکاڈمی کے موجودہ اور سابق سکریٹری جناب غلام حسین نقوی اور صباح الدین عمر بھی نظر آرہے ہیں

رباعیات

بسنت کمار بسنت

ہونٹوں پہ تبسم کی کرن آنکھ میں نور
تو دیکھ لے واعظ تو تجھے آئے سرور
جو لوٹ لے ایمان وہ کافر سی ادا
اللہ رے یہ نازنیں ہے کہ فردوس کی حور

۲

گلشن کی نو دمیدہ کلی ہو جیسے
انفاس میں رگوں میں اتر گئی ہو جیسے
وہ دور ہے نگاہ سے تصویر اس کی
سچ مچ سامنے چل پھر رہی ہو جیسے

۳

یہ پیڑ اشوک کے یہ گلشن کا سماں
ہر گام پہ یہاں وہاں آنکھیں نگراں
اک پیڑ کی چھاؤں تلے تنہائی میں
مہ وش کوئی کھڑی ہے نوخیز جواں

۴

فن، علم، ہنر، وقار اور دولت بھی ملے
نصرت کے ملیں پیام شہرت بھی ملے
عظمت یوں کب ملی کسی کو اے دوست
کردار کر بلند تو عظمت بھی ملے

رشید قریشی
۲۳۔ محمد علی لین
گوئن روڈ۔ لکھنؤ

قطعات

کوئی تدبیر چل نہیں سکتی
کوئی حسرت نکل نہیں سکتی
حوصلے ہی اگر نہ ہوں دل میں
زندگی رخ بدل نہیں سکتی

یہ بھی کیا ریت ہے زمانے کی
کوئی ہنستا ہے کوئی روتا ہے
واقعی سچ ہے یہ کہاوت بھی
کون کس کا شریک ہوتا ہے

چاند تاروں کی بات کہتے ہو
ماہ پاروں کی بات کرتے ہو
یہ بتاؤ خوشی کے دیوانو
غم کے ماروں کی بات کرتے ہو

جانے کیا کچھ نہ ہو چکا ہوتا
جانے کیا کیا نہ ہو رہا ہوتا
چند مجبوریاں نہ ہوتیں اگر
آج ہر آدمی خدا ہوتا

ڈاکٹر مصباح الانسلاھ

مولانا عبدالماجد دریابادی سے ایک ملاقات

یہ ستمبر ۱۹۷۲ء کی بات ہے، جب مجھے لکھنؤ یونیورسٹی سے "مولانا عبدالماجد دریابادی حیات اور کارنامے" کا موضوع پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے منظور ہوا۔ بظاہر موضوع مشکل نہیں معلوم ہو رہا تھا۔ دوسری اہم بات یہ تھی کہ مولانا بقید حیات تھے لیکن موضوع کی مشکلات کا علم بعد میں ہوا کیونکہ یہ موضوع ایک ایسی شخصیت کی عملی زندگی اور اس کے کارناموں سے متعلق تھا، جس کی زندگی "الحاد سے اسلام تک" اسّی برسوں پر محیط تھی۔ مجھے اس بات کا بھی علم تھا کہ مولانا ماجد اس شخصیت کا نام ہے جن سے ملنے کے لیے ابوالکلام آزاد اور سید سلیمان ندوی جیسے بزرگوں کو بھی وقت لینا پڑتا تھا۔ تحقیق کا کام شروع کرنے سے پہلے میں نے یہ مناسب سمجھا کہ مولانا سے ایک ملاقات کرلی جائے۔ ان دنوں اتفاق سے مولانا لکھنؤ ہی میں تھے اور قیام تھا خاتون منزل میں۔ حکیم عبدالقوی صاحب سے پتہ حاصل کیا اور خاتون منزل لکھنؤ کے پتہ پر اپنی غرض لکھ کر بھیج دی۔ تقریباً پانچ دن کے بعد جواب آیا۔ خط کا مضمون اس طرح تھا۔

بسم اللہ　　　　لکھنؤ۔

۲۰؍ ستمبر ۷۲ء

عزیزم۔ وعلیکم السلام

جس غرض سے آپ ملنا چاہتے ہیں اگرچہ وہ بہت پست اور میرے لیے باعث شرم و حجاب ہے، اور آپ اس سے اگر معاف ہی کر دیتے تو بہتر تھا۔ تاہم آپ کی خاطر شکنی کے خیال سے لکھے دیتا ہوں کہ آج کل اتفاق سے لکھنؤ ہی میں ہوں اور آپ ہفتہ میں کسی دن بھی (بجز جمعہ کے) ۵ بجے سہ پہر کو حکیم عبدالقوی سلمہٗ کو لیتے ہوئے میرے پاس آسکتے ہیں۔

والسلام

۲۶ حیدر مرزا روڈ　　　　دعا گو

خاتون منزل　　　　عبدالماجد

مولانا کا جواب آچکا تھا، ملنے کا وقت بھی معلوم ہوگیا تھا، رہبری کے لیے حکیم عبدالقوی صاحب موجود تھے۔ لیکن اتفاق ایسا کہ ان ہی دنوں میں اپنے ایک کام کے سلسلہ میں لکھنؤ سے باہر چلا گیا۔ اس طرح لکھنؤ میں مولانا سے ملاقات نہیں ہوسکی۔ دوسری ملاقات کے لیے مولانا کو خط لکھنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اسی درمیان ستمبر کے آخر میں مولانا کے آبائی وطن قصبہ دریاباد کے ایک کالج (لال بہادر شاستری انٹر کالج) میں بحیثیت اردو لیکچرر میرا تقرر ہوگیا۔ ملاقات کے لیے میں نے پھر مولانا سے وقت مانگا۔ اس بار ۱۲؍ اکتوبر ۷۲ء کی تاریخ مقرر ہوئی۔ مذکورہ تاریخ پر کالج کی ایک شاگردہ آمنہ نے جو مولانا کی رشتہ کی پوتی بھی تھیں، مولانا کے گھر تک میری رہنمائی کی۔ حکیم عبدالقوی صاحب میرے منتظر تھے۔ ہمارے پہنچنے کے بعد حکیم صاحب نے ملازم کے ذریعہ اندر مولانا

اطلاع بھجوائی۔ میں اور حکیم صاحب باہر برآمدہ میں رکھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ چند منٹ بعد ملازم نے میز پر ایک کرسی لاکر رکھ دی جس میں اس وقت دن کے دو بجے تھے۔ تھوڑی دیر بعد مولانا باہر تشریف لائے۔ وہ بالکل سادہ لباس میں تھے۔ سفید کھدر کا کرتا، سفید پجامہ، اونچی دیوار کی ٹوپی پہنے تھے۔ اور موٹے شیشے کی عینک لگائے تھے۔ مولانا میرے سامنے کی کرسی پر بیٹھ گئے۔ یوں تو مولانا کے متعلق بہت کچھ سن رکھا تھا۔ علمی اجتہادات کے قصے بھی سن رکھے تھے۔ لیکن کبھی ملاقات کا شرف نہیں حاصل ہوا تھا۔ آج پہلا موقع تھا کہ مولانا شبلی کی تصنیف "الکلام" پر اعتراض کرنے والے مسٹر عبدالماجد اور نیاز فتحپوری سے توبہ نامہ پر دستخط کرانے والے، مولانا عبدالماجد* میرے سامنے بیٹھے تھے۔ میں ان کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا جس سے برسوں کے تجربات نمایاں تھے۔ تھوڑی دیر میں اپنے ریسرچ کے موضوع پر گفتگو کرتا رہا۔ مولانا سے زیادہ بولنا ممکن نہ تھا۔ اس لیے میں نے ملاقات ختم کرتے ہوئے گزارش کی کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں ریسرچ سے متعلق ایک سوالنامہ تیار کر کے آپ کے پاس بھیج دوں۔ آپ اس کے جوابات تحریر فرما دیجئے گا۔ مولانا نے اجازت دے دی۔ اس کے بعد چند منٹ اور دوسرے موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ سامنے کی گھڑی نے ... گھنٹی بجائی (اس گھڑی میں ہر پندرہ منٹ بعد ایک گھنٹی بجتی تھی) مولانا سے اجازت لے کر واپس لوٹ آیا۔ دل تو چاہتا تھا کہ مولانا سامنے بیٹھے باتیں کرتے رہیں اور میں ان کو دیکھتا رہوں لیکن مولانا نے صرف پندرہ منٹ کا وقت ملاقات کے لیے دیا تھا۔

اس ملاقات کے چند دن بعد میں نے ایک سوالنامہ ... مولانا کی خدمت میں بھیجا۔ دو دن بعد مولانا نے ... سوالنامہ میرے پاس بھجوا دیا۔

اس سوالنامہ میں میں نے جو سوالات پوچھے تھے اس کی تفصیل مع جوابات درج ذیل ہے:

سوال۔ مولانا آپ کا پورا نام تو عبدالماجد ہے۔ کیا بچپن میں کوئی عرفیت بھی تھی۔؟

جواب۔ جی نہیں صرف عبدالماجد ہوں۔

سوال۔ آپ کی عمر اس وقت کتنی ہوگی؟ (یہ سوال ۷۶ء میں پوچھا گیا تھا۔ انتقال ۵ سال بعد ہوا۔ تقریباً ۸۵ سال کی عمر میں)

جواب۔ پورے اسی سال کی۔ زمانہ پیدائش وسط ۱۸۹۲ء تھا۔ اغلباً ۵ ارمارچ۔

سوال۔ آپ نے سب سے پہلا مضمون کب لکھا تھا۔ اس کا موضوع اور عنوان کیا تھا؟

جواب۔ ۱۹۰۴ء میں۔ یو۔ پی کے مقبول عام روزنامہ اودھ اخبار (لکھنو) میں۔ عنوان تو اب یاد نہیں۔ صرف اتنا یاد ہے کہ کسی مذہبی موضوع پر تھا۔ غالباً کسی روشن خیال کے جواب میں۔

سوال۔ فلسفہ کی طرف آپ کا رجحان کب ہوا۔؟

جواب۔ شروع ہی سے سمجھئے۔ اسکول میں تو میں درجہ میں تھا کہ منطق کی کتابیں انگریزی اور عربی دونوں بغیر کسی استاد کی مدد کے خود مطالعہ کرنے لگا تھا۔

سوال۔ مولانا میں جاننا چاہتا ہوں کہ جب آپ نے ہوش سنبھالا تو اس وقت کے ہندوستان کے سیاسی سماجی حالات کیا تھے۔؟

جواب۔ ہوش بہت جلد سنبھال لیا تھا۔ یعنی آٹھ ہی دس سال کی عمر سے اخبار اور رسالے پڑھنے لگا تھا۔ سرکار برطانیہ سے وفاداری اس وقت گویا جزو ایمان تھی۔ اور پھر والد ماجد تو ڈپٹی کلکٹر ہی تھے، تمدن، معاشرت، خیالات

* یہ سوالنامہ میں نے اپنی تحقیق سے متعلق سوالات کی روشنی میں مرتب کیا تھا۔ اس لیے سلسلہ وار سوالات اس میں نہیں ہیں۔

سب پر انگریزیت غالب آتی جا رہی تھی۔

سوال۔ کیا آپ اس وقت کی سیاست میں عملی حصہ لیتے تھے؟

جواب۔ سیاست اگر یو۔پی کے شریف مسلمانوں میں کوئی تھی تو بس یہی کہ کانگریس کی مخالفت کی جائے۔

سوال۔ اس وقت مسلمانوں کے سب سے بڑے قائد محمد علی جوہر سے آپ کی ملاقات سب سے پہلے کب ہوئی تھی؟ ان کے ساتھ اپنے تعلقات پر کچھ روشنی ڈالیئے۔

جواب:۔ ۱۹۰۹، ۱۹۱۰ء تک تو محمد علی خود بھی محض ایک ہونہار جونیر شمار ہوتے تھے۔ ان کی لیڈری کی شروعات تو ۱۹۱۱ء سے ہوئی۔ جب انھوں نے کلکتہ سے انگریزی ہفتہ وار، کامریڈ نکالا۔ ہندستان کا دارالسلطنت اس وقت دلی نہیں کلکتہ تھا۔ اور کامریڈ کی پالیسی اس وقت کانگریس کی نہ تھی۔ میں اس وقت "مسٹریت" کے رنگ میں غرق، مسٹر محمد علی کا ایک ادنیٰ نیازمند و معتقد تھا۔ جولائی ۱۹۱۲ء میں، میں کیننگ کالج لکھنؤ (موجودہ لکھنؤ یونیورسٹی) سے گریجویٹ ہوا اور دسمبر ۱۹۱۲ء میں موصوف سے پہلی بار شرف نیاز حاصل ہوا۔ جب وہ لکھنؤ تشریف لائے تھے اور کامریڈ اور روزنامہ ہمدرد، دونوں دلی سے نکل رہے تھے۔

سوال:۔ اکبر الہ آبادی سے آپ کی ملاقات کب اور کیسے ہوئی ان کے بارے میں کچھ بتلائیے۔

جواب:۔ اکبر پر تو میں اتنا زیادہ لکھ چکا ہوں کہ پوری ایک کتاب "اکبر میری نظر میں" کے نام سے تیار ہو گئی ہے۔ اور خطوط مشاہیر میں ان کے بہت سے مکتوبات اس کے علاوہ ہیں۔ جواب سوال میں مختصر گزارش ہے کہ حضرت اکبر سے ذاتی نیاز مجھے اپریل ۱۹۱۲ء میں حاصل ہوا جب میں الہ آباد بی۔ اے کا امتحان دینے گیا تھا۔ حضرت اکبر کو اس وقت ریٹائر ہوئے کئی سال ہو چکے تھے۔ میں نے حضرت اکبر سے ادبی، شعری، اور روحانی و دینی حیثیت سے بہت کچھ حاصل کیا۔ اپنی آخر عمر میں تو گویا میرے پیر و مرشد ہی ہو گئے تھے۔ مجھ پر بڑا ہی لطف و کرم فرماتے تھے۔ وفات ۱۹۲۱ء میں فرمائی، نیازمندی کی مدت گویا نو سال رہی۔

سوال:۔ عیسائیت، ہندومت اور اسلام ان تینوں مذاہب کا آپ نے گہرا مطالعہ کیا ہے۔ ان تینوں مذہبوں کے فلسفہ کے اپنے کچھ اصول ہیں۔ ان کے بارے میں آپ کی رائے اور خیالات کیا ہیں؟

جواب۔ ہندو فلسفہ تو تھوڑا بہت پڑھ ڈالا ہے لیکن مسیحی فلسفہ سے واقف نہیں ہوں۔ انگریزی فلسفہ جو کچھ پڑھا تھا وہ بارکلے وستشنیات وغیرہ کو چھوڑ کر ملحدوں نیم متشککوں اور مادیئین کا تھا۔ ہیوم مل اسپنسر ہکسلے وغیرہ کا۔ ہندو فلسفہ اور بعض مسلم صوفیہ کا مسلک بہت ملتا جلتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے بہت متاثر ہوئے ہیں۔ مسلم صوفیہ میں رومی کی مثنوی کا پایہ بہت ہی بلند ہے۔ یہی مجھے الحاد سے گھسیٹ کر اسلام تک لائے اور پھر غزالی اور مجدد سرہندی نے پورا مسلمان بنا دیا۔

سوال:۔ آپ کی صدق گفتاری تو مشہور ہے۔ اسی بنیاد پر میں آپ سے یہ سوال کر رہا ہوں، ہندو اور عیسائی فلسفہ کے مطالعہ کے بعد آپ نے کیا محسوس کیا اور آپ نے اس سے کیا اثرات قبول کئے۔

جواب:۔ توحید کامل صرف اسلام میں ملی اور معاشرت و تمدن کے مکمل قانون اور ضابطے بھی۔ ہندو مذہب کے بعض فرقے وحدت الوجود کے زبردست قائل ہیں اور عیسائیوں میں صرف فرقہ "یونیٹیرین" (UNITARIAN) توحید کا قائل ہے۔ اور باقی سب تثلیث کے، ہندو اور مسلم صوفیہ نے ایک دوسرے سے بہت کچھ لیا ہے۔

سوال:۔ آپ کے اسلام کی حقانیت کی طرف لوٹنے کے اسباب کیا تھے اور وہ کون سا زمانہ تھا؟

جواب:۔ مراجعت کے اسباب چھوٹے بڑے بہت سے ہیں

جیسے امریکی اور برطانوی، اور جرمن مادیئین کی کتابیں بہت
سی ترجمہ ہو چکا ہو۔ ان میں مادیئین جیسے ہیوم، اسپنسر، مل، ہیکلے
انگرسول وغیرہ سب ہی شامل رہے ہیں۔ اور ان منکرین
ملحدوں میں مورخ اور ڈاکٹر خصوصیت کے ساتھ دشمن
رسولؐ ہوئے ہیں۔ اس کے بعد طبیعت بدھ مت اور ہندو
مت کی طرف بڑھی۔ ان سے پہلی یا ضرب مادیت پر پڑی
اور معلوم ہوا کہ فلسفہ روح اور روحانیت کا بھی ہو سکتا ہے۔
مرزا غلام احمد قادیانی کی تصانیف، قبل دعوئے
نبوت (سرمہ چشم آریہ وغیرہ) مولوی محمد علی لاہوری کا
انگریزی ترجمہ قرآن اور شبلی کی سیرت النبیؐ، امیر علی
کی اسپرٹ آف اسلام۔ سب اسی راہ میں معین ہوئیں۔
اور سیرت رسولؐ کو معاندین نے خاص طور پر پراگندہ کر
رکھا تھی۔ صوفیہ کے ملفوظات بھی معین ہوئے۔ سب سے
زیادہ دستگیری رومی کی مثنوی نے کی۔ اور پوری طرح
قدیم اسلام پر [illegible] غزالی اور مجدد سرہندی اور
مجدد تھانوی ______

یہاں تک تو میں نے مولانا سے ان کی ابتدائی زندگی
الحاد اور پھر اسلام تک واپس آنے کے متعلق سوالات کیے
مولانا نے اپنے مختصر مگر جامع جوابات سے اس امر کی تصدیق
کی کہ "از کفر تا بہ یقین یک نفس است" اس کے بعد میں نے
مولانا سے ان کی علمی زندگی اور ادبی مباحثوں سے متعلق سوالات
پوچھے۔ میرا پہلا سوال تھا مولانا ابوالکلام آزاد سے آپ کے تعلقات
کے بارے میں مولانا نے جواب دیا "نیاز تو مولانا شبلی کے
طفیل غالباً ۱۹۰۵ء میں شروع ہو گیا مگر تعلقات کئی سال
تک کچھ اچھے نہیں رہے۔ زیادہ تر مولانا ہی کے ہم نشینوں کی
روایات سن سنا کر۔ مگر مولانا کی ذہانت، طباعی اور نظافت
کا [illegible] وقت بھی پوری طرح قائل رہا۔ ۱۹۱۵ء کے بعد سے
ناخوشگواری یاد نہیں پڑتی اور مولانا کی آخر عمر میں تو مولانا
کی شفقت و کرم کا مورد خاص ہو گیا تھا۔

سوال:۔ ظفر الملک علوی کے اخبار سے آپ کب اور کیوں
الگ ہوئے۔؟
جواب:۔ "سچ" ہفتہ وار ہم تین شخصوں کی شرکت و مشورہ سے
نکلتا تھا۔ میں خود، مولانا عبدالرحمٰن نگرامی اور ظفر الملک
علوی مرحوم، علوی صاحب کے لب و لہجہ سے دوستوں اور
ہم خیالوں کو بہت تکلیف ہوتی رہی تھی۔ مولانا نگرامی چند
مہینے بعد وفات پا گئے۔ پرچہ آگے چل کر تفسیری مشغولیتوں
سے مجھے روکنا پڑا۔ اس عارضی بندش کے بعد جب میں
نے پرچہ دوبارہ نکالنا چاہا تو علوی صاحب اس پر تیار
نہیں ہوئے۔ مجبوراً مجھے تنہا پرچہ نکالنا پڑا۔؟
سوال:۔ نیاز فتح پوری سے جو آپ کے مباحثے ہوئے اس پر کچھ روشنی
ڈالیں۔؟
جواب:۔ نیاز صاحب کے ماہنامہ نگار کی روش بڑی ہی
مسلم آزار ہو گئی تھی۔ کئی دفعہ "سچ" سے ان کا جواب دے
چکا تھا۔ (سچ کے بعد مولانا نے صدق کے نام سے اپنا
ہفتہ وار اخبار نکالا) جب معاملہ حد سے بڑھ گیا تو میں
نے "اسلام اور مسلمانوں پر دل خراش حملے" کے عنوان سے
ایک نمبر سچ کا شروع سے آخر تک "نگار" کے لیے وقف
کر دیا۔ اس سے ملک بھر میں آگ سی لگ گئی اور سارے مسلم
پریس نے میرا ساتھ دیا۔ ہر جگہ احتجاجی جلسے ہونے لگے۔
اور کہیں کہیں مقدمے بھی دائر ہوئے۔ نگار نے (مراد
نیاز فتح پوری سے ہے) معافی مانگی اور اس پر قضیہ
ختم ہوا۔
سوال:۔ اس کے ساتھ ہی آپ یہ بھی بتانے کی زحمت کریں
کہ حیات اللہ انصاری (سابق اڈیٹر قومی آواز لکھنؤ)
کے ساتھ آپ کے تحریری مباحثے کب اور کس موضوع پر
ہوئے؟"
جواب:۔ اسلامی، سیاست اور بعض مسلم مشاہیر کی شخصیات پر
سوال:۔ آپ اپنی زندگی کے کسی اہم واقعہ پر روشنی ڈالیے۔
(باقی ص ۳۶ پر)

شفیق شاہ پوری
موضع و ڈاکخانہ اجریاؤں
ضلع لکھنؤ

غزل

کوئی جوہر سا جو اس دور میں رہبر جاگے
ہند والوں کا نئے سر سے مقدر جاگے

ہم تو ہم درد محبت سے ستم گر جاگے
آنکھ اس طرح سے برسی کہ سمندر جاگے

تم نہ طوفاں سے ڈرو ایسے طریقے ڈھونڈو
جن سے طوفان اٹھے اور سمندر جاگے

تیری آواز سے کیا ہوش انھیں آئے گا
کتنا آزر نے پکارا نہ یہ پتھر جاگے

بات تفریق کی ساقی تجھے لے ڈوبے گی
تشنہ ترسا ہی کیے کتنوں کے ساغر جاگے

مے کشی جرم سہی آج تو اتنی پی لے
میرے ہونٹوں سے جو چھو جائے تو ساغر جاگے

میں نے اس طرح سے پلکوں پہ سجائے آنسو
دل کی تصویر اتر آئی وہ منظر جاگے

ان کی یادوں کے اجالے نہ بجھ جائیں کہیں
ہم ستاروں کی طرح رات کو اکثر جاگے

تیری تصویر مرے سامنے آئی جو شفیق
یاد رفتہ کے سہلائے کئی نشتر جاگے

نقش رحمانی
۳۲ شاہ چھڑا لین
لکھنؤ ۲۲۶۰۰۳

غزل

ہر تعصب سے گریزاں ہوں مرے پاس آؤ
میں نئے دور کا انساں ہوں مرے پاس آؤ

تم نگاہوں سے نہ پوچھو کہ سحر کب ہوگی
میں اجالوں کا نگہباں ہوں مرے پاس آؤ

صبح حسرت سے یہ قطرۂ شبنم نے کہا
چند لمحات کا مہماں ہوں مرے پاس آؤ

تشنہ لب کون ہے کس کس کا سبو خالی ہے
آج میں ساقی دوراں ہوں مرے پاس آؤ

خشک پتے کی طرح جانے کہاں اڑ جاؤں
صرصر دہر سے لرزاں ہوں مرے پاس آؤ

جانے والو مرے سینے سے لپٹ کر رو لو
مرقد شام غریباں ہوں مرے پاس

جس کے ہر شعر میں اے نقش ہے زخموں کی چبھن
میں اسی نظم کا عنواں ہوں مرے پاس آؤ

مولانا محمد علی جوہر

نثار عباسی (پرنسپل)
۳- دائرہ شاہ اجمل
الٰہ آباد

وہ اک مردِ مجاہد نیک انساں — وہ خودداریِ ملت کا نگہباں
وہ اک مردِ مسلماں نیک گفتار — وہ پابندِ شریعت نیک کردار
اخوت کا اگر وہ پاسباں تھا — تو "یک جہتی" کی وہ روحِ رواں تھا
فسادِ باہمی اس پر گراں تھا — محبت کا وہ بحرِ بیکراں تھا
"بقائے باہمی" کا رازداں تھا — "خلافت" کا وہ میرِ کارواں تھا
وہ روحِ جہدِ آزادی تھا یکسر — تخلص اپنا جو رکھتا تھا جوہر
جو دل میں اس کے اک سوزِ نہاں تھا — وہ زندہ قوم کا عزمِ جواں تھا
جوانانِ وطن کی رہبری کی — رہا وہ ہمرکابِ گاندھی جی بھی
وہ روشن طبع تھا صاحب نظر تھا — کہ وہ تھا دوربیں اور دیدہ ور تھا
ہیں شاہد اس کے حالاتِ زمانہ — کہ تھا بیشک وہ اک مردِ یگانہ
جو تھی تقریر میں جادو بیانی — تو تھی تحریر پانی کی روانی
نہایت پرکشش حسنِ بیاں تھا — "زمینِ نطق" کا وہ آسماں تھا
دکھائے شعر میں اس نے وہ جوہر — پروئے شعر میں معنیٰ کے گوہر
وہ عالم باعمل تھا راہبر تھا — کہ وہ بالغ نظر تھا دیدہ ور تھا
وہ رکھتا تھا جو دل میں دردِ ملت — یقیناً تھا وہ اک ہمدردِ ملت
تھی اس کے دل میں روشن شمعِ ایماں — حقیقت میں وہ تھا مردِ مسلماں
ہر اک دل میں بنایا اس نے گھر تھا — وہ مردِ معتبر تھا با اثر تھا
تھی اس کے ہاتھ میں نبضِ سیاست — بڑی نباض تھی اس کی فراست
وہ آزادی کی گر روحِ رواں تھا — تو "تحریکِ خلافت" کی وہ جاں تھا
"خلافت" کا لیا جو بار سر پر — تو پہونچی نیک نامی اس کی گھر گھر
گیا لینے جو آزادی وہ باہر — تو زندہ لوٹ کر آیا نہ پھر گھر
نہ آزادی اگر وہ لے کے آیا — تو آخر جان اپنی دے کے آیا
عجب محتاط اس کی زندگی تھی — سیاست میں بھی اک "پاکیزگی" تھی
کہ نام اس کا محمد باعلیؓ تھا — وہ اقلیمِ سیاست کا "ولی" تھا

وطن پر زندگی قربان کردی
نثار اس نے وطن پر جان کردی

عرفان عباسی۔
۵، موتی لال بوس روڈ،
(دنیا گارڈن)، لکھنؤ۔

سیّد مسعود حسن
۱۸۸۵ء
مسعود لکھیم پوری
۱۹۶۲ء

مضمون نگار

مرے ہر لفظ میں حسن معانی
مرے ہر شعر میں خوبی زباں کی

خان بہادر سید مسعود حسن (بی۔ سی۔ ایس) تعلقدار ان اودھ کے ایک معروف گھرانے لکھیم پور کھیری میں ۱۸۸۵ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حافظ سید علی۔ حافظ (متوفی ۱۹۱۶ء) اردو، فارسی، انگریزی، عربی زبانوں میں اچھی دست گاہ رکھتے تھے اور اردو کے صاحب دیوان شاعر تھے۔ حافظ سید علی مرحوم کے والد یعنی مسعود صاحب کے دادا مولانا سید غالب علی بڑے جیّد عالم اور اچھے شاعر تھے۔ وہ اپنے علم و فضل کی بنا پر اکبر شاہ ثانی کے دامن دولت سے وابستہ تھے۔ رام بابو سکسینہ صاحب نے اپنی مشہور تخلیق "تاریخ ادب اردو" میں اکبر شاہ ثانی کے دربار کے جن تین ممتاز شعرا کا ذکر کیا ہے ان میں شاہ نصیر، میر نظام الدین ممنوںؔ کے ساتھ سید غالب علی کا بھی نام شامل ہے۔ سید غالب علی اور ان کی اہلیہ دونوں کا انتقال حافظ سید علی حافظ صاحب کی صغر سنی میں ہو گیا تھا۔ ماں باپ دونوں کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے بعد حافظ صاحب کی پرورش ان کے حقیقی ماموں میر وزیر علی بلگرامی کے سایۂ عاطفت میں ہوئی۔ میر وزیر علی بلگرامی تحریک آزادی ۱۸۵۷ء کے فوراً بعد دہلی میں ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر تعینات تھے جن کا ذکر مرزا غالبؔ نے اپنے متعدد خطوط میں کیا ہے۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت جہانیاں جہاں گشت سے ملتا ہے۔ الغرض مسعود صاحب کو ذوق علم و ادب ورثے میں ملا تھا ــــ مسعودؔ صاحب نے علی گڑھ کالج میں تعلیم پائی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد سرکاری ملازمت اختیار کر لی اور خوش اسلوبی سے فرائض انجام دینے کے بعد ۱۹۴۰ء میں ڈپٹی کلکٹر کے عہدے سے قبل از وقت پنشن لے کر وطن چلے آئے۔ شاعری کا ذوق بچپن سے تھا کم سنی میں ہی شعر موزوں کرنے لگے تھے۔ گھر کے علمی و ادبی ماحول نے شوق کو جلا بخشی اور مشق و مطالعہ کی بدولت جلد ہی اپنے حلقے میں ممتاز ہو گئے ــــ ۱۷ سال کی عمر میں ۱۹۰۲ء سے ان کا کلام ملک کے معیاری رسائل میں چھپنے

لگا تھا۔ جس میں گلچیں، منظر، اور جشن ادب وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ جب ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کی شہرت، ہمت افزائی اور قدر دانی ہونے لگی تو اس وقت کے مشہور استاد فن فضل اللہ ولد سید افضل علی متخلص بہ افضل لکھنوی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ افضل لکھنوی صاحب، اسیر لکھنوی، استاد واجد علی شاہ اختر کے چھوٹے صاحبزادے تھے۔ مسعود صاحب نے ایک مقطع میں افضل صاحب سے عقیدت کا اظہار یوں کیا ہے۔

فیض ہے حضرت افضل کا یہ اولیٰ مسعود
ورنہ مشکل تھا مرا صاحب دیواں ہونا۔

مسعود صاحب نے اپنی علم و ادب سے دلچسپی، شاعری اور زباں دانی کی بدولت نوجوانی میں اچھی شہرت و مقبولیت حاصل کرلی تھی کہ حکومت یو۔ پی نے ان کے فرائض منصبی کے ساتھ ساتھ ایک سرکاری اخبار کو آپریٹو جرنل کی ادارت بھی سونپ دی تھی ــــــــ مسعود صاحب اپنی سرکاری مصروفیات کے باوجود ہمیشہ شعر و شاعری کے لیے وقت نکال لیتے تھے۔ انھیں علمی و ادبی مشاغل کے سبب وہ ایک بین الاقوامی علمی ادارے رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے رکن مقرر ہوئے تھے ــــ ۱۹۳۰ء میں احباب اور قدر دانوں کے اصرار پر پہلا دیوان طغرائے سخن، مصباح پریس سیتاپور سے چھپوا کر شائع کیا جو ادبی حلقوں میں مقبول ہوا ــ ۱۹۳۹ء میں دوسرا مجموعۂ کلام باغ و گلشن نامی پریس لکھنؤ سے شائع ہوا ــــ تیسرا مجموعہ باغ بد نظر میں جس کا انتخاب آغا اشہر لکھنوی (تلمیذ پیارے صاحب رشید لکھنوی) نے کیا تھا۔ ۱۹۵۰ء میں ان کے مقدمے کے ساتھ شائع ہوا۔ اور آخری تصنیف علم الحساب تواریخ جو اردو ادب کے زوال پر صنف تاریخ گوئی میں نہایت جامع اور گراں قدر اضافے کی حیثیت رکھتی ہے ۱۹۶۳ء میں ادارہ انیس اردو الہ آباد نے شائع کی۔ یہ مسعود صاحب کا نہایت اہم علمی و ادبی کارنامہ ہے۔ اس میں تقریباً ۲۰۰۰ قطعات تاریخ ہیں جو ۱۲۸ صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ مسعود صاحب کو فن تاریخ گوئی سے بے حد شغف تھا۔ آخری عمر میں مشغلہ شعر و سخن میں رفتہ رفتہ یہی فن خصوصیت کے ساتھ مرکز فکر و توجہ بن گیا تھا۔ موجودہ دور میں سہل پسندی نے اس صنف کو نظر انداز کر دیا ہے۔ ممکن ہے کہ مسعود صاحب کی قابل قدر تصنیف اس صنف سخن میں آخری اضافہ کی حیثیت حاصل کرے۔ انھوں نے اتنی کثرت سے قطعات تاریخ کہے ہیں کہ انھیں یکجا کرنا دشوار ہے۔ تاریخ گوئی میں انھیں صوری و معنوی دونوں اقسام و صنائع پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ اور انھوں نے فن تاریخ گوئی میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ سہرے میں مادۂ تاریخ کو شامل کرنا مسعود صاحب کی ایجاد ہے۔

شاعر کی حیثیت سے انھوں نے جملہ اصناف سخن، قصیدہ، سہرا، رباعی، مرثیہ، مسدس، مخمس، نظم، غزل وغیرہ میں کامیاب طبع آزمائی کی ہے۔ مگر ان کا اصل میدان غزل اور تاریخ گوئی ہے۔ غزل گوئی میں وہ اپنے استاد کے توسط سے امیر و اسیر کے رنگ سے متاثر تھے۔ ان کا ابتدائی دور شاعری اور ماحول وہ تھا جس میں داغ و جلال کا طوطی بول رہا تھا۔ انھیں کے رنگ تغزل کی دھوم تھی۔ نئے خیالات و اسالیب کو اپنایا جا رہا تھا۔ مسعود صاحب نے بھی وہی رنگ اختیار کیا اور ساری زندگی اسی کی پیروی کرتے رہے۔ دبستان لکھنؤ کی روایات کی پابندی، متروک الفاظ و محاورات کے استعمال سے اجتناب، تشبیہات و محاورات کا برمحل استعمال، فکر قدیم و جدید کا امتزاج، تخیل میں ندرت اور تنوع، فصاحت و سادگی، بیان کی صفائی اور انتخاب الفاظ ان کے کلام کی خصوصیات ہیں۔

میں نے مسعود صاحب کو بہت دیکھا، بہت سنا اور کبھی کبھی ان کی خدمت کے مواقع بھی نصیب ہوتے رہے۔ وہ میرے والد مرحوم کے مخلص اور پرانے ساتھی تھے۔ میں انھیں

بچا کہتا تھا اور وہ انتہائی مشفقانہ برتاؤ کرتے تھے۔

گداز جسم، نکلتا قد، بھرا بھرا پروقار دمکتا چہرہ، خوبصورت روشن آنکھیں، آنکھوں پر چشمہ، چمکتی اور صاف صاف مانند ستواں ناک، بڑی تنی اور گھنی مونچھیں جو کبھی برائے نام اور اور کبھی صاف بھی ہو جاتی تھیں۔ رکھ رکھاؤ شیریں لہجہ، اخلاق اور مروّت کے پیکر، کشادہ نظر، فراخ دل، چال ڈھال میں سلامت روی، قصباتی اقدار کے دلدادہ، حفظ مراتب کے قائل، شریف النفس، دردمند، ملنے والوں سے اظہار خلوص — ڈھیلی لکھنوی شیروانی، کشتی نما ٹوپی، علیگڑھ قطع کا پاجامہ، پیر میں خوبصورت پمپ — یہ حلیہ تھا سید مسعود حسن مسعود تھیم پوری کا۔

افسوس! ۲۰ دسمبر ۱۹۷۲ء کو طویل علالت اور ضعف پیری کا مقابلہ کرتے کرتے ۸۸ سال کی عمر میں یہ قادر الکلام شاعر تاریخ گو، زباں داں دنیائے علم و ادب پر اپنے گہرے نقوش چھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔ کہا تھا

دفن کرتے لاش کو دشمن تو کیوں ہوتا قلق
خاک میں احباب آئے ہیں ملانے کے لیے

احباب، سوگوار خاندان اور قدر دانوں اور مداحوں نے اسے سپرد خاک کر دیا۔

مسعود صاحب کی غیر معمولی مقبولیت اور ہردلعزیزی کا یہ عالم تھا کہ انتقال کے وقت نہ وہ ڈپٹی کلکٹر تھے، نہ زمیندارانہ جاہ و جلال باقی رہ گیا تھا۔ نہ وہ پونجی پتی تھے نہ سیاسی لیڈر لیکن انتقال کی خبر پاتے ہی اکثر دکانیں بند ہو گئیں۔ ان کے سوگ میں مقامی کچہری میں تعطیل کا اعلان کر دیا گیا۔ بار ایسوسی ایشن و مقامی سماجی، ادبی و سیاسی انجمنوں نے تعزیتی جلسے منعقد کر کے دلی رنج و غم کا اظہار کیا۔ صوبے کے مقتدر اخبارات نیشنل ہیرالڈ، پاینیر، قومی آواز، نوجیون وغیرہ میں انتقال کی خبر نمایاں طور پر شائع ہوئی۔

مسعود صاحب اپنی علمی و ادبی خدمات کے علاوہ انسان دوستی، حسن اخلاق، غیر فرقہ واریت، ضرورت مندوں کی بے لوث خدمت کے لیے بھی یاد کیے جائیں گے۔

نمونۂ کلام

غزل کے اشعار سے

رہنے دے داغ ہجر کا اے چارہ گر یوں ہی
تصویر یہ مرے دل درد آشنا کی ہے

بہت کہہ چکے آپ اپنی کہانی
ہماری بھی سن لیجیے داستاں اب

بڑے ساماں سے پیری آ رہی ہے
چلی ہے خیر مقدم کو جوانی

دل جگر میں تری چتون سے بچاتا کیونکر
تیغ کا طور بھی تھا تیر کا انداز بھی تھا

کہاں کی چال نکالی ہے اور کہاں کی طرح
زمیں پہ آپ چلے ہیں تو آسماں کی طرح

وہ سنورتے ہیں تو کہتا ہے غرور دلبری
آئینہ دیکھا ادھر تم نے ادھر محشر اٹھا

خدا ہی جانے کہ رندوں نے کیا کیا مسعود
جناب شیخ نے فریاد کی اذاں کی طرح

ٹوٹتا ہے انھیں کا عہد وفا
عہد جو بار بار کرتے ہیں

محفل میں ہم کو دیکھ کے بیزار ہو گئے
جنت میں آتے آتے گنہگار ہو گئے

دیکھو مری تقدیر کو تحریر نہ دیکھو
تم بھی وہی لکھ دو جو مقدر میں لکھا ہے

تمھیں بتاؤ کہ تاثیر اس میں کیا ہوگی
جو تم سنو گے مرا حال داستاں کی طرح

دل اپنا ہم تو زمانے سے صاف رکھتے ہیں
اس آئینے میں نہیں ہے غبار کی صورت

اک گرد باد خاک کا نقشہ ہے زندگی
گویا کہ ہیں زمیں پہ نہ ہم آسمان پر

آہ یہ چارہ سازیاں، ہائے یہ بے نیازیاں
سب سے نظر ملی ہوئی سب سے مگر الگ الگ

تم نے تو حکم صبر و تحمل کا دے دیا
یہ تو بتاؤ صبر کا امکاں اگر نہ ہو

اتنا بڑھا بتوں کی محبت کا سلسلہ
رشتے مری نگاہ کے زنار ہو گئے

لحد میں چین سے ہوتی امید سونے کی
مزار تم جو بناتے الگ مرے دل کا

غیر سے فرما رہے ہیں قتل کر دیں گے تجھے
رخ ادھر ہے اور اشارہ ہے مرے دل کی طرف

اب شوق سے کرو ستم و جور ناروا
لے وقت کریں گے نہ شکوہ خدا سے ہم

اس سخن سنجی سے اے مسعود آج
دہر میں مشہور تیرا نام ہے

نعت کے چند اشعار

ترا فیض ہے فیض عام اللہ اللہ
کرم کو ہے تیرے دوام اللہ اللہ

ہے دل میں ترا احترام اللہ اللہ
درود اللہ اللہ سلام اللہ اللہ

ترے لب کا ہر لفظ قرآں کا ناطق
اور اسلام تیرا پیام اللہ اللہ

خدا جانتا ہے کہ معراج کی شب
ہوا عرش تیرا مقام اللہ اللہ

یہ ادنیٰ کرشمہ تھا تیری نظر کا
کہ پختہ ہوا دین خام اللہ اللہ

وہی دل ہے آئینہ خانہ کہ جس میں
ہے ورد زباں صبح و شام اللہ اللہ

صدا لیل اسریٰ یہ مسعود آئی
محمدؐ ہوئے شاد کام اللہ اللہ

نظم "ہولی" کے چند اشعار

محبت کا ہے اک اظہار ہولی
گلے ملنے کا ہے اقرار ہولی

مسرت کی علمبردار ہولی
ہر اک تہوار کی سردار ہولی

اڑاتے ہیں گلال اور رنگ ہر سو
بنی ہے اس لیے گلنار ہولی

ہے اہل ہند سے یہ عرض مسعود
مبارک آپ کو سو بار ہولی

تاریخ وفات حضرت جگر مرادآبادی

شاعر خوش ذوق و خوش الحان — تھے غزل میں جدید رجحانات
تھے جگر فخر مراد آباد — جامع خوبی و ستودہ ذات

کہیئے تاریخ ان کی اے مسعود
ناظم خوش بیاں ہے سال وفات

۱۹۶۰ء

قطعہ تاریخ تعمیر اسپتال چشم سیتاپور

ہوئی فیض ایم ۔ پی سے مسعود خوب
عمارت کی تعمیر با کر و فر

جو ہے فکر تاریخ مسعود اب
کہو تم بنور سعادت نظر

۱۹۶۳ء

قطعہ تاریخ تعمیر مکان خود

مسعود نے کیا بنوائی منزل — رشک جناں ہے بہتر و برتر
دو بار سنہ تعمیر کہیے — "انا اعطینٰک الکوثر"

۱۹۶۴ء

قطعۂ تاریخ تعمیر مسجد

بن گئی تاج پور میں مسجد — مرحبا کہیے مرحبا کہیے
اب یہاں کے ہر ایک مومن کو — پیروِ دینِ مصطفٰے کہیے
سالِ تعمیر کے لئے مسعود
مسجد خانۂ خدا کہیے

۱۳۹۸ھ

سہرے میں مادۂ تاریخ

(چند شعر)

ہے محبت کی ابتدا سہرا — اور مسرت کی انتہا سہرا
اللہ اللہ ذوقِ پابوسی — جا کے پہونچا ہے تا قبا سہرا
مرکزِ حسن پر پہونچتے ہی — مطلعِ نور بن گیا سہرا
سرِ نوشہ پہ چتر کی صورت — ہو گیا سایۂ ہما سہرا
ہے یہ مسعود مصرعۂ تاریخ
شکلِ فردوس خوش نما سہرا

۱۹۷۳ء

ہر چند کوئی راہ نہیں ہے چٹان پر
پھر بھی قدم جما تو رہی ہوں ڈھلان پر
یوں تبصرہ کرو نہ دلِ نیم جان پر
وقت آنے کا تو جان بھی دے دے گی آن پر
ہے دورِ انقلاب علامت تو دیکھنا
پتھر پڑیں گے شیشہ گروں کی دکان پر
شبنم کے آنسوؤں سے دمِ صبح رو پڑا
کیا اثر صبر پڑتا مرا آسمان پر
ویرانیوں پہ ٹوٹ پڑے صحرا بھی شرمسار
آسیب کا نزول ہے ہمارے مکان پر
بھولا ہوا فسانہ تجھے یاد آ گیا
جب بھی کوئی پتنگ گری سائبان پر
نظروں سے عرضِ حال کریں گے ترے حضور
تالے اگر پڑیں گے ہماری زبان پر

مولانا عبدالماجد — صفحہ ۲۹ کا بقیہ

جس سے آپ نے سب سے زیادہ اثر قبول کیا ہو۔

جواب: پبلک زندگی میں مولانا محمد علی اور حضرت اشرف علی تھانوی، اور نجی زندگی میں بیوی مرحومہ کی وفات، کہ اس کے بعد سے آج ساڑھے چار سال تک کھل کر ہنسی نہیں آئی (یہ تحریر ۱۹۷۲ء کی ہے)

سوال: آخر میں آپ یہ بتانے کی زحمت فرمائیے کہ آج کل آپ کی مصروفیات کیا ہیں؟

جواب: سب سے اور اہم ترین مصروفیات دو ہیں:
۱۔ اردو تفسیر و ترجمہ قرآن کی کامل و مفصل نظرثانی
۲۔ صدق کی اڈیٹری

نئی زندگی — صفحہ ۲۴ کا بقیہ

عکاس ٹھنڈ اور غصہ سے کانپ رہا تھا۔ فراز علی اس کی پشت سہلانے لگا۔

"بجوا! دل چھوٹا مت کر میرے پاس آ۔"

گیلے کپڑوں میں لپٹے ہوئے فراز علی کے ہونٹوں پر ایک پھیکی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"بیٹے کو باپ سے کاہے کی شرم؟ آج سے میں تیرا بیٹا ہوں بجوا — ہوں کہ نہیں؟"

ننگا باپ اور جسم سے انگوچھا لپیٹے بیٹا نہایت بے تابی سے سورج طلوع ہونے کا انتظار کرنے لگے۔

★

غزل

ایم اے شفق
رابرٹس گنج مرزاپور یوپی

ہر ایک گام پہ تپ کر نکھر رہے ہیں ہم
وفا کی راہ سے شاید گزر رہے ہیں ہم

سب ایک جیسے مکاں ایک جیسے چہرے ہیں
بتائیں کیسے کہاں سے گزر رہے ہیں ہم

ہے مستعار حیات اس کا کیا حساب و کتاب
کہ روز روز نیا سود بھر رہے ہیں ہم

ان آندھیوں سے کتاب حیات کیا بچتی
ورق ورق ہیں تو ہر سو بکھر رہے ہیں ہم

سبق وہ ہم کو ملا دوستوں کی قربت سے
کہ آج اپنے ہی سائے سے ڈر رہے ہیں ہم

حیات ڈھونڈتی پھرتی ہے اور ہوتے ساتھ
کہیں سحر تو کہیں شام کر رہے ہیں ہم

تو سامنے ہے تو لگتا ہے یہ کہ ترے ساتھ
نہ رات بھر سہی کچھ پل سحر رہے ہیں ہم

کرم وہ ہم پہ ہوا ہے غمِ زمانہ کا
نہ جی رہے ہیں نہ اے دوست مر رہے ہیں ہم

شفق سے رنگ ستاروں سے روشنی لے کر
بساطِ اوجِ سخن پر ابھر رہے ہیں ہم

ایم اخلاق
۱۰۳ کٹرہ عبدالغنی
فتح پور یوپی

ڈھونڈ کر لائے گا کیا کوئی بھلا میری نظیر
میں ہوں اُجڑی ہوئی دنیا میں بہاروں کا سفیر

آج تک میں نے بڑھایا ہی نہیں دستِ طلب
فطرتاً میں بھی تو نگر ہوں بظاہر ہوں فقیر

جانتے جانتے تمھیں کہنی نہ تھی ایسی کوئی بات
دل میں پیوست کیے جاتے ہو میرے اک تیر

انقلابات زمانہ کا کرم ہے ورنہ
سربلند ان کو بھی کہتے تھے جو ہیں آج فقیر

میں نے ہر دور کی تاریخ مرتب کی ہے
وقت کر ہی نہ سکا مجھ کو کبھی اپنا اسیر

ہر نیا حادثہ آئینہ دکھائے گا تمھیں
یہ مرا قول ہے سمجھو اسے پتھر کی لکیر

اس کے ہاتھوں ہوئی رسوائی مقدر اخلاق
دل جسے کہیے وہ ہے ایک ستم پیشہ مشیر

کمال جائسی
کرنیل گنج
کانپور

بات جو پردے کی تھی اہلِ جہاں تک گئی
زلف کی تازہ مہک اُڑ کے کہاں تک گئی

چھونے موسم ہنسے کچھ نئے گلشن سجے
چھو کے بدن کو ترے صبح جہاں تک گئی

رات نشیلی ہوا مجھ کو لیے ساتھ ساتھ
گاتی بہکتی ہوئی اس کے مکاں تک گئی

مقفل مستی بنی رہ گزرِ مے کدہ
سنتے ہیں یہ بھی خبر پیرِ مغاں تک گئی

رنگ وفا ڈھونڈنے آج کبھی موجِ بہار
شہرِ جنوں خیز سے سرحدِ جاں تک گئی

پھول سا چہرہ ملا نور کی محراب میں
آج ہماری نظر کاہکشاں تک گئی

ہو نہ سکی شرحِ غم جب بھی مکمل کمال
میری شکستہ دلی حدِ بیاں تک گئی

سلیمان ظفر "مدھوما" فلیٹ نمبر ا
ڈی ۔ این نگر ۔ ڈھیک کالونی' اندھیری
(ویسٹ) بمبئی ۴۰۰۰۵۸

کیوی

نیوزی لینڈ کا قومی پرندہ

کیوی نیوزی لینڈ کا پرندہ ہے' قومی پرندہ' حیرت انگیز اور عجیب وغریب۔ اسی کے نام سے نیوزی لینڈ کے لوگ کیوی کہلاتے ہیں اور نام کے اس تعلق نے اسے ساری دنیا میں مشہور کر دیا ہے۔

کیوی ایک پھیکے بے کیف کتھئی رنگ کا اور بغیر دُم کا پرندہ ہے جو اُڑ نہیں سکتا۔ اس کی بھاری بھر کم ٹانگوں پر لدا گول مٹول جسم پروں سے ڈھکا ہوتا ہے' لیکن اس کے وجود کی سب سے نمایاں شے اس کی لمبی چونچ اور اس کے سرے پر واقع اس کے نتھنے ہیں' جو زبردست قوتِ شامّہ رکھتے ہیں۔ اپنی اس مخصوص قسم کی چونچ کی مدد سے یہ بڑی آسانی سے اپنی غذا کا سراغ لگا سکتا ہے۔ اس کی اس خطرناک قسم کی لمبی چونچ دیکھنے کے بعد یہ تصور ذہن میں آتا ہے کہ یہ اس کا استعمال لڑائی یا دشمن سے مقابلے میں بڑی خوبی سے کرتا ہوگا، لیکن ایسا نہیں ہے۔ دراصل کیوی کا بہترین حربہ اس کی مضبوط فولادی ٹانگیں ہیں۔

نیوزی لینڈ کا بچہ بچہ اس کے نام سے واقف ہے لیکن بہت ہی کم لوگوں نے اسے جنگل میں آزادی سے گھومتے پھرتے دیکھا ہوگا۔ یہ گھنے جنگلوں میں دن بھر کسی گرے ہوئے درخت کے کھوکھلے تنے میں یا دریا کے کنارے کسی نچلے پوشیدہ حصے میں چھپا بیٹھا رہتا ہے اور جب یہ رات کے وقت کیڑے مکوڑوں کا شکار کرنے اور زمین پر گرے ننھے ننھے پھلوں کو کھانے کی غرض سے نکلتا ہے تو یہ دیکھنے والوں کو اس دنیا کی مخلوق نہیں لگتا بلکہ زہرہ' مریخ یا کسی اور سیارے سے وارد کوئی شے لگتا ہے' خاص طور سے چاندنی رات میں اس کا کیڑے مکوڑوں کی تلاش میں دوڑنا عجیب منظر پیش کرتا ہے' یہ پرندہ نہیں بلکہ پرندے کا بھتنا نظر آتا ہے۔ نرم اور گیلی زمین پر کیڑوں کی تلاش میں اس کی لمبی' حساس اور سونگھنے کی زبردست قوت رکھنے والی چونچ کا ساتھ اس کی سخت اور بے لوچ بلیوں جیسی مونچھیں دیتی ہیں۔ یہ اپنی مونچھوں کے ذریعہ بہت سی ایسی چیزیں محسوس کر لیتا ہے جو اس کی ننھی اور کم دیکھنے والی آنکھوں سے چھپی رہتی ہیں۔

عام طور سے کیوی نہ پانی پیتا ہے اور نہ نہاتا ہے۔ یہ ریت کا غسل بھی نہیں کرتا۔ اس کے سونے کا انداز بھی دوسرے پرندوں سے قدرے مختلف ہے۔ یہ اپنی چونچ کو اپنی ٹانگوں کے درمیان ڈال کر بال و پر کی ایک بڑی گیند کی مانند پڑا سویا یا آرام کرتا رہتا ہے۔

یہ کیوی کیوں کہلاتا ہے؟ دراصل یہ نام اس کی آواز کی وجہ سے پڑا ہے۔ یہ ایک طویل 'کی ی ی' کے بعد 'وی ی' کی آواز نکالتا ہے جو رات کی خاموشی میں ایک کلومیٹر سے بھی زیادہ دور

تک سنائی دیتی ہے۔ اس کی اس بولی پر ہی نیوزی لینڈ کے قدیم ماؤری لوگوں نے اس کا نام 'کیوی' رکھ دیا ہے۔

کیوی کا گوشت بڑا لذیذ ہوتا ہے اس لیے ماؤری لوگ اس کے گوشت کے رسیا تھے اور اسے اس کی آواز کی نقل اتار کر بلاتے اور اس کا شکار کرتے تھے۔ اسے تلاش کرنے اور پکڑنے کے لیے وہ اپنے ہاتھوں میں تیز روشنی والی ٹارچیں لے کر نکل کھڑے ہوتے۔ اپنی ان ٹارچوں کی مدد سے وہ کیوی کی آنکھوں کو چندھیا کر اسے بوکھلا دیتے اور پھر آسانی سے اس کا شکار کر لیتے۔

جس رات انھیں شکار کو جانا ہوتا اس دن وہ روزہ رکھتے۔ اور شکار کے لیے رات کا انتخاب ان کے مذہبی پیشوا ٹوہنگا (TOHUNGA) کرتے تھے۔ پہلے جب کیوی کا شکار ہوتا تو آگ جلائی جاتی اور اس کے دل کو بھون کر دیوتاؤں کی نذر کیا جاتا۔ اس موقع پر ٹوہنگا ہاتھ میں کیوی کا دل لیے اپنی مخصوص دعا کراکیا (KARAKIA) پڑھا کرتے تھے۔

انیسویں صدی کے وسط میں سفید فام اقوام کی نیوزی لینڈ میں آمد اور ان کی نو آبادی کے قیام کی وجہ سے زیادہ زمین کی ضرورت پیش آئی اور انھوں نے کیوی کی آبادی والے علاقے پر یلغار کی، جنگلات کی صفائی کی اور زمین قابل کاشت بنا کر کیوی کو وہاں سے بھاگنے پر اور دور افتادہ ناقابل کاشت اور زیادہ بارش والے پہاڑی علاقے میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ یوں بھی زمین پر رہنے والے پرندے اور خاص طور سے ایسے پرندے جن کا بڑی آسانی سے شکار کیا جا سکتا ہو، ناپید ہو جاتے ہیں، ان کی نسل تک صفحۂ ہستی سے ختم ہو جاتی ہے، حیرت ہے کہ کیوی جیسا پرندہ اتنے نامساعد حالات میں کرۂ ارض پر اپنا وجود برقرار کیسے رکھ سکا۔

کیوی کے جوڑے کا جنسی اتصال رات کی تاریکی میں ان کی اپنی بو باس اور آوازوں اور جوابی آوازوں کے سہارے ہوتا ہے کیونکہ یہ ایک دوسرے کو پوری طرح دیکھ نہیں پاتے ہیں۔

گھونسلے کی تعمیر اور اس کے بعد کی ذمہ داریوں کی کہانی بھی بڑی عجیب اور دلچسپ ہے۔

نر اپنی مادہ کا بڑا خدمت گزار شوہر ثابت ہوتا ہے اور اپنی بیوی کے آرام اور خوشنودی کی خاطر بڑی بڑی تکلیفیں اٹھاتا ہے اور دوسری طرف اس کی بیوی معشوقانہ اداؤں کے ساتھ اپنے شب و روز بڑے آرام سے گزارتی ہے۔

گھونسلے کی تعمیر کا کام پوری طرح نر ہی انجام دیتا ہے۔ اس درمیان مادہ معمولی سی دلچسپی کے ساتھ اس کے کام پر نظر ڈال لیتی ہے یا بمشکل تمام شاید ہی کبھی گھاس پھوس کا ایک آدھ تنکا اٹھا کر دے دیتی ہے۔

جسم کے تناسب سے کیوی کا انڈا دنیا کے کسی بھی پرندے کے انڈے کے مقابلے میں بڑا ہوتا ہے۔ ایک انڈے کا وزن تقریباً چار سو سے پانچ سو گرام تک ہوتا ہے جبکہ مادہ کیوی کا وزن دو سے ڈھائی کلو گرام تک ہوتا ہے، غالباً یہی وجہ ہے کہ یہ ایک جھول میں صرف ایک ہی انڈا دیتی ہے۔

انڈا دینے کے بعد مادہ کیوی اسے چھوڑ کر فوراً روانہ ہو جاتی ہے اور نر کیوی دوسرے ہی لمحے اس پر قبضہ کر لیتا ہے اور پوری توجہ اور انہماک کے ساتھ اسے سینا شروع کر دیتا ہے۔ اس کے استغراق کا یہ عالم ہوتا ہے کہ یہ کبھی کبھار ہفتہ بھر بغیر کچھ کھائے پیئے اسے سیتا رہتا ہے اور جب کبھی یہ رات میں کھانے کی تلاش میں گھونسلہ چھوڑ کر جاتا بھی ہے تو انڈے کو اچھی طرح ڈھانک دیتا ہے۔

اس دوران اس کی کاہل بیوی کیڑے مکوڑے اور دیگر غذائیں کھاتی رہتی ہے اور انڈے میں سے بچہ نکلنے کے دو سے چار ہفتے تک کی مدت کے بعد یہ پھر گھونسلے کا رخ کرتی ہے اور کبھی کبھی دوسرا اور پھر اسی طرح تیسرا انڈا بھی دے دیتی ہے اور اس کا وفادار شوہر انھیں بخوشی قبول کرتا ہے اور بیوی کے عطا کردہ اس بیش بہا خزانے کو مزید حدت پہنچانے کے لیے اپنے سینے کے پر نوچ کر نکال لیتا ہے اور انھیں ۷۰ سے ۸۴ دن تک اپنے خون کی گرمی سے سیتا رہتا ہے۔

جب انڈے میں بچہ بن جاتا ہے تو اندر سے اپنی چونچ کے ذریعے کینچلی میں سوراخ کرتا ہے اور اپنے پنجے سے اسے توڑ کر باہر نکل آتا ہے۔ اس وقت اس کا رنگ تقریباً سیاہ ہوتا ہے اور یہ کیوی کی چھوٹی کاپی نظر آتا ہے۔ اگرچہ اس کے جسم پر پورے

بال و پر ہوتے ہیں، جن میں کچھ تو تقریباً ایک ایک انچ لمبے ہوتے ہیں، لیکن ان میں ایک لیس دار مادّہ بھرا ہوتا ہے۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوتی ہیں۔ اس کی ٹانگیں کافی مضبوط ہونے کے باوجود اس کے جسم کا بوجھ نہیں اُٹھا پاتیں اور یہ کھڑا نہیں ہو پاتا۔ محبت پدری سے سرشار اس کا باپ اسے گرمی پہنچاتا رہتا ہے حتیٰ کہ اس کے پر کا چکنا لیسدار مادہ سوکھ کر جھڑ جاتا ہے۔ زردی (تھیلی) کا بچا ہوا حصّہ کھا جاتا ہے اور بچہ چھ دن تک گھونسلے میں بیٹھا انڈے کی بچی کھچی زردی کھاتا رہتا ہے اور اس کا باپ اس عرصے میں کچھ بھی نہیں کھا پاتا۔

چھٹی شب فاقہ مست باپ اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور کیڑے مکوڑوں کی تلاش میں نکل پڑتا ہے، ساتھ ہی اس کا بھوکا چوزا بھی پہلی مرتبہ غذا کی کھوج میں نکل کھڑا ہوتا ہے اور اپنی لمبی چونچ نرم زمین میں کیڑوں کی تلاش میں پیوست کرنا شروع کرتا ہے اور پندرہ دن کے اندر تو یہ تیزی اور پھرتی سے دوڑنے بھاگنے بھی لگتا ہے۔ چلنا پھرنا شروع کرنے کے پہلے ہفتے میں اس کا وزن بہت کچھ گھٹ جاتا ہے لیکن پھر ایک مہینے میں اس کا وزن کوئی آدھا کلو گرام ہو جاتا ہے۔ اس وقت یہ چوبیس گھنٹے میں تقریباً آٹھ سو ننھے ننھے کیڑے کھا لیتا ہے جن کا مجموعی وزن اس کے اپنے وزن سے دگنا ہوتا ہے۔ جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے کہ کیوی صرف رات میں خوراک کی تلاش میں نکلتا ہے لیکن چوزا دن اور رات میں کسی بھی وقت کھانے کے لیے باہر آ جاتا ہے۔

چڑیا گھر یا حالتِ قید (CAPTIVITY) میں کیوی کی پیدائش اور پرداخت ہمت افزا نہیں رہی ہے کیونکہ اس کی نسل باوجود بھرپور کوشش کے دو پیڑھیوں سے زیادہ نہیں پنپ سکی۔ پارک میں پائے جانے پر یہ دھیرے دھیرے اپنے مالک سے کچھ مانوس بھی ہو جاتا ہے لیکن پھر بھی مالک کو ہوشیار رہنا پڑتا ہے کیونکہ اس کے پیر کی ذرا سی خلافِ معمول تیزی اسے اس قدر برانگیختہ کر دیتی ہے کہ یہ بجلی کی سی سرعت سے اندھا دھند اس پر حملہ آور ہو جاتا ہے اور اپنی بے پناہ قوت والی ٹھوکر سے اسے زخمی کر دیتا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا دشمنوں سے بھری اس دنیا میں کیوی اپنا وجود برقرار رکھ سکے گا یا اپنے جیسے بہت سارے دوسرے زمینی پرندوں کی طرح ناپید ہو جائے گا۔ سنہ ۱۸۹۶ء میں نیوزی لینڈ میں ایک قانون منظور کیا گیا جس کے تحت کیوی کو مکمل تحفظ دیا گیا ہے۔ جنگلات کی حفاظت کی حالیہ کوششوں نے بھی امید افزا نتائج کی نشاندہی کی ہے، لیکن ان سب سے بڑھ کر کیوی کے نئے حالات اور ماحول میں اپنے آپ کو ڈھالنے کے رجحان یعنی کیڑوں کی تلاش میں فصلوں میں اس کی آمد بڑی خوش آئند ہے کیونکہ کیوی کی طرح کی جبلّت اور فطرت کے غلام پرندوں کا اپنی عادت میں تبدیلی پیدا کر لینا ایک حیرت انگیز بات ہے، لیکن تیکر ہے کہ زندہ رہنے اور نسل قائم رکھنے کی جبلّت اس کی دوسری جبلتوں پر حاوی ہو رہی ہے نیز وہ ماحول اور حالات سے سمجھوتا کرنا سیکھ رہا ہے۔ اس کے مزاج، فطرت اور عادت کی یہ تبدیلی اس کی بقا کے لیے نہایت ضروری ہے۔ اس تبدیلی کی بنا پر یہ امید کی جا سکتی ہے کہ اس عجیب و غریب پرندے کا وجود قائم رہے گا۔

★

غزل

ایم۔ اے حسینی دیوانہ
مدرسہ برہانیہ کوٹہ (راجستھان)
۳۲۴۰۰۲

بحرِ غم میں موجزن ہے زندگی
کیا خبر کس کی لگن ہے زندگی

روزِ اوّل سے ہے سرگرمِ سفر
بے دیار و بے وطن ہے زندگی

چاک داماں گل ہیں، بلبل نالہ کش
کیا خزاں خوردہ چمن ہے زندگی

لمحہ در لمحہ پگھلتی جا رہی ہے
گویا شمعِ انجمن ہے زندگی

حسرتوں کا خون، ارمانوں کا خون
بستۂ دار و رسن ہے زندگی

درد کیا! غم کیا! خلش کیا! ٹیس کیا!
انجمن در انجمن ہے زندگی

اطلس و کمخواب تھے جن کے لیے
آج ان کی بے کفن ہے زندگی

راست گویانِ حقیقت کے لیے
عرصۂ دار و رسن ہے زندگی

اٹھ کہ دیوانے تجھے آسانی ہو موت
جذبہ ہائے کوہکن ہے زندگی

غزلیں

عارف نجمی
۲۴اے کٹرہ ابوتراب خاں
لکھنؤ

ہم کو توڑا گیا ہے دلوں کی طرح
ہم بھی پامال ہیں ساحلوں کی طرح

ہم تو ویرانیوں کے مکیں تھے مگر
محفلوں میں رہے محفلوں کی طرح

میں حقیقت میں تھا اک مقدس کتاب
لوگ پڑھتے رہے ناولوں کی طرح

مصلحت کی سنہری صلیبوں پہ ہم
قتل ہوتے رہے بزدلوں کی طرح

خود شناسی کی ہم کو سزا یہ ملی
زندگی بھر رہے غافلوں کی طرح

دھوپ میں بے بسی سے جو گھلتی رہیں
ہم بھی ہیں برف کی ان سلوں کی طرح

خون کر کے میں بخشی تمناؤں کا
خود سے چھپتا رہا قاتلوں کی طرح

فیضیاب علی شرقؔ
معرفت نیشنل ہرالڈ
لکھنؤ۔

لالہ و گل، مہ و انجم خورِ تاباں نکلا
حسن ہر رنگ میں تشہیر کا خواہاں نکلا

ختم ہستی پہ نہیں سلسلۂ بیم و اُمید
حشر تک طول تمناؤں کا طوفاں نکلا

ضائع جب ہو گیا اک حصۂ ہستیِ عزیز
پہلے درد سے تب درد کا درماں نکلا

چاند میں داغ ہے سوچ میں پڑتا ہوں عجب
کس کشش سے جمالِ رُخِ جاناں نکلا

آدمی کے لیے آساں نہیں انساں کا لقب
کن مراحل سے دُرِ قطرۂ نیساں نکلا

یا تو ملنے کے لیے تھا دلِ ناداں بیتاب
یا ملاقات کے بعد اور پریشاں نکلا

کتنے تاروں کی شب تار نے لی قربانی
تب دمِ صبح کہیں مہرِ درخشاں نکلا

ہم ہی کم صبر تھے کر بیٹھے جفا کا شکوہ
حسن ہر جور پہ دیکھا تو پشیماں نکلا

آج یہ علم و عمل ہی کی ہے برکت کہ شرقؔ
چاند پر گشت بشر کے لیے آساں نکلا

ڈاکٹر سید نقی احمد نقوی
۲۱ گولاپن ٹولہ، رانی منڈی
کمپاؤنڈر ڈاکٹر مصطفیٰ۔ الہ آباد

لال مرچ

آپ کی صحت کی حسین دشمن

دیکھنے میں سرخ، نرم و نازک ہونٹوں کی طرح اور وہ شوخی جو کسی کی ادا میں ہوتی ہے۔ مگر خطرناک اتنی کہ زندگی کو کم کر دیتی ہے۔ یہ لال مرچ ہے۔!! زبان پر ذائقہ مگر کھانا کھا کر "سی سی" کی آواز، پیشانی عرق آلود کان کی لویں سرخ۔ ہو سکتا ہے کہ ایک لمحہ کے لیے آپ کو کھانا ناپسند آگیا ہو مگر اس کھانے میں جس فیاضی کے ساتھ سرخ مرچ کا استعمال کیا گیا ہے۔ اس کا اثر آپ کی صحت پر کیا ہونے والا ہے کیا اس پر آپ نے کبھی غور کیا ہے؟

یہ سرخ مرچ۔ جو انتہائی حسین نظر آتی ہے، خاص طور سے خواتین اس کی طرف زیادہ ملتفت نظر آتی ہیں اور وہی سب سے زیادہ اس کا شکار ہوتی ہیں، انتہائی خطرناک ہے۔

اطبا نے معدہ یا آنتوں میں زخم کا سبب دماغی الجھن کھانا کھانے میں جلد بازی اور مرچ مصالحہ کا استعمال بتایا ہے۔

چونکہ مردوں کے مقابلہ میں خواتین لال مرچ کا استعمال زیادہ کرتی ہیں اس لیے یہ مرض نسبتاً خواتین کو زیادہ لاحق ہوتا ہے۔ یہ ایک بڑا موذی مرض ہے جس سے پیٹ میں پہلے ہلکا ہلکا درد ہوتا ہے جو شدت اختیار کر لیتا ہے۔ ابتدا میں طبیعت مالش کرتی ہے اور پھر کچھ عرصہ بعد کھانا کھانے کے تھوڑی دیر بعد قے ہو جایا کرتی ہے۔ یہی زخم جب زیادہ بڑھ جاتے ہیں تو خونی قے ہونے لگتی ہے۔ اور پھر آنتوں میں سوراخ ہو جانے سے کبھی کبھی موت واقع ہو جاتی ہے۔

لال مرچ کے زیادہ استعمال سے دائمی قبض، پیٹ میں تیزابیت (ACIDITY) جس کی وجہ سے کھٹی ڈکاریں سینہ میں جلن ڈکار کے ساتھ منہ میں ترش پانی کا آجانا اور منہ میں چھالے وغیرہ کی شکایتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ مستورات تو اس کی اصل شکار ہوتی ہیں تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ اکثر عورتوں کو چار چار دن اجابت نہیں ہوتی جو نتیجتاً بواسیر کا شکار ہو جاتی ہیں اور تقریباً اسی فیصد خواتین سیلان الرحم (لیکوریا) میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ اس موذی مرض سے ناکتخدا لڑکیاں بھی محفوظ نہیں ہیں۔ لیکوریا کی خاص علامات پنڈلیوں میں اینٹھن، پیر اور کمر میں درد ایام کی تکالیف اور بے قاعدگی، پیشاب میں جلن، اور طبیعت کی بے چینی ہیں اور اس کا سبب ہے لال مرچ کا زیادہ استعمال۔

لال مرچ کی تاثیر بہت گرم ہوتی ہے۔ اس لیے اس کے استعمال سے جگر میں حرارت پیدا ہوتی ہے اور جگر کا فعل ناقص ہو جاتا ہے۔ مردوں کو مادہ منویہ کے رقیق ہو جانے سے سرعت انزال کی شکایت لاحق ہو جاتی ہے۔ اس کے زیادہ استعمال سے جلدی بیماری کا احتمال بھی رہتا ہے نیز دماغ میں ضعف، اختلاج قلب، غصہ، چڑچڑاپن اور نسیانی حالت پیدا ہو جاتی ہے۔ لہذا ایسی شے کا استعمال جس سے نقصان ہی نقصان ہو بربنائے عادت یا بربنائے لذت زبان بعید از دانشمندی ہے۔

یہاں یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ ہماری غذا میں جتنے بھی حیاتین (VITAMIN) ہوتے ہیں ان سب کو لال مرچ ضائع کر دیتی ہے۔ اس کے نتیجہ میں جو قوت ہمیں غذا سے ملنا چاہیے وہ نہیں حاصل ہو پاتی۔ اس طرح جسم کو حیاتین نہ ملنے کے سبب ہم مختلف امراض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ لہذا لال مرچ کے شائقین کو ہمارا مشورہ ہے کہ وہ اس کے بجائے کالی مرچ (گول مرچ) کا استعمال کریں جس سے زبان کو لذت ملے گی اور ساتھ ہی ساتھ وہ لال مرچ کے جملہ نقصانات سے بھی بچ جائیں گے۔ کالی مرچ کے استعمال سے فوائد زیادہ ہیں اور نقصانات برائے نام۔ برخلاف اس کے لال مرچ کے نقصانات بہت زیادہ ہیں اور فائدہ نہیں کے برابر۔

ھما شکیل بدایونی
بی شوگر فیکٹری ڈاکخانہ نیولی
ضلع ایٹہ - یوپی

(افسانہ)

بڑا آدمی

" نہیں کھانا ہے تو کم بخت مت کھا ،، شو بھا، غصّے میں
ری کھانے کی تھالی میز پر پٹخ کر اٹھ کھڑی ہوئی —
شت بھر کی چھوکری نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ ہماری رانی کے
ی وقت دماغ ہی نہیں ملتے۔ اتنی ہی دیا دُ ہے تو جا، دے آ،
رکی ہر چیز اسس مزدور غلام رسول اور اس کے بیٹے شہباز
ر۔"

" ارے بھئی کیوں بگڑ رہی ہو ہماری رانی بٹیا پر؟" ورما صاحب
نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔" یہ کیسا شور مچا
کھاہے۔ تم نے ؟ ،،

" شور میں نے مچا رکھا ہے یا آپ کی چہیتی بیٹی نے ؟" وہ ایکدم
پھر گئی۔" سامنے مکان کیا بن رہا ہے میری جان آفت میں
گئی ہے۔ نہ جانے کونسی گھڑی اسس مکان کی نیو رکھی
ئی تھی۔" " آخر اسس مکان نے تمہارا کیا نقصان کیا ہے؟
ج یہ تم کیسی بے تکی باتیں کر رہی ہو شوبھا؟" " میں بے تکی
تیں کر رہی ہوں تو جائیے تُک کی باتیں آپ کیجیے۔ جتنے بھی
ریب، فقیر اور ناتھ شہر میں ہوں، سب کو بلا کر اپنے
ھر میں رکھیے، انھیں کھانا کھلائیے۔ ہونھہ! گھر نہ ہوا اناتھ
آشرم ہوگیا۔"

" اری بھاگوان کچھ بتاؤ گی بھی .... آخر ہوا کیا ہے ؟ ،
" ہونا کیا تھا۔ آپ کی بیٹی صاحبہ نے بھوک ہڑتال کر
رکھی ہے۔،،

" بھوک ہڑتال کر رکھی ہے ... آخر کیوں ؟"

" غلام رسول اور اس کے بیٹے کو دوپہر کا کھانا جو نہیں
ملتا۔ وہ چاہتی ہے میں انھیں روز بلا کر ان کو کھانا کھلاؤں یا پھر
روز ان کے لیے تھالی پرس کر بھیجا کروں۔ واہ کیا
خوب ضد ہے ... کان کھول کر سُن لیجئے۔ آپ کی صاحبزادی
صاحبہ کھانا کھائیں یا نہ کھائیں اس کی خاطر میں ہرگز اپنا
دھرم نشٹ نہیں کروں گی،، وہ غصّے سے لال پیلی ہو کر کمرے
سے چلی گئی۔ ورما صاحب نے گہری سانس لیتے ہوئے بیٹی کو
دیکھا جو دونوں ہاتھ اپنی ننھی سی ٹھوڑی کے نیچے رکھے، آنکھوں
میں آنسو بھرے خاموش بیٹھی تھی ؟ ،،

" کیوں بیٹی! کیا بات ہے ... تم نے کھانا کیوں نہیں
کھایا ؟ ؟" انھوں نے پیار سے اس کا چہرہ تھپتھپاتے ہوئے پوچھا۔!
معصوم نندہ، جو ماں کے خوف سے سہمی بیٹھی تھی، باپ کے
پیار بھرے لہجے سے یکبارگی پھوٹ پڑی — " ڈیڈی! غلام
رسول اور ... اُس کا لڑکا ... کئی وقت سے ... بھوکے ہیں ؟"
وہ باپ کے سینے سے لگ کر سسکتے ہوئے رک رک کر کہنے
لگی " شہباز بہت ... چھوٹا ہے ... ڈیڈی! بالکل ...
میرے جیسا ... سب مزدور ... گُڑ سے ... باجرے کی
روٹی ... کھاتے ہیں مگر ... وہ دونوں ... نیم کے پیڑ
کے ... نیچے بھوکے بیٹھے ... رہتے ہیں ... اُن کے پاس ...
کھانے کو کچھ بھی ... نہیں ہوتا ڈیڈی !،، بیٹی کی بات سن کر
ورما صاحب کے چہرے کا رنگ عجیب سا ہوگیا۔ وہ اُسے
غور سے دیکھنے لگے۔ شاید بیٹی کے احساسات نے اتنی تپنی کے

احساسات کا موازنہ کر رہے تھے۔ اور پھر بے اختیار انھوں نے
بیٹی کی پیشانی چوم لی۔ اور اس کے آنسوں پونچھتے ہوئے بولے۔
"اچھا بیٹی! تم فکر مت کرو۔ ہم خود جا کر غلام رسول اور اس کے
بیٹے کو پیسے دے آئیں گے۔ وہ بازار سے کھانا لا کر کھالیں گے۔"
معصوم نندہ خوش ہوگئی۔ مگر ماں کو آتا دیکھ کر اس کا
خوشی سے دمکتا ہوا چہرہ اُتر گیا۔ "کس کو پیسے دینے کی بات
کر رہے تھے؟" شوبھا نے آتے ہی دونوں کو گھورتے ہوئے
کرخت آواز میں پوچھا۔ "غلام رسول کو۔" ورما صاحب نے
مختصر سا جواب دیا۔

"تو جائیے گھر بھر دیجیے اس بھکاری کا جو دوسروں
کے بچوں کو بہلا پھسلا کر اپنا مطلب نکالتا ہے... ابھی وہ پھر
نندہ کو پوچھ رہا تھا۔ مگر میں نے ڈانٹ دیا ہے۔" "شوبھا!"
۔ ورما صاحب چیختے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے
اور نندہ بستر پر گر کر سسکیاں بھرنے لگی۔

"شوبھا! یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔ کسی غریب کا دل دکھانا
اچھی بات نہیں شوبھا! غلام رسول غریب ضرور ہے۔ مگر
آج تک اس نے کون سا مطلب نکالا ہے تم سے؟ آخر تم
غریبوں سے اتنی نفرت کیوں کرتی ہو؟ غریب کیا انسان
نہیں ہوتے شوبھا! کیا غلام رسول ہماری طرح انسان نہیں
ہے؟"

"انسان بھلے ہی ہو مگر وہ ہمارے دھرم کا تو نہیں ہے۔"

"اُف وہ شوبھا! تم یہ ہر وقت دھرم کرم، ذات پات،
امیری غریبی کا راگ کیوں الاپتی رہتی ہو۔ تم یہ کیوں نہیں سمجھتیں
کہ دوسرے مذہب کے لوگ بھی اسی بھگوان کے بنائے ہوئے
ہیں جس نے ہمیں، تمھیں بنایا ہے۔ اُن کے سینے میں کیا دل
نہیں ہوتا؟ غریبوں اور کمزوروں پر دیا کرنا تو ہر مذہب
سکھاتا ہے۔ میں تو تم کو ایک نرم دل عورت سمجھتا تھا شوبھا!
مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم تعلیم یافتہ ہوتے ہوئے بھی اس
قدر دقیانوسی اور تنگ نظر ہو۔ تمھاری باتیں سن کر
آج مجھے خود سے شرم آرہی ہے۔"

"تو کیا میں بھی آپ کی طرح ناستک بن جاؤں؟ مجھ سے
یہ ہرگز نہیں ہوگا۔ آپ مجھے میرے دھرم سے نہیں پھیر سکتے۔
اور نہ میں اپنی بیٹی کو گمراہ ہونے دوں گی۔" "تو یاد رکھو شوبھا!
میں بھی اس کے دل میں ذات پات اور امیری غریبی کا بھید
بھاؤ ہرگز پیدا نہ ہونے دوں گا۔ مذہبی تعصب سے بالاتر
ہو کر انسانیت کی خدمت کی جا سکتی ہے۔ سب سے بڑا مذہب
انسانیت ہے۔ میری بیٹی صرف انسانیت ہی کی تعلیم پائے
گی اور اسی کی پیرو رہے گی۔ وہ تمھارے راستے پر ہرگز
نہیں چلے گی۔" "تو آپ اس کو مجھ سے بدظن کرنا چاہتے ہیں۔؟"
تم سے نہیں ــــ صرف تمہارے اصولوں اور وچاروں
سے۔ تمہارے تعصب اور تنگ نظری سے۔" "تو میری ضد بھی
سن لیجیے۔ آج کے بعد اگر نندہ اس مزدور غلام رسول کے
قریب بھی گئی۔ تو میں یہاں نہیں رہوں گی۔" وہ غصّے میں بڑبڑاتی
ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ اور ورما صاحب کھڑے پیچ و تاب
کھاتے رہے ــ!

وقت بدلتے دیر نہیں لگتی۔ اور اکثر وقت ہی انسان کا
مزاج اور اس کے سوچنے سمجھنے کا انداز یکسر بدل کر رکھ دیتا
ہے ــــ غلام رسول کے نام، اس کے مذہب اور غربت سے
نفرت کرنے والی شوبھا کو بھی اسی وقت نے جھنجھوڑ کر
رکھ دیا۔ آج صبح جب غلام رسول اپنے کام پر پہنچا، تو اسے
معلوم ہوا کہ نندہ زینے سے گر کر بری طرح زخمی ہوگئی ہے
اور ہسپتال میں داخل ہے۔ یہ سُن کر وہ تڑپ اٹھا۔ اس نے
مزدوری چھوڑ دی اور ہسپتال کی طرف بھاگا۔ وہاں پہنچ کر
اسے پتہ چلا کہ نندہ کی حالت بہت نازک ہے، اسے خون کی
فوری ضرورت ہے، مگر اب تک کسی کا خون اُس کے خون
سے نہیں مل پایا ہے یہ سنتے ہی وہ ڈاکٹر کے پاس پہنچا اور منت
کرنے لگا کہ وہ اس کا خون بھی ٹیسٹ کر کے دیکھ لیں۔

اب اسے حسنِ اتفاق کہیے یا شوبھا اور ورما صاحب کی قسمت کہ اس کا خون نندہ کے خون سے مل گیا۔ اور اپنے بوڑھے جسم کا حسبِ ضرورت خون نندہ کے جسم میں داخل کرا کر غلام رسول نے اسے نئی زندگی دے دی۔ مگر خون نکل جانے سے خود اس کی حالت غیر ہو گئی۔ وہ بوڑھا اور کمزور تھا ہی، اتنا خون نکل جانے کے بعد اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا — وہ ہسپتال کے ایک پلنگ پر نڈھال پڑا تھا۔

شوبھا اس کے قریب آئی اور پیروں سے لپٹ گئی —

"مجھے معاف کر دو غلام رسول! بھگوان کے لیے میری غلطیوں کو معاف کر دو۔ میں نے تمہیں سمجھنے میں بہت بھول کی۔ تم انسان نہیں، دیوتا ہو۔" وہ سسک سسک کر کہہ رہی تھی: غلام رسول! اگر اس وقت تم اپنا خون میری اکلوتی بیٹی کو نہ دیتے تو میری گود ہمیشہ کے لیے اُجڑ گئی ہوتی۔ تمہارے اس احسان کا بدلا ہم سات جنم میں بھی نہیں اُتار سکیں گے۔"

"ایسا مت کہو بیٹی!" غلام رسول کی نحیف آواز ابھری "نندہ تمہاری ہی نہیں میری بھی بیٹی ہے۔ وہ مجھے کتنی عزیز ہے یہ تم نہیں جانتیں بیٹی! آج اپنی ننھی بیٹی کو میں نے ایک حقیر تحفہ دینا چاہا ہے، مجھ غریب کے پاس اُسے دینے کے لیے اور رکھا ہی کیا!" "تمہارے پاس بہت بڑی دولت ہے رسول بابا! جس کا کوئی مول نہیں، جس کے پاس انسانیت اور رواداری ہو، خلوص و ہمدردی ہو، پیار اور ممتا سے بھرا دل ہو، اس کے پاس سب کچھ ہے۔ تم بہت عظیم ہو بابا! بہت بڑے ہو تم۔"

غلام رسول کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو موٹے موٹے قطرے ڈھلک کر اُس کی گردن میں جذب ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر زردی چھا گئی اور آنکھیں پتھرا گئیں۔ شوبھا نے گھبرا کر دیکھا۔ کئی بار پکارا۔ جب غلام رسول کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا تو اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اور وہ اس کے قدموں سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ دور کھڑے ورما صاحب جیسے سکتے میں رہ گئے۔

وہ رسول بابا کے پرنور چہرے کو غور سے دیکھتے رہے۔ پھر آہستہ آہستہ آگے بڑھے اور عقیدت سے اس کے پیروں پر جھک گئے۔ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو گئیں تبھی ان کی نگاہ قریب کھڑے معصوم شہباز پر پڑی، جو کچھ نہ سمجھتے ہوئے آنکھیں پھاڑے حیرت سے شوبھا کو روتے دیکھ رہا تھا —

ورما صاحب کا دل کانپ گیا۔ وہ شوبھا کے قریب آئے اور گلوگیر آواز میں بولے: "شوبھا! اب رونے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ وہ عظیم آدمی اب ہمیں واپس نہیں مل سکے گا۔ ہاں اگر تمہارے دل میں ذرا بھی خلوص و محبت ہمدردی و انسانیت کا جذبہ ہو تو اس معصوم کو اپنے سینے سے لگا کر اسے ماں کا پیار دو۔ جس کا آخری سہارا ہم نے چھین لیا ہے۔"

شوبھا نے شہباز کو دیکھا۔ اور لپک کر اسے اپنے سینے سے چمٹا لیا۔

"میرا بچہ — میرا لال! تو اکیلا نہیں ہے۔ آج سے تو ہمارا بیٹا ہے اور نندہ کا بھائی۔"

اور وہ دیوانہ وار اسے پیار کرنے لگی!!!

اُتّر پردیش شاہراہِ ترقی پر

وزیراعلا شری بنارسی داس نے اس خیال کا اظہار کیا کہ درجہ چھ سے آٹھویں تک طلبا کو اردو اور ہندی دونوں زبانیں پڑھائی جانا چاہیئے جیسا کہ پہلے ہوتا تھا۔ انھوں نے کہا کہ کابینہ اس سوال پر ہمدردی سے غور کرے گی اور وہ اس سلسلے میں راہ ہموار کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ وزیراعلاء ۱۱ مارچ کو اردو اکاڈمی کی جانب سے دیے گئے استقبالیہ کا جواب دے رہے تھے۔

وزیراعلا نے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ زبان ترسیل کا ایک ذریعہ اور افکار و خیالات کے اظہار کا ایک وسیلہ ہوتی ہے۔ اسی لیے زبان کو کسی مخصوص فرقہ یا طبقہ سے منسوب نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی اسے کسی طبقہ یا کسی مذہب کی میراث قرار دیا جا سکتا ہے۔

شری داس نے کہا کہ جہاں تک اردو کا تعلق ہے۔ یہ ہمارے آئین کی تسلیم شدہ زبانوں میں سے ایک ہے۔ اردو نے ہماری تہذیب تمدن کو ہی مالا مال نہیں کیا ہے بلکہ تحریک آزادی میں بھی اس نے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ اس کی جڑیں ہمارے ملک میں کافی گہری ہیں۔

وزیراعلا نے پرزور الفاظ میں کہا کہ اردو اور ہندی میں کسی طرح کے مقابلہ کا کوئی سوال ہی نہیں اٹھتا، ہندی ہماری قومی زبان ہے اور اردو کو بھی اپنا ایک مقام حاصل ہے۔ حکومت اردو کی ترقی کے لیے ہر ممکن مدد دے گی اور اردو اکاڈمی کی گرانٹ میں اضافہ کرنے پر ہمدردی سے غور کرے گی۔

شری داس نے مزید کہا کہ تمام سرکاری ریکارڈ دونوں زبانوں میں رکھنا عملی طور پر ممکن نہیں ہے۔ لیکن اردو والوں کی سہولت کے لیے گزٹ اور دیگر قسم کا مواد اردو میں شائع کیا جائے گا۔

وزیراعلا نے کہا کہ رسم الخط کے علاوہ اردو اور ہندی میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ دونوں زبانوں کی قواعد عملاً یکساں ہے۔

انھوں نے کہا کہ اردو کو فارسی آمیز بنانے کی کوششوں سے اردو کے کاز کو بہرحال نقصان پہنچے گا۔ اسی طرح ہندی کو سنسکرت آمیز بنا دینے سے ہندی کی مقبولیت میں کبھی اضافہ نہیں ہوگا۔

انھوں نے کہا کہ آئین کی تسلیم شدہ تمام زبانوں کی جن کا اپنا ایک مقام ہے پوری حوصلہ افزائی کی جانا اور انھیں فروغ دیا جانا چاہیے۔ وزیراعلا نے مزید کہا کہ کوئی بھی زبان عوام پر مسلط نہیں کی جا سکتی بلکہ عوام اسے خود اپناتے ہیں۔ زبان کو وسعت دینے کی کوششیں کی جانا چاہیئے تاکہ عوام اسے خود اپنا لیں۔

• • •

ریاستی حکومت نے ریاست میں تجارت و صنعت کی حوصلہ افزائی کرنے، بعض خامیاں دور کرنے اور مزید وسائل مہیا کرنے کی غرض سے یکم مارچ ۱۹۷۹ء سے حسب ذیل اشیاء کی بکری ٹیکس کی شرحوں پر ترمیم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

صارف یا صارف کو خریداری کے لیے سرمایہ فراہم کرنے والی کمپنی کو فروخت کے مرحلہ پر سبھی اقسام کی موٹر گاڑیوں، چیسیں اور ہر ڈیزائن اور شکل کی موٹر باڈیز (جس میں موٹر کاروں اور ٹینکر شامل ہیں) کے لیے خواہ وہ چیسیں پر بنائی گئی ہوں یا الگ سے نو فیصد کی شرح سے ٹیکس ادا کرنا ہوگا۔

سبھی قسم کی موٹر گاڑیوں کے ٹائر اور ٹیوب، پرزوں اور معاون ساز و سامان پر کارخانہ دار یا درآمد کنندہ کو فروخت کے مرحلہ پر نو فیصدی کی شرح سے ٹیکس ادا کرنا ہوگا۔

ٹیلی ویژن سیٹ، سوڈا واٹر، لیمینڈ اور دیگر غیر نشہ آور مشروبات پر کارخانہ دار یا درآمد کنندہ کو فروخت کے مرحلہ پر ۱۰ فیصد کی شرح سے ٹیکس ادا کرنا ہوگا۔

کافور، نیپھتا، برف، ۶۶ کیلوواٹ یا اس سے زیادہ

صلاحیت کے ٹرانسمشن ٹاور، خالص سوتی ہوزری کے علاوہ ہر قسم کی ہوزری، اونی سامان جس میں اونی قالینوں کو چھوڑ کر اونی کپڑے سے تیار کیے گئے سلے سلائے ملبوسات بھی شامل ہیں، کے لیے کارخانہ دار یا درآمد کنندہ کو فروخت مرحلہ پر سات فیصد کی شرح سے ٹیکس ادا کرنا ہوگا۔

کاربن بلیک کارک، کانچ کی بوتل اور چھوٹی شیشیوں پر چار فیصد کی شرح سے اور بنائی کے دستی گولے (خواہ وہ اونی اکریلک یا کسی اور قسم کے ہوں) کارخانہ دار یا درآمد کنندہ سے فروخت مرحلہ پر چھ فیصد کی شرح سے ٹیکس وصول کیا جائے گا۔

برقی توانائی کی تقسیم و ترسیل کے لیے مطلوبہ تار سے مختلف پیتل، تانبہ، جرمن سلور یا ان کی کسی مخلوط دھات سے تیار کیے ہوئے تار یا تار کی جالی پر صارف کو فروخت مرحلہ پر دو فیصد کی شرح سے ٹیکس ادا کرنا ہوگا۔ سور کے بال پر دو فیصد اور منقاآمل پر سات فیصد کی شرح سے خریداری کے پہلے مرحلہ پر ٹیکس واجب الادا ہوگا۔

• • •

وزیر بجلی شری ریوتی رمن سنگھ کے مطابق ۱۹۷۸-۷۹ء کے دوران تھرمل بجلی پیدا کرنے والے یونٹوں کے پلانٹ لوڈ کے معاملہ میں اتر پردیش کو ہندستان کا دوسرا مقام حاصل ہوا جس کی کارکردگی ۶۲٫۵۷ فی صد اور پیداواری صلاحیت ۱۲۵۷ میگاواٹ کے بقدر تھی۔

• • •

ریاستی حکومت نے ریاست کے مختلف اضلاع کو میڈیکل گرانٹ الاٹ کرنے کے لیے اتر پردیش ریاستی لاٹری کی آمدنی میں سے ۶،۳۲۵،۰۰۰ روپیہ کی رقم منتقل کی ہے۔ میڈیکل گرانٹ کی رقم بیمار اور ضرورت مندوں بالخصوص غریب اور کمزور طبقوں سے تعلق رکھنے والوں کو علاج و معالجہ کی سہولتیں فراہم کرنے پر خرچ کی جائے گی۔

• • •

اتر پردیش کے وزیر صحت و آبکاری شری رما شنکر کوشک نے ۲۸ مارچ کو ودھان پریشد میں اعلان کیا کہ ریاست میں ۱۹۷۹-۸۰ء کے دوران ۸۰ نئے ایلوپیتھک، آیورویدک، یونانی اور ہومیوپیتھک اسپتال کھولے جائیں گے۔

وزیر موصوف نے کہا کہ آئندہ دو ماہ کے اندر ریاست کے متعدد اسپتالوں، ڈسپنسریوں میں ڈاکٹروں کی ۱۶۰۰ اسامیاں پُر کر دی جائیں گی۔

• • •

اتر پردیش کے وزیر بجلی شری ریوتی رمن سنگھ نے ۲۹ مارچ کو انکشاف کیا کہ اتر پردیش ریاستی بجلی بورڈ نے پاریچھا (ضلع جھانسی) میں ۲۲۰ میگاواٹ، آنپارہ (ضلع مرزاپور) میں ۶۲۰ میگاواٹ اور ٹانڈہ (ضلع فیض آباد) میں ۴۴۰ میگاواٹ صلاحیت کے تھرمل بجلی گھروں کی تعمیر شروع کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ بورڈ نے آنپارہ توسیعی پراجکٹ کے تحت ۵۰۰ میگاواٹ صلاحیت کے یونٹ لگانے کے لیے بھی کارروائی کی ہے۔

• • •

ریاستی محکمۂ تعمیرات عامہ نے گزشتہ دسمبر تک ۲۱٫۷۰ لاکھ روپے کی لاگت سے ۶۰ کلومیٹر لمبی رابطہ سڑکوں پر تارکول بچھانے کا کام مکمل کر لیا تھا۔ اس مقصد کے لیے مالیاتی سال رواں کے دوران ۲۵ لاکھ روپیہ کی رقم مخصوص کی گئی تھی۔

• • •

ریاستی محکمۂ تعمیرات عامہ نے حال ہی میں الموڑہ، چمولی، دہرہ دون اور ٹہری کے پہاڑی اضلاع میں ۲۰٫۳۶۵ لاکھ روپیہ کی مجموعی لاگت سے پانچ پلوں کی تعمیر اور ضلع نینی تال میں ۳۹٫۱ لاکھ روپیہ کی لاگت سے ایک پل کی نو تعمیر کا کام شروع کیا ہے۔

• • •

ہنڈن۔ کرشنی دوآبہ پر ۷۵٫۶۵ کروڑ روپیہ کی لاگت سے کام شروع ہو گیا ہے جس کی تکمیل سے میرٹھ اور مظفر نگر اضلاع کے ۹۳۹۹ ہیکٹر رقبہ میں آبپاشی کی سہولت دستیاب ہو جائے گی۔

نقد و تبصرہ

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں)

نام کتاب: سب سے چھوٹا غم ۔ مصنف عابد سہیل
صفحات: ۲۰۶ قیمت: آٹھ روپئے پتہ: کپور مارکیٹ وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ

عابد سہیل عرصے سے افسانے لکھ رہے ہیں لیکن کتابی صورت میں انھوں نے اپنے افسانوں میں سے سولہ منتخب کرکے شائع کیے ہیں۔ عابد سہیل ادبی نظریات کے لحاظ سے ترقی پسند ہیں۔ پیشے کے لحاظ سے صحافی ہیں اور اعلیٰ تعلیم انھوں نے فلسفے کی حاصل کی ہے۔ ترقی پسندی، صحافت اور فلسفہ، یہ تینوں عناصر ایسے ہیں کہ ان میں سے کسی ایک کا غلبہ افسانے کو مجروح کرسکتا ہے۔ اس طرح عابد سہیل کے افسانے ریاضی کے، کہ افسانہ نگار کی حیثیت سے خود عابد سہیل تین محاذوں پہ گھرے ہوئے ہیں، لیکن یقیناً یہ عابد سہیل کا کمال ہے کہ ان کے افسانوں پر ان تینوں عناصر میں سے کوئی بھی عنصر حاوی نہیں ہونے پاتا بلکہ یہ عناصر ایک دوسرے کی روک تھام کرتے رہتے ہیں۔ غالباً یہی سبب ہے کہ ان افسانوں میں ایک ایسے شدید اعتدال کا احساس ہوتا ہے جو بجائے خود حدِ اعتدال سے متجاوز معلوم ہوتا ہے۔ سرسری مطالعے میں یہ افسانے اپنے سفاتِ ثبوتیہ سے زیادہ صفاتِ سلبیہ کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ یعنی بادی النظر میں عابد سہیل کے افسانوں میں بعض اوصاف ہونے کی طرف ذہن اتنا نہیں جاتا جتنا متعدد خامیوں کے نہ ہونے کی طرف۔ افسانہ نگار کے حق میں یہ بات کچھ بہت مفید نہیں ہے کیونکہ اس صورت میں اس کے افسانے فوری طور پر خود کو نمایاں کرنے اور منوانے میں کامیاب نہیں ہوپاتے۔ عابد سہیل نے بھی اس صورت حال سے نقصان اٹھایا ہے اور اسی لیے ابھی تک وہ پوری طرح ہمارے افسانے کے پیش منظر تک نہیں آسکے تھے۔ لیکن "سب سے چھوٹا غم" کی اشاعت نے اس نقصان کی ایک حد تک تلافی کردی ہے۔ اس مجموعے میں عابد سہیل کا ایک کے بعد دوسرا افسانہ ہمارے سامنے آتا ہے اور آہستہ آہستہ ہمیں افسانہ نگار کی انفرادیت محسوس کراتا ہے۔

موضوعات کے لحاظ سے تقریباً یہ سب افسانے عام انسانوں کی زندگی کے عام مشاہدات پر مبنی ہیں اور عابد سہیل ایک عام انسان ہی کی طرح ان مشاہدات کو بیان بھی کرتے ہیں، لیکن وہ ان مشاہدات کے سامنے ایک ہلکا سا سوالیہ نشان بنا کر نتائج کے اخذ و استنباط کا بیشتر کام قاری کے ذہن کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔ مثلاً "روح سے لپٹی ہوئی آگ" فرقہ وارانہ فسادات کے پامال موضوع پر افسانہ ہے، لیکن اس میں نہ اتحاد کی تلقین ہے نہ انسان کی درندگی اور اس کے بالمقابل انسان کی بے رشتہ نصیحت کا تذکرہ ہے، بلکہ ہمیں صرف اس حال کی طرف متوجہ کیا گیا ہے کہ فسادات کا ماحول بچوں کے معصوم ذہن کو کس طرح مسموم کرتا ہے اور بچپن میں شعور کا جزو بن جانے والی فرقہ وارانہ منافرت آئندہ کتنی بھیانک ثابت ہوسکتی ہے۔

"منیر کی اماں" اس مجموعے کا ایک اور قابلِ ذکر افسانہ ہے۔ یہ ایک غریب اور شکستہ بڑھیا کی کہانی ہے لیکن کہانی کا انداز اس موضوع کے افسانوں کی عام روش سے مختلف ہے۔ عابد سہیل منیر کی ماں کو غیر معمولی صفات سے متصف دکھا کر اسے اس کے طبقے میں کوئی استثنائی حیثیت نہیں دیتے بلکہ اسے کے عام صفات کو جالب توجہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ اسی لیے اس افسانے کا دائرہ وسیع تر ہوگیا ہے اور اسے پڑھ کر خصوصی طور پر منیر کی ماں سے نہیں بلکہ اس پورے طبقے سے دل بستگی پیدا ہو جاتی ہے جس کی نمائندگی یہ معمولی سی غریب عورت کررہی ہے۔

لہجے کی شائستگی عابد سہیل کے افسانوں کی بہت اہم خصوصیت ہے۔ وہ کوئی بھی بات نہ تو بے دلی سے کہتے ہیں نہ شدومد سے۔ وہ اپنے جذبات کو چھپاتے نہیں لیکن شدید جذباتی ... ہمیشہ بھی ان کو اجتناب ہے۔ بظاہر انھیں اس کا احساس بھی نہیں معلوم ہوتا کہ وہ کوئی اہم بات کہہ رہے ہیں۔ لیکن قاری کو ان کی بات اہم تر معلوم ہوتی ہے۔ تحریر میں یہ کیفیت آسانی سے نہیں لائی جاسکتی، لیکن اگر آپ افسانہ نگار کو اس کے ریاضی کی داد نہ دینا چاہتے ہوں تو اسے اس کا فطری انداز یا اسلوب کہہ لیجیے۔

——— نیر مسعود

نام کتاب: شراب اور اس کا اسلامی موقف

مولف: بشیر الحق قریشی ادھونی

پتہ: گوہر بکڈپو ۔ تربلیکین ہائی روڈ ۔ مدراس

قیمت: ۳/۵۰ صفحات: ۸۸

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے فاضل مولف نے اسلامی موقف کے اعتبار سے شراب کے بارے میں تفصیلات بیان کی ہیں اور صحت پر اس کے برے اثرات کا ذکر بھی کیا ہے۔ اس اعتبار سے یہ کتاب ایک خصوصی افادیت کی حامل ہے۔ موجودہ حکومت کے نشہ بندی کے اقدام کے پس منظر میں اس کتاب کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ چنانچہ امید ہے کہ اس کتاب کی خاطر خواہ قدر ہوگی۔

ذکی کاکوروی

56 No 2
MAY 1973.
PAISE

Urdu Monthly
NAYA DAUR
POST BOX No. 146 LUCKNOW-226001

Regd No LW NP 17
Annual Subs
Rs 5

وزیر اعظم شری مرارجی ڈیسائی نے بنگلہ دیش کے دورے کے موقع پر گزشتہ ۱۶ اپریل کو ڈھاکہ (ساور) میں شہیدوں کی قومی یادگار پر پھول مالا چڑھائی۔ یہ تصویر اسی موقع کی ہے۔

جلد ۳۶ نمبر ۳
جون ۱۹۷۹ء

ایڈیٹر: خورشید احمد
جوائنٹ ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

ناشر: ہمیندر کمار
ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اتر پردیش

پرنٹر: اشوک در
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری۔ یو۔پی
مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ

شائع کردہ محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ۔ اتر پردیش

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے
زر سالانہ: پانچ روپے

سول ایجنٹ: سپرنٹنڈنٹ پرکاشن بیورو آف انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو۔پی۔ لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶۔ لکھنؤ

عنوانات

اپنی بات

گزشتہ ماہ اتر پردیش کے وزیر مالیات شری دھوکر دیگھے نے ودھان سبھا میں ۸۰-۱۹۷۹ء کا جو بجٹ پیش کیا وہ جمہوری لامرکزیت میں ریاستی حکومت کے یقین محکم کا مظہر ہے اور مختلف سطحوں مثلاً گاؤں، ترقیاتی بلاک، ضلع اور ڈویژن کی سطح پر منصوبہ بندی اور ترقیاتی سرگرمیوں سے عوام اور عوامی نمایندوں کا گہرا رابطہ قائم کرنے کے تصور کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس بات کی دلالت کرتا ہے کہ ریاست اور ملک کی فلاح دیہاتوں کی ترقی ہی میں مضمر ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ بجٹ سماجی انصاف کو یقینی بنانے کے لیے ہریجنوں اور کمزور طبقوں کی معاشی اور سماجی حالت کو بہتر بنانے، ہر شہری میں تحفظ اور ہم آہنگی نیز یک جہتی کے جذبے کو پروان چڑھانے، روزگار کے زیادہ مواقع فراہم کرکے غریبی دور کرنے اور کھیتوں نیز کارخانوں کی پیداواری صلاحیت کے بہترین استعمال کو یقینی بنانے کے عزم کا آئینہ دار ہے۔

اس بجٹ کی قابل ذکر خصوصیات یہ ہیں کہ اس کے ذریعہ مختلف سطحوں پر رائے عامہ اور انسانی طاقت کے استعمال کے ذریعہ اپنی عقلی صلاحیت کو یقینی طور پر بروئے کار لانے کی غرض سے پنچایتوں، چھیتر سمیتیوں اور ضلع پریشدوں کو ہر طرح مستحکم اور سرگرم عمل بنایا جائے گا۔ ڈویژن کی سطح پر ایک موثر تنظیم کی تشکیل کی جائے گی تاکہ ڈویژن کی سطح کے نظم و نسق کو مربوط کیا جاسکے۔ سالانہ منصوبہ برائے سال ۸۰-۱۹۷۹ء ۸۱ کروڑ روپے کا رکھا گیا ہے جس میں سے ۷۰ کروڑ روپے کی رقم پہاڑی علاقوں کی ترقی کے لیے مختص کی گئی ہے۔ ۸۰-۱۹۷۹ء کے منصوبہ جاتی اخراجات میں سے غیر منصوبہ جاتی مدوں میں دکھائی گئی تقریباً ۴۸ کروڑ روپیے کی رقم کو ملاکر سالانہ منصوبہ مجموعی طور پر ۸۹۲ کروڑ روپے کا ہوگا۔

اردو کی ترقی کے لیے ہر طرح کی حوصلہ افزائی کی جائے گی اور دیگر اقلیتی زبانوں کی پوری سرپرستی کی جائے گی۔ درجہ اول سے آٹھویں درجہ تک کی قومیائی ہوئی اردو کتابوں کی قیمتوں کو اس سطح کی ہندی کتابوں کی قیمتوں کے مساوی رکھنے کے لیے سرکاری امداد دی جائے گی۔ اردو میں جونیر ہائی اسکول کی سطح کے امتحان میں کامیاب ہونے والے افسروں اور ملازمین کو بھی اب انعامات دینے کا معاملہ زیر غور ہے۔ اس کے علاوہ بجٹ میں کفایت شعاری پر بھی زور دیا گیا ہے۔ پٹرول کی کمی اور اس کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کے پیش نظر گزشتہ سال کے مقابلے میں اس سال پٹرول کی کھپت میں ۱۰ فیصد کٹوتی کی جائے گی۔

● کسی بھی قوم یا ملک کو ترقی اور خوشحالی کے راستے پر گامزن کرنے کے لیے یہ امر بنیادی اور لازمی حیثیت رکھتا ہے کہ اس کے کمزور، پسماندہ اور غریب ترین طبقوں کو آگے بڑھنے اور اپنی سماجی و معاشی حالت کو بہتر بنانے کے لیے مساوی مواقع عملی طور پر حاصل ہوں اور یہ طبقے ان سے پوری طرح مستفید ہوں۔ نئی تعلیم و تربیت کی تمام تر سہولتیں بھی انھیں دستیاب ہوں تاکہ وہ اس سے فیض یاب ہونے کے بعد ایک نئے معاشرے کی تعمیر میں بھرپور حصہ لے سکیں جو ہر قسم کی تفریق اور تنگ نظری، منافرت، تعصب اور فرسودہ نیز ضرر رساں رسم و رواج کی لعنتوں سے بالکل پاک و صاف ہوگا۔

جہاں تک موجودہ حکومت کا تعلق ہے اس سلسلے میں اس کی پالیسیاں اور پروگرام بالکل واضح ہیں۔ موجودہ حکومت نے اقتدار کی ذمہ داری سنبھالتے ہی کمزور، پسماندہ اور غریب ترین طبقوں کی سماجی اور معاشی ترقی پر اپنی توجہ مرکوز کی نیز انھیں تحفظ دینے اور ان کی معاشی اور تعلیمی حالت میں خاطر خواہ سدھار لانے کو اپنا اولین فرض قرار دیا جس کے تحت حکومت نے متعدد ٹھوس اقدامات کیے اور کئی اہم پروگرام اور اسکیمیں شروع کیں، جن کے فائدے کمزور اور غریب ترین طبقوں کو نمایاں طور پر حاصل ہو رہے ہیں۔ کمزور، پسماندہ اور غریب ترین طبقوں کی تعلیمی، سماجی اور معاشی ترقی کے پروگراموں کی عمل آوری کے لیے موجودہ بجٹ میں زبردست اضافہ کیا گیا ہے۔ مختلف محکموں کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اپنے بجٹ کی ۲۰ فیصد رقم ان طبقوں کی فلاح و بہبود کے لیے مختص کر دیں۔ اقوام و قبائل مندرجہ فہرست کے لوگوں کو دی جانے والی تعلیمی سہولتوں کی ہی طرح ۵۸ پسماندہ طبقوں کو بھی (ان میں ۱۲ مسلم پسماندہ طبقے بھی شامل ہیں) تعلیمی سہولتیں فراہم کی گئی ہیں۔ اسی طرح سرکاری ملازمتوں میں پسماندہ طبقوں کو بھی ریزرویشن دیا گیا ہے۔ جن ۵۸ طبقوں کو یہ ریزرویشن دیا گیا ہے ان میں ۱۲ مسلم پسماندہ طبقے بھی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اقلیتی کمیشن کی تشکیل کی گئی ہے جس کا مقصد اقلیتی فرقوں سے متعلق پالیسیوں اور وسیع پروگراموں کو عملی شکل دلوانا اور اقلیتوں کے مفادات کا تحفظ کرنا ہے۔

اسی کے ساتھ ساتھ ہریجنوں اور کمزور طبقوں کے لیے وضع کی گئی تعمیر مکانات کی اسکیم کو بھی ایک نئی شکل دی گئی ہے جب سے اس اسکیم کی توسیع بھی ہوئی ہے اور تعمیر شدہ مکانوں کے الاٹمنٹ سے کمزور، پسماندہ اور غریب طبقوں کو رہائش کی جو سہولت ملی ہے اس سے ایک نئے دور کا آغاز ہوا ہے۔

مذکورہ بالا اقدامات گزشتہ چند ماہ کے اندر ہی کیے گئے ہیں۔ موجودہ حکومت اس کا عزم کر چکی ہے کہ وہ ہریجنوں، اقلیتوں، کمزور، پسماندہ اور غریب طبقوں کے ساتھ کسی طرح کی کوئی ناانصافی نہیں ہونے دے گی۔ اور سماج کے ان لوگوں کی جو غریبی کی سطح سے بھی نیچے زندگی گزار رہے ہیں، حالت میں بتدریج سدھار لاکر اور انھیں ان کی سطح سے اوپر اٹھا کر ان میں اعتماد و یقین کی ایک ایسی روشنی پھیلائے گی جس کے نتیجے میں وہ نئے سماج میں اپنا جائز مقام خود حاصل کرلیں گے۔

——— ایڈیٹر

شمسی مینائی
بیگم گنج۔ بارہ بنکی

شاعر کا پیام دریا کے نام

چوم لے آ پاؤں میرے کیونکہ میں انسان ہوں
طالب دنیا نہیں ہوں طالب ایمان ہوں

میری رفعت سے ستارے کانپتے ہیں چرخ پر
شام سے لے کر سحر تک ہانپتے ہیں چرخ پر

ہے وہی انجام تیرا جو ترا آغاز ہے
میں تو پہنچوں گا فلک پر یہ مری پرواز ہے

کیا کہا روحانیت کا کوئی متوالا ہے تو
خاک کھانے خاک پر بس لوٹنے والا ہے تو

میں نے مانا تو یہاں ہے کامیابِ زندگی
مجھ کو دھوکا دے رہا ہے ہاں سرابِ زندگی

تو سمجھتا ہے پہیتا مادرِ گیتی کا ہے
تو فقط پتلا سا ٹکڑا چادرِ گیتی کا ہے

پھر بھی ہائے بے خبر محدود ہے تیرا سفر
اور جاری ہے یہاں کے بعد بھی میرا سفر

کوہ سے پہلے نہیں اور نہ ساحل کے بعد
سر پھرے عظمت تری کچھ بھی نہیں باطل کے بعد

شوق کی گرمی سے میری زندگی سیراب ہے
لمحہ لمحہ ارتقا کے واسطے بے تاب ہے

میں نہیں کہتا کہ تو میرے لیے بیکار ہے
تیرے دم سے کچھ زمیں زرخیز ہے گلزار ہے

تیرے بڑھنے کے لیے تو دیکھ میداں صاف ہے
اور میرے ہر قدم پر ایک کوہِ قاف ہے

تو مگر پیدا ہوا ہے میری خدمت کے لیے
میں یہاں آیا ہوں ہر شے پر حکومت کے لیے

تو بلندی سے اُتر کر رہتا آغوشِ زمیں
اور میں پستی میں رہ کر قاصدِ چرخِ بریں

ہاں خدا کے بعد یاں پر حکمرانی ہے مری
یاد ہے گر کچھ فرشتوں کو کہانی ہے مری

تو تو کھو جاتا ہے جا کر بحر کے ظلمات میں
تیرا سب کچھ، کچھ نہیں رہتا اندھیری رات میں

آسماں میرے لیے ہے میری خاطر ہے زمیں
کوئی رونق ہی نہیں ہے جس جگہ پر میں نہیں

چوم آ قدموں کو آ کر چاٹ ان کی خاک کو
خاک خود چمکا رہے گی پیشانیِ افلاک کو

عبدالرشید ایم۔اے
۶۰/۸۸ پریم نگر۔کانپور

دیوانِ غالب کا اوّلین شارح

دیوانِ غالب شاعر کے نوادرِ افکار کی ایسی تماشا گاہ ہے جس نے ہر دور کے اہلِ ذوق کو فکر و نظر کی دعوت دی ہے۔ غالبؔ کی سیرت و شاعری پر تبصرہ کا آغاز مولانا حالیؔ مرحوم کے قلم سے ہوا۔ ان کی یادگار تصنیف یادگارِ غالب کی اشاعت کے بعد ملک کے بعض اہلِ قلم نے دیوانِ غالب کو اپنی سخن شناسی و شعر فہمی کا معیار قرار دے کر اس کی شرحیں لکھیں اور اس موضوع پر اردو ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔

دیوانِ غالب کے متعدد شارحین میں سرِ فہرست "مجدّدِ السنۂ مشرقیہ مولوی حافظ احمد حسن شوکتؔ میرٹھی" کا نام ہے۔ ان کی شرح موسومہ بہ حلِ کلیاتِ اردو میرزا غالب دہلوی، سب سے پہلی شرح ہے جو ۱۸۹۷ء میں شوکت المطابع میرٹھ میں طبع ہوئی۔ شارح کے ایک مخلص دوست چودھری گھنشیام سنگھ متخلص بہ خارؔ نے شرح کی طباعت کی تاریخ "حل دقائق الغالب" سے نکالی ہے۔ یا مادہ تاریخ انھوں نے اپنے ایک فارسی قطعہ میں نظم کیا ہے جو شرح کے خاتمہ پر مندرج ہے۔ اس سے ۱۳۱۷ھ مطابق ۱۸۹۷ عیسوی تاریخ طباعت نکلتی ہے۔ قطعہ حسب ذیل ہے

بسکہ دیوانِ میرزا غالبؔ — بود بر فہمِ اہلِ فن غالبؔ
کس نہ آگاہ بود ازیں معنی — گرچہ روح است اندریں قالبؔ
شعرِ غالبؔ برنگِ ناخنِ شعر — بود اربابِ فکر را غالبؔ
(۱؎ سر پھاڑنے والا)

شوکتِ علم و فن محب دِ ما — دہ چہ حل کرد بہرِ ہر طالب
از پئے فہمِ ناتوان ایں حل — ہمچو سجادہ گاہ را ہالب
سالِ تاریخ خارؔ نکتہ شناس — گفت ہاتف "دقائق الغالب"

(۱۳۱۷ھ مطابق ۱۸۹۷ء)

مولوی احمد حسن متخلص بہ شوکتؔ انیسویں صدی کے وسط میں میرٹھ کے اہلِ علم میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ مولانا حالیؔ کا آخری زمانہ انھوں نے دیکھا تھا۔ فارسی و عربی زبان و ادب سے ان کو خاص شغف تھا۔ ایک رسالہ پروانہ بہ ماہ میرٹھ سے نکالتے تھے جس میں پولٹیکل اور سوشل مضامین کے علاوہ شعرائے فارسی و عربی کے مشکل کلام کی شرحیں شائع کرتے تھے۔ اور حکیم مومن خاں مومنؔ دہلوی کے نازک اور پیچیدہ اشعار کی توضیح اکثر ان کے قلم سے نکلتی تھی۔ اس کے علاوہ ایک ہفتہ وار رسالہ شحنۂ ہند ان کی ادارت میں میرٹھ سے نکلتا تھا ادبی تنقیدات کے علاوہ، سیاسی، سماجی، اور مذہبی موضوعات پر مضامین شائع کرتے تھے۔

مولوی احمد حسن شوکتؔ میرٹھی کو اپنی زبان دانی اور سخن فہمی پر اس قدر اعتماد تھا جتنا کہ غالبؔ کو اپنی سخنوری پر۔ شاعری میں بھی ان کو دستگاہ حاصل تھی۔ وہ اردو، فارسی و عربی میں شعر کہتے تھے اور اصلاحِ شعر کا ذوق بھی رکھتے تھے۔ اپنی شرح دیوانِ غالبؔ کے شروع میں انھوں نے ایک اعلان شائع کرایا تھا جس کا کچھ اقتباس درج ذیل

"جن حضرات کو اردو، فارسی و عربی کی شاعری کی تکمیل
کا شوق ہو اور اصناف سخن پر قادر ہونا چاہتے ہوں وہ
حضرت مجدد السنۂ مشرقیہ مولانا شوکت کی جانب رجوع
لائیں جس پائے کے شاعر بننا چاہیں گے کامیاب ہوں
گے۔ اور جس درجہ کا کلام ہوگا اسی درجہ کی اصلاح ہوگی،
انشاء اللہ تعالیٰ جو لوگ تشنگیٔ طلب ہیں وہ آئیں
اور چشمۂ تجدید سے سیراب ہوں۔"

اپنی شرح دیوان غالب کا دیباچہ شوکت صاحب
نے فارسی زبان میں غالب کی طرز انشا میں لکھا ہے۔ ناظرین
کی ضیافت طبع کے لیے اس کا بھی اقتباس مع اردو
ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔

"اردو دانان چہ دانند کہ در پردۂ ایں طلسم چیست
و آسان فہمان چہ سنجند کہ نوائے ایں ساز مخالف طبع بر
آہنگ کیست سخن غالب را از نارسائی ناخن دریافت گرہ
بار خاری انگارند۔ اگر کشودنش نتوانم شرمم باد و دعوے
نگاہ داشت ناموس تجدید آزرم؟
نمی گویم کہ کارے کردہ ام کہ کردنش نتوان و ہنجارے
سپردہ ام کہ سپردنش نتوان اما میگویم از روزیکہ غالب
جان بجاندار سپرد تا دور پسیں ماکسے پا در شعلہ زار حل
تو انست نہاد۔

عرضہ دہ حلال مشکلات غالب
ابو ادریس احمد حسن شوکت مدیر پروانہ و شحنۂ ہند میرٹھ۔

ترجمہ

"صرف اردو زبان جاننے والے کیا سمجھ سکتے ہیں کہ
اس طلسم معانی (دیوان غالب) کے پردے میں کیسے
مضامین پوشیدہ ہیں اور آسان کلام کے سمجھنے والے
کیا اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس خلاف مزاج ساز کی دھن
یعنی غالب کے نغمہ شاعری کی راگ کس طرز کی ہے۔ یہ لوگ
اپنے ناخن تحقیق کی نارسائی کے باعث کلام غالب کی

گرہ کشائی کو ایک خار دار گرہ کی طرح ایک عقدۂ لاینحل سمجھتے
ہیں۔ اگر تجدید کے دعوے کے باوجود میں بھی اس کی گرہ کشائی
سے قاصر رہوں تو یہ بات میرے لیے باعث شرم ہوگی اور
تجدید کا دعویٰ میرے لیے موجب ننگ و عار ہوگا۔
میں یہ دعویٰ تو نہیں کرتا کہ جو کام میں نے کیا ہے وہ
دوسروں سے ممکن نہیں ہے اور جو راستہ میں نے اختیار کیا
ہے اس پر چلنا محال ہے۔ البتہ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ غالب
کی وفات کے بعد سے اب تک کسی شخص نے دیوان غالب
کی شرح نگاری کے شعلہ زار میں قدم رکھنے کی جرات نہیں کی۔

غالب کے پیچیدہ اشعار کا حل کرنے والا ابو ادریس
احمد حسن شوکت مدیر پروانہ و شحنۂ ہند میرٹھ۔

اردو غزل میں غالب کی مشکل پسندی اور طرز بیدل
میں ریختہ گوئی مذاق عام پر گراں ثابت ہوئی۔ دلی کے
بعض ظریف و خوش فکر شاعر غالب کے اس ناپسندیدہ
انداز شعر گوئی پر ظریفانہ حملے کیا کرتے تھے۔ مولوی محمد حسین
آزاد نے آب حیات میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک مشاعرہ
میں حکیم آغا جان عیش نے ایک طرحی غزل میں مرزا کو مخاطب
کر کے یہ قطعہ پڑھا۔

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مزہ کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے
کلام میر سمجھے اور زبان میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

مرزا غالب اس قسم کی ظریفانہ نکتہ چینیوں کی پروا نہ
کرتے تھے اور معترضین کے اعتراضوں کو ان کی کم فہمی پر محمول
کرتے تھے۔ چنانچہ ایک شعر میں کہتے ہیں۔

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

دوسری جگہ اپنے کلام کو فہم عام سے بالاتر ہونے کا اعلان
اس طرح کرتے ہیں۔

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

ایک جگہ اپنے حریفوں اور نکتہ چینیوں کو ان الفاظ میں چیلنج کرتے ہیں ؂

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالم تحریر کا

اس چیلنج کا سب سے پہلے جس شخص نے جواب دیا وہ یہی مولوی حافظ احمد حسن شوکت میرٹھی تھے۔ جنھوں نے دیوان غالب کی پہلی مستقل شرح لکھی۔

مولانا حالی نے غالب کی اردو شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے یادگار غالب میں لکھا ہے کہ مرزا کے بعض اشعار پہلو دار ہوتے ہیں۔ یعنی سرسری نظر میں ان کے ایک معنی مفہوم ہوتے ہیں مگر غور کرنے پر ایک دوسرے لطیف معنی سمجھ میں آتے ہیں۔ اس کی کچھ مثالیں بھی غالب کے اشعار سے پیش کی ہیں۔ حالی کے اس قول کے مطابق بعض شارحین غالب نے جن کے قائد یہی ہمارے "مجدد السنہ مشرقیہ" جناب شوکت میرٹھی ہیں غالب کے اکثر اشعار کی ایک سے زیادہ شرحیں لکھی ہیں۔ انھیں دیکھ کر بجز اس کے کہ ؏

ناطقہ سر بہ گریباں کہ اسے کیا کہئے۔

کچھ کہا نہیں جاتا۔ مجھے مولانا حالی کی اس رائے سے اتفاق نہیں ہے کہ غالب کے اشعار پہلو دار ہوتے تھے۔ ہر شاعر ایک شعر میں صرف ایک ہی مضمون یا خیال ادا کرنا چاہتا ہے۔ جس کے بیان کرنے کے لیے وہ ایسے الفاظ کا انتخاب کرتا ہے جو اظہار مافی الضمیر پر دلالت کرتے ہوں۔ کوئی سلیم العقل انسان بیک وقت ایک ہی لفظ کے ذریعہ دو مختلف النوع خیالات بیان کرنے کا قصد ہرگز نہیں کرے گا ورنہ اس کے سارے ایسے بیانات چیستاں بن جائیں گے۔

دیوان غالب کے شارحین کے درمیان ایسے اختلافات پائے جاتے ہیں کہ کوئی شرح بہ ہمہ وجوہ مکمل نہیں کہی جا سکتی اور لطف یہ ہے کہ ہر شارح بزعم خود یہ سمجھتا ہے کہ غالب رموز شعری کی صحیح تشریح و تاویل صرف اسی کے حصہ آئی ہے۔

شوکت میرٹھی اپنی سخن دانی و شعر فہمی کے مقابل کسی دوسرے کی رائے کو وقعت نہ دیتے تھے۔ مولانا حالی کو وہ خاطر میں نہ لاتے تھے۔ غالب کے شعر ؂

شب خمار شوق ساقی رستخیز اندازہ تھا
تا محیط بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا

کی شرح کے ذیل میں شوکت صاحب رقمطراز ہیں :-

"مولوی الطاف حسین صاحب حالی نے جو اپنے کو غالب کا شاگرد رشید بتلاتے ہیں اس غزل کو اپنی کتاب یادگار غالب میں بالکل بے معنی لکھ دیا ہے۔ ان کو ذرا شرم نہ آئی کہ اپنے استاد کو مہمل اور بے معنی گو قرار دیدیا۔ بات یہ ہے کہ ہمارے شعراء میں نازک کلام کے سمجھنے کی نہ لیاقت نہ دماغ"

اس ریمارک کے بعد شعر کی شرح لکھتے ہیں :-

"شب کو جو رندوں کے سروں میں ساقی کے آنے کا خمار شوق بھرا ہوا تھا تو اس میں اندازۂ رستخیز یعنی قیامت کا جیسا شور و غل اور چیخ پکار مچ رہی تھی کہ ساقی آئے اور شراب پلا دے۔ ایسی حالت میں شراب خواہ جام میں تھی یا صراحی یا مینا میں یا خم میں یا حوض تر سا میں اس کا محیط یعنی اوپر کے خط میں (جہاں تک شراب بھری رہتی ہے) خمیازہ کا عالم تھا۔ کیونکہ خط میں باعتبار تمدد کے خمیازہ کی شکل ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شراب خانہ کی یہ حالت تھی یہاں تک کہ خود شراب بھی خمیازہ کش تھی کہ جب تک ساقی نہ آئے اس میں بھی کیف پیدا نہیں ہو سکتا ہے۔ خمیازہ نہیں کہا بلکہ صورت خانۂ خمیازہ کہا ہے یعنی رندوں کے شوق میں تمام شراب خانہ خمیازۂ طلب کا ایک صورت خانہ بنا ہوا تھا۔ بہت بلیغ اور افکتہ دل شعر ہے۔ ہندی

میں سینکڑوں نامی گرامی مشہور اساتذہ اپنے کو غالب کا
شاگرد رشید قرار دیتے ہیں مگر کسی کو غالب کی ہوا بھی نہیں
لگی. غالب کے مانند کلام تو کیا موزوں کریں گے اس کا
کلام بھی سمجھ نہیں سکتے۔"
ایک شعر کی شرح میں شوکت صاحب نے غالب ہی کی
ن ایک واقعہ لکھا ہے جو ناظرین کے لئے لطف و دلچسپی سے
ا نہ ہوگا. شعر میں جو تلمیح ہے وہ یا تو شاعر کا ذاتی تجربہ ہے یا
ح کا اختراع. مگر اس واقعہ کا حوالہ کسی اور شارح نے
ا دیا ہے. شعر حسب ذیل ہے. ؎

میں مضطرب ہوں وصل میں خوف رقیب سے
ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں

شاعر نے وصل میں اپنے اضطراب کی وجہ خوف رقیب بتائی
ر محبوب کے وہم کی کوئی توجیہ نہیں کی ہے. اب یہ شارح
م ہے کہ اس کی وضاحت کرے۔ پروفیسر نظم طباطبائی
کی تشریح میں لکھتے ہیں:۔
"وصل میں مجھے تو یہ دھڑکا ہے کہ کہیں رقیب نہ آجائے
اور میری گھبراہٹ کو دیکھ کر تم کو وہم یہ ہوا ہے کہ یہ اپنے کسی
معشوق سے چھپ کر میرے پاس آیا ہے. اس سبب سے
گھبرایا ہوا ہے۔"
تقریباً تمام شارحین اس توجیہ میں طباطبائی کے ہم خیال
مگر حقیقت یہ ہے کہ محبوب کے وہم کی وجہ غالب ہی
ن کر سکتے تھے یا ان کا محبوب. اب شوکت صاحب کے
سے غالب کی زبانی اس کی توجیہ سنئے :۔
ہم کو معلوم ہوا ہے کہ جب مرزا غالب نے یہ شعر مشاعرے میں
پڑھا تو ختم مشاعرے کے بعد مولوی امام بخش صاحب صہبائی
نے جو ایک مقدس اور متورع بزرگ تھے مرزا صاحب سے
یا کہ آپ نے اس شعر میں کیا معنی پہنائے ہیں؟. مرزا صاحب
کہا کہ مولانا آپ اس شعر کے معنی کیا سمجھیں گے. نہ آپ نے
ا رنڈی بازی کی. نہ خانگی بازی کی نہ امرد بازی کی. نہ

فاعل بنے نہ مفعول۔ میں نے تو اپنا ایک واقعہ لکھا ہے۔ یعنی جس
مسماۃ پر میں فریفتہ تھا بڑی بڑی تدبیروں اور چالوں سے
اس کو کسی کونے کھدرے میں ڈھب پر چڑھایا مگر اس خوف
سے کہ کوئی آ کھڑا ہوگا. رجولیت چوہے کی بل میں گھس گئی۔
مسماۃ سمجھی کہ غالب محض نامرد اور عنین ہے. میں نے معذرت
میں یہ شعر پڑھا۔"
موقع اور محل کے لحاظ سے یہ تاویل کس قدر چسپاں
اور حسب حال ہے! زبان بھی نفس واقعہ کے کس قدر مناسب
ہے؟. مگر مجلس مشاعرہ میں اس غیرت سوز واقعہ کا بیان ایسی
بازاری زبان میں مرزا غالب کی شخصیت سے بہت بعید ہے۔

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی
کیوں ترا راہگزر یاد آیا

طباطبائی اس شعر کی شرح میں لکھتے ہیں:۔
"تیرا راہ گزر یاد آنے سے میری زندگی گزر گئی اور یہ
بات اچھی ہوئی کہ میں زندگی سے بیزار تھا. لیکن اس کے
یاد آنے سے ایسا قلق ہوا کہ کاٹے نہ کٹی. نہ یاد آیا ہوتا زندگی تو
کسی نہ کسی طرح کٹ ہی جاتی۔"
شوکت میرٹھی اس کی شرح ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔
"زندگی ہر حالت میں گزر جاتی ہے اب تیرا رہگزر
یاد آیا ہے. تو وہاں بیٹھ کر زندگی گزرے گی. جب وصل یار
یا دیدار میسر نہیں تو انتظار یوں بھی ہے اور دوں بھی. پھر
تیرا رہگزر کیوں یاد آیا۔"

حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گناہ گار ہوں کافر نہیں ہوں میں

شرح شوکت:۔ "حد شریعت گناہ گار پر لگتی ہے نہ کہ کافر پر،
کافر تو غیر محدود طور پر مخلد فی النار رہیں گے۔"

دیدار بادہ، حوصلہ ساقی، نگاہ مست
بزم خیال میکدۂ بے خروش ہے

حل از شوکت: "بزم خیال ایک بے خروش میکدہ ہے. یہاں

دیدار شراب ہے۔ ساقی حوصلہ ہے۔ نگاہ مست ہے۔ پس اور کیا چاہیے؛ ایسی آرام و سکون کی محفل خوش قسمتی سے ملتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم خیال میں دیدار معشوق کے مزے لے رہے ہیں۔

اس شرح کے مطابق پہلے مصرع میں اضافت کہیں نہیں ہے اور یہی صحیح ہے۔

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے
غیر کو تم سے محبت ہی سہی

شرح شوکت:۔ غیر کو تم سے محبت ہے تو ہو۔ ہم بھی تو اپنے دشمن نہیں کہ رشک سے مر رہیں۔

طبا طبائی اس کی وضاحت یوں کرتے ہیں۔

"یعنی پھر ہم تجھ سے محبت کر کے اپنے ساتھ دشمنی کیوں کریں۔ جب مجھے غیر کی محبت کا یقین ہو گیا۔"

مذکورہ بالا مثالوں سے اولین شارح دیوان غالب یعنی مولوی احمد حسین شوکت میرٹھی اور ان کی شرح کلیات غالب سے ناظرین کا تعارف کرانے کے بعد راقم الحروف اہل ذوق کو اس حقیقت کی جانب متوجہ کرنا چاہتا ہے کہ اس شرح کو تقدم زمانی کے لحاظ سے شرحوں پر فضیلت حاصل ہے۔ مگر آج بہت کم لوگ اس سے واقف ہیں۔ قدیم ترین شرح دیوان غالب ہونے کی حیثیت سے اس کی دوبارہ طباعت کی ضرورت ہے۔

★

احسن نشاط
ہراوان ضلع دیوریا

کاشی نگری

جو ذرہ ہے سورج کو یہاں تول رہا ہے
اس بات پہ سارا ہی گگن ڈول رہا ہے
کاشی کو سمجھتا ہے تو آؤ اسے دیکھو
تہذیب کا ہر نقش یہاں بول رہا ہے

کاشی کی ہواؤ کوئی اک گیت سناؤ
سنگیت کے سوئے ہوئے تاروں کو جگاؤ
اس دور کے ماتھے پہ بھی آجائے پسینہ
اس دور کو پچھلی کوئی تصویر دکھاؤ

داتا بھی ملیں گے یہاں دانی بھی ملیں گے
لچھمن بھی یہاں رام کے ثانی بھی ملیں گے
پتھر کی سلوں میں کئی جگ دیکھنے والو
ہر گھر میں یہاں آنند و مانی بھی ملیں گے

علی احمد دانش
رائیس ہاؤس، میر انیس لین لکھنؤ۔۳

نگار رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار ۔۔۔ خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو
میر انیس

نو دریافت کلام

سید ببر علی ۱۲۱۸ھ میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ تیرہ چودہ سال کی عمر میں شاعری غزل سے شروع کی۔ ان کے والد میر خلیق نے ابتدا میں حزیں تخلص رکھا جو لکھنؤ میں ناسخ نے غزلوں پر اصلاح کے زمانے میں بدل کر انیس کر دیا۔ تذکرۂ خوش معرکہ زیبا قلمی مرتبہ ناصر لکھنوی کا جو نسخہ پٹنہ میں موجود ہے اس کے حاشیے پر یہ عبارت تحریر ہے:

"عہد شباب میں جبکہ فیض آباد میں تھے اوائل میں چند غزلیں بھی کہی ہیں جب سے لکھنؤ میں تشریف لائے شوق مرثیہ گوئی کا ہوا۔ وہ سب غزلیں یک قلم دھو ڈالیں، نسیاً منسیاً کیں... غزل میر صاحب اب عنقا و نایاب ہے بہت تلاش سے ایک غزل دستیاب ہوئی ہے....."[1]

انیس نے تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی، غزل کے علاوہ نوحے، رباعی، سلام، مسدس، مخمس بھی کہے۔ اپنے والد میر خلیق، بھائی میر نواب مونس کے بعض سلاموں کی تضمین اور تخمیس بھی کیے۔ بقول مصنف آبِ حیات خلیق کے کہنے پر انیس نے غزل گوئی کو ترک کر دیا اور ان غزلوں کو سلاموں کے قالب میں ڈھال دیا۔[2] اس سلسلے میں میر محمد ہادی لائق مرحوم بیان فرماتے تھے کہ:

"میری نظر سے انیس کی تقریباً ۲۵ غزلیں گزری ہیں جو انہوں نے اپنے ایک مداح و مہربان نواب مرزا محمد تقی خاں ترقی کے فرزند کو دے دی تھیں اور وہ تمام غزلیں ۲۲×۱۸ سائز کے گلابی کاغذ پر لکھی ہوئی کتابی صورت میں تھیں۔ بڑے آغا صاحب مرحوم نے اپنا کتب خانہ مدرسۂ سلطان المدارس کو دے دیا تھا اسی میں وہ غزلیں بھی منتقل ہو گئیں۔ جستجو کی جائے تو عین ممکن ہے کہ وہ مل جائیں....."

اس کے علاوہ انیس کی غزلیں قدیم تذکروں میں پائی جاتی ہیں۔ سید مسعود حسن رضوی مرحوم نے ۱۹۵۰ء میں تذکرۂ نادر کو بڑی جاں فشانی سے مرتب کیا اور سرفراز قومی پریس لکھنؤ میں طبع کروا کے شائع کیا تھا۔ تذکرۂ نادر دراصل کلب حسین خاں نادر کے دیوانِ غریب کی تلخیص ہے۔ یہ تذکرہ ۱۲۸۴ھ میں مطبع دلکشا فتح گڑھ میں چھپا تھا۔ ہم دیوان غریب سے انیس کی ایک غزل پیش کرتے ہیں ؎

وجد ہو بلبل تصویر کو جس کی بو سے ۔۔۔ اس سے گل رنگ کا دعویٰ کرے پھر کس منہ سے

---

[1] ماخوذ از انیسیات صفحہ ۱۴۵، مرتبہ جناب صباح الدین عمر۔ ناشر اتر پردیش اردو اکاڈمی۔ سال اشاعت: نومبر ۱۹۷۶ء۔ [2] ملاحظہ ہو راقم کا مضمون "والد ماجد میر محمد ہادی لائق" ضمیمہ قومی آواز مورخہ ۲۹ مئی ۱۹۷۸ء۔

کس سے لے شوخ ہوئی رات کو ہاتھا پائی　　تو نے جو آج جو ڈھلکے ہیں ترے بازو سے
کل تو آغوش میں شوخی نے تڑپنے نہ دیا　　آج کی شب تو نکل جاؤ گے قابو سے
شمع کے رونے پہ سب صاف ہنسی آتی ہے　　آتش دل کہیں کم ہوتی ہے چار آنسو سے
ایک دن وہ تھا کہ تکیہ تھا کسی کا زانو　　اب سر اٹھتا ہی نہیں اپنے سر زانو سے
نزع میں ہوں مری مشکل کرو آساں یارو　　کھولو تعویذ شفا جلد مرے بازو سے
شوق چشمہ کا تو کس کے ہو دیوانہ انیس　　آنکھ لگتی ہے ترے یوں نقش سم آہو سے

اس غزل کے علاوہ چند شعر یہ ہیں ؎

سبب ہم پر کھلا اس شوخ کے آنسو نکلنے کا
دھواں لگتا ہے آنکھوں میں کسی کے دل کے جلنے کا

رکھ کے منھ سو گئے ان آتشیں رخساروں پر
دل کو تھا چین تو نیند آ گئی انگاروں پر

چمن کے انشاں نظر اس مہ نے جو کی تاروں پر
آسماں رات کو لوٹا کیا انگاروں پر

متذکرہ بالا شعر اس طرح بھی نظر سے گزرا ہے ؎

چمن کے انشاں جو گئی اس کی نظر تاروں پر
رات بھر آسماں لوٹا کیا انگاروں پر

خال سیہ ہے ابروئے خمدار کے تلے
ننھی سی ڈھال رکھی ہے تلوار کے تلے

اس شعر میں انیس نے خال کو ڈھال کہہ کر اور ابروئے خمدار کو تلوار نظم کر کے اپنی جدت پسند انداز فکر سے کس درجہ حسین استعارے پیش کیے ہیں۔ انیس نے لاتعداد رباعیاں کہیں جو زیادہ تر چھپ گئیں۔ لیکن اب بھی غیر مطبوعہ رباعیاں باقی ہیں انہی رباعیوں میں سے یہ غیر مطبوعہ رباعیاں درج ہیں ؎

صد حیف کہ یار جاودانی نہ رہا
شبیر کی مجلسوں کا بانی نہ رہا
افسوس افسوس میر مہدی افسوس
جیتے ہیں یہ لطف زندگانی نہ رہا

یہ رباعی میر انیس نے اپنے سمدھی میر مہدی علی لکھنوی کی وفات سے متاثر ہو کر کہی تھی۔ میر مہدی علی لکھنوی کی پوتی اور قاضی میر عابد علی متخلص بہ عابد کی دادا ان کی بیٹی میر انیس کے منجھلے فرزند میر عسکری رئیس کو منسوب تھیں[1]۔ میر عابد علی عابد خود بھی بہت اچھے مرثیہ گو اور نواب میر مونس کے شاگرد تھے۔ راقم کے پاس میر عابد علی عابد کا ایک غیر مطبوعہ مرثیہ موجود ہے جس کا مطلع یہ ہے "پھر تازہ بہار آئی گلستان سخن میں" یہ مرثیہ عون و محمد کے حال میں نظم کیا گیا ہے۔ تعداد بند ۱۷۰ اور تاریخ کتابت ۱۵ محرم ۱۳۰۶ھ ہے۔ مقطع یہ ہے ؎

پورا نہیں کچھ بین کا مضمون اگرچہ　　رونے کو مگر کافی و وافی ہیں یہی بند
عابد کو شفاعت کے شہا کیجئے خورسند　　میں عون و محمد کی تعین پڑھتا ہوں سوگند

کب تک یہ غم و رنج اٹھایا کروں گا
پھر مجلسوں میں آپ کی جایا کروں مولا

انیس کے شاگرد اور ہمعصر نواب امجد علی خاں آتش محل میر انیس سے اپنے یہاں مجالس پڑھواتے تھے، انہی کے یہاں مجلس سے قبل آپ نے یہ رباعی پڑھی ؎

دھوپ آتے ہی یاں یہ زرد ہو جاتی ہے
آندھی آتی ہے گرد ہو جاتی ہے
نکلے آہوں کے آنسوؤں کا چھڑکاؤ
یاں گرم ہوا بھی سرد ہو جاتی ہے[2]

---

[1] میر عسکری رئیس کا دوسرا عقد انیس کی حیات میں ۱۵ رجب ۱۲۸۳ھ میں شیخ ہنگا صاحب کی دختر امامی خانم کے ساتھ ہوا۔ نکاح سید باقر صاحب قبلہ مجتہد نے پڑھا۔ یہ عقد میر عسکری رئیس نے پہلی بیوی کی موجودگی میں کیا جو میر انیس اور میر نفیس کے منشا کے مطابق نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نکاح نامے پر رئیس کے والد میر انیس اور بڑے بھائی میر خورشید علی نفیس کے دستخط یا مہر موجود نہیں۔ نکاح نامے پر جن افراد کے دستخط یا مہریں ہیں وہ درج ذیل ہیں۔
مہر و دستخط۔ سید باقر مجتہد　　دستخط۔ شیخ ہنگا　　دستخط۔ یعقوب علی بیگ　　مہر و دستخط۔ سید محمد سلیس　　مہر و دستخط: ننگ خاندان سید عسکری بقلم خود

[2] ماخوذ از سوانح عمری عروج۔ مرتبہ: ڈاکٹر سید نیر مسعود رضوی (زیر طبع)

جب دور سے ایوان علا کو دیکھا
لاریب کہ عرش کبریا کو دیکھا
سو بار کیا طواف کعبہ اے دل
اک بار جو روضۂ رضا کو دیکھا

ہم کو جناب سید محمد رشید صاحب کے نایاب ذخیرہ مراثی میں ایک قدیم مطبوعہ جلد فراہم ہوئی۔ اس مطبوعہ جلد کی بدولت راقم اس حقیقت سے واقف ہوا کہ انیس کا کچھ کلام ان کی حیات ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۱ء میں مطبع اسلامی بمبئی میں چھپا تھا۔ اس کا عنوان
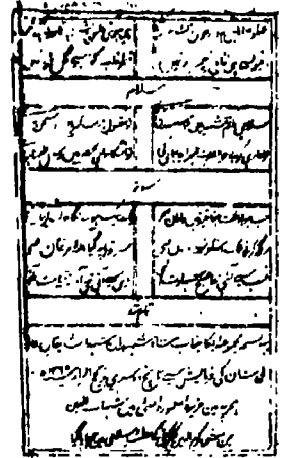
مجموعۂ بکا مطبوعہ ۱۲۶۸ھ کا آخری ورق

"مجموعہ بکا" اور جس کا سائز ۲۲x۱۸ ہے۔ اس میں انیس کے علاوہ ضمیر اور فصیح وغیرہ کا کلام شامل کیا گیا ہے۔ انیس کے حسب ذیل دو مرثیے شامل ہیں:

۱۔ جب فوج خدا قتل ہوئی راہ خدا میں۔ ۶۶ بند [1]

۲۔ اے مومنو کیا مرتبۂ سبط نبی ہے۔ ۷۵ بند [2]

کتاب کے ترقیمہ صفحہ ۸۰ پر یہ عبارت درج ہے:

"یہ نسخہ مجموعۂ بکا جناب شاہ شہیدان شہدا شائقان عالی شان کی فرمائش سے تاریخ دوسری ذی الحجہ الحرام ۱۲۶۸ھ میں جزیرہ معمورۂ بمبئی میں شہاب الدین ابن کرم الدین کے مطبع اسلامی میں چھاپا گیا......"

اس مجموعے کے علاوہ حیات انیس ۱۲۶۸ھ میں مطبع مخدومی بمبئی سے میر انیس کے دو مرثیے شائع ہوئے جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ جب فوج قتل ہوئی راہ خدا میں۔ ۱۰۴ بند مکمل مرثیہ

۲۔ آمد ہے کربلا میں شہ دیں پناہ کی۔ ۱۲۰ بند "

مذکورہ بالا دوسرا مرثیہ "آمد ہے کربلا میں شہ دیں پناہ کی" نایاب مرثیہ ہے۔ اس مرثیے کی تقطیع ۶x۱۰ ہے اور کتاب پر "مجالس نو" اور "انیس" لکھا ہے۔ تمام صفحات پر "بنینا امام حسینؑ کا دشت کربلا میں" لکھا ہوا ہے۔ اب یہ مرثیہ ۱۲۶۸ھ کے بعد پہلی مرتبہ منشی امیر علی جونیر ری مالک اردو پبلشرز لکھنؤ جواہرات انیس جلد سوم میں شائع کر رہے ہیں۔ اور پروفیسر اکبر حیدری کاشمیری نے اسے اپنی مرتب کردہ مراثی کی جلد باقیات انیس میں شامل کیا ہے۔ بزرگوں سے سنی سنائی روایات کے مطابق انیس بذات خود طباعت کے سلسلے میں بہت محتاط تھے اور اشاعت کلام کے سلسلے میں اپنے ایک دوست سید آغا منصور نگری پر بہت برہم ہوئے تھے۔ سید آغا منصور نگری کے شائع کردہ مراثی نایاب ہیں جنھیں انیس نے طباعت کی غلطیوں کی بنا پر ضائع کر دیا تھا۔ باقاعدہ طور سے انیس کے کلام کی اشاعت کا سلسلہ ان کے انتقال ۱۰ دسمبر ۱۸۷۴ء کے دو سال کے بعد نومبر ۱۸۷۶ء میں منشی نول کشور نے شروع کیا اور سید تصدق حسین صاحب کنتوری نے بڑے اہتمام سے یکے بعد دیگرے انیس کے مراثی کی تین جلدیں مرتب کیں۔ پہلی جلد میں ۲۹، دوسری میں ۲۷، تیسری میں ۱۹ مرثیے شائع کیے۔ مجموعی طور پر نول کشور پریس نے انیس کے مرثیے چار جلدوں میں شائع کیے۔ ان جلدوں کے علاوہ مراثی کی ایک جلد مرزا محمد مہدی مالک مطبع جعفری نخاس نے ۱۸۹۵ء مطابق ۱۳۱۳ھ میں "مرثیہ ہائے میر انیس مرحوم"

---

[1] پہلا مرثیہ "جب فوج خدا قتل ہوئی راہ خدا میں" صفحہ ۱۲۱ سے شروع ہو کر صفحہ ۱۳۱ پر تمام ہوا ہے جو بہ اعتبار تعداد بند نامکمل ہے۔
[2] دوسرا مرثیہ "اے مومنو کیا مرتبۂ سبط نبی ہے" صفحہ ۵۵ سے شروع ہوا ہے اور صفحہ ۶۶ پر ختم ہوا ہے۔ یہ بھی نامکمل ہے۔

کے نام سے چھاپی اور مرثیے جناب میر خورشید علی نفیسؔ فرزند جناب انیسؔ سے حاصل کیے۔ جناب نفیسؔ نے انھیں ایک ہبہ نامہ بھی لکھ دیا تھا جو درج ذیل ہے:

اعلان

صاحبان مطابع و تاجران پر واضح ہو کر جو مرثیہ جلد پنجم میں تصنیف سے جناب والد مرحوم اعلی اللہ مقامہ کے ہیں اوس کی اجازت راقم نے مرزا محمد مہدی صاحب کو دی ہے احیاناً اگر کوئی اس جلد کو کل یا جزو چھاپے گا اوس سے مواخذہ حسب قانون بذریعہ عدالت کیا جائیگا اور حق تصنیف مرزا صاحب موصوف کو ہبہ کر دیا ہے۔

العبد

سید خورشید علی نفیس عفا عنہٗ

(مہر: سید خورشید علی ۱۲۹۰ھ)

اس جلد پنجم میں میر انیسؔ کے مستند اور نایاب ۲۲ مراثی شامل ہیں جن کے مطلعے مع تعداد بند درج ذیل ہیں:

عکس تحریر میر انیسؔ ۱۲۹۱ھ

۱۔ خورشید فلک عکس دُرِ تاجِ علی ہے ۱۴۰ بند

۲۔ اے مومنو کیا شور ہے ماتم کا جہاں میں[1] ۹۱ "

۳۔ رخصت ہوئے حضرت جو محبانِ وطن سے[2] ۱۰۰ بند

۴۔ جس دم یزید شام میں مسند نشیں ہوا ۱۰۲ "

---

[1] اس مرثیے کا درمیانی مطلع یہ ہے "اے چرخ ستمگار یہ کیا جور و جفا ہے"، مرثیہ بہ اعتبار بین لاجواب ہے۔

[2] رخصت ہوئے حضرت...... الخ دراصل "کنعان محمدؐ کے حسینوں کا سفر ہے" کا درمیانی حصہ ہے اور تمام نولکشوری ایڈیشنوں میں موجود ہے۔

۵- جاتی ہے کس شکوہ سے رن میں خدا کی فوج ۱۸۴ بند
۶- تھے حسن میں یوسف سے بھی بہتر علی اکبر ۹۱ "
۷- جب خاتمہ بخیر ہوا فوج شاہ کا[1] ۱۷۰ "
۸- کیا زخم ہے وہ زخم کہ مرہم نہیں جس کا[2] ۱۷۴ "
۹- جب قصد کیا نہر کا سقائے حرم نے ۵۷ "
۱۰- جب شام کے زنداں میں ہوئی شام حرم کو ۴۴ "
۱۱- دی رن کی رضا شاہ نے جب ابن حسن کو ۶۸ "
۱۲- اے اہل عزا رخصت اکبر ہے پدر سے ۸۰ "
۱۳- جب کہ خاموش ہوئی شمع امامت رن میں ۴۰ "
۱۴- روتے ہیں ملائک یہ عزا خانہ ہے کس کا ۱۶۹ "
۱۵- بند آتی ہے زنداں میں بڑے یاد و شوہیہ ۱۰۳ "
۱۶- ہے آمد عباس کا غل فوج ستم میں ۱۰۹ "
۱۷- جب کٹ گیا تیغوں سے گلستان محمد ۱۲۱ "
۱۸- آمد ہے جگر بند شہ قلعہ شکن کی ۱۳۰ "
۱۹- اے خضر بیابان سخن راہ بری کر[3] ۹۷ "
۲۰- وہ زخ سے جو آزاد کیا حر کو خدا نے ۱۲۷ "
۲۱- جب نیزے سے مجروح ہوا قاسم نوشاہ ۲۲ "
۲۲- جب تیرے سے رن میں ہوئے گھائل علی اکبر ۷۷ "

اس جلد کے شائع ہونے کے بعد سید عبدالحسین تاجر کتب لکھنؤ نے ۱۹۰۱ء میں مراثی انیس کی تین جلدیں (جلد پنجم جدید، جلد ششم اور جلد ششم جدید) شائع کیں جن میں کئی مرثیے الحاقی ہیں مثلاً:

غم پدر سے جو صغرا نحیف و زار ہوئی
کھولا جو جہر نے علم زرنگار کو

دراصل میر انیس کے بھانجے میر احسان علی رنجیں کے ہیں یا مندرجہ ذیل مرثیے:

۱- کیوں آج زلزلے میں زمیں کربلا کی ہے
۲- کھولا علم جو خسرو زریں کلاہ نے
۳- سب سے جدا روش مرے باغ سخن کی ہے

مذکورہ بالا مرثیے عبدالحسین تاجر کتب لکھنؤ اور پاکستانی جلد بک لمیٹڈ

کاپی رائٹ ... محفوظ ہے

من بکی او ابکی او تباکی وجبت له الجنة

از تصنیفات جناب میر ببر علی صاحب متخلص بہ انیس اعلی اللہ مقامہ

جلد پنجم

مراثی میر انیس مرحوم

بار اول

ملک سید محمد مہدی لالوی بقلم

حسب فرمائش مومنین و قار و محبان حیدر کرار علیہ الصلوٰۃ والسلام

... مطبع جعفری لکھنؤ نخاس جدید مطبوع گردید

کراچی میں شامل ہیں۔ جو دراصل میر انیس کے منجھلے بھائی میر مہر علی انس کے ہیں۔ پاکستانی جلد میں یہ مرثیہ بغیر مقطع کے شائع کیا گیا ہے۔ اس کے کوئی نسخے راقم کی نظر سے گزرے۔ مقطع بند ۱۶۳ درج ذیل ہے:

اے انس کو ملول نہ طبع رسا کمال
یہ دیکھئے تو بند سے ہو بند بے مثال

---

[1] اس مرثیے کا مطلع اولی یہ ہے "واجب تھا کہ عہد جوانی گزر گیا"۔ اس کے علاوہ اس مطلع سے بھی ایک مرثیہ نظر سے گزرا "جب خاتمہ بالخیر ہوا فوج خدا کا"
[2] اس مرثیے کا مطلع ثانی یہ ہے "جب باغ جہاں اکبر ذی جاہ سے چھوٹا"
[3] مذکورہ بالا مطلع "اے خضر بیابان سخن ... الخ" دراصل میر انیس کے ایک بہت مشہور مرثیہ "یارب چمن نظم کو گلزار ارم کر" کا درمیانی حصہ ہے۔

کیا حسن سے رقم کیا ابنِ حسن کا حال سحر حلال ہے یہ اگر کیجیے خیال
رنگیں کیا ہے نظم فصاحت نظام کو
زیور پنہا دیا ہے عروس کلام کو

ان جلدوں کے علاوہ سلسلۂ آصفیہ کے تحت نظامی پریس بدایوں سے جناب علی حیدر نظم طباطبائی نے مراثی انیس کی تین جلدیں (۱۹۲۴ء تا ۱۹۳۰ء) میں شائع کیں اور مرثیے انیس کے سب سے چھوٹے فرزند میر محمد صاحب سلیس سے حاصل کیے۔ جناب سید مسعود حسن رضوی مرحوم نے انیس کے سات مراثی کو ترتیب دے کر اور مقدمہ و فرہنگ لکھ کر روحِ انیس کے عنوان سے شائع کیا۔ یہ جلد بہ اعتبار کتابت و طباعت بہترین ہے۔ اور تصحیح کا بھی بڑا اہتمام کیا گیا ہے۔ اس میں فاضل مرتب نے رباعیاں اور سلام بھی شامل کیے ہیں۔

خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ آخر میں جناب سید مسعود حسن رضوی ا[illegible] مرحوم نے ایک جامع مقدمہ لکھ کر اور واقعات کربلا کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے انیس کے سے عظیم شاعر کی فنی صلاحیت پر روشنی ڈالی ہے جو کتاب کی افادیت میں اضافہ کا سبب۔ یہ جلد اب نایاب ہے، ایسی جلد کسی اور نے اب تک نہیں چھا[illegible] اس کا سہرا مرزا محمد جواد صاحب مرحوم کے سر ہے جن کی انتھک کوششوں اور صلاحیتوں کی بدولت ایسی کتاب چھپ سکی۔ ا[illegible] جلد کے بعد سید نائب حسین نقوی امروہوی نے مراثی انیس کو ترتیب کے ساتھ چار جلدوں میں شائع کیا۔ جس میں زیاد[illegible] نول کشوری جلدوں کے مراثی شامل ہیں۔ یہ مرثیے غلام علی ا[illegible] سنز لاہور نے چھاپے تھے۔ انتخاب میر انیس کے نام سے ادارۂ یادگار میر

● میر انیس گھر میں میر عارف سے کہتے تھے کہ:
"وہ شاعر ہی کیا جو روزانہ تین شمعیں جلا کر روزانہ کچھ نہ کچھ مشقِ سخن نہ کرے"
اور وہ اس اصول کو خود بھی اپنائے ہوئے تھے، اگر طبیعت موزوں ہوئی تو پوری رات گزر جاتی تھی، بعض مراثی کے خاتمے پر تحریر فرماتے ہیں کہ:
"بعونہٖ تعالیٰ روز سہ شنبہ ۲۹ رمضان المبارک ۱۲۷۲ھ وقت شب تمام رسید"
"بعونہٖ تعالیٰ۔ بتاریخ ہفتم رجب ۱۲۸۶ھ روز چہارشنبہ وقت شب تمام رسید"

۱۹۴۳ء میں شمارہ محاسن انیس کے نام سے مالک نظامی پریس لکھنؤ جناب مرزا محمد جواد نے جو ایک بہترین خطاط بھی تھے میر انیس کا مندرجہ ذیل مرثیہ:

جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے

چھاپا۔ یہ مرثیہ اس سے قبل نول کشوری جلدوں میں چھپتا رہا تھا۔ اس مرثیے کی جلد کا سائز ۲۰×۲۶ ہے، اس کے ابتدائی صفحات میں شیخ ممتاز حسین جونپوری مرحوم نے اس میں شامل قلمی تصاویر اور اشاعت کے سلسلے میں ضروری وضاحتیں کی ہیں۔ 'عرضِ حال' سید مسعود حسن رضوی مرحوم اور تعارف سید احتشام حسین مرحوم نے لکھا ہے۔ اس کے علاوہ سر تیج بہادر سپرو اور ممتاز ناقد و فلسفی علامہ سید اختر علی تلہری نے انیس کی شاعری کے بارے میں اپنے

کراچی نے ۔ ایڈیشن چھاپے۔ ۱۹۶۱ء میں بک لینڈ کراچی نے بھی انیس مراثی کی ایک جلد چھاپی جو دراصل عبدالحسین تاجر کتب لکھنؤ [illegible] نقل ہے۔ انیس کی صد سالہ برسی کے موقع پر مجلس ترقی اد[ب] لاہور سے پاکستان میں سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی نے با[illegible] مرثیے چھاپے۔ جس میں مقدمہ اور مفید حواشی بھی لکھے۔ یہ [illegible] لاجواب ہے۔ ابھی حال ہی میں مالک اردو پبلشرز منشی امی[illegible] جونپوری نے جواہراتِ انیس کے نام سے تین جلدیں شائع [کیں] جن میں بعض غیر مطبوعہ مراثی شامل کیے گئے ہیں۔ دہلی سے محترمہ عابد حسین صاحبہ نے بڑی محنت سے انیس کے ۱۸ مرثیے شا[ئع] کیے جو بہ اعتبار کتابت و طباعت عمدہ ہیں۔ تصحیح کی وجہ [سے] بعض غلطیاں ہوئی ہیں جنھیں کوشش کی جائے تو دوسرے ایڈ[یشن]

میں درست کیا جاسکتا ہے۔ پاکستان میں انیس کے مراثی کی چھ جلدیں زیر طبع ہیں جن کو راقم کے چچا سید یوسف حسین شائق نے ترتیب دیا ہے۔ یہ جلدیں عنقریب بہ اہتمام ڈاکٹر سید صفدر حسین زیدی متخلص بہ صفدر شائع ہونے والی ہیں۔

ثانی ادب کی نزاعی شخصیت محقق کلام انیس جناب سید نائب حسین نقوی امروہوی (متوفی ۹ مئی ۱۹۷۹ء) ادھر کچھ عرصے سے جن غیر مطبوعہ مراثی کا اعلان کرتے رہے تھے وہ بھی بہت جلد منظر عام پر آرہے ہیں۔ اس کے علاوہ مراثی انیس کی ترتیب و تدوین سید بلاغت حسین رضوی معروف بہ شہاب سرمدی بھی فرما رہے ہیں۔

۱۹۶۲ء میں وقارِ انیس کے عنوان کے تحت صاحب مہذب اللغات سید محمد میرزا مہذب لکھنوی نے دو جلدیں شائع کیں جن میں ۲۰ مراثی انتخاب کر کے شائع کیے۔ اسی دوران قمر پاکٹ بک سیریز الہ آباد نے انتخاب انیس کے نام سے میر انیس کے اچھے مراثی کو چھاپا۔ اس کی دو جلدیں ابن سعید ایم۔ اے نے مرتب کیں۔

میری نظر سے ایک قدیم فہرست کتب خانہ حیدری گزری جو انیس کے الحاقی مرثیوں کے سلسلے میں بڑی مفید ثابت ہوئی۔ اس فہرست کو اس کے مالک سید شمشاد علی و سید امداد علی تاجر کتب چوک سبز منڈی لکھنؤ نے شائع کیا تھا۔ اس میں موجود ایک اشتہاری اطلاع کے مطابق خاندان انیس کے شعرا کی تین سو رباعیاں اور مجموعہ سلام خاندان انیس شائع کیا گیا تھا جو اب عنقا ہے۔

۱۹۰۵ء مطابق ۱۳۲۲ھ میں سید محمد حسن بلگرامی گورنمنٹ ایڈیٹر ریلوے و معدنیات متعلق سرکار آصفیہ نے بڑے اہتمام سے انیس کی ۱۴۵ رباعیاں مرتب کیں جو مطبع نامی کانپور میں چھپیں۔ اس مجموعے کو محمد حسن بلگرامی نے میر اسد علی خان نظام یار جنگ کے نام معنون کیا تھا۔ اس کی ابتدا میں میر انیس کی ایک تصویر اور دیباچہ مصنف بھی موجود ہے جس میں ان رباعیوں سے متعلق ضروری وضاحتیں درج کی گئی ہیں۔ ۱۹۲۰ء میں عم محترم جناب سید محمد عباس آصف ایم۔ اے نبیرۂ میر انیس نے انیس کی رباعیوں کو مرتب کیا جو مجموعۂ رباعیات میر انیس مرحوم کے نام سے نول کشور پریس لکھنؤ سے شائع ہوئیں۔ اب اسی جلد کو جدید ترتیب حواشی کے ساتھ جناب سید علی جواد زیدی ترتیب دے رہے ہیں۔ جناب آصف نے انیس کی اخلاقی رباعیوں کا ایک انتخاب انیس الاخلاق کے نام سے بڑی عرق ریزی سے مرتب کر کے نظامی پریس لکھنؤ سے شائع کیا تھا۔ ۱۹۵۰ء میں انیس کے ایک سو دو سلاموں کو مرتب کیا جو اب گلدستۂ انیس کے عنوان سے اردو پبلشرز لکھنؤ نے اپریل ۱۹۷۶ء میں شائع کیے۔ پاکستان میں سید یوسف حسین شائق مرحوم نے تجلیات انیس کے نام سے انیس کے ۸۰ سلاموں کو ترتیب دیا۔ اس جلد میں جناب شائق نے نول کشور کی جلدوں کی اتباع کی ہے اور کچھ نئے سلام شامل کیے ہیں۔ ان تمام مجموعوں کے مطالعے کے بعد راقم السطور اس نتیجے پر پہنچا کہ انیس کا کچھ کلام اب بھی غیر مطبوعہ ہے اور اب تک کہیں شائع نہیں ہوا۔ اس مضمون کا مقصد انیس کے اس کلام میں سے چند نمونے پیش کرنا ہے۔

— ۱ —

میر انیس کا سلام "نمود و بود کو عاقل حباب سمجھے ہیں" میرے خیال میں آج تک مکمل طور سے شائع نہ ہو سکا۔ یہ سلام سب سے پہلے نول کشور کی جلد میں چھپا۔ جس میں صرف ۱۱ شعر چھاپے گئے۔ یہ سلام تذکرۂ میر انیس صاحب اذکار اصحاب خاندان انیس مولفہ حفیظ الدین احمد مزاج دہلوی نے بھی چھاپا جس میں ۱۱ شعر شامل کیے۔ جناب سید مسعود

---

[1] آپ میر علی محمد عارف کے سب سے چھوٹے فرزند تھے۔ کلام انیس پر بے پناہ عبور تھا۔ ڈاکٹر صفدر حسین زیدی اپنے مکتوب مورخہ ۸ اپریل ۱۹۷۸ء میں رقمطراز ہیں۔
"عزیز گرامی۔ دعائیں۔ آپ نے جو تصویریں عنایت فرمائی ہیں ان کا شکریہ ..... میں نے میر انیس کی مراثی کی چھ جلدیں مع اضافۂ غیر مطبوعہ کلام طبع کرانے کا منصوبہ بنایا تھا جو جناب یوسف حسین صاحب شائق مرحوم کے تعاون سے روبہ تکمیل تھا، اب اس کا تمام بوجھ میرے ذہن و اعصاب پر ہے۔ بہرحال ع توفیق بہ اندازۂ ہمت ازل سے" فقط۔ مخلص صفدر حسین" شائق کا ۱۲ مارچ ۱۹۷۰ء کو کراچی میں انتقال ہوا، جنت البقیع کراچی میں سپرد خاک ہوئے۔

حسن رضوی ادیب کی مرتب کردہ جلد دوم انیس میں صرف ۱۱ شعر شائع کیے گئے۔ جناب سید محمد عباس آصف کی ترتیب کردہ جلد گلدستۂ انیس میں ۲۲ شعر شائع ہوئے۔ ۱۸۸۸ء / ۱۳۰۶ھ میں میر علی محمد عارف نے انیس اور خاندان کے دوسرے شاعروں کے سلاموں اور رباعیوں کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا جس کا نامکمل مخطوطہ راقم کے پاس محفوظ ہے۔ اس مجموعے میں یہ سلام ۱۱۶ اشعار پر مشتمل ہے۔ چند ماہ قبل لفظ 'گمراہی' کی تفصیل کے لیے

کریم مجھ کو عطا کر وہ فقر دنیا میں   کہ جس کو فخر رسالت مآب سمجھے ہیں

انیس کے تحریر کیے ہوئے سلام میں یہ شعر اس طرح موجود ہے ۔

کریم دے مجھے وہ فقر اپنی رحمت سے   کہ جس کو فخر رسالت مآب سمجھے ہیں

یا مطبوعہ جلد میں موجود یہ شعر ۔

ابو تراب کے در کا ہے ذرۂ بے قدر   ہم آسماں پہ جسے آفتاب سمجھے ہیں

قلمی نسخے میں مذکورۂ بالا شعر اس طرح ہے ۔

ابو تراب کے در کا ہے ذرۂ کم قدر   سب آسماں پہ جسے آفتاب سمجھے ہیں

غیاث اللغات کی ورق گردانی کے دوران محولہ بالا سلام جو انیس کا تحریر کیا ہوا ہے دستیاب ہوا۔ ابتدا میں انیس نے بسم اللہ خیر الاسماء لکھ کر نظم کی ابتدا کی ہے اور ۲۰ شعر درج ہیں۔ لیکن قرین واقعہ وہ صرف ۱۱ شعر انتخاب کر کے مجالس میں پڑھتے رہے جو عام طور سے لوگوں کے ذخیروں میں پایا جاتا ہے۔ اس سلام میں مطبوعہ صورت کے مقابلے میں بعض لفظی اختلاف بھی پائے گئے۔ اب تک تمام مجموعوں میں زیر نظر شعر یوں چھپتا رہا ہے ۔

مثلاً سلام کا یہ شعر ۔

خدا کی راہ میں ایذا ہے جن کو راحت ہے   زمین گرم کو وہ فرش خواب سمجھے ہیں

قلمی نسخہ میں یہ شعر اس طرح ہے ۔

خدا کی راہ میں ایذا ہے جن کو راحت ہے   وہ دھوپ کو بھی ارم کا سحاب سمجھے ہیں

اسی طرح سلام کا بیسواں شعر مطبوعہ صورت سے مختلف ہے ۔

لحد میں آئیں نکیرین آئیں بسم اللہ   ہر اک سوال کو ہم بھی جواب سمجھے ہیں

قلمی نسخہ میں کچھ اس طرح ہے ۔

لحد میں آئیں نکیرین آئیں بسم اللہ   ہر اک سوال کا ہم بھی جواب سمجھے ہیں

اس سلام کو انیس کی ترتیب کے مطابق پیش کیا جاتا ہے اور جو حصے پڑھے نہ جا سکے ان پر اس طرح کا نشان [.......] بنا دیا گیا ہے ؎

نود و بود کو عاقل حباب سمجھے ہیں   وہ جاگتے ہیں جو دنیا کو خواب سمجھے ہیں
بی کا عزّ و شرف بوتراب سمجھے ہیں   علی کی قدر رسالت مآب سمجھے ہیں
بھی برا نہیں جانا کسی کو اپنے سوا   ہر ایک ذرّے کو ہم آفتاب سمجھے ہیں
ریم دے مجھے وہ فقر اپنی رحمت سے   کہ جس کو فخر رسالت مآب سمجھے ہیں
باں پہ مشکِ ختن اور کہاں حسینؑ کی زلف   یہ مو شگاف خطا کو ثواب سمجھے ہیں
بھگو کے کھاتے ہیں پانی میں نانِ خشک کو وہ   اس آبرو کو جو موتی کی آب سمجھے ہیں
بوتراب کے در کا ہے ذرّہ کم قدر   سب آسماں پہ جسے آفتاب سمجھے ہیں
یاقِ رحمت معبود ہے قیامت و حشر   ہم اس کو بھی کرم بے حساب سمجھے ہیں
نھیں حصول ہوا رتبۂ فنا فی اللہ   حیات و موت کو وہ ایک خواب سمجھے ہیں
ب نہیں یہ جو شیشوں میں بھر کے لیجائیں   ان آنسوؤں کو فرشتے گلاب سمجھے ہیں
ے نہ آئیو دنیائے دوں کے دھوکے میں   سراب ہے یہ جسے موج آب سمجھے ہیں
اشکِ تاک یہ کہتے ہیں جس کو آبِ طرب   یہ خونِ گل ہے جسے سب گلاب سمجھے ہیں
مانہ ایک طرح پر کبھی نہیں رہتا   اسی کو اہلِ جہاں انقلاب سمجھے ہیں
ہیں یہ کچھ ہمیں روزِ شمار کا [صدمہ]   علی کے شیعوں میں اپنا حساب سمجھے ہیں
نھیں کو دارِ بقا کی ہے پختگی کا خیال   جو بے ثباتیِ دہر خراب سمجھے ہیں
باب کھو کے بھی غفلت ہی ہے پیروں کو   سحر کی نیند کو بھی شب کا خواب سمجھے ہیں
بکائیں سر کو نہ کیوں حرِ عراق کے نصحا   سوال شاہ کو سب لاجواب سمجھے ہیں
ذوالجناح کو سمجھے ہیں آسماں شوکت   قمر کو زیں مہِ نو کو رکاب سمجھے ہیں
ہشت دیگا خدا خود انھیں تعالیٰ   درِ علی کو جو رحمت کا باب سمجھے ہیں
مدایہ دھوپ میں آتی تھی لاشۂ شہ پہ   کہ سہل ہم تپشِ آفتاب سمجھے ہیں
ہدا کی راہ میں ایذا ہے جن کو راحت ہے   وہ دھوپ کو بھی کرم کا سحاب سمجھے ہیں
لحد میں آئیں نکیرین آئیں بسم اللہ   ہر اک سوال کا ہم بھی جواب سمجھے ہیں
حسین کہتے تھے مرنا ہے خوب بیعت سے   ہم اس کو نیک اسے ناصواب سمجھے ہیں
حبیب ابنِ مظاہر نے عرض کی مولا   غلط ہے سب جو یہ خانہ خراب سمجھے ہیں
ہم اس حصار کو اک دم میں توڑ ڈالیں گے   یہ جس کو قلعۂ خیبر کا باب سمجھے ہیں

اگر غرور ہے اعدا کو اپنی کثرت پر   تو اس حیات کو ہم بھی حباب سمجھے ہیں
نہ کچھ خبر ہے حدیثوں کی ان سفیہوں کو   نہ یہ معانیِ ام الکتاب سمجھے ہیں
کبھی شقی متمتع نہ ہوں گے دنیا سے   جسے یہ آب اسے ہم سراب سمجھے ہیں
گلا کٹانے کو بیعت سے بہتر و خوشتر   حضور سمجھے ہیں یا بوتراب سمجھے ہیں
جو سلسبیل کو اک دن سبیل کر دے گا   خدا کی شان اسے محتاجِ آب سمجھے ہیں
تلف ہوا کوئی بیٹا جواں تو جانیں گے   ہمارے صبر کو جو اضطراب سمجھے ہیں
مزیلِ عقل ہے دنیا کی دولت اے منعم   اسی کے نشے کو صوفی شراب سمجھے ہیں
مرارتیں ہیں مآلِ حلاوتِ دنیا   وہ زہر ہے جسے ہم شہدِ ناب سمجھے ہیں
[...............]   وہی نکاتِ حدیث و کتاب سمجھے ہیں

مذکورۂ بالا اشعار مع اختلافِ نسخ درج کیے گئے اب وہ اشعار پیشِ ناظرین ہیں جو کہیں طبع نہ ہوئے ؎

علی کے رتبۂ اعلا کو کوئی کیا جانے   خدا کے بعد رسالت مآب سمجھے ہیں
حسین پیاس میں منہ کھولتے ہیں ذبح کے وقت   چمک کو خنجرِ قاتل کی آب سمجھے ہیں
خدا پناہ دے صدقے میں پنجتن کے اسے   ہم آبرو کی جسے آب و تاب سمجھے ہیں
خدا نے دی ہے اماموں کو حشم [آخر میں]   وہی بجا ہے کہ جو کچھ جناب سمجھے ہیں
دیا ہے جن کو شرف حق نے خاکساری کا   زمین گرم کو وہ فرشِ خواب سمجھے ہیں
لگا رہے ہیں جگر گوشۂ رسول کو تیر   خطا کی راہ کو خاطی صواب سمجھے ہیں
ہے جن پہ دامنِ خاتونِ حشر کا سایہ   وہ سرد گرمیِ روزِ حساب سمجھے ہیں
شباب و شیب عجب غفلتوں میں گزرا ہے   وہ شب کا خواب اسے دن کا خواب سمجھے ہیں
دیے ہیں عالمِ دانا نے جن کو اپنے علوم   وہی دقائقِ ام الکتاب سمجھے ہیں
انھیں کو طولِ امل سے غرض نہیں جو لوگ   قلیل عمرِ جہانِ خراب سمجھے ہیں*

یہاں میر انیس نے مصرعۂ اولیٰ دوسرا قائم کیا ہے جو یہ ہے ؎

* بقائے دولتِ عقبیٰ وہی سمجھتے ہیں

نہ کنہِ ذاتِ الٰہی کوئی بشر سمجھا   مگر جنابِ رسالت مآب سمجھے ہیں
عرق کو چہرۂ سرور کے اور گیسو کو   اسے گلاب اسے مشکناب سمجھے ہیں
مفرحِ جگر و قلب ہے تو قوتِ روح   ہم اشکِ دیدۂ تر کو گلاب سمجھے ہیں*

یہاں مصرعۂ ثانی انیس نے پہلے یہ لگایا تھا ؎

* ان [.....] خالص گلاب سمجھے ہیں

پکارتے تھے یہ خندق کی جنگ میں جبریل   خدا کا قہر علی کا عتاب سمجھے ہیں

تمام قبر میں ہے روشنی مثالِ فلک ۔۔۔ ہم اپنا داغِ جگر آفتاب سمجھے ہیں
یہ نقشِ کفشِ رسولِ خدا ہے جلوہ نما ۔۔۔ جسے سپہر پہ سب آفتاب سمجھے ہیں
انیسؔ مخمل و دیبا سے کیا فقیروں کو ۔۔۔ اسی زمین کو ہم فرشِ خواب سمجھے ہیں

—— ۲ ——

اودھ اپنی گنگا جمنی تہذیب، اخلاق و کردار، نفاست و نزاکت اور قومی یک جہتی کا مسکن رہا ہے۔ اس کلچر کو یہاں کے روسار کے علاوہ شعرا نے جو مذہب کے اعتبار سے مسلمان نہ تھے اپنایا اور بڑی حد تک کامیاب بھی رہے۔ انیسؔ بھی اسی تہذیب اور ثقافت کے حامی علمبردار تھے اور اپنے مراثی میں اس بات کا خاص خیال رکھتے تھے کہ سامعین کے ذہنوں پر کوئی بار نہ ہو کیونکہ ان کے سامنے ہر مکتبِ فکر کے افراد موجود ہوتے تھے۔ انھیں رواداریوں کی بدولت ہمیں ایک پاکیزہ معاشرہ ملا تھا، جس پر آج بھی ہم فخر کرتے ہیں۔ میری نظر سے میر انیسؔ کے عزیز شاگرد سید آغا میر متخلص بہ ثباتؔ فیض آبادی[1] کے ذخیرۂ مراثی میں بعض ایسے مرثیے گزرے جن کے متعدد بند میر صاحب نے نظری کر دیے۔ ان میں بعض ایسے بھی مراثی ہیں جو نا معلوم وجوہ کی بنا پر طبع نہ ہو سکے اور ایک صدی سے زائد عرصہ گزرنے کے بعد آج تک حتمی طور پر یہ فیصلہ نہ کیا جا سکا کہ انیسؔ نے اپنی وفات ۱۰ دسمبر ۱۸۷۴ء تک کتنے مرثیے نظم کیے۔ وہ اپنے ایک سلام میں فرماتے ہیں ؎

مقبرہ قدیم جو میر مونسؔ کی وفات کے بعد میر نفیسؔ کے تعاون سے تعمیر ہوا تھا اب اس کی جگہ یادگار انیسؔ کمیٹی لکھنؤ نے جدید تعمیر کی ہے۔

فیضِ غمِ حسینؑ سے ہوتے ہیں اے انیسؔ
ہر سال ایک حال کے دفتر جدا جدا

انھوں نے اپنے مراثی کے بارے میں اپنے ایک شاگرد میر سلامتؔ رضوی ساکن مفتی گنج لکھنؤ سے پوچھا تھا: "اے بھئی سلامتؔ تم نے عون و محمد کے حال کے کتنے مرثیے جمع کیے ہیں۔ میر سلامت علی۔ پندرہ مطلعے پڑھ کر سنائے۔ کچھ سکوت کے بعد انیسؔ نے مطلعے ...

---

[1] میر قادر علی فیض آبادی کے فرزند آغا میر متخلص بہ ثباتؔ میر انیسؔ کے عزیز شاگرد تھے۔ ثباتؔ کے بارے میں میرے دادا میر عارفؔ اپنی ڈائری میں رقمطراز ہیں "آغا میر شاگرد خادم میر انیسؔ" وہ یہ بھی بیان کرتے تھے کہ میر انیسؔ اکثر اپنے بیٹوں کے سامنے آغا میر کی خوانندگی کی تعریف کیا کرتے تھے۔ اور نیا مرثیہ نظم کرتے تو پہلے آغا میر سے پڑھوا تے... آغا میر کا پڑھنا انیسؔ سے بہت مشابہ تھا۔" فنونِ سپہ گری سے بھی واقف تھے (مثلاً نیزہ، لیزم، مگدر، بانک وغیرہ) آپ کی شمع زندگی کو ۱۳۰۵ھ میں بیالیس سال ایک مجلس میں زہر دے کر گل کر دیا گیا۔ کربلائے امین الدولہ میں منبر کے آگے سیڑھیوں کے پہلو میں داہنی جانب سپردِ خاک ہوئے۔ بہ طور نمونہ کلام رباعی دستیاب ہو سکی ؎

بادل آ آ کے رو گئے ہائے غضب ۔۔۔ آنسو نایاب ہو گئے ہائے غضب
جی بھر کے حسینؑ کو نہ روئے اس سال ۔۔۔ آنکھوں کے نصیب سو گئے ہائے غضب

آغا میر فیض آبادی کے فرزند سید محمد جعفر مونسؔ و نفیسؔ کے شاگرد تھے۔ انیسؔ کے انتقال کے وقت آپ کی عمر سات سال تھی۔ میر نفیسؔ گھر میں حوض کے اردگرد گھوم گھوم کر اور سلام پڑھنے کی مشق کروایا کرتے تھے۔ اور کبھی لکڑی کے مونڈھے پر بیٹھ جاتے تھے۔ سید محمد جعفر کی خوانندگی کا یہ عالم تھا کہ آخر زمانہ میں وہ اللہ باندی کے امام باڑے میں میر انیسؔ کا یہ مرثیہ 'جب لشکرِ خدا کا علم سرنگوں ہوا' پڑھ رہے تھے، جب اس مقام تک پہنچے ؎

جاگے ہیں رات کے تو نقاہت ہے آشکار ۔۔۔ ڈورے جو سرخ ہیں تو یہ ہے نیند کا خمار
مستانہ ہے یہ طور کہ جھکتے ہیں بار بار ۔۔۔ آنسو ہیں یا یہ صدف میں ہیں یا دُرِ شاہوار
'روتی ہیں فرقتِ شہِ عالی جناب میں ۔۔۔ نرگس کے پھول تیر رہے ہیں گلاب میں'

صرف آنکھوں کے ڈھیلوں کو حرکت دے کر اس انداز سے منظر کشی کی کہ واہ واہ اور سبحان اللہ کی آوازوں سے مجلس گونج گئی اور بار بار اسی بیت کو پڑھوایا گیا۔ آپ کا ۱۹۳۲ء میں انتقال ہوا۔ کربلائے امین الدولہ میں اپنے والد آغا میر ثباتؔ کے پہلو میں سپردِ خاک ہوئے۔ بہ طور نمونہ کلام سلام کا یہ شعر درج ہے ؎

قاسمِ ابنِ حسنؑ جب رن میں گھوڑے سے گرے ۔۔۔ ہو گیا پامال لاشہ خوں میں بھر جانے کے بعد

رج کیے اور پوچھتے رہے کہ یہ تمھارے پاس ہیں، جواب میں سلامت
نے کہا..... نہیں۔ پھر میر انیس نے ان سے کہا کہ، ارے بھئی سلامت
تم کس پھیر میں پڑے ہو، خود ہمیں بھی یاد نہیں کہ ہم نے اب تک
حال میں کتنے مرثیے تصنیف کیے ہیں۔ پھر کچھ سکوت کے بعد
یا، مجھے ابتدا ہی سے عون و محمد کے حال سے زیادہ دلچسپی رہی ہے
فیض آباد سے قیام لکھنؤ تک ان کے حال میں دو سو سے زائد مرثیے
نے تصنیف کیے ...."

اگر میر صاحب کی اس روایت کو صحیح بھی سمجھا جائے تو بہرحال
وں نے اس حال میں کم از کم پچاس ساٹھ مرثیے تو ضرور کہے ہوں
وہ سب ذخیرۂ بے بہا کہاں گیا کسی کو علم نہیں۔ لیکن ذوق و
ق کا موجودہ سلسلہ جاری رہا تو ممکن ہے کہ اس سلسلے میں محققین
کامیابی حاصل ہو جائے۔ ذیل میں انیس کے ایک مطبوعہ مرثیے
وہ حصے دیے جا رہے جو اب تک شایع نہ ہو سکے۔ میرے پاس
نظر مرثیے کا جو مخطوطہ ہے اس میں ۱۳۶ بند ہیں جبکہ مطبوعہ جلد دوم
یہ مرثیہ ۱۱۲ بندوں میں چھپتا رہا ہے۔ یہ مرثیہ انیس کے شاہکا
ں میں ہے۔ اس کا موضوع شہادت امام حسین ہے۔ ان غیر مطبوعہ
دوں میں سے چند بند انیس کی ترتیب کے مطابق بند نمبر کے ساتھ
ج کیے جاتے ہیں ؎

ب قطع ہوئے نخلِ گلستانِ علی کے ۔۔۔ سر کٹ گئے تیغوں سے جوانانِ علی کے
م ہوئے دلدار دل و جانِ علی کے ۔۔۔ عاشق نہ رہے یوسفِ کنعانِ علی کے
خاک اڑنے لگی پنجتنِ پاک کے گھر میں
لوٹا گیا زہرا کا چمن تین پہر میں

(مطبوعہ بند نمبر ۲۵)
ے بھی سیہ دل بھی سیہ ننگ بھی کالے ۔۔۔ تحت الحنکیں باندھے ہوئے آنکھیں نکالے
تو کمر بند میں اور ہاتھوں میں بھالے ۔۔۔ سادات کے سب قافلے کو لوٹنے والے
مانا نہ علی کو نہ رسولِ عربی کو
دنیا کے لیے ذبح کیا آلِ نبی کو

(غیر مطبوعہ بند نمبر ۲۶)
ر کے کلیجے تھے تو فولاد کے تھے قلب ۔۔۔ بدکیش و جفا جو و شقی و دلدالقلب
دجوئی و دین پروری و جرأت فاسلب ۔۔۔ ہر قسم میں تو شیروں کے نجاست میں گئے کلب

....

....

(غیر مطبوعہ بند نمبر ۱۰۰)
اس بات کو سنتے ہی حضرت کو رہی تاب ۔۔۔ تھرا گئے گویا کہ لگا زخم پہ تیزاب
فرمایا کہ کیا بکتا ہے او کافر و کذاب ۔۔۔ تھے بہرِ امامت کے علی گوہرِ نایاب
تو دشمنِ دامادِ رسول دوسرا ہے
بہتان یہ اس شاہ پہ جو دستِ خدا ہے

(غیر مطبوعہ بند نمبر ۱۰۳)
بیعت سے حسن کے بھی ہے آگاہ خدائی ۔۔۔ تھی مصلحت وقت وہ جو کر گئے بھائی
کرتے وہ بھلا کس کے بھروسے پہ لڑائی ۔۔۔ انصار دغا دے گئے سب کچھ نہ بن آئی
دشمن تھا ہر اک دوست تھا منظور بدی تھی
تدبیر رفیقوں نے بگڑ دینے کی کی تھی

(غیر مطبوعہ بند نمبر ۱۰۶)
اس روز یہ ممکن تھا کہ میں جنگ نہ کرتا ۔۔۔ بیٹا اسد اللہ کا روباہوں سے ڈرتا
شمشیر کو میں خون سے کفار کے بھرتا ۔۔۔ نانا ہی کے پہلو میں حسن بھائی کو دھرتا
تابوت سے آئی مجھے آواز حسن کی
للہ حمایت سے رہو باز حسن کی

(غیر مطبوعہ بند نمبر ۱۰۷)
بھائی یہ نہیں وقت لڑائی کا تمھاری ۔۔۔ اس روز لڑو تم یہ نہیں مرضیِ باری
وہ اور ہی دن ہے کہ تمھیں گھیریں گے ناری ۔۔۔ تیغوں سے قلم فوج بھی ہو جائے گی ساری
ملعون تو ہر اک نہر پہ خود بند رہے گا
سادات پہ پانی کئی دن بند رہے گا

(غیر مطبوعہ بند نمبر ۱۰۸)
بیٹا بھی بھتیجا بھی ہر اک جائے گا مارا ۔۔۔ جز عابد بیکس نہ بچے گا کوئی پیارا
تنہائی میں ہووے گا کسی کا نہ سہارا ۔۔۔ کٹ جائے گا عاشور کو تن سے سر تمھارا
نیزے پہ مرے سر کے یہ معراج کا دن ہے
فرمایا تھا جو بھائی نے وہ آج کا دن ہے

(مطبوعہ سے مختلف مقطع بند نمبر ۱۳۶)
خاموش انیس اب کہ ہر سینے میں جگر چاک ۔۔۔ کی ہے تر انداحِ سبطِ شہِ لولاک
حاسد سے نہ کچھ خوف نہ دشمن سے ہو کچھ باک ۔۔۔ نافہم ہے وہ چاند پہ ڈالے جو کوئی خاک
سب مدح کریں نظم کا یہ نظم و نسق ہے
باطل ہے سو باطل ہے جو حق ہے سو وہ حق ہے

★

تسنیم فاروقی
باغ قاضی لکھنؤ

جو زندگی میں سہارے تلاش کرتے ہیں
سمندروں میں کنارے تلاش کرتے ہیں

اداسیوں کے اندھیرے میں ڈوبنے والے
تجھے سحر کے نظارے تلاش کرتے ہیں

وہ بے وفائی کا خوگر ہے ہم وفا کے اسیر
ملے گا کیا اسے بارے تلاش کرتے ہیں

قدم قدم پہ جنھیں دوستوں سے شکوہ ہے
وہ فائدوں میں خسارے تلاش کرتے ہیں

جو دل کے نام پہ کچے گھڑے سے ڈوب گئے
ندی ندی انھیں دھارے تلاش کرتے ہیں

کسی درخت سے میں نے پناہ کیوں مانگی
مرے حریف جو آرے تلاش کرتے ہیں

کھلا ہوا ایسے میں مشکل ہے میکدہ کوئی
مگر چلو کہیں پیارے تلاش کرتے ہیں

یہ خستہ حالی ہوئی ویرانیوں کے باشندے
زمیں پہ رہ کے ستارے تلاش کرتے ہیں

وہ جس سے کھلتے تھے نرگس کے پھول اے تسنیم
ہم اس نظر کے اشارے تلاش کرتے ہیں

چندر پرکاش جوہر بجنوری
۶۔ ریوا بلڈنگ لیڈر روڈ۔
الہ آباد۔۳

جب سے تو برہم ہے پیارے
عشق سراپا غم ہے پیارے

آنکھ تری کیوں نم ہے پیارے
تجھ کو کس کا غم ہے پیارے

وصل کی شب اور ہجر کا عالم
یہ کیسا عالم ہے پیارے

اپنی اپنی سب کو پڑی ہے
کس کو کس کا غم ہے پیارے

اشک مرے اور تیرا دامن
پھول پہ یہ شبنم ہے پیارے

جس دن سے دیکھا ہے تجھ کو
اور ہی کچھ عالم ہے پیارے

تیرے جلوۂ رخ کے آگے
شمع کی لو مدھم ہے پیارے

کیوں نہ اسے آنکھوں میں لگاؤں
تیری خاکِ قدم ہے پیارے

سوزِ مجسم آتشِ پنہاں
دردِ مکمل غم ہے پیارے

اک اک شعر اس تازہ غزل کا
حاصل کیف و کم ہے پیارے

ملکِ سخن میں تیرا جوہر
نازشِ اہلِ قلم ہے پیارے

معین الدین حسن کاکوروی
شفیع منزل ۲۳ تنبھاری لین لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱

لکھنؤ: ماضی اور حال کے آئینے میں

یہ شہر۔ شہرِ نگاراں، یہ دیارِ مہ رخاں و خطۂ سیمیں تناں، یہ چمن گل عذاراں، یہ مطلع فلک خیالاں۔ یہ سوادِ ملاحت آفرینیاں۔ یہ شبستانِ عیش کوشاں۔ یہ صدف گہر ہائے تاباں، یہ بدخشانِ لعل ہائے درخشاں۔ یہ گوشۂ امن نوازاں۔ یہ روضۂ ریاضِ رضواں۔ یہ مسکنِ جگر فگاراں۔ یہ کلبۂ آشفتہ حالاں۔ یہ کامروپ جادوگراں، یہ مامن کفر و ایماں، یہ خراباتِ بلانوشاں، یہ دانش کدۂ ہوش منداں، یہ گلشن صد بہار و بہاراں، یہ پرستان پری رویاں، یہ میکدہ ہائے دہومستاں، یہ کوئے ملامت و ملامتیاں، یہ محفل بذلہ سنجاں۔ یہ قرابۂ عطر عنبر افشاں، یہ دکان جواہر فروشاں، یہ ساحل سبک ساراں، یہ مرغزار شاداب و فراواں، یہ پناہ گاہ سینہ چاکاں، یہ حلب آئینہ سازاں، یہ گنجینۂ ہنرمنداں، یہ مرکز ہمہ یک دستاں، یہ کاخ قمر جبیناں، یہ نشیمن عنادل خوش الحاں، یہ ناصیۂ نصیب عاشقاں، یہ قندیل بزم عیش کوشاں، یہ آئینہ خانۂ حیرت ساماں، یہ خلوت گاہ حور و حوریاں، یہ خواب گاہ نازنیناں، یہ شبستان نغز گویاں، یہ رہ گزار نالہ ہائے ہجراں و پیام ہائے وصل مشتاقاں، یہ عافیت گاہ پناہ گزیناں، یہ حلقۂ کاکل ہائے پیچاں، یہ دائرۂ صوفیان و صافیاں، یہ تجلی گاہ روشن ضمیراں، یہ طرۂ کلاہ کج ادایاں، یہ فانوس شمع ہائے فروزاں، یہ آستان بتان سنگ دلاں، یہ نافۂ مشک آہواں، یہ قیام گاہ نازک دماغاں، یہ گہوارۂ تہذیب باستاں، یہ رقص گاہ رامشگراں، یہ طرب گاہ نغمہ سرایاں، یہ روشِ سرو ہائے خراماں، یہ طلسم خانۂ جادو نظراں، یہ منزل لطف فروزاں، یہ سرچشمۂ آبِ حیواں، یہ جواب گنج شائگاں، یہ حاصل عمر گریزاں، یہ ستائش گاہ سخن سخن وراں، یہ دبستان علم جویاں، یہ خمار خانۂ رند و مستاں، یہ سویدائے قلب پاکاں، یہ مایۂ تسکین آشفتگاں، یہ حجلۂ نو عروساں، یہ خلوت کدۂ خوبرویاں، دیکھئے تو آئینہ حیراں بن جائے۔ برتیے تو سو جان سے نثار ہو جائے۔ اس شہر کی رعنائی اور دلربائی، زیبائی اور خوش ادائی، اس کی اداؤں کا نکھار اس کی چال ڈھال میں نزاکت، قیل و قال کی فصاحت گفتار کی حلاوت، اس کے مزاج کی نفاست ہر پیکر پیکرِ اخلاق تصویرِ تواضع اور شرافت مجسم۔ جدھر نگاہ اٹھا کر دیکھئے ایک سیلاب رنگ و نور، ایک طوفان حسن و جمال ہے کہ امڈا آتا ہے۔ یہ شہر خورشید تمثال بھی ہے اور زہرہ خیال بھی۔ جہاں ہر صنف لطیف عشوہ طراز اور غمزہ نواز "ایک ذرا آپ کو زحمت ہوگی" کا نرم و نازک لہجہ، کیا مجال کہ حفظ مراتب میں ذرا سی چوک ہو جائے علم مجلس میں ذرا سی لغزش ہوئی اور محفل کی محفل کی تیوری پر بل پڑ گئے پہلے آپ پہلے آپ کا اصرار پیہم ذہن میں جودت، خیال میں ندرت باہمی برتاؤ میں متانت بات بات میں ذکاوت، ہر انداز میں ایک سلیقہ، حسن خیال اور حسن عمل میں ایک دل کش توازن تحسین و تعریف کے مواقع پر ہاتھ جوڑ کر ایک خفیف سی جھکی گردن کے ساتھ کہنا "حضور یہ آپ کا حسن خیال ہے ورنہ من آنم کہ من دانم"

بقول شاعر

خدا آباد رکھے لکھنؤ کو پھر غنیمت ہے
نظر کوئی نہ کوئی اچھی صورت آ ہی جاتی ہے

یا زش بخیر ابھی مشکل سے ایک ہی صدی نے کروٹ بدلی ہے، لیکن عہد گزشتہ کے نقوش اب بھی اس شان دار ماضی کی نشان دہی کرتے نظر آتے ہیں۔ اب بھی تصور میں اس عہد کی تصویر ابھرتی ہے۔ کسی گلی میں نکل جایئے کسی کوچے میں چلے جایئے رسیلی بولی کانوں میں رس گھولتی معلوم ہوگی یہاں کی تہذیب ایک رچی ہوئی بانکی ایرانی تہذیب کا نقش ثانی تھی جس میں ہندستانی تمدن کی رواداری اور یکسانیت ساتی اور دل نوازی نے ایک طرفہ شان ایک انوکھی آذابخش دی یہاں اہل علم بھی ہیں اور اہل ہنر بھی، ہزاروں دستکاریاں اور صنعتوں میں طاق۔ یہاں کے امن و سکون کی فضا کا حال سن سن کر نہ معلوم کہاں کہاں سے انتشار و اضطراب گردش روزگار کے ستائے ہوئے قافلے آئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے، میر و سودا، مصحفی، آتش سب یہیں آکر اپنے فن و فن کاری کے جوہر دکھاتے رہے۔ یہاں قدر شناس اور قدر داں امرا نے ان کو سر پر بٹھایا، عوام نے اپنی آنکھوں کا تارہ بنایا، سب کے سب اس کی ملیح شاموں کے سکوت پر ریجھ کر اس کے گن گاتے رہے۔ اس کے تیور کے تیکھے پن اس کے چتون کے بانکپن، اس کی اداؤں کی شوخی اس کے غمزوں کی شرارتوں کو اپنے شعروں میں ڈھالتے رہے وہ اسی عمکدہ میں شراب عشق لنڈھاتے رہے۔ حسن کی تصویروں میں رنگ بھرتے رہے۔ اسی صنم کدہ میں دھونی رماتے رہے آہ اب یہ عہد ماضی کی ایک بھولی بسری کہانی بن چکا ہے اگر پوری تفصیل اس کہانی کی دیکھنا ہو تو رجب علی بیگ سرور اس کی مقفی اور مسجع عبارت کے مزے لوٹیے، جس کا ایک ایک فقرہ ایک ایک جملہ اس دیار رنگ و بو کا آئینہ ہے اگر یہاں کی تاریخ، یہاں کے سلاطین کی زندگی دیکھنا ہو تو شباب لکھنؤ کا مطالعہ کیجیے اگر یہاں کی بیگمات و خواتین کی داستان شب و روز، ان کے مذہبی رسوم، قدیم محل اور حویلیوں کی ہماہمی کا مرقع دیکھنا ہو حسین باغات اور لہلہاتے چمن کی گلگشت کا شوق ہو تو تصدق حسین کے خزینہ معلومات سے استفادہ کیجیے۔ اگر یہاں کی علم مجلس، انواع و اقسام کے لذیذ کھانے، یہاں کی پرتکلف دعوتوں، ملبوسات کی چمک دمک، یہاں کی تفریحوں کا نگاہ تخئیل سے نظارہ کرنا ہو، تو عبدالحلیم شرر کی کتاب گزشتہ لکھنؤ کا مطالعہ کیجیے یہاں کی بے فکری امرا کی ذوق داستان سرائی اور داستان گوئی لطیفے چٹکلے، پہیلیاں، ضلع جگت کا خیال آئے تو اگلے وقتوں کے کچھ بچے کھچے لوگ شاید مل جائیں جو مزے لے لے کر عہد ماضی کی باتیں دہرائیں گے۔ اور سراپا حسرت کا یہ شعر بن جائیں گے۔

مٹ رہی ہیں رفتہ رفتہ دل سے یادیں عیش کی
اب نظر کاہے کو آئیں گی یہ تصویریں کہیں

یہ تو یاد ماضی تھی اب ذرا حال کے لکھنؤ کی نئی پھبن نئی آراستگی ملاحظہ کیجیے۔ اب وہ پرانے آداب مجلس، وہ دل پذیر حسن معاشرت کے نمونے ڈھونڈھنے سے بھی نہیں ملتے۔ ایک طریقہ سلام کو لیجیے۔ ہزار ہا قسمیں ہیں، آداب، تسلیمات کورنش مجرا، بندگی۔ درباری سلام، فرشی سلام سرنگوں ہو کر پیش ذاکی سے ملنے چاہیے تو میزبان اچھا جاتا ہے۔ ملاقات کی لطافت اس رکھ رکھاؤ سے دوبالا ہو جاتی ہے۔ لیکن اب بھی یہ قدیم تہذیب اور معاشرت کے آثار یہاں کی محفلوں میں نظر آجاتے ہیں۔ بذلہ سنجیوں اور دانش وروں کی محفلوں میں قدیم خاندانوں کی روایات میں بھی اس عہد گزشتہ کی جھلکیاں نظر آتی رہی ہیں اب بھی کھنکتے ہوئے فقرے۔ شوخی سے بھرے چلبلے سلیس گفتگو۔ فصیح الفاظ گفتگو میں رمز و کنایے، اشارے لطیف طنز، روتوں کو ہنسانے والے، محفلوں کو گرمانے والے لطیفے اور چٹکلے اب بھی یہاں کی زندگی کو فردوس بداماں بنائے

ہیں بقول شاعر ؎

زباں حال سے یہ لکھنؤ کی خاک کہتی ہے
مٹایا گردش افلاک نے جاہ و حشم میرا

اب بھی جبکہ اس شہر کے رخ جمال پر امتداد زمانہ کی گرد پڑ چکی ہے تب بھی اس کی زندگی میں شرافت اس کی ہر پہلو سے حیات میں دل نوازی اس کی قاتل چتون میں اس بلا کی شوخی ہے کہ دل کا پہلو میں سنبھالنا دشوار ہو جاتا ہے ۔ اس کی ایک ایک ادا میں سو سو اشارے اور اس کے ایک اشارے میں سو سو ادائیں اب بھی اس کے مچلنے کے تبسم میں برق کی رو اور بجلی کے خزانے پوشیدہ ہیں۔ اس کی شاموں کی ملاحت میں شام طرب کے لاکھوں فسانے گنگناتے مچلتے نظر آتے ہیں اب بھی یہ شہر مینو سواد میں ایک طرفہ رونق ہے ۔ گھما گھمی ہے اب بھی یہاں کے بازاروں میں نغمہ خیز و نغمہ آفریں ہنگامے ہیں ۔ یہ شہر نئی عمارتوں سے نئے مرغزاروں سے نئے عیش و طرب کے شبستانوں کو دامن میں لیے بکھرتا جا رہا ہے سنورتا جا رہا ہے نشۂ مسرت سے سرشار ہو کر بہکتا جا رہا ہے بہکتا جا رہا ہے ۔ رچتا جا رہا ہے بچتا جا رہا ہے ۔ ہر شخص کار امروز میں محو فکر فردا سے بے پروا زبان سے یہ کہتا نظر آتا ہے ؎

ہم ترے کشتہ رفتار ہیں کیا ہم کو خبر
کب چھٹکا صور کب لے یار قیامت آئی (امیر)

جب کوئی تازہ وارد شہر گرد غربت سے اٹے ہوئے چہرے کے ساتھ اور دل میں ہوس سیر و تماشا لیے اس شہر میں اول اول قدم رکھتا ہے تو یہ ایک نئی نویلی شوخ حسینہ کی طرح شرمیلی اداؤں البیلے انداز و ناز کے تیر لیے "غریب شہر کو رجھانے" پر چلنے اور تڑپانے کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے اور فن دلستانی کا یہ عالم کہ تیر نظر کے بسمل کو خبر بھی نہیں ہوتی اور ناوک دلبری جگر کے پار ہو جاتا ہے ۔ تیر دلربائی دل میں ترازو ہو جاتا ہے اور وہ بے ساختہ امیر کا ہم نوا بن جاتا ہے ؎

کہاں ہوں گی امیر ایسی ادائیں حور و غلماں میں
رہے گا یاد ہم کو خلد میں بھی لکھنؤ برسوں

اب دلچسپی کے محور بدل چکے ہیں کبھی شام اودھ عبارت تھی مغربی خطے کی رونقوں سے چوک کی پتلی گھومتی گھماتی گلیاں ۔ چکر کھاتے اور چکرا دینے والے کوچے نغمہ و رقص سرود و ربط کو دامن میں چھپائے دعوت نظر و نظارہ دیتے تھے ۔ اب وہاں حسن لب بام کی جلوہ طرازی خواب فراموش ہو چکی ہے ۔ اب حضرت گنج کی نئے فیشن کی چوڑی سڑکیں ہیں اس شاہراہ پر گامزن ہونے کے لیے نئے آداب و قواعد ہیں، انگرکھوں اور اچکنوں کی جگہ موٹ بوٹ اور بش شرٹ نے چھین لی ہے، زمانہ جب بدل جاتا ہے تو زندگی کا روپ رنگ بھی بدل جاتا ہے ۔ بقول آرزو ؎

زمانہ جب بدل جائے تو تا ناز اس کے نہ کیوں بدلیں
نئے ہوتے ہیں پیغمبر نیا پیغام ہوتا ہے

ہر چند زمانہ گزشتہ کی سبک، شان دار اور ذوق جمالیات کو تسکین دینے والی عمارتیں اب چند ہی باقی رہ گئی ہیں لیکن نئی عمارتیں بھی جاذب نظر ضرور ہیں ۔ اگر قیصر باغ میں حوض کے فوارے خاموش ہیں تو ہوٹل کلارک کے چھوڑے ہوئے فواروں کی رنگ برنگی پھوار مضطرب بے چین دلوں کے لیے فرحت قلب کے سامان مہیا کر رہی ہے ۔ ہوٹل کلارک کی اونچی کئی منزلہ عمارت چھتر منزل کے پہلو بہ پہلو ایک نئی تہذیب کا نشان بن کر ماضی پر خندہ زن ہے ۔ شہید تکی یادگار میں ایک مینار شام کی سلونی فضا میں عہد آزادی کے سورماؤں کو خاموش خراج تحسین پیش کرتا نظر آ رہا ہے ۔ شہر کی لطافت اب بھی وہی ہے جو پہلے تھی صرف انداز آرائش خم زلف اور آراستگی رخ و رخسار کا طریقہ بدل گیا ہے ۔

اب بھی امین آباد کے چائے خانے دانش وروں اور شعراء کے مرکز ہیں جہاں جدید شاعری پر تنقید اور قدیم

(باقی صفحہ ۲۹ پر)

غزلیں

محبوب راہی۔ نزدیک گلزاری مسجد
ڈاکخانہ بارسی ٹاکلی۔ ضلع اکولہ۔
(مہاراشٹر)

ناپ رہے ہیں دھن دولت سے جذبوں کی گہرائی لوگ
کیسے ناداں کتنے بھولے بھالے ہیں یہ بھائی لوگ

نفرت کا تو انساں کی فطرت سے ازلی رشتہ ہے
پاٹ سکیں گے کیونکر آخر نفرت کی ہر کھائی لوگ

سڑکوں سڑکوں گلیوں گلیوں بھیڑ بھاڑ ہے لوگوں کی
گھوم رہے ہیں شہروں شہروں ساتھ لیے تنہائی لوگ

گرد کدورت سے ہیں دلوں کے آئینے دھندلے دھندلے
پھرتے ہیں چہروں پر لے کر چاہت کی رعنائی لوگ

تم جو دن کو رات کہو گے کوئی کیوں کر مانے گا
اندھے ہیں لیکن رکھتے ہیں اتنی تو بینائی لوگ

جیسے کوئی صحراؤں میں نخلستاں کی کھوج کرے
ڈھونڈ رہے ہیں انسانوں کی دنیا میں اچھائی لوگ

کوئی ان کو دانا سمجھے یا کوئی نادان کہے
اپنی ہر نادانی کو بھی کہتے ہیں دانائی لوگ

جہاں تہاں یوں عقل و حکمت کے نکتے مت بیاں کرو
ورنہ اک دن تم کو راہی سمجھیں گے سودائی لوگ

مومن غازی پوری۔
ایس ۱۳۰/۲/۶، اردلی بازار
وارانسی۔ ۲۲۱۰۰۲

بے ضبطِ غمِ دوست تری حد میں رہا ہوں
امڈا کبھی اگر دل سے تو پلکوں پہ رکا ہوں

دنیا یہ نہ سمجھے کہ یونہی ڈوب گیا ہوں
تا آخرِ دم شورشِ طوفاں سے لڑا ہوں

اب ان کی جفاؤں سے شکایت ہے نہ شکوہ
مجرم ہوں محبت کا وفاؤں کی سزا ہوں

کل صبح کرن بن کے بکھر جاؤں گا ہر سو
میں مصلحتاً شام کے آنچل میں چھپا ہوں

تم ساز پہ چھیڑی ہوئی غالب کی غزل ہو
میں شاخ سے گرتے ہوئے پتے کی صدا ہوں

تو ایک حقیقت ہے حجابات میں گم ہے
میں جستجوئے شوقِ نظر فکرِ رسا ہوں

تقریرِ مسلسل تھا کبھی طولِ بیاں تھا
دو لفظوں میں اب قبر کے پتھر پہ لکھا ہوں

اب ماہرِ تاریخ مجھے ڈھونڈ نکالیں
اک عہد کی تہذیب ہوں مٹی میں دبا ہوں

مومن میں پئے امید فصیلوں پہ چڑھا تھا
پھسلا ہوں تو مایوس نشیبوں میں گرا ہوں

باوا کرشن گوپال مغموم
۳۴۴، سکٹر ۲ ڈی چنڈی گڑھ یو ٹی

قطعات

(۱)

نیلا نیلا یہ آسماں، کیا خوب! انجم و ماہ و کہکشاں، کیا خوب!
چاندنی، سبزہ، آبجو، گلِ تر منظرِ صحنِ گلستاں، کیا خوب!

(۲)

چھت سے آنگن میں دھوپ اتر آئی وہ ابھی محوِ استراحت ہیں
بند پلکیں، یہ حسن، یہ زلفیں دید کی بے پناہ جنت ہیں

(۳)

"وقت" ہے مست اور بے پروا کب کسی کا یہ ساتھ دیتا ہے
ایک لمحے کی بھی مسرت کا آدمی سے خراج لیتا ہے

(۴)

دور کشتی میں ایک مانجھی نے درد انگیز گیت چھیڑا ہے
تڑپ اٹھتا ہوں بر لبِ دریا میرے زخموں کو یوں ادھیڑا ہے

(۵)

غم کی یورش سے مر نہیں جاتیں اور بھی کچھ جوان ہوتی ہیں
آرزوئیں عذابِ جاں ہیں مگر یہ محبت کی جان ہوتی ہیں

(۶)

اوٹ میں مغربی پہاڑوں کی چھپنے والا ہے مہرِ عالم تاب
چمک اٹھا ہے چیڑ کا جنگل بہتے پانی میں کھل اٹھے ہیں گلاب

(۷)

سفرِ فن ہے کس قدر دشوار جیسے صحرا ہے پُر خطر، پُر خار
ہر قدم پر ہیں ٹھوکریں لاکھوں ہمتِ دل ہے پھر بھی کوہ وقار!

(۸)

ماضی و حال آئینہ اس پر روشن اس پر ہے چہرۂ فردا
قلبِ شاعر کے ماسوا ہے کون ایک عکاسِ کائنات نما!

(۹)

چاندنی کی یہ نرم نرم پھوار اڑتے پھرتے ہیں موتیا کے ہار
رات نے بیخودی کے عالم میں چھیڑ رکھا ہے خامشی کا ستار!

(۱۰)

زیبِ ساحل ہیں ناریل کے درخت سامنے دور تک سمندر ہے
دھوپ میں کشتیاں مچھیروں کی ایک شہکارِ فن یہ منظر ہے!

(۱۱)

اس کا مقصد ہے حسن کا عرفان شعر گوئی کا فن فضول نہیں
قدر کرتے ہیں اس کی اہلِ نظر شعر اک جنسِ نا قبول نہیں

(۱۲)

وہی تیور، وہی سراپا تھا میری تخئیل کا ہیولا تھا
خواب سے چونک کر جو میں اٹھا تو نہ تھی، وہ تو تیرا سایا تھا!

(انشائیہ)

عبدالحبیب سہالوی
دانش محل امین آباد لکھنؤ

جگت باجی

ایسی خواتین بڑے کام کی ہوتی ہیں جو گھر گرہستی کے جھمیلے میں نہیں پڑتیں اور اپنا سارا وقت خلقِ خدا کی خدمت میں صرف کر دیتی ہیں۔ ایک قصبے میں ایک خاتون تھیں وہ گھر گرہستی سے خود نہیں بھاگیں بلکہ قدرت نے انھیں بھگا دیا۔ مطلب یہ کہ اُن کا بیاہ بھی ہوا بچے بھی ہوئے مگر قسمت کی خوبی سے میاں نکھٹو ملے تھے۔ وہ بچے تو بڑی مستعدی سے پیدا کرتے تھے مگر پیسہ پیدا کرنے سے کوسوں دور بھاگتے تھے اسی لیے انھوں نے بچے پیدا کرنے کا کام اپنے ذمہ اور ان کے پالنے پوسنے کا کام سسرال والوں پر ڈال دیا تھا اللہ جھوٹ نہ بلائے ان کی بیوی بیاہ کے بعد قسم کھانے کے لیے صرف ایک مرتبہ سسر کے انتقال پر تعزیت کے لیے سسرال گئی تھیں اور کھڑی سواری واپس آئی تھیں۔ تھوڑے دنوں تک نکھٹو میاں سے لشتم پشتم انھوں نے نباہ کیا لیکن گاڑی زیادہ دنوں نہ چل سکی اور چھٹم چھٹا ہو گیا۔

دو بچے باپ کی لاپروائی سے بیزار ہو کر بچپن ہی میں اللہ کو پیارے ہو گئے تھے، دو لڑکے جو بچ گئے تھے انھیں ددھیال والوں نے بچپن سے لے لیا تھا اور یہ خاتون بیاہ اور بچوں کے باوجود گھر گرہستی کے جھمیلے سے بچی ہی بچائی نکل گئیں۔ ایسی بات نہیں کہ وہ کاہل اور کام چور تھیں حقیقت تو یہ ہے کہ وہ بڑی مستعد اور کام کاجو تھیں، یہی وجہ ہے کہ رشتے ناتے، پاس پڑوس، جان پہچان کسی کے یہاں بچہ ہونے والا ہوتا تو ولادت سے دو ایک دن پہلے باجی کو بلا لیا جاتا وہ گھر میں تو باجی کہی جاتی ہی تھیں اس کے علاوہ قصبے کے سبھی لوگ محبت میں انھیں باجی ہی کہتے تھے اس طرح وہ جگت باجی ہو گئی تھیں۔ کچھ اپنا تجربہ اور کچھ اپنے حکیم بھائی سے پوچھ پاچھ کر زچہ بچہ کی دوا دارو اور دیکھ ریکھ میں ایسی ماہر ہو گئی تھیں کہ دائیاں بھی اُن سے صلاح لیتیں اور وہ بڑی خوشی سے صلاح دیتیں۔ اُن کی کمزوری تعریف تھی وہ تعریف کے علاوہ کسی چیز کی بھوکی نہ تھیں۔

اس زمانے میں نہ اتنے زیادہ اسپتال تھے اور نہ لوگ اسپتال جانے کے عادی۔ دیہات میں لوگوں کو اسپتال کے نام سے بخار چڑھ آتا تھا۔ ایک تو زنانہ اسپتال سوائے بڑے شہروں کے چھوٹے شہروں اور قصبوں میں خال ہی خال تھے دوسرے وہ خواتین جن کے لیے ایک گھر سے دوسرے گھر جانے کے لیے ڈولی دروازے پر لگائی جاتی تھی وہ بھلا بچے کی ولادت کے سلسلے میں باہر کاہے کو جائیں۔ اس زمانے میں قصبے دیہات میں سنور کا عجیب نقشہ ہوتا تھا جاڑے ہوں یا گرمی کا موسم زچہ کو ہمیشہ بند جگہ پر لٹایا جاتا تھا۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ باجی کی سب سے بڑی بہن کے جب پلوٹھی کا بچہ پیدا ہوا تو بڑی دھوم دھام ہوئی۔ ہم بھی امی کے ساتھ دیکھنے گئے تھے۔ باجی کی بہن کا پلنگ بڑے تدرے کے بغل والی صحنچی میں بچھا تھا، صحنچی کا بڑا در جو آنگن کی طرف تھا اس پر موٹے ٹاٹ کی پٹیوں کا لمبا سا پردہ پڑا تھا اور تین چھوٹے در جو تدرے کی طرف تھے ان میں تولی رنگ کا

پردہ جس کے کنارے پر نواڑ لگی تھی بندھا ہوا تھا۔ مئی کا پہلا
ہفتہ تھا ابھی خاصی گرمی پڑنے لگی تھی لیکن اس کے باوجود
بڑے در کے سامنے لکڑی کا ایک بڑا کندہ دن رات برابر
سلگتا رہتا تھا۔ زچہ بچہ کو برے سائے سے بچانے کے لیے
دیواروں پر لکھے ہوئے تعویذ چسپاں تھے، سرہانے کی طرف
پلنگ کی پٹی میں تعویذ بندھے ہوئے تھے اس کے علاوہ زچہ
کے بازو اور گلے میں موم جامہ کیے ہوئے تعویذ لٹکتے
رہتے تھے۔ ایک خاص چیز جو زچہ کے پلنگ پر ہمیں نظر
آتی تھی وہ بندر کی کھوپڑی تھی جس پر کڑوا تیل چپڑا
ہوا تھا۔ مغرب کی اذان ہوتے ہی زچہ خانے میں ایک بزرگ
کے مزار سے خاص طور سے منگائے ہوئے لوہے کے چوگشیا چراغ کی
بتیاں کڑوا تیل ڈال کر جلا دی جاتیں، زچہ خانے کے پاس
عشاء کی نماز کے بعد مولوی صاحب روزانہ دستک دینے
آتے۔ رات کے وقت زچہ خانے میں نادن، بکسورن کے
علاوہ گھر کی ایک عورت بھی رہتی تھی۔ رات بھر باری باری
ایک عورت کا جاگتے رہنا ضروری تھا یہ سب احتیاطی تدبیریں
بچے کو جھوگو سے بچانے کے لیے کی جاتی تھیں۔

ہماری باجی اس زمانے کے زچہ خانے کے ان تمام
لوازمات سے اچھی طرح واقف تھیں جہاں جاتیں اگر کوئی
کمی دیکھتیں اسے فوراً پورا کراتیں۔ عام طور پر بچے کی نال
بکسورن کاٹتی تھی لیکن باجی نے یہ فن بھی سیکھ لیا تھا، اگر
بکسورن یا دائی کے آنے میں دیر ہوتی تو یہ آستین چڑھا کر
نال کاٹنے کے لیے بھی تیار ہو جاتیں۔ بچے کے گھٹی کا نسخہ
انھیں زبانی یاد تھا اسی طرح زچہ کے پیٹ کے صفائی کے
لیے پلائے جانے والے کاڑھے کی تیاری میں بھی یہ ماہر تھیں،
زچہ بچہ کی دوا دارو اور ٹوٹکے ٹونے ان سب باتوں
میں باجی کو حرف آخر سمجھا جاتا تھا۔ اسی طرح شادی کے موقع پر
لڑکی کے مانجھے بیٹھنے سے پہلے ہی باجی کو بلا لیا جاتا تھا۔
اس زمانے میں لڑکی آج کل کی طرح شادی [illegible]
پہلے تک جہیز کی تیاری اور خرید و فروخت میں نہیں لگی رہتی تھی
بلکہ وہ کم سے کم دو ہفتے پہلے گھر کے ڈیرے میں مانجھے بٹھا دی
جاتی تھی اور وہیں اس کے کھانے پینے اٹھنے بیٹھنے کا مکمل
انتظام کر دیا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی ہجولیاں ہی
رہتی تھیں، گھر کی بڑی بوڑھیاں وہاں جانے سے پرہیز کرتی
تھیں کیوں کہ شرمیلی بنو اپنے بزرگوں کو دیکھ کر شرم سے
پانی پانی ہو جاتی تھی۔ مانجھے میں لڑکی کے بدن پر ملنے کے
لیے ابٹن باجی ہی کے مشورے سے نارنگی کے چھلکے وغیرہ
ملا کر بڑے اہتمام سے تیار کیا جاتا اور ابٹن ملائی کی رسم
ادا کی جاتی۔ لڑکی کے مانجھے بیٹھتے ہی عزیزوں اور دوستوں
کے یہاں سے مانجھا آنے کا سلسلہ شروع ہو جاتا اور آخر تک
جاری رہتا۔ مانجھے کو ٹھکانے سے رکھنے اور اس کے مناسب
طریقہ پر لڑکیوں میں تقسیم کرنے کا کام بھی باجی ہی کے سپرد
ہوتا۔ مانجھے میں جو لڑکیاں رہتیں انھیں بھی مانجھے کے گانے
معلوم کرنے کے لیے باجی کی تلاش رہتی۔ ایک انار صد
بیمار والی مثل تھی ہر موقع پر باجی ہی کی پکار ہوتی، انھیں
اتنی کہاں فرصت کہ وہ بیٹھ کر گیت گائیں، وہ زبانی گیت کا
ایک آدھ بول بتا دیتیں لیکن لڑکیاں پیچھے پڑ جاتیں میری
باجی اللہ آپ شروع کر دیجیے پھر ہم اسی ڈھنگ سے گاتے
رہیں گے۔ باجی لڑکیوں کا دل نہ توڑتیں اور ڈھولک لے کر
"بنو جھجکی جھجکی جیو سسرال گلیاں" ایسے مزے میں گاتیں
کہ گھر بھر کی عورتیں اکٹھا ہو جاتیں اور سب کام ٹھپ ہو جاتا
یہ دیکھ کر وہ ڈھولک چھوڑ چھاڑ اٹھ کھڑی ہوتیں۔

باجی بڑی نیک دل تھیں کسی کو تکلیف میں دیکھتیں
تو تڑپ جاتیں اسی لیے دن ہو یا رات جب بھی کوئی
باجی کو بلا بھیجتا باجی کبھی انکار نہ کرتیں۔ دن میں تو انھیں
بلانے کے لیے ڈولی آتی تھی لیکن رات کو یہ خود چادر
اوڑھ کر چل کھڑی ہوتیں گھر والے ناک بھوں چڑھاتے،
طعنے تشنے سے بھی کام لیتے کوئی کہتا "سارے جہاں کا درد

دنیا کے جگر میں ہے،" کوئی کہتا باجی تو فالتو بیگم، ہو گئی ہیں کسی کے یہاں شادی ہو، غمی ہو کہیں بچہ پیدا ہو یا کوئی بیمار ہو باجی کا جانا ضروری ہے۔

باجی صرف دوا دارو ہی نہیں جانتی تھیں بلکہ شادی بیاہ کے موقعوں پر پکوان پکانے میں بھی اپنا جواب نہ رکھتی تھیں۔ ان کے ہاتھ کے پکائے گلگلے تو قصبے بھر میں مشہور تھے۔ بری کے جوڑے ٹانکنا بڑی مہارت کا کام سمجھا جاتا تھا چنانچہ یہ کام باجی کی مدد کے بغیر کہیں بھی انجام نہ پاتا۔ شادی کے موقعہ پر ہونے والی بھانت بھانت کی رسموں کے بارے میں باجی کی بات سند کی حیثیت رکھی تھی تیل، بین، حذ ارات، منھ دکھائی، سلام کرائی، جوتا چرائی، ڈولا رکائی غرض ہر موقعہ پر باجی سے صلاح لینا ضروری سمجھا جاتا تھا اور انہی کی رائے سے نیگ دیا جاتا تھا۔ لڑکی کے ساتھ سسرال جانے کا جب سوال اٹھتا تو لڑکی کی ماں یہی چاہتی کہ کسی طرح باجی جانے کے لیے راضی ہو جائیں کیونکہ باجی ہر معاملے سے خوش اسلوبی کے ساتھ نپٹنے کی پوری صلاحیت رکھتی تھیں۔ ہنس مکھ اور ملنسار ایسی تھیں کہ جہاں جاتیں گھل مل جاتیں اور کوئی الجھن نہ پیدا ہونے دیتیں۔ ساتھ ہی ساتھ جواب دینے سے بھی نہ چوکتیں لیکن اس طرح ہنس کر جواب دیتیں کہ کسی کو کوئی تلخی محسوس نہ ہوتی۔

باجی کو شادی بیاہ میں شریک ہونے کا شوق اس لیے تھا کہ وہ گانے کی بڑی رسیا تھیں، میراثنیں جب کوئی اچھی غزل گاتیں تو یہ جھوم جھوم جاتیں اور دل کھول کر پیسے دیتیں۔ جس محفل میں یہ ہوتیں میراثنوں کی بن آتی۔ ان کی دیکھا دیکھی دوسری خواتین کو بھی دینا پڑتا۔ باجی خود بھی بہت اچھا گا لیتی تھیں، ان کی آواز میں بڑا درد تھا جب وہ درد بھری آواز میں گاتیں تو لوگ دل تھام لیتے۔ باجی کا دل چوٹ کھایا ہوا تھا، اُن کی شادی مرضی کے مطابق نہیں ہوئی تھی وہ جہاں چاہتی تھیں وہاں نہ ہو سکی۔ یہ داغ وہ زندگی بھر دل میں لیے لوگوں کی خدمت کرتی رہیں اور گھر والے انھیں فالتو بیگم کہہ کر ان کا مذاق اُڑاتے رہے۔

باجی کی صورت شکل بہت اچھی نہیں تو بری بھی نہ تھی۔ پتلی اونچی نوکدار ناک، لمبی آم کی قاش کی طرح رسیلی آنکھیں، سونے جیسا دمکتا سا نولا سلونا رنگ اوسط قد، چھریرا لچکیلا جسم چار بچوں کی ماں ہونے کے باوجود کنواری لڑکی معلوم ہوتی تھیں، سونے پر سہاگا درد بھری سریلی آواز۔ باجی کی آواز میں یہ درد کہاں سے آیا یہ ایک دکھ بھری کہانی ہے۔ باجی کے گھر والے کوئی غریب نہ تھے اچھے کھاتے پیتے چھوٹے زمیندار تھے۔ باپ پرانے زمانے کے وضع دار آدمی تھے۔ مہمان نوازی کا یہ عالم تھا کہ جب تک ٹرین کا وقت نکل نہ جاتا کھانا نہ کھاتے کہ شاید کوئی مہمان آ رہا ہو۔ شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا کہ ان کے دستر خوان پر کوئی مہمان نہ ہوتا اسی لیے قصبے میں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے حالانکہ قصبے میں ان سے بڑے زمیندار تھے۔ اُن کے ایک دُور کے عزیز قصبے کے سب سے بڑے زمیندار تھے۔ یوں تو اُن کے کئی لڑکے تھے لیکن سب سے بڑا لڑکا جاوید۔ سخاوت میاں یعنی باجی کے والد سے بہت مانوس تھا۔ وجہ یہ بھی کہ سخاوت میاں کو شعر و شاعری کا شوق تھا اور جاوید کو بھی بچپن سے شعر و ادب سے لگاؤ تھا اس لیے سخاوت میاں کے یہاں اس کا آنا جانا بہت تھا۔ باجی یعنی نجمہ اور جاوید ہم عمر تھے اور ساتھ کے کھیلے تھے، دونوں کے گھر بھی قریب ہی قریب تھے۔ جاوید کے گھر کا لکھوری اینٹ کا بنا ہوا دو منزلہ پھاٹک اس تالاب کے سامنے کھلتا تھا جو دونوں گھروں کے درمیان واقع تھا۔ نجمہ کی تعلیم اگرچہ گھر ہی پر ہوتی تھی لیکن اس کے باذوق والد کے یہاں کتابوں کا بہت اچھا ذخیرہ تھا۔ نجمہ نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا تھا۔

ایک دن دوپہر کے وقت نجمہ اپنے گھر کی اٹریا پر اکیلی لیٹی ہوئی یہ غزل گنگنا رہی تھی ؎

پرسشِ غم سے بھلا چارۂ غم کیا ہوگا
اس تکلف سے تو زخم اور بھی گہرا ہوگا
کر دیے کس نے یہ گل جاگتی آنکھوں کے چراغ
تیری خوشبو بدن کا کوئی جھونکا ہوگا
درد جاگ اٹھا ہے تو دینے لگے بجھتے چراغ
دل کے زخموں کو تری یاد نے چھیڑا ہوگا

ابھی وہ یہ غزل پوری بھی نہیں کر پائی تھی کہ اس نے سنا کہ کوئی کہہ رہا ہے:

دل لرزتا ہے ہوا چیخ رہی ہے جاوید (مضطر)
پھر کسی شاخ سے پتہ کوئی ٹوٹا ہوگا

اور جاوید ٹوٹے ہوئے پتے کی طرح آکر گر پڑا جاوید کو دیکھ کر نجمہ خوش بھی ہوئی اور گھبرائی بھی۔ اس نے گھبرا کر پوچھا آپ اس وقت یہاں کیسے آگئے، جاوید نے بتایا کہ نکہت کو یکدم بخار چڑھ آیا۔ والدہ نے کہا بخار دیکھ لو مگر معلوم ہوا کہ گھر کا تھرمامیٹر ٹوٹ گیا ہے۔ یہاں تھرمامیٹر لینے آیا تھا کہ تمہاری دلکش آواز سن کر ادھر کھنچتا چلا آیا۔ نجمہ نے شوخی سے کہا تو یہ کہیے کہ آپ خشک پتے کی طرح اڑتے ادھر چلے آئے مگر آپ کو معلوم ہونا چاہیے یہ گھر ہے جنگل نہیں۔ جاوید نے کہا جنگل نہ ہونے کے باوجود کوئل کوک رہی تھی۔ نجمہ نے ذرا پیشانی پر بل ڈال کر کہا میں کالی ضرور ہوں لیکن اتنی بھی نہیں کہ کوئل کہا جائے۔ ابھی دونوں میں یہ معاملہ ہو ہی رہا تھا کہ نجمہ کے چھوٹے بھائی یوسف نے آکر کہا آپ کو امی بلا رہی ہیں۔ نجمہ جلدی سے نیچے اتر گئی تھوڑی دیر بعد جاوید آیا اور اس نے نکہت کے بخار کا حال بتایا، نجمہ کی امی نے میز پر سے تھرمامیٹر اٹھا کر دے دیا اور کہا تم چلو میں ڈولی منگوا کر ابھی آتی ہوں۔

ادھر نجمہ اور جاوید کی محبت پروان چڑھ رہی تھی اُدھر جاوید کے والد چودھری الطاف اپنے بیٹے کے لیے کسی بڑے گھر کی لڑکی لا کر جوار میں اپنی ناک اونچی کرنے کی فکر میں تھے۔ محبت پر مصلحت کو فتح حاصل ہوئی اور جاوید والد کی مخالفت کی جرأت نہ کر سکا کیونکہ چودھری صاحب کا غصہ مشہور تھا وہ عاق بھی کر سکتے تھے۔

جب چودھری الطاف کے پھاٹک پر شادی کی خوشی میں شہنائی بج رہی تھی اس وقت نجمہ اپنی اٹریا پر لیٹی یہ اشعار پڑھ رہی تھی اور رو رہی تھی ؎

کی جفا ایک ستمگر نے وفا کے بدلے
زہر کا جام ملا مجھ کو دوا کے بدلے
جس کے سینے میں دھڑکتا تھا کبھی دل میرا
آخرکار وہی بن گیا قاتل میرا
اپنے وعدوں کا محل اس نے جو ڈھایا ہوگا
کیا مرا پیار اسے یاد نہ آیا ہوگا

★

لکھنؤ ماضی و حال کے آئینے میں — صفحہ ۳ کا بقیہ

شاعری پر بکھرے ہوئے ہیں۔ انسانوں کا ایک سیلاب ہے۔ کبھی گھٹتا ہے کبھی بڑھتا ہے۔ زندگی ایک بحرِ ناپیدکنار ہے جس میں موجیں اٹھتی ہیں اور بکھرتی ہیں حباب اٹھتے ہیں اور ٹوٹ جاتے ہیں۔ دیر و حرم شام کو گلے ملتے نظر آتے ہیں۔ آوازِ اذاں میں ناقوس کی آواز فضا میں ہم آہنگ ہو کر اتحاد و اتفاق اور بھائی چارے کی تلقین و تعلیم دیتی ہے کہ یہ شہرِ شرافت۔ وضع داری اور محبت کا امین اور پیامبر آج سے نہیں برسوں سے رہا ہے اس نے محبت ہی کو شعار بنائے رکھا اور آج بھی یہ ہندوستان کے لیے ایک مینارہ نور و ہدایت ہے اور یہ پیغام دیتا رہتا ہے کہ ہم آہنگی، خیر سگالی، انسان کی خیر خواہی روحِ انسانیت ہے جس کے دامن میں زندگی جنت بنتی ہے اور جس سے حیات توانائی حاصل کرتی ہے، پھولتی اور پھلتی ہے۔

★

شمس تبریز خاں
رام چرن پارک، مکارم نگر، لکھنؤ

مولانا محمد علی جوہر کی شاعری

رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر کی وفات پر انگریزی کے مشہور ادیب و مورخ H.G WELLS نے انھیں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ "وہ نپولین کا دل، برک کی زبان اور میکالے کا قلم رکھتے تھے" یہ مقولہ جہاں ان کی عبقری شخصیت پر صادق آتا ہے، وہیں ان کی شاعری پر بھی پورا اترتا ہے۔ شاعری لطیف جذبات و خیالات اور اظہار و ابلاغ پر قدرت کے اجتماع کا نام ہے تو محمد علی جوہر کے یہاں اس کی کمی نہیں تھی، وہ فطری طور پر ایک عظیم قائد و رہنما ہونے کے ساتھ ساتھ ممتاز شاعر اور صحافی بھی تھے۔ ان کی شخصیت کی تشکیل میں شاعری اور صحافت کو بہت کچھ دخل تھا۔ انھوں نے رام پور کے اس ادبی ماحول میں آنکھیں کھولیں جہاں دلّی و لکھنؤ کے آسمانِ شعر و ادب کے ٹوٹے ہوئے تارے چراغِ سحری اور ستارۂ صبح کی طرح جگمگا اور جھلملا رہے تھے۔ اور ایک طرح سے اپنی آخری بھڑک دکھلا رہے تھے۔

ایک بار مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم نے مولانا محمد علی سے ان کی شاعری کے پس منظر کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے ۱۴ راگست ۱۹۱۷ء کو چھنڈواڑہ جیل سے ایک مفصل خط میں لکھا کہ:

"آپ میری شاعری کا کیا پوچھتے ہیں، بچپن میں تو بہت سے سامان ایسے بہم ہو گئے تھے کہ میں آج زلف و ابرو کی تعریف میں خاصے شعر نکال لیا کرتا ہوں۔ رام پور میں بیں اس زمانے میں پیدا ہوا تھا جب گھر گھر مشاعرہ ہوتا تھا، داغ، امیر، تسلیم، جلال، عروج، دہلی اور لکھنؤ کے آسمانوں کے ٹوٹے ہوئے ستارے سب رام پور کے آسمان سے نور افشانی کر رہے تھے۔ خود میرے خاندان میں بھی شعر گوئی کا شوق ہوا۔ تین چار عزیز استاد داغ کے شاگرد ہوئے جن میں میرے ایک حقیقی بھائی ذوالفقار علی خاں صاحب گوہر اور میرے چچازاد بھائی اور خسر عظمت علی خاں صاحب اور ان کے بھائی حافظ احمد علی صاحب شوق شامل تھے۔ گھر پر باہا مشاعرہ ہوا، پھر داغ کو نواب کلب علی خاں صاحب مرحوم نے جن کی نظر ہمیشہ کفایت شعاری پر رہتی تھی، از راہ پرورش سرکاری اصطبل کا داروغہ بھی کر دیا تھا، تاکہ وظیفہ محض کار بیکاراں کی نظر نہ ہو، یہ میرے مکان کے عقب میں تھا۔ اس لیے روزانہ کی زیارت یوں بھی ہو جاتی تھی .... جناب والا اس کے بعد اگر میں یہ دعویٰ کروں کہ شعر و سخن کی گود میں پلا ہوں تو بیجا نہ ہوگا۔ مگر میرا دعوا تو اس سے بھی بڑھ چڑھ کر ہے۔ سنئے!

میں نہ صرف شعر و سخن کی گود میں پلا ہوں، بلکہ اس کی تو مدبر کودا ہوں، اسے ہاتھی بنا کر پیٹھ پر سوار ہوا ہوں غرض کوئی بے ادبی یا گستاخی باقی نہیں رہی ہے جو میں نے شعر و سخن کی شان میں نہ کی ہو۔

میری پیدائش ۱۸۷۸ء کے اواخر کی ہے، میں نے دس برس کی عمر ہی میں بہت سے لغو و فضول شعر مگر با معنی اور موزوں کہے تھے اور اچھا ہوا کہ اب کسی کو یاد نہیں۔"

اس کے ساتھ ہی مولانا محمد علی کو علی گڑھ کالج کا وہ ادبی ماحول بھی ملا جس میں مولانا شبلی اور مولانا حسرت موہانی وغیرہ جیسے صاحب ذوق شاعر و ادیب موجود تھے اور وہ ان کے ساتھ مل کر شعری صحبتوں میں حصہ لیتے تھے۔ ان کے زبان و بیان کے لحاظ سے ان کا تعلق داغ اسکول سے ہے اس لیے زبان کی سلاست و روانی، روزمرہ محاوروں کے لطف اور بندش کی چستی اور فنی چابکدستی کی بیشتر خوبیاں ان کے کلام میں موجود ہیں لفظی حسن کیساتھ حسنِ معنی اور رمز و مفہوم کے اعتبار سے بھی کلام جو جس قدر منزلت ... تھا وہ اسے حاصل نہ ہوسکا

... ثبوت دیتے ہوئے

... دے ہے اس سے گرمی و

... وافادیت کو سمجھا جائے

... ت میں ایک مردِ مومن

... سرفروشی، ایک محب

... نان دوست کا

... وفراست ایک

... بشعلہ مقالی

... بے تاب عناصر

... یادت، ہے

... ساتھ ساتھ ان کی شاعری میں بھی ہوتا تھا اور اس لیے یہ سب چیزیں ہمارا قومی و ملی سرمایہ ہیں۔

حضرت جوہر کے ابتدائی کلام کے نمونے محفوظ نہیں، دو چار غزلیں ہیں جن سے تغزل کے ایک زبردست امکان کا پتہ چلتا ہے اور شاعر کے خوش آیند مستقبل کی بشارت نظر آتی ہے، چند شعر ملاحظہ ہوں:

کیوں مئے پرست دیکھ کے مدہوش ہوگئے
شیشہ میں مئے بھری تھی کہ اللہ کا نور تھا

کس زور کی لڑائی تھی اللہ رے کشمکش
تھی رات یاس اور دل ناصبور تھا

خوش قسمتی کے آگے جھکایا نہ سر کبھی
اس خانماں خراب کو کتنا غرور تھا

مجھے انکارِ وصلِ غیر پہ کیوں کر نہ شک گزرے
زباں کچھ اور بوئے پیرہن کچھ اور کہتی ہے
یقیں آنے کو تو آجائے تیرے عہد و پیماں کا
تری آنکھ اور بت وعدہ شکن کچھ اور کہتی ہے

یہ ستانے کی نکالی ہے انوکھی ترکیب
ظلم کا نام ستمگر نے حیا رکھا ہے

نہیں معلوم آئی تھی حیا کمبخت کو کس سے ...
کہ حسرت نے مرے دامانِ دل میں آکے منہ ڈھانکا
جنوں باقی ہے اب تک گو تری محفل میں بیٹھا ہے
کہ رہ رہ کر خیال آتا ہے جوہر کو بیاباں کا

۱۹۱۵ء سے (جب وہ پہلی بار انگریزی حکومت کے معتوب اور نظربند ہوئے) ان کی اس انقلابی غزل گوئی کا آغاز ہوتا ہے جو اردو غزل میں ایک منفرد آواز تھی، جس میں مردانہ لہجے کا بانکپن، ایک باغی و انقلابی کی بلند آہنگی، ایک بطلِ حریت اور غیرت مند مجاہد کے نعرۂ یلغار کی جھنکار سنی گئی۔ جس سے اردو غزل کو نئی آب و تاب، نئی طاقت و توانائی اور نیا آہنگ و اسلوب ملا اور اس کے نئے امکانات سامنے آئے۔ جنھیں اقبال، ظفر علی خاں، اور حسرت نے اور وسعت بخشی اور اس بغاوت کی روایت کو مزید مستحکم بنایا۔

ان غزلوں کی سب سے بڑی خصوصیت زندگی کی حرکت اور حالات و حوادث کے تیز گام قافلے کی عکاسی ہے، ان میں ایک جذبۂ للکار، احتجاج و حق گوئی، سلطانی و سامراج اور اس کے استبداد کو چیلنج کرنے کی صدائے بازگشت، اور لہجے کی شدت و حدت آج بھی محسوس ہوتی ہے، ان غزلوں

نے تحریک خلافت اور آزادیٔ ہند کی تحریک میں جان ڈال دی تھی اور ایک زمانے میں عوام و خواص کی زبان پر تھیں یہ نعرۂ تکبیر اور اعلانِ حق کی طرح تحریک آزادی کے میدان جنگ میں گونجتی رہی تھیں اور لوگ ایک عرصے تک ان سے روح کی گہرائی، دل کی حرارت، اور جذبات کی مستی و سرشاری کا پیغام پاتے رہے تھے۔ ان میں ایمان و اخلاص کی گرمی، جذبات کی شدت، حق گوئی کی جرأت و استقامت باطل سے عدم مصالحت اور اس کی کھلی مخالفت، اپنے موقف کے لیے سرفروشی کی تمنا، مظلوم عوام کو نجات دلانے کی زبردست خواہش اور آزادی کے لیے انتہائی تڑپ کی زندہ و توانا کیفیات نے ان غزلوں میں ایک دوامی زندگی و تازگی پیدا کر دی ہے اور وقتی و عصری احساسات کو ابقاے دوام بخش دیا ہے۔

یہ غزلیں ستائش کی تمنا سے بے نیاز ہو کر ذاتی تسکین کے لیے لکھی گئی ہیں اور خود کلامی کا انداز رکھتی ہیں۔ اس لیے ان میں خلوص و صداقتِ احساس، آمد و بے تکلفی حالات و محسوسات کی بے کم و کاست عکاسی اور راست اندازی، صاف گوئی و بے ریائی، دروں بینی و خود آگہی کی سچی تصویریں آگئی ہیں۔ عشقِ حقیقی نے ان میں عرفانی رنگ اور ایک دلکش آہنگ اور سوز و ساز پیدا کر دیا ہے مگر اس میں روایتی تصوف کا جمود نہیں بلکہ حقیقتِ کبریٰ سے زندہ تعلق اور راز و نیاز کی حرکت و حرارت ہے۔ مولانا محمد علی نے اپنی غزلوں پر خود ہی تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

"۔۔۔۔ البتہ پچھلے دو تین برس میں عشقِ حقیقی رنگ لایا ہے اور تغزل کا زور ہے۔ یہ اپنی تنک آبی ہے کہ سوائے چار پانچ غزلوں کے اس فرصت کے زمانے میں بھی کچھ نہ لکھ سکا، لکھنے کے لیے نہ بیٹھتا ہوں نہ کوشش کرتا ہوں۔ مگر جب طبیعت پر خود ہی کسی بیرونی تحریک کا غلبہ ہوتا ہے تو نہایت مجبوری کہہ لیتا ہوں اور یہی ایک ذریعہ (علاوہ تلاوت قرآن پاک کے) تسکین قلب کا رہ گیا ہے۔۔۔۔ ممکن ہے کہ بقول آپ کے میری امت ان سے کچھ تسکین پائے۔ بہر حال خود مجھے ضرور کچھ نہ کچھ تسکین ہو جاتی ہے، مگر ان کو لٹریچر سے کیا تعلق یہ صرف اپنی دست افشانی و پاکوبی کے لیے ہیں۔"[1]

مولانا محمد علی کی غزلیں زیادہ تر جیل ہی میں کہی گئی ہیں۔ اس لیے حسیاتِ زندانی ادب کی تاریخ میں ایک خاص مقام رکھتی ہیں۔ کیونکہ اس طرح کی ادبیات میں زیادہ تر سوز و گداز اور مجہول و افسردہ جذبات اور منفی خیالات کی کثرت ملتی ہے جس کی ترجمانی غالب نے کی تھی کہ ع

وہی ہم ہیں قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

مگر روش عام کے برعکس، مولانا محمد علی جوہر کا کلام زنداں نوحہ و ماتم اور یاس و الم، پژمردگی اور افسردگی سے بہت دور ہے اور اسیری ان کے لیے آزادی کا پیش خیمہ ثابت ہوئی ہے۔ اور اس سے ان کے جوش و خروش اور جذبۂ حریت کا شعلۂ جوالہ اور بھڑک اٹھا ہے۔ اقبال نے مولانا محمد علی کی بیباک شخصیت کو سامنے رکھ کر اپنی نظم "اسیری" کہی تھی جس کا پہلا شعر ہے:

ہے اسیری اعتبار افزا جو فطرت ہو بلند
قطرۂ نیساں ہے زندانِ صدف سے ارجمند

وہ شیر کی طرح زنداں کے کٹہرے میں بند تو رہے مگر اپنی شیرانہ فطرت کے سبب گرجتے اور دہاڑتے بھی رہے جس سے ایوانِ ظلم و استبداد لرزتا رہا، زنداں کے لوازمات و مناسبات کو انھوں نے جس طرح طرح سے باندھا ہے وہ انہی کا حصہ

[1] "جواہر اور ان کی شاعری" مرتبہ مولانا دریابادی ص ۲۹، ۲۰ (مکتبہ جامعہ دہلی)

ہے، اس فنی پہلو سے قطعِ نظر انھوں نے زنداں سے جو پیامِ
حریت دیا ہے اس کی آنچ اتنی تیز ہے کہ آج بھی دلوں
کے سرد آتشدان بھڑک اٹھتے ہیں۔ محمد علی کی آتش نوائی
اور شعلہ مزاجی وہ جوالا مکھی ہے جس کا لاوا کبھی ٹھنڈا
نہیں پڑتا۔ جوہر کے زندانی ادب کے چند پہلو ملاحظہ ہوں:

خوگرِ جور پہ تھوڑی سی جفا اور سہی
اس قدر ظلم پہ موقوف ہے کیا اور سہی

خوفِ غماز، عدالت کا خطر، دار کا ڈر
ہیں جہاں اتنے وہاں خوفِ خدا اور سہی

دورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد
ہے ابتدا ہماری، یہی انتہا کے بعد

لذت ہنوز مائدۂ عشق میں نہیں
آتا ہے لطفِ جرمِ تمنا سزا کے بعد

یہ نظر بندی تو نکلی ردِ سحر
دیدہ ہائے ہوش اب جا کر کھلے

اب کہیں ٹوٹا ہے باطل کا طلسم
حق کے عقدے اب کہیں ہم پر کھلے

فیض سے تیرے ہی اے قیدِ فرنگ
بال و پر نکلے قفس کے در کھلے تو ہیں

تم یوں ہی سمجھنا کہ فنا میرے لیے ہے
پر غیب سے سامانِ بقا میرے لیے ہے

پیغام ملا تھا جو حسینؓ ابنِ علیؓ کو
خوش ہوں وہی پیغامِ قضا میرے لیے ہے

مولانا محمد علی۔ اس ارشادِ نبوی پر کہ "سب سے بڑا جہاد
کسی حکمرانِ ظالم کے سامنے کلمۂ حق کہنا ہے" (افضل الجہاد
کلمۃ حق عند سلطان جائر) زندگی بھر عمل پیرا رہے۔ اور دنیا نے
نے اعلانِ حق کی راہ میں اپنی موت سے بھی اس کی تصدیق
کر گئے۔ ان کے لیے راہِ حق میں ثبات و استقامت، صبر و ضبط
ایثار و قربانی کا مثالی نمونہ ذاتِ نبوی کے بعد شہیدِ اعظم سیدنا

امام حسینؓ کی ذاتِ گرامی تھی۔ جن کی بے مثال و تاریخ ساز
شہادت ان کے لیے مصدرِ الہام اور سرچشمۂ فیضان SOURCE
OF INSPIRATION تھی۔

شہادتِ حسینؓ اور حادثاتِ کربلا، ان کے لیے صرف
پیامِ ماتم اور باعثِ حزن و غم ہی نہیں۔ بلکہ ایک حیات آفریں
قدر (VALUE) اور طریقۂ زندگی ہے جس پر
تاریخِ انسانی کے اولوالعزم اور حق پرست افراد گامزن
رہے ہیں۔

اردو دنیا میں اسوۂ شبیری سے محمد علی اور اقبال جس
انداز سے متاثر ہوئے ہیں اور جس طرح دوسروں کو متاثر
کیا ہے اس کی دوسری مثال نہیں ملتی۔ اسوۂ حسینی سے
انھیں زندگی کے ہر مرحلۂ دشوار میں رہنمائی اور طاقت ملی۔
محمد علی، شہادت کے منصبِ عالی اور مقامِ بلند کا راز پا
چکے تھے۔ ان کی پوری زندگی ذوقِ سرفروشی و جانبازی اور
شوقِ شہادت سے مسحور و مخمور نظر آتی ہے۔ وہ امام عالی مقامؓ
کی تقلید میں کربلائے ہند کے فرنگی یزیدوں سے نبرد آزما
رہے اور اتمامِ حجت اور حصولِ شہادت کے لیے انگلستان
گئے۔ مقامِ شبیری کی تعریف و تعارف میں محمد علی نے بہت کچھ
کہا ہے جس کے چند نمونے پیش کیے جاتے ہیں:

قتلِ حسینؓ اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

ہے بُعد کربلا سے بھی قربِ یزید بھی
اور چاہتے ہیں یہ کہ نہ ہوں پنجتنؓ سے دور

ہوں جو کثرت ہی کے قائل ان پہ کیا
رازِ فتحِ سبطِ پیغمبرؐ کھلے

خود دشمنؓ کو شبیرؓ کی اس تشنہ لبی سے
معلوم ہوا آبِ بقا اور ہی کچھ ہے

فرصت کے تماشائی یزید سے
اب ادعائے پیروی پنجتن کہاں

جو دشت کہ آرام گہِ سبطِ نبی ہے
اس دشت کو لاکھوں ابھی آباد کریں گے

ہے مقتلِ حسینؓ کی اب تک وہی بہار
ہیں کس قدر شگفتہ یہ گلہائے کربلا

جو ہر مسیح و خضرؑ کو ملتی نہیں یہ چیز
اور یوں نصیب سے تجھے مل جائے کربلا

جب تک کہ دل سے محو نہ ہو کربلا کی یاد
ہم سے نہ ہو سکے گی اطاعت یزید کی

نوحۂ غم سے گھٹاتے نہیں ہم شانِ حسینؓ ...
حق ہے شاہد کہ شہادت ہی تھی شایانِ حسینؓ

حق و باطل کی ہے پیکار ہمیشہ جاری
جو نہ باطل سے دبیں ہیں وہی شیعانِ حسینؓ

کچھ ناقدوں کا خیال ہے کہ محمد علی کے کلام پر دوامی رنگ کے بجائے وقتی ہنگامی رنگ زیادہ غالب ہے۔ اسی طرح ان کے یہاں جذباتی افکار بھی حاوی ہیں مگر شاید انھیں معلوم نہیں کہ ہنگامی موضوعات میں بھی اپنی ذاتی اہمیت اور فن کار کے طرزِ عمل کے ذریعہ رنگ بقا و دوام پیدا ہو جاتا ہے۔ تاریخ عالم، ہنگامی اور وقتی حوادث و حالات ہی کے تو مجموعہ کا نام ہے۔ جس کے بارے میں کارلائل کا کہنا ہے کہ وہ عظیم افراد کے اعمال کا نتیجہ ہے۔ رہا دوسرا اعتراض جو اکثر کیا گیا ہے کہ محمد علی خشک فلسفی نہ تھے۔ بلکہ سب سے پہلے وہ ایک عملی انسان تھے۔ ان کے اشعار بھی ان کی بے قرار زندگی اور بے تکان عمل کا ایک نقش جمیل ہیں۔ پھر شاعری میں مجرد فکر سے کہیں زیادہ جذباتی اپیل کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس سے محمد علی نے خاص طور پر کام لیا ہے۔

اخیر میں ہم بلا خوفِ تردید یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ محمد علی جوہر جیسے بہت کم ایسے شاعر گزرے ہیں جنھوں نے ایک مختصر مجموعۂ کلام کے ذریعہ ایسا ہمہ گیر اور دیرپا تاثر قائم کیا ہو، ہم ذیل میں بہت سخت انتخاب کے بعد بھی جوہر کے یہ جاوداں اشعار درج کرتے ہیں جن میں ہمیشہ زندہ رہنے کی صلاحیت موجود ہے۔ کچھ اشعار اوپر بھی گزر چکے ہیں:

تجھ سے مقابلے کی کسے تاب ہے ولے
میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد

ہر سینہ آج ہے ترے پیکاں کا منتظر
ہو انتخاب اے نگہِ یار دیکھ کر

آساں نہ تھا تقریبِ شیریں تو کیا ہوا
تیشہ کو کوئی رکھ نہ سکا کوہکن سے دور

ہر رنگ میں راضی بہ رضا ہو تو مزا دیکھ
دنیا ہی میں بیٹھے ہوئے جنت کی فضا دیکھ

تو طیرا ابابیل سے ہرگز نہیں کمزور
بے چارگی پہ اپنی نہ جا شانِ خدا دیکھ

ہو حسنِ طلب لاکھ مگر کچھ نہیں ملتا
ہو صدقِ طلب پھر اثرِ آہِ رسا دیکھ

سونے کا نہیں وقت یہ ہشیار ہو غافل
رنگِ فلکِ پیر زمانے کی ہوا دیکھ

لو وہ آ پہنچا جنون کا قافلہ
پاؤں زخمی خاک منھ پر سر کھلے

خاک جینا ہے اگر موت سے ڈرنا ہے یہی
ہوسِ زیست ہو اس درجہ تو مرنا ہے یہی

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف
کافی ہے اگر ایک خدا میرے لئے ہے

کرنا نہ کبھی ان پہ گماں اہلِ ہوس کا
عشاق کی نیت یہ خدا اور ہی کچھ ہے

تنہائی کے سب دن ہیں، تنہائی کی سب راتیں
اب ہونے لگیں ان سے خلوت میں ملاقاتیں

ہر آن تسلّی ہے ہر لحظہ تشفّی ہے
ہر وقت ہے دلجوئی ہر دم ہیں مداراتیں
معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت
اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کراماتیں

ہمت نہ ہار دے کوئی منزل کے سامنے
پروردگار یوں بھی کوئی ناتواں نہ ہو

لے چلے ہیں اس کی رحمت کا یقین
اپنی تو صاحب یہی اوقات ہے

مستحق دار کو حکم نظر بندی ملا
کیا کہوں کیسے رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی

طغرائے امتیاز ہے خود ابتلائے دوست
اس کے بڑے نصیب جسے آزمائے دوست

یعقوبؑ پر فضول ہوئے لوگ خندہ زن
یاں لامکاں سے آتی ہے بوئے قبائے دوست

گلہ اے دل ابھی سے کرتا ہے — عشق کا دم اسی پہ بھرتا ہے!
جان دیتا ہے عیشِ فانی پر — بس اسی زندگی پہ مرتا ہے
عشق بن کر جیے تو خاک جیے — زندہ وہ ہے جو جان پہ مرتا ہے
ہے مسلماں کی بس یہی پہچان — کہ فقط اک خدا سے ڈرتا ہے
مطمئن رہ دلا وہ جانِ جہاں — وعدہ کرکے کہیں مکرتا ہے
قلزمِ عشق میں گرا سو گرا — اس کا ڈوبا کہیں ابھرتا ہے

نہیں پالا پڑا قاتل تجھے ہم سخت جانوں سے
ذرا ہم بھی تو دیکھیں تیری جلادی کہاں تک ہے

وہ یہ نہ کہیں گے کہ تمہیں موت نہ آئی
کس منہ سے کریں ہم شبِ ہجراں کی شکایت

ہنگامے روز روز کے خوگر بنا گئے
اب خوش ہیں آئے دن کی پریشانیوں میں ہم

چلئے جوہر کو چھوڑ دیجئے ناصح
منہ لگے آپ کس دوانے کے

دشتِ وحشت سے شکایت پاؤں کے چھالوں کی ہے
دل میں کھٹکا جاکے ہر وہ خار جو دامن میں تھا

قاتل جوہر کے ہاتھوں سے نہ چھوٹا حشر تک
کس بلا کا خون ظالم کی رگِ گردن میں تھا

آئی نہ ہو زنداں میں خبر موسمِ گل کی
سننا تو ذرا شورِ عنادل تو نہیں یہ

گراں ہو اب تو شاید سیرِ گل بھی
کچھ ایسے ہو گئے خوگر قفس کے

گیا اتنے میں خود تارِ نفس ٹوٹ
تھے جوہر منتظر اک ہم نفس کے

یہ حالت ہو گئی ہے ایک ساقی کے نہ ہونے سے
کہ خم کے خم بھرے ہیں مے سے اور میخانہ خالی ہے
تری محفل میں یوں تو ایک سے اک بڑھ کے فرزانہ
مگر افسوس جائے عاشقِ دیوانہ خالی ہے

کر گئی زندۂ جاوید ہمیں — تیغِ قاتل نے مسیحائی کی

عنادل ہیں چمن کے تیرے فصلِ گل سے بے پروا
محبت کو تری ہم نے بہارِ بے خزاں پایا

طفلِ مکتب ہے ترے سامنے خود چرخِ کہن
کس سے سیکھا ہے یہ انداز دلآزاری کا

کر چکے پاؤں تو مہمانیِ خارِ صحرا — سر بھی دعوت کرے اب شہر کے دیوانوں کی

امتحاں سخت بھی پر دلِ مومن بچ رہ گیا
جو ہر اک حال میں اب سے مسرور نہیں

ہم کو تقدیرِ الٰہی سے نہ شکوہ نہ گلہ
اہلِ تسلیم و رضا کا تو یہ دستور نہیں

★

جگدیش سہائے سکسینہ (ایڈووکیٹ)
شاہجہاں پور

شفق

دل نواز و دل نشیں ہے حسنِ زیبائے شفق
غازۂ خوش رنگ گلگوں ہے سیمائے شفق
سرخ جوڑے سے مزیّن ہے جو بالائے شفق
نو عروسِ صبح بن کر آئی لیلائے شفق

جانفزائی حسنِ فطرت کی لب لعلیں میں ہے
کیف و سرمستی کا عالم جلوۂ رنگیں میں ہے

شب گزرتے ہی کھلا میخانۂ جنت کا باب
ہے رواں بہر صبوحی چشمۂ صہبائے ناب
کون اس پردہ سرائے سرخ میں ہے محوِ خواب
اک نگارِ آتشیں رخ ہے کہ سرمائے شباب

کس حریم ناز کا یہ پردۂ دلگیر ہے
جس کے تار و پود میں گلکاری تقدیر ہے

پرچم سلطانِ خاور ہے فلک پر ضو فشاں
حسن سے جس کے شفق گوں ہے فضائے آسماں
اڑ رہے ہیں اوج پر جو طائرانِ نغمہ خواں
سرخ ان کا کارواں ہے سرخ گردِ کارواں

اور بھی دلکش اب اُن کے حسن کا انداز ہے
فکرِ شاعر کے لیے گویا پرِ پرواز ہے

یا دَخالق میں یوں کہتے ہیں دیوی دیوتا
یا فروزاں ہو گیا زرتشت کا آتش کدہ
ہے یہ عکس آتشیں نارِ خلیل اللہ کا
قدرتِ حق سے جو ہم رنگ گلستاں ہو گیا

ایک پھلواری کہوں اس کو گلِ اعجاز کی
یا فلک پر انجمن ہے کشتگانِ ناز کی

تشنگانِ کربلا کے خونِ ناحق کی جھلک
طالب انصاف ہے ہر صبح بالائے فلک
یا شرر مظلوم کی آہوں کے پہنچے عرش تک
جل اٹھا ایوان نیلی فام جن سے یک بیک

اوج پر قربانگہ چرخ ستم ایجاد ہے
کس قدر رنگیں فضائے کوچۂ جلاد ہے

صفحۂ افلاک پر یہ حسن کی تفسیر ہے
یا جنوں کی داستانِ خونچکاں تحریر ہے
آسماں پر یادگارِ عاشقِ دلگیر ہے
ہے شفق فرہاد کا خوں سبح جوئے شیر ہے

اللہ اللہ کس قدر اعلیٰ مقامِ عشق ہے
زینۂ کعبے سے بھی بڑھ کر احترام عشق ہے

اے شفق بیمار ہجراں کو کبھی تو بہلا گئی
تیری رنگینی پری زادوں کو بھی شرما گئی
یہ شباب و حسن کی دولت کہاں تو پا گئی
تجھ میں کس کی سرخی خونِ تمنا آ گئی

برق کی چشمک مگر تیری بہارِ حسن ہے
کس لیے تاریک یارب روزگارِ حسن ہے

جب تجلی ہے سراپا تیری ذاتِ ذوالجلال
جو ازل سے ہے ابد تک لازوال و لایزال
حسن کو پھر کیوں کیا دنیا میں پابند زوال
بار بار آتا ہے لب پر فلسفی کے یہ سوال

کچھ سمجھ میں راز قدرت کے مگر آتے نہیں
عارفِ کامل بھی اس گتھی کو سلجھاتے نہیں

غزلیں

ڈاکٹر مظفر حنفی
۳۵۸ ۔ باٹلہ ہاؤس
جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

بے سبب روٹھ کے جانے کے لیے آئے تھے
آپ تو ہم کو منانے کے لیے آئے تھے

اختلافوں کو عقیدے کا نیا نام نہ دو
تم یہ دیوار گرانے کے لیے آئے تھے

ہم کو معلوم تھا دریا میں نہیں ہے پانی
سر کو نیزے پہ چڑھانے کے لیے آئے تھے

یہ جو کچھ لوگ خمیدہ ہیں کماں کی مانند
آسمانوں کو جھکانے کے لیے آئے تھے

ڈھونڈتے پھرتے ہیں اب سنگ نشانِ نقشِ قدم
راستے پر جو لگانے کے لیے آئے تھے

ہے کوئی تہمت جو برسائے نہ پتھر ہم پہ
ہم یہاں پھول کھلانے کے لیے آئے تھے

ہاتھ کی برف نہ پگھلے تو مظفر کیا ہو
وہ مری آگ بجھانے کے لیے آئے تھے

صفی احمد طاہر جونپوری
ذیشان نشیمن۔ ملاٹولہ
جونپور

نہ ہوتی جستجو تیری تو دیوانے کہاں ہوتے
کہاں کی بندگی ہوتی صنم خانے کہاں ہوتے

فقط طرزِ تخاطب پر نہ اتنا بدگماں ہوتے
نہ تم کو اپنا گر کہتے تو بیگانے کہاں ہوتے

ہزاروں شمع روشن ہوں مگر اک چاندنی ہوگی
نہ ہوتے شمعِ محفل وہ تو پروانے کہاں ہوتے

وفا ہو یا جفا دونوں محبت کی عنایت ہیں
نہ حسن و عشق ٹکراتے تو افسانے کہاں ہوتے

نہ ہوتا شہر امیدوں کا گر آباد اے طاہر
تمہارے در کے ٹھکرائے خدا جانے کہاں ہوتے

اختر بستوی۔ روشن محل
گاندھی نگر بستی (یوپی)

دنیا سے مٹیں قدریں، انسان ہوا خالی — در ٹوٹ گئے سارے دربان ہوا خالی
کچھ پھول سجے سر میں کچھ سیج پہ جا بکھرے — تا صبح شبستاں کا گلدان ہوا خالی
ناکام امیدوں کے سائے بھی نہیں دل میں — حیرت ہے کہ بھوتوں سے شمشان ہوا خالی
ہے شہرِ تصور بھی جادو کا نگر شاید — اس آن بسا دیکھا، اس آن ہوا خالی
پہلے تو ملا سب کچھ، پھر کچھ بھی نہ بچ پایا — وہ روز بھرا رہ کر کھلیان ہوا خالی

الفت کی زمانے میں ایسی ہوئی بے قدری
اس ذکر سے اختر کا دیوان ہوا خالی

آکرام فاروقی
سنٹرل اسکول، راجپوت رجمنٹل سنٹر
فتح گڑھ اترپردیش

شیشہ و آہن

چودھری رحیم بخش نے ایک بار پھر شرارت آمیز نگاہوں سے اپنے دیسی طمنچے کو دیکھا اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑایا ـــــ اس کی آنکھوں کے سرخ ڈورے اور گہرے ہو گئے۔ گلے کی رگیں پھول گئیں، کچھ دیر بعد اس کی شراب سے بوجھل بوجھل آنکھیں کھلیان کی اس پگڈنڈی پر جا کر ٹھہر گئیں جو حمید پور سے سیدھی اس کے گاؤں کی طرف آتی تھی۔ آج اس کی نیت میں کچھ کھوٹ تھا اس لئے وہ شدت سے کسی کی آمد کا منتظر تھا۔

شام کے سرمئی سائے رات کے اندھیروں میں ڈوبنے لگے تھے۔ اور ابھی صابر علی اپنی منزل سے دو کوس دور تھا۔ اسے اپنی جان سے زیادہ دس ہزار کی وہ کثیر رقم عزیز تھی جو جیسے تیسے اکٹھا کر کے شیر گڑھ میلے سے بیل خریدنے کے لئے اس نے اپنی کمر سے باندھ رکھی تھی۔

صابر علی نے ایک بار پھر پچھم کی طرف گردن اٹھا کر دیکھا۔ اسے گاؤں کے چھپر پوش مکانوں کے چولہوں کا دھواں اور چوپال کی مدھم روشنی دکھائی دی۔ روشنی نے اس کے قدموں میں اور جان ڈال دی۔ بس گاؤں کوئی فرلانگ بھر دور رہ گیا تھا۔ اس نے اطمینان کی سانس لی اس کی نگاہوں کے سامنے رفو گھوم گئی رفو کے بہار آفرین تصور سے اس کی نس نس میں شعلے سے لپکنے لگے۔ رفو شیر گڑھ کے چودھری رحیم بخش کی لڑکی اور صابر علی کی ہونے والی بیوی تھی۔ دو سال پہلے ربیع کی فصل پر اس کا نکاح رفو سے ہوا تھا اور عید کے چاند میں رخصتی طے تھی لیکن رخصتی کی کئی تاریخیں ٹل گئیں۔ چودھری ہر بار کوئی نہ کوئی بہانہ تراش لیتا کبھی سوکھے کا، کبھی باڑھ کا اور کبھی مہنگائی کا۔

دراصل اس کی خواہش تھی کہ وہ اپنی بیٹی کو بہت سا جہیز دے کر دھوم دھام سے رخصت کرے لیکن وہی مثل تھی کہ نہ نو من تیل ہوگا اور نہ رادھا ناچے گی۔

بےچاری رفو ہر فصل پر اور ہر عید کے چاند اپنا جی مسوس کر رہ جاتی وہ ایک سیدھی سادی مناسب نقش نگار کی سانولی سی لڑکی تھی لیکن اس کے سانولے پن میں بےحد کشش تھی۔ اس نے ملانی جی سے قرآن شریف اور کچھ معمولی سی اردو، ہندی، بھی پڑھ لی تھی لیکن تھی وہ بہت سمجھ دار لڑکی ـــــ !! درحقیقت یہ رفو کی نیک چلنی اور سلیقہ مندی کا ہی اثر تھا کہ صابر علی نے چودھری کی لڑکی سے شادی کے لئے حامی بھر لی تھی۔ حالانکہ وہ چودھری سے اس کی شراب نوشی کی وجہ سے بےحد نفرت کرتا۔ اور یہی وجہ تھی کہ چودھری ہمیشہ ساہوکار کا مقروض رہتا تھا ـــــ

رات کے گھنگھور سائے گاؤں کو اپنی سرمئی چادر میں لپیٹ چکے تھے کہ یکایک پکی کی کھڑکھڑاہٹ نے چودھری رحیم بخش

لوجو نکال دیا ـــــ

"آگئے بھیا! ـــــ؟؟" چودھری رحیم بخش صابر علی کے قدموں کی آہٹ سن کر کھڑا ہو گیا ـــــ

"جی ہاں ـــــ!!" صابر علی کی آواز میں تھکن کے آثار تھے۔

"کیا آپ میرا ہی انتظار کر رہے تھے؟" صابر علی کا لہجہ صاف ستھرا تھا۔

"ہاں رام پرشاد بھیا کا لڑکا کہہ گیا تھا کہ آج شام تک بھیا آ دیں گے۔ اس لئے میں شام سے تمہاری راہ دیکھ رہا تھا۔" چودھری نے دونوں ہاتھوں سے نیچی طمنچے پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے کہا۔۔۔

ہاں میں نے رگھو بھیا سے کہلوا دیا تھا۔" صابر علی چوپال پر پڑی چھپر کھٹ پر بیٹھ گیا۔ صابر علی کی آمد سے چودھری کے گھر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ آخر وہ اس گھر کا داماد تھا۔ جمن، رفیقا اور منی بھاگم بھاگ آئے اور دولہا بھائی کو سلام کر کے چھپر کھٹ پر اس کے پاس بیٹھ گئے۔ صابر علی ان سے ادھر ادھر کی بہت سی باتیں کرتا رہا پر اس کی آنکھیں لوٹ کی اس چوکھٹ پر ٹک گئیں جہاں ٹاٹ کا ایک بوسیدہ سا پردہ لٹک رہا تھا اور کوئی اپنی مخروطی انگلیوں سے بار بار اس پردے کو ٹھیک کر رہا تھا۔ وہ کئی لمحوں تک مخروطی انگلیوں کی کپکپاہٹ کو دیکھتا رہا اور پھر یکایک رفو کا چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے آگیا۔ اسے رفو کے چہرے اس کی آنکھوں کے آثار نظر آئے دوسرے ہی لمحے رفو اندر چلی گئی اس نے سوچا شاید رفو کچھ بیمار ہے۔

وسط اکتوبر کی گلابی رات تھی، موسم بے حد خوشگوار تھا لیکن صابر علی کو محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ پورن ماسی کی ہنس اماوس رات ہو اور رفو کا سارا اندھیارا سمٹ کر اس کی اپنی نگاہوں میں سما گیا ہو۔ دراصل وہ اپنی رفو کی خیریت پوچھنے کے لئے بے چین تھا۔

کچھ دیر بعد چودھری رحیم بخش نے حقہ تازہ کیا، موٹا توا رکھ کر کڑوے خمیرے کی چلم بھری اور صابر علی کے سرہانے آکر بیٹھ گیا۔ کھیت کھلیان، کھاد، بیج، بارش، باڑھ اور بہت سی ادھر ادھر کی خیر خبر پوچھنے کے بعد اس نے صابر علی سے دریافت کیا۔ "کہو کل بازار کرو گے؟" یہ پوچھتے ہوئے چودھری نے حقے کا ایک طویل کش لیا ـــــ

"ہاں جی! ارادہ تو ہے۔" صابر علی نے منہ پھیر کر جواب دیا۔ دراصل دھوئیں کے سرمئی مرغولے چودھری کی کھانسی کی بے ہنگم دھن پر فضاؤں میں رقص کر رہے تھے۔ دھوئیں میں شراب کی بدبو کی آمیزش تھی ـــــ صابر علی کو شراب اور تمباکو دونوں ہی سے نفرت تھی ـــــ

"تو کچھ مال پانی لائے ہو ـــــ؟" یہ پوچھتے ہوئے چودھری کا ہاتھ دیسی طمنچے کی موجودگی کی تصدیق کرنے لگا۔

"ہاں دس ہزار لایا ہوں"! صابر علی نے تہبند کی گانٹھ سنبھالتے ہوئے کہا۔

"لاؤ رقم مجھے دیدو پچھلے کچھ دنوں سے گاؤں کی حالت اچھی نہیں ہے۔ پرسوں رام دھن بازار کر کے شہر سے لوٹ رہا تھا کہ راستے میں چند بدمعاشوں نے اسے لوٹ لیا اور بعد میں اسے قتل کر دیا۔"

چودھری کے لہجہ میں بہت سی معنی خیز ہمدردیاں پوشیدہ تھیں ـــــ

صابر علی نے بغیر کسی پس و پیش کے ساری رقم اپنے سسر چودھری رحیم بخش کے حوالے کر دی۔ کچھ وقفے کے بعد چودھری رقم لے کر گھر کے اندر چلا گیا اور صابر علی رفو کے تصور میں چھپر کھٹ پر دراز ہو گیا۔ تھکا ماندہ جوان جسم مست پروائی کی ٹھنڈک بستر اور پھر سسرال کا گھر ـــــ!! اسے جلد ہی نیند آگئی ـــــ

"ارے او رمضانی کی ماں ـــــ!! کیا سو گئی؟ چودھری فاتحانہ انداز کے ساتھ گھر میں داخل ہوا ـــــ

چودھرائن اُسارے سے دبے دبے پاؤں کے ساتھ چل کر انگنائی تک آئی اور جمن کی چارپائی پر آکر بیٹھ گئی۔ سب بچے سو گئے تھے رفو اندر کی کچی کوٹھری میں عشاء کی نماز پڑھ رہی تھی رمضانی رام لیلا دیکھنے گیا ہوا تھا ——

"بس اب تو فکر مت کر، اب ساہوکار کا قرضہ بھی ادا ہو جائے گا اور تیرا زیور بھی لالہ سے چھڑا لاؤں گا۔" یہ کہتے ہوئے چودھری نے لڑکھڑاتے ہوئے چودھرائن کی جھریوں بھری کلائی تھام لی ——

"لیکن سب باتیں اچھی طرح ابھی سوچ لو کہیں ایسا نہ ہو کہ ......؟"

چودھرائن نے اپنی کلائی چھڑاتے ہوئے کہا ——

"ارے او چودھرائن، ! تو جانتی نہیں اپنے چودھری کو! اس نے کچا ہاتھ کبھی نہیں ڈالا ہے۔ یہ میرا آہنی دوست ہے جو کبھی دھوکہ نہیں دے سکتا" چودھری نے پستول پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے کہا ——

"ایک ہی گولی میں بیٹے کا کام تمام کر دوں گا بڑا سمجھتا ہے اپنے کو عالم فاضل کہیں کا —— !! چودھری کی آواز میں غصہ، نشہ اور ان دیکھی آسودگی کی شدید تمازت تھی ——

رفو نماز پڑھ چکی تھی اور اس کے کان آبا کی آواز پر لگے ہوئے تھے وہ کئی دن سے ساہوکار کے تقاضے اور چودھری کے ناپاک ارادے سن رہی تھی —— یکبارگی رفو اپنے باپ کے ناپاک ارادوں، شوہر کی نیم بسمل لاش اور فرش پر بکھری ہوئی اپنی چوڑیوں کی ننھی ننھی ان گنت کرچوں کے تصور سے کانپ اٹھی اور دوسرے ہی لمحہ اس نے طے کر لیا کہ وہ کنواری بیوہ بن کر زندگی نہیں گزارے گی۔ بلکہ اپنے شوہر کے قتل سے پہلے اپنی جان دیدے گی۔ تاکہ یہ دنیا ایک بار پھر دیکھ لے کہ چاہنے والے کس طرح اپنے جنازوں کے کھنڈر پر اپنی محبت کا حسین تاج محل تعمیر کرتے ہیں ——

اس روز چودھری نے معمول سے کچھ زیادہ پی لی تھی۔ اس کا نشہ بے ہوشی کی سی کیفیت میں تبدیل ہو گیا تھا چودھرائن اپنے شوہر کے پاؤں دباتے دباتے وہیں پائنتی نیند کے غلبے سے لڑھک گئی۔ تھی ——

ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں، چاروں طرف چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ رفو چارپائی سے اٹھی اس نے ماحول کا جائزہ لیا اور خودکشی کے نشیب و فراز پر غور کرنے لگی۔ وہ دیر تک اندھیرے اجالوں میں ہچکولے کھاتی رہی —— ایک طرف اس کے باپ کا قہر آلود آہنی دبدبہ تھا اور دوسری طرف اس کی اپنی زندگی تھی اور اس کے اپنے سہاگ کا نازک شیشہ —— !!

گھر کے سب لوگ بے خبر سو رہے تھے ابھی رمضانی بھی رام لیلا دیکھ کر نہیں لوٹا تھا۔ وہ تیزی کے ساتھ چارپائی سے اٹھی، ایک لمحے کے لیے ادھر ادھر دیکھا اور یکایک اسکی نگاہیں طاق میں رکھے ہوئے قرآن شریف پر جم گئیں۔ اور روشنی کی ایک نئی کرن اس کے دل کی گہرائیوں میں اتر گئی دوسرے ہی لمحے وہ رات کے گہرے سناٹے میں چوپال پر پہنچ گئی۔ جہاں چھپر کھٹ پر اس کا شوہر گہری نیند میں سو رہا تھا۔

صابر علی رفو کے گداز لمس اور گرم گرم سانسوں کی حرارت سے اچھل کر اٹھ بیٹھا۔ خلاف امید اپنے روبرو، چاندنی رات کی کافر تنہائی میں رفو کو دیکھ کر اس کے سارے بدن میں پھلجھڑیاں سی چھٹنے لگیں اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وفور جذبات سے اس کی پنڈلیاں کانپنے لگیں وہ دیر تک آنکھیں مل مل کر یہ یقین کرتا رہا کہ آیا کوئی خوبصورت خواب دیکھ رہا ہے یا اس کی زندہ تعبیر —— !!

"چلو جلدی یہاں سے نکل چلو —— یہ لو تم اپنی دس ہزار کی رقم اور مجھے گاؤں لے چلو کہ اب میں تمھارے بغیر ایک پل نہیں جی سکتی" !! رفو کی آواز میں خوف و ہراس

(باقی صفحہ ۴۸ پر)

محمد عارف
۱۶۲/۲۰۳، اصطبل چاند باغ مولوی گنج لکھنؤ

سرشار کسمنڈوی۔ ایک اجمالی جائزہ

سرشار فخر یہ ہے کہ کسمنڈوی ہوں میں
دنیا میں نام ہے مرے اجڑے دیار کا

سرشار کا نام صدر الدین تھا۔ پہلے صدر پھر سرشار تخلص کیا۔ دنیائے ادب میں سرشار کسمنڈوی کے نام سے شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔

ایک شاعر کی زندگی کو سرشار نے المیہ سے تعبیر کیا ہے ان کا خیال ہے کہ شاعر ہو جانا ہی شاعر کی زندگی کا سب سے بڑا حادثہ ہوتا ہے۔

اگر یہ نظریہ صحیح ہے تو ان کا جنونِ شاعری حسب ذیل واقعہ کا مرہونِ منت ہے۔

سرشار کی عمر ۱۸ یا ۱۹ سال کی تھی وہ اپنے کسی عزیز خاص سے ملاقات کے لیے لکھنؤ آئے ہوئے تھے۔ اتفاق سے اسی رات ان کے مکان کے قریب ایک مشاعرہ تھا اسکول کی بیت بازی نے اشعار سننے اور سنانے کا شوق بچپن ہی میں پیدا کر دیا تھا۔ چنانچہ مشاعرہ میں پہنچ گئے۔

دیکھتے کیا ہیں کہ محفلِ مشاعرہ عروس نو کی طرح سجی ہوئی ہے ہر شاعر کے سامنے مرصع پاندانوں میں نقرئی گلوریاں اور مورّق الائچیاں، چلموں میں لکھنؤ کا مشہور جو سیرہ تمباکو معطر بھرا ہوا تھا۔ جو ساری محفل کو بسائے تھا ہر شاعر اپنی مسند پر گاؤ تکیہ سے لگا "راجہ اندر" بنا ہوا تھا۔ غیر شاعر ان نعمتوں سے محروم الگ تھلگ سامعین کی صف میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی خودی اور مایوسی پر سرشار کو دکھ ہوا۔ وہ شاعروں کے انداز اور سج دھج سے اتنے متاثر ہوئے کہ عہد کیا کہ میں بھی آئندہ ایسی محفل میں بحیثیت شاعر ہی شرکت کروں گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

یہاں میں یہ امر بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ سرشار کو شاعری سے فطری لگاؤ تھا۔ ان کی شعر گوئی کے لیے نہ کوئی خاص وقت مقرر تھا اور نہ وہ کسی اہتمام اور موڈ (حردہ نہم ا) کے قائل و پابند تھے۔ ان کے لیے نہ تو خلوت و جلوت کی پابندی تھی اور نہ سکون اور سناٹے کی تلاش۔

سرشار نے اتنی مقبولیت حاصل کر لینے کا راز اپنے استاد مرحوم کی نگاہِ التفات کو بتایا ہے۔ وہ علامہ محمد حسین صاحب محوی صدیقی لکھنوی کے شاگرد رشید تھے۔ اور اس رشتے کو وہ اپنے لیے باعث فخر سمجھتے تھے۔ چنانچہ استاد مرحوم کے بارے میں کہتے ہیں ؎

علامہ لکھنوی میرے استاد محترم
ایک پیکر خلوص ہیں اک چشمۂ کرم
علم و ادب کے ناز زمانے کے محتشم
میرے لیے تلمذ محوی ہے مغتنم
اردو میں نظم و نثر کے ڈنکے بجا دیے
لکھنے پہ جب وہ آئے تو دریا بہا دیے

سرشار بیسویں صدی کے دور اوّل کے ایک ممتاز شاعر تھے

فطری شاعر ہونے کے باعث سب نے ان کی قدر و منزلت کی۔ اور انھوں نے ہم عصروں میں ایک اعلیٰ مقام حاصل کیا۔ اس زمانے کے سبھی مایہ ناز شعرا آپ سے ملنے کے خواہش مند رہتے تھے۔ اپنی انفرادیت کے باعث انھیں "صدر الشعرا" کا خطاب بھی حاصل ہوا۔ اس کے علاوہ "افسر الشعرا" "علامہ" اور "ناخدائے سخن" کے القاب سے بھی انھیں نوازا گیا۔ چنانچہ اپنی خود نوشت سوانح میں خود ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"میرے کرم فرما بلاوجہ حضرت' مولانا، مولوی، قبلہ اور اور جناب کے الفاظ نام کے ساتھ لکھ کر نفس کو موٹا کرنے کے لیے "بدنام کنندہ نکو نامے چند" کی صف میں مجھے لانا چاہتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ سرشار کو نام و نمود سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ اور نہ کبھی شہرت کے نام پر انھوں نے صف آرائی کی۔ انکساری اور وضعداری ان کی فطرت ثانیہ تھی وہ ہمیشہ قانع اور شاکر رہے۔ دنیاوی مال و دولت، عزت و جاہ کی بلا میں گرفتار نہیں ہوئے۔ یہی وجہ تھی کہ تمام عمر نہ قصیدہ گوئی کر کے کاسۂ گدائی ہاتھ میں لیا اور نہ کسی کے آگے کبھی دست سوال دراز کیا بلکہ انکساری اور عاجزی سے صلح کل اور قناعت پر زندگی بسر کی۔ وہ خود اظہار خیال کرتے ہیں۔

سرشار بیش و کم کا اٹھاؤ نہ تم سوال
کچھ ضابطے ہیں ساقیٔ دوراں کے سامنے

تملق اور چاپلوسی ان کی عادت نہ تھی اور نہ اس کو وہ پسند کرتے تھے۔ لیکن اگر کبھی کسی دوست کی خوشامد کرنا پڑتی تو وہ اس کو عین سعادت سمجھتے تھے۔ امرا کے سائے سے بہت دور بھاگتے تھے۔ بس یوں سمجھئے کہ فقیر اپنی گدڑی میں مست تھا۔ سرشار نے اپنی پریشاں حالی اور تنگدامنی کے باوجود صبر و شکر کی زندگی بسر کرنا نہ صرف شیوۂ آدمیت بلکہ شیوۂ ایمان بنا رکھا تھا وہ زندگی کے تکلفات سے دور بھاگتے تھے۔ چنانچہ خود کہتے ہیں:

میں شاکر ہوں سرشار اس زندگی پر
چراغ سر رہ گزر ہو رہی ہے

سرشار کی زندگی میں متعدد نشیب و فراز بھی آئے اور وہ زمانے کے سرد و گرم سے بھی دوچار ہوئے۔ مگر تحمل اور اور قناعت کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ اس ڈھنگ سے زندگی گزارنے کے سلسلے میں کہتے ہیں:

بیٹھا ہوں ایک گوشۂ محدود میں سرشار
لیکن حد دنیا کا تقاضا ہے نظر میں

سرشار نے اپنی سادگی، ایمانداری، زندہ دلی اور انسانیت کے بیشتر نمونے چھوڑے ہیں جو مشعل راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنی متانت، خوش اخلاقی اور اعلیٰ ظرفی سے اصلاح کا بھی کام لیا ہے۔ اس ضمن میں حسب ذیل واقعہ بھلایا نہیں جا سکتا۔

۱۹۳۹ء کی بات ہے ایک صاحب نے جوان کے ہم وطن تھے، اور انگریزی کے بڑے پرستار تھے اور سرشار کو اس امر کا بخوبی علم تھا۔ جب کبھی راستے میں مل جاتے تو بڑے معنی خیز انداز میں جھک کر مسکراتے ہوئے آداب و کورنش بجا لاتے۔ ایک دن ایسا ہوا کہ ان صاحب کے ہمراہ ان کے ہم عمر ایک ادیب بھی تھے۔ حسب دستور ان کے معزز دوست مضحکہ خیز انداز میں جھک کر آداب بجا لائے۔ ان کے دوست نے سلام کا یہ انداز دیکھ کر کہا "تم کو شاید سرشار صاحب کی ادبی خدمات، شاعرانہ عظمت، شہرت اور قابلیت کا اندازہ نہیں ہے مغرور دوست نے نہایت بے باکی سے جواب دیا کہ میں تو انگریزی کا دلدادہ ہوں دوسرے ہی دن کسی رسالے میں "صدر الشعرا سرشار کسمنڈوی" کے عنوان سے ایک غزل چھپی۔ سرشار صاحب کے ادیب دوست یہ رسالہ لے کر اپنے انگریزی داں دوست کے پاس پہنچے اور رسالے کے توسط سے انھوں نے اپنے دوست کو سرشار صاحب کی شاعرانہ عظمت سے آگاہ کیا۔ انگریزی داں دوست اپنی جگہ بہت نادم ہوئے اور دوسرے دن انھوں نے سرشار صاحب کے گھر جا کر اپنے اس تمسخرانہ برتاؤ کی معافی مانگی۔

شعر پر اصلاح دینے کا ان کا طریقہ بھی دیگر شعرا سے بالکل مختلف اور جدا تھا ان کی طبیعت ہمہ وقت شعر و سخن کے لیے موزوں رہتی تھی وہ وقت یا موڈ (MOOD) یا کسی خاص موقع کے قائل نہ تھے۔ اکثر لوگ گھر پر رائے مشورے کے لیے آیا کرتے تھے۔ گھر سے دفتر جاتے ہوئے یا دفتر سے گھر آتے ہوئے وہ بلا تکلف غزل کی اصلاح کر دیا کرتے اور فوراً ہی شاگرد کے حوالے کر دیتے۔ کبھی کسی کی غزل رکھنے کی عادت نہ تھی۔ ہاں اکثر ایسا ہوجاتا کہ اگر طالب اصلاح کے پاس وقت نہ ہوتا تو غزل لے کر رکھ لیتے۔ لیکن اگر دورانِ اصلاح کوئی شعر نیا کہتے یا کوئی بہتر مصرع موزوں ہو جاتا تو وہ اس کو اپنے لیے نہ رکھتے خواہ وہ شعر کتنا ہی معیاری کیوں نہ ہوتا وہ ایسے شعر کو طالب اصلاح کا ہی ایک حصہ سمجھتے تھے۔ وہ مقامی، غیر مقامی شاگرد، غیر شاگرد سب کو اصلاح سخن سے یکساں طور پر نوازتے تھے۔ چند عزیز شاگردوں نے آپ سے شکایت کی کہ حضرت! آپ سب کی اصلاح سخن کیوں فرماتے ہیں؟ تو آپ نے نہایت فراخدلی سے جواب دیا کہ علم جتنا صرف کیا جائے اتنا ہی اس میں اضافہ ہوتا ہے۔

یہ سرشار کی بلند خیالی اور قابلیت ہی کا نتیجہ تھا کہ نہ صرف ہندستان کے گوشے گوشے میں بلکہ لاہور، کراچی اور راولپنڈی تک ان کے شاگردوں اور احباب کا دائرہ پھیلا ہوا تھا۔ بہت سے شعرا کو تو خط و کتابت کے ذریعہ ہی اصلاح سے نوازا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ شاگردوں کا ایک ہجوم گھر پر لگا رہتا تھا۔

سرشار کے کلام کی شہرت اور مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس وقت کے تقریباً تمام معیاری رسائل و جرائد میں ان کا کلام شائع ہوتا تھا۔ انھوں نے غزلیات نظم، رباعیات، قطعات اور مثنوی سب پر طبع آزمائی کی ان کی کوئی غزل یا نظم ایسی نہ ہوگی جو غیر مطبوعہ ہو۔ نظم کے علاوہ انھوں نے نثر نگاری کے بھی اعلیٰ نمونے چھوڑے ہیں۔ انھوں نے متعدد افسانے بھی لکھے۔ ان کا ایک افسانہ "بھونرا" کے عنوان سے شائع ہو کر کافی مقبول و معروف ہوا ہے۔ انھیں ادبی محفلوں، اور انجمنوں سے گہرا لگاؤ تھا وہ متعدد ادبی انجمنوں کے سرپرست اور عہدہ دار بھی رہے۔

سرشار صاحب بلند اقبال ضرور تھے مگر اولاد کی دولت سے مالا مال نہ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے گھر کا ایک ہی چراغ دیا تھا وہ بھی ۲۵ سال کی عمر میں۔ اولادیں ہوئیں تو ضرور مگر سب اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ لیکن اگر کوئی شخص سرشار صاحب سے دریافت کرتا کہ جناب کی اولادیں کتنی ہیں تو بڑی شوخی، متانت اور فخر سے جواب دیتے کہ "شیروں کے بس ایک ہی ہوتی ہے۔"

سرشار صاحب حقہ کے بھی بہت شوقین تھے۔ کہا جاتا ہے کہ کثرت سے حقہ پینے اور پان کھانے کی وجہ سے ہی وہ کینسر کے موذی مرض میں مبتلا ہو گئے تھے۔ جس نے ان میں کافی مایوسی پیدا کر دی تھی۔ اس کا اظہار انھوں نے اس طرح کیا ہے۔ ؎

اب دوا ممکن نہ امکان دعا میرے لیے
لیجیے یہ وقت بھی آ ہی گیا میرے لیے

ابتدا میں انھوں نے مرض کو چھپایا آخرش یہ راز فاش ہو ہی گیا۔ مرحوم علاج کے لیے بمبئی تک ہو آئے۔ مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ پھر بھی شعر و ادب سے لگاؤ کم نہ ہوا۔ اپنے مرض کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہہ اٹھے۔

مری زندگی کی دعا کرنے والو!
سمجھتے بھی ہو مجھ کو کیا ہو گیا ہے

آخر کار ۲۸ اگست ۱۹۶۲ء کو تقریباً ۶۷ برس کی عمر میں یہ ناخدائے سخن دنیا سے چل بسا اور حسب وصیت تالکٹورہ کے ایک چھوٹے سے میدان میں آپ کی تجہیز و تکفین عمل میں آئی۔ آپ کے پسماندگان میں رفیقۂ حیات کے علاوہ ایک صاحبزادے معین الدین صاحب صبوحی ہیں۔

سرشار صاحب کے انتقال پر تقریباً ہر شعبۂ زندگی
سے تعلق رکھنے والے افراد نے رنج و غم کا اظہار کیا اور
تمام شعرائے خراج عقیدت پیش کیا۔ مرحوم اسلم لکھنوی نے
موصوف کی اجمالی خوبیوں کو اس طرح نظم کیا ہے۔ ؎

جلوۂ بزم ادب حسن سراپا کہیے
ذات مرحوم کو اور اس کے سوا کیا کہیے
فلک شعر کا تابندہ ستارا کہیے
صدف نظم و سخن کا دُر یکتا کہیے
محسن شعر و ادب زینتِ اقلیم سخن
کچھ سمجھ میں نہیں آتا انھیں کیا کیا کہیے
زود گوئی بھی تھی آمد بھی تھی رنگینی بھی
ہے بجا ان کو اگر شاعرِ یکتا کہیے

سرشار صاحب نے جس لگن، صداقت اور خلوص کے
ساتھ اردو زبان اور نظم و نثر کی خدمت کی اس کے پیش نظر انھیں ادب
میں جو مرتبہ حاصل ہونا چاہیے تھا وہ انھیں نہیں ملا۔ غالباً اس
لیے کہ ان کے رشحاتِ قلم اشاعت پذیر ہو کر شائقین ادب تک
پہنچ نہیں سکے۔ اگر ان کے کلام کی اشاعت مجموعے کی شکل میں
ہوئی ہوتی یا ان کی حیات کے بکھرے ہوئے واقعات کو کسی
نے ترتیب دینے کی کوشش کی ہوتی تو وہ بے انصافی کا شکار
ہرگز نہ ہوتے۔ زیر نظر مضمون اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے
جس میں موصوف کی شخصیت اور فن پر ایک اجمالی نظر ڈالی
گئی ہے۔

ذیل میں سرشار کی مختلف غزلوں کے چند اشعار
پیش کیے جا رہے ہیں جن میں ان کی بلند خیالی عالی حوصلگی
اور عارفانہ مزاج اور نازک خیالی پوری طرح جلوہ گر ہے۔

دل سے کسی کی یاد کو رخصت نہ کر سکا
اتنے بڑے گناہ کی ہمت نہ کر سکا

اور سب کچھ ہوا زمانے میں
قدر میرے خلوص کی نہ ہوئی

میرے نزدیک دیوانے کی یہ پہچان کافی ہے
فقط تجھ سے شناسا اور دنیا بھر سے بیگانہ

لیجیے سب مشکلیں حل ہو گئیں
کہہ گئے چپکے سے وہ ہم کیا کریں

ٹھہرے کہ نہ ٹھہرے کسی نقطہ پہ یہ کچھ دیر
کیا حکم مری عمر گریزاں کے لیے ہے

تم تو آسودۂ ساحل ہو بدستور ابھی
کیا ہیں طوفان کے انداز تمھیں کیا معلوم

قیامت کا نمونہ بن گئیں بیتابیاں دل کی
نہ جانے کس فضا میں یاد ان کو مرا نام آیا

گذر جاتے سکون سے جو تمھارے آستانے پر
وہی دو چار لمحے حاصلِ عمرِ رواں ہوتے

نہ دی اتنی بھی فرصت ہم کو رفتارِ حوادث نے
کہ ہم سرشار اپنی زندگی کے ترجماں ہوتے

دیکھنا ہے کہ ٹھہرتا ہے یہ کس نوبت پر
مجھ کو منظور نہیں درد کا اظہار ابھی

کس قدر دلکش تھے تم یادش بخیر
جب سمجھتے تھے نہ آنکھوں کی زباں

کام کے بدلے اناج

(دیہی عوام کے لیے ایک مفید اسکیم)

لکھنؤ سے تقریباً سات میل کے فاصلے پر کاکوری وہ جگہ ہے جہاں کے لوگ اپنی حب الوطنی، قوت عمل، انسان دوستی اور محنت کی عظمت میں یقین رکھنے کے باعث مشہور رہے ہیں۔ کاکوری ہماری جدو جہد آزادی کا ایک اہم باب ہے جسے اشفاق اللہ اور رام پرشاد بسمل جیسے انمول رتنوں نے بھارت کی تاریخ آزادی میں زندہ جاوید بنادیا ہے۔ یہاں کے معصوم اور سیدھے سادے عوام خاص کر دیہی عوام ابھی تک غریبی کے پنجے سے چھٹکارا نہیں پا سکے۔ کھیتی کے دنوں میں یہ ضرور مشغول رہتے مگر باقی دنوں میں ان کے پاس کوئی کام کرنے کو نہیں تھا اور پیٹ پالنے کے لیے انھیں گھر سے بہت دور جانا پڑتا تھا اور پھر بھی وہ محنت شاقہ کے بعد پیٹ بھر روٹی نہیں کھا سکتے تھے۔

دن بدلے

مرکز میں نئی حکومت کے قیام کے بعد اپریل ۱۹۷۷ء سے غریبوں کی حالت سدھارنے کے لیے جو کام شروع کیے گئے ان میں سے ایک تھا "کام کے بدلے اناج"۔ اس پروگرام سے دیہات کے غریب عوام کی حالت سدھارنے میں مدد ملی! اور یہ پروگرام دیہی عوام میں روز بروز مقبول ہوا۔ ۷۹-۱۹۷۸ء میں مرکزی سرکار نے اس اسکیم کو بروئے کار لانے کے لیے مختلف ریاستوں کو تقریباً ۱۵ کروڑ روپے کی مالیت کا گندم اور چاول دیا۔ اس پروگرام نے ملک کے مختلف حصوں میں کسانوں اور مزدوروں کو خالی وقت میں روزگار دینے اور ان کی آمدنی بڑھانے میں نمایاں مدد کی۔ مثال کے طور پر کاکوری بلاک میں جہاں کہ آبادی ۷۹۰۶۸ ہے اور جہاں کا کل رقبہ ۲۳۹۶۹ ہیکٹیر ہے جس میں سے ۱۵۵۰۹ ہیکٹیر رقبے پر کاشت ہوتی ہے اور ۱۹۵۹ ہیکٹیر اوسر زمینا ہے، اس پروگرام نے دیہی عوام کو خوش حال بنانے میں بڑا کام کیا ہے؛ اس بلاک میں بہت سی سڑکوں کی تعمیر "کام کے بدلے اناج" پروگرام کے تحت شروع کی گئی ہیں جن سے نہ صرف مقامی لوگوں کو گھر بیٹھے روزگار ملا بلکہ ان کے بن جانے سے ان لوگوں کو اپنی پیداوار اور دیگر ضروری اشیا ر گھر تک لانے اور لے جانے میں مدد مل سکے گی۔ اس طرح کی ایک لنک روڈ سروسہ سے منظفر کھیڑا تک زیر تعمیر ہے۔ فروری ۱۹۷۹ء کے مہینے میں اس سڑک پر جو مزدور کام کر رہے تھے ان سے بات چیت کر کے پتہ چلا کہ وہ اس کام سے بہت خوش ہیں۔ کام کرنے والوں میں سری رام، بدھ رام اور بابو نے خاص طور پر بات چیت میں حصہ لیا۔

سری رام نے بتایا کہ وہ اپنی جگہ خوش اور مطمئن ہے۔ جب تک اس طرح کا روزگار انھیں نہیں مل پاتا تھا تو انہیں روٹی کمانے کے لیے لکھنؤ جانا پڑتا تھا اور مشکل سے تین چار روپے یومیہ ملتے تھے۔ کبھی کبھی تو یہ بھی نہ ملتے اور انھیں کسی سے ادھار لے کر دن کاٹنا پڑتا۔ لیکن جب سے روزگار کی یہ سہولت ملی ہے، سب مزدور اپنی جگہ خوش ہیں۔ اس نے کہا کہ آج کل کھیتی کا کام نہیں ہے اس لیے خالی دنوں میں اس روزگار کی خاصی اہمیت ہے۔ بدھ رام نے بتایا کہ انھیں تقریباً ساڑھے چار کلو گرام گندم روزانہ کے حساب سے ملتا ہے۔ اس کا ایک حصہ وہ فروخت کر لیتے ہیں، باقی حصہ گھر میں کھانے کے کام آتا ہے۔ اسی علاقے میں ایک اور سڑک سروسہ گاؤں سے جہان روڈ کو ملانے والی ۲۵ نومبر ۱۹۷۸ء سے بننی شروع ہوئی ہے۔

گونڈہ کا تجربہ

مشرقی اتر پردیش میں جو ضلع پچھڑے پن کا شکار ہیں ان میں سے ایک گونڈہ بھی ہے اس ضلع میں دیہی عوام کی حالت سدھارنے کے لیے جو کام ہو رہا ہے ان میں انیتو دیہ، آبپاشی کے چھوٹے وسیلوں کا فروغ، چھوٹے کسانوں کی امداد وغیرہ پروگراموں کے علاوہ "کام کے بدلے اناج" کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ یہاں جن بلاکوں میں یہ کام تیزی سے ہو رہا ہے، ان میں جھجری، پنڈری کرپال، اٹیا تھوک، جھیتہ، اترولہ، منکاپور، کرنیل گنج، تراب گنج، بلرام پور، تیج پیڑ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مثال کے طور پر جھجری میں تراب گنج روڈ سے پرسولی پرائمری اسکول تک ایک سڑک "کام کے بدلے اناج" پروگرام کے تحت زیر تعمیر ہے۔ اس سڑک پر جو مزدور کام کر رہے تھے ان میں سے ایک مزدور بہیت لال نے بتایا کہ اس سے پہلے مشکل سے دو سے ڈھائی روپے یومیہ کی مزدوری کبھی کبھی ہاتھ لگتی تھی مگر اب تو ہماری منھ مانگی مراد مل گئی ہے۔ ایسے ہی اٹیا تھوک سے ملیانی تک، برہما پور سے بلرام پور تک، سرکنڈ سے سردس تک لنک روڈ اور ایسی ہی متعدد دیگر سڑکیں "کام کے بدلے اناج" پروگرام کے تحت تعمیر کی جا رہی ہیں۔

ترقی کے نئے افق

"کام کے بدلے اناج" پروگرام کا بنیادی مقصد محض دیہی علاقوں میں مفاد عامہ کی تعمیر اور دیکھ بھال کے لیے ریاستی سرکاروں کے وسائل میں اضافہ کرنا ہی نہیں ہے بلکہ ملک میں بے روزگار اور کم روزگار دیہی عوام کو شہروں کی طرف بھیجے بغیر ان کے اپنے علاقے میں ہی روزگار کی سہولت بہم پہونچانا ہے تاکہ دیہات میں مردوں اور عورتوں کو کام مل سکے اور ان کے اپنے تعاون سے اجتماعی فائدے کی حامل تعمیرات کو عملی جامہ پہنایا جا سکے اس طرح کی کوششوں سے دیہی ترقی کے لیے بنیادی ضرورتوں کی تکمیل عمل میں آ سکے گی۔

مرکزی سرکار نے نیے قومی بجٹ میں کام کے بدلے اناج کے پروگرام کو دیہی ترقی اور روزگار کی فراہمی کا ایک بڑا ذریعہ تسلیم کیا ہے اور اس کے لیے ۳۰ کروڑ روپے کی رقم کو بڑھا کر ایک سو کروڑ روپے کر دیا گیا ہے امید کی گئی ہے کہ اس سے سال کے دوران بحساب فی کس فی دن بہم کردہ دنوں کا روزگار مہیا کیا جا سکے گا۔

پروگرام کی اہمیت

یہ پروگرام ۱۹۷۷ء میں غیر منصوبہ جاتی اسکیم کی صورت میں شروع کیا گیا تھا تاکہ ملک میں غلہ کی فاضل مقدار کو پیداواری مقاصد کے لیے کام میں لایا جا سکے مگر اب اس پروگرام کو پلان میں شامل کر لیا گیا ہے اور اس میں منصوبہ جاتی اور غیر منصوبہ جاتی ہر دو طرح کی تعمیرات شامل ہو گئی ہیں جس سے اس کا دائرہ وسیع ہو گیا ہے۔ ۷۸-۱۹۷۷ء میں اس پروگرام کے لیے ۲۰ کروڑ روپے کی رقم مختص کی گئی تھی تاہم ۷۹-۱۹۷۸ء میں اس مد پر اخراجات کا اندازہ ۱۲۵ کروڑ روپے سے بھی زیادہ ہے گویا ۷۹-۱۹۷۸ء میں ریاستوں کو دس لاکھ ٹن سے بھی زیادہ غلہ اس پروگرام کے لیے دیا گیا جبکہ ایک سال قبل صرف دو لاکھ ٹن غلہ ہی دیا گیا تھا۔ اس سے اس پروگرام کی مقبولیت اور وسعت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

(بہ شکریہ پی۔ آئی۔ بی گورنمنٹ آف انڈیا)

نقد و تبصرہ

تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب "آپ" مصنف: ڈاکٹر عرفان عباسی۔

قیمت: ۱۸ روپے صفحات: ۲۹۵۔ ملنے کے پتے: اردو پبلشرز امین آباد لکھنؤ۔ اردو سماج۔ ڈاکٹر موتی لال بوس روڈ۔ لکھنؤ۔

"آپ" ڈاکٹر عرفان عباسی کے پچاس خاکوں کا مجموعہ ہے۔ اس سے قبل ان میں سے بیشتر خاکے قومی آواز لکھنؤ میں شائع ہو چکے ہیں اور اہل علم و ارباب دانش سے خراج تحسین وصول کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر عرفان عباسی صاحب نے ان خاکوں کو کتابی صورت میں شائع کر دیا ہے۔ اس کی اشاعت میں اتر پردیش اردو اکاڈمی لکھنؤ کا مالی اشتراک بھی شامل ہے۔

ڈاکٹر عرفان عباسی ایک تعلیم یافتہ، باشعور اور ذی علم نقاد ہیں اور ایک مدت سے علم و ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ ان کے یہ ادبی خاکے ان کی بالغ نظری پر دلالت کرتے ہیں۔ اور ان کی علمیت و ذکاوت پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ڈاکٹر عرفان عباسی صاحب نے شعرا کی ترتیب حروف تہجی کے اعتبار سے قائم کی ہے۔ اسی طرح انھوں نے تذکرہ نویسی کے قدیم فن کو برقرار رکھا ہے۔ لیکن اس ترتیب سے شعرا کے زمانے اور دور کا پتا نہیں چلتا ہے۔ میری ناقص رائے میں اس کی ترتیب کا طریقہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ مختلف شعرا کو ان کے سال وفات کے اعتبار سے اس کتاب میں جگہ دی جاتی۔ اس طرح تاریخی تسلسل قائم کیا جا سکتا تھا۔

"آپ" کے خاکے مختلف اعتبار سے اہم ہیں۔ ڈاکٹر عرفان صاحب نے اس کی جو فہرست تیار کی ہے وہ بذات خود بہت مفید ہے۔ انھوں نے فہرست میں شعرا کے تخلص کے ساتھ ان کا نام بھی لکھ دیا ہے۔ عموماً لوگ شعرا کے اصل نام سے ناواقف ہوتے ہیں۔ اس کتاب کے ذریعہ لوگ شعرا کے نام سے بھی آگاہ ہو سکتے ہیں۔ فہرست میں شعرا کا سال ولادت اور سال وفات بھی درج ہے۔ اس کی مدد سے آیندہ کے محققین کے لیے دور جدید کے شعرا کا زمانہ معلوم کرنے میں آسانی ہوگی۔ اس کے علاوہ فہرست میں شعرا کے سامنے یہ بھی لکھ دیا گیا ہے کہ وہ کس استاد کے شاگرد تھے۔ اس طرح پہلی ہی نظر میں ہم کو مختلف شعرا کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔

"آپ" کے خاکوں کی اہمیت ایک وجہ سے بہت بڑھ جاتی ہے۔ عرفان عباسی صاحب نے جن شعرا کے بارے میں لکھا ہے ان کو انھوں نے بذات خود دیکھا ہے۔ ان سے ملاقات کی ہے۔ ان سے گفتگو کرنے کا موقع ملا ہے۔ وہ ان کی شکل و شباہت، ان کے رہن سہن، وضع قطع، جامہ و لباس اور طرز گفتگو وغیرہ سے براہ راست واقف ہیں۔ اس لیے یہ خاکے ان کے ذاتی مشاہدات اور تجربات پر مبنی ہیں۔ اسی بنا پر ان خاکوں میں اصلیت اور صداقت جلوہ گر ہے۔ مثلاً وہ مولانا حسرت موہانی کی تصویر کشی یوں کرتے ہیں۔

"چھوٹا سا قد، نحیف جسم، سفید بکھری ہوئی داڑھی، غیر جاذب چہرہ، کوتاہ گردن، عجیب سی پھنسی پھنسی آواز جو بیک وقت حلق اور ناک سے نکلتی، ڈھیلی ڈھالی بوسیدہ اور میلی، کئی جگہ مختلف رنگ کے دھاگوں سے گانٹھی ہوئی شیروانی، بغیر پھندے کی کثیف ترکی ٹوپی، خاکی انگا اور لٹھا پائجامہ، پیروں میں ٹائر سول چپل، آنکھوں پر ڈوری سے بندھی بغدادی شیشوں والی عینک، بائیں ہاتھ میں پرانی اور کئی تیلیوں سے الگ لٹکنے کپڑے والی چھتری، زانو پر کپڑے کا گندہ سا لیکن بھرا ہوا تھیلا، لوگ گھیرے تھے اور وہ سب سے مخاطب تھے"

مولانا حسرت موہانی کی ایسی تصویر صرف وہی شخص کھینچ سکتا ہے جس نے بذات خود ان کو دیکھا ہو۔ حسرت موہانی پر بہت کافی تنقید لکھی جا چکی ہے اور آئندہ بھی لکھی جائے گی مگر آیندہ کا محقق اور نقاد حسرت موہانی کی شکل و شباہت اور لباس و پوشاک بتانے سے قاصر رہے گا۔ اس لحاظ سے یہ سارے خاکے بہت اہم ہیں اور تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر عرفان عباسی نے مختلف شعرا کی صورت بیان کرنے کے علاوہ ان کی سیرت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ مثلاً انھوں نے مولانا افقر موہانی کی خودداری کا ذکر کیا ہے۔ مولانا شفیق جونپوری کی بلند حوصلگی کی داد دی ہے۔ اسلم لکھنوی کی وطن پرستی کی تعریف کی ہے۔ اسی طرح مختلف شاعروں اور ادیبوں کی نمایاں خصوصیات کو

واضح کیا ہے۔

"آپ" کے خاکے صرف صورت و سیرت کے اعتبار سے اہم نہیں ہیں بلکہ ان میں تنقید و تبصرہ کے عناصر بھی موجود ہیں۔ عباسی صاحب نے ہر شاعر اور ادیب کے کلام کی نمایاں خصوصیات کا ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے مختلف اصناف سخن پر روشنی ڈالی ہے۔ اور نمونۂ کلام پیش کیا ہے۔ غرضیکہ "آپ" تصنیف سوانحی اور تنقیدی دونوں اعتبار سے بہت اہم ہے۔ نئی نسل کے محققین جب موجودہ دور کے کسی شاعر پر قلم اٹھائیں گے تو اس کتاب کا مطالعہ ان کے لیے ناگزیر ہوگا۔

— سلام سندیلوی
ریڈر شعبۂ اردو گورکھپور یونیورسٹی

نام کتاب: **گھوسی قوم اپنی تاریخ کے آئینے میں** مولف: انور حسین نعمان

صفحات ۱۱۲ قیمت: ۵ روپے ملنے کا پتہ: اخلاق حسین نعماں قصبہ وڈاکخانہ نیورہ ضلع بارہ بنکی

مولف نے نہایت تجسس و شوق کے ساتھ گھوسی مسلمانوں کی نسلی دریافت کے بطور یہ کتاب سپرد قلم کی ہے چونکہ اصلاً یہ قوم راجپوت شجرے سے ہے اس لیے اس کی تمام تفصیلی تبدیلیوں پر تاریخی محنت سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ تاریخی عوامل، مذہبی عوامل اور جغرافیائی فضائل سے آراستہ کرتے ہوئے مدلل انداز میں لکھی گئی ہے شروع میں حکیم عبدالقوی مدیر صدق جدید اور مرتضیٰ حسین فاروقی پرنسپل فاریس کالج فیض آباد کے تعارفی مضامین کتاب کو مزید مستند بنانے کے ساتھ ساتھ سونے پہ سہاگہ ہیں اس کتاب کو کسی نہ کسی طرح ہندستانی تاریخ کا ایک دروازہ کہا جا سکتا ہے۔ — تسنیم فاروقی

کتاب: **مریخ کی سمت** ۔ مصنف: مرزا احسن ناصر
صفحات: ۱۲۰ ۔ قیمت: ۵ روپیہ

اردو زبان میں سائنسی ادب کی کمی ہے۔ خصوصاً علم الفلک پر معدودے چند کتابیں ہیں۔ زیر نظر کتاب مریخ کی سمت سائنسی ادب کے خزانہ میں ایک نیا اضافہ ہے۔ مرزا احسن ناصر ایک نوجوان سائنس رائٹر اور ادیب ہیں جن کو اپنے موضوع پر مکمل گرفت ہے۔

اس کتاب میں مصنف نے جو حقائق پیش کیے ہیں وہ اپنی جگہ پر مستند ہیں اور جو طرز تحریر اپنایا ہے وہ انوکھا ہے۔ باپ اور بیٹی کے مکالمے نے کتاب کو بہت دلچسپ بنا دیا ہے۔ دیباچہ میں مصنف نے مریخ سیارہ کے متعلق جو ضروری اور ابتدائی معلومات فراہم کردی ہیں اس سے مبتدی بہرہ ور ہو کر میدان علم میں آگے بڑھ سکتا ہے۔ کتاب کے آخر میں اصطلاحات کی فہرست نے کتاب کی اہمیت میں اور اضافہ کر دیا ہے۔ یہ کتاب اس قابل ہے کہ اس کو پرائیوٹ اور پبلک لائبریری کی الماریوں میں جگہ دی جائے۔ تاکہ طلاب اس سے فیض حاصل کر سکیں۔ یہ کتاب اترپردیش اردو اکاڈمی کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے۔

— زائر حسین کاظمی

شیشہ و آہن ـــــــ صفحہ ۴۴ کا بقیہ

بھی تھا اور جذبات کی رنگین پرچھائیاں بھی ــــــ!

یکایک اندر سے چودھری کے کھانسنے کی آواز آئی۔ رنّو کسی انجانے خوف سے سر سے پیر تک پسینہ پسینہ ہوگئی ــــ

"آخر کیوں ــــ؟" صابر علی کی آواز جذبات سے بوجھل تھی۔ ایک بار پھر گاؤں کے چوپایوں کی مدھم گھنٹیوں سے فضاؤں میں ارتعاش پیدا کر دیا اور کسی انجانے خوف سے دونوں کے جوان دل دھڑک کر رہ گئے ــــ

"بس جلدی یہاں سے نکل چلو۔ آج ابا نے تمھارے قتل کا منصوبہ بنایا ہے۔ خدا کے لئے جلدی کرو ایک پل کی دیر مت کرو۔"

رنّو نے اس کے بازوؤں کو تھام کر اسے بستر سے گھسیٹ لیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ دونوں ہاتھ میں ہاتھ دیئے گاؤں کی سرحد پار کر چکے تھے۔ ساتھ ہی سورج نکلنے سے بہت پہلے یہ خبر بھی جنگل کی آگ کی طرح گاؤں میں پھیل چکی تھی کہ رات چوپال کی چھپر کھٹ پر سوئے ہوئے چودھری رحیم بخش کے جوان بیٹے رمضانی کو کسی نے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔

NAYA DAUR

ترقیاتی نمبر

عنوانات

جلد ۳۶ نمبر ۴

جولائی سنہ ۱۹۷۹ء

ایڈیٹر: خورشید احمد

جوائنٹ ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

★

پبلشر: ہمیندر کمار

ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اتر پردیش

پرنٹر: اشوک در

سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ واسٹیشنری یوپی

مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ

شائع کردہ محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ۔ اتر پردیش

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے

زر سالانہ: پانچ روپے

ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پرکاشن پربھاگ انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یوپی لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶۔ لکھنؤ

خریداری: ایڈیٹر نیا دور انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یوپی لکھنؤ

اپنی بات

اتر پردیش نے گزشتہ دو سال کے دوران مختلف شعبہ ہائے حیات میں ترقی و خوش حالی کی منزل کی جانب جو نمایاں پیش رفت کی ہے اور اس پیش رفت کے جو مثبت اور خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے ہیں اس کا سہرا بنیادی طور پر موجودہ حکومت ہی کے سر بندھتا ہے۔ نئی ریاستی حکومت نے جون ۱۹۷۷ء میں جب اقتدار کی ذمہ داریاں سنبھالیں تو اسے متعدد مسائل ورثہ میں ملے۔ ان مسائل میں بعض مسئلے فوری توجہ چاہتے تھے مثلاً ہر سطح پر جمہوری فضا کا قیام اور جمہوری اقدار کو تقویت پہنچانا۔ اس کے علاوہ ہر شعبۂ حیات میں موجود بے اطمینانی اور بے چینی کو جو ایمرجنسی کی دین تھی، دور کرنا اور امن و امان برقرار رکھنا نیز ہر سطح پر قانون اور انصاف کی برتری قائم کرنا اور اسے مستحکم رکھنا۔ یہ بڑے فخر اور مسرت کی بات ہے کہ نئی حکومت نے ان تمام مسائل پر فوری توجہ دی اور بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ انھیں نپٹایا۔ یہ ریاست کی نئی حکومت کی خصوصی کوششوں اور اقدامات کا ہی نتیجہ تھا کہ لوگوں نے کھلی فضا میں اطمینان کی سانس لی۔ ایمرجنسی کے آمرانہ طریقہ کار نے جو گھٹن پیدا کر دی تھی نئی حکومت کی کوششوں سے لوگوں کو اس سے بھی نجات ملی۔ اسی کے ساتھ ساتھ حکومت نے بابائے قوم مہاتما گاندھی کے آدرشوں کو اپنا نصب العین قرار دیا اور ان کے خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے خصوصی کوششیں شروع کیں۔ حکومت نے جو پالیسیاں، اسکیمیں اور پروگرام وضع کیے وہ گاندھی جی کے آدرشوں کو بنیاد بنا کر ہی وضع کیے گئے۔ اس طرح ریاست میں ایک نئے عہد کا آغاز ہوا۔ اس نئے عہد کی ترقیاتی سرگرمیوں کے پس منظر میں ایک روشن مستقبل کی جھلک صاف صاف نظر آ رہی ہے۔ ریاستی حکومت نے جو اسکیمیں اور پروگرام گزشتہ دو سال کے دوران شروع کیے ان میں انتودیہ کا انقلابی پروگرام اور نشہ بندی کا نفاذ خصوصی اہمیت اور افادیت کے حامل ہیں۔ انتودیہ پروگرام کے تحت قطار میں کھڑے آخری شخص کی فلاح و ترقی کا یقینی بندوبست کیا جاتا ہے سماج کے غریب ترین خاندانوں کو مالی اور دیگر قسم کی امداد فراہم کی جاتی ہے تاکہ وہ اس کے ذریعہ گزر اوقات کر سکیں۔ اس پروگرام کے پہلے مرحلے میں ۶ لاکھ دیہی خاندانوں کو مستفید کرنے کا منصوبہ تھا جس میں سے دو لاکھ ۸۲ ہزار سے زائد خاندانوں کا انتخاب عمل میں آ چکا ہے اور ان میں تقریباً ۱۰ کروڑ روپیے تقسیم کیے جا چکے ہیں۔ انتودیہ کے ساتھ ساتھ نشہ بندی کا نفاذ بھی ایک ایسا انقلابی قدم ہے جو زبردست سماجی افادیت رکھتا ہے۔ اس اقدام کے ذریعے بھی گاندھی جی کے ایک آدرش کو حقیقی شکل دی گئی ہے۔ نشہ بندی کا نفاذ مرحلہ وار کیا جا رہا ہے۔ یکم اپریل ۱۹۷۸ء سے ریاست کے پانچ پہاڑی اضلاع کے ساتھ ساتھ مزید سات اضلاع میں نشہ بندی نافذ کی گئی تھی۔ سال رواں میں نو مزید اضلاع اور دو دیگر اضلاع کے بعض علاقوں میں بھی نشہ بندی نافذ کر دی گئی ہے۔ اس طرح مرحلے وار ڈھنگ سے ریاست مکمل نشہ بندی کے نصب العین کی جانب گامزن ہے۔ وہ دن اب زیادہ دور نہیں ہے جب اتر پردیش نشہ آور اشیا اور مشروبات کی لعنت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پاک ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ گزشتہ سال مرکزی حکومت کی جانب سے شروع کیے گئے قومی تعلیم بالغان پروگرام کی عمل آوری میں بھی ریاست پیچھے نہیں ہے۔ ریاستی حکومت نے تہیہ کر لیا ہے کہ آئندہ دس برسوں میں اتر پردیش سے ناخواندگی کو دور کر دیا جائے گا اس کے لیے ۴۷ میدانی اضلاع کے ساتھ ساتھ ضلع نینی تال میں تعلیم بالغان کے ۲۵-۲۵ اور سات پہاڑی ضلعوں میں ۱۵-۱۵ مرکز کام کر رہے ہیں۔ کسانوں کو خواندہ بنانے کی ایک بھرپور مہم بھی ریاست کے ۱۱ ضلعوں میں شروع کر دی گئی ہے۔ ہر ضلع میں اس کے ۶۰ مرکز کام کر رہے ہیں اور مزید مرکزوں کے قیام کی بھی تجویز ہے۔ گزشتہ دو سال کے دوران ریاستی حکومت نے امن و قانون کے محاذ پر بھی زبردست مستعدی اور چوکسی کا مظاہرہ کیا ہے جس کے نتیجہ میں جرائم کی وارداتوں میں کافی کمی ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ ریاست کے انتظامی ڈھانچے کو صاف ستھرا اور چاق و چوبند رکھنے کے لیے بھی ریاستی حکومت نے خصوصی کوششیں کیں۔ اعلیٰ عہدوں پر برسرکار ملازمین اور افسران کے خلاف بدعنوانی کے الزام کی جانچ کے لیے ایک لوک آیکت کی تقرری کی گئی۔ بدعنوانی کے انسداد کے لیے سخت اقدامات کیے گئے۔ اس سلسلے میں جون ۱۹۷۷ء سے مئی ۱۹۷۹ء تک کی مدت میں ۳۴۳ چھاپے مارے گئے جن میں ۲۴۲ ملازمین کو رشوت لیتے ہوئے گرفتار کیا گیا۔ بجلی کی پیداوار اور سپلائی کی صورت حال میں بھی ریاستی حکومت کی مسلسل کوششوں کے نتیجے میں نمایاں اور قابل ذکر سدھار ہوا ہے۔ گزشتہ دو برسوں کے دوران بجلی کی تنصیبی صلاحیت میں ۵۰۷ میگاواٹ کا اضافہ ہوا ہے۔ اس سال ۸ جنوری کو ۳ر۹۷ کروڑ یونٹ کے زیادہ سے زیادہ لوڈ کے مطالبے کی تکمیل کی گئی اور ۲۲۵۶ میگاواٹ بجلی پیدا کی گئی اس طرح بجلی کی پیداوار کا ایک نیا ریکارڈ قائم کیا گیا۔ زراعت کے میدان پر نظر ڈالی جائے تو وہاں بھی ترقیاتی سرگرمیوں کے خاطر خواہ نتائج نمایاں نظر آتے ہیں۔ یہ حکومت کی نئی زرعی پالیسی اور خصوصی اقدامات کا ہی نتیجہ ہے کہ ۱۹۷۷-۷۸ء میں ۲۱۳ء۳۱ لاکھ میٹرک ٹن اناج پیدا ہوا اور گزشتہ سال کے سیلاب کی تباہ کاریوں کے باوجود سال ۱۹۷۸-۷۹ء میں ۲۱۵ لاکھ میٹرک ٹن اناج کی پیداوار متوقع ہے۔ اس کے علاوہ حکومت نے دوسرے شعبوں خاص طور سے تعلیم اور صنعت کے میدان میں جو نئی پالیسیاں اختیار کی ہیں اور ترقیاتی پروگرام شروع کیے ہیں ان کی تفصیل اس خصوصی شمارہ کے اندرونی صفحات میں شائع کی جا رہی ہے جس سے ریاست کی ہمہ جہت ترقی کی ایک مکمل تصویر ابھر کر سامنے آ جاتی ہے۔

—— ایڈیٹر

پیغام

مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ، اترپردیش اپنے اردو ماہانہ جریدے نیا دور کا جولائی کا شمارہ "ترقیاتی نمبر" کی شکل میں شائع کر رہا ہے۔

موجودہ حکومت کے دو سال، ۲۲ر جون ۱۹۷۹ء کو مکمل ہو رہے ہیں۔ ان دو برسوں میں ریاست نے ہمہ گیر ترقی کی ہے اور خوشحالی کی منزل کی جانب اس نے تیز رفتاری سے پیش رفت کی ہے خصوصاً بے سہارا کمزور طبقہ کے افراد، ہریجنوں اور معاشی اعتبار سے پسماندہ دیگر لوگوں کو سماجی انصاف دلانے کے لیے جو کوششیں کی گئی ہیں ان سے صدیوں سے نظر انداز کیے گئے اس طبقہ کے لوگوں کی جنھوں نے اندھیرے کو ہی شاید اپنا مقدر سمجھ لیا تھا زندگی میں ایک نئی صبح نمودار ہوئی ہے۔ زراعت اور صنعت کو وسیع دے کر جہاں ریاست کی معاشی حالت کو مستحکم بنانے کی کوشش کی گئی ہے، وہیں روزگار کے مزید مواقع فراہم کر کے بیروزگاروں کو روزگار دیا گیا ہے اور پیداوار میں اضافہ کے ذریعہ قیمتوں پر کنٹرول کر کے عوام کو راحت پہنچائی گئی ہے۔

حکومت اور عوام کے درمیان تعاون و ہم آہنگی قائم رکھنے کے لیے کی جانے والی ان کوششوں سے عوام کو واقف کرانا اشد ضروری ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ماہنامہ نیا دور کا یہ خصوصی ترقیاتی نمبر اس مقصد میں پوری طرح کامیابی سے ہمکنار ہوگا۔

بنارسی داس

(بنارسی داس)
وزیراعلا اترپردیش

جمیل مہدی
ایڈیٹر عزائم لکھنؤ

جے پرکاش نرائن

ایک نئے عہد کے جنم داتا

جے پرکاش نرائن کانگریس سے سوشلسٹ عنصر کو الگ کر کے سوشلسٹ پارٹی کو اس کا تشخص دینے والے رہنما کے روپ میں قومی سیاست کے منظر پر ابھرے تو سیاست میں پہلا زلزلہ پیدا ہوا۔ انھوں نے اپنی سیاسی ژرف نگاہی، اعتدال پسند مزاج اور قومی شعور کی بدولت کانگریس کے اندر اتنی اہمیت حاصل کر لی تھی کہ جواہر لال نہرو نے انھیں، ہندستان کا ہونے والا وزیر اعظم قرار دیا تھا۔

نہرو کے اس اظہار خیال کے بعد سیاسی حلقوں میں انھیں، نہرو کا جانشین سمجھا جانے لگا تھا لیکن جب اصولوں کی بات آئی اور کانگریس کو عملی کے ساتھ سوشلسٹ نظام پر چلانے کی ضرورت محسوس ہوئی تو جے پرکاش جی نے ایک منٹ کے لیے بھی ہندستان کی متوقع وزارت عظمیٰ کا خیال دل میں، نہیں آنے دیا، وہ یوسف مہر علی، ڈاکٹر لوہیا، پٹوردھن اور دوسرے ساتھیوں کے ساتھ کانگریس سے الگ ہو گئے۔

یہ جے پرکاش کی انفرادیت کا پہلا ثبوت تھا جس نے ملک کے کروڑوں عوام کو متاثر کیا۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے آپ کو سوشلسٹ قوتوں کو منظم کرنے کی مہم میں، پوری طرح لگا دیا۔ اور سوشلسٹ پارٹی کو ایک ناقابل انکار حقیقت میں تبدیل کر دیا۔" وہ ہندستان بھر میں گھومتے پھرے اور ہندستان کے لوگوں نے ۱۹۴۲ء کی انقلابی تحریک کے انقلابی نوجوان لیڈر کو تعمیری کام میں خاموشی کے ساتھ سر جھکائے، مصروف عمل دیکھا۔

جے پرکاش نرائن، کی ایک خصوصیت، جس نے انھیں ان کے ہر معاصر سے ہمیشہ ممتاز رکھا ہے، وہ جد و جہد میں انہماک ہے۔ اپنی زندگی کے ہر دور میں انھوں نے جو کام بھی کیا پورے انہماک اور مجسم عمل بن کر کیا۔ جب وہ ۱۹۴۲ء ہندستان چھوڑ دو اندولن میں شامل ہوئے تو بھی ان کے پیش نظر تحریک کے لیے انفرادی ریکارڈ قائم کرنے کے بجائے تحریک کو ہر قیمت پر زندہ اور فعال رکھنے کا مقصد تھا۔ یہ مقصد انھیں جیل خانے میں ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جانے کے بجائے۔ تحریک کو ہر حال میں آگے بڑھاتے رہنے پر مجبور کرتا تھا۔ تحریک کے اس تقاضے کو انھوں نے اپنی زندگی کو خطرہ میں ڈال کر بھی پورا کیا۔ وہ ہزاری باغ کے جیل خانے کی دیوار پھاند کر فرار ہوئے اور انھوں نے روپوشی کی سخت ترین زندگی گزار کر تحریک میں اتنی قوت پیدا کر دی کہ [illegible] حکومت کے عوامی مزاحمت کو مکمل طور پر کچل دینے کے سا[illegible] خواب چکنا چور ہو گئے۔

جے پرکاش نرائن جذباتی اشتعال کا شکار نہیں ہو[illegible] اور بہت سوچ سمجھ کر، مسئلہ کے ہر پہلو پر غور و غوض کر[illegible] کے بعد بہت دیر میں فیصلہ کرتے ہیں، لیکن جب ایک بار و[illegible] فیصلہ کر لیتے ہیں تو سمندر کی طوفانی لہریں اور آسمان کی بجلی[illegible] بھی انھیں ان کے طے شدہ راستے پر آگے ہی بڑھتے چلے جا[illegible]

سے روکنے میں ناکام رہتی ہیں۔ ان کا فعال ذہن جو ہر وقت بیدار اور متحرک رکھتا ہے۔ انھیں حیرت ناک طور پر نشیب و فراز سے باخبر رکھتا ہے اور وہ اپنی دوربین نگاہوں سے راستہ کا جائزہ لیتے رہتے ہیں، کوئی تحریک ہو، کوئی مسئلہ ہو، کوئی نظریہ ہو، کوئی خیال ہو، جد و جہد کی کتنی سخت اور جاں گسل منزل ہو، وہ اس جد و جہد میں کتنے ہی انہماک اور تندہی کے ساتھ لگے ہوئے ہوں، ان کا دماغ جد و جہد کے مختلف پہلوؤں کے تحلیل و تجزیہ میں مشغول رہتا ہے۔

ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی تحریک کے عین عروج کے زمانے میں ذہنی اور شعوری طور پر انھیں یکایک یہ محسوس ہو گیا کہ یہ تحریک اب فضول ہو گئی ہے، یا یہ کہ ان کے کنٹرول سے باہر ہو گئی ہے' یا کسی غلط موڑ پر مڑ گئی ہے تو انھوں نے ایک لمحہ کے لیے بھی رک کر ٹھہر جانے اور قدم پیچھے ہٹا لینے سے دریغ نہیں کیا۔ جن لوگوں نے سوشلسٹ تحریک کی فروغ کی جد و جہد میں انھیں ہمہ تن مشغول دیکھنے کے بعد اچانک تحریک سے علیحدگی اختیار کر کے خاموش زندگی گذارنے کے فیصلہ کا اعلان کرتے سنا ہوگا وہ اس بات سے خوب واقف ہیں کہ جے پرکاش نرائن کتنے بڑے حقیقت پسند اور معاملات و مسائل کو ذاتی وقار سے الگ رکھنے کے کتنے زبردست حامی ہیں۔

ان کے ذہنی سفر میں ایک مرحلہ ایسا بھی گذر چکا ہے جہاں وہ مارکسیت کے فلسفے سے پوری طرح متفق اور ماؤزے تنگ کے مقولے کے عامل بننے کے حق میں نظر آتے تھے کہ "سیاسی طاقت تو بندوق کی نال ہی سے نکلتی ہے" لیکن تشدد کی طرف ان کا یہ رجحان بہت دنوں تک قائم نہیں رہ سکا جیسا کہ انھوں نے خود کئی بار اس کا انکشاف کیا ہے، کہ "جوں ہی میرے ذہن میں اس فلسفہ کا یہ پہلو ابھرا کہ یہ تو ٹھیک ہے کہ سیاسی طاقت بندوق کی نال سے نکلتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ بندوق کس کے ہاتھ میں ہو؟"

اس خیال اور اس سوال کے جواب میں جو کچھ ان کے ذہن و دماغ اور شعور نے ان کے سامنے پیش کیا، اس کے نتیجہ میں وہ تشدد کے عقیدے سے ہمیشہ کے لیے دست بردار ہو گئے یہ وہ موڑ تھا جو ۱۹۴۲ء کے تشدد پسند انقلابی جے پرکاش نرائن کو گاندھیائی عدم تشدد کے عقیدے کے نزدیک لایا اور وہ اس کی سچائی کے قائل ہو کر، پورے صدق دل کے ساتھ اس پر عمل پیرا ہو گئے۔ اس ذہنی تبدیلی کے بعد انھوں نے عملی سیاست سے دستکش ہو کر اپنے آپ کو پوری طرح سروودے تحریک کے لیے وقف کر دیا اور اچاریہ ونوبا بھاوے کی زیر سرکردگی چلنے والی اس تحریک کے وہ ایک اہم رکن بن گئے۔ اسی تحریک سے وابستگی کے زمانے میں انھوں نے اس ہمہ گیر سیاسی انحطاط کا بغور مطالعہ کیا، جس نے کانگریس کو شخصی اقتدار کے نئے تجربہ سے روشناس کر رکھا تھا۔ انھوں نے دیکھا کہ اصولوں کی 'آزادی خیال کی' اور جمہوری تقاضوں کی پاسداری کی اہمیت سیاسی زندگی میں اتنی تیزی کے ساتھ کم ہوتی جا رہی ہے کہ ملک پر آمرانہ نظام کے تشدد کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ انھوں نے دیکھا کہ سیاسی رہنماؤں میں جرأت گفتار اور گرمی کردار کا فقدان ہو گیا ہے اور وہ چھوٹے چھوٹے فائدوں اور حقیر اغراض کے لیے بنیادی اصولوں اور اخلاقی فرائض کو قربان کرنے کے عادی ہو گئے ہیں، اور اخلاقی کمزوری کے ایسے مرحلہ تک نوبت پہونچ گئی ہے کہ پورے ملک میں ایک بھی آدمی عواقب سے بے نیاز ہو کر اس خوفناک صورت حال کا مقابلہ کرنے پر تیار نظر نہیں آتا۔

یہ صورت حال جے پرکاش نرائن کے لیے، جو اپنی چہیتی بیوی اور ان کے زندگی بھر کے کاموں کی شریک پربھا دیوی کی وفات کے بعد یوں بھی کمزور اور ذہنی اعتبار سے اپنے آپ کو بے سہارا سمجھنے لگے تھے، یقیناً ان کی زندگی کا سب سے بڑا چیلنج بن گئی اور انھوں نے حیرت ناک جرأت کے ساتھ اس چیلنج کو قبول کرنے کا فیصلہ کر کے ملک میں ایک بے مثال انقلاب کی راہ ہموار کر دی۔

انھوں نے مکمل انقلاب کے ایک نئے نعرے کے ساتھ

ملک کو اس صورت حال کے خلاف متحد کرنے کی عظیم جد و جہد کا آغاز کیا۔ اور جسمانی انحطاط کے زمانے میں نوجوانوں جیسی پھرتی دلیری اور انہماک کے ساتھ ملک میں ایک عام مزاحمتی تحریک کا آغاز کر دیا۔ ان کی اس تحریک سے کمزوروں کو طاقت ملی۔ اضطراب اور بے چینی کو راستہ ملا، انقلاب کو زبان مل گئی نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ، ہزاروں، لاکھوں کی تعداد میں جے پرکاش نرائن کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو کر ان کے خوابوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔

ایک ایسا طوفان انھوں نے اس ملک میں اپنی عظیم شخصیت اور رہنمایانہ صلاحیتوں کی بدولت پیدا کر دیا، جس کے سامنے قوت وحشت، شوکت، اقتدار، اختیار اور حکومت میں سے کوئی چیز نہیں ٹھہر سکی، اور خس و خاشاک کی طرح انسانوں کے امڈتے ہوئے سمندر میں بہتی چلی گئی۔ جے پرکاش کی قیادت میں اس ملک سے کانگریس کا تیس سالہ اقتدار ختم ہوا، ایک ایسا عہد یہاں شروع ہوا، جس کے جنم داتا کے طور پر وہ تاریخ ہند میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زندہ اور امر رہیں گے۔

★

"میں ہندو ہوں، تم مسلمان ہو،
یا میں گجراتی ہوں اور تم مدراسی ہو،
ہمیں اس طرح کی تنگ نظری کو یکسر فراموش
کر دینا چاہیے۔ ہمیں مشترک بھارتی قومیت
میں "میں" اور "میرا" کے احساس
کو بالکل مٹا دینا چاہیے"

——— مہاتما گاندھی

تنویر اعظمی
کیڈی پور۔ اعظم گڑھ

لوک نائک سے خطاب

ظلمتوں کو غم کی تو نے کر دیا خاکِ سیاہ
اے کہ تیری ذات ہے خورشیدِ روشن کی طرح

مسکرا کر دیکھتا ہے تیری پیری کو شباب
ناتواں تن میں مگر دل کوہ و آہن کی طرح

بوستانِ ہند کے اے باغبانِ لالہ رو
ہے تری فکر نظر اونچی برہمن کی طرح

ہر طرف امن و اماں کے کھیت لہرانے لگے
تیری چشمِ مہرباں برسی جو ساون کی طرح

تیرے داماں کی اماں میں گل بھی ہیں کانٹے بھی ہیں
تو خطا پوشِ جہاں گنگا کے دامن کی طرح

تیری حکمت سازبینش کا کرشمہ ہے کہ آج
زندگی بیٹھی ہے تیرے در پہ جوگن کی طرح

وادیٔ غم میں جب بجائی تو نے اپنی بانسری
سر خوشی گاتی ہوئی آئی سہاگن کی طرح

اے وقارِ حریت کے پاسباں پائندہ باد
اے زمینِ ہند کے بے تاج سلطاں زندہ باد

ملاح نوشیت یادو
نائب وزیر اعلیٰ اتر پردیش

صنعتی ترقی کی جانب

اتر پردیش کے بڑھتے قدم

ریاست کی گزشتہ دو دہائیوں کی صنعتی ترقی کا جائزہ لینے سے یہ ظاہر ہوگا کہ تو پسماندہ علاقوں میں صنعتی ترقی ہوئی اور نہ ہی دیہی علاقوں میں چھوٹے کاریگروں کی ترقی پر کوئی توجہ دی گئی۔ ریاست کی صنعتی ترقی کے سلسلے میں ایک خاص بات یہ بھی رہی کہ جو صنعتیں قائم ہوئیں وہ خاص طور سے چند بڑے شہروں یا ان کے آس پاس کے علاقوں تک ہی محدود رہیں۔

نئی صنعتی پالیسی

موجودہ حکومت کی نئی صنعتی پالیسی کا اعلان دسمبر ۱۹۷۷ء میں لوک سبھا میں ہوا جس کے مطابق صنعتی ترقی کو نئی جہت دی گئی۔ نئی صنعتی پالیسی کے مطابق دیہی اور چھوٹی صنعتوں کی تیز رفتار ترقی اور ضلع صنعتی مرکزوں کے قیام پر خاص زور دیا گیا۔ ریاستی حکومت نے بھی اپنی صنعتی پالیسی میں دیہی علاقوں میں چھوٹی اور گھریلو صنعتوں کی ترقی پر خاص زور دیا ہے اور چھوٹی صنعتوں کو لامرکزی بنانے کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی علاقائی نابرابری کو دور کرنے کی غرض سے پسماندہ اور دیہی علاقوں کے کاریگروں کے لیے نیا پروگرام تیار کیا جا رہا ہے۔

چھوٹی صنعتیں

حکومت ہند نے ۸۰۰ سے بھی زائد اشیا کی پیداوار صرف چھوٹے صنعتی داعدوں کے لیے مخصوص کر دی ہے۔ اس فہرست میں مزید اضافہ کیا جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی ایک لاکھ تک سرمایہ والی صنعتوں کو خصوصی سہولتیں فراہم کرنے کا اعلان کیا گیا ہے۔

انتیودیہ صنعتیں

ریاستی حکومت نے پسماندہ طبقوں اور ہریجنوں کے لیے صنعتی امداد باہمی انجمنیں قائم کرنے اور انھیں خصوصی سہولتیں دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ جس کے تحت گزشتہ سال کچھ ہریجن اور بے زمین افراد کی صنعتی امداد باہمی انجمنیں دیوریا، بلیا غازی پور، فتح پور، الموڑہ اور جھانسی میں قائم کی گئیں۔ ان امداد باہمی انجمنوں کو آسان شرائط پر سرمایہ حصص قرض وغیرہ کی سہولت دی جائے گی اور صنعتیں قائم کرنے کے لیے ریاستی حکومت تکنیکی افسروں کا بندوبست بھی کرے گی۔ اس سال دیگر اضلاع میں بھی اس قسم کی صنعتی امداد باہمی انجمنیں تشکیل دی جائیں گی۔

ترقیاتی مرکز اسکیم

ریاستی حکومت نے چھوٹی اور گھریلو صنعتوں کی ترقی کے لیے ترقیاتی مرکز اسکیم نافذ کی ہے۔ اس اسکیم کے تحت دیہی علاقوں کے ایسے منتخب مقامات پر، جن کی آبادی ۵۰۰۰ سے کم ہے، چھوٹی اور گھریلو صنعتوں کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے۔ اب تک ریاست میں ۸۲ ترقیاتی مرکزوں کا انتخاب کیا گیا ہے جس میں تقریباً ۳۰۰۰ صنعت کاروں نے صنعتیں قائم کرنے کے لیے درخواستیں دیں اور تقریباً ۱۳۰۰

صنعتیں قائم کی جا چکی ہیں۔ ترقیاتی مرکزوں پر جو خاص سہولتیں دستیاب ہیں وہ حسب ذیل ہیں :۔

۱۔ تکنیکی صلاح کے لیے ۱۰۰ فی صد گرانٹ

۲۔ ساڑھے پانچ فی صد سالانہ سود کی شرح سے مارجن منی قرض۔

۳۔ بینکوں اور دیگر مالیاتی اداروں سے لیے گئے قرض پر چار فی صد تک کی شرح سود پر امداد

۴۔ خام مال کے سلسلہ میں اولیت۔

۵۔ ۲۰ ہارس پاور تک بجلی استعمال کرنے والی ہر قسم کی دیہی و گھریلو صنعتوں کے لیے بجلی کی شرحوں پر نو پیسے فی یونٹ تک چھوٹ۔

ریاستی حکومت نے پسماندہ علاقوں کی تیز رفتار صنعتی ترقی کے لیے ۱۰۰ اضلاع میں ریاستی امداد فراہم کی ہے۔ جس کے تحت گھریلو صنعتوں کو ۲۱ فی صد، زیادہ چھوٹے واحدوں کو ۱۵ فی صد اور چھوٹی صنعتوں کو ۱۰ فی صد ریاستی امداد حاصل ہو سکیگی۔

ضلع صنعتی مرکز

مرکزی حکومت نے نئی صنعتی پالیسی کے تحت ضلع صنعتی مرکز اسکیم شروع کی ہے۔ ریاستی حکومت نے یہ اسکیم تمام ۵۶ اضلاع میں نافذ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ سال ۷۹-۷۸ کے آخر تک ۳۴ اضلاع میں ضروری عملہ کی تقرری کر دی گئی اور بقیہ اضلاع میں جلد ہی ضروری عملہ کی تقرری کر دی جائے گی۔ ضلع صنعتی مرکز اسکیم کا خاص مقصد چھوٹے صنعتکاروں کو مختلف سہولتیں فراہم کرنا ہے۔ اب صنعتوں کے قیام کے لیے امیدواروں کو صدر مقام (کانپور) نہ دوڑنا پڑے گا۔ بلکہ ساری امداد ضلع کی سطح پر ہی ضلع صنعتی مرکزوں پر دستیاب ہوگی۔ ضلع صنعتی مرکزوں میں ایک جنرل منیجر اور ۵ منیجروں کی تقرری کی جائے گی جو صنعتی ترقی سے متعلق مختلف کاموں کی نگرانی کریں گے۔ ان مرکزوں کا اصل کام یہ ہوگا کہ وہ ضلع میں دستیاب وسائل کا سروے کریں اور ایسی صنعتوں کی نشان دہی کریں جنھیں مقامی صنعت کار قائم کر سکتے ہوں۔ اس کے ساتھ ہی صنعت کاروں کو تربیت، تکنیکی امداد اور قرض وغیرہ کی سہولت کا بندوبست بھی ضلع صنعتی مرکزوں کے توسط سے کیا جائے گا۔

اون صنعت گونڈہ

ضلع صنعتی مرکزوں سے یہ بھی توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنے علاقہ کے دستکاروں، بنکروں اور دیگر دیہی صنعتوں میں لگے ہوئے افراد کو امداد فراہم کریں گے اور تیار شدہ اشیاء کی فروخت کے لیے بھی ضروری امداد مہیا کریں گے۔

ضلع امداد باہمی بینک کاکوری سے کسان قرض لے رہے ہیں۔

ریاستی حکومت نے صنعتی ترقی کے لیے ایک نئی اسکیم نافذ کی ہے جس کے تحت دیہی علاقوں کے نئے صنعت کاروں کو نئی صنعتیں قائم کرنے کی تربیت دی جا رہی ہے۔ گزشتہ سال تقریباً ۴۰۰ صنعت کاروں کے لیے آٹھ مقامات پر تربیت کا بندوبست کیا گیا تھا۔ اس سال ۲۶ مقامات پر تقریباً ۱۲۰۰ صنعت کاروں اور کاریگروں کو صنعتیں قائم کرنے اور اسے صحیح ڈھنگ سے چلانے کی تربیت دی جائے گی۔
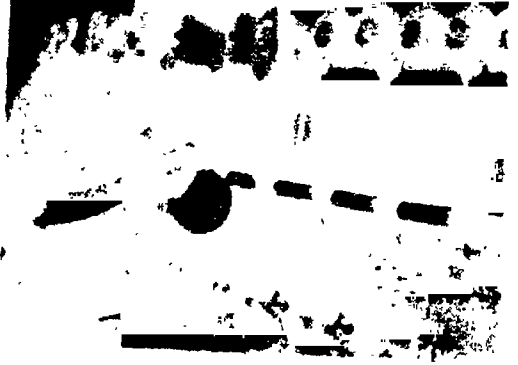
کتائی مل اعظم گڈھ

چھوٹی اور گھریلو صنعتوں کے قیام کی مناسب سہولتیں فراہم کرنے کی غرض سے حکومت نے اب تک ۶۳ مقامات پر صنعتی بستیاں قائم کی ہیں۔ ان بستیوں میں سستی شرح پر ترقی دی ہوئی زمین، بنی ہوئی ورکشاپ اور سڑک، بجلی، پانی وغیرہ کی سہولتیں دستیاب ہیں۔ اب تک بنی ہوئی ۹۰۰ ورکشاپوں میں سے ۸۷۰ چھوٹے صنعت کاروں کو الاٹ کر دی گئی ہیں اور ۲۱۳۳ ترقی دیے ہوئے پلاٹوں میں سے ۱۶۸۱ کا الاٹمنٹ کر دیا گیا ہے۔ شیڈوں کی بڑھتی ہوئی مانگ کے پیش نظر یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ اس سال ۱۵۰ شیڈ تعمیر کیے جائیں گے اور ۲۶ مقامات پر نئی صنعتی بستیوں کو ترقی دی جائے گی۔ یہ بھی فیصلہ کیا گیا ہے کہ چھٹے منصوبہ کی مدت کے دوران دیہی علاقوں میں ترقیاتی مرکزوں پر حسب ضرورت چھوٹی صنعتی بستیوں کو ترقی دی جائے گی۔

دستکاری صنعت

اتر پردیش اپنی مختلف فنکارانہ اشیاء کے لیے نہ صرف ملک بلکہ بیرونی ممالک میں بھی کافی شہرت حاصل کر چکا ہے۔ یہاں کی بنی ہوئی متعدد فنکارانہ اشیا مثلاً بنارسی سلک اور بروکیڈ، بھدوہی اور مرزاپور کے قالین، لکھنؤ کا چکن اور آگرہ کا سنگ مرمر کا سامان، مرادآباد اور وارانسی کے تانبے اور پیتل کے برتن اور سہارنپور کی منقش لکڑی کی اسکرین وغیرہ کی مانگ بین الاقوامی بازاروں میں کافی بڑھ گئی ہے۔ ریاستی حکومت دستکاری کی ایسی تمام صنعتوں کی حوصلہ افزائی کے لیے مسلسل کوشاں ہے اور ان کی مناسب ترقی کے لیے منصوبہ بند طریقے سے اسکیمیں نافذ کی جا رہی ہیں۔ تقریباً چار لاکھ دستکار ریاست کی دستکاری صنعتوں سے اپنی روزی کما رہے ہیں جبکہ تمام ملک میں تقریباً ۱۶ لاکھ افراد دستکاریوں میں لگے ہوئے ہیں۔ ملک بھر میں تقریباً ۴۰۰ کروڑ روپیہ کی مالیت کا دستکاری کا سامان تیار ہوتا ہے جس کا ۳۰ فی صد اتر پردیش میں تیار ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ تقریباً ایک لاکھ کاریگر قالین کی صنعت میں لگے ہوئے ہیں۔ قالین کی صنعت ریاست کی سب سے بڑی گھریلو صنعت ہے جس میں برآمد کی بڑی صلاحیت ہے۔ گزشتہ سال اونی قالین کے ۱۰۰ تربیتی مرکز شروع کیے گئے۔ اس کے علاوہ ۱۶۶ مرکز پہلے سے ہی چل رہے ہیں۔ یہ مرکز بنکروں کو تربیت دے رہے ہیں۔

گزشتہ سال اونی قالین کے ۱۰۰ تربیتی مرکز شروع کیے گئے ہیں جن میں ۱۵۰۰ کاریگروں کو تربیت دی گئی۔ اس سال پیتل کی فنکارانہ اشیاء کی تیاری، قالین، چکن اور لکڑی پر نقاشی کے مزید ۲۰۰ مرکز قائم کیے جائیں گے جن میں ۱۰۰۰ کاریگروں کو تربیت دینے کا بندوبست کیا جائے گا۔ ریاست میں دستکاری پر مبنی صنعتوں کی توسیع و ترقی کی غرض سے برآمداتی کارپوریشن، براس ویئر کارپوریشن اور نظامت صنعت پوری لگن اور خلوص

سے کام کر رہے ہیں۔ اس سال کے آخر تک دست کاری مصنوعات کی پیداوار تقریباً دوگنی ہو جانے کی توقع ہے۔

چکن کی کشیدہ کاری لکھنؤ کی ایک خاص دست کاری صنعت ہے اور اس کے کاریگر لکھنؤ شہر اور اس کے آس پاس آباد ہیں۔ تقریباً ۴۵۰۰۰ کاریگر اس صنعت سے وابستہ ہیں۔ لکھنؤ میں سرکاری چکن صنعت مرکز چل رہا ہے۔ آئندہ پنج سالہ منصوبہ کی مدت کے دوران اس صنعت کو اور زیادہ منظم اور مستحکم کرنے کی اسکیم ہے نیز دیگر تربیتی مرکز بھی قائم کرنے کی تجویز ہے۔ سہارنپور میں لکڑی پر نقاشی کی صنعت کافی ترقی یافتہ صنعت کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس صنعت کی ترقی کے لیے ووڈ سیزننگ پلانٹ کی صلاحیت میں اضافہ کرنا ہے اور تربیتی مرکز قائم کرنے کی بھی تجویز ہے۔

مرادآباد میں پیتل کی صنعت کو زیادہ منظم ڈھنگ سے چلانے کے لیے یو۔پی اسٹیٹ پیتل کارپوریشن کے ذریعہ مختلف سہولتیں فراہم کی جا رہی ہیں۔ کارپوریشن ایک اسٹرپ رولنگ مل بھی قائم کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ ۵۰ ماسٹر کرافٹس مین ۲۵۰ کاریگروں کو مختلف دست کاریوں کی تربیت دیں گے۔

سال ۸۰-۱۹۷۹ء میں دستکاری صنعت کی ترقی کے لیے ۲۸۰ لاکھ روپیہ کے مصارف کا تخمینہ ہے۔

ہینڈ لوم صنعت

ہینڈ لوم صنعت کے ذریعہ کپڑے جیسی ضروری چیز کی پیداوار لامرکزی بنیاد پر پانچ لاکھ سے زیادہ کرگھے لگا کر کی جا رہی ہے۔ کپڑے کی پیداوار کی موجودہ سطح ۳۶ کروڑ میٹر سالانہ ہے اور اس سے ۱۵ لاکھ سے زیادہ بنکروں کو روزی مل رہی ہے۔ ہینڈ لوم صنعت اور پیداوار کی لاگت، مطلوبہ پیداواری صلاحیت کی کمی اور پیداوار میں معیاری سدھار کی ضرورت اور تیار مال کی نکاسی جیسے مسائل سے دوچار ہے۔

ان مسائل کے حل اور بنکروں کو کل وقتی روزگار کے مواقع فراہم کرنے کی غرض سے متعدد پروگرام شروع کیے گئے ہیں اور ان کی عمل آوری سے کافی سدھار آنے لگا ہے۔ ہینڈ لوم کپڑے کی پیداوار میں اضافہ کے ساتھ ساتھ موجودہ مانگ کے مطابق نئے اور بہتر اقسام کے کپڑے کی تیاری کا پروگرام شروع کیا گیا ہے جس کے نتیجے میں ہینڈ لوم کپڑوں کی مقبولیت میں اضافہ ہو رہا ہے اور صارفین ہینڈ لوم کپڑے کا زیادہ استعمال بھی کرنے لگے ہیں۔ یہی نہیں بنکر پوری خود اعتمادی کے ساتھ ہینڈ لوم پیداواری پروگرام میں تعاون دے رہے ہیں اور توقع ہے کہ مستقبل میں بنائی کے کام کو موجودہ سماجی، معاشی پس منظر میں غریبی کی علامت کے بجائے ایک منفعت بخش خودکفیل کاروبار کی حیثیت سے تسلیم کیا جائے گا۔

جنتا کپڑے کی پیداوار

بنکروں کی معاشی حالت سدھارنے اور انھیں مسلسل کام دلانے کی غرض سے جنتا کپڑا پیداواری پروگرام وسیع پیمانہ پر شروع کیا گیا ہے۔ اس پروگرام کی کامیاب عمل آوری کے نتیجے میں ریاست کو جنتا کپڑا تیار کرنے کے سلسلے میں اولین مقام حاصل ہو گیا ہے۔ سال ۷۹-۱۹۷۸ء میں تقریباً آٹھ کروڑ روپیہ کی مالیت کا ہینڈ لوم کپڑا تیار کیا گیا۔

فروخت پروگرام

ہینڈ لوم زمرہ میں بڑھتی ہوئی پیداوار کو زیادہ سے زیادہ ادارہ جاتی ذرائع سے فروخت کرنے کے پروگرام کے تحت ریاست اور بیرون ریاست کے اہم مقامات پر فروخت مرکز قائم کیے گئے۔ اس وقت ریاست اور ریاست کے باہر مجموعی طور پر ۹۷۰ فروخت مرکز ہیں۔ ان میں سے ۲۶۴ فروخت مرکز ہینڈ لوم کارپوریشن اور ۳۱ یو پی کا نے قائم کیے ہیں۔ سال ۷۹-۱۹۷۸ء میں ہینڈ لوم کارپوریشن اور یو پی کا نے ۹۵۱٫۵۵ لاکھ روپیہ اور ۶۸۳٫۲۷ لاکھ روپیہ کی مالیت کا ہینڈ لوم کپڑا فروخت کیا۔

ترقیاتی پراجکٹ

بنکروں کی اکثریت والے علاقوں میں مقامی طور پر اور دیگر نوعیت کی سہولتیں فراہم کرنے کی غرض سے چار ہینڈ لوم ترقیاتی

پراجکٹ، گورکھپور، بستی، بجنور، مئو اور میرٹھ میں چلائے جا رہے ہیں۔ سال ۱۹۷۸-۷۹ء میں ان پراجکٹوں کے دائرہ عمل میں ۱۲۱۶۰ کرگھے شامل کیے گئے۔ اس طرح ابتدا سے اب تک ۲۶۳۸۰ کرگھے اس دائرہ عمل میں لائے جا چکے ہیں۔ سال ۱۹۷۸-۷۹ء میں تقریباً ۵۹٫۰۵ لاکھ روپیہ کا خام مال بنکروں کو تقسیم کیا گیا۔

ہینڈلوم کامپلکس

صنعت کاروں کے ترقیاتی پروگرام کے تحت ہینڈلوم کامپلکس ۲۰ سے ۲۵ کرگھے لے کر ۱۰ سے ۱۵ واحدوں کے قیام کے ذریعہ قائم کیا جاتا ہے اور صنعت کاروں کو سرمایہ نیز پیداوار کے سلسلے میں اور تیار مال کے فروخت میں مدد دی جاتی ہے۔ اس سال اس پروگرام کے تحت چار نئے کامپلکسوں (بجنور، دیوبند، اٹاوہ، رام پور) کے قیام کا کام شروع کیا گیا ہے اور اس طرح اب تک ہینڈلوم کمپلکسوں کی تعداد بڑھ کر ۱۱ ہو گئی ہے۔ اب تک ۳۵ سے زائد واحدوں میں پیداوار شروع ہو چکی ہے۔

ٹیری کاٹ کپڑے کی پیداوار

اترپردیش ریاستی ہینڈلوم کارپوریشن کی کوششوں سے مئورانی پور (جھانسی) میں ہینڈلوم پر پہلی بار پولیسٹر دھاگے کا استعمال شروع کیا گیا اور اسی کے ذریعہ ٹیری کاٹ کا کپڑا تیار ہو رہا ہے۔ اچھا دھاگہ استعمال کرنے اور قیمتی پیداوار سے بنکروں کی یومیہ آمدنی میں اضافہ ہوا ہے۔

اسی طرح بریادا (پرتاپ گڑھ) میں بھی پولیسٹر دھاگے کے استعمال سے ہینڈلوم پر ٹیری کاٹ کپڑا تیار کرنے کا پروگرام شروع کیا جا رہا ہے۔

ہینڈلوم پر بنے ٹیری کاٹ کپڑے کو مزید دل کش بنانے کی غرض سے اسے پراسسنگ کے لیے ریاست کے باہر بھیجنا پڑتا ہے جس پر ہونے والے زائد اخراجات برداشت کرنے کے لیے ریاستی حکومت سے ڈیڑھ روپیہ فی مربع میٹر کی امداد حاصل ہو رہی ہے۔

گوداموں کی تعمیر

بنکروں کی اکثریت والے چار علاقوں اٹاوہ، نہٹور (بجنور)، گورکھپور اور میرٹھ میں گودام کی سہولت فراہم کی گئی۔ اس پروگرام کے تحت قیمتیں گرنے کی صورت میں بنکر اپنا مال ان گوداموں میں رکھ سکتے ہیں اور اپنی پیداوار کی ۵۰ فی صد قیمت حاصل کر سکتے ہیں۔ اس سے وہ پیداواری عمل جاری رکھ سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ خلیل آباد (بستی) میں ۹۰ لاکھ روپیہ کی لاگت سے ایک پراسسنگ واحدے کے قیام کے سلسلے میں ابتدائی کارروائی مکمل ہو گئی ہے۔ مذکورہ پروگرام کی عمل آوری سے بنکروں کے تیار مال کی پراسسنگ کا اہم مسئلہ حل ہو سکے گا اور ریاست کا ہینڈلوم کپڑا ریاستی اور قومی سطح کے بازاروں میں دیگر ریاستوں کے مال سے مقابلہ کر سکے گا۔

خام مال کی تقسیم کا بندوبست

بنکروں کو خام مال فراہم کرنے کی اسکیم کے تحت سال ۱۹۷۸-۷۹ میں ہینڈلوم کارپوریشن نے ۱۶۵ لاکھ روپیہ کا اور یوپیکا نے ۲۳٫۵۰ لاکھ روپیہ کا خام مال بنکروں کو فراہم کیا۔

امداد باہمی پروگرام

امداد باہمی زمرہ کے تحت سال ۱۹۷۸-۷۹ میں ۳۰۵ نئی انجمنیں تشکیل دے کر ۱۶۱۱۷ کرگھوں کو امداد باہمی زمرہ میں لایا گیا۔ کاروباری سرمایہ کے لیے ۲۱۷٫۵۶ روپیہ کی رقم ۱۸۸۵ انجمنوں کو آر۔ بی۔ آئی گارنٹی اسکیم کے تحت جاری کی گئی۔ سرمایہ حصص قرض کے لیے ۱۶۰۸ انجمنوں کو ۶۳٫۲۵ لاکھ روپیہ کی رقم منظور کی گئی اور انتظامی گرانٹ کے طور پر ۱۲۴ انجمنوں کو ۴۶٫۴۲ لاکھ روپیے دیے گئے۔ امداد باہمی زمرہ کی بنکر امداد باہمی انجمنوں کو ترقی یافتہ رنگائی گھروں کے قیام، ورکشاپ کی تعمیر اور کرگھوں کی جدید کاری کے لیے ۱۲٫۸۰ لاکھ روپیہ کی امداد فراہم کی گئی ہے۔

ریشم اسکیم

ریشم ترقیاتی پروگرام ایک روزگار بخش اسکیم ہے جو دیہی عوام کو منفعت بخش روزگار کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ سال ۱۹۷۸-۷۹ میں ۱۱٫۹۰ لاکھ کلوگرام ریشم کا کویا تیار کیا گیا

اور ایک لاکھ کلو گرام ریشم تیار کیا گیا۔ اس اسکیم کے تحت ۵۰۰۰ دیہی خاندان برسرکار ہیں۔ ریاست کے سات ترائی اضلاع نینی تال، پیلی بھیت، لکھیم پور کھیری، بہرائچ، گونڈہ، بستی اور گورکھپور میں ۴۴ء۶۳ کروڑ روپیہ کی لاگت سے ایک وسیع ریشم ترقیاتی پروگرام شروع کیا گیا ہے۔

سال ۷۹-۱۹۷۸ کے لیے ۵۰ء۶۳۲ ۵ لاکھ روپیہ کے مقررہ مصارف کے مقابلہ میں ۱۴ء۱۳۳۲ لاکھ روپیہ ریاست اور مرکز کے حصہ کے طور پر خرچ کیا گیا اور ۲۹۰۰۰ افراد کو براہ راست اور بالواسطہ طور پر روزگار فراہم کیا گیا۔

سال ۸۰-۱۹۷۹ کے لیے مجوزہ پروگرام

ہینڈلوم زمرہ کی ترقی کے مقصد سے سال ۸۰-۱۹۷۹ کے لیے ۶۲۰ء۷ کروڑ روپیہ کے مصارف منظور کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ جو موجودہ اسکیمیں نافذ کی جائیں گی ان میں بنکر امداد باہمی انجمنوں کو سرمایۂ حصص قرض اور کاروباری سرمایہ کے لیے آر۔ بی۔ آئی اسکیم کے ذریعہ قرض، خام مال کی فروخت مرکزوں کا قیام، ہینڈلوم ترقیاتی پراجکٹ کامپلکس کا قیام، کنٹرول کے کپڑے اور پولیسٹر سے بنے کپڑوں کی پیداوار، رنگائی گھروں، ورکشاپوں کی تعمیر کے لیے امداد، نئی ڈیزائنوں کی رتیاری، کرگھوں کی جدید کاری کے لیے امداد، ہینڈلوم کپڑوں کی فروخت پر چھوٹ خرید و فروخت انجمنوں کی تشکیل۔ کنٹرول کے کپڑے اور دیگر پیداواری پروگرام کے لیے ایک کتائی مل کا قیام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ تانا بنانے کے شیڈول کی تعمیر، میکینائزڈ رنگائی گھروں کا قیام اور فروخت نظام کو مستحکم کرنے کی غرض سے دیہی علاقوں میں بنکر ہاٹ کی تعمیر اور فروخت مرکزوں کے قیام کے پروگراموں پر عمل درآمد کی تجویز ہے۔

کھادی اور دیہی صنعت

دیہی معیشت کو مستحکم کرنے کے سلسلے میں کھادی اور دیہی صنعت کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ اس زمرہ میں مختلف صنعتی پیشے شامل ہیں مثلاً ۔۔۔

(ا) کھادی

(ب) دیہی صنعت ۔۔ اناج اور دال کی صفائی، گڑ اور کھنڈسا ری تاڑ گڑ اور تاڑ سے تیار اشیاء، دیہی تیل دھانی، غیر غذائی تیل اور صابن، دیہی چرمی صنعت، کمہاری، گھریلو دیا سلائی، شہد کی مکھی، لوہار اور بڑھئی گیری، دستی کاغذ صنعت، ریشم کی صنعت، گھریلو چونا، کھاد اور گوبر گیس، لاکھ کی پیداوار، کتھے کی پیداوار، المونیم کے برتنوں کی تیاری، گوند کی پیداوار، دوائیں بنانے میں کام آنے والی جنگلی جڑی بوٹیاں اور پھل جمع کرنا، بانس اور بید کا کام اور پھل تحفظ و استعمال۔

ریاست میں گھریلو صنعتوں سے تقریباً ۱۰ لاکھ افراد وابستہ ہیں۔ ریاست کی خاص صنعتیں ہیں۔۔۔ کھادی، گڑ، چمڑے کی صنعت اور تیل وغیرہ۔ کھادی گرام ادیوگ بھی گھریلو اور دیہی صنعتوں کی ترقی کے لیے تربیت، مالی امداد، ترقی یافتہ آلات وغیرہ کی امداد کا بندوبست کرتا ہے۔

کھاد تقسیم کرنے والی امداد باہمی انجمن گونڈہ

(باقی صفحہ پر)

شمسی مینائی
بیگم گنج بارہ بنکی

جو کوئی اور سہارا نہ ہو

[اس نظم میں شرابیوں کو واعظانہ اور ناصحانہ انداز میں سمجھانے کے بجائے طنزیہ انداز میں اس برائی سے متنفر کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور ان کے ضمیر کو جھنجھوڑا گیا ہے۔ ش۔م]

نہیں ہے غم کا بدل اک ذرا خوشی کا سرور
جواب گردشِ دوراں ہے زندگی کا سرور
سرورِ مے سے بھی بڑھ کر ہے تشنگی کا سرور
جو یہ شعور گوارہ نہ ہو تو خوب پیو
جو کوئی اور سہارا نہ ہو تو خوب پیو

وہ سر جھکائے ہوئے گھر کی لاج بیٹھی ہے
پہاڑ دل پہ ہے نازک مزاج بیٹھی ہے
نگاہ در پہ نظر میں سماج بیٹھی ہے
یہ انتظار تمھارا نہ ہو تو خوب پیو
جو کوئی اور سہارا نہ ہو تو خوب پیو

اُجاڑ گھر ہے تو سونی ہر ایک راہ گزر
اندھیری رات کا عالم کہاں ہے نورِ سحر
تڑپ رہا ہے دوا کے لیے جو لختِ جگر
تمھاری آنکھ کا تارا نہ ہو تو خوب پیو
جو کوئی اور سہارا نہ ہو تو خوب پیو

تمھاری چال میں تقدیر پائی جاتی ہے
تو گفتگو میں زباں لڑکھڑائی جاتی ہے
کبھی تو راہ سے میت اُٹھائی جاتی ہے
بلندیوں نے اُبھارا نہ ہو تو خوب پیو
جو کوئی اور سہارا نہ ہو تو خوب پیو

اجاڑ گھر کا ہر اک در سجاؤ توبے سے
اور اپنے بچوں کی قسمت بناؤ توبے سے
یہ صرف پینا بھی کیا ہے نہاؤ توبے سے
تمھیں حیا نے سنوارا نہ ہو تو خوب پیو
جو کوئی اور سہارا نہ ہو تو خوب پیو

تمام رات ہو دورِ شراب کیا کہنا
خوشی کی بات ہو دورِ شراب کیا کہنا
غم وفات ہو دورِ شراب کیا کہنا
حقیقتوں کا نظارا نہ ہو تو خوب پیو
جو کوئی اور سہارا نہ ہو تو خوب پیو

کلی کلی پہ جو چھایا ہے بے بسی کا غبار
روش روش پہ چمن میں ہے رہزنی کا غبار
چمن کے گرد بھی چھایا ہے دشمنی کا غبار
تمھیں وفا نے پکارا نہ ہو تو خوب پیو
جو کوئی اور سہارا نہ ہو تو خوب پیو

حسین شوخ نظارے ہیں آدمی کے لیے
یہ مہر و ماہ یہ تارے ہیں آدمی کے لیے
قدم قدم پہ اشارے ہیں آدمی کے لیے
کہیں سے کوئی اشارا نہ ہو تو خوب پیو
جو کوئی اور سہارا نہ ہو تو خوب پیو

خوشی کی فکر میں جادو گری غلط ہوگی
شکستِ غم کے لیے مے کشی غلط ہوگی
جو غم غلط نہ ہوا زندگی غلط ہوگی
یہ مشورہ بھی گوارا نہ ہو تو خوب پیو
جو کوئی اور سہارا نہ ہو تو خوب پیو

ملائم سنگھ یادو
وزیر امداد باہمی اتر پردیش

امدادِ باہمی تحریک کی کامیابی

امداد باہمی نظام، مساوات اور تعاون کے جذبے کی بنیاد پر معاشی ترقی کے نشانے کی تکمیل کا سب سے اہم اور آسان طریقۂ کار ہے۔ اسی لیے امداد باہمی تحریک کو ملک کی معاشی ترقی کا اہم ستون تسلیم کیا گیا ہے۔ ہماری ریاست میں تقریباً ۸۰ فیصد آبادی، جس کا انحصار صرف کھیتی باڑی پر ہے، دیہی علاقوں میں رہتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب تک زراعت، نگہداشت مویشیان اور زراعت سے متعلق، چھوٹی گھریلو صنعتوں کی ترقی نہیں ہوتی، دیہی عوام کے معیار زندگی میں خاطر خواہ سدھار اور ان کی معاشی خوش حالی کی بات محض ایک خواب و خیال بن کر رہ جائے گی۔

اسی لیے موجودہ حکومت نے دیہی معاشی ترقی کے لیے امداد باہمی تحریک کو قومی اور ریاستی سطح پر کافی اہمیت دی ہے۔ گاؤں گاؤں میں پھیلی ہوئی امداد باہمی انجمنیں زراعت اور دیگر گھریلو صنعتوں کی ترقی اور عوامی نظام تقسیم کو مستحکم بنانے میں یقیناً بہت زیادہ مددگار ثابت ہو سکی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی گاؤں اور شہروں میں ہاتھ کا کام کرنے والے زیادہ کاریگروں کو بھی اپنے کاروبار کو بڑھانے میں امداد باہمی تحریک اہم رول ادا کر سکتی ہے۔

اس سیاق و سباق میں میرا خیال ہے کہ ہمارے امداد باہمی ادارے سماج کے غریب اور کمزور کسانوں اور دیگر نظرانداز کیے گئے لوگوں کے لیے اسی صورت میں سودمند ثابت ہو سکتے ہیں جب ان کی تنظیم ٹھیک ہو، ایماندار اور باصلاحیت ملازمین اس کا انتظام سنبھالیں اور پوری تحریک کی باگ ڈور صحیح معنوں میں عوامی نمایندوں کے ہاتھ میں ہو۔ ہمارے عوامی نمایندے اگر اس تحریک کو ایمانداری، بے لوث خدمت اور قربانی کے جذبے سے سرشار ہو کر چلائیں تو یہ کامیابی سے ہمکنار ہو سکتی ہے۔

ان سبھی باتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس ریاست میں موجودہ حکومت نے سب سے پہلے امداد باہمی تحریک کو، جو غیر مستحکم تھی، مستحکم بنانے اور اسے ایک عوامی تحریک کی ایک نئی جہت دینے کے مقصد سے ریاست گیر امداد باہمی انتخابات کرانے کا فیصلہ کیا۔ اس کے لیے انتخابات سے متعلق قانون میں تبدیلی کر کے انتخابات کے موجودہ نظام میں، جس میں بے قاعدگیوں، بدعنوانیوں اور اقربا پروری کا پورا پورا امکان تھا، خاطر خواہ سدھار کیے گئے تاکہ انتخابات ان سبھی خرابیوں اور خامیوں سے پاک رہیں۔ اس طرح پردیش ہی نہیں بلکہ دیش میں پہلی بار اتنے وسیع پیمانے پر تمام امداد باہمی اداروں میں عام انتخابات نظام کی بنیاد پر غیر جانب دار اور سیاست سے بالاتر ہو کر براہ راست خفیہ ووٹنگ کے ذریعہ انتخابات کرائے گئے۔ اب پردیش میں دیہی سطح کی امداد باہمی انجمنوں سے بلند سطح تک کی ۱۰۵۴۴ انجمنوں میں عوام کے منتخب افسران اور نمایندے ہیں۔ اس طرح ایڈمنسٹریٹروں کے ہاتھ سے سبھی امداد باہمی ادارے عوام کے منتخب نمایندوں کو سونپ دیے

گئے۔ اس وسیع انتخابی مہم میں ۴۰ لاکھ سرگرم امداد باہمی ممبروں نے حصہ لیا۔

یہ انتخابات ضلع حکام کی نگرانی میں کرائے گئے تاکہ جانبداری اور بے ضابطگی کے امکانات نہ رہیں۔

امداد باہمی انتخابات کے ساتھ ساتھ اسی درمیان اس تحریک کو مستحکم بنانے کے لیے بعض دیگر ضروری ٹھوس اقدامات کیے گئے۔ ریاستی سطح پر امداد باہمی انجمنوں کی نیائے پنچایت کی سطح پر نو تشکیل کا کام بھی مکمل کیا گیا۔ پہلے گاؤں کی سطح پر ان انجمنوں کی نو تشکیل کی جانب خصوصی توجہ دی گئی اور نیائے پنچایت کی سطح پر ان انجمنوں کی نو تشکیل کر دی گئی ہے۔ اس طرح اب ان ۸۲۰۱ انجمنوں کے توسط سے امداد باہمی قرضہ کیمیاوی کھاد، بیج، جراثیم کش دوائیں زرعی آلات وغیرہ کے لیے نقد یا اشیاء کی شکل میں قرضہ دیا جانے لگا ہے۔ یہ شکایت عام تھی کہ امداد باہمی انجمن کے کاغذات کا پتہ نہیں چلتا کیونکہ ان کا کوئی دفتر نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اب ان سبھی انجمنوں میں باتنخواہ ایک سکریٹری کی تقرری کر دی گئی ہے اور ہر انجمن کا اپنا دفتر قائم ہو گیا ہے جہاں ممبر اپنا لین دین کرتے ہیں۔ امداد باہمی انجمنوں کا مقصد منافع خوری سے بالاتر ہو کر کسانوں اور ممبروں کی خدمت کرنا ہے۔ اسی لیے گزشتہ ڈیڑھ برسوں میں سود کی شرحوں میں دو فیصد کی کمی کی گئی ہے جو اب ۱۲ فیصد ہے۔

دوسری ضرورت یہ محسوس کی گئی کہ ان سبھی انجمنوں میں اپنا ذاتی دفتر اور گودام کی عمارت ہونا چاہیے تاکہ دیہی باشندوں کو انجمن میں ہی ان کی ضروریات کی چیزیں مثلاً کھاد، بیج، دیگر زرعی اشیاء اور روزمرہ کی اشیائے صرف نیز کپڑا بھی دستیاب ہو سکے۔ اس سلسلے میں سرگرم اقدامات کیے گئے ہیں اور اب تک ۲۵۵۹ انجمنوں میں دیہی گودام تعمیر ہو چکے ہیں، ۸۵۱ زیر تعمیر ہیں اور عالمی بنک اسکیم کے تحت ۴۶۰۰ گودام ۲۵ کروڑ روپیہ کی لاگت سے تین سال کے اندر مکمل کرنے کی اسکیم شروع کی جا چکی ہے۔ اس طرح پنچایت کی سطح کی ان انجمنوں میں کسانوں کو ان کے قریب ترین کسی مقام پر سبھی ضروری سہولتیں دستیاب ہوں گی۔ ہم ان امداد باہمی قرضہ انجمنوں کو "منی بینک" میں تبدیل کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔

اس وقت ریاست میں ۴۰۶ کسان خدمتی انجمنوں کی تشکیل کی جا چکی ہے اور مستقبل میں سبھی انجمنوں کو کسان خدمتی انجمنوں میں تبدیل کرنے کی اسکیم ہے جس کا خاص مقصد یہ ہے کہ ممبروں کو انجمن میں ہی نقد قرضہ کی سہولت فراہم ہو جائے اور زرعی پیداواری اشیاء نیز اشیائے صرف وغیرہ کے ساتھ قرضہ کی سہولتیں دستیاب ہو جائیں۔ ان انجمنوں میں زرعی تکنیکی مشیر بھی مقرر کیے جا رہے ہیں جو ممبروں کو اپنی اسکیم تیار کرنے میں مشورہ دے سکیں گے۔

کچھ دن قبل ریزرو بینک آف انڈیا نے پردیش میں امداد باہمی قرضہ کی ضروریات کا ایک سروے کیا تھا۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ امداد باہمی انجمنوں کے توسط سے کسانوں کو تقریباً ۵۰۰ کروڑ روپیہ کے مختصر مدتی اور درمیانہ مدتی قرضے دیے جانا چاہیے۔ مختصر مدتی اور درمیانہ مدتی قرضہ کا بندوبست اتر پردیش امداد باہمی بنک اور ۵۵ ضلع امداد باہمی بینکوں سے کیا جا رہا ہے۔ ضلع امداد باہمی بینک کی ہر ترقیاتی بلاک میں ایک شاخ قائم کرنے کا نشانہ مقرر کیا گیا تھا۔ اب تک مطلوبہ ۸۷۵ میں سے ۸۱۵ شاخیں ریاست میں قائم ہو چکی ہیں۔ گزشتہ دو برسوں میں قرضہ کی تقسیم کے لیے مؤثر اقدامات کیے گئے ہیں۔ سال گزشتہ ۷۸-۱۹۷۷ء میں جہاں ایک طرف ۱۲۵ کروڑ روپیہ کا قرضہ تقسیم کیا گیا تھا تو دوسری طرف اس سال توقع ہے کہ ۳۰ جون ۱۹۷۹ء تک ۲۷۵ کروڑ روپیہ کے قرضے تقسیم ہو جائیں گے۔ قرضہ کے صحیح استعمال پر خاص طور سے زور دیا جاتا ہے اور زیادہ تر قرضہ کیمیاوی کھاد اور بیج وغیرہ کی شکل میں دیا جاتا ہے۔ سال ۷۸-۱۹۷۷ء (خریف اور ربیع) میں ۷۷ء۱۹ کروڑ روپیہ کی کیمیاوی کھاد تقسیم کی گئی تھی جبکہ ۷۹-۱۹۷۸ء میں ۴۴ء۵۴ کروڑ روپیے تقسیم کیے گئے۔ زرعی ترقی میں آبپاشی کی سب سے زیادہ اہمیت ہے جس کے لیے اتر پردیش ریاستی امداد باہمی ترقی آراضی بنک اپنی ۲۲۷ شاخوں کے ذریعہ طویل مدتی قرضہ فراہم کر رہا ہے۔ ابتداء سے اب تک تقریباً ۴۰۵ کروڑ روپیے تقسیم کیے گئے جس سے تقریباً ۳۸۰ لاکھ ایکڑ فاضل آراضی کو آبپاشی کی سہولتیں دستیاب ہوئی

ہیں۔ سال ۷۹-۱۹۷۸ء میں ۸۰.۸۴ کروڑ روپیہ تقسیم کیا گیا ہے۔ اس سال ۷۰ کروڑ روپیہ تقسیم کرنے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔ طویل مدتی قرضہ ابھی تک کسانوں کو ½۱۰ فیصد یا ½۱۱ فیصد شرح سود پر حاصل ہوتا تھا لیکن گزشتہ یکم اپریل سے بینک نے ایک فیصد شرح سود کم کر دینے کا فیصلہ کیا ہے۔

امداد باہمی انجمن صرف قرض کا ہی انتظام نہیں کرتی بلکہ کھاد، بیج اور زرعی آلات وغیرہ کی فروخت کا بھی بندوبست کر رہی ہے۔ اس وقت ۱۴۱۳ امداد باہمی بیج گودام اور ۴۰۷۶ کیمیاوی کھاد فروخت مراکز ہیں۔ پردیش میں جتنی کیمیاوی کھاد تقسیم ہوتی ہے اس کا تقریباً ۴۰ فیصد صرف امداد باہمی انجمنیں تقسیم کرتی ہیں۔ سال ۷۹-۱۹۷۸ء میں مجموعی طور پر ۵۴.۴۱ کروڑ روپیہ کی کیمیاوی کھاد کے علاوہ عمدہ بیج بھی امداد باہمی ممبروں کو تقسیم کیا گیا ہے۔

امداد باہمی انجمنوں کا اہم مقصد صارفین کو خالص اور مناسب قیمت پر روزمرہ استعمال کی اشیاء فراہم کرنا ہے۔ ریاستی سطح پر صارفین فیڈریشن اور ضلع کی سطح پر ۵۶ مرکزی صارفین گودام سرگرم عمل ہیں۔ اب نیائے پنچایت کی سطح کی ۲۶۶۲ انجمنوں نے بھی یہ کام شروع کر دیا ہے۔ ہماری یہ کوشش ہوگی کہ پنچایت کی سطح کی ہر انجمن اشیائے صرف کی فروخت کا کام انجام دے۔ عوامی نظام تقسیم جو یکم جولائی ۱۹۷۹ء سے شروع ہونے جا رہا ہے، اس میں امداد باہمی انجمنیں اہم رول ادا کریں گی۔

امداد باہمی صارفین انجمنوں کی کچھ خاص دشواریاں ہیں جن کی وجہ سے نجی کاروبار کا مقابلہ کرنے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ تاہم اس سال پچھلے سال کے مقابلہ میں امداد باہمی کاروبار میں کافی اضافہ ہوا ہے اور امید ہے کہ ۳۰ جون ۱۹۷۹ء تک ۴۰ کروڑ روپیہ کا کاروبار ہو جائے گا۔

امداد باہمی زمرے میں تقریباً ایک کروڑ ممبران ہیں اور ان کے منتخب کردہ نمائندے ہی ان انجمنوں کا انتظام چلاتے ہیں۔

ان انجمنوں کو کامیابی کے ساتھ چلانے کے لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ممبروں اور عہدے داروں کی تربیت کا مناسب بندوبست کیا جائے۔ اس کے لیے امداد باہمی تعلیم و تربیت کی بہت اہمیت ہے۔ اس بات کو ملحوظ رکھتے ہوئے سال ۷۹-۱۹۷۸ء میں ۱۵۸ نئے تعلیمی واحدے قائم کیے گئے ہیں۔ اس طرح اب ہر تحصیل میں ایک ایک گشتی واحدہ قائم ہو گیا ہے جو ممبروں اور عہدے داروں کو تربیت دیں گے۔ امید ہے کہ آئندہ سال اس اسکیم کی افادیت محسوس ہونے لگے گی۔ امداد باہمی قرضہ کی تقسیم کے معاملے میں اکثر شکایتیں موصول ہوتی رہتی ہیں اور اس سے بہت سے بے قصور ممبروں پر بھی اثر پڑتا رہتا تھا۔ انھیں بلا وجہ پریشان کیا جاتا تھا جس سے امداد باہمی تحریک کے تئیں ان کا اعتماد اور یقین متزلزل ہونے لگا تھا۔ لہذا فرضی قرضوں کا پتہ لگانے اور امداد باہمی تحریک کے تئیں عوام کا اعتماد بحال کرنے کی غرض سے ۳۰ جون ۱۹۷۷ء کو تین سال سے زیادہ پرانے بقایا قرضوں کی تصدیق کرانے کا فیصلہ کیا گیا۔ جنگی پیمانہ پر اس پروگرام کو شروع کیا گیا۔ ہر انجمن میں ممبروں کے بقایا قرضوں کی جانچ کرائی گئی اور اس کے بعد سینیر افسروں کی سربراہی میں جانچ کرائی گئی۔ اس کے علاوہ سینیر افسروں کی سربراہی میں جانچ رپورٹ کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس پروگرام کے تحت ۵.۷۶ لاکھ ممبروں پر بقایاجات ۴۰.۳۲ کروڑ روپیے کی تصدیق کی گئی جس میں سے ۲۲.۷۰ کروڑ روپیہ کی رقم قابل وصولی پائی گئی۔ اس کے ۴.۷۲ کروڑ روپیہ کے قرضوں کو ممبروں نے درمیانی مدت کے قرضوں کی شکل میں تبدیل کروا کر رقم کی ادائیگی قسطوں میں کرنے کی درخواست کی ہے اور تقریباً چار کروڑ روپیہ کے قرضہ کے غلط تقسیم کا معاملہ روشنی میں آیا ہے یا ان میں کچھ ایسے بھی ممبر ہیں جو فوت ہو چکے ہیں اس قرضہ کو معرض التوا میں ڈالنے کی کارروائی کی جائے گی۔ اس کے ساتھ ہی جو افسران اور ملازمین اس سلسلے میں قصوروار پائے گئے ہیں ان کے خلاف کارروائی کی جائے گی۔

جہاں امداد باہمی تحریک کے ذریعہ کسانوں کو متعدد سہولتیں

فراہم کی جا رہی ہیں وہاں اس عوامی تحریک میں امکانی بے ضابطگیوں کی روک تھام کے لیے امداد باہمی پولیس شعبہ کام کر رہا ہے۔ اس خصوصی شعبہ کے قیام کا مقصد امداد باہمی انجمنوں کی رقم کی خورد برد یا غبن وغیرہ کے معاملے میں ملوث پائے جانے والے ملازمین اور عہدے داران کے خلاف فوری کارروائی کرنا ہے۔ اگرچہ یہ شعبہ پہلے سے کام کر رہا تھا لیکن تجربہ سے یہ ثابت ہوا ہے کہ بااثر لوگوں کے معاملے میں فی الفور کارروائی نہیں کی جاتی۔ اس لیے یہ احکامات جاری کیے گئے ہیں کہ جن معاملوں میں ۵۰۰۰ روپیے سے زیادہ کی بے ضابطگی ہو، ان کی جانچ اولیت کی بنیاد پر کی جائے۔ جولائی ۱۹۷۷ء کے بعد ایسے ۷۳ بڑے معاملوں میں موثر کارروائی کی گئی اور ۸۲ معاملوں کی جانچ بڑی تیزی کے ساتھ جاری ہے۔ اس سلسلے میں ابتداً۔ ۵۸۷ معاملات میں قانونی کارروائی کی گئی تھی جن میں ملوث ۲۶۵۶ ملزموں کو گرفتار کیا گیا اور اب تک ۳۰۰ ملزموں کو سزا ہو چکی ہے۔

امداد باہمی انجمنوں کے معاملے میں گزشتہ سال قومی سطح پر امداد باہمی وزیروں کی ایک کانفرنس میں متعدد اہم فیصلے کیے گئے تھے اور امداد باہمی انجمنوں کو درحقیقت "کمزوروں کی ڈھال" کی حیثیت سے کام کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم امداد باہمی اداروں کے توسط سے "گاؤں چلو" نعرہ کی تکمیل کے لیے کوشش کریں! امداد باہمی انجمنیں ہر علاقہ میں وسیع پیمانہ پر ترقی کی راہ پر گامزن ہیں۔ ہماری کوشش ہوگی کہ انھیں اتنا زیادہ مستحکم اور کارآمد بنا دیں کہ گاؤں کے لوگ شہر نہ آکر گاؤں کو ہی جنت بنانے کے خواب کو شرمندہ تعبیر کریں۔

★

اترپردیش کے بڑھتے قدم : صفحہ ۱۲ کا بقیہ

بندوبست کے تحت یہ سہولتیں ضلع صنعتی مرکز سے دیہی صنعتکاروں کو ضلع کی سطح پر ہی حاصل ہو سکیں گی۔

بورڈ کھادی اور دیہی صنعت کی ترقی کے لیے امداد باہمی انجمنوں / اداروں / کاریگروں کو مالی امداد دینے کے ساتھ ساتھ انھیں تکنیکی رہنمائی فراہم کرتا ہے اور ان کے تیار کردہ مال کی تقسیم کا بندوبست بھی کرتا ہے۔ بورڈ مذکورہ کام دو طرح سے کرتا ہے۔ ایک تو رجسٹرڈ امداد باہمی انجمنوں / اداروں / کاریگروں کے معرفت اور دوسرے اپنی محکمہ جاتی کاروباری اسکیموں کی عمل آوری کے ذریعہ۔

سال ۷۸-۱۹۷۷ میں بورڈ کو کھادی کمیشن / قومیائے ہوئے بنکوں سے جو رقم موصول ہوئی تھی اس میں سے تقریباً ۱۶۶ لاکھ روپیہ مختلف دیہی صنعتی واحدوں کو تقسیم کیا گیا۔ اس طرح تقریباً ۸۶.۴ کروڑ روپیہ کی پیداوار اور ۴۹۶۸۳ لاکھ روپیہ کی فروخت ہوئی اور تقریباً دو لاکھ افراد کو روزگار حاصل ہوا۔ سال ۷۸-۱۹۷۷ میں ۱۱۳۸۲ امداد باہمی انجمنیں، ۳۶۷ سماجی خدمت سے متعلق ادارے اور ۱۵۳۴۳ نجی واحدے کام کر رہے تھے۔ بورڈ کی زیر عمل محکمہ جاتی اسکیموں کے تحت سال ۷۸-۱۹۷۷ میں ۶۶۶۲۶ لاکھ روپیہ کی پیداوار اور ۶۸۶۱۰ لاکھ روپیہ کی فروخت ہوئی۔

سال ۷۹-۱۹۷۸ کے آخر تک مزید ۸۲۰۸ دیہی صنعتی واحدوں کو تقریباً ۲۹۱ لاکھ روپیہ تقسیم کیا گیا اور ۲۶ ہزار سے زائد افراد کو روزگار فراہم کیا گیا۔

کھادی اور دیہی صنعت کی ترقی کے مقصد سے سال ۸۰-۱۹۷۹ کے لیے ۸۰ لاکھ روپیہ کے مصارف کا تعین کیا گیا ہے۔ آئندہ پنج سالہ منصوبہ کی مدت میں کھادی اور دیہی صنعت سے متعلق پروگراموں کو مزید توسیع دی جائے گی تاکہ روزگار کے مزید مواقع دستیاب ہو سکیں۔ اس کے ساتھ ہی موجودہ تکنیک (اپرو پریٹ ٹکنالوجی) کا استعمال بھی ان صنعتوں میں کیا جائے گا تاکہ پیداواری صلاحیت میں اضافہ ہو سکے۔ سال رواں میں بورڈ کے ذریعہ دیہی صنعتوں کو تقریباً تین کروڑ روپیہ کی امداد فراہم کی جائے گی جس سے مزید ۲۰ ہزار افراد کو روزگار ملے گا۔

★

رہبرِ امن

شری جے پرکاش نرائن

فضل نقوی
۲۸۔ جوہری محلہ لکھنؤ ۳

"لوک نائک" تری ہر سانس ہے تنویرِ حیات — باعثِ فخرِ ہمالہ ترے قدموں کا ثبات
تری نظروں میں ہیں تاریخِ وطن کی نہریں — جنبشِ نبض میں ہیں گنگ و جمن کی لہریں

تیری ہمت نے اتارا ہے سرِ ظلم سے تاج — تو نے بدلا ہے بھڑکتے ہوئے شعلوں کا مزاج
بخش دی تو نے محبت کی صدا بنسی کو — اک اشارے میں کیا ختم "ایمرجنسی" کو
تیری ہی لب سے گلستاں نے تبسم پایا — تو نے جمہور کی رگ رگ میں لہو دوڑایا
روحِ بیدار، بنی تیرے قدم کی آہٹ — عزم سے تیرے نئے ہند نے بدلی کروٹ
آتے طوفان کی طاقت کو مٹایا تو نے — قوم کو گردشِ دوراں سے بچایا تو نے

خود رہا قید میں اور قوم کو آرام دیا
تو نے گاندھی کی طرح "امن کا پیغام" دیا

صبر سے سرد کیا تپتے ہوئے آہن کو — تو نے پہچان لیا ملک کے ہر دشمن کو
قصرِ جمہور کا ہر قلب میں تعمیر کیا — تو نے ہر خواب کو وابستۂ تعبیر کیا
تیری عظمت نے سکھایا ہے گلستاں کو ادب — تجھ کو عہدے کی تمنا ہے نہ کرسی کی طلب
عام جذبہ کیا ہر ذہن میں غم خواری کا — درس تو نے ہی دیا قوم کو بیداری کا
فیض سے تیرے مہکتا ہی رہا قوم کا باغ — مسکراتا ہی رہا امن کی تھالی میں چراغ

جذبے تخریب کے دریا کے کنارے ٹوٹے — تو نے آتے ہوئے طوفان کے دھارے روکے

ایک ہی رنگ میں قسمت کے سہارے نکلے — تیرے آکاش پہ ڈوبے ہوئے تارے نکلے
آدمیت کے لیے ذہن کی معراج ہے تو
رہبرِ امن ہے اور قوم کا سرتاج ہے تو

اترپردیش کی ہمہ گیر ترقی

ایک جائزہ

کسی بھی ملک کی زندگی میں دو سال کی مدت بہت قلیل ہوتی ہے، لیکن آزادی اور جمہوریت کی، جو ہنگامی حالات کے زمانے میں درہم برہم ہو چکی تھی، بحالی، معاشی ترقی اور غریب نیز کمزور طبقوں کی فلاح و بہبود کے سلسلے میں گزشتہ دو برسوں کے دوران اترپردیش میں جو مثبت اقدامات کیے گئے ہیں ان کی بنا پر دو سال کی یہ مدت یادگار رہے گی۔

اس قلیل ترین مدت میں ہنگامی حالات کے دور کی بے ضابطگیوں کو دور کرنے اور عوام کو بنیادی نیز شہری آزادی بحال کرنے کے لیے مسلسل کوششیں کی گئیں۔ اخبارات کو مجالس قانون ساز کی کارروائی "کور" کرنے کا اختیار تفویض کیا گیا۔ میسا اور "ڈیسر" کے شکار ہونے والوں کو خصوصی سہولتیں مہیا کی گئیں اور ہنگامی حالات میں ہونے والی زیادتیوں کی جانچ کرنے کے لیے ایک کمیشن کی تقرری کی گئی۔

گاؤں کی جانب

گاندھی جی کے آدرشوں کی تقلید کرتے ہوئے نئی حکومت نے دیہی عوام کو سماجی اور معاشی انصاف دلانے کا یقینی بندوبست کرنے کی غرض سے دیہی علاقوں میں تیز رفتار ترقیاتی کاموں کے ذریعہ روزگار کے مزید مواقع مہیا کرنے کی پالیسی اختیار کی۔ موجودہ حکومت نے دیہی علاقوں کو غریبی کی دلدل سے نکالنے اور ان کا معیار زندگی بلند کرنے کے مقصد سے انتیودیہ اسکیم، بھرپور دیہی ترقیاتی اسکیم اور کام کے عوض اناج اسکیم شروع کی اور گاؤں میں دیہی اور چھوٹی صنعتوں کی ترقی کے لئے دیہی ترقیاتی مرکز قائم کیے۔ اس طرح دیہی زندگی کی تصویر کو بدلنے کی بھرپور کوشش کی گئی۔

پیداواری کاموں کے لیے مزید رقم

زراعت اور صنعتی پیداوار میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کرنے کے لئے سال ۱۹۷۷ـ۷۸ کے سالانہ منصوبہ کے لیے مختص ۶۷۵ کروڑ روپے کے مصارف میں سے زراعت، آبپاشی، بجلی اور صنعت کے لیے ۷۸ فیصد رقم متعین کی گئی تھی۔ اسی طرح سال ۱۹۷۸ـ۷۹ء کی سالانہ منصوبہ کے ۷۶۸ کروڑ روپیہ کے مصارف میں سے ریاست کی معیشت کے ان اہم زمروں کے لیے کافی رقم مختص کی گئی۔ زراعت اور متعلقہ زمروں کے لیے ۱۱۱٫۲۵ کروڑ روپیہ، آبپاشی کے لیے ۱۶۸ کروڑ روپیہ بجلی کے لیے ۲۷۵٫۸۹ کروڑ روپیہ اور دیہی صنعتوں کے لیے ۱۳٫۵ کروڑ روپیہ مہیا کیے گئے۔ سال ۱۹۷۹ـ۸۰ء کے سالانہ منصوبہ کے کل مصارف یعنی ۸۹۲ کروڑ روپیہ میں ان زمروں کے لیے ۷۵ فیصد رقم مختص کی گئی ہے۔

انسداد بدعنوانی کے لیے ٹھوس اقدامات

اقتدار میں آتے ہی موجودہ حکومت نے ریاست کے انتظامی ڈھانچے کو صاف ستھرا رکھنے کی بھرپور کوشش کی اس کے لیے اعلا عہدوں پر برسرکار ملازمین کے خلاف بدعنوانی کی جانچ کے لیے لوک آیکت کی تقرری کی گئی۔ انسداد

بدعنوانی سے متعلق مشنری کی کارگزاری کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جون ۱۹۷۷ء سے مئی ۱۹۷۹ء تک کی مدت میں ۴۳۰ چھاپے مارے گئے جن میں ۲۷۴ ملازمین کو رشوت لیتے ہوئے رنگے ہاتھوں گرفتار کیا گیا۔ اس کے علاوہ امن و قانون کے نفاذ پر مسلسل مستعدی، جرائم کی روک تھام کے لیے کئے گئے ٹھوس اقدامات اور جرائم کو روکنے کے لیے مختلف سطحوں پر پولیس ملازمین کو ذمہ دار قرار دینے کے باعث ریاست میں جرائم کی وارداتوں میں کافی کمی ہوئی ہے جیسا کہ اس سال یکم جنوری، ۱۵ مئی اور ۱۹۷۵ء کی اس مدت کے اعداد و شمار سے واضح ہو جاتا ہے۔ ڈکیتیوں کی تعداد ۱۹۶۰ سے گھٹ کر ۱۳۱۱، رہزنی کے واقعات ۳۶۷۵ سے گھٹ کر ۲۶۷۲، چوریوں کی تعداد ۱۶۷۹۱ سے گھٹ کر ۱۰۳۱۱ اور دیگر قابل دست اندازی جرائم کی تعداد ۹۵۴۳۸ سے گھٹ کر ۷۵۸۵۶ ہو گئی ہے۔ اس کے علاوہ پولیس کو چاق و چوبند بنانے اور ان کی فلاح و بہبود کے لیے بھی متعدد اقدامات کیے گئے۔

ہریجنوں کو انصاف

نئی حکومت نے ہریجنوں اور دیگر کمزور طبقوں کو مظالم سے پوری طرح تحفظ دینا اپنا فرض اولین قرار دیا ہے۔ اس لیے ضلع مجسٹریٹوں، سینیئر پولیس سپرنٹنڈنٹوں اور پولیس سپرنٹنڈنٹوں کو ان کی حفاظت کے لیے ذاتی طور سے ذمہ دار قرار دیا گیا ہے۔ ناقابل دست اندازی جرائم کی بھی فوری جانچ کرنے کے لیے ہدایات جاری کی گئی ہیں اور اس کے لیے ریاست اور ضلع کی سطح پر خصوصی سیل قائم کیے گئے ہیں۔ مظالم کے نتیجہ میں ہونے والے نقصانات کے لیے انھیں ۵۰۰ سے لے کر ۵۰۰۰ ہزار روپے تک کی مالی امداد فراہم کرنے کا بندوبست کیا گیا۔ ان طبقوں کو الاٹ کی گئی آراضی پر غیر قانونی طور سے قبضہ لینے کو قابل دست اندازی جرم قرار دینے کا سہرا اتر پردیش کے سر ہے۔ اس کے لیے جرمانہ یا تین سال تک کی سزا دینے کا بندوبست کیا گیا۔ بعض مقدمات میں انھیں قانونی صلاح دینے اور ان [illegible] حفاظت [illegible] بہبود سے متعلق قانون پر مسلسل نظر [illegible] پر ایک مانیٹرنگ رئیسرچ [illegible] کیا گیا۔

ان لوگوں کی سماجی، تعلیمی اور معاشی ترقی کے پروگرام کے لیے رقم کا خصوصی بندوبست کیا گیا ہے نیز سرکاری محکموں اور لوکل باڈیز سے ان طبقوں کی فلاح کے لیے اپنے بجٹ کی کم سے کم ۲۰ فیصد رقم مختص کرنے کے لیے کہا گیا۔ درجہ اول، دوم اور سوم کی سرکاری ملازمتوں میں ۱۵ اور درجہ چہارم کی ملازمتوں میں ۱۰ فیصد نشستیں پسماندہ طبقوں کی ۵۸ ذاتوں کے لیے محفوظ کی گئی ہیں جن میں اقلیتی فرقہ کی ۱۲ ذاتیں بھی شامل ہیں۔ بے زمین ہریجنوں اور دیگر کمزور طبقوں کو ۶۰۹۴۹۸ ہیکٹیر زمین الاٹ کی گئی۔ ذیل میں مندرجہ فہرست ذاتوں اور بے زمین کھیت مزدوروں کو زمین خریدنے کا بھی بندوبست کیا گیا ہے۔ ان طبقوں کے ۱۲۳۱۳۹ مستحق افراد کو رہائشی پلاٹ الاٹ کیے گئے۔

انتیودیہ

غریب ترین افراد کی معاشی ترقی کے لیے اس اسکیم کے پہلے مرحلے میں ۶ لاکھ دیہی خاندانوں کو مستفید کرنے کا پروگرام تھا جس میں سے ۲۸۲۹۹۹ خاندانوں کا انتخاب عمل میں آچکا ہے اور ان میں تقریباً ۱ کروڑ روپے تقسیم کیے گئے۔

مربوط دیہی ترقی

گاؤں کے کمزور طبقوں کو آمدنی اور روزگار کے مزید مواقع فراہم کرنے کی غرض سے گزشتہ سال ۳۸۴ ترقیاتی

بلاکوں میں شروع کئے گئے مربوط دیہی ترقی کے پروگرام کو مزید توسیع دی گئی اور اب مزید ۵۰ ترقیاتی بلاکوں کو اس کے دائرہ عمل میں لایا گیا ہے۔

گزشتہ دو برسوں میں ۳۳ء ۱۱ لاکھ ٹن اناج کے استعمال کے ذریعہ "کام کے عوض اناج اسکیم" کے تحت ۸۱ء ۲۱ کروڑ انسانی یوم کے بقدر روزگار پیدا کیا گیا۔ دسمبر ۷۸ء۱۹ تک

کام کے بدلے اناج

پانچ ہزار کیلومیٹر رابطہ سڑکیں اور ۱۲۳۲ پلیاں تعمیر کی گئیں اور پانی کی نکاسی کی ۱۲۰ اسکیمیں مکمل کی گئیں۔ اس طرح ۱۴ کروڑ روپیہ کے بقدر کام ہوا۔ سال ۷۸ ــ ۱۹۷۷ء میں ۹ لاکھ افراد کو چھوٹی صنعتوں میں روزگار فراہم کیا گیا۔ سال رواں میں مجوزہ نئے چھوٹے صنعتی واحدوں کے ذریعہ مزید ڈیڑھ لاکھ افراد کے لیے روزگار کا بندوبست کیا جائے گا۔ ادھر زمین کو قابل کاشت بنانے کے لیے آراضی تو بج تیار کرنے اور دیہی ترقیاتی مرکز اسکیم پر عمل درآمد کئے جانے سے توقع ہے کہ دیہی علاقوں میں روزگار کے مزید مواقع دستیاب ہو سکیں گے۔

کسانوں کو سہولتیں

کسانوں کو ۲۶ء ۱۱ ہیکٹر تک کی جوتوں پر مالگزاری سے چھوٹ اور ترقی آراضی ٹیکس کے خاتمہ کی شکل میں ان پر ٹیکس کے بارے میں ۴۳ کروڑ روپیہ سالانہ کی کمی کی گئی۔ دوسری چھوٹ کسانوں کو امداد باہمی قرض پر سود کی شرح میں کمی کرکے دی گئی۔ قلیل اور درمیانہ مدتی قرض پر سود کی شرح ۱۴ سے گھٹا کر ۱۲ فیصد اور طویل مدتی قرض پر ۵ء ۱۱ فیصد سے گھٹا کر ۵ء ۱۰ فیصد کر دی گئی ہے۔ کمزور طبقوں کو امداد باہمی قرض پر سود کی شرح میں ایک فیصد کی چھوٹ دی گئی۔

امداد باہمی تحریک

امداد باہمی تحریک کو عوامی بنیاد دینے کی غرض سے ریاست کے ۴۴ ۵ ۱۱۰ امداد باہمی اداروں میں براہ راست انتخابات کرائے گئے۔ امداد باہمی کے ذریعہ سال ۷۸ ــ ۱۹۷۷ء میں ۲۰۰ کروڑ روپیہ کے قلیل مدتی، ۱۵ کروڑ روپیہ کے درمیانی مدتی اور ۴ کروڑ روپیہ کے طویل مدتی قرضے تقسیم کئے گئے۔ توقع ہے کہ سال ۷۹ ــ ۱۹۷۸ء میں ۲۷۵ کروڑ روپیہ کے قلیل مدتی ۲۰ کروڑ روپیہ کے درمیانہ مدتی اور ۱۰ کروڑ روپیہ کے طویل مدتی قرضے تقسیم کئے جائیں گے۔

سال ۷۹ ــ ۱۹۷۸ء کی پہلی ششماہی میں ۱۱ کروڑ روپیہ کا زرعی قرض تقسیم کرکے امداد باہمی زمرہ میں ایک ریکارڈ قائم کیا گیا۔ قلیل مدتی قرض کی ۴۱۵ کروڑ روپیہ کی ضرورت پوری کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

قلیل مدتی قرض کا ۳۸ فیصد اور طویل مدتی قرض کا ۵۰ فیصد کمزور طبقوں میں تقسیم کیا جا رہا ہے۔ کسانوں کو گھر بیٹھے گودام کی سہولت دینے کے لیے ۲۶۰۰ گودام تعمیر کیے گئے ہیں اور ۴۶۰۰ کثیر مقصدی گوداموں کی تعمیر شروع کی گئی ہے۔ اس سال یکم جولائی سے شروع ہونے والے عوامی نظام تقسیم میں امداد باہمی انجمنیں اہم کردار ادا کریں گی

آبپاشی کی مزید سہولتیں

سال ۷۸ ــ ۱۹۷۷ء میں اتر پردیش میں ۴۴ء ۵ لاکھ

ہیکٹر آبپاشی صلاحیت پیدا ہوئی۔ جو ملک کی مجموعی آبپاشی صلاحیت کا ۲ء۷ فیصد تھی۔ یہ صلاحیت بڑی اور درمیانہ آبپاشی اسکیموں سے پیدا ہوئی۔ اسی طرح سال ۷۹-۱۹۷۸ء میں ریاست نے ۱۳ء۵ لاکھ ہیکٹر کے قومی نشانہ کی ۲۴ء۵ فیصد آبپاشی صلاحیت پیدا کی۔ سال ۷۸-۱۹۷۷ء میں پیدا شدہ آبپاشی صلاحیت چوتھے منصوبہ کی ۴ء۹ لاکھ ہیکٹر کی مجموعی صلاحیت سے بھی زیادہ تھی۔ ریاست میں آبپاشی کی سہولتوں کے لیے متعدد بڑی اور درمیانہ اسکیموں پر کام جاری ہے تاکہ یہاں کی اب تک غیر سیراب زمین کی پیاس بجھائی جا سکے۔

زمینی اور زیر زمین پانی کے مشترکہ استعمال کی غرض سے نئے نہر پراجکٹ شروع کیے گئے۔ اس سے وہ علاقے بھی مستفید ہوں گے جہاں ٹیوب ویلوں کی کثرت کی وجہ سے زیر زمین پانی کی سطح کم ہوتی جا رہی ہے۔ ریاست میں سرکاری ٹیوب ویلوں کی تعداد جو ۷۸-۱۹۷۷ء میں ۱۴۰۷۹ تھی سال ۷۹-۱۹۷۸ء میں ۱۵۶۳۳ ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی ان سے پیدا شدہ آبپاشی ۱۷ء۵۳ ہیکٹر سے بڑھ کر ۱۹ء۷۴ لاکھ ہیکٹر ہو گئی۔ اسی طرح چھوٹے نجی آبپاشی وسائل کی صلاحیت بھی ۷۵ء۱۲ لاکھ ہیکٹر سے بڑھ کر ۸۰ لاکھ ہیکٹر ہو گئی۔

مواضعات کو مزید بجلی

مسلسل کوششوں کے نتیجہ میں گزشتہ دو برسوں کے دوران بجلی کی تنصیبی صلاحیت میں ۷۰۵ میگا واٹ کے اضافہ سے ریاست کی مجموعی تنصیبی صلاحیت ۳۱۸۵ ہو گئی۔ سال ۸۰-۱۹۷۹ء میں تنصیبی صلاحیت میں ۶۲۲ میگا واٹ کا اضافہ کرنے، ۔۔۔۔ ۵ ٹیوب ویل اور پمپ سیٹ لگانے نیز ۴۹۰۰ مواضعات اور ۴۴۰۰ ہریجن بستیوں میں بجلی پہنچانے کی تجویز ہے۔ اس سال ۸ جنوری کو ریاست میں بجلی

کی پیداوار کا نیا ریکارڈ قائم کیا گیا۔ جبکہ ۳۱۹ کروڑ یونٹ کے زیادہ سے زیادہ لوڈ کے مطالبے کی تکمیل کی گئی اور ۲۲۵۶ میگا واٹ بجلی پیدا کی گئی۔ گزشتہ برسوں کی زیادہ سے زیادہ پیداوار صرف ۱۹۱۴ میگا واٹ تھی۔

دیہی ترقی سے متعلق کام کی حوصلہ افزائی کے مقصد سے دیہی علاقوں میں بجلی پہنچانے میں خصوصی توجہ دی جا رہی ہے۔ سال ۷۸-۱۹۷۷ء اور ۷۹-۱۹۷۸ء میں ربیع کی فصل کے دوران دیہی علاقوں کو بالترتیب ۱۶، اور ۲۰ گھنٹے یومیہ بجلی دی گئی۔ گزشتہ ڈیڑھ برس میں نجی ٹیوب ویلوں اور پمپ سیٹوں کے لیے ۱۳۰ میگا واٹ کے نئے بجلی کنکشن اور صنعتی صارفین کو ۲۷۵ میگا واٹ بجلی دی گئی۔

گاؤں گاؤں بجلی

زرعی پیداوار کا رکارڈ

زراعت کے میدان میں ریاستی حکومت کا اصل مقصد فی ہیکٹر پیداوار میں اضافہ کرنا، روزگار کے زیادہ مواقع کرنا، زمین پر انحصار کم کرنا اور زرعی ساز و سامان کی بروقت فراہمی کا یقینی بندوبست کر کے زیادہ زرعی پیداوار کے لیے کسانوں کی حوصلہ افزائی کرنا ہے۔ اسی پالیسی کا نتیجہ ہے کہ سال ۷۸-۱۹۷۷ء میں ۲۱۲ء۳ لاکھ میٹرک ٹن اناج

پیدا ہوا اور گزشتہ سال کے سیلاب کی تباہ کاری کے نتیجہ میں فصل کو پہنچنے والے نقصان کے باوجود ۱۹۷۸-۷۹ء کے دوران ریاست میں ۲۱۵ لاکھ میٹرک ٹن اناج کی پیداوار متوقع ہے۔ اس سال ۲۲۳ لاکھ میٹرک ٹن کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔

دال اور بناسپتی کی قیمت میں اضافہ کے رجحان کے پیش نظر ان کی پیداوار بڑھانے کے لیے خصوصی کوششیں کی گئیں تاکہ قیمتوں میں استحکام لایا جا سکے۔ تقریباً ۱۲ لاکھ ہیکٹیر اوسر زمین کو قابل کاشت بنانے کے لیے پانچ لاکھ بے روزگار بے زمین مزدوروں کی ایک آراضی فوج تیار کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اوسر زمین کو زرخیز بنانے کے لیے ترقی آراضی کارپوریشن کی تشکیل کی گئی ہے۔ کیمیاوی کھاد کے متوازن استعمال سے زمین کی زرخیزی میں اضافہ کرنے کے پروگرام کے تحت گزشتہ دو برسوں میں ۱۹ لاکھ میٹرک ٹن کیمیاوی کھاد تقسیم کی گئی۔ اس سال ۱۲٫۴۴ لاکھ میٹرک ٹن کیمیاوی کھاد کی تقسیم کا نشانہ ہے۔ امداد باہمی انجمنوں کے توسط سے ہی سال ۱۹۷۸-۷۹ میں ۱۰۴٫۵۴ کروڑ روپیہ اور سال ۱۹۷۷-۷۸ء میں ۷۷٫۱۹ کروڑ روپیہ کی مالیت کی کیمیاوی کھاد کی تقسیم کی گئی۔

صنعتی پالیسی میں تبدیلی

سرمایہ کاری اور شہری ضروریات پر مبنی صنعتوں کے بجائے محنت پر مبنی چھوٹی اور دیہی صنعتوں کو اولیت دینے کے نتیجے میں ریاست کی صنعتی تصویر میں بنیادی تبدیلی آنے کا امکان ہے۔ اس کے مطابق دیہی علاقوں میں چھوٹی اور گھریلو صنعتوں کے توسط سے روزگار کے زیادہ مواقع پیدا کیے جائیں گے اور ان صنعتوں کے قیام کے سلسلے میں ہر قسم کی سہولتیں اور رعایتیں دی جائیں گی۔ ریاست کے ہر ضلع میں صنعتی مرکز اور ۸۲ دیہی ترقیاتی مرکز قائم کر کے ایک نیا صنعتی ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ ان ترقیاتی مرکزوں کے لیے منتخب کیے گئے ۳۰۰۰ صنعت کاروں میں سے ۲۰۰۰ نے اپنے واحدے قائم کر لیے ہیں۔

سال ۱۹۷۶-۷۷ اور ۱۹۷۹-۸۰ کے دوران چھوٹی اور دیہی صنعتوں کے مصارف میں تین گنا اضافہ ہوا۔ سال ۱۹۷۶-۷۷ میں اس مد میں ۵٫۷۲ کروڑ روپیہ کے مصارف ۱۹۷۹-۸۰ کے دوران بڑھ کر ۱۷٫۳۵ کروڑ روپیہ ہو گئے۔ بے زمین ہریجنوں اور دیگر کمزور طبقوں کی حالت بہتر بنانے کے لیے دیوریا، جھانسی، المورہ، بلیا، فتح پور اور غازی پور میں انتیودیہ صنعتی امداد باہمی انجمنیں قائم کی جا رہی ہیں۔ قالین برآمد کرنے کے لیے ان کی تیاری کے لیے ۲۰۰ کروڑ روپیہ کی ایک زبردست اسکیم وضع کی گئی ہے۔ اس سال مزید آٹھ قالین کامپلکس قائم کیے جا رہے ہیں۔ کسٹم سے متعلق معاملات نپٹانے کے سلسلے میں سہولتیں فراہم کرنے اور برآمدات کو فروغ دینے کی غرض سے وارانسی میں "ایر کارگو کامپلکس" بھی جلد ہی شروع ہو جائے گا اور اسی قسم کا ایک کامپلکس کانپور میں بھی قائم کیا جائے گا۔

چھوٹی صنعتوں کی آلات سے متعلق ضرورتیں پوری کرنے کی غرض سے لکھنؤ میں ایک "ٹول روم" کھولا جا رہا ہے۔ پیتل کے برتنوں کی روایتی دستکاروں کی مدد کے لیے مراد آباد میں ۱٫۷۵ کروڑ روپیہ کی لاگت سے براس اسٹریپ رولنگ مل قائم کرنے کی تجویز ہے۔ ۱۵ لاکھ بنکروں کو روزگار فراہم کرنے والی ہینڈ لوم صنعت میں کپڑے کی مزید پیداوار اور بنکروں کو روزگار کی یقین دہانی کرانے کے لیے خصوصی پروگرام شروع کیے گئے ہیں۔ جنتا کپڑا اسکیم کے تحت سال ۱۹۷۸-۷۹ء میں ۸۰۰ لاکھ روپیہ کی مالیت کا کپڑا تیار کیا گیا جبکہ سابقہ سال میں صرف ۵۴۴ لاکھ روپیہ کی مالیت کا کپڑا تیار کیا گیا تھا۔

مزدوروں کی فلاح

مزدوروں کو یقینی طور پر سماجی معاشی انصاف دلانے

کے لیے مثبت اقدامات کیے گئے ہیں۔ ایمرجنسی کے دوران مزدوروں پر جو بندشیں عائد کی گئی تھیں انھیں ختم کر کے اپنے مطالبات کے سلسلہ میں آواز اٹھانے کا ان کا حق بحال کر دیا گیا۔ ایمرجنسی کے دوران مزدوروں پر کی گئی زیادتیوں کا ازالہ کیا گیا اور سبکدوش ملازمین کو بحال کر دیا گیا۔ بونس کی کم سے کم شرح چار فی صد سے بڑھا کر ۸٫۳۳ فی صد کر دی گئی۔ صنعتی امن برقرار رکھنے کی غرض سے ایک قانون وضع کیا گیا جس کے مطابق تنخواہ کے بقائے کو مال گزاری کے بقائے کی طرح وصول کرنے کا بندوبست کیا گیا۔

صنعتی تنازعات کو جلد نپٹانے کے لیے بھی ضروری اقدامات کیے گئے۔ تین مزید لیبر عدالتیں قائم کی گئیں اور تمام پریسائیڈنگ افسروں کو نجی معاملات کی بھی سماعت کرنے کا مجاز کیا گیا۔ لیبر عدالتوں کے فیصلوں کی خلاف ورزی کرنے والے آجرین کو سزا دینے کا بندوبست کیا گیا۔ ان عدالتوں کے فیصلوں کے خلاف آجرین کے دائر کیے گئے مقدمے لڑنے کا فیصلہ بھی حکومت نے کیا ہے۔ اگر آجرین مزدوروں کو کام دینے سے قاصر رہیں تو بعض زمروں کے مزدوروں کو غیر تقرری بھتہ دینے کا بندوبست بھی کیا گیا۔ شکر ملوں کے مزدوروں کی تنخواہ اور تغیر پذیر مہنگائی بھتہ میں اضافہ کیا گیا۔ اس کے علاوہ ۴۰ اداروں میں اجرت کی کم سے کم شرحیں مقرر کی گئیں۔ جسمانی طور پر معذور افراد کو کارخانوں میں ایک فیصد روزگار کا ریزرویشن دیا گیا اور یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ سبکدوش یا دوران ملازمت فوت ہو جانے والے مزدوروں کے زیر کفالت افراد کو روزگار دینے کے سلسلے میں اولیت دی جایے۔

مکمل نشہ بندی کی جانب

اتر پردیش میں یکم اپریل ۱۹۷۸ء سے ریاست کے پانچ پہاڑی اضلاع کے ساتھ ساتھ مزید سات اضلاع میں مکمل نشہ بندی نافذ کی گئی اور اس سال نو اضلاع اور دو دیگر اضلاع کے بعض حصوں کو مکمل نشہ بندی کے دائرۂ عمل میں شامل کیا گیا۔ مکمل نشہ بندی پروگرام کی کامیابی کے لیے آب کاری قوانین کو اور سخت بنایا گیا۔ تمام ریاست میں کلبوں میں نشہ آور مشروبات کا ذخیرہ کرنے، اس کے استعمال اور فروخت کو ممنوع قرار دیا گیا۔ ساتھ ہی عوامی مقامات پر نشہ آور اشیا اور گانجہ نیز تاڑی وغیرہ کے استعمال پر بندش عائد کی گئی۔

علاج وصحت کی سہولتوں میں توسیع

دور افتادہ دیہی علاقوں میں علاج وصحت کی سہولتوں میں اضافہ کرنے کی غرض سے ۲۲۲، ایلوپیتھک اور ۱۷۱ آیورویدک / یونانی / ہومیوپیتھک اسپتال قائم کیے گئے اور ۲۲۰۲ پلنگوں کا اضافہ کیا گیا۔ اب ریاست میں ان کی تعداد بالترتیب ۳۹۵۶ اور ۴۹۳۰۷ ہو گئی ہے۔ وارانسی، فیض آباد اور نینی تال انٹنسیو کارونری کیئر یونٹ قائم کیے گئے۔ ہندوستانی طریقہ علاج کو عظمت و افتخار کا درجہ دینے کی پالیسی کی تقلید کرتے ہوئے حکومت نے آیورویدک اور یونانی اسپتالوں کے میڈیکل افسروں کی شرح تنخواہ ایلوپیتھک میڈیکل افسروں کے مساوی کر دی۔

دیہی علاقوں میں ضرورت پڑنے پر فی الفور علاج کی غرض سے ۲ اکتوبر ۱۹۷۷ء سے ریاست کے ۱۸۵ ابتدائی صحت مرکزوں میں اجتماعی صحت تحفظ اسکیم شروع کی گئی۔ ۱۹۷۸-۷۹ء میں صحت تحفظ اسکیم کی توسیع مزید ۱۴۶ ابتدائی مرکزوں میں کی گئی اور اس سال ۲۳ ابتدائی صحت مرکزوں کو اس کے دائرہ عمل میں لایا جائے گا۔ علاج و صحت، اور صحت سے متعلق خدمات اور خاندانی فلاح پروگراموں کی کامیاب عمل آوری کے لیے ۴۳ ابتدائی صحت مرکزوں کو

ہر میڈیکل کالج سے ملحق کر دیا گیا ہے۔ علاج و صحت کی تعلیم میں معیاری سدھار کرنے کے لیے بھی خصوصی اقدامات کیے گئے۔ اس لحاظ سے ریاست کے ۱۵ ہومیوپیتھک کالجوں کو

بحالی اور مصنوعی اعضاء مرکز کا ایک وارڈ

سرکاری انتظام میں لیا گیا۔ ریاست میں ۶ سے ۸ سال تک کی عمر کے بچوں کو ڈپتھیریا، ٹٹنس، کالی کھانسی اور پولیو وغیرہ کی بیماریوں سے محفوظ رکھنے کے لیے خصوصی اقدامات کیے گئے۔ ریاست کے ۳۹ ضلعوں میں انسفلائٹس کی وبائی بیماری کی روک تھام کی گئی۔ خاندانی فلاح پروگرام کی عمل آوری کے لیے تعلیم و ترغیب کو خصوصی بنیاد بنایا گیا۔

پینے کے پانی کی فراہمی

گزشتہ دو برسوں میں ۳۱۰۰ سے زیادہ مواضعات کو پینے کے پانی کی سہولت مہیا کی گئی اور ۲۰۵۰ مواضعات کو اس سال یہ سہولت مہیا کی جائے گی۔ گاؤں بالخصوص ہریجن بستیوں میں پینے کے پانی کی سہولتیں مہیا کرنے کے لیے ایک مقررہ مدتی پروگرام کے تحت ۱۷۹۴۵ کنوئیں / ڈگیاں تعمیر کی گئیں۔ اس سال ۶۳۸۷ کنوئیں اور ۵۰۰ ڈگیاں تعمیر کی جائیں گی۔ سال ۷۸-۱۹۷۷ء کے آخر تک ریاست کی ۶۱۹ شہری لوکل باڈیز میں سے ۳۷۶ میں پینے کے پانی کی سہولت فراہم کی گئی۔ سال ۷۹-۱۹۷۸ء میں مزید ۲۰ شہروں میں پینے کے پانی کی فراہمی کا بندوبست کرایا گیا جبکہ اس سال ۱۱ قصبوں کو پینے کے پانی کی سہولت مہیا کی جائے گی۔

تعلیم کو نئی جہت

تعلیمی سہولتوں میں توسیع کرنے کے سلسلے میں دیہی علاقوں کو خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ ریاست میں اب نئے اسکول ان علاقوں میں ہی قائم کیے جائیں گے جہاں ابھی تک ان کی کمی رہی ہے اور بالخصوص ان علاقوں میں جہاں غریب اور کمزور طبقوں کے لوگ زیادہ تعداد میں رہتے ہوں۔ تعلیم کو ایک نئی جہت دینے کے لیے آئندہ تعلیمی سال سے درجہ اول سے بارھویں درجہ تک اخلاقی اور جسمانی تعلیم کو نصاب میں شامل کیا جا رہا ہے۔

ریاست میں بیسک جونیئر اسکولوں کی تعداد جو ۷۷-۱۹۷۶ء میں ۶۵۶۴۴ تھی ۷۹-۱۹۷۸ء میں بڑھ کر ۶۹۲۴۴ ہو گئی ۶۷۰۷۷ اور سینیئر بیسک اسکولوں کی تعداد ۱۰۷۸۳ سے بڑھ کر

تعلیم بالغان

۱۱۴۲۸ ہوگئی ہے۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے ۶۹ سرکاری ہائی اسکول قائم کیے گئے اور ۱۲ ہائی اسکولوں کو انٹرمیڈیٹ کالج کا درجہ دیا گیا۔ دیہی علاقوں کے ذہین طلباء کی حوصلہ افزائی کرنے کے لیے ۲۰ ضلعوں میں اقامتی تعلیمی اسکیم شروع کی گئی تھی جس کی توسیع گزشتہ سال مزید ۱۶ اضلاع میں کی گئی۔ تعلیم بالغان کے قومی پروگرام کے تحت ناخواندہ بالغوں میں تعلیم کی توسیع کے لیے بھرپور کوششیں کی گئیں۔ اعلا تعلیم کے میدان میں ایک نئے باب کا اضافہ کرنے کی غرض سے یونیورسٹیوں میں مقررہ وقت پر امتحانات منعقد کرکے تعلیمی سال کو باقاعدہ بنانے کے لیے موثر اقدامات کیے گئے۔ اس بات کا یقینی بندوبست کرنے کے لیے کوشش جاری ہیں کہ ۸۰-۱۹۷۹ کے تعلیمی سال کا آغاز ۱۵ اکتوبر ۱۹۷۹ء سے ہو۔

زیادہ سے زیادہ سڑکوں کی تعمیر

گزشتہ ۳۰ برسوں میں سڑکوں کی تعمیر کے سالانہ اوسط کے مقابلہ میں پچھلے دو برسوں میں اس پروگرام میں ہر سال پانچ گنا اضافہ ہوا۔ آزادی کے بعد کی مدت میں ۲۵۳۹۰ کیلومیٹر سڑکیں تعمیر کی گئیں۔ اس طرح

اناؤ۔کانپور روڈ پر گنگا ندی پر پل

اس طرح تقریباً ۸۰۰ سو کیلومیٹر سڑکوں کی اس اوسط تعمیر کے مقابلہ میں گزشتہ دو برسوں میں ۸۷۶۰ کیلومیٹر سڑکیں تعمیر کی گئیں جس کے نتیجہ میں سالانہ اوسط تقریباً ۴۰۰۰ کیلومیٹر تک پہنچ گیا۔ اس کے علاوہ ۷۶ پل تعمیر کیے گئے۔ چھٹے منصوبہ کی مدت میں ریاست کے وہ تمام مواضعات جن کی آبادی ایک ہزار سے زیادہ ہوگی بڑی سڑکوں سے مربوط ہوجائیں گے۔

بہتر نقل وحمل کی سہولتیں

ریاست کے ۱۶۲۴ قومیائے ہوئے راستوں پر چلائی جانے والی ۵۴۳۱ بسوں نے گزشتہ دو برسوں میں ۷۰ کروڑ میٹر کا فاصلہ طے کیا اور ان میں ۷۵ کروڑ مسافروں نے سفر کیا۔ گزشتہ دو سال کے دوران ٹرانسپورٹ بیڑے میں ۸۱۳ بسوں کا اضافہ کیا گیا اور اس سال مزید ۱۰۲۰ بسوں کا اضافہ کیا جائے گا۔ ریاست اور ضلع کے صدر مقام پر تسلیم شدہ صحافیوں کو ٹرانسپورٹ کارپوریشن کی بسوں میں مفت سفر کرنے کی سہولت فراہم کی گئی۔ اتر پردیش ٹرانسپورٹ کارپوریشن نے بھی پانچ سال تک کی عمر کے بچوں کو بسوں میں مفت سفر کی سہولت مہیا کی ہے۔

عالمی سال اطفال

عالمی سال اطفال کے سلسلہ میں بچوں کی نشوونما اور فلاح وبہبود کے لیے خصوصی پروگرام شروع کیے گئے اور ایک اطفال فنڈ قائم کیا گیا۔

سیلاب تحفظ اقدامات

سال ۱۹۷۸ء میں سیلاب کی تباہ کاریوں کی باعث پردیش کے ۵۵ اضلاع متاثر ہوئے اس چیلنج کا سامنا عزم

حوصلہ کے ساتھ کیا گیا۔ حکومت ہند سے پیشگی امدادی اسکیم کے تحت ۲،۹۲،۴ کروڑ روپیہ اور ۵۰۰۰ میٹرک ٹن گیہوں سیلاب سے متاثرہ افراد کو تقسیم کرنے کے لیے موصول ہوا۔ حکومت نے سیلاب سے متاثر ہونے والے لوگوں کے تحفظ کے لیے متعدد فوری اقدامات کیے اور ہر ممکن امداد سیلاب سے متاثرہ علاقوں کو پہونچائی۔

سیلس ٹیکس کو آسان بنانے کے اقدامات

ریاست میں سیلس ٹیکس اور خصوصی سروے دستوں کو ختم کرنے کے لیے بیوپاریوں کے ایک طبقہ کی ہڑتال سے پیدا ہونے والی صورت حال کے باعث صارفین کی دشواریوں کو دور کرنے کے لیے ضروری اشیاء فراہم کرنے کی غرض سے متبادل انتظامات کیے گئے۔ حکومت نے اس بات کو واضح کر دیا ہے کہ ریاست کی آمدنی کے اس اہم وسیلہ کی جن سے گذشتہ سال ۲۳۰ کروڑ روپیہ کی آمدنی ہوئی، صرف اترپردیش کے لیے اس وقت تک ختم کرنا ممکن نہیں ہوگا جب تک اس کا کوئی متبادل بندوبست نہ ہو جائے یا سمجھوتہ کے بعد ہڑتال ختم ہوگئی جس میں دیگر باتوں کے علاوہ حکومت نے اپنی اس خواہش کا اعادہ کیا کہ حکومت سیلس ٹیکس کو آسان بنانے اور بیوپاریوں کی جائز دشواریاں دور کرنے کو تیار ہے۔ سیلس ٹیکس کو آسان بنانے سے متعلق کمیٹی کی ۷۹ خصوصی سفارشات میں سے ۴۷ سفارشوں پر کارروائی ہو چکی ہے۔ وزیر اعلیٰ نے اس سلسلہ میں ایک اعلیٰ سطحی کمیٹی تشکیل کرنے کا اعلان بھی کیا ہے۔

ملازمین اور ٹیچروں کو راحت

ریاست میں سرکاری ملازمین، ٹیچروں، لوکل باڈیز کے ملازمین اور پنشنروں کو متعدد سہولتیں مہیا کی گئیں۔ سب سے اہم اقدام یہ کیا گیا کہ یکم جنوری ۱۹۷۱ء کو تین سال کی مسلسل ملازمت پوری کرنے والے ایڈھاک بنیاد پر نیز سرکاری ملازمین کی ملازمت کو باضابطہ بنا کر انھیں کام کرتے رہنے کا موقع مہیا کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ریاستی حکومت نے تنخواہ کمیشن کی تشکیل کا بھی فیصلہ کیا ہے۔

اترپردیش کی اس تصویر سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ترقی اور خوشحالی کی راہ پر گامزن ہونے، استحصال و عدم مساوات سے پاک و صاف سماج کے قیام اور معاشی ناانصافی کا خاتمہ کرکے دیہی علاقوں کی وسیع آبادی میں ایک نئی روح پھونکنے کے لیے موجودہ حکومت پُرعزم ہے۔

*

> اگر کوئی شخص دوسروں کے مقابلے میں خود کو افضل اور برتر سمجھتا ہے تو اس کا یہ جذبہ خدا اور انسان کی کی نظر میں گناہ کی حیثیت رکھتا ہے"
>
> ——— مہاتما گاندھی

شہنشاہ مرزا
۴۳ - وکٹوریہ اسٹریٹ
لکھنؤ

اتر پردیش اردو اکاڈمی

گذشتہ دو سال کی سرگرمیوں کا جائزہ

حکومت اتر پردیش نے اردو کی توسیع و ترقی کے لیے جنوری ۱۹۷۲ء میں اتر پردیش اردو اکاڈمی کی تشکیل ایک خود مختار اور رجسٹرڈ ادارے کی حیثیت سے کی تھی۔ اس وقت اس کا بجٹ محض پانچ لاکھ دس ہزار روپے تھا، اسے بعد میں بڑھا کر پہلے ۸½ لاکھ پھر دس لاکھ کر دیا گیا۔ ملک میں اردو کی ترقی کے لیے قائم کی جانے والی یہ پہلی اکاڈمی تھی جس کے بعد بہار، مہاراشٹر، آندھرا پردیش، مغربی بنگال، کرناٹک، راجستھان اور دوسری ریاستوں نے بھی اپنے اپنے یہاں اردو کی ترقی کے لیے اکاڈمیاں قائم کیں۔

ملک کی پہلی اردو اکاڈمی قائم کرنے کا حق بھی دراصل اتر پردیش کا ہی تھا۔ اول تو اس لیے کہ اتر پردیش ہندستان کا دل ہے، پھر یہی وہ ریاست ہے جہاں اردو پیدا ہوئی، پلی بڑھی اور پروان چڑھی اور اردو ہی اس ریاست کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کا جزو لازم ہے۔

سات سال کے قلیل عرصہ میں اتر پردیش اردو اکاڈمی کی سرگرمیوں کا دائرہ بے حد وسیع ہو گیا ہے۔ آج اکاڈمی کا ایک شاندار دفتر، اس کی چھوٹی سی خوبصورت لائبریری اور اس کے عملہ کو دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ اب سے سات سال پہلے جب ۷۲ء میں حکومت نے اردو اکاڈمی کی تشکیل کی اور جناب صباح الدین عمر کو اس کا سکریٹری مقرر کیا گیا تھا اکاڈمی کی حیثیت کاغذ کے چند صفحات سے زیادہ نہ تھی یعنی حکومت کا منظور شدہ اکاڈمی کا صرف دستور العمل تھا مگر اس کے علاوہ اُس کا نہ تو کوئی دفتر تھا اور نہ کوئی عملہ۔ چھ مہینے تک سکریٹری صاحب اکاڈمی کے سکریٹری سے لے کر چپراسی تک کے تمام فرائض انجام دیتے رہے اور اکاڈمی کو باقاعدہ چلاتے بھی رہے اور فیصلوں پر عمل درآمد بھی ہوتا رہا۔ اکاڈمی کی اُس وقت کی صدر بیگم حامدہ حبیب اللہ نے اکاڈمی کے دفتر کے لیے اپنے مکان کا ایک حصہ بخش کر دیا اور اس طرح اکاڈمی کا ایک دفتر عالم وجود میں آیا مگر اس وقت بھی کوئی عملہ نہیں تھا۔ جولائی ۷۲ء کے شروع میں پانچ افراد کے مختصر سے عملہ کی تقرری کی گئی اور اس طرح اکاڈمی کا کام اور آگے بڑھنا شروع ہوا۔

اکاڈمی نے اپنے قیام کی ابتدا سے ہی اردو تعلیم اور چلن کی راہ میں حائل دشواریوں کو دور کرنے پر سب سے زیادہ زور دیا۔ اردو کی نصابی کتابوں کے سلسلے میں حکومت کا ہاتھ بٹانا اور کتابیں تیار کرنا نیز چار ہزار اردو اساتذہ کی تقرری کے لیے حکومت کو آمادہ کرنا اردو اکاڈمی کے ابتدائی نوعیت کے دو اہم اور قابل ذکر کارنامے ہیں۔ اردو اکاڈمیوں کی ایک شاندار کُل ہند کانفرنس منعقد کر کے تیرہ ریاستوں کے لیے اردو کو علاقائی اور دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیے جانے کا حکومت ہند سے مطالبہ کرنا بھی اردو اکاڈمی کا ایک جرأتمندانہ کام تھا یہ کانفرنس نومبر ۷۶ء میں منعقد ہوئی تھی جس کا افتتاح سابق صدر جمہوریہ جناب فخر الدین علی احمد مرحوم نے کیا تھا۔

گذشتہ دو برسوں کے دوران اتر پردیش اردو اکاڈمی کی سرگرمیوں میں ایک نیا موڑ آیا ہے۔ "اردو ہفتہ تقریبات" سے لے کر "اردو کتابوں کے قومی میلہ" تک تقریبات کا ایک ایسا سلسلہ ہے جس کے ذریعہ اردو کے مقدمہ کو نہایت

جمہوری انداز میں عوام کی عدالت میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اردو کا پیغام گلی گلی اور گھر گھر پہنچانے کا عزم حوصلہ ظاہر کیا گیا ہے۔

اردو ہفتہ تقریبات اپنی نوعیت کے لحاظ سے منفرد حیثیت کی حامل تھیں۔ ان تقریبات کا انعقاد یکم مئی سے ۸ رمئی ۱۹۷۸ء تک سرزمین لکھنؤ کی تاریخی عمارتوں سفید بارہ دری، قیصر باغ اور بیلی گارد میں ہوا۔ ان تقریبات کے ذریعہ اردو دوستوں کے لیے رنگارنگ دلچسپیوں کے سامان بہم کردیئے گئے تھے۔ بارہ دری میں "اردو کی کہانی ۔۔۔ تصویروں کی زبانی" نمائش لگی ہوئی تھی۔ اس نمائش میں تصویروں کے ذریعہ اردو زبان کے آغاز وارتقا کی کہانی بیان کرتے ہوئے اس مشترکہ تہذیب کی جھلکیاں پیش کی گئی تھیں جو دو قوموں کے میل ملاپ اور ثقافتی لین دین کے ردعمل کے طور پر عالم وجود میں آئی تھی اور جس کا سب سے اعلیٰ نمونہ خود اردو زبان ہے۔ اس نمائش کے علاوہ اس موقع پر غالب نمائش اور اقبال نمائش کا بھی اہتمام کیا گیا۔ یہ اپنے طرز کی پہلی نمائش تھی جس کے ذریعہ اردو زبان کی تاریخ تصویروں کے سہارے بیان کی گئی۔ اس نمائش کے ساتھ ہی ساتھ "روشنی اور آواز" کے پروگرام کا بھی اہتمام کیا گیا۔ عکس اور آواز، نور و نغمہ اور سحر و اعجاز کا عجب سماں اُن دنوں لکھنؤ کے شہریوں نے دیکھا۔ اس پروگرام میں عکس اور آواز کے ذریعہ اردو کی ابتدا سے لے کر آج تک کی کہانی تمثیلی انداز میں دکھائی گئی تھی۔ عکس اور آواز کے اس پروگرام نے لکھنؤ میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کرلی اور ہر شام بیلی گارد کے میدان میں بیس پچیس ہزار آدمی اس اچھوتے پروگرام کو دیکھنے کے لیے جمع ہوجاتے تھے۔ بیلی گارد ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ایک یادگار عمارت ہے۔ اس کے کھنڈر اور ٹیلے "روشنی اور آواز" کے پروگرام کو پیش کرنے کے لیے نہایت معاون ثابت ہوئے۔ اس تمثیلی ڈرامہ کا خاکہ اکاڈمی کے جوان سال چیرمین پروفیسر محمد حسن نے لکھا تھا اور اس کے ہدایت کار "ہم سب ڈرامہ گروپ کے لیے" عرفان عسکری تھے۔

نمائش نیز روشنی اور آواز کے پروگرام کے علاوہ اس موقع پر بارہ دری کے لان پر روزانہ کسی نہ کسی ادبی نشست کا انعقاد بھی ہوتا رہا جن میں ملک کے ممتاز ادیبوں اور شاعروں، مثلاً حیات اللہ انصاری، مجتبیٰ حسین، معین احسن جذبی، باقر مہدی، ندا فاضلی، اقبال مجید، احمد جمال پاشا، گیان چند، رام لعل، قمر رئیس، شہاب جعفری، نازش پرتاب گڑھی، رتن سنگھ، اور دوسرے ممتاز ادیبوں نے حصہ لیا۔

اکاڈمی نے اگست ۱۹۷۸ء میں برصغیر کے ممتاز شاعر فیض احمد فیض کا لکھنؤ میں استقبال کیا۔ انھیں بارہ دری میں لکھنؤ کے شہریوں کی جانب سے شاندار استقبالیہ دیا گیا۔ جس میں بہت بڑی تعداد میں اردو دوستوں نے شرکت کی۔ نومبر ۱۹۷۸ء میں اردو اکاڈمی نے ممتاز بزرگ نقاد پروفیسر کلیم الدین کو تین توسیعی خطبات پڑھنے کی دعوت دی اور پروفیسر کلیم الدین نے افلاطون، ارسطو فینیز ہوریس اور لان جائنس کے تنقیدی نظریات پر توسیعی خطبے پیش کیے۔ یہ اپنی نوعیت کا پہلا خالص علمی پروگرام تھا جسے اکاڈمی نے پیش کیا۔ ان تینوں خطبات کی صدارت کے فرائض پروفیسر نریش چندر نے سرانجام دیے۔ اردو کے عام طالب علموں اور ریسرچ اسکالروں کے لیے ان خطبوں کی زبردست اہمیت ہے۔

ستمبر ۱۹۷۹ء میں اتر پردیش اردو اکاڈمی نے ایک اور بڑا قدم اٹھایا، جب وزیر اعظم ہند شری مرارجی دیسائی کے ہاتھوں اتر پردیش اردو اکاڈمی کے کتب خانہ کا افتتاح ہوا۔ اکاڈمی کا ایک اپنا اردو کتب خانہ ہونا چاہیے جو سارے ہندوستان کے لیے اردو کتابوں کے لحاظ سے ایک مثالی

حیثیت کا حامل ہو، یہ اکاڈمی کا ایک بہت پرانا خواب تھا۔ اس کتب خانہ کے قیام کا اصل مقصد تحقیق و تدوین کا کام کرنے والے ادب کے طالب علموں، ریسرچ اسکالروں اور اساتذہ کے لیے ہر لحاظ سے یادگار کتب خانہ فراہم کرنا ہے۔ اس کتب خانہ میں عنقریب ایک زیروگراف مشین اور مائکرو فلم ریڈر کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں انڈیا آفس لائبریری میں محفوظ اردو مخطوطوں کی مائکرو فلم کاپیاں اکاڈمی حاصل کر چکی ہے۔ دوسری جگہوں سے بھی اس قسم کے قیمتی علمی خزانہ کو حاصل کر کے یکجا کرنے کا ارادہ ہے۔

اکاڈمی کا ایک قابل ذکر کارنامہ اپنے زیر اہتمام ایک "سیل ڈپو" کا قیام بھی ہے۔ سیل ڈپو کے ذریعہ ان لوگوں کو بہت مدد مل رہی ہے جن کے پاس کتابوں کی نکاسی کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ اس سیل ڈپو کے ذریعہ اکاڈمی کی اپنی امداد سے شائع شدہ اور انعام یافتہ کتابوں کی فروخت میں بھی بہت مدد مل رہی ہے۔

اکاڈمی نے اپنے "خبر نامہ" کو بھی ادبی اور علمی حیثیت دے دی ہے۔ اس ماہانہ خبر نامہ کو بڑے سائز کے ۲۴ صفحات پر شائع کیا جاتا ہے اور اس میں علمی و ادبی مضامین بھی شائع ہوتے ہیں نیز افسانوں اور غزلوں کے علاوہ اس میں اردو دنیا سے متعلق مختلف نوعیت کا معلوماتی مواد بھی ہوتا ہے۔

اکاڈمی کی کتابوں کی اشاعت میں بھی اس عرصہ میں قابل ذکر اضافہ ہوا ہے۔ گذشتہ دو برسوں میں اکاڈمی ۲۵ کتابیں شائع کر چکی ہے۔ ان میں بعض ایسی نایاب کتابیں بھی ہیں جو عرصہ سے بازار میں نہیں مل رہی تھیں مگر جن کی مانگ بہت زیادہ تھی۔ روح نظیر، مراۃ الشعر، تنویر الشمس، سخن دان فارس، گنجینۂ تحقیق، سریلی بانسری اور جہان آرزو وغیرہ کچھ ایسی اہم کتابیں ہیں جنھیں شائع کر کے اکاڈمی نے ایک بہت بڑی کمی کو پورا کیا ہے۔ ماہانہ خبر نامہ کے ساتھ ہی ساتھ اتر پردیش اردو اکاڈمی کا ایک سہ ماہی ادبی رسالہ "اکاڈمی" بھی عنقریب شائع ہونے جا رہا ہے جس میں خالص علمی و ادبی مضامین شائع ہوا کریں گے۔

۲۰ اپریل سے ۲۶ اپریل ۷۹ء تک اردو اکاڈمی نے نیشنل بک ٹرسٹ کے تعاون سے اردو کتابوں کے ایک بڑے میلہ کا قیصر باغ بارہ دری میں اہتمام کیا۔ یہ میلہ اپنی نوعیت کا انوکھا میلہ تھا جس میں ہندوستان کے تقریباً سارے اہم پبلشر اپنی تازہ اور نئی کتابوں کے ساتھ شریک ہوئے۔ اس موقع پر بارہ دری کے وسیع و عریض ہال کو کتابوں کے چھوٹے بڑے اسٹالوں سے سجایا گیا تھا۔ ہندستان میں اردو کتابوں کا یہ پہلا میلہ تھا۔ اس میلہ کے موقع پر اردو اکاڈمی نے متعدد سمیناروں، ادبی مباحثوں اور مختلف تقریبات کا بھی اہتمام کیا۔ ان تقریبات میں ادبی رسائل کے مدیروں کا سمینار سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اردو کے ادبی رسائل کے مسائل پر غور و خوض کرنے کی کوشش ہندستان بھر میں سب سے پہلے اتر پردیش اردو اکاڈمی نے ہی کی۔ اردو اکاڈمی کے ہال میں، اس سمینار میں شرکت کرنے کی غرض سے گوپال مثل، خلیق انجم، شہباز حسین، ضیاء الحسن فاروقی، شین مظفر پوری، شاہد ماہلی، ابوالکلام قاسمی، عبدالصمد، افتخار امام، مسعود الحسن عثمانی، عابد سہیل، عتیق احمد عتیق، وقار خلیل، کمار پاشی، شیخ علی حسن، فرخ جعفری، علی احمد فاطمی اور مسز روشن آرا صاحبہ نے ادبی رسائل کو درپیش مختلف مسائل پر فکر انگیز مقالے پیش کیے۔ اس سمینار میں ادبی رسالوں کے مدیروں کی ایک کل ہند انجمن کی تشکیل بھی کی گئی۔ اس کے علاوہ اردو پبلشروں کی کانفرنس، لائبریریوں کے سربراہوں کی کانفرنس، لٹریری کوئیز، بیت بازی اور ایک شعری نشست کا اہتمام بھی کیا گیا۔ یہ شعری نشست بہت ہی کامیاب ثابت ہوئی جو رات بھر

جاری رہی اور تقویم اور تاخیر سے بالاتر ہوکر اس نشست میں تقریباً ستر سے زائد شعرا نے اپنا کلام سنایا۔ لکھنؤ کی تاریخ میں اتنی بڑی تعداد میں شعرا اس سے قبل شاید یکجا ہوئے تھے۔ اردو زبان و ادب سے دلچسپی رکھنے والے اردو دوستوں کی ایک بہت بڑی تعداد نے ان تقریبات میں شرکت کی اور ۱۹۷۰ء کے بعد شائع شدہ اردو کی تقریباً تین ہزار کتابوں کو یکجا دیکھا۔ اس میلے کی کامیابی پر تبصرہ کرتے ہوئے ممتاز بزرگ ادیب کوپال متل نے کہا کہ اردو کتابوں کا قومی میلہ ڈاکٹر محمد حسن کا اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ ان کی نجات کے لیے یہی کافی ہے۔

ان رنگا رنگ تقریبات اور ادبی اجتماعات کے علاوہ اکاڈمی کے دائرۂ عمل میں دیگر اہم اور مفید امور بھی شامل ہیں جن کے ذریعہ یہ ادارہ خاموشی کے ساتھ اردو کی خدمت انجام دے رہا ہے۔ اردو زبان کی ترقی و ترویج کے سلسلے میں شاید ہی کوئی کام ایسا رہا ہو جو اس کے دائرۂ عمل میں نہ آتا ہو۔ اکاڈمی ریاست کے رجسٹرڈ عوامی کتب خانوں کو اردو رسائل، کتابیں اور اخبار خریدنے کے لیے ہر سال مجموعی طور پر ایک لاکھ دس ہزار روپیے کی مالی امداد تقسیم کرتی ہے۔ ملک میں شائع ہونے والی منتخب کتابوں پر ان کے مصنفین کو ہر سال ایک لاکھ روپیے سے بھی زیادہ کی رقم تقسیم کی جاتی ہے۔ ریاست کے مصنفین کو ان کے مسودات کی طباعت میں مالی امداد دے کر ان کی کتابوں کے شائع ہونے میں مدد دینا اکاڈمی کی ایک مفید و مقبول اسکیم ہے۔ اس کے تحت اب تک دو سو سے بھی زائد کتابیں شائع ہوکر منظر عام پر آچکی ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ ریاست کے عمر رسیدہ اور ضرورت مند مصنفین کو علاج و معالجہ کے لیے یکمشت اور ماہانہ مالی امداد دینے کا سلسلہ بھی جاری ہے جس کے ذریعہ حاجت مند اور معمر مصنفین کو کافی امداد فراہم ہوجاتی ہے۔ اردو طلبہ کو درجہ چھ سے لے کر ایم اے تک اور اردو کے ریسرچ اسکالروں کو ایک محدود تعداد میں وظائف دینے کی اسکیم اکاڈمی کی مقبول عام اسکیم ہے جس کے تحت ہر سال تقریباً دو لاکھ روپیہ خرچ کیا جاتا ہے۔ اکاڈمی اردو کتابت کا ایک تربیتی اسکول بھی چلاتی ہے جس میں کتابت سیکھنے کے خواہش مند طالب علموں کو دو سالہ کتابت کورس کی تربیت دی جاتی ہے۔ ان طلبہ کو اس کے لیے وظیفہ بھی دیا جاتا ہے۔

ان اہم اور ضروری امور کے علاوہ اکاڈمی کا یہ ارادہ بھی ہے کہ وہ بڑے پیمانے پر اردو کی سستی کتابیں شائع کرے۔ عوامی ادبی سلسلے کے تحت اس قسم کی ایک کتاب شائع بھی ہوئی ہے بہت سی مزید کتابیں شائع کرنے کا ارادہ ہے۔ اس کے علاوہ غیر اردو داں حلقہ میں اردو کی نشر و اشاعت کی ایک اسکیم پر بھی عمل درآمد کیا جارہا ہے۔ اکاڈمی اپنا ایک شاندار پریس بھی قائم کرنے جارہی ہے۔ اردو مراسلاتی تربیتی کورس چلانے کا بھی ارادہ ہے۔ اس مراسلاتی کورس کے ذریعہ ایسے افراد کو اردو خط و کتابت کے ذریعہ سکھائی جائے گی جو کاروبار اور دوسرے کاموں میں لگے ہوئے ہیں اور گھر بیٹھے اردو تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

اتر پردیش اردو اکاڈمی کی سات سالہ سرگرمیوں کے مندرجہ بالا مختصر جائزہ سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اکاڈمی جن اغراض و مقاصد کے تحت قائم کی گئی تھی ان کی تکمیل میں اس نے بڑی حد تک کامیابی حاصل کرلی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں سمجھنا چاہیے کہ اس کا کام ختم ہوچکا ہے۔ اس کے حوصلے بہرحال بلند ہیں اور وہ اپنے بلند مقاصد کی تکمیل کے لیے برابر کوشاں ہے۔ گذشتہ دو برسوں میں اس کی کارگزاریوں میں جو قابل ذکر اضافہ ہوا ہے اور جس طرح اس نے نئی نئی اسکیموں پر عمل درآمد شروع کیا ہے اس کے پیش نظر اکاڈمی کی گرانٹ میں اضافہ اب ناگزیر ہوگیا ہے۔ وزیراعظم ہند کی موجودگی میں حکومت اتر پردیش سے اس اضافہ کے لیے درخواست کی جاچکی ہے۔

★

شہاب خالد
گوئین تالاب۔ امین آباد لکھنؤ

شراب بندی

حکومت اتر پردیش کا ایک اہم کارنامہ

شراب نوشی ایک ایسی تباہ کن عادت ہے جس کی زد میں نہ صرف شراب پینے والا آتا ہے بلکہ اس کا پورا کنبہ تباہی اور بربادی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اسی لیے شاید شاعروں نے بھی اسے 'خانہ خراب' کہا ہے۔ شراب پینے والا اپنے عقل و ہوش کھو بیٹھتا ہے' وہ اپنے کو اور اپنے گھر کو تباہ ہوتے دیکھتا رہتا ہے لیکن وہ اس بری عادت سے اپنے کو نجات نہیں دلا پاتا۔

اس کے معصوم بچے نہ صرف اچھی تعلیم و تربیت سے محروم ہو جاتے ہیں بلکہ بعض صورتوں میں تو دیکھا گیا ہے کہ باپ کی اس بری عادت سے وہ جھگڑے لگانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنی بیوی بچوں کی سرپرستی کرنے کے بجائے ان کے لیے ایک مستقل مصیبت بن جاتا ہے وہ شراب کے نشے میں رات گئے اول فول بکتا گھر آتا ہے اور گھر آتے ہی ہنگامہ برپا کر دیتا ہے۔ بے گناہ بیوی پر گالیوں کی بوچھار کر دیتا ہے اور سہمے ہوئے بچے اس کی ڈانٹ پھٹکار سے دم بخود ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنے بیوی بچوں کے لیے باعث راحت بننے کے بجائے عذاب جان بن جاتا ہے۔ گھر کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ بیوی کا زیور بکنے کے بعد گھر گرہستی بکنے کی نوبت آجاتی ہے وہ پیسہ جو بال بچوں کے کھانے پینے پر صرف ہونا چاہیے تھا وہ اس شراب کی خریداری پر صرف ہوتا ہے جس سے خود پینے والے کی صحت تباہ ہونے کے ساتھ ساتھ پورا گھر تباہ ہو جاتا ہے۔

شراب پینے والا صرف اپنے اور اپنے گھر والوں ہی کے لیے پریشانی کا باعث نہیں ہوتا بلکہ پاس، پڑوس اور محلے والوں کے لیے بھی مصیبت بن جاتا ہے۔ وہ آئے دن شراب کے نشے میں محلے میں ہنگامہ برپا کرتا رہتا ہے جس سے محلے والوں کی نیند حرام ہو جاتی ہے اور ہر وقت انھیں ڈر لگا رہتا ہے کہ وہ کوئی ہنگامہ نہ کھڑا کر دے۔ سچ پوچھیے تو شراب کی عادت کا شکار پورے سماج کے لیے ایک دردِ سر بن جاتا ہے۔ وہ نہ تو وقت سے اپنے کام پر جا پاتا ہے اور نہ وہ مستعدی سے اپنا کام انجام دیتا ہے۔ لاپروائی کے ساتھ کام کر کے وہ اپنے اور دوسروں کے لیے خطرے کا باعث بنا رہتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی موٹر ڈرائیور شراب نوشی کی بری عادت کا شکار ہے تو وہ کسی وقت بھی اپنی جان کے ساتھ اس پر بیٹھے ہوئے دوسرے لوگوں کی جان خطرے میں ڈال سکتا ہے۔ شراب نوشی کے انہی تباہ کن اثرات کی بنا پر دنیا کے تمام مذہبوں میں اس خراب عادت کی مذمت کی گئی ہے اور اس سے دور بھاگنے اور پرہیز کرنے کی واضح ہدایت کی گئی ہے۔

چنانچہ مسلمانوں کے مذہب میں شراب کا پینا ہی نہیں بلکہ اس کا چھونا تک حرام قرار دیا گیا ہے اور اس سے پرہیز کرنے کی سخت ہدایت کی گئی ہے اسی طرح بدھ مذہب میں اس سے دور بھاگنے کی تلقین کی گئی ہے۔ مہاتما بدھ نے اس کے بارے میں کہا ہے کہ تم چاہے شیر سے نہ ڈرو لیکن شراب سے دور رہو کیونکہ یہ شیر سے زیادہ خطرناک چیز ہے۔ شیر کے ہاتھ سے زخمی ہونے والا تو ٹھیک ہو سکتا ہے لیکن شراب کے پنجے میں پھنس جانے والا اس کی گرفت سے کبھی نہیں نکل پاتا۔ اور دوسرے مذاہب میں بھی شراب نوشی کی مذمت کی گئی ہے

جاتا تما جین نے بھی اس کی برائی کی ہے اور کہا ہے کہ انسان شراب کے نشے میں مبتلا ہو کر شرمناک باتیں کرنے لگتا ہے اس لیے شراب کے قریب نہیں جانا چاہیے ۔ اسی طرح گرو نانک جی نے بھی شراب نوشی کو برا کہا ہے اور بتایا ہے کہ یہ انسان کو شیطان بنا دیتی ہے غرض دنیا کا کوئی ایسا مذہب نہیں ہے جس نے شراب نوشی کو برا نہ قرار دیا ہو ۔

جہاں تک ہندستان کا تعلق ہے یہ ہمیشہ سے روحانی پیشواؤں کا گہوارہ رہا ہے جنھوں نے نہ صرف شراب سے بلکہ تمام لذتوں سے منھ موڑ کر گیان دھیان اور نیک کاموں پر توجہ کرنے پر زور دیا ہے اور سادہ اور صاف ستھری زندگی بسر کرنے کی ہدایت کی ہے ۔ انہی کی اعلا تعلیم کا نتیجہ ہے کہ بھارت میں اب بھی شراب اور شراب پینے والوں کو سماج میں اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا ۔ اسی لیے یہاں شراب پینے والے بھی شراب چھپ چھپا کر پیتے ہیں ۔ خوشی کی بات ہے کہ یہاں دوسرے ممالک کے مقابلے میں شراب پینے والوں کی تعداد بہت کم ہے ۔ اعداد و شمار سے معلوم ہوا ہے کہ ہندستان میں شراب پینے والے یہاں کی آبادی کے دس فی صدی سے بھی کم ہیں اس کے برخلاف دوسرے ملکوں میں شراب پینے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے بعض ملکوں میں تو آبادی کی اسّی فی صدی اس بری عادت میں مبتلا ہیں ۔

ہندستان میں ایک عرصہ تک برطانی حکومت رہی ہے جس کی وجہ سے یہاں کے لوگوں نے جہاں اپنے حاکموں کی اور دوسری باتوں کی نقل کی وہاں شراب نوشی کو بھی ترقی پسندی کی نشانی سمجھ کر اختیار کر لیا ۔ رفتہ رفتہ یہ بری عادت دولت مند اونچے طبقے کے علاوہ اوسط اور نچلے طبقے کے لوگوں تک پہونچ گئی اور ان کی تباہی اور بربادی کا باعث بن گئی ۔ لیکن ہندستانی سماج نے ابھی اسے قبول نہیں کیا ہے اور عام طور پر لوگ اسے ایک بری عادت خیال کرتے ہیں ۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کے خلاف بھرپور مہم میں کوئی تاخیر نہ کی جائے ابھی اس کے خلاف ملک میں فضا پائی جاتی ہے اس لیے مہم کو کامیاب بنانے میں آسانی ہوگی اور جتنا وقت گزرتا جائے گا اس کی راہ میں دشواریاں بڑھتی جائیں گی ۔

گاندھی جی کی رائے

گاندھی جی شراب نوشی کے ہمیشہ سے خلاف رہے ۔ ان کے خیال میں شراب سب برائیوں کی جڑ ہے ۔ وہ چاہتے تھے کہ ملک جتنی جلد اس بری عادت سے نجات پا جائے اتنا ہی اچھا ہے ۔ انھوں نے کانگرس کے لوگوں کو آمادہ کیا کہ وہ اور دوسرے مقاصد کے ساتھ ساتھ شراب بندی کو بھی اپنا مقصد بنائیں چنانچہ ۱۹۲۰ء میں کانگرس نے شراب کے خلاف مہم کو اپنا مقصد قرار دیا اور اس کے خلاف پرچار شروع کر دیا ۔ شراب کے خلاف عوام میں پروپگنڈا کرنے کے ساتھ ساتھ ستمبر ۱۹۲۵ء میں اس نے مرکزی قانون ساز اسمبلی میں شراب بندی کے خلاف ایک غیر سرکاری تجویز منظور کرائی ۔ اس سلسلہ میں دوسرا اقدام ۱۹۳۷ء میں اس وقت کیا گیا جب قانون ہند کے تحت مختلف صوبوں میں عوامی حکومتیں قائم ہوئیں انھوں نے شراب بندی کے خلاف قانون بنائے لیکن ابھی قانون پر اچھی طرح عمل درآمد کی نوبت بھی نہیں آئی تھی کہ ۱۹۳۹ء میں جنگ عظیم کے بادل چھا گئے اور صوبوں میں کانگرسی حکومتوں نے استعفا دے دیا جس کی بنا پر شراب نوشی کے خلاف کارروائی آگے نہ بڑھ سکی اور ایک عرصہ تک کوئی ٹھوس قدم اس کے خلاف نہ اٹھایا جا سکا ۔ ۱۹۴۷ء میں جب ملک کو آزادی حاصل ہوئی تو پھر اس اہم مسئلہ کی طرف توجہ کی گئی اور دستور ہند کی دفعہ ۴۷ کے تحت ملک میں نشہ بندی کو مقصد بنایا گیا ۔ مختلف صوبائی حکومتوں نے شراب نوشی کے خلاف اقدامات کیے اور کچھ صوبوں میں جزوی شراب بندی رائج کی گئی ۔

شراب بندی کے خلاف مہم کی مخالفت ظاہر ہے کہ کسی معقول حلقے کی جانب سے نہیں کی جا سکتی ۔ اس کی مخالفت میں بعض حلقے صرف یہ کہتے ہیں کہ شراب ٹیکس صوبائی حکومتوں کا ایک اہم ذریعہ آمدنی ہے ۔ شراب بندی کی صورت میں ریاستی حکومتیں اس ذریعہ آمدنی سے محروم ہو جائیں گی جس کی بنا پر انھیں مالی دشواری کا سامنا کرنا پڑے گا اور ضروری تعمیری کاموں میں رکاوٹ پڑ جائے گی

لیکن وہ لوگ جو یہ دلیل پیش کرتے ہیں وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ شراب پینے والوں کی وجہ سے جو حادثات اور جرائم ہوتے ہیں ان کی روک تھام میں انھیں شراب ٹیکس سے ہونے والی آمدنی سے کہیں زیادہ صرف کرنا پڑتا ہے۔ اگر شراب بندی کی اسکیم پوری طرح کامیاب ہو جائے تو جرائم اور حادثات میں خاطر خواہ کمی ہو سکتی ہے۔

خوشی کی بات ہے کہ موجودہ حکومت شراب بندی کی طرف خاص توجہ مبذول کر رہی ہے۔ وزیر اعظم مرارجی ڈیسائی شراب بندی کے بڑے حامیوں میں رہے ہیں انھوں نے شراب نوشی کی روک تھام کے لیے ٹھوس اقدامات کیے ہیں۔ اتر پردیش کی حکومت بھی شراب بندی کے لیے قدم اٹھا رہی ہے۔ اس نے کلبوں کے اندر شراب رکھنے اور اس کے فروخت کیے جانے پر پابندی لگا دی ہے اس کے علاوہ ۱۲ اضلاع کو شراب بندی کے تحت لایا گیا ہے جس سے امید پائی جاتی ہے کہ شراب نوشی میں خاطر خواہ کمی ہو گی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ عوام بھی اس سلسلے میں پورا تعاون دیں۔ کیونکہ کوئی اسکیم بھی عوام کی حمایت کے بغیر پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکتی۔

★

دُعا

عقیل الرحمٰن عقیل
۲۸۱-۲-۲۳ سلطان شاہی
حیدرآباد ۵۰۰۲۶۵

زندگی، جہد و محنت سے روشن رہے
پیار کا دیپ جلتا رہے ہر نفس
آدمیت فروزاں رہے :
آگہی کا جنوں زینہ زینہ بڑھے
اور خرد کی جبیں مسکراتی رہے
دستِ محنت سے غنچے چٹکتے رہیں
پیار کی چاندنی جگمگاتی رہے
حرفِ غم، ماتم آرزو ختم ہو

سب کے ہونٹوں پہ مسکان پھولے پھلے
اور انسانیت پھر سے اِترائے
پرچم وفا کے اڑیں :
دیس گلنار ہو،
چار سو رنگ اور نور کے دیپ جلتے رہیں
ایسی تقدیر سب کی بنے :
صرف اتنی دعا ہے جو مقبول ہو :
دوستو! آؤ ہم ہاتھ اٹھائیں کہ اب
ختم ہو تیرگی، روشنی، روشنی

اقبال صدیقی،
(جرنلسٹ)
محمد علی لین لکھنؤ۔

علوم مشرقیہ کی تعلیم اور توسیع و ترقی

موجودہ حکومت کا ایک کارنامہ

۱۸۶۴ء میں کیننگ کالج کے قیام کے ساتھ شعبۂ علوم مشرقیہ عربی و فارسی و شعبہ علوم مشرقیہ سنسکرت بھی قائم کیے گئے۔ ۱۹۲۰ء میں لکھنؤ یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا اور کیننگ کالج کے ساتھ یہ دونوں شعبے بھی لکھنؤ یونیورسٹی کے زیر انتظام آ گئے۔

بانیان کالج نے ناخواندگی کے خاتمہ کے لیے کثیر رقم اور جائداد ان اداروں کے چلانے کے لیے بینکوں میں محفوظ کر دیں۔ اس طرح فارسی عربی اور سنسکرت کی قدیم مشرقی طرز پر اعلا تعلیم کے ایک بہتر بندوبست کے ساتھ ان طلبا کے لیے دروازے کھل گئے جو سماجی کمزوریوں کی وجہ سے اعلا تعلیم حاصل کرنے سے مجبور و محروم تھے۔ کیونکہ ان شعبوں میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبا سے کسی قسم کی ٹیوشن فیس نہیں لی جاتی تھی۔ یہ طریقہ بانیان کی وصیت اور منشا کے بموجب اب تک جاری ہے۔ ان شعبوں میں جدید و قدیم عربی و فارسی اور سنسکرت ادبیات کے علاوہ تفسیر، حدیث، فقہ، (شیعہ سنی دینیات) نیز وید، درشن اور ویاکرن کی تعلیم کے ساتھ جدید علوم کی ہم آہنگی بھی موجود ہے۔

۱۹۶۲ء میں ڈاکٹر اے۔ وی راؤ کی وائس چانسلرشپ کے زمانہ میں علوم مشرقیہ کے ان شعبوں کے جداگانہ بورڈ آف اسٹڈیز کی تشکیل کی گئی اور ڈین فیکلٹی آف آرٹس کو ان کا کنوینر مقرر کیا گیا۔

۱۹۷۴ء میں جب مسٹر ہیم وتی نندن بہوگنا اتر پردیش کے وزیر اعلا تھے یونیورسٹی کی مجلس انتظامیہ نے حکومت سے سفارش کی کہ ان شعبوں کو فیکلٹی آف آرٹس کے ماتحت دوسرے خود مختار شعبوں کے مساوی حیثیت دی جائے۔ یونیورسٹی کی مختلف تعلیمی و انتظامی کمیٹیوں نے اس سفارش کی توثیق کی اور اس وقت کے وزیر تعلیم مسٹر عمار رضوی نے علوم مشرقیہ عربی و فارسی کی شعبہ جاتی لائبریری کے لیے دس ہزار روپیہ کی پہلی مرتبہ گرانٹ منظور کی۔ اس سے قبل ریاست کے گورنر ڈاکٹر بی گوپالا ریڈی کے ہاتھوں اس لائبریری کا قیام عمل میں آ چکا تھا۔

ایمرجنسی کے نفاذ کے بعد ان تمام ترقیاتی منصوبوں اور یونیورسٹی کی مجلس عاملہ و مجلس عامہ کی سفارشات کو اس طرح نظر انداز کر دیا گیا جیسے ان کی کوئی اہمیت ہی نہیں تھی۔

ایمرجنسی کے دوران کئی مرتبہ علوم مشرقیہ کے سابق طلبا کے وفود نے ذمہ داروں سے ملاقاتیں کر کے ان شعبہ جات کی خود مختاری کی گزارش کی لیکن ان تمام کوششوں کو ہر بار صرف "زیر غور" ہونے کا جواب ملتا رہا۔

خدا خدا کر کے ایمرجنسی کے خاتمہ کے بعد ایک نئے دور کا آغاز ہوا اور اسے جنتا دور سے تعبیر کیا جانے گا۔ نئی حکومت کے قیام کے فوراً ہی بعد جن کے سربراہ وزیر اعلا مسٹر رام نریش یادو تھے۔

تشنگان علم نے پھر رابطہ قائم کیا اور انھوں نے اس مسئلہ کی افادیت اور علمی گوشوں پر از سرِ نو غور کرنے کے لیے وزیر تعلیم کو توجہ دلائی۔

موجودہ وزیر اعلا مسٹر بنارسی داس اور وزیر تعلیم ڈاکٹر شیو انند نوٹیال نے قدیم و جدید طرز تعلیم کے سنگم شعبۂ علوم مشرقیہ عربی و فارسی نیز شعبۂ علوم مشرقیہ سنسکرت کو نئی روشنی دینے کا عزم مصمم کر لیا جس کے نتیجہ میں لکھنؤ یونیورسٹی کی مجلس عاملہ کی وہ سفارشات جو شعبۂ علوم مشرقیہ کے سلسلہ میں ۷۳، ۱۹ء سے سرکاری سرد خانہ میں محفوظ تھیں۔ ۵ جون ۱۹۷۹ء کو زندگی کی ایک نئی توانائی کے ساتھ ریاست کی نئی تعلیمی سرگرمیوں میں ایک نئے زریں باب کے اضافہ کا سبب بنیں۔

اگر ماضی پر نظر ڈالی جائے تو اس شعبہ نے عظیم عالم ادیب اور دانشور پیدا کیے، ان میں بین الاقوامی شہرت کے حامل مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور مشہور مجتہد مولانا سید علی نقی سابق ڈین فیکلٹی آف دینیات علی گڑھ یونیورسٹی جیسے ممتاز عالموں کے نام ملتے ہیں۔

ان کے علاوہ ہندستان اور پاکستان کی متعدد یونیورسٹیوں میں اس شعبہ کے سند یافتہ طلبا درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ہندستانی سفارت خانوں میں بھی یہاں کے طلبا اہم عہدوں پر فائز ہیں۔

ان شعبوں کے نامور اساتذہ میں جہاں مولانا سید علی زینبی، مولانا سید علی نقی نقوی، ڈاکٹر مولانا مصطفےٰ حسن علوی، مولانا سید محمد نصیر سابق ایم ایل سی، پنڈت آنند جھا کے نام ملتے ہیں تو وہیں طلبا میں سابق نائب وزیر تعلیم یوپی رام نرائن پانڈے، پنڈت رام نرائن مصرا (سنسکرت یونیورسٹی بنارس) جناب بی۔ این۔ پچ بے (پی سی۔ایس) مولانا سید کلب عابد (پروفیسر شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) اور مولانا ہاشم میاں فرنگی محلی کے نام قابل ذکر حیثیت رکھتے ہیں۔

علوم مشرقیہ کو فروغ دینے کے ساتھ ہی ساتھ اتر پردیش سے ناخواندگی کے خاتمے اور تعلیم کو عام کرنے کے لیے موجودہ حکومت کے ابتدائی دو برسوں میں جو قدم اٹھائے گئے ہیں وہ بہت ہی اہم دور رس نتائج کے حامل ہیں۔ مثلاً ۷۸-۱۹۷۷ء سے ہائی اسکول اور انٹر کے امتحانات میں پاس ہونے والے پہلے دس طالب علموں کی فیس اور کتب کی فراہمی کا انتظام کیا گیا۔ سرکاری امداد یافتہ اسکولوں کے غیر تدریسی عملہ کی پنشن کے احکامات جاری ہوئے۔ پسماندہ ضلعوں میں ۱۱ سے ۲۵ سال کی عمر کے لوگوں کو خواندہ بنانے کے لیے تعلیمی مرکزوں کا قیام عمل میں آیا اس زمرہ میں صرف بلیا ضلع میں ۲۶۵ تعلیمی مرکز قائم کیے گئے۔

۴۸ میدانی اضلاع کے بیسک اسکول میں پہلے درجہ سے پانچویں جماعت تک تعلیم حاصل کرنے والے ۵،۳۳،۲ طلبا اور کمزور طبقہ کے افراد کو تقسیم کرنے کے لیے کئی لاکھ روپیہ کی کتب فراہم کی گئیں۔ یہ مراعات ہریجن طلبا کو علاحدہ سے حاصل ہیں۔

اتر پردیش کی زیادہ تر آبادی زرعی علاقوں میں رہنے والی ہے اس لیے دیہی علاقوں میں تعلیم عام کرنے کی سمت بھی جنتا سرکار نے ترجیحی طور پر موثر اقدامات کیے۔ ان علاقوں میں صرف ۷۸-۱۹۷۷ء میں ۳۱۶۲ نئے پرائمری اسکول، ۶۱۲ مڈل اسکول کھولے گئے، موجودہ تعلیمی سال میں ۴۰۲۰ پرائمری اسکول اور ۱۰۳۸ مڈل اسکولوں کے قیام کی جد وجہد کا آغاز ہو چکا ہے۔

ان اسکولوں کے قیام کی منشا کمزور اور تعلیم سے محروم علاقوں کو علم کی روشنی سے مستفید کرنا ہے۔

اگر ماضی کی تعلیمی سرگرمیوں کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ بات روشن ہو کر سامنے آتی ہے کہ پہلے پنجسالہ منصوبہ میں صرف ۲۵۰۰ پرائمری اسکول اور ۲۰۰ مڈل اسکول قائم کیے گئے تھے جبکہ موجودہ حکومت کے دو سالہ دور میں یہ تعداد تقریباً ڈبل ہو رہی ہے۔

بچوں کی تعلیم

ہر ضلع کے دیہی علاقہ میں ۱۱ سے ۱۴ سال تک کی عمر کے بچوں کے لیے ۲۷۵ تعلیمی مرکز کھولے جائیں گے۔ صرف ۷۸-۱۹۷۷ء میں دس ہزار ۹۰۰ بی۔ ٹی۔ سی مدرسوں کی تقرری عمل میں

(باقی صفحہ...)

ادارہ

اُتر پردیش میں
تعمیر مکانات کی نئی اسکیمیں

رہائش کا مسئلہ شہریوں کا ایک بنیادی مسئلہ ہے۔ یہ مسئلہ خاص طور پر بڑے شہروں میں سنگین صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ حکومت اتر پردیش کی تشکیل کردہ، "شہری تعمیر مکانات و شہری ترقی سے متعلق ورکنگ گروپ" نے شہری علاقوں میں ۱۹۷۸ء میں ۷۷ر۸ لاکھ مکانات کی قلت کا اندازہ لگایا تھا جو ۱۹۸۳ء تک ۴۶ر۱۴ لاکھ تک پہنچ جائے گی۔

پردیش میں مختلف تعمیر مکانات اسکیموں کے تحت پانچویں پنج سالہ منصوبہ کے آخر تک تقریباً ۶۴ر۲ کروڑ روپیہ کے مصارف سے ۶۶۴۵۶ مکانات تعمیر کیے گئے، لیکن پردیش میں رہائش کے مسئلہ کی سنگین صورت حال کے مقابلہ میں مکانوں کی تعمیر کی مذکورہ رفتار ترقی اطمینان بخش نہیں کہی جا سکتی۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ پنج سالہ منصوبوں میں تعمیر مکانات و شہری ترقی کی مد کے مصارف پنج سالہ منصوبوں کے کل اخراجات کے سلسلے میں دوسرے منصوبہ کی مدت سے برابر کم ہوتے جا رہے ہیں۔ جہاں دوسرے منصوبہ کی مدت میں مصارف کل اخراجات کے مقابلہ میں ۴ر۳ فیصد تھے وہاں پانچویں منصوبہ میں یہ گھٹ کر ۵۸ر۰ فیصد رہ گئے ہیں۔

پردیش میں سال ۱۹۷۸ سے ۱۹۸۳ تک ۴۶ر۱۴ لاکھ مکانوں کی قلت کو دور کرنے کے لیے کم سے کم رہائشی سہولت کی بنیاد پر ۱۹۷۰ کروڑ روپیہ کی ضرورت کا اندازہ لگایا گیا تھا چونکہ اتنی بڑی رقم کا بندوبست سرکاری نجی زمروں میں تمام ممکنہ ذرائع سے کرنا ایک دشوار کام ہے اس لیے موجودہ حکومت کے دور اقتدار میں تشکیل شدہ شہری تعمیر مکانات و شہری ترقی سے متعلق ورکنگ گروپ نے ایک مخصوص نقطۂ نظر (سیلیکٹڈ ایپروچ) اختیار کرتے ہوئے ۴۶ر۱۴ لاکھ مکانوں کی کمی کا کم سے کم ۲۰ فیصد حصہ یعنی ۹۰ر۲ لاکھ مکانوں کی تعمیر "سماجی تعمیر مکانات پروگرام" کے تحت کرنے کی سفارش کی جس کے لیے ۳۶۰ لاکھ کروڑ روپیہ کی رقم کا تخمینہ لگایا گیا ہے۔ اس ورکنگ گروپ نے یہ سفارش بھی کی ہے کہ معاشی اعتبار سے کمزور طبقہ کے رہائشی مسئلہ کو حل کرنے کے لیے مذکورہ پروگرام کے تحت ۷۵ فیصد مکانات معاشی اعتبار سے کمزور طبقہ کے لیے، ۱۵ فیصد کم آمدنی والے طبقہ کے لیے اور بقیہ ۱۰ فیصد مکانات درمیانہ آمدنی والے طبقہ کے لیے تعمیر کیے جائیں۔

پنج سالہ منصوبہ (۱۹۷۸-۸۳) میں تشکیل کردہ ترقیاتی اسکیم .... ۸ سے زیادہ آبادی والے شہروں میں نافذ کرنے کی حکومت ہند کی تجویز تھی جسے اب حکومت ہند نے "شہروں کی گندی بستیوں کے سدھار اور چھوٹے شہروں کی ترقی سے متعلق نئی اسکیم" کے نام سے چلانے کی تجویز رکھی ہے۔ اگر اس اسکیم کے تحت حکومت ہند سے چھوٹے شہروں کے لیے مالی امداد

حاصل ہو جاتی ہے تو چھوٹے شہروں کی کافی ترقی ہو جائے گی اور روزگار، زراعت، پیداوار، بینک اور دواؤں وغیرہ کی سہولت حاصل ہو جانے پر بڑے شہروں کا رہائشی مسئلہ کافی حد تک حل ہو جائے گا کیونکہ موجودہ حکومت کی چھوٹے شہروں یا قصبوں کو ترقی دینے کی پالیسی کے سبب اب لوگ گاؤں، چھوٹے شہروں یا قصبوں سے بڑے شہروں میں آنا پسند نہیں کریں گے۔

رہائشی مسئلہ حل کرنے کے لیے پردیش کے پانچ کاوال شہروں کو شامل کرتے ہوئے ۱۱ ڈیولپمنٹ اتھارٹیوں کا قیام عمل میں آیا تھا۔ اس کے علاوہ تعمیر مکانات و ترقیاتی بورڈ بھی سرگرم عمل ہے۔ سال ۱۹۷۸-۸۳ میں ترقیاتی اتھارٹی، کانپور نے ۳۰۰۰، لکھنؤ نے ۲۵۰۰، آگرہ نے ۲۰۰۰، وارانسی نے ۱۵۰۰، الہ آباد نے ۱۵۰۰ اور تعمیر مکانات و ترقیاتی بورڈ نے ۱۰۰۰۰ مکانات کی تعمیر کا منصوبہ بنایا ہے۔

اس کے علاوہ تعمیر مکانات بورڈ اور خصوصی ترقیاتی اتھارٹیوں نے سال ۱۹۷۷-۷۸ء میں مختلف اسکیموں کے تحت ۴۹۲۴ مکانات، ۵۳۰ دکان یا دفتر کی عمارتیں تعمیر کی تھیں۔ اسی طرح سال ۱۹۷۸-۷۹ میں ۱۵۰۰ مکانات اور ۳۴۱ دکانیں یا دفتر کی عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ ضلع آگرہ میں دو ہوٹل اور ریسٹورینٹ تعمیر کیے گئے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ دو برسوں میں ۱۴۳۷۶۲۱ ایکڑ زمین حاصل کی گئی اور ۳۹۲-۸ پلاٹوں کو ترقی دی گئی۔

محکمۂ تعمیرات عامہ اور نجی صنعت کاران صنعتی مزدوروں کے لیے مکانات تعمیر کرتے ہیں جن کی ماہنامہ آمدنی ۳۰۰ روپیہ ہے۔ محکمۂ تعمیرات عامہ غازی آباد اور رائے بریلی کے مزدوروں کے لیے بالترتیب ۱۶۵۶ اور ۲۲۰ مکانات تعمیر کر رہا ہے۔ سال ۱۹۷۷-۷۸ کے آخر تک غازی آباد میں ۱۹۸ اور رائے بریلی میں ۴۶ مکانات تعمیر کیے گئے۔ سال ۱۹۷۸-۷۹ کے آخر تک غازی آباد میں ۲۲۶ اور رائے بریلی میں ۴۸ مکانات کی تعمیر کا کام مکمل کیا گیا اور بقیہ مالیاتی سال ۸۰-۱۹۷۹ میں مکمل کیے جائیں گے۔

نجی صنعت کاروں کی صنعتی مزدوروں کی تعمیر مکانات کی اسکیم کے تحت مودی نگر، مودی پورم، غازی آباد اور رینوکوٹ وغیرہ شہروں کے کچھ پراجیکٹ زیر غور ہیں۔

سماج کے معاشی اعتبار سے کمزور طبقوں کی تعمیر مکانات اسکیم کے تحت ۲۵۰ روپیہ ماہوار سے کم آمدنی والے لوگوں کے لیے مکانوں کی تعمیر کے لیے ۵۰ فیصد قرضہ اور ۵۰ فیصد امداد کی شکل میں مالی امداد دی جاتی ہے۔ ان طبقوں کے لیے مکانوں کی تعمیر کا کام اترپردیش ہاؤسنگ و ترقیاتی بورڈ، ترقیاتی اتھارٹیاں اور لوکل باڈیز انجام دیتی ہیں۔ سال ۱۹۷۸-۷۹ میں اسکیم کے تحت کانپور میں ۳۶۰، وارانسی میں ۱۳۶ اور الہ آباد میں ۸۴ مکانوں کی تعمیر کی اسکیمیں منظور کی گئیں جن پر تعمیراتی کام جاری ہے۔

حکومت ہند نے ۱۹۷۸-۷۹ میں پہلی بار سماج کے کمزور طبقوں کے مکانوں کی تعمیر کے لیے ۱۰.۵ کروڑ روپیہ کا قرض، عام بیمہ کارپوریشن سے دلایا تھا۔ اترپردیش ہاؤسنگ و ترقیاتی بورڈ کو ۲۰۰۰ مکانوں کی تعمیر کے لیے اس پوری رقم کی منظوری ریاستی حکومت نے سال ۱۹۷۸-۷۹ء میں دی تھی۔ اس کے علاوہ میرٹھ میں ۱۴۴، رائے بریلی میں ۷۲ اور وارانسی میں ۱۴۴ مکانوں کی تعمیراتی اسکیمیں پہلے سے ہی زیر عمل ہیں۔ ان کاموں کو مکمل کرنے اور کچھ نئی اسکیمیں منظور کرنے کی غرض سے سال ۱۹۷۹-۸۰ کے بجٹ میں ۹ لاکھ روپیہ کے مصارف کی تجویز ہے جس میں سے ایک لاکھ روپیہ پہاڑی علاقوں کے لیے مخصوص ہے۔ اس اسکیم کے تحت سال ۱۹۷۷-۷۸ میں الہ آباد میں ۵۴، وارانسی میں ۶۰، میرٹھ میں ۳۶ اور شاملی میں ۲۸ یعنی مجموعی طور پر ۱۷۸ مکانوں کی تعمیر کا کام مکمل ہو چکا ہے۔ سال ۱۹۷۹-۸۰ میں اس اسکیم کے تحت ۱۰۴ مکانوں کی تعمیر کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔ ان مکانوں پر اوسط لاگت ۸۰۰۰

نی مکان ہے۔

کم آمدنی والے طبقہ کے مکانات کی اسکیم کے تحت ۴۲۰۱ روپیہ سے ۷۲۰۰ روپیہ تک سالانہ آمدنی والے افراد کے لیے مکان تعمیر کیے جاتے ہیں۔ سال ۱۹۷۷-۷۸ میں الہ آباد میں ۲۰، میرٹھ میں ۳۲، وارانسی میں ۲۴، اتر کاشی میں ۲ اور رائے بریلی میں ۲۲ یعنی کل ۱۰۸ مکان تعمیر کیے گئے اور بارہ بنکی، میرٹھ، فیض آباد، شاملی، غازی آباد، نینی تال اور وارانسی شہروں میں تعمیراتی کام تیز رفتاری کے ساتھ جاری ہے۔ سال ۱۹۷۸-۷۹ میں الہ آباد، رائے بریلی اور کانپور شہروں کی اسکیمیں بھی منظور کی گئیں جن پر تعمیراتی کام شروع کیا جا رہا ہے۔

درمیانہ آمدنی والے طبقے سے متعلق تعمیر مکانات اسکیم کے تحت ۷۲۰۱ سے ۱۸۰۰۰ روپیہ تک سالانہ آمدنی والے لوگوں کے لیے مکانات تعمیر کیے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت سال ۱۹۷۷-۷۸ میں آگرہ میں ۱۴، مرادآباد میں ۱۲، اتر کاشی میں ۴، وارانسی میں ۲۴ اور غازی آباد میں ۴۱ یعنی کل ۹۵ مکانات تعمیر کیے گئے۔ سال ۱۹۷۸-۷۹ میں آگرہ، کانپور، علی گڑھ، مظفر نگر، وارانسی، غازی آباد، لکھنؤ، اتر کاشی اور مسوری میں مجموعی طور پر منظور شدہ ۳۲۵۰ مکانوں میں سے اب تک ۹۶۹ مکانات مکمل کیے جا چکے ہیں۔

تعمیر مکانات اسکیم کو بہتر طریقہ سے بروئے کار لانے کے لیے ترقی یافتہ زمین کی دستیابی ایک اہم مسئلہ ہے۔ اسکیم کے تحت پانچویں پنج سالہ منصوبہ کے تحت مختلف شہروں میں ۲۲۰۰ ہیکٹیئر آراضی کے حصول اور ترقی دینے کا کام مکمل ہو چکا تھا۔ سال ۱۹۷۸-۷۹ میں ۴۸۰ ہیکٹیئر مزید ترقی یافتہ آراضی فراہم کرنے کی کوشش کی گئی۔

ریاست کے اہم شہروں میں گندی بستیوں کا مسئلہ روز بروز سنگین صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ اسکیم کے تحت گندی بستیوں میں کھڑنجہ، نالی، سیور، اسٹینڈ پوسٹ عام پاخانے اور غسل خانے وغیرہ کا بندوبست کیا گیا ہے۔ اس اسکیم کے تحت سال ۱۹۷۸-۷۹ میں میرٹھ میں ۸۰ اور وارانسی میں ۸۰ یعنی کل ۱۶۰ منظور شدہ مکانات کی تعمیر کا کام زور شور سے جاری ہے۔

شہری ترقیاتی اسکیم کے تحت ایسے شہروں کی "لوکل باڈیز" جن کے عظیم منصوبے تیار کیے جا چکے ہیں، دکانوں، کاروباری مرکزوں، اجتماعی مرکزوں، دفتر کی عمارتوں، رقص گاہوں، پارکوں اور اسی قسم کی دیگر اسکیموں کے لیے صد فیصد قرضہ کی شکل میں مالی امداد دی جاتی ہے۔ سال ۱۹۷۷-۷۸ میں آگرہ میں ۱۲۶ دکانوں اور کانپور میں دفتر کی ایک عمارت کی تعمیر کا کام مکمل ہو گیا ہے۔

گندے علاقوں میں ماحول کو بہتر بنانا، کم سے کم ضروریات پروگرام کا ایک اہم حصہ ہے۔ تین لاکھ سے زیادہ آبادی والے شہروں کی گندی بستیوں میں اصلاحی کوششیں کی جاتی ہیں۔ سال ۱۹۷۸-۷۹ میں مختلف شہروں کی لوکل باڈیز کو ۸۴ لاکھ روپیہ مالی امداد کی شکل میں تقسیم کیے گئے۔

سال ۱۹۷۷-۷۸ کے آخر تک میرٹھ، کانپور اور لکھنؤ کے لیے وضع کردہ شہری ترقیاتی اسکیم کے تحت بالترتیب ۲۲۱ لاکھ روپیہ، ۱۶۸ لاکھ روپیہ اور ۱۱۱ لاکھ روپیہ کا قرضہ منظور کیا گیا۔ اس اسکیم کے تحت دسمبر ۱۹۷۸ تک میرٹھ، کانپور اور لکھنؤ شہروں میں کل ۱۰۲۶.۰۴ ہیکٹیئر آراضی حاصل ہو چکی ہے۔ سال ۱۹۷۸-۷۹ میں حکومت ہند نے لکھنؤ شہر کے لیے ۷۰ لاکھ اور ہاپوڑ کے لیے ۱۵ لاکھ روپیہ کا قرضہ منظور کیا ہے۔ سال ۱۹۷۹ میں حکومت ہند نے اس اسکیم کا نام تبدیل کر کے "شہری گندی بستیوں کو بہتر بنانا اور چھوٹے شہروں کی ترقی" کر دیا ہے۔

نیشنل کیپیٹل ریجن کے اتر پردیش سب ریجن میں اولیت والے شہروں یعنی میرٹھ، غازی آباد، مودی نگر، ہاپوڑ، بلند شہر، خورجہ اور سکندرآباد کا انتخاب کیا گیا ہے۔ سال

۷۹-۱۹۷۸ میں میرٹھ شہر کے لیے ۲۰ لاکھ اور ہاپوڑ کے لیے ۱۵ لاکھ روپیہ کا قرضہ حکومت ہند منظور کر چکی ہے۔ اس اسکیم پر اتر پردیش تعمیر مکانات و ترقیاتی بورڈ عمل درآمد کر رہا ہے۔

★

علوم مشرقیہ

صفحہ ۳۶ کا بقیہ

آئی۔ اس کے علاوہ ... پرائمری اور ۳۶۲ مڈل اسکولوں کی عمارتیں تعمیر کی گئیں۔

اردو

سرکاری محکموں میں اردو کی درخواستوں وغیرہ پر فوری کارروائی کے لیے اور سرکاری ملازمین میں اردو کی تعلیم عام کرنے کی غرض سے حکومت نے اردو اہلیتی کورس کو مزید توسیع دی جس کے تحت سرکاری ملازم کو اردو اہلیتی سرٹیفکیٹ کے ساتھ ایک متعینہ رقم بھی ملتی ہے۔

پرائمری درجوں سے لے کر اعلا تعلیم کی سطح تک اردو کی تعلیم کے لیے حکومت بندوبست کر رہی ہے۔ اردو کے اخبارات کو بعض ایسی سہولتیں بھی موجودہ حکومت نے فراہم کی ہیں جن سے وہ ابھی تک محروم تھے۔

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اتر پردیش میں موجودہ حکومت نے اپنی دو سالہ کارکردگی میں ہر شعبوں کے شانہ بہ شانہ اپنی لسانی اور تعلیمی پالیسی میں بھی کمزوروں اور اقلیتی فرقے کے جذبات کا پاس اور لحاظ رکھ کر اس ذمہ داری کو نباہنے کی سمت قدم اٹھایا ہے جو جمہوریت کی بقا اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لیے ضروری ہے۔

★

کیا حسیں رخ یہ بھی ہے یو پی تری تصویر کا

کملاپت سہائے ماہر بلگرامی
۱۹۴ سرائے حسن گنج (ڈالی گنج) لکھنؤ

اب نہ ہنگامہ نہ ہے وہ شور دار و گیر کا
حال بہتر ہے سبھی خورد و جوان و پیر کا
کیا حسیں پہلو ہے یہ بھی گردش تقدیر کا
ہر لب شیریں پہ اب قصہ نہ جوئے شیر کا
یہ بھی رخ کتنا تشفی بخش ہے تصویر کا

گرم ہر سو صنعت و حرفت کا بھی بازار ہے
کل تھا جو بیکار بالکل آج وہ فن کار ہے
دستکاری کا وہ گھر گھر پھیلا کاروبار ہے
بچہ بچہ بننے کو انجینیر تیار ہے
کیا حسیں گوشہ ہے یہ بھی جذبۂ تعمیر کا

شہر ہیں، دیہات میں قصبوں میں قائم اسپتال
اب نہیں آ سکتی ہیں ہرگز وبائیں بن کے کال
ہوں فرشتہ موت کا بھی آنکھ اٹھائے کیا مجال
ویسے وقت آ جائے پر تو ہو ہی جاتا ہے وصال
اک عطیہ یہ بھی ہے یو پی تری تدبیر کا

بالغ ناخواندہ کی تعلیم کا بھی سلسلا
اب بروئے کار صوبے بھر میں ہی جلد آنے کا
اک نہ اک دن چھو ہی لیں گے ہم بھی بام ارتقا
جو ہے گی منزل قدم گر کام ہمت سے لیا
سحر انگیں کس قدر ہے یہ عمل تسخیر کا

ہر نفس ہر گام ہے براہ ترقی ہر نگاہ
گاؤں کی گلیاں بھی ہیں اب جا رہی تا شاہراہ
ان پہ سایہ دار اشجار دو رویہ کی پناہ
جن سے راحت پا کے ہر رہرو ہے کہتا واہ واہ
کتنا دلآویز پہلو یہ بھی ہے تصویر کا

بجلی پانی سے مکمل ہریجنوں کی بستیاں
ہر ضلع میں مفت ان کے واسطے قانون داں
آبیارتی کی بدولت لہلہاتی کھیتیاں
صورت سامان آہن زر اگلتی بھٹیاں
ہیں نتیجہ اپنی پیہم دو برس تدبیر کا

وہ خماری ٹوٹتے ہیں اب نہ ہر دم جوڑ بند
ہو گئی کتنے مقاموں پر شراب اک لخت بند
یہ قدم بھی قوم کے حق میں ہے کتنا سودمند
اب ہیں تلخی کی جگہ لب آشنائے لطف قند
کیا حسیں رخ یہ بھی ہے یو پی تری تصویر کا

★

کمزور طبقوں کو نئی سہولتیں

ملک کی معاشی ترقی کے لیے وضع کی گئی کسی بھی اسکیم کا اولین مقصد سماج میں صدیوں سے دبے کچلے، مظلوم اور نظرانداز کیے گئے طبقوں کو معاشی انصاف دلانا ہونا چاہیے۔ اسی لیے ملک کے آزاد ہوتے ہی مرکزی اور ریاستی حکومتوں نے ان کمزور اور پسماندہ طبقوں کی فلاح پر خصوصی توجہ دینا شروع کی۔ سماج کے یہ کمزور طبقے سماجی، معاشی تعلیمی اور سیاسی نقطۂ نظر سے کافی پسماندہ رہے ہیں۔ صدیوں سے ظلم کا شکار یہ طبقہ غیر ملکیوں اور ہندستانی سماج کے بااثر طبقہ کے ہاتھوں استحصال کا شکار ہوتا رہا تیز ذات اور ناانصافی کی آگ میں اسے ہمیشہ جلنا پڑا۔ اسے سماجی انصاف نہیں مل سکا۔ لیکن نئی حکومت نے اقتدار سنبھالتے ہی ان کی معاشی اور سماجی ترقی پر دھیان دیا اور انھیں نیز سماج کے دیگر مظلوم و کمزور افراد کو تحفظ عطا کرنے اور ان کی معاشی سماجی زندگی میں مطلوبہ سدھار لانے کو اپنا اولین فریضہ تصور کیا۔ اسی فریضہ کے تحت نئی حکومت نے ان کمزور طبقوں کی ترقی کے لیے متعدد ٹھوس اقدامات کیے ہیں جس کے نتیجہ میں اقوام و قبائل مندرجہ فہرست اور پسماندہ ذاتوں کی فلاح کے لیے تعلیم و ترقی، رہائش اور پینے کے پانی کی فراہمی کے مختلف پروگراموں پر عمل درآمد ہو رہا ہے۔

تعلیمی پروگرام

حکومت یہ محسوس کرتی ہے کہ کسی بھی طبقہ کی سماجی اور معاشی ترقی کے لیے یہ از حد ضروری ہے کہ اس طبقہ کو مناسب تعلیمی سہولتیں فراہم کی جائیں جن سے مستفید ہو کر وہ طبقہ سماج میں اپنا مناسب مقام خود حاصل کر سکے۔ اسی غرض سے ہریجنوں اور کمزور طبقوں کی تعلیمی سماجی اور معاشی ترقی کے پروگراموں کی عمل آوری کے لیے موجودہ بجٹ میں اضافہ کیا گیا ہے۔ مختلف محکموں کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اپنے بجٹ کا ۲۰ فیصد حصہ ان طبقوں کی فلاح کے لیے مختص کر دیں۔ اقوام و قبائل مندرجہ فہرست کو دی جانے والی تعلیمی سہولتوں کی طرح ہی ۸۵ پسماندہ طبقوں کو بھی (جن میں ۲۱ مسلم طبقے بھی شامل ہیں) تعلیمی سہولتیں فراہم کی گئیں۔ میٹرک سے قبل کے درجات کے اقوام و قبائل مندرجہ فہرست کے طلبا کو مفت تعلیم کے علاوہ وظیفہ دینے کا بندوبست بھی ہے۔ بعد از میٹرک درجات کے طلبا کو جن کے سرپرستوں کی ماہانہ آمدنی ۵۰۰ روپیہ تک ہے۔ لازمی طور سے وظیفہ دیا جاتا ہے۔ سال ۱۹۷۹-۸۰ء میں اعلا تعلیم کے لیے اقوام مندرجہ فہرست کے طلبا کو وظیفہ دینے کے لیے ۱۰ کروڑ روپیہ خرچ کا تخمینہ ہے۔ نویں اور دسویں درجہ کے اقوام مندرجہ فہرست کے ایسے طلبا کو (جنھوں نے زراعت، سائنس اور ٹکنیکی مضامین لیے ہیں) وظیفہ اور درسی کتابوں کے لیے معاشی امداد بھی دی جائے گی۔ دیہی علاقوں میں کمزور طبقہ کے لڑکوں اور لڑکیوں کو پرائمری سطح تک درسی کتابیں اور اسکولی پوشاک فراہم کرنے کا فیصلہ بھی کیا گیا ہے۔

ریاست کے اقوام و قبائل مندرجہ فہرست کی امیدواروں کو

میڈیکل کالجوں میں محفوظ نشستیں پُر کرنے کی غرض سے پی۔ ایم۔ ٹی کے لیے کوچنگ دینے کی اسکیم چلائی جا رہی ہے۔ جس کی فیس وغیرہ کے اخراجات حکومت برداشت کرتی ہے۔ اسی طرح ان امیدواروں کے لیے ریاست کے دو مقامات (لکھنؤ اور الٰہ آباد) میں مقابلے کے امتحان سے قبل تربیت دینے کی غرض سے مرکز قائم کیے گئے ہیں۔ ان مرکزوں پر امیدواروں کو مفت قیام و طعام کی سہولتیں بھی دستیاب ہیں۔

معاشی پروگرام

معاشی ترقی کے پروگراموں کے تحت اقوام و قبائل مندرجہ فہرست اور ڈی نوٹیفائیڈ ذاتوں سے متعلق لوگوں کو گھریلو صنعتوں کے ذریعہ اپنی معاشی حالت سدھارنے کے لیے گرانٹ دی جاتی ہے۔ یہ گرانٹ فی کس ۵۰ فی صد یا ۳۰۰۰ روپیہ تک اور فی امداد باہمی انجمن ۱۰۰۰ روپیہ کی شرح سے دی جاتی ہے۔ زراعت کے ترقی یافتہ طریقے اختیار کرنے کے لیے ۱۰۰۰ روپیہ تک کی گرانٹ اترپردیش اقوام مندرجہ فہرست مالیاتی اور ترقیاتی کارپوریشن کے توسط سے دی جاتی ہے۔ میڈیکل، انجینیرنگ اور قانون میں تربیت یافتہ ان طبقوں کے افراد کو اپنے نجی کاروبار کے لیے فی کس ۲۰۰۰ روپیہ کی امداد دی جاتی ہے۔

اقوام و قبائل مندرجہ فہرست کو مکمل تحفظ

ہریجنوں اور کمزور طبقوں کو ظلم و تشدد سے بچانے کے لیے موجودہ حکومت نے متعدد موثر اقدامات کیے ہیں۔ اس طبقہ پر ہونے والے تشدد کی شکایتوں کی جانچ مستعدی سے کی جا رہی ہے۔ ریاستی سطح پر ایک ڈی آئی جی پولس کی زیر نگرانی ایک خصوصی شعبہ قائم کیا گیا ہے۔ ضلع مجسٹریٹوں اور پولس سپرنٹنڈنٹوں کو ہریجنوں اور کمزور طبقوں کے مکمل تحفظ کے لیے ذاتی طور سے ذمہ دار قرار دیا گیا ہے۔ تشدد کے واقعات کو کم کرنے کے سلسلے میں اس قسم کے جرائم کے لیے اجتماعی جرمانہ عائد کرنے کا بندوبست بھی کیا گیا ہے۔

ظلم و تشدد کے شکار ہریجنوں کو ضروری معاشی امداد دینے کا بھی بندوبست کیا گیا ہے۔ روزی کمانے والے شخص کے فوت ہو جانے پر اس کے پسماندگان کو ۵۰۰۰ روپیہ اور روزی نہ کمانے والے شخص کے فوت ہو جانے پر اس کے پسماندگان کو ۱۰۰۰ روپیہ کی مالی امداد دی جائے گی۔ مظالم کی وجہ سے معذور ہو جانے والوں کو بالترتیب ۱۰۰۰ اور ۵۰۰ روپیہ کی امداد دینے کا بھی بندوبست کیا گیا ہے۔ املاک کے اور دیگر قسم کے مالی نقصانات کی تلافی کے لیے بھی ۵۰۰ روپیہ تک کی امداد دینے کا بندوبست ہے۔ ان طبقوں کی فلاح و بہبود کی غرض سے سکریٹریٹ کی سطح پر ایک مانیٹرنگ، ریسرچ اینڈ ٹریننگ سنٹر قائم کیا گیا ہے۔

ہریجنوں کو الاٹ شدہ زمین پر ناجائز قبضہ قابلِ تعزیر جرم

ریاستی حکومت نے اب گاؤں سبھا کی الاٹ کردہ زمین پر غیر مجاز قبضہ کو فوجداری عدالتوں کے ذریعہ قابل تعزیر جرم قرار دیا ہے اور ایسا کرنے والے شخص کو تین سال تک قید کی سزا دی جا سکتی ہے۔ اترپردیش پہلی ریاست ہے جس نے بندوبست آراضی کے میدان میں یہ انقلابی اقدام کیا ہے اور اس کے لیے اترپردیش خاتمۂ زمینداری اور بندوبست آراضی ایکٹ، ۱۹۵۰ء میں ایک نئی دفعہ اترپردیش آراضی قانون (ترمیم) آرڈیننس ۱۹۷۸ء کا اضافہ کیا گیا ہے۔

ہاؤسنگ اسکیمیں

موجودہ حکومت نے ہریجنوں اور کمزور طبقوں کے لیے تیار کی گئی ہاؤسنگ اسکیم کو ایک نئی شکل دی ہے اور اس کی عمل آوری کا کام ہریجن اور کمزور طبقہ ہاؤسنگ کارپوریشن سے لے کر منطقائی کمشنروں کو سونپ دیا گیا تھا۔ اب یہ کام دیہی انجینیرنگ سروس کے تعاون سے ضلع مجسٹریٹوں کی نگرانی میں ترقیاتی

بلاک انجام دیں گے۔ یہ بھی بندوبست کیا گیا ہے کہ جہاں اس اس مقصد کے لیے گاؤں سبھا کی زمین دستیاب نہ ہو وہاں ریاستی حکومت زمین حاصل کرکے اور اسے بہتر بنا کر مکانات بنانے کے لیے فراہم کرے۔ اس کے لیے ۸۰-۱۹۷۹ء میں ۱۲ء۶ کروڑ روپیہ کے منصوبہ جاتی مصارف کا تخمینہ ہے۔

ہر ضلع صدر مقام پر مفت فراہم کی گئی زمین پر ہریجن لڑکے اور لڑکیوں کے لیے کم سے کم ایک ہاسٹل تعمیر کرنے کی اسکیم بھی نافذ کی جا رہی ہے۔

پینے کے پانی کی سہولت

ہریجنوں کو پینے کا پانی فراہم کرنے کے لیے میدانی علاقوں میں ۶۲۰۱ کنوئیں اور پہاڑی علاقوں میں ۱۰۰۰ ڈگیاں تعمیر کرنے کا کام جاری ہے۔

سرکاری ملازمتوں میں ریزرویشن

سرکاری ملازمتوں میں اقوام مندرجہ فہرست کے لیے ۸ فیصد اور قبائل مندرجہ فہرست کے لیے دو فی صد نشستیں پہلے ہی سے محفوظ ہیں۔ موجودہ حکومت نے پسماندہ ذاتوں کو بھی سرکاری ملازمتوں میں ۱۵ فیصد ریزرویشن دیا ہے۔ ایک دوسرا اہم اقدام پسماندہ اقلیتی طبقوں کو ملازمتوں میں ریزرویشن دینے کے سلسلے میں ہے۔ حکومت نے ۵۸ پسماندہ طبقوں کے لیے اول و دوئم اور سوئم درجہ کی ملازمتوں میں ۱۵ فیصد اور درجہ چہارم کی ملازمتوں میں ۱۰ فیصد نشستیں محفوظ کی ہیں۔ اس سے ۱۲ مسلم پسماندہ طبقے بھی مستفید ہوں گے۔ حکومت نے ایک اقلیتی کمیشن کی تشکیل بھی کی ہے جس کا مقصد اقلیتوں کی فلاح سے متعلق پالیسیوں اور وسیع پروگراموں کو عملی شکل دینے کے علاوہ ان کے مفادات کی حفاظت کرنا بھی ہے۔

حکومت نے اقوام و قبائل مندرجہ فہرست کے لیے قطعات آراضی، عمارتوں، دکانوں اور سرکاری نیز آواس وکاس پریشد کی عمارتوں کے الاٹمنٹ اور نیلامی میں بھی ریزرویشن کا بندوبست کیا ہے۔ ان ذاتوں کے خاندانوں کو کرایہ خرید بنیاد پر بازاروں میں حتی الامکان دکانیں فراہم کرنے کی کوشش بھی کی جائے گی۔

ہریجنوں اور کمزور طبقوں کے لوگوں کو ارزاں انصاف فراہم کرنے کی غرض سے بعض معاملات میں مفت قانونی امداد اور مقدموں میں ہونے والے دیگر اخراجات کے لیے مالی امداد دی جاتی ہے۔ اتر پردیش بے زمین زرعی مزدور قرض راحت ایکٹ کے ذریعہ انھیں پرانے قرضوں سے نجات دلائی گئی ہے۔ جس سے اس طبقہ پر مہاجنوں کے مظالم کی ایک طویل تاریخ کا اختتام ہو گیا ہے۔

یہ بعض ایسے موثر اقدامات ہیں جو گزشتہ چند ماہ کے اندر ہی کیے گئے ہیں۔ نئی حکومت اس بات کا عزم کر چکی ہے کہ ہریجنوں اور کمزور طبقوں کے ساتھ ناانصافی نہ ہونے دے گی۔ انھیں سماجی، معاشی، انصاف دلا کر ان کی حالت میں بتدریج سدھار کرنا حکومت نے اپنا اہم فریضہ تسلیم کیا ہے۔

★

> "مجھے جو خدا بھگوت گیتا میں نظر آتا ہے وہ انجیل مقدس اور قرآن مجید میں بھی نظر آتا ہے"
>
> ——— مہاتما گاندھی

عارف عزیز قدوائی
معرفت دانش محل آمین آباد لکھنؤ

اتر پردیش

گذشتہ دو سال کی ترقیاتی سرگرمیوں کے آئینے میں

ترقیاتی کاموں کے لیے کافی وقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہماری ریاست اتر پردیش معاشی لحاظ سے ایک پچھڑی ہوئی ریاست ہے۔ اس کی ترقی کے لیے گزشتہ دو برسوں میں جو ترقیاتی کام ہوئے ہیں وہ ریاست کی وسعت اور اس کے گوناگوں مسائل کو دیکھتے ہوئے کافی امید افزا ہیں۔ اگر اسی رفتار سے ان تعمیری کاموں میں پیش رفت ہوتی رہی تو امید ہے کہ بہت جلد ہماری ریاست ملک کی دوسری ترقی یافتہ ریاستوں کے نہ صرف دوش بدوش کھڑے ہونے کے لائق ہو جائے گی بلکہ اپنے وسیع قدرتی ذرائع اور وسائل کی بنا پر ملک میں ایک نمایاں حیثیت اختیار کر لے گی۔

تعمیری اور ترقیاتی کاموں کے لیے دو سال کی مدت کوئی بڑی مدت نہیں ہوتی۔ لیکن خوشی کی بات ہے کہ اس قلیل مدت میں بھی کافی اہم اور بنیادی کام ہوئے ہیں۔ کسی علاقے یا ریاست کی ترقی کی نشانی صرف چند شہروں کی چمک دمک اور کچھ لوگوں کی خوش حالی نہیں ہوتی۔ بلکہ غریب عوام اور کمزور طبقہ کا معیار زندگی ہوتا ہے۔ ہماری ریاست میں انتودیہ کے نام سے ۲ر اکتوبر ۱۹۷۸ء سے جو پروگرام شروع کیا گیا اس کا مقصد غریب ترین آدمی کو ترقی کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کرنا ہے۔ تاکہ وہ غربت کے غار سے نکل کر آزادی کی لائی ہوئی سہولتوں سے فائدہ اٹھا سکے اور اپنے معیار زندگی کو بلند کر سکے۔ چنانچہ اس پروگرام کے ماتحت خاص توجہ بے زمین مزدوروں، چھوٹے کسانوں اور دیہات میں رہنے والے غریب لوگوں کی طرف مبذول کی جاتی ہے۔ تاکہ ان کی بے روزگاری دور ہو سکے اور وہ دیہی علاقہ جہاں ریاست کے زیادہ تر لوگ آباد ہیں، ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہو سکے۔

اس اسکیم کی پہلی منزل میں دیہی علاقوں کے ۶ لاکھ خاندانوں کو فائدہ پہونچانے کا نشانہ مقرر کیا گیا تھا۔ جس میں سے اب تک ۹۹۹ ۲۸۲ خاندانوں کو اس پروگرام کے ماتحت لایا جا چکا ہے۔

دیہی علاقے کے کمزور طبقوں کی حالت درست کرنے اور ان کا معیار زندگی بلند کرنے کی غرض سے گذشتہ سال ۴۸۳ ترقیاتی بلاکوں میں مربوط دیہی ترقی پروگرام کو اور آگے بڑھایا گیا اور مزید ۵۰ ترقیاتی بلاک اس پروگرام کے ماتحت لائے گئے۔ تاکہ دیہی عوام کی بے روزگاری دور کی جا سکے اور انھیں زیادہ سے زیادہ ترقی کے مواقع فراہم کیے جا سکیں۔ اسی سلسلے میں گزشتہ دو برسوں میں کام کے عوض اناج فراہم کرنے کی اسکیم کو کافی بڑھا دیا گیا اور اس کے تحت ۱۱٫۴۳ لاکھ ٹن اناج تقسیم کیا گیا۔

دیہی علاقہ کی ترقی کے لیے سب سے زیادہ ضروری چیز ذرائع آمد و رفت کو بڑھانا ہے۔ بعض ایسے دیہی علاقے ہیں جو برسات کے موسم میں دوسرے علاقوں سے بالکل الگ ہو جاتے ہیں۔ اور وہاں جانا قریب قریب ناممکن ہو جاتا ہے جس کی

وجہ سے وہاں کے رہنے والوں کو بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اگر تمام دیہاتوں تک سڑکوں کے ذریعہ آمد و رفت کی آسانیاں فراہم کر دی جائیں تو وہاں کی تجارت خود بخود ترقی کر جائے۔ اور وہاں کے لوگ اپنی پیداوار آسانی سے بڑے بازاروں میں لا کر مناسب قیمت حاصل کر سکیں اسی کے ساتھ ساتھ ان کے لڑکے تعلیم کے لیے قریب کے شہروں اور قصبوں میں بغیر کسی دشواری کے جا سکیں۔ دیہی علاقہ میں آمد و رفت کی آسانی فراہم کرنے کی غرض سے دسمبر ۱۹۷۸ء میں پانچ ہزار کیلو میٹر سڑکیں دیہی علاقوں کو شہری علاقوں سے ملانے کے لیے بنائی گئیں۔ سڑکوں کی تعمیر کے سلسلے میں ۱۲۳ پلیاں بھی بنائی گئیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ نشیبی علاقوں سے پانی نکالنے کی ۱۲۰ اسکیمیں عمل میں لائی گئیں تاکہ آنے جانے میں سہولت پیدا ہو۔ ان اسکیموں پر عمل در آمد پر لگ بھگ ۱۴ کروڑ روپیہ صرف ہوا۔

کسانوں کو سہولتیں

ریاست میں چھوٹے چھوٹے کسانوں کی ایک بڑی تعداد ہے۔ جن کے پاس نہ اتنی آراضی ہے کہ وہ اس کی کاشت کے ذریعہ اچھی طرح گزر کر سکیں اور نہ کوئی دوسرا ذریعہ جس سے وہ اپنی آمدنی میں اضافہ کر سکیں۔ چھوٹے کاشتکاروں کی آمدنی میں اضافہ کے لیے حکومت نے دیہی علاقہ میں چھوٹی صنعتوں کو فروغ دینے کی اسکیم جاری کی تاکہ وہ اپنے خالی وقت میں کام کر کے اپنی آمدنی بڑھا سکیں اور اپنی حالت درست کر سکیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ ۲۶ء۱ ہیکٹر تک زمین رکھنے والے چھوٹے کسانوں کو مالگزاری اور ترقی آراضی ٹیکس سے مستثنیٰ کر دیا گیا۔ اس طرح چھوٹے کسانوں پر ٹیکس کا بار کم ہو گیا۔ چھوٹے کسان کو آپریٹو سوسائٹیوں سے جو قرض لیتے ہیں اس کی شرح سود میں بھی کمی کر دی گئی اور ایک فی صد کی چھوٹ دیدی گئی۔ اسی طرح قلیل اور درمیانی مدت کے قرض کی شرح ۱۴ سے گھٹا کر ۱۲ فی صد کر دی گئی اور طویل مدتی قرض پر سود کی شرح ۵ء۱۱ فی صد سے کم کر کے ۵ء۱۰ فی صد کر دی گئی۔

دیہی علاقہ میں لوگوں کا سب سے بڑا اور اہم ذریعہ معاش کاشتکاری ہے۔ دیہی ترقی کے لیے زراعت کی ترقی ضروری ہے۔ زرعی پیداوار بڑھانے کے لیے کاشتکاری کے نئے آلات، اچھے بیج اور کھاد کے علاوہ سب سے زیادہ اہم چیز آب پاشی کے ذرائع میں خاطر خواہ اضافہ ہے۔ اتر پردیش میں ۷۸ – ۱۹۷۷ء میں آب پاشی کی صلاحیت میں کافی اضافہ ہوا اور وہ ۴۴ء۵ ہیکٹر ہو گئی۔ جو ملک کی مجموعی آب پاشی صلاحیت کا ۲۷ فی صد ہے۔

آب پاشی کے ذرائع بڑھانے کے لیے جہاں بڑی نہروں کی ضرورت ہے اسی کے ساتھ ساتھ چھوٹے آب پاشی ذرائع کی بھی اہمیت کچھ کم نہیں ہے۔ آب پاشی کے چھوٹے ذرائع جیسے ٹیوب ویل (نل کنوئیں) کسانوں کو ہر وقت پانی کی فراہمی میں مدد دیتے ہیں۔ اور انھیں نہروں سے پانی ملنے کا انتظار نہیں کرنا پڑتا۔ چنانچہ حکومت نے آب پاشی کے چھوٹے ذرائع بڑھانے پر بھی خاص توجہ کی جس کی بنا پر چھوٹے آب پاشی وسائل کی صلاحیت ۱۲ء۵ لاکھ ہیکٹر سے بڑھ کر ۸۸ لاکھ ہیکٹر ہو گئی۔

آب پاشی کے ذرائع میں اضافے اچھے بیج اور کھاد کے استعمال سے ریاست کی زرعی پیداوار میں قابل اطمینان اضافہ ہوا ہے۔ ۷۸ – ۱۹۷۷ء میں ۲۱۲ء۳۱ لاکھ میٹرک ٹن اناج پیدا ہوا۔ اور سیلاب کی تباہ کاریوں کے باوجود ۷۹ – ۱۹۷۸ء کے دوران ریاست میں ۲۱۵ لاکھ میٹرک ٹن اناج کی پیداوار کی توقع کی جاتی ہے۔ ایک طرف موجودہ زیر کاشت آراضی کی پیداوار بڑھانے کے لیے بھرپور اقدامات جیسے آب پاشی کے ذرائع اچھے بیج، کھاد اور کاشت کاری کے نئے آلات فراہم کیے جا رہے ہیں۔ دوسری طرف ناقابل

کاشت آراضی کو قابل کاشت بنا کر ریاست کی زرعی پیداوار بڑھانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ چنانچہ ۱۲ لاکھ ہیکٹر اوسر زمین کو قابل کاشت بنانے کے لیے نعبلے روزگار اور بے زمین پانچ لاکھ مزدوروں کی آراضی فوج تیار کی جا رہی ہے۔ اور اس کام کو باقاعدہ طور پر انجام دینے کے لیے آراضی کارپوریشن کی تشکیل کی گئی ہے۔

دیہی ترقی کے لیے جہاں آب پاشی اور ذرائع آمد و رفت بڑھانے کی ضرورت ہے اسی کے ساتھ ساتھ بجلی کی فراہمی کی بھی کم اہمیت نہیں ہے۔ دیہی علاقہ میں بجلی پہونچ جانے سے صنعتی ادارے قائم کرنے میں آسانی ہوگی اور ترقی کی رفتار میں کافی تیزی پیدا ہو جائے گی۔ ریاستی حکومت نے اس سمت بھی اہم اقدامات کیے ہیں چنانچہ بجلی کی صلاحیت میں گزشتہ دو سالوں میں ۵۷۰ میگا واٹ کا اضافہ ہوا ہے جس سے ریاست کی مجموعی تنصیبی صلاحیت ۳۱۸۸ ہو گئی۔ ۸۰-۱۹۷۹ء میں بجلی کی پیداوار بڑھانے کے لیے بھرپور اقدامات کرنے کی اسکیم وضع کی گئی ہے تاکہ ۲۳۹ میگا واٹ کا اضافہ ہو سکے۔ اس اضافہ کے ذریعہ ۵۰۰۰ ٹیوب ویل اور پمپ سیٹ لگانے اور ۴۹۰۰ گاؤں میں اور ۴۴۴۰ ہریجن بستیوں میں بجلی پہونچانے کا پروگرام بنایا گیا ہے

ہریجنوں کا تحفظ

اترپردیش کی نئی حکومت نے ہریجنوں اور دوسرے کمزور طبقوں کو مظالم سے محفوظ رکھنے کے لیے خاص طور پر اقدامات کیے ہیں کیونکہ ان کی ترقی کے بغیر ملک صحیح معنوں میں ترقی نہیں کر سکتا۔ ضلع مجسٹریٹوں اور پولیس سپرنٹنڈنٹوں پر یہ ذمہ داری ڈالی گئی ہے کہ وہ ہریجنوں اور دوسرے کمزور طبقوں کی حفاظت کا خاص طور پر خیال رکھیں ناقابل دست اندازی جرائم کی فوری جانچ کی ہدایات جاری کر دی گئی ہیں اور اس کی نگرانی کے لیے ریاست اور ضلع کی سطح پر سیل قائم کر دیے گئے ہیں۔

اسی کے ساتھ ساتھ طاقتور طبقہ کے ہاتھوں ہریجنوں کو نقصان پہنچنے پر انھیں معاوضہ دینے کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔ انھیں اس سلسلے میں ۵۰۰ سے لے کر ۵۰۰۰ روپے امداد دی جاتی ہے۔ کمزور طبقے کو الاٹ کی گئی آراضی پر زبردستی ناجائز قبضہ کو قابل دست اندازی جرم قرار دیا گیا ہے۔ اس جرم میں ارتکاب کرنے والے لوگوں کو جرمانہ یا تین سال تک سزا دینے کا بندوبست کیا گیا ہے۔ کمزور طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی معاشی سماجی اور تعلیمی ترقی کے لیے ایک رقم مخصوص کر دی گئی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ سرکاری محکموں اور لوکل باڈیز سے کہا گیا ہے کہ وہ اس طبقے کے لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے اپنے بجٹ کی کم سے کم ۲۰ فی صدی رقم مخصوص کر دیں۔ اوّل، دوم، سوم کی سرکاری ملازمتوں میں ۱۵ فی صد اور درجہ چہارم کی ملازمتوں میں ۱۰ فی صد نشستیں، پسماندہ ۵۸ ذاتوں کے لیے مخصوص کی گئی ہیں۔ جن میں اقلیتی فرقہ کی ۲۱ پسماندہ ذاتیں بھی شامل ہیں۔

دو سال کی قلیل مدت میں ریاست نے دشواریوں اور الجھنوں کے باوجود ترقی کی طرف قابل اطمینان طریقہ پر قدم بڑھایا ہے۔ اس نے اپنے محدود مالی وسائل کو ریاست کی فلاح و بہبود میں لگانے کی پوری کوشش کی ہے اور کمزور طبقہ اور دیہی علاقے کی حالت درست کرنے پر خاص توجہ دی ہے جس کی ترقی پر ملک کی ترقی کا دار و مدار ہے۔

★

اداریہ

محنت کشوں کی فلاح و بہبود : نئی جہت

کسی ملک کی ترقی اور خوش حالی کے سلسلے میں اس ملک کا محنت کش طبقہ جو کردار ادا کرتا ہے وہ ایک خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ اسی لیے حالیہ چند برسوں میں محنت کش طبقہ کو سماجی انصاف دلانے اور اس کی معاشی و سماجی سطح بلند کرنے کے سلسلے میں ٹھوس اور موثر اقدامات کیے گئے۔

ایمرجنسی کے دوران مزدوروں کے بنیادی حقوق پر جو بندشیں عائد کی گئی تھیں انھیں ختم کر دیا گیا ہے جس کے نتیجہ میں اب وہ اپنے جائز مطالبات پیش کرنے کے حقدار ہو گئے ہیں اس کے ساتھ ہی اس وقت جو مزدور ہنگامی حالات کا نشانہ بنے تھے انھیں بحال کر دیا گیا ہے۔ اب خسارہ کی حالت میں بھی مزدوروں کو بونس دیا جائے گا اور بونس کی رقم ۴ فی صد سے بڑھا کر اب کم از کم ۸ء۳۳ فی صد کردی گئی ہے۔

مزدور طبقہ کی فلاح اور اس کے کام کے حالات میں سدھار کرنے کے لیے ریاست میں ۶۰ مزدور ایکٹ اور قواعد وضع کیے گئے ہیں۔ گزشتہ دو برسوں میں صنعتی اور غیر منظم زمروں کے مزدوروں کی فلاح کے لیے متعدد اسکیمیں تیار کی گئی ہیں۔

وقت پر تنخواہ

صنعتی مزدوروں کو وقت پر تنخواہ دلانے کے لیے اترپردیش صنعتی امن (تنخواہ کی بروقت ادائیگی) ایکٹ ۱۹۷۸ء وضع کر کے لیبر کمشنر کو اختیار دیدیا گیا ہے کہ اگر کسی ادارے میں مزدوروں کی تنخواہ کا بل ۵۰ ہزار روپے سے زیادہ کا بقایا ہو تو وہ وصولی سرٹیفیکیٹ جاری کر کے اسے کلکٹر کے توسط سے مالگزاری کے بقایے کی طرح وصول کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اگر بقایے کی رقم ایک لاکھ روپیہ سے زیادہ ہے تو وصولی سرٹیفیکیٹ جاری کرنے کے ساتھ ساتھ قصوروار ادارہ کے خلاف قانونی کارروائی بھی کی جائے گی۔

تنازعات کا جلد نپٹایا جانا

اب تک مزدوروں کے انفرادی تنازعوں سے متعلق معاملات کی سماعت کا اختیار ریاست کی لیبر عدالتوں اور صنعتی ٹریبونلوں کے پریسائڈنگ افسران کو تھا جو تین سال سے زائد عرصے سے ضلع جج رہے ہوں یا ہائی کورٹ کے جج رہے ہوں۔ اس سے مزدوروں کو اپنے تنازعے نپٹانے کے لیے دور افتادہ مقامات پر واقع عدالتوں میں جانا پڑتا تھا۔ موجودہ سرکار نے اس دشواری کو دور کرنے کے لیے اب تمام عدالتوں اور ٹریبونلوں کے افسران کو انفرادی تنازعہ نپٹانے کا اختیار تفویض کر دیا ہے۔

عدالتوں کے متفقہ فیصلے پر عمل درآمد نہ کرنے کی صورت میں آجرین کے خلاف کسی خصوصی سزا کا بندوبست پہلے نہیں تھا۔ موجودہ حکومت کے دور میں اب یہ بندوبست ہے کہ اگر کوئی آجر مقررہ مدت میں متفقہ فیصلہ پر عمل درآمد نہیں کرتا تو اس کے خلاف قانونی کارروائی کی جا سکتی ہے۔ اگر کوئی آجر متفقہ فیصلے پر عمل درآمد نہ کر کے معاملہ رٹ کے ذریعے ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ تک لے جاتا ہے تو حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ ایسی رٹوں کی مخالفت کرے گی۔

مزدور تنازعوں کو جلد سے جلد طے کرانے کے مقصد سے ریاست میں لیبر عدالتوں کی تعداد نو سے بڑھا کر ۱۲ کر دی گئی ہے اس کے ساتھ ہی ساتھ عدالتوں کو صنعتی تنازعے جلد نپٹا دینے کے سلسلے میں احکامات جاری کئے گئے ہیں۔

سوت، جوٹ، اُون، کپڑے، مصنوعی ریشے اور دھاگے کے کارخانے کے مزدوروں کے لیے غیر تقرری بھتہ کا بندوبست جو کہ مزدوروں کی فلاح کے سلسلے میں ایک اہم اقدام کیا گیا ہے۔ اس کے لیے کارخانوں میں ۲۴ ماہ کے دوران مستقل نوعیت کے کسی کام پر تین سو دن مکمل کر لینے والا مزدور اگر ڈیوٹی پر حاضر ہوتا ہے اور آجر مذکورہ مزدور کو کام نہیں دے سکتا ہے تو وہ ایسے مزدور کے ہر دن کے لیے غیر تقرری بھتہ دے گا جو ایک دن کی اجرت کے ۳۳ فیصد کے برابر ہوگا۔

ملازمت کے خواہش مند امیدواروں کو تربیت دینے کے بہانے اعزازی طور پر رکھ کر ان کے استحصال کرنے پر بندش عائد کر دی ہے۔ حکومت نے اس طرح سے بغیر تنخواہ کے کام کرانے پر ایک حکم جاری کر کے پابندی لگا دی ہے۔

اجرت کا تعیّن

شکر صنعت کے مزدوروں کے لیے یکم اکتوبر ۱۹۷۸ء سے بنیادی تنخواہ اور تغیر پذیر مہنگائی بھتہ میں اضافہ کیا گیا ہے۔ اس کے نتیجے میں شکر صنعت کے غیر ہنر مند مزدوروں کی کم سے کم شرح تنخواہ ۴۰۰ ــ ۲۴۸ روپیہ ہوگئی ہے

تغیر پذیر مہنگائی بھتہ کی شرح کو اشاریہ قیمت کے فی پوائنٹ کے اضافہ پر ایک روپیہ سے بڑھا کر ایک روپیہ ۳۰ پیسے فی پوائنٹ پر کر دیا گیا ہے۔

چھوٹی چھوٹی صنعتوں میں بر سر کار مزدوروں کے استحصال کو روکنے کے لیے حکومت نے کم سے کم اجرت ایکٹ کے تحت ۴۴ اداروں میں کم سے کم اجرت کی شرحیں مقرر کر دی ہیں جن پر وقتاً فوقتاً نظر ثانی کی جاتی ہے۔

ریاست میں بیڑی کی صنعت اور زرعی کاموں میں لگے ہوئے مزدوروں کی کم سے کم تنخواہ کا تعین کیا جا چکا ہے جس پر عمل درآمد کو یقینی بنانے کے سلسلے میں محکمہ محنت اور محکمہ مال کے افسران کو احکامات جاری کیے گئے ہیں۔

صنعتی مزدوروں اور ان کے خاندان کے افراد کی ہمہ گیر ترقی کے لیے ریاستی بیس فلاحی مرکزوں کے توسط سے فلاحی سہولتیں فراہم کی جا رہی ہیں۔ جن میں مزدوروں کی عورتوں اور لڑکیوں کو سلائی، کڑھائی اور بنائی کی تربیت دی جا رہی ہے۔ مزدوروں کے خاندان کی فلاح کے لیے نشہ بندی چھوت چھات کے خاتمے قومی یکجہتی اور خاندان کی فلاح سے متعلق خصوصی پروگرام منعقد کیے جاتے ہیں۔ کانپور کی تین گنجان مزدور بستیوں میں ایسے بھون تعمیر کیے گئے ہیں جن میں مزدور ذہنی ارتقا اور تفریح کے لیے ثقافتی دلچسپ تقریبات اور رنگا رنگ پروگرام منعقد کر سکتے ہیں۔

پابند مزدوری نظام کا خاتمہ

پابند مزدوروں کی حالت سماج کے لیے ایک بدنما داغ بن گئی تھی۔ ایسے مزدوروں کی تعداد ایک اندازے کے مطابق تقریباً چار ہزار تھی۔ حکومت نے نہ صرف ان افراد کو نجات دلائی ہے بلکہ ان کی ترقی کے لیے انھیں قابل کاشت زمین دودھ دینے والے مویشی اور دیگر سہولتیں بھی فراہم کی ہیں۔

اس طرح دو برسوں کی قلیل مدت میں محنت کش طبقہ کی فلاح و بہبود اور سماجی و معاشی ترقی کے لیے موجودہ حکومت نے جو اقدامات کیے ہیں ان سے ریاست کے مزدوروں کی فلاح سے متعلق سرگرمیوں کو ایک نئی جہت ملی ہے۔

★

عنوانات

نیا دور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ حکومت اتر پردیش ان سے بہر حال متفق ہو

ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

پبلشر: ہمیندر کمار

ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش

پرنٹر: اشوک در

سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری۔ یو پی
مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس، عیش باغ، لکھنؤ

شائع کردہ محکمہ اطلاعات و رابطۂ عامہ۔ اتر پردیش

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے
زر سالانہ: پانچ روپے

ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پبلک پبلیکیشن انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو۔ پی۔ لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶۔ لکھنؤ

بذریعہ رجسٹری: ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو۔ پی۔ لکھنؤ

اپنی بات

اس سال ہم اپنی آزادی کی ۳۲ ویں سالگرہ منا رہے ہیں۔ ہمارے ملک میں پندرہ اگست کا دن ایک قومی تہوار کی حیثیت سے منایا جاتا ہے کیونکہ ۱۹۴۷ء میں آج ہی کے دن ہم نے بابائے قوم مہاتما گاندھی کی رہنمائی میں غلامی کی زنجیریں توڑ کر عدم تشدد کے ذریعہ آزادی کی یہ نعمت حاصل کی تھی۔ یہ آزادی ہماری برسہا برس کی جد و جہد اور قربانیوں کا نتیجہ ہے۔ اس آزادی کے لیے ہم کو دار و رسن کی منزل سے بھی گزرنا پڑا ہے اور بڑی سختیاں جھیلنا پڑی ہیں۔ اس آزادی کو برقرار رکھنا اور اس کو مستحکم بنانا ایک آزاد اور خود دار قوم کی حیثیت سے ہم سب کا اولین فریضہ ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں سیاسی آزادی حاصل کر لینے کے بعد معاشی آزادی کا حصول بھی ضروری ہوتا ہے کیونکہ معاشی آزادی کے بغیر سیاسی آزادی ہمیشہ ادھوری رہتی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس قلیل عرصے میں ہمارے ملک نے ترقی کے ہر میدان میں نمایاں پیش رفت کی ہے لیکن ہماری منزل مقصود ابھی بہت دور ہے۔ معاشی آزادی کی اس جد و جہد کو ہمیں تیز سے تیز تر کرنا ہے۔ یہ جد و جہد اس موڑ پر ختم ہوگی جہاں سے ایک نئے نظام حیات کی ابتدا ہوگی اور ایک ایسا معاشرہ وجود میں آئے گا جس میں مکمل مساوات ہوگی، اونچ نیچ اور ذات پات کی تفریق سے وہ معاشرہ بالکل پاک و صاف ہوگا۔ اس نظام حیات اور معاشرے میں کسی قسم کی تنگ نظری، افلاس، استحصال، منافرت، جہالت اور تعصب کی گنجائش نہیں ہوگی۔ سب لوگ باہم شیر و شکر ہو کر رہیں گے۔ سرمایہ داری، اجارہ داری اور ذخیرہ اندوزی جیسی لعنتوں کو پنپنے نہیں دیا جائے گا۔ ایسے ہی نظام حیات اور معاشرے میں گاندھی جی کے خوابوں کا ہندوستان ابھر کر سامنے آئے گا اور تبھی ہماری سیاسی آزادی مکمل ہوگی۔

آئیے اس مبارک موقع پر ہم یہ عہد کریں کہ اپنے حقوق اور اختیارات کے استعمال کے ساتھ ہی ہم اپنے فرائض کی تکمیل کے سلسلے میں کسی بھی سطح پر غفلت نہیں برتیں گے۔ اس موقع پر ہمیں خاص طور سے تنگ نظری، تعصب اور فرقہ پرستی کی لعنتوں کے خلاف جنگ کی رفتار تیز سے تیز تر کرنے کا بھی عہد کرنا ہے کیونکہ جب تک یہ لعنتیں ہمارے ملک میں باقی رہیں گی تب تک گاندھی جی کے خوابوں کا ہندوستان وجود میں نہ آ سکے گا۔ گاندھی جی جب تک حیات رہے ان لعنتوں کے خلاف بے خوف و خطر لڑتے رہے کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ یہ لعنتیں نہ صرف ترقی اور خوش حالی بلکہ ہماری آزادی کی بھی دشمن ہیں۔

وفیات

● گزشتہ ایک ماہ کے اندر اندر لکھنؤ میں علم و ادب، صحافت اور شاعری کے میدان کی چار اہم شخصیتیں یکے بعد دیگرے ہم سے آناً فاناً رخصت ہو گئیں۔ ان میں مولانا محمد الحسنی ندوی عربی کے ممتاز عالم اور صحافی تھے جنھوں نے ۴۴ سال کی ہی کم عمر میں ایسی علمی اور دینی خدمات انجام دی ہیں جن کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ وہ صحیح معنوں میں اپنے عم محترم حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کے جانشین اور امین کہلانے کے مستحق تھے۔ انھوں نے ۲۰ سال کی ہی عمر میں مشہور عربی ماہنامہ "البعث الاسلامی" نکالنا شروع کیا تھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے اور بھی متعدد بلند پایہ کتابیں تصنیف کیں۔ مولانا محمد الحسنی ندوی کی جس تصنیف کو سب سے زیادہ مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی وہ "الاسلام الممتحن" ہے جس کے چار ایڈیشن مصر سے شائع ہوئے ہیں۔ ان کی اس عربی تصنیف کی عرب ممالک اور انڈونیشیا وغیرہ میں بڑی پذیرائی ہوئی۔ ان تصنیفات کے ذریعہ مولانا محمد الحسنی ندوی نے عربی زبان و ادب کے ساتھ ساتھ اسلام کی بھی بڑی گراں قدر خدمت انجام دی ہے چنانچہ ان کی ناوقت موت ایک ایسا نقصان ہے جس کی تلافی شاید ہی ہو سکے۔

● ابھی مولانا محمد الحسنی ندوی کی ناوقت موت پر آنسو بہائے ہی جا رہے تھے کہ دار العلوم ندوۃ العلماء کا ایک اور عظیم فرزند اور بلند پایہ صحافی چل بسا۔ ندوہ سے شائع ہونے والے پندرہ روزہ "تعمیر حیات" کے ایڈیٹر مولانا اسحٰق جلیس ندوی کا اچانک انتقال بھی ایک المناک اور بڑا سانحہ ہے۔ ان کے انتقال سے سنجیدہ اور شائستہ اردو صحافت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ موصوف کی صحافت ایک آدرش اور اسلامی اقدار کو فروغ دینے کے عمل پر مبنی تھی۔ "تعمیر حیات" کے حالیہ شمارے میں مولانا محمد الحسنی ندوی کی موت پر مرحوم نے ایک ایسا اداریہ لکھا ہے جو ان کی محبت، خلوص بلکہ علمیت کا بین ثبوت ہے۔ دار العلوم ندوۃ العلماء کو اپنے ان دونوں عظیم فرزندوں سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔

● لکھنؤ کی ایک باغ و بہار شخصیت اور ایک ممتاز مزاحیہ و طنز نگار شاعر ناظر خیامی جو مشاعروں کی جان تھے، ۸ جولائی کو اپنے عزیزوں اور ہزاروں مداحوں کو داغ مفارقت دے گئے۔ ناظر صاحب کی شاعری میں ایک کاری اور تیکھا طنز ہوتا تھا جسے مشاعروں میں ان کا پڑھنے کا مخصوص انداز اور بھی دو آتشہ بنا دیتا تھا۔ ناظر صاحب میں جان محفل بن جانے کی زبردست صلاحیت تھی اور ان کی زندہ دلی اور حاضر جوابی ہر محفل کو زعفران زار بنا دیتی تھی۔ واقعی ان کے نام کا اعلان ہوتے ہی مشاعرہ حرکت میں آ جاتا تھا۔ افسوس صد افسوس ان کے انتقال سے نہ صرف لکھنؤ کی شعری محفلیں سونی ہو گئی ہیں بلکہ تمام ہندوستان کے مشاعروں میں ان کی کمی شدت سے محسوس کی جائے گی۔

● ممتاز اردو شاعر ڈاکٹر کیسری کشور کا انتقال بھی اردو شاعری کا ایک بڑا نقصان ہے کیونکہ اردو شاعری کو ان سے بہت کچھ ملنا تھا۔ ان کا پہلا مجموعۂ کلام "ہنوز شیشۂ گراں" ابھی حال ہی میں شائع ہوا ہے جس سے ان کے منفرد لہجے اور اسلوب کی نشان دہی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر کشور بنیادی طور پر میڈیکل سائنس کے آدمی تھے اور ۱۹۴۶ء سے لکھنؤ میڈیکل کالج میں درس و تدریس کا کام انجام دے رہے تھے۔ میڈیکل سائنس کے خشک میدان میں ایک نمایاں حیثیت کے حامل ہونے کے ساتھ ساتھ شاعری اور ادب سے تخلیقی وابستگی رکھنا بلاشبہ ایک ایسی خصوصیت ہے جو بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔

ایڈیٹر

غزل

نشور واحدی
ناظر باغ کان پور

کوئی جلوہ ہو کوئی شعلہ ہو کوئی بات ہو تو بتایئے
ابھی شام اوّلِ شام ہے ذری رات ہو تو بتایئے

کوئی دھوم دھام یہاں نہیں، غم و درد عام یہاں نہیں
کسی شہرِ علم و کمال میں یہ برات ہو تو بتایئے

یہ سفالِ میکدہ چھوڑ دوں، یہ پیالہ پھینک کے توڑ دوں
مگر ان کی نیچی نگاہ میں یہ حیات ہو تو بتایئے

وہی کامیابِ جنوں رہا جو دلِ شکستہ میں جا بسا
جو دل اپنا ہار گیا کہیں اسے مات ہو تو بتایئے

یہ مسیحِ وقت جو آئے یاں وہ مرض بڑھا گئے بے کراں
یہ طویل وعدہ نجات کا، جو نجات ہو تو بتایئے

جو سماج آج ہے کل نہ تھا، جو مزاج کل تھا وہ اب نہیں
کسی اک نظامِ حیات کو جو ثبات ہو تو بتایئے

وہ دلوں کے گوشے نہیں رہے جہاں تھی نشور کی اک جگہ
کسی اور شہر نکل چلیں ابھی رات ہو تو بتایئے

ایس۔ایم۔عباس (ایڈووکیٹ)
مقام وڈاکخانہ مانی کلاں ضلع جونپور (یوپی)

آزادی، مساوات اور قانون

'آزادی' یوں تو سادہ سا لفظ ہے لیکن نہ جانے کس قدر جذب و کیفیت میں ڈوبا ہوا کہ ہر دل اس کا دلدادہ نظر آتا ہے۔ اس کے اختصار میں بھی کچھ ایسی وسعت ایسی ہمہ گیری ہے جو پوری کائنات کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ جیسے یہ لفظ روح کائنات و جان کائنات ہو۔ جس طرح آدمی ازل سے امن کا متلاشی رہا ہے۔ جنگ کے مقابلے میں امن اور موت کے مقابلے میں زندگی کو ترجیح دیتا رہا ہے بالکل اسی طرح غلامی سے متنفر اور آزادی کا جویا رہا ہے۔

دراصل آزادی غلامی کا متضاد لفظ ہے۔ 'غلامی' جہالت ہے، درندگی ہے۔ کفر و شر ہے۔ جبر و ناانصافی ہے۔ بے بسی اور بے کسی ہے۔ معذوری و مجبوری ہے۔ اور 'آزادی' — علم ہے۔ روشنی ہے۔ حسن ہے۔ خیر و صداقت ہے۔ زندگی اور زندگی کی کھوس حقیقت ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہر ذی روح آزادی کا متمنی ہے۔ ہم اشرف المخلوقات کی تو یہ عظیم ترین تمنا ہے۔ یہ ہمارے دل کی صدا ہے۔ روح کی آواز ہے کہ — 'ہمیں زنجیروں میں نہ جکڑو۔ ہم پر پابندیاں نہ عائد کرو۔ ہم آزاد پیدا ہوئے اور آزاد ہی رہ کر جینا و مرنا چاہتے ہیں'

یہ انسانی فطرت کا خاصہ ہے کہ وہ کسی کا محتاج نہیں بننا چاہتا کیونکہ محتاجی کی زندگی محض ایک مشینی زندگی بن کے رہ جاتی ہے۔ ایک ایسی زندگی جو دوسرے کے تابع ہوتی ہے۔ ایسی زندگی جو صحیح معنوں میں زندگی نہیں بلکہ زندگی کی مجبوری کہی جا سکتی ہے۔ اسی لیے نجی زندگی ہو یا قومی، ملکی و سماجی۔ مذہبی امور ہوں یا علمی تمدنی و معاشرتی انسان کسی کی اجارہ داری نہیں چاہتا۔ مداخلت نہیں پسند کرتا۔

صرف یہی نہیں۔ آزاد رہ کر ہی آدمی اپنی جملہ صلاحیتوں کو ابھار سکتا ہے ایک خوش گوار، اعلیٰ اور باافتدار زندگی بسر کر سکتا ہے اور انھیں ساری باتوں کے درمیان آزادی کا پودا اگتا بڑھتا اور سرسبز و شاداب ہوتا ہے۔

یقینی طور پر آزادی کا جذبہ انسان کا نہایت عظیم، مقدس اور پاکیزہ جذبہ ہے یہ آدمی کے اندر سکون و اطمینان پیدا کرتا ہے، یقین و اعتماد لاتا ہے آدمی کی شخصیت کو ابھارتا سنوارتا اور پروان چڑھاتا ہے۔ آزاد رہ کر ہی انسان حقیقی معنوں میں انسان کہلانے کا مستحق ہے۔ شاید اسی لیے مشہور مفکر ہرالڈ لاسکی نے کہا ہے۔

"آزادی سے مراد ایک ایسا ماحول پیدا کرنا ہے اور اس کا برقرار رکھنا ہے جس میں انسان کو اپنی شخصیت کو پروان چڑھانے کا موقع مل سکے۔ یعنی ہر شخص آزادی کے ساتھ اپنی خواہشات کی تکمیل کر سکے اپنے مقاصد بر لا سکے۔"

آزادی کے اس مزاج کو دیکھتے ہوئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا آزادی کا مطلب آدمی پر سے ہر قید و بند اٹھا لینا ہے اور جو کچھ بھی اس کے دل میں آئے کرنے دینا ہے دوسرے لفظوں میں اسے خود سر و خود مختار بنا دینا ہے ؟؟ — اس کا جواب نفی میں ہوگا۔ وجہ یہ ہے کہ آدمی غرض کا پتلا ہے۔ ماہرین نفسیات نے بھی یہ بات واضح کر دی ہے کہ انسانی جذبات کو کھلی چھوٹ دینا انسانیت کے لیے مستقل خطرہ ہے۔ اگر انسان کے افعال و اعمال، حقوق و فرائض کی حدیں معین نہ کی گئیں اور آدمی کو اپنی طبیعت کا

مالک بنا کر بے لگام چھوڑ دیا گیا تو سماج میں ہر سمت لاقانونیت اور جس کی لاٹھی اس کی بھینس کی وبا سی پھیل جائے گی۔ پھر سارے انسانی و اخلاقی اقدار، بلند پایہ تصورات صحت مندانہ رجحانات، زندگی کے سارے اصول و ضوابط ریت کی دیوار بن جائیں گے۔ سارے سماجی رشتے درہم و برہم ہو جائیں گے اور آدمی کا سماج میں رہ کر جینا دشوار ہو جائے گا۔

اس سلسلے میں ایک واقعہ کا اشارہ ضروری ہے۔

کہتے ہیں کہ ایک صاحب کے ذہن میں یہ بات پیدا ہوئی کہ وہ اپنی مرضی کے مختار ہیں اور جو کچھ بھی چاہیں کرنے کا حق رکھتے ہیں چنانچہ سڑک کی بھیڑ میں انھوں نے اپنی چھڑی نچانا شروع کی۔ وہ شوق فرماتے ہوئے گزر رہے تھے کہ پیچھے آتے ہوئے دوسرے صاحب نے اس حرکت پر اعتراض کیا۔ "آپ کو اس طرح اپنی چھڑی نچانا نہیں چاہیے۔"

"میں آزاد ہوں اور یہ چھڑی بھی میری ہے مجھے حق حاصل ہے کہ جو بھی چاہوں اپنی چھڑی کے ساتھ کروں" — چھڑی والے صاحب نے جواب دیا۔

"صحیح ہے۔ لیکن آپ کو یہ جاننا چاہیے کہ آپ کی آزادی، میں ختم ہو جاتی ہے جہاں سے میری ناک شروع ہوتی ہے"

بظاہر یہ مزاحیہ سا جملہ ہے لیکن اس ایک جملہ میں حقوق کے ساتھ فرائض یا آزادی کی حدود کی نشاندہی ملتی ہے۔ شاید اسی لیے مفکرین نے معاشرہ میں نظم و ضبط قائم رکھنے کے لیے ایک مطمئن و پرسکون سماج کی بنیادوں کو استوار کرنے کے لیے یہ ضرورت محسوس کی کہ آزادی کے ساتھ پابندی کا ہونا لازمی ہے۔ جہاں آدمی کو آزادانہ طور پر اپنے حقوق کے استعمال کرنے کا حق دیا جائے وہیں یہ بھی ضروری ہے کہ ان حقوق کے استعمال کرنے کی حدیں بھی معین کی جائیں یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ بڑے سے چھوٹے کی، امیر سے غریب کی اور طاقتور سے کمزور کی آزادی کی حفاظت ہو سکے۔ تاکہ ایک طاقتور، کمزور اور امیر، غریب کی آزادی پر دست درازی کر کے ظلم و جور، تشدد و استبداد کو اپنا حق آزادی نہ سمجھ بیٹھے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر آزادی کے حقوق کی حدیں کون مقرر کرے گا۔ یہ بات کس طرح طے ہوگی کہ ہم اپنے حقوق کو کس حد یا دائرے میں استعمال کر سکتے ہیں؟؟ — اس کا جواب یہ ہے کہ یہ کام کوئی غیر جانبدار و مضبوط قوت ہی انجام دے سکتی ہے۔ اور یہ طاقت قانون ہے۔ قانون ہی یہ طے کر سکتا ہے کہ کسی شخص کا کوئی فعل کہاں تک مفاد عامہ کے لیے بہتر اور کہاں تک مضر ہے۔ قانون ہی ایسی فضا پیدا کر سکتا ہے۔ ایسا ماحول بنا سکتا ہے جس میں ہر شخص کو اپنی سطح پر سکون و اطمینان، یقین و اعتماد کے ساتھ زیادہ سے زیادہ ترقی کرنے کے مواقع فراہم ہوں دوسرے معاشرے میں ایسی ہم آہنگی و توازن ہو جہاں کمزور و طاقتور امیر و غریب سبھی اپنے حقوق کو برابر استعمال کر سکیں اور طاقتور طبقہ کا کمزور اور امیر کا غریب پر اقتدار کے تسلط کا خاتمہ ہو جائے۔

اس بحث سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ قانون آزادی کے منافی نہیں، بلکہ معاون ہے۔ آزادی کی بقاء و تحفظ کے لیے پابندی کی ضرورت ہے اور یہ پابندی قانون ہی عائد کر سکتا ہے۔ اسی لیے جان لاک نے کہا تھا —

"جہاں قانون نہیں وہاں آزادی کا تصور ہی ناممکن ہے۔"

ولوبی نے اس بات کو یوں کہا —

"آزادی کا وجود اسی وقت ممکن ہے جب کہ پابندیاں بھی ساتھ ہوں۔"

آزادی اور قانون کے باہمی رشتہ کو لے کر مفکرین میں طویل بحثیں رہی ہیں اس سلسلہ میں دو نظریے سامنے آتے ہیں۔ پہلے نظریے کے مطابق جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے کہ قانون، آزادی کا محافظ ہے۔ بغیر قانون کے آزادی کا وجود خطرے میں ہے قانون، آزادی کی راہوں میں پابندیاں عائد کر کے معاشرہ میں نظم و ضبط، توازن و ہم آہنگی برقرار کرتا ہے اور عوام کو سکون و اطمینان، امن و سلامتی کے ساتھ بہتر زندگی گزارنے کے مواقع عطا کرتا ہے قومی و ملکی تعمیر و ترقی کو بحال کرتا ہے اور تمامی سماجی رابطوں کو مستحکم بناتا ہے۔ کیونکہ سماج میں بسنے والے ہر فرد کے حقوق کے تصرف کی

حد میں مقرر کر دینے کے بعد ہی ہر شخص کو اس کی آزادی کا پورا پورا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے اور آدمی کا وہ گندہ و ناپاک "ہم چنیں دیگرے نیست" والا جذبہ راہ نہیں پا سکتا ہے۔ اور GREA-
TEST GOOD FOR THE GREATEST NUMBER
والی تعلیم بر سرِ کار ہو سکتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ قانون ہر شعبۂ حیات میں ایسے دستور مرتب کرے جن پر عمل پیرا ہو کر ہر شخص اپنی آزادی کا پورا پورا فائدہ اٹھا سکے اور دوسرے کی آزادی کے استعمال میں کسی قسم کا خلل یا فتور نہ پیدا کرے یہی آزادی کی صحیح و مناسب تشریح ہے۔ ہربرٹ اسپنسر کے لفظوں میں —

"ہر شخص اپنی منشا و مرضی کے مطابق کام کرنے کو آزاد ہے صرف شرط یہ ہے کہ اس کا کوئی فعل دوسرے شخص کی آزادی میں کوئی خلل یا فتور نہ پیدا کرے۔"

قانون و آزادی کے لیے دوسرا نظریہ یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے لیے متضاد ہیں۔ ایک کی موجودگی میں دوسرے کا رہنا ممکن نہیں۔ یعنی جہاں قانون جتنا ہی زیادہ ہوگا آزادی اتنی ہی کم ہوگی۔ یوں بادی النظر میں کچھ ایسا ہی معلوم بھی ہوتا ہے لیکن قانون و آزادی کے باہمی رشتے کو عمیق نظروں سے دیکھنے کے بعد یہ نظریہ درست نہیں معلوم ہوتا۔

روزمرہ زندگی کے مشاہدات بھی بتاتے ہیں کہ آزادی پر پابندیوں کا لگنا ضروری ہے۔ مثال کے لیے سڑک کی آمد و رفت کو لے لیجئے ظاہر ہے سڑک کی تعمیر کا مقصد ہے اُسے آمد و رفت کے لیے استعمال کرنا لیکن اس کے استعمال کے لیے بھی نظم و ضبط مرتب کرنا لازمی ہے۔ اپنے بائیں سے چلنا، سواری کی رفتار پر کنٹرول رکھنا، روڈ سگنل کا دھیان رکھنا، ہارن، پاس اور ریڈ سگنل وغیرہ کے دستور کی غرض و غایت یہی ہے کہ خود آدمی سکون و اطمینان کے ساتھ سفر کرے اور دوسرے کے لیے بھی معاون و مددگار ثابت ہو۔

اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قانون اور آزادی کا چولی دامن کا ساتھ ہے قانون، آزادی پر پابندیاں ضرور عائد کرتا ہے لیکن انھیں پابندیوں میں ایک اعلیٰ و صحت مند سماج کی تشکیل مضمر ہے۔ یہ پابندیاں ہمارے دستور میں دی گئی آزادی و حقوق کو ضائع نہیں کرتیں، بلکہ یہ پابندیاں قانونی شکل میں ہمارے ساتھ رہ کر قدم قدم پر ہمیں سہولتیں پہنچاتی ہیں۔ دوسرے ہمارے شانہ بہ شانہ چلنے والے شخص کی مسرت و شادمانی، سکون و آرام، یقین و اعتماد کو بحال کرتی ہیں اور آخر میں یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ یہی پابندیاں ہمیں سماجی رابطوں کو مضبوط کرنے اور ایک خوشگوار اور بے خوف زندگی گزارنے کا موقع دیتی ہیں اور معاشرہ کی اعلیٰ تعمیر و ترقی کی بنیادوں کو مستحکم کرتی ہیں۔ اسی لیے ہمارے دستور کے آرٹیکل ۱۹ میں جہاں حقوق انسانی اور آزادی کی ضمانت دی گئی ہے یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ وہ قوانین جن کے ذریعہ آزادی پر پابندی عائد کی جائے گی ان کا قانونی جواز ہوگا اور ان پابندیوں کو اسی انداز سے برتا جائے گا جیسے کہ قانون اجازت دے گا۔

آج ہم آزادی کی ہی نہیں جمہوری فضا میں بھی سانس لے رہے ہیں اس نظام کی اساس آزادی، قومی یک جہتی، اخوت و مساوات پر رکھی جاتی ہے اسی لیے فرانس کے انقلابیوں نے آزادی مساوات اور بھائی چارگی کا نعرہ ایک ساتھ ہی لگایا تھا۔ لیکن جس طرح آزادی لامحدود نہیں، اسی طرح مساوات کا مطلب بھی یہ ہرگز نہیں کہ ہر شخص ہر معاملے میں ہر جگہ برابر ہے۔ ہمارے دستور کے آرٹیکل ۱۴ میں لکھا گیا ہے کہ قانون کے نزدیک سبھی مساوی ہیں اور سبھی یکساں حقوق و مراعات کے حامل ہیں اور قانون سبھی کے حقوق و مراعات کی یکساں طور پر حفاظت کرے گا۔

لیکن یہیں پر سوال ابھرتا ہے کہ کیا قانون کی نگاہ میں ایک اعلیٰ صلاحیتوں والا آدمی ادنیٰ کے اور ایک ذی شعور آدمی معمولی انسان کے برابر ہے اور قانون یا حکومت دونوں کے ساتھ مساوی سلوک کرے گا؟ کیا کوئی ایسا نظامِ حیات بھی ممکن ہے جہاں ایک عالم اور عامی انسان کے ساتھ یکساں سلوک ہو سکتا ہے اور اس برتاؤ میں دونوں طبقوں کے ساتھ انصاف کیا جا سکتا ہے؟ اس کا جواب بھی نفی میں ہوگا

یہ نفی میں جواب اس لیے ہوگا کہ سماج میں مختلف طبقے ہیں۔ مختلف طبقوں کی مختلف ضروریات ہیں۔ اپنی ضرورتوں کے مطابق ہی ہر طبقہ علاحدہ علاحدہ سلوک اور برتاؤ، حقوق و مراعات کا طالب ہے اور مقتضائے انصاف یہی ہے کہ جو طبقے زیادہ حقوق و مراعات کے مستحق ہیں انھیں زیادہ مراعات دی جائیں۔ پسماندہ طبقے کو ابھارا جائے اور ابھرے طبقے کو نیچے نہ گرنے دیا جائے۔ یوں دیکھنے میں یہ طرز برتاؤ مساوات کی نفی کرتا ہے۔ لیکن دراصل سماج کے ہر طبقہ کے حالات ان کی ضروریات۔ ان کی خوبیوں اور خامیوں کو مدنظر رکھ کر اس مخصوص طبقے کے ساتھ مخصوص انداز سلوک ہی حقیقی معنوں میں مساوات ہے۔

اس لیے جداگانہ برتاؤ آزادی و مساوات کی نفی نہیں کرتا بلکہ سماج میں بسنے والے مختلف طبقوں اور ان طبقوں کی سماجی، تہذیبی، معاشرتی، مالی و اقتصادی حالات، جغرافیائی ضرورتوں کو مدنظر رکھ کر ان کے ساتھ مخصوص طرز سلوک معاشرہ میں توازن و ہم آہنگی لا کر آزادی و مساوات کی بنیادوں کو مستحکم کرتا ہے اور سماج کو ایک اعلیٰ پائیدار و خوش آئند مستقبل کی طرف گامزن کرتا ہے۔

اس بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آزادی کے ساتھ مساوات کا مطلب ایک ہی حیثیت، برابر کی صلاحیت، مساوی حالات و ماحول میں برابری ہے۔ دوسرے لفظوں میں مساوات یعنی موقع و عمل کی برابری ہے۔ حکومت یا قانون کے نزدیک یکساں صلاحیت حالات و ماحول رکھنے والے یکساں حقوق و مراعات کے حامل ہیں اور کنبہ و خاندان، قوم و وطن، مذہب و فرقہ جنس و نسل وغیرہ کی بنیاد پر کوئی تفریق نہیں ہوگی۔

اس طرح یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہمارے دستور نے آزادی مساوات کا جو بنیادی تصور پیش کیا ہے، وہ ہمارے لیے نعمت ہے۔ ہم آزاد ہیں۔ ہمارا ملک آزاد ہے۔ ہم پر کسی غیر یا باہری طاقت کا تسلط نہیں جمہوری نظام نے زیادہ سے زیادہ آزادی و مساوات کی فضا پیدا کرنے کے لیے (دستور میں) معاشرہ کی تعمیر و ترقی کے لیے، انسانی فلاح و بہبود کے لیے ہمارے بنیادی حقوق کی ایک فہرست مرتب کر دی ہے۔ ایسے زریں حقوق جو نہ صرف دور حاضرہ کی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں بلکہ ایک پرامن، خوش حال ترقی یافتہ سماج کی ضمانت دیتے ہیں۔

لیکن کیا ہم نے آزادی و مساوات کے صحیح مفہوم سمجھے ہیں کیا اپنے حقوق کو انھیں حدود و دائروں میں استعمال کرتے ہیں جن کے لیے قانون اجازت دیتا ہے۔؟؟ اس کا جواب بھی شاید نفی میں اور تلخ ہوگا۔! آج ہم خود کو بالکل آزاد تصور کرتے ہیں ہر معاملہ میں۔ ہر مقام پر مساوات کے مدعی ہوتے ہیں، ہر جگہ حقوق کی بات کرتے ہیں۔ ہمیں صرف اپنی غرض سے غرض ہوتی ہے۔ دوسرے کے حقوق، تکلیف و آرام کا ہمیں ذرہ برابر احساس نہیں ہوتا بلکہ اکثر تو ہم جارحیت اور طاقت کے ناجائز استعمال کو بھی اپنا حق سمجھ بیٹھے ہیں۔ اور یہ بھول جاتے ہیں کہ ہمارے حقوق کی ڈور فرائض سے بندھی ہوئی ہے۔ دستور نے جہاں ہمیں بنیادی حقوق عطا کیے۔ آزادی و مساوات کی فضا بخشی وہیں ہم پر یہ گرانبار فریضہ بھی عائد کیا کہ ہم اپنے حقوق کے استعمال میں فرائض کو فراموش نہ کریں۔ ہمارے کسی فعل یا ترک فعل سے دوسرے کے حق آزادی اور مساوات میں کوئی خلل یا فتور نہ واقع ہو۔ ہم صرف سماج سے اپنے مطالبات پورا نہ کرائیں بلکہ ہم میں یہ جذبہ ہو کہ ہم دوسرے کے دکھ درد کو بھی اپنا غم سمجھ کر اس میں شریک ہوں اور حصہ بٹائیں قانون کو ہاتھ میں نہ لے کر بلکہ قانون کا احترام کر کے ہم آزادی و مساوات کی راہوں میں خلوص و محبت، ہمدردی و بھائی چارگی کا چراغ جلائیں تو ہمارے نہ معلوم کتنے مسائل خود بہ خود حل ہو جائیں۔

ہمارے دستور نے بنیادی حقوق کی ذمہ داری لے کر ہم پر خود ذمہ داری عائد کی ہے اس کا تقاضا یہی ہے کہ ایک آزاد ملک کے آزاد شہری ہونے کے ناطے ہم خود آزادی و مساوات کا زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں اور دوسرے کو بھی زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنے دیں اگر سماج کا ہر طبقہ اطمینان و سکون کے ساتھ اپنی اپنی سطح پر ترقی کر لے تو یقینی طور پر پورے ملک کی قسمت سنور

(باقی صفحہ ۴۱ پر)

شمیم جے پوری
کاشانۂ محمود
نئی سرائے میرٹھ

ہمارے ساتھ جسے موت سے ہو پیار چلے
کوئی چلے نہ چلے ہم تو سوئے دار چلے

نہ دورِ جام نہ اب قصّۂ بہار چلے
انھیں کا ذکر چلے اور بار بار چلے

رُخِ زمانہ بدلنے چلے تھے اہلِ جنوں
ترے حضور مگر کس کا اختیار چلے

یہ غم نہیں کہ ہمیں کو یہاں اماں نہ ملی
خوشی یہ ہے کہ تری انجمن سنوار چلے

اُدھر منائے گئے خوب جشنِ دار و رسن
کفن بدوش جدھر تیرے جاں نثار چلے

ہمیں چمن میں پیامِ بہار لائے تھے
چمن سے لے کے ہمیں حسرتِ بہار چلے

تمام عمر کا حاصل تھے بس وہی لمحے
جو تیری انجمنِ ناز میں گزار چلے

بتاؤ تو مری حالت کو کیا ہوا یارو
ہنسی اڑانے کو آئے تھے اشکبار چلے

مری طرف سے مبارک ہو اہلِ گلشن کو
جو میرے بعد کبھی بادِ نوبہار چلے!

یہ انقلاب ہے کیا آج میکدے میں شمیمؔ
کدھر یہ تیغ بکف ہو کے بادہ خوار چلے

شانتی رنجن بھٹاچاریہ
آنندا پلی - پوسٹ آفس پرباپٹری ۷۴۳۵۰۹
(نزد کلکتہ) مغربی بنگال

جدید کلکتہ کا رنگ روپ
اردو شاعری کے آئینے میں

فورٹ ولیم کالج کے زمانے سے اردو میں کلکتہ کا ذکر ہونے لگا ہے۔ اس سے قبل چند فارسی شعراء کے کلام میں کلکتہ کا ذکر آیا ہے۔ میر کاظم علی جواں نے غالباً سب سے پہلے اردو میں کلکتہ کے میلوں (خاص کر چرخ پوجا) کا ذکر کیا ہے۔ ان کا "بارہ ماسہ دستور ہند" کلکتہ سے ۱۸۱۲ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد واجد علی شاہ اختر کی وہ مثنوی "حزن اختر" ہے جس میں ہم بادشاہ کے کلکتہ میں قید فرنگ کا تذکرہ پاتے ہیں اور جس کو واجد علی شاہ نے سنہ ۱۲۶۶ھ میں قلم بند کیا تھا۔ لیکن کلکتہ کے سلسلے میں مرزا غالب کا یہ شعر ہی سب سے زیادہ مشہور و مقبول ہے ؎

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر مرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے

غالب کے بعد اردو کے کئی نامور شعرا کلکتہ آئے۔ بعض یہاں ہمیشہ کے لیے بس گئے اور کئی صرف روٹی روزگار یا کسی اور سلسلے میں یہاں آئے۔ چند ماہ یا سال رہے اور پھر واپس وطن لوٹ گئے۔ ان شعراء میں سے کئی نے اس شہر کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً حضرت داغ دہلوی جو ایک حسن فروش حجاب کے عشق میں گرفتار ہو کر رام پور سے کلکتہ آئے تھے۔ داغ کے کلام میں بھی کلکتہ کے سلسلے میں کئی اشعار موجود ہیں۔ مثلاً

دیکھ کر شہر کھل گئیں آنکھیں ، ماہ رویوں پہ ڈھل گئیں آنکھیں
سر بازار وہ مکان بلند ، جس کو کہیے اک آسمان بلند
چرخ کو رتبہ اس مکاں سے کہاں ، دور بھاگا ہے یہ کہاں سے کہاں
شرم غیرت سے چھپ گئی جنت ، ورنہ یہ قصر دیکھتی جنت

یہ حسین یہ مہ جبیں یہ شہر ایسی لہر بہر
داغ کلکتے سے لاکھوں داغ واں پر لے چلے
سب لوگ خوش قماش خوش ترکیب
اہل تمیز و صاحب تہذیب

یا پھر حجاب کی زبانی حضرت داغ نے مثنوی "فریاد داغ" میں کلکتے کی تعریف یوں کی ہے:

زر سے معمور ہے ہمارا شہر ، کون سا دوسرا ہے ایسا شہر
ہے حکومت کی شان کلکتہ ، سلطنت کا نشان کلکتہ
انتخاب زمان کلکتہ ، فخر ہندوستان کلکتہ

لیکن کلکتہ کے سلسلے میں یہ تمام بیانات حتیٰ کہ سید علی نقی صفی لکھنوی کی مثنوی "کلکتہ" آج بھی کلکتے کا نقشہ پیش نہیں کرتا حالانکہ ان تمام تخلیقات کی ادبی اہمیت مسلم ہے لیکن چوں کہ میرا مقصد جدید شہر کا نقشہ پیش کرنا ہے لہٰذا صرف اس کلام کا سہارا لوں گا جو آزادی (تقسیم ہند) کے بعد کے شعرا کا ہے۔

کلکتہ جدید ہندوستان کا سب سے بڑا شہر ہے اور بنگال کے اردو شعراء میں تقریباً پچاس فیصد شعراء کلکتہ اور اطراف کلکتہ (کلکتے کے صنعتی علاقہ اور ہوڑا) میں رہتے ہیں۔ لہٰذا بنگال کی اردو شاعری کا دامن ذکر کلکتہ سے مالا مال ہے۔ جدید شعراء میں دو شاعروں نے کلکتہ پر مثنویاں لکھی ہیں۔ پہلی تصنیف سید حرمت الاکرام کی "کلکتہ اک رباب ہے" جو سنہ ۱۹۶۶ء میں شائع ہوئی اور اس کے بعد سید لطیف الرحمٰن کی "مثنوی کلکتہ" اپریل سنہ ۱۹۷۴ء میں منظر عام پر آئی ہے۔ ان دو تصانیف کے علاوہ بنگال کے کئی شعراء کے کلام میں ہم اس

عظیم شہر کا روپ دیکھ پاتے ہیں لہٰذا ان کے کلام سے کلکتہ کے شب و روز کا ذکر اخیر کرتا ہوں۔

جدید کلکتہ کی بستیاں۔

کلکتہ کی آبادی میں سے کم از کم ستر (۷۰) فیصد کلکتے کی بستی علاقوں اور ریفیوجی کالونیوں میں آباد ہیں۔ کالونیاں وہ ہیں جو تقسیم ہند کے نتیجہ میں شہر کے دامن میں ادھر ادھر ابھری ہیں۔ تنگ و تاریک اور گنجان آبادی والے یہ علاقے زیادہ تر شمالی اور مغربی کلکتے میں ہیں اور بستیاں تو سارے شہر اور اطراف شہر یعنی پورے شہر کے جسم پر چیچک کی طرح سیاہ سیاہ داغ لگتے ہیں۔ گھناونی اور ڈراونی بستیاں ہم ان چھوٹے چھوٹے مکانات سے پُر علاقوں کو کہتے ہیں جہاں زیادہ تر غریب محنت کش عوام بستے ہیں۔ ان میں سے کئی بستیاں تو دو دو سو سال پرانی بھی ہیں۔ ہمارے کئی اردو شعراء ایسے ہی بستی والے علاقوں میں آباد ہیں لہٰذا بستیوں کے ذکر سے یہاں کی اردو شاعری کیوں کر خالی ہو سکتی ہے۔ دیکھئے کس انداز سے شعراء نے آج کے کلکتے کی ان گندی بستیوں اور ان میں بسنے والے لاکھوں لوگوں کا ذکر کیا ہے۔

اشک امرتسری[1] نے اپنے محلے کا نقشہ یوں کھینچا ہے۔

یہ جو نالی میں پڑے ہیں چیتھڑے اور دھجیاں
کھیلتے ہیں ان سے ہی ہمسائے کے ننھے میاں
دوڑ پڑتی ہے بڑھیا سر چڑھے دھوبی کی ماں
رات دن چلتی ہے قینچی کی طرح جس کی زباں
اور وہ لڑکی جو فلمی گیت گاتی ہے سدا
ٹاٹ کا پردہ ہٹا کر جھانک لیتی ہے ذرا
ایک بیوہ بھی ہے جس کا کوئی بیٹا ہے نہ گھر
کر ہی لیتی ہے گزر کاغذ کے ٹھونگے بیچ کر
چودھری نتھو کا بیٹا رات کو پی کر شراب
گالیاں بکتا ہے لیکن منتخب اور لاجواب
اور بھائی بی پڑوسن کی لڑائی کی نہ پوچھ
مفلسی کی خودنمائی جگ ہنسائی کی نہ پوچھ
الغرض یہ وہ محلہ ہے جہاں رہتے ہیں ہم
ہم کہ ہیں دانائے اسرار و رموز جام جم

اور مٹیا برج کلکتہ کے نوجوان شاعر شمیم انور نے بستی کے مکانوں کا حال یوں بیان کیا ہے:

سرخ کھپریلی ٹالیوں میں
کیپ کا لوٹا لگا ہوا ہے
بانس، جس پہ یہ چھت کھڑی ہے
گھن لگے کھوکھلے ہیں، ان میں
دیمکوں کی غذا نہیں ہے۔
اور ــــــ بند کرنے کی ساری دیواریں
ننگی اینٹوں کی بے حیائی پہ رو رہی ہیں

اور ایسی گندی بستی کے کسی ایک گھر میں جب کوئی گھر والی دال بھات پکانے کے لیے چولھا جلاتی ہے تو بستی کے دیگر گھروں میں دھواں بھر جاتا ہے لیکن یہ دھواں باشعور شعراء کو سوچنے پر بھی مجبور کر دیتا ہے۔ دیکھئے ترقی پسند انسان دوست کلکتہ کا ایک شاعر یعنی پرویز شاہدی نے اس دھوئیں سے متاثر ہو کر کیا نتیجہ نکالا تھا:

اک پڑوسی کے گھر میں آگ لگی
اور دھواں بھر گیا مرے گھر میں
ایک ہمسائے نے جو کی فریاد
گونج اٹھا درد قلب مضطر میں
میرے دل کے پڑوس میں جیسے
اب کروڑوں دلوں کا مسکن ہے
میں اکیلا ہوں یا کروڑوں ہوں
یہ جہاں میرے گھر کا آنگن ہے

کلکتہ تجارت کا مرکز ہے، عالمی منڈی ہے لیکن صرف یہ تاجروں، رئیسوں کی نگری نہیں ہے، کل کارخانوں کا شہر ہے

---

[1] اشک امرتسری۔ وفات ۲ ستمبر ۱۹۵۶ء بمقام کلکتہ۔

محنت کشوں کا شہر ہے، ہر رنگ و نسل، زبان و تہذیب اور مذہب و ملت کے لوگ، ایک لفظ میں دنیا کے کونے کونے کے لوگ اسی شہر کے دامن میں آباد ہیں اور ہمیشہ شعراء نے بھی اسی شہر کے سلسلے میں یہی کہا ہے۔

یہ ایک شہر سارے جہاں کی کہانی ہے
یہ ایک غزل ہے جس کا ہر اک شعر اکائی ہے

برلاؤں کا یہ شہر، یہ محنت کشوں کا شہر
کاروں کا شہر رکشوں، ٹراموں بسوں کا شہر

——— سید حرمت الاکرام

اکتساب رنگ عالم شہر یہ کرتا گیا ۔۔۔ روپ نئے بین الاقوامی سٹی کا یہ بھرتا گیا
سارے بھارت کے یہاں ایک ہوتے نظر ۔۔۔ نوکری پیشہ ہے کوئی اور کوئی پیشہ ور
ایشیائی لوگ بھی ہیں اور امریکن بھی ہیں ۔۔۔ رہل یورپ بھی ہیں کافی اور افریقن بھی ہیں
مالداروں کا زمانہ غم کے ماروں کا بھی ۔۔۔ ٹھاٹھ والوں کا تماشا خاکساروں کا بھی

——— سید لطیف الرحمن

مرکز کاروبار کلکتہ ۔۔۔ خرمن روزگار کلکتہ
ڈوب کر خون میں غریبوں کے ۔۔۔ بن گیا لالہ زار کلکتہ

——— حشمت فتحپوری

آدمی کا جنگل ہے ۔۔۔ شور و شر ہے دنگل ہے

——— علقمہ شبلی

عوامی جلسے جلوس

آزادی سے قبل بھی سیاسی میدان میں کلکتہ کو اہم مقام حاصل رہا ہے۔ جنگ آزادی میں اس شہر نے جو رول انجام دیا اس کے ذکر کے بغیر تاریخ آزادی ہند پر کوئی کتاب نہیں لکھی جا سکتی۔ آزادی کے بعد بھی میدان سیاست میں اس عظیم شہر کی اہمیت برقرار ہے۔ آج بھی یہیں سے کئی نئی نئی تحریکیں ابھرتی ہیں اور ہندوستان بھر میں آگ کی طرح پھیل جاتی ہیں۔ آج بھی یہ شہر سیاست والوں، رہنماؤں، انقلابیوں اور جلسے جلوس کا شہر ہے۔ جلوس تو یہاں ہر روز ہی نکلتے ہیں اور کبھی کبھی تو اتنے طویل جلوس نکلتے ہیں کہ گھنٹوں ٹرافک کے لیے شاہراہیں بند رہتی ہیں۔ نت نئے انقلابی تحریکوں اور نعروں سے یہاں کے اردو شعراء بھی متاثر ہوئے بغیر کیوں کر رہ سکتے ہیں لہٰذا حقیقت پسند اور عوامی زندگی سے قریب رہنے والے شعراء کے کلام میں ہم انقلابی بنگال کا بھرپور چہرہ دیکھ پاتے ہیں مثلاً

جب ظلم کا جھگڑا آتا ہو، جب موت کی آندھی آتی ہو
جب ظالم کا گھر بنتا ہو، مظلوم کی کٹیا جلتی ہو
جب محنت کا دم گھٹتا ہو اور دولت پھولتی پھلتی ہو
جب دھن کا دھوم دھڑاکا ہو اور فن کی لاش نکلتی ہو
اندھیارا نور اگلتا ہو، تب دیکھ بہار کلکتہ

جب ظلم بڑھے مزدوروں پر دل والوں کا دلالوں کا
غل شور بڑھے تقریروں کا بنگال موروں کا ہڑتالوں کا
ہو ایکا ہندو مسلم کا اور میل ہو گورے کالوں کا
جب نعرے ہوں ہندوستانیوں کے اور شک جھنڈے والوں کا
نعروں میں جب طوفان پلتا ہو تب دیکھ بہار کلکتہ

——— اشتاک امرتسری

بھیڑ میں جلوس
کھو گیا اک چہرہ
شورشوں میں نعروں کی
سو گئی صدائے دل
پرچموں کے سائے میں
آرزو ہے صف در صف
زندگی سوالی ہے
انقلاب آئے گا ——— انقلاب زندہ باد

اس شہر کو جلوسوں کا شہر قرار دیا گیا ہے۔ کلکتہ میدان میں جو شہید مینار نامی بلند مینار ہے عموماً اس کے نیچے ہی جلسے ہوتے ہیں سید لطیف الرحمن نے بھی یہی کہا ہے:

شہر کلکتہ ہمارا ہے جلوسوں کا نگر ۔۔۔ دامن مینار سنگم ہے جلوسوں کا نگر
اجتماعوں کی جگہ ہے نو نہالوں کی جگہ ۔۔۔ بولنے والے سیاسی سورماؤں کی جگہ
روز جلسوں کے تماشے دیکھتے ہیں ہم یہاں ۔۔۔ روز آتا ہے نظر آتش بیانوں کا سماں

سامعوں کے سامنے ہوتا ہے تفاعلی کہیم   شور "زندہ باد" کا ہے دم بدم ہے شیم شیم
جب بڑے احزاب کے ہوتے ہیں جلسے خاص کر   دور تک سیلاب انسانوں کا آتا ہے نظر
جوہر آتش بیانی سب دکھاتے ہیں یہاں   پُر غضب انداز کی ہوتی ہیں کیا کیا دھمکیاں
"یا تو مانو حق ہمارا یا تو گدی چھوڑ دو"   "تم نے حکومت کرنے والو کیا دیا ہے قوم کو"
نعرہ ہائے پُر غضب سے گونجتا ہے یہ مقام   رنگ برلاتی ہے سب کو گرمیٔ جوش کلام
دامن منار ایسی جلسہ داری سے جناب   بن گیا تاریخ کلکتہ کا روشن ایک باب

چورنگی

کلکتے کے مختلف راستوں، تاریخی مقامات اور سیر و تفریح کے باغات کا ذکر بھی مختلف شعراء نے کیا ہے لیکن چورنگی جو "جانِ کلکتہ" ہے کی رنگینی کا مختلف شعراء نے خوب خوب ذکر کیا ہے۔ چند نمونے پیش کرتا ہوں، لطف اٹھائیے:

راستوں میں راستہ ہے ایک چورنگی جناب
شہرت و مقبولیت میں کون ہے اس کا جواب
زندگی کی ہلچلوں کا دیکھئے منظر یہاں
نو بہ نو انداز کے ہیں روپ جلوہ گر یہاں
اختلافِ رنگ و بو کی ایک جلوہ گہ ہے یہ
جانِ کلکتہ یہی ہے شانِ کلکتہ ہے یہ
حسن والوں کا نظارہ ناز والوں کا خرام
دیدۂ معشوق بیں ہوتا ہے آکر شاد کام
جی کو بہلاتے ہیں آکر لوگ شاموں کو یہاں
دیکھتے ہیں خواب میں وہ جو نہ دیکھا تھا یہاں

——— سید لطیف الرحمن

چورنگی نے کہا مری دنیا ہے بے نظیر
چورنگی، اک طلسم کہ خود اپنا ہی اسیر
چورنگی، زندگی کی کمان کا سنہرا تیر
چورنگی، اپنے رانجھا کی کھوئی ہوئی سی ہیر
چورنگی، ایک آن کسی کی اٹھان کی
چورنگی، اسی زمین پہ دھنک آسمان کی

چورنگی، ایک تجربہ، اک جلوہ، اک نظر
خیام کی رباعی کا بھٹکا ہوا اثر

——— سید حرمت الاکرام

حسین نظروں میں کیا جمال دیکھا   مگر تمام کے حسن بنگال دیکھا
حسینوں کی ہر قدم رنگیں فضا تھی   بنی ہر طرف گویا اندر سبھا تھی
کوئی سامنے سے چلا آرہا تھا   کوئی ڈھا کے دل پہ ستم جا رہا تھا
کوئی شوخ رفتار گزرا بغل سے   حسیں میر و غالب کی بڑھ کر غزل سے
نگاہوں کی اللہ رے فشانی   چڑھے جیسے دریا بڑھے جیسے پانی
لباسوں کا تھا رنگ نکھرا ہوا سا   شکن در شکن حسن بکھرا ہوا سا
کمر جیسے شاخ چمن بل رہی ہو   لب سرخ جیسے کلی کھل رہی ہو
نظر جیسے چھلکا ہوا مے کا پیالہ   مصور نے اپنا قلم توڑ ڈالا

——— "چورنگی کی شام" ——— رضا جون پوری

کلکتہ کارپوریشن

کلکتے کے راستے کی صفائی کا ابھی تک کوئی حکومت درست انتظام نہیں کر سکی ہے۔ جہاں دیکھو گندگی، کوڑے کرکٹ کے ڈھیر، سڑکوں پر گڑھے۔ برسات میں تو گھر سے باہر نکلنا ہی دوبھر جان ہے۔ کلکتہ کے عوام کو اس سلسلے میں کئی شکایتیں ہیں۔ خاص کر کلکتہ کارپوریشن سے اور کلکتہ کے شعراء نے بھی عوام کے جذبات و شکایات کی بھرپور ترجمانی کی ہے۔

سیر کر کے دیکھئے کیا صورتِ احوال ہے   کارپوریشن ہمارا فارغ الاشغال ہے
کارپوریشن بھی اڈا ہے سیاست کا بڑا   کام سیٹھی نادروں کا ہے زیادہ بولنا
کانسلر بن گئے وہ بات ان کی بن گئی   شہر کو اب کون پوچھے اپنی اپنی ہے پڑی
شومئی تقدیر ہے کہ قدرداں ہم ہی نہیں   گندگی شیوہ ہمارا قدر ہم نے کی نہیں
کارپوریشن کے نوکر ہیں یہاں تو کیا ہوا   نوکری کرتے ہیں لیکن کام سے کیا واسطہ

——— سید لطیف الرحمن

پانی کی رکاوٹ سے ہے گلیوں میں قیامت
سونے پہ سہاگہ ہے نگہبانوں کی غفلت
جو شہر کے والی ہیں جو صحت کے نگہباں
راہوں کی صفائی سے ہیں یک لخت گریزاں

یوں کوڑوں کا انبار لیے سر پہ ہیں رستے
جیسے کہ بٹھائے گئے ہوں دشتوں پہ دستے
پانی جو پڑا کھل گئے تب فضلا کے جوڑے
سب بہہ کے چلے آئے مکانات میں کوڑے
گھر میں جو گھسیں گندگیاں کھولے دہانے
گھبرا کے ہر اک شخص لگا شور مچانے
دل دوز صدائیں جو ہوئیں زمزمہ پرداز
آئی کسی ہمسائے کی فوراً ہی یہ آواز
اے دوستو، چلاؤ نہ یاروں کو صدا دو
بس صبر کرو کارپوریشن کو دعا دو

——— نازش سکندر پوری

لوڈشیڈنگ

گزشتہ کئی سال سے کلکتے کی روزمرہ زندگی میں لوڈ شیڈنگ بھی ایک مصیبت ہے اور آج تک کوئی ایسی امید نہیں کہ آئندہ چار پانچ سالوں میں بھی اس مسئلہ کا کوئی حل نکل آئے گا۔ اس طرف علقمہ شبلی نے اپنی ایک نظم میں یوں اشارہ کیا ہے:

ہو رہا ہے وقت دفتر کا بھی اب
لوڈشیڈنگ آج پھر
چارسو ہے حکمراں
شیو کرنے کی کوئی صورت نہیں
آئرن ہو کس طرح؟
چائے، کافی، ناشتہ، کچھ بھی نہیں
بھاپ،
بجلی،
اور پلس
اب کتابِ زندگی کے بس یہی عنوان ہیں

ہوٹلے، بار، ریسٹورنٹ

ہوٹلوں کے بغیر بڑے شہروں کی زندگی ہی کیا۔ لاکھوں لوگ ہیں جو صرف ہوٹلوں ہی میں کھاتے ہیں چوں کہ ان کے گھروں میں پکانے کی جگہ ہی نہیں۔ اور پھر ایسے رئیس لوگ بھی ہیں جو گھروں میں پکانے کے بدلے بڑے ہوٹلوں میں کھانے ہی کو ہر لحاظ سے بہتر خیال کرتے ہیں۔ کلکتہ جو ہندستان کا عظیم شہر ہے یہاں بھی چھوٹے بڑے ہر طرح کے سینکڑوں ہوٹل ہیں۔ غریبوں کے لیے بھی اور رئیسوں کے لیے بھی۔ چند بڑے ہوٹل وہ بھی ہیں جہاں حسن فروخت ہوتا ہے ایسے ہوٹلوں کی چمک دمک رات کی تاریکی میں جاگ اٹھتی ہے۔ ان ہوٹلوں کا ذکر بھی ہم اردو شعراء کے کلام میں پاتے ہیں مثلاً

شام آئی، چائے خانوں میں گونجی نئی کھنک
کافی کی پیالیوں سے اٹھی دل نشیں گمک
دینے لگا صدائیں ادب کا حقِ نمک
لے کر سخنوروں کو چلی گھر سے اک للک
اہلِ شعور و فکر کے پھیرے کا وقت ہے
الجدیہ میں یہ ان کے بسیرے کا وقت ہے

——— سید حرمت الاکرام

شام آتی ہے تو جاگ سی اٹھتی ہے ہر پھبن
جاگ اٹھتا ہے اندھیرے کی فطرت کا بانکپن
ہر زاویے سے سجتی ہے تہذیب کی دلہن
ملتا ہے مشکبار تمدن کا ہر ختن
کیا چیز ہے اندھیرے کی دولت نہ پوچھیے
اہلِ خطا سے رات کی قیمت نہ پوچھیے
رات آتی ہے کہ دخترِ انگور ہو جواں
لچکے نشاط خانوں میں نغمات کی کماں
ہنگامِ رقص، جسم کا ہر خط بنے زباں
آجائیں کھنچ کے سڑکوں پہ گلیوں کی ندیاں
غیرت برہنہ پا ہے اجالوں کے دشت میں
رخسار و زلف و لب کی دکانیں ہیں گشت میں

——— سید حرمت الاکرام

رات کے اندھیرے میں
چاند منھ چھپائے جب
نیند کے بچھونے پر
اونگھ اونگھ جاتا ہے
کہکشاں کی ڈولی سے
بار اور ہوٹل میں
روشنی اترتی ہے
جام پھر کھنکتے ہیں
کیبرے بھی ہوتا ہے
آدمی بہلتا ہے
زندگی سسکتی ہے

علقمہ شبلی

اس تمام کے باوجود آج بھی کلکتہ علم وادب کا مرکز ہے دانش وروں، مفکروں، شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں کا شہر ہے۔ کھلاڑیوں، فن کاروں، مصوروں کا گھر ہے۔ مزدوروں، محنت کشوں، کلرکوں اور دیگر بابوؤں کا گھر ہے۔ طالب علموں، نوجوانوں اور انقلابیوں کا شہر ہے اور کلکتہ کی زندگی کے ان تمام پہلوؤں پر بھی شعراء نے روشنی ڈالی ہے۔

بنگال کے نامور اور بین الاقوامی شہرت یافتہ ادیبوں اور دیگر مفکروں مثلاً رابندرناتھ ٹیگور، قاضی نذرالاسلام پر تو بے شمار شعراء اردو نے اپنی عقیدت کے پھول نچھاور کیے ہیں ہی۔ ان کے علاوہ راجہ رام موہن رائے، اچاریہ جگدیش چندر، چت رنجن داس، نیتاجی سبھاش چندر بوس، مولانا ابوالکلام آزاد، شرت چند چٹرجی اور علامہ وحشت کلکتوی کا ذکر بھی کئی علماء نے کیا ہے۔ ان عظیم ہستیوں کے سلسلے میں شعرائے کلکتہ نے جو اشعار کہے ہیں اگر ان کو یکجا کیا جائے تو سینکڑوں صفحات کی ایک کتاب ہو جائے گی۔

یہی نہیں بلکہ آزادی کے بعد اور آج کے ادبا و شعرا کا ذکر بھی شعرا کلکتہ کے کلام میں پایا جاتا ہے مثلاً کئی شعراء نے پرویز شاہدی (مرحوم) عباس علی خاں بیخود (مرحوم) شاکر کلکتوی (مرحوم) علامہ جمیل مظہری، جرم محمد آبادی، ابراہیم ہوش، سالک لکھنوی، جوہر غازی پوری، مقیت الحسن جاوید نہال حشی کہ راقم الحروف کے سلسلے میں بھی کئی اشعار کہے ہیں۔

★

آزادی۔ مساوات اور قانون (صفحہ کا بقیہ)

جائے۔ ہم خود جئیں اور دوسروں کو بھی آرام وسکون عزت وشان کے ساتھ زندہ رہنے دیں۔ ہر طبقہ، ہر فرد میں یقین واعتماد کی فضا پیدا ہونے دیں اور ایسا سماج بنائیں جس میں زندگی اور زندگی کی نشانیاں اجاگر ہوں۔ ہم دوسرے کی کمیوں کو نہ ٹٹول کر خود کا جائزہ لیں۔ اپنی کمیوں کو دور کریں تو ہم میں سچی آزادی پیدا ہوگی۔ ہم مساوات کا صحیح مفہوم سمجھ سکیں گے اور ہم میں قانون کے ادب واحترام کا سالم جذبہ پیدا ہوگا۔ تب ہی سچا سماج وجود میں آئے گا۔ اور ایسا بھی ہوگا۔

★

غزلیات

پروفیسر سید حسن سرمد
سنگھی ہاؤس، ترپولیا
پٹنہ ۸۰۰۰۰۷

مری حیات کا کیا ہے پروگرام نہ پوچھ
خرابِ شوق کے دن رات صبح و شام نہ پوچھ

یہیں ہے وادیِ غربت یہیں ہے کوئے بتاں
تلاشِ دوست میں کس جا ملے مقام نہ پوچھ

لگائے دل سے میں رکھتا ہوں آرزو اس کی
عزیز مجھ کو ہے کتنا خیال خام نہ پوچھ

کہاں وہ دورِ جنوں اور کہاں یہ دورِ خرد
بدل گیا ہے زمانے کا کیا نظام نہ پوچھ

خزاں کے خوف سے پھولوں کا دل لرزتا ہے
ہے کس کے ہاتھ میں گلشن کا انتظام نہ پوچھ

ہوئی ہے خونِ جگر سے جو ابتدا اس کی
فسانۂ غمِ ہستی کا اختتام نہ پوچھ

نگاہِ حسن میں سُرمہ ہے اس کی خاک مزار
جہانِ عشق میں سرمد کا احترام نہ پوچھ

واحد پریمی
۲۳ گنوری بھوپال ۱۰

صہبائے الم پی کبھی صہبائے طرب پی
میخانۂ ہستی کی ہے یہ رسم عجب سی

جب تک وہ نہیں آئے تھے معلوم نہیں کیوں
ہر پھول فسردہ تھا کلی نوحہ بہ لب تھی

اے دوست بے وجہ پریشان نہیں ہوں
اس میری تباہی کا کوئی ہوگا سبب ہی

دنیائے محبت میں قیامت جو بپا ہے
اک ہلکی سی جنبش ہے تری چشمِ غضب کی

جاتے ہو تو جاؤ مگر اتنا تو بتا جاؤ
کس چیز سے بہلاؤں پریشان ہو جب جی

تاریک ہے ہر جادۂ منزل یہ بجا ہے
اے راہرو دل میں ہے کچھ ذوقِ طلب بھی

یہ سمجھو کہ واحد ابھی آغازِ سفر ہے
منزل تو بہت دور ہے اس راہِ ادب کی

محبوب راہی
نزد گلناری مسجد ڈاکخانہ
بارسی ٹاکلی اکولہ (مہاراشٹر)

پندرہ اگست

قوم کی قربانیوں کی داستاں پندرہ اگست
صفحۂ تاریخ پر ہے ضوفشاں پندرہ اگست
قوتِ جمہور کا ہے ترجماں پندرہ اگست
اہلِ بھارت کے عزائم کا نشاں پندرہ اگست
عیش و راحت کا ہے بحرِ بیکراں پندرہ اگست
منزلِ آزادیٔ ہندوستاں پندرہ اگست

ہر طرف چھائی ہوئی ہے کامرانی کی بہار
جوشِ جذبوں کا امنگوں کی روانی کی بہار
آئی ہے باغِ وطن میں شادمانی کی بہار
آج ہر غنچہ پہ ہے رنگ و جوانی کی بہار
ایک پیغامِ سرورِ جاوداں پندرہ اگست
منزلِ آزادیٔ ہندوستاں پندرہ اگست

یہ سہانی وادیاں یہ گنگناتے آبشار
برف کے ملبوس میں لپٹے ہوئے یہ کوہسار
یہ حسیں ندیاں یہ جھرنوں کا ترنم خوشگوار
جس میں گنگا کا تقدس ہے ہمالہ کا وقار
ہے ہماری عظمتوں کا پاسباں پندرہ اگست
منزلِ آزادیٔ ہندوستاں پندرہ اگست

ہر طرف جشنِ مسرت کے نظارے دیکھئے
سو بہ سو مہر و محبت کے نظارے دیکھئے
ارتباطِ قوم و ملت کے نظارے دیکھئے
جا بجا کثرت میں وحدت کے نظارے دیکھئے
اتحادِ باہمی کا ترجماں پندرہ اگست
منزلِ آزادیٔ ہندوستاں پندرہ اگست

راشد قریشی
محلہ یوسف نزولی حسن پور
مراد آباد

نغماتِ آزادی

یہ بتیس سال آزادی کے ہم نے یوں گزارے ہیں
کہ جیسے دامنِ گیتی پہ ہم روشن ستارے ہیں
گل و لالہ مہکتے ہیں چمن کے گوشے گوشے میں
بہاریں رقص کرتی ہیں وطن کے گوشے گوشے میں
نہیں ہتھیار سے کم گاندھی و نہرو کی تقریریں
غلامی کی بالآخر توڑ ہی ڈالی انھیں زنجیریں
انھیں کے حوصلوں نے زندگی کا نور بخشا ہے
انھیں کی لَے پہ آزادی کا نغمہ ہم نے گایا ہے
حسین احمد، ظہیرالدین اور آزاد و قدوائی
تھے آزادی کے متوالے وطن کے اپنے شیدائی
دلوں پر ان جیالوں کے لکھا تھا نامِ آزادی
اجل سر پر لبوں پر تھا مگر پیغامِ آزادی
انھیں کی رہ گزر میں چاند تارے جگمگاتے ہیں
انھیں کے تذکرے راہِ عمل میں کام آتے ہیں
انھیں بیدار نفسوں کی امانت ہے یہ آزادی
ہماری دیش بھگتی کی ضمانت ہے یہ آزادی
اسی جذبہ کو سینے سے لگا کر ہم کو رکھنا ہے
حسد کی آگ سے اس کو بچا کر ہم کو رکھنا ہے
وہ ہندو ہو کہ مسلم، پارسی، سکھ ہو کہ عیسائی
ترقی یافتہ ہندوستاں کا ہے تمنائی
وطن والو اٹھو اب خواب سے بیدار ہو جاؤ
وطن کے دشمنوں سے ہر نفس ہشیار ہو جاؤ
جو آزادی کا دشمن ہے اٹھو اس کو فنا کر دو
وطن کے چاہنے والو وطن کا حق ادا کر دو
ہر اک ہندی مئے الفت سے یوں سرشار ہو جائے
تعصب دور ہو اور زندگی سے پیار ہو جائے

رام لعل
آر-۳۹/II ملٹی اسٹوری
نارورن ریلوے، چارباغ، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱

ناروے کی ثقافتی زندگی کی ایک جھلک

ناروے میں دو زبانیں ہیں۔ بک مول اور نی نوشک۔ شمالی ناروے میں لیپس (LAPPS) قبیلے کا ایک ایسا گروہ موجود ہے جس کی اپنی زبان بھی ہے۔

ناروے پر نازیوں کے تسلط کے زمانے میں نارویجین ادیبوں اور شاعروں کے تخلیقی سوتے بالکل خشک ہو گئے تھے کیونکہ نازیوں نے وہاں پہنچتے ہی اشاعتی اداروں پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ ان کا تسلط سنہ ۱۹۴۰ء سے سنہ ۱۹۴۵ء تک رہا۔ تسلط ختم ہو جانے کے بعد اُن کے تخلیقی سوتے پھر پھوٹ پڑے۔ وہ پہلے کی بہ نسبت کہیں زیادہ سرگرمی سے لکھنے لگے۔ شروع شروع میں اُن کے سارے ناول اور افسانے جنگ اور جنگی کارناموں کے ہی متعلق تھے لیکن پھر جلدی ہی نارویجین لٹریچر آزادی کی جدوجہد کے جوش و خروش سے آزاد ہو گیا۔ اُن کا تمام تر جوش و خروش ایک قسم کی دانشورانہ مایوسی اور ناامیدی میں تبدیل ہو گیا۔ کتابوں کی اشاعت بھی جنگ سے پہلے کے معمول پر آ گئی۔ اس دور کی شاعری نرگسیت (INTROVERT) کی شکار تھی اور وہ عام طور پر موضوعاتی ہی ہوتی تھی۔ لیکن نثر کے میدان میں ناول نے بے مثال ترقی کی۔ تباہی کے خوف کو علامتوں کے ذریعے پیش کیا جاتا تھا۔ علامتوں کنایوں اور تجربات کا سہارا لے کر بات کو خوب پھیلا کر پیش کیا جاتا تھا۔ لیکن سنہ ۱۹۵۰ء کے بعد موضوعاتی ادب ہی چھا گیا جو تجرباتی کم اور ایک فارم جیسا زیادہ ہوتا تھا۔

ملک کے ماضی قریب کے حالات میں خاصی دلچسپی کی موجودگی کے باوجود نئے دَور کی خاص شناخت انتشاری بنی رہی۔ اُن کا ماضی بے حد سادہ لیکن مسائل سے بھرا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس دور کے ادب میں علیٰحدگی پسندی کا احساس بھی نمایاں طور پر موجود ہے اور سماجی و روز افزوں مادّی ترقی کے پس منظر میں بے معنویت سے انتہا درجے کی بیزاری نظر آتی ہے۔ لیکن جب انہی احساسات کا ذکر بہت زیادہ ملتا ہے تو یہ بھی شبہ ہونے لگتا ہے کہ اس قسم کی تخلیقات کی پیش کش نے کے پیچھے کہیں اہلِ قلم کی اپنی شناخت کا مسئلہ تو موجود نہیں تھا!

سنہ ۱۹۶۰ء کے بعد کلیسائی صورت حال سے معاشی نظام کی طرف رجوع ہونے کا ردّ عمل بھی نمایاں ہونے لگا اور اس طرح ادب میں سماجی معنویت کی جستجو کا رجحان عام ہو گیا، غیر جانبداری اور مقصدیت کے تصورات شکوک کا ہدف قرار پائے اور یہ جملہ تو ہر جگہ عوام کی زبان پر تھا۔ 'اب تو ہر چیز میں سیاست نظر آتی ہے'۔

اگر معاشی نقطۂ نظر سے بھی دیکھا جائے تو سنہ ۱۹۶۰ء کے بعد یعنی چھٹی دہائی کا ادب خاصا کمزور تھا۔ ناشرین کو زیادہ تر کتابوں سے خسارہ ہی اٹھانا پڑتا تھا۔ لیکن حکومت نے تین تین سال کی مدّت کے لیے مصنفین کو تخلیقی سرگرمیاں جاری رکھنے کے لیے مالی امداد بھی دی۔ لیکن نارویجین کلچرل فنڈ میں سنہ ۱۹۵۶ء سے ہی تمام نارویجین

تخلیقات کی ایک ایک ہزار کاپیاں خرید کر لائبریریوں میں مفت تقسیم کرانے کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ اس قسم کے اقدام سے ناروے کے ادیبوں کو دوسرے ممالک کے ادیبوں کے مقابلے میں خاصی مالی راحت نصیب ہوئی اور اس طرح نارویجین ادب ایک نئے دور میں داخل ہو چکا ہے۔

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ ۱۹۶۵ء کے بعد سے نارویجین لٹریچر نے دوسرے ممالک کے ادب سے نسبتاً زیادہ ترقی کی ہے۔ لیکن نارویجین لٹریچر صرف حال سے جڑا ہوا نہیں ہے بلکہ اس کی جڑیں جزیرۂ آئس لینڈ کی قدیمی نظموں EDDA WRITINGS میں تلاش کی جا سکتی ہیں۔ یہ ناروے کی قدیم ترین دستاویزات ہیں (شاید نویں یا دسویں صدی کی) ناروے کی ادبی روایات صدیوں تک زبانی طور پر سنائی جانے والی عوامی داستانوں اور کارناموں کی ہی بدولت زندہ رہی ہیں۔ ۱۸۱۴ء میں جب ناروے ڈنمارک سے الگ ہو گیا تو اس کے بعد ہینرک ورگی لان نے اپنی رومانی نظموں کی بدولت خود بھی شہرت پائی اور ناروے کا نام بھی زندہ رکھا۔ اُسے ناروے کا سب سے بڑا شاعر قرار دیا جا چکا ہے اور اس کی تصویر ناروے کے سو کرونز سے لے کر پانچ ہزار کرونز کے کرنسی نوٹوں تک پر چھپی ہوئی ملتی ہے۔ اُنہی کے نام کے ساتھ ناروے کے ادب میں نشاۃ ثانیہ (RENAISSANCE) کا دور شروع ہوتا ہے۔ یہی وقت اُن کے ادب کے سنہرے دور کے احیا کے لیے بہت ہی موزوں بھی تھا۔ لیکن جس شخص کو ایک ادیب کی حیثیت سے سب سے پہلے بین الاقوامی شہرت نصیب ہوئی اُس کا نام بیورن ستیرنے (BJØRNSTJERNE) ہے۔ ورگی لان کی طرح اُس نے بھی قومی ادب کی تخلیق سے ابتدا کی تھی۔ لیکن پھر وہ ڈراموں اور کہانیوں کے خالق کی حیثیت سے اور ایک جدید حقیقت نگار ہونے کی وجہ سے بھی نمایاں ہو گیا تھا۔

دوسری طرف ہینرک ابسن نے دروں بینی کی طرف زیادہ توجہ دی اور وہ زیادہ سے زیادہ کتابیں لکھ کر اخلاقی مسائل کے ساتھ ہی جڑا رہا۔ اُس نے بھی اپنے ڈراموں کی وجہ سے بین الاقوامی شہرت پائی ہے۔ اُس کے ڈرامے آج بھی نارویجین تھیٹروں میں پیش کیے جاتے ہیں اور تماشائیوں کو بڑی کوشش سے ٹکٹ حاصل کرنے پڑتے ہیں۔ ابسن کو عورتوں کی آزادی کا علمبردار اور ایبسرڈ (بے معنویت کو اجاگر کرنے والے) ڈرامے لکھنے والا بھی تصور کیا جاتا ہے۔ جب کہ سوال کے جواب میں ابسن کہہ چکا ہے کہ میں صرف عورتوں کا ہی کیوں سب لوگوں کا طرف دار ہوں۔ ناروے کے کرنسی نوٹوں پر اس کی تصاویر بھی چھپی ہوئی ہیں اور اوسلو میں نیشنل تھیٹر کے سامنے پارک میں ورگی لان اور ابسن دونوں کی قد آدم مورتیاں نصب ہیں۔

حقیقت پسندوں کو شامل کر کے یوناس لی، الیگزینڈر شی لان، بیورنسن اور ابسن کو نارویجین لٹریچر میں 'چار بڑے' (THE BIG FOUR) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ لیکن اُس سنہرے دور کی تخلیق میں تنہا وہی نہیں تھے۔ اس عزت کے مستحق ارنے گاربورگ اور کچھ دوسرے لوگ بھی ہیں جو بعد میں اُبھر سکے۔ اُن میں نارویجین ادب میں غنائی اسلوب کا اضافہ کرنے والے بھی یقینی طور پر شامل ہیں۔ بانس۔ ای۔ شِنک، کنوت ہامسن، ہونیتا اور سِگری اُنسٹ ان سب کو ادب میں نوبل پرائز مل چکے ہیں۔ مذکورہ بالا ادیبوں، شاعروں اور ڈرامانگاروں کے علاوہ اور بھی بیشمار نام ہیں جن کی نارویجین ادب میں یا تو اہمیت تسلیم کی جا چکی ہے یا جنہیں ابھی اہمیت حاصل کرنا ہے جیسے یورگن مُو، جے ایس ویل ہاون، پی ملے مُنک، پیٹر کرسٹین آس بیورنسن، اے۔ او۔ ونیئے، بیور استیرنے بیورنسن، سِگ بیورن اوبس فیلدر، پیٹر سولے، ول ہیلم کراگ، نِلز کوتت فلگت، ترگوے آنڈرسن وغیرہ وغیرہ۔

شرپسندوں سے خطاب

شرپسندوں سے مری آج گذارش ہے ضمیر   چھوڑ دیں اب تو خدارا یہ پرانی تقصیر
امن کی لاش پہ اے ناچنے گانے والو!   آدمیت کو بناؤ نہ غموں کی تصویر
گلشنِ ہند کو پیغامِ بہاراں ہوتے
تم جو ناموسِ وطن کے ہی بہی خواں ہوتے

کیا ملا ظلم کے بازار سجا کر تم کو؟   کیا ملا خون کے دریا ہی بہا کر تم کو؟
فرقہ بندی کی یہ دیوار اٹھانے والو!   کیا ملا دیش کو شمشان بنا کر تم کو؟
کتنا اچھا تھا نہ ہندو نہ مسلماں ہوتے
پیکرِ امنِ وطن بن کے نمایاں ہوتے

تم کو کرنا تھیں مساوات کی شمعیں روشن   یعنی رہنا تھا تمہیں بن کے نگہبانِ وطن
اپنی تہذیب و تمدن کو مٹانے والو!   اپنے ہی خون سے رنگنا تھا نہ اپنا دامن
بربریت کی نہ جاں سوز کہانی ہوتے
کاش ایثار کی تابندہ نشانی ہوتے

تم نے صد حیف کہ تخریب کا دامن تھاما   تم نے صد حیف اخوت کو مٹانا چاہا
اے کہ تقدیسِ وطن آج مٹانے والو!   تم نے صد حیف نہ انسان کو انساں مانا
قلبِ مظلوم کے آلام کا درماں ہوتے
تم بھی اے کاش اخوت کے نگہباں ہوتے

زور فتنے جو پکڑتے ہیں تمہارے دم سے   بھائی سے بھائی بچھڑتے ہیں تمہارے دم سے
گلشنِ زیست کو ویرانہ بنانے والو   کتنے گھر ہیں جو اجڑتے ہیں تمہارے دم سے
گردنِ جبر پہ تلوار بھی تم ہی ہوتے
مرجعِ پیار بھی، ایثار بھی تم ہی ہوتے

قتل و غارت کے یہ بازار سجائے کیوں ہیں؟   تم نے لاشوں کے یہ انبار لگائے کیوں ہیں؟
خرمنِ زیست پہ اے برق گرانے والو!   آخرش تم نے یہ طوفان اٹھائے کیوں ہیں؟
وجہِ آزار رہے، کاش مسیحا ہوتے
تم زمانے میں تمدن کا نمونہ ہوتے

آؤ اب عہد کریں گھر نہ اجڑنے دینگے   اپنی ماؤں سے نہ بچوں کو بچھڑنے دینگے
قصرِ ہستی کو کدالوں سے گرانے والو!   یہ قسم کھاؤ نہ اب بات بگڑنے دینگے
تم سنور جاؤ گے ماحول سنور جائے گا
امن کا نور ہر اک سمت بکھر جائے گا

ڈاکٹر ضمیر الحق ضمیر
میرٹھی
۳۴۹ - لساڑی گیٹ
کمبوہ کا پل - میرٹھ

نقش ردولوی
۳۳۔ شاہ مینا لین۔ لکھنؤ

آج کے دن

کلی کلی کو ملا تھا نکھار آج کے دن
چمن میں آئی تھی فصلِ بہار آج کے دن

روش روش پہ حسیں پھول مسکرائے تھے
نکل گئے تھے گلستاں سے خار آج کے دن

خزاں کا آج کے دن ہی طلسم ٹوٹا تھا
ہوا تھا صحنِ چمن پُروقار آج کے دن

گری تھیں ٹوٹ کے ظلم و ستم کی زنجیریں
دکھی دلوں کو ملا تھا قرار آج کے دن

خوشی کا جام ملا تھا الم نصیبوں کو
ہوئی تھی غم کی قبا تار تار آج کے دن

ملی تھی غیر کے چنگل سے ہم کو آزادی
گرا تھا سر سے غلامی کا بار آج کے دن

ملا تھا آج کے دن ہم کو مدعا دل کا
سنی گئی تھی ہماری پکار آج کے دن

ہوئی تھی آج کے دن ہم پہ بارشِ رحمت
غم و الم کا چھٹا تھا غبار آج کے دن

ہمارے حال پہ اے نقش بعد مدت کے
ہوئی تھی رحمتِ پروردگار آج کے دن

آفتاب نقوی سھسوانی
آدرش انٹر میڈیٹ کالج۔ کوڑا جہان آباد۔ ضلع فتحپور (یو۔پی)

پندرہ اگست

ہے آرزو کہ آئے سدا پندرہ اگست
فصلِ بہار لائے سدا پندرہ اگست

ہر بام و در سجائے سدا پندرہ اگست
حسنِ وطن بڑھائے سدا پندرہ اگست

رنج و الم مٹائے سدا پندرہ اگست
بزم طرب سجائے سدا پندرہ اگست

بیکار جائے اہلِ تمنا کا خون کیوں
گلشن میں گل کھلائے سدا پندرہ اگست

آزادیٔ وطن کا ملے سب کو فائدہ
سب ہی کو راس آئے سدا پندرہ اگست

ہر سمت ہو خلوص و محبت کی روشنی
تاریکیاں مٹائے سدا پندرہ اگست

پی کر جسے قدم نہ کبھی ڈگمگا سکیں
وہ مے ہمیں پلائے سدا پندرہ اگست

منزل ہو جس کی باہمی اخلاص و آشتی
وہ راستہ دکھائے سدا پندرہ اگست

تاریکیِ تعصب و نفرت مٹائے جو
وہ جوت ہی جگائے سدا پندرہ اگست

دل میں خیالِ جور و جفا بھی نہ آسکے
رسمِ وفا سکھائے سدا پندرہ اگست

اہلِ وطن کی بس یہ تمنا ہے آفتاب
ہر سال یونہی آئے سدا پندرہ اگست

مرزا جعفر حسین
بدری ناتھ روڈ گولہ گنج لکھنؤ

پہلے آپ

دورِ حاضر کی مشینی زندگی میں یقیناً وقت کی بڑی قیمت ہے۔ ایک ایک گھنٹہ تو درکنار ایک ایک منٹ بلکہ ایک ایک سکنڈ قیمتی ہے کیونکہ جہدِ حیات کے مطالبے قدرے تساہلی کی بھی اجازت نہیں دیتے۔ سماج کے اس رجحان کا یہ نتیجہ ہے کہ ہمارے کم با کار اور بالکل بیکار لوگ بھی جلد بازی میں مبتلا ہیں۔ کام کاج نہ بھی ہو تب بھی تامل اور انتظار سے دور رہنا ہی خصلت میں داخل ہو گیا ہے۔ یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ جلد بازی میں بسا اوقات نقصانات بھی ہوتے ہیں اور ان کو گوارا بھی کر لیا جاتا ہے لیکن با محل یا بے محل تعجیل ہی کو فرائض کی ادائی نیز لوازمات زندگی میں ضروری قرار دے لیا گیا ہے ظاہر ہے کہ ان حالات میں "پہلے آپ" کہنے کی فرصت کس کو ہے؟ اور جب یہ فقرہ زبان زد نہیں ہوتا تو اس کے پس پشت جو روایات ہیں ان کو سوچنا بھی گوارا نہیں کیا جاتا۔ اسی رجحان نے آج اس فقرہ کو مقامِ تمسخر میں ڈھکیل دیا ہے اور ہم یہ سوچنے کے لیے کبھی وقت نہیں نکالتے کہ معاشرہ میں اس کا استعمال کیوں کب اور کیسے ہوتا تھا۔ ہمارے بزرگوں نے ایک دوسرے سے "پہلے آپ" کہنے کی رسم کیوں نکالی تھی اور کیسے ادا ہوتی تھی۔

اس فقرہ کی معنویت اور خصوصیات استعمال سے لطف اندوز ہونے کے لیے یہ جان لینا ضروری ہے کہ یہ فقرہ اسی وقت استعمال ہوتا تھا جب دو یا دو سے زیادہ افراد ایک ہی کام کرنے کے لیے آمادہ ہوتے تھے۔ مثلاً گھر سے باہر نکلنا، کسی مقامِ نشست یا اجتماع میں داخل ہونا، مشاعروں کے علاوہ شعری نشستوں میں رؤسا و عمائدین کے دسترخوانوں پر کھانا شروع کرنے کے قبل، شادی بیاہ کے تقریبات میں مراسم بجالانے والے ایک دوسرے سے یہی فقرہ کہتے تھے۔ مختصر یہ کہ ہر کام اجتماعی طور پر شروع کرنے کے قبل ایک کا دوسرے سے "پہلے آپ" کہہ کر تخاطب کرنا ہماری قدیم تہذیب میں داخل تھا۔ جس کا اصل منشا یہ ہوتا تھا کہ ایک دوسرے پر سبقت کرنا معیوب سمجھتا تھا۔ فی زمانہ اجتماعات میں شرکت کرنے کے لیے ایک دوسرے کو ڈھکیل کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ یہ صورتِ حال ہمارے قدیم کلچر میں نہایت مذموم سمجھی جاتی تھی۔ ضعیف العمر جوانوں کو آگے بڑھ جانے کا موقع دینا پسند کرتے تھے۔ لیکن اسی کے ساتھ جوان طبقہ کبر سنی کا احترام کرتا تھا اس لیے وہ اس کو گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ وہ معمر لوگوں کے آگے بڑھ جائے اور وہ پیچھے رہ جائیں۔ دونوں جانب تہذیب و شائستگی، عادات و اطوار کا زیور تھی۔ اسی خصوصیت نے "پہلے آپ" کے تخیل کو جنم دیا اور اجنبی لوگ بھی ایک دوسرے سے حفظِ مراتب نیز اظہارِ شائستگی میں ایک دوسرے سے "پہلے آپ" کہنے کے خوگر ہو گئے تھے۔ وہ خواہ بڑے ہوں یا چھوٹے اس طرزِ عمل کو ننگِ شرافت سمجھتے تھے کہ ان کی ذات سے کسی دوسرے کو قدرے بھی زحمت ہو بلکہ اس کے برعکس خود زحمت گوارا کر کے دوسروں کو سہولت فراہم کرنا زینۂ انسانیت سمجھتے تھے۔

اسی تہذیب و شائستگی اور ادب و لحاظ میں تعظیم و تکریم کو بھی اہم مقام حاصل تھا۔ پرانے لوگ اپنے بزرگوں اور دوسرے معمر آدمیوں کا ادب کرتے تھے لیکن اسی کے ساتھ ہر اس ہستی کا بھی

آداب بجالاتے تھے جو صاحب دولت و ثروت یا اہل جاہ و جلال یا علم و ادب کی منزلت کا حامل ہوتا تھا۔ کہیں داخل ہونے یا کہیں سے باہر نکلتے وقت ان عظیم المرتبت شخصیتوں سے کوئی بھی "پہلے آپ" نہیں کہتا تھا بلکہ لوگ دست بستہ یا سر جھکا کر علیحدہ کھڑے ہو کر راستہ دیتے تھے یہی طرز عمل "پہلے آپ" کا قائم مقام ہوتا تھا۔ البتہ دو اعظام علمائے کرام یا مشاہیر فن کہیں مجتمع ہو جاتے تو وہ ایک دوسرے کے ساتھ آتے یا ساتھ جاتے وقت "پہلے آپ" کہہ کر ضرور تخاطب کر لیتے تھے۔ یعنی یہ کہ مراتب میں برابری یا قریب قریب برابری ہوتی تو تہذیب کا یہ پہلو مدنظر رکھا جاتا تھا۔ شعری نشستوں میں ایک دوسرے سے تخاطب میں "پہلے آپ" اسی حالت میں کہتا تھا جب اپنی جانب سے اظہار انکسار اور دوسرے کی قدر افزائی مقصود ہوتی تھی۔ یہ طرز عمل احساس بزرگی کی بنا پر ہوتا تھا لیکن عجز و انکسار ہماری پرانی تہذیب میں ایک اہم عنصر تھا۔ روسا کے دسترخوان پر بیٹھنے والے رئیس سے کبھی "پہلے آپ" نہیں کہتے تھے بلکہ رئیس سے ایسا تخاطب بدتہذیبی میں شامل تھا۔ روسا دسترخوان پر بیٹھنے کے بعد بھی حاضرین سے "بسم اللہ" کہتے اور کھانا تناول کرنا شروع کر دیتے تھے۔ اس کے بعد شرکا طعام میں ہر ایک اپنے دائیں بائیں والوں سے "پہلے آپ" کہتا لیکن اگر مراتب میں امتیازی شان ہوتی تو یہ لوگ بھی اس موقع پر "بسم اللہ" ہی کہتے تھے ساتھ کھانا کھانے میں ایک دوسرے پر سبقت کا کوئی خاص سوال پیدا نہیں ہوتا تھا اس لیے "پہلے آپ" والا فقرہ بہت کم استعمال ہوتا تھا۔ البتہ کھانے کے بعد جب ہاتھ دھونے کا وقت آتا تو ایک کا دوسرے پر سبقت کرنا لازمی ہو جاتا تھا۔ لہذا ہر ایک دوسرے سے تہذیب برقرار رکھنے کے لیے "پہلے آپ" ضرور کہتا تھا اور اپنے اپنے مراتب کے لحاظ سے تقدیم و تاخیر ہوا کرتی تھی۔ یہ "پہلے آپ" صرف ایک دوسرے کی منزلت شناسی کی بنیاد پر کہا جاتا تھا

ہر انسان کے مزاج میں تصنع اور تکلف کے کچھ نہ کچھ خصوصیات ضرور ہوتے ہیں۔ صاف گوئی کے لیے اگر مجھے معاف کیا جائے تو میں بلا تکلف کہوں گا کہ ہمارا موجودہ تصنع اور تکلف ریاکاری اور دروغ گوئی کی حدوں کو پار کر جاتا ہے اور ہماری یہ کوشش ہوتی ہے کہ ہمارا تصنع ڈھکا رہے اور اس کا پردہ چاک نہ ہو۔ ہمارے آبا و اجداد نیک سیرت اور پاک خصلت لوگ تھے وہ اپنے تصنع اور تکلف کو بھی واضح کر دیتے تھے اور اسی وضاحت میں ان کے مزاج کی لطافتیں اور صاف گوئی کی خوبیاں نمودار ہو جاتی تھیں چنانچہ اسی خلوت میں جب دوستوں کا بے تکلف مجمع ہوتا تو "پہلے آپ" "پہلے آپ" کی بدولت اگر ایک طرف گرمی محفل کی بہاریں جلوہ گر ہوتیں تو دوسری طرف ظاہری خسارے بھی ہو جایا کرتے تھے ایسے خساروں کو ظاہری اس لیے کہنا درست ہے کہ نقصان اٹھانے والوں کو تکلیف کے بجائے لطف آجاتا تھا۔ چنانچہ ایک واقعہ حکیم شیخ آغا فاضل مرحوم کے یہاں کا قابل ذکر ہے۔ حکیم صاحب بڑے یار باش، خوش گفتار اور متواضع بزرگ تھے۔ گرمی کا موسم اور دوپہر کا وقت تھا۔ دس بارہ احباب جمع تھے اور شعر و سخن کی محفل گرم تھی۔ ناگاہ صمد برف والے نے آواز لگائی۔ اس کو فوراً بلایا گیا اور برف کھلانے کی فرمائش ہو گئی۔ اس روز صمد کے پاس برف کے آبخورے نہیں تھے بلکہ بڑی بڑی قلفیاں تھیں۔ حاضرین کی تعداد کے لحاظ سے تشتریاں آگئیں اور صمد نے ایک ایک تشتری میں ایک ایک قلفی انڈیل کر پیش کی۔ اب یہ تشتری "پہلے آپ" کے تخاطب میں باری باری کئی آدمیوں کے روبرو ہوتی ہوئی بالآخر ایک مقام پر پہنچی۔ آخری تشتری پہنچتے ہی حکیم صاحب اور ان کے پہلو میں بیٹھے نواب بنن صاحب بلیغ کے درمیان "پہلے آپ" کا اتنا اصرار ہوا کہ حاضرین کی تشتریوں میں قلفیاں گھل گئیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہم لوگوں نے بالائی کی برف کھانے کے بجائے پی تھی مگر یہ بھی صحیح ہے کہ برف کھانے کے لطف میں کوئی کمی محسوس نہیں ہوئی تھی اور اگر کوئی کمی محسوس ہوئی بھی ہوگی تو اس کی بدرجۂ اتم تلافی دوسرے دور میں ہو گئی تھی۔ جس کی تشتری خالی ہوتی صمد دوسری قلفی فی الفور حاضر کر دیتا تھا۔ ایسے تکلفات ہماری معاشرت کا جز تھے اور ان کی وجہ سے اگر کوئی تکلیف واقع بھی

ہوتی تو اس کو اس لیے تکلیف کہنا صحیح نہ ہوگا کیونکہ اس تکلیف کا کسی کو احساس نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ اس سے لطف حاصل کیا جاتا تھا۔

زمانہ تغیر پذیر ہے۔ انھیں تغیرات کے ساتھ قدریں بدلتی ہیں۔ ہمارے یہاں انقلاب آیا تو ہماری سیدھی سادی معاشرت پر تشینی کلچر غالب آگیا اور اس طرح غالب آیا کہ ہماری زندگی کا سارا ڈھانچہ بدل گیا۔ اسی تبدیلی میں "پہلے آپ" کا تمدن آج تمسخر اور تضحیک کا نشانہ بنا ہوا ہے۔ یہ سچ ہے کہ وقت کی قیمت بڑھنے کے بعد سہولت اور تن آسانی کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی لیکن اسی کے ساتھ ہم کو یہ بھی سوچنا چاہیے کہ عجز و انکسار، رشتہ و ناتا عزت و احترام، پاسداری و قدر شناسی اور اخوت و محبت بھی ایسے خصائل ہیں جو شرافت کو جلا اور انسانیت کو فروغ بخشتے ہیں۔ "پہلے آپ" کے کلچر میں یہ تمام خصائل نشو و نما پاتے ہیں۔ پرانی قدروں کو بھلا دینا اگر ضروری ہے تو ان کی روح میں جو اوصاف پیوست ہیں ان کو بہر حال کلیجے سے لگائے رکھنا دانشمندی کا تقاضا ہے۔ یہ سچ ہے کہ دور حاضر کے جہد حیات میں تن زن کہاں کہ کوئی مصروف آدمی اخلاقی قدروں پر زیادہ وقت صرف کر سکے لیکن ان کو یک لخت بھلا دینا بھی ہم کو حیوانیت سے قریب کر دے گا اور ہم جوہر انسانیت سے محروم ہو جائیں گے۔ "پہلے آپ" کو یقیناً نظر انداز کر سکتے ہیں لیکن اس فقرہ کی تقدیس کو ٹھکرا دینا معاشرت کے ساتھ بھلائی نہ ہوگی۔ ظاہری طرز عمل بدل دیجیے لیکن نفس مطلب بہر حال قابل قبول ہے۔

★

نیا دور
وی۔ پی کے ذریعہ
نہیں بھیجا جاتا ہے۔

اُف وہ رات

اصغر مرزاپوری
۳۴-۳۱۲-۲-۸۰ مرزا منڈی
حیدرآباد دکن ۔ ۸

ہے میرے ہاتھ میں ساغر کھنک رہی ہے رات
سنبھل رہی ہے سنبھل کر بہک رہی ہے رات
ابھی تو وقت کی انگڑائیاں ہیں مستی پہ
ابھی تو رقص کناں ہے تھرک رہی ہے رات
وہ سازِ نغمہ کا آہنگ وہ امتزاج حسیں
کہ سحر جاگ اٹھا ہے لہک رہی ہے رات
فروغ بادہ سے رخسار تمتمائے ہوئے
خرام ناز کو حیرت سے تک رہی ہے رات
سرور خیز وہ دوشیزگی کا الھڑ پن
ہمک ہمک کے مسلسل ٹھمک رہی ہے رات
وہ رنگ و نور، وہ رعنائی جمال لیے
کسی وجود سے یک سر دمک رہی ہے رات
حسیں شباب کی اللہ رے عطر آگینی
ہر ایک سانس پہ جیسے مہک رہی ہے رات
نزاکتوں کی طرب ناکیاں ارے توبہ
بدن کے لوچ سے کیا کیا لچک رہی ہے رات
ہر اک ادا پہ یقین گماں، گماں یقیں
وہ حسیات میں کیا کیا بھٹک رہی ہے رات
وہ کسمسانا، سمٹنا، مچل مچل جانا
خود اپنے آپ سے گویا جھجک رہی ہے رات
کبھی وہ منہ کو چھپانا تبسم بر لب
کہ گھور اندھیرے میں جیسے چمک رہی ہے رات
کسا کسا وہ بدن مرمریں وہ جوش شباب
کہ جیسے لمحہ بہ لمحہ سسک رہی ہے رات
وہ سرخ چہرہ، فضائیں تپاں، خون میں جوش
بس ایک شعلہ کی صورت لپک رہی ہے رات
شباب حسن کی وہ شعلگی، وہ آتش شوق
اک آگ ہے کہ مسلسل دہک رہی ہے رات
کسی کی مستی بھری آنکھ کی نمی کی طرح
برنگ قطرۂ بادہ ٹپک رہی ہے رات
یہ آنکھیں ملنا، مسلسل جماہیاں توبہ
کہ جیسے پہلو سے میرے کھسک رہی ہے رات
پھر اس کے بعد مری زندگی کی اے اصغر
تمام راتوں میں بن کر کسک رہی ہے رات

دوستوں سے خطاب

جنید حزیں لاری
مرفت دلشاد جین کیپ مرچنٹ
دال منڈی وارانسی

ترکِ وفا کا کس پہ ہے الزام دوستو!
کتنا خلوص کتنی محبت تھی اُن دنوں
وہ اعتبارِ رنگِ طبیعت کہاں گیا؟
آپس میں تم الجھ گئے ادنیٰ سی بات پر
نفرت [illegible] جلن ہی تمہارا شعار ہے
بکھرا ہوا ہے قافلہ کیوں اہلِ شوق کا
اخلاص و اعتماد کا ماحول کیا ہوا!
ہر شخص بدگمان جو اک دوسرے سے ہے
شکوے شکایتوں کا یہ طومار بے پناہ
تنقیص ہی کو مشغلہ اپنا بناؤ کیوں
بے مغز گفتگو سے تو بہتر ہے خامشی
اپنا بھی احتساب گوارا کرو کبھی
کچھ اپنی کج روی کی بھی اصلاح چاہیے
آپس کے اختلاف کو دریا میں پھینک دو
آؤ ملیں ہم امن و اخوت کے نام پر
پہلے دلوں سے داغِ کدورت مٹائیں سب

اترے ہیں میرے لب پہ کئی نام دوستو
لاؤں کہاں سے وہ سحر و شام دوستو
کس چشمِ سحر فن کا ہے اکرام دوستو
کیوں ہو رہے ہو مفت میں بدنام دوستو
اک دوسرے کو دیتے ہو دشنام دوستو
تم ساتھ بھی نہ چل سکے دو گام دوستو
کیا دوستی کا ہے یہی انجام دوستو
کس شخص کی ہے سازشِ ناکام دوستو
تذلیل کا سبب ہے سرِ عام دوستو
دنیا میں اور بھی ہیں کئی کام دوستو
جو بات ہے تمہاری ہے ابہام دوستو
کیوں نیتیں تمہاری ہوئیں خام دوستو
اوروں کے عیب سے نہ رہے کام دوستو
ہے اتحادِ وقت کا پیغام دوستو
راس آئے یہ بہار کا ہنگام دوستو
ہو اس کے بعد شغلِ مے و جام دوستو

آگہی

طلحہ تابش
بیگم وارڈ۔ پرتاپگڑھ

تم جو چاہو کہ یہ فضا بدلے
اک نیا بابِ زیست کھل جائے
آدمی آدمی سے پیار کرے
حق پہ اپنی خوشی نثار کرے
چھوڑ دے مکر اور سیہ کاری
زندگی ہو نہ دوش پر بھاری
پاک ہو فرقہ بندیوں سے وطن
ہو نیا زندگی کا پیراہن
ہر گھڑی ہر بشر ہو نغمہ بہ لب
ہر طرف ہو فضائے عیش و طرب
چاہتے ہو اگر جہاں! تو

چاہتے ہو اگر کہ پھوٹے پو
تو اٹھو وقت کو بدل ڈالو
سارے فتنوں کے سر کچل ڈالو
تم کو لکھنی ہے عزم کی تفسیر
تم سے بدلے گی ملک کی تقدیر
جتنے دشمن ہیں سب کو پہچانو
خوابِ غفلت سے جاگو دیوانو
وقت نازک ہے تم جو سوؤ گے
سن رکھو ساری عمر روؤ گے
زیست کی شکل ہوگی کچھ ایسی
موت بھی جس سے دور بھاگے گی

نسیم شہنوی
۱۰۳-بی-ٹی-آئی کیمپس سیہور (ایم-پی) ۴۶۶۰۰۱

سجاد ظہیر اور مارکسی تنقید

ہندستانی ادب میں ترقی پسند تحریک سب سے بڑی تحریک ہے جسے عوام کی ہمدردیاں حاصل کرنے میں کامیابی ہوئی۔ اس تحریک نے صرف اردو دنیا کو ہی نہیں بلکہ ہندستان کی دوسری زبانوں کے ادیبوں اور فنکاروں کو یکساں طور پر متاثر کیا۔ ترقی پسند تحریک کے ذکر کے ساتھ سجاد ظہیر کا نام لینا بھی ضروری ہے کیونکہ ان کی حیثیت اس تحریک کے روح رواں اور بانیوں میں شمار کی جاتی ہے۔ ترقی پسند تحریک سے نظریاتی اختلاف تو ہو سکتا ہے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کہ اس تحریک کے زیر اثر اردو تنقید، شاعری، افسانے، ناول اور ڈرامے میں بڑی وسعت پیدا ہوئی ہے۔ ساتھ ہی اس تحریک نے اردو میں کئی ایسے نقاد اور فنکار پیدا کیے جن کی شہرت اردو کے علاوہ دوسری زبانوں میں بھی ہے۔

سجاد ظہیر ہر طرح سے آسودہ اور ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن ان کا حساس دل غلامی کی ذلت محسوس کرتا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بہت جلد غلامی کی زنجیروں سے آزاد ہونے کے لیے بیتاب ہو گئے۔ ہندستان کی جدوجہد آزادی اور یہاں کے مختلف مسائل تو ان کے پیش نظر تھے، لیکن ایسے ہی حالات سے دوچار دوسرے ممالک کے مسائل کو بھی انھوں نے سمجھا اور محسوس کیا۔ جب وہ یورپ گئے تو وہاں بھی انھیں اپنے ہم خیال مختلف ممالک کے لوگوں سے ملنے اور تبادلۂ خیال کرنے کے مواقع ملے۔ اسی زمانے میں جرمنی میں ہٹلر کی تاناشاہی اور فاشسٹ نظریات کی مخالفت کرنے والے روشن خیال شاعروں، ادیبوں، دانشوروں اور سائنسدانوں کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچائی جا رہی تھیں۔ اس صورت حال سے یورپی ممالک میں خوف و ہراس کا ماحول پھیل گیا تھا اور سیاسی بحران کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی، لوگ اپنی جان بچا کر دوسرے ممالک میں پناہ لینے پر مجبور ہو رہے تھے۔ سجاد ظہیر جو اس وقت انگلینڈ میں زیر تعلیم تھے ان حالات کو بڑے قریب سے دیکھا جس نے ان کے ذہن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ وہ لکھتے ہیں:

"ہم کو لندن اور پیرس میں جرمنی سے بھاگے یا نکالے ہوئے مصیبت زدہ لوگ روز ملتے تھے۔ فاشزم کے ظلم کی دردبھری کہانیاں ہر طرف سنائی دیتیں۔ جرمنی میں آزاد پسندوں اور کمیونسٹ کو سرمایہ داروں کے غنڈے طرح طرح کی جسمانی اذیتیں پہنچا رہے تھے...... وہ اندوہناک اندھیرا جو علم و ہنر کی اس جگمگاتی دنیا سے جس کا نام جرمنی تھا پھیلتا ہوا سارے یورپ پر اپنی ڈراؤنی پرچھائیں ڈال رہا تھا۔ ان سب نے ہمارے دل و دماغ کے اندرونی اطمینان اور سکون کو مٹا دیا تھا۔"[1]

یہی وجہ ہے کہ ان دنوں انگلینڈ میں زیر تعلیم ہندستانی طلبا کی اکثریت سرمایہ داروں اور فاشسٹوں کے خلاف ہوتی جا رہی تھی اور ساتھ ہی ان کا رجحان سوشلزم اور مارکسزم کے فلسفے کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ سجاد ظہیر نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے:

"ہم رفتہ رفتہ سوشلزم کی طرف مائل ہوتے جا رہے تھے۔ ہمارا دماغ

---

[1] "یادیں" سجاد ظہیر۔ نیا ادب جنوری و فروری ۱۹۴۱ء

ایک ایسے فلسفے کی جستجو میں تھا جو ہمیں سماج کی دن بدن بڑھتی پیچیدگیوں کو سمجھنے اور ان کو سلجھانے میں مدد دے سکیں۔ ۔ ۔ ۔ مارکس اور دوسرے اشتراکی مصنفین کی کتابیں ہم نے بڑے شوق سے پڑھنا شروع کیں۔ جیسے جیسے ہم اپنے مطالعہ کو بڑھاتے آپس میں بحثیں کرتے تاریخی، سماجی اور فلسفیانہ مسئلوں کو حل کرتے، اسی نسبت سے ہمارے دماغ روشن ہوتے "[2]

سجاد ظہیر نے یہ محسوس کیا کہ ہندستانی ادیب اور دانشور بھی اس سلسلے میں بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ اپنے ساتھی نوجوانوں کے ساتھ ۱۹۳۵ء میں انگلینڈ میں ہندستانی ادیبوں کی ایک انجمن کی بنیاد ڈالی اور ہندستان آنے کے بعد تحریک کی تنظیم میں مصروف ہوئے۔ اس تحریک میں پہلے اردو کے اہل قلم کو پھر اردو کے ساتھ ساتھ ہندی کے مصنفین کو پھر اس کے بعد ہندستان کی مختلف زبانوں کے اہل قلم کو ایک پلیٹ فارم پر لے آنے کی کوشش کی۔

ادب میں ایک انقلاب لانے کے جذبے سے سرشار باغی ذہن کا اظہار پہلے افسانوں میں ہوا اور اس جذبے کی شدت نے انھیں انگارے کے باغی مصنفین کی صف میں لا کھڑا کیا۔ لیکن انھوں نے ایسے چونکا دینے والے افسانوں پر اکتفا نہیں کیا۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ اردو کی تمام اصناف میں ایک انقلاب آجائے۔ ایک تحریک کے بانی ہونے اور ادب میں بڑی بڑی انقلابی تبدیلیاں دیکھنے کے خواہاں ہونے کے باوجود وہ کافی متوازن نظریہ رکھتے تھے۔ سجاد ظہیر کی تنظیمی مصروفیات اس قدر زیادہ تھیں کہ وہ ایک نقاد کی حیثیت سے اردو تنقید کو اتنا زیادہ وقت نہ دے سکے جتنا کہ اس تحریک سے وابستہ دوسرے ناقدین نے دیا۔ نظریاتی تنقید میں ان کا کل سرمایہ چند تنقیدی مضامین اور "روشنائی" ہے جو ترقی پسند تحریک کی سرگزشت ہے لیکن اس میں بھی ان کے تنقیدی نظریات پائے جاتے ہیں۔ تنقید سے قطع نظر سجاد ظہیر نے شاعری بھی کی "پگھلا نیلم" اور ایک ناولٹ "لندن کی ایک رات" لکھ کر افسانوی ادب کے میدان میں قدم رکھا۔ لیکن اس کے باوجود ترقی پسند تحریک کے زیر اثر لکھے جانے والے تخلیقی ادب اور تنقیدی سرمائے میں ان کے کارنامے کثیر نہیں ہیں لیکن یہ دعویٰ بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ وقیع نہیں۔ ان کی ادبی صلاحیت اور ناقدانہ عظمت کا اعتراف ترقی پسند ادب کے سخت معترضین نے بھی کیا۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی جو ترقی پسندی کے کٹر نکتہ چیں تھے، انھوں نے بھی سجاد ظہیر کی اہمیت کا اعتراف کیا ہے۔ ان کے الفاظ میں ؎

"میں تو یہاں تک مانتا ہوں کہ خود ترقی پسند ادب میں ایسے لکھنے والے ملتے ہیں جن کی میں عزت کرتا ہوں وہ زندگی کی پاکیزگی کو ملحوظ رکھتے ہیں اور رسوا کرنے یا رسوا ہونے میں کوئی برائی نہیں دیکھتے مثلاً اختر انصاری، راجندر سنگھ بیدی، سجاد ظہیر، فیض احمد فیض، فراق گورکھپوری اور اس قبیل کے دوسرے لوگ۔ یہ زندگی کو اچھے مجموعے میں دیکھتے ہیں اور زندگی اور فن دونوں کا احترام کرنا جانتے ہیں۔ ان کا ہنر ان کا خلوص ہے اور ان کا خلوص ان کا ہنر ہے۔ یہی وہ ہنر ہے جو حسن بن کر سامنے آتا ہے "[3]

سجاد ظہیر ادب پر بڑے غور و فکر کے بعد اپنی رائے کا اظہار کرتے تھے۔ ایک زمانے میں ترقی پسند ادیبوں پر یہ الزام برابر لگایا جا رہا تھا کہ وہ اپنی تخلیقات میں سیاسی مسائل کو ہی سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور معترضین کا خیال تھا کہ اس طرح کا ادب فنی معیار پر پورا نہیں اترتا ہے۔ لیکن سجاد ظہیر نے سیاسی مسائل کو ادبی تخلیقات میں مقام دینے کی ہمیشہ وکالت کی۔ ان کا خیال تھا کہ محنت کش عوام کی زبوں حالی اور سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف قلم اٹھانا کوئی جرم نہیں ہے۔ لیکن ساتھ ہی انقلابی ادیبوں اور شاعروں کو ہدایت دیتے رہے کہ ایسا انقلابی ادب جو

---

[2] "پلعریت" سجاد ظہیر۔ نیا ادب جنوری و فروری ۱۹۴۱ء۔ [3] آفتاب (علی گڑھ) "بیسویں صدی کا اردو ادب نمبر" ماخوذ از اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک۔ ص ۸۳۔ خلیل الرحمٰن اعظمی۔

زندگی سے علیحدگی پیدا کرے عوام میں قابلِ قبول نہ ہوگا۔ انسانی دکھ درد کو دور سے محسوس کرنے والے ادیبوں کے یہاں انقلابی ادب کی صحیح عکاسی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ انقلاب کا نعرہ لگانا جتنا آسان ہے اس کو عملی جامہ پہنانا اتنا ہی مشکل کام۔ انھوں نے ترقی پسند ادیبوں اور فنکاروں کو عوام کی زندگی کو ہمیشہ قریب سے دیکھنے کی تلقین کی اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں :-

"ہر انقلابی ادیب کے لیے یہ جان لینا ضروری ہے کہ انقلابی تحریک میں پوری طرح حصہ لیے بغیر اس کی ذہنی و جذباتی ترقی ناممکن ہے۔ انقلابی ادب زندگی سے علیحدہ ہو کر پنپ نہیں سکتا۔ ہماری انقلابی شاعری کی اکثر خامیاں تبھی دور ہو سکتی ہیں جبکہ ہمارے انقلابی شعراء اور ادیب باقاعدہ عوام کی روزمرہ کی جد و جہد میں حصہ لیں اور دیکھیں کہ انقلابی عمل کا ایک ایک قدم کتنا دشوار پیچیدہ اور کٹھن ہے۔" [4]

اس طرح سجاد ظہیر کے یہاں انقلاب کا وسیع تصور تھا۔ انھوں نے لفظی انقلاب کو کبھی بھی پسند نہیں کیا اور نہ ہی ایسے ادیبوں کی حوصلہ افزائی کی جو محض تصوراتی انقلاب کو پیش کرتے تھے۔

سجاد ظہیر نے شاعری میں مواد اور ہیئت کی یکساں اہمیت پر زور دیا ــــ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے صرف ہیئتی تجربوں کو ہی ترقی پسندیت کے دائرے میں شمار نہیں کیا اور نہ ایسے کسی مواد اور موضوع کو ترجیح دی جو عوام کے مسائل اور زندگی سے علیحدگی پیدا کرتے ہوں۔ وہ شاعری کے ذریعہ کسی مخصوص نظریے کے پرچار، واعظانہ اور خطیبانہ کام لیے جانے کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ شاعری سے انسان کے جذبات کے تسکین کا اچھا ذریعہ سمجھتے تھے انھوں نے اس سلسلے میں لکھا ہے :-

"شاعر کا پہلا کام شاعری ہے وعظ دینا نہیں۔ اشتراکیت و انقلاب کے اصول لکھنا نہیں۔ اصول سمجھنے کے لیے کتابیں موجود ہیں۔ اس کے لیے ہم کو نظمیں نہیں چاہئیں۔ شاعری کا تعلق جذبات کی دنیا سے ہے۔ اگر وہ تمام ساز و سامان تمام رنگ و بو، تمام ترنم و موسیقی کو پوری طرح کام میں نہیں لائے گا۔ اگر فن کے اعتبار سے اس میں بھونڈا پن ہوگا۔ اگر ہمارے احساسات کو لطافت کے ساتھ بیدار کرنے میں قاصر ہوگا تو لیچڑ سے اچھے خیال کا وہی حشر ہوگا جو دانے کا بنجر میں ہوتا ہے۔" [5]

ترقی پسند تحریک کے عہدِ شباب میں اس مسئلے پر اکثر مباحثے ہوتے رہے کہ حقیقی ترقی پسندیت کیا ہے۔ اس موضوع پر کچھ لوگوں نے انتہا پسندی اختیار کی اور اپنے خود ساختہ معیار قائم کر کے تحریک کو محدود کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ ان کے تیار شدہ معیار پر جو پورا نہیں اترا اسے ترقی پسند کے دائرے سے خارج کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس مسئلے پر بہت بعد تک بحث و مباحثے کا سلسلہ جاری رہا۔ سجاد ظہیر اس انتہا پسندی کے مخالف تھے۔ یہاں نامناسب نہ ہوگا کہ ہم ۱۹۵۰ء کے بعد لکھے گئے ان کے ان مضامین پر ایک نظر ڈالیں جن میں وہ ہمیں ایک وسیع النظر نقاد نظر آتے ہیں۔ اور ان کی فکر میں مارکسی نظریات دکھائی دیتے ہیں۔

قدیم ادب کے بارے میں سجاد ظہیر کا نقطۂ نظر کافی منصفانہ تھا۔ وہ ماضی کے ادب کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اس سلسلے میں انھوں نے کبھی انتہا پسندی سے کام نہیں لیا۔ بلکہ ترقی پسند ادیبوں کو ان کی ذمہ داریوں کا برابر احساس دلاتے رہے کہ جو لوگ اپنے قدیم ادبی سرمائے سے رشتہ توڑنے کی باتیں کرتے ہیں انھیں یاد رکھنا چاہیے کہ وہ اپنی تہذیب و تمدن کو فنا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ایسے ادیبوں کا رویہ آگے چل کر بہت خطرناک ثابت ہوگا۔ کیونکہ قدیم ادب سے قطع تعلق کا مطلب ہے کہ انسانی تہذیب کی ارتقائی تاریخ سے منھ موڑنا ہے اگر یہ رویہ اختیار کیا جاتا رہا تو پھر ہم کس منھ سے یہ دعویٰ کر سکیں گے کہ آج جو کچھ ہمارے ادب اور سماج میں تبدیلی ہوئی ہے وہ محض انسانی تاریخ کے پس منظر میں ممکن ہوئی ہے۔ ایک زمانے میں کچھ ترقی پسند ادیبوں نے ماضی کے

---

[4] اردو کی جدید شاعری۔ سجاد ظہیر۔ نیا ادب ۱۹۳۹ء۔ [5] اردو کی جدید شاعری، سجاد ظہیر۔ نیا ادب ۱۹۳۹ء

ادبی سرمائے کو قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ سجاد ظہیر نے ان کی سخت تنقید کی ہے۔[6]

ایک زمانے میں نیا۔ انصاری غزل پر کڑی تنقید کر چکے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ غزل جاگیردارانہ ماحول کی پیداوار اور فراری ادیبوں کی پناہ گاہ ہے۔ اپنے نقطۂ نظر میں وزن پیدا کرنے کے لیے حافظ کی غزلوں کو پیش کیا۔ لیکن سجاد ظہیر ان کے نظریے سے اتفاق نہ کرتے ہوئے غزل پر اس طرح کی تنقید کو محض جذباتیت پر مبنی قرار دیا۔ سجاد ظہیر نے ہمیشہ غزل کی اہمیت کا اعتراف کیا۔ وہ لکھتے ہیں ؎

"یہ حقیقت ہے کہ سعدی اور خسرو کے زمانے سے لے کر غالب تک فارسی اور اردو شاعری کی مرکزی اور بہترین شعری تخلیق غزل کی صنف میں ہوئی۔ گو اس زمانے میں مثنویاں، قصیدے، مرثیے، قطعے اور بلند پایہ مسلسل نظمیں بھی لکھی گئیں پھر بھی شعراء نے تخیل کے جوہر لطیف کی حیثیت سے تابانی اور معنویت، حسن اور دلکشی صنف غزل میں پیدا کی اور اسے مقبولیت اور ادبی مرکزیت حاصل ہوئی اور اس دور میں کسی دوسری صنف سخن کو نہیں۔"[7]

لیکن ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ دور حاضر میں صرف غزل لکھنا زیادہ مناسب نہ ہوگا۔ کیونکہ اردو شاعری میں غزل کے ساتھ ساتھ دوسری اصناف کی بھی اہمیت بڑھتی جا رہی ہے۔ جہاں تک غزل پر تنقید کا سوال ہے صرف ترقی پسندوں کے پلیٹ فارم سے ہی اس کی تنقید نہیں کی گئی بلکہ ہمارے بزرگ بھی غزل کی مخالفت میں آوازیں بلند کر چکے تھے۔ اس کے باوجود غزل مر نہ سکی بلکہ غزل صدیوں سے فارسی ادب پھر اردو ادب میں دھوم مچاتی رہی اور آج بھی اسی آن بان سے اچھی غزلیں تخلیق کی جا رہی ہیں ـــ

سجاد ظہیر ادب میں جمالیاتی قدروں کے قائل تھے۔ انھوں نے ہمیشہ اس بات پر زور دیا کہ تخلیقات میں جمالیاتی عناصر کو اہمیت دینی چاہیے۔ ان کا خیال تھا کہ ادب و آرٹ انسانی ذہنوں کو براہ راست متاثر کرتے ہیں چنانچہ ایسا ادب جو جمالیاتی قدروں کی اہمیت دیتا ہے اس کی مقبولیت میں بھی اضافہ یقینی ہے۔ وہ لکھتے ہیں ؎

"ترقی پسندوں کے نزدیک ادب ایک فن لطیف ہے جو زندگی کو زیادہ حسین، زیادہ معنی خیز، زیادہ پر لطف بنانے کا ایک وسیلہ ہے ۔ ۔ ۔ ترقی پسند ادیبوں کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ایک ادیب یا فنکار کا شعور اپنی قوم اس کے مختلف طبقوں کے کردار اور ان کے سامنے در پیش مسائل کے متعلق جس قدر گہرا ہوگا، حقیقت اور سچائی کا اسے جس قدر علم ہوگا اسی قدر زیادہ اسے فنی تخلیقات کو بہتر بنانے کا موقع ملے گا۔"[8]

سجاد ظہیر کی شخصیت ایک ایسے رہنما کی ہے جس نے ہندستان میں ایک ایسی ادبی تحریک کا آغاز کیا جس کے پلیٹ فارم پر اردو ہی نہیں بلکہ ہندستان کی مختلف زبانوں کے ادیبوں، شاعروں اور نقادوں کو لا کھڑا کیا۔ سجاد ظہیر نے ابتدا سے ہی مارکس کے فلسفہ کا گہرا مطالعہ کیا اور ادب کی خوبیوں اور خامیوں کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھتے رہے۔ اگرچہ انھوں نے بہت کم لکھا ہے۔ لیکن ان کی جو بھی تحریریں سامنے آئی ہیں، ان میں مارکسی نقطۂ نظر کی ہی وضاحت کی گئی ہے۔ سجاد ظہیر نے اپنے نظریات و افکار سے حقیقی ترقی پسندیت کی توضیح و تشریح کی۔ جس طرح ہندستان میں ترقی پسند تحریک کے آغاز سے قبل مارکسی نقاد کی حیثیت سے اختر حسین رائے پوری کا نام لیا جاتا ہے۔ اسی طرح ترقی پسند تحریک کے آغاز کے ساتھ ساتھ سجاد ظہیر کو بھی مارکسی نقاد کی حیثیت سے مقام ملا ہے۔ دونوں میں فرق اتنا ہے کہ اختر حسین رائے پوری انتہا پسندی کے شکار ہوئے جبکہ سجاد ظہیر کا تنقیدی نظریہ بڑا ہی متوازن نظریہ ہے۔

★

---

[6] غلط مجادلے - سجاد ظہیر - شاہراہ - فروری، مارچ ۱۹۵۱ء [7] ذکر حافظ - ،، صفحہ ۱۲ - [8] ترقی پسند تحریک اور اس کے معترضین - سجاد ظہیر - حیات دہلی جنوری ۱۹۵۶ء

وزیر اعلا شری بنارسی داس ۶ر جولائی ۱۹۷۹ء کو وارانسی میں محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش کی جانب سے منعقد کی گئی ایک نمائش کا افتتاح کرتے ہوے

وزیر برائے اعلا تعلیم ڈاکٹر شیوانند نوٹیال وِوِدھ بھارتی سے نشر ہونے والے "نیا یگ نئی کرانتی" پروگرام کا افتتاح کرتے ہوے۔ اس پروگرام کا اہتمام محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش نے کیا تھا۔

گورنر اتر پردیش شری جی، ڈی تپاسے، وزیر ریاست شری
عہدے کا حلف دلاتے ہوئے۔ دیگر وزراے ریاست
پہلی صف: عبدالرؤف لاری، اودھیش پرشاد، اشوک
دوسری صف: تیج سنگھ، دینا ناتھ سیوک، دھرم ویر سنگھ، دھرم
تیسری صف: مختار انیس، موہن سنگھ، وشنو پرتاپ

وزیر اعلا اتر پردیش شری بنارسی داس ۱۱ر جون ۱۹۷۹ء کو رویندرالیہ
لکھنؤ میں اردو۔ہندی ادب ایوارڈ کمیٹی کی جانب سے چھٹے ادب
ایوارڈ کی تقسیم کی تقریب کے موقع پر فراق گورکھپوری کو ۱۹۷۹ء میں
اردو کی گراں بہا خدمات کے صلہ میں ایوارڈ دیتے ہوئے۔

ج بھون لکھنؤ میں یکم جولائی ۱۹۷۹ء کو ان کے
، یا گیا بیٹھے ہوئے نظر آرہے ہیں۔
قبول سنگھ
کمار یادو، بھگوتی سنگھ
ٹی۔

ا رسی داس یوم صحافت کے موقع پر ۳۰ مئی ۱۹۷۵ء کو وارانسی میں پڑارکر اسمرتی بھون کا افتتاح کرتے ہوئے۔

تعلیم بالغان
پروگرام

شجرکاری
کا
ایک منظر
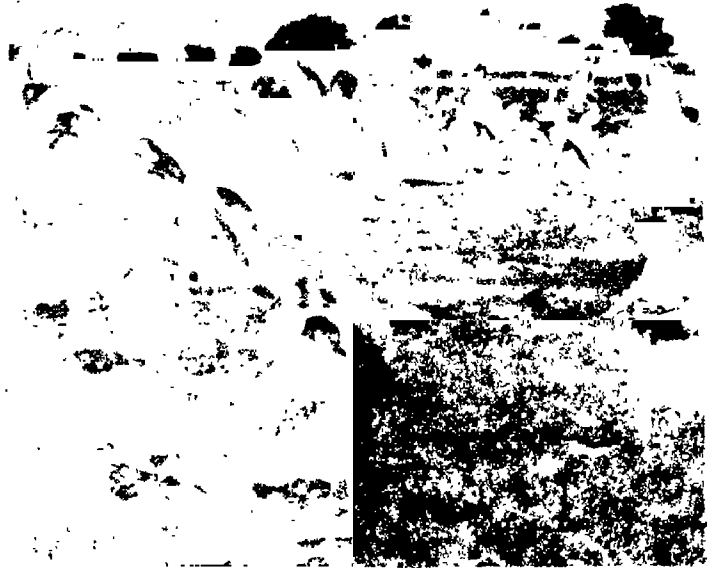
کام کے عوض
اناج
اسکیم کے تحت
زیر تعمیر ایک سڑک

حضور سہسوانی
راز منزل سہسوان (بدایوں) یو۔پی

دوشیزۂ آزادی

(سانیٹ)

آزادی کی دوشیزہ نے
کھنکائی پھر اپنی پایل لہرایا پھر اپنا آنچل
دیکھ لیا ساری دنیا نے

آنچل اس کا رنگ برنگا
جیسے دوپٹہ ہو دلہن کا جیسے رنگیں پھول چمن کا
دلکش جس کا نام ترنگا

سچ پوچھو تو یہ دوشیزہ
بھارت والوں کی منت ہے قوم کی آنکھوں کی جنت ہے
ہر شہری کی ہے محبوبہ

آج کا دن اس کا ہی دن ہے
تیس سے اوپر جس کا سن ہے

ہما شکیل بدایونی
نیولی شوگر فیکٹری۔ پوسٹ آفس۔ نیولی ضلع ایٹہ

جشنِ آزادی منائیں آؤ پھر

جشنِ آزادی منائیں آؤ پھر
نغمۂ جمہور گائیں آؤ پھر

پھر شرابِ حریت سے چور ہوں
پی کے آزادی کی مے مخمور ہوں
ہر خوشی اپنائیں غم سے دور ہوں
جس قدر بھی ہو سکے مسرور ہوں

آج ہی آزادی ہم نے پائی تھی
آج دیوارِ غلامی ڈھائی تھی
یاس کی جو گرد ہم پہ چھائی تھی
صورتِ امید وہ اب آئی تھی

جشنِ آزادی منائیں آؤ پھر
نغمۂ جمہور گائیں آؤ پھر

کوثر چاند پوری
ہمدرد نرسنگ ہوم دہلی

(افسانہ)

شریکِ سفر

جنگل کی سہانی کنواری اور شرمیلی سی شام میں خاموشی ہی خاموشی تھی۔ ہواؤں میں پھولوں کی ملی جلی مہک گھلی ہوئی تھی پیڑوں میں جنبش تک نہ تھی۔ وہ اونگھتے محسوس ہو رہے تھے۔ دور کچی سڑک پر ایک جیپ دھیرے دھیرے رینگ رہی تھی اس میں دو نوجوان بندوقیں لیے بیٹھے تھے مور سامنے آجاتے تو جیپ کی رفتار اور دھیمی ہو جاتی۔ شکاری قومی پرندوں کو بھون میں دبانا نہیں چاہتے تھے ایک دم ہرنوں کی ڈار بائیں جانب سے دوڑتی ہوئی آئی ایک شکاری نے رائفل سیدھا کیا ساتھی جلدی سے بول اٹھا۔

"انصار ہمیں مردم خور مارنے کی اجازت دی گئی ہے پرمٹ ہرنوں کا نہیں ہے محفوظ جنگل میں احتیاط ضروری ہے۔"

اسی وقت شیر کے دھاڑنے سے ہر طرف مہیب سناٹا چھا گیا۔ عقیل نے کہنی مار کر انصار کو متوجہ کیا۔

"وہی بول رہا ہے ہوشیار ہو جاؤ انصار، گھنی جھاڑیوں میں چھپا ہوا ہے۔"

سرمئی دھندلکے پھیلنے لگے تھے۔ مور رقصِ مستانہ میں معروف تھے مورنیاں ان کے گرد گھوم رہی تھیں۔ یہی ان کے اظہارِ عشق و مستی کا طریقہ تھا۔ طاؤس ناچتا ہے تو مورنی کے قد و قامت حسن میں رعنائی آجاتی ہے اس کی دوشیزگی نظر فریب بن جاتی ہے کافی تلاش کے بعد بھی مردم خور دکھائی نہیں دیا۔ ٹارچ کی لائٹ ڈال کر کوشش کی مگر اس کا نشان تک نہ ملا۔ اندھیرا بڑھنے لگا تھا۔ شکاریوں کو رات گزارنے کے لیے ڈاک بنگلہ کی تلاش تھی۔ مگر مل نہیں رہا تھا۔ اچانک ایک طرف روشنی کی جھلک نمایاں ہوئی۔

"غالباً گاؤں ہے" عقیل کے منہ سے نکلا "ادھر ہی چلنا چاہیے۔"

تھوڑی دور چلنے پر انصار بولا۔

"گاؤں نہیں کوئی پڑاؤ معلوم ہوتا ہے۔"

بیچ میں خیمہ نصب تھا۔ آس پاس جھولداریاں لگی تھیں۔ درمیان میں پیٹرومیکس لیمپ جل رہا تھا ہارن سن کر ایک دوشیزہ پینٹ اور بوشرٹ پہنے باہر آئی زلفیں شانوں پر بکھری ہوئی تھیں عقیل کی آنکھیں چندھیا گئیں حسن و جمال ہی اس کا سرمایۂ حیات تھا اس ویرانے میں حسن و شباب کا رنگین پیکر دیکھ کر وہ کھلا سا گیا نگاہیں اس کے گیسوؤں پر مرکوز ہو گئیں۔ چاندنی کھیت کرنے لگی تھی۔ دوشیزہ کے چمپئی رخسار اس پر طنز کر رہے تھے، ملازم لالٹین لیے آیا۔ ماتھے پر ہاتھ رکھ کر سلام کیا۔

"کون ٹھہرا ہے؟"

"جنگل کا صاحب"

"چھوٹا صاحب یا بڑا؟"

"یہاں سب بڑے ہیں مالک۔"

"کہاں ہیں صاحب؟ ہماری آمد کی اطلاع کر دو۔"

"ڈیرہ پر گئے ہیں ان کی بیٹا ابھی شکار سے آئی ہیں" نوکر نے دوسری طرف رخ کر کے ذرا بلند آواز سے کہا "عارفہ بیٹا صاحب کو پوچھ رہے ہیں۔"

"بولو تشریف رکھیے ان کے آنے کا وقت ہو گیا ہے۔"

عقیل اور انصار کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

عارفہ نے اردلی کو حکم دیا ۔

" پانی کا جگ اور دو گلاس میز پر رکھ دو" چند منٹ کے اندر ہی چائے آگئی بیرا ٹرے میز پر رکھ کر بولا

" عارفہ بٹیا چائے ٹیبل پر رکھ دی گئی ہے"۔

عارفہ آگئی اس نے لباس ابھی تبدیل نہیں کیا تھا مسکراتی ہوئی آنکھوں سے مہمانوں پر نگاہ غلط انداز ڈالی اس کا انداز شمار انگیز تھا۔ عقیل سرشار ہو رہا تھا۔ انصار کو انسانی خوبصورتی سے زیادہ قدرتی مناظر کا حسن متاثر کیا کرتا تھا۔ اس نے عارفہ میں کوئی خاص دلچسپی نہ لی۔ وہ اس کے مجسمہ میں نزاکت کا احساس ضرور کر رہا تھا مگر اس میں کسی رومانی پیام کی گونج نہیں تھی۔ عقیل کی سرشاری لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔

" ایسا لگتا ہے کہ آپ لوگ مردم خور کی تاک میں ہیں۔ آج کل بہت سے شکاری اس کے پیچھے چکر لگا رہے ہیں"

" جی ہاں آپ کا خیال بالکل ٹھیک ہے۔ لیکن ہم اس کی ہیبتناک دھاڑ ہی سن سکے ہیں شکل نہیں دیکھی "

" اور کچھ نہیں ملا ؟ "

" ہرن نظر آئے تھے لیکن ہم لوگ بندوق نہیں چلا سکے"

ٹرے ابھی میز پر ہی رکھی تھی کہ عارفہ کے ڈیڈی آگئے ان کا نام نیم پلیٹ پر پہلے ہی پڑھا جا چکا تھا۔ معلوم ہو گیا تھا کہ اختر حسین زیدی ہیں وہ گھوڑے سے کود پڑے۔ بہت وجیہہ اور باوقار آدمی تھے۔ چوڑی پیشانی کے نیچے گھنی بھنویں اور بڑی بڑی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ مونچھوں میں مردانہ رعب تھا۔ لبوں پر پان کا ہلکا سا لاکھا تھا۔ انھوں نے تپاک سے ہاتھ ملایا اور مخلصانہ انداز میں کہنے لگے۔

" اس جنگل میں دو ہم جنسوں سے مل کر مسرت ہوئی یہ اتفاق مسیحا و خضر کی ملاقات سے کم نہیں مہربانی کر کے اپنا تعارف بھی کرائیے "

" مجھے عقیل کہتے ہیں کالج میں انگریزی پڑھاتا ہوں یہ میرے دوست انصار یادو ہیں۔ مشہور شاعر اور ماہر فن مصور انھیں شکار سے بہت دلچسپی ہے "

" یہ سن کر اور زیادہ خوشی ہوئی کہ انصار صاحب شاعر بھی ہیں، تصویر ساز بھی اور آپ ٹھہرے پروفیسر جو سب کچھ ہو سکتا ہے "

" مصور سے میری مراد تھی فوٹو گرافر "

" بہر حال مطلب ایک ہی ہے وقت اچھا گذرے گا۔ محفل ضرور جمے گی "

" ڈیڈی" عارفہ بیچ میں بول پڑی " آپ صاحبان رات گذارنے کے لیے ڈاک بنگلہ چاہتے ہیں "

" یہیں قیام کر سکتے ہیں ڈاک بنگلہ نہ سہی ریسٹ ہاؤس سہی۔ کاکے سے کہیے کوئی چھولداری خالی کرا دے "

فوراً حکم کی تعمیل کی گئی چھولداری میں دو پلنگ ڈال دیئے گئے۔ دونوں نے کپڑے تبدیل کیے۔ دس بجے کھانا ٹیبل پر لگا دیا گیا۔ میز پر دلچسپ گفتگو ہوتی رہی۔ زیدی بذلہ سنج اور حاضر جواب تھے۔ علم مجلسی میں بہت مہارت تھی۔

" سرکاری عہدے داروں میں ایسے لوگ کم ہوتے ہیں" انصار بولا ۔

" خاص طور پر جنگل کے محکمہ میں " عقیل نے کہا۔ اس پر سب ہنسنے لگے عارفہ کی ہنسی دیر تک جاری رہی۔

" اس وقت ہم سب جنگل میں ہیں " زیدی صاحب بولے۔

تینوں کے لبوں پر مسکراہٹوں کی لہریں نمودار ہوئیں مگر بہت ہلکی جیسے پانی میں چھوٹی سی کنکری پھینک دی گئی ہو اور موجوں کے دائرے بن کر جلد ہی پانی کی سطح ساکن ہو گئی ہو۔

ڈنر سے فارغ ہو کر زیدی نے کہا۔ غزل سرائی کا وقت ہو چکا ہے "

" انصار صاحب کوئی شگفتہ سی غزل چھیڑیئے "

"میری کوئی غزل شگفتگی سی خالی نہیں ہوتی۔"

"جس طرح کوئی بات آنا سے خالی نہیں ہوتی؟"

"اتنا غیبت پرست بھی نہیں ہوں عقیل!"

انصار نے نغمہ بار آواز میں عمدہ غزل سنائی خوش گلوئی اور پرسوز انداز نے اسے بہت موثر بنا دیا مس عارفہ نے معقول داد دی "بہت خوب" اور "ویری نائس" کی میٹھی رسیلی صدائیں اس کے حیات آفریں لبوں سے ملتی رہیں۔ غزل کے اختتام پر اس نے ایک بھرپور نگاہ عقیل پر ڈالی اس کا دل پہلے ہی زور سے دھڑک رہا تھا۔ عارفہ کے انداز نظر نے اس میں بجلیاں بھر دیں۔ انصار نے دوسری غزل شروع کی۔ فضا میں نشہ سا چھانے لگا رات کا سناٹا ٹوٹتا محسوس ہوا چاندنی اور زیادہ نکھر گئی غزل بیحد رومانی تھی، عارفہ کا چہرہ دمک رہا تھا۔ اور عقیل اس کے رخساروں کی سرخی کو دزدیدہ نگاہوں سے بار بار دیکھ رہا تھا جیسے بار نظر سے اس کے حسین رنگوں کو سمیٹ لینا چاہتا ہو۔

"شمع عقیل صاحب کے سامنے رکھ دی جائے" انصار نے پانوں کی تھالی سے لونگ اٹھا کر منھ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"شمع نہیں ہے لیمپ حاضر ہے۔"

لیمپ ہی ٹھیک رہے گا یہ نظم گو ہیں جس میں فکر دخیال کو روشنی اور بلندی ہی درکار ہوتی ہے۔

"انصار میں غزل بھی کہتا ہوں۔"

"مگر ویسی ہی جیسی آپ کے شاگرد کہا کرتے ہیں۔"

عقیل نے اس کے جواب میں بڑی فرزانگی سے ساتھ افصار پر طنز کیا۔ پہلے غزل ہی سناتا ہوں لیکن سوال یہ ہے کہ

"بجتی ہوئی آواز کہاں سے لاؤں۔"

"اچھا شعر بغیر ترنم ہی کے اثر انگیز ہوتا ہے" زیدی صاحب نے کہا۔

عقیل نے غزل کے دس بارہ متفرق اشعار سنائے اور مزاحیہ موڈ میں کہا کہ بیاض ساتھ نہیں لایا اور انصار صاحب کی طرح غزلیں حفظ کرنے کی عادت نہیں۔

"عقیل صاحب اچھا کلام ہی یاد کیا جا سکتا ہے" عمدہ شعر کی ایک تعریف یہ بھی ہے کہ سنتے ہی یاد ہو جائے خیر آپ کوئی نظم سنائیے عقیل نے چھوٹی سی نظم بھی نہایت اچھے ڈھنگ سے پڑھی۔

تھوڑی دیر ایسی ہی باتیں ہوتی رہیں جن کا طنز بھی خلوص کا رنگ لیے ہوئے تھا۔ مس عارفہ نے اس دوران لب کشائی نہیں کی صرف مسکراہٹوں کا حسن ان کے ہونٹوں پر نمایاں ہوتا رہا۔ انصار نے چند غزلیں اور سنائیں زیدی نے اُن کی فنی مہارت کا اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

"آپ کے یہاں تاثیر اور دلکشی ہے جذبہ کی متوازن آنچ سے آپ شعر میں گرمی پیدا کر دیتے ہیں۔"

عارفہ بولی۔

"ڈیڈی آپ بھی کچھ سنائیے۔"

"ضرور، ضرور انصار اور عقیل نے تالیاں بجا کر تائید کی۔"

"ضرور سنائیے ورنہ نیند نہیں آئے گی۔"

"آپ سمجھتے ہیں کہ میرے اشعار میں افیون کی خاصیت ہوگی۔"

نہیں جناب ایسا ہم نے نہیں سوچا لیکن آپ جانتے ہیں کہ بھوک پیاس کی شدت میں آنکھ نہیں لگا کرتی پھر موسیقی خواب آور بھی ہے اور بنیادی قدر کے لحاظ سے شاعری اور موسیقی میں کوئی فرق نہیں۔"

زیدی نے قطعات پیش کیے کچھ فکاہیہ رباعیات سنائیں ان کا لب و لہجہ استادانہ تھا سب نے خراج تحسین پیش کیا۔ ایک بجے بزم شعر برخاست ہوئی سب لوگ بستروں پر چلے گئے۔ انصار نے آہستہ سے کہا۔

"بڑے خوش نصیب ہو عقیل!"

مس عارفہ نے آپ کو بڑی سرگرمی سے داد دی اس کے علاوہ بار بار آپ کو دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں خمارِ مے کی نرگسِ شہلا سے زیادہ دلفریب مخمور اور شربتی آنکھوں سے نشہ چھلک پڑ رہا تھا۔

"ٹھیک کہتے ہو انصار میں بھی سرشار ہو رہا تھا۔"

"یہ سرشاری غالباً دائمی ہوگی۔"

"کچھ کہا نہیں جا سکتا۔"

صبح چائے پی کر انصار نے میزبان سے اجازت طلب کی۔ زیدی دونوں سے بغلگیر ہوئے دوسری ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا۔ عارفہ نے تبسم زیرلب کے ساتھ عقیل کے سراپا کا جائزہ لیا انصار کے اشعار کو اس نے ضرور پسند کیا تھا لیکن اس کے پیکر سے اسے کوئی دلچسپی نہیں ہوئی تھی۔ مہمانوں کے رخصت ہو جانے پر عارفہ کو ایسا لگا جیسے فضا پر اداسی کا گہرا چھا گیا ہو۔ کوئی رونق اور چہل پہل باقی نہ رہی ہو۔ عرصہ تک دوبارہ ملنے کی نوبت نہیں آ سکی عارفہ کے دل میں عقیل سمایا رہا اور عقیل کی نظر میں عارفہ سمائی رہی۔ ایک روز لکھنؤ میں کارتوس خریدتے وقت عارفہ نے انصار کو دیکھ لیا وہ بڑی گرم جوشی سے ملی، پوچھا۔

"عقیل صاحب نہیں ہیں آپ کے ساتھ"؟

"اس وقت نہیں ہیں۔ شکار میں ضرور ساتھ ہوں گے۔"

"پرمٹ کس جنگل کا ہے؟"

"رام پور کے قریب کجلی بن کا ایک حصہ ہے وہیں کا اجازت نامہ حاصل کیا گیا ہے۔"

"ڈیڈی سے کہوں گی وہ بھی کجلی بن ہی میں کیمپ لگائیں۔"

انصار نے شالیمار میں عارفہ کو چائے پلائی شکار کی تاریخیں طے ہو گئیں۔ عارفہ کی گاڑی کا وقت قریب آ رہا تھا وہ دہلی ایکسپریس سے جا رہی تھی۔ انصار میرٹھ چلا آیا اس نے عقیل سے عارفہ کی ملاقات کا ذکر کیا۔ اگلے پروگرام کو سن کر وہ بہت خوش ہوا مقررہ تاریخ پر دونوں پارٹیاں اسی منزل پر پہونچ گئیں جہاں زیدی صاحب کا کیمپ لگا ہوا تھا وہ ابھی آئے نہیں تھے مس عارفہ موجود تھی۔ جگہ نہایت پرفضا تھی، درختوں میں ایک طرح کی رعنائی تھی قریب ہی ندی بہہ رہی تھی آبی پرندے بول رہے تھے شکاری گاڑیاں اپنی سمتیں متعین کر کے روانہ ہو گئیں۔ انصار نے کہا:۔

"عقیل بڑے سکندر بخت ہو!"

"وہ کیسے؟"

"عارفہ نے تمھیں منتخب کر لیا ہے"

"کیونکر معلوم ہوا؟"

"اس کی ہر ادا سے یہی ظاہر ہو رہا تھا۔"

مذاق مت کرو ورنہ میں بھی عاشق ہو جاؤں گا اس پر۔

تم پہلے ہی اس کے گیسوئے پرخم میں اسیر ہو چکے ہو۔" عقیل نہیں کہہ کر چپ ہو گیا۔ چند میل ہی چلے تھے کہ عقیل نے دیکھا بہت پرانا سا مر درخت کی شاخ میں سینگ الجھائے جھولا جھول رہا ہے۔ اس نے انصار سے چپ رہنے کو کہا اور بندوق چلانے کے لیے تیار ہو کر نیچے کھڑا ہوا ہی تھا کہ دوسری جانب سے فائر ہوا سامر بچ گیا انصار زد میں آ گیا گولی پاؤں کی ہڈی توڑتی ہوئی نکل گئی انصار کے منھ سے دلدوز چیخ نکلی، عقیل تڑپ گیا اس نے پوری عجلت سے بکس کھول کر فرسٹ ایڈ کا سامان نکالا خون کی دھار بہہ رہی تھی اسی لمحہ مس عارفہ آ گئی۔

"فائر خالی گیا میرا؟"

"آپ کا نشانہ خطا نہیں ہوا۔" انصار نے کربناک لہجہ میں درد کی شدت پر قابو پا کر کہا۔

"یہ کیا غضب ہوا؟" خون کی دھار دیکھ کر عارفہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"ہوا کچھ نہیں معمولی بات ہے۔" عقیل بولا۔

"میں آپ ہی اپنی بندوق سے گھائل ہوا ہوں۔" انصار نے کہا۔

"نہیں میری ہی گولی لگی ہے آپ کو لیکن آپ لوگوں کے حصہ میں شمالی سمت آئی تھی یہ مغرب ہے!"

"جانوروں کا پیچھا کرتے ہوئے ہم بھٹک گئے" انصار نے ہر چند توجہ دلائی لیکن میں برابر چلتا ہی رہا ان کی بات نہ سنی۔"

عارفہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی، رخسار زرد پڑ گئے تھے، اس وقت وہ عقیل کو نہیں صرف انصار کو دیکھے جا رہی تھی۔ یکایک اسے انصار کے پیکر انسانیت سے گہری دلچسپی ہو گئی تھی۔ رندھی ہوئی ہوئی آواز میں بولی۔

"ڈیڈی کو کیا جواب دوں گی وہ خفا ہو جائیں گے!"

"خفگی کی کوئی وجہ نہیں میں آپ ہی اپنی بندوق کا نشانہ بنا ہوں۔" انصار بولا جانوروں کو دیکھتے ہی ہاتھ پیر کھول گئے بے خیالی میں لبلبی پر انگلی کا دباؤ پڑ گیا غنیمت ہوا کہ عقیل بچ گئے۔"

مجھے آپ بھی مطمئن نہیں کر سکتے۔ میرا ضمیر جرم کا اعتراف کر رہا ہے۔

اسی وقت عقیل انصار کو لے کر روانہ ہو گیا ان کے جاتے ہی عارفہ نے کیمپ اکھاڑنے کا حکم دے دیا۔

چند روز بعد اطلاع ملی کہ انصار کا پاؤں کاٹ دیا گیا ہے۔ عارفہ اس کی خیریت معلوم کرنے برابر جاتی رہی۔ ہر بار پھل اور مٹھائی لے جاتی انصار کا رہن سہن معمولی تھا وہ بہت خوش حال بھی نہ تھا، ماں کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ ایک روز جب انصار کے پاؤں کی پٹی کھولی جا چکی تھی تو عارفہ اس کے یہاں گئی انصار بہت ملول تھا۔

"کیا حال ہے؟"

"اچھا ہوں ایک پاؤں نہیں رہا سوچتا ہوں زندگی کا اتنا بڑا راستہ کیونکر طے کر سکوں گا!!"

عارفہ نے بڑے اعتماد کے لہجہ میں کہا۔

"گھبرایئے نہیں آپ کا دوسرا پاؤں میں ہوں، زندگی کا راستہ کتنا ہی طویل سہی، میں آخر دم تک آپ کی ہمسفر رہوں گی۔"

انصار کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

★

مہدی پرتاپگڈھی
ایگزیکیٹو انجینئر، اری گیشن ڈویژن۔ پرتاپگڈھ

اگست ایک امانت ہے

اگست ایک امانت ہے ان جیالوں کی
جو زندگی کے لیے دار سے گذرتے رہے
لہو سے اپنے فضاؤں میں رنگ بھرتے رہے
پئے سحر جو اندھیرے سے جنگ کرتے رہے

اگست ایک امانت ہے ان جیالوں کی
ڈگا سکی نہ قدم جن کے گردشِ ایام
جنھیں ڈرا نہ سکی قوتِ ستم آدام
جو اپنی جان بھی دے کر ہیں آج تک گم نام

اگست ایک امانت ہے ان جیالوں کی
غلام رہ کے جنھیں موت بھی گوارہ نہ تھی
سنا کے ہم کو گئے جو نویدِ آزادی
چمن کے پھولوں میں ہے جن کے خون کی سرخی

اگست ایک امانت ہے ان جیالوں کی
دلوں میں جن کے نہیں تیرگی کدورت کی
وہ جن کی زیست کا مسلک ہے قومی یکجہتی
عزیز جان سے زیادہ ہے جن کو آزادی

اگست ایک امانت ہے ان جیالوں کی
جو چاہتے ہیں کہ گھر گھر میں سب خوشی آئے
ہر ایک شاخِ تمنا میں زندگی آئے
جو تیرہ ذہن ہیں ان تک بھی روشنی آئے

اگست ایک امانت ہے ان جیالوں کی
جو دیتے رہتے ہیں تاریخ کو نئے ابواب
وہ جن کے ذہن نئے، جن کی فکر ہے شاداب
جو ہر روش پہ چمن کی کھلا رہے ہیں گلاب

اگست ایک امانت ہے ان جیالوں کی
جو کرتے رہتے ہیں تعمیر کے نئے در باز
جو کرتے رہتے ہیں انسانیت کو سرافراز
سمجھتے رہتے ہیں جو لوگ زیست کے انداز

اگست ایک امانت ہے ان جیالوں کی
وطن کی کرتے ہیں جو روز و شب نگہداری
کسی بھی فرقے کی کرتے نہیں دل آزاری
مئے خلوص سے حاصل ہے جن کو سرشاری

اگست ایک امانت ہے ان جیالوں کی

ظفر احمد صدیقی
پوسٹ آفس جمال پور۔ مرزا پور
ضلع اعظم گڑھ (یو۔ پی)

قصیدہ ــ اصل، ہیئت اور حدود

اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو، فارسی کی اصطلاح میں قصیدہ اس مسلسل نظم کو کہتے ہیں، جس کے پہلے شعر کے دونوں مصرعے اور بقیہ اشعار کے دوسرے مصرعے ہم قافیہ و ردیف ہوں، اور جس میں مدح یا ذم، وعظ و نصیحت، یا مختلف کیفیات و حالات وغیرہ کا بیان ہو۔ لیکن ہمارے یہاں پڑھے لکھے لوگوں کا عام خیال ہے کہ لفظ قصیدہ اردو، و فارسی کی طرح عربی میں بھی کسی صنف سخن کا نام ہے۔ اور جس طرح ہمارے یہاں قصیدے کے ذکر کے بغیر اصناف سخن کی تقسیم نامکمل سمجھی جاتی ہے۔ غالباً یہی صورتِ حال عربی میں بھی ہے۔ لہٰذا قصیدہ۔ قصیدہ نگار۔ اور قصیدہ نگاری جیسے الفاظ کا استعمال ہم عربی شعرا کے لیے بھی انھیں معنوں میں کر سکتے ہیں۔ جن میں اردو و فارسی شعرا کے لیے کرتے رہتے ہیں۔ یہاں مثال کے طور پر چند ایسے اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔ جن سے اس قسم کے خیالات کی تصدیق ہوتی ہے:

ڈاکٹر ابو محمد سحر لکھتے ہیں:

"اردو کی اصناف سخن کی ابتدا کا سر رشتہ فارسی یا فارسی کے توسط سے عربی سے جا ملتا ہے۔ قصیدہ بھی عربی شاعری کی پیداوار ہے، عربی سے یہ صنف سخن فارسی میں پہنچی، اور فارسی سے اردو میں آئی۔"[1]

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"قصیدہ اپنی اصل کے اعتبار سے عربی کی شہرۂ آفاق صنفِ سخن ہے۔"[2]

ڈاکٹر سید عبد اللہ کا بیان ہے:

"صنفِ قصیدہ قدیم اصنافِ سخن میں ایک مقبول اور باوقار صنفِ سخن ہے بلکہ عرب کے نزدیک تو شاعرانہ کمال کا مدار ہی قصیدہ نگاری پر تھا۔ پھر جب فارسی شاعری کی ترقی ہوئی تو قصیدہ نگاروں نے اس عمارت کو اتنا رفیع اور وقیع بنایا کہ قصیدہ کے بغیر شاعرانہ کمال نامکمل سمجھا گیا۔"[3]

سید عابد علی عابد نے بھی لکھا ہے:

"اس میں کوئی شک نہیں کہ قصیدہ عربی میں بڑی اہم صنفِ سخن شمار ہوتا ہے۔ ہمارا قصیدہ فارسی قصیدے کی صدائے بازگشت ہے۔"[4]

ڈاکٹر محمود الٰہی کا خیال ہے:

"عرب کے نقاد اور تذکرہ نویس اس سوال کا کوئی واضح جواب نہیں دے سکے ہیں کہ عرب میں قصیدہ نگاری کی ابتدا کب ہوئی۔ اور عربی کا پہلا قصیدہ نگار کون ہے؟[5] لیکن واقعہ یہ ہے کہ اردو داں طبقہ۔ قصیدہ کے عربی تصور سے نہ صرف

---

[1] ابو محمد سحر: اردو میں قصیدہ نگاری ص ۳۳۔ [2] ابو محمد سحر: انتخاب قصائد اردو ص ۱۰۔ [3] سید عبد اللہ: مباحث حصہ دوم ص ۳۲۴۔ [4] سید عابد علی عابد: اصول انتقاد ادبیات ص ۴۶۸، ۴۶۹۔ [5] ڈاکٹر محمود الٰہی: اردو قصیدہ نگاری۔ تنقیدی جائزہ ص ۶۹۔

یہ کہ آگاہ نہیں بلکہ اس کی نسبت غلط فہمی میں مبتلا ہے یہ درست ہے کہ قصیدہ عربی الاصل لفظ ہے۔ اور اردو و فارسی کی طرح عربی میں بھی ایک شعری اصطلاح کے طور پر مستعمل ہے۔ لیکن یہ دعویٰ کہ یہ عربی کی ایک صنف سخن ہے، محل نظر ہے۔

یہاں سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ عربی میں اصناف کا تصور کیا ہے؟ اصناف۔ صنف کی جمع ہے۔ اور صنف قسم کو کہتے ہیں اصناف سخن یا اصناف شعر کے معنی ہوئے اقسام شعر یا شاعری کی مختلف قسمیں۔ اب یہ دعویٰ تو نہیں کیا جا سکتا کہ عربی شاعری از اول تا آخر یک رنگ و یک صفت ہے یا بالفاظ دیگر عربی میں اصناف سخن کا سرے سے وجود ہی نہیں۔ البتہ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ عربی اصناف کی نوعیت فارسی و اردو سے یکسر مختلف ہے۔ ہمارے یہاں تو اصناف کا ایک واضح تصور ہے۔ ان کی ایک مکمل فہرست ہے۔ قدما ہوں یا متاخرین اصناف کے تعلق سے ان کی تحریروں میں کچھ مخصوص ناموں کا ہی تذکرہ ملتا ہے۔ یہ تو ممکن ہے کہ بعض اصناف مٹ جائیں یا بعض نئی ظہور پذیر ہو جائیں لیکن ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہر نقاد اصناف کی تعین تشریح اور ان کی فہرست سازی اپنے ذوق و مزاج کے لحاظ سے کرے یا اپنی صوابدید کے مطابق انھیں مختلف ناموں سے نوازے۔ یہ اس لیے کہ ہمارے یہاں تقسیم اصناف کے ضابطے معین ہیں۔ اور ان کے نام بھی طے شدہ ہیں۔

اردو یا فارسی کے برخلاف عربی میں شاعری کی تقسیم اغراض و مقاصد کے لحاظ سے کی گئی ہے۔ اور ہر غرض کو شاعری کے ایک باب، شاعری کے ایک فن، اور شاعری کی ایک صنف کا نام دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اغراض بدلتی، بڑھتی اور پھیلتی رہتی ہیں اس لیے عربی اصناف شعر میں تنوع اور کثرت کا پایا جانا فطری ہے۔ پھر ہر با ذوق اپنے معیار نقد و نظر کے لحاظ سے اغراض کا تعین کر سکتا ہے۔ اس لیے ان کے شمار اور تشریح میں بھی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ یہ سوال کہ بنیادی و اصولی اغراض کون ہیں اور ضمنی و فروعی کون؟ اس کے جواب میں کبھی اتفاق رائے نہیں۔ اس بات کی آزادی بھی حاصل ہے کہ ایک ہی غرض کو مختلف ناموں سے پکارا جائے۔ بہ طور مثال یہاں اغراض شعر سے متعلق چند اقوال پیش کئے جاتے ہیں:

قدامہ بن جعفر (متوفی ۳۳۷ھ) کی رائے ہے:

ألاهم من اغراض الشعراء	شاعروں کی اہم اغراض چھ
ستة۔ المديح والهجاء	ہیں: مدح، ہجو، نسیب،
والنسيب والمراثي	مراثی، وصف اور تشبیہ۔
والوصف والتشبيه[۶]۔	

مدح، ہجو، مراثی سے تو آپ واقف ہی ہیں۔ نسیب کو بھی تھوڑی دیر کے لیے غزل کا مرادف سمجھ لیں۔ لیکن قدامہ کے نزدیک وصف یعنی منظر کشی بھی شاعری کی ایک صنف ہے۔ حالانکہ مرقع کشی و منظر نگاری کو آپ مستقل صنف کا درجہ کبھی نہیں دیتے۔ اب آگے چلیے کسی کے حاشیۂ خیال میں کبھی یہ بات نہ آئی ہوگی کہ تشبیہ بھی صنف شعر کا درجہ پا سکتی ہے۔ لیکن یہاں اس کا شمار اہم اغراض شعر میں کیا گیا ہے۔ اس کا بنیادی سبب صرف یہی ہے کہ ہماری زبان میں اصناف کا تصور اور ہے۔ اور عربی میں کچھ اور۔

اب یہیں ابوالحسن علی بن عیسیٰ الرمانی نحوی (متوفی ۳۸۴ھ) کو بھی سنتے چلیے۔ فرماتے ہیں:

اکثر ما تجری علیه اغراض	شاعری کی مروجہ اغراض پانچ
الشعر خمسة: النسيب	ہیں: نسیب، مدح، ہجو،
والمدح، والهجاء،	فخر، اور وصف رہے تشبیہ
والفخر، والوصف، ويدخل	اور استعارہ تو وہ باب وصف
التشبيه والاستعارة	میں داخل ہیں۔
في باب الوصف[۷]۔	

قدامہ اور رمانی کے اختلافات ملاحظہ ہوں: قدامہ کے مطابق اغراض چھ تھیں۔ رمانی کے نزدیک پانچ ہوگئیں۔ مراثی کا شمار قدامہ کے نزدیک اہم اغراض شعر میں تھا۔ رمانی نے اس کا ذکر ہی اڑا دیا۔ فخر کا پہلے کوئی وجود ہی نہ تھا۔ رمانی نے اسے خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ قدامہ نے تشبیہ کو مستقل صنف کا درجہ دیا تھا۔ رمانی نے اسے وصف کے تابع بنا دیا۔ ایک نئی بات یہ ہوئی کہ

[۶] قدامہ بن جعفر: نقد الشعر ص ۱۶ طبع قسطنطنیہ۔

[۷] ابن رشیق القیروانی: العمدۃ، جلد اول ص ۱۲۰ طبع بیروت ۱۹۷۲ء۔

تشبیہ کے ساتھ استعارہ بھی ضمنی ہی سہی لیکن ایک صنعت کا درجہ پا گیا۔

ابن رشیق قیروانی (متوفی ۴۵۶ھ) العمدۃ میں کسی محرم اسرار شاعری کے حوالے سے لکھتے ہیں:

قال بعض العلماء	فن شاعری کے واقف کاروں
بھذا الشان: بنی الشعر	میں سے کسی نے کہا ہے کہ شاعری
علی اربعۃ ارکان وھی	کے ارکان چار ہیں۔ مدح،
المدح، والھجاء، والنسیب	ہجو، نسیب، اور مرثیہ۔
والرثاء۔[۵۸]	

لیجئے اغراض و اصناف کی تعداد چھ سے چار تک پہنچ گئی۔ اب ان سب سے الگ ایک بیان ملاحظہ ہو:

وقال عبدالکریم: یجمع	عبدالکریم نے کہا کہ اصناف شعر
اصناف الشعر اربعۃ:	میں اصل چار ہیں: مدح،
المدیح۔ والھجاء، والحکمۃ	ہجو، حکمت، اور لہو۔ پھر
واللھو، ثم یتفرع من	ان میں سے ہر صنف کی مختلف
کل صنف من ذالک فنون	شاخیں ہیں، مدح کی شاخیں
فیکون من المدیح المراثی	مراثی، افتخار، اور شکر ہیں۔
والافتخار والشکر ویکون	ہجو کی ذم، عتاب اور استبطاء
من الھجاء، الذم	حکمت کی امثال، تزہید اور
والعتاب، والاستبطاء	مواعظ اور لہو کی غزل و طرد،
ومن الحکمۃ الامثال	اور خمریات۔
والتزھید والمواعظ	
ویکون من اللھو الغزل	
والطرد وصفۃ الخمر	
والخمور[۵۹]	

اس کے مطابق اصناف شعر سولہ ہو گئیں۔ جن میں بارہ ضمنی ہیں۔ اور چار بنیادی۔

دلچسپ بات یہ کہ مراثی، ہجو اور غزل کو ضمنی حیثیت دی گئی ہے۔ ایک بہت بڑی جماعت اس کی بھی قائل ہے کہ بنیادی طور پر شاعری دو خانوں میں تقسیم کی جا سکتی ہے۔ مدح اور ہجو۔ بقیہ تمام اصناف ضمنی ہیں۔[۶۰]

اس وضاحت کے بعد کہ بجز قدامہ کے قول کے اوپر نقل کیے ہوئے سبھی اقوال ابن رشیق نے العمدۃ میں نقل کیے ہیں۔ یہ ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خود ابن رشیق نے جن اغراض و اصناف کے لیے مستقل ابواب قائم کیے ہیں وہ بہ تفصیل ذیل نو کی تعداد میں ہیں: نسیب، مدح، افتخار، رثا، استقضاء و استنجاز، عتاب، وعید و انذار، ہجو، اعتذار۔[۶۱]

نئے لوگوں میں جرجی زیدان (متوفی ۱۳۳۲ھ) نے اپنی تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ میں لکھا ہے۔

ان ابواب الشعر الیوم	گو کہ آج دسیوں اصناف سخن
تعد بالعشرات۔ لم	شمار ہیں۔ لیکن زمانہ جاہلیت
یکن منھا فی الجاھلیۃ	میں فخر، حماسہ، تشبیب،
الا الفخر والحماسۃ	مدح، اور ہجو کے علاوہ دیگر
والتشبیب والمدیح	اصناف کا وجود نہ تھا اور
والھجاء وتفرع	مرثیہ تو مدح کی ہی ایک
من المدیح الرثاء[۶۲]	شاخ ہے۔

احمد حسن الزیات جن کی "تاریخ الادب العربی" عرب ممالک کے جامعات میں داخل نصاب ہے لکھتے ہیں:

فزخرت بحور الشعر	عربی شاعری میں فخر، حماسہ
العربی بالفخر والحماسۃ	مدح، ہجو، رثا، عتاب،
والمدح، والھجاء،	غزل، وصف، اعتذار
والرثاء۔ والعتاب والغزل	اور حکمت کی فراوانی ہے۔
والوصف والاعتذار والحکمۃ[۶۳]	

اصناف کے مسئلہ پر عدم اتفاق اور غیر قطعیت کا اندازہ اس طرح بھی ہوتا ہے کہ مختلف ارباب ذوق نے عربی شاعری کے جو انتخابات پیش

---

۵۸ ابن رشیق القیروانی العمدۃ جلد اول ص ۱۲۰ طبع بیروت ۵۹ ص ۱۲۱ ۶۰ ص ۱۲۱ ۶۱ جلد ثانی العمدۃ ۶۲ جرجی زیدان: تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ جلد اول ص ۸۳ ۶۳ احمد حسن الزیات تاریخ الادب العربی ص ۳۱ و ۳۲۔

گئے ہیں۔ ان میں بھی ابواب شعر کے سلسلے میں اتفاق نہیں مثلاً حماسہ ابو تمام کو لیجئے۔ اہل ادب متفق ہیں کہ یہ عربی شاعری کا بہترین اور ہمہ گیر انتخاب ہے۔ تاہم یہاں بھی ابواب شعر کی تقسیم الگ نوعیت کی ہے۔ ابو تمام نے اس میں دس ابواب قائم کئے ہیں جو یہ ہیں۔

حماسہ[1]، مراثی[2]، ادب[3]، نسیب[4]، ہجو[5]، اضیاف و مدائح[6]، صفات[7]، سیر و نعاس[8]، ملح[9]، اور مذمت النساء[10]۔

دوسری طرف ابو تمام (متوفی سنہ ۲۳۱ھ) کی تقلید میں اس کے معاصر بحتری (متوفی سنہ ۲۸۴ھ) نے بھی حماسہ ہی کے نام سے ایک انتخاب ترتیب دیا۔ لیکن اس کی ترتیب ابو تمام سے بالکل مختلف ہے۔ اس میں ذیلی موضوعات کے لحاظ سے ایک سو چوہتر[174] ابواب قائم کئے گئے ہیں۔ حماسہ ابو تمام کی مقبولیت کے پیش نظر کچھ اور لوگوں نے بھی اپنے انتخابات کا نام "حماسہ" ہی تجویز کیا۔ ہمیں یہاں ان کا احاطہ مقصود نہیں۔ ان میں سے فی الحال ہمارے سامنے حماسہ ابن الشجری (متوفی سنہ ۵۴۲ھ) ہے جو چودہ[14] تو مستقل ابواب قائم کیے ہیں۔ اور بیس[20] ذیلی فصلیں الگ ہیں۔ ان میں کچھ ابواب تو ابو تمام کے مطابق ہیں اور بقیہ میں ابن الشجری منفرد ہیں ــــ

ہم نے عربی اصناف سخن کی نوعیت و حیثیت پر تفصیلی گفتگو اس لیے کی ہے کہ اس سے چند اہم نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ اول تو یہی کہ جب یہ ثابت ہو چکا کہ عربی میں اصناف کا تصور فارسی و اردو سے بالکل الگ ہے تو اردو نقادوں اور محققوں کا یہ دعویٰ کہ قصیدہ عربی کی شہرہ آفاق صنف سخن ہے۔ محل نظر ہو گیا۔

اس لیے کہ تھوڑی دیر کے لیے اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ لفظ قصیدہ۔ عربی میں کسی صنف کا نام ہے۔ جب بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ جو تصور اردو و فارسی میں بحیثیت صنف سخن اس کے ساتھ وابستہ ہے۔ وہی عربی میں بھی ہے۔ حالانکہ اردو والے دعویٰ دار اسی کے ہیں۔ ورنہ قصیدہ، قصیدہ نگار، اور قصیدہ نگاری جیسے الفاظ کا استعمال وہ عربی شعراء کے لیے بھی انھیں معنوں میں نہ کرتے جن میں اردو و فارسی شعراء کے لیے کرتے رہتے ہیں۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ چونکہ عربی میں اصناف کی تقسیم اغراض و مقاصد کی بنیاد پر کی گئی ہے۔ اس لیے ہر صنف کا نام ایسا ہی تجویز کیا گیا ہے۔ جو اپنی غرض کی طرف براہ راست اشارہ کر سکے۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو لفظ قصیدہ سے کسی خاص غرض کی طرف ذہن منتقل نہیں ہوتا۔ لہذا اسے کسی صنف سخن کا نام بھی نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

اس سلسلے کی آخری بات یہ ہے کہ اصناف سخن کی شان یہ ہوتی ہے کہ ان میں سے ایک کا اطلاق دوسرے پر نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً رباعی کو مثنوی۔ اور غزل کو مرثیہ کہنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ اسی طرح کسی نظم کے بارے میں یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ یہ ایک ایسا مرثیہ ہے جو غزل یا مثنوی ہے۔

لیکن عربی میں لفظ قصیدہ کے ساتھ یہ احتیاط نہیں برتی جاتی بلکہ تمام مسلمہ اصناف کے لیے قصیدہ کا لفظ استعمال کرنے کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔ اس کے لیے تلاش و جستجو کی بھی چنداں ضرورت نہیں۔ عربی شعر و ادب سے بحث کرنے والی کسی کتاب میں بھی اس کے شواہد مل سکتے ہیں۔ یہاں ابن رشیق کی العمدۃ سے چند عبارتیں پیش کی جاتی ہیں ــــ

صنف افتخار کے ذیل میں لکھتے ہیں:

ومن اجود قصيدة افتخر فيها شاعر قصيدة سموئل بن عاديا۔	افتخار کی بہترین مثال سموئل بن عادیا کا قصیدہ ہے۔

مرثیہ کے باب میں لکھتے ہیں:

وقد اجاد ايضاً (ابو تمام) في القصيدة التي رثى بها ادريس بن بدر السامي۔	ابو تمام کا وہ قصیدہ بھی بہترین قصیدہ ہے جو اس نے ادریس بن بدر السامی کے مرثیہ کے طور پر کہا ہے۔

باب عتاب میں ایک جگہ لکھا ہے:

قال ابن الرومي لابي الصقر اسمٰعيل بن بلبل	ابن الرومی کا ایک نہایت عمدہ اور منتخب قصیدہ ہے جس میں

یعاتبہ فی قصیدۃ   اس نے ابوالعتو اسماعیل بن
جیدۃ مختارۃ ۔   بلبل کو عتاب کیا ہے۔

اسی طرح صنف اعتذار کے بارے میں لکھتے ہیں:

واجل ما وقع فی   نابغہ کے وہ تین قصائد جن کا
الاعتذار من مشہورات   شمار مشہور و معروف قصائد عرب
العرب قصائد النابغہ   میں ہوتا ہے۔ باب اعتذار
الثلاث[11]   میں نہایت عظیم المرتبت ہیں۔

ان تمام مثالوں میں لفظ قصیدہ صنف سخن کی آن بان اور رکھ رکھاؤ سے عاری ہے لہذا اسے عربی کی کسی صنف کا نام بھی نہیں قرار دیا جا سکتا۔

خلاصۂ گفتگو یہ ہے کہ:

(۱) اردو و فارسی والوں کی طرح عربوں نے اپنی شاعری کو باضابطہ طور پر اصناف سخن کی شکل میں تقسیم ہی نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں اصناف سخن کا کوئی قطعی اور واضح تصور نہیں۔ اجازت ہے کہ انھیں دو لفظوں میں سمیٹ دیا جائے یا بے پایاں وسعت دی جائے۔

(۲) لیکن بہر صورت فہرست مختصر ہو یا تفصیلی کہیں بھی "قصیدہ" کا گذر نہیں۔

(۳) عربی میں لفظ قصیدہ کی معنوی دلالت اور اس کے استعمالات کی نوعیت بھی اسے صنف سخن کا درجہ دینے کی راہ میں مزاحم ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ جب "قصیدہ" عربی زبان کا لفظ ٹھہرا۔ اور یہ بہرحال ایک شعری اصطلاح۔ تو پھر عربی میں اس کا مفہوم کیا ہے؟ علامہ سید سلیمان ندوی ایک جگہ لاکھ ٹکے کی بات کہہ گئے ہیں۔ فرماتے ہیں:

"زبان اور اس کے الفاظ کا ذخیرہ ایک سچے دیانتدار کی طرح پچھلی روداد کا ریکارڈ یا مسل ہمارے لئے تیار رکھتا ہے[12]۔ دوسرے تمام الفاظ کی طرح یہ بات "قصیدہ" پر بھی حرف بہ حرف صادق آتی ہے۔ اس لفظ سے عربی شاعری کی ایک تاریخ وابستہ ہے اہل ادب کا بیان ہے کہ عربی زبان میں شاعری کا آغاز ایک اتفاق بلکہ حسن اتفاق کا نتیجہ ہے[13]۔ کہتے ہیں کہ مضر بن نزار نامی ایک شخص کسی سفر کے دوران اونٹ کی پشت سے نیچے آ رہا۔ غریب کے ہاتھ ٹوٹ گئے۔ رفقا نے کسی طرح دوبارہ سوار کرایا اور لے کر آگے بڑھے، بے چارہ تکلیف کی شدت سے مجبور ہو کر وایداہ وایداہ (اے رے ہاتھ، ہائے رے ہاتھ) کی آواز کے ساتھ کراہنے لگا۔ ایک تو درد بھری آواز پھر اتفاق ایسا کہ گلا بھی غضب کا پر تاثیر۔ کچھ ہی دیر بعد یہ محسوس کیا گیا کہ زخمی کی مسلسل کراہ اونٹ کی رفتار کو تیز تر کرتی جا رہی ہے[14]۔ یہیں سے حدی خوانی کی شکل میں شاعری کا آغاز ہوا۔ اور کراہنے کی یہی آواز شاعری کا پہلا وزن قرار پائی[15] شاعری کا آغاز تو ہو ہی چکا تھا۔ اب بوقت ضرورت حدی کے علاوہ فخریہ، ہجویہ اور رزمیہ اشعار بھی نظم کیے جانے لگے۔ لیکن زیادہ نہیں چار، چھ یا بہت ہوئے تو دس یا بارہ ابیات۔ ایک عرصہ دراز تک عربوں کی شعری سرگرمیاں اسی مخصوص وزن اور اسی مختصر تعداد تک محدود رہیں۔ وہ اپنی ان مختصر نظموں کے لیے "رجز" یا "ارجوزہ" کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ جس کی جمع "اراجیز" ہوتی ہے۔ (ہمارے یہاں "رجز" کا لفظ جنگی ترانے کے لیے مخصوص ہے۔ لیکن عربی میں یہ عام ہے) ہیئت کے لحاظ سے "اراجیز" کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس کا ہر مصرع مستقل ہوتا ہے۔ اسے مصرع ثانی کی احتیاج نہیں ہوتی[16]

موجودہ علم العروض کی رو سے "اراجیز" کا وزن رجز مشطور یا "رجز منہوک" کہلاتا ہے۔ یہ اس لیے کہ اراجیز کا تعلق

[11] اوپر دیے ہوئے سبھی اقتباسات کے لیے ابن رشیق: العمدۃ جلد ثانی کے یہ صفحات بالترتیب ملاحظہ ہوں ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۳، ۱۲۷ [12] سید سلیمان ندوی۔ پرانے لفظوں کی نئی تحقیق بشمولہ "اردو میں لسانیاتی تحقیق" مرتبہ عبدالستار دلوی۔ ص ۲۰۶ [13] ابوبکر الباقلانی۔ اعجاز القرآن۔ ص ۳۵ طبع اول ۱۳۲۵ھ مصر [14] احمد حسن۔ الزیات = تاریخ الادب العربی۔ ص ۲۹ [15] احمد حسن۔ الزیات = تاریخ الادب العربی۔ ص ۲۹ [16] ابن منظور: لسان العرب جلد ہفتم، ص ۲۱۸۔

بحرِ رجز سے ہے۔ جو ایک شش رکنی بحر ہے۔ اور مستفعلن کی تکرار سے وجود میں آتی ہے۔ اس کی سالم شکل یہ ہوگی:

مستفعلن مستفعلن مستفعلن مستفعلن مستفعلن مستفعلن

دارٌ لسلمیٰ اذ سُلیمیٰ جارۃٌ قفرٌ ترَیٰ آیاتھا مثلُ الزّبُرْ

لیکن اگر اس میں شطر واقع ہو جائے یعنی اس کے نصف ارکان حذف کر دیے جائیں تو اُسے "رجز مشطور" کہیں گے مثلاً

مستفعلن مستفعلن مستفعلن ....

ماھاجَ احزاناً وشجواً قد شجا ....

اور اگر دو تہائی ارکان حذف کر دیے جائیں۔ اور صرف ایک تہائی باقی رہ جائے تو اس عمل کو نہک۔ اور اس وزن کو رجز منہوک کہیں گے مثلاً

مستفعلن ، مستفعلن ....

یا لیتنی منھا جذعْ ....

نہک و شطر کی مزید وضاحت نیز رجز کی ہیئت سے پوری واقفیت بہم پہنچانے کے لیے بطور مثال ابو النجم کا یہ ارجوزہ ملاحظہ ہو:

قد اصبحت اُمُّ الخیار تدّعی علیَّ ذنباً کلُّہ لم اصنعِ

مِن أن رأت رأسی کرأس الاصلعِ میّز عنہ قُنزُعاً عن قُنزُعِ

جذبُ اللیالی ابطئی او اسرعی افناہُ قیلُ اللہِ للشمسِ اطلعی

حتّی اذا واراکِ اُفقٌ فارجعی ؂

جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا جا چکا اپنی ہیئت کے لحاظ سے رجز کا ہر مصرع مستقل ہوتا ہے۔ ورنہ ابو النجم کے اس ارجوزہ کا ساتواں مصرع ناقص قرار پائے گا۔ اسی نکتے کو پیش نظر رکھتے ہوئے عروضیوں نے کہا ہے کہ "اراجیز" یا تو شطور ہوتے ہیں (اگر ہر مصرع سہ رکنی ہو) یا منہوک (اگر ہر مصرع دو رکنی ہو) دوسری طرف بعض لوگوں کی نگاہ اس طرف بھی گئی ہے کہ ہیئت کے لحاظ سے رجز کے مصرعوں اور نثر مسجع کے فقروں میں کوئی فرق نہیں۔ سوائے اس کے کہ نثر کے فقروں کا مقفیٰ و مسجع ہونے کے باوجود ہم وزن ہونا ضروری نہیں۔ جبکہ رجز کا ہر مصرع ہم وزن و ہم قافیہ بھی ہوتا ہے۔[1]

بہر حال ایک مدت دراز تک عربی شاعری "اراجیز" میں ہی منحصر رہی۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ اس میں دو بنیادی تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ پہلی تو یہ کہ عربوں نے رجز کے اکہرے مصرعوں پر گرہ لگائی۔ اور بیت کی معروف شکل ایجاد کی یا بالفاظ دیگر نصف بیت یا ثلث بیت کے مرحلے سے گذر کر بیت کامل کی منزل تک پہنچ گئے۔ لیکن اب بھی ان کی نظمیں مختصر ہی ہوتی تھیں۔ اور ابیات کی تعداد دس یا بارہ سے متجاوز نہ ہوتی۔ "اراجیز" کے مقابلے میں دوسری قسم کی ان نظموں کو "مقطوعات" کا نام دیا گیا اسلام کی آمد سے سو ڈیڑھ سو سال قبل تک عربی شاعری اراجیز و مقطوعات ہی پر مشتمل رہی۔ یہاں تک کہ اخیر زمانہ جاہلیت میں دوسری اہم تبدیلی یہ رونما ہوئی کہ مہلہل یا امرؤ القیس یا بہ اختلاف روایات بعض شعراء نے نئے نئے خیالات و مضامین کے ذریعے طویل نظموں کی طرح ڈالی۔ جنھیں جلد ہی قبول عام اور بقار دوام کی سند حاصل ہو گئی۔ اراجیز و مقطوعات کے مقابل تیسری قسم کی ان طویل نظموں کے لیے "قصائد" کا نام تجویز کیا گیا۔ یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ "اراجیز" ابتداءً تو مختصر ہوتے ہی تھے۔ لیکن آگے چل کر بعض رجز گو شعراء نے اس میں قصائد کے مضامین داخل کر دیئے۔ اور اسے بھی طول دینے کا سلسلہ چل نکلا۔ تو مضامین کے اتحاد اور طوالت کے پیش نظر ان پر بھی مجازاً "قصائد" کا اطلاق کیا جانے لگا ——— یہ ہے لفظ قصیدہ کی مختصر سرگزشت جس سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ "قصیدہ" عربی زبان کی اصطلاح میں کبھی تو رجز و قطعات دونوں کے مقابل میں استعمال ہوتا ہے۔ اور کبھی محض قطعات کے۔

اماماں ادب و لغت کے اقوال سے اب اس کے شواہد پیش کیے جاتے ہیں۔

---

[1] ابن منظور: لسان العرب جلد ہفتم، ص ۲۱۸۔

اس سلسلے میں اصمعی (متوفی ۲۱۳ھ) کا قول ہے۔ جیسے سیوطی (متوفی ۹۱۱ھ) نے امالی ثعلب (متوفی ۲۹۱ھ) کے حوالے سے نقل کیا ہے:

اول من یروی له کلمة تبلغ ثلاثین بیتا من الشعر مهلهل، ثم ذویب بن کعب۔ ثم ضمرة۔[21]

سب سے پہلا شاعر جس سے تیس ابیات پر مشتمل نظم مروی ہے۔ مہلہل ہے۔ پھر ذویب بن کعب پھر ضمرة۔

ابو عبیدہ معمر بن مثنی لغوی (متوفی ۲۱۰ھ) سے منقول ہے:

انما کان الشاعر یقول من الرجز البیتین او الثلاثة، ونحو ذلك اذا حارب او شاتم او فاخر حتی کان العجاج اول من اطاله وقصده ونسب فیه وذکر الدیار، واستوقف الرکاب علیها، ووصف ما فیها، وبکی علی الشباب ووصف الراحلة، کما فعلت الشعراء فی القصید۔[22]

ابتدا میں جب شاعر کو جنگ و جدل، یا سب و شتم یا مفاخرت کی نوبت آتی تو وہ دو تین یا اسی کے مثل رجز کے اشعار کہہ لیا کرتا تھا تا آنکہ عجاج نے رجز کو طول دے کر قصیدے کی شکل دی۔ اس نے رجز میں تشبیب کی، دیار حبیب کا ذکر کیا۔ وہاں سواریوں کو ٹھہرانے کا مضمون باندھا، منزل حبیب کی منظر کشی کی۔ جوانی پر آنسو بہائے اور راونٹنی کا سراپا پیش کیا یہ وہی عمل تھا جسے شعرا قصیدوں میں انجام دے چکے تھے۔

عربی شعرا کے اولین تذکرہ نگار محمد بن سلام الجمحی (متوفی ۲۳۱ھ) کا بیان ہے:

ولم یکن لاوائل العرب من الشعراء الا الابیات یقولها الرجل فی حادثة۔ وانما قصدت القصائد وطول الشعر علی عهد عبد المطلب وهاشم بن عبد مناف۔[23]

ابتدائی عرب شعرا سے جو کلام منسوب ہے۔ وہ چند ابیات ہی کی شکل میں ہے۔ جن میں شاعر کسی حادثہ کے موقع پر نظم کرتا تھا۔ لمبی لمبی نظموں اور مطول شاعری کا رواج تو عبد المطلب اور ہاشم بن عبد مناف کے عہد کی بات ہے۔

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

وکان اول من قصد القصائد وذکر الوقائع المهلهل بن ربیعة التغلبی فی قتل اخیه کلیب وائل۔[24]

سب سے پہلے مہلہل بن ربیعہ تغلبی نے اپنے بھائی کلیب وائل کے قتل کے موقع پر طویل نظمیں کہیں۔ اور ان میں لڑائیوں کا ذکر کیا۔

بعینہ یہی بات ابن قتیبہ الدینوری (متوفی ۲۷۶ھ) نے بھی اپنے مستند و مشہور تذکرہ الشعر والشعراء میں لکھی ہے۔ فرماتے ہیں:

لم یکن لاوائل الشعراء الا الابیات القلیلة۔ یقولها الرجل عند حدوث الحاجة۔[25]

ابتدائی شعرا بوقت ضرورت صرف چند ابیات ہی نظم کیا کرتے تھے۔

اسی طرح مہلہل کے ذکر میں لکھتے ہیں:

ویقال انه اول من قصد قصیده۔ قال الفرزدق ومهلهل الشعراء ذلك الاول۔[26]

کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے اسی (مہلہل) نے طویل نظمیں کہیں فرزدق (شاعر) نے بھی کہا ہے اور مہلہل شعرا میں پہلا قصیدہ گو ہے۔

---

۲۱ جلال الدین سیوطی: المزہر جلد دوم ص ۳۲۸۔ ۲۲ ابن رشیق: العمدۃ جلد اول ص ۹۰۔ ۲۳ محمد بن سلام الجمحی: طبقات الشعراء ص ۱۸۔ ۲۴ محمد بن سلام الجمحی: طبقات الشعراء ص ۱۸۔ ۲۵ ابن قتیبۃ الدینوری: الشعر والشعراء ص ۱۲۔ ۲۶ ابن قتیبۃ الدینوری: الشعر والشعراء ص ۸۸۔

ابن قتیبہ الاغلب العجلی کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وھو اول من اطال الرجز۔ وکان الرجل قبله یقول البیت والبیتین اذا فاخر او شاتم۔[27]

رجز کو پہلے پہل طول دینے والے اغلب عجلی ہے۔ اس سے پہلے مفاخرت یا سب و شتم کے موقع پر شعر دو شعر کہہ لیے جاتے تھے۔

ابن رشیق القیروانی: (متوفی ۴۵۶ھ) العمدۃ میں تحریر فرماتے ہیں:

زعم الرواۃ ان الشعر کله کان رجزا وقطعاً وانه انما قصد علی عهد هاشم بن عبد مناف وکان اول من قصده مهلهل وامرؤ القیس۔[28]

"راویوں کا بیان ہے کہ عربی شاعری ابتداء میں تمام تر رجز یا قطعات پر مشتمل تھی۔ ہاشم بن عبد مناف کے عہد میں اسے قصیدے کی شکل دی گئی پہلے پہل مہلہل یا امرؤ القیس نے اسے قصیدے کا روپ دیا۔"

انھیں کا کہنا ہے:

واول من طول الرجز وجعله کالقصیدۃ الاغلب العجلی۔[29]

اغلب عجلی نے پہلے پہل رجز کو طول دیا اور اسے قصیدے کی شکل دی۔

اب ابن الاثیر (متوفی ۶۳۷ھ) کا بیان بھی ملاحظہ ہو۔ لکھتے ہیں:

والذی نقلته الاخبار وتواردت علیه ان العرب کانت تنظم المقاطیع فیما یعن من الحاجات ولم یزل الحال علی هذه الصورۃ الی عهد امرئ القیس وھو قبل الاسلام بمئة سنة زائداً فناقصاً۔ فقصد القصائد ثم تتابع المقصدون واختیر من القصائد تلک السبع التی علقت علی البیت۔ وانفتح للشعراء هذا الباب التقصید۔[30]

عام طور پر جو بات نقل کی جاتی ہے۔ اور جسے مختلف لوگوں نے پیش کیا ہے یہ ہے کہ عربوں کو جب بھی کوئی ضرورت پیش آتی۔ تو وہ قطعات نظم کیا کرتے تھے۔ یہ صورت حال اسلام آمد سے کم و بیش سو سال قبل امرؤ القیس کے عہد تک قائم رہی۔ تب کہیں جا کر لمبی لمبی نظمیں (قصیدے) کہی گئیں۔ اور یہی امرؤ القیس پہلا قصیدہ گو ہے پھر تو قصیدہ نگاروں کا تانتا بندھ گیا۔ اور بیت اللہ پر آویزاں کیے جانے والے ساتوں قصائد (طویل نظموں) کا انتخاب کیا گیا۔ اس طرح شعراء کے لیے قصیدہ گوئی کا دروازہ کھل گیا۔

ہم عصر ادیبوں میں احمد حسن الزیات اپنی "تاریخ الادب العربی" میں لکھتے ہیں:

والمظنون ان العرب خطوا من المرسل الی السجع ومن السجع الی الرجز۔ ثم تدرجوا من الرجز الی القصید۔[31]

اندازہ یہ ہے کہ عربوں نے نثر مرسل سے نثر مسجع کی طرف قدم بڑھایا۔ نثر مسجع سے رجز تک پہنچے۔ پھر رفتہ رفتہ ان کی رسائی رجز سے قصیدے تک ہو گئی۔

غالباً اب یہ بات پوری طرح صاف ہو چکی کہ عربی شاعری اپنے تدریجی ارتقاء کے لحاظ سے تین حصوں میں منقسم ہے: رجز، قطعات، اور قصائد ——— چنانچہ اس لحاظ سے شاعروں کی تین قسمیں بھی کی گئی ہیں: راجز، مقطع، اور مقصد۔ راجز کا استعمال تو خیر بہت عام ہے۔ مقطع اور مقصد کا استعمال ابن رشیق کی اس عبارت میں موجود ہے۔

---

[27] ابن قتیبۃ الدینوری: الشعر والشعراء۔ ص ۱۴۴۔ [28] ابن رشیق: العمدۃ جلد اول۔ ص ۱۸۹۔ [29] ابن رشیق: العمدۃ جلد اول۔ ص ۱۸۹۔
[30] ابن الاثیر: المثل السائر فی ادب الکاتب والشاعر۔ ص ۳۱۱۔ [31] احمد حسن الزیات: تاریخ الادب العربی۔ ص ۲۸۔

فرماتے ہیں:

لانکادتری مقطعاً اِلا — عموماً مقطع (قطعہ نگار)
عاجزاً عن التطویل۔ — تطویل سے عاجز ہوتا ہے۔
والمقصد ایضاً قد — اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے
یعجز عن الاختصار۔[32] — کہ مقصد (قصیدہ نگار)
اختصار پر قدرت نہیں رکھتا۔

آگے لکھتے ہیں:

والشاعر اذا قطع — جب شاعر قطعات، قصائد
وقصد ورجز فھو ا — اور رجز میں سے ہر ایک
الکامل۔[33] — نظم کرلے تو وہ کامل کہلاتا ہے۔

اس بات کے اطمینان کے لیے کہ "قصیدہ" کی اصطلاح اصلاً رجز و قطعات ہی کے مقابل وضع کی گئی ہے۔ چند اور اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں:

ابن سلام الجمحی (متوفی ۲۳۲ھ) نے اپنے "طبقات الشعرا" میں ایک جگہ لکھا ہے:

وکتب عمر الی عامل — حضرت عمرؓ نے اپنے عامل کو
ان سل لبید والاغلب — لکھ بھیجا کہ لبید اور اغلب
ما احدثا من الشعر فی — سے پوچھو کہ اسلام کی آمد کے
الاسلام۔ فقال الاغلب: — بعد ان کا تازہ کلام کیا ہے؟
اَرَاجزاً سألت ام — تو اغلب نے جواب میں کہا:
قصیداً فقد سألت — آپ رجز چاہتے ہیں یا قصیدہ؟
ھنیاً موجوداً۔[34] — جو کچھ چاہتے ہیں بسہولت
مہیا ہے موجود ہے۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

وکان ابوالنجم ربما — کبھی ابوالنجم قصیدہ بھی کہتا
قصد فاجاد ولم یکن — تو خوب کہتا۔ وہ دوسرے
کغیرہ من الرجاز۔[35] — رجز گو شعراء کی طرح نہیں تھا۔

ابوتمام کے بارے میں ابن خلکان (متوفی ۶۸۱ھ) اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں:

فقد ذکروا ان اباتمام — بیان کیا جاتا ہے کہ ابوتمام مولف
صاحب کتاب الحماسة — کتاب حماسہ کو عربی شاعری
کان یحفظ من اشعار — سے قصائد اور قطعات کے
العرب ۱۴۰۰۰ ارجوزة — علاوہ چودہ ہزار تو صرف
غیر القصائد والمقاطیع۔[36] — رجز حفظ تھے۔

علامہ زمخشری (متوفی ۵۳۸ھ) نے "اساس البلاغۃ" میں لکھا ہے:

شعر مقصد ومقطع — شاعری بشکل قصیدہ ہوتی
ولم یجمع فی المقطعات — ہے۔ اور بشکل قطعہ۔ قطعات
مثل ما جمع ابوتمام — کا بہترین مجموعہ وہ ہے جسے
ولا فی المقصدات — ابوتمام نے پیش کیا ہے۔ اور
کما جمع المفضل۔[37] — قصائد کا بہترین مجموعہ وہ ہے
جسے مفضل نے ترتیب دیا ہے۔

اب اگر رجز، قطعات، اور قصائد کی تاریخ اور ان کی تقابلی حیثیت کو ذہن میں رکھتے ہوئے اہل لغت سے رجوع کیا جائے تو "قصیدے" کی تعریف کے سلسلے میں ان کے بیانات کی معنویت پوری طرح ہم پر منکشف ہو سکتی ہے:

مجدالدین فیروز آبادی (متوفی ۸۱۷ھ) اور ابن منظور (متوفی ۷۱۱ھ) نے قصیدے کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

القصید ما تم شطر — قصیدہ وہ ہے جس کے ابیات
ابیاتہ۔[38] — کے نصف اجزا حذف نہ

---

32 ابن رشیق: العمدة - جلد اول - ص ۱۸۹ ۔ 33 ابن رشیق: العمدة - جلد اول - ص ۱۸۹ ۔ 34 محمد بن سلام الجمحی: طبقات الشعراء ص ۴۹ ۔ 35 محمد بن سلام الجمحی: طبقات الشعراء - ص ۱۹ ۔ 36 ابن خلکان: وفیات الاعیان: جلد اول - ص ۱۲۱ ۔ 37 جار اللہ زمخشری: اساس البلاغۃ - جلد دوم - ص ۲۵۵ ۔ 38 مجدالدین فیروز آبادی: القاموس المحیط - جلد اول - ص ۳۲۹ ۔

کیے گئے ہوں۔

محض ایک لفظ کی معمولی اختلاف کے ساتھ یہی الازھری سے بھی منقول ہے:

القصید ما تم شطراً
بنیتہ [۱۷]

قصیدہ وہ ہے جس کے ارکان کے نصف اجزا حذف نہ کیے گئے ہوں۔

ابوالحسن الاخفش (متوفی ۲۱۵ھ) فرماتے ہیں:

القصید من الشعر ھو
الطویل والبسیط التام
والکامل التام والمدید
التام والوافر التام
والرجز التام والخفیف
التام [۱۸]

قصیدہ وہ کلام منظوم ہے۔ جس کا تعلق بحر طویل، بحر بسیط تام، بحر کامل تام، بحر مدید تام، بحر وافر تام، بحر رجز تام اور خفیف تام سے ہو۔

(عروضیوں کی اصطلاح میں تام وہ بیت ہے جس میں دائرہ کے تمام اجزا موجود ہوں)

ابن جنی (متوفی ۳۹۲ھ) کا بیان ہے:

ان ماتم من الشعر و
توفر آثر عندھم واشد
تقدما مما قصر واختل
فسموا ما طال ووفر
قصیدا [۱۹]

وہ شاعری جو مکمل اور بھرپور ہو۔ عربوں کے نزدیک ناقص اور ادھوری شاعری کے مقابلے میں زیادہ پسندیدہ اور زیادہ باوقعت تسلیم کی جاتی ہے۔ اس لیے وہ طویل اور مکمل شاعری کو قصیدہ کہتے ہیں۔

صاف ظاہر ہے کہ قصیدے کی یہ تمام تعریفات "اراجیز" کو پیش نظر رکھ کر کی گئی ہیں۔ کیونکہ "اراجیز" ناقص اور اکہرے ہوتے ہیں اور اس میں دائرہ کے نصف یا اس سے بھی زائد اجزا حذف کر دیے جاتے ہیں۔ پھر اپنی ابتدائی تاریخ کے لحاظ سے اختصار بھی ان کا لازمی وصف تھا۔ اس کے برخلاف قصائد کامل، دوہرے اور طویل ہوتے ہیں۔

دوسری طرف قطعات کو مدنظر رکھ کر بھی "قصیدے" کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوششیں کی گئی ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے اخفش کی رائے اور اس پر ابن جنی کا تبصرہ ملاحظہ ہو:

قال ابوالحسن الاخفش
ولیست القصیدۃ الا
ثلثۃ ابیات، قال ابن
جنی: وفی ھذا القول
من الاخفش جواز و
ذلک تسمیۃ ما کان
ثلاثۃ ابیات قصیدۃ
قال: والذی فی العادۃ
ان یسمی ما کان علی
ثلاثۃ ابیات او عشرۃ
او خمسۃ عشر قطعۃ
فاما ما زاد علی ذلک
فانما تسمیۃ العرب
قصیدۃ [۲۰]

ابوالحسن اخفش نے کہا کہ قصیدہ تین اشعار پر مشتمل نظم کو ہی کہتے ہیں۔ ابن جنی کہتے ہیں کہ اخفش کا متذکرہ بالا بیان حقیقت سے متجاوز اور مجاز پر محمول ہے۔ عرف یہی ہے کہ تین یا دس یا پندرہ اشعار والی نظم کو قطعہ کہتے ہیں۔ اور جو اس سے زائد ہو۔ عرب اسے قصیدہ کا نام دیتے ہیں۔

مجد آبادی نے اختصار کے ساتھ اخفش اور ابن جنی کے اقوال کو جمع کر دیا ہے، فرماتے ہیں:

ولیس الا ثلاثۃ ابیات
فصاعدا او ستۃ عشر
فصاعدا [۲۱]

(قصیدہ) وہ ہے جس کے اشعار کی کم از کم تعداد تین اور اس سے زائد یا سولہ اور اس سے زائد ضرور ہو۔

---

[۱۷] ابن منظور: لسان العرب جلد سوم۔ ص ۳۵۴۔ [۱۸] ابن منظور: لسان العرب جلد سوم۔ ص ۳۵۵۔ [۱۹] لسان العرب جلد سوم۔ ص ۳۵۴۔
[۲۰] لسان العرب جلد سوم۔ ص ۳۵۵۔ [۲۱] مجد فیروز آبادی۔ القاموس المحیط جلد اول۔ ص ۳۲۹۔

امام راغب اصفہانی (متوفی ۵۰۲ھ) نے درمیان کی راہ اختیار کی۔ فرماتے ہیں:

القصید من الشعر ما تم سبعة ابیات[۴۴] (الف)	قصیدہ وہ ہے جو مکمل سات اشعار پر مشتمل ہو۔

ابن رشیق بھی اصلاً اصفہانی کا ساتھ دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

اذا بلغت الابیات سبعة فهی قصیدة۔ ومن الناس من لا یعد القصیدة الا ما بلغ العشرة وجاوزها ولو ببیت واحد[۴۵]	جب اشعار کی تعداد سات تک پہنچ جائے تو اسے قصیدہ کہیں گے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ قصیدہ وہ ہے جس کے ابیات کی تعداد دس سے متجاوز ہو۔ خواہ ایک ہی شعر زائد ہو۔

صاحب المنجد نے بھی انھیں اقوال کی خوشہ چینی کی ہے لکھا ہے:

القصید من الشعر ما کان من ثلاثة ابیات فصاعدا وقالوا: من ستة عشر وصاعدا[۴۶]	قصیدہ وہ نظم ہے جو تین شعر یا اس سے زائد پر مشتمل ہو۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ نہیں بلکہ سولہ[۱۶] اور اس سے زائد پر مشتمل ہو۔

بات اپنی جگہ مکمل ہو چکی اور عربی قصیدے کی معنویت بھی پوری طرح روشن ہو چکی لیکن نامناسب معلوم ہوتا ہے کہ عرب لغویوں اور نقادوں کے بیانات کے ساتھ ساتھ یہاں اردو کا بھی ایک اقتباس پیش کر دیا جائے۔ تاکہ عربی قصیدے کے اصطلاحی مفہوم کے سلسلے میں اردو داں طبقے کے اندازِ فکر کی ایک جھلک سامنے آجائے۔

ڈاکٹر محمود الٰہی لکھتے ہیں:

قیاس کہتا ہے کہ جب اصطلاحِ قصیدہ وضع ہوئی ہوگی۔ تو اس کا اطلاق ایک شعر پر بھی کیا گیا ہوگا۔ اور اس سے زیادہ پر بھی۔ لیکن بہت جلد اس کے اصطلاحی مفہوم میں ایک اور شرط لگا دی گئی۔ وہ ہے اشعار کی اقل (کم از کم) تعداد کی۔[۴۷] ع

ببیں تفاوت رہ از کجا است تا بہ کجا

اصطلاحِ قصیدہ کی اصلیت و ماہیت تو سامنے آچکی۔ آیئے اب اس کی اصل اور وجہ تسمیہ پر بھی غور کر لیں۔

قصیدے کی اصل اور وجہ تسمیہ یعنی لغوی معنوں کے درمیان وجہ مناسبت کے سلسلے میں اردو نقادوں اور محققوں نے اپنی جانب سے کچھ کہنے کے بجائے عام طور پر فارسی زبان دانوں (ہندی و ایرانی) کی تقلید کی ہے۔ اور عربی مراجع و مآخذ سے براہ راست استفادہ نہ کرنے کی وجہ سے انھوں نے یہاں بھی ٹھوکر کھائی ہے۔

لفظ قصیدہ کی اصل و اشتقاق کے بارے میں پہلی بات تو یہ کہی گئی ہے کہ اصطلاحی قصیدے کی اصل لغوی قصیدہ ہے۔ جس کے معنی "مغز فربہ" یا "دل دار گودے" کے ہیں، چنانچہ صاحب "غیاث اللغات" لکھتے ہیں:

"قصیدہ در لغت مغزِ سطبر و غلیظ"۔[۴۸]

ان کی تقلید میں جلال الدین احمد جعفری نے "تاریخ قصائد اردو"[۴۹] میں۔ اور سید عابد علی عابد نے اصول انتقاد ادبیات[۵۰] میں اسی تعریف کو دُہرایا ہے ——— "ڈاکٹر ابو محمد سحر نے بھی" اردو میں قصیدہ نگاری[۵۱] میں دوسرے اقوال کے ساتھ اس قول کا بھی حوالہ دیا ہے۔ اس کے مطابق لغوی و اصطلاحی معنوں کے سلسلے میں دو طرح کی باتیں کہی جا سکتی ہیں۔ ان کا بیان جعفری صاحب کی زبانی سنیے:

"وجہ تسمیہ یہ بتائی جاتی ہے کہ چونکہ اس میں ایسے مضامین

---

[۴۴] حسین بن محمد الراغب الاصفہانی مفردات القرآن۔ ص ۴۱۴۔ [۴۵] ابن رشیق العمدہ جلد اول۔ ص ۱۸۸۔ [۴۶] لویس معلوف: المنجد، ص ۶۳۲۔ طبع بیروت ۱۹۵۶ء۔ [۴۷] ڈاکٹر محمود الٰہی: اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ۔ ص ۳۲۔ [۴۸] مولانا غیاث الدین رام پوری: غیاث اللغات ص ۳۴۱ (مادہ قصد) [۴۹] جلال الدین احمد جعفری: تاریخ قصائد اردو۔ ص ۱۱ بحوالہ اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ۔ [۵۰] سید عابد علی عابد: اصول انتقاد ادبیات۔ ص ۴۲۹۔ [۵۱] ڈاکٹر ابو محمد سحر: اردو میں قصیدہ نگاری۔ ص ۱۱۔

عالی و کثیر مندرج کیے جاتے ہیں، جو طبعی مذاق کے لیے لذت بخش ہوتے ہیں، (۲) واسطے اس کو قصیدہ کہتے ہیں یا یہ کہ باعتبار معنی و مضمون دوسری اصناف سخن میں ممتاز ہے۔ جس طرح کہ تمام اعضاء میں سر اور مغز سر ممتاز اور نمایاں ہے۔ اس مناسبت سے اس کو مغز سمجھ کر "قصیدہ" کہا گیا[52]۔

لیکن ڈاکٹر محمود الٰہی قصیدے کی متذکرہ بالا اصل سے متفق نہیں۔ لکھتے ہیں:

"لغات میں "قصیدہ" مغز سطبر یا دل دار گودے کے معنی میں مشہور و مستعمل ہے۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ قصیدہ باعتبار معنی و مضمون دوسری اصناف سخن سے ممتاز ہے لیکن سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ عرب میں جس وقت اور جس جگہ یہ لفظ وضع کیا گیا تھا۔ وہاں قصیدے کے علاوہ اور کون کون سی اصناف سخن رائج تھیں۔ جن کا یہ مغز ہوتا"[53]

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب موصوف کے خیال میں چونکہ زمانہ جاہلیت میں عربی شاعری صرف قصیدہ نامی صنف سخن میں دائر و سائر تھی۔ اس لیے مغز سخن والی مناسبت درست نہیں۔ لیکن گزشتہ صفحات میں ایسے متعدد اقوال نقل کیے جا چکے ہیں۔ جن سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ عربی شاعری میں قدیم سے ہی متعدد اصناف موجود تھیں۔ ہاں اس وجہ تسمیہ پر واقعی اگر کوئی اعتراض وارد ہو سکتا ہے تو یہی کہ اس کی بنیاد یہ مفروضہ ہے کہ لفظ قصیدہ عربی میں کسی صنف سخن کا نام ہے۔ حالانکہ یہ اصطلاح وہاں کسی اور ہی معنی میں مستعمل ہے۔

اس سلسلے میں دوسری رائے یہ پیش کی جاتی ہے کہ قصیدہ یا قصید ہم معنی الفاظ ہیں۔ اور ان کی اصل لفظ قصد ہے۔ جس کے لغوی معنی ہیں قصد کرنے ارادہ کرنے اور متوجہ ہونے کے۔ لہٰذا قصید یا قصیدہ مقصود و مراد کے معنی میں ہے۔ کیونکہ فعیل کا وزن عربی میں مفعول کے معنی میں بھی مستعمل ہوتا ہے۔ مثلاً قتیل بمعنی مقتول۔ ذبیح بمعنی مذبوح اور جریح بمعنی مجروح وغیرہ فارسی و اردو والوں کی اکثریت کا رجحان اسی رائے کی طرف ہے۔ چنانچہ شمس قیس رازی نے "المعجم فی معاییر اشعار العجم" میں[54] فائز "خطبہ کلیات" میں[55]۔ سید احمد علی نے "فرہنگ آصفیہ" میں[56]۔ اور ڈاکٹر محمود الٰہی نے "اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ" میں[57]۔ اسی کو اختیار کیا ہے کہ قصیدہ قصد سے مشتق ہے۔ اس قول کے مطابق جو وجہ مناسبت بیان کی جاتی ہے۔ اسے ڈاکٹر ابو محمد سحر کے الفاظ میں سنیے:

"موخر الذکر لغوی معنی کی یہ مناسبت بیان کی جاتی ہے کہ اس صنف سخن میں مدح یا ذم یا کسی اور مضمون کی طرف رجوع کرنا ہی مقصود شعرا تھا[58]۔ بعینہ یہی بات شمس قیس اور فائز نے بھی کہی ہے۔ ملاحظہ ہو:

"مقصود شاعر است با یراد معانی مختلف و اوصاف مختلف متفرق از مدح و ہجا و شکر و شکایت وغیر آں"[59]

"مقصود شاعر است با یراد معانی مختلف و ذکر اوصاف مختلف از مدح و ہجا و غیر آں"[60]

اگر یہ وجہ مناسبت تسلیم کر لی جائے تو سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر شاعر قصیدے میں بعض معانی یا موضوعات کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ تو کیا وہ قطعات یا رجز میں بلا معانی و موضوعات کے ہی شاعری کرتا ہے۔ یا غزلیات و مثنویات میں اسے معانی و موضوعات کی حاجت نہیں رہ جاتی۔ اگر وہ کسی جگہ ان سے بے نیازی نہیں برت سکتا تو یہ توجیہہ بھی بے معنی ہے۔

---

۵۲ جلال الدین احمد جعفری: تاریخ قصائد اردو۔ ص ۱۱ بحوالہ سابق۔ ۵۳ ڈاکٹر محمود الٰہی: اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ۔ ص ۲۹ ۵۴ شمس قیس رازی: المعجم فی معاییر اشعار العجم۔ ص ۱۵ بحوالہ ڈاکٹر محمود الٰہی۔ ۵۵ فائز: خطبۂ کلیات بحوالہ ڈاکٹر محمود الٰہی۔ ۵۶ سید احمد علی: فرہنگ آصفیہ جلد سوم ص ۲۰۔ ۵۷ ڈاکٹر محمود الٰہی: اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ۔ ۵۸ ڈاکٹر ابو محمد سحر: اردو میں قصیدہ نگاری۔ ص ۱۳۔
۵۹ بحوالہ ڈاکٹر محمود الٰہی: اردو قصیدہ نگاری کا جائزہ۔ ۶۰ بحوالہ ڈاکٹر محمود الٰہی: اردو قصیدہ نگاری۔ ص ۴۰۔

ڈاکٹر محمود الٰہی نے وجہ مناسبت کے سلسلے میں ایک نئی بات کہی ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ چونکہ عرب نقادوں کی ایک بڑی اکثریت نے شاعری کے لیے موزونیت کے علاوہ قصد و ارادہ کی بھی شرط لگائی ہے۔ اس لیے انھوں نے قصیدہ رکھ کر گویا اس حقیقت کی طرف اشارا کیا ہے کہ قصیدہ اسی وقت قصیدہ کہلائے گا۔ جب شاعر نے مقصد و ارادہ کے ساتھ اسے نظم کیا ہو۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس کی بھی وضاحت کر دی ہے کہ قصد و ارادہ کی شرط ان نقادوں نے اس لیے لگائی کہ پیغمبر اسلام نے ایک بار چند فقرے کہے۔ جو بظاہر دو مصرعوں کی صورت میں تھے۔ یہ مصرعے بامعنی بھی تھے۔ اور موزوں و مقفیٰ بھی[61]۔ اب اگر یہ کہہ دیا جاتا کہ آپ کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے یہ فقرے شعر تھے۔ تو آپ شاعر ٹھہرتے۔ حالانکہ قرآن نے صاف لفظوں میں اعلان کر دیا ہے "وما انت بشاعر" (آپ شاعر نہیں) اب درمیان کی راہ یہی تھی کہ یہ کہہ دیا جائے کہ چونکہ اس کے کہنے میں آپؐ کے مقصد و ارادہ کا دخل نہ تھا۔ اور شاعری کے لیے قصد ضروری ہے۔ اس لیے وہ فقرے شعر نہیں۔ اور آپؐ شاعر نہیں۔

اس توجیہ میں جدت و ندرت بھی ہے۔ اور خوبی و حسن بھی۔ لیکن سب سے بڑی قباحت یہ ہے کہ پھر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اصطلاح قصیدہ زمانۂ اسلام میں وضع کی گئی نہ کہ زمانۂ جاہلیت میں۔ حالانکہ ڈاکٹر صاحب خود ہی لکھتے ہیں۔ اور جاہلیت میں اس (قصیدہ) کا استعمال جاری و ساری تھا[62]۔

اصل بات یہ ہے کہ عربی قصیدے کی اصطلاح کو غلط مفہوم پہنانے کی وجہ سے اس کی وجہ تسمیہ اور لغوی و اصطلاحی معنوں میں بڑی حد تک غلاف واقع رہی۔ وجہ مناسبت ایسی ہونی چاہیے جو قصیدے کے عربی مفہوم کا ساتھ دے سکے اور عربی زبان و ادب کی تاریخ نیز لغت کی کتابوں سے اس کی تصدیق ہو سکے۔

"قصیدے" کو رجز و قطعات دونوں کا تقابل تسلیم کیا جائے۔ یا محض قطعات کا بہر صورت وہ "قصیدہ" بمعنی مغز غلیظ و شتر فربہ سے بھی مشتق ہو سکتا ہے۔ اور "قصد" بمعنی ارادہ و توجہ کو بھی اس کی اصل قرار دینے میں کوئی قباحت نہیں۔ بہر صورت وجہ مناسبت یہ بیان کی جا سکتی ہے کہ:

چونکہ وہ طویل و مکمل نظمیں جن میں منزل حبیب کا والہانہ ذکر کیا جاتا، تشبیب و نسیب کے مضامین باندھے جاتے، سواری یعنی اونٹنی اور گھوڑے کا سراپا پیش کیا جاتا۔ اور عہد شباب پر حسرت کے آنسو بہائے جاتے۔ ان مختصر نظموں کے مقابلے میں جو چند ابیات یا چند اکہرے مصرعوں پر مشتمل ہوتی تھیں۔ اور جن میں مندرجہ بالا مضامین نظم نہیں کیے جاتے تھے۔ شاعر سے نسبتاً زیادہ توجہ کی طالب ہوتیں۔ اور مزید ترتیب و تہذیب کی متقاضی ہوتیں۔ پھر رجز و قطعات کے مقابلے میں ان میں حسن و دل آویزی اور خوبی و عمدگی کا وہی تناسب ہوتا جو ایک عام اونٹنی اور موٹی بھاری اونٹنی یا عام گودے اور دل دار گودے میں ہوا کرتا ہے۔ اس لیے الگ الگ یا بیک وقت سبھی معانی کی رعایت کرتے ہوئے قطعات کے بالمقابل انھیں قصائد کا نام دیا گیا۔

اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو لفظ "قصیدہ" ایک استعارہ ہے۔ حسین و دل آویز کلام کا۔ کثرت استعمال کی بنا پر مشبہ حذف کر کے مشبہ بہ اس کی جگہ استعمال کرنے لگے۔ یہ مناسبت قرین قیاس اس لیے بھی ہے کہ اہل ادب کی تصریح کے مطابق عرب کلام بلیغ و فصیح کے لیے کلام سمین و فربہ کا استعارہ عام طور پر استعمال کرتے ہیں۔ قصیدے کے حسن کی ہی وجہ سے لفظ "قصیدہ" کے ایک معنی "شعر پاکیزہ و نیکو" بامرتب و مہذب نظم کے بھی بیان کیے گئے ہیں۔

اس وجہ مناسبت کی تصریح ابن منظور (متوفی ۷۱۱ھ) نے "لسان العرب" میں کی ہے:

قیل سمی قصید الان	کہا گیا ہے کہ قصیدہ کو چونکہ
قائلہ احتفل لہ	قصیدے کے لیے اہتمام کرتا

---

[61] ڈاکٹر محمود الٰہی: اردو قصیدہ نگاری۔ ص ۳۰۔ [62] ڈاکٹر محمود الٰہی: اردو قصیدہ نگاری۔ ص ۳۲۔

فتتحه باللفظ الجيد والمعنى المختار۔ واصل من القصيد وهو المخ السمين والعرب تستعير السمن فى الكلام الفصيح۔ فتقول هذا كلام سمين اى جيد وقالوا شعر قصد اذ انقح وجود وهذب[٦٣]۔

ہے۔ اور عمدہ الفاظ و معانی کی مدد سے اسے مہذب و منقح بناتا ہے۔ اس لیے اسے قصیدہ کہتے ہیں۔ اس کی اصل "قصید" بمعنی مغز غلیظ ہے۔ عرب کلام فصیح کے لیے سمین و غلیظ کا استعارہ استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ "یہ شعر مقصد ہے جبکہ وہ منقح و مہذب اور پاکیزہ ہو۔

یہ وجہ مناسبت تو اس صورت میں تھی جب قصیدہ کی اصل "قصد" بمعنی مغز غلیظ کو ٹھہرایا جائے۔ دوسری صورت جبکہ اس کی اصل "قصد" بمعنی ارادہ یا توجہ و التفات کو قرار دیا جائے تو اس کی توجیہ ابن منظور (متوفی ٧١١ھ) ہی کے الفاظ میں یہ ہوگی۔ فرماتے ہیں:

وقيل سمى الشعر التام قصيدا۔ لان قائله حبل من باله۔ فقد له قصدا، ولم يحتسه حسيا۔ على ماخطر بباله۔ وجرى على لسانه على روى فيه خاطره۔ واجتهد فى تجويده۔ ولم يقضبه اقتضابا فهو فعيل من القصد وهو الام[٦٤]۔

بیان کیا گیا ہے کہ مکمل اشعار کو قصیدہ اس لیے کہتے ہیں کہ اس کا قائل دل لگا کر اس کی تخلیق کرتا ہے۔ چنانچہ اس کے لیے فکر و اہتمام کرتا ہے۔ ایسا نہیں کہ جو خیال اس کے دل میں گذر جائے اور جو الفاظ بھی اس کی زبان پر جاری ہو جائیں۔ انھیں بلا تکلف قبول کر لے۔ بلکہ خوب غور و فکر سے کام لیتا ہے۔ اور اسے عمدہ بنانے کی پوری جد و جہد کرتا ہے۔ بدیہہ گوئی نہیں کرتا۔ لہٰذا یہ قصد بمعنی ارادہ سے مشتق ہے۔ اور مقصود و مراد کے معنی میں ہے۔

ابن منظور ہی یہ بھی نقل کرتے ہیں:

قال ابن جنى: سمى قصيدا لانه قصد واعتمد[٦٥]۔

ابن جنی کا کہنا ہے کہ اسے قصیدہ اس لیے کہتے ہیں کہ وہ مقصود اور مرکز توجہ ہوتا ہے۔

مقصود و مراد ہونے کی ایک توجیہ رجز کو پیش نظر رکھ کر کی گئی ہے چنانچہ ابن درید الازدی (متوفی ٣٢١ھ) "جمہرۃ اللغۃ" میں لکھتے ہیں:

القصيد من الشعر اخذ من القصد لتوالى الكلام وصحت وزنه[٦٦]

شعری قصیدہ در اصل قصد سے ماخوذ ہے۔ اسے یہ نام کلام کے تسلسل اور وزن کی صحت کی بنا پر دیا گیا ہے۔

علامہ مرتضیٰ زبیدی بلگرامی (متوفی ١٢٠٥ھ) نے بھی اسے نقل کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

سمى بذلك لكمال وصحت وزنه[٦٧]

تکمیل اور صحت وزن کے پیش نظر اسے قصیدہ کہتے ہیں۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ لغت و ادب کی کتابوں میں کچھ ایسے شواہد بھی ملتے ہیں۔ جن سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اہل عرب رجز و قطعات والی شاعری کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے چنانچہ رجز کے بارے میں خلیل بن احمد کا خیال ہے کہ:

ان الرجز ليس بشعر وانما هو انصاف ابيات او اثلاث[٦٨]

رجز شاعری نہیں وہ یا تو نصف بیت ہے یا ثلث بیت۔

---

٦٣ ابن منظور: لسان العرب - جلد سوم - ص ٣٥٤ - ٦٤ ابن منظور: لسان العرب - جلد سوم - ص ٣٥٤ - ٦٥ ابن منظور: لسان العرب - جلد سوم - ص ٣٥٤ - ٦٦ ابن درید الازدی: جمہرۃ اللغۃ - جلد دوم - ص ٢٠٤ - ٦٧ علامہ مرتضیٰ زبیدی بلگرامی: تاج العروس - جلد نہم ص ٣٩ طبع جدید تحقیق عبدالستار احمد فراج - ٦٨ ابن رشیق: العمدة، جلد اول - ص ١٨٥ -

اسی طرح قطعہ گو شعرا کو شاعر اور قطعات کو شاعری سمجھنے میں بھی عربوں کو کچھ تامل ہی تھا۔ اس کے برخلاف جب قصائد نظم کیے جانے لگے۔ تو ہر قبیلہ اس بات کا دعوی دار بن کر کھڑا ہو گیا کہ سب سے پہلا قصیدہ نگار اس قبیلے کا ایک فرد ہے۔ اور اس کا فیصلہ دشوار ہو گیا کہ حقیقت میں شرفِ اولیت کسے حاصل ہے؟ چنانچہ جلال الدین سیوطی (متوفی سنہ ۹۱۱ھ) نے المزھر میں عمرو بن شبہ کے حوالے سے نقل کیا ہے:

ادعت القبائل کلہا — تمام قبائل اس بات کے دعوی دار
قبیلۃ لشاعرھا انہ — بن گئے کہ اس کا شاعر ہی
الاول ولم یدعوا — پہلا شاعر ہے۔ یہ دعوی دو
ذلک لقائل البیتین — تین شعر نظم کرنے والے
والثلاثۃ۔ لانہم — شاعروں کے بارے میں
لا یسمون ذلک شعرا[۹۹] — نہیں تھا۔ کیونکہ وہ ایسی
شاعری کو شاعری کہتے ہی نہیں۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ قصائد کی شکل میں جب طویل نظموں کا آغاز ہوا تو عربی شعر و ادب کی دنیا میں ایک انقلاب سا آ گیا۔ ایک نمایاں تبدیلی محسوس کی گئی۔ اور شعر گوئی کے میدان میں پیش رفت کا اندازہ ہوا۔ اسی احساس کے پیشِ نظر ان نئی نظموں کو ایسا نام دینے کی فکر دامن گیر ہوئی جو ان کی خوبی و عمدگی کی طرف اشارہ کر سکے۔ اہلِ عرب جو بادیہ نشین اور اونٹوں کے گوشت پر گذر بسر کرنے والے تھے۔ ان کے نزدیک موٹی جوان اونٹنی یا موٹا دل دار گودا حسن و خوبی کی علامت تھا۔ اس لیے انھوں نے قصیدہ کا نام قصیدہ تجویز کر کے گویا اس کا حق ادا کر دیا۔ یا بالفاظ دیگر مقصود و مراد بنا کر دکھا دیا۔

رجز و قطعات کے مقابل قصائد کی عظمت و اہمیت اور عربوں کی نظر میں ان کے حسن و دل آویزی کے سلسلے میں ایک دلچسپ حقیقت جس کی طرف کم لوگوں کی نگاہ گئی یہ بھی ہے کہ عرب شعرا (قدما ہوں یا متاخرین) فخر و تعلی، وعد و وعید، عذر و معذرت وغیر مواقع پر جب بھی اپنی شاعری کا حوالہ دیتے ہیں۔ تو ہمیشہ "قصیدہ" ہی کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ رجز و قطعات کا ذکر کبھی نہیں کرتے اس سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ شاعری کی جھلک انھیں صحیح معنوں میں قصائد ہی میں نظر آتی تھی۔ اس کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

مسیب بن علس، مشہور جاہلی شاعر اعشی کا ماموں ہے۔ قعقاع بن معبد سے خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے:

فلأھدین مع الریاح قصیدۃ — میں ہواؤں کے دوش پر قعقاع کی جانب
منی مغلغلۃ الی القعقاع — ایک غلغلہ انداز قصیدہ روانہ
انت الذی زعمت معد انہ — کرنے والا ہوں۔ (اے قعقاع)
اھل التکرم والندی والباع — تمہارے ہی بارے میں بنو معد کا
خیال ہے کہ تم اہلِ جود و سخا اور صاحبِ دست و بازو ہو۔

عدیل بن فرخ العجلی کا شعر ہے:

سأھدی الی قیس بن سعد قصیدۃ — میں قیس بن سعد کی طرف ایک ایسا
متی ما تلاق العظم تترك کسرا — قصیدہ روانہ کرنے والا ہوں کہ وہ
جب بھی ہڈیوں سے ملے گا تو ان پر شکستگی کے آثار چھوڑ جائے گا۔

ابو صخر الہذلی کہتا ہے:

ارانی اذا احدثت یوما — (اے ممدوح) میرا مشاہدہ ہے
قصیدۃ لغیرك لم یرفع — کہ آپ کے علاوہ کسی اور کے
بہا الصوت راکب — لیے میں جب بھی کوئی تازہ
قصیدہ لکھتا ہوں۔ تو کوئی سوار اسے بآوازِ بلند نہیں پڑھتا۔
(اسے قبولیت و شہرت نصیب نہیں ہوتی)۔

عمرو بن لجا التیمی اپنی معرکہ آرائیوں کا ذکر کرتا ہے:

جدعت رباحا بالقصائد — میں نے اپنے قصائد سے رباح

---

۹۹ جلال الدین السیوطی: المزہر جلد دوم۔ ص ۲۳۸۔ ۱۰۰ ابن قتیبۃ الدینوری: نے الشعر والشعراء میں ان اشعار کی نسبت کسی ایک معین شاعر کے بجائے غیر معین شعرا ہی کی جانب ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں: ولشغف تغلب۔ قال الشعرا۔ (اس قصیدے سے غایت شغف کی بنا پر شعرا نے کہا) ص ۳۰۔

بعد ما أوطئت جرميرا — کے ناک کان کاٹ لیے۔ اور اس
وطأة المتثاقل۔ — سے پہلے کسی بوجھل شخص کے
روندے جانے کی طرح جریر کو بھی روند چکا ہوں۔

راعی الابل فخریہ کہتا ہے:

فانی زعیم ان اقول — میں ایک آراستہ و پیراستہ
قصیدۃ محرۃ کا لنقب — قصیدہ کہنے کا دعوے دار
بین المخارم۔ — ہوں۔ جو بنی کوہ میں بھی
سوراخ کرنے والا ہوں۔

عمرو بن کلثوم کی وہ فخریہ نظم جو آج سبعہ معلقہ کا جزء ہے۔
کسی زمانہ میں بنو تغلب کے خاص و عام کی نوکِ زبان تھی۔ اُس
صورت حال کے خلاف شعرائ نے عار دلاتے ہوئے کہا۔

الهى بنى تغلب عن — قبیلہ تغلب کو تمام مکارم اخلاق
كل مكرمة قصيدة — سے عمرو بن کلثوم کے ایک
قالها عمرو بن كلثوم — قصیدے نے غافل کر رکھا
يفاخرون بها مذ كان — ہے۔ وہ روز اول سے اس
اولهم يا للرجال لشعر — پر فخر کرتے چلے آرہے ہیں۔
غير مسئوم۔ — اے لوگو! کیسی نہ اکتا دینے
والی شاعری ہے۔

متنبی کے بھی دو شعر سنتے چلیے۔ ایک جگہ کہتا ہے:

خلیلی انی لا أری غیر شاعر — دوستو! مجھے ہر طرف شاعر ہی نظر

فلم منهم الدعوى ومنى القصائد — آتے ہیں۔ تو پھر یہ کیا بات ہے کہ
دعویٰ وہ کریں۔ اور قصائد میں پیش کروں۔

اور دوسری جگہ کہا ہے:

وما الدهر الا من رواة قصائدی — زمانہ تو میرے قصائد کے راویوں میں
اذا قلت شعرا اصبح الدهر منشدا — ہے۔ میں جب بھی کچھ کہتا ہوں تو وہ
اسے گنگنانے لگتا ہے۔

ماحصل اس تمام ترد راز نفسی کا صرف اس قدر ہے کہ:

(۱) "قصیدہ" عربی زبان کا ایک اصطلاحی لفظ ہے، جو عربی کے علاوہ فارسی و اردو میں بھی مستعمل ہے۔ لیکن قصیدہ بمعنی صنف سخن فارسی و اردو کے ساتھ مخصوص ہے۔ عربی میں یہ اصطلاح ایک جداگانہ مفہوم رکھتی ہے، جس کے ساتھ ایک طرف طوالت اور دوسری طرف حسن و دل آویزی کا تصور وابستہ ہے۔ پھر یہ کہ اس کا استعمال فارسی و اردو میں غزل و مثنوی وغیرہ اصناف سخن کے مقابل ہوتا ہے۔ جبکہ عربی میں اس کا تقابل رجز و قطعات سے ہے۔ اور یہ تقابل بھی ابتدائی دور میں رہا بعد میں تو "قصیدہ" ہی سکۂ رائج الوقت بن گیا۔ اور اس طرح پوری عربی شاعری ہی قصیدہ کا مصداق بن گئی۔

(۲) "قصیدے" کی وجہ تسمیہ اور لغوی و اصطلاحی معنوں میں جو جو مناسبت تلاش کی گئی ہیں وہ نادرست ہیں۔ اس لیے کہ "قصیدے" کے عربی مفہوم سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔

★

بیگم حضرت محل

سیلانی سیوتے
دور درشن کیندر لکھنؤ

اے حریت کی روح رواں تجھ پہ صد سلام
تاریخ میں اودھ کی ہے اعلیٰ ترا مقام
جب بھی عدو کی فوج سے ٹکرائی تھی یہاں
ظلمت کدوں میں برق سی لہرائی تھی یہاں
جب تو چلی تو ساتھ ترے کارواں چلے
دشوار منزلوں پہ بھی کرتی گئی قیام
اے حریت کی روح رواں تجھ پہ صد سلام

جو دشمن وطن تھا اسیر کمند تھا
قربانیوں سے تیری ہی پرچم بلند تھا
سر دشمنوں کے سامنے جھکنے نہیں دیا
غیروں کے ہاتھ ملک کا بیچا نہیں نظام
اے حریت کی روح رواں تجھ پہ صد سلام
اے مادر وطن تری ہمت پہ زندہ باد
حضرت محل کی شانِ شجاعت پہ زندہ باد

نوشابہ اسلام
۵۴۵، اترسوئیا، الہ آباد۳

غیر متوازن افراد کا تجزیہ

سماج کے وسیع دائرے میں مختلف مزاج کے لوگ رہتے ہیں جو گوناگوں احساسات، متنوع خیالات، اور الگ الگ رجحانات کے مالک ہوتے ہیں۔ ہمارا معاشرہ ان انسانوں کے لیے ایک ایسا عملی میدان ہے۔ جہاں ایک دوسرے سے ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے ہر ایک کو اپنے کردار میں لوچ پیدا کرنا پڑتا ہے۔ اس لوچ اور باہمی سمجھوتے کے ساتھ سماج کا وسیع و عریض دائرہ ارتقائی منزلیں طے کرتا رہتا ہے۔

جب کسی انسان کے نزدیک ان باہمی سمجھوتوں کے تقاضے ختم ہو جاتے ہیں تو وہ سماجی قید و بند سے الگ ہٹ کر اپنی ایک ایسی دنیا خود بنالیتا ہے جہاں اس کے افعال اس دنیا کے مختلف زاویوں کو اپنے ایسے رنگ دیتے ہیں جنھیں ہم اپنے دائرے سے ایک الگ چیز تصور کرتا ہے اور یہیں سے ایسے غیر متوازن (ABNORMAL) افراد کی تشکیل ہوتی ہے۔ جو نارمل انسانوں کو دنیا سے الگ اپنی دنیا آپ بساتے ہیں۔

فرائڈ ان غیر متوازن افراد کی دنیا کو لاشعور کا پرتو سمجھتا ہے۔ جب تک انسان کا شعور بیدار ہوتا ہے تب تک وہ دوسروں کے ساتھ سمجھوتہ اور باہمی میل ملت رکھنا اپنا ایک فرض سمجھتا ہے۔ یہاں ان طبائع، ذہین اور تخلیقی صلاحیتوں کے افراد کا تذکرہ ضروری نہیں ہے جو باشعور ہونے کے باوجود باہمی سمجھوتے کا وہ مفہوم متعین نہیں کرپاتے جسے سماج میں نارمل انسان ضروری سمجھتے ہیں اور جس کی پابندیوں سے سوسائٹی وجود میں آتی ہے۔

یہاں بات ان انسانوں کے ذہنی پس منظر کی ہے جو صرف لاشعور کی محکوم ہوتی ہے۔ یہ لاشعوری انسان، دوسرے لاشعور کے محکوم انسان سے سمجھوتا نہیں کرپاتا کیونکہ اس کی دنیا اپنے آپ میں سمٹ جاتی ہے جہاں صرف تنہا وہ رہتا ہے دوسرا نہیں۔

یہ لاشعور مختلف طریقوں سے انسانوں پر حاوی ہوتا ہے۔ لاشعور میں انسانوں کے اپنے ہی تجربات، احساسات ہوتے ہیں جنھیں وہ یکسر بھول جاتے ہیں۔ یہاں انسان کی ایسی پیچیدہ خواہشات ہوتی ہیں جنھیں وہ اپنے لاشعور کی مدد سے ایسے اندھیرے خانوں میں ڈھکیل دیتا ہے جس کا پتہ وہ خود نہیں پاتا۔ لیکن یہ احساسات مختلف طریقوں سے اس پر حاوی ہونے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ جب تک یہ ناکام ہوتے رہتے ہیں تب تک انسان سماج کے باہمی سمجھوتوں کو سمجھتا رہتا ہے اور جب یہ حاوی ہو جاتے ہیں تو سماج سے ربط باہمی ختم ہو جاتا ہے اور پھر انسان ایک ایسے حصار میں محدود ہو جاتا ہے جہاں وہ تنہا اور بالکل الگ تھلگ رہ جاتا ہے۔

ان انسانوں میں بھی دو قسمیں ملتی ہیں ایک وہ جو سماج سے رابطہ رکھتے ہوئے بھی نارمل انسانوں سے مختلف ہوتے ہیں اوّل قسم کے لوگوں کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ ان کا لاشعور پوری طرح ان پر حاوی ہو جاتا ہے اور دوسری طرح کے لوگ وہ ہوتے ہیں جن کا شعور تو کام کرتا ہے مگر وہ خود لاشعور کے گہرے اثر سے خود کو الگ نہیں رکھ پاتے۔ نفسیاتی طور پر انھیں ذہنی مریض مانا جاتا ہے۔ ذہنی امراض کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

پہلی قسم کے لوگوں کو (PSYCHOSES) اور دوسرے قسم کے لوگوں کو (NEUROSIS) کے مرض کا نام دیا جاتا ہے۔ ہماری زبان میں انھیں اعصابی خلل اور ذہنی فتور سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ذہنی فتور (PSYCHOSES) کے مریض کا سماج سے

پوری طرح رشتہ ختم ہو جاتا ہے۔ سماج کے لئے وہ اپنے اصولوں کے بارے میں علاحدہ نظریہ رکھتا ہے۔ اس کے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت مکمل طور پر ختم ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے ہی احساسات کو مختلف رنگوں کی عینک سے دیکھتا ہے۔ وہ اپنی ایک ایسی دنیا بناتا ہے جو اس کے نزدیک سو فیصدی صحیح ہوتی ہے اور دوسرے لوگ اس کی نظروں میں غلط اور مضحکہ خیز ہوتے ہیں۔

(SCHIZOPHU.NIC) شخصیت اسی قسم کی ہوتی ہے جن کی گنتی (PSYCHOSES) یا ذہنی فتور میں کی جاتی ہے۔ اردو میں اس بیماری کو ابھی کوئی نام نہیں دیا گیا۔ عام طور پر ایسی شخصیت کے مریض بہت مضحکہ خیز حرکتیں کرتے ہیں کبھی کبھی ایسے لوگ حد سے زیادہ احساس برتری کا شکار ہوتے ہیں۔ دوسرے سب ان کی نظروں میں بے وقوف اور نادان ہوتے ہیں۔ ایسے مریض یہ نہیں سمجھ پاتے کہ کن حالات میں کیسے جذبات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ وہ جذبات سے یکسر عاری ہوتے ہیں۔ اور جذباتی اضمحلال (EMOTIONOL DULLNESS) کا شکار رہتے ہیں۔

ان کے خیالات بڑے بے معنی ہو جاتے ہیں۔ حقیقتاً اگر وہ کسی تکلیف کو محسوس بھی کرتے ہیں تو اس کی تشریح صحیح طرح سے نہیں کر پاتے۔ مثلاً اگر انھیں سر میں تکلیف ہے تو وہ ناک کی بات کرتے ہیں کہ کس طرح ان کی ناک ان کے موجودہ مرض کی ذمہ دار ہے۔

(SCHIZOPHUNIC) اشخاص مختلف قسم کے واہمہ کا (DELUSION) شکار ہوتے ہیں۔

اکثر دوسرے لوگوں کو محو گفتگو دیکھ کر وہ یہ سمجھتے ہیں کہ لوگ ان کی برائی کر رہے ہیں۔ ان کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ یا ان کے خلاف کوئی منصوبہ بنا رہے ہیں۔ یا پھر کبھی ان کو یہ واہمہ ہوتا ہے کہ ان کے مختلف عمل دوسروں کے تاثرات کا نتیجہ ہیں۔ ان کے نزدیک کوئی دوسرا شخص ان کے ذہن میں خیالات پیدا کرنے میں ذمہ دار ہوتا ہے اور اپنی بات کو بہت اطمینان سے وہ اس طرح بھی کہہ گزرتے ہیں کہ آپریشن کے ذریعہ انھیں مختلف تکلیفوں میں مبتلا کر دیا گیا ہے۔

اکثر یہ غیر متوازن اشخاص نامعلوم دشمنوں کے خوف سے پریشان رہتے ہیں۔ سب سے دلچسپ بات ان اشخاص میں کبھی یہ نظر آتی ہے کہ اپنے آپ کو کسی بہت بڑی شخصیت کے نام سے پہچاننے لگتے ہیں۔ اکثر وہ اپنے کو نپولین بتلاتے ہیں یا پھر مسیح دوراں تصور کرنے لگتے ہیں۔

ان کی باتیں بہت بے ربط سی ہوتی ہیں۔ یہ واہمے ان اشخاص میں کبھی اس کثرت سے ہو جاتے ہیں کہ وہ کبھی کبھی خدا کی آواز سنتے ہیں اور ایسی چیزوں کو دیکھتے ہیں جو درحقیقت نہیں ہوتیں۔

سب سے بات بڑی یہ ہوتی ہے کہ ان میں دوسرے کی بات پر غور کرنے یا سمجھنے کی لچک ختم ہو جاتی ہے اور وہ اپنے واہمہ کو حقیقت سمجھ کر اس پر اڑے رہتے ہیں۔

(SCHIZOPHUNIC) کو پوری طرح سے PSYCHOSES کے امراض میں رکھا جاتا ہے۔ جہاں مریض کا سماج سے رشتہ پوری طرح سے ختم ہو جاتا ہے اور اس کا علاج بہت مشکل ہوتا ہے اور بھی دوسرے اس قسم کے کئی مرض ہیں۔

دوسری قسم کے امراض کو خللِ اعصاب (NEUROSIS) کا نام دیا جاتا ہے جس میں مریض سماج سے رشتہ رکھتے ہوئے بھی اپنی ایک خیالی دنیا بنائے رکھتا ہے۔ اور اس پر پوری طرح یقین رکھتا ہے۔

جھک اور سنک (OBSESSION AND COMPULSION) اس کی بہترین مثال ہے۔ سوسائٹی میں ایسے حضرات بھی نظر آئیں گے جو اپنی سنک اور جھک کی وجہ سے خاص شہرت حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ سنک اور جھک کبھی کبھی ایسے عمل میں نظر آتی ہے جو کافی حد تک ان لوگوں کو مضحکہ خیز

(باقی صفحہ ۵۳ پر)

خلیل احمد
نادان محل ۔ لکھنؤ

تعلیم بالغان پروگرام
اترپردیش میں

تعلیم بالغان کا قومی پروگرام مرکزی حکومت نے ۱۵ سے ۳۵ برس کی عمر تک کے ناخواندہ لوگوں کو خواندہ بنانے کی غرض سے اکتوبر ۱۹۷۸ء میں شروع کیا تھا۔ اس پروگرام کے تحت آئندہ پانچ برسوں کے دوران ۱۰ کروڑ ناخواندہ بالغوں کو پڑھنا۔ لکھنا سکھانے کا منصوبہ ہے۔ اس کے علاوہ ناخواندہ عورتوں کو پڑھنا لکھنا سکھانے اور ان میں مختلف پیشوں کی مہارت پیدا کرنے کی غرض سے ایک پیشہ ورانہ خواندگی پروگرام بھی شروع کیا جا رہا ہے۔

اس وقت ملک کی نصف آبادی ناخواندہ ہے۔ جس میں عورتوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ یہ صورت حال ظاہر ہے کہ کسی بھی ملک کی ترقی میں معاون نہیں ہوسکتی بلکہ ضرر رساں ثابت ہوتی ہے تعلیم ہی سے لوگوں میں بیداری اور سماجی شعور پیدا ہوتا ہے۔ تعلیم ہی لوگوں کو ان کے حقوق اور فرائض سے روشناس کراتی ہے۔ اسی لیے موجودہ حکومت نے اقتدار کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے بعد ملک سے ناخواندگی دور کرنے کے لیے تعلیم بالغان پروگرام شروع کیا اور اس کی عمل آوری پر خصوصی توجہ دی۔

اس پروگرام کے آغاز کے پہلے پانچ برسوں میں مرکزی حکومت اس پر ۱۰۰ کروڑ روپے صرف کرے گی اور یہ تعلیم ایک گھنٹہ یومیہ کے حساب سے دی جائے گی۔ اس پروگرام کے لیے تقریباً ۵۵۳ رضاکار ایجنسیوں نے اپنا تعاون پیش کیا ہے اس کے تحت تمام ملک میں ۶۰۰۰ خواندگی مرکز قائم کیے جا رہے ہیں۔

حکومت اترپردیش بھی تعلیم بالغان پروگرام کی عمل آوری کے سلسلے میں پوری طرح کوشاں اور سرگرم ہے۔

ریاستی حکومت کا عزم ہے کہ ایک منظم اور منصوبہ بند مہم کے ذریعہ آئندہ دس برسوں میں ریاست سے ناخواندگی کو دور کر دیا جائے۔ اس کے لیے ہر نیائے پنچایت میں غیر رسمی تعلیم کا بندوبست کیا جا رہا ہے اور ۴۷ میدانی اضلاع میں نیز ضلع نینی تال میں غیر رسمی تعلیم کے ۲۵-۲۵ مرکز اور باقی سات پہاڑی اضلاع میں ۱۵-۱۵ مرکز چلائے جا رہے ہیں۔

چھٹے منصوبے میں اس پروگرام کو مزید توسیع دی جائے گی تاکہ ریاست کی ہر گاؤں سبھا میں تعلیم بالغان یا غیر رسمی تعلیم کے مرکز شروع کیے جا سکیں اور ہر ناخواندہ شخص کو خواندہ بنایا جا سکے۔

ریاستی حکومت نے یہ تجویز بھی رکھی ہے کہ ۱۹۸۳ء تک مرکزی مالی امداد سے ہر ضلع میں ایک دیہی خواندگی پراجیکٹ قائم کیا جائے۔

اس مقصد کے لیے منصوبہ بندی کمیشن نے ۲۰۰ کروڑ روپے منظور کیے ہیں۔ اس پروگرام کے تحت سماج کے کمزور طبقوں کی تعلیم پر خاص زور دیا جائے گا۔

تعلیم بالغان پروگرام کی مکمل آوری کے لیے اسٹیٹ بورڈ آف ایڈلٹ ایجوکیشن بھی قائم کیے گئے ہیں۔ جس کے تحت دو اسکیمیں وضع کی گئی ہیں (۱) کسان خواندگی مہم (۲) غیر رسمی تعلیم۔

ان میں سے کسان خواندگی مہم ریاست کے ۱۱ اضلاع میں شروع کی جا چکی ہے۔ جس میں لکھنؤ بھی شامل ہے۔ ہر ضلع میں ۶۰ مرکز کام کر رہے ہیں اور مزید مرکز قائم کرنے کی تجویز ہے۔

غیر رسمی تعلیم کے لیے میدانی اور پہاڑی اضلاع میں جو
مرکز چلائے جا رہے ہیں۔ ان میں سے ہر مرکز میں ۲۰۔۳۰
افراد کو غیر رسمی تعلیم دی جا رہی ہے۔

غیر رسمی تعلیم کے تحت تین زمروں کی نشان دہی کی گئی
ہے۔ پہلا زمرہ اقوام و قبائل مندرجہ فہرست، پہاڑی
علاقوں اور گندی بستیوں کے عوام نیز سماج کے پس
ماندہ طبقوں کے بچوں پر مشتمل ہے جو کبھی اسکول نہیں گئے
یا پھر اسکول چھوڑ چکے ہیں۔ دوسرا زمرہ لڑکیوں اور عورتوں
کا ہے۔ اسکول نہ جانے والوں میں ان کی تعداد اکثریت میں
ہے۔ تیسرا زمرہ ان لوگوں کا ہے جو کم عمری میں ہی کسی پیشے سے
وابستہ ہو گئے اور تعلیم حاصل نہیں کر سکے۔

ان تینوں زمروں کے لوگوں کو بھی خواندہ بنانا اور انھیں
تعلیمی سہولتیں بہم پہنچانا ایک بنیادی فریضہ ہے اور
موجودہ ریاستی حکومت اپنے اس فرض کی تکمیل کے
سلسلے میں بھی پوری طرح مستعد اور سرگرم ہے۔

موجودہ حکومت نے متعدد ایسے کام کیے ہیں جو نہ صرف
یہ کہ دور رس افادیت کے حامل ہیں بلکہ انقلابی نوعیت
بھی رکھتے ہیں۔ مثلاً نشہ بندی کا نفاذ، غریب ترین
اور کمزور ترین افراد کو ان کی سطح سے اوپر اٹھانے اور
انھیں ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کی غرض سے شروع کیا
گیا انتیودیہ پروگرام، دیہی ضروریات و مسائل سے
ہم آہنگ اسکیمیں اور منصوبے نیز ان پر تیز رفتار عمل درآمد
دیہی علاقوں کی ترقی سے متعلق کاموں کو ترجیح، چھوٹی اور گھریلو
صنعتوں کی ترقی، دیہی علاقوں میں صنعتوں کی توسیع اور جمہوریت
کی مکمل بحالی نیز اسے مستحکم بنانے کے اقدامات۔

مذکورہ بالا تمام پروگراموں اور اقدامات کی طرح تعلیم بالغان پروگرام
بھی زبردست افادیت کا حامل ہے اور اسے شروع کرنے
نیز آگے بڑھانے کا کریڈٹ بھی موجودہ حکومت کو ہی
جاتا ہے۔

★

رشید انصاری
سرائے میر اعظم گڑھ

غزل

محفل اداس جذبۂ احساس سرد ہے
پروانہ جل گیا ہے رخِ شمع زرد ہے

فطرت کا حسن کیسے اسیرِ قلم کروں
چھائی ہوئی فضا پہ مسائل کی گرد ہے

شاید سمجھ گیا ہے حقیقت بہار کی
وہ ایک شخص آج جو صحرا نورد ہے

تصویرِ زندگی میں بھریں رنگ کس طرح
تم کو ہے اپنا ہم کو زمانے کا درد ہے

خود اپنا عکس آج ہمیں اجنبی لگا
ہر آئینے پہ دل کے رشید اتنی گرد ہے

غیر متوازن افراد کا تجزیہ: صفحہ ۵۲ کا بقیہ

بنا کر رکھ دیتی ہے۔ اکثر پاکیزگی کی جھک میں لوگ ہاتھ دھوتے
ہی چلے جاتے ہیں پھر بھی ان کی صفائی پر انھیں شبہ ہی
رہتا ہے۔

یہ صفائی اور پاکیزگی کی جھک اکثر لوگوں کو دوسروں کے
بیچ ایسی منفرد حیثیت عطا کر دیتی ہے کہ وہ دوسرے ہی اپنے
کپڑوں کو اونچا اٹھائے، لوگوں سے بچتے بچاتے نظر آتے ہیں
دوسروں کو گندا سمجھنے کی سنک میں خود ہی کارٹون بن کر
رہ جاتے ہیں اور دوسروں کو تفریح کا سامان مہیا کرتے ہیں

اس طرح سماج کا یہ وسیع و عریض دائرہ اپنے دامن
میں مختلف کرداروں کی کہانیاں سمیٹے رہتا ہے۔ سماج کی
چہار دیواری کو خوش رنگ رکھنے کی تگ و دو میں نارمل
اشخاص ان غیر متوازن اشخاص سے سمجھوتا کسی بھی حالت میں
کرنے پر تیار نہیں ہوتے اور ان کی دنیا محدود ہو کر رہ جاتی
ہے۔

نقد و تبصرہ

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں)

نام کتاب: فکر اقبال کا تدریجی انقلاب۔ مصنف: سردار احمد، صفحات۔ ۱۳۶۔ قیمت: ۱۰ روپے پتہ: ایجوکیشنل بک ہاؤس مسلم یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ۔

یہ کتاب اقبال کے کلام کے فکری مطالعہ کی ایک اہم کڑی ہے جس میں مقالہ نگار نے اقبال کی تصوف سے دلچسپی کے بارے میں اپنی تحقیقی اور تنقیدی رائے کا اظہار کیا ہے۔ ان کا خیال ہے۔

" علامہ اقبال تصوف کے بہترین ترجمان ہیں۔ علامہ نے اپنی زندگی کے چالیس سال سے زیادہ کا عرصہ اسلامی تصوف اور غیر اسلامی تصوف کے درمیان ایک واضح فرق دریافت کرنے اور تصوف کے بنیادی حقائق اور طریق کار کی قرآنی اصل تلاش کرنے میں گزارا "

مقالہ نگار تصوف کو تمامتر وحدت الوجود کے نظریہ تک محدود رکھ کر اقبال کے یہاں اس نظریہ کی کارفرمائیاں مختلف زمانوں میں تلاش کرتے ہیں۔ ان کی تلاش و تحقیق کا ماحصل یہ ہے۔

" علامہ اقبال کا ذہنی سفر وحدت الوجود کی تائید سے شروع ہو کر وحدت الوجود کی مخالفت کے خارزاروں میں داخل ہوا اور پھر اس مخالفت کو چھوڑ کر وحدت الوجود کی تائید کی طرف واپس ہو گیا "

یہ حقیقت ہے کہ صوفیوں کے مسلک میں وحدت الوجود کا عقیدہ ایک بنیادی عقیدہ ہے مگر یہ عقیدہ ہی کل تصوف نہیں ہے۔ ہندستان میں عام طور پر جس تصوف کا بول بالا ہے یعنی جو تصوف اس مسلک کے ماننے والے مسلمانوں اور صوفیا کی خانقاہوں میں نظر آتا ہے وہ قطعی طور پر اسلامی تصوف نہیں بلکہ ایرانی تصوف یا ہندستانی تصوف ہے۔ میرے خیال میں

اقبال اپنی زندگی کے آخری لمحے تک اپنے اس خیال پر قائم رہے جس کا اظہار انھوں نے ۲۰ دسمبر ۱۹۱۵ء کو خواجہ حسن نظامی کے نام اپنے ایک خط میں کیا تھا۔

" تصوف جو مسلمانوں میں پیدا ہوا اور اس جگہ تصوف سے میری مراد ایرانی تصوف ہے اس نے ہر قوم کی رہبانیت سے فائدہ اٹھایا ہے اور ہر راہی تعلیم کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کی ہے یہاں تک کہ مزدکی تحریک کا مقصد بھی بالآخر قیود شرعیہ اسلامیہ کو فنا کرنا تھا اور بعض صوفیہ کی نسبت تاریخی شہادت موجود ہے کہ وہ اس تحریک سے تعلق رکھتے تھے "

یہاں ایک بات اور خیال میں آتی ہے وہ یہ کہ ہم جس کو اسلامی تصوف کا نام دیتے ہیں دراصل ایسی کوئی چیز اسلامی دنیا کی ایمانی تاریخ میں مشکل ہی سے ملے گی۔ میرے خیال میں یہ اسلامی تصوف کی اصطلاح بھی ایرانی تصوف کا ایک PRODUCT BY ہے جس کو زیادہ سے زیادہ اسلامی شریعت و طریقت کا پابند بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ تصوف کی اسلامی اہمیت سے انکار کے یہ معنی نہیں کہ اقبال یا مسلمان، بزرگان دین یا اولیا اللہ کی روحانیت اور عظمت کے قائل نہیں۔

بحیثیت مجموعی یہ مختصر مقالہ اقبالیات کے فکری مطالعہ میں تحقیق و تنقید کے نئے گوشے فراہم کرتا ہے جن پر بڑی دلچسپ اور بصیرت افروز بحث ہو سکتی ہے۔

— ذکی کاکوروی

نام کتاب: تاریخ اودھ کا مختصر جائزہ۔ مصنف: امجد علی خاں۔ صفحات: ۲۴۴۔ قیمت ۲۰ روپے پتہ: کچا احاطہ، امین آباد لکھنؤ۔

تاریخ اودھ پر امجد علی خاں کی یہ دوسری کتاب ہے۔ جو پہلی کتاب تاجدار اودھ سے یقیناً بہتر ہے۔ مثالی اور معیاری تاریخ تنقیص و توصیف دونوں سے عاری ہوتی ہے۔ تاریخ معروضی اور غیر جذباتی طور پر حقائق کے انکشاف کا نام ہے اسے "جذباتی نگاری" راس نہیں آتی۔ حقائق مورخ کے جذبات کے پابند نہیں ہوتے وہ مورخ کی پسند اور ناپسند سے بلند ہوتے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب اودھ کی مثالی اور معیاری تاریخ کے بجائے مثالی اور معیاری تاریخ کی سمت مولف کی ایک پیش رفت معلوم ہوتی ہے۔ کتاب کے ماخذ کی فہرست میں ابھی اضافوں کی خاصی گنجائش ہے۔ اودھ کی تاریخ پر انڈیا آفس لائبریری اور برٹش میوزیم میں جو وسیع تاریخی مواد موجود ہے۔ اودھ کی تاریخ پر کام کرنے کے لیے ان خزانوں تک رسائی حاصل کرنا ضروری ہے۔ لیکن اس مشکل کام سے قبل اس موضوع سے متعلق مندرجہ ذیل ماخذوں تک مولف بہ آسانی رسائی حاصل کر سکتے ہیں:

(۱) خدنگ غدر (۲) ایک فادمر دو ناچیز (۳) ہندستانی اخبار نویسی، کمپنی کے عہد میں (۴) اٹھارہ سو ستاون۔ اخبار اور دستاویزیں (۵) ڈوکمنٹس آف اودھ (انگریزی) (۶) فوسٹ ٹو نوابس آف اودھ (انگریزی) (۷) شجاع الدولہ از اے۔ ایل سریواستوا (مقالہ برائے ڈی۔ لٹ) دو جلدیں (انگریزی) (۸) نصیر الدین حیدر پر لکھنؤ یونیورسٹی لائبریری میں ایک غیر مطبوعہ پی ایچ۔ ڈی کا مقالہ بھی موجود ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ [یہ کتابوں کی جامع فہرست نہیں۔ فوری طور پر جو کتابیں یاد آئیں ان کی نشاندہی کر دی گئی ہے] ان کتابوں کے علاوہ پھر اخبارات و رسائل کی فائلوں میں بھی مفید مواد مل سکے گا۔

مجموعی طور پر زیر تبصرہ کتاب تاریخ اودھ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اپنے دامن میں دلچسپی کا بہت کچھ سامان رکھتی ہے۔

— کاظم علی خاں

نام کتاب:۔ سرشار کسمنڈوی ـــ حیات اور کارنامے
مصنف:۔ محمد عارف ۔ ملنے کا پتہ: ۲۰۲ / ۱۶۲ مولوی گنج لکھنؤ۔ صفحات ۱۹۱۔ قیمت:۔ ۱۰ روپے۔

محمد عارف صاحب شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالر ہیں۔ یہ کتاب ان کے ایم۔ اے کلاس کا ڈیزرٹیشن ہے۔

سرشار کسمنڈوی اپنے عہد کے ایک ممتاز شاعر تھے انھوں نے کلاسیکی شاعری کی طرف توجہ کی اور فکر و فن کی مختلف منزلوں کو طے کیا۔ ایسے باشعور شاعر پر قلم اٹھانے کی ضرورت تھی۔ اب اس کام کو محمد عارف صاحب نے بحسن و خوبی انجام دیا ہے۔

محمد عارف نے اپنی کتاب کے باب اول میں سرشار صاحب کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو پیش کیا ہے۔ انھوں نے سرشار کی پیدائش، وطن، خاندان، تعلیم، ذریعہ معاش طرز رہائش اور اخلاق و عادات پر بھرپور روشنی ڈالی ہے اور کسی پہلو کو تشنہ نہیں رکھا ہے۔ باب دوم میں سرشار کے عہد کا سیاسی سماجی قومی اور ادبی پس منظر پیش کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ سرشار نہ صرف اپنے عہد کی تحریکات سے متاثر تھے بلکہ ایک زبردست محب وطن بھی تھے۔

باب سوم میں سرشار کی غزل گوئی سے بحث کی گئی ہے۔ یہ باب بہت ٹھوس ہے۔ اور سرشار کی غزل گوئی کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ عارف صاحب نے سرشار کی غزل کے موضوعات سے بھی بحث کی ہے اور اسلوب پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ خصوصاً سرشار کی غزلوں میں میریت اور تصوف کے عناصر کی تلاش قابل داد ہے۔

باب چہارم میں اردو ادب میں سرشار کا مقام متعین کیا گیا ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ ان کے یہاں دہلوی اور لکھنوی دونوں رنگوں کا حسین امتزاج ملتا ہے۔

باب پنجم میں سرشار صاحب کا نمونۂ کلام پیش کیا گیا ہے اس کے ساتھ ہی نثر نگاری کا بھی کچھ نمونہ موجود ہے۔ اس میں ایک خط کا اقتباس اور مضمون "مشاعروں کی افادیت" بھی شامل ہے۔ ان کی نثر نگاری کے اگر مزید نمونے مل جاتے تو بہتر تھا۔ (ڈاکٹر) سلام سندیلوی

نام کتاب: لغزشیں
شاعر: دل لکھنوی: ملنے کا پتہ: دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ۔ قیمت: چھ روپے

"لغزشیں" جناب دل لکھنوی کا دوسرا مجموعہ کلام ہے جس میں گیارہ قطعات اور ایک سو گیارہ غزلوں کا دلکش انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ اس مجموعہ میں کچھ ایسی غزلیں بھی شامل ہیں جو دل صاحب کے پہلے مجموعۂ کلام "آئینۂ دل" میں موجود تھیں لیکن زیر نظر مجموعہ کے لیے انتخاب کرتے وقت ان کی تراش خراش پر خاص توجہ دی گئی ہے۔

دل لکھنوی اپنے "کلام" اور "طرز کلام" کی وجہ سے گزشتہ چالیس بیتالیس برسوں سے اردو داں حلقہ میں بڑی شہرت اور مقبولیت رکھتے ہیں وہ ان شاعروں میں نہیں ہیں جو صرف مشاعروں کو اپنی "متاع حیات" تصور کر کے ایک خول کے اندر سمٹ جاتے ہیں، بلکہ ایک مبلغ یا پیغامبر کی حیثیت رکھتے ہیں، اس لیے دل صاحب کو صرف مشاعروں کا شاعر کہنا یا سمجھنا حقیقت کے بالکل برعکس اور منافی ہے۔ ان کی شاعری کسی بھی ادبی معیار کی کسوٹی پر جانچی جائے تو پوری اترے گی یہ اور بات ہے کہ جب وہ مخصوص انداز میں اپنا کلام سناتے ہیں تو اس کا وزن کئی گنا زیادہ محسوس ہوتا ہے۔

دل صاحب مولانا عبدالباری آسی کے حلقۂ تلامذہ میں رہے ہیں اس لیے ان کے کلام میں قدیم اور جدید ادبی قدروں کا احترام اور ان کی آمیزش پائی جاتی ہے وہ کل کی بات کو آج بھی بڑے حسین اور بے باکانہ انداز میں بیان کرتے ہیں حسن و عشق کے معاملات، زندگی اور موت کے مسائل، سماجی نشیب و فراز اور کائنات میں بکھرے ہوئے گوناگوں واردات و حادثات ان کے خاص موضوع ہیں۔ وہ صاف، سادہ اور سلیس انداز میں بڑی سے بڑی بات کہہ جاتے ہیں ان کی شاعری سماج سے متاثر بھی ہے اور سماج کو متاثر بھی کرتی ہے۔

بیس تیس ایک سولہ سائز کی ایک سو اٹھائیس صفحات پر مشتمل کتاب "لغزشیں" عمدہ کتابت اور طباعت کے زیور سے آراستہ ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے منفرد سرورق کی طرف بھی متوجہ کرتی ہے۔

ڈاکٹر سلمان عباسی

★

عنوانات

نیا دور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ حکومت اتر پردیش ان سے بہر حال متفق ہو

ستمبر ۱۹۷۹ء

ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

★

پبلشر: ہمیندر کمار
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش

پرنٹر: اشوک در
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ واسٹیشنری یوپی
مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ
شائع کردہ محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ۔ اتر پردیش

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے
زر سالانہ: پانچ روپے

ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پبلی کیشن بیورو پبلک انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو۔پی۔ لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶۔ لکھنؤ

بذریعہ رجسٹری: ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو۔پی۔ لکھنؤ

باتیں

نائب صدر جمہوریۂ ہند کے عہدے پر سابق چیف جسٹس جناب محمد ہدایت اللہ بلا مقابلہ منتخب کر لیے گئے۔ ان کے نام پر تمام سیاسی جماعتوں کا متفق ہو جانا، ان کی پُر وقار، اور غیر متنازعہ شخصیت کا آئینہ دار ہے۔

انھوں نے گزشتہ ۳۱ راگست کو ایک شان دار تقریب میں ہندستان کے چھٹے نائب صدر جمہوریہ کی حیثیت سے عہدے اور راز داری کا حلف یا۔ صدر جمہوریہ شری نیلم سنجیوا ریڈی نے راشٹرپتی بھون کے اشوکا ہال میں انھیں حلف دلایا۔ اس موقع پر نگراں وزیر اعظم چودھری چرن سنگھ ، سابق وزیر اعظم شری دیسائی۔ بی چوان اور کابینہ کے وزیروں کے علاوہ دیگر اہم شخصیتیں موجود تھیں۔

جسٹس ہدایت اللہ کی پیدائش ۱۹۰۵ء میں ۱۷ ر دسمبر کو ہوئی تھی۔ تعلیم انھوں نے رائے پور، ناگپور اور اس کے بعد کیمبرج اور لنکن میں حاصل کی۔ ۱۹۳۰ء میں آپ نے ناگپور ہائی کورٹ کے سب سے کم عمر بیرسٹر کی حیثیت سے خود کو رجسٹرڈ کرایا۔ ۱۹۴۳ء میں وہ سب سے کم عمر ایڈوکیٹ جنرل بنے۔ ۱۹۵۴ء میں ناگپور ہائی کورٹ کے سب سے کم عمر جج کی حیثیت سے آپ کا تقرر ہوا۔ ۱۹۵۶ء میں سپریم کورٹ کے جج مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۸ء سے ۱۶ ر دسمبر ۱۹۷۰ء تک سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کے عہدے پر فائز رہے اور اس حیثیت سے انھوں نے گرانقدر خدمات انجام دیں۔ ۱۹۶۹ء میں انھوں نے ڈاکٹر ذاکر حسین کی وفات کے بعد کچھ عرصے قائم مقام صدر کی ذمہ داریاں بھی سنبھالی تھیں کیوں کہ نائب صدر شری وی۔ وی گری نے صدر کا الکشن لڑنے کے لیے استعفا دے دیا تھا۔ بے خوفی، حق پسندی اور خود شناسی آپ کی منفرد خصوصیات ہیں۔ آپ کو گولف اور ٹینس کے علاوہ مطالعے کا بھی شوق ہے۔ اردو ادب سے بھی گہرا لگاؤ رکھتے ہیں۔ ادارہ نیا دور اس نئے اور جلیل القدر عہدے پر انھیں پُر خلوص مبارک باد پیش کرتا ہے۔

● نیا دور کے ایڈیٹر اور اسسٹنٹ ڈائرکٹر جناب خورشید احمد صاحب محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اتر پردیش میں ۳۲ سال تک بیش بہا خدمات انجام دینے کے بعد گزشتہ ۳۱ ر جولائی کو ملازمت سے سبک دوش ہو گئے۔ وہ نیا دور کی ادارت کے فرائض ایک طویل عرصے سے بحسن و خوبی انجام دے رہے تھے اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ نیا دور کو نکھارنے، سنوارنے اور اس کے معیار کو بہتر سے بہتر بنانے میں انھوں نے انتھک محنت ہی نہیں کی بلکہ اپنی اعلا صلاحیتوں کا ہمیشہ ثبوت دیا۔ انھیں کے عہد میں نیا دور کے کئی معیاری اور وقیع خصوصی نمبر شائع کیے گئے جن کی ادبی حلقوں میں کافی پذیرائی ہوئی۔ ان خصوصی نمبروں میں غالب نمبر، جعفر علی خاں اثر نمبر، پروفیسر احتشام حسین نمبر اور پروفیسر مسعود حسن رضوی نمبر قابل ذکر ہیں۔ انھیں بیش بہا خدمات کے صلے میں خورشید صاحب کو چار سال قبل اسٹیٹ ایوارڈ سے بھی نوازا گیا تھا۔ امید ہے خورشید صاحب سبکدوش ہونے کے بعد بھی نیا دور سے اپنا رشتہ قائم رکھیں گے اور ادارے کو اپنے مفید مشوروں سے نوازتے رہیں گے۔

● ہندی کے صاحب طرز صحافی اور ممتاز ادیب شری انوکھ جی گزشتہ دنوں چل بسے۔ انوکھ جی نے ہندی روزنامہ "سوتنتر بھارت" کے ایڈیٹر کی حیثیت سے نہ صرف یہ کہ ہندی صحافت کا معیار بلند کیا بلکہ اسے ایک نئی جہت دی لیکن وہ صرف ایک صحافی ہی نہیں تھے بلکہ ایک ادیب بھی تھے۔ اس لیے ان کی صحافت میں ادبیت ہوتی تھی۔ اس اعتبار سے ان کا انتقال ہندی صحافت اور ادب دونوں کا ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔ اتر پردیش کے محکمۂ اطلاعات و رابطہ عامہ سے بھی ان کا ایک تعلق رہا ہے۔ وہ یوپی پریس ایڈوائزری کمیٹی کے ممبر بھی تھے۔ محکمۂ اطلاعات کے ہندی جریدوں کو ان کے مفید مشورے اور تعاون ہمیشہ حاصل رہا۔ محکمۂ اطلاعات سے جاری ہونے والی ہندی خبروں کی زبان وغیرہ کے سلسلے میں بھی گزشتہ ماہ انھوں نے متعدد اہم مشورے دیے تھے اور اس سلسلے میں وہ خود دفتر تشریف لائے تھے اور انھوں نے متعلقہ انفارمیشن افسروں سے تفصیلی بات چیت کی تھی۔

● مشہور مزاحیہ شاعر ناظر خیامی کے انتقال کا زخم ابھی تازہ تھا کہ لکھنؤ کے ایک اور ممتاز مزاحیہ شاعر جھنجھٹ لکھنوی صاحب بھی چل بسے۔ جھنجھٹ صاحب اپنی طنزیہ اور مزاحیہ شاعری میں لکھنویت کو خاص طور سے ملحوظ رکھتے تھے۔ لکھنؤ کی زبان میں لکھنوی رکھ رکھاؤ کے ساتھ ان کا طنز اور مزاح ایک خاص لطف دیتا ہے۔ ان کا انتقال طنز و مزاح کی دنیا کا ایک بڑا نقصان ہے۔ لکھنؤ میں ان کی کمی خاص طور سے محسوس کی جائے گی۔ کیونکہ وہ یہاں کی زبان و تہذیب اور قدروں کے علمبرداروں میں تھے جو ایک ایک کر کے اٹھتے جا رہے ہیں۔ مرحوم سے ان کے انتقال سے ایک ہفتہ قبل ہی ملاقات ہوئی تھی لیکن کیا معلوم تھا کہ یہ آخری ملاقات ہوگی۔ خدا مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

— ایڈیٹر

چناب کے کنارے

پروفیسر جگن ناتھ آزاد
صدر شعبۂ اردو۔ جموں یونیورسٹی
جموں۔ کشمیر

سفر میں شام ہوئی ہے کنارِ رودِ چناب
تڑپ یہاں، تو سنبھل کر تڑپ دلِ بے تاب
دیارِ عشق ہے یہ، سرزمینِ درد ہے یہ
ہوا نہیں ہے فضاؤں کی آہِ سرد ہے یہ
یہاں گداز کا شعلہ بھڑک رہا ہے ابھی
ہر ایک ذرّے کا سینہ دھڑک رہا ہے ابھی

جو سطحِ آبِ رواں پر نگاہ جاتی ہے
ہر ایک موج کوئی داستاں سناتی ہے

وہ ایک موج نے طوفاں کا روپ دھار لیا
جنوں نے اپنا سفینہ یہیں اتار لیا
چلا ہے موج سے لڑتا ہوا سفینۂ عشق
سنبھل کے موجِ رواں! یہ ہے سوزِ سینۂ عشق
ترا تموجِ فانی نہ چل سکے گا یہاں
کوئی اصولِ زمانی نہ چل سکے گا یہاں
ابھر نہ کف بہ دہن موج اس طرح تن کر
چلی ہے، روحِ محبت سفینہ راں بن کر
ابھی سفینہ یہ دریا کے پار اترے گا
بھنور تو اپنے دکھاے ہزار اترے گا

ترے خروش کو دردِ نہاں عطا کر کے
رہے گا زندگیِ جاوداں عطا کر کے

وہ اپنے ہاتھ میں کچا گھڑا اٹھائے ہوئے
کسی کے شوقِ نظارہ سے دل لگائے ہوئے
اتر گئی کہیں طوفاں میں روحِ درد و گداز
بسی بھنور ہی میں دنیائے شانِ ناز و نیاز
ادھر شباب پہ دریا ادھر شباب پہ عشق
ہے آج ذوقِ وفا تیرے احتساب پہ عشق
بھنور کے سامنے کچے گھڑے کی تاب ہی کیا
مگر شکست جو مانے تو وہ شباب ہی کیا
گھڑے کی خاک کہاں اور بھنور کا جوش کہاں
بشر کی تاب کہاں موج کا خروش کہاں
مٹا بھنور کی تہوں سے صدائے درد آئی
وفا نے آج ہمیشہ کی زندگی پائی

گداز دے گئی ایسا کچھ آگ پانی کو
نئی حیات ملی موج کی روانی کو

رواں چناب پہ اب بھی کئی سفینے ہیں
ہر ایک موج کے دل میں نہاں خزینے ہیں
ہر ایک موج پہ اب بھی رواں ہیں کچے گھڑے
نیازِ عشق تری داستاں ہیں کچے گھڑے
دلِ صبور! یہاں آنسوؤں کا نذرانہ
کہ اس فضا میں ہے آباد بزمِ جانانہ
نگاہِ شوق مناسب ہے احترام یہاں
چھلک رہا ہے مئے عاشقی کا جام یہاں
ادب تخیلِ شاعرِ وفا کی بزم ہے یہ
حیا کی بزم ہے صدق و صفا کی بزم ہے یہ

الگ زمانے سے دنیائے آب و خاک ہے یہ
فروغِ دل کی تجلی سے تابناک ہے یہ

نازش پرتاب گڑھی
بیگم واڑہ، پرتاب گڑھ (یو پی)

اک رات[1] گزاری ہے یوں بھی

کس کو فرصت جو کرے لطف کو عام آج کی رات
کہاں بھیجوں کوئی سوغاتِ سلام آج کی رات

صبح تک مار ہی ڈالے گی یہ اک فکر مجھے
کس کو یاد آئے گا نازش مرا کام آج کی رات

اب کہاں فکرِ سخن، حسنِ کلام آج کی رات
ابر آلود ہے ہر ماہِ تمام آج کی رات

میرا سایہ بھی گیا، میرے شناسا بھی گئے
آپ اپنے ہی سے کرنا ہے کلام آج کی رات

یہ شفاخانے کی تنہائی ہنگامہ نما
مجھ سے مانگے ہے اک اک لمحے کے دام آج کی رات

اتنی بے چارگیٔ زیست کہاں تھی پہلے
طعنہ زن مجھ پہ ہے میرا ہی کلام آج کی رات

آہ بن کر کوئی ابھرا ہے کوئی آنسو بن کر
یاد آئے کئی بھولے ہوئے نام آج کی رات

کس قدر تند ہے یہ شدتِ احساس کی مے
میرے ہاتھوں میں پگھل جائے نہ جام آج کی رات

مئے رنگیں نہ سہی۔ اشک سہی، زہر سہی
خیر میں ہو تو گیا بادہ بجام آج کی رات

بات کہنے کے کئی ڈھنگ تراشے لیکن
اکھڑا اکھڑا سا ہے اندازِ کلام آج کی رات

پرسشِ حال پہ آنسو نکل آئے نازش
میری غیرت بھی نہ آئی مرے کام آج کی رات

۱۔ لکھنؤ کے ٹھاکر گنج ٹی بی کلینک میں گزری ہوئی پہلی رات کی یاد۔ نازش

شجاعت علی سندیلوی
۱۷- اشفاق اللہ مارگ
امین آباد - لکھنؤ

اردو ادب میں طبقۂ نسواں کا پہلا حامی
مولانا حالی

شمس العلماء مولانا الطاف حسین حالی کو اپنے معاصرین میں یہ اوّلیت حاصل ہے کہ انھوں نے ہندوستانی عورت کے حالِ زار اور اس کے مسائل پر سنجیدگی اور ہمدردی کے ساتھ غور کیا، ان کا عہد 'عورت' کی مظلومیت کا عہد تھا۔ معاشرہ میں اس کی کوئی عزت نہیں تھی، وہ مردوں کے ظلم و ستم کا نشانہ بنی ہوئی تھی، اس کی زندگی جانوروں سے بدتر تھی، نہ اس کا کوئی حق تھا، نہ اختیار۔ اس کی فریاد سننے والا کوئی نہیں تھا۔ حالی کا دردمند دل اس مظلوم اور بدنصیب طبقہ کی کس مپرسی، بدحالی اور بے کسی پر تڑپ اٹھا۔ انھوں نے اس کی فلاح و اصلاح کی طرف توجہ کی، اس کے جائز حقوق کی پامالی کے خلاف آواز اٹھائی۔ اردو ادب میں جس نے سب سے پہلے صنفِ نازک کی مظلومیت، اپنے سوزِ دروں کے ساتھ پیش کی، وہ مولانا حالی ہیں انھوں نے نظم و نثر دونوں میں اپنے خیالات ظاہر کیے۔ کہیں بچپن کی شادی کے نقصانات اور مضر اثرات پر توجہ دلا رہے ہیں، کہیں شادی کے رسوم کی سختی اور شدت سے مخالفت کر رہے ہیں کہیں اصلاح و ترقی نسواں کے لیے تعلیم کو ضروری بتا رہے ہیں۔ غرض حالی نے اپنے معاصرین اور رفقار کے برخلاف اصلاح و تعلیم نسواں پر زیادہ توجہ کی جبکہ سر سید احمد خاں اور دوسرے حضرات نے اصلاح نسواں اور تعلیم نسواں کو زیادہ ضروری نہیں سمجھا بعض تو تعلیم نسواں کے ہی مخالف تھے۔ وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ عورتیں بس اتنا پڑھ لکھ لیں جو گھر کی معمولی باتوں کے لیے ضروری ہے۔ مگر حالی چاہتے تھے کہ یہ مظلوم طبقہ 'نصف بدتر' کے بجائے 'نصف برتر' بن جائے۔ اس کو بھی انسان سمجھا جائے، اس سے بھی انسانیت اور ہمدردی کا برتاؤ کیا جائے۔ اس سلسلے میں انھوں نے تین نظمیں لکھیں!

۱- مناجات بیوہ ۲- چپ کی داد ۳- بیٹیوں کی نسبت

حالی نے سب سے پہلے بیوہ ۱۸۸۴ء میں لکھی، یہ درد و غم اور سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی مثنوی ۴۴۶ اشعار پر مشتمل ہے۔ غم و یاس، اور حسرت و افسوس کا یہ لاجواب مرقع، اردو شاعری میں اپنی تاثیر اور کشش میں شاہکار ہے۔ حالی اپنی پوری ہمدردی' دردمندی، محبت اور تڑپ کے ساتھ اس مثنوی میں جلوہ گر ہیں۔ یہ مناجات بیوہ نہیں ہے بلکہ ہندوستانی سماج میں اس کی حالتِ زار کی جیتی جاگتی تصویر غم ہے۔ ایک ایک لفظ اس کی موت سے بدتر زندگی کا ترجمان ہے۔ اس نظم میں بیوہ کے جذبات کی بھرپور ترجمانی تباہ کن رسم و رواج اور سماج کے ظلم و ستم کا ہو بہو نقشہ کھینچا گیا ہے۔ آسان اور موثر زبان، دلکش اور دل نشین انداز بیان، سادگی اور سچائی نے اس میں درد و اثر کوٹ کوٹ کر بھر دیا ہے کہ سخت سے سخت دل بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ اردو شاعری آج تک اس نظم کا جواب پیش نہیں کر سکی۔ اس کے بعد بیوہ کے مصائب و آلام، اور رنج و غم پر متعدد شعراء نے نظمیں لکھیں لیکن وہ مقبول نہ ہو سکیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کے سینے میں نہ تو حالی جیسا درد آشنا اور حساس دل

لیکن بیوہ عفیفہ نے اس بلا میں صبر و تحمل کے ساتھ اپنی زندگی گزار دی، بیتا آئی مگر اس کے پائے استقلال کو لغزش نہیں ہوئی۔ اس نے اپنے تن من کو صاف اور پاکیزہ رکھا وہ بدی کے سایہ سے بھی دور رہی۔ اس نے اپنے پتیم کے نام کی لاج ہر حال میں قائم رکھی مگر دنیا کو اعتبار کہاں ؟ وہ تو اسے ڈائن اور بدی کا مجسمہ ہی سمجھتی ہے۔ اس خیال اور برتاؤ سے پھر وہ مضطرب ہو کر اپنے پالن ہار اور عالم الغیوب سے بنتی کرتی ہے۔ اور کائنات کی ایک ایک چیز کو مخاطب کر کے اپنی بے گناہی کا یقین دلاتی ہے :

اے امبر کے چمکتے تارو   اے گھر کے در اور دیوارو
اے نیک اور بد کے دربانو   دیکھتی آنکھو، سنتے کانو
میں نیکی کا دم نہیں بھرتی   پاکی کا دعویٰ نہیں کرتی
گنتوں اگر میں اپنی خطائیں   ہے یہ یقیں گنتی میں نہ آئیں
پر یہ خدا سے ڈر کے ہوں کہتی   منھ پہ یہ آے بن نہیں رہتی
خواہ بری تھی خواہ بھلی میں   بات سے اپنے نہیں ٹلی میں
پڑی تھی جس بے درد کے پالے   ہوئی تھی جس بیری کے حوالے
نام پہ دھونی اس کے رما کر   آن کو رکھا جان گنوا کر
ساتھ نہ قوم دلیش کا چھوڑا   اور نہ خدا کے عہد کو توڑا
آے اگر دنیا کو نہ باور   اب مجھے کچھ دنیا کا نہیں ڈر
میرا نگہباں اور رکھوالا   سب سے بڑا ہے جاننے والا

وہ یہ بھی جانتی ہے کہ اس جہنم بھری زندگی سے سوائے خدا کے اور کوئی نجات نہیں دلا سکتا۔ اس لیے جو کچھ کہنا ہے، اسی سے کہنا ہے اور جو کچھ مانگنا ہے، اسی سے مانگنا ہے:

کیجیو جو کچھ تیری خوشی ہو   رانڈ مگر کیجیو نہ کسی کو
جس دکھیا پر پڑے یہ بپتا   کر اسے توپیوند زمیں کا
یا یہ مٹا دے ریت جہاں کی   جس سے گئی پرتیت جہاں کی
کام کوئی مشکل نہیں تجھ کو   ایک یہ کیا گر تیری خوشی ہو
سوت لگے پتھر میں نکلنے   ناؤ لگے ریتے میں چلنے

یہ تو اس کی بشریت کا تقاضہ ہے کہ وہ اپنا دکھڑا اپنے پیدا کرنے والے سے ہی کہتی ہے۔ اور دنیا اور دنیا والوں کے ظلم و زیادتی کی فریاد کرتی ہے لیکن وہ خوب جانتی ہے کہ دنیا میں کسی چیز کو بھی ثبات نہیں ہے:

ورنہ ہے اس دنیا میں دھرا کیا   خواب کا سا ہے لیک تماشا
دکھ سے یہاں کے گھبرانا کیا   سکھ پہ یہاں کے اترانا کیا
آنی جانی چیز ہیں خوشیاں   چلتی پھرتی چھاؤں ہے ارماں
ریت کی سی دیوار ہے دنیا   اوچھے کا سا پیار ہے دنیا
ہار کبھی اور جیت کبھی ہے   اس نگری کی ریت یہی ہے
خوشی میں غم یاں ملا ہوا ہے   امرت میں بس گھلا ہوا ہے
خواہ ہوں رانڈ خواہ سہاگن   موت ہے سب کی جان کی دشمن

موت، بیوہ اور سہاگن دونوں کو برابر کر دیتی ہے لیکن ایک کی موت عمر بھر کی بے قراری، اور مصیبت سے نجات دلاتی ہے۔ دوسری کی موت اسے دنیا کی تمام خوشیوں سے محروم کر دیتی ہے اسی لیے بیوہ کہتی ہے کہ :

کوئی گر انصاف سے دیکھے   کہہ کے اسے نسبت نہیں اس سے
عیش گئی وہ چھوڑ کے یاں سے   قید گئی یہ کاٹ کے یاں سے
اس کا دل دنیا سے اٹھانا   ہے ناخون سے گوشت چھٹانا
جان یہ آساں دیتی ہے ایسی   بو ہے نکلتی پھول سے جیسی

دنیا کی ہر چیز فانی ہے، جو پیدا ہوا ہے وہ مرے گا ضرور۔ ہر نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے ہمیشہ باقی رہنے والی تو اسی خالق کائنات کی ذات ہے۔ اس لیے یہاں کے عیش و آرام، یہاں کے دکھ درد، یہاں کی مسرت و عشرت، یہاں کی اذیت و مصیبت، کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہوں سب باقی رہنے والی نہیں:

غم ہو غرض یا عیش ہو کچھ ہو   ہے ہمیں جانا چھوڑ کے سب کو
تیرے سوا یاں اے مرے مولا   کوئی رہا ہے اور نہ رہے گا

اب نہ مجھے کچھ رنج کی پروا
اور نہ آسائش کی تمنا

اب اگر کوئی تمنا ہے تو صرف یہ :

چاہتی ہوں اک تیری محبت   اور نہیں رکھتی کوئی حاجت

گھونٹ اک ایسا مجھ کو پلادے — تیرے سوا جو سب کو بھلادے
آئے کسی کا دھیان نہ جی میں — کوئی رہے ارمان نہ جی میں
دل میں لگن بس اپنی لگادے — سارے غم، اپنے غم میں کھپادے
غیر کے رشتے توڑ دے سارے — دل کے پھپھولے پھوڑ دے سارے
ساتھ کوئی غم لے کے نہ جاؤں — تیرے سوا کھو دوں جسے پاؤں
جی سے نشاں پیاروں کا مٹادوں — پیار کے منھ کو آگ لگا دوں
تو ہی دل میں تو ہی زباں پر — مار کے جاؤں لات جہاں پر

پاؤں تجھے اک اک کو گنوا کر
خاک میں جاؤں سب کو ملا کر

بیوہ کی زندگی کی ایسی عکاسی، اس کے جذبات غم کی ایسی ترجمانی، اور اتنی آسان اور موثر زبان، اتنا پر سوز اور دلگداز بیان، ایک طرف حالی کی دردمندی و محبت اور ہمدردی و انسانیت کی آئینہ دار ہے تو دوسری طرف ان کے کمال فن کے اعجاز کا مظہر ہے۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے الفاظ میں:

"حالی نے عمر بھر بجز ایک 'بیوہ کی مناجات' کے اگر ایک شعر بھی نہ کہا ہوتا تو ان کے لیے یہی ایک نظم دنیا و عقبیٰ دونوں کے لیے کافی تھی۔ باتیں اتنی سچی اور روح کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی کہ آسمان کے فرشتے بھی وجد میں آ آ کر رہیں۔ بول اتنے میٹھے کہ خود معصومیت بے اختیار لپٹ لپٹ کر بلائیں لینے لگے۔"[1]

صالحہ عابد حسین کو حیرت ہے کہ:

"حالی باوجود مرد ہونے کے ایسا درد آشنا، ایسا حساس، اتنا نازک دل کہاں سے لائے جس نے کمسن بدنصیب بیوہ عورتوں کے صحیح جذبات و احساسات کو اس طرح محسوس کیا جیسے یہ سب کچھ خود اس پر بیت چکا ہو۔ لیکن یہی تو اصلی (سچی) شاعری کا کمال ہے کہ ہر ایک بیتی خود اس پر گزرتی ہے اور تب ہی وہ ایسی زندۂ جاوید چیز لکھ سکتا ہے، جیسی مناجات بیوہ۔"[2]

اسی سچائی، سادگی، درد، سوز، اور اثر سے 'مناجات بیوہ' غم کا تاج محل بن گئی جو پڑھتا ہے پیکر غم بن جاتا ہے، آنکھیں پرنم ہو جاتی ہیں تاثیر اتنی کہ

"اس کو پڑھتے وقت اکثر شوہر دار عورتیں کہتی ہیں کاش! ہم بیوہ ہوتے تو اس سے اور زیادہ لطف اندوز ہوتے۔"[3]

زبان ایسی کہ ہندوستان کے کونے کونے میں سمجھی جائے، اردو کے آسان، اور عام فہم الفاظ ہندی کے مدھر اور رسیلے شبد، فقرے اور کہاوتیں، سب ایک سے ایک بڑھ کر دل کو موہنے والے بیوہ کے جذبات کی من و عن ترجمانی، سماج کے ظلم وستم اور تباہ کن رسم ورواج کے بیان میں اردو شاعری ہی نہیں دوسری زبانوں کی شاعری بھی اس نظم کی مثال نہیں پیش کر سکتی۔ اسی لیے مناجات بیوہ کے متعدد زبانوں میں ترجمے ہوئے اور کافی مقبول ہوئے۔ یہاں تک کہ سنسکرت میں بھی اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔

دوسری نظم 'چپ کی داد' ہے یہ ترکیب بند میں ہے اور اس میں ۸ بند اور ۶۳ اشعار ہیں۔ یہ مولانا حالی نے ۱۹۰۶ء میں لکھی تھی اس کو حیدرآباد کے جلسے میں جو مہاراجہ سرکشن پرشاد کی صدارت میں ہوا تھا، پڑھی تھی۔ جلسے میں کوئی فرد ایسا نہ تھا جو ہمہ تن گوش ہو کر سن نہ رہا ہو اور جس کا دل و دماغ متاثر نہ ہوا ہو۔ درحقیقت یہ نظم حالی نے تعلیم نسواں کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالنے کے لیے لکھی تھی، لیکن اس کے لیے انھوں نے عورت کی مظلومیت کی پوری تاریخ اور مہد سے لے کر لحد تک اس کی درد بھری اور المناک زندگی کا ذکر کر کے جیسا اور جتنا تاثر پیدا کیا ہے اس سے اصلاح تعلیم نسواں کے لیے حالی کے دردمند دل کا اضطراب اور خلوص ظاہر ہوتا ہے۔ اس کا جواب " اردو تو کیا مشرق کی زبانوں میں بھی بمشکل مل سکے گا

[1] ہندوستانی جلد ۶ حصہ ۳۔ جولائی ۱۹۳۶ء صفحہ ۲۶۰-۲۶۶۔
[2] یادگار حالی صفحہ ۱۹۳ [3] تاریخ ادب اردو- رام بابو سکسینہ صفحہ ۴۱۳

اور یہ بھی حالی کے ان شاہکاروں میں سے ہے جن کا ایک ایک پارہ ان کی بقائے دوام کے لیے کافی ہے۔"؎

نظم کا آغاز مقدس، پاکیزہ اور پیار بھرے رشتے والیوں کے خطاب سے ہوتا ہے۔ ماں سے بڑھ کر محترم اور شفیق کون ہستی ہے؟ جنت اسی کے قدموں کے نیچے ہوتی ہے۔ اولاد کی پرورش و پرداخت میں وہ اپنی ہستی مٹا دیتی ہے۔ سارے سکھ چین اپنے لاڈلے پر قربان کر دیتی ہے۔ اس سے بڑھ کر عظیم اور کون ہو سکتا ہے؟ بہن، کی پاکیزہ محبت کا کوئی جواب ہے؟ وہ اپنے بھائی پر جان نچھاور کرتی ہے بھائی پر اپنا زور اور حق سمجھتی ہے، وہی تو اس کے ماں باپ کی نشانی ہے۔ اس پر ناز نہ کرے تو کس پر کرے؟ وہ جھوٹ موٹ لڑائی جھگڑتی اور جھڑکتی بھی ہے لیکن کیا مجال اس کی محبت، اس کے برتاؤ میں فرق آجائے۔ اور بیٹی وہ تو ماں باپ دونوں کے جگر کا ٹکڑا، آنکھوں کا تارا ہوتی ہے۔ وہی تو ان کی دن رات خدمت کرتی ہے۔ میکے ہو یا سسرال میں، اس کی محبت میں کمی نہیں ہوتی حالی نے پہلا بند انھیں محبت، ایثار و قربانی کی دیویوں کو مخاطب کر کے شروع کیا ہے۔ ان کی خوبیاں، نیکیاں، قربانیاں، ان کی عفت و عصمت، شرم و حیا، سب ایک ایک کر کے بیان کی ہیں:

اے ماؤ! بہنو!! بیٹیو!!! دنیا کی زینت تم سے ہے
ملکوں کی بستی ہو تمہیں، قوموں کی عزت تم سے ہے
نیکی کی تم تصویر ہو، عفت کی تم تدبیر ہو
دین کی تم پاسباں، ایماں سلامت تم سے ہے
فطرت تمہاری ہے حیا، طینت میں ہے مہر و وفا
گھٹی میں ہے صبر و رضا، انساں عبارت تم سے ہے
مردوں میں ست والے جو تھے، ست بیچ اپنا کھا چکے
دنیا میں اے ستونتو! لے دے کے اب ست تم سے ہے

ان پاکیزہ صفات کے باوجود ہندوستانی سماج لڑکیوں کی پیدائش مہا پاپ سمجھتا ہے۔ آخری شعر میں سماج کی اسی ذہنیت کو ظاہر کیا ہے۔

آتی ہو اکثر بے طلب دنیا میں آتی ہو جب تم
پر موہنی سے اپنی یہاں گھر بھر پہ چھا جاتی ہو تم

یہ موہنی میکے میں ماں باپ، بھائی بہن، سب کی خدمت گزار رہتی ہے۔ اطاعت و خدمت کے باوجود وہ اپنے کو سارے گھر کا مالک سمجھتی ہے۔ باپ کی غم خوار، ماں کی تابعدار، بھائی بہن کی خدمت گزار، اس سے بڑھ کر اور کون ہو سکتا ہے اور پھر جب قانونِ فطرت کے بموجب اس کو اپنے "بابل کا گھر اور دیس" چھوڑ کر سسرال جانا پڑتا ہے تو ماں باپ بھائی بہن یار اور میکے کا راج سب چھوٹ جاتا ہے ایک نئی دنیا سے ماحول اور نئے لوگوں سے سابقہ ہوتا ہے۔ وہاں کا عالم ہی دوسرا ہوتا ہے۔ ہر وقت یہی دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کوئی ناخوش نہ ہو۔ اپنی ہر خواہش کو سسرال اور سسرال والوں پر قربان کرنا پڑتا ہر قسم کی تکلیفیں سہنا اور اُف نہ کرنا۔ ہر وقت یہی فکر کہ:

بدلے نہ شوہر کی نظر، سسرے کا دل میلا نہ ہو
آنکھوں میں ساس اور نند کی کھٹکو نہ مثلِ خار تم
پالا بڑوں سے گر پڑے، بدخو ہوں سب چھوٹے بڑے
چتون پہ میل آنے نہ دو، گو دل میں ہو بے زار تم
غم کو غلط کرتی رہو، سسرال میں ہنس بول کر
شربت کے گھونٹوں کی طرح پیتی رہو خونِ جگر

تیسرے اور چوتھے بند میں بچوں کی ولادت، ان کی پرورش و پرداخت اور تعلیم و تربیت کا ذکر ہے۔ شادی کے بعد ہر ایک کو اولاد، کی خواہش ہونا نومولود کی آمد پر سسرال اور میکے میں خوشیوں کی دھوم مچنا پھر ماں کا بچہ کے لیے اپنا سکھ چین سب قربان کر دینا، بیماری دکھی میں اک اک پل کا سے نہ کٹنا غرض دس برس تک وہ اسی طرح اپنے بچے کی نگہداشت کر کے مشکل ترین مہم سر کر لیتی ہے:

کی ہے مہم جو تم نے سر، مردوں کو اس کی کیا خبر
جانے پرائی پیر وہ، جس کی بوائی ہو پھٹی

؎ حالی کا ذہنی ارتقاء - ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صفحہ ۱۹۲-

تھا پالنا اولاد کا مردوں کے بوتے سے سوا
آخر یہ اے دکھیا رہیو بخدمت تمھارے سر پڑی
پیدا اگر ہوتیں نہ تم، بیڑا نہ ہوتا پار یہ
چیخ اٹھتے دو دن میں اگر مردوں پہ پڑتا بار یہ

یہ انھیں کی نگرانی اور نگہبانی کی کرامت ہے کہ دنیا آباد اور گل و گلزار ہوئی، مصلح، واعظ، عالم، حکیم، مدبر، دانا، مورخ، فلسفی، وزیر، بادشاہ وغیرہ جیسے مشاہیر و یکتائے زمانہ پیدا ہوئے اور رہتی دنیا تک اپنا نام اور کام زندہ کر گئے کتنی سچی بات، اور کس سادگی سے کہہ رہے ہیں:

کیا پھول پھل یہ سب، انھیں کمزور پودوں کے نہ تھے
سینچا تھا ماؤں نے جنھیں خونِ جگر سے اپنے یاں
کیا صوفیان باصفا، کیا عارفان باخدا
کیا انبیار، کیا اولیار، کیا غوث، کیا قطبِ زماں
سرکار سے مالک کی جتنے پاک بندے ہیں بڑھے
وہ ماؤں کی گودوں کے زینے سے ہیں اوپر چڑھے

لیکن اس کے احسانات، اور خدمات کا بدلا دنیا نے کیا دیا؟ اس کا ادب و احترام اس کی محبت اور عظمت اس کی جانثاری اور قربانی سب کچھ بھلا دیا۔ اس پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے، اس کو ذلیل و رسوا کیا، اس کو قتل کیا زندہ دفن کیا، چتا پر جیتے جی جلایا، کوئی اذیت، کوئی مصیبت ایسی نہ تھی، جو اس کو نہیں دی لیکن وہ صبر و رضا کی دیوی سب کچھ برداشت کرتی رہی۔ زبان سے اُف تک نہ کی۔ مگر سب بے سود:

تم سخت سے سخت امتحان دیتی رہیں، پر رائیگاں
کیں تم نے جانیں تک فدا، کہلائیں لیکن بے وفا
گو صبر کا اپنے نہ کچھ تم کو ملا انعام یاں
پر جو فرشتے سے نہ ہو وہ کر گئیں تم کام یاں
کی تم نے اس دارِ محن میں جس تحمل سے گزر
زیبا ہے گر کہیے تمھیں فخرِ بنی نوعِ بشر

اور اگر کبھی مردوں نے اس نصف بہتر کا کچھ خیال بھی کیا، تو قید و بند کے ساتھ: علم و فن کی محرومی کے ساتھ

گو نیک مرد اکثر تمھارے نام کے عاشق رہے
پر نیک ہوں یا بد رہے سب متفق اس رائے پر
جب تک جیو تم، علم و دانش سے رہو محروم یاں
آئی ہو جیسی بے خبر، ویسی ہی جاؤ بے خبر
جو علم مردوں کے لیے سمجھا گیا آبِ حیات
ٹھیرا تمھارے حق میں وہ زہرِ ہلاہل سر بسر
دنیا کے دانا اور حکیم اس خوف سے لرزاں تھے سب
تم پر مبادا، علم کی پڑ جائے پرچھائیں کہیں
ایسا نہ ہو مرد اور عورت میں رہے باقی نہ فرق
تعلیم پا کر آدمی بننا تمھیں زیبا نہیں
آتا ہے وقت انصاف کا، نزدیک ہے یوم الحساب
دنیا کو دینا ہوگا، ان حق تلفیوں کا دا ان جواب

مصبتیں جھیلتے ہوئے جگ بیت گیے اور صبر و تحمل کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹا، آخر تا بکے، صبر کا پھل میٹھا نہ ہوتا حیف کی داد نہ ملتی، پتھر دل نہ پگھلتے۔ اور رحمت باری جوش میں نہ آتی۔

یہ کیسے ممکن تھا خدا کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں
آخر تمھاری چپ دلوں میں اہل دل کے چبھ گئی
سچ ہے جپ کی داد آخر بے ملے رہتی نہیں
بارے زمانہ نیند کے ماتوں کو لایا ہوش میں
آیا تمھارے صبر پر دریائے رحمت جوش میں

حق تلفیوں، محرومیوں اور ناکامیوں کا دور ختم ہونے والا ہے۔ اصلاح و تعلیم نسواں کے لیے بیداری ہوتی جارہی ہے:

نوبت تمھاری حق رسی کی بعد مدت آئی ہے
انصاف نے دھندلی سی اک اپنی جھلک دکھلائی ہے
گو ہے تمھارے حامیوں کو مشکلوں کا سامنا
پر حل ہر اک مشکل یوں ہی دنیا میں ہوتی آئی ہے
اٹکے ہیں روڑے نیکی کی گاڑی میں سچائی کے سدا
پر فتح جب پائی، سچائی ہی نے آخر پائی ہے

سچائی کی اس گاڑی کو زمانے نے پہچان لیا ہے۔ اب تعلیم نسواں کے حامی پیدا ہوتے جا رہے ہیں اب ان کی جہالت کا دور ختم ہو گیا۔ ہمدردان وحامیانِ ملک و ملت تعلیم نسواں کی توسیع و اشاعت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ حالی اب انھیں سے مخاطب ہیں :

اے بے زبانوں کی زبانو! بے بسوں کے بازوؤ
تعلیم نسواں کی مہم جو تم کو اب پیش آئی ہے
یہ مرحلہ آیا ہے پہلے تم سے جن قوموں کو پیش
منزل پہ گاڑی ان کی استقلال نے پہنچائی ہے
ہے رائی بھی پربت، اگر دل میں نہیں عزم درست
یہ ٹھان لی جب جی میں پھر، پربت بھی ہو تو رائی ہے
یہ جیت کیا کم ہے کہ خود حق ہے تمھاری پشت پر
جو حق پہ منھ آیا ہے آخر اس نے منھ کی کھائی ہے

نہ صرف اپنے معاصرین اور حلقۂ احباب میں، بلکہ شاید پورے ہندوستان میں، عورتوں کے حقوق کی حفاظت، اور ان کی تعلیم کی حمایت کا حالی ہی نے سب سے پہلے موثر قدم اٹھایا حالی نے تیسری نظم 'بیٹیوں کی نسبت، پر لکھی ہے یہ چند اشعار کا ایک چھوٹا سا قطعہ ہے لیکن اس میں یہ ثابت کیا ہے کہ آج کا دور، عرب کے جاہلیت کے دور سے بدرجہا بدتر ہے جب سنگدل باپ لڑکی کو پیدا ہوتے ہی زندہ دفن کر دیتا تھا۔ آج ماں باپ عام طور پر

چھان بین اس کی تو کرتے ہیں کہ گھر کیسا ہو
پر نہیں دیکھتا یہ کوئی کہ کیسا ہو بَر
بد مزاجی ہو، جہالت ہو، کہ ہو بدچلنی
کچھ بُرائی نہیں ذہ تو نتا ہے داماد اگر

یہ وہی نا تہذیبی ریت ہے کہ جس کے کارن بکریاں بھیڑیوں سے پاتی ہیں پیوند اکثر اور یہ بھیڑیے دولت کی ہوس میں معصوم لڑکیوں کی خودکشی کا باعث ہوتے ہیں۔ اکثر بلکہ زیادہ تر وہ خود ان کو جلا کر مار ڈالتے ہیں۔ آج کل تو آئے دن یہ دردناک واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ دختر کشی کی رسم سے صرف لڑکی کی جان جاتی تھی اور آج کی رسم لڑکی کے ساتھ ماں باپ کو بھی زندہ درگور کر دیتی ہے :

ساتھ بیٹی کے مگر اب پدر و مادر بھی
زندہ درگور سدا رہتے ہیں اور خستہ جگر
اپنا اور بیٹیوں کا جبکہ نہ سوچیں انجام
جاہلیت سے کہیں ہے وہ زمانہ بدتر

حالی کی یہ صدائے درد رائیگاں نہیں گئی۔ ہندوستان آزاد ہوا۔ اور اس کے مایۂ ناز سپوت جواہر لال نہرو نے 'عقد بیوگان، کا قانون پاس کرایا۔ تعلیم نسواں عام ہوئی۔ لڑکیوں کی شادی پر مال و دولت اور جہیز دینا قانوناً ممنوع ہوا۔ سماج میں کچھ کچھ بیداری پیدا ہوئی۔ اگرچہ رسم و رواج کی جڑیں اتنی مضبوط ہیں کہ ان کوششوں کے باوجود اب بھی یہ لعنت موجود ہے۔ مگر حالی نے تو پوری محفل کو ہلا کے چھوڑا۔

حالی اٹھا ہلا کے محفل کو آخر اپنا کہا کیا تو نے

معاونین نیا دور سے ایک گذارش

نیا دور میں اشاعت کے لیے مضامین اور شعری تخلیقات کی ایک کثیر تعداد جمع ہو گئی ہے۔ لہذا کوئی غیر طلبیدہ مضمون یا شعری تخلیق فی الحال تین ماہ تک ارسال کرنے کی زحمت نہ فرمائیں۔ اس سلسلے میں ادارہ کسی قسم کی خط و کتابت سے بھی معذور ہے۔

———ادارہ

رازؔ الہ آبادی
۳۰۔ بہادر گنج الہ آباد ۲۱۱۰۰۳

غزل

ہر ایک شخص کو حاصل غم حبیب کہاں
تمہاری یاد میں رونا مجھے نصیب کہاں

یہ سب تمہارے کرم پر ہے منحصر ورنہ
تمہاری بزم کہاں اور یہ غریب کہاں

میں اپنی جاگتی آنکھوں سے آج پوچھوں گا
جگا کے سو گیا مجھ کو مرا نصیب کہاں

مسافتوں کے سمندر رہیں بیچ میں حائل
جنھیں قریب میں سمجھا ہوں وہ قریب کہاں

بس ان کے دیکھنے والوں کو دیکھ لیتا ہوں
خود ان کو دیکھ سکوں یہ مرا نصیب کہاں

نہ ملتے خاک میں ملتا جو آپ کا دامن
ہمارے اشک مگر اتنے خوش نصیب کہاں

قلم اٹھاؤں میں کیا ان کی بے وفائی پر
یہ واقعہ ہے مگر واقعہ عجیب کہاں

تمھیں پہ ناز تھا تم نے بھی پھیر لی آنکھیں
بنے گا اب مرا بگڑا ہوا نصیب کہاں

ہر ایک شاخ پہ صیاد کی نگاہیں ہیں
نشیمن اپنا بنائے اب عندلیب کہاں

بس ایک ان کی نگاہوں کے ماسوائے رازؔ
ہمارے درد کا اس دور میں طبیب کہاں

نصرؔ قریشی
۴۷۷ چوہٹیا
بہادر گنج، الہ آباد ۳

عید آئی ہے

عید آئی ہے، نئے رنگ کی برسات ہوئی
صبح رنگین، حسیں شام، حسیں رات ہوئی
روپ کا رنگ نکھرنے لگا ہر رنگ لیے
زلف کی چھاؤں میں رنگین ملاقات ہوئی
بزم یاراں میں چھڑی زلف کی رخسار کی بات
آج رنگین بہت بزم خیالات ہوئی
عید کا نور غم دل کی سیاہی چاٹے
بات ہی بات میں شرح غم حالات ہوئی
پھیکے، بے رنگ نظاروں کو ملا پیار کا رنگ
گھل کے ہر بستی میں پھر بارش نغمات ہوئی
عید کے رنگ سے گلنار ہوئی ساری فضا
کتنی گلرنگ سی یہ گردش اوقات ہوئی
دیس، پردیس سے آئے ہیں یہ رنگین خطوط
رنگ جذبات لیے یادوں کی برسات ہوئی
تشنہ کاموں کے لیے جام مسرت لائی
شام ہوتے ہی جواں بزم خرابات ہوئی
پیار کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہر شخص لگے
دشمن جاں سے بھی ہنس ہنس کے ملاقات ہوئی
عید آئی ہے مسرت کے خزانے لے کر
غمزدوں کے لیے خوشیوں کی بارات ہوئی
سرحد دل میں محبت کے ترانے جاگے
سونے ماحول میں نغمات کی برسات ہوئی
بادۂ مست سے لبریز ہے یہ عید کا دن
عید آتے ہی ہر اک سمت نئی بات ہوئی
غم کی راہوں میں حسیں پھول بچھائیں آؤ
عید کے روز حسیں محفل جذبات ہوئی
نصرؔ یہ پیار کا موسم ہے، ہنسی ہیں کلیاں
عید تو سب کے لیے پیار کی سوغات ہوئی

تسنیم فاروقی
باغ قاضی لکھنؤ ۳

غزل

ملتی ہے کچھ گناہ میں لذت سوا مجھے
یہ جانتا ہوں دیکھ رہا ہے خدا مجھے

اس مشغلے کو سوچ سمجھ کر نہ کیجیے
ہر دل یہ چاہتا ہے کوئی چاہتا مجھے

دستِ غرض نے شمع بجھا دی ضمیر کی
سچ بولنے سے پہلے خریدا گیا مجھے

ہستی کی جستجو میں چلا جا رہا تھا میں
اک اجنبی نگاہ نے اپنا لیا مجھے

کچھ اس کو دیکھنے کے بھی آداب چاہیے
خود ہی مری نگاہ نے رسوا کیا مجھے

پی کر تو اور بڑھ سی گئی زندگی کی پیاس
اس کو بھلا رہا تھا وہ یاد آگیا مجھے

بڑھتا ہی جا رہا تھا سفر اعتبار کا
اچھا کیا کہ آپ نے چونکا دیا مجھے

تسنیم تھک کے بیٹھ گیا ہوں میں راہ میں
حسرت سے دیکھتا ہے مرا راستا مجھے

ساحر لکھنوی
۵۰ سی۔ میدان ایلچ خاں
لکھنؤ ۳

غزل

یوں بزمِ گل رخاں میں وفا آشنا رہے
جیسے کہ دستِ ناز میں رنگِ حنا رہے

تکمیلِ آرزو کے لیے عمر چاہیئے
کب تک حسین خواب کوئی دیکھتا رہے

ہم بابِ مصلحت پہ جبیں خم نہ کر سکے
کچھ لوگ اس قصور پہ ہم سے خفا رہے

دیوانہ تم نے مجھ کو کہا، ٹھیک ہے مگر
میں "مرکزِ نگاہ" جو کہہ دوں تو کیا رہے

برکھا کی بھیگی رت میں، شبِ ماہتاب میں
ہم بھی کسی حسیں کے لبوں کی دعا رہے

ساحر اسی کا نام ہے شاید کہ زندگی
انسان صرف پیکرِ ارماں بنا رہے

بلقیس بنارسی
ڈی ۲۹ ڈیلوگلی۔ قاضی پورہ
کلاں بنارس

سپنے

روپ رنگھاؤں کی دنیا کے سجیلے سپنے
بند آنکھوں ہی میں آتے ہیں لجیلے سپنے
بجوا ہوتے ہیں اس درجہ ہٹیلے سپنے
چٹکیاں لیتے ہیں رہ رہ کے کٹیلے سپنے

اب بھی ویرانوں میں یہ دیپ جلا دیتے ہیں
کتنی سنسان منڈیروں کو سجا دیتے ہیں

ملبلی نیند میں جب آتے ہیں چنچل سپنے
بے کلی اور بڑھا دیتے ہیں بے کل سپنے
دل میں اک آگ لگا دیتے ہیں کومل سپنے
رس بھری آنکھوں کو کر دیتے ہیں جل تھل سپنے

بھولی بسری ہوئی یادوں کو جگا دیتے ہیں
یوں کبھی سپنے کبھی ہلچل سی مچا دیتے ہیں

ایسے ایسے بھی دکھا دیتے ہیں منظر سپنے
ان کی آغوش میں رکھتے ہیں مرا سر سپنے
غم کی دنیا کو لگا دیتے ہیں ٹھوکر سپنے

جب بھی سپنوں کی گھنی چھاؤں میں نیند آتی ہے
زندگی ایک نئے موڑ پہ آ جاتی ہے

جب دکھانے ہی پہ آتے ہیں جوانی سپنے
بن کے آتے ہیں تمناؤں کی رانی سپنے
اور سناتے ہیں کبھی میری کہانی سپنے
یوں بناتے ہیں مری سیج سہانی سپنے

دیکھتے دیکھتے بلقیس میں کھو جاتی ہوں
ایک انجان سی آغوش میں سو جاتی ہوں

بسنت کمار بسنت ایڈوکیٹ
۳۹۔ ٹیڑھی باز ار رکاب گنج۔ لکھنؤ

عہدِ نَو

دوستو! آج ہمیں عہد نیا کرنا ہے
عہد وہ جس سے غم و کفر کے بادل چھٹ جائیں
عہد وہ جس سے اماں مفلس و بیکس پائیں
عہد وہ جس سے بہار آئے ہنسیں سب گائیں

دوستو! آج ہمیں عہد نیا کرنا ہے

عہد وہ جس سے رہِ حق پہ اٹھیں اپنے قدم
عہد وہ جس سے خوشی آئے مٹیں سب کے غم
شادمانی کی کرن پھوٹے مٹے رنج و الم

دوستو! آج ہمیں عہد نیا کرنا ہے

عہد وہ جس سے گلستاں میں بہار آ جائے
پھول تو پھول ہیں کلیوں پہ نکھار آ جائے
چین مل جائے ہر اک دل کو قرار آ جائے

دوستو! آج ہمیں عہد نیا کرنا ہے

عہد وہ جس سے خوشی آئے مٹے رنج و محن
عہد وہ جس سے پھلے پھولے فسردہ گلشن
عہد وہ لائے جو ہر لب پہ مسرت کی کرن

دوستو! آج ہمیں عہد نیا کرنا ہے

معین الدین حسن کاکوروی
شیخ منزل۔ تذعاری لین لال باغ لکھنؤ

ناصر میاں فرنگی محلی

کچھ یادیں کچھ باتیں

اس چمن ہستی میں بے شمار پھول کھلے اور اپنی اپنی نت نئی مہک پھیلا کر آغوشِ خاک میں جا چھپے۔ نہ معلوم کتنے دُرِ خوش آب زینت کلاہِ کج ادایاں نہ بن سکے، اسی طرح نہ معلوم کتنی ہستیاں جو کاکلِ گیتی کا نکھار اور رخِ ہستی کا سنگار تھیں، اس پردہ خاک سے ابھریں اور اپنی آب و تاب سے چشمِ عالم کو خیرہ کرکے چل بسیں۔ انھیں منتخب روزگار ہستیوں میں مولانا ناصر میاں بھی تھے۔ جن کی یاد کے نقوش زمانہ کی سیل آسا رو سے بلند ہیں اور جن کی خوشگوار یادیں ان کے جاننے والوں اور محبت کرنے والوں کے دلوں کا ایک بے بہا سرمایہ بن گئی ہیں۔ بقول شاعر ؎

ذہن سے محو ہوئے عہدِ گزشتہ کے نقوش
ایک تیری یاد ہے ایسی جو فراموش نہیں

اور پھر اس تیرہ روزگار اور پر آشوب دورِ حیات میں جبکہ آج کا انسان انس و محبت، پاس وضع تواضع، رواداری، مروت، وسیع النظری اور بلند اخلاقی کے اعلا اقدار کو یکسر بھلا بیٹھا ہے ایک ایسے انسانیت نواز اور انسان دوست شخصیت کا اٹھ جانا کہ جس کی ذات و صفات کی بلندی سے ایک عالم فیضیاب ہو رہا تھا، ایک ایسا روح فرسا سانحہ، ایک ایسا دلدوز حادثہ ہے جس کی تلافی محال اور جس کا زخم ناقابلِ علاج ہے۔ مولانا ناصر میاں بھی اس خزاں رسیدہ چمنِ ہستی کے گلِ شاداب تھے۔ وہ ان غنیمت ہستیوں میں تھے جن کا نعم البدل ناممکن سا معلوم ہوتا ہے۔ وہ ایک تابندہ دماغ اور غمِ انسانیت سے پُرسوز دل کے مالک تھے، ان کی وفات ایک عہد ایک دور تہذیب کی موت ہے۔ ان کی دلکش، دلآویز، دل آرا اور دل نواز شخصیت، طریقت اور شریعت کا عطر مجموعہ تھی جس نے اپنے حسنِ اخلاق کی نکہت جانفزا سے ایک عالم کو مہکا دیا۔ جن کی ذات میں وہ تمام صفات عالیہ بیک وقت جمع ہو گئے تھے جن سے زلفِ ہستی بنتی، نکھرتی اور سنورتی ہے۔ ناصر میاں خلوص، اخلاص، دلسوزی، مروت، رواداری اور ایثار کے پیکر مجسم تھے۔ ان کو دیکھ کر سلف صالحین کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ ان کے صفائے باطن سے دل کی صیقل ہوتی اور جن کی ایک نگاہ توجہ سے بصارت کو بصیرت کی دولت بیدار ہاتھ آتی۔ کردار کی تعمیر، شخصیت کی تشکیل ایک عمل پیہم اور مسلسل جد و جہد ہے۔ بقول حالی مرحوم نیشِ عشق گوارا کرنے کے لیے اور زخمِ جگر کی لذت حاصل کرنے کے لیے ایک عمر چاہیے کردار کی بلندی اور اس کی بافت مدت اور شدت کا حاصل ضرب ہے۔ یہ تپش پروانہ، یہ گداز شمع اور یہ اضطراب بلبل ہر شخص کے بس کی بات نہیں اس کے لیے قسام ازل نے روزِ ازل ہی سے کچھ مخصوص دل چن لیے ہیں، یہ بادۂ محبت ساقی ازل ظرف قدح خوار کو دیکھ کر اور پرکھ کر عطا کرتا ہے۔ مولانا ناصر میاں بھی اسی سوز و درد اسی غم و غمگینیٔ دل سے نوازے گئے تھے۔ جس کے باعث انھیں چشمِ پر آشوب کی دولت، فغان نیم شبی کی لذت اور نالہ ہائے صبح گاہی کی نعمت قدرت سے عطا ہوئی اور یہی حُبِّ انسانی انسانیت ان کے لیے قربِ الٰہی کا ذریعہ بن گئی۔ اور جس نے ان کے دیدۂ اعتبار کے سامنے سے حجاباتِ نظر دور کرکے ان کو رازِ ہستی کا

اور مقصدِ حیات کا راز داں بنا دیا۔ انسان دوستی، ذوقِ حق گوئی اور حق شناسی، خوفِ الٰہی، فرائض کا شدید حسن خیال اور حسن عمل میں ہم آہنگی، یہ جذبے ان کی زندگی کے بنیادی محرکات بن چکے تھے جن پر وہ تا زندگی سختی سے عمل پیرا رہے اور میر کے اس شعر کی جیتی جاگتی تفسیر بن گئے ؂

یک رنگیوں کی راہیں طے کر کے مر گیا ہے
گل کی رگیں نہیں ہیں، ہے نقشِ پائے بلبل

ناصر بھائی نہایت سیر چشم، فیاض طبیعت تھے، تواضع، اعزا و اقربا کے ساتھ رکھ رکھاؤ، خاطر مدارات ان کی طبیعت ثانیہ بن چکے تھے۔ کھلانے، پلانے کے وہ بہانے ڈھونڈا کرتے تھے۔ سال بھر میں مشکل سے کچھ دن ایسے ہوتے جب ان کے یہاں دعوتوں کا اہتمام نہ ہوتا۔ خاندان کے بزرگوں کے وصال کی تاریخوں پر پابندی سے فاتحہ ہوتے لیکن اور بہت سے مواقع بھی انھوں نے پیدا کر رکھے تھے۔ آج پوتے کی سالگرہ ہے کل دارالافتا کے قیام کے لیے مجلسِ مشاورت طلب ہو رہی ہے۔ خوشبودار کشمیری چاء اور شیرمال سے تواضع ہو رہی ہے۔ کھلا رہے ہیں اور خوش ہو رہے ہیں۔ ماہ رمضان میں روزہ افطار کرنے کے لیے تمام معتقدین اور دوستوں کو باصرار بلاتے، یہ مہینہ بڑی ہماہمی اور رونق کا ہوتا ہے۔ نشست گاہ، حاضرین سے پُر ہو جاتی، وہ جو کچھ آتا بے دریغ خرچ کرتے اور کبھی فکر فردا اور اندیشہ ہائے دور دراز سے اپنے پاک و پاکیزہ لمحات کو برباد نہیں کرتے تھے، وہ وقت پر نظر رکھتے تھے اور ہمیشہ آرزو کے اس شعر پر کاربند رہے ؂

پھولوں میں باس ہے پھل میں رس جو ہے وہ اور ہی
آس نہ توڑ جی نہ چھوڑ جتنی بہوں بلائے جا!

قناعت، توکل اور خودداری ان کے کردار کے اہم صفات تھے، جن کے باعث لوگ ان کی بزرگی کے قائل اور ان کی دل سے عزت کرتے تھے، میرا چشم دید واقعہ ہے وہ میرے یہاں میری بڑی پھوپھی کے انتقال کے موقع پر تعزیت کے لیے تشریف لائے۔ اس موقع پر میرے بھانجے اعتضاد تعلقہ دار رسول پور بھی موجود تھے۔ ان کے خاندان کے بزرگ، مولوی نعیم صاحب مولوی اسلم صاحب کے مرید تھے۔ اسی رشتہ کی وجہ سے اعتضاد میاں مرحوم نے ان کو نذر پیش کی لیکن ناصر بھائی نے نہایت لجاجت سے یہ کہتے ہوئے نذر قبول نہیں کی کہ اعتضاد میاں یہ موقع نہیں کہ آپ نذر کی تکلیف و تکلف کریں۔ موقع و محل کے لحاظ سے بات کرنا اور معاملات برتنا ان کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ اپنے اصولوں میں سخت تھے اور بے خوفی سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے وہ نہ شخصیتوں سے مرعوب ہوئے اور نہ کبھی مصلحت اندیشی کے قائل رہے۔ ان کا ضمیر بیدار تھا اور انھوں نے کبھی اس کا خیال نہیں کیا کہ ان کے حق گوئی سے انھیں فائدہ پہنچے گا یا نقصان، وہ سود و زیاں کے اندیشوں سے ہمیشہ بے نیاز رہے۔ خودداری کے مسئلہ میں وہ بے حد حساس تھے اور جب کبھی ان کی عزتِ نفس پر آنچ آتی تو وہ مظہرِ جمال ہوتے ہوئے بھی شانِ جلال میں نظر آتے۔ خاکساروں سے معاملت میں وہ ہمہ تن انکسار تھے لیکن سربلندوں اور اہلِ دولت سے وہ ہمیشہ وقار سے ملتے اور اپنے کو لیے دیے رہتے۔ وہ فقر کے بوریہ پر ایک آن ایک شان سے مسند نشین رہے اور میر تقی میر کے اس شعر کا مصداق تھے ؂

در پہ شاہوں کے نہیں جاتے فقیر اللہ کے
سب جہاں رکھتے ہیں سر واں ہم قدم رکھتے نہیں

مولانا ناصر میاں میرے حقیقی ہم زلف تھے۔ تقریباً تیس پینتیس سال تک میرا ان کا بہت قریب کا ساتھ رہا۔ میں نے جلوت کی محفلوں میں ان کو ایک صوفی اور ایک فقیہہ کی شان سے دیکھا اور جانا، خلوت کی صحبتوں میں ان کو قریب سے بے تکلفی کے عالم میں بھی پرکھا۔ لیکن ان کو ہر رنگ اور ہر صورت میں ہمہ شفقت، ہمہ محبت پایا اور ان کے عمل اور خیال میں مکمل یک رنگی اور ہم آہنگی تھی۔ سب سے اچھا انسان وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لیے اچھا ہو۔ وہ ایک خوش مزاج اور روادار شوہر، ایک شفیق باپ اور اپنی بہو کو بیٹی کی طرح برتنے والے محبتی خسر تھے۔ باوجودیکہ ہم دونوں کے مزاجوں میں کافی تفاوت اور فرق

تھا لیکن اس تیس سال کے طویل عرصے میں کبھی کوئی ناگواری کوئی رنجش کا موقع نہیں آیا۔ ان کا رکھ رکھاؤ، حفظ مراتب اعلیٰ قدری، ان کی طبیعت کا ٹھہراؤ، ان کے مزاج کا توازن۔ بردباری، لہجہ کی نرمی، آواز کی شیرینی دل میں گھر کرتی رہی اور یہ تعلقات یوماً فیوماً بڑھتے ہی رہے۔ اور شجر اخلاص اور خلوص کے سایہ میں ہمیں بڑی راحت اور بڑا سکون ملا بلکہ بعض وقت جب میں ان سے ملنے جاتا تو وقت کا احساس ہی باقی نہ رہتا بقول شاعر ؎

ہم ان سے مل کے بھول گئے کلفتیں تمام
گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا

ناصر بھائی دن اور رات میں صرف دوپہر میں کھانا کھاتے تھے۔ میں اکثر و بیشتر یا تو شریک طعام ہوتا (اگر دسترخوان پر کوئی لذیز چیز ہوتی) ورنہ پاس بیٹھ جاتا، وہ کھانا کھاتے رہتے اور بڑی بے تکلفی سے ہنسی مذاق کی باتیں ہوا کرتیں لیکن اس بے تکلفی میں بھی تکلف رہتا اور یہ مزاح یہ تفریحی گفتگو بھی حفظ مراتب کے تمام آداب کے ساتھ ملحوظ رکھی جاتی۔ ان کو اپنی تعریف سے سخت چڑھ تھی۔ میں چڑھانے اور ستانے کے طور پر اکثر کہتا: "بھائی مجھے اپنی نرم خوئی، شیریں گفتاری، بھولی بولی کے گر بتا دیجیے تو ایک خفیف سی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر دوڑ جاتی اور وہ گردن جھکا کر بڑے نرم لہجے میں جواب دیتے "بھائی معین الدین صاحب لکھنؤ میں مدتوں رہتے رہتے آپ میں لکھنویت بہت آگئی ہے!"۔ ایک مرتبہ میں نے ایک صحبت احباب میں بڑے فخر سے کہا کہ ایک عالم سے میری لڑائی ہوتی رہی لیکن ناصر بھائی سے کبھی کوئی تلخی، کوئی ناگواری کی صورت نہیں پیدا ہوئی۔ اس موقع پر میرے ایک بے تکلف دوست بھی بیٹھے ہوئے تھے اور فقرے چست کرنے میں بڑے ماہر، برجستہ بولے تو پھر اس میں آپ کی کیا تعریف؟ یہ تو ناصر میاں کی وضعداری اور بردباری ہے کہ وہ آپ جیسے شخص سے بہ ہمہ وجوہ نباہ کر رہے ہیں۔ میں یہ حد انگتی بات سن کر لاجواب ہو گیا۔ واقعی ان کی یہ رائے بادن تولے پاؤ رتی درست تھی۔

قلم حیران ہے! کون کون سی باتیں بتائی جائیں اور کسے چھوڑا جائے۔ وہ ان کا مسکراتے ہوئے معانقہ کرنا، وہ اتباع رسول میں پیشانی پر مہر نبوت ثبت کرنا، وہ بچیوں اور بچوں کے سروں پر شفقت سے ہاتھ رکھنا وہ دل میں کھب جانے والی رسیلی بولی یاد آ کر خون کے آنسو رلا رہی ہیں۔ آشفتہ حالوں کی جمعیت خاطر کا سامان اور پریشاں حال دلوں کے زخموں کا مداوا چند لمحوں کی صحبت میں مل جاتا اور ان کے تسلی اور دلاسے کے جملے سکون قلب کا ساز و برگ فراہم کرتے۔ اب تو یہ حال ہے کہ ؎

جب ترا نام لیجئے تب چشم بھر آوے
اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

آپ نے مولانا ناصر میاں کی گھریلو زندگی کی کچھ جھلکیاں دیکھ لیں۔ آئیے ان کی باہر کی زندگی کے کچھ حالات سنیے۔ ان کا مشرب تصوف اور ان کا مسلک انسان دوستی تھا۔ وہ ہر فرقے، ہر مذہب، ہر مکتب خیال کے لوگوں سے نہایت محبت اور خلوص سے ملتے تھے۔ وہ ایک بلند پایہ عالم اور فقیہہ تھے لیکن ان میں علم کا پندار اور غرور چھو کر نہیں گزرا تھا۔ وہ خاکسار تھے، سب سے جھک کر ملتے تھے لیکن اہل دولت سے ان کی امارت کے باعث کبھی مرعوب نہیں ہوتے تھے، ان کے یہاں خاکساروں سے خاکساری تھی لیکن سربلندوں سے انکسار نہ تھا، جو بھی ان سے ملتا۔ ان کے حسن اخلاق کا گرویدہ ہو جاتا۔ فعال سیاست اور اس کے جوڑ توڑ سے وہ ہمیشہ دامن کشاں رہے۔ لیکن اپنے خیالات میں وہ پکے قوم پرور تھے۔ ملک و ملت کی فلاح و بہبودی کے لیے دعا گو اور فکر مند رہے۔ وہ سراپا پیکر مہر و وفا تھے اور قومی ہم آہنگی کے ایک جیتا جاگتا نشان۔ ان کے یہاں ہر ملت ہر مذہب کے ماننے والوں کے لیے دروازے باندازِ گل آغوش کشا رہتے تھے۔ وہ انسانیت کے اس مقام پر پہنچ چکے تھے جہاں مذہبی حد بندیاں ٹوٹ چکی تھیں۔ جہاں محبت کی جلوہ آرائیاں اور خیر سگالی کا حسن ہر تعلق ہر رشتے میں چار چاند لگا رہا تھا۔ وہ چمن زار ہستی میں گل و یاسمن کی طرح مہکے اور نسیم صبح کے جھونکے کی طرح اس

جہانِ گزراں سے رخصت ہو گئے ۔ وہ اپنی جدائی کا غم اور اپنے یادوں کے انمٹ نقوش چھوڑ گئے جن سے ہزارہا دل منور و تاباں ہیں۔

ایک بلند انسان کی تشکیل شخصیت اور تعمیر کردار میں مختلف عوامل، گوناگوں اثرات اور بیرونی حالات کارفرما ہوتے ہیں، نسلی خصوصیات، معاشرتی رجحانات، عمرانی تصورات اور خاندانی روایات یہ سب مل جل کر انسان کی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کرتے ہیں۔ اور اس کی قوتوں کو ابھارتے ہیں جس سے اس کی انفرادیت نمایاں ہوتی ہے اور اس کے ہم عصروں سے ایک امتیاز عطا کرتی ہے۔ ناصر میاں بھی اپنے اسلاف کے اوصاف عالیہ کے حامل و مظہر تھے وہ حضرت ابوایوب انصاری صحابیِ رسول کی اولاد سے تھے جنھیں مدینہ میں اول اول میزبانیِ رسولؐ کا شرف حاصل ہوا تھا، ان کے مزاج میں عربی سادگی، وقار اور تواضع اکٹھا ہو گئے تھے ان میں عجمی کج کلاہی رکھ رکھاؤ کا بانکپن اک اک ادا سے نمایاں تھا۔ ناصر میاں نے جس دور میں آنکھیں کھولیں اور ہوش سنبھالا وہ دور فرنگی محل کا دورِ زریں تھا۔ ہر گھر میں علم و فضل کا چرچا تھا، ناصر میاں کے مورث اعلیٰ حضرت قطب الدین صاحب کا وطن مالوف سہالی تھا۔ وہ ایک آبائی جائداد کے نزاع میں کچھ بے رحم اعزا کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ آپ کے صاحبزادے ملا نظام الدین اس وقت نہایت کم سن تھے اور صغیر سنی ہی میں دل پہ داغ یتیمی اٹھائے لکھنؤ آئے۔ شاہ وقت نے اس المیہ سے متاثر ہو کر فرنگی محل کا وسیع محل اور اس کی گرد و پیش ان کے قیام کے لیے عنایت کی اور سارا کنبہ یہیں آباد ہو گیا۔ ملا نظام الدین نے جملہ علوم منقولی اور معقولی میں تکمیل کی اور ان کا درس نظامیہ تمام عالم اسلامی کے مدرسوں کا دستور العمل بن گیا اور نہایت مقبول ہوا، پھر علم ظاہر سے پوری طرح سیراب ہونے کے بعد جب علم باطنی کی جستجو ہوئی تو سید شاہ عبدالرزاق بانسوی کے مرید ہوئے اور اس طرح شریعت نے طریقت کو گلے لگا لیا۔ اس طرح یہ خاندان علوم ظاہری اور باطنی کا ایک ایسا سرچشمہ بن گیا جس نے تشنہ کامانِ معرفت کو سیراب کیا اور ان کو راہِ حق دکھائی۔ ملا نظام الدین کے صاحبزادے علوم دینی و باطنی میں بحرِ ذخار تھے اور وہ ملا بحرالعلوم کے لقب سے جانے اور پہچانے گئے۔ آپ مدراس میں قیام فرما ہوئے اور وہاں اپنے کمال علم سے طالبانِ علم و دانش کو فیض پہنچاتے رہے۔ وہاں آج بھی ان کے ہزارہا عقیدت مند موجود ہیں۔ مولانا ناصر میاں کے پردادا مولوی محمد نعیم صاحب نے فقہ میں کمال حاصل کیا۔ آپ کے فتاوے کا مجموعہ آج بھی مستند علیہ سمجھا جاتا ہے اور طالبانِ حق کے لیے ایک نعمت عظمیٰ ہے۔ ناصر میاں کے والد محمد اسلم صاحب بھی ایک با اصول اور مرنجاں مرنج بزرگ تھے۔ ان کا کردار بے حد بلند تھا اور ہمیشہ اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے رہے۔ بااثر حضرات نے ان سے ان کے اصولوں کے خلاف عمل پر آمادہ کرنے کی کوشش کی لیکن وہ کوہِ گراں کی طرح اپنے اصولوں پر اٹل رہے اور کبھی اپنے منصب اور مقام سے ہٹ کر کسی اثر کو قبول نہیں کیا۔ بعض دفعہ اس سلسلے میں ان کو شدید مالی نقصان بھی پہنچا لیکن انھیں اس کی مطلق پروا نہیں ہوئی۔ حمیت الٰہی اور تقویٰ ان کے کردار کی اہم خصوصیات تھیں جن کے باعث وہ ہم چشموں میں ہمیشہ سربلند باعزت اور پروقار رہے۔ مولوی صاحب موصوف نے ناصر میاں کو فقہ کی تعلیم دی اور اپنا جانشین و خلیفہ بنایا۔

آئیے ان کی سراپا کی تصویر تصور کے پردۂ سیمیں پر کھینچیں کہ علاوہ حسن سیرت کے منعم حقیقی نے ان کو حسن صورت سے بھی نوازا تھا۔ کتابی چہرہ، فراغ پیشانی، کھلتا ہوا گیہواں رنگ، سفید لمبی داڑھی، بوٹا سا قد، لبوں پر ہلکا سا تبسم، آنکھوں میں ذہانت کی چمک اور روحانیت کی دمک، شیریں سخن، شیریں گفتار اور شیریں ادا۔ ان کی روح کی پاکی اور پاکیزگی ان کے چہرے کے خد و خال سے عیاں تھی۔ سفید و سادہ ملبوس میں بھی ان کی آن اور شان دیکھنے والے کو دل و جان سے گرویدہ کر لیتی ۔۔ یہ ہر دلعزیزی بھی فضل خدا ہے اور ہر ایک کے مان کی بات نہیں، صدق خیال اور صدق مقال ان کے جوہر تھے جنھوں نے ان کی شخصیت کو اتنا پرکشش اور پرجمال بنا دیا تھا۔

ناصر بھائی کی صحت عنفوانِ شباب میں زیادہ اچھی نہیں رہی۔ شادی کے بعد سخت بیمار پڑے پھیپھڑے کمزور ہوگئے تھے۔ ہلکی حرارت ٹھہر گئی تھی۔ اس زمانہ میں لکھنؤ میں شفاء الملک حکیم عبدالحمید اور ڈاکٹر عبدالحمید صاحب کا طوطی بول رہا تھا۔ ایک حاذق حکیم، ایک حاذق طبیب دونوں ناصر میاں کے خاندان کے عقیدت مند۔ بڑی دلسوزی سے علاج کیا۔ بھوالی بھی علاج کے لیے بھیجے گئے۔ شفایاب ہوگئے لیکن پھیپھڑے کمزور رہ گئے۔ پھر شبانہ روز کی طویل عبادتیں۔ حاجت مندوں کو گھنٹوں بیٹھ کر تعویذات دینا، بڑی محنت کا متقاضی تھا۔ لیکن انھوں نے حاجت خلق کے مقابلہ میں کبھی اپنی ذاتی آرام و آسائش کو مقدم نہیں سمجھا۔ حیاتِ مستعار کے آخری چند برسوں میں صحت زیادہ گر گئی تھی تنفس کی شدید شکایت پیدا ہوگئی۔ جس کے باعث بڑے بے چین رہتے اور اسی سانس پھولنے کے باعث قلب کمزور ہوتا گیا۔ دو تین بار قلبی دورے بھی پڑے۔ ایسے سخت کہ اللہ کے گھر سے واپس ہوئے تا آنکہ ۲۳ دسمبر ۱۹۷۸ء کو وقتِ موعود آ گیا۔ عین حالتِ نماز میں سجدے میں جان شیریں جان آفریں کو سپرد کر دی۔ رہے نام اللہ کا۔

زندگی کے آخری دن بھی لوگوں کو تعویذ دیتے رہے، دن کے وقت میری اہلیہ ان کی عیادت کو گئیں۔ حسبِ معمول ہنسی مذاق کی باتیں ہوتی رہیں۔ شیرینی اور ایک چٹائی کی جا نماز مرحمت کی۔ اور اسی رات کو عشا کے اول وقت دفعتاً سفر آخرت اختیار کر لیا اور اس شعر کا مصداق بن گئے:

سبک روحی یاروں کو دکھلاؤں میں
کہ بو ہو کے غنچے سے اڑ جاؤں میں

اب زندگی کے آخری سفر کا بھی حال سنیے! انتقال کی خبر سارے شہر میں بجلی کی طرح پھیل گئی۔ تقریباً سارا شہر امیر، غریب جاہل عالم، دوست اور اجنبی جوق در جوق آخری دیدار کے لیے ان کی نشست گاہ کی طرف چل پڑے۔ کمپنی باغ چوک کے وسیع میدان میں نمازِ جنازہ پڑھی گئی۔ تخمیناً اور تقریباً ڈیڑھ دو لاکھ لوگوں نے نمازِ جنازہ میں شرکت کی۔ یہ منظر ایسا دلدوز اور الم انگیز تھا کہ پتھر دل بھی پانی ہو گئے۔ کہیں دبی دبی سسکیاں تھیں اور کہیں نالہ و شیون۔ ہزاروں کو کندھا دینے کی حسرت باقی رہ گئی اور ہزار ہا مٹی دینے سے محروم۔ ایک سردار جی کی حالت بہت غیر ہو رہی تھی۔ وہ فرطِ الم سے کئی بار بے ہوش ہو چکے تھے۔ وہ چل کیا رہے تھے دوسروں کے سہارے چل رہے تھے۔ غم کے مارے دنیا ان کے سامنے اندھیر تھی، ہوش و حواس گم، معلوم ہوتا تھا کہ ان کو راستہ نہیں سوجھ رہا ہے۔ ان کی حالت کو دیکھ کر اس قدر قلق ہوا کہ ہزاروں لوگ تو ان کی بے پناہ عقیدت اور والہانہ محبت کو دیکھ کر رو پڑے۔ سچ ہے جو اللہ کا ہو گیا اللہ کی مخلوق اس کی ہو گئی۔

مولانا انوار کے خاندانی قبرستان میں اپنی والدہ کے پہلو میں دفن کیے گئے۔ یہی سردار جی جن کا تذکرہ اوپر کیا گیا دفن کے وقت ایسے بے قابو اور بدحواس ہوئے کہ مچل گئے۔ بے قابو ہو گئے ایسے بے قابو کہ بار بار یہی ضد کیے جا رہے تھے کہ میاں کے ساتھ مجھے بھی قبر میں لٹا دو۔ بڑی مشکل سے اس نازک صورتحال پر قابو پایا جا سکا۔ بعد میں پتہ چلا کہ آخری بیماری میں جب یہی سردار جی عیادت کو آتے تو وہ اکثر کہتے کہ کاش ان کی زندگی کے باقی ماہ و سال مولانا ناصر میاں کی زندگی میں جڑ سکتے! تمنا لاکھ معصوم سہی لیکن اس سے ان کی بے پناہ عقیدت اور بے مثال محبت کا ایک ہلکا سا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ قومی ہم آہنگی، صلح پسندی اور رواداری، یہ اوصاف تھے جنھوں نے مسلم، غیر مسلم، دوست و دشمن کو ایک جگہ اکٹھا کر دیا تھا۔ کسی دانشمند نے سچ کہا ہے کہ جو تن من دھن سے اپنے خالق کا ہو گیا تو خالق کی مخلوق بھی اس کی ہو گئی۔ سچ ہے ؎

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اب جب ان کا جمالِ جہاں آرا پردۂ خاک میں جا چھپا ہے۔ ان کی نشست گاہ جس میں ایک عرصہ تک وہ رشد و ہدایت اور خدمتِ انسانیت میں مشغول رہے سونی سونی معلوم ہوتی ہے چاروں طرف حسرت بھری نگاہیں ان کو ڈھونڈھتی ہیں اور جب

(باقی صفحہ ۲۹ پر)

غزلیں

رضا امروہوی
بی ٹی ۲۳ جی پوائنٹ
نئی دہلی ۱۰

آج بے چہرہ ہیں چہروں کے سمندر کتنے
آئینے ڈھونڈتے پھرتے ہیں سکندر کتنے

ایک آنسو بھی نہیں، ایک تبسم بھی نہیں
مٹ گئے حرفِ غلط بن کے مقدر کتنے

میں نے بچوں کے گھرونوں کے جو بنوائے تھے
بہہ گئے وقت کے سیلاب میں وہ گھر کتنے

ایک بھی شخص کو خود اپنا پتہ یاد نہ تھا
شاہراہوں پہ نظر آئے تو بگھر کتنے

دل کے آئینے میں ہیں حسن کے ہی آئینے
ایک محور پہ ہیں ٹھہرے ہوئے محور کتنے

ہم نے اپنا ہی مکاں آج کھلا چھوڑ دیا
پھینک سکتا ہے کہیں سے کوئی پتھر کتنے

قتل ہوتے ہیں اجالے بھی کہیں اے لوگو
ظلمتوں کے بھی نشانے ہوں ستمگر کتنے

ایک بھی حرفِ جنوں یاد نہیں ہے یا رو
آج بہروپیے بنتے ہیں قلندر کتنے

گرمیِ بازاری صلیبوں سے بڑھی ہے آگے ـ
رات دن کرتے ہیں سوداگری خنجر کتنے

تشنگی ڈستی رہی تشنہ لبوں کو لیکن
شیش محلوں میں چھلکتے رہے ساغر کتنے

ہو گیا لفظِ وفا بند کتابوں میں رضا
سرد مہری کے ہر اک سمت ہیں دفتر کتنے

مدحت دکنی سیمابی
۳۱ کراس روڈ نمبر ۳
ایگریکو جمشید پور ۸۳۱۰۰۹

ہم ہی پر پتھراؤ بھی ہو، ہم ہی ٹھہریں دوشی بھی
جرم ہے اک سنگین قسم کا، ایسے میں خاموشی بھی

کاغذ کے پھولوں سے عبارت زینت ہے ان پھولوں کی
سہرے کے پھولوں کی لڑیاں، قبروں کی گلپوشی بھی

صحبت مسند اقدار کا حاصل، نشہ بھی ہو جاتا ہے
ورنہ کا عرفاں بن جاتی ہے ایسے میں مدہوشی بھی

رہنے دو آواز کا جادو، سر چڑھ کے کیا بولے گا
ہم نے چمن کے نغمے سنے ہیں، جنگل کی سرگوشی بھی

زخموں کا کیا ہو، جو اگر عریانی کرے فکرِ ملبوس
کھٹکی ہے کانٹوں کی زباں پر تلووں کی پاپوشی بھی

افقِ حزن و یاس سے بھی اب سورج امن کا ابھرے گا
راحتِ دل کا موجب اکثر ہوتی ہے غم کوشی بھی

ہوش و خرد کا جائزہ! اور وہ دشمنِ ایماں کیا کہنے
رونق یا اللہ کا کرم ہے ایسے میں بیہوشی بھی

جہیز کی لعنت

ظہیر غازی پوری
ریلوے آؤٹ ایجنسی
ہزاری باغ (بہار)

دق زدہ مفلوج ذہنوں کی امانت ہے جہیز
مال و زر والوں کی بے جا شان و شوکت ہے جہیز
غربت و افلاس کے ماروں کی شامت ہے جہیز
بیکس و نادار کے حق میں ہلاکت ہے جہیز
ننگِ عزت، ننگِ شہرت، ننگِ عظمت ہے جہیز
مسلکِ انسانیت میں ایک ذلت ہے جہیز
جسم میں خیر و اخوت کے ہے اک موذی مرض
قوم کے چہرے پہ داغِ شرم و خفت ہے جہیز
لوحِ احساسات پر ہو جیسے اک حرفِ غلط
ارتقا کی راہ میں کوہِ جہالت ہے جہیز
ہم نشینو! جاہلیت کا زمانہ اب نہیں
پھر بھی کیوں سوداگریِ مرد و عورت ہے جہیز
نوجوانانِ وطن کو کر دیا بے دست و پا
درحقیقت باعثِ تحقیر و نفرت ہے جہیز
رسم ہے، لیکن یہ قاتل رسم ہے اے دوستو
باوجودِ علم کیوں اب تک سلامت ہے جہیز
پھینک دو اس بیسوا کو نوچ کر اب پھینک دو
گردنِ انسانیت میں طوقِ لعنت ہے جہیز
آج کیوں احساسِ خاص و عام مردہ ہو چکا
کاش کوئی سوچتا، ننگِ ملامت ہے جہیز
جس قدر ہو جلد اس سے پاک کر دو اپنے گھر
اک خباثت، اک کثافت، اک غلاظت ہے جہیز
لاکھوں مرجھائی ہوئی معصوم کلیوں کی قسم
گلشنِ ہستی میں دوزخ کی تمازت ہے جہیز
غیر قانونی اسے سرکار نے بھی کر دیا
اے ظہیر اب ایک ناجائز تجارت ہے جہیز

اشتیاق علوی
کاکوری کوٹھی ۔ نیالی محج لکھنؤ

ایک شکاری سورما کی کہانی

اس کے کارناموں کی زبانی

خطرات سے کھیلنے والے جیالے شکاریوں میں بیشتر انگریزوں کے نام آتے ہیں جن کی ہمت اور جوانمردی کی داستانوں سے کتب خانے بھرے پڑے ہیں۔ ہمارے مایہ ناز شکاریوں نے اس طرف توجہ بہت کم کی اور نہ ہی صاحب قلم حضرات نے اس طرف دلچسپی دکھائی۔ بہرحال میں یہ ماننے پر تیار نہیں ہوں کہ ہمارے دیش کے شکاری بہادری کے معیار پر اترتے ہی نہیں کہ ان کی خدمات کی جی کھول کر داد دی جا سکے۔ انگریز شکاری جو ہماری سرزمین سے ابھرے وہ سب کے سب حکمرانی کے خصوصی مراعات سے فیضیاب رہے جو ہم میں سے کسی کو نصیب نہیں رہیں۔ میرا دعویٰ ہے کہ ہمارے دیسی شکاریوں کی فہرست اور ان کی خدمات اس درجہ بلند ہیں کہ کسی انگریز شکاری سے کسی مقابلے میں کم نہیں ہیں۔ ضلع پیلی بھیت کے مشہور زمانہ بالا خاں مینگل خاں۔ حاجی عبدالمجید خاں۔ حکیم غلام ربانی خاں۔ کاکوری کے حاجی اعجاز علی صاحب۔ کانپور کے مصباح صاحب اور شبیر صاحب۔ مشہور و معروف شکاری مسٹر سونی۔ مسٹر شیر جنگ۔ مسٹر سرکشن دید۔ دکن حیدرآباد کے قطب یار جنگ اور مسٹر حامد بن شبیر وغیرہ نہ صرف مشہور و معروف شکاری تھے بلکہ ان کی شکاری لیاقت فنی حیثیت اختیار کر چکی تھی جنگل گراؤنڈ پر عبور استادی کی حد تک تھا۔ جنگلی جانوروں کی مزاج شناسی ماہرانہ درجہ کی تھی۔ خطرناک درندوں کے مقابلے میں ان کی بہادری اور آدم خور درندوں کو مارنے میں ان کی مہارت کے ساتھ ساتھ وہ جذبہ انسانیت سے اتنا سرشار تھے کہ انھوں نے اپنی جان کو جان نہیں سمجھا اور خطرہ دوسروں کی حفاظت کے لیے مول لیا۔

میرے عقیدے کے بموجب ایسی ہستیاں قومی ہیرو ہیں اور ان کی لیاقت و خدمات کو خراج عقیدت پیش کرنا مجھ ایسے کم مایہ کے لیے فخر کی بات ہے۔ اس سلسلے میں آج میں ایک ایسے شکاری سورما کا ذکر کرتا ہوں جو ابھی ڈیڑھ سال ہوا ہمارے بیچ سے اٹھ گیا۔ اس محترم ہستی کے شکاری کارناموں اور بے لاگ خدمت انسانیت کا تذکرہ اور کچھ شکاری واقعات ضبط تحریر میں محفوظ کر دینا چاہتا ہوں تاکہ ہمارے قومی وقار میں اضافہ ہو۔ اگرچہ ان کا ہر شکار ایک کارنامہ تھا اور ان کی شکاری زندگی کی داستان کے لیے پوری کتاب درکار ہوگی مگر میں چیدہ چیدہ واقعات بیان کر رہا ہوں۔ لکھیم پور کھیری میں واقع ریاست ککرہ کے راجہ صاحب کا سماج میں ایک خاص مقام تھا۔ جمیل الرحمٰن صاحب ان کے چھوٹے صاحبزادے تھے یعنی لکھنؤ کے مشہور ایڈوکیٹ حاجی شفیق الرحمٰن صاحب کے چھوٹے بھائی۔ بہت منکسر مزاج۔ بڑے سنجیدہ اور کم سخن۔ اپنی تعلقداری کے جنگلات اور ملحقہ انگریزی عملداری کے جنگلات میں شیر۔ تیندوے۔ بھالو۔ جنگلی سور۔ سانبھر۔ چیتل۔ نیل۔ پاڑھا۔ الغرض سب ہی جانور موجود تھے۔ جمیل الرحمٰن صاحب اس قدر ہر دلعزیز تھے کہ عام طور پر جمیل بھائی اور جمیل چچا کہہ کر یاد کیے جاتے تھے۔ اگرچہ ریاست سے ہر آسائش میسر تھی مگر وہ پیدل گھوم پھر کر شکار کھیلنا پسند کرتے تھے۔ جنگل کی ہر ہر پتی۔ لیک۔ پالی اور گھانس و مٹی پہ بنے نشانات پر اور جنگل کی زمین کی مختلف حالتوں اور جھاڑیوں کے گرد راستوں پر اتنی گہری نگاہ تھی کہ گویا جنگل کی نبض پر ان کی انگلیاں رکھی رہتی تھیں۔ جنگلی جانوروں کے مزاج اور عادتوں کی ایسی پرکھ تھی کہ پہلی ہی

نظر میں وہ بتا دیتے تھے کہ کون جانور کدھر ہوگا۔ کدھر سے جائے گا۔ اگر پیروں کے نشان زمین پر دیکھ لیے تو بتا دیں گے کہ جانور کا قد کیا تھا۔ عمر کیا تھی۔ موڑ کیا تھا اور کس گھڑی اس طرف سے وہ گزرا تھا۔ اس علم کو جنگل گرانٹ کہتے ہیں جس کے وہ ماہر مانے جاتے تھے۔ ہر جانور کا پیچھا پیدل کر کے اور گھنٹوں اس کی ایک ایک ادا کو دیکھ کر اپنی اس مہارت کا مظاہرہ ہر شکار میں کیا کرتے تھے۔ چھوٹے بور کا آٹومیٹک رائفل ہاتھ میں لے کر نشانے کی اتنی مشق کرلی تھی کہ اڑتی چڑیا اسی فیصدی مار لیتے تھے۔ زیادہ دور جانا ہوا تو بیل تانگہ جس میں بھینسے جتے ہوں ساتھ لے کر آدم خور تک کا شکار کھیلتے تھے۔ گورنر اور وائسرائے کی بارگاہ میں ان کا بڑا محترم مقام تھا یو۔ پی۔ اور سنٹرل انڈیا اور نیپال راج کے ہر اہم شکاری پروگرام میں بحیثیت ماہران کا شریک ہونا بقول شخصے شکار کی کامیابی کی ضمانت تھا۔ بڑی سادہ زندگی کے ساتھ جمیل چچا اتنے با اصول نمازی تھے کہ آدم خور شیر کا پیچھا کرتے کرتے وہیں زمین پر رائفل رکھ کر نماز ادا کر لیتے تھے۔ معتبر رکارڈ کے مطابق جمیل چچا نے تنہا ڈیڑھ سو شیر مارے۔ چھبیس آدم خور مارے اور ان اعداد سے کہیں زیادہ دوسروں کے زخمی کیے شیروں کو مارا۔ جمیل چچا مچان پر سے یا پانی پر (پیاؤ) پر بیٹھ کر شکار نہیں کرتے تھے، یہ طریقے مہمانوں کے لیے ہی وہ جائز سمجھتے تھے۔ پیدل یا ہاتھی پر بیٹھ کر گھوم پھر کر شکار مارنا اچھا سمجھتے تھے۔ ان کا ایک نوکر سلامت میاں ساتھ رہتا تھا اور اکثر پڑے کے بجائے بندوق لے کر آدم خور شیر کے لیے جمیل چچا کے سامنے گھنٹوں بیٹھا رہتا تھا۔ جس زمانے میں مجھے جمیل چچا کے ساتھ شکار سیکھنے کا موقع ملا وہ ان کے ماہرانہ عروج کا زمانہ تھا۔ ہر فاصلے اور ہر زاویہ سے بڑی چابکدستی اور کامیابی کے ساتھ ان کی رائفل دونوں کندھوں پر رکھ کر چلا کرتی تھی۔

نیپال راج سے بلاوا آیا کہ شیر نے ۲۵ آدمی مار دیئے ہیں۔ جمیل چچا موقعہ پر پہونچے تو پتا چلا کہ آدم خور شیر بہت گہری کھڈ میں رہتا ہے اترنے کا راستہ نہیں تھا۔ پتھروں کی نوکیں پکڑ پکڑ کر اور گھسل گھسل کر سلامت میاں بندوق لیے کھڈ میں اتر رہے تھے اور جمیل چچا کھڈ کے اوپر ایک جگہ کھڑے ہو گئے۔ ایک پتھر لڑھکا، اسی کے ساتھ شیر کی گرجدار آواز نے کھڈ کو گونج دیا مگر سلامت میاں نیچے اترتے ہی رہے۔ جمیل چچا کی ماہرانہ نظریں سلامت میاں پر نہیں بلکہ اس گرجدار آواز کی سمت جمی ہوئی تھیں۔ نیپالی حکام اور جاگیردار سب اپنے آدمیوں کے دور بھاگ چکے تھے۔ کسی اندرونی سرنگ راستے سے آدم خور شیر نے سلامت میاں کے عین پیچھے چار گز پر سر نکالا اور سنبھل کر جست کرنا چاہتا تھا کہ جمیل چچا کی گولی نے شیر کا سر اڑا دیا۔ فائر کی گونج نے کھڈ کو ہلا دیا مگر سلامت میاں نہ جانے کس پانی کا آدمی تھا کہ بغیر کسی گھبراہٹ کے اظہار کے شیر کی طرف گھوم کر بندوق تانے تھا۔ شیر گولی کھا کر سرنگ میں واپس جاتا معلوم ہوا تھا۔ سلامت میاں نے جمیل چچا کی طرف دیکھا انھوں نے اشارے سے بتایا گولی سر میں لگی ہے۔ اب تو سلامت میاں اور بے خوف ہو کر سرنگ کے منھ میں جھانکنے لگے۔ خون میں لت پت شیر آخری سسکیاں لے رہا تھا۔ اپنے اگلے پنجوں سے پتھروں کو کھرونچ رہا تھا۔ آدھے گھنٹے تک سلامت میاں وہیں ٹھہرے رہے وہیں ایک رسی منگوائی اور شیر کے گلے میں پھندا ڈال کر باہر نکل آئے۔ سلامت میاں خود شکاری تھا مگر کس بلا کی ہمت اس میں تھی اور کتنی خود اعتمادی جمیل چچا میں تھی اس کی مثال کسی دوسرے شکاری کی داستان میں میں نے نہیں پڑھی۔ جمیل چچا نے پونے دو سو شیر سلامت کے ساتھ شکار کیے مگر ان کا کبھی کوئی اندازہ غلط نہیں ہوا اس کا ثبوت یہ ہے کہ سلامت میاں کو نہ جمیل چچا کو کسی شیر نے زخمی کیا نہ خراش پہنچائی۔

اک زخمی شیر نے اک شکاری ہاتھی پر حملہ کر دیا اور اس کی سونڈ میں لٹک گیا۔ جمیل چچا کے ہاتھی نے سونڈ بڑھا کر شیر کی کمر پکڑ کر گھسیٹا۔ اس کھینچا تانی میں جمیل چچا والا فیل وان توازن کھو کر زمین پر گر پڑا اور جمیل چچا اس کی جگہ ہاتھی کی گردن پر بیٹھ کر اشارے دینے لگے ان سے ہاتھی نے شیر کو کچھ اور کھینچا اب زخمی ہاتھی نے جھٹکا دے کر اپنی سونڈ چھڑاتے ہوئے شیر کا اگلا دھڑ اپنی سونڈ سے پکڑ لیا۔ دونوں ہاتھیوں نے اپنی اپنی طرف شیر کو

کھینچا۔ فی الفور اپنے پیروں سے اس کو روند ڈالا۔

جمیل چچا کو خبر دی گئی کہ شیر ایک آدمی کی لاش کو منہ میں دبا کے بھاگنے کی کوشش میں ایک اندھے کنویں میں گر پڑا ہے۔ ایک کھٹولہ باندھ کر جمیل چچا نے کنویں میں لٹکوا دیا۔ اس کو دیکھ کر شیر گرجا مگر جب کھٹولا اس کے پاس پہونچا وہ اس پر بیٹھ کر چینختا رہا۔ گراری میں رسی ڈال کر پندرہ بیس آدمیوں کو بیس پچیس گز دور سے کھٹولے کو اوپر کھینچنے کو کہا۔ جیسے ہی جگت قریب آئی شیر نے جمیل چچا پر حملہ کر دیا جو دس قدم ہٹ کر کھڑے تھے۔ ابھی وہ آدھی دور ہی ہوگا کہ جمیل چچا نے زمین پر گھٹنے ٹیک کر گولی ماری جس نے اس کا جبڑا توڑ دیا۔ حلق سے گذرتی گردن کے رگ پٹھوں کو کاٹتی پورے بدن کے اندر قیمہ بناتی گردن کو پھاڑ کر دم کے جوڑ میں ٹھکوکر دی۔ شیر چاروں پیر پھیلا کر زمین چاٹنے لگا۔

ایک لڑکی کو آدم خور شیر اس کی جھونپڑے سے اٹھالے گیا اسی آدم خور کی تلاش میں جمیل چچا پڑاؤ کیے تھے۔ انھوں نے شیر کا پیچھا کیا۔ سلامت میاں ساتھ تھے۔ لڑکی کے گھر والوں اور گاؤں والوں نے جنگل میں گھسنے سے انکار کر دیا۔ جمیل چچا ہر اس جگہ پہونچے جہاں شیر اس لاش کو رکھ کر کھانا چاہتا۔ شیر کا غصہ بڑھتا گیا۔ دو ایک بار نیچی جھاڑیوں کے اندر اندر دھمکانے کے لیے لدکا بھی۔ گہرے نالے کے کنارے کٹے پھٹے کگارے گھنی جھاڑیوں سے ایسے چھپے تھے کہ شیر لاپتہ ہو گیا۔ جمیل چچا نے سلامت میاں کو نالے کے کگارے کے اوپر چھوڑا اور خود انتہائی خطرناک کھیل کا وہ راستہ اختیار کیا جو صرف ایک ہی پگڈنڈی کا تھا جس کے چاروں طرف کانٹے دار جھاڑیاں تھیں۔ وہاں اتنی گنجائش بھی نہ تھی کہ رائفل کو گھمایا جا سکے۔ یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ لیک کہاں لے جائے گی۔ گہرائی میں اترتی لیک پر شیر کے پنجوں کے تازے نشانات پر جمیل چچا چلدیے۔ رائفل نہ چل سکے یا کارتوس خراب نکل جائے ان تمام اتفاقات سے بے خطر جب نالے کے پانی کے لیول میں پہنچے تو راستہ ایکدم سے بائیں طرف مڑا۔ جاپ پاکر آدم خور شیر لاش کھانا بند کر کے بلی کی طرح اپنے پچھلے دھڑ کو پچھلے پیروں پر رکھ کر دم کو لمبا کر کے پیٹ کو زمین میں چپکا کے اگلے پنجوں کو آگے بڑھا کر اس پر اپنا ہیبت ناک منہ رکھ کر کانوں کو پیچھے پلٹے ہوئے اپنی خونخوار آنکھیں تین گز آگے اس موڑ پر جمائے تھا جدھر سے جمیل چچا مڑنے والے تھے۔ جمیل چچا جیسے ہی مڑے شیر نے آواز دے کر شاید اٹھی، اگلے پنجے اٹھائے تھے کہ جمیل چچا کی گولی نے شیر کو جا لیا۔ آدھے کھلے منہ کے راستے حلق میں ہوتی ہوئی گولی بدن کے اندر کے کسی ایسے حصے کو پھاڑ چکی تھی کہ بدن بھر مفلوج ہو گیا۔ اس کی حلق سے عجیب سی کرخت گرج نکلی۔ اس کے اگلے پنجے آگے بڑھنا چاہتے تھے مگر گولی کی زبردست دھمک سے اس کی آنکھوں کی روشنی جاتی رہی۔ وہ تڑپا زمین کھرچی اٹھنا چاہا مگر اٹھ نہ سکا۔ اس نے خون کی قے کی۔ پورا بدن زور سے تھرتھرا اٹھا۔ دم کی نوک کئی بار الٹی پلٹی اور مر گیا۔

جے پور میں وائسرائے کی پارٹی کا شکار تھا۔ ریاست کے بڑے بڑے افسران اور کرنل کیسری سنگھ جو ریاست کے محکمہ شکاریات اور جنگلات کے انچارج تھے بھاگ دوڑ میں لگے تھے۔ تیس ہاتھی مع شکاریوں کے مقررہ جگہوں پر ہنکوے کے انتظار میں کھڑے تھے۔ مہاراجہ صاحب ذاتی معائنے کو جمیل چچا کے ساتھ نکلے وائسرائے بہادر کے ہاتھی کے کھڑے ہونے کی جگہ دیکھ کر جمیل چچا نے مہاراجہ صاحب سے کہا کہ وائسرائے کے ہاتھی سے پچاس گز سے شیر نکلے گا مگر کرنل کیسری سنگھ نے یقین دلایا کہ وہ دس گز کے اندر سے نکلے گا۔ جمیل چچا خود مہمان ہونے کی وجہ سے مسکرا کر چپ ہو گئے مگر خود مہاراجہ صاحب کو لے کر اپنی بتائی جگہ پر جا کھڑے ہوئے۔ ہنکوے میں تین شیر اٹھے جدھر وہ جانا چاہتے تھے ادھر سے پلٹایا گیا۔ شیر غصے میں بپھرے ہوئے کسی کی نہ مانے اور جمیل چچا اور مہاراجہ صاحب کے دس گز کے اندر سے نکل گئے۔ مگر کسی نے فائر نہیں کیا۔ کرنل کیسری سنگھ شرمندہ ہوئے۔ دوسرا ہانکوا اگلے ٹکڑے کا تھا اب جمیل چچا کو اگوا کار بنایا گیا۔ انھوں نے وائسرائے بہادر کے ساتھ دو اور ہاتھیوں کو پاس پاس نالے کی اتار پر کھڑا کر دیا اور خود ہنکوے والوں کے آگے اسٹاپ (روک) کی جگہ پر کھڑے

ہو گئے۔ تینوں شیر پھر اٹھے اور وائسرائے بہادر کے ہاتھی سے دس قدم پر نکلے۔ دو شیر مارے گئے اور ایک بے داغ نکل گیا۔

سنٹرل انڈیا میں شاید بھوپال کے قریب آدم خور شیر کو مارنے میں کئی شکار پارٹیاں ناکام واپس آ چکی تھیں۔ کسی کے ذریعہ جمیل چچا کو حکام نے اس کے شکار کے لیے راضی کر لیا۔ اب کی بار سلامت میاں ان کا خاص نوکر ساتھ نہیں تھا۔ جنگل ان کے لیے نیا تھا۔ تین دن ہاتھی پر جنگل کو چھان مارا شیر نہ ملا۔ جمیل چچا نے ۹ بجے صبح کو ہاتھی پر اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر پیدل اکیلے گھومنا طے کیا۔ ہاتھی والوں سے کہہ دیا تھا کہ تم میری سیٹی یا فیر کی آواز سن کر آ جانا میں میل بھر کے اندر ہی رہوں گا۔ شام کے پانچ بج گئے۔ پانی کے چشمے کے کنارے سے چڑیوں کی مخصوص خطرے کی آوازیں اٹھ رہی تھیں۔ جمیل چچا اکیلے دم بڑی ہوشیاری سے چشمے کے اونچے کگارے کی آخری حد پر پہنچے تو نشیب میں دیکھا کہ آدم خور شیر کسی آدمی کی سڑی لاش کی ہڈیوں کو چبا رہا تھا۔ دس گز کے فاصلے سے جمیل چچا نے گردن کی جوڑ میں مار دی۔ عجیب دھندھی ہوئی مگر کرخت آواز سے شیر گر جاتا مگر اس کی جھول چکی تھی۔ آدمی کی لاش کی ہڈیوں پر ہی وہ پلٹ گیا۔ پنجوں سے زمین کو اتنا کھرچا کہ بڑے بڑے پتھر ادھر ادھر ہو گئے۔ پودا یا درخت کی پتری ہاتھ میں آ گئی تو اس کے دھجے اڑا دیے۔ ہر بار وہ اٹھنا چاہتا تھا مگر قلابازی کھا کر گر جاتا۔ یہ آوازیں ہاتھی والوں کو مل چکی تھیں۔ ہاتھی دوڑ کر وہاں پہنچا اور ہاتھی نے اپنا بھاری پیر رکھ کر شیر کو دبا ڈالا۔

اندھیری رات میں جمیل چچا بیل تانگے سے اتر کر شکار کے پیچھے چل رہے تھے کہ بیلوں کو شیر کی بد بو محسوس ہوئی اور بے چین و بے قابو ہو کر وہ تانگے کو لے کر جنگل میں ایک طرف گھسے تھے کہ تانگہ کسی ٹھونٹھ میں پھنس گیا۔ جمیل چچا گلیارے کے کنارے سب کچھ سمجھ کر ٹھہر گئے۔ اتنے میں کرخت گرج کے ساتھ شیر بیلوں پر کودا۔ بیل زمین پر گرا اور شیر اچک کر گلیارے پر کھڑا ہو گیا۔ آزمودہ کار سلامت میاں اور تجربہ کار گاڑی بان تانگے کے نیچے جا چکے تھے۔ ٹارچ لائٹ شیر پر پڑتے ہی جمیل چچا کی گولی دونوں شولڈر بلیڈ کے بیچ اچھے اڑ چکی تھی۔ حیرت کی بات ہے کہ اندھیرے میں گلیارے پر شیر کے کودنے کی آواز پر ٹارچ لائٹ بالکل ٹھیک شیر پر ہی پڑی پھر رائفل کی گولی بھی وہیں پر پڑی۔ ایسے خطرناک لمحات میں حواس کو قابو میں رکھنا آنکھ کان اور ہاتھوں کو اپنا توازن قائم رکھنا پھر ٹھیک نشانے پر گولی چلانا یقیناً مہارت کا بلند ترین ثبوت ہے۔

مہاراجہ جے پور گورنر صاحب اور ان کے انگریز دوستوں کو ہرنوں اور چیتل کے غول کی طرف لے گئے۔ کوئی دو سو جانور پچاس گز سے تین سو گز کے اندر پھیلے ہوئے تھے۔ گورنر صاحب اور دوسرے انگریزوں نے فائر کی پہلی باڑھ چلائی۔ پچاس ساٹھ فائر ہو گئے۔ کل بارہ جانور گرے۔ جانوروں کا غول تین سو گز سے زیادہ دور جا چکا تھا۔ گورنر صاحب کی فرمائش پر جمیل چچا اور مہاراجہ صاحب کے ساتھیوں کو آگے بڑھا دیا گیا۔ دونوں سورماؤں نے رائفل سنبھالے ہر فائر پر ایک سینگ والا جانور گر جاتا۔ جب میگزینوں میں کارتوس ختم ہوئے تو دوسرے بھرے رائفل ہاتھوں میں دے دیے جاتے۔ بارہ بارہ فائر دونوں نے کیے ہوں گے اور ہر گولی بال باندھی لگا کی۔ تعریفوں کا شور بلند ہوا۔ ماہرانہ نشانے بازی کے جوہر کھلے۔ انگریز شکاریوں پر ہمارے شکاری سورماؤں کا سکہ بیٹھ گیا۔ انھوں نے دانتوں تلے انگلیاں دبا لیں کیونکہ یہ فائرنگ تین سو گز سے لے کر ہزار گز تک ہوئی تھی۔

جمیل چچا کی سربراہی میں وائسرائے صاحب تیتر کا شکار کرنے نکلے۔ چورہ ہاتھی ایک لائن میں اور ہر ایک ہاتھی پر چار چار شکاری۔ وائسرائے صاحب کے سالانہ شکاری پڑاؤ میں شرکت کے لیے انگلستان سے خصوصی نشانے باز آئے ہوئے تھے۔ پہلی باڑھ میں سیکڑوں فائر ہو گئے۔ دوسری باڑھ میں کچھ زیادہ ہی فائر ہوئے۔ وائسرے صاحب نے مہاراجہ صاحب اور جمیل چچا کو ہاتھیوں کی لائن سے آگے کر دیا۔ دونوں کے ہاتھی پچیس گز کے فاصلے سے بڑھے۔ آٹومیٹک بندوق سے دونوں نے فائرنگ کرنا شروع کی۔ جو تیتر اڑا وہ مارا گیا۔

میدان گرم ہو گیا فائرنگ تیز ہو گئی اب جمیل چچا نے داہنی طرف کے تیتروں کو بائیں کندھے پر بندوق رکھ اور بائیں طرف سے اڑنے والے تیتروں کو داہنے کندھے پر بندوق رکھ کر مارنا شروع کیا ۔ ان کی فائرنگ کی رفتار اور تیز ہو گئی اور نشانے کی سچائی نے جھنڈے گاڑ دیئے۔ یہ میدان جمیل چچا کے سر رہا۔ مہاراجہ صاحب فائرنگ روک کر جمیل چچا کی طرف بڑھے اور ان کے ہاتھی کے پاس آکر جمیل چچا کا ہاتھ مانگا اور بڑی عقیدت سے اس کو چوم لیا۔ وائسرائے صاحب اور ان کے ساتھیوں نے جمیل چچا کی بندوق مانگ کر اس کو اونچا اٹھا کر گویا میدان جیتنے کا اعلان کیا۔ رات کے ڈنر کے موقع پر وائسرائے صاحب نے اعلان کیا کہ چند حقیر سی مراعات کا وہ سرکاری اعلان کرتے ہیں کہ ہر میل اور ایکسپریس ٹرین جس کو راجہ صاحب نگرہ کے خاندان والے چاہیں گھنٹہ بھر کے نوٹس پر نگرہ اسٹیشن پر روک سکتے ہیں ۔ جس بندوق اور رائفل کو وہ چاہیں براہ راست باہر کے ممالک سے منگا سکتے ہیں ۔ جس باہری ملک کو ان میں سے کوئی جانا چاہے وہ انگریزی سرکار کے مہمان رہیں گے ہندوستان بھر میں ٹرین پر ان کو وہ سیٹ ملے گی جو خصوصی ہوتی ہے اسی طرح ہر جنگل میں شکار کی اجازت ان کو خصوصی طور پر ملتی رہے گی ۔ وائسرائے کے دربار میں خصوصی سیٹ دی جایا کرے گی ۔

اب ہمارے درمیان جمیل چچا نہیں رہے لیکن ان کے کارنامے شکاریات کی تاریخ میں زریں حروف سے لکھے جائیں گے شکاری اور بھی پیدا ہوں گے لیکن جمیل چچا جیسے جیالے نڈر اور نشانے باز شکاری کو دیکھنے کے لیے آنکھیں ترستی رہیں گی ۔

کچھ ایسے بھی اٹھ جائیں گے اس بزم سے جن کو
تم ڈھونڈنے نکلو گے مگر پا نہ سکو گے

★

عبدالمتین نیاز
موتیا پارک بھوپال

غزل

سفید و سیہ کے نئے سلسلے ہیں
گلے جو ملے ہیں انھیں بھی گلے ہیں

بدلنے سے موسم کے قسمت نہ بدلی
کہ پھر شاخِ دل پر وہی گل کھلے ہیں

کہاں کھو گئیں شعلہ آسا صدائیں !
زباں ہی کٹی ہے نہ لب ہی سلے ہیں

نئے راستوں کی کتھا کہنے ــــ والو
تمھارے ہی تلوے ابھی کب چھلے ہیں

کٹی زندگی آرزومندیوں میں
مگر دل کے اب تک وہی سلسلے ہیں

یہ سب گھاؤ دل کے، یہ آنکھوں کے آنسو
ہماری وفاداریوں کے صلے ہیں

نیاز آپ دل کی یہ چوٹیں چھپا لو
وہ مدت کے بعد آج ہنس کر ملے ہیں

حیات وارثی
ایڈیٹر افکار ادب" باغ مولوی انوار لکھنؤ ۳

سراؔج لکھنوی ـــ ذات و صفات

شہر نگاراں لکھنؤ اپنی تہذیبی، اخلاقی اور ادبی و سماجی خصوصیات کے لیے برصغیر میں ایک ممتاز حیثیت کا حامل رہا ہے۔ شام اودھ کی خنک تابی میں گیسوئے ادب سنورنا سیکھا ہے۔ اسی خطۂ رنگ و بو میں زبان کو انداز بیان ملا اور اسی کے مہکتے ہوئے آنگن میں اُردو نے لجانا اور شرمانا سیکھا ہے۔ یہاں کے فنکاروں کی قدردانی نے فن شعر گوئی کو دلکشی اور رعنائی کے زیورات سے آراستہ کیا ہے۔ اسی بزم کے چراغوں سے پورے ملک نے فصاحت و بلاغت اور علم و شرافت کی روشنی حاصل کی ہے۔ لکھنؤ نے تلمیحات و استعارات اور اشارات و کنایات سے وہ آئینہ بندی کی ہے کہ محفل سخن کارگہ شیشہ گراں بن گئی۔

اُسی رخصت ہوتی ہوئی بہار اور اجڑتے ہوئے دیار کے آخری نمائندہ فنکار تھے سراؔج لکھنوی۔ سراج لکھنوی کی ولادت مارچ ۱۸۹۷ء میں ہوئی اور ۲۳ر جنوری ۱۹۶۸ء کو صبح ۸ بجے یہ چراغ محفل ادب اپنی فکری اور فنی درخشندگی ہمیں سونپ کر گل ہوگیا۔

سراؔج لکھنوی کا انداز فکر منفرد تھا وہ تقلید یا اسکول والی شاعری کے قائل نہیں تھے۔ انھوں نے خود اس کی تردید کی ہے اور "شعلۂ آواز" میں لکھا ہے کہ "میں لکھنؤ اور دھلی اسکول کا اب قائل نہیں ہوں یہ بحث پہلے کوئی اہمیت رکھتی ہو مگر اب ہر چیز انقلاب پذیر ہوچکی ہے۔ حالات بدل چکے ہیں وقت کے ہل نے زمین شعر و ادب کو ہموار کر دیا ہے۔ اب ایک ہمہ گیر آفاقیت دنیائے شاعری میں پیدا ہو چکی ہے"

سراؔج لکھنوی کی اسی بالغ نظری اور وسعت ذہنی کی بنا پر انکی شعری تخلیقات میں جدید انداز اور بلندئ فکر دونوں کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ انھوں نے کسی سے متاثر ہونے کے بجائے اپنی راہ خود بنائی۔ اُن کے تجربات اور مشاہدات دلوں کو چھوتے ہیں اور طرز نگارش ذہنوں کو دعوت فکر دیتی ہے۔

ہر اشک سُرخ ہے دامان شب میں آگ کا پھول
بغیر شمع کے بھی جل رہے ہیں پروانے

آنسو ہیں کفن پوش ستارے ہیں کفن رنگ
لو چاک کیے دیتے ہیں دامان سحر ہم

نئی تراکیب اور مصرعۂ اوّل سراؔج لکھنوی کی وہ خصوصیات ہیں جس میں وہ اپنے ہم عصر تمام شعرا سے الگ نظر آتے ہیں:

وہ بھیڑ ہے کہ ڈھونڈنا تیرا تو درکنار
خود کھویا جارہا ہوں ہجوم خیال میں

وہ گل ہوں وقت کی چٹکی جسے مسل بھی چکی
خیال بھی نہیں کس کے گلے کا ہار ہوں میں

یہ جنوں کی سادگی ہے، وہ فریب رنگ و بو
رُخ دیا پھولوں کا اور کانٹوں میں اُلجھایا گیا

سراج لکھنوی قدیم لکھنوی تہذیب کے دلدادہ اور دورِ حاضر کے نمائندہ تھے۔ اسی لیے ان کا کلام کسی کے لیے اجنبیت پیدا نہیں کرتا۔ اردو شاعری کی تاریخ میں کم فنکار ایسے ہوئے ہیں جو ماضی سے مستقبل کو ملاتے ہیں۔ سراج لکھنوی کی شخصیت قدیم و جدید کے درمیان ایک رابطہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کی شاعری ایک ایسا پل ہے جو "کل" سے "کل" کو ہم آغوش کرتا ہے۔

کہاں سے لائیے ایسی سبک جنبش نگاہوں کی
خبر ان کو نہ ہونے پائے اور دیدار ہو جائے
نگاہ گرم نے پگھلا دیئے آخر یہ شیشے بھی
حبابوں کی عمارت تھی مری آئینہ دیواری

سراج لکھنوی کی ذات سے لکھنؤ میں بڑے بڑے ادبی معرکے وابستہ ہیں۔ ایک موقع پر بات عدالت تک بھی پہنچ گئی تھی یہ مقدمہ سراج صاحب اور انقرؔ موہانی کے درمیان چلا تھا جس سے لکھنؤ ہی نہیں بلکہ پورے ملک کے ادبی حلقے نے دلچسپی لی تھی۔ مشاعروں میں وہ نہایت پسند کیے جاتے تھے اور لکھنؤ کی نمائندگی کے لیے سراج لکھنوی اور قدیر لکھنوی باہر مدعو کیے جاتے تھے اس لیے ایک حلقہ ان کو ہمیشہ ایسی چیزوں میں الجھائے رکھتا تھا تاکہ وہ تخلیقی سرگرمیوں میں کم وقت صرف کر سکیں۔ لیکن بقول سید صدیق حسن (آئی، سی، ایس) "سراج لکھنوی شرافت اور وضع داری کے اونچے درجے پر ہیں دوستوں میں بھی اور محفلِ اغیار میں بھی سراج صاحب ہمیشہ "مرنجان مرنج" رہے ہیں۔ آپ نے احباب کی کوتاہیوں سے ایسی بے دریغ آنکھ پھیری ہے کہ کسی کو گمان بھی نہ ہو سکا کہ آپ کو تکلیف بھی پہنچی ہے۔"

ٹکراؤں کیوں زمانے سے کیا فائدہ سراجؔ   خود اپنے راستے سے ہٹا جا رہا ہوں میں
مرا عزم تشدد بھی ہے شرحِ شانِ مظلومی   جو آیا بھی تو آنسو بن کے جوشِ انتقام آیا

سراج لکھنوی نے عشق بھی کیا ہے اور عشق کا اظہار بھی۔ لیکن ان کے عشق میں پاکیزگی اور طہارتِ نفس موجود ہے۔ وہ محبوب سے باتیں کرتے ہیں لیکن حجاب آگیں انداز میں۔ ان کی بے تکلفی میں بھی ایک تکلف نہاں ہے۔ اظہارِ مدعا اور عرض مقصد اس انداز میں کرتے ہیں کہ محبوب خود محب کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

کچھ اور مانگنا مرے مشرب میں کفر ہے
لا اپنا ہاتھ دے مرے دستِ سوال میں
فرصت میں ٹانک لینا کہیں اس کرن کو بھی
لپٹی ہوئی حجاب سے میری نظر بھی ہے
حسن و محبت ہم رشتہ ہیں سب گرہیں دمساز نہ کھول
دل میں اک ہلکی سی خلش کو سلسلہ جنباں رہنے دے

ایک حقیقی شاعر اور سماجی رہنما کے فرائض سے بھی سراج صاحب غافل نہیں رہے انھوں نے انسان کو اس کی عظمت کا احساس دلایا ہے۔ اور ظالموں کو ان کی حرکتوں پر ٹوکا ہے۔ جذبۂ انسانیت اور آدمیت کے فروغ کے سلسلے میں اپنے فن کا صحیح استعمال کیا ہے۔ ان کے لہجے میں ایک ہمدرد اور دوست کے تاثرات ہیں ناصح کے نہیں کیونکہ نفسیاتی اعتبار سے آدمی دوست کی رائے سنتا ہے جبکہ ناصح کی گفتگو ہمیشہ ذہنی بار ثابت ہوتی ہے:

یہ جزر و مد ہے پاداشِ عمل اک دن یقینی ہے
نہ سمجھو خونِ انساں بہہ گیا ہے رائیگاں ہو کر
انسانیت کے خون سے ہولی تو کھیل لی
تاریخ باز پرس کرے گی بہا رسے
شگاف ڈال دو تاریکیوں کے سینے میں
ہوا کے رخ پہ ہوں تالے سحر کی بات کرو
چند تنکوں کی سلیقے سے اگر ترتیب ہو
بجلیوں کو بھی طوافِ آشیاں کرنے پڑے
شاخیں تراشی جاتی ہیں بڑھنے کے واسطے
ہے رنگ و بو کی جیت شکستِ بہار میں

سراج صاحب کی ذات ایک اسکول کی حیثیت رکھتی تھی۔ ان کے فکر و فن سے بے شمار لوگوں نے اکتساب فیض کیا ہے۔ ان سے براہ راست اکتساب فیض کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد آج بھی رہگزار ادب پر گامزن ہے اور لو وارفتگان شعر کی ادبی قیادت کر رہی ہے۔ ان کے تلامذہ میں مظہر لشوانی، تادر صدیقی، حیات وارثی، مطرب نظامی، شفق شاہانی، تسنیم فاروقی، شو کمار شوق، کمال احمد صدیقی، شمبھو دیال شفق، انوار الحق انوار، تجسس اعجازی، نظر لکھنوی، اپنے اپنے انداز میں زلف شعر و سخن کو سنوارنے کے لیے عمل شانہ کشی میں مصروف ہیں۔

سراج لکھنوی کا طریقۂ اصلاح بھی ملک کے تمام استادوں سے الگ تھا۔ وہ شعر کی اصلاح سخن کر دیتے تھے۔ شاگرد اپنا شعر سناتا اور وہ اس میں مناسب ترمیم کر دیتے اور مشورہ دیتے۔ اس طریقۂ اصلاح سے سیکھنے کا بہترین موقع فراہم ہوتا تھا۔ ہر شعر کی خوبی اور خامی پر گفتگو ہوتی۔ رائے لینے والا اپنی صلاحیت اور لیاقت کی بنیاد پر ان سے کچھ نئی باتیں سیکھتا اور آئندہ اسی غلطی کو دہرانے کا امکان ختم ہو جاتا جس کی جانب سراج صاحب اشارہ کر دیتے تھے۔

مطلع میں ایک ردیف زائد ہونے کا نازک عیب میں نے سراج صاحب کے علاوہ اور کسی سے نہیں سنا۔ سراج لکھنوی کی "ذات و صفات" شرافت و ادب کی حیات و کائنات ہیں۔ لکھنؤ اپنے جن مایۂ ناز فرزندوں پہ فخر کر سکتا ہے ان میں سراج لکھنوی بھی شامل ہیں۔

ابھی یہ آئینہ ناقدری کی گرد سے دھندلا دکھائی دے رہا ہے لیکن مجھے پورا یقین ہے کہ وقت اسے صاف کر کے جلا ضرور بخشے گا۔ خود انھوں نے اس کا شکوہ اپنے انداز میں یوں کیا ہے۔

ہم نے جو روشن کیے تھے جل رہے ہیں وہ چراغ
اور ہمارے پاس مانگے کا اجالا بھی نہیں

*

خواجہ توصیف
بورڈ آف ریونیو اتر پردیش لکھنؤ

غزل

قید الم میں خواب سحر دیکھتے ہیں ہم
مایوسیوں میں ان کو اگر دیکھتے ہیں ہم

کیا کیا ہوئی ہے ان کی عنایت نہ پوچھیے
ہر شب اسی کرم کا اثر دیکھتے ہیں ہم

ٹھہری مگر کہاں یہ نظر انتخاب کی
حیرت سے اپنا ذوقِ نظر دیکھتے ہیں ہم

اے دل نگاہِ شوق کو پابندیاں قبول
ان ہی کو دیکھتے ہیں جدھر دیکھتے ہیں ہم

جو ان کے خیالوں کی گزرگاہ بھی نہیں
توصیف کیوں وہ راہ گزر دیکھتے ہیں ہم

ناصر میاں فرنگی محلی (صفحہ ۲۰ کا بقیہ)

محروم واپس ہوتی ہیں تو سوائے آنسو بہانے کے کیا چارہ۔ ناصر میاں کے قیام گاہ کا ذرہ ذرہ آج بھی سوگوار و پر غم نظر آتا ہے، جو کوئی آتا ہے اس کے چہرے کا حزن و ملال زبان حال سے یہ کہتا نظر آتا ہے کہ ؎

یہ کیا بات ہے ساقی مست و بیخود کہ اب تو نے چشم عنایت اٹھالی
وہی میکدہ ہے مگر سونا سونا وہی جام و مینا مگر خالی خالی

*

عتیق الرحمٰن قاسمی
شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

نذیر احمد کی ناول نگاری

فنی، ہئیتی اور موضوعاتی اعتبار سے ناول کی جو شکل بنتی ہے وہ بظاہر داستانوں کی معین اقدار و روایات کی بازیافت کے بجائے ان سے بے تعلقی کے تصور کو ابھارتی ہے لیکن اس کے باوجود ان دونوں نثری اصناف میں ایسا رشتہ تلاش کیا جا سکتا ہے جو ان میں ایک وحدت پیدا کر سکے۔

داستانیں ہمارے ادب کا اولین سرمایہ ہیں۔ یہ ایک ایسے دور کی یاد دلاتی ہیں جب انسان کا ابتدائی تخلیقی عمل توہمات اور اساطیر کے پس منظر میں فروغ پاتا تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ انسان توہمات سے آزاد ہوتا گیا اور اس کے ادبی معیاد تفریحی شغلوں اور وسیلۂ اظہار میں بھی تبدیلی رونما ہوتی گئی۔ یوں تو بہت سی داستانیں لکھی گئی ہیں جیسے سب رس، طلسم ہوشربا اور پھر باغ و بہار، فسانۂ عجائب اور رانی کیتکی کی کہانی۔ اس لیے اہمیت رکھتی ہیں کہ انھوں نے کسی نہ کسی شکل میں قدیم رنگ سے گریز کرتے ہوئے ناول کے خد و خال واضح کرنے میں اہم کردار ادا کیے ہیں، ساتھ ہی ساتھ فورٹ ولیم کالج کے زیر اثر لکھی گئی یا ترجمہ کی گئی داستانیں بھی اردو کے نثری سرمایہ میں خوبصورت اضافہ ہیں خاص طور سے باغ و بہار اپنی زبان و بیان اور لب و لہجہ کے اعتبار سے ایک ممتاز حیثیت کی حامل ہے۔

لیکن اگر ۱۸۵۷ء کے بعد سیاسی حالات نہ بدلے ہوتے تو نہ یہ عبوری دور ختم ہوتا اور نہ ہی مغربی اثرات اتنی تیزی سے آپاتے۔ اس کے بعد ہی ہندوستان میں زندگی کی ایک جہت متعین ہو گئی اور یہ جہت راست یا غلط جیسی بھی تھی بڑی واضح تھی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ مغربی اثرات جو ابھی تک کھڑکیوں اور روشن دانوں سے آرہے تھے اب ان کے لیے دروازہ کھل گیا جس سے زندگی کا پہلو متاثر ہونے لگا ادب بھی متاثر ہوا اور ناول تو خاص طور سے مغرب اور مشرق کے اتصال کا نتیجہ ہے۔ لیکن معاشرہ میں سب سے زیادہ مذبذب حالت مسلمانوں کی تھی جو ایک طرف اپنی کھوئی ہوئی عظمت پر غمزدہ تھے تو دوسری جانب انھیں انگریزی تہذیب کا عفریت خوفناک شکلیں بدل بدل کر ڈرا رہا تھا، اس آسیب زدگی سے نبرد آزما ہونے کے لیے اس وقت دو طرح کے رجحان سامنے آتے ہیں جن میں ایک مثبت تھا اور دوسرا منفی۔ اول الذکر کی قیادت سرسید مرحوم کر رہے تھے جو مسلمانوں کی پسپائی کا اعتراف کرتے ہوئے خندہ پیشانی کے ساتھ انگریزوں کی عملداری سے مفاہمت چاہتے تھے اور اس ساز کو توڑ پھینکنا چاہتے تھے جس سے صرف ماتمی دھن نکل رہی تھی۔ لہٰذا انھوں نے ادب، سیاست، مذہب اور زندگی کے مختلف شعبوں میں اصلاح کی ضرورت محسوس کی اور ادب کے اس پرانے میلان کو یکسر بدل کر اسے مقصدی اور افادی بنا دیا۔ اب یہ الگ بحث ہے کہ یہ نیا میلان ادب کے لیے کس حد تک مفید یا مضر ثابت ہوا؟

سرسید مرحوم اور ان کے دوسرے معاونین نے ادب کی مختلف اصناف میں اصلاح کی۔ حالی نے تنقید کو تذکروں کی حدود سے نکال کر اسے ایک الگ فن کی حیثیت سے روشناس کرایا جو

یقیناً ایک عظیم کارنامہ تھا نذیر احمد نے ناول نگاری کی ابتدا کی اور اس کے توسط سے اپنے مقدور بھر قوم اور معاشرے کی اصلاح کی کوشش کی خواہ وہ اپنے اس مقصد میں خاطر خواہ پوری طرح کامیاب نہ ہوئے ہوں اور معاشرہ میں رونما ہونے والی تبدیلی کو نہ روک سکے ہوں تاہم انھوں نے اردو کو ناول جیسی جدید اور زندہ صنف ادب سے روشناس کرا دیا چنانچہ عزیز احمد لکھتے ہیں :-

"میرے خیال میں حافظ نذیر احمد کے ناولوں سے ہم لوگوں نے بڑی مجرمانہ غلطی برتی ہے۔ نذیر احمد اردو کے پہلے کامیاب ناول نگار ہیں اور ان کی کہانیاں زندگی سے براہِ راست چنی گئی ہیں۔"

چونکہ نذیر احمد کا نقطہ نظر افادی تھا اس لیے ان کے ناولوں میں (جنھیں کچھ لوگ قصے اور کچھ تمثیلی قصے کہتے ہیں) صحافتی انداز میں زندگی کی نقالی نہیں ملتی بلکہ ان میں زندگی کا عرفان و آگہی موجود ہے۔ یہاں اس نکتہ پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ شاعری یا ادب کے دوسری اصناف صرف ذات کے اظہار تک محدود ہو سکتے ہیں مگر ناول کائنات کی عکاسی اور سماجی شعور نیز معاشرہ کی جھلکیوں کے بغیر نامکمل رہے گا۔ چنانچہ جے۔ بی ٹریلی نے لکھا ہے :-

"ناول تیزی سے بڑھتے ہوئے غیر منظم طریقہ پر پھیلے ہوئے بدلتے ہوئے سماج اور ایسے حالات میں جن میں قدیم معاشرتی اور تہذیبی اقدار ختم ہو رہی ہوں وجود پذیر ہوتا ہے تاکہ وہ ایسے معاشرہ کو آئینہ دکھا سکے۔"

نذیر احمد کا وہ عہد تھا جب تہذیبی قدریں ریزہ ریزہ ہو چکی تھیں اور جو باقی رہ گئی تھیں وہ بھی اتنی سر بریدہ تھیں کہ ان کی شناخت ناممکن ہو گئی تھی۔ نذیر احمد انھی قدروں کو سمیٹ کر اپنے ناولوں میں جذب کر لینا چاہتے تھے۔ ان کا یہ تصور الہامی نہ تھا بلکہ قدیم داستانوں اور قصوں پر مبنی تھا جسے ناول کو (جو صدیوں پہلے یوروپ میں رواج پا کر مقبول ہو چکا تھا) قبول کرنے میں زیادہ تکلف نہیں ہوا۔ نذیر احمد سے پہلے اردو میں متعدد ناولوں کے ترجمے ملتے ہیں مگر نذیر احمد ہی نے ۱۸۶۹ء میں مراۃ العروس کے نام سے اردو کا پہلا باقاعدہ ناول لکھا۔ اس ناول میں اگرچہ فن اور تکنیک کا سلجھا ہوا شعور نہیں ملتا مگر جس طرح حالی کی تنقید میں کمزوریوں کے باوجود اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح نذیر احمد کے یہاں فنی فروگزاشتوں کے باوجود ناول نویسی کے میدان میں ان کی تاریخی اہمیت مسلم ہے۔

مراۃ العروس میں مقصد فن پر غالب ہے جس کی وجہ سے پلاٹ وعظ و نصیحت کی ضرب بے تحاشہ سے متاثر نظر آتا ہے لیکن اسی کینوس پر ایک ایسے معاشرہ کی تصویر بھی ملتی ہے جہاں لڑکیوں کی تعلیم کو معیوب اور مخرب اخلاق سمجھا جاتا تھا اور لڑکی اپنے سسرال والوں کے لیے دردِ سر بن جاتی تھی۔ نذیر احمد کے دیگر کرداروں کی طرح اکبری اور اصغری کے مثالی ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مقصدی ناولوں میں مثالیت ناگزیر بھی ہو جاتی ہے۔ نذیر احمد کے اس ناول میں تاثیر کا (جو ناول کا حسن ہے) یہ عالم ہے کہ حیات النذیر کے مصنف کے بیان کے مطابق لوگ ایک عرصہ تک دہلی آ کر اکبری اور اصغری کے گھروں کا پتہ پوچھتے پھرتے تھے۔ ان کے ناول ایامیٰ کا موضوع بیوہ کے مسائل ہیں۔ بیواؤں کو انیسویں صدی میں اور کسی حد تک آج بھی ناقابل اعتنا بلکہ منحوس خیال کیا جاتا ہے جن سے حالی اور دیگر فن کاروں نے اپنی شعری اور نثری تخلیقات میں اظہارِ ہمدردی بھی کیا ہے لیکن اس ضمن میں نذیر احمد کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے بیوہ کے مسائل کو اس کی ذہنی اور نفسیاتی کشمکش کے ساتھ مذکورہ ناول ایامیٰ میں پیش کیا ہے۔ یہ نذیر احمد کا سب سے اہم ناول ہے جو جدید ناول کے قریب آ جاتا ہے اس ناول میں کردار کی نفسیات کو ایک جگہ اس طرح واضح کیا گیا ہے :-

"جسم پر میرا بس چلتا تھا اور اس کی میں نے حفاظت کی لیکن دل تو میرے اختیار میں نہ تھا۔ وسوسوں کو کیونکر روکتی، خیالات کو کس طرح ٹالتی، بس میرا بدن بالکل بے گناہ ہے لیکن دل نہ میں اس کو بے گناہ سمجھتی ہوں نہ بے گناہ کہتی ہوں، مجھ پر ایک وقت گزرا ہے، دن نہیں،

ہفتے نہیں، مہینے نہیں بلکہ برس کے برس مرد کی آواز میرے کانوں
کو بھلی معلوم ہوتی تھی، رات کو چوکیدار پکارتا یا دن کو
سودے والے صدا لگاتے تو کان لگا کر سنتی بلکہ ایک دفعہ
تو بے اختیار ہو کر ڈیوڑھی میں جا کر کھڑی ہو گئی "
آگے چل کر آزادی بیگم کہتی ہیں :۔
" ان بے چاریوں کے شوہر فوت ہوئے ہیں نہ کہ وہ
ضرورت جس کی وجہ سے دنیا جہاں میں نکاح ہوتے ہیں
اور جس کی وجہ سے خود ان کے نکاح ہوئے تھے "
نذیر احمد نے اس ناول میں بیوگی سے بحث کی ہے، پلاٹ کی تعمیر اور کردار نگاری میں نفسیات کا سہارا لیا ہے ایک گھریلو اور شریف عورت کے شادی سے متعلق جو خیالات اور احساسات ہو سکتے ہیں ان کو پیش کیا ہے جس میں رومانویت کا کیف بھی ہے اور مسلم پردہ دار خواتین کے عشقیہ اور جنسی جذبات نیز مجرد زندگی کی عکاسی بھی کی گئی ہے لیکن آخر میں یہ ناول کچھ غیر ضروری اور غیر فطری باتوں سے غیر متوازن ہو جاتا ہے نیز فن اور تکنیک کے اعتبار سے کمزور ہو جاتا ہے جس میں آزادی بیگم حالت نزع میں ایک طویل وصیت کرتی ہیں جو ممکن الوقوع نہیں تاہم اس نقص کے باوجود یہ ناول سماج کے ایک اہم مسئلہ کی تصویر کشی کرتا ہے۔

فسانۂ مبتلا میں بھی کہیں کہیں مسلم سماج کی پرچھائیاں ملتی ہیں۔ تعدد ازدواج سے اچھا خاصا گھر کورو کھیشتر کا میدان بن جاتا ہے کیونکہ عورت خواہ کتنی ہی وسیع النظر اور عالی ظرف ہو اس کی فطرت اپنا رنگ ضرور دکھاتی ہے چنانچہ اس ناول میں نذیر احمد نے تعدد ازدواج کے سلسلہ میں پیدا ہونے والی مشکلات پر روشنی ڈالی ہے۔ نذیر احمد کے مذہبی عقائد پر معترض حضرات شاید یہ بھول جاتے ہیں کہ دوسری شادی کی اسلام میں اجازت تو ضرور ہے لیکن اس کے ساتھ بہت سی شرائط کی پابندی بھی لازم ہے۔ نذیر احمد اگرچہ ایک انتہائی مذہبی شخص تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک فنکار بھی تھے جن کے نزدیک فن بھی ایک عبادت کا درجہ رکھتا ہے اور فن کے سلسلے میں وہ کسی طرح کی ریاکاری کو پسند نہیں کرتا۔ اس ناول میں کہانی صرف یہ ہے کہ مبتلا اپنی بیوی غیرت بیگم سے غیر مطمئن ہو کر ایک طوائف ہریالی سے شادی کر لیتا ہے جس پر سماج کا ہر فرد انگشت نمائی کرتا ہے اور اسے اس سلسلہ میں بڑی تلخ باتیں سننا پڑتی ہیں جس سے وہ ایک ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس ناول کا پلاٹ غیرت بیگم اور ہریالی کے کرداروں سے ترتیب دیا گیا ہے اور اس میں کہیں کہیں نفسیاتی تجزیہ بھی مل جاتا ہے جیسا کہ مبتلا غیرت بیگم کے بارے میں ہریالی سے کہتا ہے۔
" مجھے اپنی بی بی کا حال معلوم ہے وہ یہی نہیں کہ صورت
کی اچھی نہیں بلکہ اس میں عقل کی کوتاہی ہے صورت تو خیر
چل کے دیکھ لو گی مگر عقل کی کوتاہی اس سے ظاہر ہے کہ
اس نے عورت لانے کی فرمائش کی تھی تو مجھ سے "
لیکن عورت کی اس فرمائش کے بعد ازدواجی زندگی کا انتشار بظاہر کچھ عجیب سا لگتا ہے مگر چونکہ عورت تلون مزاج ہوتی ہے اس لیے اس سلسلے میں یقینی طور پر کچھ کہا نہیں جا سکتا کہ وہ کب کیا کر گزرے۔

توبۃ النصوح کے ماخذ پر محققین نے خاصی بحث کی ہے۔ ڈاکٹر صادق صاحب نے توبۃ النصوح اور اس کے ماخذ کے نام سے ایک مستقل کتاب تصنیف کر ڈالی ہے اگرچہ اس کے بعد بھی نذیر احمد کی اہمیت کم نہیں ہوتی کیونکہ اس ناول میں جس طرح کہانی ترتیب دی گئی ہے اور سماجی مسائل کو جس طرح موضوع بنایا گیا ہے وہ نذیر احمد کا اپنا فن ہے۔ اس میں خاص طور پر نصوح کا خواب اور اس سے پہلے کا حصہ خاصا اہم ہے جس میں ہیضہ کے مضر اثرات کا فطری نقشہ کھینچا گیا ہے اور لوگوں کی نفسیاتی کیفیت سے قصہ میں رنگ آمیزی کی گئی ہے۔ اس میں فنکار نذیر احمد واعظ نذیر احمد پر حاوی ہے۔ اس کے کردار آئیڈیل کردار ہیں۔ نصوح خود بھی ایک انداز میں زندگی نہیں گزارتا اور بیماری کے بعد تو اس میں بڑی تبدیلی آ جاتی ہے۔ ناول میں اہم بات یہ

ہے کہ اس میں مشرقی اور مغربی قدروں کے مابین تصادم کی جھنکار صاف سنائی دیتی ہے، کہانی صرف اتنی ہے کہ نصوح اور فہمیدہ ایک مدت کے بعد دین داری کی طرف مائل ہوتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کی اولاد بھی نیک اور صالح ہو۔ مگر انسان جو سوچتا ہے وہ ہوتا کب ہے؟ ان کے دو بچے کلیم اور نعیمہ (جو نذیر احمد کے عہد کے نمائندہ کردار ہیں ان میں کلیم خاص طور سے قابل ذکر ہے) دونوں مشرقی تہذیب، آداب اور روایات سے بیزار نظر آتے ہیں ان میں نعیمہ اپنی ایک سہیلی کے سمجھانے سے راہ راست پر آجاتی ہے مگر کلیم اپنی خو نہیں چھوڑتا جس کی وجہ سے اس کے کردار میں اصلیت آگئی ہے۔ یہ بھی عجیب سی بات ہے کہ نذیر احمد نے جن کرداروں کو بدتر بنا کر پیش کیا ہے صرف وہی اصلی اور حقیقی کردار ہیں بقیہ کردار تو اتنے آئیڈیل ہیں کہ بالکل مصنوعی معلوم ہوتے ہیں۔

۱۸۵۷ء کے بعد ہندستان کے حالات نے جو رخ اختیار کیا اور یہاں کی تہذیب و ثقافت جس طرح انتشار سے دوچار ہوئی وہ ایک زبردست المیہ ہے۔ ابن الوقت اسی زوال شدہ معاشرہ اور تہذیب رفتہ کا ایک نمائندہ کردار ہے۔ آپ اسے مرعوبیت اور احساس کمتری کے زیر سایہ تربیت پانے والا کہہ کر اس وقت کے حالات اور حقائق سے دامن بچا نہیں سکتے۔ نذیر احمد مشرقی تمدن اور قدیم تہذیب کے اس قدر دلدادہ ہوتے ہوئے بھی مشرق کی پسپائی سے انکار نہ کر سکے بلکہ آخر وقت تک حجۃ الاسلام کے ذریعہ اپنی تہذیب کی برتری اور بحالی کی کوشش کرتے رہے جس میں ایک مسلم ناول نگار کے احساسات کارفرما نظر آتے ہیں۔

واقعہ صرف اتنا ہے غدر (پہلی جنگ آزادی) کے زمانہ میں ابن الوقت نے ایک انگریز نوبل کی جان بچائی اور اسے اپنے یہاں پناہ دی۔ جنگ فرو ہونے کے بعد جاگیر اور دوسری مراعات کی شکل میں ابن الوقت کو اس کا معاوضہ بھی مل گیا۔ صرف اتنا ہی نہیں انگریز اپنے اس محسن اعظم کو اپنی محفلوں اور تقریبوں میں بھی شریک کرنے لگے اور اس کے ساتھ کافی احترام و محبت سے پیش آنے لگے۔ دوسری طرف کچھ ثقہ قسم کے بزرگ انگریزوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانے پینے کے جرم میں اس کا مقاطعہ کر بیٹھے تھے۔ مگر ابن الوقت نے ان کی کوئی پرواہ نہ کی اور کچھ ہی دنوں میں وہ ابن الوقت سے ابو الوقت بن گیا۔ وہ اپنی وضع قطع لباس رہن سہن، انداز گفتگو اور تمام طور طریقے بدل کر انگریز سے بھی دو چار قدم آگے نکل گیا جیسا کہ ردعمل کے طور پر ہوا کرتا ہے۔ اس کے اعزاز میں ایک نشست ہوئی جس میں اس کا تعارف کرایا گیا۔ آخر میں ابن الوقت ایک تقریر بھی کرتا ہے جو بہت اہم ہے مگر طوالت نے اس کو غیر متوازن بنا دیا ہے۔

نذیر احمد اس ناول میں ابن الوقت کے ساتھ ساتھ چلتے نظر آتے ہیں اور بالآخر اسے مغربی تہذیب سے بدل کر دیتے ہیں اور حجۃ الاسلام کی وعظ و تلقین کی مدد سے ایک گمراہ مسلمان کو راہ راست پر لے آتے ہیں —— یہ ناول حجۃ الاسلام کی مداخلت سے پہلے فطری طور پر آگے بڑھتا ہے۔ بعد میں غیر فطری انداز اس ناول میں آجاتا ہے۔

اس ناول سے غدر کے واقعات، تاریخ، مشرقی و مغربی تہذیب کے تصادم، مغربیت کے غلبے اور اس کے نقصانات پر روشنی پڑتی ہے لیکن حجۃ الاسلام اور ابن الوقت کے مباحثوں سے قصہ غیر متوازن ہو جاتا ہے اسی لیے بعض لوگوں نے اسے مجموعۂ مقالات کہا ہے جبکہ کردار نگاری اور پلاٹ کے سلسلے میں یہ نذیر احمد کے دوسرے ناولوں سے مختلف اور بہتر ہے، لیکن اسے تھوڑی سی اصلاح سے اور بھی اچھا بنایا جا سکتا تھا۔ مثلاً حجۃ الاسلام کی باتیں مختصر کر دی جاتیں اور اگر کرداروں پر بھی تھوڑی سی توجہ دی گئی ہوتی تو ڈاکٹر سید عبداللہ اسے پوچ نہ کہہ پاتے۔

اس میں شک نہیں کہ نذیر احمد اردو کے پہلے ناول نگار ہیں جن کی ناولوں میں سماجی شعور اور آگہی ملتی ہے لیکن ان کے

(باقی صفحہ ۳۸ پر)

غزلیں

ڈاکٹر ابو محمد سحر
۴۹ مالویہ نگر بھوپال ۳

دیارِ لالہ و گل میں جواں ہوئے ہم لوگ
حدیثِ شوق بنے داستاں ہوئے ہم لوگ

حضورِ یار ملی طاقتِ سخن کس کو
زبانِ حال سے جادو بیاں ہوئے ہم لوگ

شعورِ ذات بھی ادراکِ غیرِ ذات بھی تھا
حدودِ ذات میں یوں بیکراں ہوئے ہم لوگ

جہاں کو ہم نے دیا تازہ منزلوں کا سراغ
کبھی جرس تو کبھی کارواں ہوئے ہم لوگ

تھا محوِ خواب زمانہ ہمیں نہ دیکھ سکا
طلوعِ صبح سے پہلے عیاں ہوئے ہم لوگ

ہمارے دم سے چمن میں رہی یہ شرمِ وجود
نہ تھی بہار تو فخرِ خزاں ہوئے ہم لوگ

بجھے تو رہ گئے اک سرد مشتِ خاک سحرؔ
جلے تو غیرتِ برقِ تپاں ہوئے ہم لوگ

سلطان احمد نادمؔ
ملکہ گنج گیٹ ۔ لکھنؤ

تعلق ہے نہ اب بیگانگی ہے
حسیں زنجیر اک ٹوٹی پڑی ہے

محبت کی یہی تو سادگی ہے
تمنا آج بھی بیتاب سی ہے

کئی دن سے تبسم آزما ہیں
ادا شاید کوئی سیکھی نئی ہے

وہی ہم کو نہیں پہچانتے اب
وہی جن سے ہماری دوستی ہے

تبسم لب پہ ان کے آ رہا ہے
کلی گویا چمن میں کھل رہی ہے

زمانے بھر سے قائم ہے تعلق
کوئی اپنا نہ کوئی اجنبی ہے

کہاں باقی نظامِ آرزو بھی
نظر ان کی بہت بدلی ہوئی ہے

تمنا، پھر تمنا، پھر تمنا
مرے جینے کا حاصل بس یہی ہے

وہ پھر مائل ہوئے مشقِ ستم پر
دعاؤں میں کہیں کوئی کمی ہے

میں اپنے آپ سے اک دن تو ملتا
مجھے فرصت ہی اتنی کب ملی ہے

اگر شامل ہو نادمؔ ان کی مرضی
غموں سے بھی مجھے حاصل خوشی ہے

تلامیذہ سُہا ماھرؔ بلگرامی
۱۹۴ سرائے حسن گنج ڈالی گنج، لکھنؤ

فرہاد صفت کوہ کنی ہو کے رہے گی
شیریں کے لیے تیشہ زنی ہو کے رہے گی

دل والو چلو سینہ سپر تیرِ نظر کھائیں
اس سمت سے ناوک فگنی ہو کے رہے گی

بس اتنی سی اک شرط ہے ہو دیدۂ دل وا
مقبول دعائے ارنی ہو کے رہے گی

جلوہ فگن اک روز وہ اس سمت بھی ہوگا
پُر نور ہماری کفنی ہو کے رہے گی

دل دے کے حسینوں سے سلامت ملے واپس
ممکن ہی نہیں دل شکنی ہو کے رہے گی

مجروحِ محبت کے لیے ضبط کی ہے شرط
اکسیرِ مرض کم سخنی ہو کے رہے گی

اترا ؤ نہ اس حسنِ دو روزہ پہ کہ پھر خاک
یہ سیم تنی گل بدنی ہو کے رہے گی

ماھرؔ یہی ہر سانس ہے کہتی کہ بہت جلد
ختم اب یہ غریب الوطنی ہو کے رہے گی

م۔ ق۔ خاں
معروف گنج، گیا، بہار

مطالعۂ اقبال کا فنی پہلو

کہا جاتا ہے کہ کسی خطے کی آب و ہوا کا وہاں کے باشندوں کے رہن سہن، عادات و اطوار اور قوت فکر و عمل پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ اس خطۂ زمین کے رہنے والے بھی یہاں کی آب و ہوا کی طرح ہی مجموعۂ اضداد ہیں۔ اسی لیے ہم کسی بات کو بڑی شدت سے محسوس کرتے ہیں اور جذبات کی رَو ہمیں بہت دور تک بہالے جاتی ہے۔ اس صورت حال میں استدلال پر ہماری گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے اور ہمارا فعل کسی سمجھے بوجھے منصوبے یا غور و خوض کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ یہ وصف شاید ہماری فطرت میں داخل ہے۔ ہمارے خون میں شامل ہے۔ جس سے بچنا بچوں کا کھیل نہیں۔ ہم یا تو کسی چیز کی پرستش کرنے لگتے ہیں یا ملامت کی تمام حدیں ختم کر دیتے ہیں۔ یہ پرستش یا ملامت ہماری شخصیت کے انہی پوشیدہ اوصاف کا نتیجہ ہے۔ جو غیر شعوری طور پر فعال رہتے ہیں خواہ ہم انھیں محسوس کریں یا نہیں ان اوصاف کا ہماری زندگی اور ادب پر گہرا اثر پڑا ہے۔ ان سے مغلوب ہو کر جب ہم ادبی اقدار کا تعین کرتے ہیں تو ایک عجیب غریب صورت حال پیدا ہو جاتی ہے۔ جس میں ہم ادب کے پیغام یا اصلاحی اور فلسفیانہ پہلو کو جمالیاتی اور فنی پہلو پر ترجیح دیتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ادب و گوشش یا اقبال جیسے شاعر محض مبلغ کی حیثیت سے مسند فاخرہ پر جلوہ افروز نظر آتے ہیں۔ ان کے گرد بنے ہی روشن ہالے ان کی شاعرانہ عظمت اور فنی خصوصیات تک رسائی میں سدِ راہ بن جاتے ہیں۔ رامائن، مہابھارت، سادتری اور کلام اقبال کو ہم اس نقطۂ نگاہ سے پرکھنے کی سعی نہیں کرتے جن کے یہ متقاضی ہیں۔ گوئٹے کے ڈاکٹر فاؤسٹ (DR. FAU-STUS) ملٹن کی پیراڈائز لوسٹ (PARADISE LOST) اور ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی نظم دی ویسٹ لینڈ (THE WASTE LAND) کی جو ادبی اہمیت ہے۔ مندرجہ بالا شاہکار وہاں تک نہیں پہنچ پاتے۔ گو ان میں بھی وہی آفاقیت اور وہی شاعرانہ حسن ہے۔ جہاں تک اقبال کا تعلق ہے تو انھیں فنکار کی حیثیت سے دیکھنے اور پرکھنے کی بہرحال ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں ایک بنیادی سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا اقبال عمومی طور پر مذہبی مصلح، فلسفی اور مبلغ اسلام تھے یا شاعر تھے؟ اور کیا کسی شخصیت میں ان دونوں حیثیتوں کا حسین امتزاج نہیں ہو سکتا؟ اقبال نواز اور ان کے فلسفہ سے متاثر لوگوں کی ایک جماعت نے اپنی عقیدت کے جوہر دکھلائے اور انھیں تبلیغ کی مسند عالیہ پر بٹھا دیا۔ میرے خیال میں اقبال کی فنی عظمت کو گہن آلود کرنے میں ان لوگوں کا نام سرفہرست ہونا چاہیے۔

فکر و فن دو الگ لفظ ہیں۔ فکر کی تشہیر و اشاعت فلسفی، مفکر یا دانشور کا کام ہے۔ جبکہ فنکار انھیں افکار کو فنی رکھ رکھاؤ کے ساتھ پیش کرتا ہے۔

مذہبی ادب اور خاص کر مذہبی شاعری کو ادب میں اعلیٰ مقام نہیں ملا ہے جس کے پس پردہ کچھ دشواریاں ہیں، کچھ رکاوٹیں ہیں۔ مذہبی شاعری عظیم نہیں ہو سکتی۔ یہ ایک مفروضہ ہے۔ ویسا ہی جیسا یہ کہ "غزل ایک نیم وحشی صنف سخن ہے"۔ مذہب

سے تحریک پانے والے جذبات و احساسات اتنے ہی شدید اور ہمہ گیر کیوں نہیں ہو سکتے جتنے سیکولر جذبات و احساسات ہوتے ہیں؟ کیا مذہب دوسرے جذبات سے اس قدر دور ہے؟ تاریخ عالم اس بات کی شاہد ہے کہ مذہب کے نام پر لوگوں نے اپنی جانیں تک قربان کر ڈالی ہیں۔ حقیقت حال یہ ہے کہ کسی شخص کے منفرد وجدان یا کسی مخصوص جذبہ یا احساس سے اعلیٰ فن پارہ ظہور پذیر نہیں ہوتا۔ اس کا تعلق اس بات سے ہوتا ہے کہ اس نے محسوس کس شدت سے کیا؟ خواہ اس سلسلے میں محرک کچھ بھی ہو۔ اور اس کے بعد اس نے اپنے مشاہدات اور جذبات و احساسات کو کس طرح فنی پیکر بخشا۔

جہاں تک شدتِ جذبات و احساسات کا سوال ہے یہ ایک نہایت واضح امر ہے کہ انسان پتھر کے ٹکڑے میں اللہ کا جلوہ دیکھتا ہے اور عقیدت سے سربسجود ہو جاتا ہے۔ پھر کسی شاعر یا ادیب کے مذہبی جذبات اتنے بلیغ کیوں نہیں ہو سکتے کہ اس کی ذات اور فن پر ایسی کیفیت طاری ہو جائے جو عظیم شاعری یا شاہکار کے لیے لازمی ہوتی ہے۔

جان بنیان کی کتاب پلگرمس پروگیس (THE PILG-RIM'S PROGRESS) ملٹن کی "پیراڈائز لوسٹ" اور ڈیوائن کومیڈی ایسے ہی جذبات کی مرہونِ منت ہیں۔ مذہبی وابستگی اور عقیدت ان تخلیقات کے شاہکار بننے میں رکاوٹ نہیں بنی بلکہ اس ضمن میں معاون ہی ثابت ہوئی۔ اقبال کبھی بھی کٹر روایت پسند یا متعصب قسم کے انسان نہیں رہے۔ نیا شوالہ، گرو نانک، سوامی رام تیرتھ، رام۔ ہندستانی بچوں کا گیت اور شعاع امید جیسی ان کی نظمیں ان کے غیر متعصب اور روادار ہونے کا واضح ثبوت ہیں۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ طریقہ زندگی، مذہب اور ادب غرض کہ ہر میدان میں باغی تھے۔ ان کی کتاب "اسلامی الہیات کی جدید تشکیل" اس کا بیّن ثبوت ہے۔

دوسری جانب غالب کے علاوہ شاید ہی اردو کا کوئی دوسرا شاعر خدا کی مطلق العنانی کو اس بیباکی کے ساتھ پیش کرنے کی جرات کر سکا ہو ؎

آئے عشاق گئے وعدۂ فردا لے کر
اب انھیں ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر

انھوں نے انسانی جبلت کے اس پہلو کو ہمیشہ سراہا۔ اسی باعث ان کی شاعری میں نہ کیٹس کی پھدکتی بلبلیں ہیں نہ شیلی کی اسکائی لارک۔ یہاں درویش صفت شاہین ہے جو حمام و کبوتر کا بھوکا نہیں لیکن جس کی فطرت ہمیشہ بلند پروازی ہے۔ انقلاب روس کا انھوں نے دلی خیر مقدم کیا اور چینیوں کے بارے میں کہا ؎

گراں خواب چینی سنبھلنے لگے
ہمالہ سے چشمے ابلنے لگے

انھوں نے مسولینی پر بھی ایک نظم کہی اور شیطان کی شخصیت کو اس ڈھنگ سے پیش کیا ہے کہ جبرئیل کا رنگ فق نظر آتا ہے ایک رباعی ملاحظہ ہو ؎

ترے شیشے میں مے باقی نہیں ہے
بتا کیا تو مرا ساقی نہیں ہے
سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم
بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے

شاعری خام جذبات و احساسات کا اظہار نہیں ہے اور نہ ہی علم عروض کی چابکدستی۔ شاعر ہونے کے لیے یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ حسین تشبیہات و استعارات کے استعمال پر پوری گرفت ہو۔ شاعر عرفانِ ذات، تجربہ، مشاہدہ، جذبہ اور کیفیت کے ساتھ ماضی کی صحت مند روایت، حال کی حشر سامانیوں، عصری آگہی اور مستقبل کی غمازی کی مٹی کو گوندھ کر ایک پیکر کی تشکیل تو کرتا ہے۔ چنانچہ ضروری ہے کہ اس کی دوربینی ماضی، حال اور مستقبل کا محاصرہ اور محاکمہ کر سکتی ہو اور اسے زندگی کی تمام تلخ و شیریں حقیقتوں کا بھرپور احساس ہو۔

ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ رقمطراز ہے "شاعر کا عمل نئے تجربات یا جذبات کا انکشاف نہیں ہے بلکہ وہ ادنیٰ چیزوں کی نئی ترویج بخشتا ہے۔ وہ اپنی کاوشوں سے ان احساسات کو زندگی عطا کرتا ہے جو محض جذبات ہوں۔ شاعری جذبات کی رو میں بہنے کا نام نہیں یہ شخصیت کا اظہار نہیں بلکہ اپنی ذات سے فرار ہے۔ لیکن یہ عمل صرف

ان کا حصہ ہے جو شخصیت کے مالک ہیں اور وہی جانتا ہے کہ شخصیت سے فرار کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے ۔"

اقبال بھی ایسی ہی شخصیت کے مالک تھے۔ شاعری سے قطع نظر ان کی دوسری نگارشات کے مطالعہ سے اس امر تک نہایت آسانی سے رسائی ہو سکتی ہے۔

اقبال نے علوم مشرق و مغرب کا غائر مطالعہ کیا۔ یہ خوشہ چینی نہیں تھی بلکہ تلاش و جستجو تھی۔ انھوں نے فلسفہ و شاعری کے تمام خزانوں کو ڈھونڈا جوہر نایاب کی تلاش میں انھوں نے کبھی ہندوستان کے قدیم رشیوں کی تعلیم و تصنیفات کی جانب رجوع کیا تو کبھی روم اور یونان کی تہذیب میں جھانکا، کبھی اہل یورپ کے فلسفے اور فن کے سمندر میں غوطہ زنی کی اور آخر کار انھیں رومی اور نیٹشے جیسے مفکروں سے نہ صرف درس زندگی ملا بلکہ فن کو برتنے کا سلیقہ بھی۔ لیکن ان کی شاعری کشتۂ مرکب نہیں۔ انھوں نے اردو شاعری کو ایک نیا آہنگ دیا، ڈرامائی انداز بخشا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ شاعری کو ایک نئی جہت دی۔

علی سردار جعفری جیسے اقبال بیزار نقاد نے بھی ابھی حال ہی میں ایک مضمون میں اعتراف کیا ہے کہ انھوں نے شہد کی مکھی کی طرح مختلف پھولوں سے رس چوس کر اسے شہد بنا کر پیش کیا۔

اربند و گھوش نے کہا ہے "شاعری شاعر کے ذاتی کسب یا کشفی عمل کا نام نہیں بلکہ اس کا انحصار اس کے عہد اس کے ماحول کی آگہی، تجربات و خیالات کی ہمہ گیری، ابہام کی تشکیل نو اور روحانی اکتساب کی گہرائی و گیرائی پر ہے" عظیم شاعری کے لیے یقین ہی نہیں علم کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ تخیل کے ساتھ مشاہدہ بھی ضروری ہوتا ہے۔ شاعر کو نباض فطرت ہونا چاہیے۔ اربندو گھوش نے کہا ہے "میں سمجھتا ہوں کہ میں یہ کہہ سکتا ہوں۔ میں اپنے روز و شب کا ایک زمانے تک کسی سائنس داں سے زیادہ احتیاط سے جو نظام قدرت کا تجربہ کرتا ہے محاسبہ و محاکمہ کرتا رہا ہوں"

اقبال نے کہا ہے ؎

میری صراحی سے قطرہ قطرہ نئے حوادث ٹپک رہے ہیں

میں اپنی تسبیح روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ

اقبال کی شاعری کی ترسیل میں ان کے اسلوب بیان ور لب و لہجہ کو بڑا دخل ہے۔ اس نے بھی شاعر اور قاری کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دی ہے۔ مذہب ایک نظریے مذہبے قیاس آرائی اور اظہار کیفیت و انبساط سے کچھ الگ شے ہے۔ یہ تمام چیزیں مذہب کا جزو نہیں لیکن شاعر کو ان کے اظہار کے سلسلے میں محتاط رہنا پڑتا ہے اور کچھ بندشوں کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ اقبال کی شاعری کا یہی تو وصف ہے کہ وہ پابہ جولاں ہونے کے باوجود بھی شاعرانہ حسن و جمال سے مالا مال ہے۔ محض ایقان یا نظریہ کی تبلیغ و اشاعت نہیں ہے۔"

آج کے مذہبی شاعر کو ترسیل کا پیچیدہ مسئلہ درپیش ہے ایہام و تصورات جنھوں نے ایک زمانے تک لوگوں کو اپنی جانب متوجہ رکھا، دھیرے دھیرے اپنی کشش کھو بیٹھے۔ دوسری جانب ایقان رو بہ زوال ہوا اور تشکیک مذہب کی جو روایت اور تشکیک کے درمیان معلق تھا گرفت ڈھیلی پڑتی گئی۔ حالیہ اور مادی ترقی نے اس کی جڑیں اور کھوکھلی کر دیں۔ نتیجے کے طور پر اقبال کی شاعری میں کہیں پر اسرار رمزیت ہے تو کہیں لامرکزیت ہے۔ اس کے علاوہ ان کا لہجہ بھی تشدد آمیز ہے۔ خود آگہی کی یہ محشر سامانی صرف مذہبی شاعر یا عام شاعر تک ہی محدود نہیں بلکہ آج ہر دانشور کے شعور یا تحت الشعور میں در آئی ہے۔ مذہبی شاعر کے یہاں یہ اور نمایاں ہے۔ کیونکہ اس کے اندر خود آگہی اور مذہب کے تقاضوں کے درمیان زبردست جنگ جاری ہے۔

C.S. LEWIS کے مطابق مذہبی شاعری اظہار کے مندرجہ ذیل اسلوب اختیار کرتی رہی ہے۔

اوّل تخاطب مستقیم یا (FRONTAL ASSAULT) یعنی روبرو موضوع کے لیے بلند آہنگ لہجہ یہاں شاعر کا لہجہ مقرر جیسا ہوتا ہے اور وہ اس کیفیت کا اظہار کرتا ہے جو حقیقتاً ناقابل

اظہار ہوتی ہے۔

دوسرا اسلوب اس کے بالکل برعکس ہے جیسے HUM-BLESOBRIETY) یعنی منضبط منکسر المزاجی۔ کہا جا سکتا ہے۔ یہ اسلوب سادہ، سلیس اور فصیح ہوتا ہے۔ آخری اسلوب ہے تبدیل شدہ کلاسکیت (TRANSFERRED CLASSICISM) یعنی قدیم دیو مالا کے ذریعہ مطلب برآری۔ زمانہ قدیم کے ادب و فن کو نئے انداز سے بروئے کار لانے کی کوشش۔ پہلا اور آخری اسلوب ہی اقبال کے مزاج سے مطابقت رکھتے تھے۔

اقبال نے فارسی شاعری اور یورپ کے سائنسدانوں اور دانشوروں سے بھی اکتساب فیض کیا۔ بات نہایت آسان ہے۔ آئنسٹائن پران کی نظمیں ان لوگوں کیلئے کیوں پڑھنے لگیں۔ جنھوں نے سرے سے آئنسٹائن کو پڑھا ہی نہیں۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی نظم "ڈی ویسٹ لینڈ" (THE WASTE LAND) کا بھی یہی حشر ہوا تھا۔ جو شخص رنگوں کی زبان نہیں جانتا اس کے لئے آج کی مصوری بلاشبہ خلل دماغ ہے اور اقبال کی شاعری مجذوب کی بڑ۔

اقبال کی شاعری کی اہمیت اور اس کی بلندی کو سمجھنے میں اردو شاعری کا روائتی مزاج بھی بڑی حد تک ایک رکاوٹ بنا ہے۔ یہاں تبدیلی کو کفر سمجھا جاتا ہے۔ اردو قارئین کا ذہن روائتی غزل اور بندھے ٹکے مضامین سے ہی محظوظ ہوتا ہے۔ اقبال کی شاعری کا آہنگ ان کی قوت سامعہ کے مخصوص عضو قبولیت یعنی RECEIVING ORGAN کو ضرب پہنچاتا ہے۔ جمالیاتی حس کے اس شجر خزاں رسیدہ کو نئی کونپلوں سے مالا مال کرنے کی ضرورت اقبال نے محسوس کی اور اردو شاعری کے دامن کو کس قدر وسیع کیا۔ یہ کچھ ڈھکی چھپی بات نہیں۔ جانسن کو ملٹن کی نظم لیسی ڈاس LYCIDAS اور پہلی نظر میں ایلیٹ کو PARADISE LOST مہمل نظر آتی ہو تو ان کا کیا علاج ہے۔

حالانکہ ایلیٹ نے بعد میں ایک مضمون لکھ کر اس غلطی کی تلافی کر دی تھی۔ انصاف کا تقاضہ تو یہ ہے کہ ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ اقبال نے اپنے احساسات اور جذبات ایمان و ایقان کو شاعری کا پیکر بخشا یا یہ تمام چیزیں محض غیر مربوط ملبے کی شکل میں سامنے آتی ہیں۔ میں مسجد قرطبہ اور ساقی نامہ کو اقبال کی شاعری کے دو گواہوں کے طور پر دنیائے ادب کے مصنفوں کی عدالت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔

اقبال کے کلام کا ترجمہ بھی ضرور ہوا لیکن افسوس یہی ہے کہ انھیں عمر خیام کی طرح کوئی FITZERALD نہیں مل سکا۔ پھر بھی اقبال کی شہرت آفاقی ہے اور ہر زبان و ملک ان سے واقف ہے۔

★

مطالعہ اقبال کا فنی پہلو - صفحہ ۳۲ کا بقیہ)

اندر کا فن کار مختلف خانوں میں بٹا ہوا ہے۔ وہ مراۃ العروس، ایامیٰ، توبۃ النصوح مبتلا اور ابن الوقت میں سے کسی ناول میں بھی پورا ناول نگار نہیں ہے۔ کسی میں اس کا دل ہے تو کسی میں صرف دماغ۔ لیکن اگر مختلف خانوں میں بٹے ہوئے اس ناول نگار کو جمع کیا جائے تو اس سے ایک اچھے ناول نگار کی شبیہہ بن سکتی ہے۔

★

نشاط چنگیزی۔ بروان چندن پور
کھوریا بازار۔ ضلع گورکھپور۔ ۲۷۳۱۶۴

عید مسرت

عید ہر دل سے ہے ہر بشر کے عیاں
ہر نفس آرہا ہے نظر شادماں
چار سو ہیں مسرت کی نیرنگیاں
بن گیا گلستانِ ارم کل جہاں
کتنے جلوؤں کا آنکھوں میں ہے آشیاں
کس قدر کیف پرور ہیں رنگینیاں
ہیں وفورِ محبت کے دریا رواں
دل سے ہر شخص کے بے حد و بے کراں
جب بھی ملتا ہے کوئی کسی سے گلے
دل سے مٹ جاتا ہے نفرتوں کا دھواں
اک طرف بن گیا میہماں ہر کوئی
اک طرف ہر کوئی بن گیا میزباں
دل مسرت کے نغموں سے مسرور ہے
پاؤں پڑتے زمیں پر ہیں اپنے کہاں
اپنے بندوں میں خوشیوں کی دولت لیے
جیسے آیا ہو خود مالکِ کون و مکاں
یوں طلسم خوشی چھا گئی ہر طرف
دور تک غم کا ملتا نہیں ہے نشاں
چار جانب سے خوشیوں کا سیلاب ہے
جا رہے ہیں بہے جس میں پیر و جواں
ہر طرف ہر نفس کی الگ شان ہے
ہو رہے ہیں فدا جس پہ کر و بیاں
بعد روزوں کے دولت ملی عید کی
آج قدرت ہے ہم پر بڑی مہرباں
کتنی پُر کیف ہے بھینی بھینی فضا
کتنا پُر لطف ہے یہ سہانا سماں
ہے خدا سے دعا یہ نشاطِ حزیں
کاش ہو جائے اب ہر خوشی جاوداں

نسیم نکہت
لٹریری بلڈنگ نخاس، لکھنؤ ۳

کل رات کو (ناظر خیامی کی یاد میں)

گدگدی کرتے تھے تیرے زمزمے کل رات کو
ہر طرف پھیلے ہوئے تھے قہقہے کل رات کو
ایک لب سے دوسرے لب تک رواں تھی مثلِ موج
مسکراہٹ میں بپا تھے زلزلے کل رات کو
کہکشاں تک جا رہی تھی تیرے شعروں کی کمند
آسماں چھوتے تھے تیرے ولولے کل رات کو
بارشِ مے کر رہی تھی فکرِ خیامی تری
جام و ساغر میں تھے قائم سلسلے کل رات کو
گردشِ دوراں نے توڑا تو مگر ٹوٹے نہیں
رند و ساقی میں تھے ایسے رابطے کل رات کو
ہر نظر کو جگمگاتا تھا ترا طرزِ مزاح
تیری فنکاری کے روشن تھے دیے کل رات کو
تیرے شعروں کی حقیقت اس سے زائد کیا کہوں
پیکرِ الفاظ میں تھے واقعے کل رات کو
تو ہمیشہ کے لیے خاموش ہو کر رہ گیا
زندگی نے ایسے بدلے زاویے کل رات کو
تیری مستانہ روش سے جن میں رونق تھی بہت
گہرے سناٹے میں تھے وہ راستے کل رات کو
ڈھونڈنے سے بھی جگا ہوں کو نشاں ملتا نہیں
ایسے ڈوبے آنسوؤں میں قہقہے کل رات کو
دوست تیرے آبدیدہ تیرا فن ہے اشکبار
سانحے لایا ہے کتنے سانحے کل رات کو
ایک صورت پر نہ نکہت رہ سکا قائم کبھی
درد نے بدلے ہزاروں زاویے کل رات کو

بلقیس شبیہ
(آکولہ)

(افسانہ)

ساحل کا تھپیڑا

مکرمی چچا جان! جذبۂ خلوص !!

ے کیا بھول ہوئی ہم سے کہ اب آپ نے یکسر
وہ سلسلۂ لطف و کرم توڑ دیا ہے

عرصے سے آپ کی خیریت نہیں معلوم ہوئی۔ طبیعت متفکر ہے۔ میں یہاں اچھی ہوں۔ اشرب بھی بخیر ہیں اکثر ہم دونوں کو آپ کی بے حد کمی محسوس ہوتی ہے۔ ہم دونوں کی خواہش ہے کہ اب آپ ہمارے ہی پاس رہیں۔ چچا جان! والدین کے انتقال کے بعد میں آپ ہی کے زیر سایہ پروان چڑھی۔ مجھے والدین کی شفقت و محبت کا تو کچھ احساس نہیں لیکن آپ نے مجھے جو محبت اور عنایت بخشی ہے وہ ماں اور باپ کی محبت سے سوا ہے اور اب مجھے یہاں ایسا ہی محسوس ہوتا ہے جیسے لڑکی کو نیکے سے سسرال آ کر محسوس ہوتا ہوگا۔ میرا اس بھری پری دنیا میں اور تھا ہی کون سوائے آپ کے اشرب کے۔ آپ نے نہ صرف مجھے اپنی اولاد کی طرح پالا بلکہ ہمیشہ کے لیے مجھے اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا۔ آپ نے مجھے زمین سے اٹھا کر آسمان پر بٹھا دیا۔ میں آپ کی اتنی احسان مند ہوں کہ میرے پاس اظہار تشکر کے لیے الفاظ نہیں۔

چچا جان! مجھے اشرب سے کوئی شکایت نہیں۔ میں اپنی زندگی سے بے حد مطمئن ہوں۔ مجھے گمان بھی نہ تھا کہ آنے والی زندگی میرے لیے اتنی خوشیاں لائے گی کہ میرا شجر حیات بارِ مسرت سے جھک جائے گا۔ شرم دامن گیر ہے لہٰذا اس سے زیادہ اظہار مسرت نہیں کر سکتی۔ آپ کب آ رہے ہیں؟

اشرب کی طرف سے قدم بوسی۔ فقط

طالب دعا

آپ کی بیٹی یا بہو

(دلہیا اشرب)

۴ر دسمبر ۱۹۷۶ء

شاداب منزل سیتا بلڈی
ناگپور

پیارے دوست، دوست سے زیادہ عزیز بھائی بھائی سے زیادہ ہمراز و غمخوار محب جان !!! پیارے کلیم !!

یادیں اور محبتیں۔ !!

اپنے احباب سے یوں کوئی جدا ہو جائے
بعد کی فصل میں آپس میں نہ ملنے پائے
رام سے بڑھ کے کبھی بن باس لے کے جاتے ہیں

———— کہتے ہیں "آب و دانہ" انسان کو کھینچتا ہے۔ تمہارے رزق نے تمہیں اپنے وطن، اپنے عزیزوں، دوستوں سے کتنی دور پردیس میں جا بسایا۔ اور ہماری مٹی ہمارے لیے پابہ زنجیری ہوئی ہے۔ تم مجھے وہاں بلا رہے ہو۔ لیکن وہاں کے زمین، آسمان، لوگ سب میرے لیے پرائے ہیں۔ ہاں تم ضرور یہاں آؤ یہ تمہارا وطن ہے۔ یہاں کے لوگ، یہاں کے زمین و آسمان یہاں کا ذرہ ذرہ تمہارا اپنا سا ہے۔ کیا تمہیں یہاں کی کوئی چیز یاد نہیں آتی، دوست! انسان کی طرح مٹی بھی انسان کو پیار کرتی ہے۔ "وطن کی خاک" انسان کو اپنی طرف بلاتی ہے۔ کیا تم اس کی پکار نہیں سنتے۔ سچ کلیم! اس غیر ملک میں جا کر تم بھی بڑے کٹھور اور اجنبی بن گئے ہو۔ جب سے تم نے کراچی بسایا ہے۔ تم اک بار بھی اپنے ہندوستان نہیں لوٹے۔ وہاں کے بیس برسوں میں تم نے یہاں کے چالیس سال بھلا دیے۔ یہاں

کے خوشی وغم، مسرت وشادمانی کی کئی انمٹ داستانیں تمہارے دل پر نقش ہوں گی وہ لڑکپن کا معصوم زمانہ، کالج کے پر شباب دن!
تمہیں واسطہ ان یادوں کا چلے آؤ صرف اک بار ان یادوں کو زندہ کرنے کے لیے۔ لیکن تم بڑے بے رحم ہو ہر دفعہ میرے پیار کی اِس پکار کو ٹھکرا دیتے ہو ؎

اک تم ہی نہ مل سکے ورنہ
ملنے والے بچھڑ بچھڑ کے ملے

طویل جدائی کی کربنا کی نے میرے جذبات میں اک طغیانی پیدا کر دی ہے۔ میری بات کا برا نہ ماننا۔

ہاں میرے بیٹے اشرب کی شادی ہو گئی ہے۔ تمہیں دعوت نامہ اس لیے نہیں بھیجا کہ یہ اک رسمی سی بات ہے۔ میں جانتا تھا کہ تم وہاں سے ہرگز نہ آ پاتے۔ صرف مبارکباد کا اک تار بھیج دیتے۔ تمہارا تار پاکر میرے دل میں تمہاری یاد زندہ ہو جاتی۔ اور آزردہ ہو جاتا اور اس طرح شادی کی خوشی ناآسودگی میں بدل جاتی۔ اشرب کو تم نے دیکھا ہو گا۔ تمہارے سامنے چھ سات سال کا تھا۔ ہاں میری بہو کو تم نے نہیں دیکھا ہو گا۔ یا ممکن ہے دیکھا بھی ہو۔ میرے عزیز و اقارب سے تو تم اچھی طرح واقف تھے۔ بے چاری راسیہ: (ہاں میری بہو کا یہی نام ہے) جب ماں کے پیٹ میں تھی تو باپ فوت ہو گیا۔ اور جب چار پانچ سال کی ہوئی تو ماں کا انتقال ہو گیا۔ اس کے علاوہ میری بیوی کو بیٹی کا ارمان بھی تھا۔ اور ہم لوگ اس کے قریبی رشتہ دار بھی تھے۔ اس لیے مجھے اسے اپنی سرپرستی میں لینا پڑا۔ لیکن اس کے یہاں آنے کے فوراً بعد ہی جیسا کہ تم جانتے ہو میری بیوی کا اچانک سانپ کے ڈس لینے سے انتقال ہو گیا۔ اب سب خاندان والوں نے میری بیوی کی موت کا ذمے دار اُسے ٹھہرایا۔ اس کی منحوسیت کو۔ اشرب اس کا دشمن ہو گیا کہنے لگا پاپا! یہ منحوس ہے اس نے اپنی ممی پاپا کو بھی کھا لیا میرے گھر آئی تو میری ممی کا بھی خاتمہ کر دیا پاپا اسے فوراً میرے گھر سے نکالو ورنہ اس کی نحوست سارے گھر کو برباد کر دے گی۔ لیکن لڑکی غضب کی صابر تھی۔ اشرب کی چرب زبانی کو بڑی خاموشی سے سہہ لیتی۔ اس کی ساری زیادتیوں کو پی جاتی جبیں پر شکن تک نہ آنے دیتی۔ بلا کی سمجھدار ذہین اور محنتی تھی۔ عمر کے حساب سے اس کی قوتِ برداشت دیکھ کر مجھے حیرت ہوتی۔ پھر رفتہ رفتہ اس کی صلاحیتیں بھی اجاگر ہونے لگیں۔ اشرب کی ماں کے مرنے کے بعد گھر میں جو انتشار اور افراتفری پھیلی تھی بہت جلد ختم ہو گئی۔ اس نے گرہستی کو بڑی خوش اسلوبی سے سنبھال لیا۔ اور گھر کے ماحول میں اپنے آپ کو اس طرح ڈھال لیا کہ اشرب کے غصہ چڑچڑے پن اور اس کی نفرت کے باوجود اس کے کھانے سے لے کر سونے تک اس کے آرام اور خوشی کا پورا پورا دھیان رکھنے لگی۔ اور میں سمجھ گیا کہ یہ اک بہترین بیوی اور بہترین ماں ثابت ہو گی۔ اس میں انسانوی حسن نہیں ہے۔ لیکن بہرحال وہ ایک بھولی بھالی سمجھدار قبول صورت لڑکی ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی اس کا مکمل عورت پن ہے۔ راسیہ کے مقابلہ میں میرا لڑکا بڑا خود پسند ضدی اور مغرور ہے: بچپن سے لے کر شادی ہونے تک ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے اس نے میرے بیٹے کے ہاتھوں بڑے دکھ اٹھائے ہیں۔ اشرب نے ہمیشہ اس کے ساتھ بڑا تحقیر آمیز برتاؤ کیا ہے۔ کبھی کبھی میں اپنے بیٹے سے ناراض ہو جاتا تو بڑی خندہ پیشانی سے کہتی۔ چچا جان آپ ان سے ناراض نہ ہوں۔ مجھے ان کی کسی بات کا برا نہیں لگتا۔ بڑوں کا تو فرض ہے کہ وہ چھوٹوں کی بری عادتوں پر خفا ہوں اور ڈانٹیں۔ انہوں کی خفگی بھی کہیں قابل اعتراض ہوتی ہے اور میں اس کی برداشت کی داد دیئے بغیر نہ رہ پاتا۔ اشرب اس کے ساتھ شادی کے لیے بھی بہ مشکل راضی ہوا۔ میں نے اسے سمجھایا خاندان کی بچی ہے۔ میں نے اسے اولاد کی طرح پالا ہے۔ مزاج داں ہے۔ سب سے بڑی بات والدین کے بعد ان کی جو کچھ بھی جائیداد تھی وہ اس کی تنہا وارث ہے۔ گھر کی دولت گھر ہی میں رہے گی۔ لیکن وہ کمبخت نفع اور نقصان کے اس فارمولے کو کہاں سمجھے گا بچپن ہی سے حساب میں کمزور ہے۔ اشرب کو شادی کے بعد میں نے گاؤں بھیج دیا ہے۔ جہاں راسیہ کی آبائی زمین ہے۔ اس طرح ان کا ہنی مون بھی ہو جائے گا اور زمین کی دیکھ ریکھ بھی۔ اشرب کو بھی زندگی کا تجربہ ہونا چاہیئے۔ اب اس کے علاوہ کہاں زمین اور جائیداد کو کون سنبھالے گا۔ میں تو اب بوڑھا ہو گیا

ہوں اپنی ہی زندگی کا بار اب میرے ناتواں کندھے اٹھانے سے قاصر ہیں۔ ویسے اشرب کا خط آیا ہے۔ اس کے خط سے تو اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں اک دوسرے سے بے حد خوش ہیں میری بھی یہی دعا ہے کہ اشرب صحیح معنوں میں راسیہ کا شریک حیات ثابت ہو اور اپنی بیوی کو پرا اعتماد محبت دے سکے۔ ایسا بھرپور پیار جو عورت میں اک وقار پیدا کر دیتا ہے اور تبھی صحیح معنوں میں ازدواجی زندگی مکمل ہوتی ہے اور یہ دنیا راحت بکنار جنت نشاں بن جاتی ہے۔ اور کیا لکھوں خط بہت طویل ہو گیا ہے۔ تم جواب کو اتنا طول نہ دینا۔ بھابی کو پیار بھرا دلار بھرا سلام۔ انور، رضیہ، شمشاد کو دعائیں۔ فقط تمہارا

دوست خان محمد "شاداب"

یکم جنوری ۱۹۷۰ء

۲۷، زیڈ/۲ پی۔ای۔سی۔ایچ۔ایس

کراچی (پاکستان)

پیارے دوست شاداب!

ہمیشہ شاداب و شادکام رہو!!

"سال نو مبارک ہو"

"دشمن کو بھی اللہ چھڑائے نہ وطن سے

جانے وہی بلبل جو بچھڑ جائے چمن سے

اس غم میں میری روح پریشان ہے اب تک

اک درد سا احساس میں غلطاں ہے اب تک"

خط ملا۔ مگر ہائے ظالم! تم نے کتنی آسانی سے مجھے بے وفا اور اجنبی جیسے خطابات سے نوازا ہے۔ ان جدائی کے کبھی نہ ختم ہونے والے فاصلوں نے تم جیسے دوستوں کی محبت خلوص و وفا بھی مجھ سے چھین لی۔ مجھے وطن کتنا یاد آتا ہے اور وہاں کی ہر ہر چیز مجھے کتنا تڑپاتی ہے۔ دل کا یہ درد تم نہیں سمجھ سکو گے تم مجھے تڑپ تڑپ کر بلاتے ہو، میں آنے کے لیے بے چین ہوں۔ قلم میں جرأت انکار نہیں۔ تم جیسے دوستوں کے خلوص و محبت کی کشش اور "جنم بھومی" کی پکار ایک طرف ہے اور دوسری طرف حالات کا شکنجہ۔ آزاد ہوتے ہوئے بھی انسان آزاد نہیں۔ ماحول کی قید، حالات کی قید، سماج کی قید، ملک کی حد بندیاں، قانون کی قید، عمر کے ساتھ قید کا یہ سلسلہ دراز تر ہوتا جاتا ہے سو پھر یہ زنجیر قید حیات کے ساتھ ہی ٹوٹتی ہے۔ مدت ہلی کا ایسا اٹل اور ناگہانی بلاوا ہے جو انسان کو سوچ و فکر اور ٹال مٹول کی مہلت نہیں دیتا اور ہزار ضروری، غیر ضروری کاموں کو ادھورا چھوڑ کر جانا پڑتا ہے۔ ورنہ انسان یہاں کے لیے بھی ہزار حیلے بہانے تراشے۔ بھائی! ہم مہاجرین وطن کی بھی کیا زندگی ہے جسم یہاں ہے اور روح تم لوگوں کے پاس جان یہاں ہے اور دل احباب وطن کے پاس۔ تم جیسے دوستوں کے چند خطوط آتے ہیں تو ہم جیسے بن باسیوں کے لیے سال بھر کا سہارا ہو جاتے ہیں۔ آئندہ اپنے خط میں آنے کے لیے نہ لکھنا۔ انکار کرتے ہوئے روح تڑپ اٹھتی ہے۔ حالات اجازت دیں گے تو خود ہی چلا آؤں گا۔ میرا تو وہاں سب کچھ ہے۔ اپنی زندگی کے چالیس سال ادھر چھوڑ آیا ہوں۔ گھنٹوں ان بیتے دنوں کو یاد کرتا ہوں

بیتے ہوئے لمحوں کی خاطر دل حال سے ناطہ توڑتا ہے

خوابوں کے جزیرے میں جا کر مستقبل سے منھ موڑتا ہے

خوابوں کے جزیرے میں یوں بھی اشکوں کے سوا کیا رکھا ہے

ماضی کی سہانی یادوں سے یہ حال کا غم ہی اچھا ہے

تم نے اپنی بہو کی جو قلمی تصویر کھینچی ہے اسے پڑھ کر دل بہت خوش ہوا۔ سچ پوچھو تو بھیا! فرمانبردار بیٹا اور خدمت گزار و سعادت مند بہو بڑھاپے کی سب سے بڑی خوشی اور دولت ہیں۔ ہاں تم نے اپنی بہو کا نام راسیہ لکھا ہے۔ تمہاری بھابی کہتی ہیں کہ کیا یہ مرزا اشرف اللہ بیگ کی لڑکی ہے؟ اور ماں کا نام رقیہ خانم تو نہیں۔ اگر وہی ہے تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ کیونکہ وہ ہماری بیگم کے قریبی رشتہ داروں میں تھیں۔ جب تک رقیہ بیگم حیات رہیں ہمیں برابر اپنی اور بچی کی خیر خیریت بھیجتی رہیں دوسری خوشخبری یہ کہ نورچشمی راسیہ کی سگی خالہ یہیں کراچی میں رہتی ہیں اور ان کی لڑکی سے حال ہی میں میرے چھوٹے لڑکے پرویز کا رشتہ طے ہوا ہے۔ لیکن بھئی شاداب! تمہاری بھابی تو کہتی ہیں کہ مرزا اشرف اللہ بیگ کے پاس بہت دولت تھی۔ کیا مرنے سے پہلے ہی انھوں نے ختم کر دی یا پھر بچی کو ورثے میں ملی ہے۔ بھئی بڑے تعد

والے ہو۔ اشرب میاں بھی بڑے نصیبے والے ہیں۔ جو انھیں ایسے پیارے کردار اور ایسی معصوم سیرت کی دولت مند بیوی ملی ہے۔ بہت بہت مبارک ہو۔ رابیہ کو ہماری اور ہماری بیگم کی طرف سے جو رشتے میں ان کی خالہ لگتی ہیں دعا کہنا اور اشرب میاں کو بھی۔ بہو اور بیٹے کے ساتھ اپنی بھی اک فوٹو ضرور بھیجو۔ تمہاری ۲۰ سال پہلے کی فوٹو جو ودائی کے وقت کھینچی گئی تھی میرے پاس موجود ہے۔ اب دیکھنا ہے کہ عمر نے تمہیں کہاں پہنچایا۔ میرے تصور میں تو تمہاری وہی شبیہ بسی ہے پروقار چہرہ، پرکشش آنکھوں پر رنگین عینک دل آویز مسکراہٹ۔

اور زیادہ کیا لکھوں۔

نہ دے نامے کو اتنا طول غالبؔ مختصر لکھ دے
کہ حسرت سنج ہوں عرضِ ستم ہائے جدائی کا

فقط

بہت زیادہ یادوں اور محبتوں کے ساتھ

تمہارا "بن باسی رام"

کلیم

۲۵ر فروری ۷۶ء

"گھاٹ پاٹ" ضلع بیرم

پیاری انجم!

؎ نیاز و ناز کا عالم سبزہ زار رکھتا ہے
تیرے سوال کا پہلو میرے جواب کا رنگ

تم اپنے ہر خط میں ہزاروں بار بھی معافی مانگو تو میں تمہارے اتنے بڑے جرم (میری شادی میں شرکت نہ کرنے) کو معاف نہ کروں گی۔ جبتک کہ تمہاری شادی میں شریک نہ ہو کر تم سے اس کا بدلہ نہ لے لوں۔

ہاں یہ تم فوٹو کیوں منگوا رہی ہو۔ تم نے تو اشرب کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور مجھے بھی ہاں اس "میری ہستی" کو نہیں دیکھا جو ہم دونوں کی دنیا میں آنے والی ہے۔

تمہارے پاپا کے تبادلے کا کیا ہوا؟ اللہ کرے تم یہاں آ جاؤ۔ ہر چند کہ یہ میرا آبائی گاؤں ہے۔ سب لوگ اپنوں جیسے ہی لگتے ہیں مگر تب بھی تم جیسی اک پیاری ہمراز و ہم مزاج سہیلی کی بیحد کمی محسوس ہوتی ہے۔

ارے ہاں وہ اکتا آئی تھی۔ شہر کی وہ بلبل پتہ نہیں اس گاؤں میں کیسے بھٹک گئی۔ ہمیشہ کی طرح بہت باتیں کیں۔ کویتا، گلرو، بیگی اور بہت سوں کے قصے سنائے۔ غضب کی یادداشت ہے اس لڑکی کی۔ تمہارے بارے میں بھی کہہ رہی تھی کہ تمہارے جس جگہ رشتہ چل رہا ہے تم اس سے خوش نہیں ہو اور انکار کرنے کی جرات کر رہی ہو۔ لیکن مجھے اس بات کا یقین نہ آیا۔ اکتا کی عادت میں جانتی ہوں وہ "زیب داستاں" کے لیے بڑھا چڑھا کر بیان کرتی ہے۔ پیاری انجم! میں نے تمہیں ہمیشہ اپنی بہن سمجھا ہے اپنے دل کی اک اک بات تم پر آشکار کر دی ہے۔ تم بھی اپنے دل کی بات مجھے بتا دو شاید میں تمہاری کچھ مدد کر سکوں

انجم! والدین کے مرنے کے بعد تم نے میری زندگی دیکھی تھی۔ اسی گھر میں اشرب اور چچا جان کے ساتھ رہتے ہوئے مجھے اپنی محرومی اور کمتری کے احساس نے ہمیشہ ستایا اپنی اداسی اور کرب کو چھپانے کیلئے میں نے ذمہ داری اور مصروفیات کا لبادہ اوڑھ لیا ہے لیکن اندر سے میری روح ہمیشہ کراہتی رہتی لیکن ان دل دوز چیخوں کو میں نے اپنی سانسوں میں اس طرح مدغم کر لیا تھا کہ کوئی انھیں محسوس ہی نہیں کر سکا۔

لیکن انجم! آج وہی گھر میرے لیے جنت بنا ہوا ہے، ہمیشہ مجھ پر حکومت کرنے اور برتری جتانے والے وہی اشرب آج میرے جیون ساتھی میری خوشیوں کے پیامبر ہیں۔ آج مجھے اپنے چاروں طرف خوشیاں ہی خوشیاں، بہاریں ہی بہاریں بکھری نظر آتی ہیں۔

؎ عشق کی لذت زباں سے کیا کہیں
جانتا ہے دل، مزے پاتی ہے روح

شادی کے بعد میں کتنی خوش ہوں۔ ان خوشیوں کا احساس میں تمہیں کس طرح دلاؤں۔ مرد کی محبت! شوہر کا اعتماد اور بھرپور پیار صحیح معنوں میں عورت کے لیے اسی دنیا میں بہشت ہے۔ شادی کے بعد کی زندگی اتنی خوبصورت ہوتی ہے کہ دل مرنے کو قطعی نہیں چاہتا سچ! دل چاہتا ہے اتنے دن زندہ رہوں صدیوں......

جمنوں تک۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور پھر بھی شاید .. .. لو! اشرب آگئے ہیں۔ باہر ان کی موٹر سائیکل آکر رکی ہے۔ یہ خط ادھورا چھوڑ رہی ہوں معاف کرنا چلتے چلتے پھر تمہیں سمجھاتی ہوں شادی سے انکار کی غلطی کبھی نہ کرنا۔ اری پگلی! مسرت کے لمحوں کو گلے سے لگا لے پھر دیکھ زندگی کا لطف اور جینے کی تمنا !!

ارے ہاں! تمہارے سوال کا جواب تو ابھی باقی ہی ہے جو تم نے اپنے خط میں مجھ سے دریافت کیا ہے۔ اوں ہونھ! ابھی نہیں اتنی آسانی سے جواب تھوڑے ملے گا۔ پہلے تم بھی میری طرح کسی کی "اہلیہ" بن جاؤ تب دیکھا جائے گا۔ غصہ سے دانت کیوں کچکچا رہی ہے لو ہم چلے .. ..

ویسے جواب کا بہت سا مفہوم تو تم خط سے سمجھ ہی گئی ہوگی۔

فقط

صرف تجھے ہی "راس آنے والی"

رابیہ اشرب

۲ مارچ ۷۸ء

مسجد والی گلی بڑا پل جام نگر

اشرب!!

مقام ایسے بھی اکثر عشق کی منزل میں آتے ہیں
جہاں ہم دل کی امیدیں صلیبوں پر سجاتے ہیں

رابیہ کا خط ملا تھا۔ اس کے بعد تمہارا بھی۔ تم میرے خط کا انتظار کر رہے ہو اور میرے قطعی فیصلے کا بھی، لیکن رابیہ کے خط نے میرے ارادے کو یکسر بدل ڈالا ہے۔ میں اک عورت ہوں۔ پھر رابیہ میری بہت ہی پیاری ہمدرد و ہمراز سہیلی ہے پھر وہ تم سے بے پناہ پیار کرتی ہے۔ اسے تمہاری محبت پہ اعتماد ہے، اور وہ تمہارے پیار کے نشے میں اتنی سرشار ہے کہ صدیوں تک جینے کی خواہش کر رہی ہے۔ جبکہ وہ پہلے موت کو "چھٹکارا" اور "ابدی سکون" جیسے ناموں سے یاد کیا کرتی تھی۔ اس کے خط سے پتہ چلا کہ وہ ماں بھی بننے والی ہے۔ تم اپنے خط میں یہ ساری باتیں کہاں لکھتے ہو۔ تم تو بس اک ہی بات کی رٹ لگائے ہوئے ہو کہ رابیہ کے ساتھ شادی کر کے تم نے صرف اپنے باپ کی خواہش کو پورا کیا ہے اور اپنی سعادت مندی کا ثبوت دیا ہے۔ ورنہ تم اب بھی صرف مجھ ہی سے پیار کرتے ہو اور اگر تمہیں میری محبت سے محروم رکھا گیا تو ابد تک تمہاری روح تشنہ رہے گی اور تم آوارہ بدروح بن کر مرنے کے بعد بھی بھٹکتے رہو گے۔ تمہاری ان ہی باتوں نے تو مجھے ابھی تک تمہارے دام محبت میں گرفتار رکھا تھا۔ تم نے لکھا ہے کہ تمہیں رابیہ سے صرف اتنی محبت ہے جتنی گھر کے اک پالتو جانور سے ہو سکتی ہے۔ اشرب! تم بہت بے وفا ہو۔ میرے لیے بھی اور رابیہ کے لیے بھی اس کے پرکھوں کی جائیداد کی خاطر تمہارے باپ نے اسے اپنی بہو بنایا ادھر تم اس کے بچے کے باپ بن رہے ہو ادھر تم میرے ساتھ بھی شاندار مستقبل کے گھروندے بنانے کی کوشش کر رہے ہو۔ رابیہ بچپن ہی سے میری بے حد ہمدرد و غمخوار رہی ہے۔ اس کا خط پڑھ کر میرے ضمیر نے مجھے بے حد ملامت کی ہے ؎

دامنِ گل میں لرزتی ہوئی شبنم کی قسم
ایک قطرہ کبھی طوفان اٹھا دیتا ہے

واقعی میں کتنی بری ہوں۔ اس کی زندہ رہنے کی خواہش کو پامال کر رہی ہوں ؎

امید وفا امیدی کا بھرم ہونا ہی جائے
کہ جن نے کشتیوں کو ڈوبتے دیکھا ہو ساحل سے

اچھا خدا حافظ — تمہاری اک بھولی بسری یاد

"انجم"

۸ مارچ ۷۸ء

گھاٹ پاٹ ضلع بیرم

بوقت ۹ بجے صبح

چچا جان —!!

مودبانہ سلام!!

صرف تیرے کرم کی اک امید
ہر مصیبت میں کام آتی ہے

میں آج صبح سویرے ہی میٹرنٹی ہوم میں ایڈمٹ ہوئی ہوں۔ مجھے تکلیف زیادہ ہے۔ ایسے وقت میں کسی مخلص اور بزرگ ترین ہستی کا پاس ہونا بے حد ضروری ہے۔ زندگی کے ہر تکلیف دہ موڑ پر آپ کو میں نے اپنے قریب پایا ہے اور آج .. .. .. آپ نہیں ہیں تو عجیب سے

ہونا ک سناٹے مجھے چاروں طرف سے گھیرتے ہوئے محسوس ہو رہے ہیں۔ پتہ نہیں کیا ہو جائے۔ زندگی کی اس آنے والی سب سے بڑی خوشی کا منھ دیکھنے سے پہلے ہی موت کی آغوش میں سما جاؤں۔ ہاں یہ دیکھ کر بڑی خوشی محسوس ہوتی ہے کہ اشرب میرے ہر دکھ میں برابر کے شریک ہیں۔ پتہ نہیں ڈاکٹر نے کس اندیشے کا اظہار کیا ہے جس کی وجہ سے وہ کچھ بوکھلائے ہوئے ہیں محسوس ہو رہے ہیں۔ میں تو خیر آنے والی خوشی کے خوش آئند تصور کے سہارے اس مصیبت کا سامنا کر لوں گی لیکن اشرب کی پریشانی مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔ آپ کا ان کے پاس رہنا بے حد ضروری ہے۔ میں تقریباً ایک ہفتے سے آپ کو بلانے کی کوشش کر رہی ہوں لیکن یہ مجھے ہر بار روک دیتے ہیں کہ وقت پر کار بھیج کر بلا لیں گے۔ ابا جان کا دل گاؤں میں بالکل نہیں لگتا۔ ڈرائیور کے ہاتھ رقعہ اور موٹر بھیج رہی ہوں۔

اک بات آپ کو بتا دوں۔ خدارا مجھے معاف کر دیجئے گا اور اشرب پر بھی ناراض نہ ہوئیے گا۔ وہ میرے جسم و جان کے مالک ہیں ہی۔ اُن کی خواہش کے مطابق میں نے اپنی زمین اور حویلی اُن کے نام منتقل کر دی ہے۔ مال و دولت تو کیا میں اپنی جان بھی ان پر نچھاور کر دوں تو کم ہے۔

اچھا خدا حافظ۔ آپ کے خلوص کی پروردہ

"راسیہ اشرب"

ٹیلی گرام

۹ مارچ [illegible]

گھاٹ پاٹ ضلع بیرم تین بجے شب

پتہ

خان محمد شاداب "شاداب منزل"

سیتا بلڈنگ، ناگپور

"لڑکے کی ولادت کے بعد پوائزن چڑھ جانے سے راسیہ فوت ہو گئی۔"

سوگوار

خان محمد اشرب

۴۸۶

۸ مارچ [illegible] ۸½ بجے شب

میٹرنٹی ہوم گھاٹ پاٹ ضلع بیرم

دل و جاں سے پیاری رگ جاں سے قریب

ڈیر انجم۔

دل میں چبھتی ہوئی یادوں کو اتر جانے دو
آج روتے ہوئے اک رات گزر جانے دو
کل صبح پیار کا انداز بدل جائے گا
گیت رہ جائیں گے اور ساز بدل جائے گا

میرے خط کے جواب میں تم نے اشرب کو جو خط لکھا وہ غلطی سے میرے ہاتھ لگ گیا۔ کبھی کبھی غلطیاں بھی کتنی صحیح اور مناسب ہوتی ہیں۔ جب سے مجھے تمہاری اور اشرب کی محبت کا علم ہوا ہے اپنی زندگی مجھے اک بوجھ لگنے لگی ہے اشرب کی محبت ہی میری زندگی ہے۔ میں نے تمہیں پہلے ہی لکھا تھا مرد کی آغوش عورت کے لیے بہشت ہوتی ہے۔

؎ تو ڈھونڈ فلک پر باغِ ارم اپنا تو عقیدہ ہے واعظ
جس خاک پہ دو دل ملتے ہیں اس خاک پہ جنت ہوتی ہے

میں اس بہشت سے نکل کر نفرت کے شعلے کیسے سہ پاؤں گی۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ ایک شوہر کے مقابلے میں ایک سہیلی کی محبت زیادہ قابل اعتماد ہے۔ خدا تمہیں خوش رکھے اور اشرب کی باہیں تمہارا سہاگ محل بنی رہیں۔ آج ۲ بجے میں نے ایک پھول سے بیٹے کو جنم دیا ہے۔ اب میری زندگی کی ہر آرزو پوری ہو گئی ہے اور اس کے ساتھ ہی میرا مقصد حیات بھی پورا ہو گیا ہے تم سے اک التجا ہے۔ اگر ایک سہیلی کی کربناک حسرت بھری موت تمہیں اشرب کی بیوی بننے سے خوفزدہ کر دے تو بخدا! میرے ننھے منّے معصوم فرشتے کی خاطر اشرب کی جیون ساتھی بننے کے لیے راضی ہو جانا۔ اس طرح اشرب کی ایک دیرینہ آرزو (جس کی خاطر میں یہ قربانی دے رہی ہوں) پوری ہو جائیگی اور ایک ننھے منّے گلاب کو نرم و نازک اور شفقت بھری آغوش مل جائے گی۔

دل تو نہیں چاہتا لیکن اک سہیلی ہونے کے ناطے یہ بات

(باقی [illegible] پر)

اُتّر پردیش شاہ راہِ ترقی پر

دیہی ترقی اور انیتودیہ کا سال

باپو نے قوم مہاتما گاندھی کا خیال تھا کہ حقیقی آزادی صحیح معنوں میں مربوط ترقی اور قطار کے آخری شخص یعنی کمزور ترین اور غریب ترین شخص کی سماجی اور معاشی فلاح و ترقی کے ذریعہ ہی حاصل ہوسکتی ہے۔ گاندھی جی کے اس اصول پر عمل پیرا ہو کر ان کے خواب کو شرمندہ تعبیر کرنے کی راہ میں ریاست میں پہلی بار آزادی کے ۳۲ویں سال مثبت اور موثر اقدامات کئے گئے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سال کو "دیہی ترقی اور انیتودیہ" سال کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

"اگر گاؤں ترقی کرتے ہیں تو ریاست اور ملک بھی ترقی کرتا ہے"۔ کسی پالیسی کو عملی جامہ پہنانے کے لئے حکومت اترپردیش نے زیر نظر سال میں جو پہلا اقدام کیا وہ تھا پیداواری پروگراموں کے لیے سب سے زیادہ رقم کا بندوبست کرنا۔ جہاں ۱۹۷۷-۷۸ء میں ریاست کے سالانہ منصوبہ کے لئے ۶۷۵ کروڑ روپیہ کا بندوبست تھا وہاں ۱۹۷۸-۷۹ء میں ۷۸۶ کروڑ روپے کا اور سال رواں میں ۸۹۲ کروڑ روپیہ کا بندوبست کیا گیا۔ اس سال کے سالانہ منصوبہ کے مصارف کی تقریباً ۷۵ فیصد رقم زراعت، آبپاشی، بجلی جیسی پیداواری اور دیہی ترقی سے متعلق اسکیموں کے لئے مختص کی گئی۔ اس کے نتیجہ میں زرعی پیداوار اور آبپاشی و بجلی کی پیداواری صلاحیت میں اضافہ کے نئے ریکارڈ قائم کئے گئے۔

موضعات کے غریب، استحصال کا شکار اور مظلوم عوام کو سماجی اور معاشی انصاف دلانے اور ان کا معیار زندگی بلند کرنے کے لیے انیتودیہ سے مربوط دیہی ترقی اور کام کے عوض اناج پروگرام چلائے گئے اور چھوٹی و گھریلو صنعتوں کا جال بچھانے کی راہ میں صنعتی ترقیاتی مرکز قائم کر کے مواضعات میں بھی روزگار کے مزید وسائل فراہم کرنے کی کوششیں کی گئیں۔

ان کوششوں کے نتیجہ میں ہم جب آزادی کے اس ۳۲ویں سال ریاست کی کامیابیوں کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم ان پر فخر کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ان کامیابیوں کی وجہ سے ہی آج ہمیں اترپردیش ہندوستان کے نقشہ میں اٹھتا، ابھرتا، بنتا اور سنورتا نظر آتا ہے۔

امن و قانون کے محاذ پر مسلسل چوکسی، جرائم کی روک تھام کے لیے کیے گئے مثبت اقدامات اور جرائم روکنے کے لیے مختلف سطحوں پر پولس عملہ کو ذمہ دار قرار دینے کی وجہ سے جرائم کی تعداد کافی کم ہوئی۔ پولس کو مستحکم اور طاقتور بنانے اور پولس ملازمین کی حالت میں مطلوبہ سدھار کرنے کی راہ میں بھی سرگرمی سے اقدامات کئے گئے۔

عوام کی شکایتوں کا ازالہ کرنے کے اقدامات کی ایک کڑی کے طور پر ہر محکمہ کے سربراہ کے دفتر میں ایک سینئر افسر کی زیر نگرانی ایک عوامی شکایت شعبہ قائم کرنے کا بندوبست کیا گیا۔ تاکہ محکموں کے سربراہوں اور علاقائی، نیز ضلعی دفتروں میں موصول ہونے والی شکایتوں پر کارروائی کی جاسکے۔

سکریٹری کی سطح پر ہر سکریٹری کی زیر نگرانی ڈپٹی سکریٹری، جوائنٹ سکریٹری کی سطح کے ایک افسر کو عوام اور ملازمین کی شکایتوں کے ازالہ کا کام سونپنے کا بھی بندوبست کیا گیا ہے۔

دیہی علاقوں میں کمزور طبقوں کو روزگار کے زیادہ مواقع مہیا کرنے کے مقصد سے ۳۸۴ ترقیاتی بلاکوں میں نافذ کی گئی اس اسکیم کے دائرۂ عمل میں اس سال مزید ترقیاتی بلاکوں کو شامل کیا جارہا ہے۔ اب اس اسکیم کو کچھ اس طرح وضع کیا جا رہا ہے کہ اس سے ہر ترقیاتی بلاکوں میں ہر سال ۳۰۰ خاندان مستفید ہوں جن میں کم سے کم ۲۰ فیصد اقوام و قبائل مندرجہ ذیل فہرست کے خاندانوں کے لوگ بھی ہوں۔

امداد باہمی تحریک کو ایک عوامی تحریک کی شکل دینے کی غرض سے ریاست نے متعدد اہم اقدامات کرنے میں پہل کی۔

ریاست کے ۱۰۵۴۴ امداد باہمی اداروں میں براہ راست انتخابات کرائے گئے۔ امداد باہمی اداروں کے ذریعہ زیر نظر سال میں ۲۷۵ کروڑ روپیہ کے مختصر مدتی، ۲۰ کروڑ روپیہ کے درمیانہ مدتی اور ۷۰ کروڑ روپیہ کے طویل مدتی قرضوں کی تقسیم کا تخمینہ ہے۔ سال ۷۹-۱۹۷۸ء کی پہلی ششماہی میں ہی ۱۱۰ کروڑ روپیہ کے زرعی قرضے تقسیم کرکے امداد باہمی زمرہ میں ایک ریکارڈ قائم کیا گیا۔ مختصر مدتی قرضہ کی ضروریات کو، جو ۴۱۵ کروڑ روپیہ کے بقدر ہے۔ پورا کرنے کے لیے کوششیں کی جا رہی ہیں۔

زرعی پیداوار بڑھانے کے لیے کیے گئے اقدامات کے نتیجہ میں گزشتہ سال اتر پردیش نے ملک میں سب سے زیادہ یعنی ۱۱۲ لاکھ ۳۰ ہزار ٹن گیہوں پیدا کیا۔ جبکہ مجموعی غذائی پیداوار تقریباً ۲۲۸ لاکھ ٹن رہی۔ ان کامیابیوں کے پیش نظر اس سال ۲۴۰ لاکھ ٹن اناج کی پیداوار کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔ اس میں ۹۰ لاکھ ٹن خریف کی پیداوار شامل ہے۔ اس کے علاوہ ۲۵ لاکھ ٹن تلہن، ایک لاکھ ۵۰ ہزار گانٹھ جوٹ اور ۲۶ ہزار گانٹھ کپاس کی پیداوار کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔

آلو کی پیداوار میں اتر پردیش دیگر ریاستوں سے آگے رہا ہے۔ گزشتہ سال تقریباً ۴۵ لاکھ ٹن آلو پیدا کرکے ریاست نے ایک نیا ریکارڈ قائم کیا۔ اس سال ۴۶ لاکھ ٹن آلو کی پیداوار کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔ آلو کی ذخیرہ صلاحیت بڑھانے کی کوشش بھی کی جا رہی ہے اور اس سال ۲۰۰ نئے کولڈ اسٹوریج تعمیر کیے جا رہے ہیں۔

سال ۷۷-۱۹۷۶ء اور ۸۰-۱۹۷۹ء کے درمیان چھوٹی و دیہی صنعتوں کے مصارف میں تین گنا اضافہ ہوا۔ ۷۷-۷۶ء میں اس مد کے مصارف ۶۲۷۵ کروڑ روپیہ تھے جو ۸۰-۱۹۷۹ء میں بڑھ کر ۱۷۳۵ کروڑ روپئے کے ہوگئے۔ بے زمین ہریجنوں اور دیگر کمزور طبقوں کے لوگوں کی حالت سدھارنے کے لئے دیوریا، جھانسی، الموڑہ، بلیا، فتحپور اور غازی پور میں انیتودیہ صنعتی امداد باہمی انجمن قائم کی جا رہی ہیں۔

اتر پردیش میں یکم اپریل ۱۹۷۸ء سے ریاست کے پانچ پہاڑی اضلاع کے علاوہ مزید سات اضلاع میں بھی مکمل نشہ بندی نافذ کی گئی اور اس سال نو اضلاع اور دو دیگر اضلاع کے بعض حصے مکمل نشہ بندی کے دائرہ میں شامل کئے گئے۔ مکمل نشہ بندی پروگرام کی کامیابی کے لیے آبکاری قوانین کو اور سخت بنایا گیا۔

حکومت نے تعلیم کے میدان میں جو ایک انقلابی اقدام کیا ہے وہ ہے موجودہ تعلیمی سال سے درجہ اول سے بارہویں درجہ تک باقاعدہ طور پر اخلاقی تعلیم اور ورزش کے نصاب کا نفاذ۔ اسکولوں میں بیڑی سگریٹ اور نشیلی اشیاء کے استعمال کو ممنوع قرار دینے کے لئے بھی موثر اقدامات کئے گئے ہیں۔

یک رخی علم پر مبنی تعلیم کی وجہ سے پیدا ہونے والی بیروزگاری کو دور کرنے کی غرض سے تعلیم کو روزگار بخش بنانے، اور اساتذہ، سرپرستوں کا استحصال کرنے والے اور تجارتی ڈھنگ سے چلنے والے تعلیمی اداروں پر موثر کنٹرول کرنے اور تعلیم کو دیہی ضروریات و مسائل سے ہم آہنگ کرنے کا فیصلہ کرکے موجودہ حکومت نے تعلیم کو ایک نئی جہت دی ہے۔ اس کا فرد اور سماج پر وسیع اور پائیدار اثر پڑے گا۔

تعلیم کی مختلف سطحوں پر اسکولوں کی تعداد میں اضافہ کے ساتھ ہی اسکولوں اور اساتذہ کے سلسلے میں متعدد ایسے اصلاحی اور سہولت بخش اقدامات کئے گئے۔ جن کے دوررس اور بہتر نتائج برآمد ہوں گے۔

★

نقد و تبصرہ

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں)

نام کتاب : میر کارواں - شاعر - تکمیل رضوی
ضخامت : ایک سو اٹھائیس صفحات - قیمت : چھ روپے
ملنے کا پتہ : مکتبۂ تکمیل ادب - ۴ - چوپٹیاں لکھنؤ ۳

میر کارواں جناب تکمیل رضوی کا تیسرا شعری مجموعہ ہے۔ اس سے قبل سلاموں اور نعت و منقبت پر مشتمل ان کے دو مجموعے تکمیل غم اور منارہ نور کے نام سے شائع ہو چکے ہیں زیر تبصرہ مجموعہ ان کی قومی و ملی نظموں پر مشتمل ہے جس میں مذہبی پیشواؤں، مذہبی تیوہاروں، قومی رہنماؤں، جشن آزادی اور بعض دیگر موضوعات پر نظمیں شامل ہیں۔

ویسے تو جناب تکمیل رضوی نے بیشتر اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے لیکن لکھنوی ذوق کے عین مطابق ان کی محبوب صنف سخن غزل ہے اسی لیے وہ غزل کی روایت کو جہاں تہاں نظموں میں بھی برتنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تکمیل صاحب اقبال اور جوش سے متاثر ہونے کی بات بھی کرتے ہیں لیکن اس تاثر کے عناصر ان کی نظموں میں زیادہ نمایاں نہیں ہو سکے ہیں یہی سبب ہے کہ وہ "سرکاری کرمچاری کی مانگ" "دردناک مشاہدہ" اور "مزدور کی موت" کی بات تو کرتے ہیں لیکن وہ اپنے گرد یاس اور ناامیدی کا ہالہ بھی ضرور قائم رکھتے ہیں، لیکن ایسا بھی نہیں کہ جوش و جذبہ کے عناصر ان کی نظموں میں یکسر مفقود ہوں ؎

سکوں مقصود ہے جن کو انھیں جینا نہیں آتا
شعور زندگی جن میں ہے طوفانوں میں بہتے ہیں

بعض نظموں میں اردو ہندی زبانوں کی آمیزش بھی ملتی ہے جسے تجرباتی تو نہیں کہا جا سکتا ہاں اس قدر ضرور ہے کہ اس سے جناب تکمیل رضوی کی عصری حسیت اور فکری رجحانات کا پتہ لگایا جا سکتا ہے "تاریخ اردو" "طب یونانی کی مانگ" اور "تتلی" وغیرہ نظمیں بھی خاصی ہیں۔

وسیم احمد اعظمی

ساحل کا تھپیڑا — : صفحہ ۴۴ کا بقیہ

تمہیں بتا دوں۔ اور ویسے بھی میں نے اپنا ہر راز صرف تم پر ہی آشکار کیا ہے۔

انجم ! مردوں کی محبت کا کبھی اعتبار نہ کرنا . . . . . .

ہاں .. .. .. ہاں .. .. یہ اشرب جن کی محبت و وفا کے میں نے سامنے گیت گائے ہیں۔ آج صبح میں نے انھیں.. .. ..اک نرس سے میٹرنٹی ہوم میں باتیں کرتے سنا.. .. ..کیا!!.. .. ..سنو گی تو شاید تمہیں بھی یقین نہ آئے مجھے بھی اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ مجھے چکر سا آگیا.. .. .. اور.. .. .. میں گر پڑی .. .. .. شاید میں بیہوش ہو گئی .. .. .. کاش! یہ سب سننے سے پہلے ہی میری موت واقع ہو جاتی، سنبھلنے پر معلوم ہوا کہ تکلیف کی شدت نے مجھے نیم جان کر دیا ہے۔ ادھر اسی عالم میں مجھے لڑکا تولد ہوا۔ اور آج .. .. .. رات میں .. .. شاید میری .. .. موت .. .. .. واقع ہو جائے۔ کیونکہ نرس سے مل کر اشرب نے خواب آور گولیوں کا انتظام کر لیا ہے۔ جو مجھے چائے میں دی جائیں گی تاکہ ڈلیوری کے بعد یوں آپریشن چڑھ جانے سے میری موت فطری بن جائے یا پھر تکلیف کی وجہ سے نیند نہ آنے کی بنا پر خواب آور گولیاں دی جائیں گی۔ پتہ نہیں ان کا کیا پلان ہے۔ خیر.. .. .. یہ سب جانتے ہوئے بھی میں ان کے ساتھ پورا تعاون کروں گی اچھی بہن خدا حافظ ؎

ہم سے کیا ہو سکا عشق کی راہ میں دل مگر کچھ نہ کچھ مطمئن ہو گیا
لوگ سجدوں کی حد سے نہ آگے بڑھے ہم نے سر رکھ دیا سنگ در کے لیے

فقط قریب مرگ

راسیہ

SEPT 19
50 PAISE

NAYA DAUR
POST BOX No 146 LUCKNOW 226001

REGD
Annual Rs

نائب صدر جمہوریہ ہند جناب محمد ہدایت اللہ صاحب

جلد ۳۶ نمبر ۷

اکتوبر سنہ ۱۹۷۹ء

ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

جوائنٹ ایڈیٹر: شاہ نواز قریشی

پبلشر: ہمیندر کمار

ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اتر پردیش

پرنٹر: اشوک در

سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری یو۔پی
مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ

شایع کردہ محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ۔ اتر پردیش

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے
زر سالانہ: پانچ روپے

ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پبلی کیشن برانچ انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو۔پی۔ لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶۔ لکھنؤ

بذریعہ رجسٹری: ایڈیٹر نیا دور انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو۔پی۔ لکھنؤ

عنوانات

اپنی بات

جمہوریت، مساوات، سیکولرزم اور اخلاقی قدروں کے علمبردار اور ملک میں ایک نئے انقلاب کے بانی لوک نائک شری جے پرکاش نرائن کے انتقال سے ہندوستان اپنے ایک عظیم سپوت سے محروم ہو گیا۔ وہ صحیح معنوں میں اس وقت ملک کے محبوب ترین رہنما تھے ان کی موت تمام قوم کے لیے ناقابل تلافی نقصان ہے۔ جے پرکاش جی کی پوری زندگی جہد مسلسل میں گزری۔ انھوں نے بلند اصولوں اور اعلا آدرشوں کو عملی شکل دینے اور ملک و قوم کی خدمت کی راہ میں اپنا سب کچھ قربان کر دیا اور کبھی بھی کسی عہدے کی پرواہ کی نہ ستائش کی تمنا۔ ان کی پوری زندگی قربانیوں کی داستان ہے۔ ان کی جو خصوصیت اور انفرادیت سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ ہے اقتدار کی سیاست سے ان کی عملی بے تعلقی اور اصولوں سے کسی حال میں بھی سمجھوتہ نہ کرنے کی پالیسی جس پر وہ آخر دم تک عمل پیرا رہے۔ انھوں نے عہدوں اور اقتدار کی پرواہ کیے بغیر گاندھیائی انداز میں ملک کی بے لوث خدمت کی۔ اور اقتدار کی سیاست سے انھوں نے ذاتی طور پر ہمیشہ بیزاری ظاہر کی۔ جے پرکاش جی کی یہ خصوصیت اور انفرادیت بے لوث خدمت اور ایثار کے عظیم اصولوں سے ان کی اٹوٹ عملی وابستگی کی آئینہ دار ہے۔ وہ صحیح معنوں میں گاندھی جی کے عظیم آدرشوں اور اصولوں کے وارث اور نگہبان تھے۔ افسوس صد افسوس کہ سرزمین ہند اس عظیم وارث و نگہبان سے بھی محروم ہو گئی۔ جے پرکاش جی کی پیدائش بھی اس مہینے یعنی اکتوبر کی ۱۱ر تاریخ کو (۱۹۰۲ء میں) ہوئی تھی اور نو برس کی عمر میں ہی جب انھوں نے پٹنہ کے کالیجیٹ اسکول کے ساتویں درجے میں داخلہ لیا، ان کی غیر معمولی ذہانت اور دیگر عام بچوں سے مختلف ان کی دلچسپیاں نمایاں طور سے ظاہر ہونے لگی تھیں۔ ۱۹۱۸ء میں انھوں نے سرکاری وظیفے کے ساتھ میٹرک کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ ۱۹۲۱ء میں تعلیم چھوڑ کر عدم تعاون کی تحریک میں شامل ہو گئے۔ ۱۹۲۲ء میں اعلا تعلیم کے لیے امریکہ گئے۔ وہیں انھوں نے انقلابی سوشلسٹ نظریات کا مطالعہ کیا اور مارکس ازم سے متاثر ہوئے۔ ۱۹۳۰ء میں گاندھی جی اور جواہر لال نہرو سے قریب آئے۔ ۱۹۳۲ء میں کانگریس کے جنرل سکریٹری ہوئے ۱۹۴۲ء میں گاندھی جی کے ذریعہ چلائی گئی بھارت چھوڑو تحریک میں سرگرم حصہ لیا۔ ۱۹۴۳ء میں لاہور ریلوے اسٹیشن پر گرفتار کر لیے گئے۔ ۱۹۴۶ء میں رہا ہوئے۔ ۱۹۵۲ء میں کانگریس پارٹی سے استعفا دے کر پرجا سوشلسٹ پارٹی کی تشکیل کی اور پھر بھودان اور سروودے تحریک میں شامل ہو گئے۔ ماہ اکتوبر، ۱۹۵۰ء میں وہ سیاست سے تقریباً کنارہ کش ہو گئے ۱۹۷۲ء میں چار سو سے زائد ڈاکوؤں کو سپر اندازی کے لیے آمادہ کیا جس کے نتیجے میں ان ڈاکوؤں نے ڈاکہ زنی وغیرہ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے توبہ کر لی۔ اس طرح دنیا نے عدم تشدد اور اعلا اخلاقی قدروں کی فتح ایک بار پھر دیکھ لی۔ ۱۹۷۴ء میں بہار تحریک کے ذریعہ جے پرکاش جی نے پھر سیاسی سرگرمیاں شروع کیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے تصنیف کا کام بھی جاری رکھا۔ ان کی سات تصنیفات شائع ہو چکی ہیں جو کافی مقبول ہیں جن میں وھائی سوشلزم، ٹوورڈس اسٹرگل، فرام سوشلزم ٹو سروودے اور ان کی جیل ڈائری خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی تمام زندگی جہد مسلسل، ایثار، ریاضت اور عزم و عمل کی ایک اعلا اور قابل تقلید مثال ہے۔

وزیر اعلا اترپردیش شری بنارسی داس نے جے پرکاش جی کے انتقال پر انھیں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے بالکل صحیح کہا ہے کہ "جے پرکاش جی عوامی زندگی میں اخلاقی قدروں کی روشنی کا ایک منارہ تھے۔ وہ ہمیں صحیح راستے پر چلنے کی تحریک دیتے رہے۔ وہ محض ایک فرد ہی نہیں بلکہ ایک مکتب فکر تھے۔ اب یہ ہماری ذمے داری ہے کہ ہم ان کے ورثہ کو سنبھالیں اور اس روشنی کو قائم رکھیں جو انھوں نے مہاتما گاندھی سے حاصل کی تھی۔ ہمیں اس کے لیے مسلسل کوشاں رہنا ہے کہ ہمارا عمل عدم تشدد پر مبنی رہے اور قدروں نیز اصولوں کے لیے ہماری جدوجہد کو بھی عدم تشدد پر ہی مبنی ہونا چاہیے۔"

● ہمارے ایک مشہور اردو شاعر جناب بال مکند عرش ملسیانی کا بھی ۲۵ر ستمبر کو نئی دہلی میں انتقال ہو گیا۔ عرش صاحب حکومت ہند کے محکمۂ اطلاعات کے شعبۂ اشاعت سے منسلک رہے تھے اور ماہنامہ "آج کل" کے مدیر بھی رہ چکے تھے۔ ان کے پدر بزرگوار پنڈت لبھو رام جوش ملسیانی بھی اردو کے ایک ممتاز شاعر تھے۔ چنانچہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ادبی ذوق اور فن شعر گوئی انھیں ورثہ میں ملا تھا۔ جہاں تک عرش صاحب کی شاعری کا تعلق ہے اس میں نئی روایت کا احترام اور استحکام نمایاں ہے اس کے باوجود ان کے لہجے اور اسلوب میں ایک تازگی کے ساتھ ہی ساتھ اثر آفرینی پائی جاتی ہے۔ عرش صاحب کو اردو زبان و ادب سے گہرا لگاؤ تھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ وہ ایک مخلص محب وطن اور ایک نیک انسان بھی تھے۔ ان کا انتقال بلاشبہ اردو زبان و ادب کا بھی ایک بڑا نقصان ہے، جس پر ادارۂ نیا دور رنج و غم کے جذبات کے ساتھ ان کے پس ماندگان سے اظہار ہمدردی کرتا ہے۔

——— ایڈیٹر

نشور واحدی
اطرباغ۔ بیکن گنج کانپور

دلفگاروں پہ ستم ہو یہ چلن آج بھی ہے
دور تک سلسلۂ دار و رسن آج بھی ہے

اب بھی بے نور ہیں ایوانِ محبّت کے چراغ
رنگ در رنگ جراحت کا چمن آج بھی ہے

انھیں ذرّوں سے دھڑکتے ہوئے دل اٹھیں گے
ہلکی ہلکی یہ امیدوں کی کرن آج بھی ہے

چونکتے سب ہیں مگر چونک کے سو جاتے ہیں
محفلِ کہنہ میں کچھ تازہ سخن آج بھی ہے

ایک لغزش کی کئی بار سزا مل کے رہی
سود در سود زمانے کا چلن آج بھی ہے

کس نے پہچانا ہے اے دوست زمانے کا مزاج
وقت کے ماتھے پہ تھوڑی سی شکن آج بھی ہے

آدمی وہ نہیں اب شہر کی گلیوں میں نشورؔ
منظرِ صبحِ وطن شامِ وطن آج بھی ہے

فضا ابن فیضی
مئو ناتھ بھنجن ۲۷۵۱۰۱
یو۔پی

غزل

رتبۂ خشت و خزف، اور گہر سے اونچا
قد یہاں بے ہنری کا ہے ہنر سے اونچا

ایک دن غرق نہ کر دے تجھے یہ سیلِ وجود
دیکھ! ہو جائے نہ پانی کہیں سر سے اونچا

مانگتا کس سے، مجھے ننگِ سرافرازی دے
کوئی دروازہ تو ہوتا ترے در سے اونچا

کیسی بستی میں یہ دنیا نے بسایا ہے مجھے
نظر آتا ہے ہر اک گھر مرے گھر سے اونچا

ہم قدم ہے تپشِ جاں، تو پہنچ جاؤں گا
ایک دو جست میں، دیوارِ سحر سے اونچا

ایک بگڑی ہوئی تمثیل ہیں سارے چہرے
کوئی معیار نہیں، میری نظر سے اونچا

بلبلہ اٹھنے کو اٹھا تو، مگر بے چارہ
رکھ سکا خود کو، نہ دریا کے بھنور سے اونچا

دھوپ اتری تو سمٹنا پڑا خود میں اس کو
ایک سایہ کہ جو تھا اپنے شجر سے اونچا

وہ کہاں سے، یہ تخیل کے افق لائے گا
آسماں اب بھی نہیں ہے مرے سر سے اونچا

کون اس شور میں سنتا مری سرگوشی کو
میں نے آہنگ کو رکھا اسی ڈر سے اونچا

خاکِ شبلی سے خمیر اپنا بھی اٹھا ہے فضاؔ
نام "اردو" کا ہوا ہے اسی گھر سے اونچا

جمیل مہدی
ایڈیٹر عزائم، امین آباد۔ لکھنؤ

گاندھی جی ۔ ہندستانی سیاست کی سب سے بڑی "بشارت"

گاندھی جی ۔ ہندستان کی سیاست میں بشارت بن کر آئے تھے، ان سے پہلے جد وجہد کے میدان میں جوش تھا، منزل تھی، غیر ملکی حکومت کے خلاف غم وغصہ تھا، استخلاص وطن کا جذبہ تھا، بڑے مخلص عظیم اور حب الوطن کے جذبات سے سرشار رہنما تھے۔ لیکن کوئی متعین راستہ نہیں تھا۔ منزل سب کو نظر آتی تھی، راستہ کے تعین میں سب کو مشکل پیش آتی تھی۔

پورا ملک خلافت تحریک کے اٹھائے ہوئے ہنگاموں اور جوش وخروش سے گونج رہا تھا، مولانا محمد علی، شوکت علی، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر انصاری، بال گنگا دھر تلک، گوپال کرشن گوکھلے، لالہ لاجپت رائے، جیسے عظیم دیوزادوں نے مل کر انگریزی سلطنت کی دیو زادوں کو ہلانے کی مہم چلا رکھی تھی، ہندستان کے باہر راس بہاری بوس، ہر دیال، برکت اللہ بھوپالی، راجہ مہندر پرتاپ اور مولانا عبید اللہ سندھی، ہندستان کی آزاد لیکن جلاوطن حکومت بناکر، بین الاقوامی سیاست کا پہیہ ہندستان کی حمایت میں موڑنے کی جد وجہد میں لگے ہوئے تھے۔

یہ سب کچھ بہت زیادہ حوصلہ افزا، امید بخش اور قابل اطمینان نظر آتا تھا۔ عوامی سطح پر اتنی زبردست بیداری۔ ہندستان کی سیاسی تاریخ میں بے مثال تھی، تاہم، برٹش سامراج بدستور قائم تھا اور مستقبل قریب میں بنیادوں کے ہل جانے کی کوئی تشویش اپنے کردار عمل میں شامل کرنے پر تیار نظر نہ آتا تھا۔

چھوٹے چھوٹے علاقائی گروہوں میں تو پورا ہندستان بیدار اور منظم نظر آتا تھا لیکن ان گروہوں کے اجتماعی طور پر منظم ہوکر ایک مرکزی قوت میں ڈھل جانے کی سبیل ابھی تک پیدا نہ ہوئی تھی۔ یہ وقت تھا کہ ہندستان سے بہت دور جنوبی افریقہ کے ملک میں ہندستان کے ایک ایسے فرزند کی حریت پسندی اور برٹش سامراج کی نسلی پالیسی کے خلاف ٹکر لینے کے واقعات کی خبریں ہندستان میں پھیلنی شروع ہوئیں جسے اس کی خواہش اور مرضی کے خلاف قسمت نے قانون کے پیشہ سے ہٹاکر سیاسی میدان میں پہونچا دیا تھا۔

موہن داس کرم چند گاندھی، جنوبی افریقہ ایک قانون داں کی حیثیت سے ایک ہندستانی کے مقدمہ کی پیروی کے لیے گئے تھے، وہاں جاکر انھوں نے نسلی امتیاز اور وہاں کے اصلی باشندوں کے ساتھ ہندستانی باشندوں کے ساتھ بھی انگریزوں کے جانوروں جیسے برتاؤ اور سلوک کا مشاہدہ کیا تو انسانی قدروں کی یہ تذلیل ان سے دیکھی نہ گئی، انھوں نے قانون اور مقدمہ کی پیروی کو بھول کر، اس امتیازی سلوک کے خلاف جد وجہد کا آغاز کر دیا۔ جنوبی افریقہ کی گوری حکومت کے نزدیک ان کا رویہ حیرت انگیز بھی تھا اور اشتعال انگیز بھی، اس حکومت نے جیسی سخت گرفت وہاں کے انتظام اور انتظامیہ پر قائم کر رکھی تھی اور حکومت اور رعایا کے فرق کو بھی نظر انداز کرکے آقائیت اور غلامی کے رشتوں میں جس طرح وہاں کی آبادی کو جکڑ رکھا تھا پھر اس امتیازی سلوک کو جس طرح قانونی اور دستوری درجہ دیکر زندگی کے معمول میں داخل کر دیا تھا، ان سب کا تقاضا ہی یہ تھا کہ اس کی خلاف ورزی کرنے والا کوئی بھی شخص مجرموں کے اس طبقہ میں آجائے، جس کے لیے عبرت ناک سزا سے محفوظ رہنے کی

کوئی صورت باقی نہ رہ سکے۔

نوجوان قانون داں موہن داس کرم چند گاندھی کے سلسلے میں جنوبی افریقہ کی گوری حکومت کو سب سے بڑی دقت یہ پیش آئی کہ وہ برٹش تاج کے سب سے قیمتی ہیرے" ہندستان سے تعلق رکھتے تھے اور ہندستان میں سیاسی صورت حال اس وقت اطمینان بخش نہیں تھی، اس لیے انھوں نے ان کی سرگرمیوں کے خلاف توپ و تفنگ اور قید و بند کے خلاف ذاتی طور پر تذلیل و تحقیر اور اخلاقی طور پر حوصلہ شکن برتاؤ کی نئی حکمت عملی اپنائی۔ وہ گوروں کے لیے مخصوص ٹرین کے ڈبہ میں سوار ہوتے تو کوئی قلی انھیں زبردستی اس سے نیچے اتار دیتا، وہ کسی ضابطہ کے خلاف ورزی کے مرتکب ہوتے تو انھیں ایسی سزا دی جاتی جو زیادہ سے زیادہ عزت نفس کے خلاف اور دل خراش ہوتی۔ ان پر غلاظت پھینکنے سے لے کر، جسمانی طور پر زدوکوب کرنے کے واقعات دراصل اسی حکمت عملی کا نتیجہ تھے۔

لیکن جیسا کہ مشیت کے پیدا کردہ اسباب کا قاعدہ ہوتا ہے، یہ سارے واقعات گاندھی جی کو بے عزت اور انھیں احساس کمتری میں مبتلا کرنے کے بجائے ان کی عزت اور شہرت میں چار چاند لگا دینے کا سبب ثابت ہوئے اور شہرہ چار دانگ عالم میں اتنی تیزی کے ساتھ پھیل گیا کہ ان کی واپسی سے پہلے ان کے لیے ہندستان میں وہ سیاسی میدان پوری طرح تیار ہو گیا جس میں انھیں کام کرنا تھا اور بالآخر قوم کے سب سے عظیم اور معزز منصب — آزادی دلانے والے رہنما — کے منصب تک پہونچنا تھا۔

گاندھی جی کا جنوبی افریقہ کا تجربہ — اپنے مخصوص نتائج کے اعتبار سے اتنا زبردست اور فیصلہ کن تجربہ تھا، جس کی بدولت ان کے ذہن، ان کے مزاج، ان کی رفتار طبیعت اور قوت فیصلہ میں وہ خصوصیات پیدا ہوئیں جنھوں نے انھیں ہندوستانی قوم کا واحد ترجمان بنایا اور جو آگے چل کر ان کے اس فلسفہ کے بنیادی عناصر کی تشکیل میں مددگار ثابت ہوئیں جو آج ساری دنیا میں گاندھیائی فلسفہ کہلاتا ہے۔

مثال کے طور پر — عدم تشدد اور اہنسا کا اصول، جو ان کی زندگی اور ان کی تعلیمات میں بنیادی اہمیت کے اصول کی اہمیت رکھتا ہے، سب سے پہلے جنوبی افریقہ میں ہی بروئے کار لایا گیا۔ اور اس اصول کے جیسے خوشگوار اور اطمینان بخش نتائج وہاں ظاہر ہوئے، ان ہی کی بدولت انھیں اس اصول کی سچائی اور کامیابی کا یقین ہوا۔ جنوبی افریقہ کی تحریک کے حاصل شدہ تجربات کی بدولت ہی ان کی شخصیت میں، استقلال، مخالفت کا مقابلہ کرنے اور نتائج کو برداشت کرنے کی وہ عادت پیدا ہوئی جس نے انھیں بالآخر ہندستان کا بے مثال اور کامیاب رہنما بنایا۔

جنوبی افریقہ کے اسی تجربے کی بدولت یہ ممکن ہوا کہ موہن داس کرم چند گاندھی جو ہندستان سے ایک قانون داں کی حیثیت سے جنوبی افریقہ گئے تھے، جنوبی افریقہ سے ایک ایسے سیاسی لیڈر بن کر واپس آئے کہ ان کی شخصیت، عظمت اور شہرت کے سورج کے سامنے ہندستانی سیاست کے سبھی آفتاب و ماہتاب ماند اور مدھم ہو کر رہ گئے۔ جیسا کہ ابتدا میں کہا گیا، گاندھی جی ہندستان کی سیاست میں ایک بشارت کی صورت میں رونما ہوئے تھے، ان کی آمد سے ہندستان کی قومی سیاست کو حوصلہ ملا، روشنی ملی نئی امنگیں اور نئے ولولے تحریک کے اندر داخل ہوئے، لیکن ان سب سے زیادہ اہم بات یہ واقعہ ہوئی کہ آزادی کی منزل کا وہ راستہ مل گیا جس پر چل کر اس نے کامیابی کے ساتھ — حیرت ناک اور بے مثال کامیابی کے ساتھ — دنیا کی سب سے بڑی طاقتور اور مسلح برطانوی حکومت کے مقابلہ کی سخت آزمائش اور سخت ترین مقابلے کے مراحل طے کر لیے۔

آج ہندستان میں قوم کے باپ کی حیثیت سے مہاتما گاندھی کو جو مقام اور ان کے خیالات کو جیسا قابل احترام درجہ ملا ہے، اس میں ان کے جنوبی افریقہ کے تجربات کو بڑا دخل تھا، اس لیے جس وقت ہندستانی قوم ان کی سبق آموز زندگی کا مطالعہ اور اس عظیم زندگی سے حوصلہ اور روشنی حاصل کرنے کی کوشش کرے، اسے اس پس منظر کو لازمی طور پر اپنے سامنے رکھنا چاہیے، جو اس ملک سے ہزاروں میل دور جنوبی افریقہ میں قائم ہوا تھا۔

علی احمد جلیلی
نیو ٹاؤن محبوب نگر ۵۰۹۰۰۱

فن سے گریز۔ ایک رجحان

غزل کے آئینے میں

پچھلی دو دہائیوں سے اردو شاعری تجربوں کی آماجگاہ بنی ہوئی ہے۔ پہلے ترقی پسند تحریک نے زور پکڑا پھر امریکی یورپی ادب کے تحت نت نئی تبدیلیوں کی آندھی چلی جس نے روایتوں کو جھٹکے کھا کر پھینکا اور نئی نسل کو جدیدیت کے رستے پر لا ڈالا۔ اردو نظم پر تو اس کا اثر پڑا کہ اس نے اپنا چولا ہی بدل دیا یعنی موضوع مواد اسلوب و ہیئت کی پرانی قبا بکھیر اتار پھینکی۔ غزل بھی اس کی لپیٹ میں آئی اور بچی بچر کر روندی گئی۔

اس انقلاب کے تجرباتی دور میں جہاں صحت مند عناصر نے بار پایا وہاں بہت سارے غیر صحت مند عناصر بھی غزل میں داخل ہو گئے۔ علامتی اظہار نے ابہام پیدا کیا، نئے ڈکشن نے زبان کی لطافت چھین لی۔ نئی بحریں ایجاد ہوئیں، کھردری اور آزاد غزل کے تجربے ہوئے اور منجملہ ان تمام عناصر کے ایک اہم منفی رجحان زبان و فن سے گریز کی صورت میں سامنے آیا۔ یہ رجحان شاعری کو بے سمتی کی طرف لے جا رہا ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ فن و زبان کے ساتھ ایسا سلوک کرنے میں اگر کم درجہ کے خامکار نوجوان شاعر ہوتے تو کوئی بات نہ تھی لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس میدان میں ایسے لوگ بھی اتر آئے ہیں جو معتبر ہیں اور دنیائے شعر و ادب میں خاصا نام و مقام رکھتے ہیں۔

نئے رجحانات کو اپنانے میں یا ان کی پذیرائی میں نئی نسل اور ترقی پسند گروپ کے جو شعرا آگے بڑھ رہے ہیں ان کو بآسانی دو گروپ میں بانٹا جا سکتا ہے۔ پہلے گروپ میں وہ شاعر ہیں جن کے ذہین اور ایماندار ہونے میں کوئی شک نہیں۔ قدامت و تقلید سے بڑی حد تک فرار کے باوجود ان کی جدیدیت کلاسیکی شاعری کے پس منظر میں روایات کی توسیع کی صورت میں ہے لیکن ان میں ایک بڑی تعداد ایسے انتہا پسندوں کی بھی ہے جنھوں نے روایتوں اور اصولوں سے رشتہ توڑ کر اپنے انفرادی تجربوں کے دائرہ میں خود کو محصور کر لیا ہے۔ شاعروں کا یہ گروپ غزل کے مواد، موضوع، اسلوب اور ہیئت میں من مانے تجربوں کے ساتھ زبان و فن کے تعلق سے دانستہ غفلت برت رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے شاعر جان بوجھ کر صحیح راستے سے کترا کر چل رہا ہے۔ ان کے انداز فکر اور بنائے ہوئے اصولوں کا نچوڑ یہ ہے۔

۱۔ مواد مضمون یعنی خیال اور معنوی محاسن کے آگے زبان و فن کو ثانوی اہمیت حاصل ہے۔

۲۔ زبان و بیان کا غیر صحت مند ہونا ہی جدیدیت کی دلیل ہے۔ فن و زبان کی بے نیازی سے ہی جدید سے جدید تر کی خواہش تکمیل پاتی ہے۔

۳۔ نئی شاعری میں ضبط و نظم کی جگہ بے راہ روی اور سلاست و نفاست کی جگہ کھردرے پن کو ملنی چاہیے۔

دوسرا گروپ نئی نسل کے ان شاعروں کا ہے جنھوں نے شاعری کو محض فیشن کے طور پر اپنایا ہے۔ اس طبقہ کے بیشتر افراد ادبیات

عالیہ کے قدیم ورثے سے نابلد ہیں۔ ان کی معلومات سطحی ہے۔ ان کے پاس نہ اقدار کا سرمایہ ہے اور نہ فن کا احترام۔ علمی پس منظر نہ ہونے سے زبان کے اصول و فن کے مسائل ان کے پلے نہیں پڑتے۔ یہ لفظوں کی بناوٹ اور ان کے استعمال سے نہ واقف ہیں اور نہ واقف ہونا چاہتے ہیں۔ تلفظ و اعراب یعنی حرکت و سکون وغیرہ جو انھیں معلوم ہیں وہی ان کی نظر میں صحیح ہیں۔ تحقیق و تلاش ان کے منصب میں داخل نہیں۔ معیار سے دور بھاگتے ہیں کہ قواعد و ضوابط کی پابندی ان کے بس کی بات نہیں۔ اصول، فن اور معیار ان کے پاؤں کی زنجیریں ہیں جن کو توڑ کر آگے بڑھنے ہی میں ان کی جدیدیت کا بھرم ہے۔

پہلے گروپ کے انتہا پسندوں اور دوسرے گروپ کے بیشتر شاعروں نے زبان و قواعد اور شعری لوازمات کے تعلق سے جو غیر ذمہ دارانہ رویہ اختیار کر رکھا ہے اس نے شعر و ادب کی بنیادیں ہلا دی ہیں۔ اب جبکہ ان کی بے راہ روی اور بے اعتدالی کھل کر سامنے آگئی ہے تو سوال یہ ہے کہ کیا اس رجحان کو یوں ہی چھوٹ دے دی جائے۔ کیا جدید ادب کے اصول یا جدیدیت کے چارٹر میں یہ بات شامل ہے کہ زبان و فن کے اصولوں کی پابندی غیر ضروری ہے یا غلطیوں کو کوئی اہمیت نہیں دینی چاہیے۔؟ اگر ایسا نہیں ہے تو یہ ادبی جرم انھیں کے پلے باندھا جانا چاہیے۔

زندہ زبان کے بڑے سے بڑے لکھنے والوں سے غلطیاں ہوتی رہی ہیں لیکن ان کی فروگذاشتیں ان کی خدمتِ زبان اور شاعرانہ خوبیوں کے مقابلہ میں اتنی شاذ ہیں کہ قابلِ اعتنا نہیں۔ یہ قابلِ گرفت ان شاعروں کے پاس ہو جاتی ہیں جو یا تو ارادی طور پر قصداً زبان سے غفلت برتتے ہیں یا جو اپنی کم علمی کے سبب فنی لوازمات سے کماحقہ واقف نہیں۔ آج کل کے شائع ہونے والے شعر و ادب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نئی غزل کی زبان میں جہاں شکست و ریخت کا میلان ہے۔ وہیں غزل کے فن اور اس کے اصولوں سے انحراف کا میلان بھی واضح ہے۔ لفظوں کے غیر محتاط صرف یعنی حرکت و تلفظ کی بے احتیاطی اور قوافی و عروض سے روگردانی کی مثالیں بہت ملتی ہیں ان کی وضاحت مختلف ذیلی عنوانات کے تحت کی جاسکتی ہے۔

قوافی کا غلط استعمال

ہندی اثرات کے تحت صوتی اصول پر بعض قوافی کا استعمال کیا جا رہا ہے اردو کے بعض سینیر شاعروں نے بھی اس اجتہاد میں عملی طور پر حصہ لیا ہے لیکن اگر قوافی کے اس چلن کو ایک بار اصولی طور پر تسلیم کر لیا گیا تو پھر اس کا دائرہ کتنا وسیع ہوگا اس پر بھی نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔

جاں نثار اختر کی ایک غزل کے قوافی راتیں، باتیں ہیں ان کے ساتھ بساطیں کا قافیہ بھی شامل ہے۔

ہم نے ان تند ہواؤں میں جلائے ہیں چراغ
جن ہواؤں نے الٹ دی ہیں بساطیں اکثر

نذیر اختر نے اپنے ایک مطلع میں مات اور سقراط کو ہم قافیہ بنایا ہے۔

ہوشمندوں کو دی ہے تنہا مات
ہم بھی ہیں اپنے وقت کے سقراط

ناصر شہزاد نے انھیں قافیوں یعنی رات، بات کے ساتھ فٹ پاتھ قافیہ باندھا ہے۔

چائے کی پیالی اٹھا مجھ کو کنکھیوں سے نہ دیکھ
لان ہوٹل کا ہے یہ مال کا فٹ پاتھ نہیں

اب اس کے آگے سہی کا قافیہ صحیح، طمع کا قافیہ صبا، دامن کا قافیہ فوراً اور انداز کے ساتھ کے قافیے الفاظ و امراض سب کچھ قبول کر لینا ہوگا۔ یہاں یہ بات بھی لائق غور ہے کہ ہندی رسم خط کی صورت میں تو یہ بات کچھ نبھ جاتی ہے لیکن اردو میں ان قافیوں کی لکھت کچھ عجیب معلوم ہوگی آخر بصری آہنگ بھی تو کوئی چیز ہے۔ غزل کے مزاج دانوں نے تو یہاں تک کیا کہ آئینہ کو جب دعا اور صبا کے ساتھ باندھا تو آئینا لکھا آئینہ نہیں لکھا۔

عادل جعفری کی ایک غزل کا مطلع ہے

رشتہ ہے زندگی کا ادب سے جڑا ہوا
یہ بات اور ہے کہ ہے قدرے مڑا ہوا

اس مطلع کے قافیے جڑا اور مڑا ہیں۔ ان میں حرف روی ڑ ہے جس کے

ماقبل کے حروف متحرک اور بالضم ہیں۔ لیکن اسی غزل کا دوسرا شعر یہ ہے

نام و نمود کی مجھی نہ خواہش خدا گواہ
خدمت کا حوصلہ تھا کہ میں اٹھ کھڑا ہوا

کھڑا کے ساتھ کے دوسرے قوافی اسی غزل میں پڑا اور کڑا ہیں جن میں حرف ردی سے پہلے کے حروف بالفتح ہیں۔ اصول قوافی کے تحت کھڑا اور مڑا باہم قافیہ نہیں ہو سکتے۔

سلیمان اطہر بھی قافیہ کے استعمال میں محتاط نہیں ہیں۔ ان کی غزل کے دو شعر ہیں

کون کہتا ہے کہ آؤ مجھے غاروں سے بچاؤ
موسم گل کا ستایا ہوں بہاروں سے بچاؤ
سر سڑک کاٹنے آئی سبھی خنجر سے قاتل
بھولے جاؤ کسی گاؤں میں شہروں سے بچاؤ

شاعر نے غار اور بہار کے قافیوں کی پابندی مطلع میں قبول کر لی ہے۔ دوسرے شعروں میں ان سے گریز ممکن نہیں لیکن اسی غزل کے دوسرے شعروں میں شہروں اور فسانوں اور سوالوں کے تمام قوافی ملتے ہیں جو اصولاً غلط ہیں۔ غزل عام قوافی میں ہو تو مطلع ہی سے اس کی شروعات ہونی چاہیے۔

عبدالرحیم نشتر اپنی ایک غیر مردف غزل میں قافیہ کی صحت پر دھیان نہیں دیتے

کسی کو اپنا کریں یا کسی کو اپنا کہیں
تمہارے بعد اگر جی سکیں تو جی بھی لیں
مگر یہ چاند ستارے مرے رفیق نہیں
کہ ان کو دیکھوں تو صورت تری دکھاتے ہیں

مطلع کے قوافی کہیں اور لیں تو درست ہیں لیکن ہیں کے جواز کی کیا صورت ہے جبکہ ہیں کی ہا بالفتح ہے اور کہیں اور لیں کی بالکسر۔

فضا ابن فیضی شاید حرف روی کی پابندی کے قائل نہیں

زلفوں کی ہے بہار یہ اشکوں کی چاندنی — میرے سوا نہیں ہے کوئی حسن دیدنی
اف رے فروغ طبع کی رسوائیاں فضاؔ — پی جائے کوئی میرے چراغوں کی روشنی

مطلع کے قافیوں میں اگر حرف روی "ن" کو سمجھا جائے تو اس کے قبل کے حروف ن اور ی کو متحرک ہونا چاہیے تھا جو ساکن ہیں اس لیے چاندنی اور دیدنی باہم قافیہ نہیں ہو سکتے۔ ان کے ساتھ روشنی کے درست ہونے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

اجمل صدیقی کی ایک غزل میں بھی قافیوں کا یہی نقص موجود ہے

ہر گھڑی قافلہ سوالوں کا
میرے ہمراہ گھومتا کیوں ہے

غزل کے سارے قوافی پوچھتا، گھورتا اور نچوڑتا وغیرہ میں ت بالالتزام ہر ایک میں ہے اور ت حرف روی کے پہلے کے حروف ساکن ہیں جنھیں اصولاً متحرک ہونا چاہیے تھا۔

ندا فاضلی نے قافیہ کے مسلمہ اصولوں سے گریز کرتے ہوئے ایک نیا تجربہ یوں کیا ہے

یہ لوگ جو تصویروں سے کمروں کو جڑے ہیں
مت چھیڑ دا انھیں تیر کمانوں پر چڑھے ہیں

جڑے کے قوافی پڑے، کڑے اور کھڑے ہیں جن میں حرف روی "ڑ" ہے۔ ان کے ساتھ چڑھے کا قافیہ کیونکر آ سکے گا۔ چڑھے کے قوافی بڑھے اور پڑھے ہوں گے۔ انھیں قافیوں کے غلط استعمال یا تجربہ پر ہدایت محسنی کے ایک مطلع پر اعتراض کرتے ہوئے ڈاکٹر سیفی پریمی نے اپنے خیال کا اظہار یوں کیا ہے:-

"اس دانستہ کوشش میں اگر شاعر نے صوتی اثر کا جواز پیش نظر رکھا ہے تب بھی قابل قبول نہیں کیونکہ جڑے اور چڑھے میں ڑ حرف ردی قافیہ کی بنیاد ہیں۔ چڑھے میں ہائے مختفی ہے جڑے میں نہیں۔"

من موہن تلخ کے پاس قافیوں کے استعمال کی ایک نئی صورت ملتی ہے

ایسی بھی کیا خموشی کبھی لب تو کھولیے
کچھ گل سے بات کیجئے بلبل سے بولیے
جانا کسی کا اور کوئی حادثہ نہ تھا
یہ اور بات بیٹھ کے کچھ دیر رو لیے

مطلع کے قوافی کھولیے، بولیے مصادر کھولنا اور بولنا سے بنائے گئے ہیں جو درست ہیں۔ ان کے ساتھ رولیے کا قافیہ نادرست ہے جو دو

مصادر کا مرکب ہے جو پہلی امدادی فعل کا کام دیتا ہے جس میں لی بالکسر اور متحرک ہے جبکہ مطلع کے قوافی میں ل ساکن ہے۔ ردیف کے ساتھ کے قوافی دھویئے سوئیے ہوں گے۔

وزن وعروض سے انحراف

الفاظ کو وزن سے گرا کر موزوں کرنے کی بات بہت عام ہوگئی ہے۔ فنِ شعر اس بات کی اجازت نہیں دیتا ضرورتِ شعری کی وجہ سے یا اس سبب سے کہ شاعر اسے درست وزن و تلفظ کے ساتھ موزوں نہیں کر پاتا الفاظ کے حروف وزن سے گرا دیے جائیں۔ اردو یا ہندی کے لفظوں کے ساتھ یہ عمل درست ہے لیکن فارسی و عربی کے حروف گرانا اصولاً درست نہیں۔ مثلاً

دستِ دگر یہاں ہے یہاں ہر شاعر و ادیب
کیا کیجیے کمال یہ ہے حاسدوں کا شہر

خود اپنی بد دعا کی زد میں آ گیا ہی نہ ہو
وہ جس کا ذکر ہمیشہ تری دعا میں رہے

کمال جعفری نے گریباں اور آزاد گلاٹی نے بددعا کا الف گرا کر شعر موزوں کیا ہے۔ اسی طرح ذیل کے شعروں میں

کچھ نہ کرنے پہ کبھی پہلے تھی پشیمانی بہت
اب یہ عالم کہ گناہوں پہ بھی پچھتاؤں نہیں

کچھ اس طرف بھی سیہ رات کا جھکاؤ رہے
اجالے خودکشی کرتے ہیں بند کمرے میں

بشر نواز نے پشیمانی اور رکاوش بدری نے خودکشی کی یا کو گرا کر شعر کا وزن برابر کر دیا ہے۔

اسی قبیل کی ایک عام غلطی ایسے الفاظ سے تعلق رکھتی ہے جو ع اور ح سے شروع ہوتے ہیں۔ یہ حروف صوتی لحاظ سے الف سے مشابہ ہیں اس لیے شاعر دھوکا کھا جاتا ہے مثلاً

اک عمر اپنی بھی گزری ہے اے چمن والو
گلوں کے کنج میں اندیشۂ خزاں سہتے

وہ غم جو ظہیر عشق بشر کی ہے امانت
اس غم پہ گوارا کوئی تہمت نہ کریں گے

پہلے شعر میں عمر اور دوسرے شعر میں عشق کی ع تقطیع سے گر گئی ہے۔ لطف کی بات تو یہ ہے کہ جب ان کی گرفت کی جاتی ہے تو اس کا جواب کچھ اس طرح ملتا ہے۔ کرامت علی کرامت اپنی ایک تنقید میں لکھتے ہیں:-

"اردو میں چونکہ الف اور عین کے تلفظ میں کوئی فرق نہیں اس لیے الف وصل کی طرح عین کو بھی گرانے میں کوئی قباحت نہیں۔ اس سلسلے میں حرمت الاکرام صرف میرے ہم خیال ہی نہیں بلکہ انھوں نے اپنے کلام میں ارادتاً ثبوتاً کہیں کہیں جگہ عین کو گرایا ہے۔"

ح کی صورت میں بھی کچھ شاعر ایسا ہی کر رہے ہیں مثلاً:

اب جا ترے دھوکے میں نہ ہم آئیں گے دنیا
ہم نے تجھے اچھی طرح پہچان لیا ہے

عظمتِ خسروی جانو تو اجالے دو ہیں
ہند میں اس طرح دیکھو تو ہمالے دو ہیں

پہلے شعر میں ساجد لکھنوی اور دوسرے شعر میں صابر شاد آبادی اسی غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ ح کو الف کی آواز میں موزوں کیا ہے صابر یوں کہہ سکتے ہیں۔

اس طرح ہند میں دیکھو تو ہمالے دو ہیں

ساقی فاروقی نے پارسا کا الف گرا کر زبردستی تقطیع میں لانے کی کوشش کی ہے

مجھے گناہ میں اپنا سراغ ملتا ہے
وگرنہ پارسا و دیندار میں بھی تھا

پارسا کا املا قافلہ کی طرح پارسہ سمجھ لیا گیا ہے۔

قافیہ کی ایک نئی غلطی خلیل الرحمٰن اعظمی کے ان شعروں میں ہے۔

ہمیں سے کیوں نہیں دعویٰ کہ ہم بھی یکتا ہیں
ہمارے خون کے پیاسے جب اہلِ دنیا ہیں

صدائے ساز نہیں ہم نوائے غم ہی سہی
ہمیں سنو کہ ہمیں اعتبارِ نغما ہیں

یکتا اور دنیا کے قوانی کے ساتھ نغمۂ سحر وہ اور جلوہ کے قافیے استعمال کیے جا سکتے ہیں لیکن فنی اصول یہ ہے کہ ایسے قوافی تنہا استعمال کیے جائیں فارسی اضافت کے ساتھ نہیں یہاں اہلِ دنیا درست ہے اہلِ تمنا نہیں حرمت الاکرام بھی یہ فنی پابندی قبول کرنے کو تیار نہیں۔

کھلے گی آنکھ تو عالم بھی دوسرا ہوگا — حصارِ شب میں سزا رباب پہ قافلہ ٹھہرا

تلفظ کی بے راہ روی

جن شاعروں کے کلام میں تلفظ کی بے راہروی ملتی ہے اس کی دو وجوہات ہو سکتی ہیں۔

(۱) صحیح تلفظ سے غفلت (۲) کم علمی یا ناواقفیت

تلفظ کی غلطی کا شمار فاش غلطی میں ہوتا ہے۔ اچھے شاعروں سے اس کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ پھر بھی اس فہرست میں ایسے نام بھی آجاتے ہیں جنھیں نہیں آنا چاہیے تھا۔

زیادہ تر غلطیاں ایسی ہیں جن میں لفظوں کے ساکن حروف متحرک اور متحرک حروف ساکن ہو گئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شعر میں جس وزن کے ساتھ لفظ موزوں ہو گیا ویسا ہی تلفظ بحال رکھا۔ پرکاش فکری ایک ہی لفظ کو اپنے دو شعروں میں دو تلفظ کے ساتھ موزوں کرتے ہیں

چپکا ہے اشتہار سا کچھ اسکی شکل پر — میں دیکھتا ہوں روز ہی اسکو دھیان سے
اسی کا دھیان ہے اور پیاس بڑھتی جاتی ہے — وہ اک سراب کہ صحرا بنا رہا ہے مجھے

پہلے شعر میں دھیان بروزن مکان ہے دوسرے میں دھیان کے وزن پر ہے۔ اس میں صحیح تلفظ کونسا ہے اس کی انھیں فکر نہیں۔

دلھن کا صحیح تلفظ بروزن چمن ہے جس میں ل متحرک ہے جیسا کہ امیر مینائی کے اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے۔

آتے ہیں سر میں عطرِ دلھن کا وہ ڈال کے — کیا کیا سہاگ ہیں مرے روز وصال کے

لیکن آج کے کئی شاعروں شکیل صدیقی، ظہیر ایاز اور شہیر مراد آبادی نے دلھن کی لام کو ساکن کر کے اس کو گلشن کا وزن دے دیا ہے۔

جسم کے حصے سمٹے سمٹے — جیسے سیج پہ کوئی دلھن

مانگ تاروں کی سجائے کسی دلہن کی طرح — راہ تکتی ہے مری راہ سہاگن کی طرح
سوئی ہوئی صدی کو صدا دیجیے بار بار — فن کی گلی سے سوچ کی دلہن گزر گئی

لفظ گزراں کو لیجیے۔ اس کا صحیح تلفظ جلیل مانک پوری کے اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے۔

سابقہ پڑنے سے یہ راز سمجھ میں آیا — ہر زمانہ گزراں ہے شبِ فرقت کے سوا

فرحت کیفی اور حسنیٰ سرور نے گزراں کی ر کو ساکن کر دیا

داستانِ لمحۂ گزراں ہے اور — میں وہی ہوں دیدۂ حیراں ہے اور
یادِ گزراں ترا افسانہ بنا لیتے ہیں — دل کے بہلانے کی تدبیر بنا لیتے ہیں

لفظ المیہ کا استعمال ذیل کے دو شعروں میں دو مختلف تلفظ کے ساتھ ملتا ہے۔

موت سے خوف زدہ جینے سے بیزار ہیں لوگ — اس المیہ پہ ہنسا جائے کہ رویا جائے
المیہ آخری بہر دیکھ یہ تھا پردۂ تیز — دُور ہی سے آسے پہچان لیا ہے میں نے

پہلے شعر میں شاہد رحمانی المیہ کی میم کو ساکن کر کے "سلیقہ" کے وزن پر موزوں کرتے ہیں۔ دوسرے شعر میں پرویز رحمانی المیہ کی لام کو ساکن کر کے "صوفیہ" کا ہم تلفظ بناتے ہیں۔ دونوں تلفظ درست نہیں۔ المیہ کا صحیح تلفظ اَلَ میہ ہے یعنی الف، لام، میم تینوں متحرک ہیں۔

اقبال عظیم کے اس شعر میں تعلقات کا وزن ملاحظہ ہو۔

یوں سرِ رہگزر پرسشِ حال کی اس زمانے میں فرصت کسی کو کہاں
آپ سے یہ تعلقات رسمی نہیں اتنی زحمت بھی کچھ کم عنایت نہیں

تعلقات میں لام مشدد ہے ساکن نہیں جیسا کہ شعر میں ہے۔

یوسف جمال صحیح اور سہمی کے تلفظ میں کچھ فرق نہیں کرتے

رقاصہ ناچتی ہے بظاہر خوشی کے ساتھ — جو روپ دیکھنا ہو صحیح غم کی تال دو

رمضان بول چال میں تو امکان کے وزن پر بولا جاتا ہے یعنی میم کے سکون کے ساتھ لیکن جب شعر میں استعمال ہوتا ہے تو ر اور میم دونوں کو متحرک رکھا جاتا ہے۔ عمیق حنفی بول چال کے تلفظ ہی میں اس کو استعمال کرنا درست سمجھتے ہیں۔

دامنِ فکر اپنا سمیٹے ہوئے — سالہا سال رمضان گزرتے رہے

سہیل احمد زیدی نے اپنے ایک شعر میں دعویٰ کو اس طرح موزوں

کیا ہے۔

ہم نے دعوائے انا الحق کر تو ڈالا تھا مگر
شکل دیکھی آئینہ میں اور خود شرما گئے

گویا صحیح املا دعویٰ ہے دعوی نہیں۔

آئینہ خانے پر کسی کا یہ شعر بہت مشہور ہے:

آئینہ خانے میں او زلف بنانے والے
مجھکو بگڑی ہوئی قسمت بھی بنا آتی ہے

آئینہ کے اس مروجہ تلفظ کے ساتھ مظفر حنفی یوں اجتہاد کرتے ہیں:

آئینہ خانے مرا چہرہ مجھے واپس کر دیں
ورنہ میں ہاتھ بڑھا سکتا ہوں پتھر کی طرف

لفظ طرح کا استعمال غزل میں دو تلفظ کے ساتھ ملتا ہے۔ طرح کی رکو ساکن بھی باندھنا درست ہے اور متحرک بھی۔ لیکن عشرت کرتپوری کے یہاں طرح کے استعمال کی ایک تیسری صورت بھی نظر آتی ہے۔

تمنا ہے کوئی سر شام ہی
چراغوں کی طرح جلائے مجھے

شعر موزوں پڑھنے کے لیے طرح کو طرا پڑھنا ہوگا۔

الفاظ پیاسا اور پیالا کے تلفظ کی غلطی بہت عام ہوتی جا رہی ہے۔ پیاسا کا صحیح وزن و تلفظ فعلن ہے فعولن نہیں۔ جیسا کہ حسرت سہروردی اور نثار الماس کے اشعار سے ظاہر ہوتا ہے۔

کڑوے پانی کا سمندر دتیا
لب ساحل ہوں پیاسا یارو

پی گیا شب کے اندھیروں کو پیاسا سورج
صبح کے وقت اگلتا ہے اجالا سورج

پیاسا کے برخلاف پیالا کا صحیح تلفظ بروزن فعولن ہے۔ لیکن شفیق نے اپنے شعر میں بروزن فعلن موزوں کیا ہے

تلخی مے سے شفیق اور بڑھی تشنہ لبی
ہو جو سقراط کا پیالہ تو پلایا جائے

سلیمان اطہر علامت نفی نہ کو اشباع کے ساتھ ناموزوں کرتے ہیں

پر دیکھا میں ان کا چہرہ
پھر بھی وہ نہ آئیں ہاتھ

عبد الرحیم نشتر بھی اس جدت میں انھیں کے ہمنوا ہیں

میں بھی اردو زبان جیسا ہوں
لکھنؤ میرا نا دکن میرا

اہل سخن نے ایسے مواقع پر نے کہا ہے نا نہیں کہا جیسے ع

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

زبان و قواعد سے بے اعتنائی

نئی نسل کے اکثر شعرا کے کلام میں زبان و قواعد کی پابندی کم نظر آتی ہے۔ کاش یہ سمجھ سکتے کہ زبان سے بے احتیاطی شاعر کو اس کے مقام سے گرا دیتی ہے۔

واؤ عطف کے استعمال کے لیے یہ ضروری ہے کہ جن الفاظ کے درمیان یہ ربط کا کام دے وہ الفاظ فارسی اور عربی ہی کے ہوں لیکن اب دوسری زبان کے لفظوں کو بھی واؤ عطف سے جوڑا جا رہا ہے۔ مہدی پرتاپ گڑھی کا شعر ہے

یہ بیل بائم یہ جوڑا یہ دوزلف اشک
سجی سجائی ہو تم تو کسی دکاں کی طرح

اسی طرح اردو ہندی یا دوسری زبانوں کے لفظوں کے ساتھ فارسی اضافت کا استعمال نادرست ہے۔ لیکن گویا آل حسن حمید قرار جالب وطنی اس پابندی کو توڑ دینا چاہتے ہیں

خدمت راج محل پر انھیں دیکھا یارو
جو یہ کہتے تھے سر دار بسیرا ہوگا

امتحاں قدموں کا میں لینے بیاباں کو چلا
دیکھنا ہے دوستوں کانٹوں کا زور بانکپن

نظام شمسی سے باہر نہ آس پاس میں ہے
جو روشنی کا تصور دل اداس میں ہے

خدمت راج محل، زور بانکپن اور دل اداس کی اضافتیں قابل غور ہیں۔

لفظ کوئی کا استعمال واحد کے ساتھ ہوتا ہے نہ کہ جمع کے ساتھ لیکن مشیر جھنجھانوی کوئی معنی کے بجائے کوئی معانی کہہ جاتے ہیں۔

کوئی مطلب نہ سہی کوئی معانی نہ سہی
پڑھ رہا ہوں تری یادوں کو کتابوں کی طرح

اسی طرح کوئی پڑھنے والا کے بجائے کوئی پڑھنے والے کیونکر درست ہو سکتا ہے۔ شاہین بدر کا یہ شعر دیکھیے۔

میں ہوں تنہائی کے اوراق کی سادہ سی کتاب
مجھ کو کوئی بھی نہیں ہیں یہاں پڑھنے والے

احمد فراز ہر ایک کے بجائے ہر کوئی کہنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے۔

ہر کوئی اپنی ہی آواز سے کانپ اٹھتا ہے
ہر کوئی اپنے ہی سائے سے گریزاں جاناں

کرشن موہن کا ایک شعر ہے

کر رہا ہے روز و شب اے فتنہ ساز
عاشق جانباز تیرا شکریہ

شکریہ ادا کرنا زبان ہے شکریہ کرنا نہیں۔

اردو لفظ کو فارسی لفظ کے ساتھ ترکیب دینے کی مثال ذیل کے اس شعر میں ملتی ہے

روشنی کا جل زدہ بدبو میں آلودہ ہوا
پیار جیسے تیرے تہہ خانے کا روشندان ہے

من موہن تلخ نئے سرے سے کہنے کے بجائے نئے سرے سے کہنا زیادہ فصیح سمجھتے ہیں

نئے سرے سے تعلق بنیں گے بگڑیں گے
کہ اب ارادے ہیں ایک ایک بار کرنے کے

جہاں اب بھی کہنا چاہیے وہاں حبیب احمد ابھی بھی کہتے ہیں جو خلاف زبان ہے

کچھ اور دیر تو سہنے دے سائباں مجھ پر
ابھی بھی دم ہے مرے جسم کے طنابوں میں

گھر کی دیکھ بھال روزمرہ ہے۔ مظفر حنفی اس میں یوں تحریف کرتے ہیں

اپنی سدھ بدھ بھول گئے گھر کی دیکھا بھالی میں

لے چلے کوئی کے بجائے لیچلو کوئی بول چال کی زبان ہو سکتی ہے ادبی نہیں۔ کمار پاشی:

اس کی یادوں کا دھواں ہے ہر سو
لیچلو کوئی اس فضا سے دور

میں نے گفتگو کیا خلاف قاعدہ ہے۔ کیونکہ گفتگو مونث ہے۔

نصیر احمد کہتے ہیں:

کانٹے مری زباں پہ بکھرنے لگے نصیر
جب زندگی سے میں نے کھری گفتگو کیا

یہ غلطیاں اور خامیاں جن کی طرف اشارہ کیا گیا ہے بہرحال کمزوریاں ہیں۔ انھیں کوئی بھی جائز کا سرٹیفکیٹ نہیں دے سکتا۔ پیش کردہ مثالوں سے ظاہر ہے کہ ان میں صرف چند شاعروں کو چھوڑ کر جنھوں نے چند بندھے ٹکے اصولوں سے آزادی حاصل کرنے کے لیے فن سے قصداً گریز کیا ہے زیادہ تعداد ایسے جدیدیوں کی ہے جنھوں نے فن کے تعلق سے کسب و ریاض کی کوشش ہی نہیں کی ہے۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں فن کی پابندیوں سے ادب میں سلیقہ پیدا ہوتا ہے اور اسی سے اظہار خیال کی تزئین ہوتی ہے۔ فن کی زبان سے کہی ہوئی بات کا اثر بھی بڑھ جاتا ہے۔ فکر و فن کے صحیح امتزاج سے ہی معیاری ادب وجود میں آتا ہے۔ کج رو ذہنیت کسی دور میں بھی ادب کا موضوع نہیں بن سکی ہے۔ غزل کا آرٹ بالخصوص بڑا ہی نازک آرٹ ہے۔ اس میں زبان، اصول اور فنی لوازمات کا پاس اور احترام ضروری ہے۔ ساتھ ہی یہ حقیقت بھی ہمیں فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ نیا شاعر یا جدید شاعر ہونے سے کوئی شخص اپنی ادبی روایتیں نہیں کھو بیٹھتا۔ فن اور زبان کو بھول نہیں جاتا اپنی منزل پر لایا جا سکتا ہے۔

زبان و فن کے اس گریز سے یہ خطرہ بھی تو لگا ہوا ہے کہ اس سے غلط نگاری کی ایک مستقل روایت قائم نہ ہو جائے۔ اس تحریر سے میرا مطلب صرف یہ ہے کہ ادبی و شعری تجربات کے عنوان سے فنکار کے جنوں کو کارفرما ہونے کا موقع نہیں دیا جانا چاہیے اور نہ اس کی ہمت افزائی ہونی چاہیے۔

بقول وحید اختر محض زبان کو بلا وجہ توڑنا پھوڑنا لاعلمی اور جہالت میں غلط الفاظ استعمال کرنا کمال نہیں۔ عجز بیان کو اجتہاد کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ ہر دور کا ادب ترقی پسند ہوتا ہے اس ترقی پسند ادب کو فنکارانہ حیثیت سے بھی بلند کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

★

محسن رضا جونپوری
موہٹہ (بھڑیا ٹولہ)
جونپور

باپو

آبرو بخشِ متاعِ قلب و جاں پیدا ہوا
ہستیِ دل کا امین و رازداں پیدا ہوا

جس پہ ہوں گے منکشف حق و صداقت کے رموز
وہ مجسم نکتہ پرور، نکتہ داں پیدا ہوا

جس کی خاطر چشمِ نرگس تو ہے بے خواب تھی
دیدہ ور وہ اک میانِ گلستاں پیدا ہوا

ہر قدم پہ دے گا جو انسانیت کا ایک درس
وہ سراپا داعیِ صلح و اماں پیدا ہوا

قطع زنجیرِ غلامی ہوگی جس کے ہاتھ سے
وہ اہنسا کی لیے تیغ و سناں پیدا ہوا

ہوگا روشن چار سو جس کی قیادت کا چراغ
وہ مدبر، سرگروہِ عاقلاں پیدا ہوا

آ گیا تائیدِ حق میں جب کبھی وقتِ جہاد
خیمۂ باطل میں شورِ الاماں پیدا ہوا

ہر قدم پہ اب تو منزل کے چمک اٹھیں گے نقش
کارواں والو امیرِ کارواں پیدا ہوا

وہ مکینِ بامِ رفعت، خسروِ اقلیمِ دل
وہ سزاوارِ متاعِ نقدِ جاں پیدا ہوا

اے زہے وہ آ گیا دنیائے دل کا حکمراں
اے خوشا وہ والیِ اقلیمِ جاں پیدا ہوا

پارہ پارہ قوم و ملت کا نہ ہوگا اتحاد
اک تعلق سا میانِ این و آں پیدا ہوا

صاعقہ بر دوش اب اٹھتی نہیں کالی گھٹا
کون وہ وجہِ فروغِ آشیاں پیدا ہوا

آیا وہ کہتے ہیں جس کو ایشیا کی آبرو
چشمِ یورپ جس پہ ہو وہ بائع و شاں پیدا ہوا

آ گئے باپو لیے اک مشعلِ عزم و یقیں
آستاں پہ جس کے خم اقوامِ عالم کی جبیں

تسنیم فاروقی
باغ قاضی۔ لکھنؤ ۳

گاندھی جی کا مجسمہ

کرو جو غور تو مشکل تھا مسئلہ یارو
وطن یونہی نہیں آزاد ہو گیا یارو

خیال جن کے جو دھرتی پہ جم گیا یارو
یہ ایک بوڑھا یہ صدیوں کا رہنما یارو

وطن کو دے کے اخوت کی جاگتی تصویر
وطن کے درد میں جاں سے گزر گیا یارو

یہی وہ شخص ہے جس نے دلائی آزادی
فسادو فرق سے اک جنگ کر گیا یارو

یہ جھانکتی ہوئی آنکھیں سفید چشمے سے
کہ جن پہ ناز کرے فکر و فلسفہ یارو

یہ اپنے دیش کی دھرتی کا اک فرشتہ ہے
جو اس سیاہ سے پتھر میں ڈھل گیا یارو

مٹا گئے اسے کچھ پھوٹ ڈالنے والے
برائے امن دیا اس نے خوں بہا یارو

یہ بولتا ہے اسے سنگِ بے صدا نہ کہو
یہ ایک دور ہے اس کو مجسمہ نہ کہو

رادھا کرشن گوپال مغموم
۳۳۰۴ سیکٹر ۲۲ ڈی چنڈی گڑھ

بیادِ حضرت عرش ملسیانی

عرش، فرزندِ نامدارِ جوش
جو تھا پیکر صفاتِ عالی کا
جملہ امراض میں تھا فالج بھی
تن لاغر تھا جسم و بستر کا
سادگی و خلوص کا پیکر
ہر کسی کا تھا غمگسار و حبیب
علم و فن پر نہ تھا غرور اسے
مقصد نیکِ ادب کی خدمت تھا
تھی زباں داغ کے گھرانے کی
ہر خیالِ بلیغ و فکرِ بلند
شعر کتنے فصیح کہتا تھا
کس قدر تھا بیان پر قابو

ابدی نیند سو گیا، افسوس!
وہ بشر ہم سے کھو گیا، افسوس!
دو برس جس نے سخت اذیت دی
موت نے سب دکھوں سے فرصت دی
اک نمونہ تھا وہ شرافت کا
ایک شہکار تھا محبت کا
ذات اس کی ادب نواز رہی
طبع شہرت سے بے نیاز رہی
گر اسلوب کیا نرالا تھا
کیف زا شعریت میں ڈھالا تھا
فن پہ کتنا عبور تھا اس کو
کیا تفظی شعور تھا اس کو
علم و فن و ادب کی دنیا میں
موت اس کو تو لے گئی لیکن

کیا مرصع تھی، نظم تھی کہ غزل
نکتہ نکتہ تھا قطعے قطعے میں
یاد ہے اس نے جب بطورِ مدیر
ادبِ عالیہ کو دے کے فروغ
کیا کرے کوئی وصفِ بست و بود[2]
اور "فیضانِ غالبِ مغفور"[3]
وہ ترنم میں شعر خواں ہو کر
یاد آئے گا مدتوں ہم کو
متعدد کتب ہوئیں مطبوع
ان کے چھپنے کی ہو کوئی تدبیر
دلی، پنجاب، لکھنؤ، کشمیر
وہ علی گڑھ ہو، بمبئی کہ دکن
ہو گیا آج اک خلا پیدا
عرش ہوگا نہ دوسرا پیدا

نثر میں شانِ دلربائی تھی
ہر رباعی میں جانفزائی تھی
"آجکل"[1] کو دیا نیا معیار
اور افزوں کیا زباں کا وقار
واہ وا! نثر سادہ و پرکار
روحِ تحقیق بھی ہے جس پہ نثار
جانِ ہر محفلِ سخن ہونا
اس کا مقبولِ اہلِ فن ہونا
غیر مطبوعہ ہیں ابھی کچھ اور
صورتِ حال ہے یہ قابلِ غور
اس کا ماتم کہاں نہیں ہوگا؟
غم کا عالم کہاں نہیں ہوگا؟

شہرتِ ہند و پاک کا حامل
اس کو رکھے گی زندۂ جاوید
وہ عجب شان کا تھا پنجابی
اس کے اشعار کی ہے تابانی

★

---

[1] مرکزی وزارتِ اطلاعات و نشریات، نئی دہلی، کا اردو ماہنامہ "آجکل" جس کے مدیر عرش ملسیانی تھے۔
[2] ادبی شخصیتوں پر عرش صاحب مرحوم کے، مضامین کا مجموعہ۔
[3] "فیضانِ غالب" مولفہ حضرت عرش ملسیانی مرحوم۔ (مغموم)

محمد یعقوب اسلم
۴۹۱ - ایم - بی اسٹریٹ - بڑی پیٹ
وانم باڑی ۶۳۵۷۵۱

علامہ شبلی کی قومی شاعری

شبلی نعمانی ایک مورخ کا ذہن اور ایک ادیب کا قلم لے کر پیدا ہوئے تھے۔ جہاں تک شاعری ادب اور تاریخ نویسی کا تعلق ہے انھوں نے جس موضوع کو بھی ہاتھ لگایا۔ اس کا حق پوری طرح ادا کیا۔ شعر العجم لکھنے بیٹھے تو فارسی شاعری کا عہد بہ عہد نشوونما اور ارتقا کے ساتھ ساتھ فارسی زبان و ادب کی پوری تاریخ بھی نگاہوں کے سامنے آگئی۔ اور اس سے متاثر ہو کر عبدالسلام ندوی نے شعر الهند لکھی۔ اور حالی نے مقدمۂ شعر و شاعری، الفاروق، لکھنے کا ارادہ کیا تو قسطنطنیہ کے کتب خانوں سے کھوج کھوج کر وہ نادر مواد ڈھونڈھ نکالا جس نے خلیفۂ دوم حضرت عمرؓ کی زندگی کا ایک ایک گوشہ عیاں کر دیا۔ الفاروق، المامون وغیرہ، تصانیف ہی کے نتیجہ میں حالی نے یادگارِ غالب، اور حیات جاوید لکھی۔ اس طرح شبلی ایک ایسے کارواں کے سپہ سالار تھے۔ جن کے پیچھے کاروانِ علم و ادب نے اپنے عروج و ارتقا کی سیکڑوں منزلیں طے کیں۔

ذہنی طور پر شبلی کا اندازِ فکر تفصیلی اور مبسوط موضوعات کی طرف مائل تھا۔ وہ عام طور پر انھیں موضوعات کو ہاتھ لگاتے تھے۔ جو وسعت، گیرائی اور گہرائی کے حامل ہوں۔ غزل کی داخلی شاعری انھیں زیادہ اپیل نہ کر سکی۔ اگر شبلی نے تغزل پر ذرا بھی توجہ دی ہوتی اور غزل کی شاعری کی ہوتی تو اگر ان کی نثری تصانیف موجود نہ بھی ہوتیں تو بحیثیت شاعر ان کا مرتبہ ان کے موجودہ مرتبہ کے برابر ہی قرار پاتا۔ ویسے انھوں نے بہت سی فارسی اور اردو غزلیں بھی لکھی ہیں۔ اور ان کا کلیات شائع بھی ہو چکا ہے لیکن وہ سب تفنن طبع یا وقتی اثرات سے متاثر ہو کر لکھی گئی تھیں۔ فن شاعری میں کمال اور نام و نمود حاصل کرنے، یا ہیئت و اسلوب کے کسی تجربے کے طور پر یہ شاعری نہیں کی گئی تھی۔ بلکہ ایک وقتی لہر تھی جو وقتی طور پر اپنا تاثر چھوڑ کر ختم ہو گئی۔ اسی لئے نہ تو خود انھوں نے اس کو جمع کرنے کی طرف کوئی توجہ دی اور نہ دوسروں کو ترغیب۔ اور اس دور کی جو فارسی اور اردو غزلیں بچ گئی ہیں ان میں سے بھی تغزل سے زیادہ قطعات قصائد یا مسلسل نظموں کا ہی انداز پایا جاتا ہے۔ ان میں کسی واقعہ یا کیفیت کی مسلسل عکاسی کا عالم ہی دکھائی دیتا ہے ــــ واقعہ یہ ہے کہ جہاں تک موضوع کا تعلق ہے شبلی کی شاعری میں عام اور مروجہ مشرقی شاعری کے برخلاف، انگریزی اور مغربی شاعری کے اثرات ہی زیادہ نمایاں ہیں۔ دراصل شبلی کا مورخانہ اور فلسفیانہ ذہن انھیں ان روایتی چیزوں کی اجازت ہی نہیں دیتا تھا لیکن بدقسمتی یا خوش قسمتی سے شبلی ایک ایسے ادیب تھے۔ جو رومانی شاعر بھی تھے۔ ان کے مزاج میں زہد و اتقاء

کے ساتھ ساتھ رمزی اور رومانیت بھی رچی بسی ہوئی تھی یا وہ ایسے شاعر تھے، جنہیں حالات اور گرد و پیش کے تقاضو لئے ادیب بنا دیا ہو۔

شاعری کا ملکہ، جذبات کا تلاطم، اور طبیعت کی موزونی حالات کے دباؤ کے تحت مضمحل تو ہو سکتی ہے۔ لیکن یکسر فنا نہیں ہو جاتی۔ کیونکہ تخیل کے سمندر کی ایک ہی لہر کسی تند و تیز موج کی طرح حالات کے خس و خاشاک کو بہا لے جاتی ہے۔

شبلی کو اس بات کا پورا احساس تھا کہ زندگی ایک اکائی ہے اور اسے ایک اکائی کی حیثیت سے ہی تسلیم کرنا چاہیئے۔ ایک طرف ان کا علمی تبحر اور فلسفیانہ قابلیت ایک زاہد خشک؛ اور سنجیدہ مزاج فلسفی بننے کی تلقین کرتے ہیں، تو دوسری طرف ان کا شاعرانہ اور عاشقانہ مزاج انھیں مجبور کرتا ہے کہ زندگی کو اس کی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ زندگی کی طرح برتیں اور اس کے نشیب و فراز سے واقفیت حاصل کریں۔ یہ اور بات کہ اکثر اوقات پر انھیں اپنے علمی تبحر کا ہی زیادہ احساس رہا اور اس کے علاوہ اس دور کی سوسائٹی اور ماحول کے رجحانات بھی انھیں اس پر مجبور کرتے رہے۔ لیکن جذبۂ شاعری بہر حال اپنے اظہار کے لیے راہیں تلاش کرتا رہا اور بالآخر عام اور مروجہ موضوعات سے ہٹ کر ہی سہی۔ تاریخی اور سیاسی نظم گوئی کی صورت میں ابل پڑا۔

بقول عبد القادر سروری اپنی تاریخی تحقیقات سے اکثا کر شعر گوئی کی طرف متوجہ ہوئے تھے' اور یہ حالی کی غیر معمولی کامیابی ہی کا اثر تھا کہ شبلی کو اردو شعر کہنے کا خیال پیدا ہوا۔

شروع میں شبلی نعمانی بھی غالب ہی کی طرح اردو زبان میں لکھنے پڑھنے کو عار سمجھتے تھے جس کا اظہار انھوں نے سیرۃ النعمان میں کیا ہے۔ لیکن غالب ہی کی طرح شبلی کی نثر اور نظم نے انھیں مقبولیت اور حیات جاوید عطا کی۔

بقول علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم "اس زمانہ میں مولانا کا تخلص تسنیم تھا، خیال ہوتا ہے کہ اس زمانے میں منشی امیر اللہ صاحب تسلیم لکھنوی کی شہرت تھی۔ اسی لئے تسلیم کے وزن پر تسنیم کا تخلص پیدا کیا گیا۔ لیکن اس کے بعد انھوں نے خود اپنے نام شبلی کو تخلص قرار دیا۔" (کلیات شبلی ص۳)

بقول ڈاکٹر افتخار حسین شاہ۔ انھوں نے تسنیم اور شبلی کے علاوہ کشاف بھی تخلص کیا ہے۔

"شروع میں شبلی کا تخلص تسنیم تھا بعد میں شبلی اور کشاف کے نام سے بھی نظمیں اور غزلیں لکھیں۔"
(اقبال اور پیروئ شبلی ص۲۸)

لیکن یہ عام طور پر سیاسی نظمیں ہوا کرتی تھیں جو حالات حاضرہ پر طنز اور انگریزی حکومت کی غلط پالیسیوں۔ شاطرانہ چالوں اور اس دور کے بعض مسلمانوں کی ذہنی اور قومی بے راہروی کے سلسلہ میں لکھی جاتی تھیں۔ بعد میں جب کشاف کا بھید کھل گیا تو وصاف کے نام سے لکھنے لگے۔

مولانا سید سلیمان ندوی نے شبلی کی شاعری کو چار ادوار میں تقسیم کیا ہے۔

پہلا دور شروع سے ۱۸۸۳ء تک جب وہ علی گڑھ کالج گئے ہیں۔

دوسرا دور علی گڑھ کے قیام کا زمانہ ۱۸۹۸ء تک۔

تیسرا دور حیدر آباد کا زمانہ اور کچھ لکھنؤ کا یعنی ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۸ء تک۔

چوتھا دور ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۴ء تک جس میں انھوں نے وفات پائی۔

شبلی نے غزل، قصیدہ، مثنوی، مسدس، تقریباً ہر صنف سخن میں شاعری کی ہے۔ لیکن تاریخ ان کا خاص موضوع تھا۔ اور شاعری، اور اسلوب کے اعتبار سے بھی ان کی وہی نظمیں کامیاب کہی جا سکتی ہیں، جو تاریخ یا اس سے مماثل موضوعات۔ مثلاً سیاست اور معاشرت پر لکھی گئی ہیں۔

جہاں تک اسلوب اور تکنیک کا تعلق ہے، آزاد اور

حالی نے عام روائتی غزل گوئی سے انحراف کرتے ہوئے عملی اور شعوری طور پر جدید شاعری کے اسالیب کو رواج دیا تھا۔ اس تحریک کے سلسلے میں انھوں نے کرنل ہالرائڈ کے زیر اثر خارجی اسباب سے بھی روشنی حاصل کی تھی۔ لیکن جہاں تک شبلی کی نظم گوئی کا تعلق ہے اس میں ان کی اپنی داخلی اپج اور پسند کا دخل تھا۔ اور موضوع کے اعتبار سے بھی، چونکہ حالی کی بیشتر جدید انداز کی نظمیں عصری، تقاضوں کے زیر اثر لکھی گئی تھیں اس لیے ان کا دائرہ اثر بھی ایک محدود وقت تک کے لیے تھا۔ لیکن شبلی کے یہاں عصری تقاضوں کے علاوہ بیشتر نظمیں تاریخی موضوعات کی حامل ہیں اور ظاہر بات ہے کہ تاریخی کو ہر دور میں قدر و قیمت کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا۔

اس کے علاوہ حالی اور شبلی کے نظموں کے درمیان ایک اور فرق بھی پایا جاتا ہے۔ وہ یہ کہ حالی نظموں بلکہ بتمامتر شاعری میں ایک گہری سنجیدگی، واعظانہ متانت اور نہایت المناک سی اداسی کا پس منظر پایا جاتا ہے۔ جو ان کی طبیعت کی دردمندی اور اثر انگیزی کا خصوصی اور نہایت نمایاں جوہر ہے۔ اس کے برخلاف شبلی کی نظموں میں، دلکشی، رنگینی، رعنائی اور شگفتگی کے عناصر بدرجۂ اتم موجود ہیں اور یہ تصور شروع سے آخر تک ان کی تقریباً ہر نظم میں پایا جاتا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ مذہبیت اور عالمانہ سنجیدگی دونوں کی طبیعتوں میں شامل ہے لیکن حالی کی حساس طبیعت اور دردمند دل نے اس کا کچھ زیادہ ہی اثر قبول کیا تھا۔ اور ایک شاعر ہونے کے باوجود ان کے دربار میں ظرافت، بذلہ سنجی اور خوش مزاجی کے عناصر کو جگہ نہ مل سکی۔ اس کے برخلاف شبلی ایک شاعر سے زیادہ عالم اور فلسفی کی حیثیت سے مشہور ہونے کے باوجود ان چیزوں سے دامن نہ بچا سکے۔ — اس کے باوجود ان کی نظموں میں وہ رعنائی اور دلکشی

نہیں پیدا ہو سکی جو تخیل اور جذبہ کی صحیح آمیزش سے پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ ان کی شاعری کے موضوعات تخیل اور جذبہ کی پیداوار نہیں بلکہ تاریخ اور مطالعہ تاریخ کا عطیہ ہے۔ جہاں تک خلوص اور صداقت کا تعلق ہے وہ شبلی اور حالی دونوں کی نظموں میں پوری طرح جلوہ گر ہے۔

زبان کے اعتبار سے بھی شبلی کی نظموں کا مرتبہ حالی سے بلند ہے۔ حالی بسا اوقات انتہائی خشک اور نامانوس الفاظ استعمال کر جاتے ہیں۔ ان کی اکثر بحروں میں روانی اور شگفتگی کا فقدان ہوتا ہے۔ ترکیبوں میں تعقید عام ہوتی ہے۔ لیکن شبلی نے نہایت رواں اور شگفتہ بحریں استعمال کی ہیں، اور خاص کر مثنویوں میں تو الفاظ اور ترکیبوں کا استعمال اس طرح کرتے ہیں کہ تعقید برائے نام بھی باقی نہیں رہتی اور وہ بات جو شعر کی تعریف کے سلسلہ میں مشہور ہے کہ اگر اس کی نثر کرنا چاہیں تو نہ کر سکیں، شبلی کے اشعار پر پوری طرح صادق آتی ہے۔ یعنی ان کی ترکیب اتنی چست اور صحیح ہوتی ہے کہ اس میں نثر کی سی شان پائی جاتی ہے۔ اور اس کی دوبارہ نثر کرنا ناممکن ہے اور یہ شاعر کی قدرت زبان کی نشاندہی کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔ مثنوی صبح امید کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

کیا یاد نہیں ہمیں وہ ایام
جب قوم تھی مبتلائے آلام

وہ قوم کہ جان تھی جہاں کی
جو تاج تھی فرق آسماں کی

تھے جس پہ نثار فتح و اقبال
کسریٰ کو جو کر چکی تھی پامال

گل کر دئیے جہ اغ جس نے
قیصر کو دیئے تھے داغ جس نے

اس کے برخلاف حالی کی ایک مثنوی کا آغاز ملاحظہ

فرمائیے۔ اور دونوں کی بندشوں اور ترکیبوں میں جو تعقید
پائی جاتی ہے۔ اس کا موازنہ کیجیے۔

تھا کسی ملک میں ایک دولت مند
حق نے تین اس کو دیے تھے فرزند
دور و نزدیک تھا گھر گھر چرچا
باپ بیٹوں کی جواں مردی کا
ہو چکا عمر کا جب سرمایا
ایک دن باپ کے جی میں آیا

شبلی نے فارسی ادب اور شاعری کا گہری نظروں سے
مطالعہ کیا تھا اور ان کی فارسی غزل گوئی بھی بے مثال ہے۔
اسی طرح ان کی نظموں میں بھی فارسی الفاظ اور تراکیب
بے کھٹکے داخل ہو جاتے ہیں۔ اور اپنی تاریخی نظموں میں
انھوں نے صحیح روایات کا بھی پورا پورا خیال کیا ہے اور اکثر
مقامات پر روایات کو ہو بہو اردو کا جامہ عطا کرنے کی کوشش
کی ہے۔ لیکن ہر جگہ انھوں نے اس بات کا خیال رکھا ہے
کہ کسی طرح نظم میں ثقالت یا جھول نہ پیدا ہو۔ بحروں اور
قافیوں کے انتخاب میں وہ انتہائی محنت سے کام لیتے ہیں۔
اور عام طور سے غیر معروف زمینوں کا انتخاب کرتے ہیں جس کی
وجہ سے ان کی نظمیں چکبست اور اقبال کی نظموں کی طرح
رواں سلیس اور شیریں بن جاتی ہیں۔ شبلی اور چکبست میں
ایک اور بات جو قدر مشترک کے طور پر پائی جاتی ہے وہ
یہ کہ ان دونوں کا سرمایۂ کلام نہایت مختصر اور موضوعات کا
دائرہ انتہائی محدود ہے۔ شبلی کو اپنے قومی واقعات اور
قومی شخصیتوں کے کارنامے نظم کرنے میں لذت ملتی تھی اور
چکبست بھی اس وصف میں پوری طرح ان کے ہم نوا ہیں
اور جہاں تک سلسلۂ کلام میں ربط اور واقعات میں روانی
کا تعلق ہے شبلی کی نظمیں اپنی مثال آپ ہیں۔

اسلوب کے اعتبار سے بھی شبلی کا موازنہ حالی، اکبر
اور اقبال کی بہ نسبت چکبست سے زیادہ آسانی کے ساتھ
کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ حالی کا انداز ایک مبلغ اور ناصح کا
ہے۔ تو اقبال کا فلسفیانہ۔ اور شبلی ایک فلسفی ہوتے ہوئے
بھی فلسفیانہ شاعری سے گریز کرتے تھے۔ اور شاعری اور
فلسفہ کو الگ الگ اقدار کے روپ میں دیکھنا پسند کرتے
تھے۔ اس کا برخلاف چکبست کی شاعری اپنے موضوعات
اور ہیئت و اسلوب کے اعتبار سے بھی شبلی کی قومی شاعری
سے زیادہ قریب محسوس ہوتی ہے۔

شبلی کی اکثر تصنیفات کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ وہ
پہلے موضوع کے طور پر کسی ہیرو کا انتخاب کر لیتے ہیں پھر اس
کے متعلق مواد اور دلائل جمع کر کے انھیں ترتیب دے
دیتے ہیں۔ الفاروق، المامون، سیرۃ النعمان اور
موازنۂ انیس و دبیر اسی طرز کی تصانیف ہیں اور یہی
انداز فکر ان کی قومی شاعری میں بھی پایا جاتا ہے۔ اسی
غرض کو پیش نظر رکھ کر انھوں نے تاریخ اسلام کے منتخب
واقعات کو نظم کے پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ اہل بیت کی
زندگی، مساوات، عدل جہانگیری، وغیرہ نظمیں اسی انداز
فکر کی حامل ہیں۔ اور بعد میں جو طویل اور مبسوط نظمیں
شاہ نامۂ اسلام کے نام سے حفیظ جالندھری اور عامر عثمانی وغیرہ نے
لکھیں۔ کیا عجب ہے کہ وہ شبلی کی انھیں نظموں سے متاثر ہو کر
لکھی گئی ہوں۔

ان نظموں کے لیے شبلی نے رواں اور سلیس بحریں انتخاب کیں
ہیں جو اکثر مقامات پر ردیف کی گراں باری بھی برداشت نہیں کر سکیں۔
ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ موضوعات، ان کے خاص ذوق کی چیزیں
ہونے کی وجہ سے انھوں نے یہ نظمیں جھوم جھوم کر لکھی ہیں۔ چند نظموں
کے شروع کے اشعار ملاحظہ فرمایئے۔

کافروں نے یہ کیا جنگ احد میں مشہور
کہ پیمبر بھی ہوئے کشتۂ شمشیر و دو دم
ہو کے مشہور مدینہ میں جو پہنچی یہ خبر
ہر گلی کوچہ تھا ماتم کدۂ حسرت و غم

(ایثار کی اعلیٰ ترین نظیر)

ایک دن حضرت فاروق نے منبر پہ کہا
میں تمھیں حکم جو کچھ دوں تو کروگے منظور
ایک نے اٹھ کے کہا یہ کہ نہ مانیں گے کبھی
کہ ترے عدل میں ہم کو نظر آتا ہے فتور

(عدل فاروقی کا ایک نمونہ)

قصر شاہی میں کہ ممکن نہیں اوروں کا گزر
ایک دن نور جہاں بام پہ تھی جلوہ فگن
کوئی شامت زدہ رہگیر ادھر آنکلا
گرچہ تھی قصر میں ہر چار طرف سے قدغن

(عدل جہانگیری)

افلاس سے تھا سیدۂ پاک کا یہ حال
گھر میں کوئی کنیز نہ کوئی غلام تھا
گھس گھس گئی تھیں ہاتھ کی دونوں ہتھیلیاں
چکی کے پیسنے کا جو دن رات کام تھا

...... سچے ادیب اور شاعر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ انھیں باتوں کو اپنے قاری کے سامنے پیش کرتا ہے جن کی صداقت پر خود اس کو پورا اعتماد ہو۔ یہ بات کسی اور کے بارے میں سچ ہو یا نہ ہو، لیکن شبلی پر پوری طرح صادق آتی ہے۔ انھوں نے خلیفۂ دوم حضرت عمرؓ، امام اعظم ابو حنیفہؒ اور میر انیس کی زندگیوں اور ان کے کارناموں سے جو تاثر قبول کیا تھا۔ اسی کو انھوں نے اپنے قاری کے سامنے پیش کیا۔ اور اس انداز میں پیش کیا کہ قاری بھی ان کے معروضات اور دلائل سے پوری طرح مطمئن ہو جائے۔ اور یہی حال ان کی شاعری کا بھی ہے۔ حالی نے شاعری کے لیے جذبہ کی صداقت کو ضروری قرار دیا تھا۔ اور شبلی کے جذبات کی صداقت اور ان کے کلام کے خلوص سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔

★

پریم وار برٹنی
۱۱۷۹۔ سیکٹر ۸ سی، چنڈی گڑھ۔
۱۶۰۰۰۸

غزل

سچائی کے اجلے گھر میں اتنا گھور اندھیارا ہے
ہر کویتا کا چہرہ کالے شیشوں سے گھبرائے

اندر، باہر اندھیارا ہے پریم نگر میں ہر سو
کالے مندر کی چوکھٹ پر جوگن جوت جگائے

جیسے آنکھ مچولی کھیلیں لمبی بحر کی غزلیں
یوں کاغذ پر لہراتے ہیں تیری زلف کے سائے

جیون بھر کے ساتھی تو ہیں، بعد کی باتیں چھوڑو
تن من کی سوندھی مالی نے کیا سنجوگ ملائے

شام سلونی تن ڈھلنے تو بھڑکے اگن جو الا
پربت پربت برف گھلے اور دریا شور مچائے

گوری دھوپ کے ماتھے پر ہے زرد خزاں کا جھومر
اس الھڑ بیرہ کے پاؤں میں مہندی کون لگائے

یوں نس نس میں رینگ رہا ہے تیرا درد نشیلا
جیسے چندن کے پیڑوں سے ناگ لپٹتا جائے

میری کویتاؤں سے سچ مچ پیار اگر ہے اس کو
ننگے پیروں دھوپ میں چل کر میرے گھر تک آئے

پریتم میری آنکھوں نے دیکھا ایسا روپ بھی جس سے
جنم جنم کے پاپ دھلیں اور من نرمل ہو جائے

ساغر مہدی
سید واڑہ بہرائچ یو۔پی ۲۷۱۸۰۱

جعفر عسکری
۱-نوراللہ روڈ۔ الہ آباد

غزلیں

…گی نذرِ خرابات ہے شہروں شہروں
رقص میں گردشِ حالات ہے شہروں شہروں

…کو کیا جانے ہے کس شہرِ نگاراں کی تلاش
یوں تو ہر اک سے ملاقات ہے شہروں شہروں

…ہی درد ہے چھایا ہوا قریہ قریہ
ایک ہی رنگ کی ہر بات ہے شہروں شہروں

…لوگ بھی ملتے ہیں شناسا کی طرح
یہ عجب طرح کی سوغات ہے شہروں شہروں

…مرے شہر مرے حالِ پریشاں پہ نہ جا
ایک ہی صورتِ حالات ہے شہروں شہروں

…اک ساتھ لیے پھرتی ہے بستی بستی
اپنے ہاتھوں میں کوئی ہات ہے شہروں شہروں

…میں ڈوبے ہوئے گیت تڑپتی غزلیں
ہم فقیروں کی یہ سوغات ہے شہروں شہروں

…ہی ابر برستا ہے ہر اک بستی پہ
ایک ہی طور کی برسات ہے شہروں شہروں

ہر طرف اہلِ جنوں رقص کناں ہیں ساغر
کس دوانے کی مدارات ہے شہروں شہروں

جب سے فضائے شہر ہوئی سوگوار ہے
شہروں کے آئینوں پہ بھی غم کا غبار ہے

ہو جائیں تیز بادِ مخالف کی آندھیاں
صحرائے آرزو کا شجر پائدار ہے

میں خیمۂ سکوت میں بیٹھا ہوں بے خبر
برپا اگرچہ شہر میں اک خلفشار ہے

طوفاں فصیلِ شہر کے نزدیک آ چکا
مجنوں ابھی اسیرِ خمِ زلفِ یار ہے

اب چاک ہو چکا ہے لبادہ قیاس کا
خوش رنگ ساعتوں کی قبا تار تار ہے

معدوم ہو گیا ہے تعفن فضاؤں کا
گزرا جدھر سے قافلہ مشک بار ہے

وارفتگئ شوق سے جعفر گریز کر
مانا کہ دشتِ شوق بڑا خاردار ہے

شمیم صادقہ
شعبۂ اردو گورنمنٹ ویمنس کالج مریم منزل
گردنی باغ۔ پٹنہ ۸۰۰۰۰۲

(افسانہ)

مرگ ترشنا

میں نے ان لوگوں کا ہمیشہ مذاق اڑایا ہے جو عمر کی اک خاص حد پار کر لینے کے بعد عشق کے چکر میں پڑ جاتے ہیں — گھر میں بیوی بچے موجود — اور حضرت کسی کیفیٹیریا کے کیبن میں اپنی زندگی کے حالات کی بے بسی کا یقین دلانے میں معروف ہیں۔

میرا خیال ہے — اگر واقعی کسی نے کسی کو چاہا ہے یا تو اسی سے شادی کر لے۔ یا پھر شادی کے بعد ذہن کو اس بھوت سے آزاد کر لے جسے عشق کہتے ہیں۔

میں خود بے حد پریکٹیکل ہوں — مجھے اب بھی اپنی نوعمری کا وہ دور یاد ہے۔ جب صبا سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ وہ میرے پڑوس میں، اپنے والدین کے ساتھ نئی نئی آئی تھی۔

سونی سونی، بڑی بڑی اداس آنکھیں، خاموش لبوں پہ ہزارہا داستانوں کا عنوان، اور چلتے چلتے اچانک چونک کر گردن جھٹک دینا۔ جیسے خود سے ہی نجات کی طلبگار ہو — شادی اور غمی کے موقعوں پر اسے میں نے قریب سے دیکھا اور خود کو ہار گیا۔

مجھے لوگوں نے بتایا۔

"صبا کی شادی ہو چکی ہے — مگر اس نے شوہر سے طلاق لے لی ہے کیونکہ وہ پاگل تھا"—

مجھے ایک لمحہ کو جھٹکا سا لگا، جیسے مخملی روشوں پہ ننگے پاؤں ٹہلتے ہوئے ببول کا کانٹا تلوؤں میں چبھ گیا ہو۔

مگر روش، — بہت دور تک سرسبز و شاداب تھی!

میں نے کانٹا نکال پھینکا اور اپنے تلوے پہ جمے ہوئے خون کے قطرے کی طرف دیکھنے کے بجائے کانٹے کو ہمدردی کی نظروں سے دیکھنے لگا۔

بیچاری صبا! — کیا زندگی کی مسکراہٹوں پر اس کا کوئی حق نہیں؟

مجھے ٹیگور کی دنودنی یاد آئی! —

میں سوچنے لگا — گوتم کا فلسفہ کتنا مقدس ہے!۔

میں نے کلام پاک کو ہاتھوں میں لے کر کہا —

"میں صبا سے شادی کرنا چاہتا ہوں!"

لوگوں نے میری طرف حیرت سے دیکھا۔ جیسے میرے سر پہ سینگ نکل آئے ہوں۔ مگر کوئی بھی 'لفظ' مجھ تک نہ پہنچ سکا۔ شاید اس لیے بھی کہ میرے گھر کا ایک ایک فرد، اپنے دائرے کے اندر اپنے نظریات کا عصا لیے۔ اسی راستے پہ الگ الگ چلا کرتا ہے جسے "آئیڈیلزم" کہتے ہیں! —

دعوتی کارڈ چھپوائے گئے — چھوٹی۔ بڑی ایک ایک رسم ادا کی گئی۔ گھر مہمانوں سے بھر گیا۔ وسیع و عریض آنگن پہ سرخ شامیانے کی چھت ڈال کر بہنوں نے نیگ لیا۔ بہنوں کے شوہروں کی سفید قمیض نیلے پیلے رنگوں سے تر بتر ہو کر زندگی کی بہاروں کا خیر مقدم کرنے کو لہلہا اٹھیں — برات، روشنی اور موسیقی کے بیچ روانہ ہوئی اور پھولوں سے سجی کار میں دلہن کو لے کر واپس آ گئی۔

صبا کو گھی کے چراغوں کی روشنی میں اتارا گیا۔

سب کچھ ویسے ہی ہوا جیسے ہوا کرتا ہے اور جیسے ہونا چاہیئے تھا — سجا سجایا کمرہ بھی وہی تھا۔ دلہن بھی تھی۔ سہاگ رات کی مدھم

سرگوشیاں بھی وہی تھیں !۔

لیکن جیسے جیسے رات گزرتی گئی ـــــ مجھے احساس ہونے لگا جیسے میں پل پل ـــــ لمحہ لمحہ ہارتا جا رہا ہوں ! ـــــ

"کیا دلہن یہی ہوتی ہے ؟" ـــــ

میرا ذہن بار بار سوالی ہو کر میری انا کا دامن تھام لیتا !۔

صبا مجسم سپردگی ہے۔ احتجاج کیوں نہیں اس میں! ـــــ

پہلی مرتبہ جب چور چوری کرنے نکلتا ہے اور اتفاقاً دروازہ کھلا ہوا ملتا ہے تو اسے خوشی ہوتی ہے ـ لیکن جب وہ اپنے فن کا ماہر ہو جاتا ہے تو تالا یا دروازہ توڑ ڈالنے سے ہی اس کی انا کو تسکین ملتی ہے۔ اس کا مجھے پتہ نہ تھا !!

میں نے کتابوں میں پڑھا تھا ـــــ میں نے سنا تھا ! ـــــ

سہاگ رات کا لمحہ لمحہ بڑا کیف آ‌ذیں ہوتا ہے۔ مگر جیسے کہیں کچھ ادھورا سا تھا !۔

میں صبا کی طرف دیکھنے لگتا ! جو میرا ہاتھ تھامے، صاف ستھرے زندگی کے راستے پہ لے چلی تھی ! ـــــ

اور میرے اندر ایک انجانی سی گرہ پڑ گئی تھی ! ـــــ

لیکن مجھے اپنے نظریے اور اپنے اصول بے حد عزیز تھے ـ اور پھر میں اپنی شکست کا از خود اعلان بن کر مذاق کا نشانہ کیوں بنتا !ـ

صبا بڑی فرماں بردار ـــــ اور خدمت گزار بھی تھی ! جیسے جیسے دن گزرتے گئے میں صبا کا عادی ہوتا گیا ! ـــــ میں روٹھتا ناراض ہوتا، وہ مجھے منا لیتی ـــــ میں معمولی معمولی باتوں پہ خفا ہو جاتا، وہ خاموشی سے اپنا کام کیے جاتی اور رات کے اندھیرے میں چپکے سے آ کر میرے سینے سے چپک جاتی ـــــ میں اندر اندر جھنجھلا اٹھتا ـ جیسے صبا میری کمزوری ہو ـ مگر ذہن کسی فیصلہ کن نتیجے پہ پہنچے بغیر تھک جاتا ! ـــــ

اب تو صبا میرے کئی بچوں کی ماں بن چکی ہے۔ شاید میری اور اسکی عمروں میں کوئی خاص فرق نہیں۔ لوگ تو کہتے ہیں۔ وہی مجھ سے کچھ بڑی ہے ـــــ مگر میں طبعی عمر پہ کبھی غور نہیں کرتا ـــــ کیونکہ میری ذہنی عمر اس سے بہت چھوٹی ہے ـــــ اس کا اعتراف مجھے چونکا کر جھنجھوڑ جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ میں نے سن رسیدہ لوگوں کی صحبت اختیار کر لی ہے۔ مجھے اپنے ہم عمر دوستوں سے وحشت ہونے لگتی ہے۔ شاید میں ان سے خوفزدہ ہوں کہ کہیں ان کا کوئی بے باک قہقہہ، کوئی کھلا ہوا ریمارک یا کوئی عام سی بات ہی میرے اندر کے بند دریچوں کو کھول نہ دے اور میں شرمندگی کے بوجھ تلے دب کے نہ رہ جاؤں۔ ہاں، عمر رسیدہ لوگوں کی صحبت نے مجھے جینے کے کئی وسیلے دیے۔ بیٹیوں کے لیے فکس ڈیپازٹ کرنا ـــــ ہر بچے کے نام رکرنگ ڈیپازٹ الگ کرنا ـــــ شام کے بعد رات گئے تک بچوں کو ڈانٹ ڈانٹ کر پڑھانا ـ تقاضے کے سوا جا! سیلون کے چکر لگانے کے بجائے صبح اٹھ کر شیو کرنا۔ اخبار پڑھنا ـــــ سبزی خرید لانا وغیرہ وغیرہ۔

شاید زندگی کی حقیقت یہی ہے ! ـــــ

گویا میں نے خود کو مطمئن کر لیا تھا ! ـــــ

دیکھتے دیکھتے میرے بڑے لڑکے نے میٹرک پاس کر لیا ہے۔ آج ہی تو اس کا ریزلٹ آیا ہے ـــــ فرسٹ ڈویژن میں پوزیشن! معمولی بات نہیں ـــــ گھر مبارک باد دینے والوں سے بھر گیا ہے۔ صبا نے ڈھیروں مٹھائیاں منگا کر تقسیم کی ہیں ـــــ لیکن میرے بیٹے کی ضد ان سب خوشیوں سے الگ تھلگ سی ہے ـــــ وہ بار بار کہتا ہے۔

"پا ـــــ اپنی کلاس میس کے پاس مٹھائی لے کر آج ہی چلیں گے" ـــــ

میں اسے ٹالتا ہوں ـ مگر شاید میرے الفاظ میں اب زور نہیں۔ زندگی کا لمحہ لمحہ خود سے چھین کر میں نے جنھیں دیا ہے، وہ یہی بچے تو ہیں ـ ان کی امانت انھیں سے چھین کر میں کیا کروں گا۔

"چلو۔ تیار ہو جاؤ" ـــــ میں نے کہا۔

وہ خوشی خوشی تیار ہونے لگتا ہے ـ میں بھی تیار ہوتا ہوں۔۔ صبا پوچھتی ہے۔

"اتنے لوگ آئے ہیں ـ اور بھی آئیں گے ـ کیا آج ہی جانا ضروری ہے ؟" ـــــ

"ہاں — یہ میرے بیٹے کی خوشی ہے !" —

اور ہم دونوں باپ بیٹے ماضی اور مستقبل کے خواب ایک دوسرے کے کندھوں پہ ڈال کر' مٹھائی کا بڑا سا ڈبہ لے کر اس کی کلاس مس کے کمپاؤنڈ تک پہنچ گئے ! — میں نے کال بیل پہ اپنی انگلی رکھ دی ہے۔

میرا بیٹا خوشی سے میری طرف دیکھ کر اپنے کپڑے کی کریز ٹھیک کرنے لگتا ہے۔

دروازہ کھلتا ہے۔

سرخ کنارے کی سفید ساری۔ سرخ بلاؤز۔ کھلے ہوئے ڈھیر سارے بکھرے بکھرے بال —

"گڈ ایوننگ مس !" میرا بیٹا کہہ اٹھتا ہے۔

"او — ہلو — گڈ بوائے" — وہ میری طرف مسکرا کے دیکھتی ہوئی ' کانگریچولیشنز' کہتی ہے اور دروازے سے ایک طرف ہٹ جاتی ہے۔

میرا بیٹا مٹھائی کا ڈبہ اس کی جانب بڑھا دیتا ہے — وہ تھینکس کہتی ہوئی لے لیتی ہے — اس نے ہمیں کافی پیش کی پھر وہ گھنٹوں باتیں کرتی ہے۔ میرے بیٹے کی شرارتوں اور ذہانتوں سے متعلق — اس کے فیوچر اور داخلے سے متعلق — یہاں کے کالجز کے ماحول سے متعلق — لیکن شاید میں کچھ بھی نہیں سن پاتا ہوں — کیونکہ میرے ذہن میں ٹیگور کی ان دیکھی دلہن کا سراپا لرزاں ہے۔ اور میں یوں ہی سراسیمہ سا لوٹ آتا ہوں۔

راستے میں بھی خاموش اور نڈھال سا ہوں۔ جیسے پُروا ہوا کے جھونکوں نے کسی بہت پرانے زخم کو کرید دیا ہو ——

اور میں اپنے بیٹے سے پوچھ اٹھتا ہوں ! —

"تمہاری مس کا نام کیا ہے بیٹے ؟" —

وہ بشاش سا جواب دیتا ہے —

"مس سیما — ہاؤ سویٹ از شی ؟" —

اور یہ نکون میرے اندر تک اتر آتا ہے۔ "مس سیما۔ سویٹ" —

میرے بیٹے نے بہت سے کالجوں کے فارم لا کر مجھے دیئے ہیں — اور میں اسے بتائے بغیر مس سیما کے یہاں بھی فارم لے کر پہنچ جاتا ہوں —

وہ مجھ سے ویسے ہی باتیں کرتی ہے ' مشورے دیتی ہے۔ پھر جب کمزمیشن ہر کالج سے کال لیٹر آ جاتا ہے تو بھی میں مس سیما سے ہی مشورہ لیتا ہوں۔

داخلے کے بعد بھی — اور اس کے بعد بھی — مصروف زندگی کا پل پل نئے جواز دیتا ہے۔

اور چند مہینے بعد ..... اچانک میں نے مس سیما سے کورٹ میرج کر لی — لیکن سیما ' صبا کی طرح نہیں۔ اور مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے برسوں کا چبھا ہوا کانٹا نکل جانے کے بعد کانٹے کی جگہ خالی خالی رہ گئی ہے۔

★

مبین اقوامی سال اطفال ۱۹۷۹ء کے موقع پر نیا دور بھی ایک خصوصی نمبر شائع کرنے جا رہا ہے۔ یہ نیا دور کا نومبر۔ دسمبر ۱۹۷۹ء کا مشترکہ شمارہ ہوگا۔

۱۔ گورنر اتر پردیش شری جی۔ ڈی تپاسے گزشتہ ۲۵ اگست کو سکریٹریٹ سے متصل مسجد میں لوگوں سے عید ملتے ہوئے

۲۔ یوپی اسمبلی میں تحریک عدم اعتماد کی ناکامی کے بعد وزیر اعلا شری بنارسی داس چند

۳۔ بری فوج کے سربراہ جنرل او۔پی ملہوترہ، بحری فوج کے سربراہ ایڈمیرل آر۔ایل۔پریرا اور ہوائی فوج کے سربراہ ایرچیف مارشل آئی
ایچ لطیف نے وزیر اعظم چودھری چرن سنگھ سے گزشتہ یکم اگست کو نئی دہلی میں ملاقات کی

۔ وزیر اعلا شری بنارسی داس ۲۹ر اگست کو امین آباد لکھنؤ میں لوگوں سے عید ملتے ہوئے

وزیر اعلا شری بنارسی داس نے ۱۶ اگست ۱۹۷۹ء کو مسلم مسافر خانہ (چار باغ۔ لکھنؤ) میں افطار پارٹی میں شرکت کی۔ یہ تصویر اسی موقع کی ہے

وزیر اعلا شری بنارسی داس کی جانب سے اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس لکھنؤ میں ۱۲ اگست ۱۹۷۹ء کو شہر کے ممتاز مسلم شہریوں کو روزہ افطار کرایا گیا۔ جہاں مسلمانوں نے روزہ افطار کے بعد نماز مغرب بھی ادا کی۔ یہ تصویر اسی موقع کی ہے

وزیر اعلا شری بنارسی داس ۱۳ اگست کو ریاستی للت کلا اکاڈمی لکھنؤ میں وزارت اطلاعات و نشریات حکومت ہند کی جانب سے منعقدہ "بھارت کے بچے" نامی نمائش کا افتتاح کرنے کے بعد نمائش دیکھتے ہوئے

ممتاز ہندی صحافی اور ادیب شری اشوک جی کے انتقال پر ۲۰ اگست ۱۹۷۹ء کو ہندی بھون لکھنؤ میں منعقدہ تعزیتی جلسہ میں لکھنؤ کے دانشوروں، ادیبوں اور صحافیوں نے انھیں خراج عقیدت پیش کیا۔ یہ تصویر اسی موقع کی ہے

عبدالاحد خاں خلیل
نعمت اللہ روڈ۔ امین آباد۔ لکھنؤ۔ ۱

غزل

علاج دردِ دل خود دردِ دل ہے
طبیعت کیا کہیں کیوں مضمحل ہے

کوئی آدابِ فرزندی سکھائے
وقارِ ابنِ آدم پا بہ گِل ہے

وہی سامانِ بربادی ہوا ہے
جسے سمجھا تھا اپنا تختِ دل ہے

کیا تھا جس کو رشکِ مہرِ تاباں
وہی ذرہ عذابِ مستقل ہے

مصاحب آپ کا جب سے ہوا ہوں رقیؔ
عجب مشکل میں جانِ مضمحل ہے

جو کچھ کہیے تو ناراضی کا خطرہ
جو چپ رہیے ضمیر اپنا خجل ہے

مسلسل صورتیں زیر و زبر ہیں
عجب بستی جہانِ آب و گِل ہے

چلی تو آئی خستہ جاں کے گھر تک
بلائے آسماں خود منفعل ہے

مسیحایوں تو کہنے کو میں کہہ دوں
مگر بے التفاتی جاں گسل ہے

بہ فیضِ بے دلی الحمد للہ
مرا زخمِ جگر کچھ مندمل ہے

خلیل اپنا یہ اندازِ تغزل
رہینِ گلفشانئ متصل ہے

بشیر فاروقی
اکھاڑہ کریم اللہ شاہ مراد علی لین، لکھنؤ

غزل

وادیٔ بے نام کی جانب رواں ہو جائیں گے
ہم جو منزل کا نشاں ہیں بے نشاں ہو جائیں گے

پیار خوشبو کی طرح پھیلے گا کیا معلوم تھا
کچھ نہ کہنے پر بھی افسانے بیاں ہو جائیں گے

دوستو! دل میں محبت کی کرن رہنے بھی دو
کل تو ہم یوں بھی چراغوں کا دھواں ہو جائیں گے

میری سانسوں میں تو اب بھی ہیں وہی چنگاریاں
تم تو کہتے تھے کہ غم آرامِ جاں ہو جائیں گے

توڑ ہی دے گا فصیلِ صبر کو احساسِ غم
اب مرے غم میرے چہرے سے عیاں ہو جائیں گے

کم سے کم یہ سوچتا تو چھوڑنے کا اب وہ شخص
وہ جبیں چاہے وہ ذرے کہکشاں ہو جائیں گے

اب وہ منزل آگئی ہے اب جو ہم پیچھے ہٹے
اب جو ہم ٹھہرے، تو گردِ کارواں ہو جائیں گے

میں جب اس عہدِ ترقی پر اٹھاؤں گا قلم
جانے کتنے چاند سے چہرے دھواں ہو جائیں گے

تم غمِ محبوب کی عظمت کو سمجھا تو بشیر
داغِ دل خالِ لبِ شعلہ رخاں ہو جائیں گے

سید غلام مرتضیٰ
انٹرنیشنل کمرشیل انسٹی ٹیوٹ
بہار شریف ضلع نالندہ ۔ بہار

اختر اورینوی ایک مطالعہ

اردو ادب کی عظیم شخصیتوں میں اختر اورینوی کی شخصیت کو ایک خاص اہمیت، انفرادیت اور عظمت حاصل ہے۔ وہ ایک ہمہ گیر اور ہمہ جہت فکر و فن کے مالک تھے۔ انھوں نے تخلیق و تنقید دونوں میدانوں میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ انھوں نے اردو شعر و ادب کو فکر کی گہرائی، مشاہدات کی وسعت اور خیالات کی بلندی عطا کی ہے۔ درحقیقت ان کی شخصیت ایک پہلودار تراشیدہ ہیرے کی مانند تھی۔ وہ بیک وقت ایک عظیم افسانہ نگار، ایک دیدہ ور نقاد، ایک پروقار شاعر، ایک کامیاب ناول نگار اور ڈراما نگار رہے۔ وہ ایک طویل مدت تک گیسوئے ادب کو خلوص و محبت، عمل پیہم اور نیرنگِ خیال سے سنوارتے اور نکھارتے رہے۔

اختر اورینوی کی پیدائش ۱۸ راگست ۱۹۱۱ء میں قصبہ اورین ضلع مونگیر (بہار) کے ایک ذی رتبہ سادات گھرانے میں ہوئی۔ عمر کا ابتدائی حصہ قرب و جوار کے شاداب پہاڑی علاقوں میں گذرا۔ ابتدائی تعلیم بھی اسی ماحول و فضا میں ہوئی۔ اس کے بعد ایک عرصہ تک اپنے والد بزرگوار کے ساتھ چھوٹا ناگپور میں رہے اور ثانوی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ چھوٹا ناگپور کے سرسبز و شاداب نظاروں نے ان کے دل و دماغ پر بڑا گہرا اثر ڈالا۔ یہی سبب ہے کہ اُن کے بیشتر افسانوں میں ناگپور اور مونگیر کی دیہاتی زندگی کے گہرے نقوش ابھرتے نظر آتے ہیں۔ ثانوی تعلیم ختم کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کی غرض سے وہ پٹنہ آئے پٹنہ کالج سے بی۔ اے۔ آنرز کا امتحان امتیازی شان کے ساتھ پاس کیا۔ ۱۹۳۶ء میں اردو ادب میں ایم۔ اے کیا اور پوری یونیورسٹی میں اوّل آکر طلائی تمغہ حاصل کیا۔ ۱۹۳۸ء میں پٹنہ کالج میں اردو کے لکچرر مقرر ہوئے۔ پھر تحقیقی مقالہ "بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا" مکمل کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ۱۹۵۳ء میں پروفیسر ہوئے اور ۱۹۶۳ء تک اس عہدے پر فائز رہے۔ پھر ۱۹۶۳ء میں یو۔ جی۔ سی۔ میں۔ پروفیسرشپ ملی اور تادم حیات اس عہدے پر فائز رہے۔

اختر اورینوی نے تخلیق و تنقید دونوں میدان میں بیک وقت قدم رکھا اور کامرانی کے ساتھ ارتقائی منزلیں طے کرتے رہے۔ رفتہ رفتہ تخلیقی اور تنقیدی دونوں ادب میں اپنا ایک انفرادی مقام بنا لیا۔ اختر اورینوی نے جس وقت افسانہ نگاری اور مقالہ نگاری شروع کی اس وقت ادبیات عالم میں دو طرح کے نظریات عمل پذیر تھے۔ ایک "ادب برائے ادب" کا نظریہ اور دوسرا "ادب برائے زندگی" کا نظریہ۔ "ادب برائے ادب" کا نظریہ اردو کے تخلیقی اور تنقیدی ادب پر گہرا اثر ڈال چکا تھا۔ اس مکتب خیال نے بڑے بڑے رومانی و جمالیاتی ادیب و نقاد پیدا کیے۔ مثلاً سدرشن، علی عباس حسینی، اعظم کریوی، مجنوں گورکھپوری، نیاز فتح پوری، سجاد یلدرم وغیرہ وغیرہ لیکن دوسری طرف اسی زمانے میں "ادب برائے زندگی" کا نظریہ بھی زور پکڑ رہا تھا۔ اس نظریہ کی تبلیغ و اشاعت شروع ہو چکی تھی۔ یہ نظریہ انقلاب روس کی دین ہے۔ اس خیال و نظریہ کی بنیاد دراصل مارکس اور اینگلز کی جدلیاتی مادیت پر قائم ہے جس میں حرکت و عمل اور ترقی و ارتقا کی خاصیت مضمر ہے

مارکس نے اپنے خیالات کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مادی زندگی میں پیداوار کا طریقہ ہی عام طور پر زندگی کے سماجی، سیاسی اور ذہنی طریقۂ عمل کو متعین کرتا ہے۔ انسان کا شعور اس کی سماجی حقیقت کو متعین نہیں کرتا بلکہ سماجی حقیقت شعور کو متعین کرتی ہے۔ حقیقتاً یہ رجحان تین کے نظریۂ نسل، زمانہ اور ماحول کا نتیجہ ہے جو بالآخر ہرڈر کے قومی اور لسانی نظریہ سے مل جاتا ہے۔ اس نظریہ نے سماجی نقطۂ نظر سے پورے ادبیات عالم کو متاثر کیا۔ ہندستان میں اس ادب و نظریہ کو لانے اور پھیلانے کا شرف سجاد ظہیر کو حاصل ہے سجاد ظہیر نے "ترقی پسند مصنفین" کے نام سے ایک انجمن قائم کی جس کی ایک باضابطہ کانفرنس ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں ہوئی جس میں پریم چند، جواہر لال نہرو، ملک راج آنند، اعجاز حسین، عبدالعلیم احتشام حسین، وقار عظیم، فراق گورکھپوری اور دوسرے نوجوان ادیب و فنکار شریک تھے۔ اس کانفرنس کا اصل مقصد ادب کو سیاسی، سماجی اور معاشرتی زندگی کا ترجمان اور عکاس بنانا تھا اس خیال کی بھی وضاحت کی گئی کہ ادب کو قوم و ملک اور تہذیب و تمدن کا نباض ہونا چاہیے۔ قومی شعور اور قومی جذبہ کو ابھارنا ہر ادیب و فن کا فرض اولین ہونا چاہیے۔ ہر ادیب و شاعر کو ترقی پسند اور حقیقت نگار ہونا چاہیے۔ پریم چند اردو ادب کا پہلا ادیب ہے جس نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں قوم و ملک اور سماج و معاشرے کی بھرپور نباضی اور عکاسی کی ہے۔ انھوں نے حقیقت نگاری کی داغ بیل ڈالی۔

افسانوی ادب میں حقیقت نگاری کے جس پودے کو پریم چند نے لگایا تھا اس کو اختر اورینوی اور کرشن چندر نے خون جگر سے سینچا اور سرسبز و شاداب بنایا۔ اختر اورینوی نے مغربی خیالات و رجحانات کا گہرا مطالعہ کیا اور مشرقی تہذیب و تمدن، سماج و معاشرے اور ماحول و فضا کا بھرپور جائزہ لیا۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے عمیق مشاہدات اور وسیع تجربات سے افسانوی ادب کے دائرے کو وسعت و گہرائی عطا کی۔ انھوں نے انفرادی اور اجتماعی زندگی کے پیچ و خم اور حقائق و مسائل سے ہی خام مواد فراہم کیا ہے۔ یہی وجہ کہ ان کے افسانوں میں حیات و کائنات کی بیکراں بوقلمونی جھلکتی ہے۔ انھوں نے عوامی زندگی میں دیہات و شہر دونوں کی نمائندگی کی ہے۔ انھوں نے دہقانی اور شہری دونوں زندگی کے متوسط طبقے کی بھرپور نباضی اور عمل جراحی کی ہے۔ ان کے افسانوں میں طبقاتی کش مکش، سماجی جبر و استبداد، انفرادی مجبوریوں اور نفسیاتی تصادم کی جھلکیاں نمایاں دکھائی دیتی ہیں۔

اختر اورینوی کو فن افسانہ پر فن کارانہ کمال حاصل تھا۔ فن افسانہ کے رموز و نکات اور تکنیک سے اچھی طرح واقف تھے۔ ان کی نظر میں افسانہ ایک اچھے ترشے ہوئے نگینہ کی طرح ہے انھوں نے افسانے کی تین خاص بنیادی خصوصیتیں بتائی ہیں (۱) حسن و تکمیل کی تعمیر (۲) برجستگی اور ڈرامائیت (۳) شستگی اور صفائی۔ بلاشبہ افسانہ زندگی کی ایک قاش ہے۔ اس کا دائرہ محدود اور کینوس مخصوص ہوتا ہے۔ اس فن میں مرقعٔ حیات کی صرف ایک ہی تصویر پیش کی جاتی ہے۔ اس لیے افسانہ نگار کو زندگی کے ہر واقعات و حادثات سے باخبر رہنا پڑتا ہے۔ وہ تخلیقی تحریکات پر گہری نظر رکھتا ہے۔ اس کو فنی تکنیک اور لوازمات کے برتنے میں بڑی ہوشیاری عقلمندی اور چابک دستی سے کام لینا پڑتا ہے۔ وہ فن پارے میں جذبات و تخیلات اور مشاہدات و تجربات سے تاثراتی اور جمالیاتی رنگ بھرنے میں فن کارانہ کمال دکھاتا ہے۔ اختر اورینوی کو ان ساری باتوں پر عبور حاصل تھا۔ وہ ایک ماہر فن تھے وہ ایک باشعور، ذہین اور تجربہ کار فن کار تھے۔ افسانہ نگار کے فرائض سے وہ اچھی طرح واقف تھے ایک جگہ وہ لکھتے ہیں کہ:

افسانہ نویس کو سخت تہذیب و تنظیم کی صلاحیت رکھنی چاہیے ..... افسانہ نویس اپنی محدود فضا میں زندگی کا ایک جلوہ دکھلاتا ہے۔ حیات کی ایک ادا پیش کرتا ہے مگر وہ جلوہ اپنی اثر خیزی کے لحاظ سے مکمل ہوتا ہے اور اپنی انفرادیت میں تشنۂ تکمیل نہیں ہوتی ...... بلند پایہ افسانہ نویس کا کام حیات کے حسن و نیرنگ کی نمائش نہیں ہوتی بلکہ ان کی طرف ایک بلیغ اشارہ کر دینا ہوتا۔

ہے۔ وہ انسانوں کے افعال و اطوار کی تفسیر صرف کنایہ کے ذریعے کرتا ہے۔ اور افسانہ نویس گزرگاہ ہستی کے کسی حصہ کی ایک جھلک سفر کے گزرتے ہوئے اور آنے والے منازل کی طرف افسانے میں صرف ایک اشارہ کر سکتا ہے۔ ماہرین فن پُراسرار طریقے سے ناظرین کو انتہائی امید و انتظار کی بلندی پر لے جاتے ہیں صرف اسی ایک گھڑی کی خاطر جب منظر کے چہرے پر سے نقاب حجاب چشم زدن میں اٹھا دیا جاتا ہے اور زندگی کا ایک عنوان تکمیل و حسن کے ساتھ عریاں نظر آتا ہے۔"

اختر اورینوی کے افسانوی گلدستوں کے نام ہیں۔ منظر اور پس منظر، انار کلی، کلیاں اور کانٹے، بھول بھلیاں، سپنوں کے دیس میں، ان گلدستوں میں اختر اورینوی نے حقیقت نگاری، جذبات نگاری، نفسیات و کیفیات اور مشاہدات و تخیلات کے گلہائے رنگا رنگ کھلائے ہیں۔ یہ مجموعے داخلیت و خارجیت، حقیقت و مثالیت پسندی، اور فکر و خیال کے بیش بہا نمونے ہیں۔ ان افسانوں میں زمانی و مکانی عناصر بھی ہیں اور وحدت تاثر بھی ہر جگہ قائم ہے۔ ان کا ہر افسانہ مقصد حیات اور تفسیر کائنات ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں ماحول و فضا کو پس منظر کے طور پر نہایت کامیابی کے ساتھ فن کارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔

اختر اورینوی نے ادب میں افادی پہلو کو ہمیشہ ملحوظ رکھا ہے افسانے کی افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ :

"میرے خیال میں افسانے کا افادی فرض صرف ایک ہے۔ انصاف کا قیام۔ افسانہ نگار کو اپنے فن سے انصاف کرنا ہے اور اپنے تجربوں سے انصاف کرنا ہے اور سماج سے انصاف کرنا ہے اور یہی فرض ہر ادب، ہر فن اور ہر علم و حکمت کا ہے۔ آج افسانہ نگار کو چاہیے کہ جرأت سے زندگی پر نظر ڈالے اور صداقت سے تصویر حیات بناتا جائے اور اپنی خوبصورت تنقید زندگی سے وسیع اور منصفانہ تمدن کے قیام میں مدد دے ورنہ وہ مریض ہے یا مجرم۔"

اختر اورینوی کا دوسرا پہلو جو تنقیدی ادب سے تعلق رکھتا ہے وہ بھی بڑا ہی آبدار اور تابدار ہے۔ اختر اورینوی دور جدید کے ایک بڑے دیدہ ور نقاد تھے ان کا شعور بالیدہ، ذہن رسا اور فکر بلیغ تھی۔ مغربی تنقیدی رجحانات سے انھوں نے مکمل طور پر استفادہ کیا ہے۔ انھوں نے مارکسی و جمالیاتی نظریات سے تاثرات قبول کیے ہیں لیکن حقیقتاً ان کی عملی تنقید سائنٹفک نقطۂ نظر کی ترجمان ہے۔ انھوں نے ہمیشہ سائنٹفک اصول تنقید کی پیروی کی ہے کسی فن پارے کی تنقید کرتے وقت وہ سب سے پہلے تخلیق فن کے محرکات و تحریکات کا سراغ لگاتے ہیں۔ پھر عہد و ماحول کے آئینہ میں فن پارے کا تجزیاتی مطالعہ کرتے ہیں۔ اس کے بعد فن کار کے داخلی تاثرات اور خارجی مشاہدات و تجربات کا بھرپور جائزہ لیتے ہوئے قدروں کا تعین کرتے ہیں یعنی وہ اس حقیقت کا پتہ لگانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں کہ فن کار نے انفرادی اور اجتماعی مقاصد کی کہاں تک ترجمانی کی ہے۔ دوسری طرف وہ فن پارے میں ادبیت اور حسن و جمال کی رنگینی اور فنی لوازمات کی تہذیب و تزئین پر بھی دھیان رکھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ "ادب ایک صناعت ہے۔ لہٰذا یہ جمالیات کے بنیادی اصولوں کی پیروی کرتا ہے۔ لطافت اور حسن کاری ادب کی تشکیل کے لیے ضروری ہے۔"

اختر اورینوی کی تنقید میں خلوص و ہمدردی، سنجیدگی و متانت، استدلال اور ہمہ گیری کی کارفرمائی ہر جگہ نمایاں ہے۔ اُن کے تنقیدی مضامین تجزیاتی اور بصیرت افروز ہوتے ہیں۔ انھوں نے اپنے مضامین میں تنقیدی اشارات و فنی لوازمات اور عصری میلانات کو اجاگر کرنے کی کامیاب سعی و کوشش کی ہے۔ وہ ہمیشہ ایک صالح اور صحت مند ادب کی تعمیر و تشکیل کے لیے جدوجہد کرتے رہے۔ وہ ادب و تنقید کو مختلف نظریاتی خانوں میں تقسیم کرنے کی مخالفت کرتے رہے۔ ان کا خیال تھا کہ ادب کو کسی خاص مولا یا سانچہ میں مقید کر دینا صحت ادب کے لیے نقصان دہ ہے کوئی ٹھوس یا قطعی معیار قائم کر دینا بھی ادب کے لیے مضر ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ادب کی تعمیر و ترقی میں عہد و ماحول اور تاریخ و تہذیب کا بہت

بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ ادب ہمیشہ زمانے کے حالات و تغیرات کے زیر اثر عمل پذیر اور ترقی پذیر ہوتا ہے۔ ہر فن کار اپنی تخلیقات میں عصری میلانات اور جدید نظریات کو سمو کر اپنی شخصیت اور انفرادیت کو ابھارنے کی بھرپور کوشش کرتا ہے۔ نقاد ان سارے حقائق کا پتہ لگاتا ہے۔ اختر اورینوی نکاتِ ادب اور لوازمات تنقید سے اچھی طرح واقف و آگاہ ہیں۔ ادب کے معیار و میزان کے متعلق ان کی رائے ملاحظہ ہو۔

" ادب میں معیار قائم ہوتے ہیں اور ان کی پیروی کی جاتی ہے اور گاہے گاہے معیار میں تبدیلیاں بھی ہوتی ہیں۔ معیار کی تبدیلی زمانہ کے رجحانات یا کسی نابغہ کی شدید انفرادیت کی رہین منت ہوتی ہے۔ نابغہ ماحول اور زمانہ کی پیداوار ہوتا ہے اور زمانہ کا ردعمل۔ اول الذکر اپنے زمانہ کا نمائندہ ہوتا ہے اور آخرالذکر خالق و ماحول و پروردگار زمانہ۔ وہ ایک انقلاب پیدا کرتا ہے "

اختر اورینوی میں تنقیدی بصیرت و بصارت بدرجہ اتم موجود تھی۔ تنقیدی ادب کا انھوں نے بہت گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اسی لیے وہ نقاد کے فرائض پر بھی رائے زنی کر دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

" نقاد کا فرض ہے کہ وہ کاذب اور صادق میں تفریق کرے کھرے کھوٹے کو علیحدہ کرے، ایک فطری نقاد مطلقاً کا غلام نہیں ہوتا۔ وہ نور پیشانی سے نابغہ کو پہچانتا ہے اور اس پر ایمان لا کر اس کی صداقتوں کی تبلیغ کرتا ہے نقاد کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ کاذبوں کے کذب سے اہل ادب کو آگاہ کرتا ہے۔ ادبی گمراہیوں، خطاکاروں، خام کوششوں اور باغیوں پر نگاہ رکھنا بھی اس کا کام ہے "

اختر اورینوی جدیدیت اور ترقی پسند ادب کے علمبردار تھے۔ انھوں نے " ترقی پسند ادب " کے زیر عنوان ایک بصیرت افروز مقالہ سپرد قلم کیا ہے جس میں " ادب اور زندگی " ادب اور مقصد و پیام " " نظام معاشرہ اور ادب کی متوازن ترقی و انحطاط " " ادب اور انقلاب " " عہد حاضر اور ادب " اور " ترقی پسند ادب اور تکنیک " کا بھرپور تنقیدی اور تشریحی جائزہ لیا ہے جس سے ان کے خیالات و نظریات پر روشنی پڑتی ہے۔ انھوں نے ہر نقطۂ نظر پر وضاحتی بحث کی ہے، ان کا خیال ہے کہ " ترقی پسند ادب خزاں میں امید نو بہار ہے، ترقی پسند ادیب انسانی روح کے معمار ہیں یہ وہ ترقی پسند ادیب کو محبت، نفرت، خوف، وفاداری، خلوص، نفور، امید، ناامیدی، غرور، انکسار، خودغرضی، ایثار، اطاعت، بغاوت وغیرہ جذبات کو اپنی نوع در نوع بوقلمونیوں کے ساتھ ادب پاروں میں منعکس کرنا چاہیے۔ ..... ترقی پسند کو اتنا ہی وسیع ہونا چاہیے جتنی حیات حاضرہ وسیع ہے "

اختر اورینوی ایک ہمہ گیر فکر و فن کے مالک تھے وہ ایک دیدہ شناس نقاد تھے، ان کی نگاہیں دور بیں اور دور رس تھیں وہ ادب کے اعلیٰ اخلاقی اقدار کے متمنی تھے ایک صالح اور اخلاقی ادب کے معیار و میزان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ " صالح ہونے کا معیار وسیع ترین انسانی ہمدردی، مساوات، اعلیٰ اخلاقی اقدار، ذہنی برتری، روحانی علو، استحصالی قوتوں اور ظالم عناصر کا فقدان اور نوع انسان کی اجتماعی فلاح ہے "

اختر اورینوی ایک وسیع النظر اور وسیع القلب نقاد تھے۔ فن تنقید کے دائرۂ عمل کو بھی انھوں نے وسعت و ہمہ گیری عطا کی ہے۔ ان کی عملی تنقید اعتدال و غیر جانب داری کی آئینہ دار ہے۔ ان میں تنقیدی شعور کے ساتھ ہی ساتھ تخلیقی شعور بھی بدرجہ اتم موجود تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ہر عملی تنقید بڑی جاندار ہمہ جہت اور پُرمغز ہوتی ہے۔ ان کے تنقیدی مقالات میں فکر و فن اور شعور و ادراک کی گہرائی و گیرائی اس قدر ہوتی ہے دراصل وہ تخلیقی ہو جاتے ہیں، یہ بھی حقیقت ہے کہ اچھی اور بڑی تنقید وہ ہے جو بذات خود ایک اہم تخلیق ہو، بقول اختر اورینوی، " اعلیٰ ادب پیدا کرنا بڑا کارنامہ ہے، انکشاف، جدت اور ایجاد، نیز ان باتوں کو جمالیات کے اصولوں کی پیروی کرتے ہوئے زندگی کے پس منظر کے ساتھ پیش کرنا ادب العالیہ کی تخلیق کرنی ہے "

زمانے کے انقلابات و تغیرات کے ساتھ ساتھ اختر اورینوی کے شعور ادب اور خیال و نظریہ میں بھی قدرے تبدیلی آئی ہے۔

انھوں نے فلسفۂ جمالیات کا بغور مطالعہ کیا ہے اور مناظر قدرت کا بہ نظر غائر مشاہدہ کیا ہے۔ اسی بنا پر وہ ادب میں جمالیاتی و تاثراتی مطالبوں کو پورا کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ ان کی بعد کی تنقیدوں میں جمالیاتی و تاثراتی نظریۂ تنقید کے گہرے اور شوخ رنگ نظر آتے ہیں۔ اپنے مقالہ "ادب و فن کی بنیادی قدریں" میں وہ لکھتے ہیں کہ "حسن اور لطافت آرٹ کی جان ہے۔ فن لطیف میں حسن آفرینی قدر پیدا کرتی ہے۔ عام فنون میں حسن لطافت کی ترکیب سے جمالی فن کی تخلیق ہوتی ہے۔"

اسی طرح انھوں نے ادب کی قدر اور جبلتوں پر بھی ایک پُرمغز مقالہ لکھا ہے جس میں انھوں نے اس حقیقت پر روشنی ڈالی ہے کہ "آرٹ کی داخلی اور خارجی انفرادیت جبلت جمال کی حسن کاری سے ہی وجود میں آتی ہے ...... آرٹ ایک نئی تخلیق ہے۔ آرٹ زندگی کو نئی قماش، نئی ہم آہنگی، نیا ترنم، نئی موزونیت، کیف و کم عطا کرتا ہے ...... کامیاب اور قیمتی فن پارہ وہ ہے جو حسن و اثر کے معیار پر پورا اترے۔"

جہاں تک اسلوب اور طرز تحریر کا تعلق ہے اختر اورینوی کو اس فن میں بھی انفرادیت حاصل ہے۔ ان کی طرز تحریر میں کشش و جاذبیت حد درجہ ہے۔ ان کو الفاظ و بیان پر قدرت حاصل ہے۔ ان کی عبارت سلیس و استدلالی ہوتی ہے۔ نادر تشبیہات و استعارات اور برمحل فقروں سے انھوں نے اپنے فن پارے کو آراستہ کیا ہے جس سے ان کی تحریر و عبارت میں شگفتگی اور شگفتگی پیدا ہوگئی ہے اور یہ خصوصیت ان کے فن پارے کے ساتھ ہی ساتھ ان کی شخصیت و عظمت کو بھی وزن و توانائی عطا کرتی ہے۔

گلاب کا پھول

عبدالمنان سیتاپوری

اے شہنشاہِ گلستاں رونقِ بزمِ جہاں
تیری خوشبو سے معطر ہیں زمین و آسماں
تیرے رنگ و بو کا شیدا ہے جہاں کا ہر بشر
چاہتا ہے صدق دل سے تجھ کو ہر اہلِ نظر
تیرا حسنِ جانفزا مقبولِ خاص و عام ہے
تو سراپا بادۂ عیش و طرب کا جام ہے
تو جہانگیر اور بابر کا تھا منظورِ نظر
اپنے جان و دل فدا کرتے تھے تیرے حسن پر
مسند نورجہاں پر تو ہی تھا نکہت فشاں
جو مراتب ہیں ترے وہ اور پھولوں کے کہاں
سیج تھی تجھ سے مزین ملکۂ ممتاز کی
قدر اس کے دل میں تھی تیرے ہر اک انداز کی
ملکۂ نورجہاں موجد تھی تیرے عطر کی
جس کی نکہت سے مہک اٹھتی ہے ہر دل کی کلی
شیروانی کی تھا زینت تو جواہرلال کی
ہو نہیں سکتی ثنا تیرے بلند اقبال کی
دیکھ کر پاکیزگی تیری یہ ہوتا ہے گماں
تو یہاں آیا ہے بن کر تحفۂ باغِ جناں
سارے گلہائے چمن کا تو ہی قومی پھول ہے
غنچۂ خاطر کھلا دینا ترا معمول ہے
تیری چادر کو چڑھاتے ہیں کبھی درگاہ پر
تیرا سہرا باندھتے ہیں چہرۂ نوشاہ پر
قرب حاصل ہے تجھے دربارِ شاہنشاہ کا
صوفیانِ ذی شرف کے مرقدِ ذی جاہ کا
کیوں نہ ہو منان تیرا مدح خواں شام و سحر
اے سکونِ قلبِ مضطر اے شہِ گلہائے تر

چندر پرکاش جوہر بجنوری
۹۔ ریواں بلڈنگ لیڈر روڈ الہ آباد ۲۱۱۰۰۳

غزل

تعمیر آشیاں ہو کہ حفظِ چمن کی بات
دونوں کے سلسلے میں ہے دار و رسن کی بات

جدت انھیں پسند، قدامت مجھے قبول
یہ تو ہے اپنے مذاقِ سخن کی بات

ہر بانکپن کے ساتھ ہے اک حسنِ سادگی
ہر سادگیٔ حسن میں ہے بانکپن کی بات

افشائے رازِ عشق گوارا نہیں مجھے
کیوں لوگ پوچھتے ہیں تری انجمن کی بات

خوش ہوں کہ اہلِ ہوش کی محفل میں آج تک
سمجھا نہ کوئی بھی مرے دیوانہ پن کی بات

حسنِ قبا پہ لالہ و گل بھی ہیں دم بخود
اب کیا کوئی بتائے ترے پیرہن کی بات

جوہر تجھے غزل پہ یہاں داد کیا ملے
سمجھیں گے اہلِ فن ہی فقط اہلِ فن کی بات

ڈاکٹر اسماء سعیدی
۳۳۹۵ بیگمی اچھے جی
باڑہ ہندو راؤ
دہلی ۶

غزل

الٰہی آہ میں اب تو اثر ہو — ہمارے حال پر بھی اک نظر ہو
پسند ہم کو نہ کوئی اور در ہو — ترے در ہی پہ یارب اپنا سر ہو
نہ جب تدبیر کوئی کارگر ہو — بھروسہ پھر نہ کیوں تقدیر پر ہو
مسلسل تیرگی ہے شامِ غم کی — نشاط آگیں بس اب کوئی سحر ہو
گوارا ہے نہ اب اظہارِ احوال — نہیں اپنی نہ کوئی بھی خبر ہو
اثر جس پہ نہ ہو آفات و غم کا — ہمیں یارب عطا ایسا جگر ہو
کہیں یہ روز و شب اس کو بھلائیں — وہی اک گفتگو بارِ دگر ہو
نہ ہو تکمیل کیا ہوتا ہے اس سے — تمھاری آرزو ہی عمر بھر ہو
ٹھہر کر یاد کر لینا کسی کو — کبھی اس راستے سے جب گزر ہو
نہیں ہے اب تعلق زندگی سے — بسر ہو جائے جیسی بھی بسر ہو
سفر دنیا سے تبدیل کر گئے ہیں — تمام اس زیست کا بھی اب سفر ہو
یہ کیا ویرانیاں قسمت میں لکھیں — فضا ویران ہو ویراں سا گھر ہو
نہیں غم سے مفر گو زندگی کو — خوشی بھی زیست میں شامل مگر ہو
وہ عالم ہے کہ اپنا بھی نہیں ہوش — اس عالم میں تمھاری کیا خبر ہو
ہزاروں حشر برپا ہر طرف ہیں — مبادا یہ جہاں زیر و زبر ہو
نہیں شایانِ شاں کچھ بھی ہمارے — زر و زیور ہو یا لعل و گہر ہو

بڑی مدت سے یہ خواہش ہے اسماء
کبھی اپنے لیے شام و سحر ہو

آفاق حسین صدیقی
شعبہ اُردو۔ وکرم یونیورسٹی اجین

جاں نثار اختر کے شخصی مرثیے

جاں نثار اختر اردو کے ترقی پسند شعرا میں ایک ممتاز درجہ رکھتے ہیں، وہ ترقی پسند شعرا کی اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو رومانیت کے راستے سے ترقی پسند شاعری کے میدان میں داخل ہوئی تھی اور جس نے ترقی پسند تحریک کے آغاز کے زمانے میں ہی اس تحریک کے نظریات کو پورے اعتماد اور خلوص دل کے ساتھ قبول کر کے اس تحریک کو تقویت پہنچانے، وسعت عطا کرنے اور مقبول عام بنانے میں نمایاں رول انجام دیا۔ اس کے علاوہ جاں نثار اختر کا تعلق ترقی پسند شاعروں کے اس طبقے سے بھی ہے جس نے شاعری میں مخصوص نظریات کے سامنے شخصی محسوسات و جذبات اور ذاتی تجربات و نجی معاملات کو یکسر نظر انداز نہیں کیا اور شاعری کو صرف زندگی کی شکایت، سرمایہ داری کی مذمت، طبقاتی نظام کی مخالفت، مارکس ازم کی تبلیغ، اشتراکی نظریات کی نشر و اشاعت اور انقلاب کے پروپیگنڈے یا محض نعرہ بازی تک محدود نہ رکھ کر اس کو انسان کے داخلی جذبات و محسوسات تک پھیلانے کی کوشش بھی کی، زندگی کے خارجی معاملات کے ساتھ داخلی کیفیات کو بھی ملحوظ رکھا، اجتماعیت کے ساتھ انفرادیت پر بھی توجہ دی، سماجی نوعیت کے موضوعات کے ساتھ دوسرے موضوعات بھی اختیار کیے، شاعری کے شعری مطالبات و فنی لوازمات کا لحاظ رکھا اور سماجی معاملات و اشتراکی نظریات کو شخصی و ذاتی تجربات و داخلی محسوسات کے ساتھ ہم آہنگ کر کے ایک ادبی معیار کے ساتھ پیش کیا، اسی بنا پر اس طبقہ کے یہاں اشتراکی نظریات نغمہ کا روپ لے کر اور انقلاب کا نعرہ صدائے دل بن کر ظاہر ہوا اور سماجی زندگی کی حقیقتوں نے داخلیت میں تحلیل ہو کر ایک ایسی شکل اختیار کی جو ذہن و دل دونوں کو متاثر کرتی ہے۔ ترقی پسند شعرا کے اس طبقہ میں جو خصوصیت جاں نثار اختر کو امتیازی حیثیت عطا کرنے کا باعث ہوئی وہ ان کے لہجہ کا دھیما پن نرمی و لوچ اور مانوس شعری فضا ہے۔ جاں نثار اختر نے اپنے تخلیقی سفر میں ورثے میں ملے ہوئے کلاسیکیت کے صالح عناصر کو پورے یقین کے ساتھ اختیار کیا، اپنے زمانے کے رومانوی رجحان سے اثرات قبول کیے، مطالعہ و مشاہدہ سے علم و آگہی حاصل کرنے کی کوشش کی، زندگی پر گہری نظریں ڈال کر اس کے دکھ سکھ کو دیکھا اور اس میں ڈوب کر ان کو محسوس کیا، سماجی زندگی سے گہری واقفیت حاصل کی، مسائل کو سمجھنے کی سعی کی، اپنے عہد کی حقیقتوں کا عرفان حاصل کیا اور غور و فکر کر کے زندگی کی اچھائیوں اور زمانے کی برائیوں کو جاننے کی جستجو کی، ان کے سلسلہ میں نتائج اخذ کیے اور نظریات قائم کیے اس کے ساتھ انھوں نے اپنے زمانے کے ممتاز بزرگ شعرا اور مقبول ہم عصروں کے فکری و شعری تجربات سے فیض حاصل کیا بلکہ کبھی کبھی تو ان کے ڈھالے ہوئے سانچوں سے بھی استفادہ کیا جس کی بنا پر ان کے یہاں بیک وقت کلاسیکیت، رومانویت، حقیقت نگاری اور اپنے زمانے کے اہم فکری و شعری رجحانات کو راہ حاصل ہوئی ہے اور ان کی شاعری میں سماجی بصیرت تاریخی واقفیت، اجتماعی شعور و فنی آگہی کے ساتھ دوسروں کے تجربات کی روشنی، ذاتی تجربات کی گرمی، انفرادی محسوسات و داخلی جذبات کی ترجمانی، اجتماعی کیفیات و خارجی حالات کی عکاسی، زندگی کی مسرتوں کی حرارت و کلفتوں کی کسک، عام انسانی زندگی کے دکھ درد کی

بشی اور روایت پسندی وجدت آفرینی جیسی متنوع خصوصیا
ے عجیب سا امتزاج دیکھنے کو ملتا ہے بالفاظ دیگر ان کی شاعری
یت و رومانویت، حقیقت پسندی و تخیل آفرینی اور شعریت کی
ت آمیزش کا نمونہ پیش کرتی ہے۔ لیکن ان کی شاعری کے
یں ایک منزل ایسی بھی آئی ہے جہاں ان کے فن کو آب و تاب
نے والی یہ مختلف النوع خصوصیات ان کی فنی آگہی اور شعور
ں اور ان کے بے حساب تجربات میں مل کر ایک دوسرے میں
ب ہو گئی ہیں اور غیر محسوس طور پر ہم آہنگ ہونے کے عمل سے
کر انھوں نے جاں نثار اختر کی شاعری کو ایک مخصوص فضا
مخصوص آواز ایک امتیازی خصوصیت اور وہ رنگ عطا کر دیا
سے ڈاکٹر ظ۔ انصاری نے غنائی رنگ سے تعبیر کیا ہے[۱۰]
جاں نثار اختر کی شاعری کی یہ امتیازی خصوصیت یا غنائی
ے جو ایک قسم کی لطافت، نرم روی نغمگی، ایک قسم کی شائستگی
ایک قسم کی گرمی و اثر آفرینی پر محیط ہے اس کا بھرپور احساس
کے شخصی مرثیوں میں ہوتا ہے، جاں نثار اختر کے شخصی مراثی
ل ان کے تخلیقی یا شعری سفر میں اس سنگ میل کی حیثیت رکھتے
جہاں سے ان کی شاعری ایک نیا موڑ اختیار کرتی ہے اور ان کی
ری میں حصہ لینے والے مختلف عناصر ان کے درد و کرب اور
جگر کے ساتھ مل کر ایک حیثیت اختیار کر لیتے ہیں اور ان کی
ز کا تعین کر دیتے ہیں، جاں نثار اختر نے یہ شخصی مرثیے
اختر کی وفات پر اور راشالن کی موت پر لکھے تھے، جاں نثار اختر
شخصی مرثیوں میں ان دونوں ہستیوں کی موت پر اظہار
، رغم اس بات کا ثبوت بھی ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری
حدود نہیں رکھا ہے بلکہ اسے دل سے لے کر دنیا تک پھیلایا ہے
صفیہ اختر کی وفات پر اظہار غم کر کے انھوں نے اپنے ذاتی دکھ
درد کی ترجمانی کی ہے تو اسٹالن کی موت پر افسوس کا اظہار
کے اس دکھ کو ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے جو سماجی شعور نے
کے دل میں پیدا کیا تھا، ایک کی موت نے ان کی اپنی زندگی
ار یک کر دیا تھا تو دوسرے کی موت سے اجتماعی زندگی میں

تاریکی کا احساس پیدا ہوا تھا۔

اردو شاعری میں شخصی مرثیوں کی روایت نئی نہیں ہے، جاں نثار اختر سے پہلے، بہت سے ممتاز شعراء نے عزیز و اقارب، سماجی کارکنوں، عوامی رہنماؤں، سیاسی لیڈروں و دانشوروں اور ادیبوں و شاعروں کی موت پر شخصی مرثیے کہے ہیں لیکن جو خصوصیات جاں نثار اختر کے شخصی مرثیوں کو بالخصوص ترقی پسند شعراء کے شخصی مرثیوں سے ممتاز کرتی ہیں وہ داخلی جذبات کا زیر لب اظہار، انداز بیاں کا نیاپن، لب و لہجہ کی دردمندی و کسک اور گہری فکر و شدید جذبے کی، غیر محسوس آمیزش ہے۔ جاں نثار اختر نے شخصی مرثیوں میں متوفی کی موت پر صرف آنسو نہیں بہائے ہیں نہ ہی صرف اس کی صفات کا بیان کر کے ان پر ماتم کیا ہے بلکہ متوفی کی موت کے غم کو اپنے دل کی گہرائیوں میں جذب کر کے اس کے ردِ عمل سے پیدا کیفیت کا موثر اظہار کیا ہے اسی بنا پر ان کے مرثیوں میں درد و کرب کی ایک تڑپا دینے والی کیفیت پیدا ہو گئی ہے، غم آنسو یا نالہ کے بجائے سسکیوں کے روپ میں ظاہر ہوا ہے اور مرثیوں کی ساری فضا سوگوارانہ کیفیت میں ڈوب گئی ہے۔ صفیہ اختر کی وفات پر ان کی دو طویل نظمیں "خاکِ دل" اور "خاموش آواز" اس کی مثالیں ہیں۔ ان نظموں کے علاوہ دو غزلیں ایک نامکمل نظم "خیر مقدم" اور ایک رباعی "آج تک" بھی ایسی ہی کیفیت کی غمازی کرتی ہیں — انھوں نے "خاکِ دل" صفیہ اختر کے انتقال کے بعد لکھنؤ سے رخصت ہوتے ہوئے کہی تھی اور "خاموش آواز" جنوری ۱۹۵۴ء کی چاندنی رات میں صفیہ اختر کے مزار پر کہی۔ اس سلسلہ کی پہلی غزل بھی ۱۹۵۴ء میں کہی گئی ہے اور "خیر مقدم" "آج تک" و دوسری غزل ۱۹۵۵ء میں کہی گئی ہیں۔

"خاکِ دل" جاں نثار اختر کے ان الم ناک جذبات و محسوسات کی ترجمان ہے جو پیار و محبت سے لبریز دل کے خاک ہونے پر پیدا ہوئے تھے۔ یہ نظم ایک بیوی کی موت پر شوہر کے اظہار غم کے ساتھ بے حساب رنگینیوں، رعنائیوں اور بے پناہ خلوص و محبت اور بے لوث پیار سے مالا مال ایک دنیا کے مٹنے کا مرثیہ بھی ہے اور ایک

انسان کا ایک ایسے انسان کی موت پر اظہار عقیدت بھی ہے جس کی موت سے زندگی کا ایک قافلہ بے نیل مرام ہو گیا تھا، ایک عہد مر گیا تھا، ایک دنیا اجڑتی نظر آئی تھی۔ ایسی دنیا جسے ایک سلیقہ مند بیوی کے پیار، ایک ماں کی ممتا اور ایک فنکارہ کی دردمندی و ہوش مندی نے آباد کیا تھا، رونق و رنگینی عطا کی تھی۔ جہاں ایک بیوی نے شوہر کے دکھ سکھ بانٹے تھے، ماں نے آرزوئیں اور تمنائیں کی تھیں، سپنے سجائے تھے، نت نئے خواب دیکھے تھے اور انہیں اپنے خون سے سینچا تھا، جہاں ایک باشعور ادیبہ نے زندگی کو سنوارنے کے لیے قربانیاں دی تھیں۔

صفیہ اختر کا انتقال ۱۷ جنوری ۱۹۵۳ء کو لکھنؤ میں ہوا۔ اس وقت جاں نثار اختر بمبئی میں تھے جب وہ لکھنؤ پہنچے تو انہیں صفیہ اختر کے بجائے ان کی قبر ملی۔ صفیہ اختر کی رفاقت میں جاں نثار اختر نے زندگی کے خوش گوار ایام بھی گزارے اور دکھ بھی جھیلے تھے، ان کے ساتھ مل کر دکھوں نے سر اور ... بھی کی تھیں اور ... کا بوجھ بھی اٹھایا تھا۔ زندگی کی پر پیچ راہوں میں کشمکش حیات کے دوران ایسے نہ جانے کتنے موڑ اور کتنے نشیب و فراز تھے جن میں جاں نثار اختر کو صفیہ اختر کا ساتھ اور سہارا ملا تھا۔ صفیہ اختر نے ہر جگہ ہر مقام پر جاں نثار اختر کے دکھوں کو اپنے سینے سے لگایا اور سکھوں کو ان تک پہنچانے کی کوشش کی، کبھی وہ ایک وفا شعار اور حساس بیوی بن کر سامنے آئیں کبھی انھوں نے ایک مخلص اور باشعور دوست کا رول ادا کیا۔ کبھی ہمدرد ساتھی بن کر ان کے ہمراہ رہیں تو کبھی غمگسار کی شکل میں انھوں نے جاں نثار اختر کے غم کو ہلکا کرنے کی سعی کی، کبھی رازدار بن کر ان کے راز ہائے سربستہ کو اپنی امانت بنا لیا تو کبھی ترجمان بن کر انھوں نے جاں نثار اختر کی زندگی پر پڑے ہوئے پردوں کو ہٹا کر ان کی صفات کو ظاہر کرنے کا حق ادا کیا اسی کے ساتھ انھوں نے جاں نثار اختر کی آنکھوں میں حسین خواب جگائے، آرزوؤں اور تمناؤں کو بیدار کیا، ان کی محفلوں کو رونق عطا کی، تنہائیوں کو سکون بخشا، زندگی کی کٹھن راہوں کو طے کرنے کا حوصلہ دیا، جینے کی ہمت دلائی، غموں میں مسکرانے کا عزم پیدا کیا۔ غرض یہ کہ صفیہ اختر کی آنکھوں میں غم دوراں کو نظارہ بھی کیا اور زندگی کی حقیقی تصویریں بھی دیکھیں، ان کی پلکوں کے سائے میں انھیں زندگی کی کڑی دھوپ سے بچنے کا موقع ملا تو اسی سائے میں کھڑے ہو کر انھوں نے زندگی کی تیز دھوپ کی تمازت بھی محسوس کی۔ ان کی رفاقت میں انھوں نے غم دل کی دولت بھی حاصل کی اور غم دل سے ابھر کر ایک ایسی نئی صبح کی لگن بھی اپنائی جس سے ساری دنیا سرشار ہو سکے، وہ صفیہ اختر کی پہلو دار اور پرکشش شخصیت تھی جس نے آوارہ ہواؤں کی طرح بھٹکنے والے اس شاعر کے ذہن کے اجزائے پریشاں کی شیرازہ بندی کر کے اسے ایک حیثیت عطا کی، اس کے دل کو دھڑکنے کے لطیف انداز سکھائے اور اسے نئے جذبوں سے روشناس کرایا، اس کے تخیل کو نئی دنیاؤں کی سیر کرائی اور اس کی شخصیت کو جلا عطا کی اور اس کی انفرادیت کو صیقل کیا۔ جاں نثار اختر کے شاعرانہ وجدان اور فن کو آب و تاب عطا کرنے میں صفیہ اختر کا جو نمایاں حصہ رہا ہے "خاک دل" کے دیباچہ میں جاں نثار اختر کے اعتراف سے اس کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے انھوں نے لکھا ہے "میرے شاعرانہ وجدان اور فنی شعور کے ارتقا میں جو کچھ اثر (صفیہ اختر کا) حصہ رہا ہے اس کا اعتراف بھی ...."[۲] اس کے علاوہ خاک دل کی بہت سی نظموں سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے۔

دراصل صفیہ اختر کے آئینے میں جاں نثار اختر نے اپنے خد و خال کو پہچانا اور اپنے جمال کا نظارہ کیا تھا۔ صفیہ اختر کی وفات سے جاں نثار اختر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس آئینے سے محروم ہو گئے اور ان کی شخصیت بکھر گئی اس کے ساتھ محبت کا وہ کارواں جو صفیہ اختر کی رفاقت میں مسلسل چل رہا تھا ان کی موت سے یکلخت منتشر ہو گیا۔ اس انتشار نے ان کے ذہن و دل کو شدید بے چینی اور بے قراری میں مبتلا کر دیا، انھیں شدید تنہائی کا احساس ہوا اور اس سے گھبرا کر انھوں نے ماضی میں پناہ لی ۔ ان کے سامنے یادوں کی بے حساب دنیائیں آباد ہو گئیں اور صفیہ اختر کی رفاقت میں گزرے ہوئے لمحات ایک ایک کر کے ذہن میں جاگنے لگے، ان کے پیار کے بے حساب نقوش

ہن کے پردے پر منعکس ہونے لگے وہ ان کا اظہار کرنے پر مجبور ہوگئے
سرزمین لکھنؤ کو مخاطب کرکے کہہ اٹھے ؎

لکھنؤ میرے وطن میرے چمن زار وطن !

....

دفن ہے دیکھ مرا عہد بہاراں تجھ میں
دفن ہے دیکھ مری روحِ گلستاں تجھ میں
میری گلپوشش جواں سال امنگوں کا سہاگ
میری شاداب تمنا کے جھلکتے ہوئے خواب
میری بیدار جوانی کے فروزاں مہ و سال
میری شاموں کی ملاحت، میری صبحوں کا جمال
میری محفل کا فسانہ ، مری خلوت کا فسوں
میری دیوانگی شوق ، مرا ناز جنوں

....

صفیہ اختر کے انتقال سے جاں نثار اختر کی زندگی کا ایک حسین دور ختم ہوگیا تھا ایک موجود دنیا سے ان کا رابطہ ٹوٹ گیا تھا لیکن اسی کے ساتھ ان کے احساس میں ایک نئی دنیا نے جنم بھی لیا تھا جو صفیہ اختر کے ساتھ بتے ہوئے شب و روز کی رنگینیوں سے معمور تھی اس دنیا کو اب وہ اپنی زندگی کا قابل قدر اور لازوال سرمایہ سمجھ رہے تھے اس کا اندازہ ذیل کے اشعار سے ہوتا ہے ؎

اے مری روحِ چمن، خاکِ لحد تیری
آج بھی مجھ کو ترے پیار کی بو آتی ہے
زخم سینے کے مہکتے ہیں تری خوشبو سے
وہ مہک ہے کہ مری سانس گھٹی جاتی ہے
مجھ سے کیا بات بنائے گی زمانے کی جفا
موت خود آنکھ ملاتے ہوئے شرماتی ہے

صفیہ اختر کی یادوں کے سرمایہ سے اپنی محرومی اور حرماں نصیبی کے شدید صدمے کو کم کرنے کی کوشش میں جاں نثار اختر نے "خاک دل" میں کئی جگہ ان کی یادوں کی محفل سجائی ہے، بار بار ماضی کی طرف پلٹ کر اپنے آپ کو حال کی اذیت سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی ہے لیکن فطری طور پر وہ صفیہ اختر کے مادی یا جسمانی وجود کے ختم ہونے پر اپنے آپ کو شدید رنج و الم کا شکار ہونے سے روک نہیں پاتے چنانچہ تیسرے بند میں وہ صفیہ اختر کے ساتھ گزرے ہوئے لمحات میں ذہن کو محو کر دینے کی کوشش کے باوجود ایک دفعہ پھر شدید غم و اندوہ میں مبتلا دکھائی دیتے ہیں اذیت ناک ذہنی کرب کا شکار نظر آتے ہیں، انھیں ساری کائنات ساکت و غیر متحرک نظر آنے لگتی ہے۔ زندگی کے قدم تھمے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ ان کی اس ذہنی کیفیت کا اندازہ ان اشعار سے ہوتا ہے جن میں وہ صفیہ اختر کو مخاطب کرتے ہیں ؎

میں اور ان آنکھوں سے دیکھوں تجھے پیوند زمیں
اس قدر ظلم نہیں ، ہائے نہیں ، ہائے نہیں
کوئی اے کاش بجھا دے مری آنکھوں کے دیے
چھین لے مجھ سے کوئی کاش نگاہیں میری

صفیہ اختر کی وفات پر جاں نثار اختر کی غم و اندوہ میں گھری ہوئی شخصیت کی نفسیاتی کیفیات کا مزید اندازہ نظم کے آخری بندوں سے بھی ہوتا ہے جب وہ صفیہ اختر کے بخشے ہوئے عزم جواں سے عرصہ گہہ جہد مسلسل کی آواز کی طرف متوجہ ہو کر غم دوراں کا بار اٹھانے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں اور " زندگی کے حکم سفر پر شعلۂ جاں دل" لیے گامزن ہونے کو قدم بڑھانے کا ارادہ کرتے ہیں تو بار بار پلٹ کر سرزمین لکھنؤ پر اپنی نگاہیں مرکوز کرتے دکھائی دیتے ہیں اسی کے بعد نظم کے آخر میں انھوں نے جس انداز میں سرزمین لکھنؤ کو مخاطب کر کے اس سے صفیہ اختر کو محفوظ رکھنے کی درخواست کی ہے اس سے بھی صفیہ اختر سے ان کی بے پناہ محبت اور عقیدت ظاہر ہوتی ہے اور ان کے دل میں موجزن بے پناہ غم کا اظہار ہوتا ہے اور ان کی ذہنی کیفیت سامنے آتی ہے ملاحظہ کیجیے :-

لکھنؤ میرے وطن، میرے چمن زار وطن !
دیکھ اس خاک کو آنکھوں میں بسا کر رکھنا
اس امانت کو کلیجے سے لگا کر رکھنا
لکھنؤ میرے وطن، میرے چمن زار وطن !

"خاکِ دل" میں جاں نثار اختر نے جس انداز میں رنج و غم کا اظہار کیا ہے اور جس طرح اپنی ذہنی و قلبی کیفیات کو پیش کیا ہے اس سے اس نظم میں بڑا سوز و گداز، بڑی تاثیر اور گہری معنویت پیدا ہو گئی ہے اور یہ نظم متنوع خصوصیات کی حامل بن گئی ہے۔ "خاکِ دل" جاں نثار اختر کے شدید غم اور گہرے دکھ کی ترجمانی بھی کرتی ہے، حزن و ملال میں مبتلا ان کی ہستی اور غمِ دوراں و غمِ ہجراں میں گھری ہوئی ان کی شخصیت کی ذہنی و نفسیاتی کیفیات کی عکاسی بھی کرتی ہے نیز ان کی اور صفیہ اختر کی ازدواجی زندگی کی وہ تصویریں بھی پیش کرتی ہے جن میں صفیہ اختر نے اپنے خونِ جگر سے رنگ بھرا تھا، اسی کے ساتھ یہ صفیہ اختر کی پرکشش شخصیت کے مختلف و متنوع پہلوؤں کی بھی آئینہ دار ہے اور جاں نثار اختر کی شاعری کی خصوصیات کا نمونہ بھی ہے — یہاں شاعری کی خصوصیات سے مراد جذبہ و احساس کی شدت و صداقت، جذبات و محسوسات کا موثر اظہار، خیالات و الفاظ میں گہرا ربط، بیان کی دردمندی، زبان کی سادگی اور اثر آفرینی اور لب و لہجہ کا سوز و گداز و اثر انگیزی سے ہے۔ "خاکِ دل" کا ہر بند شاعر کے جذبات و احساسات کی بھرپور ترجمانی کرتا ہے، ہر لفظ سے داخلی کیفیت کی عکاسی ہوتی ہے اور جذبات کی کیفیت و نوعیت کے لحاظ سے لب و لہجہ میں تبدیلی رونما ہوتی ہے جس کی بنا پر مجموعی طور پر گہرے اور دیرپا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

صفیہ اختر کی وفات پر دوسری طویل نظم "خاموش آواز" اپنے منفرد اسلوب، مخصوص اندازِ بیان، لب و لہجہ کی دردمندی و سوز و گداز، زبان کی سادگی و گھلاوٹ اور جذبہ کی شدت کے لحاظ سے نہ صرف جاں نثار اختر کی نظموں میں بلکہ اردو کے شخصی مرثیوں میں امتیازی حیثیت رکھتی ہے اور صفیہ اختر کے انتقال کے بعد جاں نثار اختر کی ذہنی و قلبی کیفیات کا پتہ دیتی ہے۔ اس نظم سے اندازہ ہوتا ہے کہ صفیہ اختر کی وفات کے بعد ایک مدت تک جاں نثار اختر شدید تنہائی اور اکیلے پن کے احساس میں گرفتار رہے اور انھوں نے قدم قدم پر ان کی کمی محسوس کی اور شدید کرب و اذیت کا شکار رہے، اسی کے ساتھ صفیہ اختر کے انتقال کے بعد ان کی زندگی کا ہر لمحہ صفیہ اختر کے ساتھ گزری ہوئی زندگی کی یادوں کو تازہ کرتا رہا۔ صفیہ اختر کی وفات کے بعد جاں نثار اختر کے سامنے اگرچہ ایک دنیا موجود تھی لیکن وہ اس دنیا سے محروم ہو چکے تھے جس کو انھوں نے صفیہ اختر کے ساتھ مل جل کر آباد کیا، جس کی رنگینی اور رعنائی صفیہ اختر کی ذات سے وابستہ تھی، جس کی بنیاد ان کے خلوص و محبت پر مبنی تھی، جہاں انھیں صفیہ اختر کی بے لوث محبت اور رفاقت میسر تھی، جہاں صفیہ اختر کا طوفانوں کے رخ موڑ دینے والا اعتماد تھا، ان کی کبھی نہ جھکنے والی وفا تھی، ان کی منتظر آنکھیں تھیں، آنکھوں میں سجے ہوئے دلکش سپنے تھے، عزم و ہمت عطا کرنے والی نگاہیں تھیں اور امید و یقین کو گرمانے والی نظریں تھیں، جہاں ان کی مسکراہٹیں تھیں اور غموں کو بھلانے والی ہنسی تھی۔ اسی کے ساتھ جاں نثار اختر سے وہ دنیا بھی چھن چکی تھی جس پر انھوں نے ناز کیے اور ناز اٹھائے تھے، جہاں کوئی کسی سے روٹھا تھا اور کسی نے اسے منا لیا تھا، جہاں کی فضا میں زندگی کے غم مسرت اور کلفتیں راحت بن جاتی تھیں اس دنیا کی محرومی اور ان فضاؤں کی بربادی پر جاں نثار اختر کا دل یقیناً غم سے فگار اور زخموں سے لالہ زار ہو گیا ہوگا اور ان کا ذہن بھڑکتے ہوئے شعلوں کی آماجگاہ بن گیا ہوگا ساتھ ہی ان کے دل کے آتش کدے میں صفیہ اختر نے محبت کی جو آگ روشن کی تھی وہ بھڑک اٹھی ہوگی اور اس کے لپکتے ہوئے شعلوں میں انھیں ہر طرف صفیہ اختر کے سائے نظر آ رہے ہوں گے جو مہر بہ لب محوِ گفتگو ہوں گے اس کے علاوہ صفیہ اختر کی جدائی نے وقت کی راکھ میں دبی ہوئی محبت کی یادوں کی چنگاریوں کو بھی بیدار کر دیا ہوگا اور ان تمام چیزوں نے غالباً جاں نثار اختر کے ذہن کو مختلف النوع کیفیات کا مسکن بنا دیا ہوگا وہ بیک وقت حزن و یاس، محرومی و ذہنی اور قلبی اضطراب کا شکار اور حسین و دلفریب یادوں کے رنگین جال میں گرفتار ہوں گے اور محرومی و کامرانی کی اس ملی جلی کیفیت کا براہِ راست اظہار کرنے میں اپنے کو مجبور محسوس کر رہے ہوں گے چنانچہ اپنی اس کیفیت کو ظاہر کرنے کے لیے انھوں نے صفیہ اختر کی

آواز کا سہارا لیا انھیں اپنا ترجمان بنایا اور اپنے بے چین و بے قرار دل کی کیفیات کا اظہار کرنے کی غرض سے انھوں نے اپنے خیال و احساس میں صفیہ اختر کی رفاقت و محبت سے لبریز ایک دنیا آباد کر لی "خاموش آواز" میں ایک ایسی ہی دنیا آباد نظر آتی ہے جس میں صفیہ اختر کی ایثار و قربانی اور ان کے خلوص کے بے حساب نقوش جلوہ گر ہیں، ہر طرف ان کے پیار کی چاندنی پھیلی ہوئی ہے اور جا بجا ان کی رفاقت میسر ہے اور ان کی محبت موجود ہے۔ یہ دنیا صفیہ اختر کے جلوۂ صد رنگ سے معمور ہے اور اس میں جاں نثار اختر ان کو چلتے پھرتے، سوتے جاگتے کام کرتے، ہنستے مسکراتے، خدمات انجام دیتے، غم گساری کرتے، حوصلہ بڑھاتے، ہمت بندھاتے، دکھوں کا مداوا کرتے، درد کا درماں تلاش کرتے، خلوص کی بارش کرتے، خفگی کا اظہار کرتے اور ان کی ہنسی، قہقہوں گنگناہٹ و سرگوشیوں کی آوازیں سنتے، ان کے ہاتھوں کی گرمی، نگاہوں کی موہنی اور چہرے کی تمازت کو محسوس کرتے نظر آتے ہیں غرض یہ کہ یہ دنیا صفیہ اختر کے ساتھ گزری ہوئی ان کی زندگی کی رعنائیوں و رنگینیوں سے لبریز ہے اس میں ہر طرف ان کی ازدواجی زندگی اپنی تمام رنگینیوں کے ساتھ بکھری ہوئی ہے، ہر طرف صفیہ اختر کی آوازیں گونج رہی ہیں، ان کے خلوص کی کرنیں جگمگا رہی ہیں اور ان کی محبت کی گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں، اس دنیا میں وہ صبحیں و شامیں ہیں جن کو صفیہ اختر نے لطافت و رونق بخشی تھی، وہ راتیں ہیں جنھیں انھوں نے اپنے پیار سے رنگینیاں عطا کی تھیں اور وہ گھریلو ماحول ہے جس کے درمیان جاں نثار اختر کو زندگی کا سب سے زیادہ قیمتی سکھ ملا تھا اور جس کے ختم ہو جانے پر ان کو زندگی کی شدید ترین تھکن سے دوچار ہونا پڑا تھا۔

"خاموش آواز" میں جاں نثار اختر نے اپنی تنہائی کی اذیت، جدائی کی محرومی اور حسرت و یاس میں گھرے ہوئے اپنے وجود کو ایک نئی معنویت عطا کر دی ہے، ذہن کے نہاں خانوں میں دبی ہوئی یادوں کو ظاہر کر کے انھوں نے اپنی بے چینی کا ہی اظہار نہیں کیا ہے بلکہ اس سے صفیہ اختر کو سمجھنے اور سمجھانے کی کامیاب کوشش بھی کی ہے۔

"خاموش آواز" گیت کے انداز کی نظم ہے جس میں جاں نثار اختر کو اپنا ترجمان بنایا ہے اور ان کی جدائی میں زندگی کی ایک سالہ تنہائی کی کربناک داستان انھیں سے سنوائی ہے، ان کی بے قراری، حرماں نصیبی اور شدید تھکن کا اندازہ ان اشعار سے ہوتا ہے جن میں صفیہ اختر ان کو مخاطب کر کے کہتی ہیں ؎

کتنے دن میں آئے ہو ساتھی … میرے سوتے بھاگ جگانے
مجھ سے الگ اس ایک برس میں … کیا کیا بیتی تم پہ نہ جانے
دیکھو کتنے تھک سے گئے ہو … کتنی تھکن آنکھوں میں گھلی ہے
آؤ تمھارے واسطے ساتھی … اب بھی میری آغوش کھلی ہے

صفیہ اختر کی جدائی میں جاں نثار اختر حزن و یاس کی ایک عجیب کیفیت میں مبتلا تھے اور زمانے کی تبدیلیاں اور موسموں کے تغیرات اس میں مزید اضافہ کا سبب تھے، ہر صبح و ہر شام ان کے دل پر نئے زخم لگاتی اور ہر موسم ان کی بے قراری اور بے چینی کو بڑھا رہا تھا اپنی اس کیفیت کا اظہار انھوں نے صفیہ اختر کے جذبات کو پیش کر کے اس طرح کیا ؎

تم بن سارے موسم بیتے … آئے مجھ کو مست بنا کے
نرم گلابی جاڑے گزرے … میرے دل میں آگ لگا کے

. . . .

کتنی نکھری صبحیں گزریں … کتنی مہکی شامیں چھائیں
میرے دل کو دور سے تکنے … جانے کتنی یادیں آئیں

جاں نثار اختر نے صفیہ اختر کی رفاقت میں جو لمحات گزارے تھے ان کی تصویریں ان بندوں میں نظر آتی ہیں ؎

آؤ میں تم سے روٹھ سی جاؤں … آؤ مجھے تم ہنس کے منا لو
مجھ میں سچ مچ جان نہیں ہے … آؤ مجھے ہاتھوں پہ اٹھا لو
آؤ جاگی رات ہے ساتھی … پیار تمھارا دل میں بھر لوں
آؤ تمھاری گود میں ساجن … تھک کر آنکھیں بند سی کر لوں

صفیہ اختر کی رفاقت نے جاں نثار اختر کی زندگی میں صرف رنگینیاں ہی نہیں بکھیری تھیں بلکہ انھیں کار زار حیات میں شامل ہونے

حوصلہ بھی عطا کیا تھا، انھوں نے جاں نثار اختر کو امیدیں بندھائی تھیں اور ان کے عزائم کو گرمایا تھا، زندگی کی جدوجہد کے ہر سفر میں صبر و تحمل کا ثبوت دیتے ہوئے انھیں ہنس ہنس کر رخصت کیا تھا اور ایثار و قربانی کی مثال قائم کی تھی، جاں نثار اختر کے دل میں ان کا بخشا ہوا حوصلہ اور ہمت ان کی جدائی کے بعد بھی تازہ تھی چنانچہ ان کی وفات کے بعد وہ اس سے ایک دفعہ پھر نئی طاقت اور نئی توانائی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور محرومی و مایوسی کے اندھیروں میں ان سے روشنی حاصل کرتے نظر آتے ہیں ؎

میں جو تمھارے ساتھ نہیں ہوں — دل کو مت مایوس کرو تم
تم ہو تنہا تم ہو اکیلے — ایسا کیوں محسوس کرو تم
آج ہمارے لاکھوں ساتھی — ساتھی ہمت ہار نہ جاؤ
آؤ کروڑوں ہاتھ بڑھیں گے — ایک ذرا تم ہاتھ بڑھاؤ

"خاموش آواز" میں ایسے اور بھی بہت سے اشعار سامنے آتے ہیں جن سے صفیہ اختر مرحومہ کی سیرت کی متنوع خصوصیات اور کردار کے محاسن کا اندازہ ہوتا ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

میرے غم کا غم نہ کرو تم — اچھا اب سے غم نہ کروں گی
میرے ارادوں والے ساتھی — جاؤ میں ہمت کم نہ کروں گی
تم کو ہنس کر رخصت کر دوں — سب کچھ میں نے ہنس کے سہا ہے
تم بن مجھ میں کچھ نہ رہے گا — یوں بھی اب کیا خاک رہا ہے

"خاموش آواز میں" جہاں تک جاں نثار اختر کے درد و غم کا تعلق ہے ذیل کے بندوں سے اس کا اندازہ ہوتا ہے جن میں انھوں نے صفیہ اختر کی جدائی کے دوران کے جذبات کا اظہار کرکے ایک طرح سے اپنے احساسات کی عکاسی کی ہے ملاحظہ کیجیے۔

یہ تو پوچھو مجھ سے چھٹ کر — تیرے دل پر کیا کیا گزری
تم بن میری ناؤ تو ساجن — ایسی ڈوبی پھر نہ ابھری
ایک تمھارا پیار بچا ہے — ورنہ سب کچھ لٹ سا گیا ہے
ایک مسلسل رات کہ جس میں — آج مرا دم گھٹ سا گیا ہے

"خاموش آواز" کے درج بالا اشعار جاں نثار اختر کے شدید رنج و غم کو ظاہر کرتے ہیں اور ان سے جاں نثار اختر کے دل میں موجزن بے پناہ حسرت و یاس کے جذبات کا احساس ہوتا ہے لیکن اسی کے ساتھ جاں نثار اختر نے صفیہ اختر کی وفات کے غم کو اپنی بیش قیمت میراث تصور کرکے غم کو ایک مثبت کیفیت بھی عطا کی ہے۔ اس غم کو اپنے سینے میں سمو کر اسے سارے جگ کو روشن کرنے والی آگ بنانے کی اور اس سے انسانی زندگی کے غم کا عرفان حاصل کرنے کی کوشش بھی کی ہے، نظم میں صفیہ اختر کی اس درخواست سے اس کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے ؎

اچھا میرا غم نہ بھلاؤ — میرا غم ہر غم میں سمو لو
اس سے اچھی بات نہ ہوگی — یہ تو تمھیں منظور رہے بولو
میرے غم کو میرے شاعر! — اپنے جواں گیتوں میں رچا لو
میرے غم کو میرے شاعر — سارے جگ کی آگ بنا لو

مجموعی طور پر "خاموش آواز" جاں نثار اختر کی خوشگوار ازدواجی زندگی کی جو انھیں صفیہ اختر کی رفاقت میں میسر تھی اور ان کی کربناک تنہائیوں کی جو صفیہ اختر کی دائمی جدائی سے ان کے وجود میں تحلیل ہو گئی تھیں نہایت موثر تصویر ہے۔ یہ راہ عشق کی بے حساب کامرانیوں اور منزل عشق کی دردناک ناکامی کی داستان ہے۔ یہ نظم جاں نثار اختر کے دل میں موجزن پیار اور بے پناہ انسانی محبت کی مظہر بھی ہے اور ان کے دل میں بسیرا کئے ہوئے غم ناک جذبات کی عکاس بھی، اس میں وصل کی سرشاری و ہجر کی بے قراری کا امتزاج بھی ہے اور کامرانیوں و محرومیوں کی آمیزش بھی۔ کامرانیاں صفیہ اختر کی رفاقت کی اور محرومیاں ان کی جدائی کی۔ اس نظم میں انسان کی وہ سرشاری کی کیفیت بھی ہے جو گھریلو ماحول کے سکون سے پیدا ہوتی ہے اور وہ مقدس کرب بھی ہے جو جدائی پر یادوں کی امانت سے جگر کو خون کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ نظم بظاہر خاموش آواز ہے لیکن اس میں جا بجا گنگناہٹیں، مسکراہٹیں اور سرگوشیاں ہیں، اور آہیں، نالے و چیخیں بھی۔ اس نظم کے مطالعہ سے آتش رفتہ کا سراغ بھی ملتا ہے، ماضی کے خوش کن لمحات کی تصویریں بھی نظر آتی

ہیں ماضی قریب کے درد و کسک کی چنگاریوں کی جلن کا احساس
بھی ہوتا ہے، حال میں جھلسا دینے والے شعلوں کی لپک بھی محسوس
ہوتی ہے اور شاعر کے مستقبل پر گہرے یقین و اعتماد کا پتہ بھی چلتا
ہے۔ اس میں شاعر اگر خطِ وصل کے بے حساب تحفے اور سوغاتیں
اٹھائے نظر آتا ہے تو اسی کے ساتھ بے شمار آرزوؤں اور تمناؤں
کے جنازوں کا بوجھ اس کے ناتواں کندھوں پر رکھا ہوا محسوس
ہوتا ہے غرض یہ کہ "خاموش آواز" میں زندگی کی ہما ہمی بھی ہے،
قبرستان کی ویرانی بھی، خوشگوار یادوں کے حسین صنم خانے بھی
آباد ہیں اور حسرت و یاس کی قبریں بھی ۔ اس آبادی اور ویرانی
اور کامرانی و محرومی کے امتزاج اور لب و لہجہ کی دردمندی
و سوز و گداز نے نظم میں ایک عجیب سی فضا پیدا کر دی ہے،
پوری نظم غم کے کہرے میں ڈوبی ہوئی اور یادوں کی پرچھائیوں میں
گھری [illegible] ہے۔

"خاکِ دل" اور "خاموش آواز" کے علاوہ صفیہ اختر
کی وفات سے متعلق جاں نثار اختر کی دوسری مختصر نظموں
اور اشعار میں بھی کامرانی اور محرومی کی ایک ملی جلی کیفیت نظر
آتی ہے اور یادوں سے منور شاعر کے ذہن و دل کے نگارخانے
حزن و یاس کے کہرے میں ڈوبے ہوئے محسوس ہوتے ہیں نیز اس کے
رگ و پے میں زہرِ غم سرایت کیا ہوا معلوم ہوتا ہے یہاں مثال
کے لیے چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں ؎

میں لے کے جاؤں کہاں اپنے دل کے ٹکڑوں کو (تلاش)
مجھے ملے تو مرا شیشہ گر کہاں سے ملے

وہ "ندیم مطرب و ساقی" کہاں گم ہو گیا (غزل ۱۹..)
خلوتوں کی انجمن آرائیاں جاتی رہیں

ہزار پردۂ محمل اٹھے ہوئے ہیں تو کیا (تلاش)
وہ میری لیلیٰ آشفتہ سر کہاں سے ملے

جیون کی یہ چھائی ہوئی اندھیاری رات
کیا جانئے کس موڑ پہ چھوٹا تیرا ساتھ

پھرتا ہوں ڈگر ڈگر اکیلا لیکن (آخ[illegible])
شانے پہ مرے آج تلک ہے ترا ہاتھ

"استالن" سیاسی رہنما کی موت پر کہا گیا شخصی مرثیہ ہے۔
یہ ۹ بندوں پر مشتمل ہے اور "خاکِ دل" اور "خاموش آواز" کے
درمیان کے زمانے میں ۱۹۵۳ء میں کہا گیا ہے۔

"استالن" میں جاں نثار اختر نے استالن کی موت پر اظہار
افسوس کرتے ہوئے اس کی موت سے پیدا ہونے والے ہنگامہ رنج
و غم کی عکاسی کی ہے اور [illegible] کی اہمیت و عظمت کا ذکر کیا نیز
عالمی سیاست پر [illegible] اثرات کی نشاندہی کرتے
ہوئے اس کی خدمات بیان کی ہیں درج ذیل اشعار ملاحظہ کیجئے۔

تجھ میں [illegible] ادا کس کی ہے
سر [illegible] سے ترے سینے میں ضیا کس کی ہے

کو ریا! عزم بہت کس کا ترے جانبازوں میں
ہمکی [illegible] چھپی ہے تری آوازوں میں

[illegible] یہ ترے شعلوں میں لپک کس کی ہے
تیرے بڑھتے ہوئے قدموں میں دھمک کس کی ہے

"استالن" میں جاں نثار اختر نے اس کی خدمات بیان
کرنے کے بعد اس کی شخصی صفات مثلاً صاحب نظری، دیدہ وری
راہبری، عزم محکم اور جہد پیہم کا ذکر کیا ہے، عوام کو اس کی راہ پر
چلنے کی دعوت دی ہے اور اس کی بتائی ہوئی منزل کو حاصل
کرنے کے لیے حوصلہ شوق کو مہمیز کرنے اور تیز قدم [illegible] کا پیغام دیا ہے ؎

[illegible] حوصلہ شوق کو مہمیز کرو
ہاں قدم تیز کرو تیز کرو تیز کرو

[illegible] فرمان [illegible] چلو
[illegible]

استالن کی موت پر جاں نثار اختر کے [illegible]
سیاسی نظریات کا شدید غلبہ ہے اور جذبات و احساسات [illegible]
نظریہ کی گرفت میں جکڑے ہوئے محسوس ہوتے ہیں اور اصل
یہ شخصی مرثیہ استالن کی موت پر اظہار افسوس سے زیادہ اشتراکیت

سے اس نقصان پر اظہار افسوس ہے جس کا احساس اسٹالن کے مرنے پر اُس زمانے میں ہر اشتراکیت سے دلچسپی رکھنے والے فرد کو ہوا تھا اسی لیے اس زمانے میں جب اشتراکی دنیا میں اسٹالن کو اہمیت و عظمت حاصل تھی یہ مرثیہ بھی اہمیت کا حامل تھا لیکن اب یہ صرف شاعر کی اشتراکیت سے غیر معمولی دلچسپی کی مثال کی سی حیثیت رکھتا ہے اس سلسلہ میں خود جاں نثار اختر کا بیان اس کا ثبوت ہے " اسٹالن کے بارے میں آج جو کچھ بھی کہا جائے، اس وقت اسٹالن اشتراکی نظام کی کامیابی اور اشتراکیت کا واحد سمبل یا علامت سمجھا جاتا تھا۔ اس نظم میں جو خلوص ہے وہ اسٹالن کے نام سے نہیں ہے اشتراکیت کے شدید اُنس کی بنا پر ہے " [؎]

اسٹالن کے شخصی مرثیہ میں جہاں تک شعری خصوصیات کا تعلق ہے اس میں زبان و بیان کی بہت سی خوبیاں نظر آتی ہیں۔ جا بجا روانی اور تسلسل بھی موجود ہے اس کے علاوہ اس کے بعض حصوں میں رجائی نقطہ نظر کی گرمی اور انقلابی آہنگ کا جوش بھی نظر آتا ہے اور یہ نظم جاں نثار اختر کے قدرت بیان کا ثبوت بھی مہیا کرتی ہے غالباً انہیں خصوصیات کے پیش نظر سردار جعفری نے لکھا ہے کہ " شعری حیثیت سے مجھے پسند ہے " [؎] ۔ لیکن ان خصوصیات کے باوجود جاں نثار اختر کی یہ نظم زیادہ متاثر نہیں کرتی، اشتراکی نظریہ کے شدید غلبہ نے اسے کمزور کر دیا ہے اس میں نہ تو کرب نغمہ بن سکا ہے نہ ہی نظریہ بھرپور شعریت میں ڈھل سکا ہے یہ قلبی کیفیات کے اظہار و جذبہ رنج و غم کے موثر بیان کے بجائے اشتراکیت کا پروپیگنڈہ بن کر رہ گئی ہے اس میں شاعری کا وہ رچاؤ اور شعریت بھی مفقود ہے جو شاعری کو نظریاتی اختلاف کے باوجود شعری حیثیت سے تسلیم کرنے پر آمادہ کرتی ہے اور جس کی بنا پر شاعری ہر عہد میں دلوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور ہمیشہ تازہ محسوس ہوتی ہے ۔ ایسی تخلیق جو بعض نظریاتی اختلافات یا زمانے کی تبدیلیوں کی بنا پر اپنی اہمیت کھو دے اور اس کے بارے میں نقاد یہ کہے کہ " اس مجموعے میں شامل نہ ہوتی تو بہتر تھا " [؎] شعری لحاظ سے نہ تو بلند معیار کہی جا سکتی ہے نہ بلند شعری کارنامہ قرار دی جا سکتی ہے ۔ کسی بھی تخلیق کی بلند شعری حیثیت کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ ہر زمانے ہر عہد میں تازہ محسوس ہوتی ہے اور ہر نظریے کے لوگوں کے دامن دل کو اپنی طرف کھینچتی ہے ، ہمارے شعری سرمایے میں اس کی بے حساب مثالیں ملتی ہیں ۔

دراصل جاں نثار اختر کے شخصی مرثیوں کی اصل خصوصیت اور ان کی شاعری کے امتیازی محاسن صفیہ اختر کی وفات پر کہے گیے شخصی مرثیوں میں ہی کھلتے ہیں ۔ یہ مراثی جاں نثار اختر کے گہرے دکھ درد اور الم ناک جذبات و محرومی کی کیفیات کو انتہائی موثر انداز میں پیش کرتے ہیں ، ان کے ہر شعر سے ان کے دل میں پنہاں بے پناہ غم و اندوہ کا اظہار ہوتا ہے اور ہر لفظ سے ذہنی کرب و قلبی دکھ کی کیفیت سامنے آتی ہے اسی کے ساتھ متوفی سے گہرا تعلق اور شدید محبت ظاہر ہوتی ہے اور اس کی انفرادی صفات سامنے آتی ہیں ۔ جاں نثار اختر کے ان شخصی مرثیوں کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ ان میں انھوں نے غم کو مثبت انداز میں اختیار کیا ہے ، موت و زندگی کو ایک نئے انداز سے دیکھنے کی کوشش کی ہے اور المیہ سے پیدا ہونے والے زہر غم کو اپنے خون میں شامل کر کے اسے جزو جان بنا لیا ہے ، نیز غم سے ایک قسم کی توانائی اور طاقت حاصل کرنے کی سعی کی ہے غالباً اسی خصوصیت کے پیش نظر سردار جعفری نے ان کے شخصی مرثیوں کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ :-

" بیویوں کی موت پر بعض شعراء نے نظمیں کہی ہیں لیکن تمھاری نظموں کی کیفیت کچھ اور ہی ہے جس نے ان کو بہت اہم بنا دیا ہے، ان نظموں میں زندگی کا مثبت تصور ہے جو غم کو غم تو سمجھتا ہے ، لیکن دنیا کے مسائل سے چشم پوشی نہیں سکھاتا ، اقبال کی نظم " تسلسلۂ غم " اور " والدہ مرحومہ کی یاد " کو چھوڑ کر باقی کوئی شخصی مرثیہ ایسا نہیں جس کا نام تمھاری نظموں کے ساتھ لیا جا سکے " [؎]

جاں نثار اختر کے شخصی مرثیوں کے بارے میں سردار جعفری کی یہ رائے گہرے غور و فکر پر مبنی ہے اور ان کے

مرثیوں سے ایک اہم پہلو کو نمایاں کرتی ہے لیکن اس سلسلہ میں علی سردار جعفری صاحب نے اقبال کی جن نظموں کا ذکر کیا ہے ان میں اور جاں نثار اختر کے شخصی مراثی میں اسی حد تک مماثلت ہے کہ دونوں کے یہاں زندگی کا مثبت تصور کار فرما ہے اور غم کو عمیری روپ میں اختیار کیا گیا ہے مگر جہاں تک اقبال کی مذکورہ نظموں کی مجموعی فضا کا تعلق ہے ان کی ساری فضا فلسفیانہ ہے اور فلسفہ کا رنگ اتنا گہرا ہے کہ جذبہ و احساس پناہ مانگتے نظر آتے ہیں اور دل پر عقل کا سخت پہرہ لگا ہوا محسوس ہوتا ہے دل کہیں بھی تنہا نظر نہیں آتا جب کہ جاں نثار اختر کے یہاں صفیہ اختر کی ذات پر کہے گئے مرثیوں میں دل کے قریب اگرچہ پاسبان عقل موجود ہے مگر اس نے دل کو تنہا بھی چھوڑا ہے جس کی بنا پر ان کے مرثیوں میں کبھی دل کے عمیق جذبات غم زدہ محسوسات کو بھرپور انداز میں ابھرنے کے مواقع ملے ہیں۔

جاں نثار اختر کے شخصی مرثیے اصل میں "مرثیے" ہی ہیں جو غم کے مثبت تصور، زندگی کے رجائی نقطہ نظر، انسانی دکھ درد کے فنکارانہ اظہار اور قلبی کیفیات کے صداقت سے بھرپور بیان کے لحاظ سے اردو کے ترقی پسند شعراء کے شخصی مرثیوں میں جداگانہ نوعیت و امتیازی حیثیت کے حامل ہیں اور پروفیسر آل احمد سرور کے الفاظ میں "فکر و فن کے ایسے مرثئے ہیں جن کی رعنائی اور لالہ کاری کبھی ماند نہیں ہو سکتی"۔ [۸]

[۱] جاں نثار اختر اور اس کی شاعری "خاک دل صفحہ ۱" [۲] پیش لفظ۔ دو دان صفحہ، (جاودداں کا انتساب صفیہ اختر کے نام ہے اس انتساب کے سلسلہ میں جاں نثار اختر نے یہ اعتراف کیا ہے) [۳] - [۴] - ایک خط۔ سردار جعفری) خاک دل صفحہ ۱۱ [۵] - [۶] - (ایک خط سردار جعفری) - خاک دل صفحہ ۱۱ - ۱۴ - [۷] پچھلے پہر صفحہ ۶ -

سراج مرزاپوری
۲۲، دائرہ شاہ اجمل الہ آباد

غزل

دل سے ارمانوں کی جب جلوہ گری جاتی رہی
زندگی تو رہ گئی زندہ دلی جاتی رہی

چار دن دنیا سے ناتے ہو میں جب لینے کے بعد
زندگی کہنا کہ فریب زندگی جاتی رہی

رک گئی جب ایک مرکز پر نگاہ جستجو
ذہن احساسات کی آوارگی جاتی رہی

یوں کسی نے ساغر زہراب کے بوسے لیے
لمحہ بھر میں عمر بھر کی تشنگی جاتی رہی

پختگی پیدا ہوئی جو غم کے احساسات میں
پیکر احساس کی تر دامنی جاتی رہی

کوشش ناکام کی ایسی بڑھیں تاریکیاں
دل سے شمع آرزو کی روشنی جاتی رہی

میں نہ کہتا تھا کہ کوئی غیر سنجیدہ نہ ہو
آخرش ماحول کی سنجیدگی جاتی رہی

زندگی بن جائے گی آغوش دریا کا سکوت
وقت برہم کی اگر ناراضگی جاتی رہی

حوصلہ پاتے ہی اظہار تمنا کا سراج
غیرت دل جذبۂ محتاط کی جاتی رہی

محمد نعیم صبا
۵۴ ۔ محلہ نور محل ۔ جی پی او
بھوپال (ایم پی)

باپو

تھا آزادی کا شیدائی، اہنسا کا پجاری تھا
سفیرِ امن و راحت تھا نقیب بردباری تھا
چھڑایا اس نے بھارت کو غلامی کے شکنجے سے
بچایا اس نے ساری قوم کو گوروں کے دندے سے
وہ تھا اپنے وطن کا محسنِ اول حقیقت میں
اجالوں کا تھا قاصد تیرہ بختی کی حکومت میں
سبھی ذاتوں کے انساں اس کی نظروں میں برابر تھے
سکھ و ہندو و مسلماں اس کی نظروں میں برابر تھے
وہ بندہ تھا محبت کا عداوت کا وہ دشمن تھا
نہایت پیار کا رحم و کرم کا ایک گلشن تھا
تپسیا کا سبق اس نے دیا سنسار والوں کو
سکھایا تیاگ اس نے خود غرض بے فیض لوگوں کو
غریبوں بے بسوں کے سر پہ تھا اک سایہ رحمت کا
وہ مرد کامل و سادہ بڑا رہبر تھا بھارت کا
دلوں کو اتحاد اور بھائی چارے سے بھرا اس نے
بھلائی کے عوض چاہا نہ کوئی بھی صلہ اس نے
محبت سے عقیدت سے جسے کہتے ہیں ہم باپو
ادب سے اور عزت سے جسے کہتے ہیں ہم باپو
اسی باپو کے سپنوں کو ہمیں سچ کر دکھانا ہے
وطن کی آبرو کے واسطے ہر دکھ اٹھانا ہے

مومن خاں شوقی
اشرف ولا ۲۳، ۷-۳-۱۱ تلے یلی،
حیدرآباد-۱...۵

دیوالی کا سندیس

دیپ جلاؤ
دیوالی کے دیپ جلاؤ
پیار محبت، بھائی چارہ
ہم سب کا ہو ایک ہی نعرہ
بستی بستی، آنگن آنگن
جگمگ جگمگ ہو اجیارا
رہے نہ کوئی غم کا مارا
دیوالی کے دیپ جلاؤ
آشاؤں کے گیت سناؤ
رنگوں کی تقدیس کو سمجھو
رنگوں کی توقیر کو جانو
دیپ جلاؤ، دیپ جلاؤ
ہندو، مسلم، سکھ عیسائی
بھارت کے رہنے والوں نے
جیون کی تیرہ راہوں میں
یگ یگ دیپ جلائے ہیں
دیوالی پھر آئی اب کے
کیسی نئی سوغات لیے
دین، دھرم کے رشتے ناطے
ہوں مضبوط تو مہکے گلشن
بھارت دھرموں کا گلدستہ
بھارت تہذیبوں کا وطن
دیوالی کا یہ سندیس
دھرتی جاگے، جنتا جاگے
جاگے سب سنسار

شاہ فاروق عطا
۲۹۔ سی پارک روڈ، لکھنؤ

گاندھی جی — ایک آفاقی شخصیت

غلامی، غربت، نفرت، تعصب، جہالت اور سامراج کے خلاف مہاتما گاندھی نے جو ناقابلِ شکست جنگ شروع کی تھی، اس کے نقوش جاوداں آج عالمی تاریخ کے ایک ایک صفحہ پر موجود ہیں۔ آج بھی یہ معرکہ جاری ہے۔ افریقہ کے جھلستے ہوئے ریگزاروں پر آج بھی جو سیاہ افریقی لہو ذرّوں کی مانند چمک رہا ہے، یہ ان بہادروں کا لہو ہے جو گاندھی کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے حق و انصاف اور آزادی کے حصول کے لیے بڑی سے بڑی مادی طاقت سے ٹکرا جانے کا حوصلہ لے کر رہوڈیشیا اور جنوبی افریقہ میں نبرد آزما ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ساری دنیا میں انسانیت اور آزادی کے پرستار بڑی عقیدت اور بڑے خلوص سے گاندھی کو یاد کرتے ہیں اور انسانیت کو غلامی سے نجات دلانے کا عہد کرتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ گاندھی ہندستان میں پیدا ہوئے اور ہندستان کی مقدس سرزمین ان کی سرگرمیوں کا مرکز رہی ہے لیکن گاندھی کے مشن نے ہمہ گیر وسعتیں اختیار کیں اور انھیں ایک آفاقی حیثیت دے دی۔ اس حقیقت کا اعتراف ہر جگہ کیا گیا ہے۔

امریکہ میں سیاہ فام حبشیوں کو گاندھی کی تعلیمات اور عملی زندگی نے بہت متاثر کیا تھا۔ نسلی امتیاز کے خلاف وہاں جو تحریک چلائی گئی اس کے قائد مارٹن لوتھر کنگ نے گاندھی کی یاد میں منعقد ہونے والی ایک کانفرنس میں کہا تھا۔ اگر مہاتما گاندھی چند برس اور زندہ رہ جاتے تو وہ امریکہ، افریقہ اور ایشیا و لاطینی امریکہ میں ان تحریکوں کی قیادت کرتے جو نسلی امتیاز اور غلامی کے خلاف چلائی جا رہی ہے اور ان تحریکوں کی کامیابی میں وہ تاخیر نہ ہوتی جو مشاہدہ میں آرہی ہے۔" مارٹن لوتھر کنگ نے کہا تھا کہ ان کی تحریک سیاہ فاموں کو باوقار مقام دلانے میں ایک بڑی حد تک کامیاب ہو رہی ہے لیکن وہ نسلی امتیاز کے خلاف امریکہ کے عوام کا ضمیر جھنجھوڑنے میں ابھی تک کامیاب نہیں ہو سکے۔ ظلم و ناانصافی کے خلاف انسانیت کو بیدار کرنے اور ظالموں کا ضمیر جھنجھوڑنے میں گاندھی کو جو ملکہ حاصل تھا وہ کسی دوسری بڑی شخصیت کو حاصل نہ ہو سکا۔ یہی گاندھی کی عظمت کی دلیل ہے۔ مارٹن لوتھر کنگ نے جس حقیقت کا اعتراف کیا تھا وہ سچائی پر مبنی تھا اور ہوا بھی یہی کہ گاندھی کے اس معتقد کو بڑی بےدردی سے قتل کر دیا گیا۔ ایک بڑے مقصد کے لیے متاعِ زندگی کو ہنستے ہنستے قربان کرنے کا وصف مارٹن لوتھر کنگ نے گاندھی سے ہی اخذ کیا تھا اور کنگ جیسا شخص جو امریکی عوام کے ضمیر کو بیدار نہ کر سکنے کا شکوہ کر رہا تھا، گاندھی کی طرح، اپنا خون بہا کر سارے عالم کو جھنجھوڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ امریکی عوام نے سیاہ فام اقلیت کے ساتھ انصاف کرنے کی ضرورت محسوس کی اور عوامی زندگی نیز اقتدار میں انھیں واجبی حصہ دینے کی دستوری گنجائش پیدا کی۔

گاندھی کے فلسفہ پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، دنیا کی ہر لائبریری میں گاندھی کی زندگی اور فلسفہ پر ضخیم کتابیں موجود ہیں، لیکن گاندھی کا فلسفہ بہت سیدھا سادہ اور عام فہم تھا، ایسا فلسفہ جو ایک عام آدمی کے دل و دماغ کو متاثر کر دے، ان کی بنیادی فکر یہ تھی کہ اگر مقصد پر یقین و اعتقاد ہے تو اسے حاصل کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی جائے یہاں تک کہ اگر ضرورت ہو تو اس کے حصول کے لیے جان بھی قربان کر دی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی پرارتھنا

سبھاؤں میں عدم تحفظ کا ماحول دیکھتے ہوئے بھی ان میں پابندی
سے شرکت کی اور محبت کا پیغام جاری رکھا۔ وہ جانتے تھے کہ پرارتھنا
سبھاؤں میں وہ جو پیغام دے رہے ہیں اس پر سارے ملک کی
نظریں لگی ہیں اور ان کی ہر بات ہر شخص تک پہنچ رہی ہے' وہ یہ بھی
محسوس کر رہے تھے کہ پرارتھنا سبھاؤں سے ان کا جو پیغام نشر
ہو رہا ہے وہ ہر ہندستانی کے ضمیر کو متاثر کر رہا ہے اور وہ مطمئن تھے
کہ ان سبھاؤں سے ان کے عظیم مقصد کی تکمیل ہو رہی ہے اسی لیے
عدم تحفظ کے تمام امکانات کے باوجود وہ بڑی بے خوفی اور ہمت
کے ساتھ محبت کا پیغام نشر کرتے رہے اور بالآخر اپنے مقصد کے
حصول کے لیے قربان ہو گئے۔ بے خوفی اور جرأت گاندھی کی زندگی
کے بنیادی اوصاف تھے۔ ہر انسان سے محبت اور ان کا بنیادی
ایمان تھا۔ ہمارے ملک کے دستور اساسی اور ہماری خارجہ پالیسی پر
گاندھی کے اثرات آج بھی پوری طرح کارفرما نظر آتے ہیں۔
... سے لازوال دوستی کی پالیسی بھی گاندھی کے تصورات
سے ہم آہنگ ہے۔ سامراج کے خلاف فلسطینی عوام نے جو آزادی
کی جنگ شروع کی ہے اس کے بڑے بڑے قائد گاندھی سے
متاثر ہیں اور بے خوفی سے مقصد کے لیے جنگ کر رہے ہیں۔
ویت نام میں نہتے عوام نے سامراج کے خلاف جو گوریلا جنگ
شروع کی تھی اور جس کا مغربی پریس نے ہمیشہ مذاق اڑایا تھا،
وہ جنگ بھی گاندھی کے اس فلسفہ سے متاثر تھی کہ "انصاف کے
لیے بڑی سے بڑی مادی طاقت سے ٹکرا جانا ہی انسانیت ہے۔"
ویت نام کے عوام کی جد و جہد میں ہمارے ملک نے جو زبردست
حمایت کی تھی وہ بھی اسی جذبہ کی آئینہ دار تھی۔ اس طرح ۳۰ سال
گزر جانے کے بعد بھی گاندھی اور اس کے فلسفہ کو فنا نہیں کیا جا سکا
ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ حق کے لیے شہادت کے بعد گاندھی نے
عظیم آفاقی رہنما اور تاریخ ساز شخصیت کا جو مرتبہ حاصل کر لیا تھا
اس کے احترام میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور ساری دنیا
میں حق و انصاف کے طلبگار گاندھی سے فیض حاصل کرتے رہیں گے۔

★

نثار چنگیزی
بسپروا چندن پور
کھوبا بازار۔
ضلع گورکھپور۔ ۲۰۳۱۳۲

کرکے اب پرنام چلے

ایسا کچھ کر جائیں بھائی جس سے سب کا کام چلے
اس کا جینا کیا جینا ہے جو ہو کر بے نام چلے
جو بے مقصد چلتا ہو وہ صبح چلے یا شام چلے
اس کو جگ سے کیا ملنا ہے چاہے چاروں دھام چلے
نندن بن کے جیون کی خاطر اوروں کا سکھ لینا کیا
سکھ اپنے جیون میں نہیں تو دکھ کا رستہ تھام چلے
سارے جگ کے جیون داتا ہو اپنی قسمت میں تو
تھوڑی سی خوشیاں بھی دینا جس سے اپنا کام چلے
دنیا ہے جو اس نگری میں راون جیسا کام نہ کر
ایسی چال چلا کر بھائی جیسی لچھمن رام چلے
جیب میں جب ادھکا[1] ہو پیسہ چیزیں سستی لگتی ہیں
آؤ چلیں بازار بر اچھیں جب تک اپنا دام چلے
نام کو اونچا مت کر پیارے ناموں میں کیا رکھا ہے
کام اسے پہنچوا دے گا بن کر جو گمنام چلے
جو ماٹی سے فصل اگائے وہ انسان تو سونا ہے
وہ سونا ہو کر ماٹی ہے جو بن کر گلفام چلے
مجھ کو تو جو کچھ بھی کہنا تھا وہ میں نے کہہ دیا نثار
اچھا تو اے لوگو رخصت کرکے اب پرنام چلے

[1] زیادہ

اتر پردیش میں
خشک سالی کا مقابلہ کرنے کے لیے جنگی پیمانے پر اقدامات

ادارہ

اتر پردیش کے وزیر اعلا شری بنارسی داس نے گذشتہ دنوں ریاست گیر خشک سالی سے ہونے والے زبردست نقصانات کا ذکر کرتے ہوئے سرکاری افسروں اور ملازمین، مالی اداروں اور سماجی خدمت کرنے والے رضا کار اداروں سے مل جل کر جنگی پیمانہ پر ان تباہ کاریوں کا مقابلہ کرنے کی اپیل کی۔

انھوں نے خشک سالی سے ریاست کی خریف کی فصل تقریباً پوری طرح سے تباہ ہو جانے کی وجہ سے بنکوں سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنے بقایہ جات کی وصولی کم سے کم چھ ماہ کے لیے ملتوی کر دیں۔ انھوں نے غریب اور کمزور طبقوں کو بلا ضمانت ۵۰۰ روپیہ تک کا صارفین قرض فوری فراہم کیے جانے کے لیے بنکوں سے ضروری کارروائی کرنے کی درخواست کی خشک سالی کے سلسلے میں اسٹیٹ بنک کی دیہی علاقوں میں اپنی شاخوں کو پمپنگ سیٹوں اور ہینڈ پمپوں کے لیے فیاضی سے قرض دینے کی ہدایت کی تعریف کرتے ہوئے شری بنارسی داس نے دیگر بنکوں سے اس کی تقلید کرنے کی اپیل کی۔

○ خشک سالی سے متاثرہ اضلاع میں آبپاشی وسائل کے لیے امداد باہمی زرعی قرض کی رقم میں فی الفور اضافہ کر دیا گیا ہے۔

اس ضمن میں جاری احکامات کے مطابق کسانوں کو زرعی ساز و سامان کی شکل میں جو قرض دیا جاتا تھا اس کے علاوہ ضروری زرعی اخراجات کے لیے قلیل مدتی نقد قرض کی خصوصی سہولتیں بھی دی جا رہی ہیں۔

○ ریاستی حکومت نے خشک سالی سے متعلق تمام کاموں کے سلسلے میں ہر ضلع میں مشاورتی ہنگامی خشک سالی کمیٹیاں تشکیل دی ہیں۔ اس کمیٹی کی سربراہی ریاستی کابینہ کے ممبران کریں گے اور ایڈیشنل ضلع مجسٹریٹ اس کے کنوینر ہوں گے۔ ضلع کے تمام ممبران مجلس قانون ساز اور راجیہ سبھا اور تحلیل شدہ لوک سبھا کے ممبران، ضلع مجسٹریٹ اور دیگر متعلقہ محکمہ کے افسر اس کے ممبر ہوں گے۔

○ وزیر اعلا شری بنارسی کی صدارت میں گذشتہ دنوں ہونے والے ایک اعلا سطحی جلسہ میں خشک سالی کا مقابلہ کرنے اور بڑھتی ہوئی مہنگائی کی روک تھام کے لیے متعدد موثر اور فوری اقدامات کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

دیہی علاقوں میں زیادہ بجلی کی فراہمی کے لیے یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ ہنڈالکو کو صرف ۳۵ میگاواٹ بجلی دی جائے اور ریاست میں بجلی کی مجموعی پیداوار کا ۶۶ فیصد زرعی کاموں کے لیے دیا جائے۔

یہ فیصلہ بھی کیا گیا ہے کہ آرک فرنیس کو بجلی بالکل نہ دی جائے۔ صرف پمپ سیٹوں، جنریٹنگ سیٹوں اور ٹرکوں کے استعمال کے لیے فاضل ڈیزل کا بندوبست کیا جائے گا۔

وزیر اعلا نے ریاست میں زبردست خشک سالی کا مقابلہ کرنے کے لیے تمام پارٹیوں سے اپیل کی ہے کہ وہ سیاسی اختلافات کو فراموش کر کے نیز تحریک چلانے اور نکتہ چینی کرنے کے بجائے زیادہ کام کرنے کا رجحان پیدا کرنے کے لیے تعاون کا ماحول قائم کریں۔ تاکہ عوام کا حوصلہ بلند رہے۔

وزیر اعلا نے ۱۱ ستمبر کو تمام پارٹیوں کی تشکیل شدہ خشک سالی مشاورتی کمیٹی کے پہلے جلسے کو لکھنؤ میں ودھان بھون کے تلک ہال میں خطاب کرتے ہوئے کہا کہ وسیع علاقوں میں پھیلی ہوئی نہریں کاٹنے کی روک تھام کرنے میں تمام لوگوں کا تعاون درکار ہے۔ کلم

حکومت تنہا نہیں انجام لے سکتی۔ اسی طرح موجودہ صورت حال میں ملازمین کی جانب سے بجلی سے متعلق کام میں کسی طرح کی رکاوٹ پیدا کرنا ایک سنگین سماجی جرم ہے۔

وزیر اعلا نے کہا کہ حکومت اس بحران سے مقابلے کے لیے ہر ممکن کوشش کر رہی ہے۔ ریاست میں ایک شخص کو بھی بھوک سے مرنے نہیں دیا جائے گا۔ خشک سالی سے خریف کی فصل کو جو نقصان پہنچا ہے اس کی تلافی کے لیے ربیع میں کوشش کی جائے گی۔ اس کے لیے ایسی فصلوں کی پیداوار پر زور دیا جائے گا جن کے لیے کم پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً چنا، جو اور مٹر وغیرہ

وزیر اعلا نے یہ بھی اعلان کیا کہ کھاد اور بیج کی قلت نہیں ہونے دی جائے گی۔ یہ تمام اشیا سبھی اضلاع کو بر وقت مہیا کی جائیں گی۔ زرعی کاموں کے لیے روزانہ پانچ گھنٹے بجلی سپلائی کرنے کا بندوبست کیا گیا ہے۔

○ خشک سالی سے متاثر ہونے والے مویشیوں کی حفاظت اور بیماری کی روک تھام کی غرض سے ریاستی نگہداشت مویشیاں نظامت نے یہاں صدر مقام پر ایک کنٹرول روم قائم کر دیا ہے جو صبح ۹ بجے سے رات ۱۰ بجے تک کام کرے گا۔

کنٹرول روم کا ٹیلیفون نمبر ۴۵۳۸۱ ہے۔

○ وزیر اعلا نے تاجروں سے کہا ہے کہ وہ اس بحران کے وقت منافع خوری اور ذخیرہ اندوزی سے باز آ جائیں۔ اس وقت جو بھی استحصال کرے گا، اس کے خلاف عوام میں برہمی پیدا ہوگی۔ ایسے عناصر کے خلاف حکومت بھی سخت کارروائی کرے گی۔ اس سلسلے میں تاجروں کے یہاں کئی مقامات پر چھاپے مارے گئے ہیں اور گرفتاریاں بھی کی گئی ہیں۔

○ تمام اضلاع میں نہروں اور سرکاری ٹیوب ویلوں کے باقاعدہ طور پر چلتے رہنے کی صورت حال سے باخبر رہنے کے لیے کنٹرول روم قائم کیے گئے ہیں جن میں محکمہ آبپاشی کا ایک گزیٹیڈ افسر ہر وقت موجود رہتا ہے۔

○ ریاست میں خشک سالی کا مقابلہ کرنے کے لیے چیف سکریٹری کی صدارت میں تشکیل کردہ اختیاری کمیٹی کو بتایا گیا ہے کہ خشک سالی کا مقابلہ کرنے کے لیے ریاست کے تمام نہری نظاموں کو پوری صلاحیت کے ساتھ چلایا جا رہا ہے۔ شاردا سہایک نہر کے ۱۲۰۰۰ کیوسکس کے مقابلہ میں ۱۳۰۰۰ کیوسکس پانی دیا جا رہا ہے۔

○ اتر پردیش صارفین فیڈریشن نے ریاست میں خشک سالی کی موجودہ صورت حال کے پیش نظر عوام کو روزمرہ استعمال کی ضروری اشیا مناسب قیمتوں پر فراہم کرنے کی غرض سے ایک خصوصی تقسیم پروگرام شروع کیا ہے جس کا مقصد کھلے بازار میں قیمتوں پر کنٹرول رکھنا بھی ہے۔

○ ریاستی حکومت نے خشک سالی اور سیلاب سے متاثرہ اضلاع میں امداد کے لیے تقریباً چار کروڑ روپیہ اور ۱۳۰۰۷۰ ٹن گیہوں الاٹ کیا ہے۔ اس میں سے ۲٫۶۶ کروڑ روپیہ اور پورا گیہوں مفت کا امداد کے طور پر الاٹ کیا گیا جسے مستحق افراد میں مفت تقسیم کیا جائے گا۔

○ ریاست میں خشک سالی کے روزمرہ کے مسائل پر غور و خوض کرنے کے لیے وزیر اعلا شری بنارسی داس کی صدارت میں کابینہ کی ایک ذیلی کمیٹی کی تشکیل کی گئی ہے۔ نائب وزیر اعلا شری نرائن سنگھ ذیلی کمیٹی کے نائب صدر اور زراعت، آبپاشی، دیہی ترقی، بجلی، مالیات، ہوم گارڈ، چھوٹی آبپاشی، تعمیرات عامہ، جنگلات اور غذا و رسد کے محکموں کے وزرا اس کمیٹی کے ممبران ہوں گے۔

ضلع خشک سالی کمیٹیوں کی بھی نو تشکیل کی گئی ہے جس میں جنتا (ایس)، جنتا، کانگریس (ارس) اور اندرا کانگریس کے ضلع صدر شامل رہیں گے۔ بعض اضلاع میں کمیونسٹ پارٹی کے صدر بھی ان کمیٹیوں میں شریک رہیں گے۔

★

نقد و تبصرہ

تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب :- **شعلۂ نیم سوز** (نظموں کا مجموعہ)
مصنف :- فضا ابن فیضی - صفحات - ۲۸۸ تقطیع ۲۶ × ۲۰
قیمت - چالیس روپے - ناشر :- فیضی پبلیکیشنز، مئوناتھ بھنجن (یوپی) ۲۷۵۱۰۱

ادبی گفتگوؤں اور تبصروں میں جب فضا ابن فیضی کا ذکر آتا ہے تو ان کی شاعری کی ایک خصوصیت کا خاص طور پر اظہار و اعتراف کیا جاتا ہے۔ وہ ہے قدیم و جدید کا امتزاج۔ مگر مشکل یہ ہے کہ ہر شاعرے کا ہر ناؤنسر ہر شاعر کے تعارف میں اس قدیم و جدید کے امتزاج (بلکہ حسین امتزاج) کو اس شاعر کی خاص خصوصیت قرار دیتا ہے۔ شعری مجموعوں کے تبصروں یا تعارفی تحریروں پر نظر ڈالیے وہاں بھی یہی قدیم و جدید کا امتزاج بطور خاص مذکور ہوگا۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اردو کے ہر اچھے برے شاعر کے یہاں قدیم و جدید کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ اور یہ حقیقت بھی ہے۔ دراصل قدیم و جدید کا امتزاج کسی ایک شاعر کی خصوصی صفت نہیں بلکہ ہر شاعر کی مجبوری ہے۔ اگر وہ ایسی شاعری کرنا چاہتا ہے جسے محض ہیئتی یا لسانی تجربہ نہ سمجھا جائے تو وہ کوشش کے باوجود روایت یعنی قدامت کی پرچھائیں سے بھاگ نہیں سکتا۔ اگر وہ خالص قدیم رنگ میں شاعری کرنا چاہتا ہے تو اس کے لیے اسے ماضی میں جینا پڑے گا جو ممکن نہیں، اس کا حال یعنی اس کا اپنا عہد اس کے شعر پر اپنا سایہ ڈال ہی دے گا۔ غرض شاعر کے لیے قدیم و جدید کا امتزاج اختیاری نہیں ناگزیر ہے۔ البتہ اس امتزاج کی نوعیت شاعر بہ شاعر مختلف ہو سکتی ہے۔ اور امتزاج میں یہ اختلاف اس پر منحصر ہے کہ شاعر روایت کے کن عناصر سے کس حد تک واقف اور متاثر ہے اور آج کے انسان کے داخلی اور خارجی مسائل کو کس طرح دیکھتا اور پیش کرتا ہے۔

قدیم و جدید کا امتزاج فضا ابن فیضی کی بھی مجبوری ہے لیکن فضا نے اپنی اس مجبوری سے فائدہ اٹھایا ہے۔ ان کے یہاں شعر کے روایتی عناصر ماضی کی طرف مراجعت کی کوشش نہیں معلوم ہوتے بلکہ ہماری شعری لسانیات کے تسلسل کی کڑیوں کے طور پر سامنے آتے ہیں اور اسی تسلسل کی موضوعاتی کڑیاں آج کے انسان کے تجربات اور محسوسات ہیں جو "شعلۂ نیم سوز" کی نظموں میں بکھرے پڑے ہیں۔

میں سر سے تا بہ قدم تھا غریقِ تلخابی
کسی کو تحفۂ قند و گلاب دے نہ سکا
ہزار یوسفِ دل نے مرے خرابی کی
میں اس کو چشمِ زلیخا کے خواب دے نہ سکا
ہوں اپنے دور کے اہلِ طرب سے شرمندہ
کہ زندگی کو نشاطِ شباب دے نہ سکا

"شعلۂ نیم سوز" کی سرسری ورق گردانی کیجیے تو جہاں موضوعات کے تنوع پر حیرت ہوتی ہے وہاں ایک طرح کی بدظنی بھی پیدا ہوتی ہے۔ کشمیر پر نظم، مصر کی ریاست پر نظم، جنرل ایوب خاں اور محمد علی بوگرہ پر نظمیں، رانچی اور احمد آباد کے فسادات، دارالمصنفین اعظم گڑھ، شیخ عبداللہ، جواہر لال نہرو اور قومی یک جہتی کونسل پر نظمیں، میر و غالب، انیس و جگر، مجاز، فیض وغیرہ پر نظمیں، یہ فہرست خاصی پریشان کن معلوم ہوتی ہے اور اندیشہ ہوتا ہے کہ یہاں ہمیں اسی پامال شاعری سے دوچار ہونا پڑے گا جو بعض مشاعروں کے بہت سے شاعروں اور بعض رسالوں کے بہت سے صفحوں کو ناقابل برداشت بنا دیتی ہے، اس لیے کہ آج کی بدترین شاعری یہی حسب موقع اور حسب فرمائش قسم کی شاعری ہے جو بعد نکاح پڑھے جانے والے سہروں کی یاد دلاتی ہے۔ لیکن فضا کی یہ نظمیں ان مروجہ نظموں سے یکسر مختلف ہیں اس لیے کہ ان میں بھی فنی پختگی کے ساتھ وہی خلوص اور وہی تاثر و صداقتِ احساس جھلکتی ہے جو فضا کی دوسری نظموں کی خصوصیت ہے۔ اسی صداقت احساس کی وجہ سے یہ خالص رسمی اور خارجی موضوعات بھی فضا کے داخلی

وزیراعظم چودھری چرن سنگھ گزشتہ ۵ ستمبر کو نئی دہلی میں برطانوی ہائی کمیشن کے دفتر میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے انتقال پر اظہار تعزیت کرتے ہوئے تعزیتی رجسٹر پر دستخط کر رہے ہیں۔

ماہنامہ نیا دور لکھنؤ

اطفال نمبر

قیمت: ایک روپیہ
نومبر، دسمبر ۱۹۷۹ء

نیا دور

جلد ۳۶ نمبر ۸،۹

نومبر دسمبر ۱۹۷۹ء

ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

جوائنٹ ایڈیٹر: شاہ نواز قریشی

★

پبلشر: سمیندر کمار
ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اتر پردیش

پرنٹر: اشوک در
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ واسٹیشنری۔ یو پی
مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ۔ لکھنؤ
شائع کردہ محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ۔ اتر پردیش

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے
زر سالانہ: پانچ روپے

ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پبلی کیشن برانچ انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو۔پی۔ لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶۔ لکھنؤ

بذریعہ رجسٹری: ایڈیٹر نیا دور انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو پی لکھنؤ

کہانی - ڈرامہ

نظمیں

بچوں کا ادب

نظمیں

بچوں کی فلاح و بہبود

نظمیں

بچوں کی صحت

سرورق : عظمت

اس شمارے کی قیمت

صرف ایک روپیہ

اپنی بات

نیا دور کا اطفال نمبر پیش خدمت ہے۔ یہ دعویٰ تو نہیں کیا جا سکتا کہ یہ نمبر ہر اعتبار سے مکمل اور جامع ہے تاہم اتنا تو کہا ہی جا سکتا ہے کہ اس میں بچوں کے مختلف نوعیت کے مسائل کا جائزہ لیا گیا ہے اور ان کی مکمل فلاح و ترقی کی جانب توجہ مبذول کرائی گئی ہے۔ ہم اپنے مقصد کے حصول میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں اس کا فیصلہ قارئین کو کرنا ہے لیکن بہر حال امید ہے کہ نیا دور کے سابقہ نمبروں کی طرح آپ اس نمبر کو بھی معیاری پائیں گے۔ یہاں ہم ان تمام ادیبوں اور شاعروں کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں جنھوں نے ہماری درخواست پر اس خصوصی اطفال نمبر کے لیے اپنی گرانقدر تخلیقات اور مضامین ارسال فرمائے۔ اسی کے ساتھ ہی یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ اس نمبر میں تمام مضامین مختلف زمروں کے تحت شائع کیے گئے ہیں، اس لیے جو مضمون جس زمرہ سے متعلق تھا اسے اسی زمرے کے تحت شائع کیا گیا ہے۔ چنانچہ بعض ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات کو جنھیں ابتدائی صفحات پر شائع ہونا چاہیے تھا نسبتاً بعد کے صفحات پر ان کو جگہ دینا پڑی ہے۔ اس ترتیب سے کچھ اور مطلب نکالنا کسی طرح مناسب نہ ہوگا۔ اس کے علاوہ ہمیں اس کا بھی افسوس ہے کہ ملک کے بعض ممتاز قلم کاروں اور شعرا نے عدیم الفرصت ہونے کے سبب ہمیں شکر گزار ہونے کا موقع نہیں دیا۔ ان تمام کمیوں اور خوبیوں کے ساتھ یہ نمبر آپ کے سامنے ہے۔ اس کے متعلق اپنی رائے ضرور تحریر فرمائیے۔ ادارہ آپ کی رائے کا منتظر رہے گا۔

بچوں کی پرورش و پرداخت کے سلسلے میں ان کی نفسیات کو ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ بچے کا رجحان طبع کیا ہے؟ اسے سمجھے بغیر اسے کسی راستے پر لگا دینے کا نتیجہ منفی ہی ہوتا ہے۔ جہاں تک بچے میں تعمیری رجحانات اجاگر کرنے کا تعلق ہے، اس کے لیے ابتدا ہی سے کوشش کی جانا چاہیے۔ اس موقع پر ایک واقعہ یاد آیا ہے۔ ایک ماں اپنے چار سال کی عمر کے بچے کو اپنے وقت کے ایک مشہور فلسفی اور مفکر کے پاس لے گئی اور کہا کہ آپ اس کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں میری رہنمائی کیجیے۔ فلسفی نے جواب دیا "بی بی آپ نے بہت تاخیر کر دی۔ بچے کے ہونٹوں پر جب پہلی بار مسکراہٹ کھیلی تھی اسی وقت سے بچے کی تربیت کا دور شروع ہو گیا تھا۔" تعلیم کے ساتھ ساتھ ابتدا ہی سے اس کی ذہنی تربیت بھی ضروری ہوتی ہے اور اس ذہنی تربیت میں بچوں کا ادب خاص طور سے معاون و مددگار ہوتا ہے۔ لیکن ہماری زبان اردو کا المیہ یہ ہے کہ اس میں بچوں کے لیے لکھنے والوں کو انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اردو میں بچوں کے ادب اور بچوں کے ادیبوں کی اتنی ہمت افزائی بھی نہیں ہوتی جتنی کہ ہونا چاہیے۔ اس بنا پر بھی اردو میں بچوں کے ادب کو پوری طرح فروغ نہیں حاصل ہو سکا ہے۔ متعلقہ افراد اور اداروں نیز ناشروں کو اس جانب توجہ کرنا چاہیے۔

جو قلم کار بچوں کے لیے لکھتے یا لکھنا چاہتے ہیں، انھیں یہ حقیقت پیش نظر رکھنا چاہیے کہ یہ مافوق الفطرت کرداروں والی کہانیوں کا دور نہیں ہے۔ اس میں جنوں اور پریوں کی کہانیوں سے آج کے بچے کی کوئی تربیت نہیں کر سکتے۔ آج ایسا ادب تخلیق کرنا ہوگا جو بچوں کو منطقی اور سائنسی انداز فکر کے قریب لے جائے۔ اس سلسلے میں زبان کا بھی خاص طور سے خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے: بچوں کا ادب، بچوں کی زبان میں ہی ہونا چاہیے۔ بچوں کے ادب کا لیبل چسپاں کر دینے سے ہی کوئی ادب بچوں کا ادب نہیں ہو جاتا۔ دنیا کی دوسری زبانوں میں بچوں کے لیے بہترین ادب کی تخلیق ہو رہی ہے لیکن اردو میں اس جانب پوری طرح توجہ نہیں دی جا رہی ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ممتاز ادیب اور شاعر بچوں کے لیے لکھنا کسر شان سمجھتے ہیں۔

بچوں کو آج کی مغربیت زدہ سوسائٹی کے کلچر، نمائش پسندی، تشدد کی جانب جھکاؤ، تنگ نظری، تعصب، فرقہ پرستی اور دیگر تخریبی نیز ضرر رساں رجحانات سے محفوظ رکھنے کے لیے ابتدا ہی سے ان پر توجہ مرکوز رکھنا چاہیے اور ان میں سماجی شعور، ملک، قوم اور انسانیت کے لیے کچھ کرنے کا جذبہ اور اعلا اخلاقی و انسانی قدروں سے لگاؤ اور سیکولر انداز فکر پیدا کرنے کی کوشش بھی ابتدا ہی سے کرنا چاہیے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ابتدائی درجے سے ہی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کی ذہنی تربیت بھی کی جائے اور اس سلسلے میں ہر ممکن توجہ دی جائے۔ اسی صورت میں بچوں کو آنے والے کل کی تعمیر کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لائق بنایا جا سکے گا۔

یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ وہی ملک ترقی اور خوشحالی کے راستے پر گامزن ہیں اور برابر آگے بڑھتے جا رہے ہیں جہاں بچوں کی پرورش و پرداخت کے ساتھ ساتھ ان کی تعلیم و تربیت پر بھی زیادہ سے زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ بچوں کا یہ بین اقوامی سال اس اعتبار سے بھی مبارک ہے کہ اس نے پسماندہ غیر ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک میں بھی بچوں کے مسائل اور ان کی فلاح و ترقی کی جانب توجہ مبذول کرائی ہے۔ چنانچہ ان ممالک میں بھی اس سلسلے میں ایک بیداری جوش و خروش اور جذبہ پیدا ہوا ہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اس بین اقوامی سال اطفال کے بعد بھی یہ بیداری، جوش و خروش اور یہ جذبہ قائم رہے، تاکہ بے سہارا، نادار اور غریبی کی سطح سے نیچے زندگی گزارنے والے بچوں کے مسائل بھی حل کیے جا سکیں اور انھیں زندگی کی ہر سہولت فراہم کی جا سکے جس کے نتیجے میں ان کی فلاح و ترقی بھی یقینی ہو جائے۔

—— ایڈیٹر

نائب صدر جمہوریۂ ہند
نئی دہلی

پیغامِ امروز

مجھے یہ معلوم ہوکر بے حد مسرت ہوئی کہ اردو ماہنامہ نیا دور لکھنؤ بین الاقوامی سال اطفال ۱۹۷۹ء کے موقع پر ایک خصوصی شمارہ "اطفال نمبر" شائع کررہا ہے۔ درحقیقت یہ نونہالان قوم ہمارے آنے والے "کل" کی تقدیر ہیں۔ میرا یقین ہے کہ اگر فکروعمل کے شفاف پانی سے اس "پودے" کی آبیاری کی جائے تو ہمارے ملک اور قوم کے خوش آئند مستقبل کا راز اس میں پوشیدہ ہے۔

میری دعا ہے کہ آپ کی محنت کامران ہو۔

محمد ہدایت اللہ
(محمد ہدایت اللہ)

گورنر اتر پردیش
راج بھون
لکھنؤ

پیغام

یہ امر باعث مسرت ہے کہ عالمی سال اطفال کے موقع پر محکمۂ اطلاعات ورابطۂ عامہ کا اردو ماہنامہ "نیادور" "اطفال نمبر" شائع کر رہا ہے۔

عوام میں بیداری پیدا کرنے اور انھیں حکومت کی سرگرمیوں سے باخبر رکھنے کے سلسلے میں نیادور اہم خدمت انجام دے رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ خصوصی نمبر بچوں کی ہمہ گیر ترقی کے نقطۂ نظر سے مفید اور گرانقدر مواد پر مشتمل ہوگا۔

میں 'نیادور' کے 'اطفال نمبر' کی کامیابی کے لیے اپنی نیک خواہشات پیش کرتا ہوں۔

گنپت راؤ دیوجی تپاسے

گورنر بہار
پٹنہ

پیغام

بین الاقوامی سالِ اطفال کے موقع پر "نیادور" کے اطفال نمبر کی اشاعت مبارک اقدام ہے۔ بچے قوم کی بیاض ہیں، ملک کا گلدستہ اور تہذیب کی امانت ہیں۔ بچوں ہی سے قوم کا تسلسل قائم و دائم رہتا ہے۔ اس امر کی قطعی ضرورت ہے کہ اس "بیاض" کو تابناک بنانے میں ہمارا خونِ جگر شامل ہو، اس گلدستہ کی تزئین میں ہماری حسن کاری، دیانتداری اور تخلیق کاری کی ساری ہنرمندیاں شامل ہوں تاکہ ہم اپنے ملک اور قوم کی اس گرانقدر دولت کے بہ طریقِ احسن امین ہونے کا حق ادا کر سکیں اور تاریخ کے صفحات میں سرخرو ہو سکیں۔

میں بہ صمیمِ قلب ادارہ اور محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ، اتر پردیش کو اس خصوصی شمارہ کے لیے مبارکباد دیتا ہوں۔ خدا کرے یہ سعیٔ بلیغ ثمرآور ہو۔

آمین!

اخلاق الرحمٰن قدوائی
(اخلاق الرحمٰن قدوائی)

وزیراعلیٰ اتر پردیش

پیغام

مجھے یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ ماہنامہ "نیا دور" بین اقوامی سال اطفال کے موقع پر ایک خصوصی اطفال نمبر شائع کر رہا ہے۔

بچے ملک وقوم کا بیش بہا سرمایہ ہوتے ہیں اور مستقبل کو سنوارنے نیز ایک صالح اور صحت مند معاشرے کی تعمیر میں ایک کلیدی رول ادا کرتے ہیں۔

آج کے بچوں کو ہی آنے والے کل کی تاریخ بنانا ہے۔ اس لیے ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کی تمام ضرورتیں پوری کریں تاکہ ان کی صحیح پرورش اور مناسب نشو ونما ہو سکے نیز انھیں کارآمد، باصلاحیت اور لائق شہری بنایا جا سکے۔ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم ان کی تعلیم و تربیت پر بھی پوری توجہ دیں تاکہ وہ آنے والے کل کی ذمہ داریوں سے بھی بہ خوبی عہدہ برآ ہو سکیں۔

بچوں کے اس بین اقوامی سال کا مقصد یہی ہے کہ ہم اس سلسلے میں بچوں پر خصوصی توجہ مرکوز کریں۔ لیکن اس کا یہ مطلب قطعی نہیں ہے کہ اس بین اقوامی سال کے بعد بچوں کے سلسلے میں ہماری ذمہ داریاں ختم ہو جائیں گی۔ اس سال کے بعد بھی ہمیں بچوں کے ذہنی، جسمانی اور سماجی ارتقاء کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دینے کے جذبہ سے کام کرنا ہے تبھی ہمارا ملک ترقی اور خوش حالی کے راستہ پر گامزن ہو سکے گا اور اقوام عالم میں اپنے لیے ایک نمایاں جگہ حاصل کر سکے گا۔

امید ہے کہ "نیا دور" کا یہ خصوصی اطفال نمبر اس سلسلے میں عزم و عمل کی تحریک ثابت ہوگا۔ اس خصوصی نمبر کی کامیابی کے لیے ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

بنارسی داس

وزیراعلیٰ اتر پردیش

صباح الدین عمر
۱۲۔ نعمت اللہ روڈ لکھنؤ

بچوں کی پرورش و پرداخت

ایک نفسیاتی جائزہ

بچے، گھر اور ملک دونوں کے چراغ ہوتے ہیں۔ انھیں سے سُونے گھر میں رونق ہوتی ہے اور وہی آگے بڑھ کر ملک کی قسمت سنوارتے ہیں۔ اگر وہ والدین کے صدموں میں علاج دلِ مجروح، ثابت ہوتے ہیں تو بڑے ہو کر ملک کے لیے اس کے محافظ، اس کے مسائل حل کرنے والے اور اس کی بنیادوں کو مضبوط کرنے والے معمار کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ ہستیاں جو چراغ خانہ بھی ہوں اور شمع انجمن بھی، جو والدین کی آنکھوں کا نور بھی ہوں اور قوم کے لیے سُرمۂ چشم بصیرت بھی، ان کی کیا اہمیت ہوگی۔ لیکن مغربی ملکوں کے مقابلے میں کم ترقی یافتہ ممالک، جیسے ہمارے برصغیر میں ان کی پرورش و پرداخت، ان کی دیکھ بھال ان کی اچھائیوں اور برائیوں، ان کی کمزوریوں اور صلاحیتوں کا غائر مطالعہ نہیں کیا جاتا اور نہ ان کی نشو و نما پر اتنی توجہ کی جاتی ہے جس کے وہ مستحق ہیں۔

یورپ اور امریکہ میں بچے کی پیدائش سے لے کر اس کے سِن بلوغ تک اس کے تمام حرکات و سکنات، اس کے عادات و اطوار اس کے .... رجحانات، اس کے مزاج اور مزاجی تبدیلیوں، اس کی دماغی صلاحیت یا عدم صلاحیت وغیرہ کے سلسلے میں باقاعدہ تحقیق و تفتیش کی جاتی ہے، رپورٹیں تیار کی جاتی ہیں، تجربات کیے جاتے ہیں، نفسیات کی روشنی میں ہر عمر کے بچے کی مزاجی کیفیت، اس کے ماحول اور گرد و پیش کا جائزہ لیا جاتا ہے اور ہر ہر پہلو پر کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ ہمارے ملک میں بھی یہ تجربات شروع ہوئے ہیں لیکن ابھی یہ ابتدائی منزل سے آگے نہیں بڑھے ہیں۔ نہ والدین بچوں کی نفسیات سے واقف ہوتے ہیں اور نہ ایسے ادارے اور ڈاکٹر عام طور سے پائے جاتے ہیں جن سے کسی بچے کا نفسیاتی تجزیہ کرایا جا سکے اور اگر کسی بچے میں کوئی خامی پائی جاتی ہو تو اس کا حل معلوم کیا جا سکے۔ بچوں کے بین القومی سال نے ہمیں اس کا موقع ضرور دیا ہے کہ ہم بھی بچوں کے مسائل کی طرف کچھ توجہ کریں لیکن ضرورت ہے کہ اس مسئلے میں ہماری دلچسپی برابر قائم رہے اور ہم صرف اس پر مطمئن نہ ہو جائیں کہ کسی ایک بچے کا "ستارۂ بلندی" اس کے "بالائے سر" چمک رہا ہے۔

بچے کے رجحانات اور مزاجی کیفیت کا اس کے پیدا ہونے کے بعد ہی سے مطالعہ شروع کر دینا چاہیے۔ مغربی ممالک میں جو تجربات اس سلسلے میں کیے گئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ پیدائش کے ایک ہفتے سے لے کر چار ہفتوں تک بچے پر آوازوں سے یا ستوہ سے یا کسی خاص چیز کے دیکھنے سے یا اسے زور سے اٹھانے یا ہلانے سے ایک ردعمل ہوتا ہے لیکن اگر شور کم ہو رہا ہو یا آوازیں دھیمی ہوں تو بچے پر کوئی خاص ردعمل نہیں ہوتا۔ پہلے مہینے کے آخر اور دوسرے مہینے کے شروع ہونے پر بچہ جب کسی انسان کو دیکھتا ہے تو اس کا بھی اس پر ردعمل ہوتا ہے۔ بچے سے جب بات کی جاتی ہے تو وہ مسکراتا ہے۔ اگر کوئی کھلونا اس کے پاس رکھ دیا جائے تب بھی اسے دیکھ کر بچے کے لبوں پر مسکراہٹ آتی ہے۔ پانچویں مہینے یہ کیفیت ہوتی ہے کہ اگر کوئی شخص اس کے قریب آئے یا اسے آواز دے یا اسے کوئی کھلونا دکھائے اور اس سے آواز پیدا ہو تو ان تمام باتوں سے بچے کی توجہ اس طرف مبذول ہو جاتی ہے۔ چھٹے ساتویں مہینے

تک بچہ نہ صرف خود کھلونے سے کھیلنے لگتا ہے بلکہ چاہتا ہے کہ دوسرے بھی اس کے ساتھ اس کھیل میں شریک ہو جائیں اور جب کوئی دوسرا اس کی اس خواہش کو پوری کرتا ہے تو بچہ محظوظ ہوتا ہے۔ آٹھویں مہینے، بچہ دوسروں کی خواہشات کا بھی احساس کرنے لگتا ہے اور اگر اس کے پاس اس سے بھی کوئی چھوٹا بچہ لٹا دیا جاتا ہے یا بٹھا دیا جاتا ہے تو وہ اپنے سے چھوٹے بچے سے مخاطب بھی ہوتا ہے۔ بلکہ اگر چھوٹا بچہ رونے لگے تو بڑا بچہ چاہتا ہے کہ وہ چپ ہو جائے۔ دسویں مہینے اس میں اتنا سوچنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ اگر کوئی دوسرا شخص اس کے ساتھ کوئی کھلونا کھیل رہا ہے تو یہ مناسب ہے یا نہیں۔ اگر وہ یہ پسند نہیں کرتا کہ دوسرا بھی اس کے ساتھ کھیلے تو وہ اسے الگ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

ایک سال کی عمر میں بچے میں ایک طرح کی جارحانہ ذہنیت بھی پیدا ہو جاتی ہے اور ثبوت میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر بچے کے پاس کوئی شخص، کوئی کھلونا یا کوئی ایسی چیز لیے بیٹھا ہو جو بچے کو پسند ہو تو بچہ اس چیز کو اس شخص سے چھیننے کی کوشش کرے گا۔ اس عمر میں بچہ یہ بھی چاہتا ہے کہ وہ جس طرح بھی لیٹے یا جس طرح بھی ادھر ادھر حرکت کرے کوئی دوسرا اس سے مزاحمت نہ کرے اور اگر کوئی مزاحمت کرتا ہے تو بچہ روتا اور مچلتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں، بچہ آزادیٔ نقل و حرکت چاہتا ہے۔ جہاں تک دوسرے بچے سے کھلونا چھیننے کا سوال ہے، چھ مہینے کا بچہ بھی دوسرے بچے سے کھلونا چھیننے کی کوشش کرتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر بچے کی یہی عادت ہو۔ بعض بچے دوسرے بچوں سے کھلونا یا اسی قسم کی کوئی چیز چھیننے کی کوئی کوشش ہی نہیں کرتے۔ یہ بھی تجربہ کیا گیا ہے کہ ایک سال سے تین سال کی عمر تک کا بچہ کسی نئے آدمی کی صورت دیکھ کر گھبرا سا جاتا ہے۔ اگر بچے کی جانی پہچانی شکل پوری طرح اس کے سامنے نہ آئے بلکہ اس شکل کا صرف ایک حصہ اسے دکھائی پڑے تو بچہ ادھر اکثر ملتفت نہیں ہوتا بلکہ پریشان ہو جاتا ہے کہ یہ کون ہے۔ دو برس کی عمر ہو جانے پر کسی خاص آدمی یا آدمیوں کو بچہ خاص طور سے پسند کرنے لگتا ہے اور اس کی یا ان کی طرف خاص طور سے التفات کرتا ہے، بچے کے التفات کا یہ سلسلہ چار یا پانچ برس کی عمر تک قائم رہتا ہے۔

مغربی ملکوں میں متعدد افراد اور اداروں نے بچوں اور لڑکوں کی نیند کے سلسلے میں مشاہدات اور تجربات کے بعد یہ تحقیق بھی کی ہے کہ مختلف عمر کے بچوں اور لڑکوں کے لیے کتنی دیر تک سونا ضروری ہے۔ ان تحقیقات سے جو نتائج برآمد ہوتے ہیں ان کا اوسط ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

ایک سے دو سال تک	۱۳ - ۱۶ گھنٹے
ایک سے ۳ سال تک	۱۲ - ۱۵ گھنٹے
۳ سے ۴ سال تک	۱۲ - ۱۴ گھنٹے
۴ سے ۵ سال تک	۱۱ - ۱۳ گھنٹے
۵ سے ۶ سال تک	۱۱ - ۱۲ گھنٹے
۶ سے ۹ سال تک	۱۰ - ۱۱ گھنٹے
۱۰ سے ۱۷ سال تک	۹ - ۱۰ گھنٹے
۱۵ سے ۱۹ سال تک	۸ - ۹ گھنٹے

لیکن عام طور سے یہ دیکھا گیا ہے کہ نیند کے معاملے میں بچے سے غفلت برتی جاتی ہے اور وہ پوری نیند نہیں سو پاتے۔ اگر بچے اس حساب سے سوتے رہیں تو، ان کی تندرستی پر اچھا اثر پڑتا ہے اور اگر بچے، یا لڑکے کو پوری نیند میسر نہ ہو تو وہ تھکن محسوس کرنے لگتا ہے۔ جس بچے یا لڑکے کی نیند پوری ہو چکی ہو وہ زیادہ چاق چوبند رہتا ہے اور پڑھنا لکھنا ہو یا کوئی دوسرا کام، وہ زیادہ محنت اور توجہ سے کر سکتا ہے۔

عمر کے لحاظ سے بچوں کی سمجھ اور معمولی ذہنی صلاحیتوں کی جانچ کے لیے بھی متعدد تجربات کیے گئے ہیں اور بچوں کے امتحانات لیے گئے ہیں۔ ان امتحانوں کے نتائج، والدین، استادوں، سماجی کارکنوں اور ڈاکٹروں سبھی کے لیے بہت دلچسپ اور مفید ہیں۔ ایک دلچسپ تجربہ اور اس سے اخذ کیے جانے والے نتیجے جو ویانا یونی ورسٹی (آسٹریا) کے ایک پروفیسر، ڈاکٹر شارلوتے بلوہر (CHARLOTTE BLUHER) نے اپنی کتاب میں لکھا ہے، نیچے کی سطروں میں درج کیا جا رہا ہے:-

چار بچوں (۱) الف (۲) ب (۳) ج (۴) د کے پاس، الگ الگ دو چھوٹی لکڑیاں رکھ دی گئیں۔ ان بچوں کی عمریں ایک

سال سے ایک سال تین مہینے تک تھیں۔ دوسرے تجربات سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اس عمر کے بچے کے پاس جب دو چیزیں رکھ دی جاتی ہیں تو وہ دونوں کو چھوتا ہے اور ایک کو دوسرے سے ملاتا ہے۔ اس لیے ان بچوں سے بھی، جن کا امتحان لیا جا رہا تھا، یہ توقع کی گئی تھی کہ وہ ان لکڑیوں کو ایک دوسرے سے ملائیں گے ضرور۔ اب دیکھا یہ گیا کہ کاشف نے ان میں سے کسی لکڑی کو چھوا بھی نہیں، صرف انھیں دیکھتا رہا۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ اس بچے کے سلسلے میں اسی قسم کے دوسرے تجربات کیے جائیں۔ اگر وہ دوسری چیزیں ہوں، انھیں کسی صورت میں استعمال کرتا ہے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان دو لکڑیوں سے بچے کو کوئی دل چسپی نہیں تھی ورنہ معمولاً وہ ٹھیک ہے۔ ہاں اگر دوسری چیزوں کو بھی دیکھ کر اس پر کوئی ردعمل نہیں ہوتا تو یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے ہر عمل میں مجہول (PASSIVE) ہے۔ مؤخر الذکر صورت سے یہ بھی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یا تو یہ لڑکا بہت شرمیلا ہے یا اس سے قبل ایسی کوئی چیزیں اس کے پاس رکھی نہیں گئیں جنھیں وہ چھوتا یا ان سے کھیلتا۔ اس کے یہ معنی بھی ہوتے ہیں کہ اس بچے کے والدین نے اسے نظر انداز کیا، اس کی دل چسپی کی چیزیں اسے فراہم نہیں کیں یہاں تک کہ اسے کھلونے بھی نہیں دیے جن سے وہ کھیلتا۔ دوسرا بچہ ب دونوں لکڑیاں اٹھاتا ہے اور ایک کو دوسرے پر مارتا ہے یا رگڑتا ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ یہ بچہ مزاجاً نارمل (NORMAL) ہے۔ تیسرا بچہ ج ہے۔ یہ ایک لکڑی اٹھاتا ہے مگر اسے دوسری لکڑی پر مارتا نہیں بلکہ اس سے دوسری چیزوں کو، جو اس کے گرد بیٹھی ہیں، مارتا ہے۔ یہ بچہ ذہنی حیثیت سے چھ مہینے کا بچہ سمجھا جائے گا۔ چوتھا بچہ د ہے۔ یہ دونوں لکڑیاں اٹھاتا ہے اور دونوں کے ایک ایک سرے کو ایک دوسرے سے ملا کر اس طرح رکھتا ہے کہ وہ ایک سیدھی لائن بن جاتی ہے۔ یہ بچہ ذہنی طور سے اپنی عمر سے آگے ہے۔ اگر ان دونوں لکڑیوں کے سروں پر خول ہوتا (ایک بڑا اور ایک چھوٹا) تو یہ ابتدائی منزل اس بات کی ہوتی کہ بچہ ایک لکڑی کو دوسری لکڑی کے اندر ڈالنے کی کوشش کرتا۔

بچوں کے سلسلے میں اس قسم کے اور دوسرے تجربات مغربی ملکوں میں عرصے سے جاری ہیں اور ان کا سلسلہ ختم نہیں ہوا ہے۔ ان نئے نئے تجربات سے بعض اوقات پرانے تجربات و نتائج کی تصدیق کے ساتھ ان کی تکذیب بھی ہو جاتی ہے اور بعض نئی باتیں بھی سامنے آتی ہیں جن کا علم نہیں تھا۔

بچوں میں ایک بات یہ بھی دیکھی گئی ہے کہ دوسرے برس سے چوتھے برس تک کی عمر میں ان میں زیادہ ضد پائی جاتی ہے۔ ایسے بچوں کو معمول پر لانے میں بڑی دقت ہوتی ہے۔ پانچویں برس سے نویں برس تک کی عمر کے بچے میں ضد کی عادت کم ہو جاتی ہے۔ اس عمر کے بچے کم ملیں گے جو ضدی ہوں اور اگر وہ زیادہ ضد کرتے ہیں اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ (NEUROTIC) ہیں۔ دس برس کے بعد خاص طور سے چودھویں برس سے سولھویں برس تک ضد پھر بڑھ جاتی ہے لیکن بالعموم یہ دیکھا گیا ہے کہ بارھویں اور چودھویں برس ضد زیادہ ہوتی ہے۔ البتہ آٹھویں برس سے لے کر بیسویں برس تک ضد کے معاملے میں والدین یا استادوں کو بچے کے سلسلے میں کوئی خاص پریشانی نہیں ہوتی۔ دس بارہ برس کی عمر میں بچے کو اپنی [illegible] کا بھی احساس ہو جاتا ہے اور کھیل کی طرف اس کا رجحان بڑھ جاتا ہے۔ اس عمر میں لڑکے لڑکیوں دونوں کو کھیل کا یکساں شوق رہتا ہے مگر عمر میں اضافے کے ساتھ ساتھ لڑکوں میں یہ شوق عام طور سے بڑھتا جاتا ہے اور لڑکیوں میں کم ہو جاتا ہے۔

بچوں کے سلسلے میں ایک کہاوت کچھ اس قسم کی ہے کہ بچے کو سونے کا نوالہ کھلاؤ مگر دیکھو قہر کی نگاہ سے۔ یہ غلط ہے۔ بچہ فطری طور پر شریر ہوتا ہے اور بعض اوقات والدین کا کہنا بھی نہیں مانتا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہوا کہ اسے مارنا پیٹنا شروع کر دیا جائے۔ جگہ کی وجہ عام طور سے یہ ہوتی ہے کہ بچے کے جذبات کی پوری تسلی نہیں ہوتی۔ بچہ کھیلنا کودنا، اچکنا پھاندنا چاہتا ہے اور کبھی کبھی گھر کی چیزیں توڑ پھوڑ دیتا ہے۔ ہندستان میں گھروں کے اندر جگہ کی قلت اور بہ ذات خود چھوٹے گھروں کی وجہ سے یہ زیادہ ممکن تو نہیں لیکن جہاں کہیں ممکن ہو، دو تین برس کے بچے کو گھر کے کسی ایک کمرے میں ایک چھوٹی سی جگہ دے دینا چاہیے تاکہ وہ وہاں اپنا جو یا اپنے کھیل کی جو چیزیں رکھنا چاہے اور جس طرح چاہے رکھے

اور پھر ان چیزوں میں مصروف رہے یا ان سے اپنا دل بہلاتا رہے البتہ اس کا خیال رکھا جائے کہ وہ جگہ ایسی ہو جہاں سے کہ کم از کم اس کی ماں اس کی نظروں سے دور نہ ہو۔ بچے کا ان چیزوں سے جی بہلتا رہے گا، اس کے جذبات کی تسلی ہوتی رہے گی اور پھر ماں کو یہ کہنے کی ضرورت نہ پڑے گی کہ "یہ نہ کرو" (یہ جملہ جہاں تک ہو سکے کہنا ہی نہ چاہیے۔ اول تو اس قسم کا موقع بچے کو نہ دینا چاہیے کہ اس سے یہ کہنا پڑے اور دوسرے یہ کہ "یہ نہ کرو" کی بجائے "ایسا کرو" پر زیادہ زور دینا چاہیے۔)

اگر کوئی بچہ بہت شریر ثابت ہوتا ہے یا بڑوں کا کہنا نہیں مانتا یا پڑھنے لکھنے میں جی نہیں لگاتا تو والدین اس کے بارے میں کبھی یہ سوچتے ہیں کہ انھوں نے اس کے ساتھ بہت زیادہ نرمی برتی ہے جس کی وجہ سے بچے کی یہ حالت ہوگئی ہے اور یا یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اس کے ساتھ بڑی سختی برتی گئی ہے کہ بچے کو بھی ضد پیدا ہوگئی ہے اور وہ "خراب ہوگیا ہے"۔ بہت زیادہ نرمی اور بہت زیادہ سختی دونوں بچوں پر مضر اثر ڈالتی ہیں اس لیے والدین کو چاہیے کہ بچوں کے معاملے میں انتہاپسندی پر نہ اتر آئیں۔ اگر کوئی بچہ ایسی حرکت کرتا ہے جو اُسے نہ کرنا چاہیے تو کبھی تھوڑی سی لعنت ملامت سے کام چل جاتا ہے کبھی تھوڑی سی ڈانٹ کی ضرورت ہوتی ہے اور کبھی تھوڑی سی جسمانی سزا کی۔ لیکن جسمانی سزا کے یہ معنی نہیں کہ بچے کو لکڑی سے پیٹا جانے لگے۔ جسمانی سزا بھی مختلف قسم کی ہو سکتی ہے مثلاً کسی کمرے میں کچھ دیر کے لیے بند کر دیا، کچھ دیر تک بچے کا کھانا بند رکھا، یا اس کی گوش مالی بھی کر دی۔ بہر حال، اگر سمجھانے سے کام نکل جائے تو یہ سب سے اچھا ہوتا ہے۔ اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ بچے کو اگر کسی معاملے میں ماں منع کرے تو باپ کچھ نہ کہے اور اگر باپ بچے کو کچھ کہے تو ماں بچے کی بے جا حمایت نہ کرنے لگے۔ اگر بچے کے معاملے میں ماں باپ کا یہ رویہ نہیں رہتا ہے تو اس کا ایک نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچہ دونوں میں سے ایک کو نیک اور اچھا سمجھنے لگتا ہے اور دوسرے کو بُرا۔ بچے کے معاملے میں والدین کے باہمی اختلاف کا کبھی کبھی یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ ان دونوں میں ذاتی طور سے اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ کبھی ماں کو اپنے شوہر سے یہ شکایت پیدا ہو جاتی ہے کہ جب بچوں کے سامنے تم میرا خیال نہ کرو گے تو یہ بچے میری کیا وقعت کریں گے اور کبھی باپ یہ کہتا ہے کہ تم بچوں کے سامنے ہی میری مخالفت کرکے اور بچوں کی حمایت کرکے میرا وقار اور عزت بچوں کے دل سے ختم کیے دیتی ہو اس لیے اب یہ بچے جاہے جو کریں اور جس حال میں رہیں میں نہ بولوں گا۔ کبھی بچہ بھی یہ سوچنے لگتا ہے کہ میری ماں کو تو مجھ سے محبت ہے لیکن باپ کو نہیں اور کبھی وہ یہ سوچنے لگتا ہے کہ میرا باپ میرا خیال کرتا ہے مگر میری ماں کو مجھ سے کوئی الفت نہیں یعنی بچے کے دل میں ماں یا باپ کی طرف سے (جو بھی صورت ہو) ایک طرح کی بے تعلقی، بے گانگی بلکہ ایک حد تک کچھ نفرت یا عداوت پیدا ہو جاتی ہے

والدین پر یہ بھی لازم ہے کہ وہ بے سوچے سمجھے بچے کو سزا نہ دینے لگیں۔ بعض مرتبہ بچہ نادانستگی میں کوئی ایسی حرکت کر بیٹھتا ہے جو ماں باپ کو بری لگتی ہے لیکن بچہ جان بوجھ کر انھیں ستاتا نہیں ہے یا ان کی نافرمانی نہیں کرتا ہے بلکہ بعض اوقات وہ یہ سمجھ بھی نہیں پاتا کہ اس کی یہ حرکت باپ یا ماں کو ناگوار گزرے گی۔ اگر نادانستگی میں بچے سے کوئی ایسی بات ہو جائے جسے ماں یا باپ پسند نہ کریں تو لڑکے پر ایک دم سے خفا ہو جانے اور جھگڑنے کی ضرورت نہیں بلکہ اسے سمجھا دینا کافی ہوگا۔ مثال کے طور پر باپ ایک کمرے میں بیٹھا کوئی کام کر رہا ہے یا لکھ پڑھ رہا ہے۔ ایک بچہ چیختا ہوا اندر آجاتا ہے اور باپ کے کام یا اس کے لکھنے پڑھنے میں خلل پڑ جاتا ہے۔ اب اگر باپ اسے ڈانٹنے لگے تو لڑکا سہم جائے گا مگر اس کی سمجھ میں یہ نہ آئے گا کہ اسے کیوں ڈانٹا گیا ہے یا اس نے کیا قصور کیا ہے۔ ایسے موقع پر باپ کو چاہیے کہ وہ لڑکے کو یہ سمجھائے کہ تمھارے اس طرح شور مچانے سے میرے کام میں حرج ہوا یا یہ کہہ دے کہ باہر کھیلو، اس کمرے میں میں کام کر رہا ہوں۔ بچہ سمجھ جائے گا اور غالباً وہ آئندہ اس قسم کی کوئی حرکت نہ کرے۔ کبھی ایسا بھی واقعہ پیش آجاتا ہے کہ دو بچے کھیل رہے ہوتے ہیں۔ بڑا بچہ، چھوٹے بچے کو مار دیتا ہے اور چھوٹا بچہ جواب میں اتفاق سے ایسا گھونسہ لگاتا ہے کہ بڑے بچے کی ناک میں یا کسی اور جگہ چوٹ لگ جاتی ہے اور بڑا بچہ رونے لگتا ہے۔ ماں

پوچھتی ہے کہ کیا ہوا تو بڑا بچہ روتا ہوا چھوٹے بچے کی شکایت کرتا ہے کہ اس نے مجھے مارا ہے۔ اب ماں اگر واقعے کی تحقیق کیے بغیر چھوٹے بچے پر بگڑنے لگے یا اسے مارنے لگے تو چھوٹے بچے پر برا اثر پڑتا ہے اور وہ سوچنے لگتا ہے کہ ماں مجھے چاہتی نہیں۔ ایسے موقع پر ماں کو چاہیے کہ وہ دونوں بچوں سے یہ دریافت کرے کہ جھگڑا کیوں ہوا۔ اس طرح ماں کو صحیح بات معلوم ہو جائے گی۔ اس وقت بڑے بچے کو یہ سمجھانا چاہیے کہ زیادتی اسی کی تھی اس لیے اسے رونا نہ چاہیے اور آئندہ اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ اپنے سے چھوٹے بچے یا بھائی کو ستایا نہ کرے۔

مائیں اپنی اولاد کے ساتھ زیادہ محبت دکھاتی ہیں لیکن یہ محبت بعض اوقات غیر فطری اور مضحکہ خیز ہوتی ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ ماں اپنے کسی بچے بالخصوص چھوٹے بچے کو کئی برس تک اپنے ہی ساتھ سلاتی رہتی ہے۔ ایسی بھی مثالیں ہیں کہ دس دس برس کی عمر تک بچہ اپنی ماں کے پاس سوتا رہا ہے۔ یہ غلط چیز ہے۔ اس طرح بچہ زندگی بھر ماں کے سہارے کا محتاج رہتا ہے۔ بعض مائیں محبت ہی میں اپنی لڑکی پر اس حد تک اثر انداز ہونا چاہتی ہیں کہ شادی کے بعد بھی لڑکی اپنی ماں کے مشوروں کی طالب رہتی ہے اور ماں اپنی محبت میں یا اس خیال سے کہ لڑکی پر شادی کے بعد اس کا اثر کم نہ ہو جائے مشورے دیتی رہتی ہے۔ ماں کو چاہیے کہ کم سے کم لڑکی کی شادی کے بعد اس کے فیصلوں پر اثر انداز ہونے کی کوشش نہ کرے اور لڑکی یہ سمجھ کر کہ اسے اپنی بقیہ زندگی شوہر اور سسرال والوں کے ساتھ گزارنا ہے، خود موقع اور محل کے ساتھ فیصلے کرے۔ بعض مائیں بچوں سے اتنی محبت کرتی ہیں کہ اگر کوئی بچہ بیمار ہو گیا اور عارضی طور سے چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہا تو نہ صرف اس کی بیماری کے دوران اسے گود میں اٹھائی پھرتی ہیں بلکہ صحت مند ہو جانے کے بعد بھی بچے کے ساتھ اسی طرح پیش آتی رہتی ہیں گویا وہ اب بھی بیمار ہے۔ اگر ماں بیماری اور صحت دونوں حالتوں میں بچے کے ساتھ یہ رویہ رکھتی ہے تو بچہ ماں کا دست نگر بن جاتا ہے اور ماں پر یہ انحصار بڑے ہونے پر بھی قائم رہتا ہے۔ ایسی صورت میں ماں کو یہ کرنا چاہیے کہ جب بچہ بیماری سے صحت یاب ہو جائے تو بچے کو آمادہ کرنا چاہیے کہ وہ پہلے کی طرح اپنا کام خود کرنے لگے۔

اس بات کا خاص طور سے خیال رکھنا چاہیئے کہ ایک ہی باپ ماں کے ایک بچے میں یہ احساس نہ پیدا ہونے پائے کہ باپ اس کے ایک بھائی یا بہن کو زیادہ چاہتا ہے اور دوسرے کو کم۔ یا ماں ایک بچے کا زیادہ خیال کرتی ہے اور دوسرے کا کم۔ والدین کو (بالخصوص ماں کو) اس بات کا بھی دھیان رکھنا چاہیئے کہ سارے بھائی بہنوں میں محبت رہے اور گھر کا کوئی بچہ گھر ہی کے کسی دوسرے بچے سے جلنے نہ لگے یا اس میں جذبۂ رقابت نہ پیدا ہونے پائے۔ جب تین چار برس یا اس سے بڑے بچے کے گھر میں کوئی بھائی بہن پیدا ہوتا ہے تو قدرتی طور پر نووارد سے اُسے ایک محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر بعض اوقات بڑے بچے سے ماں کچھ اس طرح نادانستگی اور کم فہمی میں سلوک کر جاتی ہے کہ بڑے بچے کے دل میں دو خیال جاگزیں ہو جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ میری ماں چھوٹے بھائی یا بہن کو مجھ سے زیادہ چاہتی ہے، دوسرے یہ کہ مجھے اس چھوٹے بھائی یا بہن سے محبت جتانے کا کوئی حق ہی نہیں ہے۔ اگر کسی بچے کے دل میں یہ خیال بیٹھ جاتا ہے تو اُسے سخت ذہنی تکلیف ہوتی ہے اور اس ذہنی تکلیف سے وہ زندگی بھر متاثر ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ بعض اوقات اس کے دل میں جوان ہونے کے بعد بھی ایک مایوسی کی سی کیفیت بیدار رہتی ہے اور اس میں افسردگی پیدا ہو جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو بڑا ہو جانے کے بعد بھی بروئے کار نہیں لا پاتا۔

ایک خاتون پر افسردگی کے لمحات اکثر طاری ہوتے رہتے تھے۔ اُسے کسی طرح کی مالی پریشانی نہیں تھی۔ شوہر بھی اس سے محبت کرتا تھا مگر بعض اوقات یکایک اس کی جو حالت ہو جاتی تھی اس سے سوسائٹی میں بھی اسے حیرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، شوہر بھی پریشان رہتا تھا اور کبھی کبھی کسی میٹنگ وغیرہ میں اس خاتون کو بھی بڑی خفت اٹھانی پڑتی تھی۔ اس کا نفسیاتی تجزیہ کیا گیا اور اس کے بچپن کے حالات معلوم کیے گئے تو پتہ چلا کہ وہ اپنے والدین کی بڑی اولاد تھی۔ جب وہ پانچ برس کی تھی تو اس کے ایک بھائی پیدا

اور بھائی کی پیدائش کے بعد ہی اسے یہ محسوس ہونے لگا کہ گویا ں اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں اور یہ کہ ابھی تک تو اسے خیر اشت کر لیا جاتا تھا مگر اب والدین کو نعم البدل مل گیا ہے اس لیے کی کوئی وقعت نہیں رہ گئی ہے۔ اس احساس کی وجہ یہ تھی گھر میں ہر شخص ساری توجہ اس کے بھائی پر ہی صرف کرتا تھا۔ ایک مرتبہ ن نے بھائی کی محبت میں اُسے چھونا چاہا، پیار کرنا چاہا۔ ماں اس ت اس کے چھوٹے بھائی کو گود میں لیے کھڑی تھی۔ لڑکی نے یے ہی ماں کے گلے میں اپنی باہیں حمائل کر کے اپنے بھائی کو چھونا پیار کرنا چاہا، ماں نے سرد مہری سے اس کے ہاتھ اپنی گردن سے ہٹا دیے اس سے مخاطب بھی نہیں ہوئی۔ اس لڑکی کے دل کو اس سے بڑا دھکا ا، ایک مرتبہ گھر ہی میں اس نے اپنے بعض رشتے داروں کو یہ بھی کہتے نہ چلو، ماں کی مُراد بر آئی، وہ شروع سے چاہتی تھی کہ اس کے لڑکا اور جب لڑکے کی جگہ لڑکی ہوئی تو اسے بہت رنج ہوا تھا، بہرحال اس کے لڑکا ہو گیا۔ گھر والوں نے تو آپس میں اس طرح کی باتیں کر دا لیں ڑکی نے یہ سب سُن لیا تھا اور اس کے دل کو ایک اور دھکا پہنچا تھا ں گھر میں اس کی حیثیت ایک غیر مطلوب بچے کی سی ہے اور وہ نہ ا ہوتی ہوتی تو اچھا تھا۔ یہ لڑکی پڑھنے لکھنے میں بہت تیز تھی اور کول میں بہت اچھے نمبروں سے پاس ہوتی تھی۔ مگر لڑکی اور کے دونوں کی عمروں میں اضافے کے بعد بھی لڑکی کے ساتھ ماں کا برتاؤ رہا۔ اسکول کے ایک امتحان میں جب وہ اچھے نمبروں سے ں ہو گئی تو اسے وظیفہ بھی ملنے والا تھا مگر ماں نے یہ کہہ کر اسے ے پڑھنے دیا نہ وظیفہ لینے دیا کہ اب یہ امتحان پاس کر لینے کے اور آگے پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسی طرح ایک مرتبہ لڑکی ڑے ہو جانے پر ایک بائیسکل کی ضرورت پڑی مگر والدین نے ہ کر سائیکل کی خریداری سے مجبوری ظاہر کر دی کہ روپیہ کہاں سے ے گا۔ لیکن اس کا بھائی جیسے ہی ۱ برس کا ہوا اس کے لیے ایک سائیکل خرید دی گئی۔ والدین کے اس رویے کا یہ اثر تھا کہ ، پر افسردگی اور مایوسی کے لمحات اکثر طاری ہوتے رہتے تھے۔ اگر دین بھائی بہنوں میں یہ تفریق نہ برتتے تو اس لڑکی کا مستقبل کہیں

زیادہ خوش گوار ہوتا جتنا وہ تھا اور اس کی زندگی کہیں زیادہ سکون سے کٹتی۔

یہ قصہ انگلستان کی ایک لڑکی کا تھا لیکن ہمارے ملک میں بھی اس قسم کے واقعات اور تجربات ہوتے رہتے ہیں۔ ہمارے والد بھی اکثر اپنے منھ سے اسی قسم کی باتیں نکال دیتے ہیں جو اس لڑکی کے والدین نے کی تھیں۔ وہ سمجھتے نہیں ہیں کہ دوسرے بچے کے سامنے اس طرح کی باتیں کر دینے سے اس کے دماغ پر کیا اثر پڑے گا مگر ہوتا یہی ہے کہ اگر بچہ اپنے یا دوسرے بچے کے متعلق اس قسم کی رائے سنتا ہو تو اس کے لاشعور میں دوسروں کے یہ خیالات ہمیشہ کے لیے ذہن نشین ہو جاتے ہیں اور اس کی مزاجی کیفیت پر آئندہ زندگی میں بھی اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ ہمارے گھروں میں تو عام طور پر ایسا ہوتا رہتا ہے کہ لڑکے کی پیدائش پر ایسی خوشی کا اظہار کیا جاتا ہے کہ لڑکی یا لڑکیوں کے جذبات کا مطلق احساس ہی نہیں رہتا۔ اب زمانہ بدل گیا ہے اور قدریں بھی بدل گئی ہیں۔ اب لڑکوں کی طرح لڑکیوں کی تعلیم بھی ہمارے گھروں میں ضروری سمجھی جاتی ہے اس لیے اب والدین کو بھی چاہیے کہ وہ لڑکوں اور لڑکیوں کو برابر سمجھ کر ہی ان کی پرورش و پرداخت اور تعلیم و تربیت کا خیال رکھیں۔

والدین کو ایک بات کی طرف اور بھی خاص طور سے دھیان رکھنا چاہیے وہ یہ کہ بچوں کو ان کی کارگزاریوں، اچھے کام اور اچھے طور طریقوں پر تعریف ضرور کریں۔ اگر کوئی بچہ اپنی پڑھائی کا کافی خیال رکھتا ہے، پڑھنے میں جی لگاتا ہے، اسکول میں اچھے نمبروں سے کامیاب ہوتا ہے، گھر میں سب کے ساتھ تمیز سے پیش آتا ہے، والدین کی عزت کرتا ہے تو اس کی تعریف بھی کرنی چاہیے۔ اور خوشی کا اظہار بھی۔ بچے کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اگر وہ اچھا کام کرتا ہے، جی لگا کر پڑھتا ہے، وغیرہ تو اس کی تعریف بھی کی جائے۔ اگر اس کی یہ خواہش پوری نہیں ہوتی تو وہ احساس کمتری میں مبتلا ہونے لگتا ہے اور یہ سمجھنے لگتا ہے کہ باوجود ان تمام باتوں کے اس میں کوئی ایسی کمی ہے جو اس کی تعریف نہیں کی جاتی۔ اگر بچے کو گھر میں پیار ملے اور اسکول میں پڑھائی کے علاوہ اپنے ہم عمر بچوں کے ساتھ کھیلنے کا

موقع ملے تو یہ احساس پیدا نہیں ہونے پاتا۔ اگر گھر میں کسی بچے کو اس کے دوسرے بھائی بہنوں کے مقابلے میں حقیر خیال کیا جانے لگے اور اس کے مقابلے میں کسی دوسرے بچے یا بچوں کے ساتھ زیادہ محبت دکھائی جانے لگے تو بھی بچہ احساس کمتری کا شکار ہونے لگتا ہے اور اگر یہ صورت حال عرصے تک قائم رہتی ہے تو اس کی آئندہ زندگی بہت تلخ بلکہ ناکامیاب ہو جاتی ہے۔ اگر وہ اسکول کا کام نہیں کر پاتا یا کسی وجہ سے دوسرے لڑکوں کے برابر وہ تیز نہیں ثابت ہوتا تو وجہ معلوم کرنا چاہیے نہ کہ اس پر برس پڑا جائے۔ اگر اسے گھر اور اسکول دونوں جگہوں پر سست، نکما، بے وقوف اور گدھا مسلسل کہا جانے لگا تو بچہ وہ احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ جب بچے کو بار بار ایسے القاب سے یاد کیا جاتا ہے تو یا اُسے والدین اور استاد سے نفرت ہو جاتی ہے یا واقعی وہ اپنے آپ کو گدھا سمجھنے لگتا ہے اور یہ تاثر اس کے لاشعور میں اس طرح جاگزیں ہو جاتا ہے کہ وہ آگے بڑھ کر بھی اپنے آپ کو یہی سمجھتا رہتا ہے اور کوئی اچھا کام یا کامیاب زندگی بسر کرنے کے قابل نہیں رہ جاتا۔ اگر کوئی بچہ واقعی کم عقل ہے تو اس کو ڈانٹنے کی جگہ اس کی ہمت افزائی کرنا چاہیے۔ یہ ہمت افزائی کئی طرح سے ہو سکتی ہے مثلاً یہ کہا جائے کہ یہ بچہ یا لڑکا تو گھر کا کام خوب کر لیتا ہے یا اپنے بھائی بہنوں کا بہت خیال کرتا ہے یا اپنے والدین یا اپنے بڑوں کا کہا بہت مانتا ہے یا فلاں کھیل بہت اچھا کھیلتا ہے وغیرہ۔ اُس سے یہ نہ کہنا چاہیے کہ تو کسی کام کا نہیں، تیرے تو نہ تو عقل ہے نہ تمیز، تو کچھ کر ہی نہیں سکتا۔

اسی طرح اگر ایک بچے کی پیدائش کے تین چار برس بعد دوسرا بچہ گھر میں ہو تو پہلے بچے کو اس امر کا احساس کسی طرح نہ ہونا چاہیے کہ اب اس کی ماں اُسے نہیں بلکہ اس سے چھوٹے بچے کو چاہے گی۔ اکثر بڑے بچے کے دماغ میں یہ ذہن نشین ہو گیا کہ اس کی جگہ اس کے چھوٹے بھائی نے لے لی ہے تو باوجود اس فطری محبت کے جو دو بھائیوں یا دو بھائی بہنوں میں ہوتی ہے بڑے بچے کے دل میں چھوٹے سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک واقعہ سے اس کا ثبوت مل جائے گا۔ ہوا یہ کہ ایک بچہ جب تین چار برس کا تھا تو اس کا چھوٹا بھائی پیدا ہوا۔ بڑے گھر کی بات تھی۔ پہلے بچے کی دیکھ بھال کے لیے ایک انّا پہلے ہی سے مقرر تھی اور بچہ اس سے کافی ہلا ہوا تھا۔ دوسرے بچے کی پیدائش سے ایک دن قبل پہلا بچہ انّا کی سپردگی میں بالکل دے دیا گیا۔ انّا نے اس سے کہنا شروع کر دیا کہ اب تمھارے ایک بھائی پیدا ہونے والا ہے، اب تمھاری امّی تم سے نہیں، چھوٹے بھیا سے پیار کرے گی اور اسی کو اپنے ساتھ رکھے گی۔ انّا نے بے وقوفی میں اس بچے سے اتنی مرتبہ یہ باتیں کیں کہ اس کے معصوم دماغ میں پتھر کی لکیر بن گئیں اور جب اس کا چھوٹا بھائی پیدا ہوا تو خوش ہونے کی بجائے اسے سخت اذیت محسوس ہوئی۔ اتفاق سے چھوٹا بچہ تین دن بعد ہی مر گیا۔ اس کے مرتے ہی بڑے بچے کو ایسی خوشی ہوئی گویا خود اسے دوسری زندگی مل گئی ہو۔ بڑے ہونے پر اسے اپنا یہ جذبہ یاد رہا اور ایک مرتبہ اس نے اپنی اس کم عقلی اور بھائی کی وفات پر سخت اظہار افسوس کرتے ہوئے ایک ڈاکٹر سے خود ہی بتایا تھا کہ چھوٹے بھائی کی پیدائش اور موت پر اس کے کیا تاثرات تھے۔ ہمارے گھروں میں لوگ اکثر اس قسم کی باتیں بچوں سے کرتے رہتے ہیں۔ انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ دوسرے بچوں کے ذہن پر ایسی باتوں سے کتنے خراب اثرات چھا جاتے ہیں۔

بچے کی صحیح تربیت میں ماں کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ بچہ ایک عمر تک اسی کی نگرانی میں رہتا ہے اور اسی کے زیر اثر اس کی زندگی گزرتی ہے۔ اسکول میں نام لکھا دیا جائے تب بھی وقت کا باقی حصہ ماں کے پاس ہی گزرتا ہے۔ ماں اگر عقل مندی سے کام لے تو بچے کے ذہن پر کوئی خراب اثر نہ پیدا ہونے پائے گا اور اس میں صحت مند رجحانات پیدا ہوتے رہیں گے۔ چونکہ بچے کی عمر کا وہ حصہ جس میں ذہن پر مختلف باتوں کا زیادہ اثر ہو جاتا ہے ماں کی صحبت ہی میں بسر ہوتا ہے اس لیے بچے کی عمر کے اس حصے میں ماں کو اور زیادہ ہوشیار رہنا چاہیے۔ اگر بچے میں قدرتی طور سے کوئی کمی ہے اور اس میں اس کی وجہ سے کوئی احساس

کمتری پایا جاتا ہے تو عقل مند ماں اس احساس کمتری کو بھی دور کر سکتی
ہے ۔ ایک لڑکی تھی ۔ بچپن میں اسے چیچک نکل آئی جس کی وجہ سے
ایک حد تک وہ کم رُو ہو گئی اور اس کی عام صحت بھی خراب رہنے
لگی ۔ دوسرے بچے یا تو اس کے ساتھ کھیلتے نہیں تھے یا وہ خود اُن
سے کترائی رہتی تھی ۔ اس کی ایک چچازاد بہن اسی کی ہم عمر تھی ۔ وہ
البتہ برابر اس کے ساتھ رہتی اور کھیلتی تھی ۔ یہ دوسری لڑکی خوبصورت
تندرست ، بڑی ذہین اور باتونی تھی ۔ ان دونوں کے اعزا جب
ان کے گھر آتے تو زیادہ تر اسی خوبصورت لڑکی سے بات کرتے ۔ ایک
دن یہ دونوں لڑکیاں ، چیچک والی لڑکی کی ماں کے ساتھ بازار کچھ
خریدنے گئیں ۔ ایک دوکان پر دونوں کھڑی تھیں کہ اُن کے ایک
عزیز وہاں پہنچ گئے ۔ خوبصورت لڑکی سے انھوں نے باتیں کیں اور
اپنے پاس سے دام دے کر کوئی کھلونا بھی اُسے خرید دیا ۔ دوسری
لڑکی سے انھوں نے بات بھی نہ کی ۔

جب دونوں لڑکیاں گھر واپس آئیں تو بیچاری کمزور اور کم رُو
لڑکی ایک کونے میں جا کر بے ساختہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ۔ یہ
احساس کمتری کا رونا تھا ۔ آخر کہاں تک اس پر اثر نہ ہوتا ۔ لیکن
اس کی ماں نے بڑی عقل مندی سے کام لیا ۔ اس سے پوچھ پاچھ کر کہا کہ
خوبصورتی ہی میں ساری خوبی تو نہیں ہوتی ۔ اگر تمھاری شکل بیماری کی
وجہ سے اتنی اچھی نہیں ہے تو تم دوسرے طریقے سے اس کمی کو اس طرح
پوری کر سکتی ہو کہ تمھاری تعریف تمھارے سامنے اور تمھارے پیٹھ پیچھے
سب لوگ کریں ۔ اور وہ طریقہ یہ ہے کہ تم پڑھنے میں اتنا دل لگاؤ کہ
اپنے اسکول میں اول آیا کرو اور ہر امتحان میں سب سے زیادہ نمبر حاصل
کرو ۔ دوسرے ، ہر ایک سے ایسا برتاؤ کرو اور ہر ایک کے اتنا کام
آؤ کہ سبھی تمھارے اخلاق کے بھی بے انتہا گرویدہ بن جائیں ۔ یہ تمھارے
ہاتھ کی بات ہے ۔ اگر تم کوشش کرو اور ایک کیا ، ہزاروں لڑکیوں
سے تم کو اچھا سمجھا جائے گا اور ہر ایک تمھیں سر آنکھوں پر بٹھائے گا ۔
ماں نے کچھ اس طرح اس لڑکی کو سمجھایا کہ اس کے دل میں ایک عزم پیدا
ہو گیا اور وہ ایک نئے انہماک سے ان سب کی نگراں ہوتی تھی ۔ وہ
ساتھ اخلاق برتنے لگی ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بچہ کی صحت و عافیت کا
کی وجہ سے بد اخلاق خلاق ہو گئی اور اس میں جو احساس اہتمام دیتی جو ماں
کمتر اور
ہو گیا تھا وہ یکسر زائل ہو گیا ۔

بچوں کی پرورش و پرداخت کے متعلق یہ چند ضروری باتیں
تھیں ۔ بچوں کی نفسیات اور ان کی ذہنی تربیت کے بارے میں کسی
ایک مضمون میں تفصیل سے نہیں لکھا جا سکتا ۔ ان کے ہر ہر پہلو پر بہت
کچھ بتانے اور بہت کچھ سمجھنے کی ضرورت ہوتی ہے ۔ والدین جتنا بھی
سمجھ سکیں اور اسی کے مطابق عمل بھی کریں اتنا ہی بچے کے حق میں اچھا
ہوگا ۔ والدین اور ٹیچر کے علاوہ بچوں کا ادب بھی ان کی ذہنی تربیت
پر اثر انداز ہو سکتا ہے مگر شرط یہ ہے کہ یہ ادب ، واقعی بچوں کی نفسیات
کا خیال رکھتے ہوئے تیار کیا جائے ۔ اردو میں بچوں پر بہت سے لکھنے
والے خاص طور سے وہ جو اپنے کو "بچوں کا شاعر" سمجھتے ہیں دعوا تو
کرتے ہیں کہ وہ بچوں کے لیے لکھتے ہیں مگر ان کا زیادہ تر لکھا ہوا صحیح
معنوں میں "بچوں کا ادب" نہیں کہا جا سکتا ۔ اکثر شاعر بچوں کو
مخاطب کر کے نظم لکھتے ہیں یا کسی نصیحت آمیز کہانی کو اشعار کا جامہ
پہنا دیتے ہیں مگر الفاظ اتنے مشکل استعمال کرتے ہیں یا وہ جانتے
ہی نہیں کہ کس عمر کے بچے کے لیے کیسے الفاظ استعمال کیے جائیں ، کہ
اس عمر کا بچہ جس کے لیے وہ نظم کہی گئی ہے ، یہ نظم سمجھ بھی نہیں
پاتا ۔ اور جب وہ سمجھے گا نہیں تو اس پر کیا اثر ہوگا ؟ ضرورت
ہے کہ بچوں کا ادب تیار کرنے والے حضرات پہلے بچوں کی نفسیات
اور ان کی عمر کے تقاضوں کو سمجھیں ، پھر آسان زبان میں نثر یا نظم لکھیں ۔
والدین کو بھی یہ محسوس کر لینا چاہیے کہ بچے کی صحیح تربیت اس کی
کم سنی ہی میں ہوتی ہے ۔ اگر اس سن میں والدین کی بے پروائی
کی وجہ سے "خشت اول" کج ہوئی تو "تا ثریا" تک بھی دیوار سیدھی
نہیں ہوگی ۔

★

اگر جنت میں پہنچنے کی خواہش ہے تو پہلے بچہ بنو ۔ — حضرت عیسیٰ ؑ

ایک واقعہ پیش کیا جاتا ہے۔ موسم گرما میں ایک بار پڑھتے وقت
مجھے شدید پیاس محسوس ہوئی، میرے مولوی حافظ محمد عمر
مرحوم نے اٹھ کر پانی کا کٹورہ مجھے بڑھایا۔ میں جلد جلد پانی
پی گیا۔ انھوں نے اس روز باقی تمام وقت پانی پینے کے طرز
پر تعلیم میں صرف کر دیا۔ فرمانے لگے کہ "ڈگ ڈگا کر پانی پینے
سے اچھو ہو جاتا ہے۔ حلق سینہ اور معدہ کو زحمت ہوتی ہے
کبھی کبھی دست بھی آنے لگتے ہیں، وغیرہ وغیرہ" وہ اسی
طرز سے آداب و شائستگی کی تلقین دیتے تھے اور استاد و شاگرد
کے درمیان کچھ ایسا رکھ رکھاؤ ہوتا تھا کہ اس دور کے قریب قریب
سب بچے اپنے اپنے استاد کا اتنا زیادہ احترام کرنے لگتے
تھے جو فی زمانہ ہمارے نوجوان اپنے والدین کا نہیں کرتے۔
اسی کے ساتھ یہ بات بھی کہنے میں آتی ہے کہ یہ تعلیم اتنی دیرپا ہوتی
تھی کہ اس کے اثرات زندگی بھر برقرار رہتے تھے۔ مجھے اچھی
طرح یاد ہے کہ یونیورسٹی کی تعلیم سنہ ۱۹۲۳ء میں ختم کرنے کے
بعد سنہ ۱۹۳۹ء میں یعنی سولہ برس کے بعد پروفیسر سدھانت کا
دفعتاً سامنا ہو جانے پر میرے ہاتھ سے بے ساختہ جلتا ہوا سگار
زمین پر جا پڑا تھا۔ اس لیے کہ اپنے استاد کے حضور سگریٹ یا
سگار پینا شدید ترین بدتہذیبی تھی۔ یہ اثر بچپن کی صحیح تعلیم کا تھا۔

مولوی صاحب کی خدمت میں پانچ چھ برس تک کم سن بچے
تعلیم و تربیت پاتے تھے۔ اس مدت میں ہونہار اور ذہین لڑکے
صرف و نحو کی ابتدائی درسی کتابیں اور فارسی میں گلزار دبستاں
ختم کر لیتے تھے اس کے بعد کسی پسندیدہ مکتب یا مدرسہ میں داخلہ
کرا دیا جاتا تھا۔ لکھنؤ والوں کو انگریزی تعلیم سے بیر تھا۔ پھر
بھی انگریزی تعلیم کا دستور شروع ہوا تو تیزی سے آگے بڑھتا
گیا لیکن جہاں تک اعلیٰ تربیت اور مذاق سلیم حاصل کرنے
کا معاملہ تھا یہ مقصد مکتبوں اور مدرسوں میں پڑھ کر ہی حاصل
ہوتا تھا۔ ایسی اچھی درس گاہوں میں مدرس اپنے طلاب
کے کردار کو سنوارنے پر نظر رکھتے تھے۔ اس زمانے میں ہمارے
شہر کے در و دیوار شعریت میں سرشار رہتے۔ اسی رنگ میں
مکتب اور مدرسے بھی رنگے ہوئے تھے۔ چنانچہ ہر درس گاہ
میں آئے دن مشاعرے اور مقاصدے ہوا کرتے تھے چھوٹے
چھوٹے لڑکے بھی طبع آزمائی کرتے تھے جس کی بدولت ان کی
زبان میں سلاست، مزاج میں سلامت روی اور طبیعت میں
شگفتگی پیدا ہوتی تھی۔ خوش بختی سے مجھے اس زمانے میں
مولوی سید محمد رضا مرحوم کے ایسے نامی گرامی استاد کے تلمذ کا فخر
حاصل ہو گیا تھا۔ مولانائے موصوف اپنے شاگردوں پر سبق بھول
جانے یا سبق یاد کر کے نہ آنے پر سختی نہیں فرماتے تھے ان کو بار با
سمجھاتے بجھاتے اور طرح طرح سے ان کو تحریص و ترغیب
دلاتے تھے۔ لڑکے معصومانہ انداز میں گستاخانہ جسارت کر لیتے
تو وہ مسکرا کر ٹال دیتے تھے لیکن اخلاق سے گرے ہوئے حرکا
اور غیر شریفانہ اطوار کو قطعاً برداشت نہیں کرتے تھے اور فی الفو
سزائیں دیتے تھے جن میں اپنے ہاتھ کے استعمال کے علاوہ کبھی
قمچیاں ٹوٹ جایا کرتی تھیں۔ ان کے اسی طریقہ کار کا نتیجہ
تھا کہ ان کا ہر شاگرد شرافت و انسانیت کا پیکر بن کر
فارغ التحصیل ہوتا تھا۔

ہنرمندانہ، تہذیب کھلائی اور خوش گفتار دائی کی گود
میں پرورش، خوش کردار اور شائستہ مولوی کی تربیت اور بلند
درس گاہ میں جلیل القدر استاد سے تعلیم حاصل کرنے کے باوصف
وہ تعلیم و تربیت زیادہ گراں قدر اور سود مند ہوتی تھی جو بچے
اپنے شفیق و مہربان والدین کی برکتوں سے پا لیتے تھے۔ یہی
تعلیم و تربیت ہر جلیل القدر خاندان کی دیرینہ عظمت اور خاندانی
اعزاز و وقار کو برقرار رکھنے میں ممد و معاون ہوتی تھی۔ اس
مقام پر میں دوسرے خاندان کے سنے سنائے حالات پیش
کرنے کے بجائے خود اپنے تجربات بیان کر دینا بہتر سمجھتا ہوں
یہ وہ واقعات ہیں جو خود مجھ پر عہد طفولیت میں گزرے تھے
والد مرحوم اپنی اولاد کی کبھی کبھی لیکن کڑی نگرانی فرماتے تھے
وہ بچوں کو ڈانٹنے یا مارنے کے قائل نہیں تھے۔ فرماتے تھے
کہ روز سختی کرنے کے بجائے کبھی کبھی ایک کڑی آنکھ دکھا کر بچ

اصلاح کرنا چاہیے چنانچہ انھوں نے مجھے صرف ایک بار ڈانٹا
ایک مرتبہ ایک تھپڑ مارا تھا۔ ان کا ایک مخصوص خدمت گار
ی حسن نامی تھا جو ان کے مقربوں میں تھا۔ ہم تینوں بھائی
کو "آپ" کہہ کر تخاطب کرتے تھے۔ ایک روز اتفاق سے
مرحوم کی موجودگی میں کسی کام کے لیے میں نے اس آدمی کو پکارا
م کہہ کر تخاطب کیا۔ فی الفور انھوں نے غیظ و غضب میں مجھے
ا اور بلند آواز سے کہا کہ "بد تہذیب" اس ڈانٹنے کا اور تنبیہ
بانے کا یہ اثر ہے کہ آج تک میں ملازمین سے زیادہ تر آپ
ہ بات کرتا ہوں اور کسی نوکر سے کبھی ترش روئی سے بات
ن کی۔ دوسرا واقعہ کچھ مدت کے بعد پیش آیا تھا جب میں عربی
سہ میں تعلیم حاصل کر رہا تھا لیکن ابتدائی درجہ میں تھا۔ والد مرحوم
رنی خوش رنگ اور خوش رو قلم استعمال کرتے تھے جن کو اس
نہ میں کلک کہتے تھے، ایک بار میں نے ان کے قلمدان سے بغیر
ازت اور بغیر ان کی اطلاع کے ایک قلم نکال لیا۔ کم سنی کی
الت و نا واقفیت میں انھیں کے سامنے اس قلم سے لکھ رہا
۔ انھوں نے دریافت کیا کہ قلم کہاں سے لائے۔ چونکہ سادہ
ال معمولی لہجہ میں تھا، میں نے جواب دیا کہ مول لیا ہے۔ انھوں
دوکان کا پتہ اور قیمت دریافت کی۔ میں نے ہر سوال کا فی الفور
ب دے دیا۔ ان کو غصہ آگیا مجھے ایک تھپڑ مارا اور فرمایا "
ری کرتا ہے اور جھوٹ بھی بولتا ہے" ان کی تعلیم تھی کہ جھوٹ بولنا سب سے
ناہ ہے جس کا ارتکاب کسی حالت میں نہ کرنا چاہیے اس موقع پر جھوٹ نہ
بولنے کی تعلیم کا وہ اثر ہوا تھا جو اب تک برقرار ہے اور زندگی
ر برقرار رہے گا۔

بچوں کی تعلیم گھر کے مولوی اور مکتب و مدرسہ تک محدود
یں تھی بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ تعلیم کا اصل مقصد گھر کی
بیت و پرداخت ہی سے پورا ہوتا تھا۔ نہ صرف متوسط درجہ
لوگ بلکہ روسا و عمائدین بھی اپنے بچوں کو گھروں میں
نہ کچھ ضرور پڑھاتے اور سکھاتے تھے۔ بچوں کو اپنے اپنے مذہب کی
یم بھی گھروں ہی میں دی جاتی تھی۔ دینیات پڑھانا اور فرائض مذہبی

سے باخبر کرنا والدین ہی کا فریضہ ہوتا تھا بہت سے گھرانوں
میں مستورات اتنی تعلیم یافتہ ہوتی تھیں کہ وہ اپنے بچوں کو مذہبیات
سے آگاہ کر دیتی تھیں۔

پرانے زمانے میں لڑکیوں کو پڑھوایا جاتا تھا لیکن
لکھنا نہیں سکھایا جاتا تھا۔ شادی ہونے کے بعد وہ خود لکھنا
سیکھتی تھیں اور چونکہ درسیات پر پورا پورا عبور ہوتا تھا اس لیے
لکھنا سیکھ جانا مشکل نہ ہوتا تھا پھر بھی بعض گھرانے اس طرز کو
پسند نہیں کرتے تھے اور لڑکیوں کو بھی لکھنا سکھاتے تھے ایسے ہی
گھرانوں میں ایک ممتاز خانوادہ خان علامہ کا تھا جس سے میرا
تعلق تھا۔ مرحوم عزیز لکھنوی نے ہمارے خاندان کو "ثقافت کدہ"
کا لقب دیا تھا۔ اس خاندان کی عورتیں بڑی ہنرمند تھیں میری
والدہ مرحومہ بھی بہت پڑھی لکھی معلمہ تھیں ان کا طرز تعلیم و تربیت
یہ تھا کہ وہ ہمارے طور طریقوں حرکات و سکنات یہاں تک کہ زبان
سے نکلے ہوئے ایک ایک فقرہ پر نظر رکھتی تھیں۔ ذرا ذرا سی
لغزش پر ٹوک دیتی تھیں اور ہماری بے راہ روی یا معمولی سی
غلطی پر بھی دیر تک سمجھاتی تھیں۔ دوران تقریر میں آیات قرآنی
احادیث، اشعار اور عقلائے پیشین کے روایات سناتی تھیں
ان کی تقریر اس وقت تک ختم نہیں ہوتی تھی جب تک کہ یہ اطمینان
نہ ہو جاتا کہ ان کی بات سننے والے کے ذہن نشین ہو گئی ہے۔
ان کا یہ طرز کبھی کبھی افسانوں اور داستانوں کی شکل اختیار
کر لیتا تھا۔ جو بہت پرلطف ہوتا اور سننے والے کی طبیعت نہیں
گھبراتی تھی۔ حقیقت امر یہ ہے کہ ان کے گراں قدر درس میری
طویل زندگی میں برابر سبق آموز رہے ہیں اور آج بھی مشعل راہ
ہیں۔

عہد طفلی کی پرورش و پرداخت میں کھیل کود اور جسمانی
ورزش کے ضروریات بھی شامل ہوتے ہیں۔ پرانے زمانے میں
جدید طرز کے کھیل رائج نہیں تھے صرف ایک گلی ڈنڈا تھا لیکن
وہ بھی روسا و شرفا کے نزدیک مبتذل تھا۔ ورزش کے نئے
اسلوب بھی معرض ظہور میں نہیں آئے تھے صحت مندی کے لیے صرف

مرغن و مقوی غذائیں تھیں اور تازہ ہوا میں سیر کر لینا کافی سمجھا جاتا تھا۔ البتہ تفریحی مشاغل کی بہتات تھی۔ بچپن ہی میں پتنگ بازی کا شوق ہو جاتا تھا۔ بزرگ خود اپنے بچوں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ برادر مرحوم جعفر علی خاں اثر کے والد بزرگوار اپنے فرزند کے لیے خود ہی کنکوے بناتے اور ان کو کنکوا اڑانا سکھاتے تھے۔

والدین کا یہ طرز عمل تھا کہ ان کے بچے جو کچھ کریں اس کا ان کو علم ہوتا رہے اور زیادہ تر انھیں کے سامنے کھیلتے کودتے رہیں۔ بچوں کو یہ نصیحت ضرور اور برابر کی جاتی تھی کہ برے بچے کھیل نہ کھیلیں اور ان برے برے کھیلوں میں دھول دھپا بدزبانی اور فحش کلامی کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ بیگمات شرفا کے اوقات میں اور ان اوقات کی بہتات تھی، اپنے بچوں کو دلچسپ تفریحی مشغلوں پر آمادہ کرتی تھیں اور خود بھی شریک رہ کر لطف اندوز ہوتی تھیں۔ ان مشاغل میں بیت بازی اور "سم سم" کھیلنے کو بڑی ہر دلعزیزی حاصل تھی۔ بیت بازی اب بھی شاید کہیں کہیں ہوتی ہو لیکن "سم سم" کھیلنا یقیناً متروک ہو چکا ہے۔

آخر میں یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ ہمارے طفولیت کا زمانہ اس قدر بدل گیا ہے کہ اپنی اصلی حالت پر اس دور کا کوئی رسم و رواج اور اس عہد کی کوئی قدر اب باقی نہیں رہ گئی ہے اور نہ قدیم رجحانات جدیدیت کے لیے قابل قبول ہیں وہ وقت نہ رہا، وہ ماحول بدل گیا، ہماری طبیعتوں اور مزاجوں میں فرق آ چکا اس لیے قرین قیاس یہی ہے کہ میری ہرزہ سرائی ناقابل توجہ قرار پائے اور میرے پیش کردہ واقعات افسانوی حیثیت پر محمول کیے جائیں لیکن والدین اور اولاد کا رشتہ کچھ فطری تقاضے بھی رکھتا ہے اور ان تقاضوں کو پورا کرنا ہمارا انسانی فرض ہے انسان کا صرف اتنا ہی فریضہ نہیں ہے کہ وہ توسیع نسل کرے بلکہ اس توسیع کے ساتھ یہ بھی لازم ہے کہ وہ خاندان اور سماج کے لیے کارآمد افراد مہیا کرے یعنی ایسی اولاد پیدا کرے اور اسے بعد کے لیے چھوڑ دے جو بڑھ کر ملک و قوم کے لیے سودمند ثابت ہو۔ یہ صورت حال صرف اسی طرح یقینی ہو سکتی ہے کہ والدین اپنی اولاد کی تربیت و تعلیم میں ذاتی طور سے دلچسپی لیں گھریلو تعلیم درس گاہوں میں کتابیں پڑھانے اور رٹا دینے سے زیادہ مفید ہوتی ہے اس لیے کہ کردار گھر ہی کے ماحول میں ابتداءً بنتا یا بگڑتا ہے۔ وہ بچے زیادہ سلیقہ مندی اور شائستگی کے مالک ہوتے ہیں جو اپنے والدین کی آغوش تربیت میں پھلتے اور پھولتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ موجودہ دور کی کشمکش حیات میں والدین کو اپنی اولاد کی طرف توجہ کرنے کی مہلت کم ملتی ہے لیکن ان کو یہ بھی سوچنا چاہیے کہ اولاد پیدا کرنے کے بعد پرورش و پرداخت کی ذمہ داری بھی انھیں پر عائد ہوتی ہے اور یہ ذمہ داری تنخواہ دار ملازموں یا مدرسوں کے حوالے کر دینے سے ایسے دور میں جبکہ احساس ذمہ داری تیزی کے ساتھ ختم ہو رہا ہے پوری نہیں ہوتی۔ یہ فریضہ ہر بچہ کی ماں کے لیے اور زیادہ اہم ہے کیوں کہ ایک اچھی ماں اپنے بچہ کا کردار جتنا بلند کر سکتی ہے اتنا کوئی دوسرا استوار نہیں سکتا۔ یہی قانون فطرت ہے جو اپنی جگہ پر اٹل ہے اس کو نظر انداز کرنا نہ صرف اپنے ساتھ بلکہ سماج کے مقابلے میں دشمنی ہے کیونکہ سیرت فرزند ہا از امہات جوہر صدق و صفا زامہات

★

شمس تبریز خان
۴ چمن پارک مکارم نگر
لکھنؤ

بچوں کی تعلیم و تربیت پر چند خیالات

مقام مسرت ہے کہ خواتین کے سال کے بعد ساری دنیا
بچوں کا سال منا رہی ہے۔ اور ہماری حکومت ہند بھی اپنے
۲۶ ملین بچوں کے لیے فکر مند ہے اور ان کے بہتر مستقبل کے
بارے میں منصوبے بنا رہی ہے، ابھی حکومت ہند نے
۱۹۷۸ء میں چائلڈ میرج ایکٹ کے ذریعہ ۲۱ سال سے کم کے
لڑکوں اور ۱۸ سال سے کم کی لڑکیوں کی شادی غیر قانونی
قرار دی ہے، بنیادی حقوق کے آرٹیکل ۲۴ میں ۱۴ سال
سے کم بچوں کو فیکٹریوں، کارخانوں اور دوسرے مشقت طلب
کاموں اور ملازمتوں میں رکھنے سے منع کیا گیا ہے۔ کیونکہ جنوبی
ہند کی فائر ورک فیکٹریوں اور بہار کے کوئلے اور ابرک کی
کانوں میں بہت سے بچوں کے مرنے کی اطلاع ملی تھی۔

اعداد و شمار کے بموجب ۱۷٫۸ فیصد ہندستانی
بچے زراعت میں لگے ہوئے ہیں اور بعض ۱۵، ۱۵ گھنٹے کام
کرتے ہیں[1]۔ بڑے افسوس کا مقام ہے کہ غربت و افلاس کے
سبب نہ بچوں کی صحیح پرورش ہوتی ہے نہ انھیں مقوی غذائیں
اور وٹامنس مل پاتے ہیں جن کی وجہ سے ان کی ذہنی و جسمانی
نشو و نما رک جاتی ہے، بڑے ہونے کے بعد اچھے اسکولوں
اور کالجوں کی نایابی کے سبب انہیں مناسب تعلیم نہیں مل پاتی
ہے۔ اس طرح ہم روحانی اور جسمانی دونوں لحاظ سے بچوں
کی ایک بڑی تعداد کو ناکارہ اور ناقص بنا رہے ہیں۔ اور
ملک و قوم کی امانت کو ضائع کر رہے ہیں۔

ہمیں یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ بچے ہمارے ہاتھوں میں موم کا
کھلونا ہیں، ہم چھوٹی عمروں میں انھیں جیسا بنانا چاہیں
گے۔ وہ آسانی سے ویسا ہی بن جائیں گے۔ اس لیے بچوں
کے سلسلے میں ساری ذمہ داری ان کے والدین ان کے سرپرستوں
اور پھر آخر میں پورے معاشرے اور حکومت کی ہے۔ مگر افسوس
ناک صورت حال یہ ہے کہ غربت اور تعلیم کی کمی اور جہالت
کے سبب انفرادی و اجتماعی سطح پر بچوں کی حالت سے بے توجہی
برتی جا رہی ہے اور اس طرح نادانستہ طور پر ملک و قوم
بلکہ دنیائے انسانیت کو نقصان پہنچایا جا رہا ہے، اکثر
والدین اپنی جہالت کے سبب بچوں کے سلسلے میں اپنے فرائض
اور ذمہ داریوں سے بے خبر ہوتے ہیں اور ان سے محبت رکھنے
کے باوجود نادان کی دوستی کی طرح ان کے لیے نقصان دہ
ثابت ہوتے ہیں، ناقص غذاؤں اور غلط تربیت، توہمات
اور ضعیف الاعتقادی کے سبب ان کے لیے اور اپنے لیے
طرح طرح کی مشکلات پیدا کر دیتے ہیں۔

---

[1] THE TIMES OF INDIA, SEPT. 2 P. 6

اس مرحلے سے گزرنے کے بعد جب بچہ مکتب یا اسکول
میں جانے کے قابل ہوتا ہے تو یہیں سے اس کی انفرادیت
مخصوص لیاقت وصلاحیت اور رجحانات کو کچلنا شروع
کر دیتے ہیں اور اس کے ذہنی رویے اور میلان و رجحان
پسند و ناپسند کا لحاظ کیے بغیر ایسے موضوعات کی تعلیم دینے
لگتے ہیں جن میں وہ شوق و دلچسپی نہیں رکھتا۔ تعلیمی لائن
کے غلط انتخاب کے سبب کتنے بچے وہ نہیں بن پاتے جس کے
وہ مستحق تھے یا جس کی صلاحیت رکھتے تھے۔ آپ نے
کتنوں کو حسرت و افسوس کے ساتھ کہتے سنا ہوگا کہ کاش
مجھے والدین نے میرے پسندیدہ موضوع کی تعلیم دلائی
ہوتی!

اسی کے ساتھ ہمارے ترقی پذیر معاشرے اور پیچیدہ
تر ہونے والی زندگی کی بدنصیبی ہے کہ ایک بچے کو شروع
ہی سے درجن بھر اور بعض دفعہ اس سے بھی زائد مضامین
پڑھنا پڑتے ہیں اور اس طرح اس کی انفرادیت کا ابھرتا ہوا
پودا اس بوجھ تلے دب کر رہ جاتا ہے۔ بچے کا فطری رجحان جس
موضوع و مضمون کی طرف ہوتا ہے اس کے بجائے بہت سی
دوسری نامانوس چیزیں اس کے ذہن میں اتاردی جاتی
ہیں۔ جس کے نتیجے میں برسوں کی محنت کے بعد ملازمت
کے لئے ایک پڑھا ہوا شخص تو تیار ہو جاتا ہے مگر ایک
کڑھی اور نکھری ہوئی شخصیت کی تشکیل نہیں ہوتی اقبال
نے اپنی نظم ہندی، مکتب میں تعلیم حاضر کے اسی نقص کی طرف
اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ [1]

اقبال یہاں نام نہ لے علم خودی کا
موزوں نہیں مکتب کیلئے ایسے مقالات
(ضرب کلیم)

شکایت ہے مجھے یارب خداوندان مکتب سے
سبق شاہین بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا
(بال جبریل)

کنڈر گارٹن (KINDER GARTEN) طریقہ تعلیم کے
بانی فروبل (١٨٥٢ء) کے خیال میں تعلیم کا مقصد "کھری
پرخلوص، بےعیب اور پاک صاف زندگی بسر کرنے کے قابل
بنانا ہے۔ ۔ ۔ ۔ تعلیم ایسی ہونی چاہیے کہ افراد اپنے کو پہچان
سکیں اور ان کے اندر کثرت میں وحدت کا احساس ابھرے۔
بچوں کی تعلیم دلچسپ اور آسان طریقوں سے ہونی چاہیئے
اور اس کے کنڈر گارٹن، مونٹیسری ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
اور کھیل کے ذریعہ تعلیم (PLAY WAY EDUCATIONS)
کے طریقے اپنانے چاہیے۔

موجودہ نظام تعلیم کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اس
میں مذہبی و اخلاقی تعلیم یا تو سرے سے نہیں یا برائے نام
ہے۔ جس سے طلبہ کے دل و دماغ پر روحانیت و اخلاق کی پرچھائیں
بھی نہیں پڑتی اور وہ زندگی کے مادی عوامل اور مظاہر کے سوا
کسی اور اخلاقی قدر کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں اور ان کا ذہن ایثار و قربانی
کے بجائے، نفع اندوزی اور فائدہ طلبی کے خطوط پر سوچتا ہے۔
جس سے انسانی معاشرے میں حیوان نما انسان بکثرت
نظر آنے لگے ہیں اور دردمند مفکرین یہ کہنے پر مجبور ہو گئے ہیں
کہ "موجودہ انسان نے مچھلی کی طرح پانی میں چلنا اور چڑیوں
کی طرح فضا میں اڑنا سیکھ لیا۔ مگر آدمی کی طرح زمین پر
چلنا نہیں سیکھا۔"

تعلیم کی بات آگئی ہے تو بچوں کے لٹریچر (JUVENILE
LITERATURE) کے متعلق بھی کچھ باتیں بچوں اور نوعمروں
کے لئے لکھنے والوں سے کہتا چلوں، افسوس کے ساتھ کہنا

---

[1] فن تعلیم و تربیت: ماسٹر افضل حسین ص٤٠

[2] ملاحظہ ہو انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا ٥/٦٧-٤-٤، طبع چہاردہم مقالہ "CHILDREN'S BOOKS"

پڑتا ہے کہ ہم اس میدان میں بھی مغرب سے بہت پیچھے ہیں۔ وہاں کے مختلف ملکوں میں بچوں کا ادب اتنا ترقی کر گیا ہے کہ اس کی قومی حیثیت تسلیم کی جاتی ہے۔ اور اس ملک کے ادب کے ساتھ اس کا بھی نام لیا جاتا ہے اور اسے ایک صنف ادب کا مقام حاصل ہے[1]۔

ہمارے یہاں ادب اطفال، کو ہلکا ادب سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے لکھنے والے کی طرح پڑھنے والے بھی اسے بے وقعتی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، حالانکہ یہ ادب انتہائی خلوص دردمندی اور سنجیدگی کا طالب اور ایک انتہائی نازک کام ہے، اس پر آئندہ نسلوں کی ذہنی و فکری تربیت اور ان کے ہمہ جہتی نشو و نما کا دار و مدار اور اس طرح ملک و ملت کے مستقبل کا سوال ہے۔ کیونکہ بچے کے ذہن پر اولین تعلیم و تربیت ہی کے نقوش دیر پا ہوتے ہیں اور دور تک اثر انداز ہوتے ہیں اور اگر اس وقت ان نونہالوں کی مناسب ذہنی آبیاری ہو جاتی ہے تو پھر بڑے ہو کر ہم ان کے خوشگوار پھولوں اور پھلوں کی توقع کر سکتے ہیں ورنہ نہیں۔

اردو میں ڈیڑھ دو سو سال سے بچوں کے لیے نظم و نثر میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ مگر بیشتر تحریروں میں مذاق سلیم بچوں کی نفسیات اور ذہنی کیفیات کا بہت کم لحاظ رکھا گیا ہے اور ناصحانہ و واعظانہ رنگ اختیار کیا گیا ہے۔ کہیں زبان مشکل استعمال کی گئی ہے۔ کہیں مضامین بچوں کی سمجھ سے بالاتر رکھے گئے ہیں۔ کہیں اسلوب بہت سنجیدہ اور بوجھل ہو گیا ہے۔ جبکہ بچوں کے لیے لکھتے وقت مصنف کو بچہ بن جانا چاہیئے اور اپنے کو ان کی سطح پر رکھ کر مخاطب کرنا چاہیئے۔ بچوں کی نفسیات سے صرف واقفیت ہی کافی نہیں۔ بلکہ ان کے رنگ میں رنگ جانے، ان کے ساتھ مل بیٹھنے اور ان کا راز دار بننے اور اپنے کو ان کا ہم خیال و ہم مذاق اور یار غار بنا لینے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اس کے ساتھ ہی قصہ کہانی کا انداز، بات چیت کا اسلوب، اور سوال و جواب کا طریقہ اپنا کے آسان سے آسان زبان میں اپنی بات کہنی چاہیئے۔ اس اہتمام کے بعد بچوں کے دلوں میں اپنی بات اتاری جا سکتی اور ان کی نفسیات پر اثر انداز ہوا جا سکتا ہے۔

اوپر جو باتیں لکھی گئیں ان پر اسی وقت عمل ہو سکتا ہے۔ جبکہ ہمارے دلوں میں اپنے بچوں کا نہیں بلکہ دوسرے بچوں کے لیے بھی جگہ اور نرم گوشہ ہو اور ہم انسانی ہمدردی کے تحت بچوں کے ساتھ تمام ہی کمزور طبقات، عورتوں، ضعیفوں اور معذوروں کے لیے بے چین اور فکر مند ہوں۔ اس کے لیے ضرورت ہے کہ مذاہب و اخلاق کی تعلیمات پر عمل کیا جائے اور انسانیت دوست مفکرین کے خیالات کی قدر کی جائے۔ اور اپنے ضمیر میں انسانیت کا درد محسوس کیا جائے جو ہم سب کی مشترکہ میراث ہے کیونکہ درحقیقت ایک انسان، عالم انسانی میں رہتے ہوئے اپنے تمام بھائیوں سے انسانیت کے رشتے میں منسلک ہے اور اس پر ان سب کی ذمہ داری کسی نہ کسی حد تک عائد ہوتی ہے[2]۔

چیست انسانی تپیدن در غم ہمسائیگان
از سموم نجد در باغ عدن بریان شدن

دنیا کے تمام ہی مذاہب نے بچوں اور کمزور طبقوں کی اعانت و حمایت کی تعلیم دی ہے۔ میں سردست اسلام کی چند تعلیمات پر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

عرب جاہلیت میں شرم اور غربت کی وجہ سے بچوں کو قتل کر دیتے تھے۔ قرآن نے اس ظالمانہ رواج پر بندش لگاتے ہوئے کہا کہ "اپنی اولاد کو فقر کے ڈر سے قتل نہ کرو بلکہ میں ہی تمھیں اور انھیں روزی دیتا ہوں، ان کا قتل بہت بڑا گناہ ہے[3]"

(بقیہ ص ۲۹ پر)

---

[1] ملاحظہ ہو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ۵/۷۶-۷۴۔ ۲ طبع چہاردہم مقالہ "CHILD REN'S BOOKS" [2] الانعام۔ [3] الفرقان

یاسمین بودھے (ماریشس)
طالبہ لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ

بچوں کی نفسیات — ایک مطالعہ

سائنس جہاں زندگی کے مختلف شعبوں میں تحقیق و مشاہدے کے مختلف مدارج طے کرتے ہوئے آگے بڑھی وہاں یہ اہم ضرورت بھی محسوس کی گئی کہ بچے کا باقاعدہ نفسیاتی مطالعہ کیا جائے۔ متعدد ماہرین نفسیات اس میدان میں پیدا ہوئے جنھوں نے بچوں کی نشو و نما اور ارتقا کے مختلف مدارج میں ان کی اضطراری حرکات و سکنات کا وسیع مطالعہ اور عمیق مشاہدہ کیا۔ ابتدائی دور میں بریئر ڈارون جِن اور بعض دیگر اہم ماہرین نفسیات نے بچوں کے تجزیے کے سلسلے میں اپنے مختلف ذاتی تجربے ظاہر کیے۔ رفتہ رفتہ اس میدان میں ترقی ہوتی گئی جس کا دائرہ نوزائیدہ بچوں سے لے کر سن بلوغت تک کے مختلف مرحلوں پر پھیل گیا اور ہر دور کا نفسیاتی نقطۂ نظر سے مشاہدہ کرنے کے لیے گوناگوں بنیادی اصول وضع کر لیے گیے۔

فرانس کے مشہور ماہر نفسیات بنٹ (BINET) نے ذہانت کے تجزیے کا ایک آزمائشی طریقہ ایجاد کیا جس سے کسی کردار کی انفرادیت کو آزمایا جا سکتا ہے۔ یہ طریقہ انھوں نے پرائمری اسکول کے بچوں کے ذہنی مطالعہ کے لیے وضع کیا تھا۔ بعد میں ویکلر (WECHLER) جو دماغی اسپتال کے ماہر نفسیات تھے، بالغ بچوں کی ذہانت کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک آزمائشی طریقہ منظر عام پر لائے۔ بچے کی ذہانت کے مشاہدے کے ساتھ ساتھ ماہرین نفسیات نے بچوں کے کردار کے دیگر مختلف پہلوؤں پر بھی تحقیق و تجزیہ کا کام جاری رکھا۔ ان لوگوں کی نظر میں زبان بچے کے کردار اور شخصیت کو بنانے اور سنوارنے میں سب سے اہم رول ادا کرتی ہے۔ زبان ہی کی مدد سے ہم بچے کی نوّے فی صد ضروریات کو سمجھ سکتے ہیں۔ بچے کی زبان کے آئینے میں ہم اس کی عمر کو سامنے رکھتے ہوئے اس کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ بچے کی ذہانت اور اس کی عمر دونوں متوازن طریقے سے قدم بہ قدم چل رہے ہیں یا نہیں۔ اس میدان میں متعدد ماہرین نفسیات نے تحقیق و مشاہدے سے متعلق اہم کارنامے انجام دیئے ہیں۔ اس سلسلے میں ماہر نفسیات پیاجے (PIAGET) نے بچوں کی لسانیاتی نشو و نما کا باقاعدگی کے ساتھ مطالعہ کرنے کے بعد جو ذاتی تجربے حاصل کیے ان کو ایک کتاب کی شکل میں "بچوں کی زبان اور تخیل" کے عنوان سے معرض تحریر میں لائے۔ اس طرح اسمتھ، ڈیوس ولیم اور میٹس نے بھی بچوں کے لسانیاتی نشو و نما کے میدان میں مختلف نظریات پیش کیے ہیں۔ انھوں نے مشاہدے اور تجزیے کے ذریعے یہ دیکھنے کی کوشش کی ہے کہ عمر کے مختلف مدارج طے کرتے ہوئے ذخیرۂ الفاظ کہاں تک ساتھ دیتا ہے۔

بچے کی لسانیاتی نشو و نما میں نقل (IMITATION) کا بڑا ہاتھ ہے۔ اگر واقعی دیکھا جائے تو بچہ ایک مکمل نقال ہوتا ہے وہ ہر اس حرکت یا آواز کی نقل کرنے کی کوشش کرتا ہے جو اس کے ارد گرد چلتے پھرتے دیکھنے یا سننے میں آتی ہے چاہے وہ اچھی ہو یا بری۔ نفسیاتی نقطۂ نظر سے بچوں میں دوسروں کی نقل کرنے کی صلاحیت نو مہینے کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ بچوں کے ایک ماہر نفسیات چمنیز (CHAMNEYS) کا خیال ہے کہ اگر کسی آواز یا کسی جملے کو کئی مرتبہ دہرایا جائے تو بچہ اس کی جلد نقل

کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ چمپنیز کے علاوہ بعض دیگر ماہرین نفسیات نے نقل کے الگ الگ مدارج بتائے ہیں۔ جیسے سی۔ بلیر (C.BULER) نے ۶ مہینے اور گیسل (GESELL) نے دس مہینے کے بعد بچے میں نقل کرنے کی صلاحیت کا انکشاف کیا ہے۔ جیسا کہ اوپر اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ بچہ ہر اس حرکت اور آواز کی نقل کرنے کی کوشش کرتا ہے جو اس کے ارد گرد دیکھنے یا سننے میں آتی ہے۔ ان اہم باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم پورے یقین کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ بچے کے کردار کو بنانے یا بگاڑنے میں سب سے اہم رول وہ ماحول ادا کرتا ہے جس میں بچہ سانس لے رہا ہے۔ ماحول بچے کے معاشرتی عروج و ارتقا اور تنزلی کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اس میں رہ کر بچہ بولنا سیکھتا ہے۔ چلنا سیکھتا ہے۔ چھوٹے بڑوں میں فرق محسوس کرتا ہے، آداب و اطوار سیکھتا ہے یعنی ہر اس چیز کو اپنانے کی کوشش کرتا ہے جو اس کا اپنا ماحول اسے فراہم کرتا ہے۔ بچہ اچھا ہے یا برا۔ یہ سراسر اس کے ماحول پر منحصر ہے۔ جس میں وہ ایک انفرادی شخصیت کی صورت میں پروان چڑھتا ہے۔

بچے کے کردار اور اطوار کو اخلاق و انسانیت کا بہترین نمونہ بنانے کا اہم ذریعہ اس کے گھر کے افراد ہوتے ہیں جہاں اس نے آنکھ کھولی۔ کہا جاتا ہے کہ بچہ گھر کا اصلی ترجمان ہوتا ہے سب سے پہلے وہ گھر کے افراد سے متاثر ہوتا ہے۔ ان کے خیالات اور حرکات کا باقاعدہ مشاہدہ کرتا ہے اور ان کو رو بہ پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے چاہے وہ اچھے ہوں یا برے۔ دھیرے دھیرے وہ اپنی شخصیت کو ان رنگوں میں رنگ لیتا ہے جو آگے چل کر بچے کے بننے یا بگڑنے کا سبب بنتے ہیں۔ بچے کی ایک سالم اور مکمل شخصیت کی تعمیر اور اس کے مستقبل کو روشن کرنے کے ذمہ دار گھر کے افراد ہوتے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ اہمیت والدین کو حاصل ہوتی ہے۔ اور والدین ہی ایسی بنیادی شخصیتیں ہیں جو بچے کی ہر ضرورت کو جان و دل سے پورا کرنے کی کوشش کرتی ہیں دوسروں کے مقابلے میں بچے کو اپنے والدین سے زیادہ رغبت ہوتی ہے۔ اس کی نظر میں والدین ہی وہ ہستیاں ہوتی ہیں جن کے اشارے اور سہارے سے وہ بولنا سیکھتا ہے، چلنا سیکھتا ہے اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا سیکھتا ہے۔ اس طرح والدین اپنے بچے کو اپنے مستقبل کا سہارا سمجھ کر اس کی صحیح تعلیم و تربیت اور اسے ایک اچھا شہری بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کوشش کی کامیابی اسی وقت ممکن ہے جب والدین خود با اخلاق اور مہذب و متمدن شہری ہوں۔ بچہ کی عملی اور اخلاقی زندگی کی عمارت کے بنیادی ستون گھر کا ماحول اور اسکے افراد ہوتے ہیں۔ ان ہی کے نقش قدم پر چل کر وہ اپنی زندگی کی عمارت کھڑی کرتا ہے۔ اگر گھر کا ماحول ناسازگار ہو تو بچے کی ذہنی اور جسمانی نشو و نما کے ساتھ اس کے اخلاقی، معاشرتی اور تمدنی ارتقا پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔ ایسے ماحول میں پلنے والے بچے کو جب ذہنی اور روحانی تسکین نہیں ملتی ہے تو یہیں سے وہ غلط راستہ اپنا لیتا ہے جس کے ذریعہ وہ اپنی مختلف ضروریات پوری کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ حالانکہ اس میں اچھے برے کی تمیز نہیں ہوتی۔ اس لیے ضروری ہے کہ سوسائٹی کا اہم اور مہذب رکن بنانے کے لیے بچے کو اسی وقت سے صحیح تربیت دی جائے جب اس میں نقل کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ یہی وہ مرحلہ ہے جہاں سے بچے کے کردار کی تعمیر اس کے آنے والے کل کے لیے شروع ہوتی ہے۔

گھر کے ماحول سے نکل کر جب بچہ باہر کے ماحول میں قدم رکھتا ہے تو مختلف معاشروں کے مختلف قسم کے بچوں سے اس کا واسطہ پڑتا ہے۔ ہر بچہ ایک انفرادی شخصیت کا مالک ہوتا ہے اور اپنے طبقے کے ماحول اور خیالات کا آئینہ دار بن کر باہر کی سوسائٹی میں قدم رکھتا ہے۔ جہاں اسے مختلف خیالات کے حامل بچوں کے ساتھ واسطہ پڑتا ہے۔ یہ دور بچے کے کردار کو پروان چڑھانے میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہیں سے بچے کی لیاقت قابلیت اور استعداد میں تیزی سے اضافہ ہوتا ہے۔ ساتھ کھیلتے کودتے، چلتے پھرتے ہوئے بچے ایک دوسرے کے نظریے سے دو چار ہوتے ہیں۔ ان کے تصورات اور خیالات ایک دوسرے

(باقی صفحہ ۹۵ پر)

ڈاکٹر مرزا رفیع الدین احمد
صدر شعبۂ سوشل ورک، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ۔

بچوں کے تعلیمی مسائل

ایک فلاحی ریاست جہاں اپنے سبھی شہریوں کی فلاح و بہبود کی ذمہ دار ہے وہاں خصوصاً اس کی ذمہ داری بچوں کی طرف زیادہ ہے۔ اس کی دو وجوہات ہیں:

(۱) یہی بچے آگے چل کر ملک کی باگ ڈور سنبھالیں گے یعنی یہ ہمارا مستقبل ہیں۔

(۲) مخصوص طور پر مشرق کے ترقی پذیر ممالک میں بچوں کی سطح زندگی بہت نیچی ہے اور وہ گوناگوں مسائل سے دوچار ہیں۔

آج سے کئی سال قبل نومبر ۱۹۵۹ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے متفقہ طور پر بچوں کے حقوق کے اعلان کو تسلیم کیا تھا۔ متحدہ اقوام (U.N.O.) نے یہ اعلان کیا کہ انسانیت کا یہ فرض ہے کہ وہ بچوں کو بہتر سے بہتر سہولتیں بہم پہنچائے اور یہ کہ بچوں کو نسل، رنگ، جنس، مذہب اور قومیت کے امتیاز کے بغیر مساویانہ شہری حقوق دیے جائیں گے۔ اس اعلان میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ بچوں کو مخصوص تحفظ ملے گا۔ انھیں اس بات کا موقع ملے گا کہ وہ آزادی کے ماحول میں اور عزت کے احساس کے ساتھ تندرست اور نارمل بن سکیں اور انھیں خاطر خواہ خورد و نوش، رہائش اور طبی خدمات کے حصول کا حق ملے گا۔ یہ اعلان ساری دنیا کے اطفال کے لیے کیا گیا تھا لیکن اس کا صحیح اطلاق خصوصیت کے ساتھ غریب ممالک پر ہوتا ہے جہاں کے بچے افلاس و بیچارگی کی زندگی گذارنے پر مجبور ہیں۔ اقوام متحدہ کے اعلان کے مطابق بچوں کو مفت تعلیم کا حق ہونا چاہیے جو انھیں اس قابل بنائے کہ وہ مساویانہ مواقع کی بنیاد پر اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا سکیں اور بچوں کو ہر طرح کے ظلم اور استحصال سے محفوظ رکھا جائے۔

ہم جانتے ہیں کہ سنہ ۱۹۷۹ء بچوں کا بین الاقوامی سال ہے۔ اقوام متحدہ کے مذکورہ بالا اعلان کو بیس سال کا عرصہ گذر چکا۔ لیکن جب ہم دنیا کے بچوں کی حالت پر نظر ڈالتے ہیں تو افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ابھی تک ہم نے بچوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا ——— ایک مصنف کے مطابق ابھی تک دنیا میں ۲۰ لاکھ بچے مہاجر کی حیثیت سے رہ رہے ہیں۔ تقریباً ڈیڑھ کروڑ بچے ۲ سال کی عمر سے پہلے انتقال کر جاتے ہیں۔ چار کروڑ بچے بغیر... کے کام کرتے ہیں۔ تقریباً ۱۶ کروڑ بچے گندی بستیوں میں رہتے ہیں اور ستر کروڑ بچوں کو صاف پینے کا پانی مہیا نہیں ہے۔ ان میں زیادہ تر بچے غریب اور ترقی پذیر (DEVELOPING) ممالک میں رہتے ہیں۔

ایک منصوبے کے مطابق سنہ ۱۹۷۹ء میں ۸۰ ممالک سے تقریباً ایک ہزار بچے ہندوستان آئیں گے اور کسی مرکزی مقام پر ان کا اجتماع ہوگا۔ اس کے بعد باہر سے آئے ہوئے بچوں کے ساتھ سارے ہندوستان کی سیر کے لیے ہر ریاست سے پانچ بچے بھیجے جائیں گے۔

بھارت کے بچوں کے مسائل

رجسٹرار جنرل کے مطابق بچوں کی آبادی ہمارے ملک میں تشویشناک طور پر بڑھ رہی ہے۔ ملک کا نوجوان طبقہ دیہی علاقوں میں تقریباً ستر لاکھ اور شہری علاقوں میں ... کی آبادی کا اضافہ کر رہا ہے یعنی کل سالانہ آبادی کے اضافہ کا ۳۹ فی صد اضافہ نوجوان طبقہ ہی کر رہا ہے۔ اس وق

ل میں ۶ برس تک کے بچوں کی آبادی تقریباً ½ ۱۱ کروڑ ہے
ن میں سے ایک بڑی تعداد ایسے کنبوں میں رہتی ہے جو
ریبی کی سطح سے نیچے کی زندگی گذار رہے ہیں۔ تقریباً
ے لاکھ بچے گندی بستیوں میں رہتے ہیں۔ ۲۸ لاکھ قبائلی
بقوں سے متعلق ہیں اور تقریباً ساڑھے تین کروڑ دیہی علاقوں
ں رہتے ہیں، یونی سیف (UNICEF) کے ایک جریدے
ے مطابق اس ملک میں چھ برس تک کی عمر کے بچوں کی تعداد ½ ۱۱
روڑ ہے اور اس میں تقریباً ۵ لاکھ بچے ایسے کنبوں میں رہتے ہیں
ن کی سطح زندگی غریبی کی سطح سے نیچی ہے۔ اس جریدے کے مطابق
بچوں کی تعداد قصبوں اور شہروں میں ۹۲ لاکھ ہے اور ۳ کروڑ ۲۵ لاکھ
بچے اقوام متحدہ کی فہرست کے ہیں۔

عالمی صحتی ادارے (WHO) کی ایک رپورٹ کے مطابق
ھارت میں بیماروں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ تقریباً ایک کروڑ
ہتر لاکھ آنکھ کے مریض ہیں۔ ۳۲ لاکھ کوڑھ کے مریض چالیس لاکھ
یریا کے مریض، دس لاکھ کینسر کے مریض اور ۲۵ لاکھ تپ دق کے
یض ہیں، اندھے بچوں کی تعداد ۵ لاکھ ہے اور اس تعداد میں
یک لاکھ کی درسے ہر سال اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ بہرے
بچوں کی تعداد دو لاکھ ہے اور اپاہج بچوں کی تعداد پانچ
لاکھ ہے۔ بہرے بچوں کی تعداد میں فی سال چالیس ہزار اور
اپاہج بچوں کی تعداد میں فی سال ایک لاکھ کا
اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ابھی تک ان بچوں کی فلاح کے لیے
و کچھ کیا گیا ہے وہ بہت کم ہے۔ اندھے بچوں کے علاج
ور تربیت کے لیے جو ادارے ہیں وہ صرف پانچ ہزار
ندھے بچوں کی ہی ضروریات کو پورا کر پاتے ہیں جبکہ
ندھے بچوں کی تعداد پانچ لاکھ ہے۔ بہرے بچوں کے لیے
صرف ۷۲ ادارے ہیں جو صرف چار ہزار بچوں کے لیے کافی
ہیں اور اپاہج بچوں کے لیے صرف ۴۲ ادارے ہیں جو صرف
تین ہزار بچوں کی ضروریات پوری کر پاتے ہیں۔

انڈین کاونسل آف سوشل ویلفیئر (بمبئی کی شاخ) نے
نے اپنے اکتوبر ۱۹۷۸ء کے جریدے میں لکھا ہے کہ مارچ
سنہ ۱۹۷۹ء تک ۱۵ سال سے کم کے بچوں کی تعداد ۲۵ کروڑ
۹۰ لاکھ ہو جائے گی۔ ان میں سے تقریباً ۹ کروڑ تیس لاکھ بچے
یعنی ۲۰.۸ فی صد صفر سے ۴ برس کی عمر کے اور ۱۶ کروڑ ۶۰ لاکھ دس
سے چودہ برس کی عمر کے یعنی ۲۳.۵ فی صد ہوں گے۔ تمام عمری
گروہوں میں بچوں کی کل تعداد تقریباً چالیس فی صد ہوگی۔

ان اعداد و شمار سے ظاہر ہے کہ بچوں کے مسائل
کتنے اہم ہیں۔ اگر ان مسائل کا علاج بچپن ہی میں نہ کیا گیا تو یہ
بچے بڑے ہو کر ملک کے لیے ایک بوجھ بن جائیں گے اور اگر ان کی ضروریات
صحیح طور پر پوری نہ کی گئیں تو یہ بڑے ہو کر عدم توافق (MALAD-JUSTMENT) کا شکار ہو جائیں گے۔

ہمارے آئین کی دفعہ ۳۸ میں یہ لکھا ہے کہ حکومت کی ذمہ
داری ہے کہ وہ اس بات کی ضامن رہے کہ مرد اور عورت کام
کرنے والوں کی صحت اور طاقت اور بچوں کی چھوٹی عمر کا غلط
استعمال نہ کیا جائے اور ملک کے شہری معاشی احتیاج سے مجبور
ہو کر ایسے پیشوں کو نہ اختیار کریں جو ان کی عمر اور طاقت سے
مناسبت نہ رکھتے ہوں اور یہ کہ بچپن اور نوجوانی کا استحصال
اور اخلاقی اور مادی لاپرواہی سے تحفظ کیا جائے۔ آئین کی اس
دفعہ کے مطابق حکومت کی ذمہ داری بچوں کے معاملے میں بہت
ہی اہم ہو جاتی ہے۔

مجرم بچے

ہمارے ملک میں مجرم بچوں (DELINQUENT CHILDREN)
کی خاصی تعداد ہے اور حالانکہ بچوں کے قانون (CHILDREN ACT 1960) کے تحت بچوں کی اصلاح کے لیے بہت کچھ کیا
جا رہا ہے پھر بھی ملک کے مختلف قید خانوں میں اوسطاً بیس ہزار
بچے ہر دن داخل کیے جاتے ہیں اور سال بھر میں قید خانوں
کے اندر تقریباً نوے ہزار بچوں کا آنا جانا (TURNOVER)
ہوتا ہے۔ بچوں کی اصلاح کے لیے تو مختلف ادارے قائم

ہیں لیکن سب سے بڑی کمی یہ ہے کہ ان اداروں سے بچوں کے نکلنے کے بعد ان کی دیکھ بھال کرنے کے لیے کوئی ادارہ نہیں ہے۔ لہٰذا یہ پتہ نہیں چلتا کہ اصلاحی اداروں سے نکلنے کے بعد یہ بچے کیسی زندگی گذارتے ہیں یعنی کیا وہ پھر مجرمانہ عمل کرتے ہیں یا سماج میں توافق (ADJUSTMENT) حاصل کر لیتے ہیں۔ پروبیشن افسروں کی بہت کمی ہے۔ ایک پروبیشن افسر کے زیر نگرانی سو یا دو سو اشخاص کر دیے جاتے ہیں، جبکہ قاعدے سے ایک افسر حد سے حد بیس اشخاص کی نگرانی کر سکتا ہے۔

بچوں کی صحت کا مسئلہ

اقوام متحدہ کی ایک رپورٹ کے مطابق غریب ملکوں میں ۶ سے ۱۱ برس کی عمر کے بچوں میں ایسے بچوں کی تعداد جو کسی اسکول میں نہیں پڑھ رہے ہوں گے، ۱۹۸۵ء میں ۱۳½ کروڑ تک پہونچ جائے گی۔ ایسے بچے ایشیائی ممالک میں ۹ کروڑ ہوں گے اور افریقی ممالک میں ۳½ کروڑ ہوں گے باقی نوے لاکھ لاطینی امریکہ میں ہوں گے۔

ترقی پذیر ممالک (DEVELOPING COUNTRIES) میں جہاں ہر سال تقریباً ۸ کروڑ بچے پیدا ہوتے ہیں، دس فی صد سے بھی کم بچوں کو بچپن کی بیماریوں سے تحفظ کے ٹیکے لگ پاتے ہیں۔ ان جان لیوا بیماریوں میں ڈپتھیریا، کالی کھانسی، ٹیٹنس، خسرہ اور پولیو شامل ہیں۔ بہت سے بچے تپ دق کا بھی شکار ہو جاتے ہیں۔

عالمی صحتی ادارے (WHO) کا اندازہ ہے کہ دنیا میں ساری بیماریوں کا ۸۰ فی صد گندے پانی کے پینے سے ہوتی ہیں۔ ایشیائی ممالک میں اقوام متحدہ نے بچوں کی فلاح کے لیے بہت کم کام کیے ہیں۔ یونی سیف (UNICEF) نے ۱۹۷۶ء میں ۲۵ ممالک کو بچوں کے لیے سماجی خدمات مہیا کرنے کے لیے تقریباً چار کروڑ روپے دیے۔ ان ممالک میں سے صرف ۱۲ ممالک ایشیا کے تھے۔

کام کرنے والے بچے اور ان کے مسائل

ہندوستان ایک غریب ملک ہے اور یہاں کی غربت کنبوں کو مجبور کر دیتی ہے کہ وہ اپنے چھوٹی عمر کے بچوں کو گھر سے باہر مزدوری پر کام کے لیے بھیجیں، اس میں دو خرابیاں مضمر ہیں اول تو یہ کہ جو عمر بچوں کی تعلیم کے لیے یا کم از کم ابتدائی تعلیم لینے ہوتی ہے وہ بغیر تعلیم کے گزر جاتی ہے اور پھر بڑے ہو کر وہ جاہل ہی رہ جاتے ہیں، دوسرے جو کام ان سے لیا جاتا ہے وہ اکثر ان کی صحت کے لیے بھاری یا نقصان دہ ہوتا ہے اور انھیں اس کا معاوضہ بھی کم ملتا ہے۔ اس سلسلے میں حالانکہ حکومت نے قانون بھی پاس کیے ہیں لیکن اکثر و بیشتر ان قوانین کی جا لاکی سے خلاف ورزی ہوتی ہے اور بچوں کا استحصال کیا جاتا ہے۔ استحصال کی حد تو یہاں تک ہے کہ ایسے لوگ بھی ہیں جو بچوں کو اپاہج بنا کر ان سے بھیک منگواتے ہیں اور ان کا سارا پیسہ چھین کر انھیں بہت ہی کم کھانے اور کپڑے پر رکھتے ہیں۔ دوا علاج اور تعلیم کا تو سوال ہی نہیں۔ اس برائی کو دور کرنے میں حکومت کے علاوہ عوام کو بھی سرگرمی سے حصہ لینا چاہیے، ایسے بچوں کو بھیک نہیں دینا چاہیے بلکہ پتہ لگانا چاہیے کہ وہ کون لوگ ہیں جو ان بچوں سے کام کروا رہے ہیں اور پھر اس کی اطلاع متعلقہ افسران تک پہنچانی چاہیے تاکہ وہ لوگ پکڑے جا سکیں اور سزایاب ہوں۔ انڈین کاؤنسل آف چائلڈ ویلفیر نے دہلی میں ایک تحقیق کروائی جس سے یہ پتہ چلا کہ ۱۹۷۳ء میں دہلی میں اکیس ہزار کام کرنے والے بچے تھے۔ جو بچے چائے خانوں اور ڈھابوں میں کام کرتے تھے ان میں سے آدھے یعنی ۵۰ فی صد دن میں ۱۲ گھنٹوں سے زیادہ کام کرتے تھے اور غیر رجسٹرڈ ڈھابوں میں تو دو تہائی بچے ۱۲ گھنٹوں سے زیادہ کام کرتے تھے۔ حالانکہ بچوں کے لیے مزدوری ۸۸ روپیہ ماہوار قانوناً ہونا چاہیے مگر اکثر جگہوں پر انھیں اس سے کہیں کم مزدوری ملتی ہے۔ اس تحقیق میں

یا کہ اکثر دکانوں یا کارخانوں میں متعینہ عمر سے کم کے بچوں سے
مزدوری سے کم پر کام لیا جاتا ہے۔ ان بچوں کو رہائشی سہولتیں بھی
یسر ہیں اور یہ مناسب کپڑوں سے بھی محروم ہیں۔ جب دلی میں
ہے تو چھوٹی جگہوں پر تو قانون کا نفاذ شاید اور بھی کم ہو پاتا
ر بچوں کا استحصال اور بھی زیادہ ہوتا ہو۔

بچوں کی فلاح ویسے تو بات خود توجہ چاہتی ہے لیکن
یہ پورے کنبے کی فلاح سے منسلک ہے۔ جب تک ہمارے
سے غریبی بے روزگاری اور عدم مساوات دور نہ ہوں
بچوں کی فلاح پوری طور پر مشکل ہے۔ جس گھر کے ماں باپ
بے روزگار ہوں گے اس کے بچے کس طرح تندرست و توانا
ہ ہیں۔ بچوں کے مادی مسائل کے علاوہ ایک خاص مسئلہ ان
ہم اور ان کی شخصیت کی صحیح نشو و نما ہے۔

آج ہمارے ملک میں بچوں کی ایک کثیر تعداد دیہاتوں اور
شہروں کے پرائمری اور ثانوی اسکولوں میں پڑھتی ہے جہاں کے
استادوں کی تنخواہ بقول ڈاکٹر گنار مرڈل کے نقصان دہ طور پر
کم ہے۔ جو لوگ ان عہدوں کے لیے ملتے ہیں وہ خود اہلیت نہیں
رکھتے اور بچوں کو ایسی تعلیم نہیں دے پاتے جس سے ان میں ایک
سیکولر اور جمہوری سائنسی منطقی اور انسانیت پرست نقطۂ نظر پیدا
ہو سکے۔ اس کے لیے آج اپنے ملک میں اعلا اونچی
اقدار پیدا کرنے کے لیے پرائمری اور ثانوی تعلیم پر ہی زور دینا
اور اس کی سطح کو اونچا کرنا ہوگا۔ تبھی ہم ایسے بچے تیار کر سکیں گے
جن کے لیے اقبال نے لکھا تھا،

دور دنیا کا مرے دم سے اندھیرا ہو جائے
ہر جگہ میرے چمکنے سے اجالا ہو جائے

بچوں کے بین اقوامی سال ۱۹۷۹ء میں خصوصی توجہ اس طرف
ہونی چاہیے۔

★

بچوں کی تعلیم و تربیت پر چند خیالات — (صفحہ ۲۳ کا بقیہ)

اس کے برعکس قرآن نے بیوی بچوں کو "آنکھوں کی
ٹھنڈک" قرار دیا ہے۔ اور ان کے حقوق کی وضاحت کی۔
معاشرے میں یتیم بچے سب سے زیادہ کسمپرسی کے شکار ہوتے
تھے اس لئے قرآن نے اپنے متعدد بیانات میں بہت
زور دے کر ان کے حقوق کی حفاظت کرتے ہوئے لوگوں کو
یاد دلائی کہ "لوگوں کو دوسروں کی اولاد کی اتنی ہی فکر کرنی
چاہئے جیسے اگر اپنی اولاد اس طرح کمسن چھوڑ کر مرنے لگتے
تو کتنی فکر کرتے، اور اللہ سے ڈرنا اور سیدھی بات کہنا
چاہئے۔ جو لوگ یتیموں کا مال ناحق کھا جاتے ہیں وہ اپنے پیٹ
آگ بھرتے ہیں اور دوزخ میں جائیں گے۔"

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی عورتوں، بچوں اور
کمزور طبقات کے لیے نہایت رحمدل واقع ہوئے تھے۔ آپ کی
تعلیم ہے کہ "جو ہمارے چھوٹوں پر شفقت اور بڑوں کی عزت
نہ کرے۔ وہ ہم میں سے نہیں۔" اسی طرح آپ نے اولاد کو نیک
تربیت دینے پر جنت کی بشارت دی ہے۔ بچوں سے آپ کو
خصوصی انس و تعلق تھا۔ آپ ان سے بڑی بے تکلفی سے ملتے
اور کبھی کبھی ان سے مزاح بھی فرماتے، چھوٹے بچوں کو گود میں
لیتے اور ان کو چومتے ہوئے فرماتے کہ "یہ جنت کے پھول ہیں۔"
کبھی فرماتے کہ —

"نومولود بچہ ابھی تازہ تازہ اپنے رب سے جدا ہوا ہے۔"

آپ کی شفقت کا یہ عالم تھا کہ ایک بار آپ حالت نماز میں
تھے کہ کسی عورت کا بچہ رونے لگا۔ آپ نے نماز مختصر کر دی اور
بعد میں فرمایا کہ "میں چاہتا تھا کہ اس کی ماں کا دل نہ دکھے۔"

★

وقار خلیلی
ایوانِ اردو، پنجہ گٹہ روڈ۔ حیدرآباد

۔۔۔۔۴

خوش مزاجی

(ان دنوں بچوں کے لیے منظوم قاعدہ لکھ رہا ہوں۔ یہ نظم "خ" سے شروع ہوتی ہے اور اس باتصویر منظوم قاعدہ کا ایک حصہ ہے۔ و۔خ)

خدمتِ خلق ہی عبادت ہے
خوش مزاجی ہزار نعمت ہے

خوش عقیدہ رہو، شگفتہ رہو
کوئی موسم ہو مسکرا کے جیو

خوبیوں پر نظر ہمیشہ رہے
مقصدِ زندگی یہی تو ہے

خوبصورت لباس میں بچے
ایسے لگتے ہیں جیسے گلدستے

خواب کیا ہیں، خیال کی باتیں
جیسے دن ہیں اسی طرح راتیں

خیر، خیرات میں بھلائی ہے
خرچ کرنا بھی اک کمائی ہے

خاص باتوں کو عام کرنا ہے
دوستو! نیک کام کرنا ہے

پھولوں کی غزل

خوش نما ہے حیات پھولوں کی
دیکھنا کائنات پھولوں کی

جوہی، چمپا، چنبیلی اور گلاب
نام بچوں کے ذات پھولوں کی

تتلیوں کی طرح سجل نازک
ان کی ہر بات، بات پھولوں کی

وہ جو پڑھتے ہیں اور لکھتے ہیں
اور کہتے ہیں بات پھولوں کی

لہلہاتا چمن، ہجومِ بہار
مسکراتی ہے ذات پھولوں کی

علم کی روشنی کے دیپ جلیں
مہکی مہکی ہے رات پھولوں کی

"نذرِ مخدوم" ہے غزل، یعنی
شخصیت تھی حیات پھولوں کی

پھول کی طرح مدرسوں میں وقار
سج رہی ہے برات پھولوں کی

علم

علم ثروت ہے علم شوکت ہے
علم اک لازوال دولت ہے
اس کا سورج چمکتا رہتا
اس کا ماتھا دمکتا رہتا
جیسے غنچہ چمن میں کھلتا ہے
اس کا سکہ جہاں میں چلتا ہے
علم تہذیب کا ٹھکانا
رہنے والا سدا خزانا
حکمرانی ہے کارخانے میں
قدردانی ہے ہر زمانے میں
علم سورج ہے علم تارا
جگمگاتا یہ ماہ پارا
علم کھیتوں کو لہلہاتا ہے
اور جینا ہمیں سکھاتا ہے
علم دنیا کے امن کی چھایا
علم خوشیوں کی بے بہا مایا

نثار اعظمی
ریسرچ اسکالر
شعبۂ اردو، لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ

بچّوں کے سیّد

اردو میں بچوں کے ادب کی طرف بہت بعد میں توجہ کی گئی۔ مولانا محمد حسین آزاد، مولانا حالی، مولوی نذیر احمد کے یہاں ایسے مضامین و موضوعات پر مشتمل کچھ کتابیں ضرور مل جاتی ہیں جنھیں بچوں کے ادب کی ابتدائی کڑیوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ نظیر اکبر آبادی کی رنگا رنگ شاعری میں متعدد نظمیں بچوں کی دلچسپی اور توجہ کا مرکز بن جاتی ہیں کیونکہ یہ اپنے مواد اور شگفتہ اسلوب بیان کے سبب پرکشش اور پُراثر ہیں۔ مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی نے بچوں کے ادب کے لیے خصوصی توجہ دی اور نثر و نظم پر مشتمل کتابیں اور ریڈریں تیار کیں جو انداز بیان کی سادگی اور زبان کی سلاست و روانی کے سبب بے حد مقبول ہوئیں۔ زندگی بھر انھوں نے درس و تدریس کا معزز پیشہ اختیار کرکے بچوں کے فلاح و بہبود اور تعلیم و تربیت کے پیش نظر جو کچھ لکھا ان کی سعی مشکور ہوئی۔ ان کی کتابوں کے بارے میں ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی کی رائے ہے۔ [1]

"سچ تو یہ ہے کہ مولوی اسمٰعیل کی ریڈریں، شیخ سعدی کی "گلستاں، بوستاں کی طرح مقبول ہوئیں اور بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت کرنے، ان کے اخلاق و عادات سدھارنے میں ان ریڈروں نے بڑا کام کیا۔ [2]

علامہ شبلی نعمانی کی بعض نظمیں بھی سلاست و روانی اور شگفتگی کی بدولت بچوں کے ادب میں درجہ پاتی ہیں۔ علامہ اقبال نے بھی اپنی شاعری کے ذریعہ خصوصیت کے ساتھ اس طرف توجہ کی، اور بچوں کے مزاج و طبیعت کے موافق خاصی تعداد میں نظمیں ان کے کلیات میں موجود ہیں جو بچوں کے شوق و تجسس اور اخلاقی تعلیم کے معیار پر پوری اترتی ہیں اور بچوں میں شروع سے ہی مقبول ہیں جنھیں یاد کرکے بچے ترنم سے پڑھتے ہیں۔ علامہ اقبال کے بعد دیگر شاعروں نے بھی اپنے کلام سے بچوں کو نوازا۔ پنڈت برج نرائن چکبست اور تلوک چند محروم کی نظمیں بچوں میں اتحاد و یگانگت کی تعلیم کے ساتھ ان میں حب الوطنی کے جذبات پیدا کرنے میں بہت اہم رول ادا کرتی ہیں۔ سرور جہاں آبادی اور حامد اللہ افسر میرٹھی نے تو بچوں کی زبان میں بچوں سے باتیں کیں۔ انھیں پیارے پیارے گیت سنائے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین سابق صدر جمہوریۂ ہند نے جن کا شمار ہندستان کے مشہور ماہرین تعلیم میں ہوتا ہے اور جنھوں نے عمر کا بیشتر حصہ تعلیم و تدریس میں گزار دیا، بچوں کی تعلیم و تربیت کی طرف نہ صرف خصوصی توجہ دی بلکہ خود بھی بچوں کے لیے لکھا اور دوسروں کو بھی اس راہ پر لگایا کیونکہ بچوں کی نشو و نما میں اچھے ادب کی بڑی اہمیت ہے۔ جامعہ ملیہ دہلی کے قیام و بقا کے لیے ہمیشہ وہ کوشاں رہے جس کے قیام کا بنیادی مقصد ہی یہ تھا کہ کم سنی سے ہی بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت ایسے ماحول میں کی جائے کہ وہ آپس میں میل جول سے رہیں، تعصب اور تنگ نظری سے دور رہ کر نئے ہندستان کی تعمیر کے لیے اچھے شہری بن سکیں۔ گویا جامعہ ملیہ میں ایک مہم کے طور پر بچوں کی نفسیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا گیا۔ ۱۹۲۶ء میں جامعہ ملیہ سے بچوں کا رسالہ "پیام تعلیم" بھی جاری کیا گیا۔ اس مقصد کے لیے ادیبوں اور شاعروں کی ایک ٹیم

تیار ہو گئی اور بچوں کا ادب تخلیق کیا جانے لگا۔ رشید احمد صدیقی
نے بھی بچوں کے لیے بڑی دلچسپ اور سبق آموز کہانیاں لکھیں۔
حسین حسّان ندوی جو "پیام تعلیم" کے اخیر وقت تک ایڈیٹر
رہے بچوں کے لیے دلچسپ اور مزیدار کہانیوں کی کتابیں لکھتے رہے۔
شفیع الدین نیّر نے تو بچوں کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کر دی
تھی۔ راجہ مہدی علی خاں، عبدالواحد سندھی، عبدالغفار مدھولی
اور محوی صدیقی لکھنوی نے بچوں کے لیے جو کچھ کیا اور لکھا وہ
اردو ادب میں ایک بیش قیمت سرمائے کی حیثیت رکھتا ہے۔ کرشن
چندر، جگن ناتھ آزاد، حیات اللہ انصاری، رضیہ سجاد ظہیر، صالحہ
عابد حسین، کوثر چاندپوری، قرۃ العین حیدر، رام لعل، ذکی انور،
گوپی چند نارنگ، محمد اسحاق صدیقی، اظہر افسر، قدسیہ زیدی وغیرہ
نے بچوں کے لیے کہانیاں و ڈرامے لکھے۔

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ ۱۸۵۷ء کے بعد سے جس طرح
اردو کی ترقی و ترویج اور فروغ و ارتقا کے ذرائع وسیع ہوئے،
دن بدن اس کا دامن وسیع ہوتا گیا اور بہت جلد اردو کا ادب
ہندستان کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور بیش قیمت شہ پاروں سے
مالا مال ہوتا گیا۔ اس کی ترقی کے دوش بدوش بچوں کے ادب کی بھی
جزوی طور پر پرورش اور نشو و نما ہوتی رہی اور کم و بیش تمام ادیبوں
اور شاعروں کے ہاں ڈھونڈنے پر ایسا مواد ضرور مل جائے گا
جس کا تعلق بچوں کے ادب سے ہے۔ لیکن وہ لوگ جنھوں نے بچوں کی
تعلیم و تربیت اور درس و تدریس میں اپنی زندگیاں گزار دیں
ایسے چند ہی لوگ ہیں جن کا شمار انگلیوں پر کیا جا سکتا ہے۔ دیکھا
جائے تو صحیح معنوں میں بچوں کا ادب انھیں بزرگوں کی کوششوں
کے نتیجے میں آج اس لائق ہو سکا ہے کہ موجودہ زمانے کے نظام
تعلیم سے ہم آہنگ ہو کر بچوں کی تعلیمی نفسیات اور اس کے تقاضوں
سے عہدہ برآ ہو سکے۔ ان کی ساری زندگی کی خدمات کے طفیل ہی
اردو میں بچوں کے ادب کا گوشہ سرسبز و شاداب و قیمتی اور اہم ہے۔
مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی، حامد اللہ افسر، محوی صدیقی لکھنوی،
حسین حسّان ندوی اور شفیع الدین نیّر وغیرہ کے نام اس سلسلے میں
خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ مندرجہ ذیل سطور میں بچ
ادب کے لیے جناب شفیع الدین نیّر کی خدمات کا ایک م
جائزہ پیش کرنا مقصود ہے۔

نیّر صاحب کا پورا نام محمد شفیع الدین ہے اور نیّ
۱۹۰۴ء میں پیدا ہوئے ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد
ملازمت اختیار کرنا پڑی اور دہلی ماڈل اسکول میں تقر
تک بچوں کی نگہداشت، تعلیم و تربیت اور تدریس کے فرا
دیتے رہے۔ تحریک خلافت شروع ہونے پر ملک و قوم ک
حب الوطنی کے جذبات سے سرشار ہو کر آپ نے اپنی د
جامعہ ملیہ کو پیش کر دیں۔ یہاں رہ کر آپ نے بڑے تجر
بچوں کی دیکھ بھال اور تعلیم و تربیت کے سلسلے میں انھ
بچوں کی نفسیات اور ماحول کے مطالعہ و مشاہدہ کا مزید
نتیجتاً آپ نے کم عمر بچوں سے لے کر چودہ پندرہ سال تک
مزاج و معیار کے مطابق نہ صرف درسی کتابیں لکھنے کا آ
ان کے لیے آسان اور عام فہم زبان میں سیدھے سادے
پر مبنی دلچسپ نظمیں اور کہانیاں بھی لکھیں۔ یہ کہانیو
نظموں کی چھوٹی چھوٹی اور ننھی منی کتابیں ایک طرف ا
اور مکاتیب و مدارس کے نصاب میں داخل ہوئیں، د
بچوں کے مطالعہ اور شوق و جستجو کے لحاظ سے غیر درس
کے طور پر بھی مقبول ہوئیں۔ اس میدان میں نیّر صاح
اور کامیابی کا راز غالباً یہی ہے جس کی طرف ڈاکٹر ذاکر
اشارہ کیا ہے۔

"ان میں (نیّر صاحب میں) بچوں کے ذہن کو سمجھنے
کرنے کی وہ صفت ہے جو پیدائشی معلم کا جوہر ہوتی ہے نیز ذوق
ذوق جمال کی سمت بچوں کی رہنمائی کے لیے جس صلاحیت
ہے وہ ان میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ بچوں کے لیے جو نظمیں
لکھیں ہیں وہ ایک پیش رو کی حیثیت سے ان کا نہایت
کارنامہ ہے۔ انھوں نے وہ میدان سر کیا ہے جسے سر کر
کم اصحاب نے جرأت کی ہے۔ ان کی نظموں نے تعلیم

کام کو خوشگوار بنا دیا ہے۔ ان بچوں میں بھی ادبی دلچسپی پیدا کرنے میں کامیاب ہوئی ہیں جو دوسرے مضمونوں کی طرح مادری زبان کی تحصیل کو غیر دلچسپ سمجھتے تھے۔

نیر صاحب کو اعلا تعلیم کا موقع غالباً بہت بعد میں میسر آیا چنانچہ آپ نے رفتہ رفتہ پرائیوٹ امتحانات دے کر ایم اے اردو میں پوسٹ گریجویشن کی ڈگری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے حاصل کی۔ فرسٹ ڈویژن میں امتیازی نمبروں سے کامیاب ہونے پر یونیورسٹی کی جانب سے آپ کو ایک تمغۂ انعام کے طور پر دیا گیا۔ آپ نے اگرچہ ابتدائی درجات کی سطح سے بچوں کو تعلیم دینے کا کام شروع کیا لیکن اپنی خدا داد صلاحیتوں اور تعلیمی اکتسابات کی بدولت ترقی کرتے کرتے وہ جامعہ کالج میں اردو کے لیکچرر ہو گئے تھے۔ ساری عمر آپ نے کم عمر بچوں سے لے کر حد بلوغیت تک پہنچنے والے بچوں کو پڑھایا اور پیشۂ معلمی کے ساتھ ساتھ اردو ادب کی قابل قدر خدمات انجام دیں۔

موجودہ دور میں بچوں کے ادب کے سلسلے میں ان کے پائے کا ادیب و شاعر کوئی نظر نہیں آتا جنھوں نے پوری زندگی اسی مہم اور مقصد کے لیے صرف کر دی۔ بچوں کا یہ محبوب و مقبول ادیب و شاعر تقریباً ۸۴ سال کی عمر پا کر ۱۹۷۸ء میں اس دنیا سے رخصت ہوا۔ ڈاکٹر عبدالحق صدیقی (دہلی یونیورسٹی) نے ان کی خدمات کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے۔ [۱۳]

"دور حاضر کے سب سے زیادہ مشہور ادیب شفیع الدین نیر اس موضوع پر ایک یادگاری شخصیت رکھتے ہیں۔ ان کی تخلیقات کی مجموعی تعداد بیالیس سے زیادہ ہے۔ بچوں کی نفسیات اور شعور کا ادراک اور اسی نسبت سے ادبی تخلیق کی حسن کاری کا جو ملکہ انھیں حاصل ہے وہ ابھی تک کسی ادیب کو میسر نہ ہو سکا۔ وہ نظم و نثر دونوں طریقۂ اظہار کو پوری صناعی کے ساتھ برتتے ہیں۔"

بچوں کا ادب اور نیر صاحب

گو کہ ہر زبان ادب کی بنیادی قدریں ایک سی ہوتی ہیں جس میں مقامی رنگوں کے ساتھ آفاقی اپیل بھی ہوتی ہے لیکن جب بچوں کے ادب کے سلسلے میں بات کرتے ہیں تو کم و بیش ادب کی ساری باتیں اور تمام اصناف سخن بھی اس ضمن میں آجاتے ہیں لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ اس سلسلے میں کچھ بنیادی باتیں اور نزاکتیں ایسی ضرور ہیں جن کو مد نظر رکھ کر ہی کسی ادب پارے یا فن پارے کی جانچ کی جاتی ہے۔ کیونکہ ادب کو جب بچوں کے لیے مخصوص کر دیا جاتا ہے تو پھر بچوں کے ذہن و مزاج، طبیعت، پسند ناپسند، ماحول، ان کے فطری تجسس، ان کے سوالوں کا جواب، ان کی آسودگی کو ملحوظ رکھنا ضروری ہو جاتا ہے پھر مواد کے علاوہ ہیئت کے سلسلے میں انداز بیان کی خوبیوں اور خامیوں پر نظر رکھنا بھی لازمی ہے، کیونکہ مشروط طور پر جو ادب بچوں کے لیے تخلیق کیا جائے اس میں سلاست و روانی، شگفتگی، عام فہم انداز، سادہ و پر اثر اسلوب، تشبیہات و استعارات اور ثقیل عبارتوں سے پرہیز، اور اخلاقی قدروں کو پیش کرنے میں فنکارانہ انداز کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ گویا ادیبوں اور شاعروں کے لیے یہ بڑی آزمائش کا سبب بن سکتا ہے اور بڑی مشکل سے گوہر مقصود تک رسائی ممکن ہے۔ اور اس سلسلے میں بیشتر انھیں حضرات کو کامیابی نصیب ہو سکی ہے جنھیں بچوں سے بہت زیادہ محبت و شوق، ان کی نفسیات کا مطالعہ، ان کے ماحول سے دلچسپی اور ان کی عادتوں اور اخلاق و طبیعت کا مشاہدہ ہو، ان کے درمیان زیادہ رہنے اور ان کے مسائل کو سمجھنے کا موقع ملا ہو اور پھر ان کے لیے خصوصی طور پر جو ادب فنکارانہ طور پر تخلیق کیا گیا ہو یقیناً وہ بچوں کے ادب میں قابل قدر سمجھا جائے گا۔ بچوں کا ادب آمد سے زیادہ آورد کا متقاضی ہوتا ہے لیکن اس میں بھی یہ فنکار کا کام ہے کہ آورد کو اس انداز سے پیش کرے کہ اس میں آمد کا لطف آجائے اور آورد کا گمان نہ ہونے پائے۔ بچوں کے ادب کے سلسلے میں شفیع الدین نیر صاحب کا خیال ہے: [۱۴]

"میں جہاں تک سمجھتا ہوں بچوں کے ادب سے مراد نظم اور نثر کا وہ ذخیرہ ہے جو خاص طور پر بچوں کے لیے لکھا گیا ہو یا اپنی معنویت و افادیت کے اعتبار سے بچوں کے لیے موزوں ہو۔ یوں سمجھیے کہ جو ادب چار پانچ سال کی عمر سے لے کر تیرہ چودہ برس تک

کے بچوں کے لیے مخصوص ہوا سے بچوں کے ادب سے تعبیر کر سکتے ہیں۔
بلاشبہ بچوں کے ادب کو ان اقدار اور خصوصیات کا حامل ہونا
چاہیے جو کسی بھی زبان کی لطافت اور بیان کا حسن شامل ہیں۔ کوئی بھی تحریر
جو دل کو چھو لینے والی کیفیت اور تاثیر سے محروم ہو ادب میں شامل نہیں
ہو سکتی بچوں کا ادب اس سے مستثنیٰ نہیں' بچوں کی جمالیاتی حِس کی تسکین
ان کی تربیت اور نشوونما اُس کا بنیادی مقصد ہونا چاہیے۔"

بچوں کے ادب کی خصوصیات کے سلسلے میں ڈاکٹر مشیر
فاطمہ نے بہت پہلے اپنی رائے دی تھی۔

"بچوں کے ادب کی تخلیق بھی ایک فن ہے، بچوں کے ادب کا
اپنا ایک مقصد ہونا چاہیے، اس کو صرف ذریعہ نہیں بنانا چاہیے
بچوں کے ادب کی تنقید اس معیار پر کرنی چاہیے کہ کیا وہ بچے کی
ذہنی و جسمانی نشوونما میں مدد کرتا ہے؟ ان میں بنیادی قدروں کے
سمجھنے کی صلاحیت پیدا کرتا ہے۔ جو کچھ بچہ کہنا چاہتا ہے کیا وہ
اسے ایک اچھے پیرائے میں کہہ سکا ہے، کتاب حقائق اور واقعات کا
ایک پلندہ نہیں ہے بلکہ معلومات حاصل کرنے کا ایک دلچسپ
ذریعہ ہوتی ہے۔" [۵]

بچوں کے ادب کے سلسلے میں اصحاب قلم نے اور خود نیر صاحب
نے اپنی تحریروں کی بنا پر جن لوازمات اور معلومات کا ذکر کیا ہے اس
کسوٹی پر جب ہم نیر صاحب کو دیکھیں اور ان کی خدمات اور ادبی
کارناموں کا جائزہ لیں تو اس نتیجے پر پہونچتے ہیں کہ بلاشبہ نیر
صاحب نے بچوں کے لیے جو کچھ کیا ہے وہ انھیں کا حصہ ہے۔
بظاہر ان کی رنگارنگ موضوعات پر شگفتہ و سلیس انداز کی
نظمیں اور صاف و شیریں زبان میں مزیدار سبق آموز کہانیاں
بچوں کے تعلیمی نقطۂ نظر سے بڑی گراں قدر ہیں اور بچوں میں
ہمیشہ سے اس قدر مقبول اور پسندیدہ ہیں کہ ان کی بیشتر کتابوں کے
متعدد ایڈیشن ان کی زندگی ہی میں ہزاروں کی تعداد میں
چھپ کر ختم ہو چکے ہیں، ایسی مقبولیت اور شہرت اردو کے
کم ہی ادیبوں اور مصنفوں کے حصے میں آئی ہے۔ پروفیسر عبدالقوی
دسنوی نے بر سبیل تذکرہ جیسا کہ اپنے خیال کا اظہار فرمایا ہے

"بچوں کا شاعر وہی کامیاب ہوتا ہے جو بچوں میں گھل مل
بچے اس سے اجنبیت محسوس نہ کریں وہ بچوں کے ذہن و د
ساتھ چلے، ادب صحیح سمت کی طرف موڑ دے اور صحیح منزل کی،
تاکہ وہ مستقبل میں اچھے انسان کامیاب انسان اور با
انسان بن سکیں۔" [۶]

نہیں کہا جا سکتا کہ شفیع الدین نیر صاحب نے ا
سالہ تعلیمی خدمات کے دوران تربیت اور تعلیم و تدر
بدولت آزاد ہندستان میں کتنے بچوں کو کامیاب او
انسان بنا دیا ہوگا۔ ان کی مجموعی علمی و عملی خدمات کا
جامعہ کے بزرگوں اور اساتذہ کو ہی اچھی طرح ہوگا۔

نیر صاحب نہ صرف بچوں کے استاد رہے او
شخصیت، اُن کے بہتر مستقبل کی تعمیر کے لیے ہمہ دم اد
مصروف کار رہے بلکہ ان کے دل میں ملک و قوم کا درد
سے محبت اور اس پر جاں نثاری کا جذبہ قدرت کی جانب
ودیعت ہوا تھا۔ آزادیٔ وطن سے پہلے وہ غیر ملکی
کے تسلط اور ان کے ظلم و جبر اور زیادتیوں سے نالا
خود ان کا بلکہ ہر بیدار مغز، پڑھے لکھے ہندستانی کا
اور خیال تھا۔ انھوں نے ملک و قوم کی محبت کا پاکیزہ
کرنے کی خاطر بچوں کے لیے انھیں کی زبان میں وطنی نظمیں لکھیں
انھوں نے اتحاد و یگانگت کے ساتھ رہنے کے لیے درس اخو
آزادی کا جذبہ بیدار کیا اور جب ہندستان آزاد ہو گیا تو ا
جو پیغام آزادی بچوں کو دیا تھا وہ ہر بچے کی زبان پر تھ
اونچا ہے ہمارا پیارا پیارا دیس ہمارا' سب سے اچھا دیس
ہندستان پیارا، پیارا وطن ہمارا، وغیرہ۔ انھوں
وطن کی صبح و شام، اس کی ندیوں، پہاڑوں، آبشار
باشندوں اس کے موسموں اس کی اداؤں کے گیت
سیدھے سادے انداز میں، کبھی گنگنا کر کبھی گا کر بچو
بھی کورس میں گایا معصوم اور میٹھی آوازوں کے سا
سماں بندھ گیا، بچوں اور بڑوں میں ان کے گیتوں ک
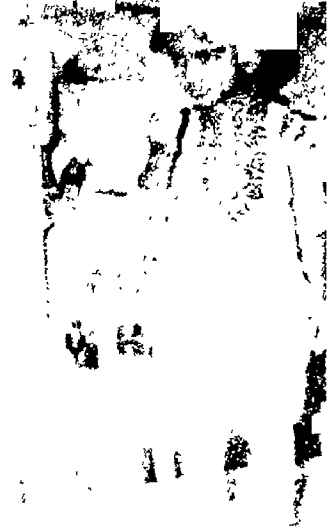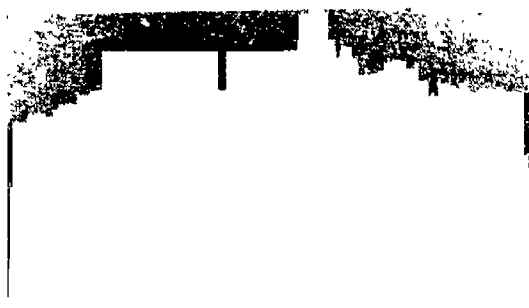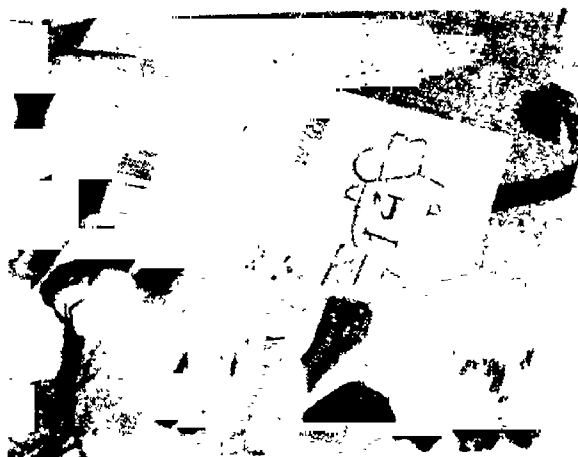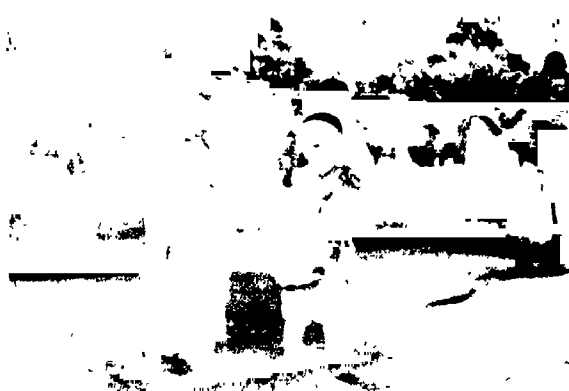
بج گئی۔ ان نظموں میں بڑا خلوص ہے اسی لیے یہ نظمیں تاثیر سے معمور ہیں۔

انھوں نے اسلامی تعلیمات کو بھی بچوں میں عام کرنے کی غرض سے اسلامی نظمیں لکھیں۔ جن میں بڑی زندگی ہے، توانائی ہے۔ اخلاق و عادات کی سیرت و کردار کی انھوں نے یکارنامہ بھی سہل اور آسان زبان اور سادہ اسلوب میں انجام دیا۔

ان کی ایک نظم "مادرِ ہند کا خطاب" (ہندو اور مسلمان سے) میں سے کچھ اشعار نمونے کے طور پر درج کیے جاتے ہیں دیکھیے ان میں کتنی تاثیر، جاذبیت اور سوز ہے:

ہندو مجھے پیارے مسلم بھی مجھے پیارے
میرے لیے دونوں ہیں آنکھوں کے میرے تارے
اس دیس کے باسی ہیں اس خاک سے پیدا ہیں
آپس کے یہ جھگڑے پھر کیوں ان میں ہویدا ہیں
دونوں کو یہیں مرنا دونوں کو یہیں جینا
کیوں بیر رہے ان میں، کیوں ان میں ہو کینا
پرنام بھی جاری ہو، تسلیم رہے قائم
قرآن کی، ویدوں کی تعلیم رہے قائم

نیّر صاحب کے "قومی ترانہ" کے بھی چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

پیارا ہندستان ہمارا، پیارا ہندستان
جان فدا ہے اس پر اپنی، دل اس پر قربان
ملک نہیں، یہ جنت کا ہے دلکش ایک مکان
پیارا ہندستان ہمارا، پیارا ہندستان
پیارے پیارے دریا اس کے، پیاری پیاری نہریں
پیارے پیارے چشمے اس کے، پیاری پیاری لہریں
پیارے پیارے منظر پیاری پیاری اس کی شان
پیارا ہندستان ہمارا، پیارا ہندستان

نیّر صاحب کی نثر و نظم کی کتابوں کی مقبولیت کا سبب بلاشبہ وہ خصوصیات ہیں جو انھوں نے اپنی کتاب (نظم) "بچوں کا تحفہ" کے دیباچے میں تحریر فرمایا ہے۔ بچوں کے ادب کے سلسلے میں ان خصوصیات کو ایک بنیادی کسوٹی اور معیار کا درجہ حاصل ہے اور جو اس ضمن میں لکھنے والوں کے لیے مشعل راہ بھی ہیں۔ [۵]

"میں نے ان نظموں کے ذریعہ بچوں کو اپنے گرد و پیش کی چیزوں سے دلچسپی لینے اور ان کا دلچسپی کے ساتھ بغور مشاہدہ کرنے کی طرف مائل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ضرورت تھی کہ اول زبان سلیس، عام فہم اور بامحاورہ ہو۔ دوم خیالات سادہ ہوں، سوم۔ عام اور مفید معلومات فراہم کی جائیں۔ چہارم بغیر نصیحت کا پیرایہ اختیار کیے، اخلاقی تعلیم کا پورا لحاظ رکھا جائے۔ پنجم نظموں میں روانی اور اختصار ہو، ششم، عنوانات میں تنوع ہو۔ ہفتم بحریں قابل ترنم ہوں۔

نیّر صاحب کے اسی معیار کے پیش نظر ان کی دو نظموں کے کچھ اشعار پیش کیے جا رہے ہیں پہلی نظم کا عنوان ہے۔ شام۔ جو کہ سات آٹھ برس کے بچوں سے متعلق ہے [۶]

ہوئی شام سونے کا وقت آگیا
اندھیرا سا چاروں طرف چھا گیا
گیا ڈوب پچھم میں اب آفتاب
افق پر چمکنے لگا ماہتاب
پرند آشیانے میں جانے لگے
مویشی بھی جنگل سے آنے لگے
فلک پر ستارے چمکنے لگے
جواہر کی صورت دمکنے لگے
چمکتے بھی ہیں جھلملاتے بھی ہیں
ہمارے دلوں کو لبھاتے بھی ہیں
کسان اپنی کھیتی سے فارغ ہوئے
اٹھا ہل کو کندھے پہ گھر کو چلے
ہوا اس طرح سارا بازار بند
کہ آنکھیں کرے جیسے بیمار بند

غرض یہ کہ دنیا میں آئی ہے تمام
خدا نے عجب شے بنائی ہے تمام

دوسری نظم کا عنوان ہے۔ باغ کی سیر جو کہ آٹھ سے دس گیارہ برس کے بچوں کے لیے ہے۔ ؎

صبح سویرے آج اٹھا میں
سیر کی خاطر باغ گیا میں
ٹھنڈی ٹھنڈی خوب ہوا تھی
مہکی ہوئی خوشبو سے فضا تھی
کلیوں کی مہکار غضب تھی
چڑیوں کی چہکار عجب تھی
فرش وہاں سبزے کا بچھا تھا
اس پر پانی لوٹ رہا تھا
ہر سو چشمے پھوٹ رہے تھے
اور فوارے چھوٹ رہے تھے
باغ میں تھی اک نہر بھی جاری
ستھری ستھری، پیاری پیاری
پھول کھلے تھے پیارے پیارے
دل کش جن کے رنگ تھے سارے
پھل بھی لگے تھے کچے پکے
کچھ میٹھے تھے اور کچھ کھٹے
دیکھی پھولوں کی رنگینی
سونگھی خوشبو بھینی بھینی
نیّر کا بھی دل شاد تھا اس دم
فکروں سے آزاد تھا اس دم

بچوں کے لیے نظموں کی ضرورت پر اظہار خیال کرتے ہوئے انھوں نے یہ بتایا کہ "نظموں کا سننا اور ترنم کے ساتھ ان کو بار بار دہرانا بچوں کو بہت مرغوب ہوتا ہے۔ اس لیے ان کے اس فطری رجحان سے ضرور فائدہ اٹھانا چاہیے۔ اسی طرح یہ بھی ایک اہم مسئلہ ہے کہ بچوں میں جوش اور جذبے کا مادہ بہت ہوتا ہے۔ ان کی تخیلاتی اور تصوراتی اولوالعزمیاں متقاضی ہوتی ہیں کہ وہ حیرت و استعجاب میں ڈالنے والے شہزادوں، شہزادیوں پریوں اور بھوتوں، بہادروں اور جرنیلوں کی کہانیاں سنیں۔ اور خیر و شر کی کش مکش میں، حق و باطل کی آمیزش میں جیت اور ہار کا منظر کہانیوں کے نقطۂ عروج پر دیکھیں۔ نیک اور اچھے کاموں کی خواہش اور برے کاموں سے نفرت کا جذبہ ان میں بیدار ہو۔ وہ شہزادوں کے ساتھ موجودہ زمانے کے ہوائی جہاز کے مقابلے میں اڑن کھٹولے پر اڑنے کو ترجیح دیتے ہیں جو بلا رکاوٹ ہر حالت میں اڑتا ہے۔ وہ انھیں بلند و بالا تخیلات و تصورات کے ساتھ کہانیوں کے پر لگا کر نیند میں پرستان کی سیر کرنا چاہتے ہیں۔

کہانیاں کہنا بھی ایک فن ہے اور ان کا سننا بچوں کا پیدائشی اور بنیادی حق ہوتا ہے۔ اس لیے انھیں کوئی فنکار دلچسپ انداز میں کہانیاں سنانے کے لیے چاہیئے۔ مزے دار کہانی اور انداز دلچسپ نہ ہو تو وہ اوب جائیں گے۔ کہانی کہنا اور سننا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ خاص طور سے بچوں کو سنانا اور بھی مشکل کام ہے۔ لیکن شفیع الدین نیّر صاحب بچوں کو ان کی پسند کے مطابق کہانیاں کہنے اور سنانے کا گر جانتے ہیں اسی لیے بچے انھیں پسند کرتے ہیں اور ان کی مزے دار کہانیوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ خود نیّر صاحب کو بھی بڑا مزہ آتا ہے کہانیاں کہنے اور سنانے میں جبھی تو انھوں نے ڈھیروں اچھی پیاری ننھی منی اور چھوٹی بڑی رنگارنگ کہانیاں لکھ کر بچوں کو تحفے میں دی ہیں۔ بلاشبہ بچوں کے لیے شاعری کی طرح وہ نثرنگاری کے بھی شہسوار ہیں۔ بچوں کی جنت نگری جیسے دیس کے وہ فاتح ہیں۔ یہ دیس فتح کرنے کی ساری حکمت عملی سے وہ بخوبی واقف ہیں اور موقع و محل کے لحاظ سے ان حکمتوں کو برتنے کا سلیقہ بھی انھیں آتا ہے۔ دیگر بہت سی کہانیوں کے علاوہ انھوں نے بچوں کو اردو کے صاحب طرز انشا پرداز اور شاعر مرزا غالب کی بھی کہانی سنائی۔ اتنے بڑے اور عظیم شاعر و ادیب کی کہانی سنانے

لیے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی نظر انتخاب نیر صاحب
پر پڑی۔ دیکھیے نیر صاحب نے مرزا غالب کی کہانی کس
راز میں شروع کی ہے۔

"سو برس ہوئے ہمارے دیس میں ایک شاعر تھے۔
ان کا نام اسداللہ بیگ خاں تھا۔ وہ ایک خوش مزاج
اور ہنس مکھ انسان تھے۔ جو بھی ان سے ملتا، ان کی
بات چیت سے اس کا دل باغ باغ ہو جاتا۔ وہ باتیں
اس طرح کرتے گویا ان کے منھ سے پھول جھڑ رہے ہوں۔
کسی کو دکھ میں دیکھ کر ان کو بھی دکھ ہوتا۔ اس دکھ کو
دور کرنے کے لیے ان سے جو کچھ بن پڑتا اس میں دریغ
نہ کرتے۔ غرض انھیں انسانوں سے پیار تھا اور اچھے
انسان میں جو خوبیاں ہونی چاہئیں وہ سب ان کی
ذات میں جمع تھیں۔"

اردو میں ہزاروں شاعر اور ادیب ہوئے ہیں اور
ہزاروں آج بھی موجود ہیں۔ مگر اس زبان کی نثر اور نظم
میں جو مرتبہ مرزا غالب کا ہے وہ کسی اور شاعر یا ادیب
کا نہیں ہے۔"

نیر صاحب کی خدمات اردو ادب خصوصاً بچوں کے ادب
کے لیے بڑی گراں قدر ہیں۔ مولوی اسمٰعیل میرٹھی نے جس
فن کے لیے اپنی زندگی صرف کر دی تھی اور ادب میں
بچوں کے لیے جو بنیاد قائم کر دی تھی اس پر نیر صاحب نے
اپنی بے لاگ کوششوں اور انتھک محنت و لگن سے ایک
شاندار تاج محل کھڑا کر دیا۔ اپنے پچاس سالہ پیشۂ معلمی کے
دوران انھوں نے نظم و نثر کی پچاس کتابیں یادگار چھوڑ دیں
جو موجودہ اور آئندہ نسلوں کی آبیاری کرتی رہیں گی۔
تاریخ ادب میں ان کا نام سنہرے حرفوں میں لکھا
جائے گا۔ ان کی بیشتر کتابیں جامعہ ملیہ دہلی میں اور جامعہ اردو
علی گڑھ اور دیگر مکاتب و مدارس نیز اسکولوں کے نصاب
میں شامل ہیں۔ غیر درسی کتابوں کے طور پر بھی ان میں بہت

مشہور و مقبول ہیں۔ نیر صاحب اردو مصنفین کے درمیان
اس لحاظ سے بہت خوش قسمت ہیں کہ ان کی کتابوں کے
متعدد ایڈیشن چھپ کر ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں
فروخت ہو چکے ہیں۔ ان کی اس کامیابی اور مقبولیت کے لیے
اردو زبان بھی ان کی کچھ کم احسان مند نہیں۔

نیر صاحب کی نظموں اور کہانیوں کی کتابوں پر دانشوروں
اخبارات و رسائل کے مدیروں اور ماہرین تعلیم نے بڑے
حوصلہ افزا خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ خصوصاً ان کی ایک
کتاب بچوں کا تحفہ پر تو ڈاکٹر ذاکر حسین، خواجہ غلام
السیدین، منشی پریم چند، پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی،
بابائے اردو مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر علامہ اقبال نے ان کی بڑی
ہمت افزائی کے کلمات لکھے۔

نیر صاحب کا انداز نگارش بہت سیدھا سادا اور
تاثیر سے پُر ہے۔ وہ پاک و صاف، سہل اور عام فہم زبان اختیار
کرتے ہیں جس میں بڑی روانی اور جاذبیت ہوتی ہے۔ چھوٹے
چھوٹے جملوں میں بڑی تاثیر، صفائی اور دلکشی ہوتی ہے تاکہ
بچے انھیں پڑھ کر بہ آسانی سمجھ سکیں۔ شاعری میں بھی ان کا یہی پہلو
مکمل طور پر جلوہ گر ہے جیسا کہ خود انھوں نے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت
پہلے ہی کر دی ہے۔ وہ سیدھے سادے خیال کو پیش کرتے ہیں۔
بے جا تلمیحات، تشبیہات اور استعارات سے گریز کرتے ہیں اور
بچوں کے لیے وہی فطری اسلوب اور زبان اختیار کرتے ہیں جو
بچوں کے ذہنی و تعلیمی بساط کے مطابق ہو۔ سنجیدہ اور علمی موضوعات
کے لیے ان کی تحریریں عالمانہ ہوتی ہیں۔ اور پھر یہ بھی گمان
نہیں ہو سکتا کہ یہ وہی بچوں کے نیر صاحب ہیں۔ مذکورہ بالا
سطور میں بچوں کے ادب کے سلسلے میں ان کی رائے، ان کے وسیع
مطالعہ اور متوازن لب و لہجہ کی غماز ہے۔

نیر صاحب نے مختلف عمروں کے بچوں کے لیے نظم و نثر کی
جو کتابیں لکھی ہیں ان کے نام خود انھیں کی قائم کردہ درجہ بندی
کے ساتھ لکھے جا رہے ہیں :-

۱۔ چھ سات برس کے بچوں کے لیے۔ گلگلے کی دوڑ ــــ میں گھر جاؤں تو کیسے؟۔ مکھن کا ڈبا۔ ڈھول کا پول۔ آٹے کا پتلا۔ ہوشیار خرگوش۔

۲۔ سات آٹھ برس کے بچوں کے لیے۔ تارا کا ڈنڈا ــــ انار راجا۔ بطخ شہزادی۔ ریڈیو کا بھوت۔ بونے کا بٹوا۔ پری کی چھڑی پرستان کی سیر۔ بونے کا انصاف۔

۳۔ آٹھ سے گیارہ برس کے بچوں کے لیے۔ چنن منن۔ منی کا پرستان۔ لٹو میاں۔ انوکھی چھتری۔ تعلیمی تحفہ حصہ اول (نظمیں)۔ تعلیمی تحفہ حصہ دوم (نظمیں)۔ نئی کہانیاں (نظمیں)۔ میاں مٹھو۔ طلسمی مینا۔ کھلو میاں۔ یادگار انگوٹھی۔ بدھو کی بیوی۔

۴۔ گیارہ سے چودہ برس کے بچوں کے لیے۔ چھنگو منگو۔ پیسے کا صابن۔ گھر کا آئینہ۔ عید کے کھلونے۔ باپ کی ناؤ۔ مزدور کا بیٹا۔ شیر خاں کے معرکے۔ غالب کی کہانی۔ بچوں کا کھلونا (نظمیں)۔ کھمی شکر (نظمیں) منو کے گیت۔ (نظمیں)۔ منو کا تحفہ (نظمیں)۔ وطنی نظمیں۔ بچوں کا تحفہ اول (نظمیں)۔ بچوں کا تحفہ دوم (نظمیں)۔ ہماری نعت۔ ہماری زندگی (نظم)۔ اسلامی نظمیں۔ ظالم زمیندار۔ گاؤں سدھار گیت (نظم)۔ اچھی چڑیا ظالم کسان۔

ان کے علاوہ دو کتابیں دوسری زبان سے اردو میں ترجمہ ہیں جو نہرو بال پستکالیہ کے زیر اہتمام رنگین تصویروں کے ساتھ آفسٹ کے ذریعہ چھاپی گئی ہیں۔[۱۲]

۱۔ پرندوں کی دنیا (جبال آدا) ترجمہ شفیع الدین نیر۔

۲۔ خالہ بلی کا خاندان (منوہر داس چترویدی) = شفیع الدین نیر۔

★

۱و۲ جواہرات اسمٰعیل ص۸ از شجاعت سندیلوی۔ ۳ آج کل دسمبر ۱۹۶۱ء اردو میں بچوں کا ادب ص۳۷۔ ۴ آج کل جنوری ۱۹۶۹ء بچوں کا ادب۔ از۔ شفیع الدین نیر۔ ۵ بچوں کے ادب کی خصوصیات۔ از مشیر فاطمہ (۱۹۶۲ء)۔ ۶ بالک باغ ص۱۲ (مطبوعہ ۱۹۶۶ء)۔ ۷ بچوں کا تحفہ ص۱۶ (طبع دوم ۱۹۳۵ء)۔ ۸ صفحہ نمبر ۲۰۔۲۱ بچوں کا تحفہ اول۔ مطبوعہ ۱۹۳۵ء ۹ صفحہ نمبر ۱۷۔۱۸۔۱۹ = دوم = ۱۹۳۵ء ۱۰ غالب کی کہانی۔ (طبع ہشتم ۱۹۶۸ء) ۱۱ ماہنامہ کتاب نما ص۲۳۔۲۴ (مارچ ۱۹۶۹ء) ۱۲ ماہنامہ پیام تعلیم اکتوبر ۱۹۶۲ء صفحہ ۳۰

بچے قوم کی روح رواں ہیں، کیونکہ انہیں سے قوم ترقی کر سکتی ہے، ان میں ماضی سویا ہوا ہے، حال کروٹیں لے رہا ہے اور مستقبل کے پوشیدہ بیج بوئے جا رہے ہیں

ــــــــ نامعلوم

صلاح الدین نیّر
۲۳-۲-۲۳۴ مغل پورہ
حیدر آباد ۲۶-۲
آندھرا پردیش

پھول گلشن میں کھلیں .....

پھول گلشن میں کھلیں یا کسی صحرا میں کھلیں
پھول پلکوں پہ کھلیں یا کسی دامن میں کھلیں
پھول ہونٹوں پہ کھلیں یا کسی چہرے پہ کھلیں
پھول آنگن میں کھلیں یا کسی ویرانے میں
پھول ساغر میں کھلیں یا کسی میخانے میں
پھول مسجد میں کھلیں یا کسی مندر میں کھلیں
اپنی خوشبو کا وہ احساس دلا دیتے ہیں
صحنِ گلشن کی لطافت کو بڑھا دیتے ہیں

پھول گلشن میں کھلیں یا کسی صحرا میں کھلیں
پھول فطرت کے تقاضوں پہ کھلا کرتے ہیں
جیسا ماحول ہو وہ سانس لیا کرتے ہیں

دیکھنا یہ ہے کہ ہیں ان میں شگفتہ کتنے
دیکھنا یہ ہے کہ ہیں ان میں گل تازہ کتنے
کتنے ایسے ہیں یہاں جن کے لبوں پہ ہے ہنسی
کتنے ایسے ہیں یہاں جن کو میسر ہے ہنسی
کتنے ایسے ہیں جو ہر حال میں جی سکتے ہیں
زہرِ غم ہنستے ہوئے چین سے پی سکتے ہیں

ہم بھی بہبودیٔ اطفال کے قائل ہیں مگر
پہلے بچوں کو بتانا ہے کہ کس ملک میں ہو
یہ بتانا ہے انھیں حب وطن کیا شے ہے
عظمت ہند ہے کیا ان کو سکھانا ہوگا
کتنے مخلص ہیں یہاں ان کو بتانا ہوگا

ان کو بتلانا ہے، اسلاف کی تاریخ ہے کیا
ان سے کہنا ہے یہاں جسم تلک کون جلا
دشمنِ ہند سے کس وقت یہاں کون ملا
ان سے کہنا ہے کہ سولی پہ یہاں کون چڑھا
ان سے کہنا ہے یہاں پھر نہ اندھیرا رہ جائے
جتنے ہم پیاسے ہیں اتنا کوئی پیاسا نہ رہے

ان سے کہنا ہے نہ چھن جائے کسی لب سے ہنسی
پھر نہ اُبھرے کسی مظلوم کی پلکوں پہ نمی
ان سے کہنا ہے کسی ماں بہن بیٹی کی عظمت نہ لٹے
آبرو ماں کی کسی گھر کی شرافت نہ لٹے
ان سے کہنا ہے کہ بھڑکے نہ فسادات کی آگ
ان سے کہنا ہے کہ لٹ جائے نہ بہنوں کا سہاگ
ان سے کہنا کسی سلمیٰ کا یہاں گھر نہ جلے
کسی رادھا کا مہکتا ہوا بستر نہ جلے
ان سے کہنا ہے کہ ہم ایک ہیں ہم ایک ہیں
ان سے کہنا ہے کہ ہر غم کو یہاں مل کے سہیں
پیار کی رسم چلے جرم بسر اکچھ بھی نہ ہو
اپنے ہر گھر میں محبت کے سوا کچھ بھی نہ ہو

امیر احمد خسرو
۱۰۰-۱-۲۲ سلطان پورا
حیدرآباد - ۵۰۰۰۲۴

۱ انسان کو سینے سے لگاؤ

اب دیس کو ہر ایک بُرائی سے بچاؤ — دنیا کو نیا ڈھنگ نئی راہ دکھاؤ
نفرت کا نشاں تک بھی زمانے سے مٹاؤ — سوتے ہیں ابھی تک جو انھیں بڑھ کے جگاؤ
انسان ہو انسان کو سینے سے لگاؤ

آیا ہے محبت کو بڑھانے کا زمانہ — ہر ایک کے دکھ درد مٹانے کا زمانہ
سیدھی ہے جو اس راہ پہ جانے کا زمانہ — دنیا کو یہ پیغام سُنانے کا زمانہ
انسان ہو انسان کو سینے سے لگاؤ

ہو جائیں گے سب ایک تو ہوگا یہ نظارا — روشن نظر آئے گا ہمیں دیس ہمارا
چمکے گا خوشی اور محبت کا ستارا — مل جائے گا ہر ایک کو جینے کا سہارا
یہ کام کی ہے بات اسے بھول نہ جاؤ
انسان ہو انسان کو سینے سے لگاؤ

(۲) ہمارا دیس

دنیا میں سب سے پیارا — جس کا ہر اک نظارا
اُمید کا سہارا — جس کا ہر اک اشارا
وہ دیس ہے ہمارا، وہ دیس ہے ہمارا

ہر سو جہاں خوشی ہے — الفت ہے زندگی ہے
کھیتوں میں دلکشی ہے — رونق ہے تازگی ہے
وہ دیس ہے ہمارا، وہ دیس ہے ہمارا

جو ایشیا کی جنت — دنیا میں جس کی شہرت
جو سرزمینِ راحت — مشہور جس کی دولت
وہ دیس ہے ہمارا، وہ دیس ہے ہمارا

موسم جہاں سہانے — دلکش جہاں فسانے
خوشیوں کے یہ خزانے — چلتے ہیں کارخانے
وہ دیس ہے ہمارا
وہ دیس ہے ہمارا

---

(۳) ایک تمنّا

تمنا ہے اک ایسی دنیا بسائیں
محبت کی ہوں جگمگاتی فضائیں

جہاں ہر طرف علم کی روشنی ہو
خوشی کا جہاں نام ہی زندگی ہو

نہ محنت سے کوئی جہاں جی چرائے
نہ افلاس و غربت کسی کو ستائے

جہاں لوگ آپس میں ہوں بھائی بھائی
مٹے ظلم و نفرت کی ساری بُرائی

جہاں دن نئے، اور راتیں نئی ہوں
ترقی کی ہر وقت باتیں نئی ہوں

محبت کی دنیا، محبت کا جینا
مسرت کی موجوں پہ دل کا سفینہ

یہی آرزو ہے، یہی ہیں دعائیں
تمنا ہے اک ایسی دنیا بسائیں

ساغر مہدی
سید داڑہ بہرائچ
یو۔پی

ایک پہیلی بوجھو

بہت دن ہوئے
ایک کالا سا معصوم بچہ
بنارس کے نزدیک
اک گاؤں کی
دودھیا۔ ملگجی سی فضاؤں میں
پیدا ہوا۔
منھ میں سونے کا چمچہ
نہ ہاتھوں میں چاندی کی پیالی
نہ ریشم کی ڈوری میں لٹکا ہوا پالنا
پھر بھی
بھارت کی تاریخ میں وہ[1] امر ہو گیا
ہر نئے قافلے کے لیے
رہ گذر ہو گیا۔

[1] لال بہادر شاستری

پانی کے موتی

مطرب نظامی
جوہری محلہ۔ لکھنؤ

نادان ایک بچہ ماں باپ کا دُلارا
ماتھے پہ اس کے جیسے اُجلا سا تھا ستارا
اسکول سے مکاں تک جتنا بھی فاصلہ تھا
یہ اس کے سوچنے کا خاموش سلسلہ تھا
آنکھوں میں زندگی کی رنگین سی دھنک تھی
خوشبو کی طرح اس کے ہر بات میں لچک تھی
رستے میں روز اس کو ملتے تھے اور بچے
تھے بات کے بھی اچھے اور ذہن کے بھی اچھے
ان سب کے ساتھ چلنا اس کو نہ کچھ بھی بھایا
اس قومی ایکتا کو اس نے بُرا ہی جانا
قوموں کو اس نے سمجھا سب تنگ الگ ہیں
رستے میں زندگی کے بس ہم الگ تھلگ ہیں
سب سے الگ وہ اک دن اسکول جا رہا تھا
اک باغ خوبصورت رستے میں اس نے دیکھا
پگڈنڈیاں حسیں ہیں اور پھول پیارے پیارے
بوٹے ہوئے زمیں پہ جیسے کہ ہوں ستارے
خوشبو نے دھیمے دھیمے کھولا تھا عطر دان کو
چڑیاں سمجھ رہی تھیں پھولوں کی بھی زباں کو
موتی جو اوس کے تھے پتوں پہ رک گئے تھے
یا نیلے آسماں کے کچھ تارے جھک گئے تھے
یہ موتیوں کا جھرمٹ اس کو پسند آیا
کچھ دل میں اس نے سوچا پھر خود ہی مسکرایا
ان موتیوں کو چن کر لے جاؤں گا میں تنہا
قسمت ہے میری اچھی میں آج ہوں اکیلا
لیکن وہ دوپہر میں اسکول سے جو پلٹا
تھیں گرم سی ہوائیں اُلٹا ہوا تھا نقشہ
کرنیں تو پی چکی تھیں سب اوس کے وہ موتی
ویسا سماں ہی رہتا گرمی اگر نہ ہوتی
چالاک تھا بہت وہ پر عقل سو رہی تھی
اس کی الگ پسندی کانٹے ہی بو چکی تھی

ابوالمجاہد زاہد
جے۔ آئی اسکول دو محلار
رام پور، یوپی

اگر چاہتے ہو

اگر چاہتے ہو ——— کہیں سب بھلا
اگر چاہتے ہو ——— کہ خوش ہو خدا

تو پھر ——— اپنے ابّو کی خدمت کرو
تو پھر ——— اپنے ابّو کی عزت کرو

کہ ——— ابو کی خدمت میں ہے بہتری
کہ ——— اُن کی خوشی ہے خدا کی خوشی

اگر چاہتے ہو ——— کہ عزت ملے
اگر چاہتے ہو ——— کہ جنت ملے

تو پھر ——— اپنی امی کی عزت کرو
تو پھر ——— اپنی امی کی خدمت کرو

کہ ——— عزت ہے امی کے قدموں تلے
کہ ——— جنت ہے امی کے قدموں تلے

بچپن

ہے کتنا پیارا پیارا
یہ بچپنا ہمارا

اک باغ خود خوشی بھی جس میں خوشی منائے
اک پھول جس کی خوشبو ہر ایک کو لبھائے
اک رنگ جس کی شوخی روتوں کو بھی ہنسائے
اک گیت جس کو سن کر ہر روح جھوم جائے

ہے کتنا پیارا پیارا
یہ بچپنا ہمارا

خوشیوں کا اک جزیرہ خوابوں کی ایک دنیا
بستی شرارتوں کی اک شہر شوخیوں کا
ننھا سا ایک سورج اک چاند بھولا بھالا
اک شمع بات کرتی اک بولتا ستارا

ہے کتنا پیارا پیارا
یہ بچپنا ہمارا

عبدالمجیب سہالوی
معرفت دانش محل، امین آباد، لکھنؤ

(کہانی)

دادا میاں

اللہ بخشے ہمارے رشتے کے ایک دادا میاں تھے، دیہات کے رہنے والے، پرانے زمانے کے لوگ، بات کا اتنا پاس کہ جان جائے پر بات نہ جائے، وضعداری تو اُن کی گھٹی میں پڑی تھی۔ جیسے خود صاف دل اور محبت کرنے والے تھے ویسے ہی اُن کے دوست اور ساتھی بھی تھے۔ پرانے زمانے کے لوگوں کے دوست کم لیکن اُن کی دوستی پکی ہوتی تھی۔ پڑوس میں ٹھاکرو ل کے گھر تھے، ایک ٹھاکر صاحب سے اُن کی دانت کاٹی روٹی والی دوستی تھی، بچپن کے ساتھی اور لنگوٹیا یار تھے بچپنے میں ساتھ کھیلے تھے اور جوانی میں ایک ہی اکھاڑے میں زور آزمائی کی تھی، پھر جب بوڑھاپا آیا تو دونوں نے چوپال میں ساتھ بیٹھ کر بیتے دنوں کی بات تازہ کی تھی۔

ٹھاکر صاحب کی صحت تو اچھی تھی لیکن لڑکے کا غم مارے ڈال رہا تھا۔ بڑی ٹھاکورائن جوانی ہی میں سورگ باش ہو گئی تھی اور کوئی نشانی بھی نہ چھوڑی تھی۔ بڑی ٹھاکورائن کے غم کے باوجود کنبے کا نام زندہ رکھنے اور گھر کا چراغ جلائے رکھنے کی غرض سے ٹھاکر صاحب نے دوسری شادی کی اور بھگوان کی دیا سے جلد ہی چھوٹی ٹھکرائن کی گود بھر بھی گئی اور لڑکے کو جنم دے کر انھوں نے ٹھاکر صاحب کی دلی خواہش پوری کر دی۔

منتوں، مرادوں کا اکلوتا لڑکا ماں کی آنکھوں کا تارا باپ کا دلارا تھا۔ باپ لاڈ دلار کے باوجود لڑکے پر کڑی نگاہ رکھتے مگر لڑکا ان کی نگاہوں سے بچ کر خوب شرارتیں کرتا محلے پڑوس کے لوگ ٹھاکر صاحب کے لحاظ سے کچھ نہ کہتے مگر شن گن تو ٹھاکر صاحب کے کانوں تک پہنچ ہی جاتی جس سے انھیں بڑا دکھ ہوتا۔ وہ دمے کے پرانے مریض تھے لڑکے کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر ان کی صحت تیزی سے گرنے لگی۔ ایک دن تو لگاتار ایسی سانس پھولی کہ جان کے لالے پڑ گئے۔

دادا میاں بوڑھاپے کے باوجود ابھی کافی ہٹے کٹے تھے۔ ٹھاکر صاحب پر جب دمے کا دورہ پڑا تو انھوں نے ساری رات سرہانے بیٹھ کر بتا دی۔ سویرے ذرا آنکھ جھپک گئی مگر ٹھاکر صاحب کی آواز سن کر فوراً چونک پڑے اور خیریت پوچھی۔ ٹھاکر صاحب نے سوکھے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا دوست یہ امانت تمہارے سپرد ہے اور لرزتے ہوئے ہاتھوں سے لڑکے کا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے دیا اور آنکھیں بند کر کے ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئے۔

دادا میاں اس موقعہ پر لڑکے کا ہاتھ نہ پکڑتے تو کیا کرتے۔ ٹھاکر صاحب تو اپنا بار ہلکا کر کے سدھار گئے لیکن دادا میاں کی جان جنجال میں پڑ گئی۔ اپنے ہی بال بچوں کی فکر کیا کم تھی، دوست کے لڑکے کی دیکھ بھال کا بار اور سر پر لد گیا۔

لڑکا بھی کس کا ٹھاکر کا لڑکا جو ناک پر مکھی تک بیٹھنے نہ دیتا اور اگر کبھی ناک میں چلی جاتی تو خود بھاڑ میں گھس جانے پر آمادہ ہو جاتا۔ جب تک چھوٹا رہا گاؤں کے لڑکوں سے لڑتا رہا۔ بڑا ہوا تو جوار کے بڑے بڑے لٹھ بازوں سے مورچہ لینے لگا۔ بد دماغی کا یہ حال تھا کہ اس کے دروازے کے سامنے سے اگر کوئی گھوڑے پر سوار ہو کر نکلتا تو اس پر بھوت سوار ہو جاتا اور تاؤ میں آ کر

گھوڑے کی ٹانگیں توڑنے کے علاوہ سوار کا سر پھوڑنے پر آمادہ ہو جاتا۔ اس اکھڑ پن کا نتیجہ ظاہر تھا۔ ایک مرتبہ کسی بگڑے دل ٹھاکر سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ سر پھٹول ہوئی، پھر دونوں طرف سے گھر یا ؤں بلائے گئے، خوب جم کر لاٹھی چلی، دو چار ادھر اور دو چار اُدھر زخمی ہوئے جن میں بوڑھے دادا میاں اور ان کا جوان نوکر بھی تھا۔

دادا میاں کی کسی سے لڑائی نہ تھی، جوار کے لوگ انھیں اپنا بزرگ مانتے تھے۔ لوگوں نے لاکھ سمجھایا، اونچ نیچ دکھائی لڑکے کی شورہ پشتی اور اُجڈپن کے قصے بتائے اور کہا کہ آپ اس کا ساتھ نہ دیجئے ورنہ اپنے ساتھ یہ آپ کو بھی لے ڈوبے گا لیکن دادا میاں سب جاننے اور سمجھنے کے باوجود لڑکے کا ہاتھ پکڑنے کے بعد مرتے دم تک اس کا ہاتھ نہ چھوڑ پائے۔ جب کبھی کہنے سننے سے ہاتھ سمیٹ لینے کا خیال آتا تو دوست کی ڈوبتی ہوئی نگاہیں یہ کہتی معلوم ہوتیں کہ کچھ سمجھ ہی کر لڑکے کا ہاتھ پکڑایا تھا پھر ان کے ہاتھ لوہے کی طرح سخت ہو جاتے اور کسی کے چھڑانے سے بھی لڑکے کا ہاتھ نہ چھوڑتے۔

لاٹھی لڑلینا اور سر پھٹول کر لینا تو آسان ہوتا ہے لیکن اس کے بعد آنے والی مصیبتوں کا سامنا کرنا ٹیڑھی کھیر ہوتا ہے۔ رپورٹ ہوتے ہی پولیس موت کی طرح گھر گھیر لیتی ہے اور پھر اس سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے۔

فوجداری کے بعد دونوں طرف سے دوڑ دھوپ شروع ہو گئی۔ زخمیوں کا ڈاکٹری معائنہ کرانا، وکیل کے گھر کے چکر لگانا اور پیسے کو پانی کی طرح بہانا آسان کام نہ تھا۔ مقدمے کی پیروی میں جوانوں کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں تو پینسٹھ برس کے دادا میاں کا جو حال ہوا ہوگا وہ ظاہر ہے لیکن اُن کے چہرے پر شکن تک نہ آئی۔ ان کا دل گرفتار رہا لیکن منھ کی مسکراہٹ کبھی نہ گئی۔ جب کوئی سمجھاتا تو کہتے کہ اوکھلی میں سر دے کر چوٹوں کا کیا ڈر، جب لڑکے کا ہاتھ پکڑا تھا تو کیا اس کے چھن جانتے نہ تھے، اب پیچھے ہٹنے کا کوئی سوال نہیں۔

پولیس نے دونوں طرف کے لوگوں کا چالان کر دیا۔ ... کے ساتھ ان کے بھتیجے بھی گیہوں کے ساتھ گھن کی طرح پس گئے ٹھاکر صاحب کے لڑکے تیغ بہادر سنگھ اور اُن کے نوکر وا... علاوہ دادا میاں، ان کے بھتیجے اور ملازمین سب گرفتار ... حوالات میں پہونچا دیئے گئے۔ اب گھر میں ضمانت کا انتظا... بھی کوئی نہ رہا۔ ... ہاتھ پاؤں پھول گئے لیکن ٹھکرائن کے ... پر بل نہ آیا اور انھوں نے قسم کھالی کہ جب تک بڑے بھیا یعنی دادا میاں حوالات میں رہیں گے وہ چارپائی پر نہ لیٹیں گی وہ فوراً رتھ پر بیٹھ کر اپنے میکے پہونچیں اور دو دو ضمانت دا... لیے کھڑے کر کے لے آئیں۔ لیکن ابھی ضمانت کی کاروائی پوری ہوئی تھی کہ وہ آدمی جو تیغ بہادر کی لاٹھی سے زخمی ہوا تھا چل... عدالت نے دادا میاں کی ضمانت تو منظور کر لی لیکن تیغ بہادر کی نہیں منظور کی جب دادا میاں حوالات سے نکالے جانے لگے تو باہر جانے سے انکار کر دیا۔ وہ خاموش تھے لیکن اُن کی ڈبڈبا... آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ میں نے جس کا ہاتھ پکڑا ہے اسے اکیلا چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ جب لڑکے کی ضمانت اوپر کی عدالت سے منظور ہو جائے گی تب ہم دونوں ساتھ گھر آئیں گے۔

وہ اکھڑ لڑکا جو بڑے بڑے اونچی مونچھ والوں کا سر جھکا نا کیا آنکھیں نیچی کرنا بھی نہیں جانتا تھا وہ آنکھوں آنسو بھرے دادا میاں کے پاؤں پکڑے اُن سے حوالات سے جانے کی خوشامد کر رہا تھا لیکن دادا میاں پہاڑ کی طرح اپنی ... پر اٹل تھے، وہ اپنے فیصلے سے ذرا بھی ٹس سے مس نہ ہوئے ... دوسرے لوگ مجبور ہو کر دادا میاں کو تیغ بہادر کے ساتھ حوالا... میں چھوڑ کر چلے گئے۔

سب لوگوں کے چلے جانے کے بعد جب تنہائی ہوئی ... تیغ بہادر دادا میاں کے پاس آیا اور سسکیاں بھر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس نے کہا کہ یہ بے عزتی یہ تکلیف پریشانی میرے بُرے کرتوت سے آپ کو اٹھانی پڑی، میں ... زمین میں گڑا جا رہا ہوں، بھگوان کے لیے آپ مجھے معاف کر دیں

(باقی صفحہ ۱۲ پر)

(کہانی)

صبیحہ انور
نامی پریس بلڈنگ
خواجہ قطب الدین روڈ (نخاس)
لکھنؤ ۳

بچّوں کا دن

دو نرم اور گداز باہیں اس طرح آگے بڑھیں کہ اس کا پورا سراپا ان میں سمٹ گیا باہوں کی قربت اور لمس کی حدّت میں اس کے جسم و جان حل ہو گئے۔ اور اس نے بڑی طمانیت سے اپنا سر ان باہوں میں چھپا لیا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے محبت اور سپردگی کے نشے میں سر سے پیر تک ڈوبتا جا رہا ہو۔ اس کی آنکھیں خود بخود بند ہونے لگیں۔

بارہ سالہ راجو دن بھر کی مشقت کے بعد آج بہت تھک گیا تھا۔ آج کے کام کی تفصیل اسے کل ہی بتا دی گئی تھی۔ باپ کی بیماری کی وجہ سے سڑکوں اور نالیوں کی صفائی کا کام پندرہ دن سے راجو خود ہی نپٹا رہا تھا ماں کے ذمہ جن گھروں کی صفائی اور پونچھائی کا کام تھا۔ ان میں سے دو بڑی کوٹھیوں کی صفائی اور جھاڑو پونچھ تو وہ بہت جلدی کر لیتا تھا۔ مگر اس میں بھی بڑی چالاکی کی ضرورت تھی۔ کیونکہ اگر کام دیر میں ہوتا تو سستی اور کام چوری کا الزام لگتا اور ڈانٹ پڑتی۔ اور اگر جلدی جلدی کر لیا جاتا تو مالکن دوسرے کام بتانے لگتی ہیں۔ ذرا گملوں کے پیچھے سے تو کوڑا نکالو۔ کچن کی پچھلی والی نالی میں فینائل ڈال کر پھر سے صفائی کر دو۔ اور کچھ نہیں تو "چلو سیڑھیوں کو گیلے کپڑے سے پونچھو" ۱۲ نمبر والی کوٹھی سے اسی لئے راجو بہت گھبراتا۔ اور ہمیشہ اس کا کام بعد میں کرتا۔ اس کوٹھی کی مالکن کالج میں پڑھاتی تھیں۔ اسی لئے راجو کی یہی کوشش ہوتی کہ ان کے کالج جانے کے بعد گھر میں قدم رکھے مگر آج تو وہ پہلے ہی کالج چلی گئیں۔ کیونکہ ان کے گھر میں سناٹا تھا۔ مالکن کے جانے کے بعد آیا کچن میں چائے پی رہی تھی۔ راجو نے جلدی جلدی جھاڑو لگائی اور باتھ روم میں صرف ایک بالٹی پانی لڑھکا کر دھوئے بغیر دبے پاؤں نکل بھاگا۔ آج سڑکوں پر اتنی رونق اور گہما گہمی تھی کہ اس کا دل کام میں بالکل نہیں لگ رہا تھا۔

۱۴ نمبر کی کوٹھی میں بھی آج چہل پہل تھی۔ چھوٹے بھیا کے اسکول میں آج ڈرامہ ہے۔ آیا نے اسے باہر ہی بتا دیا تھا۔

اس نے میم صاحب کے کمرے میں جھانکا۔ چھوٹے بھیا کا منہ آج کچھ کالا کالا ہو رہا تھا۔ صاحب اور میم صاحب ہنسی کے مارے لوٹے جا رہے تھے۔ چھوٹے بھیا کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی جھاڑو اور کوڑے کی ٹوکری تھی۔ وہ دونوں اسے "راجو جمعدار" راجو جمعدار" کہہ کر چھیڑ رہے تھے۔ راجو نے دیکھا میم صاحب ایک ہاتھ میں جھاڑو اور دوسرا ہاتھ کمر پر رکھ کر بھیا کو جھاڑو لگانے کا طریقہ سکھا رہی ہیں اور ہنستے ہنستے دوہری ہو

ہیں۔ مگر راجو کو یہ نقلی راجو، جمعدار، پسند نہ آیا۔ اسی لئے وہ اس کمرے کے پاس ٹھہرا نہیں — میم صاحب کو چھوٹے بھیا کو اسکول لے جانے کی جلدی تھی۔ اس لئے انھوں نے یہ نہ دیکھا کہ راجو نے آج لان پر سے نہ سوکھے پتے سمیٹے ہیں اور نہ ہی کتے کا برتن دھویا ہے۔

باہر ڈرائیور نے بتایا کہ آج چھوٹے بھیا کے اسکول میں فینسی ڈریس ہوگا — جس میں بھیا جمعدار بنیں گے۔ راجو کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیسا فینسی ڈریس ہے جس میں بھیا تو جمعدار بنیں گے۔ مگر راجو جمعدار کو بھیا نہ بنایا جائے گا۔ کوئی اسے بھی تو چھوٹے بھیا کی طرح تیار کرے۔ اسے بھی بھیا کی طرح اُجلے خوشبودار کپڑے پہنائے جائیں اور ناشتے کے ڈبے میں مکھن لگے ٹوسٹ لے کر لمبی موٹر پر بیٹھ کر وہ بھی ایک ہی دن کے لئے سہی اسکول جائے — تب ہوگا اصلی فینسی ڈریس۔"

مکھن لگے ٹوسٹ کا خیال آتے ہی راجو کی بھوک چمک اٹھی۔

آج ہر گھر میں مصروفیت تھی۔ اسی لئے کسی نے راجو کو چائے بھی نہ دی۔ ورنہ اکثر اسے کہیں نہ کہیں سے بچی کھچی چائے اور روٹیاں ضرور مل جاتی تھیں۔ اب ان میں نالیوں اور سڑکوں کی صفائی کرنے کی سکت نہ تھی وہ کھیلنے اور زمین پر لوٹنے کے لئے بے قرار ہو رہا تھا۔ مگر آج کام سے بچنا ناممکن تھا۔ ہر طرف جمعداروں کے کام کی چیکنگ ہو رہی تھی — گلی کے نکڑ پر دیوار سے لگا دو پہیوں والا کوڑے کا ٹھیلہ اور جھاڑو دے کر اسے مجبوراً باپ کی عوضی نبٹانے جانا ہی پڑا — مگر آج کے کام میں تو خلاف توقع خوب مزہ آیا — بڑے والے اسکول میں جھاڑو دینا تو بالکل نہیں کھلا۔ اسکول میں آج سب ہنسی مذاق میں مصروف تھے۔ ایک موٹا لڑکا ساری پہنے خوب گھونگھٹ میں لدا۔ میز پر چڑھا ناچ رہا تھا — ڈرامہ شروع ہونے میں ابھی دیر تھی۔

ناچتے ناچتے موٹے لڑکے کا پیر ساری میں الجھا۔ اس کے گرنے پر دوسرے بچوں کے ساتھ راجو نے بھی خوب تالیاں بجائیں۔ وہ تو آج شاید پورا دن یہیں گزار دیتا۔ مگر اسے یاد آیا ابھی تو بہت سارے کام باقی ہیں۔ اسکول میں گورے والی استانی نے اسے بھی دو کیلے اور مٹھائی کی ایک پڑیا دی۔

اسکول میں پھل کھا کر جسم میں کام کرنے کی طاقت آگئی تھی۔ اس لئے راجو نے باقی کام بھی کسی نہ کسی طرح پورا کر لیا۔ حالانکہ پوری دوپہر گزر گئی اور پھر پڑے اٹھنے کے ساتھ سیدھے راستے کے بجائے اس نے گھر جانے کے لئے سینما والا راستہ چنا۔ سینما ہال کے برآمدے میں تھوڑی دیر تک شیشے میں لگی رنگین تصویریں دیکھیں، سب کی آنکھ بچا کر لال کپڑوں والی لڑکی کی تصویر پر جس نے پروں کی ٹوپی لگا رکھی تھی — دو چار بار ہاتھ بھی پھیرا۔ مگر بہت جلد دل اکتا گیا — اکیلے کچھ مزہ نہیں آ رہا تھا۔ دوسرے لڑکوں کو بھی شاید کام سے فرصت نہیں ملی تھی — تحریر چل رہی تھی۔ اس لئے باہر سناٹا سا تھا مجبوراً گھر کی طرف چل پڑا۔

گھر میں بابا کی طبیعت آج کچھ زیادہ خراب تھی۔ ماں نے اسے کھانا تو دیا مگر ساتھ ہی تاکید کی کہ کھانا جلدی سے ختم کر کے ۱۲ نمبر کوٹھی سے اپنی تنخواہ میں سے دس روپے پیشگی مانگ لائے۔ ڈاکٹر سے دوائی لانا ضروری ہے۔ اس نے کچھ اتنی خوشامد سے کہا کہ دل نہ چاہتے ہوئے بھی راجو کوٹھی کی طرف چل پڑا۔ شام ہونے والی تھی مگر کوٹھی میں سناٹا تھا۔ باورچی نے بتایا کہ سب لوگ کہیں گھومنے گئے ہیں۔ راجو سیڑھیوں پر بیٹھا تھوڑی دیر انتظار کرتا رہا — پھر تھکے قدموں سے گھر کی طرف چل پڑا — مگر راستے کی گہما گہمی نے اس کے قدم روک لیے سامنے

رک میں ایک بڑے سے ہاتھی کو دیکھ کر وہ بے خیالی
ں پارک میں داخل ہوگیا۔ وہ روز اس ہاتھی کو دیکھتا تھا۔
ینٹوں سے سیمنٹ اور لوہے سے بنایا جا رہا تھا۔ مگر
ج تو اس کی سجاوٹ دیکھنے کے قابل تھی۔ پیٹھ پر سنہری
ول ڈالے اپنے سفید دانتوں کے ساتھ وہ بڑی فاتحانہ
ان سے سونڈ اوپر اٹھائے کھڑا تھا۔ ہاتھی پر چڑھنے کے
لئے چھوٹی چھوٹی سیڑھیاں بھی بنی تھیں۔ ہاتھی کی شان
شوکت سے مرعوب راجو ہاتھی کے پاس کھنچتا چلا گیا۔
ں طرف بینڈ بج رہا تھا۔ دوسری طرف رنگ برنگے گیس
غبارے ہوا میں اڑ رہے تھے — بہت سی کرسیاں
ی تھیں اور پھولوں کے گملے چاروں طرف سے کرسیوں کو
یرے تھے — کرسیوں سے ذرا دور پر بچوں کو رنگین لفافے
ٹ رہے تھے۔ بھیڑ بھاڑ میں ایک لفافہ راجو کے بھی
تھ لگا جس میں دو غبارے ایک پیس مٹھائی، کاغذ کی
روں والی ٹوپی — اور ایک سیٹی تھی — ابھی دن کی
وشنی بھی باقی تھی۔ مگر پارک بلبوں کی روشنی سے جگمگا
رہا تھا — بچوں کے قہقہوں اور موسیقی کے شور سے
ہاں ایک عجیب ہی ماحول قائم تھا۔

ہاتھ میں کاغذ کی تھیلی لئے فضا کی رنگینی سے مبہوت
جو تھوڑی دیر تو بھونچکا کھڑا رہا — اسے اس وقت
حساس ہی نہ تھا کہ اس کے کپڑے میلے ہیں اور کپڑوں سے
بو آرہی ہے۔ جلد ہی بچوں کے اس ریلے نے اسے
پنے اندر سمو لیا جو لائن بنائے ایک ٹھیلنے والے جھولے
ی طرف بڑھ رہے تھے — ایسی خوبصورت شام راجو نے
واب میں بھی نہ دیکھی تھی — وقت کیسے گزرا اسے احساس
ی نہ ہوا — اس کے ہاتھ میں جھولے کی زنجیریں
تھیں جو اسے نئے آسمانوں کی سیر کرا رہی تھیں —
سے ایسا لگا جیسے یہ دو زنجیریں نہیں ہیں۔ دو گداز بانہیں
ں نے تھام رکھی ہیں۔ ان ہاتھوں سے محبت اور شفقت
کی پھوار برس رہی ہے۔ نیند گہری اور گہری ہوتی جا رہی
ہے کہ اچانک ایک جھٹکے کے ساتھ کسی نے اسے ممتا
بھری گود سے چھین لیا۔ وہ آنکھیں ملنے لگا۔ پارک میں
تقریباً سناٹا ہو گیا تھا۔ چاروں طرف اندھیرا تھا۔
مگر وہاں ابھی تک روشنی کا سیلاب تھا۔ سامنے
اس کی ماں محلے کے کچھ آدمیوں کے ساتھ کھڑی تھی —
وہ شاید اس ممتا بھرے بوڑھے سے لگ کر سو گیا تھا —
جو پارک کے ایک کونے میں لگا تھا۔

"حرام خور یہاں مزے کر رہا ہے — کہاں مر گیا تھا۔
پیسے لے کر" — ماں نے اسے جھنجھوڑ ڈالا —

بول پیسے کیا کیے —؟ خرچ کر ڈالے؟" — ماں نے
اس کی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے — دوسرے
ہاتھ سے اس کے گال پر تھپڑ لگایا —

"ارے چھوڑ دو بچہ ہے — آج بچوں کا دن ہے"۔
پیچھے سے ایک آواز آئی۔

"بچوں کا دن ہے۔ ہنھ —" ماں بڑبڑائی۔
"کیا کما کر لایا۔ بچوں کے دن —"؟

ماں نے راجو کی جیب سے ہاتھ نکال کر مٹھی کھولی
تو اس کی ہتھیلی پر کاغذ کی ایک مڑی تڑی ٹوپی اور
دو پچکے ہوئے غبارے تھے جو راجو کو منہ چڑھا رہے
تھے —

٭

جنت بچپن کے
آس پاس رہتی ہے۔
— ورڈس ورتھ

کہانی

ڈاکٹر انوار الحسن
صدر شعبہ علوم شرقیہ (عربی و فارسی) لکھنؤ یونیورسٹی۔ لکھنؤ

اِسٹاوُرِن کی شہزادی

اب سے بہت دنوں پہلے ملک ہالینڈ میں ایک بڑے سمندر کے کنارے ایک بہت خوبصورت شہر آباد تھا، اس شہر کا نام "اِسٹاوُرِن" تھا۔ وہاں کے رہنے والے بہت مالدار اور مغرور تھے۔ ان لوگوں کے پاس خوب صورت، بلند اور شاندار محل تھے، سونے اور چاندی کے برتنوں میں کھانا کھاتے تھے اور قسم قسم کے قیمتی ہیرے اور جواہرات سے ان کی تجوریاں ہر وقت بھری رہتی تھیں۔ ان کے جہاز دور دور کے ملکوں کا سفر کرتے اور وہاں سے قیمتی اور نفیس سامان لایا کرتے تھے۔ مال اور دولت کے ساتھ ساتھ ان کا غرور بھی ہر روز بڑھتا جاتا تھا۔ دن رات عیش کرتے تھے اور سوائے اپنی دولت بڑھانے کے انھیں اور کوئی فکر نہ تھی۔ غریبوں پر ترس کھانا تو جانتے ہی نہ تھے، ان پر مہربانی کرنے کے بجائے خوب ظلم اور زیادتی کرتے تھے۔

ہاں تو اسی شہر اسٹاوُرِن میں ایک حسین شہزادی رہتی تھی۔ اس کے پاس کئی بڑے بڑے خوب صورت محل اور بہت سے جہاز تھے، اس کی دولت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ بے شمار قیمتی ہیروں اور جواہرات سے اس کا خزانہ بھرا ہوا تھا۔ شہر کے کسی رئیس کا محل اتنا خوبصورت اور شاندار نہ تھا جتنا کہ اس شہزادی کا۔ جتنی دولت شہزادی کے پاس تھی اتنی دولت کسی دوسرے کے پاس نہ تھی اور جیسے خوبصورت اور قیمتی کپڑے اس کے پاس تھے ویسے کپڑے تو کہیں دکھائی نہیں دیتے تھے، اس کے پاس سواری کے لیے سونے کی ایک ٹم ٹم تھی۔ جب وہ اپنی سونے کی ٹم ٹم پر سوار ہو کر بازار سے نکلتی تو اس کی چمک دمک سے لوگوں کی آنکھیں چکاچوند ہو جاتی تھیں۔ شہزادی کی دولت روز بہ روز بڑھتی جا رہی تھی۔ دولت کے ساتھ اس کا غرور اور لالچ بھی روز بہ روز بڑھتا جاتا تھا۔ اسی دھن میں رہتی کہ کس طرح اپنی دولت بڑھائے۔

(۲)

ایک روز صبح صبح شہزادی نے شہر کے سب سے بڑے ملاح کو اپنے محل میں بلایا اور اس سے کہا۔

"جاؤ ایک بڑے سفر کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

بوڑھے ملاح نے سر جھکا کر بڑے ادب سے جواب دیا:

آپ کا حکم سر آنکھوں پر، لیکن شہزادی صاحبہ! یہ تو بتائیے کہ مجھے کس کام سے اور کس طرف سفر کرنا ہوگا؟"

شہزادی نے چلّا کر کہا:

"یہ میں نہیں جانتی ہوں کہ کدھر جاؤ مگر اتنا ضرور ہے کہ کہیں جاؤ اور وہاں سے واپسی پر میرے لیے دنیا کی سب سے قیمتی چیز لاؤ۔"

بوڑھا ملاح اسی طرح سر جھکائے ہوئے آہستہ سے بولا:

"سرکار! میں آپ کے حکم سے کب انکار کر رہا ہوں۔ ضرور جاؤں گا۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ شہزادی صاحبہ اس چیز کا نام بتا دیں جسے وہ دنیا کی سب سے زیادہ قیمتی چیز سمجھتی ہیں تاکہ میں اس کو حاصل کرنے کی کوشش کروں۔"

شہزادی نے جھنجھلا کر جواب دیا:

"میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ دنیا میں کوئی ایک

ضرور سب سے زیادہ قیمتی ہے لیکن مجھے اس کا نام نہیں معلوم ہے۔ میں نے تمھیں اپنی آرزو بتادی ہے۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں چاہتی ہوں۔"

شہزادی کا جواب سن کر بوڑھا ملاح سکتے میں پڑ گیا مگر مصلحت سمجھ کر چپ رہا کیونکہ اگر شہزادی سے پھر اس چیز کا نام پوچھتا تو اسے غصہ آجاتا۔ اور شہزادی کو جس پر غصہ آجاتا تھا اس کا مال چھین کر اسے زمین میں زندہ دفن کروادیتی تھی۔

(۳)

بوڑھا ملاح شہزادی کے ڈر کی وجہ سے جلدی سے محل سے باہر نکلا اور سمندر کے کنارے کی طرف چل دیا۔ راستے بھر سوچتا رہا کہ کون سی چیز شہزادی کے نزدیک دنیا کی سب سے زیادہ قیمتی ہو سکتی ہے؟ مگر کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کبھی اس کا خیال ایک چیز کی طرف جاتا اور کبھی دوسری طرف۔ کبھی جھنجھلاتا، کبھی الجھتا اور کبھی پاؤں پٹختا۔ غرض اسی ادھیڑ بن میں چلا جا رہا تھا اور کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ آخر اسی حالت میں سمندر کے کنارے پہنچ گیا۔ وہاں اس کے ساتھی بہت سے ملاح کھڑے تھے۔

دوسرے ملاحوں نے بوڑھے ملاح کو اس طرح پریشانی دیکھا تو پوچھنے لگے کہ "تم پر کیا مصیبت آئی ہے، کیوں اس قدر پریشان ہو؟"

بوڑھے ملاح نے جواب دیا: "آج صبح صبح شہزادی نے مجھے اپنے محل میں بلایا تھا۔ میں جلدی سے تیار ہو کر گیا کہ دیکھوں شہزادی نے مجھے کیوں یاد کیا ہے۔ وہاں پہنچا تو اس نے مجھ سے ایک ایسی چیز کی فرمائش کی ہے جس کا ملنا ناممکن ہے۔"

سب ملاحوں نے پوچھا: "بتاؤ تو سہی کہ وہ کیا چیز ہے؟ شاید اسے حاصل کرنے میں ہم تمہاری مدد کر سکیں۔"

بوڑھے ملاح نے جواب دیا: "اس چیز کا نام تو خود شہزادی نے بھی نہیں بتایا ہے تو میں کیا بتاؤں۔ شہزادی نے حکم دیا ہے کہ میں کسی بڑے سفر پر جاؤں اور وہاں سے واپسی پر اس کے لیے کوئی ایسی چیز لاؤں جو دنیا میں سب سے زیادہ قیمتی ہو۔"

بوڑھے ملاح کی زبانی شہزادی کی اس انوکھی فرمائش کو سن کر سب ملاح سوچ میں پڑ گئے۔ پھر ہر ایک نے اپنی عقل اور سمجھ کے مطابق کوئی نہ کوئی چیز بتائی۔

ایک ملاح نے کہا: "شاید بہت سی چاندی لے جانے سے شہزادی خوش ہو جائے۔"

دوسرا ملاح بولا: "نہیں سونا پسند کرے گی۔"

تیسرے ملاح نے کہا: "شاید قیمتی ہیرے اور جواہرات چاہتی ہو۔"

بوڑھا ملاح سوچ رہا تھا کہ "اگر میں اپنے نزدیک سب سے زیادہ قیمتی شے لے بھی جاؤں تو معلوم نہیں شہزادی اسے پسند بھی کرے گی یا نہیں۔"

اتنے میں ملاحوں کی ٹولی میں سے ایک نوجوان ملاح آگے بڑھا اور بوڑھے ملاح سے پوچھنے لگا: "کیا میں بھی اپنی رائے ظاہر کر سکتا ہوں؟"

سب ملاح تعجب سے نوجوان ملاح کی طرف دیکھنے لگے۔

بوڑھے ملاح نے سر اٹھا کر نوجوان کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے جواب دیا: "ضرور، ضرور، تم بھی اپنی رائے ضرور ظاہر کرو۔"

نوجوان ملاح نے کہا: "میرا خیال ہے کہ گیہوں دنیا کی سب سے زیادہ قیمتی چیز ہے کیونکہ اگر گیہوں نہ ہو تو روٹی نہ ہو اور روٹی نہ ہو تو زندہ رہنا مشکل ہے۔"

نوجوان ملاح کی رائے سن کر سب ملاح ہنسنے لگے مگر بوڑھا ملاح بہت خوش ہوا، نوجوان ملاح کو شاباشی دی اور کہا: "میں بھی دنیا کی کسی چیز کو گیہوں سے زیادہ کام آنے والی اور قیمتی نہیں سمجھتا ہوں۔"

(۴)

بوڑھا ملاح جہاز کا لنگر اٹھا کر خوشی خوشی سفر کے لیے روانہ ہو گیا اور دریا بالٹک سے گزرتا ہوا ایک ساحلی شہر پر پہنچ گیا۔ ساحل پر پہنچ کر بوڑھے ملاح نے بہت سا گیہوں خریدا اور جہاز میں بھر کر وطن کی طرف روانہ ہوا۔ تھوڑے ہی دنوں میں

اپنے شہر اسٹاڈرن میں واپس پہنچ گیا۔

شہزادی کو بوڑھے ملاح کے اتنی جلدی واپس آجانے کی خبر ملی تو اسے بہت تعجب ہوا۔ بوڑھا ملاح شہزادی کے محل پہنچا تو شہزادی نے اس سے پوچھا: "کیا تمہارا جہاز پانی پر چلنے کے بجائے ہوا میں اڑتا ہے جو تم اتنی جلدی سفر سے واپس آگئے؟"

بوڑھے ملاح نے جواب دیا: "جو چیز آپ چاہتی تھیں جلد مل گئی اس لیے میں بھی جلدی سے واپس آگیا۔"

شہزادی نے پوچھا: "بتاؤ کیا لائے ہو؟"

بوڑھا ملاح بولا: "گیہوں۔"

"گیہوں؟ کیا گیہوں دنیا کی سب سے زیادہ قیمتی چیز ہے؟ کیا میں نے تمہیں ایسی ہی معمولی اور گھٹیا چیز لانے کے لیے سفر پر بھیجا تھا؟" شہزادی نے چیخ کر کہا اور مارے غصے کے اپنی کرسی سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی، دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ کر دانت پیسنے لگی اور چلا چلا کر بوڑھے ملاح کو گالیاں دینے لگی۔

"معزز شہزادی! گیہوں معمولی اور گھٹیا چیز نہیں ہے بلکہ یہ تو زندگی کی ضروریات میں سے ہے۔ اگر گیہوں نہ ہو تو روٹی نہ ہو اور روٹی نہ ہو تو زندہ رہنا مشکل ہے۔" بوڑھے ملاح نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔

بوڑھے ملاح کا جواب سن کر شہزادی اور بھی جھنجھلا گئی اور حکم دیا: "جہاز پر لدا ہوا سارا گیہوں فوراً سمندر میں پھینک دیا جائے۔"

بوڑھے ملاح نے کہا: "شہزادی صاحبہ! آپ نے غصے اور ناراضگی کی وجہ سے یہ حکم دیا ہے۔ اگر اتنی جلدی نہ کیجیے تو میں گیہوں کے اور فائدے معلوم کر کے بتاؤں، اور اگر گیہوں کے تمام فائدے معلوم ہونے کے باوجود یہ قیمتی چیز آپ کو پسند نہ آئے تو مجھے اجازت دیجیے کہ میں سارا گیہوں شہر کے غریبوں اور بھوکوں میں بانٹ دوں۔"

شہزادی نے غصے سے بپھر کر جواب دیا: "بوڑھے ملاح! اگر اپنی جان کی سلامتی چاہتے ہو تو فوراً میرے محل سے باہر نکل جاؤ اور ابھی سارا گیہوں سمندر میں پھینک دو۔"

(۵)

شہزادی کا جواب سن کر بوڑھے ملاح کی آنکھوں میں آنسو آگئے، رنجیدہ اور اداس ہو کر سر جھکائے ہوئے شہزادی کے محل سے نکلا اور شہر کی طرف چل دیا۔ بوڑھا ملاح شہزادی کے محل سے نکل کر شہر کی سڑکوں اور گلیوں میں یہ سوچتا ہوا چلا جا رہا تھا "شہزادی کا حکم مانے یا نہ مانے۔"

آخر بوڑھے ملاح نے اپنے دل میں ٹھان لی کہ "وہ شہزادی کا حکم ہرگز نہ مانے گا۔" اس لیے کہ شہزادی نے غصے میں آکر حکم دیا اور غصے میں آدمی اندھا ہو جاتا ہے۔ کیسے ممکن ہے کہ خوب صورت شہزادی اس قدر سنگ دل ہو جائے کہ کام کی چیز کو سمندر میں پھینکنے کا حکم دے دے۔

بوڑھا ملاح شہر کی سڑکوں اور گلیوں میں دیر تک پھرتا رہا۔ راستے میں جس غریب اور محتاج کو دیکھتا اس سے کہہ دیتا: "سمندر کے کنارے چلو اور شہزادی کے آنے کا انتظار کرو، وہ آج تمہیں گیہوں بانٹے گی۔"

شہر کے غریب اور محتاج لوگ خوش خوش سمندر کی طرف پہنچ گئے۔ بوڑھا ملاح اور دوسرے ملاح پہلے سے وہاں موجود تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں شہزادی بھی اپنی سونے کی ٹم ٹم پر سوار ہو کر سمندر کے کنارے آ پہنچی اور بوڑھے ملاح کو اپنے پاس بلا کر پوچھا: "تم نے میرے حکم کے مطابق اب تک سمندر میں گیہوں کیوں نہیں پھینکا؟"

بوڑھے ملاح نے جواب دیا: "جی نہیں، شہزادی! ابھی میں نے آپ کے حکم کے مطابق سمندر میں گیہوں نہیں پھینکا ہے۔"

شہزادی نے چلا کر کہا: "دیکھ، بوڑھے ملاح! اگر میری آنکھوں کے سامنے سارا گیہوں سمندر میں پھینک نہ دے ورنہ تیری جان کی خیر نہیں ہے۔"

بوڑھے ملاح کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔

لگے۔ اس نے اپنا سر جھکا لیا اور سمندر کے کنارے کھڑے ہوئے غریبوں اور محتاجوں کی طرف ہاتھ سے اشارہ کر کے کہا: "اِن ننگے، بھوکے، غریب اور محتاج مردوں، عورتوں اور ننھے ننھے معصوم بچوں کی طرف ایک نظر دیکھ لیجیے۔ اِن کی خراب حالت پر خدا کے لیے رحم کیجیے اور اجازت دے دیجیے کہ سارا گیہوں اِن لوگوں میں بانٹ دیا جائے۔"

اپنے شہر کے ننگے بھوکے، غریب اور محتاج انسانوں کی خراب حالت کو دیکھ کر شہزادی کا دل ذرا بھی نہ پسیجا اور چلّا کر بولی: "میں ہرگز اس کی اجازت نہ دوں گی۔ میں کئی دفعہ کہہ چکی ہوں اور اب پھر کہہ رہی ہوں کہ ابھی سارا گیہوں سمندر میں پھینک دیا جائے یہی میرا آخری فیصلہ ہے۔"

(۶)

شہزادی کے آخری فیصلے کو سن کر بوڑھے ملّاح کو جوش آگیا اور زور سے چلّا کر بولا: "میں ایسا کام نہیں کر سکتا ہوں اور آپ کے ویسے حکم کو ماننے کے لیے بالکل تیار نہیں ہوں۔"

شہزادی نے بوڑھے ملاح کی بات کی طرف کوئی دھیان نہ دیا اور دوسرے ملاحوں کو پکارا اور انھیں حکم دیا کہ "سارا گیہوں سمندر میں پھینک دیں۔"

شہزادی کو یقین تھا کہ اُن ملّاحوں میں سے کسی کی اتنی جراُت نہیں ہے کہ بوڑھے ملاح کی طرح اس کے حکم سے انکار کرے۔

آخر وہی ہوا جس کا شہزادی کو یقین تھا۔ دوسرے ملّاحوں میں سے کسی کو اتنی جراُت نہ ہوئی کہ شہزادی کا حکم ماننے سے انکار کرتا۔ سب نے جلدی جلدی جہاز سے گیہوں نکال نکال کر سمندر میں پھینکنا شروع کر دیا۔

بیچارے ننگے، بھوکے، غریب اور محتاج لوگ یہ دردناک منظر دیکھ کر روتے اور شہزادی سے فریاد کرتے رہے کہ "اُن کے حال پر رحم کرے اور سمندر میں گیہوں پھینکنے کے بجائے ان لوگوں کو بانٹ دے۔" لیکن سنگدل شہزادی پر کچھ اثر نہ ہوا۔ وہ سمندر کے کنارے کھڑی رہی اور اپنے سامنے سارا گیہوں سمندر میں پھنکوا دیا۔

حسین شہزادی تھی بڑی سنگدل۔ ملّاحوں کو سمندر میں گیہوں پھینکتے ہوئے دیکھتی اور مسکراتی رہی۔ اور جب سارا گیہوں سمندر میں پھینکا جا چکا تو سمندر کے کنارے کھڑے ہوئے سب لوگوں کو اپنے پاس بلا کر پوچھنے لگی: "لوگو! تم نے دیکھا کہ میرے حکم سے سارا گیہوں سمندر میں پھینک دیا گیا۔"؟

"ہاں" سب نے ایک زبان ہو کر کہا۔

اتنے میں بوڑھا ملّاح بھی لوگوں کے مجمع سے نکل کر آگے بڑھا اور شہزادی کے سامنے پہنچ کر بولا: "میں نے بھی آپ کے گھمنڈ کا تماشہ دیکھا ہے، شہزادی صاحبہ! آپ نے گیہوں سمندر میں پھینک تو دیا ہے لیکن یاد رکھئے کہ وہ وقت بھی جلد آنے والا ہے جب آپ کو اپنے کیے پر پچھتانا پڑے گا اور ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ آپ کو بھی بھوک کی تکلیف اٹھانا پڑے گی۔"

بوڑھے ملاح کی بات سُن کر شہزادی نے زور سے قہقہہ لگایا اور کہا: "میں اور بھوک! محال ہے کہ میری جیسی دولت مند شہزادی تکلیف اٹھائے اور بھوکوں مرے۔ بوڑھے ملّاح! شاید تمھارا دماغ خراب ہو گیا ہے جب ہی ایسی باتیں کر رہے ہو۔"

شہزادی نے اپنی انگلی سے عقیق کی انگوٹھی اتاری اور لوگوں کو دکھلا کر سمندر میں پھینک دی اور بوڑھے ملاح سے کہا: "دیکھو اگر یہ سمندر میں پھینکی ہوئی انگوٹھی میرے پاس دوبارہ واپس آ جائے تو مجھ پر اتنی غریبی بھی آ سکتی ہے کہ میں تکلیفیں اٹھاؤں اور بھوکوں مروں۔ لیکن جس طرح سمندر میں پھینکی ہوئی انگوٹھی کا دوبارہ ملنا ناممکن اور محال ہے، اسی طرح میرے لیے تکلیفیں اٹھانا اور بھوکوں مرنا بھی ناممکن اور محال ہے۔"

شہزادی اتنا کہہ کر جلدی سے اپنی سونے کی ٹم ٹم پر سوار

ہوئی اور اپنے شاندار محل کی طرف چل دی۔

(۷)

دوسرے روز صبح ہی صبح شہزادی کی ایک خادمہ اس کے کمرے میں گھبرائی ہوئی داخل ہوئی اور آتے ہی شہزادی سے کہا: "آج کھانے کے لیے جو مچھلیاں سمندر سے شکار کرکے لائی گئی ہیں، اُن میں سے ایک کے پیٹ سے عقیق کی ایک انگوٹھی نکلی ہے۔" اور یہ کہہ کر شہزادی کے سامنے جلدی سے انگوٹھی پیش کردی۔

یہ انگوٹھی وہی تھی جسے ایک روز پہلے شہزادی نے لوگوں کو دکھا کر سمندر میں پھینکا تھا اور کہا تھا کہ "جس طرح یہ انگوٹھی اب سمندر سے دوبارہ میرے پاس نہیں آسکتی ہے اسی طرح غریبی اور مفلسی بھی میرے پاس نہیں آسکتی ہے اور مجھ جیسی دولت مند شہزادی کبھی بھوکوں نہیں مرسکتی ہے۔"

لیکن اب اپنی سمندر میں پھینکی ہوئی انگوٹھی دیکھتے ہی شہزادی گھبرا گئی۔ اُسے فوراً بوڑھے ملاح کی بات یاد آئی اور ڈری کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ بوڑھے ملاح کی پیشین گوئی سچی ہو جائے۔

(۸)

اس واقعہ کے تھوڑے ہی دنوں بعد ایک روز شہزادی اپنے محل کے خوشنما باغیچہ میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ ٹہل رہی تھی کہ ایک خادمہ دوڑی ہوئی آئی اور شہزادی سے کہا: "ایک بہت خراب خبر سنانے آئی ہوں۔ اگر اجازت ہو تو عرض کروں؟"

شہزادی نے جواب دیا: "کہو، کیا بات ہے؟"

خادمہ نے سر جھکا کر ڈرتے ڈرتے کہا: "شہزادی صاحبہ! ابھی ابھی یہ خبر ملی ہے کہ آپ کے سب جہاز جو تجارت کا سامان لے کر دوسرے ملک جا رہے تھے، سمندر میں طوفان آجانے کی وجہ سے ڈوب گئے اور ایک جہاز بھی نہیں بچ سکا۔ صرف چند ملاح تیر کر کنارے پہنچ گئے اس لیے وہ تو زندہ بچے ہیں۔ جہازوں پر جو دوسرے ملازم تھے وہ سب کے سب پانی میں ڈوب کر مر گئے۔"

اتنے بڑے نقصان کی خبر سُن کر شہزادی کے منھ سے چیخ نکل گئی اور رو رو کر کہنے لگی: "ہائے! میں لٹ گئی۔ ہائے! لُٹ گئی۔"

شہزادی کو اپنے جہازوں کے ڈوب جانے کا بڑا افسوس تھا اور بار بار سوچتی تھی کہ کہیں یہ بوڑھے ملاح کی پیشین گوئی تو پوری نہیں ہو رہی ہے۔ اسی غم اور فکر میں شہزادی نے دو روز تک کھانا بھی نہیں کھایا۔

تیسرے روز شہر کے ایک بڑے رئیس کے مکان پر دعوت تھی۔ شہزادی کو خاص طور سے بلایا گیا تھا۔ کھانے کا وقت آگیا تھا مگر شہزادی کا دعوت میں جانے کا ارادہ نہ تھا، اتنے میں اس کی دو تین خاص سہیلیاں آگئیں اور شہزادی کو راضی کرکے اپنے ساتھ دعوت میں لے گئیں۔

اتفاق کی بات کہ شہزادی تو اپنی سہیلیوں کے ساتھ دعوت میں گئی ہوئی تھی، ادھر اس کے کمرے میں روشن دان سے ایک بلی گھس آئی۔ بلی نے شہزادی کے کمرے میں ادھر اُدھر تلاش کرتی دوڑائی کہ کہیں کچھ کھانے کو مل جائے۔ ڈھونڈتی ڈھونڈتی شہزادی کی مسہری کے پاس والی میز پر چڑھ گئی۔ میز پر تیل کا ایک بڑا سا لیمپ رکھا تھا۔ بلی کا دھکا لگنے سے جلتا لیمپ مسہری پر گر گیا اور آگ لگ گئی۔

شہزادی کے کمرے کی ساری چیزیں جل گئیں۔ دروازوں اور کھڑکیوں میں بھی آگ لگ گئی، پھر ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں، دوسرے سے تیسرے کمرے میں، اسی طرح سارے محل میں آگ لگ گئی۔

شہزادی کے نوکر چاکر تو محل کے باہر کوارٹروں میں رہتے تھے۔ انھوں نے محل کو جلتے دیکھا تو سب دوڑ پڑے۔ سب نے آگ بجھانے کی لاکھ کوشش کی مگر ایک نہ چلی کیونکہ تو بوڑھے ملاح کی پیشین گوئی پوری ہو رہی تھی۔

اس طرح اچانک آگ لگ جانے سے سارا محل جل کر خاک ہو گیا۔ سونے اور چاندی کے پلنگ اور برتن سب پگھل

ق کپڑے، فرش اور بچھونے، ہر چیز جل گئی۔ شہزادی کا شاندار
ے اور اس شاندار محل کا تمام سامان تباہ اور برباد ہو گیا۔ اتنے
ے محل کی جگہ پر راکھ کا ایک بڑا سا ڈھیر لگ گیا۔

شہزادی کا ایک وفادار خادم دوڑتا ہوا گیا اور شہزادی کو
دی کا سے خبر دی کہ اس کے محل میں آگ لگ گئی اور سارا
ے راکھ کا ڈھیر بن گیا۔ شہزادی نے یہ خبر سن کر اپنا سر پیٹ
۔ رنجیدہ اور اداس ہو کر محل کی طرف لوٹی تو وہاں شاندار محل
بجائے راکھ کا ایک ڈھیر نظر آیا۔

شہزادی کو اپنے شاندار محل اور شاندار محل کے تمام
مان اور اپنی ہزاروں قیمتی چیزوں کی تباہی اور بربادی کی
بے حد افسوس تھا، مگر افسوس سے کیا نتیجہ؟ وہاں تو بوڑھے
ح کی پیشین گوئی پوری ہو رہی تھی۔ سارے قیمتی جہاز
ب چکے تھے، شاندار محل اور شاندار محل کا تمام قیمتی سامان
ب تباہ و برباد ہو چکا تھا۔

اب شہزادی نے دوسرے محل میں رہنا شروع کر دیا تھا
مگر پہلی سی شان کہاں رہ گئی تھی! سارا قیمتی سامان پہلے ہی
تباہ و برباد ہو چکا تھا، خزانے کی ساری دولت ختم ہو چکی تھی۔

تھوڑے دنوں میں شہزادی اپنا پچھلا غم بھول گئی
ور جائیداد بیچ بیچ کر پہلے کی طرح ناچ گانے اور عیش و آرام
میں بڑی بڑی رقمیں خرچ کرنے لگی۔ کچھ دنوں تک تو جہازوں کے
ڈوبنے اور شاندار محل کی تباہی اور بربادی کا بہت افسوس
وتی رہی اور بوڑھے ملاح کی پیشین گوئی یاد کر کر کے پچھتاتی
رہی، لیکن دھیرے دھیرے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پچھلی
باتیں بھولنے لگی اور شہزادی کا گھمنڈ پھر بڑھنے لگا۔ غریبوں
اور محتاجوں پر پھر ظلم کرنے لگی اور بوڑھے ملاح کی پیشین گوئی
بھی بھول گئی۔

مگر دنیا کا قاعدہ ہے کہ "جو جیسا کرتا ہے ویسا ہی اس کے
آگے آتا ہے۔" شہزادی نے "کھانے کی چیز" کو سمندر میں پھنکوایا
تھا اور غریبوں پر ظلم کیے تھے، اس لیے اسے اس کی ان بڑی
باتوں کا تو بدلہ ملنا ضروری تھا۔

شہزادی کے سر پر پھر مصیبت کے بادل منڈلانے لگے۔
روز ایک نہ ایک نقصان ہونے لگا۔ آج محل کا کچھ حصہ گر پڑا،
تو کل آگ لگ گئی۔ کہیں اس کے جانور مر گئے۔ کہیں سوکھا پڑ
جانے سے لگان نہیں ملا اور کبھی چوری ہو گئی۔

غرض روز ایک نہ ایک مصیبت اور ایک نہ ایک پریشانی
لگی رہتی تھی۔ آخر دھیرے دھیرے تھوڑے ہی دنوں میں یہ نوبت
آ گئی کہ شہر استادرن کی سب سے زیادہ دولت مند اور گھمنڈی
شہزادی ٹکے ٹکے کی محتاج ہو گئی اور در در بھیک مانگنے لگی۔

شہر کے لوگ اپنی گھمنڈی شہزادی کو بھیک مانگتے دیکھتے
مگر کسی کو اس کی حالت پر رحم نہ آتا اور کوئی اسے بھیک بھی نہ
دیتا کیونکہ ان کو شہزادی کا سمندر میں گیہوں پھینکنے والا واقعہ یاد
تھا، اور وہ شہزادی کے ظلم سہتے سہتے اس کی صورت سے
نفرت کرنے لگے تھے۔

آخر وہ وقت بھی آ گیا کہ ایک روز صبح صبح سمندر کے
کنارے ایک عورت کی لاش پتھروں میں لپٹی ہوئی
پڑی ملی۔ ملاح لاش کو دیکھ کر دوڑ پڑے کہ دیکھیں کس کی
لاش ہے؟ قریب پہنچے تو دیکھا کہ اسی گھمنڈی شہزادی
کی لاش ہے جس نے ایک روز بوڑھے ملاح کے جہاز کا
سارا گیہوں سمندر میں پھینکوا دیا تھا۔

لوگوں کو بوڑھے ملاح کی پیشین گوئی یاد آ گئی، جس نے
شہزادی سے کہا تھا کہ: "یاد رکھیے کہ وہ وقت بھی جلد آنے
والا ہے جب آپ کو اپنے کیے پر پچھتانا پڑے گا اور بھوک
کی تکلیف اٹھانا پڑے گی۔"

بوڑھے ملاح کی پیشین گوئی پوری ہو گئی تھی۔ استادرن
کی خوبصورت اور گھمنڈی شہزادی فاقے کرتے کرتے
مر گئی تھی اور اس کی لاش پتھروں میں لپٹی ہوئی سمندر کے
کنارے پڑی ہوئی تھی ــــ اور لوگ اسے دیکھ دیکھ کر
سبق لے رہے تھے۔

★

ڈاکٹر شمیم انہونوی
صدر شعبۂ اردو حلیم ڈگری کالج
کانپور

ایک بڑے سائنسداں کی کہانی

بچو! آج ہم تم کو بیسویں صدی کے سب سے بڑے سائنس داں کا حال سناتے ہیں۔ اس کا نام البرٹ آئن سٹائن تھا۔ یہ ۱۴ مارچ ۱۸۷۹ء کو جرمنی کے ایک چھوٹے سے قصبہ اُلم میں ایک یہودی گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ ایک سال بعد اس کا باپ اُلم سے میونخ میں آ گیا اور وہاں اس نے بجلی کے سامان کی ایک دکان کھولی تھی۔ جب آئن سٹائن پانچ برس کا ہوا تو اس کے باپ ہرمن آئن سٹائن نے اسے ایک قطب نما دکھایا۔ اسے دیکھ کر اسے بہت تعجب ہوا اور اس نے اپنے باپ سے پوچھا کہ قطب نما کی سوئی کیوں اُتر کی طرف رہتی ہے۔ باپ کے جواب سے وہ مطمئن نہیں ہوا اور سمجھنے لگا کہ اس میں کوئی راز ہے۔ اس وقت سے اس کی سوچ بچار کی عادت پڑ گئی۔

لیکن اپنی اسکول کی تعلیم میں اس نے کوئی تیزی نہیں دکھائی۔ ایک مرتبہ اس کے باپ نے اسکول کے ہیڈ ماسٹر سے پوچھا کہ کون سا پیشہ اس کے لیے اچھا رہے گا؟ اس نے جواب دیا کہ "چاہے جس کام میں اسے لگاؤ یہ کسی کام میں کامیاب نہیں رہے گا۔"

اس کی ماں (پالین کا ش) موسیقی میں بہت دخل رکھتی تھی چنانچہ جب آئن سٹائن چھ برس کا ہوا تو اس کی ماں نے اسے وائلن بجانا سکھا دیا۔ یہ وائلن پھر اس کا عمر بھر کا ساتھی بن گیا۔ اور لطف یہ ہے کہ باجا بجاتے وقت بھی اس کا ذہن ریاضی کی گتھیوں کو سلجھانے میں لگا رہتا تھا۔

پہلے میونخ کے ایک پبلک اسکول میں اس کا نام لکھایا گیا۔ اسی زمانے میں ایک نوجوان روسی یہودی جو طب پڑھ رہا تھا، اس کے گھر آیا جایا کرتا تھا۔ اس نے اس کو بہت سی کتابیں دیں۔ ان میں دو تین ریاضی کی کتابیں بھی تھیں۔ ان کو اس نے بڑے شوق سے پڑھا اور بہت خوش ہوا۔

۱۸۹۴ء میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کے باپ کی دوکان میں خسارہ ہوا اس لیے وہ اٹلی چلا گیا اور وہاں مِلآن میں ایک نیا کارخانہ قائم کیا۔ البرٹ کو میونخ کے ایک ہاسٹل میں رکھ دیا گیا۔ اپنے اسکول میں وہ بہت سے ایسے سوالات اپنے استادوں سے اکثر پوچھ بیٹھتا۔ وہ جواب نہ دے پاتے اور ساتھی لڑکے اس کے سوالوں کا مذاق اڑاتے۔ کچھ عرصہ کے بعد اس نے وہاں پڑھنا چھوڑ دیا اور اپنے والدین کے پاس مِلآن چلا گیا۔ جرمنی کی شہریت بھی ترک کر دی۔ اٹلی کی آب و ہوا بہت پسند آئی اور وہ اٹلی کے تمام شہروں میں خوب گھوما لیکن ریاضی سے دلچسپی برابر قائم رہی۔

ایک دن اس کے باپ نے کہا کہ میرا کاروبار ٹھیک نہیں چل رہا ہے اس لیے اب میں تمہاری مدد نہیں کر سکتا۔ تمہارے لیے بہتر یہ ہوگا کہ کوئی پیشہ مثلاً بجلی انجینئرنگ سیکھو اور فلسفیانہ حماقتیں ترک کر دو۔ البرٹ کو یہ سن کر بڑا شاق ہوا لیکن اس نے ہمت نہ ہاری اور سوئزرلینڈ روانہ ہو گیا۔ وہاں آرَو کے مقام پر ایک اسکول میں داخلہ لیا۔ ایک سال میں ثانوی تعلیم کا ڈپلوما لیا۔ اس عرصے میں اس کا ماموں اس کے مصارف برداشت کرتا رہا۔ اس کے بعد زیورخ پالی ٹکنک میں داخلہ لیا جہاں وہ چار سال رہا۔ اگست ۱۹۰۰ء میں اس نے بی۔ اے کر لیا۔ اب اس نے ملازمت تلاش کرنا شروع کر دی۔

بے کاری کے دور میں بھی وہ طبیعیات پر مضامین لکھتا رہا جو جرمنی کے معیاری رسالوں میں چھپتے رہے۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں اسے سوئزرلینڈ کی شہریت مل گئی لیکن عارضی ملازمتوں کے علاوہ کوئی مستقل ملازمت نہ مل سکی۔ آخر کار ایک دوست کی مدد سے برن میں ایک ٹیکنیکل اسسٹنٹ کی جگہ ایک آفس میں ملی جس میں تنخواہ زائد نہ تھی۔

جون سنہ ۱۹۰۳ء میں اس نے اپنی ایک کلاس کی ساتھی ملیوا میرک سے شادی کر لی۔ وہ اس سے عمر میں ۴ سال بڑی تھی اور ہنگری کی رہنے والی تھی۔ اس کے دو بیٹے ہوئے لیکن اس کی گھریلو زندگی کچھ خوشگوار نہ تھی، بہرحال وہ گزر کرتا رہا اور اپنے تحقیقاتی مضامین شائع کرواتا رہا جن کے باعث اس کی شہرت بڑھتی رہی۔ اور جب سنہ ۱۹۰۵ء میں اس نے بتایا کہ مادہ کو حرارت میں کس طرح تبدیل کیا جا سکتا ہے، تب تو وہ بہت مشہور ہو گیا اور اسی مضمون کی روشنی میں تیس سال بعد امریکہ ایٹم بم بنا سکا۔

سنہ ۱۹۰۵ء ہی میں زیورخ سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری ملی سنہ ۱۹۰۹ء میں وہ زیورخ یونیورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسر ہو گیا لیکن اس کی شہرت پھیل چکی تھی چنانچہ اسی سال اسے اعزازی طور پر ڈی ایس سی کی ڈگری دی گئی۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں وہ پراگ یونیورسٹی میں پروفیسر مقرر ہو گیا۔ یہاں اس نے ایک بہت اہم مقالہ لکھا جس میں بتایا گیا تھا کہ جب روشنی کی کرن کسی مقناطیسی میدان سے گزرتی ہے تو اس میں کچھ کجی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس نے روشنی کی Quantum Theory (نظریۂ زیورخ) پر اپنا مقالہ یہیں مکمل کیا۔ پراگ میں ½ ۱ سال رہنے کے بعد البرٹ طبیعیات کا پروفیسر ہو کر اپنی پرانی درس گاہ (پالی ٹکنک) میں واپس آ گیا اس کی بیوی بھی زیورخ آنا چاہتی تھی۔

کچھ عرصہ بعد اپریل سنہ ۱۹۱۴ء میں اپنے بعض دوستوں کے کہنے سے وہ برلن میں قیصر ولیم انسٹی ٹیوٹ میں نظریاتی طبیعیات کا پروفیسر ہو کر چلا گیا لیکن اس کی بیوی کو وہاں کا ماحول پسند نہیں آیا اور وہ اپنے دونوں بیٹوں کو لے کر اگست میں زیورخ واپس چلی گئی۔ ادھر عرصے سے اس کے تعلقات البرٹ سے اچھے نہیں رہے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ شاید وہ خود علم طبیعات میں اپنے کو البرٹ سے کم نہیں سمجھتی تھی۔ شاید اس لیے وہ اس سے جلتی ہو۔ بہرحال چند سال بعد دونوں میں طلاق ہو گئی اور جب البرٹ نے اپنی خالہ زاد بہن الیسا سے شادی کر لی جو بیوہ تھی اور اس کے دو بیٹیاں تھیں۔ لیکن اپنی مطلقہ بیوی کی بھی کفالت کرتا رہا اور اپنی بیوہ ماں کی بھی جواب لوزرن میں رہنے لگی تھی۔

آئن سٹائن برلن میں بیس برس (۱۹۳۳-۱۹۱۳ء) تک رہا جہاں اس کی بڑی قدر و منزلت ہوتی رہی اور اپنے طلبہ میں بہت مقبول رہا۔ جنگ عظیم کے زمانے میں بھی وہ امن آشتی کی تبلیغ کرتا رہا۔ جرمنی کا حکمراں قیصر اس بات پر اس سے خفا ہو گیا مگر اس کو وہ اس لیے سزا نہ دے سکا کہ اس کی قومیت سوئزرلینڈ کی تھی۔

اگرچہ وہ سنہ ۱۹۰۷ء کے بعد ہی سے روشنی کی مقناطیسیت پر کام کر رہا تھا لیکن سنہ ۱۹۱۶ء میں وہ نظریۂ اضافیت کی تحقیق مکمل کر سکا۔ اسی نظریے کے ذریعہ معلوم ہو سکا کہ کائنات واقعات کے لیے صرف ایک پس منظر کا کام نہیں کرتی بلکہ خود مختار و خود کار ساخت ہے۔ اسی طرح تارہ عطارد کی چال اور ستاروں کی روشنیوں کے متعلق اہم نظریے پیش کیے جن کی تصدیق لورزن کے ہیئت دانوں کی سوسائٹیوں (رائل سوسائٹی اور دی رائل اسٹرانومی کل سوسائٹی) نے ۲۹ مارچ سنہ ۱۹۱۹ء کے سورج گرہن کے موقع پر کر کے اس کی صحت کا اعلان سنہ ۱۹۱۹ء میں کیا۔ اس سے آئن سٹائن کی بڑی شہرت ہو گئی اور ہر ملک سے اس کو دعوت نامے پہنچنے لگے اور سنہ ۱۹۲۱ء میں اسے نوبیل پرائز ملا۔ سنہ ۱۹۳۳ء میں آئن سٹائن امریکہ چلا گیا اور وہیں کی شہریت اختیار کر لی کیونکہ اسے ہٹلر سے خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ ہٹلر نے بعد میں یہودیوں کا قتل عام شروع کر دیا۔ چنانچہ سنہ ۱۹۳۳ء میں آئن سٹائن کے اس گھر کی تلاشی لی گئی جو برلن میں تھا اور اس کا جو روپیہ بینک میں تھا ضبط کر لیا گیا اور اس کی لائبریری جلا دی گئی اور اعلان کیا گیا کہ جو اسے مار ڈالے اسے ایک ہزار پاؤنڈ انعام ملے گا۔ اس کے نظریات کے خلاف ایک کتاب بھی شائع کی گئی۔ اکتوبر سنہ ۱۹۳۳ء میں آئن سٹائن ......

طبعیات کا پروفیسر ہو کر پرنسٹن میں بس گیا۔ دسمبر ۱۹۳۶ء میں اس کی بیوی ایلسا وفات پا گئی اور آئن سٹائن اپنے کو بہت تنہا محسوس کرنے لگا۔ خوش قسمتی سے اس کی بہن ماجا اور سوتیلی بیٹی مارگٹ آ گئیں جنھوں نے گھر کا کام کاج سنبھال لیا۔

۱۹۳۸ء کے آخری مہینوں میں جرمنی کے سائنس دانوں نے یورونیم دھات کے ایٹم (ذرّے) کو دو حصّوں میں توڑنے کا تجربہ کر لیا تھا اور اندیشہ پیدا ہو چلا تھا کہ کہیں ایٹم بم نہ بنا لے جس سے ہٹلر کو تمام دنیا تباہ و برباد کر دینے کا آلہ ہاتھ آ جائے گا۔ اس وقت آئن سٹائن نے سوچا کہ امریکہ کو اس معاملے میں جرمنی سے پیچھے نہ رہ جانا چاہیے۔ چنانچہ اس نے امریکہ کے صدر کو ایک خط لکھا کہ یورنیم دھات کو آتشی قوت میں تبدیل کیا جا سکتا ہے جو کسی شہر اور اس کے مضافات کو آناً فاناً تباہ و برباد کر سکتا ہے۔ اگر روز ولٹ ایک ایسا کارخانہ قائم کر دیں جہاں اس کے تجربے کیے جا سکیں تو بہت بہتر ہوگا۔ روز ولٹ نے یہ بات مان لی اور مانٹن ہٹن کے مقام پر ایسا کارخانہ کھول دیا گیا۔ چنانچہ جولائی ۱۹۴۵ء میں نیو میکسیکو میں پہلا ایٹم بم چھوڑنے کا تجربہ کیا گیا۔ اس پر آئن سٹائن کے دوستوں نے اسے بُرا بھلا کہا۔ اس نے جواب دیا میں امن پسند ضرور ہوں اور کسی حالت میں طاقت کا استعمال نہیں چاہتا سوائے اس کے کہ جب دشمن نے قتل و غارت کرنے کی پالیسی اختیار کر رکھی ہو۔

۱۹۴۸ء میں جرمنی کے اسی انسٹی ٹیوٹ نے جہاں آئن سٹائن نے بحیثیت ڈائرکٹر کے کام کیا تھا اس کو یہ لکھ کر درخواست کی کہ وہ اس کا بدیسی ممبر بن جائے۔ آئن سٹائن نے یہ اعزاز یہ لکھ کر قطعی نامنظور کر دیا کہ "جرمنی نے ایسے مظالم کیے ہیں جن کی مہذب دنیا میں مثال نہیں ملتی۔ یہودیوں کے قتل عام میں وہاں کے عام لوگ ہی نہیں وہاں کے دانشور بھی شامل تھے اور اب بھی انھیں اس بربریت پر کوئی ندامت نہیں ہے، نہ تلافی مافات کی خواہش۔ اس لیے میں جرمنی کی کسی پبلک کاموں میں شرکت سے میرے دل میں سخت نفرت کا جذبہ ہے۔"

آئن سٹائن ۱۹۴۵ء میں پرنسٹن کے ادارے سے سبکدوش ہو گیا لیکن پھر بھی وہ برابر اپنے گھر پر کام کرتا رہا۔ ۱۹۵۲ء میں ڈاکٹر وائزمین صدر جمہوریہ اسرائیل کی وفات کے بعد اسے وہاں کی صدارت کے لیے مدعو کیا گیا اور تمام آسانیاں دینے کا وعدہ۔ اس نے اسے شکریہ کے ساتھ قبول کرنے سے انکار کر دیا اور لکھ بھیجا کہ میں نیچر کے متعلق تھوڑا بہت تو جانتا ہوں لیکن انسانی فطرت کے متعلق میری معلومات کچھ بھی نہیں ہیں۔ آئن سٹائن نے ۱۸ اپریل ۱۹۵۵ء میں ایک پرسکون موت پائی۔ اس نے اپنی کامیابی کا راز یہ بتایا تھا کہ آدمی کو ذاتی تعریف سے بے پروا ہو کر صرف کام کرتے رہنا چاہیے کام کے سوا اور کوئی چیز لائق توجہ نہیں ہے۔

★

جس طرح صبح دن کی آئینہ دار ہوتی ہے اسی طرح عہدِ طفلی دورِ بلوغت کا غماز ہوتا ہے۔ ——— ملٹن

ڈاکٹر نیر مسعود
"ادبستان" دین دیال روڈ۔ لکھنؤ ۳

(ڈرامہ)

احتیاط شرط ہے

کام کرنے والے

ابّا : عمر تقریباً چالیس سال
امّی : عمر تقریباً تیس سال
کلیم : عمر دس سال
شبنم : عمر آٹھ سال
میرن صاحب : ابّا کے رشتے کے بھائی۔ دُبلے پتلے مگر پیٹو اور چٹورے
ایاز : نوکر
لاڈو : کلیم کی پالی ہوئی بلّی

پہلا منظر

(کھانے والا کمرہ۔ کھانے کی میز کے گرد ابّا، امّی، کلیم اور شبنم بیٹھے ہوئے ہیں۔ لاڈو کلیم کی گود میں ہے۔ کھانا ہو رہا ہے۔ کلیم کے ہاتھ میں کوئی رسالہ ہے۔)

ابّا : اب انڈے کھائے جائیں گے۔ (ایک پلیٹ اپنی طرف کھسکاتے ہیں اور سب کو ایک ایک اُبلا ہوا انڈا بانٹ دیتے ہیں۔) سوال یہ ہے کہ ادھر انڈے خوب ہو رہے ہیں۔ واللہ مرغیاں ہوں تو ایسی ہوں جیسی ہمارے یہاں ہیں۔ کیوں بیگم!

امّی : اے ماشاءاللہ پانچ چھ سے کم تو کسی دن ہوتے ہی نہیں'... اوئی کلیم! یہ کیا؟ یہ کھانا کھاتے کھاتے پڑھنا کہاں سے لے بیٹھے؟ بیٹا پہلے کھانا تو کھا لو۔ پھر پڑھنا اطمینان سے۔

ابّا : سوال یہ ہے کہ آپ کورس کی کتابوں سے تو بھاگتے ہیں اور الم غلم کہانیاں پڑھتے ہیں شوق سے! اب امتحان میں پاس ہوں گے تو کیونکر؟ ایک ہماری شبنم بیٹی ہے، ہمیشہ اوّل آتی ہے! اور ایک آپ ہیں، کہ دماغ میں بھرا ہوا ہے کوڑا نہیں، بلکہ کہانیاں! کیوں بیگم کیسی رہی؟ (ہنستے ہیں۔ کلیم رونی صورت بنا کر امّی کی طرف دیکھتا ہے۔)

امّی : اچھا اب اسے کہانی ختم ہی کر لینے دیجیے۔ بیچ میں ٹوکنے سے سارا مزا کرکرا ہو جاتا ہے۔

ابّا : ہوگا جی، ہمیں کیا۔ بڑے ہو کر خود ہی بھگتیں گے۔ ہاں میں کیا کہہ رہا تھا؟ بھلا دیا لے کے۔ (سر پر دو تین بار انگلی مار کر یاد کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔)

امّی : (شبنم سے) اور یہ تم کیوں منھ بنا رہی ہو شبنم؟ انڈا اس طرح کھا رہی ہو جیسے انڈا نہیں، کڑوا کریلا ہے!

شبنم : امّی اب ہم سے روز روز انڈے نہیں کھائے جاتے۔

ابّا : ٹھیک ٹھیک، یہی میں بھی کہنے جا رہا تھا۔ ہاں تو سوال یہ ہے کہ سادے انڈے کھاتے کھاتے جی بھر گیا ہے اب ان کی بننا چاہیے کوئی شاندار چیز! مثلاً، کیا کہتے ہیں، پُڈنگ حلوا یا ایسی ہی کوئی مٹھائی ـــ کیوں کیسی رہی؟

امّی : اے ہاں سچ تو ہے۔ لیکن اس کے لیے کوئی اچھی سی ترکیب

بھی تو معلوم ہونا چاہیے۔ وہ کس سے معلوم ہو؟ (کچھ دیر سوچتی ہیں) میرن بھائی کو حلووں کی بہت سی ترکیبیں معلوم ہیں۔ انھیں سے انڈے کے حلوے کی ترکیب بھی مل سکتی ہے
.... مگر.... (رُک جاتی ہیں)

ابّا : [خوش ہو کر] بالکل ٹھیک، بالکل ٹھیک۔ خوب یاد دلایا! بس پھر کیا ہے، میرن بھائی نے اس وقت آنے کو بھی کہا ہے۔ بس انھیں سے پوچھ لیں گے... مگر......
(رک جاتے ہیں) سوال یہ ہے کہ پھر انھیں بھی کھلانا ہوگا۔ اور وہ ٹھہرے مٹھاس کے شوقین! اور خوراک بھی ماشاءاللہ چار آدمیوں کے برابر! لاحول ولا قوۃ، کیا بے تکا پن ہے! بھائی موٹے تازے ہوتے تو خیر ہمیں بھی صبر آجاتا کہ چلو جیسی غذا ہے ویسا ہی ڈیل ڈول بھی ہے۔ مگر یہ کیا کہ صورت دیکھو تو پھونک مارے سے اڑ جائیں اور دسترخوان پر بیٹھیں تو رستم کو پچھاڑ دیں۔!

امّی : [دھیمی آواز میں] یہی سب سوچ کر تو میں بھی چپ ہو رہی تھی۔

[کلیم رسالہ بند کر کے لمبی سی سانس لیتا ہے اور آنکھیں مل کر ابّا کو دیکھنے لگتا ہے۔]

ابّا : [کچھ دیر سوچ کر۔] مگر سوال یہ ہے کہ مٹھائی تو بہرحال بننا ہے، گویا میرن بھائی کو بہرحال کھلانا ہے۔ (کمزور آواز میں) خیر، پھر یہی سہی۔

شبنم : مگر ہم تو اپنے حصّے کی مٹھائی میں سے کسی کو نہیں دینے گے۔

کلیم : [چونک کر] ابّا کیسی مٹھائی؟

ابّا : یہی انڈے کی مٹھائی۔ خیر آپ کا تو انڈوں سے جی ہی نہیں بھرتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ امتحان میں بھی ملے گا انڈا! کیوں بیگم کیسی رہی؟ (ہنستے ہیں)

کلیم : انڈا؟ (چونک پڑتا ہے) مگر میرا انڈا کیا ہوا؟ (ادھر اُدھر دیکھ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ لاڈو اس کی گود سے نیچے گرتی ہے) اُف! لاڈو کی بچی! کھا گئی میرا انڈا!!

شبنم : ارے تو کیا ہوا؟ آخر تمھاری چہیتی ہی نے تو کھایا!

کلیم : مار ڈالوں گا اس پاجی کو۔ (شبنم کو غصّے کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور لاڈو کو ایک لات مارتا ہے۔ وہ دور جا کر گرتی ہے۔ کلیم اس کے پیچھے لپکتا ہے)

ابّا : [کلیم کو روکتے ہوئے] ہَیں ہَیں!! وہ تو جانور ہے۔ تم خود ہی کب ہوش میں تھے۔ آج بلّی انڈا لے بھاگی، کل چوہا کان کتر لے جائے گا! کیوں بیگم کیسی رہی؟ (ہنستے ہیں) اچھا بیٹا، کبھی کلیم پہلوان۔ تم کو انڈے کی مٹھائی میں دُہرا حصہ ملے گا۔ بس اب تو خوش ہو؟

شبنم : [ٹھنک کر] تو پھر میں بھی دُہرا حصہ لوں گی۔

کلیم : کیوں؟؟ بڑی آئیں دہرا حصہ لینے والی۔

امّی : ارے چپ بھی رہو تم دونوں۔ سوت نہ کپاس، کوری سے لٹھم لٹھا۔ حلوا بنا نہیں اور حصّے بخرے ہونے لگے۔ جتنا جی چاہے کھانا۔ [ایاز داخل ہوتا ہے]

ایاز : حضور! میرن صاحب آئے ہیں۔

امّی : اچھا یہ برتن ہٹا لے جاؤ اور انھیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ۔

[ایاز برتن سمیٹنے لگتا ہے۔ پردہ گرتا ہے]

دوسرا منظر

[ڈرائنگ روم۔ صوفے اور کرسیاں قرینے سے لگی ہوئی ہیں۔ امّی ایک کرسی پر کاغذ اور قلم لیے بیٹھی ہیں۔ شبنم اور ابّا ایک صوفے پر، میرن صاحب دوسرے صوفے پر بیٹھے ہیں۔ کلیم ان کے قریب ہی بیٹھا ہے۔ میرن صاحب امّی کو حلوے کی ترکیب لکھوا رہے ہیں]

میرن صاحب : پہلے وزن لکھواتا ہوں۔ لکھیے، دودھ سیر بھر (امّی لکھنا شروع کرتی ہیں) بھینس کا دودھ ہونا چاہیے۔ انڈے تین عدد

......

کلیم : بس؟ تین ہی انڈے؟

شبنم : میرن چچا بھلا تین انڈوں میں کیا ہوگا!

میرن صاحب: بیٹا میں تو وزن کا اندازہ بتا رہا ہوں۔ جی چاہے تو سوا انڈوں کا حلوا بناؤ۔ مگر اسی حساب سے دوسری چیزوں کا وزن بھی بڑھانا ہوگا۔

کلیم: یعنی تین انڈوں کے لیے سیر بھر دودھ تو سوا انڈوں کے لیے .... (رک جاتا ہے)

شبنم: (تیزی سے) بتاؤ بتاؤ!! سوا انڈوں پر کتنا دودھ خرچ ہوگا؟

کلیم: تم مجھے حساب میں کمزور سمجھتی ہو؟ امی ذرا لائیے تو قلم!

شبنم: (ہاتھ اٹھا کر) جی اس کی شرط نہیں۔ کاغذ پر حساب لگا کر نہیں، یوں ہی زبانی بتائیے۔

میرن صاحب: (بگڑ کر) بیٹا یا تو سوال ہی حل کر لو اور یا ترکیب ہی لکھ جانے دو۔ بار بار قلم اچک لیا گیا تو لکھیں گی کیا خاک؟

امی: بھئی تم لوگ نچلے کیوں نہیں بیٹھتے۔ ہاں میرن بھائی؟ انڈے تین عدد ۔ ۔

میرن صاحب: شکر لکھیے ڈیڑھ پاؤ۔ گھی اگر اصلی ہو تو آدھ پاؤ، اور بناسپتی ہو تو تین چھٹانک۔ یہ تو ہوا اس کا سامان۔ اب ترکیب لکھیے —— پہلے انڈوں کی سفیدی اور زردی کو الگ الگ خوب اچھی طرح پھینٹنا جتنا زیادہ ان کو پھینٹا جائے گا اتنا ہی نفیس حلوا تیار ہوگا۔

شبنم: اسی طرح جیسے ایک مرتبہ دیوتاؤں اور راکھشسوں نے سمندر کو متھ کر امرت نکالا تھا۔ ہے نا کلیم؟ (کلیم کسی خیال میں کھویا ہوا ہے)

میرن صاحب: خیر خیر۔ اب اس زردی اور سفیدی کو اُبلے ہوئے دودھ میں ملا دیا، مگر دودھ گرم نہ ہو، اسی میں شکر اور گھی بھی ڈال دیا۔ ان سب کو ملا کر بھی تھوڑی دیر تک پھینٹا۔ پھر اس سب کو تیز آنچ پر چڑھا دیا ....

شبنم: کسی برتن میں رکھ کر؟

میرن صاحب: (پھر خفا ہو جاتے ہیں) اور نہیں تو کیا یوں ہی چولھے میں جھونک دیا جائے گا؟

ابّا: (ہنسی روک کر) شبنم تو خاموش نہیں رہے گی؟

میرن صاحب: دیکھو ہمارا کلیم کیسا چپ چاپ بیٹھا ہے!

کلیم: (ایک دم اچھل پڑتا ہے) تینتیس سیر، ایک پاؤ، ایک چھٹانک، ایک تولہ اور آٹھ ماشے!

میرن صاحب: (چکرا جاتے ہیں) ایں! یہ کیا بکواس؟ (شبنم کھکھلا کر ہنس پڑتی ہے)

کلیم: (جھینپ کر) سوا انڈوں پر اتنا دودھ خرچ ہوگا۔ (سب قہقہہ مار کر ہنسنے لگتے ہیں)

میرن صاحب: اچھا! تو یہ کہیے۔ آپ اسی کا حساب لگا رہے تھے! جبھی تو میں حیران تھا کہ یا اللہ! یہ کلیم چپ شاہ کا روزہ کیوں رکھے ہوئے ہیں!

امی: مگر دیکھیے آخر اس نے یہ سوال زبانی حل کر ہی لیا! ہاں تو میرن بھائی! تیز آنچ پر چڑھا دیا، پھر....؟

میرن صاحب: اب اس کو برابر چلاتے رہنا چاہیے....

کلیم: (تعجب سے) چلاتے رہنا چاہیے؟ میرن چچا کیا یہ حلوا بھی کسی پہیوں دار برتن میں بنایا جائے گا؟ (امی سے ہنسی ضبط نہیں ہو پاتی)

میرن صاحب: (بالکل ناراض ہو جاتے ہیں) تم لوگوں کے سامنے تو زبان کھولنا دوبھر ہو جاتا ہے!

ابّا: کلیم! خدا کے لیے تم کوئی دوسرا سوال لگاؤ اور میرن بھائی کو ترکیب لکھا لینے دو۔ (میرن صاحب سے) میرن بھائی! ان لوگوں کی بات کا بُرا نہ مانیے، ابھی بچے ہیں۔

میرن صاحب: (فوراً من جاتے ہیں) نہیں نہیں! اے لو۔ بھلا میں ان کا بُرا مانوں گا؟

شبنم: کلیم! میرن چچا کا مطلب تھا کہ حلوے کو کفگیر سے چلاتے رہنا چاہیے۔

امی: میرن بھائی! اس کے بعد؟

میرن صاحب: اگر اس میں ابال آنے لگے تو دم بھر کے لیے نیچے اتار کر پھر چولھے پر چڑھا دیا جائے۔ اب جب دیکھا کہ حلوا

گاڑھا ہوگیا ہے تو آنچ دھیمی کر دی۔ جب رنگ ہلکا بادامی ہوگیا اور گھی کے چھینٹے اڑنے لگے تو اتار لیا۔ ایک بڑی سینی لی، اس پر گھی مل دیا۔ حلوا اتار کر اس میں انڈیل دیا، کفگیر سے برابر برابر پھیلا دیا، اور اوپر سے چاندی کا ورق بچھا دیا۔۔۔ (ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہیں) اے لو، حلوا تیار!۔۔۔۔ (ہاتھ ملتے ہیں)۔۔۔۔ ٹھنڈا ہونے پر نوش جان۔۔۔۔ اگر اس پر سے ایک رات گزر جائے تو۔۔۔ (تھوک نگلتے ہیں)۔۔۔۔ تو اور قیامت کا مزہ ہو جائے، وہی مثل کہ ایک تو کریلا کڑوا۔۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ ایک تو۔۔۔۔ اونہہ۔۔۔۔ (گڑبڑا جاتے ہیں اور جیب سے بیڑی نکال کر سلگانے لگتے ہیں)

ابّا : یوں کہیے میرن بھائی کہ ایک تو انگور میٹھا، پھر وہ بھی قلمی آم چڑھا! کیوں بیگم کیسی رہی؟ (ہنستے ہیں)

میرن صاحب : [سنی ان سنی کرکے] مگر یاد رہے کہ جتنا بڑا گھان اتارا جائے، میرا مطلب ہے کہ ایک مرتبہ میں جتنا حلوا بنایا جائے، اتنا ہی مزہ بڑھتا ہے۔ (ابّا مسکرانے لگتے ہیں)

امّی : اچھا میرن بھائی! یہ تو بتایئے کہ آپ نے خود بھی کبھی یہ حلوا بنا کر کھایا ہے؟

میرن صاحب : بھئی کیا بتاؤں۔ دراصل انڈوں کی وجہ سے اس میں خرچ زیادہ بیٹھتا ہے۔ ہاں ایک مرتبہ چھبّو صاحب نے البتہ مجھ سے ترکیب پوچھ کر بنوایا تھا۔ تبرکاً تھوڑا سا ایک طشتری میں مجھے بھی بھجوا دیا تھا۔ مشکل سے آدھ پاؤ ہوگا۔ یہاں اتنے میں ڈاڑھ بھی گرم نہیں ہوتی۔ مزہ تو غضب کا تھا! (پھر تھوک نگلتے ہیں) مگر اچھا یہ تھا کہ نہ بھیجتے۔ واللہ طبیعت ترس کر رہ گئی! جی بھر کر کھانے کی حسرت ہی رہی۔ خیر یہ حسرت یہاں پوری ہو جائے گی۔ (ہاتھ ملتے ہیں) انشاء اللہ! (امّی رومال سے اپنا منھ پونچھتی ہیں)

ابّا : ہاں تو میرن بھائی! یہ حلوا کل بنایا جائے گا اور پرسوں ناشتے میں کھایا جائے گا۔ (میرن صاحب پھر تھوک نگلتے ہیں) تو پھر پرسوں آپ ناشتہ ہمارے ہی ساتھ کیوں نہ کیجیے؟

میرن صاحب : بھائی بات دراصل یہ ہے کہ ادھر مجھے کچھ معدے کی تکلیف پیدا ہو گئی ہے۔ اس لیے میں ناشتہ تو کرتا نہیں، کھانا ہی ذرا سویرے کھا لیتا ہوں، وہ بھی کبھی کبھار۔

ابّا : [سر جھکا کر، دھیمی آواز میں] اچھا تو کھانے ہی پر سہی۔ (کنکھیوں سے امّی کی طرف دیکھتے ہیں) آپ تو پرہیزی کھاتے ہوں گے؟

میرن صاحب : ارے خیر اس تکلف کی کیا ضرورت ہے؟ پھر نہ معلوم کیوں نمکین کھانے سے تو بالکل ہی طبیعت ہٹ گئی۔ مٹھاس ہی پر گزر اوقات ہے! بس جتنا کھایا جا سکے گا حلوا ہی کھا لوں گا (ابّا رومال سے اپنا منھ پونچھتے ہیں)

[کچھ دیر خاموشی رہتی ہے۔ آخر امّی ایاز کو آواز دیتی ہیں]

امّی : ارے ایاز!! بچّوں کا دودھ لے آؤ۔

ایاز : [باہر سے] لایا بیگم صاحب!!!

کلیم : میرن چچا! اس حلوے میں زعفران تو آپ نے بتائی ہی نہیں؟

شبنم : اور کیوڑا بھی نہیں پڑے گا؟

میرن صاحب : ارے توبہ کرو! اس میں تو خود وہ سوندھی مہک ہوتی ہے (ہاتھ ملتے ہیں) کہ اس پر سے کیوڑے کی سو بوتلیں نچھاور! سمجھیں بیٹی شبنم، اور زعفران کا پورا کھیت قربان سمجھے میاں کلیم؟

[اندر سے کسی برتن کے گرنے اور ساتھ ہی ایاز کے چیخنے کی آواز آتی ہے]

ابّا : [چونک کر] ہیں!!؟ یہ کیا ہوا!؟ (آواز دیتے ہیں) کیا ہوا ایاز؟

[ایاز ایک خالی پتیلی ہاتھ میں لیے بڑبڑاتا ہوا داخل ہوتا ہے]

ایاز : حضور اس لاڈو نے تو ناک میں دم کر رکھا ہے۔ دیکھیے بیگم صاحب آپ کے سامنے نعمت خانے میں یہ دودھ کی پتیلی رکھی تھی اور کنڈی تو آپ نے اپنے ہاتھ سے لگائی تھی مگر یہ بلی! ارے غضب بے بھتنی!! پنجوں سے کنڈی کھول لی۔ میں کہوں ' آئیں!! یہ کنڈی کس نے کھولی؟ اب ہاتھ جو اندر ڈالتا ہوں تو "پھوں" کر کے بھاگی، اور کلائی پر کھرونچا مارا، وہ گھاتے میں! (کلائی دکھاتا ہے) اور ابھی کیا ہے، کچھ دن میں تالے نہ توڑنے لگے تب کی سند...!

میرن صاحب : [بھنویں چڑھا کر گنگناتی ہوئی آواز میں] بھائی!! یہ تو گڑبڑ ہے! حلوا ذرا سنبھال کر رکھا جائے، ورنہ کہیں یہ کی کرائی محنت ملیامیٹ نہ کر دے۔ ہاں! احتیاط شرط ہے!!

ابا : اجی کیا بات کرتے ہیں میرن بھائی! میں اس قطامہ کو کہیں بند کر دوں گا۔ چلتے تک نہ دوں گا۔

میرن صاحب : ہاں بھائی! احتیاط شرط ہے۔ (اٹھ کھڑے ہوتے ہیں) اچھا اب چلنا چاہیے۔ پرسوں سویرے آٹھ بجے تک آؤں گا۔ انشاء اللہ۔ اچھا خدا حافظ۔

[جاتے ہیں]

کلیم اور شبنم : [ایک ساتھ] خدا حافظ میرن چچا!!

میرن صاحب : [باہر سے] جیو بیٹا، سلامت... اررر...

(لڑکھڑانے اور بلی کے پھنکارنے کی آواز آتی ہے)....

لاحول ولا قوۃ..... کیسی صورت حرام بلی ہے! توبہ کم بخت پاؤں کے نیچے آئی جاتی ہے!

[آواز دور ہوتی چلی جاتی ہے۔ پردہ گرتا ہے]

تیسرا منظر

[دوسرا دن۔ رات کا وقت۔ سونے والا کمرہ۔ ایک سینی میں حلوا تیار رکھا ہے۔ شبنم اور امی اس پر چاندی کے ورق لگا رہی ہیں۔ کلیم لاڈو کو پکڑے بیٹھا ہے]

کلیم : [لاڈو کو ایک چپت مارتا ہے] بیٹھ چپکی۔ امی یہ تو بڑا زور لگا رہی ہے!

شبنم : [ہنستی ہے] زور کیوں نہ لگائے گی۔ ندیدے کی بلی بھی ندیدی! میں نے پالی ہوتی تو کھانے کی طرف مڑ کے بھی نہ دیکھتی۔

کلیم : چپ!! امی دیکھ لیجئے اس کو!

امی : اے شبنم! تو اس کو بہت ستاتی ہے۔ ہمارا کلیم ندیدہ کیوں ہونے لگا؟

شبنم : اللہ امی آپ کو تو کچھ معلوم ہی نہیں ہوتا۔ مجھ سے پوچھیے کلیم کا حال سوتے میں حلوا سمجھ کر تکیے کا آدھا غلاف چبا گیا۔ اور پوچھو تو کہا کیا ہے (کلیم کی سی آواز بنا کر) "تیزاب گر گیا ہوگا" بتائیے بھلا وہاں تیزاب کہاں سے آیا؟

کلیم : [چیختا ہے] تیزاب کی بچی!! تیزاب نہیں تو اور کیا تھا؟ امی میں اس کو مار دوں گا! (تیزی سے اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ ڈھیل پا کر لاڈو چھوٹتی ہے اور چھوٹتے ہی جست لگا کر سیدھی سینی کے قریب جا کر گرتی ہے۔)

شبنم : [چیخ مار کر] امی، روکیے اسے!!

امی : [لاڈو کو دبوچتی ہیں] اے ہے مُردی!! نتھنوں میں دم کر دیا ہے کم بخت نے! (دروازے کی طرف اچھال دیتی ہیں)

[ابا داخل ہوتے ہیں۔ چاندی کا ورق لگی ہوئی لاڈو ان کے کالر میں لٹک جاتی ہے]

ابا : [بوکھلا جاتے ہیں] ہیں ہیں!! ارے... لاحول ولا قوۃ۔ (لاڈو کو دروازے کے باہر پھینک دیتے ہیں ایاز کے چیخنے کی آواز آتی ہے)

ایاز : [باہر سے] دھت تیرے کی.....!! سارا سالن خراب کر دیا!! دیکھ لیا بیگم صاحب؟ اس بلی نے تو سر کش اوں

کومات کر دیا ہے۔ اندر کمرے سے چھلانگ مار کر یہاں پہنچی!
..... اور یہ چاندی کا ورق..... ! [illegible]...؟

ابّا : [جھینپ کر کان کھجانے لگتے ہیں] او [illegible] ایاز کا تو مجھے خیال ہی نہیں رہا۔ ۔ ۔ (ایک دم تیوریاں چڑھا کر) مگر یہاں کیا جھگڑا ٹنٹا ہو رہا تھا؟

کلیم اور شبنم : (ایک ساتھ) ابّا! دیکھیے ...

ابّا : (جھنجھلا جاتے ہیں) کچھ نہیں دیکھوں گا جی۔ میں کہتا ہوں تم لوگوں کو کمینوں کی طرح لڑتے شرم بھی نہیں آتی؟ بھلے آدمیوں کے بچے..... (حلوے کی سینی دیکھ کر ایک دم رک جاتے ہیں)... اہاہ! ۔ ۔ ۔ (زور سے سانس کھینچتے ہیں) ارے ابھی تیار!؟ (پھر سانس کھینچتے ہیں) واللہ! کیا نفیس خوشبو ہے!!

امّی : ورق بھی لگا دیے گئے۔ اب اس کو کہیں احتیاط سے رکھ دیا جائے۔ لاڈو آج کل بہت لاگو ہو رہی ہے۔

شبنم : جی ہاں! کلیم کی بلّی ہے نا! (ہنس کر چپ ہو جاتی ہے)

کلیم : ابّا دیکھ لیجیے!!

ابّا : شبنم! میں دیکھتا ہوں لڑائی میں تو ہی ہمیشہ پہل کرتی ہے۔ بالکل اپنی امّی کی طرح! کیوں بیگم کیسی رہی؟ (ہنستے ہیں)

امّی : (مسکراتی ہیں) اوئی یہ مجھ نگوڑی کو کیوں بیچ میں گھسیٹ لائے!

ابّا : (قہقہہ لگاتے ہیں) اچھا خیر، یہ تو سب مذاق تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ واقعی حلوا کہاں رکھا جائے؟
[ایاز لاڈو کو لیے ہوئے داخل ہوتا ہے]

امّی : اسے نعمت خانے کے سوا اور کہاں رکھا جا سکتا ہے؟ بس اس میں قفل ڈال دیں گے۔

ایاز : بیگم صاحب! اللہ قسم! نعمت خانے میں آپ چاہے تالا ڈال لیں، چاہے اینٹوں سے چنوا دیں، لاڈو اسے کھول ضرور لے گی۔ پھر میرا نام نہ لگایا جائے کہ تو نے حلوا پار کر دیا۔ یہ میں پہلے ہی سے جتائے دیتا ہوں!

ابّا : لو بھیا ایاز! ہمیں تمھارا ارادہ معلوم ہو گیا۔ اب بھلا نعمت خانے میں حلوا کیونکر بچ سکتا ہے؟ جبکہ یہ بڑا ابلا، بلکہ اود بلاؤ، کھانے پر لاگو ہو جائے! کیوں بیگم کیسی رہی؟ (ہنستے ہیں)

ایاز : (ہنسنے لگتا ہے) ہی ہی ہی... صاحب بھی ہمارے خوب مزاخ کرتے ہیں! لو کلیم میاں، سنبھالو اپنی مہارانی کو۔
[لاڈو کو کلیم کے ہاتھ میں دے کر چلا جاتا ہے]

امّی : واقعی نعمت خانے میں رکھنا تو ٹھیک نہیں۔ اس کی جالی میں چھید ہیں اور ادھر نیولے بھی موئے فوج کی فوج آنے لگے ہیں۔ وہ کاہے کو چھوڑنے لگے؟

ابّا : پھر کیا کیا جائے؟ (سر پر انگلی مارتے ہیں) لاڈو کو کون روکتا ہے۔ (ایک دم خوش ہو کر) بھئی اچھی ترکیب سمجھ میں آئی!! اسی میں کلیم اور شبنم کی ہوشیاری کا مقابلہ بھی ہو جائے گا۔ پوچھو وہ کیونکر؟ وہ اس طرح کہ حلوا تو کلیم چھپا کر رکھیں!... اور لاڈو کو شبنم کہیں بند کریں!! کیوں بیگم.....

کلیم اور شبنم : (خوش ہو کر) ہاں ہاں ابّا!!

ابّا : بس تو پھر، میاں کلیم! آپ کہانیاں بہت پڑھتے ہیں۔ اٹھائیے حلوے کی سینی اور اسے یوں چھپا آئیے جیسے کوئی کنجوس مکھی چوس اپنے روپے چھپا کر رکھتا ہے!
[کلیم سینی اٹھا کر مسکراتا ہوا چلا جاتا ہے۔ لاڈو کو شبنم لے لیتی ہے]

امّی : ترکیب تو آپ نے بڑی نرالی سوچی!

شبنم : دیکھیں کلیم حلوا کہاں رکھتا ہے! اچھا ابّا، جو مقابلے میں جیتے اسے انعام بھی تو ملنا چاہیے؟

ابّا : کیوں نہیں، کیوں نہیں۔ ایک روپیہ اور حلوے میں سے زیادہ حصّہ!
[کلیم واپس آتا ہے۔ مسکرا رہا ہے]

کلیم : ابّا ایسی جگہ چھپایا ہے کہ...

ابا : [بات کاٹ کر] ...... کہ کل خود تم کو بھی ڈھونڈھے سے
نہ ملے گا! کیوں بیگم کیسی رہی؟ (ہنستے ہیں) اچھا اب
شبنم بیٹا! آپ کی باری ہے۔ آپ بی لاڈو کو یوں بند
کیجیے جیسے دس مرتبہ کے بھاگے ہوئے چور کو پولیس بند
کرتی ہے!

امّی : ہاں بیٹی! خوب حفاظت سے بند کرنا۔

کلیم : مگر دیکھو، میری لاڈو کو کوئی تکلیف نہ پہنچنے پائے۔

شبنم : [چڑھاتی ہے] جی نہیں! میں تو انھیں حلوا کھلاؤں
گی۔ اسے کیا تکلیف پہنچ سکتی ہے؟ بے غیرت سے،
ڈھیٹ کہیں کی۔ [کلیم کے کچھ بولنے سے پہلے ہی لاڈو
کو لے کر چلی جاتی ہے]

[کچھ دیر خاموشی رہتی ہے]

امّی : میرن بھائی نے تو کہا ہے کہ وہ صرف حلوا ہی کھائیں گے!

ابا : [بُرا سا منھ بنا کر] کیا مصیبت ہے! ایسا حلوا اصل (ان) میں
تو میری نظر سے گزرا ہی نہیں۔ اور مٹھاس تو اس کا اوڑھنا
بچھونا ہے!

[شبنم واپس آتی ہے]

امّی : کیا بند کر آئیں بھئی؟

شبنم : جی ہاں۔ اب دیکھنا ہے کس طرح حلوا کھاتی ہیں بی لاڈو!

ابا : ہاں یہی تو دیکھنا ہے۔

ایاز : [دور سے] حضور کھانا لگ گیا ہے۔

[سب اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ پردہ گرتا ہے]

چوتھا منظر

[دوسرا دن۔ کھانے والا کمرہ۔ امّی، ابا، کلیم، شبنم
اور میرن صاحب کھانا کھا رہے ہیں]

میرن صاحب : ترکیب تو واللہ خوب نکالی! ادھر بلّی بند، ادھر
حلوا بند۔ دونوں بچوں نے بھی مقابلے کے شوق میں اپنا
پورا زور لگا دیا ہوگا۔ ہے نا؟ لیکن اب دیر کیا ہے؟
حلوا نکال کر دسترخوان پر رکھ دیا جائے۔ جب تک
ٹھنڈا ہو۔

امّی : آپ کی بھی میرن بھائی کیا باتیں ہوتی ہیں! ارے رات
کا بنا ہوا حلوا، موا اب تک گرم ہی ہوگا؟

میرن صاحب : [جھینپ جاتے ہیں] میرا مطلب تھا ذرا دیکھوں
تو کیا رنگ ہے! ..... کیسی خوشبو ہے! ..... کیسا
تاؤ رہا! ..... (تھوک نگلتے ہیں)

ابا : اب اکٹھا ہی دیکھ لیجیے گا۔ مگر یہ کیا حضرت!؟ آپ تو
ہاتھ روکے بیٹھے ہیں؟ (گھور کر) خدا کے لیے کچھ تو
کھا لیجیے!

میرن صاحب : بھائی کھا تو رہا ہوں۔ اور میں نے تو پہلے ہی کہہ
دیا تھا کہ ادھر نمکین کھانا میرے حلق سے اترتا ہی نہیں۔
کوئی مٹھائی ہوتی تو البتہ ایک آدھ ڈلی منھ میں ڈال بھی
لی۔ جناب ایمان قسم! چار وقت سے ایک کھیل بھی اڑ
کے منھ میں نہیں گئی ہے۔ بھوک ہی بند پڑی ہے اور
اس وقت جو تھوڑی بہت لگ بھی رہی تھی۔ وہ یہ دال
سالن دیکھ کر اڑی جا رہی ہے.... (بے چینی سے پہلو
بدلتے ہوئے) ارے صاحب آپ لوگ بہت ڈھیرے
ڈھیرے کھانا کھاتے ہیں۔ بھلا اس میں بھی کچھ دیر لگتی
ہے؟ ادھر کھانا لگا، ادھر دسترخوان بڑھا، یوں...
(چٹکی بجاتے ہیں) تو بھئی حلوا نکلوائیے.... (کچھ سوچتے
ہیں) بات یہ ہے کہ دیر تک بند رہتا ہے تو مزے میں
فرق آجاتا ہے.... ہاں اور کیا!

امّی : لیجیے بس ہم کھا چکے۔ (آواز دیتی ہیں) ایاز یہ برتن
اٹھاؤ!!!

[ایاز آ کر برتن سمیٹ لے جاتا ہے]

ابا : ہاں بھائی.... (پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہیں) جاؤ
بیٹا کلیم! حلوا نکال کر لے آؤ۔ (کلیم جانے لگتا ہے)

امّی : ٹھہر بیٹے تو.... (میرن صاحب برا سا منھ بنا کر امی
کو دیکھتے ہیں) ... کلیم ذرا ٹھہرنا تو! (کلیم رک جاتا ہے)

لاڈو بے چاری رات بھر بند رہی ہے۔ غریب بھوک سے تڑپ رہی ہوگی۔ میرے خیال میں پہلے اس کو نکال کر دودھ پلا دیا جائے۔ اے ہاں سب تو مزے سے کھائیں اور وہ بے زبان ترسے! (میرن صاحب سر پکڑ لیتے ہیں)

ابا: اوہو!! آج تو لاڈو پر بڑا پیار آرہا ہے! (میرن صاحب کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہیں) مگر تم نے ٹھیک ہی کہا۔ جاؤ بیٹی شبنم! تم لاڈو کو نکال لاؤ۔ (ایاز کو آواز دیتے ہیں) ارے ایاز!! لاڈو کے لیے دودھ لے آؤ۔

(شبنم جاتی ہے۔ ایاز دودھ کا پیالہ لے کر آتا ہے)

(کچھ دیر کے بعد شبنم لاڈو کو لیے ہوئے آتی ہے)

میرن صاحب: (منھ بھیڑ لا ہوا ہے) ہو بہو ان کا ووزخ یا ٹو!

(کلیم دودھ کا پیالہ لاڈو کے منھ سے لگاتا ہے۔ لیکن وہ منھ ہٹا لیتی ہے)

ابا: (قہقہہ لگاتے ہیں) بھئی یہ خوب رہی! بی لاڈو اس بات پر روٹھ گئی ہیں کہ ان کو چور سمجھا گیا! کیوں بیگم کیسی کہی؟ (ہنستے ہیں)

میرن صاحب: (جل کر) جب اتنا سر چڑھائی جائے تو نخرے کیوں نہ بگھارے گی۔ پھینکو جی اسے، اور لاؤ حلوا۔

امی: ہاں بیٹا کلیم لے آؤ (کلیم لپک کر جاتا ہے) بات یہ ہے کہ رات بھر بند رہی نا؟ اس سے کچھ طبیعت ماندی ہو گئی ہوگی۔ اس کی تو عادت ہے کہ رات بھر ایک کوٹھے سے دوسرے ......

(کلیم کے چیخنے کی آواز آتی ہے۔ سب چونک پڑتے ہیں۔ کلیم حلوے کی سینی لیے ہوئے داخل ہوتا ہے۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں)

ابا: کیا ہوا! کیا ہوا!! (کلیم کے قریب جاتے ہیں) ...ہیں!! یہ سب حلوا کیا ہو گیا! .. ..؟..... اس میں تو شکل سے آدھا پاؤ رہ گیا ہے!

امی: اے ہے!؟ دیکھوں تو! (سینی کلیم سے لے لیتی ہے) اے سچ تو ہے.... ! اور یہ صاف بلی کا کھایا ہوا (میرن صاحب پھٹی پھٹی آنکھوں سے سینی کی طرف دیکھ رہی ہیں)

ابا: (بیٹھی ہوئی آواز میں) بلی ... ؟ بلی سوائے لاڈو اور کون آتی ہے؟ (چونک کر) اور اسی لیے لاڈو دودھ نہیں پی رہی ہے! (شبنم سے) یہ تو نے معلوم ہوتا اسے ٹھیک سے بند نہیں کیا تھا!!

شبنم: (مجبور کر) ابا میں نے تو بہت مضبوطی سے بند کیا تھا۔ ابھی وہیں سے نکال کر لا رہی ہوں۔

ابا: خاک مضبوطی سے بند کیا تھا! (چلا کر) بتا کہاں بند کیا تھا؟

شبنم: (رو دیتی ہے) دوسرے دالان کی کوٹھری میں جو کالا صندوق ہے، اس میں ....

کلیم: (چیخ پڑتا ہے) کیا؟؟ (زور زور سے رونے لگتا ہے)

ابا: (گرج کر) اب رو کیا رہے ہو؟؟ حلوا تم نے کس جگہ رکھا ہوگا.... کہاں رکھا تھا آخر؟؟

کلیم: (سسکیاں بھرتے ہوئے) .... اسی ... کالے .. صندوق .... میں .... !!

ابا اور امی: (ایک ساتھ) .... ہائیں!!!

میرن صاحب: (ہاتھ پیر ڈھیلے ہو جاتے ہیں) مر گئے ....!!

(امی کے ہاتھ سے سینی چھوٹ جاتی ہے۔ میرن صاحب بلبلا کر اسے روکنے کے لیے لپکتے ہیں۔ مگر سینی زمین پر آ جاتی ہے۔ میرن صاحب بھی کچھ دیر تک لہرانے کے بعد بے ہوش ہو کر لاڈو پر گر جاتے ہیں۔ لاڈو چیختی ہے۔ پردہ گرتا ہے)

★

ڈاکٹر کرشن گوپال مغموم
۲۱۴۴ - سیکٹر ۲۰ ڈی - چنڈی گڑھ - یو ٹی

دیش کے بچوں سے

مبارک تم کو بچو! یہ "نیا سال" — یہی ہے، ہاں یہی ہے "سالِ اطفال"
یہ دنیا میں منایا جا رہا ہے — تمھیں اونچا اٹھایا جا رہا ہے
تمھارے حال کی پاکر خبر اب — پڑی ہے قوم کی تم پر نظر اب
تمھاری ماہیت جانی گئی ہے — تمھاری قدر پہچانی گئی ہے
نہ اب تم سے کوئی غفلت کرے گا — نہ اب تم سے کوئی نفرت کرے گا
تمھیں ہو کل کے شہری، کل کے رہبر — تمھیں ہو دیش کا اپنے مقدر
تمھیں ہو آئینہ اپنے وطن کا — تمھیں سے رنگ نکھرے گا چمن کا
حکومت نے اٹھایا ہے یہ بیڑا — تمھیں موقع ملے گا اُنتی کا

دوا دارو ہو یا اچھی غذا ہو — بہم ہوگا وہی جس سے بھلا ہو
وہ مکتب ہو کہ ہو کھیلوں کا میدان — دکھاؤ جوہر ہمت، بڑھے شان
غلاظت میں نہ اب تم سانس لوگے — فضائے صاف میں اب تم رہوگے
اگر تم میں کوئی معذور ہوگا — نحیف و ناتواں مجبور ہوگا
اسے دے گی حکومت طبی امداد — علاج مفت سے ہوگا وہ دلشاد
نظر میں جبکہ ہے اک اک ضرورت — ملے گی تم کو ہر ممکن سہولت
محبت کی فضا تم کو ملے گی
نئی آب و ہوا تم کو ملے گی

بچو! سنو کہانی سچّی

حیاتؔ وارثی
باغ مولوی انوار
لکھنؤ ۳

ہوم ورک جب ختم ہوا تو کہنے لگیں غزالہ
گڈّو اور حمیرا نے بھی گھیر لیا خالہ کو
خالہ بولیں سنو شباہت تم بھی سچا قصّہ
تھا وہ ایسا دور کہ مشکل کام تھا پڑھنا لکھنا
رخصت ہو کر اپنی ماں سے علم کا وہ پروانہ
اہلِ قافلہ کو رستے میں راہزنوں نے گھیرا
کیا ہے تمھارے پاس ہمیں سچ سچ فوراً بتلاؤ
اعتماد سے بچہ بولا ہیں چالیس دینار
ہوتے گر دینار تو کیسے یہ ہم کو بتلاتا
لوٹ مار جب ختم ہوئی تو ہوتے وہ ڈاکو یکجا
میں نے پوچھا اس سے کیا ہے پاس تمھارے بولو
حکم دیا سردار نے جا کر اس بچے کو لاؤ
دیکھ کے اس بچے کو بولا وہ رہزن سردار
بچہ بولا پہلے ہوئے ہیں گدڑی میں دینار
ڈاکو بولا اے بچے تم ہو کتنے معصوم
تم نے اپنی سادہ لوحی سے خود روپیہ کھویا
بچہ بولا، اپنی ماں سے کیا تھا میں نے وعدہ
روپیہ پیسہ چیز ہے کیا سردار میں سچ کہتا ہوں
بچے کی باتوں سے دل پر ضرب لگی وہ کاری
ایک کرن سے اندھیارے کا سارا جادو ٹوٹا
سوچا یہ سردار نے دل میں میں بھی ہوں کیا انساں
حرص و ہوس کے ہاتھوں میں نے ساری عمر گنوائی
حکم دیا سردار نے سب کا مال ابھی لوٹاؤ
بھٹکے راہی راہ پہ آئے قلب ہوا آئینہ
سچ آخر زیبا بولی اچھا ہے یہ قصّہ
سچ کی کرنوں سے غم کے اندھیارے چھٹ جاتے ہیں
سچائی ہر مشکل کو آسان بنا دیتی ہے
محنت سے تم پڑھو لکھو اور دنیا کو بتلاؤ
نام بتا کر اس بچے کا پوری کریں کہانی

کوئی کہانی ہمیں سنائیں میری اچھی خالہ
کہنے لگیں شگفتہ ردولی اور صبوحی بیٹھو
تھا گیلان کا رہنے والا اک چھوٹا سا بچہ
علم سیکھنے کی خاطر کوسوں تھا جانا پڑتا
ایک قافلے میں شامل ہو کر وہ ہوا روانہ
اس بچے کے پاس بھی آیا اک خونخوار لٹیرا
ڈاکو بولا، روپیہ دے کر اپنی جان بچاؤ
تم چاہو تو نہیں ہے مجھ کو دینے میں انکار
بچے کی اس بات کو وہ بچپن کی شوخی سمجھا
وہ ڈاکو سردار سے بولا ہے ان میں اک بچہ
اس نے کہا دینار ہیں میرے پاس جو چاہے لو
اس کی بات کہاں تک سچ ہے یہ گتھی سلجھاؤ
کیا ہے تمھارے پاس کہو تم اب اس کا اظہار
پہلے بھی اظہار کیا تھا ہے اب بھی اقرار
آخر نہ خود بتلاتے ہم کو کیوں ہوتا معلوم
اپنے لیے اپنے ہاتھوں سے تم نے کانٹا بویا
چاہے جو کچھ ہو جائے میں جھوٹ نہیں بولوں گا
میں اپنے وعدے کی خاطر جان بھی دے سکتا ہوں
ہو گیا اس کی آنکھوں سے اشکوں کا دریا جاری
لوٹنے والے کو اک ننھے سے بچے نے لوٹا
جس کو اب تک یاد نہ آیا اپنے رب کا فرماں
لیکن حاصل کیا ہے اس کا بدنامی رسوائی
میں بھی توبہ کرتا ہوں اور تم سب بھی باز آؤ
اس بچے کے ہاتھ پہ کی سردار نے فوراً توبہ
اس قصے کو سن کر کوئی جھوٹ نہیں بولے گا
سچ رہبر ہو تو مشکل رستے بھی کٹ جاتے ہیں
سچائی ویرانوں میں بھی پھول کھلا دیتی ہے
بچو، تم بھی سچ بولو، ماں باپ کا کہنا مانو
اس بچے کو کہتے ہیں عبدالقادر جیلانیؒ

ڈاکٹر سلمان عباسی
۷۵-ڈاکٹر موتی لعل بوس روڈ
لکھنؤ-۲۲۶۰۰۱

ماں کی پکار

چمن کی، اور بہارِ بے خزاں کی لاج رکھنا ہے
مصیبت اور وقتِ امتحاں کی لاج رکھنا ہے
جواں ہو کر تجھے سارے جہاں کی لاج رکھنا ہے
اہنسا کے لیے امن و اماں کی لاج رکھنا ہے
مرے بچے تجھے ہندوستاں کی لاج رکھنا ہے

بہادر بن کے جینا اور بہادر بن کے مر جانا
تمامی مشکلاتِ زیست سے ہنس کر گزر جانا
جواں ہو کر زمانے کے لیے کچھ کام کر جانا
تجھے گاندھی کے عزمِ جاوداں کی لاج رکھنا ہے
مرے بچے تجھے ہندوستاں کی لاج رکھنا ہے

شرابِ امن دنیا بھر کو نظروں سے پلانا ہے
تجھے ٹوٹے ہوئے شیشوں سے میخانہ سجانا ہے
تجھے اپنے وطن کے واسطے کچھ کر دکھانا ہے
محبت کیش سیلِ بیکراں کی لاج رکھنا ہے
مرے بچے تجھے ہندوستاں کی لاج رکھنا ہے

یقیں مجھ کو ہے اس عہدِ وفا کی لاج رکھ لے گا
تو اہلِ ہند کے فہمِ رسا کی لاج رکھ لے گا
دُعا کرتی ہوں تو میری دعا کی لاج رکھ لے گا
زمیں پر رہ کے تجھ کو آسماں کی لاج رکھنا ہے
مرے بچے تجھے ہندوستاں کی لاج رکھنا ہے

خلوصِ دل سے یہ گنگ و جمن تجھ پر تصدق ہیں
گلوں کا ذکر کیا لاکھوں چمن تجھ پر تصدق ہیں
پئے امن و اماں اہلِ وطن تجھ پر تصدق ہیں
تجھے بننا ہے رہبر کارواں کی لاج رکھنا ہے
مرے بچے تجھے ہندوستاں کی لاج رکھنا ہے

شعورِ زندگی کی ہر ادا تیرے حوالے ہے
یہ دنیا بھر بنامِ ایشیا تیرے حوالے ہے
امینِ خورد ماں کی مامتا تیرے حوالے ہے
وطن کے لعل کو اب اپنی ماں کی لاج رکھنا ہے
مرے بچے تجھے ہندوستاں کی لاج رکھنا ہے

جعفر عسکری
نور اللہ روڈ - الہ آباد ۳

نوائے تازہ

رہے فانوسِ تمنا روشن
تیرگی ہو نہ کبھی سایہ فگن
عزمِ محکم کی جبینوں پہ نہ پڑ جائے شکن
نونہالانِ وطن
اے عزیزانِ وطن!

پہنچے ہر ایک کو راحت تم سے
ملک کی ہو گی حفاظت تم سے
وقت پڑنے پہ اٹھو باندھ کے تم سر سے کفن
نونہالانِ وطن
اے عزیزانِ وطن

نورِ فردا کے ستارے تم ہو
بحرِ ہستی کے کنارے تم ہو
شاد و آباد رہیں تم سے گھروں کے آنگن
نونہالانِ وطن
اے عزیزانِ وطن

مفلسی، درد، پریشاں حالی
دور ہو تم سے ہر اک پامالی
ختم تم سے ہوں دکھی ماؤں کے آہ و شیون
نونہالانِ وطن
اے عزیزانِ وطن!

علم کی شمع جلائے رکھو
جہل سے خود کو بچائے رکھو
کام آئیں گے نہ فردا میں یہ آدابِ کہن
نونہالانِ وطن
اے عزیزانِ وطن!

توڑ دو خواب کی زنجیروں کو
پھاڑ دو وہم کی تصویروں کو
پھینک دو کاٹ کے ہر شاخِ غم و رنج و محن
نونہالانِ وطن،
اے عزیزانِ وطن!

سفرِ تازہ کا آغاز کرو
زندگانی ہے نئی، ناز کرو
کھل اٹھیں تازہ شگوفوں سے امیدوں کے چمن
نونہالانِ وطن
اے عزیزانِ وطن

کے طور پر یہ گیت ملاحظہ ہو۔

ڈھلوان پہاڑوں سے بھیڑ چل پڑی
کھدی ہوئی گھاس دکان پر رکھی
جو کوئی اس کو لے گا وہی آگے نکلے گا

ایک اور گیت ـــ

سفید خرگوش کہاں بھاگ گیا
بلوط کے جنگل میں
چھال اتار کے کہاں رکھ دی ؟
تختے کے نیچے ۔ چھال کس نے چرائی ؟
مینشی شیشو نے چھال کھالی اور سوداگر کے
صحن میں بھاگ گیا
راجہ اور رانی کے پاس
لال سندری کے پاس
گھٹنوں کے بل پر اٹھا کر کے
نکل جا بادشاہ

چڑھیں

بچے آپس میں کھیلتے کھیلتے لڑ پڑتے ہیں ۔ اور غصہ ہو کر ایک دوسرے کو چڑھاتے ہیں ۔ ان چڑھوں میں نشست الفاظ کا خیال رکھا جاتا ہے ۔ مثال کے طور پر ایک لڑکا تینکا نام کی لڑکی کو چڑھاتا ہے ۔

تینکا سوری انگیٹھی پر گر پڑی اور برتن
توڑ ڈالا

تینکا چڑھ کر جواب دیتی ہے

فردگھا ، بردگھا کو کھا گیا بھالو

نکولائی نام کے لڑکے کے بارے میں دو مختلف اقسام کی چڑھیں ہیں :۔

کولیا ، کولیا ، نکولائی ، چھینک دو ٹوپی
چھپر پر
ٹوپی ملتی ہے ، کولیا غصہ ہوتا ہے

کولیا ، کولیا ، نکولائی ، چڑیوں کو نہ ڈرا
چڑیاں ڈرپوک نہیں ، کولیا سے نہیں ڈرتیں

منظوم کہانیاں

بچوں کو من بہلانے کے لیے بوڑھی ماں منظوم کہانیاں سناتی ہے ۔ ایک منظوم کہانی ملاحظہ ہو ۔

تورو ، تیرے چرواہا ، اوسین کی لاٹھی ، کہاں دور
جائے گا ۔ ؟
ایک ساگر سے دوسرے ساگر کو
کوئی شہر تک ، زار کیا گزر رہا ہے ؟
گھر بڑھ رہا ہے ، ملکہ کیا کہہ رہی ہے ؟
لڑکے کا سنگار کر رہی ہے ۔ لڑکے کا کیا نام ہے ؟
کوگات ، لودت زار ، کونستان تین ۔
بو مین ، تو لو مین ، میرے لڑکے کو اپنی لڑکی
دے دو
زار کو نستا تین کے تین دروازے ہیں
ریشم سے ڈھکے ہوئے ، سونے سے منڈھے ہوئے ۔
بکری نہیں کودتی ، سینگ نہیں توڑتی ۔
بکری کود گئی ، سینگ توڑ لی ، کہاں ہے سینگ ؟
نکو لکالے گیا ۔ کہاں ہے نکو لکا ؟
بنجر ملے میں پھنس گیا ۔ بنجرا کہاں ہے ؟
پانی میں بہہ گیا ۔ کہاں ہے پانی ؟
بیل پی گئے ۔ بیل کہاں ہیں ؟
پہاڑوں پر چلے گئے ۔ کہاں ہیں پہاڑ ؟
کیڑے گھسیٹ لے گئے ۔ کہاں ہیں کیڑے ؟
بطخیں کھا گئیں ۔ کہاں ہیں بطخیں ؟
سمندر کی طرف پرواز کر گئیں ۔
کہاں ہے سمندر ؟
پھول کھل گئے ؟
کہاں ہیں پھول ؟ لڑکیوں نے توڑ لیے

کہاں ہیں لڑکیاں؟ شادی کرلی۔
کہاں ہیں ان کے جیون ساتھی
لڑائی پر چلے گئے۔ جرمنوں کو مارنے"

آخری تین بول زیب داستاں کے لیے بڑھا دیے گئے ہیں۔ ایک اور کہانی ملاحظہ ہو :۔

بڑھیا سکو چین سے بھوج پتر کے پیڑ کے
نیچے رہتی تھی
بڑھیا دانت کے درد کے عالم میں تالاب پر
نہانے چلی گئی۔
بڑھیا کتنی اچھی ہے، بھال کا گھٹر لے گئی

لوریاں

پالنے میں بچہ سو رہا ہے۔ بوڑھی آنا ہلا رہی ہے اور لوریاں سُنا کر بچہ کو سلانے کی کوشش کر رہی ہے:

بالو بائی، بالو بائی، ہمارے یہاں آئی ماما ئی۔
کہہ رہی ہے، واسیا کو دیدو،
ہم واسیا کو نہیں دیں گے۔ ہمیں خود ضرورت ہے

واسیا کا رونا بند نہیں ہوتا۔ بوڑھی آنا دوسری لوری گاتی ہے

واسیا کی دوست، دودھ کی شیشی کے
بغیر جھلاتی ہوں۔
بغیر جھنجھنے کے۔
سو جا پالنے میں

لیکن ضدی بچہ گلا پھاڑ پھاڑ کر رو رہا ہے اور لوریوں کی طرف ذرا بھی دھیان نہیں دیتا۔ برابر ہاتھ پاؤں مار رہا ہے "اوہو۔ تو تو بہت خراب بچہ ہے" کہتے ہوئے آنا نے بچہ کو پالنے سے اٹھاتے ہوئے گہری سانس لی۔ واسیا کو گود میں لے کر ٹہلنے لگتی ہے۔ اور فضا میں نئی نئی لوریاں ابھرنے لگتی ہیں :

بایو ! بایو بائی جاری ہوا گھاس کی کوٹھری میں
واسیا کو مت ڈرا۔
بایو، بایو، بائی، واسیا پالنے کے کنارے نہ لیٹ
تیرے سر پر چوٹ لگ جائے گی
تو پالنے کے بیچ میں لیٹ جا۔ رسّی کو پکڑے رکھو۔

بچوں کو ہنسانے والے گیت

آخر کار ضدی بچہ رو دھو کر خاموش ہو گیا۔ لہٰذا نیند پوری پر جب اس نے آنکھیں کھولیں تو آنا نے اسے گود میں لے لیا۔ پر بیٹھ کر بچہ کو اوپر اچھالنے لگی :۔

واسیا! واسیا! جوان واسیا، پیڑ کی شاخ پر
بیٹھ گیا
شاخ ٹوٹ گئی، واسیا گر گیا۔ اوہو۔ اوہو۔

اس نے بچہ کو اوپر اچھالا گویا وہ بچہ کو پھینک رہی ہو۔ واسیا مار کر ہنسنے لگا۔ آنا گانے لگی۔

بطخیں اڑ گئیں، واسیا کے سر پر بیٹھ گئیں۔

اور ساتھ ہی ساتھ وہ ایسی حرکتیں کرنے لگی جیسے بطخ واسیا سر پر چونچیں مار رہی ہو۔ بچہ اس پر کھلکھلا کر ہنس پڑتا ہے

روسی زبان میں بچوں کے لوک گیتوں کے یہ نمونے اور مختصر ہونے کے باوجود فنکاری کے اشتیاق کو بڑھاتے ہیں۔ گیت مختلف ممالک کے محنت کشوں کی بے کیف زندگی کی تر کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر پومور میں جو لوریاں گائی جاتی ہیں وہاں کے مچھیروں کے بیڈ ننگے جیون کی آئینہ دار ہیں۔ اس کے لوگوں کا پیشہ ماہی گیری ہے۔ ایک مختصر سی لوری ملاحظہ

بایو بائی! بایو بائی سیگا مچھلی تیر جاؤ۔
آلیکو کا انتظار کرو
آلیکو بڑا ہو گا۔ باپ کے ساتھ ساگر پر
جائے گا اور وہ بھی مچھلیاں پکڑے گا

اسی دلیش کی ایک لوری :۔

بایو بائی! بایو بائی، جلدی سے سو جا
نہیں تو تجھے پالنے میں پھینک دوں گی
ساگر میں مچھلیوں کے سامنے ڈال دوں گی
کھلا جا مچھلی لیلا کو، بات نہ سننے والی کو

(باقی صفحہ ۱۱۲ پر)

شاھد میر
لکچرر گورنمنٹ کالج ۔ بنسوارہ
راجستھان ۔ ۳۲۷۰۰۱

ایک روز کی بات

ایک روز کی بات ہے بھائی
وقت کی چڑیا اُڑتے اڑتے
اک دن میرے گھر میں آئی
میں نے اس کو کچھ چمکارا
کچھ موتی کے دانے ڈالے
سونے چاندی کے پنجرے میں
قید پھر اس کو کرنا چاہا
پر اتنی من موجی تھی وہ
ایسی اُڑی
کہ ہاتھ نہ آئی !!
ایک روز کی بات ہے بھائی

یادور

انور سلونوی
سلون ضلع رائے بریلی

بچوں کا ترانہ

کوئی پھول نفرت کا کھلنے نہ دیں گے   کدورت کا پودا نکلنے نہ دیں گے
تعصب کے دیپک کو جلنے ہی نہ دیں گے   بغاوت کی آندھی کو چلنے نہ دیں گے

دیا ایکتا کا جلا کر رہیں گے
جہاں سے اندھیرا مٹا کر رہیں گے

سبھی قوم و مذہب برابر یہاں ہیں   سبھی رونقِ باغ ہندوستاں ہیں
بہم سب کے سب باغ کے باغباں ہیں   رہیں متحد سب تو کوہِ گراں ہیں

حقیقت یہ سب کو بتا کر رہیں گے
وطن سے تعصب مٹا کر رہیں گے
کوئی دیکھے انسانیت کی یہ پستی   محبت ہے مہنگی عداوت ہے سستی
یہ بغض و عداوت یہ فرقہ پرستی   ہمیشہ بڑھاتی رہے تنگ دستی

ہر انساں کو انساں بنا کر رہیں گے
جہاں سے برائی مٹا کر رہیں گے

اٹھے آنکھ کوئی جو صحنِ چمن پر   پڑے وقت کوئی جو اپنے وطن پر
جو انگلی اٹھے عظمتِ انجمن پر   تو دھکا رہے دشمنو سنگٹھن پر

محبت کی شمعیں جلا کر رہیں گے
اندھیرے کو یکسر مٹا کر رہیں گے

کوثر نظامی
۲۷- پاٹا نالہ ـ لکھنؤ ۳

یہ ننھے منے بچے ہیں قوم کی امانت

کچھ آفتاب اِن میں، کچھ ماہتاب اِن میں
کچھ بے مثال اِن میں، کچھ لاجواب اِن میں
کچھ کامگار اِن میں، کچھ کامیاب اِن میں
یہ ننھے منے بچے ہیں قوم کی امانت

ہوں گے یہی نگہباں کل زینتِ چمن کے
ہوں گے یہی محافظ کل سرحدِ وطن کے
ہوں گے یہی اُجالے کل شمعِ انجمن کے
یہ ننھے منے بچے ہیں قوم کی ا

تعلیم و تربیت سے محروم رہ نہ جائیں
اہلِ جہاں پیچھے، معصوم رہ نہ جائیں
ہیں یہ نقوشِ فردا معدوم رہ نہ جائیں
یہ ننھے منے بچے ہیں قوم کی اماتت

اشفاق و چندر شیکھر، رحمت، وحید ہوں گے
بسمل، بھگت کے پیرو کتنے شہید ہوں گے
قوم و وطن کے ہیرو، کتنے حمید ہوں گے
یہ ننھے منے بچے ہیں قوم کی ا

علم و ہنر سکھاؤ، جتنا پڑھیں پڑھاؤ
شفقت، خلوص دے کر انسانیت سکھاؤ
تم کچھ نہ بن سکے ہو ان کو تو کچھ بناؤ
یہ ننھے منے بچے ہیں قوم کی امانت

کس کو خبر ہے ان میں سردو بنیں گے کتنے
کتنے سبھاش و جوہر، ٹیپو بنیں گے کتنے
گاندھی بنیں گے کتنے، نہرو بنیں گے کتنے
یہ ننھے منے بچے ہیں قوم کی ا

ہوگی انھیں کے دم سے صبحِ یقیں منور
عزم و عمل انھیں کے قوم و وطن کے رہبر
ہر بحرِ بیکراں کے ہوں گے یہی شناور
یہ ننھے منے بچے ہیں قوم کی امانت

کچھ سرفروش ہوں گے، شعلہ نوا مقرر
کچھ اہلِ ہوش ہوں گے، دانشور و مفکر
کچھ لب خموش ہوں گے، اہلِ نظر مدبر
یہ ننھے منے بچے ہیں قوم کی ا

مستقبلِ حسیں کے معمار بھی یہی ہیں
خود قافلہ یہی ہیں، سالار بھی یہی ہیں
کشتی بھی ان کو سمجھو، پتوار بھی یہی ہیں
یہ ننھے منے بچے ہیں قوم کی امانت

کیف احمد صدیقی
۹۰- شیخ سرائے - سیتاپور
۲۶۱۰۰۱

بچوں کی مسکراہٹ

یہ نونہال سارے گلشن کی آبرو ہیں
یہ جانِ فصلِ گل ہیں یہ روحِ رنگ و بو ہیں
یہ شادماں رہیں تو شاداب گلستاں ہے
بچوں کی مسکراہٹ ہر قوم کا نشاں ہے

ان کے ہر ایک سکھ میں دنیا کا سکھ ہے شامل
یہ شاد ہوں تو خوش ہے سارے جہاں کا دل
ان کی ہر اک خوشی میں سب کی خوشی نہاں ہے
بچوں کی مسکراہٹ ہر قوم کا نشاں ہے

بچوں کی کامرانی دنیا کی کامرانی
بچوں کی شادمانی ہے سب کی شادمانی
بچے ہیں شادماں تو دنیا بھی شادماں ہے
بچوں کی مسکراہٹ ہر قوم کا نشاں ہے

بچے اگر ہیں خوش تو خوش حال ہے زمانہ
بچے اگر ہیں مفلس کنگال ہے زمانہ
بچوں کا رنگ ساری تہذیب پر عیاں ہے
بچوں کی مسکراہٹ ہر قوم کا نشاں ہے

مستقبلِ حسیں کی تعمیر ہیں یہ بچے
ہر خوابِ دلنشیں کی تعبیر ہیں یہ بچے
ان کا ہر اک تبسم اک صبحِ ضوفشاں ہے
بچوں کی مسکراہٹ ہر قوم کا نشاں ہے

یہ ننھے بچے اک دن دنیا کی شان ہوں گے
جب ہم ضعیف ہوں گے یہ نوجوان ہوں گے
ان کے وجود ہی سے یہ رونقِ جہاں ہے
بچوں کی مسکراہٹ ہر قوم کا نشاں ہے

بچوں کی ہے مناسب نشو و نما ضروری
دنیا کی ہر ترقی ان کے بغیر ادھوری
بچوں کی داستاں ہی دنیا کی داستاں ہے
بچوں کی مسکراہٹ ہر قوم کا نشاں ہے

اُف یہ غریب بچے جو بھیک مانگتے ہیں
رہنے کو گھر نہیں ہے فٹ پاتھ پر پڑے ہیں
میں سوچتا ہوں آخر اِن کا خدا کہاں ہے
بچوں کی مسکراہٹ ہر قوم کا نشاں ہے

ان سب کو ہے مناسب تعلیم کی ضرورت
افلاس و جہل نے ہی بدلی ہے ان کی صورت
ورنہ سبھی کے اندر اک حسن بیکراں ہے
بچوں کی مسکراہٹ ہر قوم کا نشاں ہے

بچوں کی پرورش کی ہم پر ہے ذمہ داری
یہ نسل ہیں ہماری یہ فصل ہیں ہماری
ان کی رگوں میں اپنا خونِ جگر رواں ہے
بچوں کی مسکراہٹ ہر قوم کا نشاں ہے

بچوں کو ہے مناسب خوراک کی ضرورت
دیکھو خراب ہونے پائے نہ ان کی صحت
کہتے ہیں تندرستی اک نعمت جہاں ہے
بچوں کی مسکراہٹ ہر قوم کا نشاں ہے

بچوں کے واسطے یوں تعلیم ہے مقدم
لیکن ہو کھیلنے کا ساماں بھی فراہم
ورزش بھی اک طرح سے خوراکِ جسم جاں ہے
بچوں کی مسکراہٹ ہر قوم کا نشاں ہے

اتر پردیش میں فلاحِ اطفال

بچے قوم کی بیش بہا دولت ہیں۔ تندرست و ذہین اور نظم و ضبط کے پابند بچے ہی مستقبل میں کارآمد شہری بن کر ملک کو ترقی کی راہ پر لے جانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ آج کے بچے ہی آگے چل کر انسانی سماج کو نئی قوت، نئی جہت اور نئی روشنی دیتے ہیں۔

اقوام متحدہ نے بچوں کی اسی اہمیت کے پیش نظر سال ۱۹۷۹ء کو بین الاقوامی سال اطفال قرار دیا ہے اور اس بات پر خاص زور دیا ہے کہ بچوں کی ضرورتوں اور ان کے حقوق کو بخوبی سمجھا جائے۔

سال ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق ہمارے ملک میں ۱۴ سال تک کی عمر کے تقریباً ۲۶ کروڑ بچے ہیں۔ اتر پردیش میں بچوں کی تعداد تین کروڑ ۷۰ لاکھ ہے جو مجموعی آبادی کا ۴۳ فی صد ہے۔ بچوں کی حالت مخصوصاً غریبی کی سطح سے نیچے زندگی بسر کرنے والے خاندانوں میں انتہائی تشویشناک ہے۔ ملک میں تقریباً ۱۰ کروڑ بچے گھٹن بھرے ماحول میں رہتے ہیں جن میں سات سال تک کی عمر کے بچوں کی تعداد تقریباً چار کروڑ ۸۵ لاکھ ہے۔ ۳.۱۶ کروڑ بچوں کو پینے کے لیے صاف پانی دستیاب نہیں ہے۔ چھ کروڑ بچے مناسب دیکھ بھال سے محروم ہیں اور تقریباً ۱۴ ہزار بچے ہر سال وٹامن "اے" کی کمی کے باعث نابینا ہو جاتے ہیں۔ ملک میں تقریباً آٹھ لاکھ نابینا، ۲۰ لاکھ ذہنی طور پر کمزور، پانچ لاکھ ہڈیوں کے امراض میں مبتلا اور دو لاکھ گونگے بہرے بچے ہیں۔

بچوں کے جسمانی اور ذہنی نشو و نما اور ان کی تعلیم وغیرہ کے سلسلے میں حکومت اتر پردیش نے متعدد اہم اقدامات کیے ہیں۔

ریاست میں اولیت کی بنیاد پر بے سہارا اور معاشی طور پر کمزور طبقوں کے بچوں کو نظر انداز کیے جانے کی صورت حال سے نیز ظلم و جور، مصیبت اور استحصال سے نجات دلانے کے لیے ادارہ جاتی خدمات کا ایک ڈھانچہ تیار کر کے ان خدمات کی توسیع کی گئی ہے۔

ریاست میں بے سہارا بچوں کے لیے تین شِشو، ایک پرورش گاہ، تین بالیکا نکیتن اور چار بال سدن پہلے سے ہی قائم ہیں۔ اس سال دو مزید شِشو سدن، ایک بال سدن اور ایک آشرم کے طرز کا اسکول قائم کیا جائے گا۔ ریاست میں برسرکار محنت کش عورتوں کے بچوں کے لیے ۱۲ شِشو اور بال باڑی مرکز قائم کیے جا چکے ہیں اور اس سال کے آخر تک پانچ اور مرکز قائم کیے جائیں گے۔ اس کے علاوہ علاقوں میں ۵ پڑوسی شِشو شالائیں قائم کرنے کی اسکیم تیار کی گئی ہے۔

معذور بچوں کو خود کفیل بنانے کے لیے حکومت گونگے بہروں کے تین، نابیناؤں کے تین، ذہنی طور پر بچوں کے دو اور جسمانی طور پر معذور بچوں کے دو اسکول چلا رہی ہے۔ نابینا اور ذہنی طور پر کمزور لڑکیوں کے لیے ایک اسکول اسی سال قائم کیا جا رہا ہے۔

ریاست میں کم سن مجرموں کے لیے ۴۸ اضلاع میں جیلیں ہیں ۔ ان جیلوں میں کمسن مجرموں کے لیے ہلکے کاموں کا بندوبست کیا جاتا ہے تاکہ وہ مجرمانہ ذہنیت سے نجات حاصل کر سکیں ۔ مجرم بچوں کے مقدمے ختم ہو جانے اور عدالت سے انھیں بری کر دیے جانے کے بعد ان بچوں کو منظور شدہ اسکولوں میں رکھا جاتا ہے جہاں ان کی تعلیم اور پیشہ ورانہ تربیت کا بندوبست کیا جاتا ہے تاکہ وہ خود کفیل بن کر سماج میں باعزت زندگی گزار سکیں۔ ریاست میں اس طرح کے آٹھ منظور شدہ اسکول قائم ہیں ۔

ریاست میں بچوں کی چھ عدالتیں ہیں اور سال ۱۹۷۹-۸۰ء کے آخر تک مزید ۲۰ عدالتیں قائم کی جائیں گی ۔ ریاست کے ۱۵ اضلاع میں مرکزی پروبیشن ایکٹ نافذ کیا جا رہا ہے ۔

اطفال مربوط ترقیاتی پراجکٹ

اس اسکیم کے تحت چھ سال تک کی عمر کے بچوں کو قوت بخش غذا، صحت کے ٹیکے، صحت سے متعلق جانچ اور ابتدائی تعلیم وغیرہ سے متعلق خدمات فراہم کی جاتی ہیں ۔ اس کے ساتھ ساتھ حاملہ اور دودھ پلانے والی عورتوں کو بھی صحت و غذائیت سے متعلق مذکورہ سہولتیں دی جاتی ہیں ۔ ریاست میں بچوں کی مربوط ترقی کے تین پراجکٹ دو اکتوبر، ۱۹۷۵ء سے شروع ہوئے اور اب تک مرکزی حکومت کی جانب سے سات اور ریاستی حکومت کی جانب سے تین پراجکٹ شروع کیے جا چکے ہیں ۔ اس سال مرکزی حکومت کی جانب سے تین اور ریاستی حکومت کی جانب سے چار مزید پراجکٹ شروع کیے جائیں گے ۔ ہر پراجکٹ سے تقریباً چھ سال تک کی عمر کے ۱۰ ہزار بچے اور سات ہزار حاملہ اور دودھ پلانے والی عورتیں مستفید ہوں گی ۔

بچوں کے لیے اس وقت ریاست کے ۱۲ اضلاع میں علاج و معالجہ سے متعلق یونٹ کام کر رہے ہیں ۔ بقیہ اضلاع میں بھی اس سال اس طرح کے یونٹ قائم کر دیے جائیں گے۔ ہڈی کے مرض میں مبتلا بچوں کے علاج کے لیے تمام ۵۶ اضلاع میں یونٹ قائم کر دیے گئے ہیں ۔ بچوں کی صحت کے سلسلے میں ریاستی حکومت نے جو بھی اقدامات کیے ہیں ان سے بھی بچے بلاشبہ کافی مستفید ہوں گے ۔

ریاستی حکومت بچوں کی مناسب تعلیم کے لیے بھرپور کوشش کر رہی ہے ۔ بچوں کی تعلیم کے فروغ و توسیع کے لیے اس بین اقوامی سال اطفال کے دوران ہر ضلع صدر مقام پر ایک بال بھون قائم کیا جائے گا جس سے تین سے ۱۴ سال تک کی عمر کے تقریباً ۲۵ ہزار بچے ہر سال مستفید ہوں گے۔ بین اقوامی سال اطفال کے دوران تعلیم کے میدان میں متعدد قابل ذکر اقدامات کیے جا رہے ہیں ۔ جن میں سے بعض یہ ہیں :-
۶۹۵٫۶۵ لاکھ روپیہ کے مصارف سے ۱۰۵۰ پرائمری اور ۲۱۵ جونیر ہائی اسکولوں کا قیام جن سے تقریباً تین لاکھ ۲۰ ہزار بچے مستفید ہوں گے ۔ یونیسیف کے تعاون سے سیلاب سے متاثرہ علاقوں میں چھ کروڑ روپیہ کے مصارف سے اسکول کی ۱۰۰ عمارتوں کی تعمیر، ۱۲۶۵ اسکولوں کی عمارتوں کی تعمیر کی ایک دوسری اسکیم کی تیاری، تین ہزار اسکولوں میں بچوں کے لیے ۱۵ لاکھ روپیہ کے مصارف سے پینے کے پانی کی سہولت کی فراہمی، پانچ لاکھ ۲۵ ہزار بچوں کی غیر رسمی تعلیم کے لیے ایک کروڑ روپیہ کا بندوبست ۔

ریاست کے ۴۲ اضلاع میں نافذ بے بی فوڈ اسکیم کو بقیہ اضلاع میں بھی شروع کرنے پر غور کیا جا رہا ہے ۔ اس اسکیم پر تقریباً ۱۲۶٫۶۵ لاکھ روپیہ کے مصارف ہوتے ہیں جس سے ایک لاکھ ۳۳ ہزار بچے مستفید ہو رہے ہیں خصوصاً

(باقی صفحہ ۱۱۷ پر)

شفاعت علی
آل انڈیا ریڈیو
لکھنؤ

بھٹکے ہوئے راہی

——— بھٹکے ہوئے راہی، ان بچوں کی کہانی ہے، جن کی تعلیم و تربیت کی طرف سے ان کے والدین نے لاپرواہی برتی اور وہ بری صحبتوں میں پڑ کر راستے سے بھٹک گئے، جس کے نتیجے میں مجرم بچوں کی حیثیت سے ان پر مقدمہ چلا اور انھیں بچوں کی اصلاحی جیل میں بھیج دیا گیا۔ اس اصلاحی جیل کو عام طور سے ریفارمیٹری اسکول اور اپروڈ اسکول کہا جاتا ہے۔ (ش۔ ع) ———

چمن کی زینت اس کے دل کش پھولوں اور ہرے بھرے پودوں سے ہوتی ہے، باغبان اگر ان کی طرف سے لاپرواہی برتے تو پھر چمن کی دل کشی اور سجاوٹ ختم ہو جائے گی۔ یہی حال ہمارے نونہالوں کا بھی ہے، ان میں ملک و قوم کا اچھا فرد بننے کی پوری صلاحیت موجود ہوتی ہے، شرط یہ ہے کہ انھیں سنوارا جائے اور تربیت کے صحیح سانچے میں ڈھال کر ان کی اچھی صلاحیتوں کو اجاگر کیا جائے۔ انھیں بچوں میں دنیا کی عظیم اور قابلِ فخر شخصیتیں بھی ہوتی ہیں اور ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو اپنے داغدار کردار کی وجہ سے ہمیشہ لعنت و ملامت کے ساتھ یاد کیے جاتے ہیں۔ بڑی شخصیتیں صحیح پرورش، اچھی تعلیم اور بہتر تربیت کی وجہ ہی عظیم بنتی ہیں۔

بچے قوم و ملک کے چشم و چراغ، مستقبل کے معمار اور اپنے وطن کی دولتِ لازوال ہیں ان میں اثر قبول کرنے کی زبردست صلاحیت ہوتی ہے بالکل اسی طرح جیسے نرم لکڑی کو جدھر اور جس طرح چاہے موڑ دیا جائے۔ ان بچوں کو اچھی راہیں دکھائی جائیں تو یہ ایک ایسے معاشرے کے خالق ہو سکتے ہیں جس کا خواب انسانیت مدتوں سے دیکھتی چلی آئی ہے لیکن انھیں بچوں نے اگر بری عادتیں اپنائیں اور راستے سے بھٹک گئے تو پھر یہ لوگ ملک و قوم اور پورے معاشرے کے لیے زبردست خطرہ بن سکتے ہیں۔

پرانے لکھنؤ میں ایک محلہ وکٹوریہ گنج کے نام سے مشہور ہے۔ اسی محلے میں دین دیال روڈ پر اردو کے نامور ادیب اور محقق سید مسعود حسن رضوی ادیب کی عالی شان کوٹھی "ادبستان" ہے۔ اسی کوٹھی کے ایک حصے میں ایک اصلاحی اسکول ہے جس میں تقریباً ۱۸۸ ایسے بچے ہیں جو تربیت کی خرابی اور لاپرواہی کی وجہ سے غلط راہوں پر پڑ گئے تھے۔ اس اسکول میں ان بھٹکے ہوئے مسافروں کو صحیح راستوں کا پتہ بتا کر سماج کا اچھا فرد بنانے اور انھیں اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر باعزت زندگی گزارنے کی تعلیم و تربیت دی جاتی ہے۔ حکومت اتر پردیش نے صوبے بھر میں ایسے نو اسکول قائم کیے ہیں جو اس کے محکمۂ ہریجن اور سماجی بہبود کی نگرانی

ے چلتے ہیں۔ ان لوگوں کے لیے جو بچوں کی تعلیم و تربیت
توجہ نہیں دیتے اور ان کی صحیح پرورش کی طرف سے
پروا ہی برتتے ہیں، اصلاحی اسکول کے ان بچوں کی آپ
میں درد و غم بھی ہے اور عبرت و سبق بھی۔ میں نے یہاں
بہت سے بچوں سے ملاقات کی اور ان کے حالات معلوم
۔ سب سے پہلے بھوپورا گڑھ ضلع کے ایک لڑکے گنیش سنگھ سے
گفتگو ہوئی۔ گنیش کی عمر تقریباً ۱۵ سال ہے۔ وہ ہونہار
ذہین لڑکا ہے۔ اس نے بتایا۔

"میرے ماں باپ بہت غریب تھے۔ ہم لوگوں کو کھانے پینے
بہت کمی رہا کرتی تھی، کبھی کبھی تو ایسا ہوتا کہ کئی کئی دقت کھانا
ملتا تھا۔ مجھ سے بڑا ایک بھائی اور تھا جو ستار گنج میں
کرتا تھا، جب میں کچھ بڑا ہوا اور چھوٹا موٹا کام کرنے کے
ہوا تو میرا بھائی مجھے اپنے ساتھ ستار گنج لے گیا۔ اس نے
سے کہا کہ ستار گنج میں اس کا نام اسکول میں لکھوا دوں گا
کسی صاحب کے گھر میں نوکر بھی رکھا دوں گا۔ میری ماں نے اجازت
دی تو میں اپنے بھائی کے ساتھ ستار گنج آگیا۔ یہاں اس نے
اسکول میں پڑھنے کو بٹھا دیا اور ایک گھر میں مجھے نوکری بھی
گئی۔ میں اس گھر میں آٹھ سال تک نوکری کرتا رہا۔ میرا صاحب
بہت ڈانٹتا تھا اور مارا بھی کرتا تھا۔ میں اس کے ڈر سے چھپ
خوب رویا کرتا تھا۔ وہ مجھے تنخواہ بھی بہت مشکل سے دیا کرتا تھا
اس نے پورے پیسے مجھے نہیں دیے۔ ایک بار اس نے کئی
مہینے تک ایک پیسہ بھی نہیں دیا، جب میں نے اس سے تنخواہ
کی تو اس نے مجھے بہت برا بھلا کہا اور گالیاں دیں۔ میں
بھی اس سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں اپنی تنخواہ لے کر
گا۔ اس پر وہ اور بھی تاؤ کھا گیا۔ رات جیسے تیسے کٹی جب
سویرے اٹھا تو مالک کے رویہ سے ایسا معلوم ہوا جیسے
بات ہی نہیں ہوئی، اس نے حسب معمول مجھ سے چائے
کو کہا۔ میں چائے بنانے لگا تو وہ گھر کے باہر چلا گیا اور تھانے
پولیس والوں سے کچھ کہہ آیا، تھانہ اس کے گھر سے ملا
ہوا ہی تھا جب وہ لوٹ کر آیا تو میں نے اسے چائے بنا کر دی۔
اتنے میں پولیس والے بھی آ گئے۔ مالک کے کہنے سے میں نے
ان لوگوں کے لیے بھی چائے لگائی۔ جب وہ لوگ چائے
پی چکے تو مجھ سے بولے کہ تم میرے ساتھ تھانے تک چلو
اب میں بہت گھبرایا اور رونے لگا لیکن وہ لوگ مجھے زبردستی
تھانے لے گئے اور وہاں لے جا کر تھوڑی دیر تک بٹھائے
رکھا۔ پھر میرا مالک آ گیا اس کے پاس ایک ریڈیو تھا۔
اس نے ریڈیو پولیس والوں کو دے کر کہا کہ اس لڑکے
نے میرا یہی ریڈیو چرایا تھا۔ پولیس والوں نے مجھ سے کہا کہ
بتا تو نے یہ ریڈیو کیوں چرایا تو میں نے کہا کہ میں نے نہیں چرایا
تو اس پر انھوں نے مجھے بہت مارا اور حوالات میں بند کر دیا۔
اور شام کو مجھے ہلدوانی لے آئے جہاں مجھے بچوں کی جیل میں
ڈال دیا گیا۔ پھر جب مجسٹریٹ کے سامنے پیشی ہوئی تو انھوں نے
۳ سال کے لیے مجھے لکھنؤ کے اس اسکول میں بھیج دیا۔ میں یہاں
ستمبر ۱۹۷۷ء سے رہ رہا ہوں۔ پانچویں درجے میں پڑھتا ہوں اور
سلائی کا کام بھی سیکھتا ہوں۔"

بمبئی کا رہنے والا ایک لڑکا بشیر جس کی عمر ۱۳ سال ہے۔
اس نے بتایا کہ اسے چوری کرنے کی عادت پڑ گئی تھی اور
وہ گھر سے پیسے چرا کر اپنے دوستوں پر خرچ کیا کرتا تھا۔
اس بری عادت سے روکنے کے لیے ماں باپ اس کی مرمت
کیا کرتے تھے اس نے بتایا۔

"ایک بار ایسا ہوا کہ میرے باپ نے مجھے بہت مارا۔
میرے منھ سے خون بہنے لگا اس پر بھی ان کا غصہ کم نہ ہوا اور
انھوں نے مجھے ایک کھمبے میں باندھ دیا۔ مجھے کھانا پانی بھی نہیں
دیا گیا۔ پھر میں نے کسی طرح سے اپنے ہاتھ کھول لیے اور گھر سے
بھاگ کھڑا ہوا۔ بمبئی ہی میں ایک ہوٹل والے نے مجھے اپنے یہاں
نوکر رکھ لیا لیکن وہ بھی مجھے بہت مارتا تھا اور گالیاں دیا کرتا
تھا پھر مجھے یہ ڈر بھی لگا رہتا تھا کہ کہیں میرے باپ کو اس
ہوٹل کا پتہ نہ چل جائے اس لیے میں ایک دن وہاں سے بھی

نکل بھاگا۔ اسٹیشن پہنچ کر میں دلی جانے والی ریل پر سوار ہوگیا لیکن راستے میں مجھے پکڑ لیا گیا کیونکہ میرے پاس ٹکٹ نہیں تھا۔ پھر مجھے جیل بھیج دیا گیا اور مجسٹریٹ کے سامنے میری پیشی ہوئی انھوں نے مجھے اس اسکول میں داخل کرنے کا حکم دیدیا۔ اب میں یہاں پڑھ بھی رہا ہوں اور کرسی بُننے کا کام بھی سیکھ رہا ہوں ساتھ ہی ساتھ ٹیلرنگ کے کلاس میں بھی جاتا ہوں۔"

یہ پوچھنے پر کہ اس اسکول سے چھٹی ہوجانے کے بعد تم کیا کروگے؟ بشیر نے جواب دیا کہ "میں کسی اچھی جگہ نوکری کروں گا اور اگر نوکری نہ ملی تو پھر کرسی وغیرہ بن کر اتنا پیسہ جمع کروں گا کہ سلائی کرنے کی دُکان کھول سکوں۔"

کاشی کلکتے کا رہنے والا ہے۔ ۱۳، ۱۴ سال کی عمر ہے لیکن اس عمر میں ہی اس نے زندگی کے جو نشیب و فراز دیکھے اور حالات نے اس کے ساتھ جو سلوک کیا، اس کا اندازہ اس سے گفتگو کے بعد ہی ہوتا ہے اس کا خیال ہے کہ دنیا صرف ظلم و زیادتی کرنے والوں کی جگہ ہے۔

کاشی نے بتایا کہ وہ بہت چھوٹا تھا جبھی اس کے ماں اور باپ کا انتقال ہوگیا تھا۔ کاشی سے بڑا ایک بھائی اور تھا لیکن وہ بھی اس قابل نہیں تھا کہ کچھ کر سکے رشتہ داروں نے بھی ان دونوں بچوں کو سہارا نہ دیا۔ بڑے بھائی کو کلکتے میں ہی کوئی کام مل گیا کچھ دنوں کے بعد کاشی بھی ایک ہوٹل میں کام کرنے لگا۔ ہوٹل والے کا سلوک بھی کاشی کے ساتھ اچھا نہ تھا وہ اسے تنخواہ بھی نہیں دیتا تھا مجبور ہو کر وہ وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اسے اپنی منزل کا کچھ پتہ نہ تھا بس ایسے ہی ایک ٹرین پر سوار ہوگیا جس نے اسے ناگپور پہنچا دیا۔ یہاں اسے ایک کوٹھی میں تیس روپیہ مہینے اور کھانے پر کام مل گیا۔ کوٹھی والے لوگ کاشی پر مہربان بھی [illegible] لیکن ان کے یہاں ایک اور نوکر تھا جو کاشی کو پریشان کرتا رہتا تھا۔ چوری خود کرتا اور کاشی پر الزام لگا دیتا آخر تنگ آکر وہ وہاں سے بھی بھاگ کھڑا ہوا اور ٹاٹا نگر پہنچ گیا۔ ٹاٹا نگر میں وہ کئی سال تک رہا اور وہاں کے مختلف ہوٹلوں میں کام کرتا رہا۔ ہوٹلوں کے مالک اسے پوری تنخواہ بھی نہیں دیتے تھے۔ مارتے بھی تھے اور گالیاں بھی دیا کرتے تھے اس لیے وہاں سے کام کی تلاش میں لکھنؤ آگیا۔ یہاں بھی اسے ہوٹل میں ہی کام ملا۔ ایک دن رات کو وہ سنیما دیکھ کر لوٹ رہا تھا کہ پولیس والوں نے اسے پکڑ کر اس سے پوچھ گچھ کی اور جب اس نے انھیں اپنے حالات بتائے تو اسے سرکاری ہوم (مغلی گنج) بھیج دیا گیا اس کے بعد مجسٹریٹ کے حکم سے اسے اصلاحی اسکول بھیج دیا گیا۔

کاشی اس اسکول میں پڑھتا بھی ہے اور موٹر سائکل و اسکوٹر کی مرمت کا کام بھی سیکھتا ہے ساتھ ہی ساتھ ٹیلرنگ بھی سیکھ رہا ہے اس کا ارادہ ہے کہ جب اس اصلاحی جیل سے اس کی رہائی ہوگی تو وہ موٹر سائکل و اسکوٹر کی مرمت کا کام کیا کرے گا کیونکہ اس کام میں بہت اسکوپ ہے۔

جب بچوں میں کوئی بری عادت پڑجاتی ہے تو بہت سے والدین اس کا علاج یہی سمجھتے ہیں کہ ان پر بے انتہا سختی کی جائے تاکہ وہ اپنی حرکتوں سے توبہ کرلیں لیکن اس طرح کی سزائیں بچوں کی تباہی کا سبب بھی بن جاتی ہیں اور اس سختی سے بچنے کے لیے بچے اس راستے پر چل پڑتے ہیں جو انھیں تباہیوں کی طرف لے جاتا ہے۔

کانپور کا ایک بچہ راجو اپنے باپ کی ایسی ہی سختی کا شکار ہوا۔ شروع سے اس کے والدین نے تربیت میں غفلت برتی جس سے کچھ ایسے لڑکے اس کے دوست بن گئے جنھوں نے اسے گھر سے پیسے چُرا چُرا کر لانے کی ترغیب دی۔ راجو نے بتایا کہ ایک بار اسی چوری کی وجہ سے اس کے باپ نے اسے بہت مارا اس نے ارادہ کرلیا کہ وہ اس گھر میں نہیں رہے گا چنانچہ وہ اپنے گھر سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اسٹیشن پہنچا جو ٹرین اسے ملی اس پر بیٹھ گیا۔ اس طرح وہ اٹاوہ پہنچ گیا۔ اٹاوہ میں اسے کوئی کام نہ ملا تو وہ پھر کانپور آیا اور اسٹیشن ہی سے دوسری گاڑی میں بیٹھ گیا اس گاڑی نے اسے ممبئی پہنچا دیا۔ ممبئی میں چھ سات دن تک

مارا مارا پھرتا رہا۔ اسے کوئی کام نہیں ملا۔ بھوک سے پریشان
ہو کر وہ بھیک مانگنے لگا آخر تنگ آ کر وہ وہاں سے بھی بھاگا اور
دہلی پہنچا۔ دہلی اسٹیشن پر اترا تو اسے لکھنؤ جانے والی گاڑی کھ
ڑی دکھائی دی وہ اس میں بیٹھ کر لکھنؤ پہنچ گیا۔ لکھنؤ میں وہ تین چار
دن تک مارا مارا پھرتا رہا جب یہاں بھی کوئی کام نہ ملا تو بغیر
سوچے سمجھے لکھنؤ سے بھی بھاگ کھڑا ہوا اور وہاں سے بہرائچ
پہنچ گیا۔ بہرائچ میں اسے ایک ایسا آدمی ملا۔ جو اسے کھانا
کھلا دیا کرتا لیکن اس کے بدلے اسے سامان ڈھونا پڑتا تھا۔
وزنی بورے ہوتے تھے جنھیں لاد کر وہ چل نہیں پاتا تھا
پر وہ آدمی اسے بری طرح مارا کرتا تھا تنگ آ کر وہ بہرائچ
سے بھی بھاگا اور پھر لکھنؤ آ گیا اس بار لکھنؤ میں اسے پکڑ کر علی گنج
میں بھیج دیا گیا پھر عدالت نے اسے اس اسکول میں بھیجنے
کا حکم دیا۔ یہاں اس کی پڑھائی بھی ہو رہی ہے اور اسے صنعتی
تعلیم بھی دی جا رہی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اس اسکول سے
نکلنے کے بعد وہ اس قابل ہو جائے گا کہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو
سکے اور شریفوں کی طرح زندگی گزار سکے۔

بچوں کی بری عادتیں، والدین کے لیے ایک سنجیدہ مسئلہ
بن جاتی ہیں۔ جب اصلاح کی تمام کوششیں اور ترکیبیں بیکار
ہو جاتی ہیں تو پھر وہ انھیں اصلاحی سکول میں داخل کر دیتے ہیں۔
شاہجہانپور کے رہنے والے ایک لڑکے شیام منوہر کو اس کے والد
یہاں داخل کر گئے تھے۔ شیام منوہر ذہین ہے۔ ۱۲ سال کی عمر میں
ہی بڑی عقل مندی کی باتیں کرتا ہے اسے بڑی ندامت ہے کہ
بعض لڑکوں کے ساتھ رہ کر اسے پیسے چرانے کی عادت پڑ گئی
تھی اور گھر سے پیسے چرا کر سنیما وغیرہ دیکھا کرتا تھا۔ ماں باپ
نے بہت سمجھایا۔ سختی بھی کی۔ اس حرکت پر کئی بار اسے بہت
زیادہ مارا بھی گیا۔ کئی کئی دن تک بھوکا بھی رکھا گیا لیکن جب
اس کی یہ عادت نہ چھوٹی تو اس کے باپ اسے اسکول میں لے
آئے۔ یہاں وہ پانچویں درجے میں پڑھ رہا ہے ساتھ ہی ساتھ
سلائی کا کام بھی سیکھ رہا ہے اسے امید ہے کہ جب یہاں سے
اسے چھٹی ملے گی تو وہ شاہجہانپور واپس جا کر سلائی کا کام کرے
گا۔ خوب محنت کر کے پیسہ کمائے گا اور اپنی خدمت سے والدین
کو زیادہ سے زیادہ آرام پہنچائے گا۔

بچوں کی تربیت کی طرف سے غفلت برتنے والے والدین
کے علاوہ ایسے ماں باپ بھی ہوتے ہیں جو کسی میلے، نمائش یا دوسری
بھیڑ بھاڑ کی جگہ پر اپنے بچوں کو بڑے شوق سے لے جاتے ہیں
لیکن وہاں پہنچ کر ان کی ذرا سی لاپرواہی سے بچہ بچھڑ جاتا
ہے پھر زندگی بھر وہ اس کی یاد میں خون کے آنسو بہاتے رہتے
ہیں۔

کئی سال ہوئے جب ایک بہت چھوٹا بچہ لاوارث
بچے کی حیثیت سے اس اسکول میں داخل کیا گیا تھا اس بچے
کو اپنا ماضی بالکل یاد نہیں، نہ ہی اسے یہ خیال ہے کہ اس کے
ماں باپ کیسے تھے۔ اپنی یادداشت پر بہت زور دینے
کے بعد وہ صرف اتنا ہی بتا پاتا ہے کہ وہ اپنے ماں باپ کے
ساتھ میلہ دیکھنے جا رہا تھا کہ ان سے بچھڑ گیا۔ اس اسکول
میں اسے اوم پرکاش کے نام سے پکارا جاتا ہے ابھی وہ اتنا
سمجھدار نہیں ہے کہ اپنے مستقبل کے بارے میں کچھ بتا سکے اور
یہ کہہ سکے کہ اس اسکول سے نکلنے کے بعد کیا کام کرے گا۔
حکومت کے اصلاحی اسکولوں میں ان بچوں کی تعلیم و
تربیت کا بہت اچھا انتظام ہے۔ صنعتی تعلیم کے ذریعے یہ
کوشش کی جاتی ہے کہ اسکول سے نکل کر بچے اپنے پیروں
پر کھڑے ہو سکیں۔ لکھنؤ کے اصلاحی اسکول میں بچوں کا
ایک بینڈ بھی ہے جسے مناسب معاوضے پر لوگ اپنے یہاں
کی تقاریب میں بلاتے ہیں۔ اس سے جو معاوضہ ملتا ہے اس
کا کچھ حصہ اس میں شریک بچوں کے حساب میں جمع کر دیا جاتا
ہے یہ رقم انھیں اسکول سے رخصت کرتے وقت دے دی
جاتی ہے تاکہ باہر جا کر اس سے کوئی کام شروع کر سکیں۔

ان بچوں سے ملاقات کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ گھروں
سے بھاگنے والے زیادہ تر بچے ایسے ہوتے ہیں جن کے والدین غریبی اور

(باقی صفحہ ۱۱۲ پر)

ڈاکٹر اقبال ماہر
۲۲۷-نخاس کہنہ - الہ آباد ۳

عالیشان ہیں بچے

دل ہیں بچے جان ہیں بچے   راحت کا سامان ہیں بچے
سیرت میں معصوم فرشتے   صورت میں انسان ہیں بچے
گھر کے آنگن کی پھلواری   کلیوں کی مسکان ہیں بچے
چھوٹے موٹے بھولے بھالے   عظمت کی پہچان ہیں بچے
ان میں افلاطون ارسطو   حکمت میں لقمان ہیں بچے
ان میں باپو اور جواہر   ملک کے ودیہان ہیں بچے
یہ نعمت قسمت سے ملی ہے   قدرت کا احسان ہیں بچے
مستقبل کے افسانوں کا   اچھا سا عنوان ہیں بچے
ان کو محبت سے ہے مطلب   نفرت سے انجان ہیں بچے
کمسن ہیں کمزور بظاہر   ہمت میں بلوان ہیں بچے
ہر گھر میں ہے رونق ان سے   ہر محفل کی جان ہیں بچے
بھارت ماتا کے سینہ میں   پیار بھرا ارمان ہیں بچے
ماہر یہ فردا کے محافظ
اپنے وطن کی شان ہیں بچے

روسی زبان میں بچوں کے لوک گیت ——— (صفحہ ۹۸ کا بقیہ)

بچوں سے متعلق روسی لوک گیتوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ روسی عوام کے خیالات بچوں کے متعلق کیا تھے۔ زمانہ قدیم کے مواضعات میں جہاں ایک طرف بڑا کنبہ، گھر کے مالک کے لیے ایک بار گراں تھا وہیں نوزائیدہ بچہ بیکار و بے مصرف تصور کیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ کومل جذبات اور ممتا سے بھرپور مائیں بھی ضروریات زندگی اور شفقت کے کاموں سے تنگ آکر کبھی کبھی اپنے جگر گوشوں کو گالیاں تک دے دیا کرتی تھیں۔ اور یہ طعنہ دیتی تھیں کہ وہ ایسے گھر میں کیوں پیدا ہوئے جہاں ان کے بغیر بھی کچھ نہیں رکھا تھا۔

مگر یہ پہلے کی بات تھی۔ اب زمانہ بدل گیا ہے۔ آج کل کی لوریوں کا آہنگ کچھ اور ہے۔ ان میں بچوں کے پیار اور لگاوٹ کے جذبات سمو دیے گئے ہیں۔ اور ان کے بچھڑ جانے کے تصور ہی سے ماں کا پیار بھرا دل کانپ کانپ اٹھتا ہے۔

بچے کل کی آشائیں ہیں۔ ماں باپ کی امیدوں کا مرکز اور زندگی کا حاصل ہیں۔ "ایک روز بڑا ہوگا۔ باپ کے ساتھ سا گر پر جائے گا وہ مچھلیاں پکڑے گا۔"

یہ حسین اور مسرت بخش خواب ہیں جو ماں باپ کے لیے بہت بڑا سہارا ہیں اور جو ان کے خیال سے ضرور شرمندۂ تعبیر ہوں گے۔ بچوں سے متعلق روس کے موجودہ لوک گیت جیون کے نئے سکھ اور درخشاں مستقبل کی جھلکیاں پیش کرتے ہیں۔ ••

★

بھٹکے ہوئے راہی ——— (صفحہ ۱۱۱ کا بقیہ)

مفلسی کی وجہ سے انھیں نہ تو تعلیم ہی دلا سکتے ہیں اور نہ ہی ان کی تربیت پر توجہ دیتے ہیں۔ کچھ بچے اپنے گھروں سے اس لیے بھی بھاگ کھڑے ہوتے ہیں کہ ان کے والدین آپس میں جھگڑتے اور گھر کا ماحول خراب کرتے رہتے ہیں۔ کچھ بچوں کو سوتیلی ماں کے برتاؤ نے بھی گھروں سے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ گھروں سے بھاگنے والے لڑکوں کی خاصی تعداد ایسی بھی ہے۔ جن کے باپ شرابی ہوتے ہیں اور نشے میں دھت ہو کر اپنی بیوی اور بچوں کو بے تحاشہ مارا کرتے ہیں۔

★

اکرام حسین انصاری اکرام
گوپی نگر - تالکٹورہ روڈ
لکھنؤ - یوپی

میرے پیارے وطن

میرے پیارے وطن میرے نیارے وطن
تجھ پہ قربان ہوں میرے جان اور تن
میرے پیارے وطن میرے نیارے وطن

تو ہے شاداب پھولوں بھرا اک چمن
سبز تیری زمیں سر پہ نیلا گگن
میرے پیارے وطن میرے نیارے وطن

تیرے دامن پہ پربت ہیں پھولوں بھرے
تیرے آنگن میں بہتی ہیں گنگ و جمن
میرے پیارے وطن میرے نیارے وطن

تیری ممتا ہے سب کے لیے ایک سی
کوئی مسلم ہو سکھ ہو کہ ہو برہمن
میرے پیارے وطن میرے نیارے وطن

ہیں عبادت کے تیرے یہاں خوب ڈھنگ
مسجدوں میں اذاں مندروں میں بھجن
میرے پیارے وطن میرے نیارے وطن

تیرے قدموں کو دھوئے سمندر کا جل
تیری چوٹی سنوارے ہمالہ کہن
میرے پیارے وطن میرے نیارے وطن

ہم ہیں اکرام ہندی ہمیں ناز ہے
پیار اپنا دھرم پریم اپنا چلن
میرے پیارے وطن میرے نیارے وطن

مصطفیٰ فطرت
۳۹ - حسن پوریہ کشمیری محلہ لکھنؤ ۳

نونہالانِ چمن

حسنِ تنظیم کے معیار بناؤ بچو!
درس اخلاص و محبت کے پڑھاؤ بچو!
ہیں جو گمراہ انھیں راہ پہ لاؤ بچو!
جو کہو اس کو عمل کر کے دکھاؤ بچو!
میرے خوابوں کی تمنا یہ تمھیں یاد رہے
ایسا اقدام عمل ہو کہ ہر اک شاد رہے

خلق و ایثار و مروت سے دلوں کو جیتو
موم فولاد بنے ایسا ہنر تم سیکھو
ساتھ ہمجولیوں کے حسنِ سلوک ایسا ہو
اپنے بیگانے میں کچھ فرق نہ مطلق سمجھو
تب کہیں منزلِ مقصود نظر آئے گی
ہر طرف عیش و مسرت کی گھٹا چھائے گی

نفرت و بغض کے دھارے کو اگر پلٹاؤ
ایک مرکز پہ اگر کھینچ کے سب کو لاؤ
جو نہیں جانتے ان کو یہ اگر سمجھاؤ
علم و اخلاق و مروت کے ترانے گاؤ
دور گلشن سے کدورت کا اندھیرا ہو جائے
ہر طرف مہر و محبت کا اجالا ہو جائے

اظہر لکھنوی
تکیہ پیر غائب۔ بھوانی ٹولہ
لکھنؤ ۳

بچوں سے خطاب

پیارے بچو ہند کو جنت بنانا ہے تمھیں
روشنی امن و محبت کی بڑھانا ہے تمھیں

نونہالو اپنے گلشن کو سجانا ہے تمھیں
علم کی اک روشنی بن بن کے چھانا ہے تمھیں

اپنے ہاتھوں اپنا مستقبل بنانا ہے تمھیں
آج ملک و قوم کی عظمت بڑھانا ہے تمھیں

کھیلو کودو شوق سے لیکن رہے یہ بھی خیال
علم اور تہذیب کا دامن بچانا ہے تمھیں

علم کے سانچے میں ہنستے کھیلتے ڈھل جاؤ تم
پیارے بچو علم کا دریا بہانا ہے تمھیں

آج اس گرتی ہوئی انسانیت کے دور میں
پرچم انسانیت پھر سے اٹھانا ہے تمھیں

علم جب حاصل کروگے خود سنور جاؤ گے تم
ہر فضا ہر در کو دل کش بنانا ہے تمھیں

ذہن و دل میں روشنی ہی روشنی ہو علم کی
منزلِ مقصود پر اس طرح جانا ہے تمھیں

ہے دعا اظہر کی بچوں کے لیے پھولیں پھلیں
پیارے بچو ملک کی قسمت جگانا ہے تمھیں

بانو طاہرہ سعید
حیدرآباد (اے۔پی)

بچوں کا سال

"وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ"
وجودِ طفل سے ہے کائنات۔ نغمہ بلب!
ہے تندرست سا بچہ بھی کس قدر دلکش
چمکتی آنکھیں۔ دمکتا ہوا رُخِ معصوم!
کبھی خفا تو کبھی شاد۔ اپنی مرضی سے
ہر ایک شے کا تجسس ہر اک سے دلچسپی
عجب عجب سے سوالات عجب عجب سی زباں
نہ بھید بھاؤ ہے دل میں نہ مصلحت کوشی
نہ پوچھو کون سی دنیا کا ہے یہ باشندہ
ہر ایک قوم کا ملت کا ہے یہ سرمایہ
اسی کے دم سے ہے مستقبلِ بشر کی "امید"
اسے اگر نہ ملے تندرستی۔ کیا ہوگا
ملے نہ اس کو مناسب غذا تو کیا ہوگا
اگر یہ پیار سے محروم ہو تو کیا ہوگا
اسے نصیب نہ تعلیم ہو تو کیا ہوگا
غلط ملے اسے ماحول گر تو کیا ہوگا
سماج پر نہیں ذمہ تو کس پہ ذمہ ہے؟
یہ بے گناہ یہ معصوم عمر بھر کے لیے
رہِ حیات کی تاریکیوں میں کھو جائے
سماج گر نہیں مجرم تو کون ہے مجرم؟
نہیں سماج پہ ذمہ تو کس پہ ذمہ ہے؟

ڈاکٹر اے ایچ انصاری
سینیر چائلڈ اسپشلسٹ
سول اسپتال۔ لکھنؤ

بچّوں کی خوراک طبّی نقطۂ نظر سے

ہمارے ملک میں بچّوں کی خوراک میں ضروری قوت بخش اجزا مناسب مقدار میں نہ ہونے کی وجہ سے بچے متعدد بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یہ صورت حال عام طور سے غریب گھرانوں میں پائی جاتی ہے جہاں غریبی کے سبب پیٹ بھر خوراک بچوں کو نہیں مل پاتی۔ لیکن ان گھرانوں میں بھی، جہاں کسی چیز کی کمی نہیں ہوتی محض لاعلمی کے سبب مناسب خوراک بچوں کو نہیں مل پاتی ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں بعض ضروری امور یہاں پیش کیے جا رہے ہیں۔ جن پر عملی توجہ کے ذریعہ بچوں کی پرورش اور نشو و نما میں یقیناً مدد ملے گی۔ یہ امور حسب ذیل ہیں :

بچوں کی خوراک کے سلسلے میں یہ بات خاص طور سے توجہ چاہتی ہے کہ ۶ ماہ کی عمر تک تو بچے صرف ماں کے دودھ پر گزر کر سکتے ہیں۔ لیکن اس عمر کے بعد دودھ پوری خوراک کا کام نہیں کرتا۔ اس لیے اس عمر کے بعد بچوں کو دیگر چیزیں بھی دینا شروع کر دینا چاہیئے۔

بچوں کی خوراک میں جن ضروری اجزا کا ہونا ضروری ہے وہ ہیں : پروٹین، کاربوہائیڈریٹ، چربی، پانی، معدنیات، رقیق اشیا اور وٹامنس۔ ان میں سے کسی جز کی بھی کمی ہونے پر بچہ بیمار ہو سکتا ہے۔

پروٹین : بچوں کو پروٹین بخش غذا دینا بہت ضروری ہوتا ہے۔ پروٹین کی کمی کے سبب بچے کو ایسا مرض لاحق ہو جاتا ہے جس میں وہ بہت کمزور ہو جاتا ہے۔ اس کے پورے بدن میں سوزش ہو جاتی ہے۔ پیٹ میں پانی اتر آتا ہے۔ کھال چتکبری ہو جاتی ہے۔ بالوں کا رنگ بھورا ہو جاتا ہے اور بچہ ہر وقت روتا رہتا ہے۔ اس کی نشو و نما رک جاتی ہے کیونکہ خون کی کمی ہو جاتی ہے۔ اس مرض میں مبتلا بچوں کو پروٹین بخش غذا زیادہ دینا چاہیے۔ ابتدا سے ہی پروٹین بخش غذا دی جاتی رہے تو بچہ اس مرض سے محفوظ رہتا ہے۔ پروٹین بخش اشیا حسب ذیل ہیں :

دالیں، مٹر، سیم، دودھ، پنیر، سویابین، مچھلی، انڈا گوشت، کلیجی، بیج کی اشیا مثلاً کرٹھی، دال موٹھ، سیو، چنا وغیرہ۔

کاربوہائڈریٹ : یہ بچوں کی خوراک کا ایک اہم جز ہے۔ اس کی کمی کے سبب بچہ بہت کمزور اور دبلا ہو جاتا ہے نیز اس کے بدن کا گوشت اور چربی بالکل ختم سی ہو جاتی ہے جس کے سبب بچے کے جسم پر ہڈی ہی ہڈی نظر آتی ہے۔ ایسے بچے بہ آسانی متعدد بیماریوں کے شکار ہو جاتے ہیں۔ کاربوہائڈریٹ مندرجہ ذیل اشیا میں ہوتا ہے :

چاول اور اس سے تیار شدہ اشیا، گیہوں اور اس سے تیار شدہ اشیا، شکر اور اس سے بنی چیزیں، آلو، چقندر اور حلوا۔

بچوں کو مندرجہ بالا اشیا ضرور دی جانا چاہیے :

چربی : اس سے بچوں کا بدن سڈول ہوتا ہے۔ اسی کے ذریعہ بعض وٹامن مثلاً وٹامن اے، ڈی، ای اور کے حل ہو کر

خون میں پہنچتے ہیں۔ چربی کی کمی دو اسباب کی بنا پر ہوتی ہے ایک خوراک کی کمی کے باعث۔ دوسرے ہاضمہ ٹھیک نہ رہنے کے سبب یہ ہضم نہیں ہوپاتی اور پاخانے کے راستے نکل جاتی ہے۔ اس کی کمی کے سبب بھی بچے دبلے ہوجاتے ہیں۔

وٹامن اے کی کمی کے باعث رتوندھی کا مرض لاحق ہوجاتا ہے اور کبھی کبھی آنکھوں کی بینائی بھی جاتی رہتی ہے۔ وٹامن ڈی کی کمی کے سبب بچے سوکھے کی بیماری کا شکار ہوسکتے ہیں۔ چربی گھی، تیل، جانوروں کی چربی، مچھلی کے تیل، دودھ، مکھن، گوشت اور مچھلی وغیرہ سے حاصل ہوتی ہے۔

معدنیات (منرلس):

لوہا: یہ خوراک کا ایک بہت ہی ضروری جز ہے۔ اس سے خون بننے میں مدد ملتی ہے۔ چھ ماہ سے زائد عمر کے بچوں کی غذائی ضرورت محض دودھ سے پوری نہیں ہوتی۔ اس لیے بچوں کو دیگر اشیا بھی دینا شروع کر دینا چاہیے۔ لوہا ہری سبزیوں، گاجر، چقندر، گڑ، اور دودھ وغیرہ میں ہوتا ہے۔ اس کی کمی کے سبب بچے کمزور ہوجاتے ہیں۔ ناخن سفید ہوجاتے ہیں۔ آنکھوں کے سفید حصے میں پیلاپن آجاتا ہے۔ اس کیفیت والے مرض کو انیمیا کہتے ہیں۔ مندرجہ بالا اشیاء بچوں کو دی جاتی رہیں تو وہ اس مرض سے محفوظ رہیں گے۔

کیلشیم: یہ دودھ، پنیر، انڈے اور گوشت جیسی چیزوں میں ہوتا ہے۔ اس سے ہڈی مضبوط ہوتی ہے۔ اس کی کمی سے بچوں کو سوکھے کا مرض لاحق ہوجاتا ہے۔ کیلشیم وٹامن ڈی اور سورج کی روشنی کی مدد سے جسم کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ اس لیے بچوں کے بدن پر سورج کی روشنی کا پڑنا ضروری ہے

فاسفورس:۔ کیلشیم کی طرح یہ بھی وٹامن ڈی اور سورج کی روشنی کی مدد سے جسم کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ اس کی کمی کے سبب بھی سوکھے کی بیماری ہوجاتی ہے۔ فاسفورس دودھ وغیرہ میں ہوتا ہے۔ بچے کو اگر بتائی گئی غذا اور دودھ ملتا رہے تو اس کی کمی نہیں ہوتی۔

آیوڈین:۔ یہ ماں کے دودھ میں مناسب مقدار میں ہوتا ہے۔ اور پانی میں بھی اس کا کچھ جز رہتا ہے۔ ان علاقوں میں جہاں پانی میں اس کی کمی ہوتی ہے (جیسے گورکھپور اور دیوریا وغیرہ) ماں کا دودھ چھوڑ دینے والے بچوں کے بدن میں آیوڈین کی کمی ہوجاتی ہے جس کے سبب گلے کے غدود بڑھ جاتے ہیں۔ جسے عام طور سے لوگ گھینگھا کہتے ہیں۔

آیوڈین نمک میں ہوتا ہے۔ یہ نمک گولی کی شکل میں ملتا ہے۔ جس کے روزانہ استعمال سے اس کی کمی پوری ہوجاتی ہے۔

فلورین:۔ عام طور سے میونسپلٹی کے پانی میں اس کی مناسب مقدار شامل رہتی ہے۔ اس کی کمی اور بیشی دونوں ہی مسوڑھوں اور دانتوں کے لیے نقصان دہ ہوتی ہے۔

وٹامن اے:۔ یہ غذا کا ایک بہت ہی ضروری جز ہے۔ اسکول جانے سے پہلے کی عمر کے ۴۰ فیصد بچے اس کی کمی کے سبب بیمار ہوتے ہیں اور سال میں تقریباً ۔۔۔۱۴ بچے اس کی کمی کے باعث نابینا ہوجاتے ہیں۔ وٹامن اے گاجر، لوکی، ہری سبزیوں پالک کے ساگ، امرود، پپیتا، کیلا، دودھ، انڈے، کلیجی، مچھلی اور مچھلی کے تیل وغیرہ میں پایا جاتا ہے۔ بچوں کو اگر دو آونس ہری سبزی روزانہ کھلائی جائے تو اس کی کمی نہیں ہوتی۔ اس کی کمی کے نتیجے میں رتوندھی ہوجاتی ہے اور آنکھوں کی سفیدی میں میلاپن اور سیاہی میں سفیدی پیدا ہوجاتی ہے جسے لوگ ماڑا کہتے ہیں۔ صحیح علاج نہ ہونے پر بچے اپنی بینائی ضائع کر دیتے ہیں۔ اس بیماری میں ابتدا ہی سے وٹامن اے دیا جاتا رہے تو مرض کی روک تھام ہوجاتی ہے اور اگر مذکورہ بالا اشیاء کا استعمال ابتدا ہی سے جاری رہے تو یہ مرض دور ہی رہے گا۔

وٹامن بی۔ کمپلکس:۔ یہ دودھ، گوشت، مچھلی، انڈے ہری سبزیوں اور پھلوں میں ہوتا ہے۔ اس کی کمی ان لوگوں میں ہوجاتی ہے جو روزانہ کی عمومی غذا کے علاوہ دیگر کوئی شے نہیں لیتے۔ اس کی کمی ان لوگوں میں بھی ہوجاتی ہے جن کی خاص غذا مکئی ہے۔ اس کے علاوہ بچوں کے پیٹ خراب ہوجانے کی وجہ سے

بھی اس کی کمی ہو جاتی ہے جس کے سبب کھال پر روکھاپن اور پیروں پر سوجن آجاتی ہے اور پیٹ میں پانی اتر آتا ہے کھال کا رنگ چتکبرہ ہو جاتا ہے۔ ہونٹوں کے کناروں پر زخم ہو جاتا ہے زبان اور منھ میں چھالے پڑ جاتے ہیں۔ مذکورہ بالا اشیا کا استعمال کرتے رہنے سے یہ مرض نہیں ہوتا۔

وٹامن سی:۔ لیموں، آنولے، نارنگی، موسمی اور ٹماٹر وغیرہ میں ہوتا ہے۔ دودھ، پھل اور ہری سبزیوں میں بھی اس کا کچھ جز ہوتا ہے۔ یہ مسوڑھوں کو مضبوط رکھتا ہے۔ اس کی کمی سے مسوڑھوں اور جسم کے متعدد حصوں سے خون آنے لگتا ہے اور ہڈیو میں درد رہتا ہے۔

وٹامن ڈی:۔ جب سورج کی کرنیں بچے کے بدن پر پڑتی ہیں تو بدن وٹامن ڈی بنا لیتا ہے۔ اس کی کمی ان بچوں میں ہوتی ہے جنھیں سورج کی روشنی نہیں مل پاتی یا جن کا پیٹ خراب رہتا ہے۔ اس کی کمی سے سوکھے کی بیماری ہو جاتی ہے۔ جس میں ہڈیاں ٹیڑھی ہو جاتی ہیں۔ پیٹ باہر نکل آتا ہے، پیشانی باہر کو ابھر آتی ہے نیز سینے کی ہڈی باہر اور پسلی کی ہڈیاں اندر ہو جاتی ہیں۔ بچوں کو سورج کی روشنی ملتی رہے تو انھیں یہ مرض نہیں ہوتا۔ اس مرض میں مبتلا بچے کو ڈاکٹر کو ضرور دکھا دینا چاہیے۔

وٹامن کے:۔ اس کی کمی پت کی بیماری یا پیٹ کی خرابی یعنی پرانی پیچش کے سبب ہو جاتی ہے۔ اس کی کمی سے بچوں کی ناک، منھ سے اور پاخانے کے راستے خون آنے لگتا ہے۔ وٹامن کے کی گولی یا انجکشن بر وقت دے دینے سے یہ مرض ٹھیک ہو جاتا ہے۔

رقیق چیزیں:۔ ان تمام اشیا کے علاوہ جن کا ذکر مندرجہ بالا سطور میں کیا گیا، بچے کو رقیق اشیا بھی دینا ضروری ہوتا ہے جن میں پانی، دودھ، پھلوں کا رس اور سوپ وغیرہ شامل ہیں۔ ابتدا میں بچوں کو فی پونڈ وزن پر ہر ۲۴ گھنٹے میں ۲½ آونس اور چار سال سے زیادہ کی عمر کے بچوں کو فی پونڈ وزن پر ہر ۲۴ گھنٹے میں ۱½ آونس رقیق شے دینا چاہیے۔ رقیق اشیا کی کمی سے آنکھیں دھنس جاتی ہیں۔ کھال پر جھریاں پڑ جاتی ہیں۔ پیٹ دھنس جاتا ہے۔ بچہ بار بار پانی مانگتا ہے اور کمزور ہو جاتا ہے۔

مذکورہ بالا حقائق کی روشنی میں تمام والدین کے لیے یہ لازمی ہے کہ وہ بچوں کی غذا میں وہ تمام چیزیں شامل کریں جن میں مندرجہ بالا قوت بخش اجزا ہوتے ہیں۔ اس سے بیماریاں کم ہوں گی اور بچہ تندرست و توانا رہے گا نیز اس کی صحیح اور مناسب نشو و نما ہوگی۔

★

فلاح اطفال: (صفحہ ۱۰۷ کا بقیہ)

قوت بخش غذا اسکیم اسی سال ۱۲ میدانی اور دو پہاڑی اضلاع میں شروع کی جا رہی ہے۔ اس اسکیم کے تحت بچوں کو پروٹین سے پُر متوازن غذا اور حاملہ نیز دودھ پلانے عورتوں کو قوت بخش غذا فراہم کی جاتی ہے۔

بین اقوامی سال اطفال کا پیغام ہر فرد تک پہنچانے کے لیے یوم اطفال کے موقع پر ہر ضلع اور منطقہ کی نیز ریاستی سطح پر مختلف قسم کی تقریبات مثلاً بچوں کا میلہ، کانفرنس نمائش سیمینار اور مقابلے منعقد کیے جائیں گے اور بچوں کو انعامات دیے جائیں گے۔

فلاح اطفال کی ان مختلف اسکیموں کا مقصد بچوں کو ایسی سہولتیں فراہم کرنا ہے جن سے وہ ملک کے کارآمد شہری بننے کے ساتھ ہی اپنی زندگی میں بھی کامران و کامیاب ہو سکیں۔

★

ڈاکٹر افسر جہاں (ایم۔ بی۔ بی۔ ایس)
سپرنٹنڈنٹ لیڈی ہاسپٹل۔ بلیا

ہوتی ہے پھولوں سے چمن کی زینت

کوئی بھی ملک اور کوئی بھی قوم بچوں کو نظر انداز کر کے ترقی نہیں کر سکتی۔ بچے ملک کی بیش بہا دولت اور مستقبل کے معمار ہوتے ہیں نیز ایک مہذب، شائستہ اور سربلند قوم کی تعمیر میں کلیدی رول ادا کرتے ہیں۔ مفکرین نے بچوں کو انسان کا جدِّ امجد بھی کہا ہے۔ اور ان کی نشو نما اور تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت کا احساس دلایا ہے۔

بچوں سے ہی ایک خاندان کی خوشیاں، زندگی کی ہما ہمی وابستہ ہے۔ انسان کی تمام جدّ و جہد تمام قدریں، بہتر سے بہتر نظامِ حیات کی خواہش اور اس کے حصول کی کوشش اور ہر دم ترقی کی منزلوں کی جانب رواں دواں رکھنے والی خون کی گرمی سبھی کچھ تو بچوں کے دم سے ہے۔ جس گھر میں بچے ہوں وہ گھر خوش نصیب ہوتا ہے۔ سب والدین اپنے بچوں کو بہتر غذا فراہم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ماں باپ چاہے دیہات کے ہوں یا شہر کے تعلیم یافتہ ہوں یا غیر تعلیم یافتہ یہ کبھی نہیں چاہتے کہ ان کے بچے بھوک سے بے حال اور غیر تعلیم یافتہ رہیں۔ جہاں تک ہمارے ملک کا تعلق ہے تو بلاشبہ یہ ایک غریب ملک ہے۔ ترقی کی راہوں کا ایک مسافر ہے۔ لیکن ذاتی طور پر میں نے محسوس کیا ہے کہ ہم جتنے زیادہ احساسِ کمتری کا شکار رہیں در حقیقت اُتنے کمتر ہیں نہیں۔ یہ احساسِ کمتری دراصل ہماری بے فکری اور لاپرواہی کی پیداوار ہے جس کو دور کرنا ملک کی ترقی کے لیے اشد ضروری ہے۔

میں نے اکثر محسوس کیا ہے کہ انسان کے پاس پیسے کی کمی نہ ہوتے ہوئے بھی وہ اس لاعلمی کے باعث اچھی صحت سے محروم رہ جاتا ہے کہ تندرستی کے لیے کس طرح کی خوراک کی کتنی ضرورت ہوتی ہے۔ انڈا مچھلی دودھ اور پنیر میں اُلجھے ذہن، آٹے کی چوکر۔ بھوسی لگے میلے چاول۔ بازار کی سب سے سستی سبزی، چولائی یا پالک کے فوائد سے لاعلم ہیں۔ وٹامن کو طاقت کا سرچشمہ سمجھنے والے وٹامن پر وٹامن کھا کھا کر بھی تندرستی بہتر نہ ہونے کے شاکی ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ ہمارے جسم کو کس وٹامن کی کتنی مقدار کی ضرورت ہوتی ہے اور روز مرہ کی کتنی ضرورت خوراک کے ذریعہ پوری ہوتی ہے۔

صحیح معنوں میں تندرستی صرف بیماریوں سے محفوظ رہنا ہی نہیں ہے بلکہ صحیح معنوں میں دماغی۔ جسمانی اور سماجی اعتبار سے بھی صحت مند ہونے کا نام ہی تندرستی ہے۔ اقوامِ متحدہ نے اس سال کو بچوں کا سال قرار دیا ہے۔ چنانچہ ہر فکر جو بچوں کی فلاح بہبود کے لیے ہو اس میں عمل کی روح پھونکنے کی ذمہ داری ہم پر عائد ہوتی ہے۔ اسی کے ساتھ ہی اس سلسلے میں ہر سطح پر عوام کو بیدار کرنا ہمارا نصب العین ہونا چاہیے۔

ہمارا ملک ایک عظیم ملک ہے۔ آبادی کے لحاظ سے بھی ہر سال عظیم سے عظیم تر ہوتا جا رہا ہے۔ ملک کی بیشتر آبادی دیہاتوں میں رہتی ہے۔ تقریباً بیس فی صد آبادی ہی شہروں میں رہتی ہے۔ ۱۵ برس سے کم کی عمر کے بچے ۴۲ فی صد ہیں اور دیہاتوں میں رہنے والے بچے ۴۰، فی صد نیز قبائلی بچے ۶ فی صد ہیں۔

دُنیا کے ترقی پذیر حصے میں ہر سال تقریباً ۸۰ کروڑ بچے پیدا ہوتے ہیں۔ اور پچاس لاکھ بچے ہر سال مرجاتے ہیں۔ کل آبادی کا تقریباً دس فی صد حصہ ہی بیماریوں سے تحفظ کے ٹیکے لگوا پاتا ہے۔ جبکہ ترقی یافتہ ملکوں میں بچے اپنی پہلی سالگرہ منانے تک کم سے کم آٹھ بیماریوں سے تحفظ کے ٹیکے لگوا لیتے ہیں۔

ہمارے ملک میں ایک اندازے کے مطابق دو کروڑ دس لاکھ بچے ہر سال پیدا ہوتے ہیں۔ یا یوں کہیئے کہ اس چمن میں ہر سال دو کروڑ دس لاکھ کلیاں کھلتی ہیں لیکن افسوس ۳۵ لاکھ کلیاں اگلی بہار دیکھنے سے پہلے ہی مرجھا جاتی ہیں۔ ہمارے دیہاتوں میں شرح اموات شہر کی بہ نسبت زیادہ ہے۔ ایک ہزار زندہ پیدا ہونے والے بچوں میں ۱۲۴۰۴ بچے اپنی پہلی سالگرہ بھی نہیں دیکھ پاتے اور مرنے والے بچوں کی مجموعی تعداد میں ایسے بچوں کی تعداد تقریباً ۲۰ فی صد ہے۔ ماں کی خراب صحت، دوران حمل مناسب خوراک اور خون کی کمی کے سبب نہ جانے کتنے ہی بچے پیدائش سے پہلے ہی فوت ہوجاتے ہیں۔ لیکن ذرا اُن بچوں کے متعلق سوچیے جو ماں باپ کے لیے ایک بوجھ بن کر زندہ رہتے ہیں۔ جو نہ مرتے ہیں اور نہ زندگی کا کوئی لطف حاصل کرپاتے ہیں۔ مثلاً دماغی طور پر کمزور۔ بناوٹ کے اعتبار سے ناقص۔ بیماریوں کے سبب لقوہ زدہ۔ پھیپھڑوں اور دل کے امراض سے متاثر۔ بہرے۔ اندھے۔ کمزور اور معذور بچے۔ جن کا پالنا ایک مستقل عذاب یا قہر خداوندی محسوس ہوتا ہے۔

یہ بات اب سبھی جانتے ہیں کہ بیماریوں میں پولیو۔ دماغی کمزوری اور جسمانی لقوہ پیدا کرتی ہے۔ کالی کھانسی نہ صرف یہ کہ بچے کا کھایا پیا الٹی کی شکل میں جسم کے باہر کردیتی ہے بلکہ متعدد بیماریوں جیسے تپ دق اور سانس کی دوسری بیماریوں کے لیے راستہ کھول دیتی ہے۔ تپ دق بذات خود بچوں سے بڑوں تک سب کو متاثر کرنے والا مرض ہے اور کبھی کبھی خاندان کا خاندان تباہ کردیتا ہے۔ ڈفتھیریا ایک بہت خاموش مگر بے حد خطرناک مرض ہے۔ محبت کی طرح یہ بھی چپکے چپکے اثر کرتا ہے اور جب بھرپور وار کر جاتا ہے تو سانس رُکنے لگتی ہے۔ حالت غیر ہوجاتی ہے اور تب موت ہی راحت دیتی ہے۔ اگر کوئی بچہ اس کے آہنی شکنجہ سے بچ بھی نکلا تو دماغی اور جسمانی طور سے اتنا معذور ہوجاتا ہے کہ زندگی اجیرن ہوجاتی ہے۔ ٹٹنس اور خسرہ جیسے موذی مرض بھی محتاج تعارف نہیں پھر بھی برسبیل تذکرہ عرض کردوں کہ ٹٹنس نہ صرف بچے کی جان کے لیے بلکہ ماں کی زندگی کے لیے بھی خطرناک ہے۔ یہ مرض نہ صرف پھل ہی خراب کرتا ہے بلکہ اس شاخ کو بھی خشک کردیتا ہے جس سے مزید پھلوں کی امید کی جاسکتی ہے۔ خسرہ بھی جسم کی تمام طاقت نچوڑ کر جسم کی قوت مدافعت کو برباد کرکے اسے دوسرے امراض سے متاثر ہونے کے لیے بے یار و مددگار چھوڑ دیتا ہے۔ اور کبھی کبھی ہزار دو ہزار میں ایک آدھ کی جان بھی لے لیتا ہے۔

ان سب حالات سے نپٹا جاسکتا ہے۔ ان بیماریوں اور اس عذاب سے بچا جاسکتا ہے اگر خدا کی دی ہوئی عقل کا استعمال کیا جائے۔ ماں کی صحت کا خیال دوران حمل رکھا جایے۔ مناسب خوراک اور بیماریوں سے بچنے کے مناسب ٹیکے اور زچہ بچہ اسپتال میں حمل کے تین ماہ بعد سے ہی ڈاکٹر سے حمل کے نشو و نما کے متعلق بروقت صلاح لی جاتی رہے۔ بچے کی پیدائش کے بعد مناسب وقت پر سال بھر کے اندر ہی بیماریوں سے بچنے کے ٹیکے بھی لگوالیے جائیں۔ چیچک اور تپ دق کے ٹیکے پیدائش کے بعد ہی یا ایک ماہ کے اندر اندر لگوا دینا چاہئیں۔ کالی کھانسی۔ ڈفتھیریا ٹٹنس اور پولیو سے تحفظ کے لیے ایک ساتھ تیسرے چوتھے اور پانچویں ماہ تین ٹیکے لگوا دینا چاہیے۔ چوتھا ٹیکہ تیسرے کے ایک سال بعد۔ اور پانچواں ٹیکہ چوتھے کے ۳ سے ۵ سال کے بعد لگوا دینا چاہیے۔ اگر یہ ٹیکے کسی وجہ سے مناسب وقت سے نہ لگے ہوں تو ان کا فائدہ جان لینے کے بعد جتنی جلد ہوسکے لگوا دینا چاہیے۔ خسرہ کا ٹیکہ ابھی اپنے ملک میں عام تو نہیں مگر دستیاب ضرور ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ اس سال کے آخر تک یہ ٹیکہ بھی جو ۹ ماہ کی عمر میں دنیا چاہیے، عام استعمال

میں آجائے گا۔ اسی طرح ملیریا کے مرض سے بھی ٹیکے کے ذریعہ بچایا جا سکے گا۔ یہ ٹیکہ ہمارے ملک میں تیار ہو چکا ہے اور امید کی جاتی ہے کہ جلد ہی تجرباتی دور سے نکل کر عام استعمال میں آسکے گا۔

بیماریوں کے علاوہ بچوں کی اموات سب سے زیادہ حادثات کے سبب ہوتی ہیں۔ یہ حادثات کسی بھی عمر میں ہو سکتے ہیں مگر سب سے زیادہ حادثات ۲ سے ۴ سال کی عمر میں ہوتے ہیں۔ اور لڑکیوں کے مقابلہ میں لڑکے ان میں زیادہ ملوث ہوتے ہیں۔ آگ سے جلنے کے واقعات؛ سکول جانے والی عمر میں زیادہ ہوتے ہیں یا رینگ کر چلنے والی عمر میں۔ ایک سال تک کی عمر کے بچوں میں ہر چیز زمین سے اٹھا کر منھ میں رکھ لینے کی عادت ہوتی ہے۔ بچہ اس عمر میں کھڑا ہونا اور چلنا سیکھتا ہے۔ گرنے، پانی کے ٹب میں ڈوبنے زہریلی چیزوں مثلاً دوا کی گولی۔ مٹی کا تیل، اور زمین پر بکھری ضرر رساں دوسری اشیاء سے یہ حادثات ہو سکتے ہیں لہذا اس عمر کے بچوں کی مسلسل نگرانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ساتھ ہی زہریلی اشیا رکو ان کی پہنچ سے دور رکھنا بھی والدین کی ذمہ داری ہے۔

دو سال کی عمر کے بچے دوڑنے اور بھاگنے میں خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔ سڑک کے کنارے دریا اور تالاب کے کنارے۔ زینوں کے پاس۔ بجلی کے تار اور پوائنٹ کے قریب ان کی حرکتوں سے غافل نہیں ہونا چاہیے۔

بچے چار پانچ سال کی عمر میں اونچی جگہوں سے کودنے، خود سے دروازہ کھولنے۔ میز کی درازوں کی تلاشی لینے اور الماریوں پر چڑھنے کے شوقین ہوتے ہیں اس عمر میں پستول سے کھیلنے میں بھی بچے کافی دلچسپی لیتے ہیں لہذا اسلحہ، سائیکل، موٹر سائیکل۔ اور الماریاں بے قاعدگی سے رکھنے کے خطرات ذہن میں ضرور رکھنا چاہیئے۔

پانچ سے ۹ سال تک کے بچوں کو سڑک پار کرنا اور پانی میں تیرنا سکھانا چاہیے۔ اور اسلحہ بھی اس کی پہنچ سے دور رکھنا چاہیے۔ دس اور چودہ سال کے بچے اجتماعی کھیلوں میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں اور دیگر بچوں کو پریشان کرنے اور ان پر اپنی بہادری اور کارکردگی کا رعب ڈالنے کی طرف ان کا رجحان زیادہ ہوتا ہے۔ ایسے بچے خطرات میں زیادہ کودتے ہیں تاکہ ان کی تعریف کی جائے چنانچہ ان کی نگرانی سے بھی غافل نہیں رہنا چاہیے، نگرانی کا مطلب بھی نہیں ہے کہ ہر دم ان پر مسلط رہا جائے یا ہر بات پر انھیں برابر ٹوکا جائے۔ بچوں کو نرمی سے سمجھانا چاہیے، بلکہ کبھی کبھی ہلکی پھلکی چوٹ انھیں خود محسوس کرنے دیں۔ خود سے حاصل کیا گیا تجربہ تلقین اور نصیحت سے کہیں زیادہ اثر رکھتا ہے اور آئندہ زندگی میں بڑے بڑے خطرات سے بچاتا ہے۔ ہر ایک ماں باپ کی یہ دلی تمنا ہوتی ہے کہ اس کا بچہ صالح ہونے کے ساتھ ساتھ صحت مند بھی رہے۔ وہ جب اپنے گوشۂ جگر کو توانا اور تندرست دیکھتے ہیں، ان کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ بچوں کے لیے مصیبت جھیلنا ہی بہادری یا پدری ذمہ داری نہیں ہے بلکہ ان کو مصیبت سے بچائے رکھنا ہی عقلمندی ہے۔ بیماری کی حالت میں بچے کے لیے رات دن ایک کر دینے اور بے تحاشا پیسہ صرف کرنے سے کہیں زیادہ بہتر ہے کہ اس بیماری یا حادثہ کی روک تھام مناسب وقت پر پہلے ہی کر لی جائے۔ بچوں کو خود رو گھاس کی طرح اگنے کے لیے نہ چھوڑا جائے۔ ان کی پرورش خوراک تعلیم اور ذہنی آسودگی کی ذمہ داری کو سمجھا جائے۔ پیار بچے کا پیدائشی حق ہے۔ بچہ جب تک ماں کے پاس رہتا ہے اس کا دوسرا حریف پیدا کر کے پیار کی دولت کا بٹوارہ نہ کیجیے اور اس کے ذہن پر کوئی بوجھ نہ ڈال کر اسے ذہنی آسودگی کے ساتھ پلنے بڑھنے دیجئے۔ بچوں کی پیدائش میں وقفہ ضروری ہے۔ ماں اور بچے دونوں کا مفاد اسی میں مضمر ہے۔ ایک خاندان میں دو بچے آج کی ضرورت ہیں اور ان کا صحت مند ہونا اور بھی ضروری ہے۔

★

Urdu Monthly
Vol. 34 No. 8-9
NOV-DEC-1979
NAYA DAUR
POST BOX No. 146 LUCKNOW 226001
Regd No. LW/NP.17
Annual Subs. Rs. 5/-

۱۹۸۰
جنوری

جلد ۳۶ نمبر ۱۰

جنوری سنہ ۱۹۸۰ء

ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

جوائنٹ ایڈیٹر: شاہ نواز قریشی

پبلشر: ہمیندر کمار

ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اتر پردیش

پرنٹر: اشوک در

سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری یو پی
مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ

شائع کردہ محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ۔ اتر پردیش

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے
زر سالانہ: پانچ روپے

ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پرکاشن پربھاگ انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو۔پی۔ لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶۔ لکھنؤ

بہ سلسلہ رجسٹری: ایڈیٹر نیا دور انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو۔پی لکھنؤ

عنوانات

اپنی بات

سال ۱۹۷۹ء شمالی ہند خاص طور سے اتر پردیش کے لیے سخت پریشانیوں اور بحران کا سال رہا جس کے دوران اس ریاست کو زبردست خشک سالی کی تباہ کاریوں کا سامنا کرنا پڑا جس کے اثرات زندگی کے ہر شعبے میں نمایاں تھے۔ اس خشک سالی سے نہ صرف فصلوں کو زبردست نقصان پہنچا بلکہ بجلی کا بحران بھی پیدا ہوا۔ لیکن یہ بات نہ صرف قابل ذکر بلکہ قابل فخر بھی ہے کہ اتر پردیش نے اس پریشانی اور بحران کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ اب بجلی کی پیداواری صورت حال بھی بہتر ہو گئی ہے اور آئندہ فصل کے سلسلے میں بہتر امکانات بھی نمایاں طور پر نظر آ رہے ہیں۔ پریشانیوں اور بحران کے اس سال کے دوران ریاستی حکومت اور ریاست کے عوام دونوں نے زبردست حوصلے اور عزم سے کام لیا جس کے نتیجے میں مشکلات اور دشواریاں قابل تسخیر ہو گئیں۔ اس وقت جبکہ ہم اپنی جمہوریت کی ۳۰ ویں سالگرہ منا رہے ہیں حالات نہ صرف یہ کہ بہتر ہیں بلکہ امید افزا اور حوصلہ افزا بھی ہیں جس کی جھلک جشن جمہوریت کے جذبے سے سرشار بشاش چہروں پر بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ ۲۶ جنوری ۱۹۸۰ء کے جشن جمہوریہ کے موقع پر آئندہ کے لیے زیادہ تندہی، زیادہ حوصلے اور عزم کے ساتھ اپنے فرائض انجام دینے کا عہد کرنے سے پہلے ہمیں گزشتہ سال کی اپنی کامیابیوں کا جائزہ بھی لینا چاہیے اور یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ ہم نے کہیں کسی سطح پر کوئی غلطی تو نہیں کی۔ یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ انسان غلطیوں سے سیکھتا ہے اور غلطی بھی اسی سے سرزد ہوتی ہے جو اپنا قدم آگے بڑھاتا ہے۔ جہاں تک کامیابیوں کا تعلق ہے تو ان سے عزم و عمل کی راہ میں بڑی تقویت اور تحریک ملتی ہے اور ہم بہتر سے بہتر منزلوں کی جانب آگے بڑھتے ہیں۔

یوم جمہوریہ یعنی ۲۶ جنوری کی تاریخ ہر سال آتی ہے اور اس تاریخ کا کیا پس منظر ہے اور اس کی کیا اہمیت ہے؟ اسے بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں یہ بات ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے کہ ۲۶ جنوری محض جشن منانے کی تاریخ نہیں ہے۔ محض جشن اور خوشیاں منا کر ہمیں بیٹھ نہیں جانا ہے۔ ۲۶ جنوری کی تاریخ حقیقتاً ایک ایسی تاریخ ہے جو جمہوریت کے سلسلے میں ہمیں اپنا فرض یاد دلاتی ہے۔ تو آئیے اس مبارک اور پر مسرت موقع پر یہ عہد کریں کہ ہم کسی بھی سطح پر اور کسی بھی صورت میں اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی نہیں کریں گے بلکہ جمہوریت کو زیادہ سے زیادہ مستحکم اور طاقتور بنائیں گے اور ہر شعبۂ زندگی میں ہر سطح پر جمہوری طرز عمل اختیار کریں گے نیز جمہوریت کو جذبے اور فکر میں ڈھال لیں گے اور اس طرح اسے سیاسی نظام سے بڑھ کر ایک طرز حیات کے طور پر اپنائیں گے۔ یاد رکھیے کہ غریبی، تنگ نظری، جہالت، فرقہ پرستی، رنگ و نسل کے امتیاز، لسانی، علاقائی اور مذہبی عصبیت، نیز فرسودہ اور ضرر رساں رسومات سے جمہوریت کے دامن پر کلنک لگتا ہے بلکہ ان لعنتوں سے جمہوریت کمزور بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ ضروری ہے کہ ہم ان لعنتوں کے خلاف پوری طاقت سے لڑیں اور انھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نیست و نابود کر دیں۔

وفیات ۔ گزشتہ سال یعنی ۱۹۷۹ء کے آخری مہینوں میں اردو کے تین نامور ادیب اور افسانہ نگار جناب سہیل عظیم آبادی، رضیہ سجاد ظہیر، علیم مسرور اور ایک اہم شاعر پریم وار برٹنی اس دار فانی سے رخصت ہو گئے۔

جناب سہیل عظیم آبادی ایک اچھے افسانہ نگار تھے اور انھوں نے اردو افسانے میں پریم چند کی قائم کردہ روایات کو آگے بڑھایا تھا۔ اسی لیے انھیں پریم چند کا جانشین کہا جاتا تھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ وہ ایک ممتاز صحافی بھی تھے اور بابائے اردو مولوی عبدالحق کے رفیق کار بھی رہے تھے۔ اردو افسانہ ان کی دین کا ہمیشہ معترف رہے گا۔ ان کا انتقال بلاشبہ اردو افسانہ کا ایک بڑا نقصان ہے۔ اس دور میں جبکہ تجریدیت اور گنجلک علامت نگاری کے ذریعہ افسانہ کے فن کو مجروح کیا جا رہا ہے ان کے جیسے افسانہ نگاروں کی کمی شدت سے محسوس کی جائے گی۔

بیگم رضیہ سجاد ظہیر جنھیں عام طور سے رضیہ آپا کہا جاتا تھا ایک اچھی افسانہ نگار تھیں۔ اسی کے ساتھ ہی وہ ایک دلیر اور مثالی خاتون تھیں۔ ترقی پسند تحریک اور نظریات سے ان کی وابستگی نہ صرف یہ کہ اٹوٹ تھی بلکہ عملی بھی تھی۔ اپنے ان نظریات اور اصولوں کے لیے انھوں نے بہت کچھ جھیلا بھی۔ لیکن ان کے قدم کبھی ڈگمگائے نہیں۔ ترقی پسند تحریک کو فروغ دینے اور اس کی توسیع میں اپنے رفیق حیات سجاد ظہیر صاحب کے ساتھ رضیہ آپا کا بھی ایک اہم رول رہا ہے۔

رضیہ آپا ایک زندہ دل، بے باک، نڈر اور بذلہ سنج خاتون بھی تھیں۔ ادبی محفلوں میں اپنا افسانہ پڑھتے وقت وہ خود اسی افسانہ کا کردار بن جاتی تھیں۔

ڈاکٹر علیم مسرور ایک ایسے ناول نگار تھے جن کی محض ایک ہی ناول "بہت دیر کر دی" شائع ہوئی۔ لیکن اپنے اسی ناول کی بدولت ہی انھوں نے اردو ناول نگاری میں ایک اہم مقام حاصل کر لیا۔ ان کا یہ ناول پلاٹ نگاری، کردار نگاری، زبان و اسلوب ہر اعتبار سے ایک انتہائی مسحور کن فن پارہ ہے۔ اردو میں اچھے اور صاحب طرز ناول نگاروں کو انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ ایسے وقت میں ڈاکٹر علیم مسرور جیسے ناول نگار کا ناوقت انتقال یقینی طور پر اردو ناول نگاری کا ایک نقصان عظیم ہے۔

پریم وار برٹنی اردو کے ایک ایسے شاعر تھے جن کی شاعری میں حسن فن بن گیا تھا اور فن حسن کے سانچے میں ڈھل گیا تھا۔ ابھی اکتوبر ۱۹۷۹ء کے نیا دور میں ان کی ایک انتہائی خوبصورت غزل شائع ہوئی تھی۔ اس غزل کی ہی بیشتر تشبیہات اچھوتی نہیں ہیں بلکہ ان کی تمام شاعری ایسی نادر اور اچھوتی تشبیہات اور حسن تاثیر سے مالا مال ہے۔ ان ادیبوں اور قلم کاروں کے انتقال پر نیا دور اپنے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔ ان قلم کاروں کے انتقال سے اردو زبان و ادب کو جو زبردست نقصان پہنچا ہے۔ اس کی تلافی شاید ہی ہو سکے۔

ایڈیٹر

غزل

خمار بارہ بنکوی
بارہ بنکی۔ یو پی

صبر کرو کہ زندگی چند دنوں کی بات ہے
معرکۂ غم و خوشی چند دنوں کی بات ہے

نشہ ہو لاکھ دیر پا پھر بھی اتر ہی جائے گا
زعم خودی و بےخودی چند دنوں کی بات ہے

مجھ کو تو ایک اک نفس صدیوں سے بھی سوا لگا
کہتے تھے سب کہ زندگی چند دنوں کی بات ہے

واعظِ خانماں خراب مژدہ کہ چل بسا شباب
اب تو ہماری مےکشی چند دنوں کی بات ہے

اہلِ زمانہ جس طرح ہنستے ہیں اہلِ دل پہ آج
ہنستے تھے ہم بھی ایسے ہی چند دنوں کی بات ہے

لوگ دعا کریں کہ پیار میری بلا سے اے خمار
دشمنی ہو کہ دوستی چند دنوں کی بات ہے

پروفیسر سید حسن
ڈنگھی ہاؤس، ترپولیا
پٹنہ ۸۰۰۰۰۷

مرزا عبدالقادر بیدل کا مولد و نسب

مرزا عبدالقادر بیدل ہندستان کے متاخرین فارسی گو شعرا میں شہرت دوام کے مالک ہیں۔ ان کا کلام خیال بندی مضمون آفرینی، دقت پسندی، فلسفہ طرازی، معنیٔ تازہ کی تلاش اچھوتی تشبیہات، نازک استعارات اور نوبہ نو محاوروں کے استعمال کے اعتبار سے سبک ہندی کا اعلا نمونہ سمجھا جاتا ہے۔ وہ حقایق کی فلسفیانہ ترجمانی، تجربات کی حکیمانہ تشریح، مشاہدات کی عارفانہ عکاسی، پیچ در پیچ تفکر اور غیر معمولی قوت ابداع و اختراعات سے لفظ و معانی کا ایک ایسا حیرت انگیز طلسم تعمیر کرتے ہیں جس کے نظارے سے اہل نظر مات و مبہوت ہو جاتے ہیں، ان کی شاعری فارسی ادب میں بے مثال ہے، اردو ادب کی تاریخ میں بھی بیدل کا اہم مقام ہے، ریختہ کے وہ دو شعر جو ان کی طرف منسوب ہیں شمالی ہند میں ابتدائی اردو کے نمونے سمجھے جاتے ہیں۔ غالب نے اس احساس و اعتراف کے باوجود کہ طرز بیدل میں ریختہ کہنا قیامت ہے اپنی اردو شاعری کا آغاز بیدل کی تقلید سے کیا اور خاصے عرصے تک سبک بیدل کی پیروی کرتے رہے، اقبال نے بیدل کو 'مرشد کامل' کہا ہے اور اپنی نظم بعنوان "مذہب" میں بیدل کے مندرجہ ذیل شعر کی تضمین کی ہے۔

با ہر کمال اندکے آشفتگی خوش است
ہر چند عقل کل شدہ بے جنوں مباش

حیف کہ بیدل ایسے باکمال و دانش مند شاعر کے احوال زندگانی جو اکثر تذکرۂ شعرا میں درج ہیں غیر تشفی بخش ہیں، خصوصاً بیدل کے مولد و موطن اور خاندان کے متعلق اکثر تذکرہ نگاروں میں اختلاف پایا جاتا ہے، یہ اختلاف میرے خیال میں اس سبب سے ہے کہ انھوں نے تحقیق کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی ہے، اور زیادہ تر قیاس سے کام لیا ہے۔

فارسی شعرا کے وہ تذکرے جو بیدل کے زمانے کے قریب لکھے گئے ہیں ان میں سے سب سے زیادہ اہم بیانات ذیل میں قلم بند کیے جاتے ہیں۔

تذکرۂ طاہر نصر آبادی۔ یہ تذکرہ مولف نے صفہان ایران میں سنہ ۱۰۸۳ھ اور سنہ ۱۰۹۱ھ کے درمیان یعنی بیدل کے زمانۂ حیات میں ترتیب دیا ہے۔ طاہر کا بیان ہے کہ "او (یعنی بیدل) ہم از ولایت لاہور است" ظاہر ہے کہ طاہر نصر آبادی نے دور سے بیدل کے بارے میں سنا تھا اور ہو سکتا ہے کہ کسی لاہور والے نے اس کو بتایا اس لیے اس نے بیدل کا وطن لاہور بتا دیا۔

دوسرا تذکرہ جو بیدل کی وفات سے پہلے لکھا گیا شیر خان لودی کا 'مراۃ الخیال' ہے جو سنہ ۱۱۰۲ھ میں مرتب ہوا بیدل کے بارے میں اس میں یہ لکھا ہے کہ "بالفعل در شاہجہان آباد بلکہ در اکثری از سواد ہندستان بہتر از مرزا عبدالقادر بیدل کہ در سرکار بملازمت منسلک است نخواہد بود" اس سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ تذکرہ مرتب ہوتے وقت یعنی سنہ ۱۱۰۲ھ میں بیدل دہلی میں مقیم اور دربار شاہی میں ملازم تھے۔

سرخوش کا تذکرہ کلمات الشعرا بھی بیدل کے زمانۂ
زندگی میں تالیف ہوا ہے یعنی ۱۰۹۳ھ اور ۱۱۰۸ھ کے
درمیان ۔ اس میں بیدل کے ترجمے میں یہ اطلاع دی گئی
ہے کہ "امروز در دار الخلافہ کوس رستمی می نوازد و بہ دادِ معنی یابی و
نازک بندی می رسد" یعنی اس تذکرے میں بھی بیدل کے
دہلی میں سکونت پذیر ہونے کی خبر دی گئی ہے ۔

بیدل کی وفات (۱۱۳۳ھ) کے کچھ ہی بعد جو تذکرہ لکھا
گیا وہ بندرابن داس خوشگو کا "سفینۂ خوشگو" ہے جو ۱۱۳۷ھ اور
۱۱۴۷ھ کے درمیان مرتب ہوا ہے اس میں بیدل کو مرحوم لکھا
ہے اور ان کے حالات قدرے تفصیل سے تحریر ہوئے ہیں، خوشگو
کا بیان ہے کہ "آنحضرت از قوم مغول در مغولان ارلاس
تورانی الاصل و اکبرآباد الوطن است آنچہ طاہر نصرآبادی ذکر اصل
ایشان نوشتہ کہ لاہوریست اصلی ندارد" و در ... کہ "آنحضرت بطریق
سیاحی رو بمشرق آمادہ عزیمت فرمودہ مدتی در صدد دہماکہ
بنگ و بہار و اڑیسہ بہ آزادگی و بے تعینی بسر بردہ از دشت و
بیاباں ہا پیمودہ ... از آنجا بہ تکلیف میرکامگار بہ ہندوستان
رسیدہ چندی بہ بلدۂ اکبرآباد اقامت ورزیدہ باز بہ دار الخلافہ
شاہجہاں آباد رسیدہ کنج عزلت گزید" یعنی خوشگو نے
بیدل کے لاہوری ہونے کی تردید کردی اور بتایا کہ وہ مغل تھے
اور قبیلہ ارلاس سے تعلق رکھتے تھے، ان کا خاندان تورانی تھا
اور وطن اکبرآباد (آگرہ) بہار و بنگال و اڑیسہ سے بیدل کا تعلق
صرف یہ بتایا کہ وہ وہاں بغرض سیاحت گئے تھے اور پھر لوٹ کر
اکبرآباد میں کچھ دن قیام کرنے کے بعد دہلی چلے آئے افسوس
ہے کہ اس امر کے باوجود کہ خوشگو کو بیدل سے بڑی ارادت تھی
اور وہ بیدل کی خدمت میں ہزار بار سے زیادہ حاضر رہا تھا
جیسا کہ وہ خود لکھتا ہے کہ "فقیر خوشگو در عمر خود زیادہ از ہزار مرتبہ
بخدمتش مستفید شدہ باشم" اس نے بیدل کے بارے میں صحیح
معلومات مہیا نہیں کیں ۔ تقریباً اسی زمانے میں جب خوشگو نے
اپنا تذکرہ ترتیب دیا تھا شاہ محمد شفیع وارد پسر محمد شریف تہرانی
نے ایک تذکرہ بنام "مراۃ الواردات" ۱۱۴۶ھ میں تالیف کیا
مولف "روز روشن" نے وارد کے ترجمے میں لکھا ہے کہ "وہ ملا سلیم
تہرانی کا شاگرد تھا اور اسی کے ساتھ ہندوستان آیا تھا، بندرگاہ
سورت میں ملا سلیم تہرانی سے جدا ہو کر عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں
حیدرآباد پہنچا بعد ازاں دہلی میں وارد ہوا اور یہاں بہادر شاہ
خلف شہنشاہ عالمگیر کے دربار سے متوسل ہوا" خوشگو نے وارد کا حال اپنے
سفینہ میں لکھا ہے اس کا بیان ہے کہ وارد نے مدت تک دہلی میں نواب روح اللہ خاں
کے بیٹے بیرم خاں کی ترتیب میں زندگی بسر کی پھر ترک دنیا کر کے
فقیری اختیار کرلی، اس کے مریدوں اور مخلصوں کا حلقہ وسیع
تھا، شعر بھی بہت کہتا تھا"

مراۃ الواردات میں بیدل کا بھی ترجمہ احوال مرقوم ہے
اور اس میں چند ایسی باتیں بیدل کے بارے میں لکھی ہیں جو دوسرے
تذکروں میں نہیں ملتیں ۔ چنانچہ اس تذکرے کو دیکھ کر لچھمی نرائن
شفیق اورنگ آبادی نے یہ ضرورت محسوس کی کہ وارد کے بیان کو
اپنے تذکرے "شام غریباں" میں نقل کر دے حالانکہ "شام غریباں"
ان شاعروں کا تذکرہ ہے جو باہر سے آکر ہندوستان میں بس گئے
تھے اور بیدل ان شاعروں کے زمرے میں نہیں آتے ۔ پھر
شفیق بیدل کا حال گل رعنا میں لکھ چکا تھا مراۃ الواردات
غیر مشہور اور نایاب ہے ۔ شفیق نے اچھا کیا کہ مراۃ الواردات سے
بیدل کا پورا ترجمہ شام غریباں میں نقل کر دیا کیونکہ اس سے
بیدل کے خاندان اور مولد و موطن کے متعلق صحیح باتیں معلوم ہوتی
ہیں، شام غریباں کو حیدرآباد یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے
استاد محمد اکبر الدین صدیقی نے مرتب اور انجمن ترقی اردو پاکستان
نے شائع کیا ہے ۔

بیدل کے متعلق مراۃ الواردات کی جو عبارت شام غریباں
میں نقل ہوئی ہے اس کے ضروری حصوں کا اردو ترجمہ ذیل میں
درج کیا جاتا ہے ۔

بیدل بنگال کے مقام اکبرنگر عرف راج محل میں تولد ہوئے
اور ایک عرصے تک زندگی اسی مقام پر باطمینان بسر کی ۔ کمال

جوانی میں ہندستان (یعنی شمالی ہند) کا رخ کیا اور اولاً سلطان معزالدین (خلف شاہ عالم بن عالمگیر) کے حقیقی ماموں میرزا سلیمان کی صحبت میں کئی سال اقامت گزیں رہے، سلطان معزالدین کی وفات کے بعد اعظم شاہ بن عالمگیر کی ملازمت میں منسلک ہوئے ایک دن مقربان سلطنت میں سے کسی نے بیدل کے شعر بادشاہ کو سنائے بادشاہ نے دریافت کیا کہ یہ شعر کس کے ہیں، عرض کیا کہ مرزا بیدل کا کلام ہے، بادشاہ نے خوش طبعی کے طور پر کہا کہ لشکر میں جہاں جوانان پُردل ہیں بیدل کا کیا کام۔ جب بیدل کو بادشاہ کے قول کی خبر ملی تو اسی وقت دہلی سے نکل کھڑے ہوئے اور متھرا پہنچ کر جمنا ندی کے کنارے ڈیرا ڈالا۔ اس علاقے کے حاکم لعل محمد خاں نائب حسن علی خاں کو جب بیدل کے آنے کی اطلاع ملی تو وہ انھیں گھر لے گیا اور خاطر داری میں مصروف ہوا، بیدل بھی اس کی صحبت کے گرویدہ تھے، ان دنوں اتفاقاً سلطان عالمگیر دکن میں تھا اس نے لعل محمد خاں کو اپنے پاس طلب کیا، لعل محمد جبراً و قہراً بموجب فرمان بادشاہ دکن کو روانہ ہوا۔ لیکن اثنائے راہ میں اس کی موت ہوگئی، اس کے بعد بیدل وارد کے مکان میں ڈیڑھ سال تک بے تشویش معاش سکونت گزیں رہے، یہاں تک کہ شکر اللہ خاں نے جو اس زمانے میں میوات کے قصبہ نارنول کا حاکم تھا قاصد اور رتھ روپیہ بھیج کر بیدل کو بلوا بھیجا، بیدل نے شکر اللہ خاں کی وفات تک اس کی صحبت میں زندگی بسر کی، دونوں میں بحد محبت اور اخلاص تھا، ایک کو دوسرے کی جدائی گوارا نہ تھی۔ شکر اللہ خاں کے تین بیٹے تھے، تینوں دربار شاہی میں معزز منصب و خطاب سے سرفراز ہوئے انھوں نے بیدل کی خاطر تواضع اور حفظ مراتب میں از حد کوشش کی اور بیدل نے اپنی وفات تک طویل زندگی بہت آرام و اطمینان سے گزار دی۔

وارد لکھتے ہیں کہ بیدل نے انھیں چند مرتبہ یہ بتایا کہ ان کے اجداد کا سلسلۂ نسب ایران کے خاندان مظفریہ کے فرماں روا شاہ منصور بادشاہ فارس و ممدوح خواجہ حافظ سے ملتا ہے، جب تیمور کے ساتھ جنگ کرنے میں شاہ منصور قتل ہوا تو اس کے بیٹے پوتے بخارا چلے گئے اور وہیں بود و باش اختیار کر لی، بیدل کے اسلاف چند پشتوں تک ماوراءالنہر میں مقیم رہے۔ بزرگان بیدل ماوراءالنہر سے ہجرت کر کے بنگالہ آگئے اور یہیں اقامت گزیں ہوئے۔ ایک پشت گزرنے کے بعد بیدل متولد ہوئے۔ مرزا بیدل کی سیرت و شخصیت بیان کرتے ہوئے وارد نے لکھا ہے کہ بیدل کی مدت العمر میں شکر اللہ خاں اور اس کے بیٹوں کے سوا کسی دوسرے اعیان عصر کے گھر بہت کم جاتے تھے۔

وارد کے بیانات کے معتبر ہونے میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے کیونکہ بیدل سے اس کے تعلقات اس حد تک گہرے تھے کہ وہ ڈیڑھ سال تک وارد کے گھر میں مقیم رہے اور انھوں نے خود کئی بار اپنے نسب کا تذکرہ وارد سے کیا تھا، چنانچہ یہ بات محقق ہو جاتی ہے کہ بیدل کی ولادت اکبر نگر عرف راج محل میں ہوئی تھی اور ان کے اجداد اصلاً ایرانی تھے۔ راج محل آج کل ریاست بہار کے سنتھال پرگنہ ضلع میں بنگال کی سرحد کے قریب واقع ہے، عہد مغلیہ میں بنگال و بہار کا ایک صوبہ تھا، اور راج محل موسم گرما میں صوبے کے گورنر کا مستقر ہوتا تھا معلوم ہوتا ہے کہ بیدل کے دادا یا والد راج محل میں کسی سرکاری عہدے پر مقرر تھے اور انھوں نے اس مقام کو اپنی مستقل جائے سکونت قرار دے دی تھی۔ بیدل آغاز شباب تک راج محل ہی میں مقیم رہے۔ پھر عظیم آباد پٹنہ بغرض ملازمت گئے اور وہاں سے [illegible] کا رخ کیا۔ جن تذکرہ نگاروں نے بنگال اور بہار سے بیدل کا تعلق بتایا ہے وہ اس حد تک صحیح ہیں کہ بیدل اسی صوبے کے فرزند تھے، البتہ ان تذکرہ نویسوں کو بیدل کے مولد کا صحیح علم نہ تھا لہٰذا ان کے بیانات قدرے مبہم ہیں۔ بعد کے تذکرہ نگاروں نے صحیح علم نہ ہونے اور زمان و مکان کی دوری کی وجہ سے تحقیق کیے بغیر بیدل کے مولد و موطن اور نسب کے بارے میں یا تو سفینۂ خوشگو کی پیروی کی ہے یا قیاس سے کام لیا ہے۔ مرآۃ الواردات کمیاب ہونے کے سبب ان کی دسترس سے باہر تھی، چنانچہ مجمع النفائس میں جو بیدل کی وفات کے تیس سال بعد (۱۱۶۴ھ میں) مرتب ہوئی ہے بیدل کی قومیت تو تورانی بتائی ہے لیکن ان کی زادگاہ کے متعلق صرف یہ کہا گیا ہے کہ عظیم آبادی

بخیال غلط ہے کہ مرزا لاہوری تھے۔ غلام علی آزاد کے تذکرہ
ۂ عامرہ میں جس کا سال تالیف ۱۱۷۶ھ ہے غالباً پہلی مرتبہ
ل کا مولد عظیم آباد پٹنہ بتایا گیا ہے۔ اس تذکرے کی عبارت
خطہ ہو۔

"اصلش از گروہ ارلاس است و در بلدۂ عظیم آباد پٹنہ از
شبستان عدم بہ صبح کدۂ ہستی رسید و در بنگالہ بیشتر بسر برد"
اکبر نگر (راج محل) ایک غیر معروف مقام ہے اور عظیم آباد پٹنہ
مشہور شہر۔ آزاد اکبر نگر سے واقف نہیں ہوں گے۔ بیدل کا بہار و
نگال سے تعلق ہونے کی وجہ سے انھوں نے ان کا مولد عظیم آباد پٹنہ
دیا۔ مضافات پٹنہ کے باشندوں کو اکثر عظیم آبادی کہہ دیتے ہیں۔
لیکن تعجب یہ ہے کہ بہار کے دو نامور تذکرہ نگاروں نے بھی اس
کی تحقیق کی طرف توجہ نہیں کی اور اپنے پیشرو تذکرہ نگاروں کے
ل پر بھروسا کر لیا۔ میرا اشارہ صحف ابراہیم کے مؤلف علی ابراہیم خاں
لیل اور نشتر عشق کے مرتب حسین قلی خاں عاشقی کی طرف ہے،
صحف ابراہیم میں جس کی تدوین ۱۲۰۵ھ میں مکمل ہوئی ہے
بیدل کے ترجمے میں لکھا ہے کہ:

"اصلش از مغول ارلات توران است، در ہزار و پنجاہ و چہار
بقول خوشگو در اکبر آباد و بقول میر غلام علی آزاد در عظیم آباد میلاد
یافت، و اینکہ مرزا طاہر نصر آبادی او را ابعلت و دری این ملک
لاہوری نوشتہ از صحت بعید است"

نشتر عشق کا سال تکمیل ۱۲۳۳ھ ہے، اس میں بیدل کے ترجمے میں
یہ تحریر ہے۔

"از قوم برلاس و الوس جغتا است، در عظیم آباد پٹنہ من مضافات
صوبہ بہار ... از کمل خفا بعرصۂ وجود شتافت"

یہاں قوم ارلاس کی جگہ قوم برلاس لکھ دیا اور بیدل کی
اصل جغتائی بتا دی۔

نامبردہ بالا بزرگ و مقتدر تذکرہ نگاروں کے بیانات
سے بعد میں آنے والے سارے تذکرہ نویسوں اور سوانح نگاروں
نے استفادہ کیا ہے، تاجکستان کے مشہور و معروف شاعر و ادیب
صدر الدین عینی نے "مرزا عبدالقادر بیدل" کے نام سے ایک مستقل
کتاب بزبان فارسی تاجیکی و بخط روسی تالیف کی ہے جسے نشریات
دولت تاجیکستان، اسٹالن گراڈ نے ۱۹۵۴ء میں شائع کیا ہے
اس میں بیدل کے سوانح حیات تفصیلی طور پر قلمبند ہوئے ہیں اور
ان کی نظم و نثر پر تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے اس میں ترجمہ حال بیدل
کے زیر عنوان (ص ۲۵) لکھتے ہیں۔

نام این شاعر فیلسوف مرزا عبدالقادر تخلصش بیدل و لقب
از طرف اہل ادبیات دادہ شدہ اش ابوالمعانی (پدر معانی)
بودہ، در شہر عظیم آباد پٹنہ کہ از مضافات ولایت ہای بہار و
بنگالہ باشد در سال ۱۰۵۴ ہجری (۱۶۴۴ میلادی) تولد یافتہ
است"

(باقی ص ۴۹ پر)

۱؎ اسی اکبر نگر کو خوشگو نے اپنے سفینے میں اکبر آباد بنا دیا؛ اکبر نگر (راج محل) بھاگلپور سے تقریباً سو کیلومیٹر دور پورب میں واقع ہے۔ بھاگلپور کے ۵ کیلومیٹر دور پچھم میں ہی ایک اور قصبہ اکبر نگر کے نام کا واقع ہے۔ ۲؎ شاہ منصور آل مظفر کے نامور فرزند اور فارس کے فرمانروا شاہ شجاع کا نواسہ تھا اس کا عہد حکومت ۷۹۰ھ سے ۷۹۵ھ تک ہے ۳؎ تاریخ آل مظفر مولفہ حسین قلی ستودہ (تہران ایران) میں لکھا ہے کہ شاہ منصور کے قتل اور فارس کو فتح کرنے کے بعد تیمور نے سارے شہزادگان آل مظفر کو قید کر لیا تھا جن کی تعداد ۲۲ تھی، بعد ازاں تیمور نے ان سب کو قتل کرنے کا حکم دے دیا، اٹھارہ شہزادوں کے قتل ہونے کا پتہ چلتا ہے لیکن چار شہزادوں کا کیا حشر ہوا یہ معلوم نہ ہو سکا، کیا عجب ہے کہ یہی چار شہزادے فرار ہو کر بخارا چلے گئے ہوں۔ ۴؎ شاہ شجاع کی ماں خان قتلغ مخدوم شاہ کا سلسلۂ نسب کرمان کے ترک قبیلہ قراختائیاں سے ملتا ہے، اس لحاظ سے بیدل کے اجداد کے خون میں تورانی عنصر شامل تھا۔ ۵؎ ارلات، ارلاس کی غلط شکل ہے جو سہو کاتب سمجھا جا سکتا ہے۔ ۶؎ یہ بھی سہو کاتب ہے غالباً "اصلش" کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔

غزل

شمیم جے پوری
کاشانہ محمود بنی سرائے
میرٹھ

وہ پہلے پہل مرحمتِ ناز کا عالم
اللہ غنی عشق کے آغاز کا عالم

اے دل کہیں دھڑکن تو نہ سُن لی کسی دل کی
آج اور ہی کچھ ہے تری آواز کا عالم

دیکھا مجھے اس طرح کہ جیسے نہیں دیکھا
عالم سے الگ ہے نگہہ ناز کا عالم

ہر شعر میں شامل ہے مرے دل کی تڑپ بھی
جو ساز کا عالم وہی آواز کا عالم

پھر کوئی نہ آئے گا ترے ناز اٹھانے
ہم تک ہے تری انجمنِ ناز کا عالم

غصہ بھی محبت بھی شکایت بھی وفا بھی
آواز میں ہے صاحبِ آواز کا عالم

تا حدِ تصوّر نگہِ شوق کی دُنیا
تا حدِ نظر انجمنِ ناز کا عالم

ابتک تو میں صیاد قفس توڑ رہا تھا
اب دیکھ مری جراُتِ پرواز کا عالم

سید نواب افسر
چھتر رانی بلہرہ وکٹوریہ گنج لکھنؤ

کیا پوچھتے ہو حالِ دُنیا ہم رنج والم کے ماروں سے
پہلے نکہت آتی تھی اب لُو آتی ہے گلزاروں سے

ہے خطرۂ جاں سایہ کیسا کیا جانیں کس کے سر پہ گریں
اک مدت کی دیواریں ہیں بچ کر چلیے دیواروں سے

جو فصلِ بہاراں ذہن میں ہے وہ فصلِ بہاراں آنے دو
شعلے شبنم بن جائیں گے رس ٹپکے گا انگاروں سے

یہ طاقت و دولت سب کی ہے کچھ لوگ امانت دار ہیں بس
حق اپنا بہر صورت ہم کو لینا ہے امانت داروں سے

کچھ سوزِ دروں کچھ دردِ جہاں کچھ بے چینی کچھ بے خوابی
فن جیسے بدلہ لیتا ہے اچھے اچھے فن کاروں سے

اک بوند لہو کی دل میں نہیں آنکھوں کے سوتے سوکھ گئے
جا اے غمِ دنیا اور کہیں کیا لے گا ہم ناداروں سے

ابھرا تو نیا سورج لیکن رفتارِ عمل کچھ رُک سی گئی
اک مدت گزری صبح ہوئے دھوپ اُتری نہیں دیواروں سے

کاظم علی خاں
(وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ ۲۲۶۰۰۳)

مرزا حاتم علی مہر لکھنوی
سوانح اور ادبی آثار

مرزا غالب [متوفی ۲ ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ[1] مطابق ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء] کے ہم عصر مکتوب الیہ[2] اور نادیدہ[3] دوست مرزا حاتم علی بیگ مہر کے سوانحی حالات اور ادبی آثار کے متعلق مختلف مصادر کی ورق گردانی کے بعد جو مواد دستیاب ہو سکا ہے سطور ذیل میں پیش ہے۔

(۱) اسلاف و خاندان

مرزا حاتم علی بیگ مہر کے اسلاف کا وطن اصفہان تھا[4]۔ مہر کے پردادا[5] نادر شاہ کے ہمراہ کمانڈر توپ خانہ کی حیثیت سے ذی قعدہ ۱۱۵۱ھ مطابق فروری ۱۷۳۹ء میں ہندستان آئے تھے[6]۔ معاصرین مہر میں محسن[7]، ناسخ[8] و نادر[9] نے مہر کے دادا کا نام مرزا امراد علی خاں بتایا ہے۔ ان معاصر شہادتوں کے علی الرغم مولانا غلام رسول مہر نے مرزا حاتم علی بیگ مہر کے دادا کا نام "امراد علی خاں" درج فرمایا ہے[10]۔ مہر کے سگے پوتے مرزا قاسم حسین اختر [متولد ۱۰ اپریل ۱۸۷۰ء[11] جن کا بچپن مہر کی تربیت میں گزرا تھا] بھی مہر کے دادا کا نام مرزا امراد علی خاں بتاتے ہیں[12]۔ سراپا سخن [طبع اپریل ۱۸۷۵ء ص ۱۵۶] میں مہر کے دادا کا نام مع خطاب "رکن الدولہ مرزا امراد علی خاں" درج ملتا ہے۔ مراد علی خاں کو رکن الدولہ کا خطاب دربار اودھ سے ملا تھا[13]۔ رکن الدولہ مرزا امراد علی خاں، والی اودھ نواب شجاع الدولہ کے درباری اور علاقہ دلمؤ [ضلع رائے بریلی موجودہ اتر پردیش] کے ناظم تھے جیسا کہ مہر کے سگے پوتے مرزا قاسم حسین اختر کی انگریزی کتاب ٹسٹی مونیلس (TESTIMONIALS) کے سرورق سے ظاہر ہے۔

محسن[14]، ناسخ[15]، کلیم[16] اور نادر[17] جیسے معاصرین نے مہر کے والد کا نام مرزا فیض علی لکھا ہے۔ باطن[18] اور مرزا قاسم حسین اختر[19] ان کا نام "مرزا فیض علی بیگ قزلباش" بتاتے ہیں۔ مرزا فیض علی بیگ قزلباش انگریزی عمل داری میں کھیری (علی گڑھ) کی تحصیل داری کے عہدے پر فائز تھے[21]۔ اسلاف و خاندان کے متعلق مختلف شہادتیں مہر کو ایک شریف اور معزز مغل قزلباش[22] خانوادے کا چشم و چراغ ثابت کرتی ہیں۔

(۲) سنہ ولادت، مولد و تعلیم

مرزا محمد عسکری نے مہر کا مولد آگرہ بتایا ہے[23]۔ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کے پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے میں مہر کا سنہ ولادت ۱۸۱۴ء درج ہے[24]۔ ڈاکٹر گیان چند جین[25] اور ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کے[26] (بالترتیب) ڈی لٹ اور پی ایچ۔ ڈی کے مقالے مہر کا سنہ وفات ۱۲۹۷ھ قرار دیتے ہیں۔ لیکن مہر کے مولد، سنہ ولادت اور سال وفات کے متعلق محولہ بالا تمام اندراج نظر ثانی کے محتاج ہیں۔ میری اطلاع کے مطابق مرزا حاتم علی بیگ مہر آگرہ کے بجائے لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے۔ مہر کا سنہ ولادت ۱۸۱۴ء کے بجائے ۱۸۱۵ء ہے اور مہر کا سنہ وفات ۱۲۹۷ھ کے بجائے ۱۲۹۶ھ ہے [تفصیلات اگلے صفحات پر ملاحظہ ہوں]۔ مہر کے سنین ولادت و وفات کے متعلق پی ایچ۔ ڈی اور ڈی لٹ کے تحقیقی مقالوں میں غلط اندراجات سے مہر کے سوانحی حالات کے بارے میں اردو تحقیق کی سمت و رفتار کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ان حالات میں مہر کے صحیفۂ حیات کے ضروری حصے پیش کرنا بے محل نہ ہوگا۔

مرزا حاتم علی بیگ شنبہ ۱۵ اپریل ۱۸۱۵ء کو قریب شام بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے[27]۔ ان کا تاریخی نام خورشید علی تھا جس سے سنہ ولادت

۱۲۲ھ نکلتا ہے[۳۰] آبِ بقا (ص ۱۰۵) کے اندراج کے مطابق تقریباً
ں کے سن میں یتیم ہو گئے گویا قہر کے والد مرزا فیض علی بیگ نے ۱۸۱۹ء[۳۹]
ء انتقال کیا تھا۔ باپ کی رحلت کے بعد قہر کی تعلیم ان کی والدہ نے
ے اہتمام سے دلائی [ریاض الفردوس ص ۱۳۹] قہر کی والدہ کافی
صے بعد ۱۲۸۶ھ میں فوت ہوئی تھیں جیسا کہ قہر کی تاریخ "شو جنتی
در پاک قہر" [۱۲۸۶ء] سے ظاہر ہے [آبِ بقا ص ۱۰۸]۔

۲) آغازِ شاعری، تخلص، تلمذ و تلامذہ

بعض قرائن[۳۱] سے اندازہ ہوتا ہے کہ قہر نے شاید ۱۳ سال کے سن
ں [۱۲۴۳ھ کے آس پاس] شاعری شروع کی ہوگی۔ ۱۲۴۸ھ میں ۱۸
سال کے سن میں کہا جانے والا قہر کا ایک فارسی قطعۂ تاریخ[۳۱] بھی اس بات
کی تائید کرتا ہے کہ قہر نے لڑکپن ہی سے شعر گوئی شروع کی ہوگی۔ شاعری
ں انھوں نے قہر تخلص اختیار کیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ قہر تخلص شاید ان
کے اسمِ تاریخی خورشید علی کی رعایت کا مرہونِ منت ہو۔

اردو سے معلیٰ: غالب کے فرہنگ نگار نے قہر کو غالب کا شاگرد
بتایا ہے[۳۲]۔ اس واحد اور سست شہادت کے برخلاف حسن[۳۳]، باطن[۳۴]، ناسخ[۳۵]،
حلیم[۳۶]، مظفر حسین صبا[۳۷]، ناصر[۳۸]، نادر[۳۹] اور صفیر بلگرامی[۴۰] کی مضبوط معاصر
شہادتیں قہر کو ناسخ لکھنوی کا شاگرد ثابت کرتی ہیں۔ قہر کے نام غالب
کے ڈیڑھ درجن سے زائد مکاتیب میں کہیں بھی غالب نے قہر کو اپنا
شاگرد نہیں بتایا ہے۔ اس کے برخلاف قہر کے نام ایک مکتوب میں غالب
نے قہر کو لکھا ہے: "ناسخ مرحوم جو تمھارے استاد تھے میرے بھی دوست
صادق الوداد تھے ۔ ۔[۴۱]" گویا خود غالب نے بھی قہر کو ناسخ کا شاگرد
قرار دیا ہے۔ ان شواہد کے علاوہ اپنی مثنوی شعاعِ مہر میں ایک غزل
کے عنوان میں خود قہر نے ناسخ کو اپنا استاد بتایا ہے[۴۲]۔ مزید برآں قہر کا
کا یہ مصرع:

مرا استادِ کامل قہر، ناسخ سا ہمہ داں ہے[۴۳]

قہر کو ناسخ کا شاگرد ثابت کرتا ہے۔ بعد کے لکھنے والوں میں مالک رام[۴۴]
اور آفاق حسین آفاق[۴۵] نے غالب کے درجنوں شاگردوں پر مشتمل جو
فہرستیں پیش کی ہیں اُن میں بھی قہر کا نام شامل نہیں ملتا۔ اس کے برعکس
ڈاکٹر شبیہ الحسن نونہروی نے تلامذۂ ناسخ کی فہرست میں قہر کا بھی نام

درج کیا ہے [ناسخ (تجزیہ و تقدیر) طبع فروری ۱۹۷۵ء ص ۱۹۶]۔
یہ تمام شواہد ثابت کرتے ہیں کہ قہر غالب کی شاگردی کے شرف سے محروم
تھے اور انھیں ناسخ لکھنوی ہی سے فیضِ تلمذ حاصل تھا۔

مختلف ماخذ کی ورق گردانی کے نتیجے میں مجھے قہر کے تلامذہ میں
مندرجۂ ذیل شعرا شامل ملے ہیں جو قہر کے سوانحی حالات پر اضافہ ہیں:

(۱) راجا بلوان سنگھ راجا[۴۶]
(۲) منشی کفایت علی تنہا[۴۷]
(۳) سید علی نقی جلالوی[۴۸]
(۴) مغل خاں تمنا اکبرآبادی[۴۹]
(۵) کنور رگھبر ورتی سنگھ کنور[۵۰]
(۶) عبدالرحمٰن خاں انصاف اکبرآبادی[۵۱]
(۷) رن بہادر سنگھ بہادر[۵۲]
(۸) منشی رام سہائے تسلیم[۵۳]

(۴) شادی، اولاد، اعزا و احباب

قہر نے فارسی میں اپنے عقد کی یہ تاریخ لکھی ہے: ؎

چوں مرا قیدی زندانِ علایق کردند
سالِ تاریخ عروسی خود بنوشتم
یعنی آزاد و شے بودم و اکنوں لے قہر
از سرِ جبر گرفتار شدم بنوشتم[۵۴]

شمارِ جمل کی رُو سے "گرفتار شدم" میں سرِ "جبر" یعنی "ج" کے تعمیہ
سے [۱۲۴۵ + ۳ = ۱۲۴۸ھ] ۱۲۴۸ھ ہجری مستخرج[۵۵] ہوتا ہے۔ گویا
قہر کی شادی ۱۸ برس کے سن میں[۵۶] ہوئی تھی اور قہر [متولد ۱۲۳۰ھ] ۱۸
سال کے سن میں تعمیہ کی نزاکتوں کے ساتھ فارسی تاریخ کہنے پر قادر تھے۔

شادی کے دو سال بعد ۱۰ شوال ۱۲۵۰ھ [از روئے تقویم
مطابق ۹ فروری ۱۸۳۵ء (یوم دوشنبہ)] کو جب قہر ایک فرزند کے
باپ بنے تو انھوں نے بیٹے کا تاریخی نام آغا بہرام رکھا جیسا کہ قہر
کے قطعۂ تاریخ سے ظاہر ہے: ؎

شوال کی دسویں تھی دوشنبے کا وہ دن
تو عین نمازِ [صبح][۵۷] کا تھا وہ ہنگام

خالق نے عطا کیا تجھے جو فرزند
ہم صولتِ اسکندر و ہم جراتِ سام
دل نے کہا تو سے قہر اس بیٹے کا
تاریخ بھی ہونے جس میں رکھنا وہ نام
ناگاہ یہ دی سروشِ غیبی نے ندا
لو ہم نے تو رکھا نام آغا بہرام ۱۲۰۷ھ

[بحوالۂ آبِ بقا ص ۱۰۵]

آغا بہرام کا اصل نام مرزا سخاوت علی رکھا گیا تھا - مرزا سخاوت علی کی ولادت کے تین سال بعد قہر کے یہاں [شاید ۱۲۵۳ھ میں] ایک لڑکی بھی ہوئی جو دو برس کے بعد [غالباً ۱۲۵۵ھ] میں فوت ہو گئی [بحوالۂ آبِ بقا ص ۱۰۵] - دستیاب ماخذ قہر کی کسی تیسری اولاد کا ذکر نہیں کرتے -

قہر کے فرزند سخاوت علی بھی شاعر تھے - ان کا تخلص ضیا تھا - سخنِ شعرا [طبع اکتوبر ۱۸۷۴ء ص ۲۹۱] اور تذکرۂ نادر [ص ۱۰۲] میں سخاوت علی ضیا کا ترجمہ موجود ہے - قہر کی مثنوی شعاع مہر [طبع ۱۸۶۰ء] کے آخر میں جو قطعاتِ تاریخ چھپے ہیں اُن میں ضیا کا قطعۂ تاریخ بھی شامل ہے - ضیا کی شادی آتش لکھنوی کے مشہور شاگرد میر وزیر علی صبا لکھنوی کی صاحبزادی سیدہ مرتضی بیگم سے ہوئی تھی - اس رشتے سے قہر اور صبا لکھنوی ایک دوسرے کے سمدھی ہوتے تھے - مولانا فاضل لکھنوی کے ایک بیان سے قہر، میر صبا کے داماد ظاہر ہوتے ہیں - یہ اندراج تصحیح کا طالب ہے - ضیا کے فرزند مرزا آقا حسین اختر [میری اطلاع کے مطابق] میر وزیر علی صبا لکھنوی کے حقیقی نواسے تھے - کلامِ اختر کے سرورق پر مرزا قاسم حسین اختر کو نبیرۂ میر وزیر علی صبا لکھا گیا ہے - خود اختر نے صبا لکھنوی کے فرزند میر بادشاہ علی بقا لکھنوی [جو مرزا دبیر کے داماد تھے] کو اپنا حقیقی ماموں اور صبا لکھنوی کے داماد حکیم سید رضا حسین نُہا کو اپنا خالو لکھا ہے [ر-ک کلامِ اختر ص ۴] اُن رشتوں سے پتہ چلتا ہے کہ :

(۱) قہر صبا لکھنوی کے سمدھی تھے -
(۲) قہر کے بیٹے ضیا - صبا لکھنوی کے داماد تھے -
(۳) ضیا - میر صبا لکھنوی کے بیٹے میر بقا لکھنوی کے سگے بہنوئی تھے اور بقا مرزا دبیر کے داماد تھے -
(۴) ضیا - رضا حسین نُہا [خویش صبا لکھنوی] کے ہم زلف تھے -
(۵) بقا لکھنوی - مرزا دبیر کے بیٹے مرزا جعفر اوج[۲۳] کے سگے بہنوئی ہوتے تھے -
(۶) ضیا - اوج کے سگے بہنوئی بقا کے بہنوئی تھے -
(۷) قہر کے سمدھی صبا لکھنوی مرزا دبیر کے بھی سمدھی تھے -

یہ تمام قرابتیں مرزا حاتم علی قہر کے سببی اعزہ کی نشاندہی کرتی ہیں -

ان سببی قرابت داروں کے علاوہ قہر کے نسبی عزیزوں میں ہمیں ان کے ایک سگے بھائی مرزا عنایت علی کا پتا چلتا ہے - مرزا عنایت علی کو آبِ بقا [ص ۱۰۵] میں قہر سے ڈھائی سال چھوٹا بتایا گیا ہے - قہر کی تاریخ ولادت ۱۵ اپریل ۱۸۱۵ء کی بنیاد پر مرزا عنایت علی کا سنہ ولادت ۱۸۱۷ء نکلتا ہے - مرزا عنایت علی بھی شاعر تھے اور شاید اپنے بڑے بھائی قہر کی رعایت سے انھوں نے اپنا تخلص ماہ رکھا تھا - مرزا عنایت علی ماہ کو نصف درجن سے زائد معاصر تذکرہ نگاروں نے اپنے مندرجۂ ذیل تذکروں میں آتش لکھنوی کا شاگرد لکھا ہے :

(۱) سخنِ شعرا طبع اکتوبر ۱۸۷۴ء ص ۴۰۷
(۲) سراپا سخن طبع اپریل ۱۸۷۵ء ص ۳۱۷
(۳) گلستانِ بے خزاں طبع جون ۱۸۷۵ء ص ۲۴۱
(۴) بزمِ سخن طبع ۱۸۸۱ء ص ۱۰۲/۱۰۱ -
(۵) طورِ کلیم طبع ۱۸۸۱ء ص ۸۷
(۶) جلوۂ خضر (جلد دوم) طبع ۱۸۹۰ء ص ۱۲۶
(۷) تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا - مرتبۂ ڈاکٹر شمیم ص ۲۱۲
(۸) تذکرۂ نادر ص ۱۳۵

شعاع مہر طبع ۱۸۶۰ء میں بھی کئی جگہ ماہ کو آتش لکھنوی کا شاگرد بتایا گیا ہے -

ماہ کے علاوہ آبِ بقا (ص ۱۰۶) اور نسخۂ مونیلس (ص ۵) سے قہر کے ایک ماموں مرزا رجب علی کا بھی پتا چلتا ہے -

مختلف مصادر[1] کو کھنگالنے پر مہر کے احباب میں مجھے مندرجہ ذیل افراد کا سراغ ملا ہے :

(۱) غالب (۲) تفتہ (۳) آرام (۴) یوسف علی خاں عزیز (۵) نبی بخش حقیر (۶) خواجہ غلام غوث بے خبر (۷) قطب الدین باطن [صاحب تذکرۂ گلستان بے خزاں] (۸) محسن علی محسن [صاحب تذکرۂ سراپا سخن] (۹) میر گلزار علی اسیر [خلف نظیر اکبر آبادی] (۱۰) میر نثار علی پذیر [فرزند گلزار علی اسیر] (۱۱) شیخ مہدی علی خاں ذکی (۱۲) نواب مرزا محمد علی خاں حزیں (۱۳) مولوی عبدالوہاب (۱۴) مولوی غلام امام شہید (۱۵) منیر شکوہ آبادی (۱۶) میر انیس (۱۷) مرزا دبیر (۱۸) صبا لکھنوی (۱۹) مرزا رجب علی بیگ سرور (۲۰) استاد علی شور (۲۱) زین العابدین خاں شورش۔

(۵) ملازمت اور اعزاز خلعت و جاگیر

مہر ابتداءً تحصیل دار تھے لیکن ۱۸۴۲ء میں منصفی کا امتحان پاس کر کے چنار گڑھ (ضلع مرزا پور موجودہ اتر پردیش) میں منصف ہوئے۔ پھر منصفی کا عہدہ چھوڑ کر مہر نے وکالت کا پیشہ اختیار کیا اور عدالت دیوانی اکبر آباد میں وکیل رہے۔ بعض ماخذوں میں انھیں وکیل ہائی کورٹ بتایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مہر آگرہ میں آنریری مجسٹریٹ بھی رہے تھے۔ ان امور کا ذکر عود ہندی: مرتبہ فاضل لکھنوی (ص ۸۸ ۲) آب بقا (ص ص ۱۰۶ - ۱۰۷) سراپا سخن (ص ۱۵۱) سخن شعرا (ص ۸۷ ۴) ادبی خطوط غالب (ص ۲۹۱) اور مہر کے سگے پوتے کی انگریزی کتاب ٹسٹی مونیلس (TESTIMONIALS) میں موجود ہے۔ میری اطلاع کے مطابق مہر ۱۲ فروری ۱۸۵۸ء تک منصفی کے عہدے کو چھوڑ چکے تھے کیوں کہ تاریخ مذکورہ کے ایک سرکاری خط میں مہر کو سابق منصف چنار لکھا گیا ہے [ر.ک ٹسٹی مونیلس ص ۳]۔ اودھ اخبار، لکھنؤ کے ایک شمارے[2] سے معلوم ہوتا ہے کہ مہر کو سنہ ۱۸۶۳ء تک عہدۂ وکالت مل چکا تھا۔ آگرہ کے قلعے میں ۱۰ فروری ۱۸۶۰ء کو بوقت ۹ بجے شب لفٹیننٹ گورنر [صوبہ جات این ڈبلیو پی نیز اودھ] کے دربار میں شرکت کے لیے مہر کے نام ایک دربار ٹکٹ جاری کیا گیا تھا۔ اس دربار ٹکٹ پر مرزا حاتم علی بیگ جیدر بائی کورٹ

درج ہے [ر.ک. انگریزی کتاب ٹسٹی مونیلس ص ۱۲]۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۰ فروری ۱۸۷۹ء تک مہر آگرے میں ہائی کورٹ کے معزز وکیل تھے۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب میں مہر نے اپنے بیٹے مرزا سخاوت علی ضیا اور اپنے ماموں مرزا رجب علی کی مدد سے جان کا خطرہ مول لے کر مندرجہ ذیل صاحب انگریز افراد کی جان بچائی تھی:

(۱) مسٹر براؤن۔ یہ آگرے کے ڈپٹی کلکٹر مسٹر ٹی۔ اے براؤن کے بھائی تھے (۲) مسز بیکھم لینی (۳) زوجہ مسٹر بیکھم لینی (۴) دختر مسٹر بیکھم لینی (۵) مسز لوسیا بیلی۔ زوجہ جان ولیم بیلی پروفیسر بریلی کالج (۶) دختر مسز لوسیا بیلی (۷) دختر مسز لوسیا بیلی۔

[ر.ک آب بقا ص ۱۰۲ نیز ٹسٹی مونیلس ص ص ۱-۲ نیز ص ۵]

اس کارنامے پر مہر اور اُن کے فرزند ضیا کے لیے ۱۲ فروری ۱۸۵۸ء کو مبلغ دو ہزار روپے نقد انعام کی منظوری کا حکم جاری ہوا۔ اسی سلسلے میں گورنر جنرل نے ۱۰ دسمبر ۱۸۵۸ء کو ایک حکم نامہ جاری کرایا جس میں متعلقہ افراد کے لیے مندرجہ ذیل انعامات منظور کیے گئے تھے :

(۱) مرزا حاتم علی بیگ۔ ایک ہزار روپے کی مالیت کا ایک خلعت۔

(۲) مرزا سخاوت علی بیگ۔ ۶۵۰ روپے (ساڑھے چھ سو روپے) کی مالیت کا ایک خلعت۔

(۳) مرزا رجب علی [مہر کے ماموں]۔ ۴ سو روپے کی مالیت کا ایک خلعت۔

(۴) مہر۔ ۱۲۰۰ روپے کی مالیت کی مال گزاری کا کوئی ضبط شدہ گاؤں۔ حکم میں یہ بھی توضیح ہے کہ مہر کے لیے تاحیات اس جاگیری گاؤں کی ½ مال گزاری معاف رہے گی اور ان کے فرزند مرزا سخاوت علی کے لیے ¼ مال گزاری معاف رہنے کی رعایت دی گئی ہے۔

گورنر جنرل کے اس ۱۰ دسمبر ۱۸۵۸ء کے حکم پر انگریزی حکومت نے ۴ اپریل ۱۸۵۹ء کو آگرے میں مرزا حاتم علی بیگ مہر کو جو خلعت عطا کیا اس کے پارچہ جات میں مندرجہ ذیل اشیا شامل تھیں:

(۱) دو شالہ گلنار ایک جوڑ (۲) رومال شالی محرمات ایک عدد

(۳) جغہ کمخواب پُرزر ایک عدد (۴) تقان مشروع ایک عدد
(۵) تقان کمخواب پُرزر ایک عدد (۶) شال ٹیکہ ایک عدد
(۷) کلاہ مغلی زریں کار ایک عدد (۸) مالائے مروارید ایک عدد
(۹) انگشتری طلائی بانگیں یاقوت ایک عدد (۱۰) گھڑی ایک عدد
(۱۱) بندوق ولایتی ایک عدد (۱۲) قبضہ شمشیر ولایتی ایک عدد
(۱۳) داب شمشیر یعنی پرتلہ ایک عدد (۱۴) اسپ باکار چوبی سامان ایک راس
ان پارچوں میں سے مہر کی کلاہ، تلوار اور بندوق پر فارسی میں ایک ایک شعر بھی تھا۔

مرزا مہر کے خاندانی کاغذات میں مورخہ ۲۰ مئی ۱۸۶۴ء کی ایک سند سے معلوم ہوتا ہے کہ حاتم علی مہر اور ان کے فرزند سخاوت علی ضیا کو فتح پور سیکری (آگرہ) میں واقع "کاندبادہ" اور "سیکری ایک حصہ" نام کے مواضعات بطور جاگیر ملے تھے۔ ان حالات کے سلسلے میں اپنے شفیق بزرگ جناب آغا عنایت قاسم قزلباش (ریٹائرڈ سپرنٹنڈنٹ پولیس) کا ممنون ہوں کہ موصوف نے اپنے سگے دادا مرزا قاسم حسین قزلباش المتخلص بہ اختر [خلف مرزا سخاوت علی ضیا ابن مرزا حاتم علی بیگ مہر] کی انگریزی اور اردو میں بھی دو عدد کتابیں عنایت فرمائیں جن کے مطالعے کے بعد راقم الحروف مہر کے سوانحی حالات پر مولہ بالا اضافہ کر سکا ہے۔ مہر کے اخلاف میں جناب مرزا الطاف حسین قزلباش نے بھی مجھے اپنے خاندانی حالات بتائے جس کے لیے میں موصوف کا متشکر ہوں۔

(۶) آگرے میں سکونت

۱۸۵۷ء کے انقلاب میں مہر نے جن انگریزوں کی جان بچائی تھی انھیں لے کر وہ لکھنؤ سے آگرہ چلے گئے اور پھر مہر نے آگرہ کو اپنا مسکن بنا لیا۔ تفتہ و مہر کے نام غالب کے متعدد مکاتیب بتاتے ہیں کہ ۱۸۵۸ء کے نصف آخر میں مہر آگرہ میں مقیم تھے۔ غالب کے ایک خط سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ جولائی ۱۸۵۸ء میں مہر کشمیری بازار آگرہ میں اقامت گزیں تھے[1]۔ تذکرہ ریاض الفردوس (ص ۱۳۹) سے یہ بھی علم ہوتا ہے کہ مہر آگرے میں نواب معتمد خاں کی مسجد کے متصل سکونت پذیر تھے۔ سراپا سخن طبع ۱۸۷۵ء (ص ۱۵۶) اور سخنِ شعرا طبع اکتوبر ۱۸۸۰ء (ص ۸۷) میں مہر کے ترجموں سے بھی آگرے میں مہر کی سکونت ثابت ہے۔

(۷) سفر ایٹہ، سنہ وفات و مدفن

آب بقا (ص ۱۰۸) میں مہر کے ایک قطعۂ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ مہر کے بیٹے ۱۸۶۶ء میں ایٹہ میں بہ عہدہ سررشتہ داری مال متعلق ہوئے تھے اور مہر چھٹیوں میں آگرے سے اپنے بیٹے سخاوت علی ضیا کے پاس ایٹہ جایا کرتے تھے۔ خواجہ غلام غوث بے خبر کے غالب کے نام ایک خط سے بھی ایٹہ میں مہر کی آمد و رفت کا سراغ ملتا ہے۔ کلام اختر (ص ۱)، نسخۂ مونیلس (سرورق)، آب بقا (ص ۱۰۹) اور تذکرہ ریاض الفردوس (ص ۱۳۹) میں سخاوت علی ضیا کو تحصیل دار ایٹہ بتایا گیا ہے۔

۱۸۷۹ء میں بھی مہر اپنے لڑکے ضیا سے ملنے ایٹہ گئے تھے۔ وہاں مہر کو ہچکی کا عارضہ شروع ہو گیا۔ ایٹہ میں دوشنبے کے روز ۱۸ اگست ۱۸۷۹ء کو مہر کی وفات ہوئی[2]۔ اختر[3] اور مظفر حسین صبا گوپاموی[4] نے مہر کی تاریخ وفات ۲۸ شعبان ۱۲۹۶ھ درج کی ہے۔ عطا کاکوی نے اپنی کتاب تلخیص و ترجمہ تذکرۂ روز روشن [طبع پٹنہ جون ۱۹۶۸ء (ص ۶۳)] میں مہر کی تاریخ وفات "۲۴ شعبان ۱۲۹۶ھ" رقم کی ہے۔ موصوف کا یہ اندراج نظرثانی کا محتاج ہے۔ مرزا سخاوت علی ضیا نے اپنے والد کی وفات پر جو تاریخ کہی ہے اس سے بھی مہر کا سنہ وفات ۱۲۹۶ھ [تعمیہ کی مدد سے] مستخرج ہوتا ہے[5]۔ لیکن طور کلیم [طبع ۱۲۹۸ھ (۱۸۸۱ء) ص ۱۰۲] میں مہر کا سنہ وفات ۱۲۹۰ھ درج ملتا ہے جو محل نظر ہے۔ ڈاکٹر گیان چند[6] اور ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی[7] کے علی الترتیب ڈی۔ لٹ اور پی ایچ۔ ڈی کے مقالے میں مہر کا سنہ وفات ۱۲۹۰ھ رقم کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اندراج بھی تصحیح کا طالب ہے کیوں کہ مہر کے حقیقی پوتے مرزا قاسم حسین اختر نے عینی شاہد کی حیثیت سے مہر کی تاریخ وفات ۲۸ شعبان ۱۲۹۶ھ لکھی ہے [کلام اختر ص ۲/۳] اور مہر کے معاصر تذکرہ نگار صبا گوپاموی نے بھی اپنے تذکرہ [روز روشن طبع ۱۲۹۷ھ ص ۶۶۲] میں وفات مہر کی یہی تاریخ بتائی ہے۔ ان دو معاصر شہادتوں کی موجودگی میں

ڈاکٹر گیان چند جین اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے بے حوالہ بیانات قابلِ قبول نہیں قرار دیے جاسکتے۔

حاتم علی مہر کا مدفن تکیہ اسد علی ایٹہ میں ہے اور مہر کے فرزند مرزا اسخاوت علی ضیا [متوفی ۱۲ شوال ۱۲۹۶ھ] بھی ایٹہ میں عقب عیدگاہ دفن ہوئے تھے۔ [ر۔ک: کلامِ اختر (ص ۳) نیز آبِ بقا ص ۱۰۹]۔

(۸) افتادِ طبع

جاہ و منصب اور مال و دولت کے ساتھ مہر قد و قامت اور چہرے مہرے کے اعتبار سے بھی ایک دل کش شخصیت کے مالک تھے[۶۷]۔ مہر اس طرح مجموعی طور پر ایک رئیس، شاعر، حسین اور یار باش شخص تھے۔ ان اوصاف کے علاوہ ان کی عاشق مزاجی کا بھی پتا چلتا ہے۔ مہر کے نام غالب کے بعض مکاتیب[۶۸] چنا جان اور مغل جان سے مہر کے عشقیہ روابط کے غماز ہیں۔ شعاعِ مہر کا مطالعہ مہر کو "بُت کا فرکیش و سنگِ راہِ حرم" بی درگا جان متخلص بہ صنم کا پرستار ثابت کرتا ہے۔ مثنوی شعاعِ مہر کی ابتدا اس مصرعے سے ہوتی ہے: ع

"خدا کا آسرا عشقِ صنم ہے"[۶۹]

یہاں "عشقِ صنم" کی ترکیب قابلِ غور ہے۔ بزمِ آخر کے صفحات بھی مہر و صنم کے عشقیہ روابط کی داستانوں سے خالی نہیں[۷۰]۔ تذکرہ شمیم سخن میں بی درگا جان صنم کا یہ ترجمہ موجود ہے: "صنم تخلص۔ درگا نامی طوائف ساکنۂ اکبرآباد [اکبرآباد = آگرہ جو مہر کا بھی مسکن تھا] درگابائی مشہور ہے اور شاہدانِ بازاری آگرہ میں متمول و خلیق شمار ہوتی ہے"[۷۱]۔ طوائفوں سے ربط و ضبط آج معیوب ہے مگر انیسویں صدی کے جاگیردارانہ نظام میں طوائف رُسا و شرفا کے لیے ایک اہم ادارے کی حیثیت رکھتی تھی جہاں شریف زادے ادب و تہذیب نشست و برخواست اور شائستہ طرزِ تکلم سیکھا کرتے تھے۔ مہر کی زندگی کا یہ پہلو عہدِ رفتہ کے جاگیردارانہ نظام کی روایتوں کا امین ہے۔

(۹) ادبی آثار

مرزا قاسم حسین اختر نے اپنے دادا مہر کو بیس کتابوں کا مصنف قرار دیا ہے[۷۲]۔ مجھے مہر کے ادبی آثار میں مندرجۂ ذیل کتابوں[۷۳] کا سراغ ملا ہے:

(۱) الماسِ درخشاں یا خیالاتِ مہر۔ مہر کے دیوان کے ان دونوں ناموں سے ۱۲۸۰ھ مستخرج ہوتا ہے۔ اس اردو دیوان میں بعض فارسی غزلیں بھی ہیں۔ اسے مہر کے پوتے مرزا قاسم حسین اختر نے چھپوایا تھا۔

(۲) ایاغِ فرنگستان۔ تاریخ کی کتاب ہے۔ عشرت لکھنوی سنہ انطباع ۱۸۷۲ء بتاتے ہیں۔

(۳) داغِ نگار۔ یہ مہر کی مثنوی ہے۔ اگر نام تاریخی ہے تو اس سے ۱۲۷۲ھ برآمد ہوتا ہے۔ "لکھنؤ کا دبستانِ شاعری" (ص ۲۳۰) میں غلطی سے اس کا نام "داغِ نگاہ" لکھا گیا ہے۔ ایک عشقیہ واقعے پر مبنی یہ مثنوی [بہ قول عشرت لکھنوی] مہر نے محض ایک روز میں کہی تھی۔ یہ چھپ چکی ہے۔

(۴) داغِ دلِ مہر۔ واسوخت۔ [بہ حوالہ ادبی خطوطِ غالب (ص ۲۹۲) نیز آبِ بقا ص ۱۰۷]۔

(۵) شبیہِ عشرت۔ اس میں مہر نے اپنے پوتے مرزا قاسم حسین اختر [متولد ۱۰ اپریل ۱۸۷۰ء] کی ولادت و بسم اللہ وغیرہ کی تقریبوں کا ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب چھپ چکی ہے۔ یہ اطلاعات کلامِ اختر (ص ۱) پر مبنی ہیں۔

(۶) ذابِ انتقام۔ بزمِ غالب۔ (ص ۳۶۷) اور ادبی خطوطِ غالب (ص ۲۹۲) میں اس کا نام بالترتیب "ذبِ انتقام" اور "ضبطِ انتقام" لکھا گیا ہے حالاں کہ اس کا صحیح نام ذابِ انتقام ہے۔ یہ حضرت مختار کے حال میں ایک منظوم مذہبی کتاب ہے۔

(۷) ہمامِ اُخوت۔ مرزا محمد عسکری، خواجہ عشرت لکھنوی اور مولانا غلام رسول مہر نے اس کی نشان دہی کی ہے۔

(۸) توقیرِ شریف۔ " " "

(۹) عہدِ قیصری۔ [بہ حوالہ ادبی خطوطِ غالب (ص ۲۹۲)] آبِ بقا (ص ۱۰۸) میں اس کا نام "عہدِ قیصریہ" ملتا ہے۔ کتاب دسترس میں نہیں کہ صحیح نام بتایا جاتا۔ بزمِ غالب (ص ۳۶۷

میں بھی اسے "عہدِ قیصریہ" لکھا گیا ہے۔

(۱۰) پیرایۂ عروض [بہ حوالۂ ادبی خطوطِ غالب (ص ۲۹۰)
نیز خطوطِ غالب: مرتبہ مولانا غلام رسول مہر طبع چہارم (ص
۱۰۹)] - بزمِ غالب (ص ۴۶۳) اور آبِ بقا (ص ۱۰۰) میں
اس کا نام "بہارِ عروض" بتایا گیا ہے۔ یہ اردو میں فنِ عروض پر
ایک مختصر رسالہ ہے جسے مہر کے ایک شاگرد نے چھپوایا تھا۔

(۱۱) بیاضِ یوسف ۔۔ رسالہ مطبع حیدری آگرہ سے ۱۲۷۷ھ
میں طبع ہوا تھا۔ اس کی طباعت کے مصارف نواب مرزا محمد علی
خاں بہادر [تلمیذ آتش لکھنوی] نے عطا کیے تھے۔ اس
رسالے میں مہر کی محبوبہ [illegible] جان [تاریخ وفات ۱۰ ذی قعدہ
۱۲۷۶ھ] کی وفات پر مہر کے منظوم تاثرات اور مہر، ناد و مولوی
عبدالوہاب کے قطعاتِ تاریخ شائع ہوئے ہیں۔ [بہ حوالہ
پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب]۔ مولانا غلام رسول مہر نے
اسے غلطی سے مثنوی قرار دیا ہے [خطوطِ غالب مرتبہ غلام رسول
مہر طبع چہارم ص ۱۰۹]

(۱۲) رسالۂ زُبدۃ البیّنات - مرزا دبیر نے زبدۃ البیّنات میں
میر انیس کی وفات پر جو فارسی قطعۂ تاریخ کہا تھا اس پر بعض
اعتراضات ہوئے۔ مہر نے اس رسالے میں مرزا دبیر کی تائید
میں ان اعتراضات کے جواب دیے تھے۔ فاضل لکھنوی لکھتے
ہیں کہ یہ رسالہ ان کے پاس موجود ہے۔ [عودِ ھندی: مرتبہ
فاضل لکھنوی طبع جون ۱۹۶۷ء ص ۴۸۸]۔

(۱۳) شعاعِ مہر - مہر کی یہ عشقیہ اردو مثنوی مطبع حیدری آگرہ
سے ماہ دسمبر ۱۸۶۰ء / ۱۲۷۷ھ میں شائع ہوئی تھی۔ خواجہ عشرت لکھنوی
اور مولانا فاضل لکھنوی نے شعاعِ مہر کا سنہ انطباع ۱۲۷۵ھ
بتایا ہے جو درست نہیں [ر-ک: (۱) آبِ بقا ص ۱۰۸ نیز (۲)
عودِ ھندی: مرتبۂ فاضل لکھنوی ص ۴۴۳ (حاشیہ ۲)، ص ۲۹۹
(حاشیہ ۱) نیز ص ۳۰۱ (حاشیہ ۱)]۔ اس کتاب پر میرا مضمون
"شعاعِ مہر اور اس کی روشنی میں جہانِ غالب" [مشمولہ
'ہماری زبان'، دہلی مورخہ ۲۲ جولائی ۱۹۷۹ء] ملاحظہ ہو۔

(۱۴) خارِ عشق - غدر ۱۸۵۷ء میں تلف شدہ کلام۔[۸۲]

(۱۵) انجامِ عشق - " "

(۱۶) کشکول - غدر میں یہ بھی تلف ہو گیا۔

(۱۷) قاعدۂ نظم - محض نام سنا ہے۔

(۱۸) محیطِ آشنا - یہ ان شعرا کا تذکرہ تھا جو مہر کے ملاقاتیوں
میں شامل تھے۔ افسوس کہ اس کے بھی نام ہی کا سراغ مل سکا ہے۔

(۱۹) پنجۂ مہر - سخنِ شعرا طبع اکتوبر ۱۸۷۴ء (ص ۴۰۸)
نیز سراپا سخن طبع اپریل ۱۸۰۵ء (ص ۱۵۶) میں مہر کی اس
تصنیف کو رسالہ قرار دیا گیا ہے۔ غنچۂ آرزو: صبا لکھنوی[۸۳] طبع
۱۸۷۷ء میں پنجۂ مہر کے متعلق میر صبا لکھنوی کا یہ قطعۂ تاریخ
ملتا ہے: -

پنجۂ مہر چو از مہر شنید — بہ بیانش دل من شیدا گشت
جست انشیٔ [illegible] لفظش — حسنِ معنی بصفا پیدا گشت
عیسوی گفت صبا تاریخش — پنجۂ مہر ید بیضا گشت

[آخری مصرعے سے ۱۸۵۲ء مستخرج ہوتا ہے۔ کاظم علی خاں]

(۲۰) نمونۂ کلام

اس مضمون میں کلامِ مہر پر کسی تنقیدی بحث کا محل نہیں لہٰذا
نمونۂ کلامِ مہر پر اکتفا کی جاتی ہے۔

تجھ سے تو ہے امید ہمیں لطف و کرم کی
ہوگا کسی کافر ہی کو ڈر روزِ جزا کا

اس دور میں ہر اک تہِ چرخِ کہن لٹا — اوروں کا زر لٹا مرا نقدِ سخن لٹا
بلبل کو کیسی کیسی ہوئیں آفتیں نصیب — گلچیں کے دستِ ظلم سے کیا کیا چمن لٹا
ناتوانی جب ہوئی زور آزما — جامۂ تن اپنا دھجی ہو گیا

ہم سیہ کاروں کا گر یوں ہی رہے گا بوسہ گاہ
سنگِ اسود اس کا سنگِ آستاں ہو جائے گا

میں تو اس چال پہ مرتا ہوں کہ چلتے چلتے
ٹھوکریں مارتیں سرِ گورِ غریباں کیا کیا

شہر ویراں ہے جنگل بسے دیوانوں سے — باعثِ کثرتِ آبادیِ صحرا ہے وہ رخ
اس قدر باغ میں جو گل کے لیے نالاں ہے — تو عندلیب بھی شاید نہیں دیکھا ہے وہ رخ

بلایا آئی، نکالا نکل گئی دم میں — یہ شکر ہے کہ رہی حکم کردگار میں روح
جہاں نہ ہو کوئی باتوں کو جی لگے کیا خاک — رہی سوال نکیرین تک مزار میں روح
خیال رنج سے ایسا رہا دوازدہ ماہ — تو خواب مرگ میں ہے تہر مشت خاک میں روح
ہوئی تمام رات بستر پیچ و تاب میں — دل پھنس گیا ہے زلف شکن در شکن میں آج

لکھا کیے ہیں مضامین زلف و عارض کے
سیاہ کاغذ سادہ کیا ہے ساری رات

خوشی کی بات پر بھی غم زدے کب شاد ہوتے ہیں
ہمارے سامنے اب کوئی ہنستا ہے تو روتے ہیں

رنگ صحبت بدلتے جاتے ہیں — ساتھ کے یار چلتے جاتے ہیں

آئیں تو عنایت ہے، نہیں آتے نہ آئیں
ہم دل کو تصور ہی سے بہلائے ہوئے ہیں

کیا بات تری اے لب جاں بخش ہے کیا بات
عیسیٰ بھی ترے وقت میں دم کھلنے ہوئے ہیں

تمھارے واسطے دل سے نہیں کوئی مکاں بہتر
جو آنکھوں میں تمھیں رکھوں تو ڈرتا ہوں نظر ہوگی

شانہ نہ کرو گیسوؤں کا تار نہ ٹوٹے — دیوانوں کی زنجیر ہے، ہشیار نہ ٹوٹے
قربان میں کس ناز سے کہتے ہیں وہ مجھ سے — سر پھوڑیے لیکن مری دیوار نہ ٹوٹے

کوئی دل سوز سوا اس کے نہ دیکھا اپنا
شمع رونے کو مری قبر پہ آجاتی ہے

دل سوز ہے کوئی، نہ کوئی غم گسار ہے — مرنے کو ہم ہیں رونے کو شمع مزار ہے

عبث کرتے ہیں کیوں ہر کام میں تدبیر پہلے سے
وہ ہوگا لکھ چکا جو کاتب تقدیر پہلے سے

شمع کی تقریر پروانوں سے یہ محفل میں ہے
وہ زباں پر ہے ہمارے جو تمھارے دل میں ہے

زلف اندھیر کرنے والی ہے — تم نے ناگن بلا کی پالی ہے
اس کے مذہب کا اعتبار ہے کیا — تہر اک رند لاابالی ہے

رومال کے لباس میں ابر آکے بار ہا
پانی پیا کیا مری چشم پر آب سے
نہ کیوں ہر طرز میں پڑھتا غزل اس ماہ کے آگے

مرا استاد کامل تہر، ناسخ سا ہمہ داں ہے
ملے ہیں خاک میں گل رو ہزاروں
عجب گلزار اک زیر زمیں ہے

تہر کی ایک غزل کے چند غیر منقوط اشعار بھی ملاحظہ ہوں :-

حالِ دل تہر کا کھلا ہم دم — درد ہم دردِ دل ہوا ہم دم
کس طرح کا معاملہ ہوگا — وصل اس کا اگر ہوا ہم دم
اللہ اللہ آہِ سرد سحر — گرم کس کس طرح ہوا ہم دم
ہم کو اس لعل کا دکھا عالم — مسکرا کر لہو رُلا ہم دم

۱۱۔ قطعاتِ تاریخ

سطور ذیل میں تہر کے قطعاتِ تاریخ کے بعض نمونے پیش ہیں :

(۱) قطعۂ تاریخ اتمام تذکرہ سراپا سخن : ؎

شور و غوغا جدا بیاں ہے جدا — زمزمہ ہے جدا فغاں ہے جدا
بلبلوں کا جدا نشیمن ہے — مرغ معنی کا آشیاں ہے جدا
ہے ہر اک بات کا جدا انداز — روشِ طرزِ نکتہ داں ہے جدا
واہ کیا بات میر محسن کی — دل جدا مدح خواں زباں ہے جدا
تذکرے میں بھرا سراپا حسن — کہ سراپا کا ڈھنگ یاں ہے جدا
اس کی تاریخ اب لکھوں اے تہر (سراپا سخن طبع ۵، ۱۸۰ء
یہ گلستانِ بے خزاں ہے جدا ص ۳۸۰]

[: "یہ گلستانِ بے خزاں ہے جدا" سے ۱۲۶۹
مستخرج ہوتا ہے ۔ کاظم علی خاں]

---

(۲) تذکرۂ سراپا سخن کے پہلے ایڈیشن کے سنہ انطباع کی تاریخ : ؎

اسی تذکرے کی ہے باغِ جہاں میں — ہر اک سطر موج نسیم معانی
ہوا میر محسن علی کا یہ احساں — کہ ہے عطر آگیں شمیم معانی
کہوں تہر تاریخ چھپنے کی اس کے — سراپا سخن ہے کلیم معانی
(سراپا سخن ص ۳۹۴)

("سراپا سخن بل کلیم معانی" = ۱۲۷۷ھ)

(۳) قطعۂ تاریخ وفاتِ میر وزیر علی صبا : نمبر

بزم عزا باغِ جہاں ہو گیا — پھولوں کی بو پھولوں کی نکہت میں ہے
اسے مرے دوست صبا لے گئے — نالہ یہی جوشِ رقت میں ہے
مصرع تاریخ سنو مہر سے
دورِ صبا گلشن جنت میں ہے [۱۲۷۱ھ]

[غنچۂ آرزو (دیوان صبا) : میر وزیر علی صبا ۔ مطبع ثمر ہند، لکھنؤ طبع ۱۸۷۷ء ص ۱۹۵ مملوکہ کاظم علی خاں]

(۴) غالب کے انتقال کی مہر نے یہ تاریخ نکالی ہے: مصرع

بجناں غالبِ نامی آمد [آبِ بقا ص ۱۰۸]
[۱۲۸۵ھ]

حواشی

لہ اردوئے معلّیٰ (حصہ اوّل) : غالب ۔ اکمل المطابع، دہلی طبع مارچ ۱۸۶۹ء مطابق ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ (ص ۴۶۰) میں مرزا قربان علی بیگ سالک نے خاتمۂ کتاب میں غالب کی تاریخ وفات ۲ ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ بتائی ہے۔ تقویم یک صد و دو سالہ مطبع منشی نول کشور، لکھنؤ طبع ۱۸۷۵ء کا جو نسخہ رضا لائبریری رام پور میں موجود ہے اس میں ایک ماہرِ فن نے بعد کے سنین کا اضافہ کیا ہے۔ یہ اضافہ شدہ تقویم ۲ ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ کو دوشنبہ ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کے مطابق بتاتی ہے۔ والیِ رام پور نواب کلب علی خاں کے نام حسین علی خاں نے غالب کے سوم کو جو خط ارسال کیا تھا اس سے بھی یہی دن اور تاریخیں معلوم ہوتی ہیں۔ (دیکھئے مکاتیب غالب : مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی ۔ ناظم پریس، رام پور (طبع چہارم) مطبوعہ ۱۹۴۲ء از متن ص ۹۴ ۔ مکتوب نمبر ۱۱ حاشیہ ۳]

کہ عودِ ہندی : مرزا غالب ۔ مطبع مجتبائی، میرٹھ طبع ۱۰ رجب ۱۲۸۵ھ (مطابق ۲۷ اکتوبر ۱۸۶۸ء) نیز دوسرے مجموعوں میں مرزا حاتم علی مہر کے نام غالب کے ڈیڑھ درجن سے زائد مکاتیب موجود ہیں۔

سہ تلاش کے باوجود مجھے غالب و مہر کی کسی ملاقات کا سراغ نہیں مل سکا ہے۔

کہ بہ حوالہ تذکرۂ آبِ بقا : مولفہ خواجہ عبدالرؤف عشرت ۔ مرتبہ مرزا جعفر علی نشتر ۔ نامی پریس، لکھنؤ طبع ستمبر ۱۹۲۸ء ص ۱۰۵

ھ مرزا حاتم علی بیگ مہر کے سگے پوتے مرزا قاسم حسین قزلباش اختر کی مختصر انگریزی کتاب ٹسٹی مونیلس [TESTIMONIALS] لحسنی برادرس پریس مراد آباد (سنہ اشاعت ندارد) کے دیباچے (ص ۱) سے معلوم ہوتا ہے کہ مہر کے پردادا ہی نادر شاہ کے ہم راہ ہندستان آئے تھے۔ مگر بزمِ غالب : عبدالرؤف عروج ۔ ادارۂ یادگارِ غالب، کراچی (پاکستان) طبع مارچ ۱۹۶۹ء (ص ۳۶۵) میں اس مقام پر غلطی سے مہر کے پردادا کے بجائے دادا لکھ دیا گیا ہے۔ [کاظم علی خاں]

لہ تذکرۂ ریاض الفردوس : تالیف محمد حسین خاں ۔ ترتیب و حواشی مرتضیٰ حسین فاضل (لکھنوی) شائع کردہ شیخ مبارک علی لاہور طبع اپریل ۱۹۶۸ء (ص ص ۱۳۹/۱۳۸) نیز آبِ بقا (ص ۱۰۶) سے معلوم ہوتا ہے کہ مہر کے پردادا نادر شاہ کے ساتھ ہندستان آئے تھے۔ نادر شاہ نے مغل حکمراں محمد شاہ رنگیلے کے عہد میں ہندستان پر حملہ کیا تھا۔ محمد شاہ رنگیلے کی جانب سے اودھ کے صوبے دار سعادت خاں برہان الملک میر محمد امین نے ۱۵ ذی قعدہ ۱۱۵۱ھ [از روئے تقویم مطابق سہ شنبہ ۱۳ فروری ۱۷۳۹ء] کو نادر شاہ سے مقابلہ کیا تھا [بہ حوالہ تاریخ اودھ کا مختصر جائزہ از امجد علی خاں ۔ سرفراز پریس، لکھنؤ طبع ۱۹۷۸ء ص ۴]۔ انگریزی کتاب ہسٹری آف انڈیا : ایشوری پرشاد ۔ دی انڈین پریس، الہ آباد طبع ۱۹۴۵ء (ص ۲۶۰) میں بھی ہندستان پر نادر شاہ کے حملے کا سال ۱۷۳۹ء قرار دیا گیا ہے۔ مگر لکھنؤ کی تہذیبی میراث : ڈاکٹر سید صفدر حسین ۔ بارگاہ ادب، لاہور طبع ۱۹۷۵ء (ص ۴۲) میں خلافِ واقعہ یہ سنہ ۱۷۳۸ء درج ملتا ہے۔ راقم الحروف نے مہر کے پردادا کے ہندستان میں ورود کا زمانہ حملۂ نادری سے متعین کیا ہے۔ [کاظم علی خاں]۔

۷ سراپا سخن: محسن علی محسن۔ مطبع منشی نول کشور، لکھنؤ طبع اپریل ۱۸۷۵ء ص ۱۵۶ نیز ۳۱۔
۸ سخن شعرا: مولوی عبدالغفور نساخ۔ مطبع منشی نول کشور، لکھنؤ طبع اکتوبر ۱۸۷۴ء ص ۴۷۸ء
۹ تذکرۂ نادر: مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب۔ کتاب نگر لکھنؤ طبع ۱۹۵۷ء ص ۱۵۳۔
۱۰ خطوطِ غالب: مرتبہ غلام رسول مہر۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، لاہور طبع چہارم ۱۹۶۸ء ص ۱۷۸۔
۱۱ کلامِ اختر: مرزا قاسم حسین اختر۔ علی گڑھ۔ طبع ۱۹۱۹ء ص ۱
۱۲ رک سرورق انگریزی کتاب ڈسٹی مونیلس از مرزا قاسم حسین اختر۔ ۱۳ ایضاً دیباچہ ص ۱۔
۱۴ جلال الدین حیدر نواب شجاع الدولہ اپنے والد مرزا مقیم ابوالمنصور بہادر صفدر جنگ کی وفات [۱۷ ذی الحجہ ۱۱۶۷ھ مطابق شنبہ ۵ اکتوبر ۱۷۵۴ء] کے بعد اودھ کے حکمراں ہوئے۔ شجاع الدولہ کی تاریخ وفات ۲۲ ذی قعدہ ۱۱۸۸ھ [مطابق ۲۶ جنوری ۱۷۷۵ء] بتائی جاتی ہے۔ اس طرح اودھ میں نواب شجاع الدولہ کا عہدِ حکومت ۶ اکتوبر ۱۷۵۴ء تا ۲۶ جنوری ۱۷۷۵ء کی درمیانی مدت کو محیط ہے۔ [رک (۱) تاریخِ اودھ کا مختصر جائزہ ص ۹۰ نیز ۱۰۲۔ (۲) شجاع الدولہ (جلد دوم): ڈاکٹر اے۔ ایل۔ سری واستو طبع ۱۹۷۴ء ص ۲۵۹]۔
۱۵ سراپا سخن طبع اپریل ۱۸۷۵ء ص ۱۵۶۔
۱۶ سخن شعرا (طبع اکتوبر ۱۸۷۴ء) ص ۴۷۸۔
۱۷ تذکرۂ طورِ کلیم: سید نورالحسن خاں (کلیم) مطبع مفیدِ عام آگرہ۔ طبع ۱۲۹۸ھ ص ۱۰۲۔
۱۸ تذکرۂ نادر ص ۱۵۳۔
۱۹ گلستانِ بے خزاں: حکیم قطب الدین باطن۔ مطبع منشی نول کشور، لکھنؤ۔ طبع جون ۱۸۷۵ء ص ۲۳۸۔
۲۰ بہ حوالۂ سرورق ڈسٹی مونیلس۔
۲۱ ایضاً۔
۲۲ ایضاً دیباچہ ص ۱۔
۲۳ ادبی خطوطِ غالب: مرتبہ مرزا محمد عسکری (طبع نہم) ۱۹۷۰ء ص ۲۹۱۔
۲۴ لکھنؤ کا دبستانِ شاعری: ڈاکٹر ابواللیث صدیقی۔ مکتبۂ علم و فن، دہلی۔ طبع اپریل ۱۹۶۵ء ص ۴۲۹۔
۲۵ اردو مثنوی شمالی ہند میں: ڈاکٹر گیان چند۔ انجمن ترقیِ اردو (ہند)، علی گڑھ۔ طبع ۱۹۶۹ء ص ۵۸۵۔
۲۶ لکھنؤ کا دبستانِ شاعری ص ۴۳۰۔
۲۷ آبِ بقا (ص ۱۰۵) میں مرزا حاتم علی بیگ کی تاریخِ ولادت ۴ جمادی الاول ۱۲۳۰ھ (یوم شنبہ) ملتی ہے۔ شنبہ کو بنیاد مان کر تقویم ہجری و عیسوی سے پتا چلتا ہے کہ ۱۵ اپریل ۱۸۱۵ء کو ۵ جمادی الاول ۱۲۳۰ھ اور شنبے کا دن تھا۔ آبِ بقا کا اندراج ۴ جمادی الاول ۱۲۳۰ھ کو شنبہ بتاتا ہے۔ تقویم کے قیاسی حساب میں ہجری تاریخ میں ایک دن کا فرق عام بات ہے۔ میں نے اسی لیے شنبہ ۱۵ اپریل ۱۸۱۵ء کو ترجیح دی ہے حالاں کہ تقویم ۴ جمادی الاول ۱۲۳۰ھ کو ۱۴ اپریل ۱۸۱۵ء (یوم جمعہ) کے مطابق بتاتی ہے لیکن یوم ولادت شنبہ سے ۱۵ اپریل ۱۸۱۵ء خلافِ تقویم نہیں۔ [کاظم علی خاں]

(باقی ص ۵۳ پر)

محمد مرسلین شیدا
۲۔ نوراللہ روڈ (مقابل شاہی مسجد)
الہ آباد - ۲۱۱۰۰۳

محمد علی جوہر

چہرے پہ نمایاں تھے جواں عزم کے تیور
انکار کا پہلو تھا کہ احساس کا خنجر
ایوانِ فرنگی میں کہا اس نے گرج کر
"جینے سے غلامی کے ہے مرنا کہیں بہتر"
وہ مردِ مجاہد تھا محمد علی جوہر

آزادیٔ انساں کا طلب گار رہا وہ
ہر بزمِ سیاست کا نگہہ دار رہا وہ
تاریک فضاؤں میں ضیا بار رہا وہ
دنیا نے پکارا "افقِ ہند کا خاور"
وہ مردِ مجاہد تھا محمد علی جوہر

تقریر میں حق گوئی و بے باکیٔ فطرت
تحریر پہ قربان تھی دنیائے صحافت
بازیچۂ اطفال نظر میں تھی سیاست
کوزہ، جو سمٹ جائے، وہ پھیلے تو سمندر
وہ مردِ مجاہد تھا محمد علی جوہر

ہو ترکِ موالات کہ تحریکِ خلافت
ہمدرد رہا پرتوِ افکارِ سیاست
ہر موڑ پہ کی جبر و تشدد کی مذمت
ہمت کا دھنی، بحرِ سیاست کا شناور
وہ مردِ مجاہد تھا محمد علی جوہر

ہمدرد غریبوں کا، امیروں کا امیں بھی
مسلم کا محافظ تھا وہ ہندو کے قریں بھی
پرواز فلک پر تھی، نظر میں تھی زمیں بھی
شاہین تھا فطرت میں، اخوت کا پیمبر
وہ مردِ مجاہد تھا محمد علی جوہر

تخلیقِ سخن پر جو طبیعت کبھی آئی
تخیل نے الفاظ کی مہندی وہ رچائی
غالب کی فصاحت میں زباں داغ کی پائی
اندازِ سخن میں نہ تھا اس کا کوئی ہمسر
وہ مردِ مجاہد تھا محمد علی جوہر

آنکھوں میں جھلکتی ہوئی تصویرِ عبادت
ہونٹوں پہ مچلتی ہوئی قرآں کی تلاوت
رگ رگ میں تڑپتی ہوئی ایماں کی حرارت
دل بادۂ عرفاں کا چھلکتا ہوا ساغر
وہ مردِ مجاہد تھا محمد علی جوہر

ہم دیدہ وری شوق کی پیدا کریں برسوں
تصویرِ جہاں غور سے دیکھا کریں برسوں
پائیں گے بھلا کیا اسے ڈھونڈا کریں برسوں
دنیا پہ کھلا چھوڑ گیا شوق کا دفتر
وہ مردِ مجاہد تھا محمد علی جوہر

طرب صدیقی
ایس ۲۳/۱۲۳ ڈیٹھوری محال اردلی بازار
وارانسی

مرحبا اے سالِ نو

تو بہاروں کی نویدِ جاں فزا ہو سالِ نو
تیری آہٹ نغمۂ موجِ صبا ہو سالِ نو
تیرے دم سے ذرہ ذرہ نور ساماں ہو یہاں
کاش تو خورشیدِ الفت کی ضیا ہو سالِ نو
تیرے دم سے گل بداماں ہو امیدوں کا جہاں
مرحبا اے سالِ نو اے ضامنِ امن و اماں

ظلمتوں کی اوٹ سے پھوٹے محبت کی کرن
کیف و مستی کی فضا میں زندگی ہو نغمہ زن
یوں چلے بادِ صبا انگڑائیاں لیتی ہوئی
نکہتِ جاوید سے سرشار ہو سارا چمن
اہلِ دل، اہلِ نظر، اہلِ وطن ہوں شادماں
مرحبا اے سالِ نو اے ضامنِ امن و اماں

کیا بتاؤں کیسی اس دنیا کی حالت ہو گئی
شہر ہو یا گاؤں ہو پھیلی ہوئی ہے ابتری
اس قدر انسان خود غرضی پہ مائل ہو گیا
اٹھ گیا ہے زندگی سے اعتبارِ زندگی
صاحبِ حسنِ یقیں ہے بندۂ وہم و گماں
مرحبا اے سالِ نو اے ضامنِ امن و اماں

آنکھ میں آنسو لیے ہے ملتجی مظلومیت
بخش دے ہم کو متاعِ جذبۂ انسانیت
تیرے دم سے ہو فروغِ اتحادِ باہمی
زندہ ہو رسمِ وفا پائندہ ہو جمہوریت
یعنی پھر جنت نشاں ہو گلشنِ ہندوستاں
مرحبا اے سالِ نو اے ضامنِ امن و اماں

موحسنہ غازیپوری
ایس ۲۳/۱۴۰ اردلی بازار
وارانسی - ۲۲۱۰۰۲

جشنِ جمہوریت

اپنی محفل کا نیا رنگ ہوا آج کے دن
ساقیا پیار بھرا جام پلا آج کے دن
رقص کرتی ہوئی شام آئی سنہرے کل کی
مطربہ چھیڑ غزل ساز اٹھا آج کے دن
حوصلہ شوقِ طبیعت کا بڑھا آج کے دن
اپنی تقدیر کو خود ہم نے لکھا آج کے دن

ہم نے سب دورِ غلامی کے چلن چھوڑ دیے
غیر کے ساغر و مینا و سبو توڑ دیے
اپنے افکار و خیالات کو بدلا ہم نے
اپنی راہوں کو نئی سمت نئے موڑ دیے
غنچہ و گل کو نیا رنگ دیا آج کے دن
اپنی تقدیر کو خود ہم نے لکھا آج کے دن

قدر افزائیِ آزادیِ انساں ہوئی
اک نئی شان سے اپنی بھی پہچان ہوئی
ہم نے اس طرح سے تنظیمِ چمن کی اپنی
زندگی باعثِ راحت ہوئی آسان ہوئی
سانس آزاد فضاؤں میں لیا آج کے دن
اپنی تقدیر کو خود ہم نے لکھا آج کے دن

رات کی زلف پریشاں تھی سنوارا ہم نے
دن کا آئینہ دھواں سا تھا نکھارا ہم نے
مشعلیں پیار کی ہر راہ میں روشن کر کے
عظمتِ عہدِ گذشتہ کو پکارا ہم نے
عزمِ تعمیرِ وطن ہم نے کیا آج کے دن
اپنی تقدیر کو خود ہم نے لکھا آج کے دن

ڈاکٹر فضل امام
شعبۂ اردو۔ راجستھان یونیورسٹی جے پور

مختصر افسانہ اور اس کے جدید رجحانات

نذیر احمد کی مولویت اور پریم چند کی منشیت کسی نہ کسی طور پر ایک عرصے تک اردو افسانہ نگاری پر اپنا سایہ ڈالے رہی۔ جیسے ترقی پسند تحریک نے کچھ اس طرح فکر و فن کے سانچے میں ڈھالا کہ اس کے سینے کے داغ لپکتے ہوئے "انگارے" اور اس کی روح کی تڑپ بھڑکتے ہوئے "شعلے" کا روپ دھار گئی۔ انھیں انگاروں نے افسانہ نگاری کے میدان میں جدید رجحانات کے آتش کدے روشن کیے۔ ستم ظریفی یہ ہوئی کہ ان روشنیوں کے باوصف مختصر افسانہ نگاری کی متعدد اور مختلف تعریفوں نے اس صنف ادب کو چیستاں بنا دیا۔ در اصل اس صنف کی جو بھی تعریف آج کی جائے گی وہ کل کے ابھرتے ہوئے سورج کی روشنی میں ضرور پرانی ہو جائے گی۔ کیونکہ مختصر افسانہ بہ حیثیت افسانہ اور بہ اعتبار فن نئے زمانے کی صنف ہے اس کی تعمیر و تشکیل میں عہد حاضر کے پیچیدہ مسائل اور آج کی زندگی اہم رول ادا کرتی ہے۔ میں اس نقطۂ نظر کو بھی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ چونکہ آج کے دور میں انسان کو موٹی موٹی ضخیم کتابیں پڑھنے کی فرصت نہیں ہے اس لیے وہ ذہنی سکون کے لیے مختصر افسانوں کی طرف مائل ہوا یعنی مختصر افسانہ نگاری نے داستانوں اور ناول نگاری کی جگہ لے لی ہے۔ اگر یہ ہے تو ناول نگاری کا خاتمہ ہو جانا چاہیے تھا۔ لیکن تاریخ افسانہ نگاری اس امر کی شاہد ہے کہ ناول نگاروں کے ہاتھوں سے ہی اس صنف کی نقاب کشائی ہوئی۔ دونوں اصناف ادب دوش بدوش چلتی رہی ہیں۔ اس لیے افسانہ نگاری کو ناول نگاری کا بدل قرار دینا شدید غلطی ہے۔

دوسرا پہلو بھی بڑا مضحکہ خیز ہے۔ وہ یہ کہ ذہنی سکون کے لیے افسانوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ یا کیا جاتا رہا ہے میرے خیال میں یہ بھی گمراہ کن نقطۂ نظر ہے۔ افسانہ نگاری کو تفریح طبع اور تفنن طبع کا ذریعہ قرار دینا اس صنف ادب سے عدم واقفیت کی واضح دلیل ہے اور اگر آج بھی اسے تفریح طبع کا ذریعہ ہی گردانا جاتا رہا تو پھر تفریح اور طبع دونوں کے روشن اور تاریک امکانات پر غور کرنا ہوگا۔

ہمارے مغربی افسانہ نگاروں اور ناقدین نے بھی مختصر افسانے کے سلسلے میں بڑی نیترے بازیاں کی ہیں۔ ایچ۔ جی ویلیم کا نقطۂ نظر یہ ہے:۔

> "SHORT STORY AIMS AT A SINGLE CONCENTRATED IMPRESSION."

JAMES W. LINN کا خیال ہے:

> "SHORT STORY IS A REPRESENTATION IN BRIEF DRAMATIC FORM, OF A TURNING POINT IN THE LIFE OF A SINGLE CHARACTER."

HUDDSON کا کہنا ہے:

> "SINGLENESS OF AIMS AND SINGLENESS OF EFFECTS ARE GREAT CAUSES BY WHICH WE HAVE TO TRY THE VALUE OF SHORT STORY AS A PIECE OF ART."

ایڈگرایلن پو (EDGER ALLENPOE) نے مختصر افسانہ کی جو تعریف بیان کی۔ اس میں ایک نشست کی قید لگا دی تھی۔ یعنی مختصر افسانہ وہ ہے جو آدھ گھنٹے سے لے کر ایک گھنٹے یا دو گھنٹے میں پڑھا جا سکے۔ ایک دو گھنٹے یا آدھ گھنٹے کی نشست کی پابندی بے معنی ہے۔ اس کا تعلق فن اور فنی محاسن سے نہیں بلکہ جسمانی ریاضت سے ہو جائے گا۔ اصل بات تو کہانی کی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کہانی چند لمحوں میں ختم ہو جائے۔

دراصل انسانی زندگی اور کہانیاں لامحدود ہیں جتنی زندگیاں ہیں ان کے اتنے ہی مختلف رخ ہیں اور اس سے زیادہ کردار ہیں۔ جو وقت کے دھارے میں مختلف سمتوں میں رہتے، بستے اور چلتے ہیں زندگی ایک دریا کے مانند ہے۔ جس کی کچھ لہریں ساحل سے ٹکرا کر تموّج پیدا کر دیتی ہیں۔ کچھ لہریں دوسری تیز لہروں میں ضم ہو جاتی ہیں۔ اور کچھ ساحل سے ٹکرا کر اور بعض ساحلِ مراد سے قبل ہی دم توڑ دیتی ہیں۔ چنانچہ ادب اور خاص طور سے افسانہ کے لیے جس کا تعلق براہ راست انسانی زندگی سے ہے کوئی فرسودہ اور بندھی ٹکی تعریف کافی نہیں۔

مختصر افسانوں پر گفتگو کے وقت عام طور سے یہ ضرور کہا جاتا ہے کہ کہانی اور قصہ میں نئی بات کیا ہے؟ نئے لوگ جو لکھ رہے ہیں وہ محض ان کے رجحانات اور میلانات ہیں۔ بعض بزرگ یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ کہانیاں تو جوں کی توں ہیں مگر شہری، قصباتی اور دیہاتی زندگی میں تقسیم ہو گئی ہیں۔ ..... لیکن بات یہی نہیں ہے۔ مختصر افسانوں میں جدید رجحانات نے صرف جغرافیائی حدود کو ہی نہیں توڑا بلکہ داخلی طور سے بہت بڑے پیمانے پر تغیرات برپا کر دیئے ہیں۔ تاریخی حقائق کی روشنی میں اس کا تجزیہ زیادہ نتیجہ خیز ثابت ہوا ہے۔ کیونکہ جب یہ تغیرات رونما ہوئے تو صرف ایک نسل ہی نہیں بدل رہی تھی۔ بلکہ وہ مکمل بیداری کا عہد تھا۔ اس مکمل بیداری کی کروٹیں ہی مختصر افسانے میں جدید رجحانات یا میلانات سے موسوم کی جاتی ہیں۔ اسی ذیل میں نیا افسانہ، قدیم افسانہ، ہم عصر افسانہ یا مختصر افسانے کی بحثیں بھی اٹھتی ہیں۔ ان سب سابقوں اور لاحقوں کے کچھ نہ کچھ مضمرات بھی ہیں کیونکہ خود افسانے کا لفظ اپنی تعبیر میں، عام معیار اور اصطلاح میں استعمال کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

ایک مختصر وضاحت :۔

افسانے کے ساتھ قدیم اور قدامت کا تصوّر ان لوگوں کی جانب سے قائم کیا جاتا ہے جو نئے افسانے کے حمایتی ہیں ان کے پیش نظر افسانہ فرسودہ اور روایتی ہو گیا تھا۔ اس کے اجزا منتشر اور چولیں ڈھیلی ہو گئی تھیں اور افسانہ چھوٹے آدرشوں کا پلندہ بن گیا تھا۔ افسانہ کا کردار مثالی اور اکہرا ہو گیا تھا۔ ہم عصر افسانے کی اصطلاح بھی دلچسپ اور بصیرت افروز ہے۔ اس کے تحت افسانے کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ بنانے کی کوششیں جاری ہیں۔

ممتاز ہندی افسانہ نگار کملیشور نے اپنی کتاب "نئی کہانی کی بھومیکا" میں صفحہ ۸۴ پر صاف لفظوں میں اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ "مختصر افسانے کے زیادہ تر افسانہ نگار وہ ہیں جو نئی شاعری سے نئی کہانی کی طرف مڑے ہیں اور ادب کی وسعتوں میں یقین نہیں رکھتے۔ ان کے لئے کہانی اندھیرے میں ایک چیخ ہے اور وہ نظریاتی سطح پر نئے افسانوں کے مخالف بھی ہیں۔ مختصر افسانے کی کہانی زندگی نہیں بلکہ صرف اخلاقی، عقلی اور دماغی الٹ پھیر کے نتائج ہیں۔"

" بہر حال ایک عجیب بدحواسی میں اس طبقے کے افسانہ نگار ہیں۔"

افسانوں کی مختلف اصطلاحات یعنی قدیم افسانہ، مختصر افسانہ، ہم عصر افسانہ، نیا افسانہ، کہانیوں کو نہیں بدل رہی ہیں اور کہانیاں بدلی بھی نہیں جا سکتیں۔ وقت کی مانگ بدلی ہے اور وقت کی تبدیلیوں نے خود زندگی اور کہانی کے نئے

انداز و معیار قائم کیے ہیں۔ جنھیں تسلیم کرنا ہوگا۔ تمام مباحث سے قطع نظر مختصر افسانہ نگاری کو چار رجحانات سے گزرنا پڑ رہا ہے۔ رومانی یا رومانوی، حقیقت پسندی، نفسیاتی اور داخلی۔

رومانی یا رومانوی افسانہ نگاری کا رجحان بڑا عام رہا ہے لیکن زیادہ تر اردو افسانہ نگاروں نے لفظ رومان کو فیشن کے طور پر استعمال کیا ہے اور بہت سے چھوٹے بڑے افسانہ نگار اس طرح گڈمڈ ہو گئے کہ ان میں امتیاز کرنے میں دشواری پیش آتی رہی۔ اس لفظ کی وسعتوں کے پیش نظر یہ قول زیادہ کارآمد ہے:

"BEAUTY, STRANGENESS AND MYSTERY COMBINED TOGETHER PRODUCE THE SENSE OF ROMANCE."

زندگی کے فطری پن کو حسن اور اس کے انوکھے انداز کو اور اس کے رازہائے سربستہ کو رومانی افسانہ نگاروں نے مقامی اور ارضی ماحول سے علاحدہ کر کے تخیل کی حسین وادیوں میں گم کر دیا ہے۔ حسن و عشق محبت اور نفرت رزم و بزم ہجر و وصال کے جذبات رومانی یا رومانوی افسانوں کا مواد رہے ہیں۔ موپاساں اور زولا کا افسانوں پر بہت اثر رہا ہے۔ گورکی بالزاک اور چیخوف کی کہانیوں نے اسے خالص رومانی انداز سے نکال کر رومانوی فلسفۂ حیات سے ہم آغوش کر دیا۔ لیکن رومانی افکار کے مقابلے میں خالص رومانی مزاج پیش پیش رہا۔ اردو کے ان افسانہ نگاروں میں نیاز فتح پوری سجاد حیدر یلدرم، حجاب امتیاز علی کے نام سرِ فہرست آتے آتے ہیں۔ نیاز فتح پوری کے افسانے کیوپڈ اور سائکی صحرا کا گلاب اور زائرِ محبت اس کی واضح مثال ہیں۔ ان افسانوں کی روحیں رومان پرور فضا میں رچی بسی ہیں۔ سجاد حیدر یلدرم کے افسانوں میں حسن کی روشنی اور شعری دل آویزی ملتی ہے۔ "کلوپیٹرا" "قاہرہ کو دیکھ کر" "میرے بعد" ویران صنم خانے"، "جہاں پھول کھلتے ہیں"، "ایک مغنیہ سے التجا"، اسی انداز کے ترجمان ہیں۔ حجاب امتیاز کے افسانوں کی فضا بڑی مسحور کن ہوتی ہے۔ اس رجحان کے پیش نظر کئی اور مغربی افسانوں کے ترجمے بھی ہوئے ہیں۔ اس طرح کے مترجمین میں جلیل قدوائی، منصور احمد، حامد علی خان اور سجاد حیدر یلدرم کے نام نمایاں ہیں۔

⁂ —— ⁂ —— ⁂

حقیقت پسندانہ رجحان بڑا موثر ثابت ہوا۔ گو کہ حقیقت صداقت اور آدرش کی بحثیں بڑی جان لیوا ہیں۔ فی الحال اس کو چھیڑنا مقصود نہیں ہے، بہرکیف یہ رجحان نئی فکر، نئی دنیا اور نیا ماحول قائم کرنے میں بڑا معاون ثابت ہوا۔ ظلم و جبر اور استبداد کے خلاف اسی رجحان کے تحت پرزور صدائے احتجاج بلند کی گئی۔ اس کی باقاعدہ ابتدا انگارے سے ہوتی ہے۔ جس میں سجاد ظہیر، رشید جہاں، احمد علی اور محمود الظفر کے افسانے شامل ہیں۔ ان کی مجموعی تعداد دس ہے۔ اس میلان نے کرشن چندر تک کو متاثر کیا۔ چنانچہ وادیٔ کشمیر کی رنگین فضا، بادام کے پھولوں کی مہک اور زعفران زار مناظر کی دلکشی سے وہ بہت جلد صنعتی انقلاب اور مشینی زندگی تک آ گئے۔ صداقت پسندی کے رجحان کی تہہ میں فرانس اور روس کے انقلابات کی جھنکاریاں بھی پوشیدہ ہیں۔ سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام کی لعنتیں گھناؤنی حد تک پہنچ گئی تھیں۔ چنانچہ ان پر کاری ضرب لگانے کے سلسلے میں حقیقت پسندانہ رجحان نے ایک نمایاں رول ادا کیا۔

⁂ —— ⁂ —— ⁂

جنسی اور نفسیاتی رجحان کی کشمکش بھی مغرب کی دین ہے۔ اردو افسانہ نگاری کے اس رجحان پر فرائڈ، اڈلر اور یونگ کے اثرات ہیں۔ فرائڈ کے نزدیک انسانی زندگی کی سب سے طاقت ور خواہش جنس کی ہے SEX INSTINCT کو

وہ انسانی زندگی کی مرکزی فکر سمجھتا ہے۔ جسے تحلیل نفسی نے نئی سمتوں کی طرف مہمیز کیا۔ یہ رجحان غلط نہیں لیکن اس کی شدت نے کجروی ضرور اختیار کرلی۔ عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو اسی رجحان کے نمائندے اور نقیب ہیں۔ احسن فاروقی کے بعض افسانے بھی اس دائرہ میں شامل کئے جاسکتے ہیں۔ راجندر سنگھ بیدی اور محمد حسن عسکری کا افسانوی مزاج بھی اسی محور پر قائم ہے۔ ہمارے نفسیاتی افسانہ نگاروں نے جنسی مسائل سے اتنی زیادہ عقیدت مندی ظاہر کی ہے کہ جیسے فرائڈ کا نقطۂ نظر جنس ہی نہیں جنس زدگی بھی ہے۔ حالانکہ فرائڈ نے جذبات انسانی میں جنس کو بنیادی حیثیت دی ہے لیکن اس کی وکالت ہمارے افسانہ نگاروں نے اپنے طور پر بہت مزے لے لے کر کی ہے۔

تقسیم ہند کے بعد داخلیت کے رجحان نے اردو افسانوں میں بڑی شدت اختیار کرلی۔ جس میں تقسیم سے پیدا ہونے والے حالات بہت ہی روح فرسا اور دل سوز رہے ہیں۔ کتنے ہی اپنے پیاروں سے جدا ہو گئے۔ وطن کے لہلہاتے ہوئے کھیت اور سبزہ زار سوکھ گئے۔ آرزوؤں کی دنیائیں پامال ہو گئیں۔ معلوم نہیں کتنی تمناؤں نے پیرہن حسرت پہن لیا۔ بہت سی انسانی زندگیاں اس پار اور اس پار سسکیاں لیتی رہیں لیکن انھیں انصاف نہ مل سکا اور نہ استحصال کا خاتمہ ہوسکا۔ ایسے عالم میں افسانہ نگاری نے ہئیت اور مواد دونوں میں تبدیلی قبول کی۔ اس رجحان کے افسانہ نگاروں میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، مہندر ناتھ، حیات اللہ انصاری، انتظار حسین، قرۃ العین حیدر اور رام لال کا نام سرفہرست ہے۔ قرۃ العین حیدر کا جلا وطن، ڈالن والا، ہاؤسنگ سوسائٹی وغیرہ اسی داخلیت کی دین ہیں۔ جس میں ایک شدید روحانی کرب اور بے چینی ملتی ہے۔

داخلیت کے رجحان نے علاقائی تہذیبوں کے احیا پر بھی زور دیا ہے۔

———

نئی افسانہ نگاری دراصل داخلیت کی توسیع ہے جو کسی مخصوص رجحانِ فکر اور میلانِ طبع کی رہینِ منت نہیں۔ اس رجحان میں قصبے، شہر، اور دیہات کا فرق ختم ہوگیا ہے۔ یہ تبدیلی اصول و نظریات اور زندگی کی نت نئی بدلتی قدروں کی ہے۔ اس ذیل میں باقر مہدی نے ممتاز ہندی افسانہ نگار نرمل ورما کے حوالے سے بڑی واضح بات کہی ہے۔ جسے سطور، دسمبر، جنوری، فروری ۷۸ء کے اداریے میں دہرایا گیا ہے کہ "جب ہم نئے افسانے کی بات کریں تو ہمیں مختصر افسانے کی موت سے اپنی بحث کا آغاز کرنا چاہئیے۔" یہ نقطۂ نظر جتنا بحث طلب ہے اتنا ہی تلخ بھی۔ اول یہ کہ مختصر افسانہ کن سمتوں کی طرف متوجہ کرتا ہے اور اس کی وسعتیں کیا ہیں اور نیا افسانہ کس حد تک مختلف اور نیا ہوسکتا ہے لیکن ایک بات سر دست عرض کر دینا ضروری ہے کہ معلوم نہیں کیا بات ہے کہ مختصر افسانہ نگاری میں تخلیقی صلاحیتیں اور فطری ذوق و وجدان بہت کم بروئے کار آسکا ہے۔ اس کے برعکس تقلیدی افکار بہت شد و مد کے ساتھ نمایاں ہوئے ہیں۔ یہاں موردِ الزام بے چارہ مختصر افسانہ نہیں بلکہ خود تقلیدی اذہان ہیں جنھوں نے اس اہم صنفِ ادب کو تقلیدی بنا دیا۔ یہ حقیقت ہے کہ جب ذہن کے سوتے خشک ہو جاتے ہیں تو سوائے بیتر بازی اور جوڑ توڑ کے کوئی سرمایہ باقی نہیں رہ جاتا۔

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ ربع صدی میں حیات انسانی نے پھر ایک بار بڑی تیزی سے کروٹ بدلی ہے۔ جس نے تمام تر طبقاتی کشمکش اور درجہ بندیوں کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا ہے۔ اردو افسانے نے بھی ان اثرات کو کھلے ذہن سے قبول کیا۔ جس میں داستان حسن و عشق کی روح بھی تبدیل ہوگئی ہے۔ اب افسانہ نگار زبان و

لفظیات کے اسرافِ بے جا سے بھی پرہیز کرتا ہے۔ نئے افسانے کا بیان اور لب و لہجہ آج کے انسان اور آج کی زندگی کی صحیح اور سچی عکاسی کرتا ہے۔ اس طرح کے افسانہ نگاروں میں قرۃ العین حیدر، جوگیندر پال، غیاث احمد گدی، اقبال متین، رتن سنگھ، اقبال مجید، سُرون کمار، رام لعل اور اور افسر آذر وغیرہ کے نام آتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر کے افسانے کارمن اور سیت جھڑ کی آواز میں ایڈ دیخبر کی بے پناہ خواہشات انگڑائیاں لیتی ہیں سینٹ فلورہ آف جارجیہ کے اعترافات میں امریکن سائنس دان جدید لسانیاتی اشارے مختلف علوم جدیدہ اور کلیسا کا تقدس نظر آتا ہے اور کچھ دیر بعد یہ کیفیت بھی سامنے آجاتی ہے۔

"اس پر فادر گریگری بڑبڑا کر بولا۔۔۔ "ارے" اب کیا ہوگا؟۔۔۔ اب ۔۔۔ یہ ہوگا"۔ ایک پولیس آفیسر نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ ہم دونوں دہشت زدہ ہو کر صوفے سے کھڑے ہو گئے۔ ہمارے گرد ناچنے والوں کا مجمع لگ گیا۔ پولیس افسر کے ساتھ دو سپاہی موجود تھے۔ اس نے فادر کو درشت آواز میں مخاطب کیا۔" فلاں ڈپارٹمنٹ اسٹور سے یہ گاؤن جو تمہاری گرل فرینڈ نے پہن رکھا ہے۔ تم چرا کر بھاگے تھے۔ پولیس اس رات سے تمہاری تلاش میں مصروف ہے۔ یہ گاؤن جیکلین اوناسس کی فرمائش پر خاص طور سے تیار کیا گیا تھا۔ مختلف لائبریریوں سے ہمیں اطلاع ملی ہے کہ ایک شخص راہب کے بھیس میں نادر کتابیں چراتا پھر رہا ہے لیکن یہ بیش قیمت گاؤن ۔۔۔ تم دونوں کو ہمارے ساتھ پولیس اسٹیشن چلنا ہوگا۔"

مندرجہ بالا مثال اس بات کی دلیل ہے کہ آج کے افسانوں میں تخلیقی فکر اور تخلیقی ذہن کس قدر ممتاز اور نمایاں ہے۔ جو بیک وقت مختلف حالات کو اپنی گرفت میں لینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

آج کے افسانوں میں اختصار اور ایجاز کی ایک مثال اور ملاحظہ کیجئے۔ اس کے لیے منشی جی اور ان کے مقلدین کم از کم ایک پیراگراف پر قبضہ کر لیتے ہیں۔ یہ غیاث احمد گدی کے افسانے "پرندہ پکڑنے والی گاڑی" سے ماخوذ ہے۔

"صبح ہوتی، دن چڑھتا اور جب ٹھیک نصف النہار پر پہونچتا، شہر میں ایک ایسی گاڑی آتی جو شہر کے پرندوں کو پکڑ کر لے جاتی۔ ٹھیک ویسے ہی جیسے میونسپلٹی کی گاڑی کتے پکڑنے کے لیے نکلتی ہے۔"

علامتوں نے آج کے افسانوں کو اور بھی تہہ دار بنا دیا ہے جس کی تفہیم میں مغز سر کا آماس قبول کرنا ہوگا۔ یہ افسانہ نگاری محض دل اور طبیعت سے نہیں بلکہ دماغ اور ذہن سے بھی مطابقت رکھتی ہے۔ اقبال متین کے افسانے موم کے اور شرمیلا بڑی خوبصورتی سے حقائق پر سے پردہ اٹھاتے ہیں اور تخلیقی فن کو پیش کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ ایسے بھی افسانہ نگار ہیں۔ جنھیں نئے پن کے شوق نے مجبور کر دیا ہے۔ انھیں ذوق و وجدان سے واسطہ نہیں۔ لیکن بہر حال اردو افسانے کا مستقبل تابناک نظر آتا ہے۔ لیکن ہر لمحہ یہ خدشہ بھی لگا رہتا ہے کہ ذوق کا فقدان کہیں اس رجحان کو سر بازار رسوا نہ کر دے میں اس سلسلے میں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی سے متفق ہوں۔ وہ کہتے ہیں:۔

"میری ملاقات ایک مغربی مصنف سے ہوئی جسے برصغیر کے کسی مشاعرے میں شرکت کا موقع ملا تھا۔ مشاعرہ شاید اس قسم کا تھا کہ نماز مغربین کے بعد شروع ہوا ہوگا اور اختتام پر جب پہنچ رہا ہوگا تو موذن نماز صبح کی اذان دے رہا تھا۔ وہ مجھ سے پوچھنے لگا آپ شاعر بھی ہیں میں نے جب اپنی محرومی کا ذکر کیا تو بڑے تعجب سے بولا آپ پہلے پڑھے لکھے اردو بولنے والے مجھے ملے ہیں جو شاعر نہیں۔ معلوم نہیں شاعروں کی یہ کثرت اب ہے یا نہیں لیکن افسانہ نگاروں کی ایک فوج نے ضرور اس فن پر یلغار کی ہے۔ دیکھئے انجام کیا ہو؟"

★

ڈاکٹر ولی الحق انصاری
شعبۂ فارسی، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

غزل

دنیائے عاشقی میں جو دستور تھا، سو ہے
ہر دل میں زخم آنکھ میں ناسور تھا، سو ہے

مٹتا نہیں شرابِ طرب سے خمارِ غم
میخانۂ جہاں میں جو مخمور تھا، سو ہے

ہر عہدِ زیست کے ہیں مسائل جدا جدا
دل منزلِ سکوں سے بہت دور تھا، سو ہے

پروازِ عقل لاکھ بشر کی بڑھے، مگر
اک حدِّ اختیار میں مجبور تھا، سو ہے

دل اب بھی سرد مہریِ خوباں سے ہے تپاں
ہر زخمِ دل پہ مرہم کافور تھا، سو ہے

ظلمت پرست ہوتے نہیں نور آشنا
خفّاش عاشقِ شبِ دیجور تھا، سو ہے

بزمِ طرب میں بھی نہ ملا میرے دل کو چین
یہ خانماں خراب جو رنجور تھا، سو ہے

رفتارِ زندگی نے بگاڑے تو خال و خد
مکھڑے پہ اس کے آج بھی جو نور تھا، سو ہے

پردے نگاہِ عقل کے ثابت ہوئے حجاب
وہ شوخ چشمِ فہم سے مستور تھا، سو ہے

شیشہ نہیں ہے دل کہ جڑے پھر سے ٹوٹ کر
یہ رشکِ آفتاب ولے چور تھا، سو ہے

---

[1] در زمینِ رفیع سودا بہ ادنیٰ تغیر

غزلیں

سید نجم الدین نقوی
۱۷۔ اے قلعہ، رام پور
یو پی

اپنے دیوانے ہزاروں اس کے دیوانے کہاں
قیس شہروں کے بہت، صحرا کے فرزانے کہاں

شمع کیسے جل سکے گی بے حسی کی بزم میں
اور جلی تو لو بھڑک جائے گی پروانے کہاں

زینتِ محفل ہی خود جب غارتِ محفل ہو دوست
پھر نشاطِ غم کہاں اشکوں کے نذرانے کہاں

محفلوں میں کیف و مستی کا نہ کیوں فقدان ہو
دل کے پیمانے کہاں۔ آنکھوں کے میخانے کہاں

نعمتِ توفیقِ غم ہیں چشمِ تر اور خشک لب
بے بصیرت کو میں اشکوں کے نذرانے کہاں

داد خواہی مشغلہ ہے روز و شب کا کیا کریں
آپ بھی سن لیں۔ سنیں گے پھر یہ افسانے کہاں

دل لیے بیٹھے ہو پھر بھی پوچھتے ہو کون ہو
ہم سے انجانے کہاں اور تم سے بیگانے کہاں

اک نظر میری طرف بھی چشمِ ویراں سازِ غم
دہر میں ہوں گے بہت پر مجھ سے دیوانے کہاں

نقوی پیمانہ کش ہے اور زلفوں کی گھٹا
حضرتِ ناصح چلے ہو کس کو سمجھانے کہاں

حق بنارسی
۱۳۲/۴۰۳ ـ بابو پروہ
کان پور۔ یو پی

یادِ غربت جو سرِ راہِ وطن آئی ہے
دل شکن، ضبط شکن، عزم شکن آئی ہے

عرضِ غم پر ترے اس حسنِ توجہ کے نثار
کس کس انداز سے ماتھے پہ شکن آئی ہے

وحشتِ تازہ کہیں موت کا پیغام نہ ہو
تارِ دامن سے یہ کیوں بوئے کفن آئی ہے

اب تو آنکھوں میں پئے نذر اک آنسو بھی نہیں
ہائے کس وقت مجھے یادِ وطن آئی ہے

آج پھر ان کو فراموش کیا ہے میں نے
آج پھر گردشِ دوراں تری بن آئی ہے

رہ گیا ہم سفر و ہمتِ عالی کا بھرم
شکر کی جا ہے کہ منزل پہ تھکن آئی ہے

میری قسمت میں کہاں تھے یہ سحر کے جلوے
راستہ بھول کے سورج کی کرن آئی ہے

کیوں گہر ہائے عقیدت نہ لٹاؤں اے حق
یادِ فردوس نہیں یادِ وطن آئی ہے

عرفان صدیقی
پی۔آئی۔بی، لال باغ لکھنؤ

ہندستان میں جمہوریت، جمہوری روایات اور ادارے

آزاد ہندستان کی تاریخ میں ۲۶ جنوری کا دن بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ۳۰ سال قبل یعنی ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو ہندستان میں باقاعدہ طور پر پارلیمانی جمہوریت قائم کی گئی جس کی بنیاد بالغ حق رائے دہی پر رکھی گئی۔ اس کے تحت ملک میں پہلا الکشن ۱۹۵۲ء میں ہوا۔ اس میں اور اس کے بعد ہونے والے انتخابات میں عوام اپنے حق رائے دہی کا آزادانہ استعمال کر کے اپنے نمائندے منتخب کرتے رہے ہیں۔ اس طرح پارلیمانی جمہوریت کی جڑیں ہندستان کی دھرتی میں گہری اور مستحکم ہو چکی ہیں اور پارلیمانی جمہوریت ہندستانی عوام کے مزاج کا ایک جزو لاینفک بن گئی ہے۔ جمہوریت ہندستانی معاشرت اور یہاں کے لوگوں کی زندگی میں رچ بس گئی ہے۔ لیکن جمہوریت اور جمہوری مزاج ہندستان کے لیے کوئی نئی چیز نہیں ہے اور محض دور جدید سے ہی وابستہ نہیں ہے۔ اگر ہم گہری نظر سے جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ ہندستان اپنی سماجی روح کے اعتبار سے زمانۂ قدیم ہی سے جمہوریت پسند رہا ہے۔ شخصی آزادی اور اقتدار و طاقت کی لامرکزیت جو جمہوری نظام کے دو اہم بنیادی ستون ہیں، قدیم ہندستان کی سماجی اور سیاسی زندگی کی تصویر میں دو نمایاں رنگوں کے طور پر نظر آتے ہیں۔ دوسروں کے نقطۂ نظر اور زاویۂ فکر کو سمجھنے کی مخلصانہ کوشش اور انھیں برداشت کرنے کی صلاحیت ہندستان کے تہذیبی مزاج کی ایک ایسی اہم خصوصیت رہی ہے جو ہندستان کے لیے بتدریج جمہوری نظام کو اس کی واضح ترین اور معروف ترین شکل میں قبول کرنے میں معاون ثابت ہوئی ہے۔ اس تہذیبی روایت کا تسلسل ہندستان کی طویل تاریخ کے تقریباً ہر دور میں کسی نہ کسی انداز میں برقرار رہا ہے، کبھی واضح روشن اور تیز اور کبھی ہلکا نرم اور دھندلا۔ تاریخ کے مختلف مرحلوں میں ہمارا یہ تہذیبی آئینہ غبار آلود بھی ہوتا رہا ہے۔ مثلاً ورن دیوستھا یا ذاتوں کا نظام جس کی ابتدا سماجی ذمہ داریوں اور خدمات کی عملی تقسیم کے مقصد سے ہوئی تھی، مختلف سماجی اور تاریخی عوامل کی بنا پر رفتہ رفتہ استحصالی طاقتوں کے ہاتھ میں آکر ایک خطرناک ہتھیار بن گیا۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اس غبار آلودگی کے باوجود ہندستانی تہذیب کی جمہوری روح کا یہ آئینہ، عکس ریزی کی صلاحیت کے لحاظ سے بدستور تاب دار رہا۔ ورنوں کی تقسیم کے باوصف یہ بھی ممکن رہا ہے کہ کوئی چھتری فلسفہ و عقلیات کے شعبہ میں امتیاز حاصل کر کے برہمن کا درجہ حاصل کر لے۔ ویدوں کے ادب میں وشوامتر کا قصہ بہت مشہور ہے جو پیدائش کے اعتبار سے تو چھتری تھے لیکن جنھوں نے برہمنی علوم حاصل کر کے خود کو برہمن ورن میں شامل کر لیا تھا۔ اسی طرح کی ایک کہانی ودیہہ کے راجہ جنک کے بارے میں بھی ملتی ہے۔ اسی طرح برہمن بھی جرأت و دلاوری کا مظاہرہ کر کے چھتریوں کی صف میں شامل ہو سکتے تھے۔

قدیم ہندستان کے جمہوری مزاج کی ایک خاص پہچان اس کا پنچایتی نظام رہا ہے۔ اس نظام کی بنیادی خوبی سماجی امور سے متعلق فیصلوں میں "شورائیت" کا طریقہ اپنانا تھا۔ عموماً ان پنچایتی فیصلوں میں سماج کے تمام طبقوں کی رائے کا عکس نظر آتا تھا۔ ہندستان کے قدیم پنچایتی نظام کا متفقہ فیصلوں اور باہمی مشورے کا یہ پہلو مطلق العنانیت کے اس بنیادی طریقہ سے قطعاً مختلف ہے جس میں فیصلے کا حق اور نفاذ کا اختیار صرف

ایک فرد یا ایک مخصوص گروہ تک محدود رہتا ہے۔ اس ضمن میں ایک قابلِ ذکر تاریخی حقیقت یہ ہے کہ بعض اوقات ان پنچایتوں میں ورن نظام کے سب سے نچلے درجے سے متعلق افراد بھی تمام فیصلوں میں برابر کے شریک رہے ہیں۔ جی۔ ایس۔ گھوریئے "ہندستان میں ذات اور طبقہ" میں لکھتے ہیں:

"مراٹھا ریاست کی دیہی کونسلوں (پنچایتوں) کے جو فیصلے ہم تک پہنچے ہیں ان پر گاؤں کے تقریبًا تمام خدام کے دستخط ملتے ہیں جن میں مہار اور منگ جیسی اچھوت ذاتوں کے افراد بھی شامل ہیں۔ ۱۸ویں صدی کے وسط میں لکھی ہوئی آنند رنگم پلّے کی ایک نجی ڈائری میں شامل ایک اندراج میں ایک ایسی دیہی میٹنگ کا ذکر کیا گیا ہے جس میں ایک مندر کی بے حرمتی کے واقعے پر غور کیا گیا تھا اور جس میٹنگ میں برہمن سے لے کر پڑیہ تک تمام ذاتوں کے افراد شریک ہوئے تھے۔ ڈاکٹر متھائی نے ایک گاؤں پنچایت کا ذکر کیا ہے جس میں برہمن اور شودر دونوں نے حصّہ لیا تھا... وراثتی حقوق کے بارے میں برہمن چچازاد بھائیوں کا ایک جھگڑا تصفیے کے لیے پورے گاؤں کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ جس جلسہ میں جھگڑے کا فیصلہ کیا جانا تھا اس میں مراٹھا، ڈھانگر، گراو، سُنار، لوہار، کمھار، کولی، نھاوی، چمار، مہار اور منگ (تمام ذاتوں کے لوگ) شامل تھے۔"

سیاسی نظام کے ارتقا کے مختلف ادوار میں جمہوری قدریں اور ادارے ہندستان کے لیے نامانوس اور اجنبی نہیں رہے ہیں۔ آریائی تہذیب کے آغاز سے 'کنبہ' یا 'کل' سماجی اور سیاسی دونوں نظاموں کی بنیاد تھا۔ 'کل' کے بعد بتدریج گاؤں (گرام)، برادری (وِس)، قبیلہ (جَن)، اور ملک (راشٹر) آتے تھے۔ ہر چند کہ اس پدری سماج میں بادشاہت، عام طرزِ حکومت کی حیثیت رکھتی تھی تاہم غیر شہنشاہی اداروں کے حوالے بھی ملتے ہیں۔ بعض آریائی قبائل نے ایک قسم کا اشرافی نظامِ حکومت بھی اختیار کر رکھا تھا۔ ویدوں کے ابتدائی عہد میں انتخابی بادشاہت کا تصور بھی غالباً موجود تھا اگرچہ رگ وید میں اس کا کوئی واضح حوالہ نہیں ملتا۔ اس دور کی بادشاہت کے ضمن میں بھی ایک قابل لحاظ بات یہ ہے کہ بادشاہ یا راجہ کے ذریعے اقتدار اور طاقت کے من ملنے استعمال پر روک لگانے کے مقصد سے دو عوامی اسمبلیاں یعنی 'سبھا' اور 'سمِتی' ہوتی تھیں جو اہم امور کے سلسلے میں عوام کی خواہش اور رائے کا اظہار کرتی تھیں۔

جمہوری زندگی کا ایک خاص پہلو عورت اور مرد دونوں کو مساوی درجہ دینا بھی ہے اس نقطۂ نظر سے جب ہم قدیم ہندستانی سماج پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ویدوں کے زمانے میں عورتوں کو علم کے مختلف شعبوں تک رسائی حاصل تھی۔ ویدوں سے متعلق تاریخی ادب میں گھوشا، اپالا، اور وشو وارا جیسی عورتوں کا ذکر ملتا ہے جنھوں نے اعلا درجہ کے دیپی نغمات مرتب کیے تھے۔ اپنشدوں کے عہد میں گارگی جیسی فلسفی عورت پیدا ہوئی جس نے یاگیہ والکیہ جیسے عظیم فلسفی اور عالم سے مباحثہ کیا۔ اعلا ذاتوں سے تعلق رکھنے والی عورتیں اپنے شوہروں کے ساتھ 'یگیہ' میں لازمی طور پر شریک ہوتی تھیں۔ اس دور میں عورتوں کو جائداد کی ملکیت اور بیوہ عورتوں کو دوبارہ شادی کرنے کا حق حاصل تھا۔ بدھ کے زمانے میں بھی عورتوں کو علم حاصل کرنے کے حق سے محروم نہیں رکھا گیا۔ اس دور کی عورتیں بھی گاؤں کی سماجی زندگی میں سرگرمی سے حصّہ لیتی تھیں۔

ویدوں کے ابتدائی دور کے سیاسی نظام کی سب سے اہم اور نمایاں خصوصیت اس کی عوامی مجلسیں تھیں۔ ان میں سے دو عوامی مجلسیں یعنی 'سبھا' اور 'سمتی' خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ان مجلسوں کے بارے میں حاصل ہونے والی معلومات کی بنا پر جو خاص خاص نتائج ان کی تشکیل اور ان کے کارناموں کے بارے میں اخذ کیے جا سکتے ہیں وہ اس طرح ہیں: سمتی ایک اعلیٰ قبائلی مجلس تھی جسے بعض اوقات بادشاہ منتخب کرنے کا کام تفویض کیا جاتا تھا۔ دوسری طرف سبھا نسبتاً محدود اختیارات والا ایک ادارہ تھا جس کو بیشتر عدالتی فرائض انجام دینا ہوتے تھے۔ سبھا اور سمتی دونوں مجلسوں کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ ان کے اراکین کو مباحثے کے حقوق حاصل تھے۔ بعد کے زمانے میں ایک عوامی مجلس کی حیثیت سے سمتی کا تو وجود تقریبًا ختم ہی ہو گیا۔ البتہ سبھا ایک محدود ادارے کی حیثیت سے باقی رہی۔ جس کا انداز بادشاہ کی درباری عدالت کا سا ہو گیا تھا۔

قدیم ہندستان کی تاریخ میں 'گن راجیہ' اور 'سنگھ' جیسی جمہوری ریاستوں کا ذکر بھی ملتا ہے۔ اس طرح کی جمہوری ریاستوں میں 'درشنی کنتھ'، 'ویسال' اور 'ساکیہ' خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ 'جن پد' یعنی ضلعی یا شہری ریاستوں کا بھی حوالہ تاریخی بیانات میں ملتا ہے۔ جن کی حیثیت بڑی حد تک جمہوری ریاستوں کی سی ہوتی تھی۔ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ چولوں کے زمانے میں ایک ترقی یافتہ بلدیاتی نظام موجود تھا۔ جس کی ایک اہم خصوصیت 'دریام' نامی کمیٹیاں تھیں۔ ان کمیٹیوں کا کام زراعت، آب پاشی، مندروں کے نظم و نسق، مالیات وغیرہ امور کی نگرانی تھا۔ ان دریاموں میں بستی کے منتخب نمایندے شامل ہوتے تھے۔ گاؤں کی سبھائیں بھی جامد ادارے نہیں تھیں۔ بلکہ وہ وقتاً فوقتاً حالات کے پیشِ نظر اپنے دستور العمل میں ضروری ترمیم کرتی رہتی تھیں۔

مہاتما بدھ کے دور سے متعلق ایک تاریخی واقعہ سے بھی اس دور کی جمہوری اقدار پر روشنی پڑتی ہے۔ جب مگدھ کے راجہ نے 'لچھوی' اور 'ودیہہ' راجوں پر حملہ کرنے کے اپنے ارادے کے بارے میں مہاتما بدھ سے مشورہ طلب کیا تو مہاتما بدھ نے اپنے چیلے آنند سے کہا: "آنند کیا تم نے سنا ہے کہ وجّی لوگ ('لچھوی' اور 'ودیہہ' کے لوگ) اکثر بھری پُری مجلسیں منعقد کرتے رہتے ہیں؟" پھر انھوں نے کہا کہ "جب تک وجّی لوگ باہم مل کر بیٹھتے رہیں گے، باہمی اتفاق سے فیصلے کرتے رہیں گے اور تمام کام اتفاق رائے سے کرتے رہیں گے، وہ ترقی کرتے رہیں گے۔"

ماضی کی جمہوری ریاستوں سے متعلق ایک اور حوالہ ایک یونانی تذکرے میں ملتا ہے۔ جس میں دریائے بیاس کے کنارے قائم ایک ہندستانی جمہوری ریاست کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس میں پانچ ہزار نمایندوں پر مشتمل ایک پارلیمنٹ بھی قائم تھی۔ ایسی تاریخی شہادتیں بھی ملتی ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ لچھوی راج کے لوگ اپنے فوجی سپہ سالار کا تقرر بھی انتخاب کے ذریعہ کیا کرتے تھے۔

قدیم بادشاہوں کے اختیارات کی کچھ حدود ہوا کرتی تھیں۔ کوٹلیہ کے ارتھ شاستر کے مطابق جب کبھی امورِ حکومت سے متعلق کوئی غیر معمولی مسئلہ یا معاملہ پیش آئے تو راجہ کو فوراً اپنے تمام وزرا اور مشیروں کو بلا کر انھیں صورتِ حال سے پوری طرح آگاہ کرنا چاہیے۔ ضروری غور و خوض اور تبادلۂ خیال کے بعد راجہ کو اکثریتی فیصلہ تسلیم کر لینا چاہیے۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے اکثر اوقات راجاؤں کے انتخاب کا چلن بھی تاریخ میں ملتا ہے۔ ویدوں کے زمانے میں جب راجہ کا انتخاب کیا جاتا تھا تو اس سے مخاطب ہو کر کہا جاتا تھا کہ عوام نے آپ کو بادشاہت کے لیے منتخب کیا ہے اور آپ اس منصب پر فائز ہو کر قدرت نے جو دولتیں عطا کی ہیں انھیں سب میں تقسیم کیجیے۔ اس کے جواب میں بادشاہ یا راجہ بھی یہ عہد کرتا تھا کہ وہ کبھی من مانی نہیں کرے گا۔ کوٹلیہ نے ہی ایک موقع پر کہا ہے کہ غضب ناک عوام کے غیظ و غضب سے زیادہ خطرناک غصہ اور کسی کا نہیں ہوتا۔ ان تمام حوالوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ زمانۂ قدیم ہی سے ہندستان میں عوام کی رائے اور عوامی خواہشات کی اہمیت تسلیم کی جاتی رہی ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ جمہوریت اور جمہوری اندازِ فکر سے ہندستان کی وابستگی کسی نہ کسی شکل میں زمانۂ قدیم ہی سے رہی ہے۔ اس ناطے بھی ہم پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ ہم جمہوریت، جمہوری اقدار اور اصولوں کی حفاظت کے لیے پوری طرح بیدار اور چوکس رہیں۔ اور جمہوریت پر کبھی کسی قسم کی کوئی آنچ نہ آنے دیں۔ آج کے دور میں شہنشاہیت، آمریت اور مطلق العنانیت کے لیے کوئی گنجائش نہ ہونا چاہیے۔ جمہوری نظام کو زیادہ سے زیادہ مستحکم بنانے اور اس کی کامیابی کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم جمہوری اصولوں پر پوری طرح کاربند رہیں اور ہر شعبۂ حیات نیز ہر سطح پر جمہوری طور طریقے اور رویے اختیار کریں۔

ہندستانی جمہوریت دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہے۔ جو دیگر اقوام و ممالک کے لیے ایک قابلِ تقلید مثال بھی رہی ہے اور غیر جمہوری ملکوں میں جمہوریت پسند لوگوں کو اس سے تحریک و تقویت بھی حاصل ہوتی رہی ہے۔ اس لیے اگر ہمارے ملک میں جمہوریت کمزور ہوتی ہے تو اس کا اثر یہیں تک محدود نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ یہ انتہائی ضروری ہے کہ ہم اپنی جمہوریت کو کسی بھی سطح پر کمزور نہ ہونے دیں۔ بلکہ اسے زیادہ سے زیادہ مضبوط اور طاقت ور بنانے پر اپنی توجہ مرکوز رکھیں۔

★

نصرت قریشی
۷۷۴ - ہٹیا بہادر گنج - الہ آباد ۳

اُتر پردیش

خوشحالی کا پرچم ہر سو لہرائے اتر پردیش
نئی منزلوں کی جانب بڑھتا جائے اتر پردیش

صبح بنارس، شامِ اودھ، تیرتھ کا مرکز گنگ و جمن
ہریدوار، کلیر کا روضہ، گوکل، متھرا، برندا بن
بہرائچ کے غازی، دیوی کے دوارے، مخدومِ زمن[1]
ہر دل ہے اک پیار کا مندر، یکجہتی اس کا درپن
قومی یکجہتی کا منظر دکھلائے اتر پردیش
نئی منزلوں کی جانب بڑھتا جائے اتر پردیش

جلسے، میلے، عرس، بھجن، میلاد سے ہر گوشہ روشن
نہرو، لال بہادر جیسے فرزانوں کا یہ مسکن
کاکوری کے امر شہیدوں سے سرسبز ہے یہ گلشن
آزادی کی جنگ میں لاکھوں نکلے سر سے باندھے کفن
تہذیبوں کا سنگم بن کر مسکائے اتر پردیش
نئی منزلوں کی جانب بڑھتا جائے اتر پردیش

تلسی داس، کبیر داس اور سور داس کی دھرتی
صوفی، سنتوں کے اپدیشوں سے روشن مینار بنی
پنت، فراق، نرالا کے نغمات سے یہ بھرپور ہوئی
پریم چند کے افسانوں سے ابھرے کتنے ہی ہوری[2]
علم و ادب کی کرنیں ہر سو پھیلائے اتر پردیش
نئی منزلوں کی جانب بڑھتا جائے اتر پردیش

علم کے ماہر، نقادِ فن، شاعرِ اعظم، دانش ور
موسیقاروں، فنکاروں کے فکر و فن کا یہ مظہر
بھاشاؤں کا سنگم، ادبی مرکز، الفت کا پیکر
مندر، مسجد، گردوارے اور گرجے سب بھگوان کا گھر
ہر مذہب کی عزت کرنا سکھلائے اتر پردیش
نئی منزلوں کی جانب بڑھتا جائے اتر پردیش

الہ آباد، لکھنؤ، کانپور صنعت و حرفت میں آگے
کاشی اور علی گڑھ علم و فن کی رفعت میں آگے
مئو ناتھ بھنجن اور گورکھپور ہر حالت میں آگے
اس کے گاؤں اور شہر ہیں اب تو جاہ و حشمت میں آگے
پیار کی خوشبو سے گھر آنگن مہکائے اتر پردیش
نئی منزلوں کی جانب بڑھتا جائے اتر پردیش

ملک کے ہر گوشے میں نمایاں جہد و عمل سے اس کا نام
ہر جانب رفتارِ ترقی کی تیزی کے چرچے عام
کھیتوں میں فصلوں کے منظر دیتے ہیں سب کو پیغام
ملک کو آگے لے جانا ہے، سب پر ہے آرام حرام
روز و شب کی محنت کا ہی پھل کھائے اتر پردیش
نئی منزلوں کی جانب بڑھتا جائے اتر پردیش

اپنے تعمیری کاموں کو سپھل بنائے بڑھتا ہے
ملک کی عظمت و رفعت کے پرچم کو اٹھائے بڑھتا ہے
منصوبہ بندی سے پیدائش کو گھٹائے بڑھتا ہے
بنجر دھرتی پہ محنت سے فصل اگائے بڑھتا ہے
راحت کے پیغام کو گھر گھر پہنچائے اتر پردیش
نئی منزلوں کی جانب بڑھتا جائے اتر پردیش

بیتے برسوں، حال کو بہتر اور بنانا ہے لوگو!
منزل پانے کی خاطر بڑھتے ہی جانا ہے لوگو!
وقت نے اک میدانِ عمل، کچھ کر کے دکھانا ہے لوگو!
حال سے مستقبل وابستہ، سب کو جگانا ہے لوگو!
مشعلِ عزم و عمل سے راہیں چمکائے اتر پردیش
نئی منزلوں کی جانب بڑھتا جائے اتر پردیش

---

[1] حضرت مخدوم جہانیاں کچھوچھا شریف [2] پریم چند کے ناول گئودان کا کسان کردار۔

بسنتے کمار بسنتے
۳۹۔ ٹیڑھی بازار
رکاب گنج۔ لکھنؤ۔

اے وطن

یہ فضا مست یہ نکہتِ دلنشیں
بیخودی کا نہیں ایسا عالم کہیں
ماہرو ہر طرف ہر طرف مہ جبیں
یہ ہے شہرِ نگاراں کہ اپنا چمن
اے وطن اے وطن اے وطن اے وطن

ہر طرف کوکتی کوئیلوں کی صدا
ہر طرف بلبلوں کی ہے شیریں نوا
ہر طرف ایک ماحولِ نور و ضیا
چومتی رخ بشر کا سحر کی کرن
اے وطن اے وطن اے وطن اے وطن

رشکِ خلد بریں باغ کشمیر ہے
تو مرے خواب دلکش کی تعبیر ہے
آب میں تیرے امرت کی تاثیر ہے
کس قدر جانفزا ہے ترا بانکپن
اے وطن اے وطن اے وطن اے وطن

شب تری کیف زا صبح تیری حسیں
اور کوئی ملک دنیا میں تجھسا نہیں
چھوڑ کر کیوں تجھے کوئی جائے کہیں
تجھ پہ قرباں مرا دل میرا تن بدن
اے وطن اے وطن اے وطن اے وطن

جامع مسجد بھی ہے روضۂ تاج بھی
گنگا جمنا، گوداوری سرسوتی
ہے ہمالہ پہ چادر بھی برف کی
یہ اجنتا ایلورا کے نقشِ کہن
اے وطن اے وطن اے وطن اے وطن

یونس مخمور
۲۹۔ پاتھرا ماحی گیٹ۔
بھوپال (ایم پی)
۴۶۲۰۰۱

میرے ہندوستاں

کرشن کی سرزمیں رام کے گلستاں
مرکزِ آرزو مثلِ جنت نشاں
کیوں نہ ہو میرے لب پر تری داستاں
میرے پیارے وطن میرے ہندوستاں

تو مساوات و الفت کی ہے انجمن
تیرے سر پر ہمالہ ہے سایہ فگن
اے فرید اور نانک کے پیارے وطن
تیری دھرتی ہے تقدیس کی ترجماں
میرے پیارے وطن میرے ہندوستاں

ہیں بنارس کی صبحیں تو شب مالوہ
حسن شامِ اودھ رنگ کا سلسلہ
تیرا کشمیر فردوس کا آئینہ
تیرے پہلو میں گنگ و جمن ہیں رواں
میرے پیارے وطن میرے ہندوستاں

تاج ہے سنگ مرمر کا تیرے لیے
تو قبائے اجنتا ہے پہنے ہوئے
تیرا زیور ہیں تیرتھ کے یہ سلسلے
تیرے مکھ پر تمدن کی رنگینیاں
میرے پیارے وطن میرے ہندوستاں

دانش و علم و حکمت کا ہمراز ہے
امن اور ایکتا ہے مدھر ساز ہے
تجھ کو معلوم جینے کا انداز ہے
تو ہے انساں کی عظمتوں کا نشاں
میرے پیارے وطن میرے ہندوستاں

صلاح الدین عثمان
راج بھون کالونی لکھنؤ

گزشتہ لکھنؤ کی چند جھلکیاں

آج سے تقریباً ۶۹ سال قبل یعنی ۱۹۱۱ء کی بات ہے کہ لکھنؤ میں ایک نئے بازار کی بنیاد ڈالی گئی جس کا نام تھا امین آباد۔ اس نئے بازار کی عجب سج دھج تھی۔ بیچ میں ایک بہت بڑا پارک تھا جو کچے احاطے سے جہاں اب امین آباد کی بسوں کا اڈہ ہے لاٹوش روڈ تک پھیلا ہوا تھا زمین پر ہری ملائم گھاس کا فرش تھا کنارے کنارے درختوں کی قطاریں تھیں، بیچ میں پھولوں کے تختے اور کیاریاں تھیں۔ پارک کے دو حصوں میں دو بڑے بڑے فوارے تھے اور پارک کے تین طرف دکانیں تھیں جن کو نئے طرز سے سجانے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس سج دھج کا بازار اس سے قبل شہر میں کوئی نہ تھا۔ کچھ برسوں بعد بیچ سے ایک چوڑی سڑک نکال کر پارک کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ یہ سڑک نظیر آباد کو فتح گنج سے ملاتی تھی

پورا بازار نواب امین الدولہ بہادر کے محل سے ملی ہوئی زمین پر لبایا گیا تھا اس لیے ان کے نام پر بازار کا نام امین آباد ہوا اور پارک کا نام امین الدولہ پارک۔

اس زمانہ میں لکھنؤ میونسپل بورڈ نیا نیا قائم ہوا تھا۔ بابو گنگا پرشاد ورما کو جو مشہور نیشنلسٹ لیڈر اور جرنلسٹ تھے، بورڈ کا چیرمین چنا گیا تھا۔ امین آباد کا نیا بازار انھیں کے تخیل (IMAGINATION) کی دین تھی۔ وہ شہر کی گلی کوچوں کے بازاروں کے بجائے ایک نیا (MODERN) بازار قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس وقت شہر کی زیادہ تر آبادی اور شہر کا خاص بازار چوک، پل غلام حسین، یحییٰ گنج تک محدود تھا۔ ان علاقوں سے امین آباد تک کسی بڑی سڑک کا نام ونشان بھی نہ تھا گلیاں اور کوچے تھے۔ جن میں بعض کا نام سڑک ہو گیا تھا اس نئے بازار کو پرانے شہر سے جوڑنے کے لیے ایک نئی سڑک کا ہونا بھی ضروری تھا۔ چنانچہ امین آباد سے نخاس تک ایک نئی اور چوڑی سڑک نکالی گئی اور بابو گنگا پرشاد ورما کے نام پر اس سڑک کا نام گنگا پرشاد ورما روڈ رکھا گیا۔

نخاس سے امین آباد تک کی یہ سڑک شہر لکھنؤ کی زندگی کا آئینہ بن گئی۔ لکھنؤ کی گنگا جمنی تہذیب خصوصی رسم ورواج روایات اور تہواروں کی سج دھج، سب کچھ اس سڑک پر وقتاً فوقتاً دیکھنے کو مل جاتا۔ دسہرہ آتا تو اسی سڑک سے رام نومی کے جلوس نکلتے۔ محرم ہوتا تو امین آباد سے نخاس تک سواریوں سے لدے ہوئے یکوں اور تانگوں کا تانتا بندھ جاتا۔ ہزاروں آدمی ہندو اور مسلمان محرم کی روشنی اور تعزیوں کے جلوس دیکھنے کے لیے اسی سڑک سے ہو کے جاتے۔ چوک اور نخاس کے رہنے والے اگر نئی قسم کی چیزیں جیسے بساط خانہ کا سامان، سلائی مشین، بجلی کا سامان خریدنا چاہتے تو امین آباد آتے، سہالگ کا موسم ہوتا تو امین آباد کے رہنے والے نخاس کے بزازے میں کپڑا خریدنے، چوک میں زیورات خریدنے اور یحییٰ گنج میں برتن خریدنے جاتے۔ غرضکہ لکھنؤ کی نئی سڑک پر دن بھر آنے جانے والوں کا سلسلہ قائم رہتا۔ شہر کی آبادی اس زمانہ میں دو لاکھ سے بھی کم تھی اس لیے آنے جانے والوں کے لیے یکہ اور تانگہ کی سواری کافی تھی۔ امین آباد، نخاس اور چوک میں یکے اور تانگوں کے اڈے تھے۔

تانگے اور یکے والے ایک آنہ اور دو پیسے سواری پر امین آباد سے چوک اور نخاس پہنچا دیتے۔ لکھنؤ اس زمانہ میں اپنی مخصوص مشترکہ تہذیب اور زبان کے لیے دور دور تک مشہور تھا یہاں کے تانگے اور یکے والے بھی لکھنؤ کی شستہ اور منجھی ہوئی اردو میں

گفتگو ہوتے۔ اگر آپ کسی خاص جگہ جانے کے لیے سواری کرنا چاہتے تو تانگے والا ہی دام طے کرتا اور نہ سواری۔ اگر سواری کبھی دام پوچھ بھی لیتی تو عام طور پر جواب ملتا "حضور سے یہ میرے کہنے کی بات ہے۔ آپ ہی کی خدمت سے تو بچوں کا پیٹ پلتا ہے۔ میں سرکار سے کیا کہوں۔ جو مناسب سمجھیے گا پرورش کے لیے دیدیجیے گا۔" کسی آدمی سے یہ امید ہی نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ دستور سے کم اجرت دے گا۔ یکے اور تانگے تو ہزاروں کی تعداد میں تھے ان کے علاوہ بگھی اور ڈولیاں اور فینس بھی تھیں۔ بگھی بالکل بند ڈبے کی طرح ہوتی (اور پردہ نشین خواتین لمبے سفر کے لیے بگھی میں ہی چلتی تھیں۔ پردے کا رواج ہندوؤں میں بھی تھا اور مسلمانوں میں بھی۔ پردہ گویا شرافت اور تہذیب کی نشانی تھی۔ ڈولی صرف عورتوں کی سواری تھی کیونکہ شریف عورتوں کا سڑک پر چلنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ ڈولی پر پردہ اس طرح باندھا جاتا کہ چاروں طرف سے ڈولی ڈھک جاتی اور ڈولی پر بیٹھنے والا نظر نہ آتا گنگا پرشاد روڈ کی کہانی غالباً ادھوری رہے گی جب تک ایک صاحب کا بھی ذکر نہ کیا جائے جو اس سڑک پر بھیک مانگتے تھے۔ یہ نواب تو نہ تھے لیکن تھے کسی اچھے گھر کے۔ پینے کی لت پڑ گئی تھی۔ اس لت کے پیچھے گھر بار سب بک چکا تھا۔ مگر نشہ تھا کہ چین نہ لینے دیتا۔ یہ صبح صبح گنگا پرشاد روڈ پر آکر کھڑے ہو جاتے سفید کرتا اور سفید پاجامہ پہنے ہوتے۔ اور ہر گزرنے والے سے کہتے "بابو جی آج منگل ہے۔ مہینہ کی چودہ تاریخ ہے۔ جاننے والے جانتے تھے کہ یہ دن اور تاریخ کیوں بتائی جا رہی ہے۔ وہ پیسے دیتے اور یہ دعائیں۔ شام تک کے دو دم مارنے کے لیے پیسے جمع ہو جاتے۔ اور یہ رات گزارنے مدک خانے کو روانہ ہو جاتے۔

گرمیوں میں امین الدولہ پارک اور امین آباد کی رونق دوبالا ہو جاتی۔ جگہ جگہ پر پیاؤ اور سبیلیں لگ جاتیں۔ جہاں مٹکوں اور گھڑوں میں جھلا ہوا ٹھنڈا پانی دن بھر مفت تقسیم کیا جاتا۔ شام ہوتی تو خوانچے والے پارک کے پاس کی سڑک کے کنارے خوانچے لے کر بیٹھ جاتے۔ چھوٹے چھوٹے تختوں پر ڈم کا ئیں سجائی جاتیں، کہیں گنے کی گنڈیریاں والے آواز لگاتے "یہ مصری کے ڈلے ہیں۔ شیرے میں پلے ہیں" کہیں فالودہ والا بولتا "جو مزہ چکھے عمر بھر یاد رکھے"، پیتل کی تھالیوں میں شیشہ کے چھوٹے چھوٹے رنگین گلاس، چینی اور پیتل کے برتنوں میں شکر کے "اولے"، فالودہ، کیوڑا اور طرح طرح کے خوشبودار عرق کی بوتلیں برف نہیں ہوتی تھی مگر مٹی کے گھڑے کا جھلا ہوا پانی برف کے پانی سے زیادہ ٹھنڈا ہوتا۔ دو گھونٹ پی لیجیے تو کلیجہ ٹھنڈا ہو جائے۔

امین آباد کے آگے مولوی گنج کا بازار تھا جس کی بازار کی حیثیت سے کوئی شہرت نہ تھی۔ دو دکانوں کے درمیان مکانوں کا سلسلہ بھی آ جاتا۔ ان دکانوں میں بھیڑ بھکڑ کم ہوتی۔ زیادہ تر دکانوں پر کاریگر اپنی اپنی چیزیں بناتے۔ شام کو بڑھئی آتے تو سامان لے جاتے اپنی دکانوں میں ایک بڑی سی دوکان غازی منے خان کی تھی۔ منے خاں "غازی" (فاتح جنگ) تو نہ تھے۔ ہاں ۱۹۲۱ء کی تحریک خلافت میں انھوں نے بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ ان کے دائرہ عمل میں لکھنؤ سے پنجاب تک کا علاقہ شامل تھا۔ ایک مرتبہ پولس اور کانگریس کے والنیٹروں میں مڈبھیڑ ہو گیا تو منے خاں آگے آگئے تھے۔ "بہت دلیری سے لڑے"۔ ان کے مداحوں نے خوش ہو کر ان کو غازی کا خطاب دے دیا۔ تھے بے پڑھے لکھے مگر سیاست سے دل چسپی تھی جو مرتے دم تک قائم رہی۔ سیاسی حالات سے باخبر رہتے اور اس سلسلے میں اپنی بساط بھر پیسہ خرچ کرتے۔ لکھنؤ، دہلی اور لاہور اس وقت اردو اخبارات کے مرکز تھے۔ لکھنؤ سے اُردو کے تین روزنامے اور کئی ہفتہ وار اخبار شائع ہوتے تھے۔ دہلی اور لاہور کا بھی یہی حال تھا۔ غازی منے خاں اُردو کے سب اخبار خریدتے اور ہر اخبار شروع سے آخر تک پڑھوا کر سنتے۔ منے خاں کی دکان پر جوتے بنتے تھے اور وہ خود بھی "جفت سازی" (پرانے طرز کے سلیم شاہی جوتے بنانے) میں مشہور تھے۔ منے خاں جوتے بناتے جاتے اور اخبار سنتے جاتے۔ اخبار پڑھنے والوں کی جن میں زیادہ تر اسکول اور کالج کے لڑکے ہوتے بڑی خاطر مدارات کرتے۔ خود کئی مرتبہ جیل گئے، دکان اور مکان پر پولیس کے چھاپے پڑتے تھے۔ کاروبار خراب ہوا۔ آمدنی کم ہوتی گئی۔ مگر کانگریس اور سیاست سے محبت کم نہ ہوئی۔ بالآخر ۱۹۳۷ء یا ۱۹۳۸ء میں غریبی کی حالت میں

چل بسے۔ اپنے وقت میں بڑا نام کر گئے۔ اس دور میں ایک طرف تو غازی منے خاں کے سے جیالے تھے تو دوسری طرف نوابین اور شریفوں کے خاندان تھے جو مولوی گنج کے علاقہ سے لے کر چوک اور سعادت گنج تک آباد تھے۔ ان گھروں میں سیاست کا گزر ہی نہ تھا۔ ان میں کچھ زمیندار تھے تو کچھ وثیقہ دار جن کو گھر بیٹھے سینکڑوں روپے مل جاتے۔ باقیوں کے پاس باپ دادا کی دولت تھی۔ ہر شخص کی ضروریات زندگی حسب حیثیت پوری ہو جاتیں۔ شعر و شاعری، کبوتر بازی اور بٹیر بازی کا شوق عام تھا۔ رکھ رکھاؤ اور وضع داری نبھانے میں ہی زندگی گذرتی تھی۔ کم پیسے والے بھی سفید پوشی نہ چھوڑتے۔ گھر کے اندر چاہے لنگی اور عرق چین کر ہی گزر ہوتی مگر گھر کے باہر نکلتے تو بدن پر سفید دھلا ہوا کرتا اور سفید انگرکھا ہوتا۔ پیسے والوں کے انگرکھے جامدانی ململ کی طرح ہلکے کپڑے کے ہوتے جو کر گھے پر تیار کیے جاتے اور کپڑا بنتے وقت ہی اس میں طرح طرح کے پھول بوٹے بنا دیے جاتے۔ کپڑے کی ہر دھاری گویا پھولوں کی کیاری ہوتی۔ اسی زمانہ میں تین ساڑھے تین گز کا ٹکڑا ڈیڑھ دو سو روپیہ کا ملتا تھا۔ اب نہ جامدانی بنانے والے رہے نہ پہننے والے اور نہ جامدانی کا کپڑا۔

شام ہوتی تو لوگ ہوا خوری کو نکل پڑتے۔ رئیس اپنی بگھیوں پر اور کم پیسے والے پیدل۔ راستہ چلتے اگر دو جاننے والے ایک دوسرے سے مل جاتے تو چاہے ملاقات کتنی ہی سرسری ہو پرانی وضع کی صاحب سلامت ہوتی۔ آج کل کی طرح چلتے چلتے "آداب عرض ہے" پر یہ ملاقات ختم نہ ہوتی۔ یہ شرافت کا دستور نہ تھا۔ لوگ ایک دوسرے کو دیکھ کر فوراً رک جاتے اور جھک کر کم از کم تین مرتبہ تو آداب بجالاتے۔ اس میں ہندو مسلمان کا فرق نہ تھا سب ہی "آداب" "عرض" کرتے۔ پھر ہاتھ جوڑ کر پوچھتے "حضور کے مزاج تو اچھے ہیں" اگر جان پہچان قریبی ہوتی تو بال بچوں کی خیریت بھی دریافت کر لی جاتی۔ آج سے چالیس برس پہلے سڑکوں اور گلیوں میں یہ بھیڑ بھاڑ اور گہما گہمی نہ تھی۔ سڑک پر کھڑے ہو کر بھی اطمینان سے بات چیت ہو جاتی۔ اگر گھر پر کوئی ملاقاتی آجاتا تو پھر آداب و تسلیمات کا لمبا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ میزبان خود اٹھ کر مہمان کا خیر مقدم کرتا۔ بچوں کی خیریت پوچھتا۔ ان ملاقاتوں میں خوردی اور بزرگی کا بڑا خیال رکھا جاتا تھا۔ اگر کوئی چھوٹا بڑوں کی محفل میں پہنچ جاتا تو پہلے آداب کرتا اور بڑوں کی مزاج پرسی کرنا اس کا فرض ہو جاتا۔ بڑوں کی محفل میں چھوٹے عموماً جاتے نہ تھے اور اگر پہنچ جاتے تو محفل کا رنگ یکا یک بدل جاتا۔ مجال کہ چھوٹے کی موجودگی میں بڑے آپس میں ہنسی مذاق کی کوئی بات کر لیں۔ یوں ہم عمر لوگوں کی محفلیں گھنٹوں چلتیں جن میں ہنسی مذاق، قصے کہانیاں سب ہی کچھ ہوتا۔ پیسے والوں کے شام کو دوستوں سے ملاقات کی لکھنؤ میں ایک خاص جگہ تھی۔ چوک جہاں ڈیرے دار طوائفوں کے گھر تھے۔ آج سے چالیس پچاس سال پہلے تک چوک عجیب پُر رونق جگہ تھی۔ شہر کا سب سے بڑا بازار یہی تھا۔ ہیرے جواہرات سے لے کر لون نمک تک سب چوک میں مل جاتا۔ کہیں پھول والوں کی گلی تھی تو کہیں عطر والوں کی کہیں بنارس کا زر بفت ملتا تو کہیں گھر کا گاڑھا دھوتر۔ یہیں کتابوں کی مشہور دکانیں تھیں اور یہیں چوسر کی بساط گنجیفے کے پتے اور مانجھے کی چرخیاں ملتیں۔

شام ہوتے ہی اس بازار کی رونق دوبالا ہو جاتی بلکہ پھولوں سے مہک اٹھتیں۔ ہر قدم پر پھول والے بیلا چمیلی اور گلاب کے گجرے لیے ہوئے نظر آتے۔ بازار کے دونوں طرف کوٹھوں سے سازوں کی جھنکار کی آوازیں آتیں۔ سریلی لچکتی آواز راہ گیروں کا دل موہنے لگتیں۔ نظر اٹھا کر دیکھتے تو کوٹھوں پر لوں کی قطاریں نظر آتیں۔ ہر شام سجیلے نوجوانوں کا میلہ لگتا۔ لوگ کوٹھوں پر جاتے۔ گانا سنتے۔ پان کھاتے اور جیب میں جو کچھ ہوتا "بائی جی" کی نذر کر آتے۔

ان کوٹھوں پر جانے والوں میں سے صرف ایک ہی آدمی سے "بائی جی" کا تعلق ہوتا۔ جس کی وہ "ملازم" ہوتی۔ باقی لوگوں سے صرف گانا سنانے کا اور شستہ مذاق تک کا رشتہ رہتا۔ یہ طوائفیں صرف گانے اور رقص میں ہی ماہر نہ ہوتیں۔ ان کو ہندی، اردو، فارسی، شاعری اور ادب کی بھی تعلیم دی جاتی۔ طرز گفتگو

سکھایا جاتا۔ دل لبھانے کے طریقے بتائے جاتے۔ آداب محفل سے واقف کرایا جاتا۔ ان محفلوں میں انتہائی غمگین اور پریشان حال شخص بھی دو گھڑی کے لیے اپنے غم بھول جاتا۔ وہاں صرف ناچ گانا ہی نہیں شعر و شاعری بھی ہوتی۔ علمی اور ادبی گفتگو بھی ہوتی۔ بحث و مباحثہ ہوتا جن میں یہ طوائفیں بھی حصہ لیتیں کوئی نہیں جانتا کہ ان میں کتنی امراؤ جان ادا تھیں۔ چوک کے ان کوٹھوں پر ہر شام محفلیں سجتیں۔ دل والے کچھ رات گذار کر گھر جاتے۔ دولت والوں کے یہاں خود ان کے دربار لگتے۔ جہاں دوست اور مصاحب جمع ہوتے۔ علمی اور ادبی موضوعات پر گفتگو ہوتی۔

جن کو چوک جانا پسند نہ ہوتا وہ شام کو وکٹوریہ پارک اور دریائے گومتی کے کنارے ہوا خوری کو آتے۔ اور عام طور پر یہ ٹہلتے رہتے۔ آج سے چالیس سال پہلے لکھنؤ میں سینما صرف دو تھے، ایک قیصر باغ میں الفنسٹن اور دوسرا حضرت گنج میں پرنس۔ دونوں سینما گھروں میں انگریزی فلمیں دکھائی جاتی تھیں۔ ۱۹۲۰ء کے لگ بھگ امین آباد میں ایک سینما بنا جس کو رائل سینما کا نام دیا گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندستان میں ہندستانی فلمیں بننا شروع ہوئی تھیں مگر تمام فلمیں خاموش ہوا کرتی تھیں۔ ڈائی لاگ پردہ پر لکھا ہوا آجاتا تھا شاید اسی لئے سینما سے زیادہ تھیٹر مقبول تھا۔

آج کا گولہ گنج جہاں بلند باغ کا محلہ آباد ہے ایک وسیع میدان تھا۔ کلکتہ اور بمبئی کی تھیٹر کمپنیاں یہیں آکر اپنا ڈیرہ جماتیں آغا حشر کاشمیری کے ڈرامے کھیلتیں اور بہت سے لکھنؤ والوں کو مفلس اور کنگال بنا جاتیں۔ لوگ ایک ایک ڈرامہ کئی کئی مرتبہ دیکھتے۔

حضرت گنج سے لکھنؤ والوں کا اس زمانہ میں نام کا رشتہ تھا۔ یہ انگریزوں کا علاقہ سمجھا جاتا تھا۔ یہاں سیر و تفریح کرنے والے بھی انگریز ہوتے تھے اور دکاندار بھی۔ مشہور دکانیں انگریزوں کی ہی تھیں۔ جیسے بیک ایلن کمپنی وہائٹ وے لائڈلا کمپنی وغیرہ۔ شام ہوتے ہی مقبرے سے بڑے ڈاک خانہ تک کی سڑکیں انگریز صاحب بہادروں اور ان کی میموں سے بھر جاتیں۔ اس علاقہ میں کئی تھیٹر اور ڈانس ہال تھے۔ جہاں شام کو بال ڈانس کا انتظام ہوتا۔

اعلا انگریز افسران سول سروس کلب چھپتر منزل میں جمع ہوتے جہاں ہندستانیوں کو قدم رکھنے کی بھی اجازت نہ تھی صرف چھپتر منزل نہیں حضرت گنج میں بھی ہندستانیوں کے آنے پر روک ٹوک ہوتی۔ کوئی شخص بھی صاف ستھرے کپڑے پہنے بغیر شام کے وقت حضرت گنج کی طرف نہیں آسکتا تھا۔ لال باغ کے چوراہے پر ہی سپاہی روک ٹوک شروع کر دیتے۔ لیکن زمانہ اتنی تیزی کے ساتھ بدلا کہ چوک اور نخاس کی تمام محفلیں بھی ختم ہو گئیں، چوک میں اب بھی صرافہ اور چکن کے کپڑوں کا سب سے بڑا بازار ہے۔ مگر اب صرف کاروبار ہی رہ گیا ہے وہ محفلیں اور نشستیں ختم ہو گئی ہیں۔ لوگ آتے ہیں خرید و فروخت کرتے ہیں اور گھر کا راستہ لیتے ہیں۔ امین آباد اب پہلے سے زیادہ آباد ہے، سڑک کا تو ذکر ہی کیا۔ گلی کوچوں میں بھی بڑے بڑے بازار ہیں۔ جہاں پہلے امین آباد پارک تھا اب وہاں مارکیٹ ہے۔ امین آباد پارک کٹتے کٹتے اب ایک چھوٹی سی پٹی رہ گیا ہے۔ آدمیوں کی وہ ریل پیل ہے کہ سڑکوں پر چلنا مشکل ہے کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔ شام کو پارک میں دوستوں کی جو بیٹھکیں ہوتی تھیں وہ ختم ہو گئیں ہیں۔ پرانی تہذیب اور وضعداری بھی رخصت ہو چکی ہے۔ بس ان کا ذکر رہ گیا ہے۔

★

قارئین نیا دور

کو

نیا سال

مُبارک ہو!

ناوک حمزہ پوری
ایم ای اسکول سی سی ایل سوندا ۔
ہزاری باغ ۔ بہار

یوم جمہوریہ

آیا ہے گن تنتر دِوس پھر — ہر سُو اُلّاس ہے اک برس پھر
گونج اٹھی شہنائی ہر سُو — کانوں میں گھلتا ہے رس پھر
جشنِ طرب ہے صحنِ چمن میں — ہمسرِ گُل ہیں خار و خس پھر
نور افشاں مسجد کا منارہ — رخشاں ہے مندر کا کلس پھر
کوئی نہیں اب اونچا نیچا — ایک سمان ہیں مور و مگس پھر
قافلۂ جمہور بڑھا ہے — تیز کرو آوازِ جرس پھر
ہشیاری لازم ہے لوگو! — گھات میں ہیں کچھ اہلِ ہوس پھر
کان کھڑے آنکھیں وا رکھیے — سب کو رہنا ہے چوکس پھر

آزادی کی فضا میں ناوک
آج ہے رقصاں نفس نفس پھر

مہدی پرتاپ گڑھی
بمعرفت ایگزیکٹیو انجینیر اریگیشن ڈویژن ۔
پرتاپ گڑھ

جشن جمہور

نئی سحر نے انگڑائی لی جاگ اٹھی تقدیرِ چمن
برپا ہے اک جشن مسرت ہر ہر گھر، ہر ہر آنگن
جمہوری قدروں نے دی ہے انساں کو جینے کی پھبن

آزادی کی نعمت سے ہر برگِ چمن سرشار ہے
بادِ سحر کے آتے ہی غنچہ غنچہ بیدار ہو
طوقِ غلامی جب سے ٹوٹا دور ہر اک آزار ہو

دانش و حکمت کے ہر جانب کتنے ہی در باز ہوئے
جو ٹھکرائے طبقے تھے لو وہ بھی سرافراز ہوئے
ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی آخر ہم آواز ہوئے

سورج نے تعلیم کے بانٹا ہے گھر گھر اجالا ہو
فیضِ رواں ہے نہروں کے کھیتوں کھیتوں نئی عز
ملک کے گوشے گوشے میں ڈالا خوشحالی نے

محنت کش انسانوں نے فولاد کو نغمے بخشے ہیں
قسمت جو بالوں کی جاگی جام خوشی کے چھلکے ہیں
رقص کناں کھیتوں کھلیانوں میں گندم کے خوشے ہیں

جنوری کی چھبیس نے جب جمہور کو عزت و ثروت
دنیا کے نقشے پر ابھری ایک عوامی طاقت
کرنے لگی آئینہ سازی ملک میں حسنِ ثقافت

آؤ صحنِ چمن میں برپا پھر جشنِ جمہور کریں
عام وطن میں ہر جانب یکجہتی کا دستور کریں
نور سے حسنِ محبت کے ہر ذہن و دل معمور کریں

شاد فیض آبادی
احاطہ اثل خاں
فیض آباد (یو پی)

مبصر امروہوی
۳۱۳۔ اسماعیل نگر
میرٹھ۔ یو پی

عقیل رحمت اعظمی
شبلی پوسٹ گریجویٹ کالج
اعظم گڑھ۔

غزلیں

ہم وہ شرابِ پاک ہیں ساقی دنیا کے میخانوں ہیں
پی گئے ہم کو پینے والے، ڈھل گئے ہم پیمانوں میں

ہیں خلوصِ سوز نہ کم ہو دیکھ کہیں ایسا تو نہیں!
آگہی کیوں آوارہ مزاجی شمع ترے پروانوں میں؟

ایسے ادب کو دل نہیں پڑھتا، خالی آنکھیں پڑھتی ہیں
سن نہ ہو غزلوں میں کہیں جب عشق نہ ہو افسانوں میں

دسمِ گل ہے تجھ سے برہم جوشِ جنوں بھی تجھ سے خفا
سب ہمارا نام نہیں ہر یار ترے دیوانوں میں

زک نازک لان کی بیلیں ٹوٹے وفا سے خالی ہیں
رنگ برنگے پھول سجے ہیں شیشے کے گلدانوں میں

رفتِ ضرورت' بزمِ خرد کی جس سے سجائی جاتی ہے
ہم ہیں وہی سامانِ مہذب تفریحی سامانوں میں

شاد ہمارے ذہن کا البم دیکھ کے جیسے کانپ اٹھا
غالب و مومن کی تصویریں ردی کی دوکانوں میں

غموں کی یورشِ پیہم ہے کیا کیا جائے
چراغِ زیست کا مدھم ہے کیا کیا جائے

شعاعِ مہر جو پھیلی ہے صحنِ گلشن میں
حریفِ قطرۂ شبنم ہے کیا کیا جائے

رہِ حیات کا عالم تو دورِ حاضر میں
بشکلِ گیسوئے برہم ہے کیا کیا جائے

ہم اپنے غم کا فسانہ کہیں تو کس سے کہیں
نہ کوئی دوست نہ ہمدم ہے کیا کیا جائے

بلاکشوں کا سرِ میکدہ ہے ایک ہجوم
مگر شراب بہت کم ہے کیا کیا جائے

کسی بھی جام سے آسودگی نہیں ہوتی
عجیب پیاس کا عالم ہے کیا کیا جائے

غمِ حیات کا دامن تو چھوٹتا ہی نہیں
عجیب رشتۂ محکم ہے کیا کیا جائے

کسی طرح نہیں آتی فضا میں یک رنگی
کہیں خوشی ہے کہیں غم ہے کیا کیا جائے

میں جانتا ہوں خوشی کی حقیقتیں لیکن
علاج غم کا فقط غم ہے کیا کیا جائے

مبصر اب تو متاعِ سکوں کا شیرازہ
کچھ اور درہم و برہم ہے کیا کیا جائے

عہدِ ماضی کے فسانے نہ سناؤ لوگو
میں پریشاں ہوں مجھے اب نہ ستاؤ لوگو

زندگی بھر تو میں جلتا ہی رہا ہوں یونہی
کم سے کم قبر پہ اب کچھ نہ جلاؤ لوگو

مجھ سے بھی رونقِ میخانہ رہی ہے برسوں
میری جانب بھی کوئی جام بڑھاؤ لوگو

آج کی شب تو ہے بیمار کی شب میرے لیے
آج کی رات تو نہ پاس سے جاؤ لوگو

جان تو ہو گئی میری غمِ دوراں پہ نثار
آؤ اب لاشِ عقیل آ کے اٹھاؤ لوگو

آفتاب نقوی سہسوانی
آدرش انٹر کالج، کوڑا جہان آباد
ضلع فتحپور (یوپی)

نیا سال آیا

نئی صبح نے رخ سے پردہ اٹھایا
فضا میں ہر اک سمت اک نور چھایا
وہ مہرِ درخشاں نے جلوہ دکھایا
روپہلی شعاعوں نے مژدہ سنایا
نیا سال آیا نیا سال آیا

وہ بن جاگ اٹھے چمن جاگ اٹھے
وہ گلشن میں سرو و سمن جاگ اٹھے
وہ سوئے ہوئے گلبدن جاگ اٹھے
نسیمِ سحر نے یہ جادو جگایا
نیا سال آیا نیا سال آیا

اٹھو تم کو آواز دیتی ہے منزل
چلو وہ بلاتی ہے ہر موجِ ساحل
نہ سوچو کہ ہے راہ دشوار مشکل
جو بڑھتا رہا اس نے ساحل کو پایا
نیا سال آیا نیا سال آیا

سرِ راہ سرگرم یوں قافلے ہوں
کہ طے ایک دو گام میں فاصلے ہوں
امنگیں نئی ہوں نئے حوصلے ہوں
دلوں پر ہو کیوں ناامیدی کا سایا
نیا سال آیا نیا سال آیا

نئے عزم سے راہ میں گامزن ہو
نئی منزلوں کی طلب ہو لگن ہو
دلوں میں نہ کچھ خوفِ رنج و محن ہو
پیام ایک یہ ہی نیا سال لایا
نیا سال آیا نیا سال آیا

عبرت بہرائچی
ناظر پورہ
بہرائچ ۲۷۱۸۰۱

وہ ہے ہندوستاں

وہ ہے ہندوستاں

جس کی ہمت کا قائل ہے یہ آسماں
جس نے توڑی ہے غم کی فصیلِ گراں
جس کو تکتا ہے حیرت سے سارا جہاں
جس کی چوکھٹ کے درباں ہیں امن و اماں

ذرے ذرے میں ہیں جس کی رعنائیاں
قابلِ رشک ہیں جس کی پرچھائیاں
چاندنی جس پہ لیتی ہے انگڑائیاں
جس کی بانہوں میں کشمیر سا گلستاں

جس کی محفل میں تلسی کا استھان ہے
آج تک جس کی نظروں میں رسکھان ہے
جس کے ہاتھوں میں غالب کا دیوان ہے
اردو ہندی ہیں دونوں ہی جس کی زباں

پھول رہتے ہیں جس میں سدا خندہ زن
ڈھونڈھتی ہے جسے خود بہارِ چمن
جس کو کہتی ہے دنیا گلوں کا وطن
آرزو جس کی کرتا ہے سارا جہاں

شہ زوروں کی بھی ختم کی سرکشی
ظلمتوں کو عطا کی نئی روشنی
لاپتہ ہو گئی خود بے بسی
ہمتوں کی ہے جو اک فصیلِ گراں

سید اسحاق حسینی بشر
حسنی فارمیسی - ۴۱ - گوئن روڈ
لکھنؤ

غزل

دیکھو تو کون آیا ہے فضلِ خدا کے ساتھ
تقدیر کائنات بدل دی وفا کے ساتھ

شکوے کے ساتھ اور نہ آہ و بکا کے ساتھ
اس وقت کو گزار دو صبر و رضا کے ساتھ

دنیا ہمیں اجل سے ڈراتی ہے کس لیے
ہم مدتوں سے کھیل رہے ہیں قضا کے ساتھ

ملتی تو ہے نظر سے نظر ان سے روز و شب
لیکن سنبھل سنبھل کے شعور و حیا کے ساتھ

حالِ دلِ تباہ بیاں کس سے کیا کروں
ہوش و حواس اڑ گئے اک ہی ادا کے ساتھ

اے ساکنانِ دہر ذرا ہوش میں رہو
تبلیغ ہو رہی ہے جفا کی وفا کے ساتھ

میں ہو گیا وفا کا پرستار اے بشر
جب جب نگاہ لڑ گئی اک بے وفا کے ساتھ

قمرؔ عثمانی
مدرسہ اصغریہ محلہ قلعہ ۔ دیوبند ۔ سہارن پور

جشنِ جمہور

پھر پھول کھلے ہیں گلشن میں پھر فصلِ بہاراں آئی ہے
تقدیرِ چمن کی جاگ اٹھی پھر بادِ صبا لہرائی ہے
پھر دورِ مسرت آیا ہے بلبل نے ترانے چھیڑے ہیں
پھر جھوم اٹھے ہیں سرو و سمن ہر سمت نئی رعنائی ہے
راہوں کے دھندلکے دور ہوئے منزل کے نشاں کچھ چمکے ہیں
خدمت کے جہادِ پیہم میں پھر آج وفا کام آئی ہے
ذروں میں چمک ہے انجم کی شاداب فضائے گلشن ہے
اب رات اندھیری بیت چکی پھر صبح درخشاں آئی ہے
آنکھوں میں چمک ہے خوشیوں کی ہر دل میں مسرت رقصاں ہے
اب دورِ خزاں کا بیت گیا پیغام صبا یہ لائی ہے
جمہور کے دل میں جاگے ہیں ارمان نئے جذبات نئے
اب اس سے بھی آگے بڑھنا ہے تقدیرِ جہاں لے آئی ہے
اس دیش کے رہنے والوں نے تعمیر کا اک انداز لیے
ایثار سے اور قربانی سے تقدیرِ وطن چمکائی ہے
منزل کے قریں جو آئے ہیں رقصاں ہے دلوں میں عزمِ جواں
دیکھے تو کوئی اب کس کو یہاں احساسِ شکستہ پائی ہے
محنت کو قبولِ عام ملا دہقاں کی قسمت جاگ اٹھی
کھیتوں کے سنہرے چہروں پر کیا رونق کیا زیبائی ہے
با عزمِ جواں بے خوف و خطر آباد جہاں اک کرنا ہے
محکوم کسی کا کوئی نہیں اپنی ہی یہاں دارائی ہے
رفتارِ سفر کو تیز کیے پھر جانبِ منزل بڑھنا ہے
اس جشن کے رنگیں موقع پر یہ عہد ہمیں اب کرنا ہے

محبوب راہیؔ
نزد گلزاری مسجد
پوسٹ : برسیتا کلی
اکولہ ۔ مہاراشٹر

پیامِ باپو کا

دلوں پہ لاکھ ہو نقشِ دوام باپو کا   کوئی ہزار کرے احترام باپو کا
عبث ہے ذکرِ محض صبح و شام باپو کا   فضول ہے جو لبوں پر ہے نام باپو کا
کرو بلند زمانے میں نام باپو کا
سناؤ سارے جہاں کو پیام باپو کا

حصارِ قوتِ اغیار توڑنے کے لیے   کلائی جبر و ستم کی مروڑنے کے لیے
تمام ٹوٹے ہوئے رشتے جوڑنے کے لیے   ہر ایک اہلِ وطن کو جھنجھوڑنے کے لیے
شریکِ کار تھا ہر خاص و عام باپو کا
سناؤ سارے جہاں کو پیام باپو کا

ابھی تو ہند میں افلاس کا بسیرا ہے   ابھی تو ہند میں مایوسیوں کا ڈیرا ہے
ابھی تو ہند میں چاروں طرف اندھیرا ہے   ابھی تو دور بہت دور وہ سویرا ہے
ابھی جہاں میں ادھورا ہے کام باپو کا
سناؤ سارے جہاں کو پیام باپو کا

ابھی تو زندہ مظالم کی چیرہ دستی ہے   ابھی تو دنیا لٹیروں کی ایک بستی ہے
نفس نفس میں گراوٹ ہے اور پستی ہے   ہر ایک ذہن اسیرِ ہوس پرستی ہے
محض لبوں پہ ہے ذکر مدام باپو کا
سناؤ سارے جہاں کو پیام باپو کا

زباں کے جھگڑے علاقوں کے واد مٹ جائیں   یہ دین اور دھرم کے فساد مٹ جائیں
دلوں سے نفرت و بغض و عناد مٹ جائیں   اے راہیؔ فتنے ہیں باہم تضاد مٹ جائیں
اگر ہو ہند میں رائج نظام باپو کا
سناؤ سارے جہاں کو پیام باپو کا

کرشن کشور سریواستو

ترجمہ: نہال الدین عثمانی
۵۸۳ - پیر بٹاون
بارہ بنکی - یوپی

(ہندی افسانہ)

فرج

ابھی چار دن پہلے میرے بچپن کا دوست نوین میرے ہی دفتر میں افسر بن کر آ گیا۔ میں نے مسکرا کر اس کا استقبال کیا، بڑے پر جوش انداز میں اس کی کامیابیوں کی تعریف کی۔ پورے دفتر میں اپنی اور اس کی دوستی کا ڈھنڈورا پیٹا۔ لیکن حقیقت تو یہ تھی کہ اس کی تقرری پر میں دل ہی دل میں جل گیا تھا۔ میری وہ مسکراہٹ کھوکھلی تھی، میرا سارا جوش و خروش محض نمائشی تھا۔ نوین سے پہلے نہ جانے کتنے آفیسر آئے اور چلے گئے۔ سب اجنبی تھے۔ میں تو کلرک کی حیثیت سے بھرتی ہوا تھا اور آج بھی بابو ہی تھا۔ افسر کے عہدے کے لیے نااہل قرار دیا گیا تھا، اس لیے کسی اور کو میرا افسر بننا ہی تھا، یہ سب سمجھتے ہوئے بھی نوین کے آنے پر میں نے گھٹن سی محسوس کی شاید میں اپنے دوستوں کو اپنے جیسا بابو ہی دیکھنا چاہتا تھا۔

یہ گھٹن میری مجبوری تھی اور کرتا بھی کیا؟ جس متوسط طبقہ سے میرا تعلق ہے یہ گھٹن اسی کا ورثہ ہے...... اور یہ کمبخت متوسط طبقہ ایک عجیب سی چیز ہے۔ سماج کی تمام پابندیاں اپنے کاندھے پر ڈھوتا ہے اور کراہنے میں بھی شرم محسوس کرتا ہے۔ نچلا طبقہ تو اپنی تکلیفوں اور محرومیوں کی نمائش لگاتا ہے۔ اعلا طبقہ اپنی مفاد پرستانہ ذہنیت کی وجہ سے اندھیرے میں اپنی دنیا روشن کرتا ہے۔ لیکن میرا طبقہ سماج کے خوف سے چھپ کر روتا ہے اور شکستہ چینی کے ڈرے سے بچ کر ہنستا ہے۔ نوین کی آمد پر میری ہنسی بھی کچھ ایسی ہی تھی۔

نوین نے آتے ہی سارے آفس پر اپنا رعب جما لیا۔ سبھی ملازم اس کے پرستار بن گئے۔ لیکن میرا دل اس کے منصب کے خلاف بغاوت کر رہا تھا۔ میں اسکول کے دنوں سے اس کو جانتا تھا ساتھ پڑھتا تھا اس لیے اس کی خوبیاں اور خامیاں مجھ سے پوشیدہ نہیں تھیں، لیکن اس وقت اس کی کمزوریاں ہی مجھے یاد آ رہی تھیں سگریٹ اور شراب اس کی پرانی لت تھی۔ لڑکیوں کے پیچھے گھومنے اور ان سے چھیڑ چھاڑ کرنے میں اسے مزہ آتا ہے۔ اپنی انھیں حرکتوں کی وجہ سے وہ کئی بار گھر، اسکول اور محلہ میں پٹا بھی گیا تھا۔ اس کی تمام حرکتوں کو میں للچائی نظروں سے دیکھتا تھا لیکن ڈانٹ اور پٹائی کے خوف سے آدرش وادی بن گیا تھا۔

گھر سے باہر شراب پینے کے بعد، الائچی کھا کر گھر لوٹنے والے اس متوسط طبقہ کی جیتی جاگتی تصویر میرے والد بھی تھے۔ اس لیے میرے میٹرک پاس کرتے ہی انھوں نے اپنی طرح مجھے بھی آفس میں بابو بنوا دیا۔ اپنی روایات کی وجہ سے میں جلد ہی پورے دفتر میں ایک مثالی بابو بن گیا۔ نہ کسی سے جھگڑا، نہ کسی سے کچھ لینا دینا۔ افسر کو دیوتا ماننے والا فرماں بردار سرکاری ملازم دن بھر فائلیں اور شام کو افسر کے گھر کی چوکھٹ بس انھیں کو میں نے جانا اور سمجھا اور پھر رفتہ رفتہ اپنی کرسی میں دھنستا تو دھنستا ہی چلا گیا۔

نوین کا حال دوسرا تھا۔ اس کے والد بھی اسے بابو ہی بنانا چاہتے تھے لیکن وہ نہ مانا، والد سے جھگڑ کر گھر سے بھاگ گیا۔ نوین کے اس برتاؤ پر سب کے ساتھ میں نے بھی تھو تھو کی۔ اس

کے بعد کبھی کبھار اس کی کچھ خبر مل جاتی تھی۔ اب وہ کسی کالج میں پڑھ رہا تھا لیکن کالج کی یونین میں بھی سرگرم تھا۔ پرنسپل سے بھی اکثر جھگڑا کرتا۔ ان دنوں کالج سے نکال بھی دیا گیا تھا۔ اب کسی آفس میں نوکری کر رہا ہے اور نائٹ کالج میں پڑھ بھی رہا ہے ......
ابھی تین چار سال قبل اس کے کسی دوسری ذات میں شادی کر لینے پر بڑا ہنگامہ ہوا تھا۔ اس کے والد منھ چھپائے پھرتے تھے اور میں ان پر خوب نکتہ چینی کرتا تھا۔

نہ جانے وہی نوین آج کیسے میرا افسر بن کر آ گیا۔ میں دفتر میں بابو کی حیثیت سے آیا تھا اور پندرہ برس بعد بھی بابو ہی تھا۔ لیکن مجھے اس کا افسوس نہ تھا، رنج تو یہ تھا کہ نوین افسر بن گیا۔ افسر بننے کے بعد بھی نوین بڑا پر خلوص تھا، لیکن مجھے محسوس ہوتا تھا کہ اس کی یہ سادگی محض دکھاوا ہے۔

اپنی کلرک والی ذہنیت کے تحت ایک شام میں اپنی بیوی کے ساتھ کچھ رسمی طور پر نوین سے ملنے اس کے بنگلہ پر چلا گیا۔ نوین اور اس کی بیوی نے ہمارا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ ایک لمحہ کے لیے مجھے محسوس ہوا کہ نوین میرا نیا افسر نہیں، میرا پرانا دوست ہے لیکن تھوڑی ہی دیر میں میری ذہنیت نے میرے احساس کو دبوچ لیا۔ میں دل ہی دل میں کڑھتا رہا۔ چلتے وقت اس نے بڑے بے تکلفانہ انداز میں کہا "اتوار کو ہم دونوں تیرے گھر آ رہے ہیں۔ رات کو بھابی کے ہاتھ کا تیار کیا ہوا کھانا کھا کر لوٹیں گے۔"

نوین کے گھر سے نکلتے ہی میری بیوی کی تقریر شروع ہو گئی اس کے ایک ایک لفظ میں طنز، نفرت اور مایوسی کا عکس تھا نوین کو نیچا دکھانے کا اس نے فیصلہ کر لیا تھا، لیکن یہ کیسے ممکن ہوگا؟ وہ طے نہیں کر پا رہی تھی۔ اپنے گھر میں قدم رکھتے ہی بولی "میں ایسا کھانا پکاؤں گی کہ ان کے باپ دادا نے بھی نہ کھایا ہوگا۔ لیکن ویسا ٹھنڈا پانی کہاں سے آئے گا؟
وہ کچھ جھجکی، پھر مجھ سے بولی "اتوار تک اپنے گھر میں بھی فرج آ جانا چاہیے۔"

فرج کی بات آتے ہی میں برف کی طرح منجمد ہو گیا لیکن مجھے شکست تسلیم کرنا ہی تھی، اور مجھے شکست ہو بھی گئی۔
بھاگ دوڑ، ادھار، قرض ..... سبھی کچھ کیا اور سنیچر کو ایک فرج قسطوں پر لے آیا۔ بیوی نے اطمینان کی سانس لی۔ اب وہ نوین کو نیچا دکھانے کے لیے پوری طرح لیس تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے فرج میں پانی کی بوتلیں بھر گئیں۔ انڈے اور دودھ کی جگہ کچھ سبزیاں ادھر ادھر ٹھونس دی گئیں۔

اتوار کی رات کو نوین اپنی بیوی کے ساتھ آیا۔ اس نے بے تکلفی کے ساتھ کھانا کھایا اور دل کھول کر کھانے کی تعریف کی۔ اس کے بعد پانی کا گلاس اٹھاتے ہی بولا،
"بھابی! یہ فرج کی بیماری آپ کو بھی لگ گئی؟"
میری بیوی نے شرمانے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا،
"کیا کریں بھائی صاحب، گھڑے کا پانی اچھا ہی نہیں لگتا۔"
نوین ہنس پڑا، بری طرح ہنس پڑا۔ ہم سب اسے دیکھتے ہی رہے۔ تھوڑی دیر بعد دو گھونٹ پانی گلے کے نیچے اتار کر بولا "فرج تو میرے یہاں بھی ہے، مگر مجھے فرج سے نفرت ہے۔" اس کے بعد اس نے کہنا شروع کیا "یار مجھے تو مجبوراً اسٹیٹس کا ڈھونگ رچانے کے لیے فرج خریدنا پڑا، لیکن تجھے یہ بیوقوفی کیسے سوجھی؟ یقین کر دوست میں جب بھی فرج کھولتا ہوں، مجھے بڑا دکھ ہوتا ہے۔ ہر چیز وقت سے کٹی اور پچھڑی لگتی ہے۔" نوین میری بیوی کی ہی طرح سنجیدہ ہو گیا اور بولا،
"بھابی، جب باہر کی تپش سے ڈر لگتا ہے وہ فرج میں قید ہو جاتا ہے، اور آگے بڑھتے ہوئے وقت کا ساتھ نہیں دے سکتا!"
وہ کرسی سے اٹھا اور مجھ پر نظر ڈالی۔ گرم سلاخوں جیسی دہکتی نظر میری بیوی کی طرف دوڑاتے ہوئے اس نے اپنی بات پوری کی "میرا دوست میری بات سمجھ گیا ہے۔ آپ کو بھی سمجھا دے گا۔" یہ کہتے ہی وہ اچانک ہنس پڑا۔ اپنی بیوقوفی کو چھپانے کے لیے میری بیوی نے بھی اس کا ساتھ دیا، لیکن میں نہ ہنس سکا نہ رو سکا۔

★

ش۔ اخگر عظیم آبادی
تو بیر کالج واسع پور
دھنباد۔ ۸۲۶۰۰۱

یومِ جمہوریہ

چہرۂ ہند پہ ہے آج انوکھی سی پھبن
سیلِ مستی میں ہر اک فرد بہا جاتا ہے
مثلِ گل پیر و جواں ہے کہ کھلا جاتا ہے
مسکراتے ہیں گل و غنچہ ہے رونق پہ چمن

فرطِ جذبات سے لبریز ہیں یوں گنگ و جمن
جیسے پیمانہ بکف رند چلا جاتا ہے
لڑکھڑاتا ہے، سنبھلتا ہے، گرا جاتا ہے
رشکِ فردوس نظر آتے ہیں سب کوہ و دمن

نغمہ پیرا ہیں طیور آج باندازِ حسن
ایسے میں آتشِ تفریق بجھائیں مل کر
عظمتِ قوم و وطن اور بڑھائیں مل کر
دل میں ہو جذبۂ بیداری و تعمیرِ وطن

یومِ جمہور، یہ انداز سکھاتا ہے ہمیں
سال کا بھولا سبق یاد دلاتا ہے ہمیں

ڈاکٹر ذکی کاکوروی
شاہ گنج نخاس۔ لکھنؤ

غزل

دل میں طوفاں بپا سا لگتا ہے
جب کوئی آشنا سا لگتا ہے
پھر کوئی پیکِ آرزو آیا
زخمِ دل کا ہرا سا لگتا ہے
وہ خفا ہوگئے تو ہائے نصیب
سارا عالم خفا سا لگتا ہے
آج انسان پہلے انساں سے
دیکھنے میں بھلا سا لگتا ہے
لمحہ لمحہ بدلتے رنگوں میں
فرد اک دوسرا سا لگتا ہے
تم نے جو کچھ کہا ابھی مجھ سے
یہ مرا مدعا سا لگتا ہے
خون ہے یا یہ زندگی کا عرق
قطرہ قطرہ خدا سا لگتا ہے
کوئی جدت نہیں فسانوں میں
ہر فسانہ سنا سا لگتا ہے
ہم نے چھیڑا تو کھل گیا آخر
یوں بڑا پارسا سا لگتا ہے
اُف زمانے تری یہ نیرنگی
ہر نظر میں نیا سا لگتا ہے
دل کے شیشے میں مدتوں سے ذکیؔ
کوئی چہرہ چھپا سا لگتا ہے

یوم جمہوریہ کا تیسواں سال

پریشانیوں اور کامیابیوں کی داستان

سال گذشتہ پورے ملک کے ساتھ ساتھ اتر پردیش کے لیے
ن ایک بحرانی سال رہا ہے۔ ریاست کو اس صدی کی سب سے
ی اور سنگین خشک سالی سے دوچار ہونا پڑا جس سے خریف
فصل کو دس ارب روپے سے زائد کا نقصان پہنچا۔ بروقت
رش نہ ہوسنے کے باعث ربیع کی بھی مناسب طور سے بوائی
مکن نہ ہوسکی۔ خشک سالی کا سب سے زیادہ اثر بے زمین
رعی مزدوروں، چھوٹے اور مارجنل کسانوں نیز کمزور طبقوں پر
ڑا۔ بارش کے فقدان سے بجلی کی پیداوار کو بھی نقصان پہنچا۔
لیکن اتر پردیش نے قدرت کے اس بڑے چیلنج کا بہت مستعدی
سے مقابلہ کیا۔ ریاستی حکومت نے ریاست کو درپیش بحران کا
سامنا کرنے کے لیے معاشی پروگراموں کی رفتار تیز تر کر دی اور
رقی کے راستے میں حائل تمام دشواریوں پر قابو پانے کی کامیاب
وشش کی۔ خشک سالی سے متاثرہ علاقوں میں زور شور سے
امدادی کام شروع کیے گئے۔ بڑے پیمانے پر "کام کے عوض
اناج اسکیم" نافذ کی گئی۔ "انتیودیہ پروگرام" کے تحت قطار
میں کھڑے سب سے آخری شخص کو مالی امداد فراہم کی گئی اور
ایسے افراد کو خود اپنا روزگار شروع کرنے کے مواقع فراہم کیے
گئے۔ اس اقدام کا مقصد غریب سے غریب لوگوں کی ترقی پر
پوری توجہ دینا تھا۔ زرعی میدان میں بھی کئی ریکارڈ قائم کیے
گئے۔ دیہی صنعتوں کی حوصلہ افزائی کرنے کے لیے بھی مسلسل
کوششیں کی گئیں۔ قیمتوں پر قابو حاصل کیا گیا۔ ضروری
اشیائے صرف کی دستیابی کا یقینی بندوبست کیا گیا۔ ہریجنوں کے
مکمل تحفظ کے ساتھ ساتھ فلاحی پروگراموں کو ایک نئی جہت
دی گئی۔

ریاستی حکومت نے زیر نظر سال میں خشک سالی سے نپٹنے
کے لیے سبھی نہروں اور ٹیوب ویلوں کو چلانے کا حکم دیا۔ دستیاب
آبپاشی وسائل کو پوری صلاحیت سے چلانے کی کوشش کی گئی۔
کسانوں کو اولیت کی بنیاد پر زیادہ سے زیادہ بجلی اور ڈیزل
آئل دینے کا بندوبست کیا گیا تاکہ وہ اپنے ٹیوب ویل پمپنگ
سیٹ چلا سکیں۔ اس کے نتیجہ میں خریف کی فصلیں کافی حد تک
بچ گئیں اور ربیع کے پلیوا کے لیے پانی مل سکا۔

اتر پردیش کے کل ۱۷۲ لاکھ ہیکٹیر مزروعہ رقبہ اور ۵۸
لاکھ ہیکٹیر دو فصلی رقبہ میں ۲۰۰ فیصد کے بقدر بھرپور آبپاشی
سہولتیں فراہم کرنے کی غرض سے بڑے اور درمیانہ ۱۵ آبپاشی
پراجکٹوں پر اس سال خصوصی کام شروع کیا گیا۔ اسے زیادہ
اسکیموں پر پہلے کبھی بھی کام نہیں کیا گیا تھا۔

حکومت نے زراعت کے میدان میں جو امداد فراہم کی ہے
اسکی بنیاد پر اس کا اندازہ لگایا جارہا ہے کہ اب ربیع کی فصلوں کا
رقبہ کاشت مجموعی طور سے ۱۰۰ لاکھ ہیکٹیر تک پہنچ جائے گا۔

کاشتکاروں کو ان کی پیداوار کی مناسب قیمت دلانے اور
ایک باقاعدہ مارکٹنگ کا طریقہ نافذ کرنے کے لیے منڈی سمیتوں
کے ذریعہ اب تک ۳۸ نئی خاص منڈیوں اور ایک ذیلی منڈی کی
تعمیر مکمل ہو چکی ہے۔ علاوہ ازیں ۷۴ نئی منڈیوں اور ۷ دیہی منڈیوں
کی تعمیر بھی جاری ہے۔

دیہی ترقی پروگرام کا خاص مقصد دیہی عوام کا معیار زندگی بلند کرتے ہوئے انھیں سماجی، ثقافتی اور معاشی ترقی سے ہمکنا کرنا ہے۔ دیہی سماج کے غریب ترین طبقہ کی فلاح کی غرض سے انتیودیہ پروگرام شروع کیا گیا ہے۔ سال ۸۰-۱۹۷۹ء میں انتیودیہ پروگرام کے تحت گذشتہ نومبر تک مستفید ہونے والے خاندانوں کی تعداد ۱۰۲۳۶۳ تھی اور انھیں قرض کے طور پر ۲۲ کروڑ روپیہ دیا جا چکا ہے۔

امداد باہمی کے توسط سے عوامی نظام تقسیم کی حوصلہ افزائی کرنے اور عوام کو مناسب قیمت پر ضروری اشیائے صرف فراہم کرنے کی غرض سے ریاست کی امداد باہمی کمیٹیوں میں اب تک ۷،۱۰۵ تقسیم مراکز قائم کیے جا چکے ہیں۔

صارفین کو مناسب قیمتوں پر ضروری اشیا فراہم کرنے کی غرض سے یکم جولائی ۱۹۷۹ء سے پیداوار اور تقسیم اسکیم شروع کی گئی ہے۔ اس اسکیم کے تحت ہر ۲۰۰۰ آبادی کے لیے ایک خردہ فروخت مرکز کھولا جائے گا۔ اتر پردیش میں اس قسم کی دکانوں کی تعداد ۲۳۰۰۰ سے بڑھ کر تقریباً ۵۰۰۰۰ ہو جانے کی توقع ہے۔

صنعتی ترقی کے سلسلہ میں حکومت کی یہ پالیسی رہی ہے کہ بڑی صنعتوں کی ترقی کے ساتھ ساتھ چھوٹی اور گھریلو صنعتوں کی ترقی اور روایتی دیہی صنعتوں پر زیادہ زور دیا جائے۔

ریاستی پولس کے لیے پچھلا سال انتہائی ذمہ داریوں، پیچیدگیوں اور چیلنجوں کا سال رہا۔ سال کے شروع ہوتے ہی مختلف صنعتی اداروں، مختلف سروسیز کے ملازمین اور طلبا نے اپنے مطالبات کو لے کر تحریکیں اور ہڑتالیں کیں۔ ریزرویشن مخالف طلبا، محکمۂ بجلی کے ملازمین اور بعض اہم اضلاع میں ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات کے دوران پولس کو بہت زیادہ مستعد اور چاق و چوبند رہنا پڑا۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ اس نے بڑی کامیابی کے ساتھ یہ ذمہ داریاں پوری کیں جس کے نتیجہ میں ریاست میں امن و امان برقرار رہا۔ ہڑتالوں اور مختلف تحریکوں میں مشغول رہنے کے باوجود وہ مجرموں اور گنڈوں کے خلاف مسلسل ٹھوس کارروائی کرتی رہی۔ جس سے جرائم کی صورت حال پر قابو پانے کے سلسلہ میں امید افزا کامیابی حاصل ہوئی۔

گذشتہ سال کئی ریاستوں میں پولس ملازمین نے تحریکیں چلا لیکن اتر پردیش میں اس کا قطعی کوئی اثر نہیں ہوا۔ ریاست پولس نظم و ضبط کی پابند رہ کر اپنا فرض پورا کرتی رہی۔

علاج و صحت خدمات کی توسیع کے لیے حکومت نے ۱۸ ایلوپیتھک اور ۲۶۰۰ ہومیوپیتھک اسپتالوں اور ڈسپنسریوں قیا کے علاوہ علاج کے ہندستانی طریقوں کو فروغ دینے پر خصوص توجہ دی۔ اس مدت میں آیورویدک اور یونانی اسپتالوں ا ڈسپنسریوں کی تعداد ۹۲۱ سے بڑھا کر ۱۱۵۲ کر دی گئی او ان میں بستروں کی تعداد ۳۱۸۲ سے بڑھا کر ۳۵۹۴ کر دی گئی۔

طلبا کی ہمہ گیر ترقی کے لیے معلومات بخش تعلیم کے سا ساتھ عملی، جسمانی و اخلاقی تعلیم کی بھی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ اسی غرض سے ریاستی حکومت نے اخلاقی تعلیم اور ورزش کو موجود تعلیمی سال سے درجہ اول سے درجہ ۱۲ تک نصاب کا لازمی جز قرار دیا ہے۔ ریاست میں ناخواندگی دور کرنے کے لیے خواندگ مہم کا بھی آغاز کیا گیا ہے۔

سال ۱۹۷۹ء "بین الاقوامی سال اطفال" کے طور پر منایا گیا اس موقع پر محکمہ سماجی بہبود نے بے سہارا اور نظر انداز بچوں کی فلاح، رہائش، تعلیم اور آبادکاری کے لیے ریاست میں چا نئے رشتشو سدن، ایک بالیکا نکیتن، لڑکیوں کے لیے آشر طرز کا اسکول اور ایک سدن قائم کیا۔ مجرمانہ رجحان وال بچوں کی فلاح کے لیے ریاست میں دو مزید منظور شدہ اسکو اور بچوں کی ۲۲ اطفال عدالتیں قائم کی گئیں۔ چھ سال تک کی عمر کے دیہی علاقوں کے بچوں، شہری گندی بستیوں کے بچوں اور قبائل مندرجہ فہرست علاقہ کے بچوں کی ہمہ گیر ترقی کی بنیادی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے ریاست کے متعدد مقاما مربوط اطفال ترقیاتی پراجکٹ قائم کیے گئے۔

★

اخلاق الرحمٰن قدوائی (گورنر۔ بہار)

نیا دور کا اطفال نمبر موصول ہوا۔ شکریہ۔ اس سادہ و پُرکار خصوصی شمارہ کو دیکھ کر مسرت ہوئی۔ بچوں کی پرورش و پرداخت سے متعلق مضامین مفید اور معلوماتی ہیں۔ بین الاقوامی سالِ اطفال میں اس شمارہ کی اشاعت تعمیری قومی مقاصد کے حصول کے لیے لائق تحسین کوشش ہے۔ بچوں کی فلاح و بہبود ہمارے لیے ایک مستقل ذمہ داری ہے۔ اس لیے بین الاقوامی سال کے ختم ہوجانے کے باوجود اس سلسلہ میں ہمارے عزم و عمل کو قائم رہنا چاہیئے۔ امید ہے کہ ادارہ نیا دور اور محکمۂ تعلقاتِ عامہ اتر پردیش کی یہ تخلیقی کوشش خاص و عام میں مقبول ہوگی۔

پروفیسر سید حسن (پٹنہ)

نیا دور کا اطفال نمبر موصول ہوا۔ بڑا وقیع شمارہ ہے جسے آپنے خوب اچھے اچھے مضامین سے سجایا ہے۔ اس میں بزرگوں اور بچوں دونوں کی دلچسپی اور فائدے کا مواد جمع ہوگیا ہے۔ یقین ہے کہ یہ خاص شمارہ علمی و ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہوگا۔

حرمت الاکرام (مرزاپور، یوپی)

آداب و اخلاص، نئے سال کی مبارکباد قبول کیجیے۔ نیا دور کا اطفال نمبر نظر نواز ہوا۔ ممنون ہوں۔ کیا کہنا! بچوں کے شعری و نثری ادب کے اس قدر جامع مشتملات سے مزین صحائف شاذ ہی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اس کی تہذیب و ترتیب میں خاص تندہی برتی گئی ہے۔ نیز خصوصی مدیرانہ کاوش کا ثبوت دیا گیا ہے۔ اس کامیاب نمبر پر میری دلی مبارکباد قبول کیجیے۔

وقار خلیل (حیدرآباد)

"نیا دور" کا اطفال نمبر نظر نواز ہوا۔ تمام مشمولات اہم اور افادی نوعیت کے ہیں۔ بزرگ اہل قلم صباح الدین عمر، مرزا جعفر حسین، شور واحدی، حرمت الاکرام، انوار الحسن، پروفیسر نور الحسن ہاشمی اور عابد سہیل کی تحریروں نے اسے وقیع بنایا ہے۔ خدا کرے آپ ایسے کئی نمبر نکالتے رہیں۔

سید محمد آفاق (سیتاپور، یوپی)

"نیا دور" کا اطفال نمبر ملا۔ سب سے پہلے اداریہ "اپنی بات" پڑھا۔ انداز بیان میں خلوص نظر آتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اطفال کی بہبود پر آپ نے غور و خوض کیا ہے۔ اسی لیے اس میں تفکر کی جھلک نظر آتی ہے۔ واقعی اس سلسلے میں جتنے زاویے ہوسکتے تھے۔ سب کو ملحوظ رکھتے ہوئے آپ نے سب پر روشنی ڈالی ہے۔ آپ کو مطلوبہ مضامین حاصل کرنے کے لیے مناسب حضرات سے رابطہ قائم کرنے میں کتنی زحمت پیش آئی ہوگی۔ اب جبکہ ہر حیثیت سے اس رسالہ نے دستاویزی شکل اختیار کر لی ہے، آپ کو کتنی مسرت حاصل ہوئی ہوگی۔ دیگر رسائل نے بھی اطفال نمبر نکالے ہیں۔ اس میں وہ بھی شامل ہیں جنھیں آپ سے زیادہ سہولتیں حاصل ہیں۔ مگر آپ کو فوقیت حاصل ہے۔ یہ آپ کی لگن، تنظیمی صلاحیت اور خلوص کا اثر ہے۔ یہ خط آپ کو بطور مبارکباد لکھ رہا ہوں۔

عرفان عباسی (لکھنؤ)

نیا دور کا "اطفال نمبر" اپنی تمام تر خوبیوں اور خصوصیات کے ساتھ باصرہ نواز ہوا۔ اتنا خوبصورت، تعمیری، جامع اور دلچسپ نمبر نکالنے کے لیے دلی مبارکباد قبول فرمائیں۔

اختر حسین (احمدآباد)

نیا دور کا اطفال نمبر یکم جنوری ۱۹۸۰ء کو ملا۔ ۱۲۰ صفحات پر مشتمل یہ خصوصی نمبر اپنی نوعیت کا واحد نمبر ہے۔ سب سے پہلے میری جانب سے اور میرے گھر کے تمام افراد کی جانب سے آپ کو اور نیا دور کے تمام اراکین کو دلی مبارکباد۔ عمدہ کاغذ پر عمدہ چھپائی کے ساتھ آپ نے اس خصوصی نمبر کو پیش کیا ہے لیکن جو بات قابل صد ستائش ہے وہ یہ ہے کہ اس خصوصی نمبر کی قیمت آپ نے صرف ایک روپیہ رکھی ہے۔ لہٰذا اردو کا غریب سے غریب قاری بھی اس نمبر کو خرید سکتا ہے۔

حبیب اختر قریشی (ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ)

نیا دور کے عام شماروں کو بھی علمی اور ادبی حلقے میں قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے اور اچھے لکھنے والوں کا تعاون ہمیشہ سے نیا دور کو حاصل رہا ہے۔ پیش نظر خصوصی شمارہ اطفال نمبر نمایاں تبدیلیوں اور خصوصیتوں کا حامل ہے جو اس سے پہلے دیکھنے کو نہ ملیں۔ غالباً آپ کی خوشگوار جدتوں نے اس خاص نمبر میں ایک نئی جان ڈال دی ہے۔ مضامین و موضوعات کی رنگا رنگی اور متعلقہ نمبر کے سلسلے میں تقریباً سبھی پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہوئے نیا دور کا جو اطفال نمبر ہمارے سامنے ہے وہ بڑی اہمیتوں کا مالک بن گیا ہے۔ جہاں تک میری معلومات اور مطالعہ کا تعلق ہے مجھے یہ بات کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ نیا دور کا اطفال نمبر مذکورہ خصوصیتوں کی بدولت ممتاز و منفرد ہے ایک سرسری نظر ڈالنے سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس کے لیے آپ نے کتنی محنت کوشش اور جد و جہد کی ہے۔ اتنا کامیاب نمبر نکالنے پر آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

نثار چنگیزی (گورکھپور)

نیا دور کا اطفال نمبر باصرہ نواز ہوا۔ دیر آید درست آید کے مصداق یہ نمبر دیر میں نکلا لیکن بہت خوب نکلا۔ آپ کی حسن ترتیب اور مزید برآں اچھے لکھنے والوں کے تعاون نے رسالہ کے "اطفال نمبر" کو چمکا دیا ہے۔ ایسا نمبر تو بچوں کے خصوصی ماہناموں میں بھی نہیں نکلا۔ نیا دور کے عام نمبر بھی خوب ہوتے ہیں، لیکن اس خاص نمبر کے لیے آپ یقیناً مبارک باد کے مستحق ہیں۔

ایم۔ اے۔ شفق (مرزا پور)

ماہنامہ نیا دور کا اطفال نمبر موصول ہوا نمبر کو ہاتھ میں لیتے ہی طبیعت خوش ہو گئی۔ آپ نے وقت کی ضرورت کے پیش نظر بہت ہی اہم نمبر پیش کیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے اس کی افادیت کا احساس اور بڑھ جاتا ہے۔ آپ نے بہت ہی محنت اور لگن کے ساتھ اس نمبر کو ترتیب دیا ہے اس کے مضامین نظمیں کہانیاں اور ڈرامہ وغیرہ اپنی اپنی جگہ بہت خوب ہیں خاص طور سے بچوں کی تعلیم و تربیت ان کی پرورش دیکھ بھال اور علاج پر جو مضامین ہیں وہ والدین کے لیے بہت ہی مفید ثابت ہوں گے۔ حکومت اتر پردیش بچوں کی صحت تعلیم اور علاج کے لیے جو کام کر رہی ہے وہ قابل ستائش ہے۔

ڈاکٹر سلمان عباسی (لکھنؤ)

نیا دور کا "اطفال نمبر" کامیاب اور وقیع ثابت ہوا شکم مبارک باد قبول کریں۔ بچوں کی ذہنی نشو و نما اور تربیت کے لیے اس قسم کے اقدامات بڑے بیش قیمت ہیں۔

سید زین العابدین (رانچی۔ بہار)

اس میں کوئی شک نہیں کہ نیا دور کے حسن میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ آپ نے نیا دور کا اطفال نمبر نکال کے ایک بیش؟ کیا اس کے علاوہ اور بھی نمبر نکالیے مثلاً لوکلچر نمبر وغیرہ۔ اس سے اور بیش بہا اضافہ ہوگا۔

محمد نجیب انصاری (کانپور)

بڑا خوبصورت اطفال نمبر نکالا ہے آپ نے جی خوش ہو گیا۔ رنگا رنگ نمبر نکالنا صرف آپ ہی کا حصہ تھا۔ سب کچھ تو ہے اس میں نہیں ہے۔ نظمیں، کہانی، ڈرامہ بچوں کا ادب، بچوں کی فلاح و بہبود بچوں کی صحت، بچوں کی نگہداشت، تعلیم و تربیت، بچوں کے ادب اور شاعر وغیرہ وغیرہ۔ بہرحال اتنے خوبصورت نمبر کے لیے میری مبارکباد قبول فرمایئے۔

نسیم شاہجہانپوری (شاہجہانپور)

نیا دور کا "اطفال نمبر" نظر نواز ہوا شکریہ آپ کا مذکورہ نمبر کے ادب میں ایک خاص اضافہ ہے۔ اس میں شامل سبھی مضامین اور نظمیں بڑی معیاری اور جاندار ہیں۔ آپ نے ملک کے نامور ادیبوں اور شاعروں سے رابطہ قائم کر کے جو تخلیقات فراہم کی ہیں وہ آپ کی فنکارانہ صلاحیت اعلیٰ صحافتی کردار کی واضح مثال ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اطفال نمبر ادبی حلقوں اور صاحب اولاد حضرات کی نظروں میں عزت اور مقبولیت

محمد اظہر حیات (ناگپور)

نیا دور کا اس قدر خوبصورت انداز سے خاص نمبر نکالنے پر ہماری سے مبارکباد۔ واقعی آپ نے سال اطفال میں سب سے بہترین تحفہ قارئین کو کیا ہے اور حق ادا کر دیا ہے۔ کاش کہ ملک کے دوسرے بڑے بڑے جریدے بھی اس طرف توجہ کرتے۔ مگر شاید یہ سعادت آپ کے ہی حصہ میں آنا تھی۔ یہ دیکھ کر محسوس ہوا کہ حقیقت میں آپ نے اس میں خاص دلچسپی لی ہے۔

قیام الدین احمد قاصد (جہانپوری، راجستھان)

اتنے خوبصورت اور بے مثل اطفال نمبر کی اشاعت کے لیے ادارہ نیا دور مبارک باد اور شکریہ کا مستحق ہے۔ اس نمبر کا ہر مضمون اور ہر نظم خیال انگیز اور متاثر کن ہے۔ خاص طور پر حرمت الاکرام، حیات وارثی اور اقبال ماہر صاحب کی نظمیں بے حد متاثر کرتی ہیں۔ بچوں کے ادیبوں سے متعلق مضامین نے اس نمبر کی زینت دوبالا کر دی ہے۔ یہ نمبر دالدین پر ایک احسان کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک بار پھر مبارکباد قبول فرمایئے۔

امجد علی خاں (لکھنؤ)

نیا دور کا اطفال نمبر نظر سے گزرا۔ یہ نمبر ہر اعتبار سے قابل قدر اور قابل ستائش ہے۔ جس کے لیے آپ مبارک باد کے مستحق ہیں۔

اردو ادب میں اطفال کے لیے بہت ہی کم لکھا گیا ہے۔ اردو میں بچوں کے ادب کا فقدان ہے۔ یقیناً نیا دور کا یہ نمبر بچوں کے ادب کے لیے ایک مشعل راہ ثابت ہوگا۔

میر علی احمد دانش (لکھنؤ)

سال نو کی مبارکباد قبول فرمایئے۔ نیا دور کا "اطفال نمبر" دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی۔ باعتبار نثر و نظم اور باعتبار ترتیب یہ خصوصی شمارہ بڑی اہمیت کا حامل ہے —— خاص طور سے مدیر صاحبان نے "نونہالان چمن" کی تصاویر کے شمول سے چار چاند لگا دیے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ چیدہ چیدہ مضامین کا حاصل کرنا جن سے بچوں کی نفسیات کے مختلف گوشوں پر روشنی پڑتی ہو، آپ ہی کی تلاش کا نتیجہ ہیں۔ امید ہے کہ اسی طرح آئندہ بھی آپ خصوصی توجہ سے اس وقیع رسالے کو سنوارنے و نکھارنے کی کوششیں جاری رکھیں گے۔

شاہینہ پروین (میرٹھ)

نیا دور کا "اطفال نمبر" موصول ہوا۔ دلکش اور معیاری مضامین و کہانیاں اور نظموں کا حسین امتزاج بہت پسند آیا۔ رسالہ کی فضا اور نظم و نثر کی خوشگوار ترتیب قابل ستائش ہے۔ یہ نمبر جس سلیقہ اور کاوش سے ترتیب دیا گیا ہے اس سے آپ کی بلند نظری کا پتہ چلتا ہے۔

میری طرف سے مبارک باد قبول فرمائیں۔

شاہنواز احمد (امروہہ)

نیا دور کا اطفال نمبر دیکھا۔ بڑی مسرت ہوئی۔ ہر مضمون اور نظم قابل تعریف ہے۔ خاص طور سے ڈاکٹر نیر مسعود صاحب کا "ڈرامہ اقتباط مشرط ہے" کافی پسند آیا۔ ویسے نثر اور نظم دونوں میں آپ حضرات کا انتخاب قابل تعریف ہے۔

(باقی آئندہ شمارہ میں)

★

بیدل کا مولد و نسب

—— مٹ کا بقیہ

بیدل کی زندگی میں شاہی ملازمت ترک کرنے کا واقعہ بھی اہم ہے اس سے ان کی سیرت پر روشنی پڑتی ہے، اس واقعہ کا سبب جو مراۃ الواردات میں تحریر ہوا ہے وہ سارے دوسرے تذکرہ نویسوں کے بیانات سے مختلف ہے، میر غلام علی آزاد بلگرامی کے خزانۂ عامرہ کے مطابق بیدل نے ترک ملازمت اس لیے کی کہ شاہزادے نے ان سے اپنی مدح میں قصیدہ لکھنے کی فرمائش کی تھی جسے انھوں نے قبول نہیں کیا اور یہ واقعہ عظیم آباد میں پیش آیا ہوا، لیکن وارد کا قول ہے کہ بادشاہ نے ان کے اشعار سن کر از راہ تفنن فرمایا کہ فوج میں جہاں جوانان پر دل ہیں بیدل کا کیا کام، بیدل کو جب بادشاہ کے قول کی خبر ملی تو وہ ترک ملازمت کرکے دہلی سے نکل گئے۔

خلاصہ یہ کہ مراۃ الواردات کے بیانات سے بیدل کی جائے ولادت متعین ہو جاتی ہے اور ان کے نسب کا معاملہ بھی واضح ہو جاتا ہے۔

★

نقد و تبصرہ

تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا لازمی ہیں۔

نام کتاب: قائد بدر و اُحد

مصنف: مولانا ڈاکٹر مصطفٰے حسن صاحب علوی،

صفحات: ۳۴۸۔ قیمت: پندرہ روپے

پتہ: قرآنستان، ۶۰ مولوی گنج، لکھنؤ

سیرت نبوی پر اردو میں بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں مگر ان میں سے چند ہی بلند پایہ علمی و تحقیقی حیثیت رکھتی ہیں۔ ماضی قریب میں ڈاکٹر حمید اللہ نے رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی، اور جنرل اکبر خاں نے 'حدیث دفاع' کے نام سے اردو میں ایسی سیرتیں لکھی ہیں جن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغمبرانہ مقام کے علاوہ ان کی سیاسی و دنیوی فہم و بصیرت، اور قائدانہ و مدبرانہ اہتمام کا بھی پتہ چلتا ہے

مقام مسرت ہے کہ جناب مولانا ڈاکٹر مصطفٰے حسن صاحب علوی ایم اے پی۔ ایچ۔ ڈی (سابق صدر شعبہ عربی لکھنؤ یونیورسٹی) نے اپنی پیرانہ سالی میں اس ولولہ انگیز اور جرأت آموز موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور سیرت نبوی پر نئے اور اچھوتے انداز سے روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے، کتاب اپنے مواد اور طرز و اسلوب معنی آفرینی اور نکتہ سنجی کے اعتبار سے انتہائی قابل قدر اور لائق مطالعہ ہے مولانا مدظلہٗ حضرت محسن کاکوروی کے خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے انکی تحریر میں بھی تقریر کا رنگ جھلکتا ہے اور اردو کا شیریں لہجہ مزہ دے جاتا ہے

—— شمس تبریز خاں

نام کتاب: گل داؤدی

مترجمہ: ایم۔ ایل۔ وشنوی   ناشر: نیشنل بوٹینکل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

صفحات: ۱۱۶،   ملنے کا پتہ: نیشنل بوٹینکل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱

اردو میں شعری مجموعوں، ناولوں، افسانوں اور حکایتوں وغیرہ پر بہت زور دیا جاتا رہا ہے۔ نتیجتاً اردو میں سائنسی ادب کا فقدان ہے۔ اردو میڈیم اسکول اور کالج کھولنے کے لیے آئے دن مانگ کی جاتی ہے مگر اردو زبان میں مختلف مضامین کی کتابیں شائع کرنے کی سعی نہیں کی جارہی ہے۔ جب کبھی سائنس کے متعلق کوئی کتاب اردو زبان میں شائع ہو جاتی ہے تو پڑھنے والوں کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ زیر نظر کتاب ایک مشہور اور جاذب نظر پھول کے متعلق ہے جس کو ہمارے ملک میں گل داؤدی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ کتاب کے مصنف ایم۔ اے کھیر ہیں جنھوں نے اسے انگریزی میں لکھا ہے۔ مسٹر ایم۔ ایل۔ وشنوی نے اس کا ترجمہ اردو زبان میں کیا ہے اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ روزمرہ استعمال ہونے والے الفاظ کا استعمال مترجم نے بڑی خوبی سے کیا ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ دقیق اور غیر مانوس الفاظ سے گریز کیا جائے۔ اس کتاب میں گل داؤدی کی تاریخ بھی پیش کی گئی ہے اور اس کے اگانے کے طریقے بھی بتائے گئے ہیں اقسام پر بھی تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے اور روزمرہ کی زندگی میں اس کے فوائد بھی بتائے گئے ہیں۔ اردو میں نیشنل بوٹینکل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے یہ پہلی کتاب شائع کی ہے۔ ادارہ کی جانب سے جو کام ہو رہے ہیں ان سے ملک کے ان لوگوں کو بھی باخبر رکھنا چاہیے جن کی زبان اردو ہے اور جن کی تعداد تقریباً ۱۱ کروڑ ہے۔

یہ کتاب بلاشبہ اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کی لائبریریوں اور پبلک لائبریریوں میں محفوظ رکھنے کے قابل ہے تاکہ طلبا اس سے مستفید ہو سکیں انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر موصوف سے گذارش ہے کہ وہ یہ سلسلہ جاری رکھیں تاکہ اردو والے بھی اس انسٹی ٹیوٹ کی سرگرمیوں سے باخبر رہنے کے ساتھ ہی ان سے مستفید بھی ہو سکیں۔ —— سید زائر حسین کاظمی

نام کتاب: تلسی داس اور رام چرت مانس   مصنف: ڈاکٹر صفدر آہ۔ صفحات ۲۸۰، قیمت ۱۰ روپے، ناشر: مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر۔ نیتاجی سبھاش روڈ، بمبئی ۴۰۰۰۰۲۔

تلسی داس بھگتی کال اور اودھی کے ممتاز صوفی شاعر تھے۔ ان کی راماین یا رام چرت مانس ایک عہد آفریں اور تاریخ ساز کتابوں میں سے ہے جس نے اپنے وقت سے لیکر اب تک ہندستانی عوام کے بڑے طبقے کو متاثر کیا ہے۔ عالمی ادبیات میں اس کا ذکر شاہنامہ، الیڈ، اور ڈوانٹے کا میڈی جیسی کلاسیکی کتابوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس کی اسی اہمیت کے پیش نظر اردو میں اس کے کئی ایک ترجمے کیے گئے، مگر ضرورت تھی کہ تلسی داس اور ان کی راماین کا تاریخی و تنقیدی اور تحقیقی جائزہ بھی لیا جاتا۔ مقام مسرت ہے کہ اردو کے ممتاز محقق و ناقد ڈاکٹر صفدر آہ صاحب نے اس فرض کو انجام دیا اور اس سے بحسن و خوبی عہدہ برآ ہوئے۔ انھوں نے یہ کتاب

جس محنت و لیاقت اور بصیرت سے لکھی ہے اس کے سبب یہ ادب اردو میں تو ایک گراں قدر اضافہ ہے ہی اس کے ساتھ ہی ہندی والوں پر بھی ایک احسان کی حیثیت رکھتی ہے۔

انھوں نے تلسی داس کی زندگی پر موجود مواد سے کام لے کر اسے تحقیق کی روشنی میں لانے کی امکانی کوشش کی ہے، اس کے ساتھ ہی رامائن، اور ان کی دوسری تصانیف پر مدلل اور مفصل تبصرہ کیا ہے، خاص طور پر رامائن کے پلاٹ، اس کے کرداروں اس کے فن اور ادبی و لسانی قدر و قیمت کے تعین کے ساتھ ملک محمد جائسی اور سور داس اور دو ایک سے ان کا موازنہ بھی پیش کیا ہے، ان تمام خصوصیات نے کتاب کو بہت مستند و معتبر بنا دیا ہے۔

نام کتاب **رام چرت مانس** (اردو ترجمہ): وشنو پرکاش اور رندر رحانی۔ صفحات: ۶۸ مفت تقسیم کے لیے۔ پتہ: وشنو پرکاش ۲۔ شرم نکنج، سرو ودے نگر، کانپور۔

یہ رامائن کے باب پنجم "سندر کانڈ" کا سلیس و شگفتہ اردو ترجمہ ہے جسے دو مترجموں نے مل کر کیا ہے۔ رامائن کے متن کے ساتھ نیچے اس کا اردو ترجمہ درج ہے۔ ترجمے کی زبان آسان اور ہندی آمیز ہے مگر مفہوم اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے۔ مترجم کے شوق کو دیکھتے ہوئے یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ وہ رامائن کا مکمل ترجمہ کر ڈالتے تو اردو والوں کے مزید شکریے کے مستحق ٹھہرتے۔

نام کتاب **شمع فروزاں** شاعر: عروج زیدی - صفحات: ۱۲۸ قیمت: ۵ روپے۔ پتہ: مکتبۂ حجاب رام پور، یو پی۔

عروج زیدی صاحب ایک کہنہ مشق، خوش فکر اور خوش گو شاعر ہیں اور شائستہ غزل گوئی کے لیے امتیاز رکھتے ہیں، یہ ان کے قطعات کا مجموعہ ہے جس کی داد مولانا امتیاز علی خاں عرشی، ماہر القادری اور گوپال متل جیسے اہل علم و اہل قلم نے دی ہے، قطعات میں تغزل کی کیفیت اور شعریت موجود ہے اور اس کے ساتھ ہر قطعہ ایک موضوع سے متعلق ہے اور افادیت کا حامل ہے، ایک حساس شاعر جب اپنے گرد و پیش کے پھیلے ہوئے فاسد معاشرے پر تنقیدی نظر ڈالتا ہے تو اسے بڑے تلخ حقائق کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ عروج صاحب کی خوبی یہ ہے کہ اس تلخی کو شعری مٹھاس دینے کی انھوں نے کامیاب کوشش کی ہے، جس سے ان کے قارئین کافی محظوظ ہوں گے۔ (شمشیر تبریز خاں)

نام کتاب: **ریاض عقیدت** مرتب: رئیس نعمانی
شائع کردہ: علمستان۔ اصطبل چار باغ لکھنؤ
صفحات: پچاس قیمت: ۳ روپے پچاس پیسے۔

ماہنامہ گیلری کے ربیع الاول نمبر کے مرتب رئیس نعمانی نے ابتدا میں نعتیہ ادب کی توسیع و ترقی کے بارے میں ایک مختصر مضمون شرح نشاط کے باوصف لکھا ہے۔ جن لوگوں کی تخلیق شامل ہیں ان میں حالی، علامہ اقبال، اقبال سہیل، ماہر القادری، جگر مراد آبادی، ڈاکٹر انور الحسن، جمیل مظہری، حفیظ جالندھری، اثر زبیری اور روش صدیقی وغیرہ قابل ذکر شعرا بھی ہیں۔ اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں نعت سے متصل کئی اصناف پر کلام موجود ہے۔ مدح نگاری اور منقبت نگاری کے کچھ ایسے نمونے بھی دیکھنے کو ملتے ہیں جو ادب کے نشو و نما میں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کہیں کہیں سے چند اشعار یوں ہیں۔

سید الابرار پر جیسے رسالت ہی تمام — حیدر کرار پر جیسے خلافت ہی تمام
کیوں نہ خوں اس غم میں ٹپکے دیدۂ نمناک سے — صفحۂ قرآں پہ گل کاری ہو خون پاک سے
آئینہ دار معیت اذ ھما فی الغار ہے — شان فاروقی اشداء علی الکفار ہے
اہل ایماں کو ہوا و ہاس کی امامت کیا کام — خود امام دو جہاں جس کو بنا جائیں امام

یہ مختصر سی کتاب معیار تلاش و تحقیق کے اعتبار سے ایک نمایندہ کوشش ہے۔

نام کتاب: **نوائے سحر** شاعر: ڈاکٹر سحر اعظمی صفحات: ۱۴۴
قیمت: پانچ روپے ملنے کا پتہ: سحر کلینک۔ پلیتھرا روڈ۔ ضلع بلیا

ڈاکٹر سحر اعظمی صاحب عصری ہندوستان کی اس صف کے شاعر ہیں جو اردو غزل کی ٹھوس روایات پر ایمان رکھتی ہے۔ احتشام حسین مرحوم کے پیش لفظ سے بھی ظاہر ہے کہ سحر صاحب ایک آئیڈیل شاعر ہیں۔ اردو اکاڈمی اتر پردیش کے تعاون سے چھپی ہوئی یہ کتاب مطالعہ خانوں میں محض شمار و ظہور کے لیے نہیں بلکہ واقعی مطالعے کی اہمیت رکھتی ہے، رنگ کلام کے لیے ان کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

ہزار طرح کی پابندیاں ہوں پھر بھی سحر — نسیم نشکر کو مجبوری خرام نہیں

تسنیم فاروقی

★

۲۸ آبِ بقا (ص ۱۰۵) میں مہر کا تاریخی نام خورشید علی بتایا گیا ہے۔ جو حسابِ جمل کے رو سے بہ تفصیل ذیل ۱۲۳۰ھ کے مساوی ہے:

غ ر و ش ی د ع ل ی = خورشید علی

۶۰۰ + ۲۰۰ + ۶ + ۳۰۰ + ۱۰ + ۴ + ۷۰ + ۳۰ + ۱۰ = ۱۲۳۰ھ (کاظم علی خاں)

۲۹ بزمِ غالب (ص ۳۶۵) میں مرزا فیض علی کا سنہ وفات ۱۲۴۳ھ بتایا گیا ہے۔

۳۰ آبِ بقا (ص ۱۰۹) بتاتا ہے کہ مہر نے ناسخ سے شاید دس برس اصلاح لی تھی کہ ناسخ کا انتقال ہو گیا۔ اگر یہ بیان درست مانا جائے تو مہر نے ناسخ لکھنوی کے انتقال [۲۴ جمادی الاول ۱۲۵۴ھ (از روئے تقویم مطابق چہار شنبہ ۱۵ اگست ۱۸۳۸ء)] سے دس برس قبل یعنی ۱۸۲۸ء (مطابق ۱۲۴۳ھ) کے آس پاس تقریباً ۱۳ سال کے سن میں شاعری شروع کی ہوگی۔ ناسخ کے حالات کا مطالعہ یہ بھی بتاتا ہے کہ ناسخ ناسازگار حالات کے باعث رجب یا شعبان ۱۲۴۳ھ (مطابق جنوری/فروری ۱۸۲۸ء) میں لکھنؤ سے نکل کر کافی مدت بعد اوائل رجب ۱۲۴۸ھ مطابق اواخر نومبر ۱۸۳۲ء میں لکھنؤ واپس ہوئے تھے۔ ان امور سے اندازہ ہوتا ہے کہ مہر شاید رجب ۱۲۴۳ھ مطابق جنوری/فروری ۱۸۲۸ء سے قبل ہی ناسخ کے شاگرد ہوئے ہوں گے۔ [بہ حوالہ ناسخ (تعارف و تجزیہ)، ڈاکٹر شبیہ الحسن نونہروی۔ اردو پبلشرز لکھنؤ۔ طبع فروری ۱۹۷۵ء ص ص ۸۰، ۹۰ نیز ص ۱۱۹]۔

۳۱ یہ قطعہ تاریخ مہر کی شادی کے ذکر کے ماتحت آگے ملاحظہ ہو۔

۳۲ اردوئے معلّیٰ: غالب۔ شائع کردہ رام نرائن لال پبلشرز، الٰہ آباد مطبوعہ نیشنل پریس، الٰہ آباد (سنہ اشاعت ندارد) کی فرہنگ (ص ۲۱) میں مہر کو غالب کا شاگرد اور دہلی کا رہنے والا بتایا گیا ہے جو غلط محض ہے ـــ [کاظم علی خاں]۔

۳۳ سراپا سخن، طبع اپریل ۱۸۷۵ء ص ۱۵۶۔

۳۴ گلستانِ بے خزاں، طبع جون ۱۸۷۵ء ص ۲۳۸۔

۳۵ سخنِ شعرا، طبع اکتوبر ۱۸۷۴ء ص ۴۸۰۔

۳۶ تذکرۂ طورِ کلیم، طبع ۱۲۹۰ھ ص ۱۰۲۔

۳۷ روزِ روشن: مولوی محمد مظفر حسین [صبا گوپاموی] مطبع شاہ جہانی، بھوپال طبع ۱۲۹۷ھ ص ۶۶۲۔

۳۸ تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا، مؤلفہ سعادت خاں ناصر، مرتبہ ڈاکٹر شمیم انہونوی، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ۔ طبع جولائی ۱۹۷۱ء ص ۳۵۳۔

۳۹ تذکرۂ نادر، ص ۱۵۳۔

۴۰ تذکرۂ جلوۂ خضر (جلد دوم): مؤلفہ سید فرزند احمد صفیر بلگرامی۔ مطبع نور الانوار، آرہ۔ طبع ۱۳۰۷ھ مطابق ۱۸۹۰ء ص ۔

۴۱ عودِ ہندی: مرزا غالب۔ مطبع مجتبائی، میرٹھ (طبع اول) مطبوعہ ۱۰ رجب ۱۲۸۵ھ [مطابق ۲۷ اکتوبر ۱۸۶۸ء] ص ۱۲۵ [مملوکہ کاظم علی خاں]

۴۲ شعاعِ مہر: مرزا حاتم علی مہر۔ مطبع حیدری، آگرہ۔ طبع دسمبر ۱۸۶۰ء [مطابق جمادی الاول ۱۲۷۷ھ] ص ۵۰، صفحات متنوی

۴۳ بہ حوالۂ گلستانِ بے خزاں، طبع جون ۱۸۷۵ء ص ۲۴۰۔

۴۴ تلامذۂ غالب : مالک رام۔ مرکزِ تصنیف و تالیف، نکودر طبع اوّل (سنہ اشاعت ندارد)

۴۵ نادراتِ غالب : آفاق حسین آفاق۔ مشہور پریس، کراچی۔ طبع ۱۹۴۹ء (حصۂ اوّل) ص ۱۰۵ تا ۱۰۹،

۴۶ دیکھیے : (۱) تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا، مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۷۱ء ص ۵۵۳۔

(۲) خمخانۂ جاوید (جلد سوم) : لالہ سری رام۔ دلّی پرنٹنگ ورکس دہلی۔ طبع ۱۹۱۷ء ص ۲۹۹۔

(۳) بزمِ آخر : مفتی محمد انتظام اللہ شہابی اکبر آبادی۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ (سنہ اشاعت ندارد) ص ۱۸۔

(۴) بزمِ غالب، ص ۳۶۷۔

۴۷ تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا، طبع لکھنؤ ۱۹۷۱ء ص ۵۵۳۔

۴۸ و ۴۹ بہ حوالۂ سراپا سخن، طبع اپریل ۱۸۷۵ء ص ۳۱۹۔

۵۰ شعاعِ مہر، طبع ۱۸۶۰ء میں اُن کا قطعۂ تاریخ شامل ہے جو بتاتا ہے کہ کنور جگر درتی سنگھ کنور مہر کے تلامذہ میں شامل تھے۔

۵۱ بہ حوالۂ تذکرۂ نادر، ص ۳۶۔

۵۲ بہ حوالۂ سخن شعرا طبع اکتوبر ۱۸۷۴ء ص ۶۹۔

۵۳ بہ حوالۂ ہند و شعرا : مؤلفۂ خواجہ عشرت لکھنوی۔ نامی پریس لکھنؤ، طبع جنوری ۱۹۳۱ء ص ۳۸۔

۵۴ آبِ بقا، ص ۱۰۵۔

۵۵ بہ شکریۂ ڈاکٹر نیر مسعود۔

۵۶ آبِ بقا (۱۰۵) سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ مہر کی شادی ۱۸ برس کے سن میں ہوئی تھی۔

۵۷ ماخذ میں کتابت کے سہو سے یہاں صبح کی جگہ جبہ درج ملتا ہے۔

۵۸ میر وزیر علی صبا لکھنوی (خلف میر بندہ علی) کا شمار آتش لکھنوی کے ممتاز شاگردوں میں ہوتا ہے۔ ان کی ایک صاحبزادی سیدہ مرتضیٰ بیگم کا عقد مرزا حاتم علی مہر کے فرزند مرزا سخاوت علی ضیا سے ہوا تھا۔ صبا لکھنوی مرزا مہر کے سمدھی تھے۔ صبا کے فرزند میر بادشاہ علی بقا لکھنوی دبیر کے داماد تھے۔ صبا اور دبیر بھی ایک دوسرے کے سمدھی ہوتے تھے۔ ان کا دیوان غنچۂ آرزو [معروف بہ دیوان صبا] ان کے فرزند نے مطبع ثمر ہند لکھنؤ سے ۱۸۷۷ء میں چھپوایا تھا۔ غنچۂ آرزو ۲۰۰+۴+۲=۲۰۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر سید محمد عقیل نے اپنے ڈی۔ فل کے مقالے اردو مثنوی کا ارتقا (شمالی ہند میں) مطبوعہ اسرار کریمی پریس الہ آباد طبع ۱۹۶۵ء (ص ۱۸۳) میں میر وزیر علی صبا کا سنہ وفات ۱۸۵۴ء درج فرمایا ہے۔ یہ اندراج تصحیح کا طالب ہے۔ میری اطلاع کے مطابق صبا لکھنوی کی تاریخ وفات ۱۳ رجون ۱۸۵۵ء [مطابق ۲۶ رمضان ۱۲۷۱ھ] ہے [ر۔ک غنچۂ آرزو طبع ۱۸۷۷ء ص ۱۹۵/۱۹۴ (قطعۂ تاریخ وفات میر صبا لکھنوی از میر دلدار حسن نوق)]۔ صبا لکھنوی کے حالات مندرجہ ذیل مصادر میں موجود ہیں : (۱) قطعۂ منتخب : مولوی عبدالغفور نساخ۔ مطبع منشی نول کشور، لکھنؤ، طبع جولائی ۱۸۷۴ء ص ۱۷ (۲) سخنِ شعرا : نساخ طبع اکتوبر ۱۸۷۴ء ص ۲۰۶ (۳) سراپا سخن طبع اپریل ۱۸۷۵ء ص ۱۴۱ نیز ص ۲۰۴ (۴) تذکرۂ طور کلیم طبع ۱۲۹۸ھ ص ۶۳ (۵) گلستانِ بے خزاں طبع جون ۱۸۷۵ء ص ۱۴۵ (۶) بزمِ سخن طبع ۱۸۸۱ء ص ۷۴ (۷) جلوۂ خضر (جلد دوم) طبع ۱۸۹۰ء ص ۱۲۶ (۸) تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا طبع لکھنؤ ۱۹۷۱ء ص ۶۴۴ (۹) تذکرۂ نادر ص ۹۶ (۱۰) تذکرۂ گلِ رعنا : حکیم عبدالحی۔ مطبع معارف اعظم گڑھ طبع ۱۳۷۰ھ ص ص ۲۷۴ تا ۲۷۷ (۱۱) مرآۃ الشعرا ء (جلد اوّل) : مولوی محمد یحییٰ تنہا۔ عالم گیر پریس لاہور (سنہ اشاعت ندارد) ص ص ۵۰۲ تا ۵۰۵ (۱۲) خمخانۂ جاوید (جلد پنجم)

مؤلفۂ لالہ سری رام مرتبہ پنڈت برج موہن دتا تریہ کیفی۔ دہلی طبع ۱۹۴۰ء ص ص ۲۵۳ تا ۲۵۸۔

۵۹ کلامِ اختر کے سرورق پر مرزا سخاوت علی ضیا کے فرزند مرزا آغا حسین اختر کو نبیسہ [نبیسہ = نواسہ] میر وزیر علی صبا لکھا گیا ہے۔ اس رشتے سے اختر کے والد ضیا، میر صبا لکھنوی کے داماد ہوئے۔ انگریزی کتاب فسٹے مونیلیسے (ضمیمہ ص ۹) میں اختر کی والدہ کا نام سیدہ مرتضیٰ بیگم رقم ملتا ہے۔ ان بکھری ہوئی شہادتوں کو جمع کرنے پر ثابت ہوتا ہے کہ تہر کے فرزند ضیا کی شادی صبا لکھنوی کی صاحب زادی سیدہ مرتضیٰ بیگم سے ہوئی تھی ۔۔۔ (کاظم علی خاں)

۶۰ عودِ ہندی: غالب۔ مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی۔ مجلس ترقی ادب، لاہور۔ طبع جون ۱۹۶۷ء ص ۸۷۔

۶۱ میر بادشاہ علی بقا لکھنوی [متولد ۱۲۶۳ھ / ۱۸۴۷ء متوفی ۱۳ رجب ۱۳۲۳ھ مطابق چہار شنبہ ۱۳ ستمبر ۱۹۰۵ء] میر وزیر علی صبا لکھنوی کے فرزند اور مرزا دبیر کے داماد تھے۔ بقا لکھنوی کے ایک چھوٹے بھائی میر عابد علی رسا [متوفی ۱۹۱۸ء] بھی شاعر تھے۔ بقا نے مرثیے اور غزل پر توجہ دی۔ بقا کے حالات مندرجہ ذیل ماخذوں میں موجود ہیں: (۱) مضمون کاظم علی خاں: "مرزا دبیر کی غزل گوئی" مشمولہ شیرازہ، سری نگر (کشمیر) جلد (۱۶)، شمارہ (۱) ص ۶۰ (حاشیہ ۲) (۲) خمخانۂ جاوید (جلد اوّل): لالہ سری رام مطبع منشی نول کشور، لاہور۔ طبع ۱۹۰۸ء ص ۶۰۹ (۳) سبع مثانی (جلد ۱): مرتبہ سید سرفراز حسین خبیر لکھنوی تمام: بک ایجنسی، لکھنؤ طبع ۱۳۴۹ھ (دیباچہ از ثاقب لکھنوی) ص ۲ (۴) حیاتِ دبیر (جلد اوّل): مؤلفہ افضل حسین ثابت لکھنوی، بیوک اسٹیم پریس، لاہور۔ طبع ۱۹۱۳ء ص ۸۵ (۵) دبستانِ دبیر (تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ۔ ڈی): ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ۔ طبع مئی ۱۹۶۶ء ص ۲۶۶ تا ۲۷۶ (۶) مشاطۂ سخن: صفدر مرزا پوری۔ صدیق بک ڈپو، لکھنؤ (سنہ اشاعت ندارد) ص ۴۵۔ کاظم علی خاں۔

۶۲ حکیم میر رضا حسین تنہا لکھنوی، مرزا سخاوت علی ضیا (خلف تہر) کے ہم زلف اور میر وزیر علی صبا کے داماد تھے۔ تنہا لکھنوی اپنے خسر صبا لکھنوی ہی کے شاگرد تھے۔ تنہا لکھنوی کے حالات و کلام سے عموماً تذکرے خالی ہیں۔ کافی تلاش کے بعد مجھے رضا حسین تنہا لکھنوی کے جو اشعار ملے ہیں ان میں سے چند بہ طور نمونۂ کلام پیش ہیں: ؎

کہوں کیا اُس بُت کافر پہ میرا دم نکلتا ہے
جہاں جاکر ہر اک کرتا ہوا ماتم نکلتا ہے

شدائد موت کے ہرگز نہ دیکھے جائیں گے تم سے
سرہانے سے مرے اُٹھو کہ میرا دم نکلتا ہے

بہت کم سن ہیں وہ ڈر جائیں گے اُن کو نہ آنے دو
بڑی مشکل سے عاشق کا سنا ہے دم نکلتا ہے

تُو تنہا کچھ کربلا سے کم نہیں ہے کوچۂ جاناں
کہ جو جاتا ہے وہ کرتا ہوا ماتم نکلتا ہے

تنہا لکھنوی کی یہ غزل ایک طرحی مشاعرے کے لیے کہی گئی تھی جس کا مصرعِ طرح: "حسینوں کے بگڑنے میں بھی اک عالم نکلتا ہے" پیامِ یار، لکھنؤ، جلد (۳)، شمارہ (۱۰)۔ بابت ماہ اکتوبر ۱۸۸۵ء میں چھپا تھا۔ تنہا کی یہ غزل پیامِ یار، لکھنؤ جلد (۳)، شمارہ (۱۱)۔ بابت ماہ نومبر ۱۸۸۵ء (ص) میں طبع ہوئی ہے۔ گویا یہ غزل اکتوبر / نومبر ۱۸۸۵ء کا کلام ہے۔ تنہا کے بعض اور اشعار بھی ملاحظہ ہوں: ؎

فصلِ خزاں کے آتے کیسی ہوا چلی یہ
شمعِ مراد بلبل گل ہو گئی چمن میں

پہنچی یہاں تلک ہے اب لاغری ہماری
بنتی ہیں دو قبائیں مجنوں کے پیرہن میں

آتش کی ہے زمیں یہ جل جائیں گی زبانیں
آہو نہ چر سکیں گے اس شیر نر کے بن میں

یہی آہیں رہیں تو سُن لینا
اک نہ اک دن یہ آسماں نہیں

تیرے عاشق کی یہ سُنتے ہیں کہ لاش آئی ہے
سیر کو تُو بھی نکل خلق تماشائی ہے

اِتنا کہے دیتے ہیں سُنو یا نہ سُنو تم — عاشق تو سبھی ہیں پہ سُہاؔ اور ہی کچھ ہے

[خم خانۂ جاوید (جلد چہارم): لالہ سری رام۔ ہمدرد پریس، دہلی۔ طبع ۱۹۲۶ء ص ص ۲۹۳ تا ۲۹۴] ۔ کاظم علی خاں۔

۶۳ؔ رک مضمون از قاضی عبدالودود: "مرگ دبیرؔ" مطبوعہ معاصر، پٹنہ حصّہ ۱۲ (ص ۱۳۲)۔ جناب قاضی عبدالودود کا یہی مضمون سرفراز، لکھنؤ (مرزا دبیرؔ نمبر): مرتبہ کاظم علی خاں۔ شمارہ بابت ۱۷ دسمبر ۱۹۷۶ء ص ص ۱۸ تا ۲۶ میں بھی شائع ہوا ہے۔ کاظم علی خاں۔

۶۴ؔ اِن افراد میں سے متعدد کے قطعاتِ تاریخ یا تقاریظ مہرؔ کی مثنوی شعاعِ مہرؔ طبع ۱۸۶۰ء میں شامل ہیں جو انھیں مہرؔ کا دوست ثابت کرتے ہیں۔ شعاعِ مہرؔ ص ص ۲۴ تا ۶۰ کے مندرجات سے بھی ان اشخاص میں سے بعض مہرؔ کے دوست ثابت ہوتے ہیں۔ مہرؔ، تفتہؔ، حقیرؔ اور آرامؔ کے نام غالبؔ کے بعض خطوط [مشمولہ خطوطِ غالبؔ (۱۲): مرتبہ مالک رام۔ طبع ۱۹۶۲ء] ان اشخاص کے درمیان دوستانہ تعلقات پر دال ہیں۔ مکتوب بےخبرؔ بہ نام غالبؔ [مشمولۂ فغانِ بےخبر ص ۱۲۹ (بہ حوالۂ فاضل لکھنوی)] مہرؔ کو بےخبرؔ کا دوست قرار دیتا ہے۔ مہرؔ اور راجا بلوان سنگھ راجاؔ کی دوستی کے لیے تذکرۂ خم خانۂ جاوید (جلد سوم): لالہ سری رام۔ دلّی پرنٹنگ ورکس، دہلی۔ طبع ۱۹۱۷ء (ص ۲۹۹) ملاحظہ ہو۔ نگارشاتِ ادیب: پروفیسر سید مسعود حسن رضوی، ادیبؔ۔ کتاب نگر، لکھنؤ۔ طبع ۱۹۶۹ء (ص ۳۲) کا مطالعہ نواب مرزا محمد علی خاں بہادر کو مہرؔ کے احباب میں شامل کرتا ہے۔ تذکرۂ خم خانۂ جاوید (جلد دوم): لالہ سری رام۔ رائے گلاب سنگھ پریس، لاہور۔ طبع ۱۹۱۱ء (ص ۳۹۸) معلوم ہوتا ہے کہ نواب محمد علی خاں بہادر شاعر تھے اور ان کا تخلّص حزیںؔ تھا نیز حزیںؔ آتشؔ لکھنوی کے شاگرد تھے۔ تذکرۂ آبِ بقا (ص ۱۰۷) میں غالبؔ، مولوی شہیدؔ، بےخبرؔ، صباؔ لکھنوی، منیرؔ شکوہ آبادی، دبیرؔ اور انیسؔ کو مرزا حاتم علی مہرؔ کا دوست قرار دیا گیا ہے۔ مرزا رجب علی بیگ سرورؔ لکھنوی کی کتاب شبستانِ سرورؔ کے ہبہ نامے پر مرزا حاتم علی بیگ مہرؔ کے دستخط کی موجودگی سرورؔ و مہرؔ کی دوستی پر دال ہے [بہ حوالۂ رجب علی بیگ سرورؔ (حیات اور کارنامے): ڈاکٹر نیر مسعود۔ شائع کردہ شعبۂ اُردو الہ آباد یونیورسٹی۔ طبع ۱۹۶۷ء ص ۳۰۳]۔ خم خانۂ جاوید (جلد پنجم): مؤلفۂ لالہ سری رام۔ مرتبہ پنڈت کیفی طبع ۱۹۴۰ء (ص ۷۶ نیز ص ۷۵) میں استاد علی شوقؔ اور زین العابدین خاں شورشؔ کو مہرؔ کا دوست بتایا گیا ہے۔ [کاظم علی خاں]۔

۶۵ؔ اودھ اخبار، لکھنؤ مورخہ ۲۰ مئی ۱۸۶۳ء (ص ۳۵۰) [بہ شکریۂ فاضل لکھنوی]۔

۶۶ؔ رک خطوطِ غالبؔ (حصہ اوّل): مرتبہ مالک رام طبع ۱۹۶۲ء ص ۳۴۶ (مکتوب نمبر ۲۱۳ بہ نام مہرؔ)۔

۶۷ؔ مشمولۂ فغانِ بےخبر ص ۱۲۹ [بہ شکریہ فاضل لکھنوی]۔

۶۸ؔ بہ حوالۂ آبِ بقا ص ۱۰۹۔

۶۹ؔ کلامِ اختر ص ۲۔

۷۰ؔ روزِ روشن: مولوی محمد مظفر حسین [صباؔ گوپاموی]۔ مطبع شاہ جہانی، بھوپال۔ طبع ۱۲۹۷ھ ص ۶۶۲۔

۷۱ؔ مرزا سخاوت علی ضیاؔ نے اپنے والد کی وفات پر مندرجۂ ذیل قطعۂ تاریخ کہا تھا: ؎

بفردوس حاتم علی بیگ رفت — فتاد از سرم تاج سرِ ملی
چہ درماں کنم دردِ دل را بہ ہجر — چہ سازم علاجِ جگر ہائے ہائے
رقم شد بقلبِ ضیاؔ سالِ فوت — اجل داد داغِ پدر ہائے ہائے [کلامِ اختر ص ۳]

[قلبِ ضیا = ی = ۱۰]۔ تعمیہ ۱۲۸۶ + ۱۰ = ۱۲۹۶ھ۔

۷۲ؔ اُردو مثنوی شمالی ہند میں ص ۵۸۵۔

۵۳۔ لکھنؤ کا دبستانِ شاعری طبع ۱۹۶۵ء (دہلی) ص ۴۳۰۔

۵۴۔ مکتوبِ غالب بہ نام مہر [مشمولہ اردوئے معلّٰی (حصہ اوّل) : مرزا غالب ۔ اکمل المطابع، دہلی۔ طبع مارچ ۱۸۶۹ء ص ۲۵۲/۲۵۳] میں غالب نے مہر کو "طرح دار" اور "کشیدہ قامت" شخص بتایا ہے جو مہر کی دل کش شخصیت کا ثبوت ہے۔ کاظم علی خاں

۵۵۔ رک عودِ ہندی : مرزا غالب مطبع منشی نول کشور، لکھنؤ۔ طبع دسمبر ۱۹۲۵ء مکاتیبِ غالب بہ نام مہر ص ص ۱۰۹ (نیز ا (خط نمبر ۱۰۰ نیز خط نمبر ۱۰۲)۔

۵۶۔ شعاعِ مہر : حاتم علی مہر طبع دسمبر ۱۸۶۰ء ص (صفحات مثنوی)۔

۵۷۔ بزمِ آخر : مفتی محمد انتظام اللہ شہابی اکبر آبادی ۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ دسنہ (اشاعت ندارد) ص ص ۳۱/۳۰۔

۵۸۔ تذکرۂ شمیم سخن : مرتبۂ مولوی عبدالحیٔ صفا بدایونی ۔ مطبع منشی نول کشور، لکھنؤ طبع ۱۸۹۱ء ص ۱۸

۵۹۔ رک سرورقِ نسخۂ مونیلس [جس میں ایاغِ فرنگستان کے علاوہ مہر کو دوسری اور ۱۹ کتابوں کا مصنف بتایا گیا ہے] کاظم

۶۰۔ افسوس کہ مہر کی متعدد کتابیں اب نایاب ہیں۔ راقم اطروحے مہر کی مندرجہ فہرستِ کتب میں سے محض چند ہی کتابیں دیکھی ہیں۔ یہ فہرست مولانا فاضل لکھنوی، مولانا غلام رسول مہر، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر گیان چند جین، خواجہ عشرت لکھنوی، مسعود حسن رضوی ادیب، مرزا عسکری، عبدالرؤف عروج وغیرہ کے بیانات پر مبنی ہے۔

۶۱۔ بہ حوالۂ مضمون کاظم علی خاں : "شعاعِ مہر اور اس کی روشنی میں جہانِ غالب" مشمولہ ہماری زبان، دہلی مورخہ ۲۲ جولا ۱۹۷۹ء ص ۲ (کالم ۴)۔

۶۲۔ غدر ۱۸۵۷ء میں مہر کا کلام تلف ہوا تھا جیسا کہ مہر کے اس شعر سے ظاہر ہے : ؎

اس دور میں ہر اک تہہ چرخِ کہن لٹا اوروں کا زر لٹا مرا نقدِ سخن لٹا [بزمِ آخر ص ۲۹]

۶۳۔ غنچۂ آرزو [معروف بہ "دیوانِ صبا"] : میر وزیر علی صبا۔ مطبع ثمرِ ہند، لکھنؤ طبع [فروری] ۱۸۷۷ء مطابق [محرم ۱۲۹۴ھ] ص ۱۹۳۔ [مملوکہ کاظم علی خاں]

۶۴۔ مہر کے نمونۂ کلام کے ماتحت پیش ہونے والے اشعار مندرجۂ ذیل ماخذوں سے منقول ہیں :

(۱) آبِ بقا (۲) بزمِ آخر (۳) لکھنؤ کا دبستانِ شاعری (۴) گلستانِ بے خزاں طبع جون ۱۸۷۵ء (۵) سراپا سخن طبع اپریل ۱۸۷۵ء (۶) بزمِ غالب (۷) تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا لکھنؤ طبع ۱۹۷۱ء (۸) تذکرۂ ریاض الفردوس (۹) تذکرۂ نادر (۱۰) تذکرۂ طورِ کلیم طبع ۱۲۹۸ھ (۱۱) سخنِ شعرا طبع اکتوبر ۱۸۷۴ء (۱۲) نگارشاتِ ادیب ۔ استدراک : ①

ڈاکٹر اکبر حیدری نے مہر کے فرزند ضیا کو بہ حوالۂ "تذکرۂ نادر" ڈپٹی کلکٹر قرار دیا ہے ۔ لیکن تذکرۂ نادر (ص ۱۰۲) میں ضیا کو ڈپٹی کلکٹر بجائے سررشتہ دار کلکٹری ضلع ایٹہ بتایا گیا ہے۔ ڈاکٹر اکبر حیدری نے مہر کی تاریخ وفات ۸ راگست ۱۸۷۹ء (دوشنبہ) قرار دی ہے۔ یہ اندراج خلاف تقویم بھی ہے اور خلاف واقعہ بھی۔ ۸ راگست ۱۸۷۹ء کو تقویم دوشنبہ کی جگہ جمعہ بتاتی ہے۔ مہر کی صحیح تاریخ وفات دراصل دوشنبہ ۱۸ راگست ۱۸۷۹ء ہے جو خلاف تقویم نہیں [رک۔ تحقیقی نوادر : ڈاکٹر اکبر حیدری۔ اردو پبلشرز لکھنؤ۔ طبع ستمبر ۱۹۷۳ء، ص ۴۳۰ (حاشیہ ۱) ۔ کاظم علی خاں]۔

② تاریخِ لطیف (از مہدی علی خاں ممتاز و آرام رام پوری) میں مرزا حاتم علی مہر کو استادِ تسلیم سہوانی لکھا گیا ہے گویا تسلیم سہوانی بھی مہر کے شاگرد تھے [رک : تلخیص تاریخِ لطیف : تلخیص از اکبر علی خاں عرشی زادہ مشمولۂ نگار، رام پور جولائی ۱۹۶۳ء (تاریخ نمبر) ص ۵۶۔ کاظم علی خاں]۔

★

Urdu Monthly

Vol 34 No. 10

JANUARY 1980

50 PAISE

NAYA DAUR

POST BOX No 146 LUCKNOW 22600[illegible]

Regd No LW/NP 17

Annual Subs Rs [illegible]

نیا دور
جلد ۳۴
نمبر ۱۱
فروری ۱۹۸۰ء
ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی
جوائنٹ ایڈیٹر: شاہ نواز قریشی
★
پبلشر: ہمیندر کمار
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش
پرنٹر: اشوک در
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری یوپی
مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ
شائع کردہ محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ۔ اتر پردیش
قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے
زر سالانہ: پانچ روپے
ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پکاشن ریبھاگ انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو۔پی۔ لکھنؤ
خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶۔ لکھنؤ
بذریعہ رجسٹری: ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو۔پی۔ لکھنؤ

عنوانات

اپنی بات

ملک میں جنوری ۱۹۸۰ء کے پہلے ہفتہ میں درمیانی مدت کے نئے پارلیمانی انتخابات ہوئے جن میں ووٹروں نے پوری دلچسپی لی۔ ان انتخابات کے نتائج سے بھی پتہ چلتا ہے کہ اس ملک کے عوام کا سیاسی شعور اب اور پختہ ہو چکا ہے نیز جمہوریت ان کی زندگی میں رچ بس گئی ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ہندوستانی عوام اور جمہوریت اب لازم و ملزوم بن گئے ہیں۔ اب تو یہ بھی احساس ہونے لگا ہے کہ جمہوریت کے بغیر ہندوستان شاید اپنا حقیقی وجود برقرار نہ رکھ سکے۔ یعنی جمہوریت ہندوستان کی روح بن گئی ہے۔ اس پس منظر میں نئی مرکزی حکومت کی ذمہ داریاں اور زیادہ بڑھ جاتی ہیں جن سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ہم سب کو اپنا پورا پورا عملی تعاون دینا چاہیے کیونکہ کوئی بھی عوامی اور جمہوری حکومت عوام کے تعاون کے بغیر اپنے فرائض کو بحسن و خوبی انجام نہیں دے سکتی۔ ہمیں یہ بھی سمجھ لینا چاہیے اور اسے ہمیشہ پیش نظر بھی رکھنا چاہیے کہ جمہوریت محض ایک سیاسی نظام نہیں ہے بلکہ ایک طرز معاشرت اور ایک فلسفۂ حیات بھی ہے۔ چنانچہ ہمارا کام صرف یہی نہیں ہے کہ اپنے ووٹ کا استعمال کر لیں اور اس کے بعد بیٹھ جائیں۔ ہماری ذمہ داری یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ جمہوریت میں حکومت عوام کی، عوام کے لیے اور عوام کے ذریعہ ہوتی ہے اس لیے اسے ہر سطح پر تعاون دینا بھی ضروری ہوتا ہے۔ اپنے مطالبات اور حقوق کے لیے ہمیں کبھی کوئی غیر جمہوری طریقہ یا راستہ نہیں اختیار کرنا چاہیے۔ کیونکہ اس سے جمہوریت پر آنچ آتی ہے۔ اپنے حقوق کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنے فرائض پر بھی ہر لحظہ نظر رکھنا چاہیے اور فرائض کی انجام دہی سے کبھی غافل نہیں ہونا چاہیے۔ تشدد پسندی، تنگ نظری، جہالت، رنگ و نسل کے امتیاز، علاقائی اور لسانی عصبیت، فرقہ واریت اور تعصب جیسی لعنتیں جمہوریت کی سب سے بڑی دشمن ہیں ہمیں نہ صرف یہ کہ ان سے محفوظ رہنا چاہیے بلکہ ان کے خلاف اس وقت تک لڑنا بھی ہے جب تک یہ لعنتیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم نہیں ہو جاتیں۔ ہماری ہر دلعزیز وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی ان لعنتوں کے خلاف ہمیشہ لڑتی رہی ہیں۔ امید ہے کہ اب اس لڑائی میں اور تیزی آئے گی اور وہ زیادہ موثر طور پر ان لعنتوں سے نپٹ سکیں گی جس کے نتیجے میں ہماری جمہوریت ان لعنتوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جائے گی۔ اس سلسلے میں ظاہر ہے کہ انتظامیہ کے ساتھ ساتھ ہر سطح پر عوام کا سرگرم عملی تعاون بھی ضروری ہے۔ عوام کے تعاون کے بغیر اس محاذ پر بھی کامیابی نہیں حاصل ہو سکتی۔

جہاں تک نئی مرکزی حکومت کا تعلق ہے وہ یقینی طور سے موثر اقدامات کرے گی۔ اس کے سامنے بہت سے پیچیدہ مسائل ہیں جن میں لا اینڈ آرڈر اور مہنگائی کا مسئلہ سب سے زیادہ توجہ چاہتا ہے۔ نئی حکومت نے اقتدار کی ذمہ داری سنبھالتے ہی اس پر توجہ مرکوز بھی کی ہے۔ وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کی زبردست تنظیمی صلاحیت، انتظامی امور سے متعلق ان کے طویل تجربے، ان کے موثر طریقۂ کار، ان کی دوراندیشی اور حالات و مسائل سے نپٹنے کے ان کے مخصوص انداز کی بنا پر یہ بات یقینی طور سے کہی جا سکتی ہے کہ وہ جلد ہی موجودہ مسائل پر قابو حاصل کر لیں گی جس کے نتیجے میں تمام ملک میں ایک پرسکون ماحول قائم ہو جائے گا جو عوام کے لیے باعث طمانیت و راحت ہوگا۔

ادارہ نیا دور ملک کی محبوب رہنما شریمتی اندرا گاندھی کو وزیر اعظم کے عہدہ جلیلہ پر دوبارہ فائز ہونے نیز نئی مرکزی حکومت کی تشکیل پر پرخلوص مبارکباد پیش کرتا ہے۔

○ نیا دور کے اطفال نمبر کی ادبی حلقوں میں جس طرح پذیرائی ہوئی ہے اور اسے جس طرح سراہا جا رہا ہے اس سے ادارے کی بڑی حوصلہ افزائی ہوئی ہے۔ اس سلسلے میں ممتاز ادیبوں اور قلم کاروں اور قارئین کے توصیفی اور مبارکباد کے خطوط ہمیں برابر وصول ہو رہے ہیں جن کے لیے ادارہ انتہائی ممنون و متشکر ہے۔ اسی کے ساتھ ہی ہم یہاں ایک اور نمبر کی اشاعت کا اعلان کرنا چاہتے ہیں۔ جیسا کہ سبھی واقف ہیں کہ عظیم محسن اردو منشی نولکشور مرحوم نے اپنے شہرۂ آفاق مطبع کے ذریعہ اردو زبان و ادب کی جو بیش بہا اور بے مثل خدمات انجام دی ہیں، ان کے پیش نظر انھیں خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے نیا دور جلد ہی ایک مخصوص نولکشور نمبر شائع کرنے جا رہا ہے جس میں ان کی زندگی، شخصیت اور کارناموں سے متعلق تمام پہلوؤں پر ملک کے مقتدر اور ممتاز ادیبوں اور قلم کاروں کے مضامین اور نظمیں شامل اشاعت ہوں گی۔

○ نیا دور میں اشاعت کے لیے مضامین اور شعری تخلیقات ایک بڑی تعداد میں برابر موصول ہوتی رہتی ہیں۔ جن کے سبب مضامین اور شعری تخلیقات کا ایک انبار جمع ہو گیا ہے۔ چنانچہ فی الحال نیا دور میں غیر طلبیدہ مضامین اور شعری تخلیقات کے لیے گنجائش نہیں ہے۔ قلمی معاونین سے گزارش ہے کہ وہ مضمون یا شعری تخلیق ارسال کرنے کی فی الحال زحمت نہ فرمائیں۔ اس سلسلے میں ادارہ خط و کتابت سے بھی معذور رہے گا۔

——— ایڈیٹر

حرمت الاکرام
رام باغ - مرزا پور ۲۳۱۰۰۱

چکبست

نئی نسل کا رہبر

وہ ایک شاعر جسے تخلص کا بار بھی ناگوار گزرا
وہ ایک شاعر جو وادیِ روز و شب سے مردانہ وار گزرا
وطن کا ـــــــ صبحِ وطن کا شاعر
چمن کا بلبل ـــــــ چمن کا شاعر
رقم ہے لوحِ سخن پہ چکبست نام جس کا
دلوں کی قلزم شناس گہرائیوں میں اترا پیام جس کا
انیس کے مرثیوں کا جو ہر سمو کے لَے میں
ربابِ آتش کا سوز بھر کر مقالِ دانشوری کے نَے میں
انوکھے نغمے سُنانے والا
وہ دریا کو آئینہ تو لہروں کو اپنا گیسو بنانے والا
وہ کفر و دیں کے رخوں سے پردہ اٹھانے والا
وہ برہمن اور شیخ دونوں کو اپنا دشمن بنانے والا

لیے ضمیرِ سخنوری میں تغیر آگیں حرارتوں کا وفورِ پنہاں
لبوں سے سینے کی وسعتوں تک
زمیں سے گردوں کی رفعتوں تک
کبھی ستارے کبھی شرارے اچھالتا تھا
کہ زندگی سے نہ رابطہ ٹوٹے روشنی کا
وہ انگلیوں میں قلم ـــ وہ کاندھے پہ حریت کا علم سنبھالے
محاذِ صوت و بیاں کا غازی
تڑپ اک ایسی چھپائے دل میں کہ پتھروں میں بھی جان ڈالے
سخن کو نشتر بنانے والا
وہ نوکِ خامہ کو نوکِ خنجر بنانے والا

وہ رزمِ جمہور کا سپاہی
وہ سرفروشِ جہادِ نصرت
جدالِ نغمات کا مجاہد
سفینۂ درد کا مسافر
خزینۂ درد کا محافظ
وہ طوق و زنجیر کے شعورِ زیاں کا شاعر
کشاکشِ امتحاں کا شاعر
وہ گوکھلے کی چتا پہ آنسو بہانے والا
تلک کی میت کو دل کا کاندھا لگانے والا
بساطِ معنی پہ وہ بناتا تھا ایسی تصویر
جس میں فردا کا رنگ بھی نور بھی نہاں تھا
یہ رنگ ـــ یہ نور ارضِ ہندوستاں سے اٹھے کی کہکشاں تھا
وہ ایک شاعر: کہ نسلِ نو کا پیامبر بھی تھا راہبر بھی
وہ ایک شاعر: نوائے بیداریں لئے سحر بھی سحر بھی
ہو جس میں احساس کا تموج: غزل کو وہ رنگ دینے والا
وہ کاروانِ سخنوراں کو رجز کا آہنگ دینے والا
روایتوں کو جدید اقدار دینے والا

وہ نازنینِ سخن کے دستِ حسیں میں تلوار دینے والا
وطن میں وہ ایک دل کا جویا تھا [ایسے دل کا]
جو واقعی دردآشنا ہو
کہ درد ہی تھا متاعِ آدم — کہ درد ہی ہے متاعِ انساں،
ضیائے شمس و قمر کی صورت
وہ حبِّ ملک و وطن کی دولت لٹانے والا
جواں سنوں میں ۔ جواں دلوں میں لہو کی حدت لٹانے والا

وہ چاہتا تھا
کہ نونہالانِ گلستاں کی بہار اندوزیوں کی بو دور دور پہنچے
وہ مہکیں لہکیں تو چشم و دل کو سرور پہنچے
بنائی حسنِ سخن کے پھولوں کی ایک مالا
تھی جس کی نکہت فروشیوں میں چراغِ منزل کی خوش ادائی
کہ دخترانِ وطن نہ بھٹکیں
نئے اجالوں کے بیچ و خم میں،
کہا کہ پردہ اٹھایا رخ سے تو خیر لیکن
نہ دل سے پردہ حجاب کا اٹھنے پائے [اس کا خیال رکھنا]

پئے سفر وہ چلا تھا گھر سے
کسی کو معلوم تھا کہاں، یہ
سفر عدم کا سفر بنے گا
مگر وہ شاعر: وطن کا — صبحِ وطن کا شاعر
جبینِ دوراں کا نقشِ تابندہ تر بنے گا

ایم کوٹھیاوی راہی
گورکھپور۔ یو پی

غزل

جس دن سے ساعتوں کے شجر مسکرائے ہیں
ہم جنگلوں سے ان کی طرف لوٹ آئے ہیں

روشن ہوئے ہیں زخم شفق ڈوبنے کے بعد
اِن بستیوں میں دیپ کہاں جگمگائے ہیں

وہ سر چھپا پڑا ہے چٹانوں کے درمیان
سجدوں میں جس نے ہجر کے لمحے بتائے ہیں

ویران کس قدر ہے ترے باغ کی ہوا
شاید اسی نے یاد کے دیپک بجھائے ہیں

میکر جنوں کو اور سہارا نہ دے کوئی
منزل ملی ہے جب یہ قدم ڈگمگائے ہیں

پایا ہے اک گلاب کتابوں کے درمیان
بجتی ہیں پتیاں کہ ورق پھڑپھڑائے ہیں

ڈاکٹر حنیف نقوی
لیکچرر شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی
وارانسی (۲۲۱۰۰۵)

مرزا ثاقب لکھنوی

کچھ نئی دریافتیں
کچھ تازہ انکشافات

ہندستان میں علوم و فنون کے فروغ میں بعض چھوٹے چھوٹے قصبے نمایاں اہمیت کے حامل رہے ہیں۔ ضلع بدایوں کا قصبہ سہسوان بھی ایسی ہی مردم خیز بستیوں میں سے ایک ہے۔ کسی زمانے میں اسے متعدد اولیا ء اللہ، علما و فضلا اور شعرا و ادبا کا مولد و مسکن اور موسیقی کے ایک ممتاز گھرانے کا مرکز ہونے کی بنا پر ملک گیر شہرت حاصل تھی۔ علم و ادب اور فضل و کمال کی ان دیرینہ روایات کا اعتبار قصبے کی جن برگزیدہ شخصیتوں کے دم سے ماضی قریب تک برقرار رہا، ان میں میرے نانا مرحوم منشی شاکر حسین صاحب[1] نکہت اور عم محترم مولانا سید اعجاز احمد صاحب معجز[2] سرِ فہرست تھے۔ اتفاقاً یہ دونوں بزرگ اولادِ نرینہ سے محروم تھے، اس لیے انھوں نے اپنی علمی وراثت کو آئندہ نسلوں تک منتقل کرنے کے خیال سے اپنے نواسوں کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہات صرف کیں۔ چنانچہ میں نے بھی پیدائش کے چند ماہ بعد ہی سے اپنی والدہ کی سب سے بڑی اولاد ہونے کے ناتے اپنے نانا کے ظلِ عاطفت میں پرورش پائی۔ تعلیم کے ابتدائی دور میں حرف شناسی کی منزل سے گزرنے کے بعد مختلف دعاؤں اور قرآن کی چھوٹی چھوٹی سورتوں کے ساتھ اشعار بھی یاد کرائے گئے۔ ان شعروں میں مرزا ثاقب لکھنوی کا یہ شعر بھی شامل تھا ؎

سارے عالم میں پھرایا حسرتِ دیدار نے
طور کے سرے کو پھر بھی شوقِ بینائی رہا

اس شعر کے ذریعے پانچ ساڑھے پانچ سال کی عمر میں ثاقب کی شاعری سے میرا پہلا تعارف ہوا۔ لیکن ان کے نام سے میرے کان اس سے قبل ہی آشنا ہو چکے تھے۔ وہ نانا مرحوم کے دوستوں میں سے تھے اور طرفین سے خطوط کے مستقل تبادلے نیز ایک دوسرے کے حالات سے مسلسل باخبری کی بنا پر ان کی ذات نانا مرحوم کے علاوہ گھر کے دوسرے افراد کے لیے بھی خاندان کے ایک دور افتادہ فرد کی حیثیت رکھتی تھی۔ میری والدہ اور خالہ چچا جان کہہ کر محبت و احترام کے ساتھ ان کا ذکر کیا کرتی تھیں۔ اس بے پناہ تعلق خاطر اور ناموں کی غیر معمولی مماثلت کی بنا پر اچھی خاصی عمر تک میں نے انھیں اپنے نانا کا حقیقی بھائی سمجھا اور کم سنی کے باوجود ان کے انتقال کے صدمے کو اسی طرح محسوس کیا جس طرح کوئی حساس بچہ اپنے کسی قریبی بزرگ کی موت کا اثر قبول کرتا ہے۔

ثاقب صاحب میرے نانا سے عمر میں تقریباً ڈھائی سال بڑے تھے۔ ان کی پیدائش ۲ جنوری ۱۸۶۹ء کو آگرہ میں اور نانا مرحوم کی ولادت ۲۹ جون ۱۸۷۱ء کو رام پور میں ہوئی تھی۔ عمر کے ابتدائی مراحل میں نانا مرحوم اپنے والد محترم منشی صابر حسین صبا[3] سہسوانی کی معیت میں ۱۸۸۱ء میں اور ثاقب صاحب اپنے پدرِ بزرگوار آغا محمد عسکری قزلباش کے ہمراہ ۱۸۸۲ء میں بھوپال پہنچے، جہاں دونوں کے درمیان دوستانہ روابط استوار ہوئے جو بڑھتے بڑھتے برادرانہ تعلق تک پہنچ گئے۔ ثاقب صاحب کے والد محترم نے تقریباً بارہ سال تک بھوپال میں قیام کرنے کے بعد ۱۸ اپریل ۱۸۹۸ء کو وہاں سے ترکِ سکونت کر کے لکھنؤ میں مستقل بود و باش اختیار کر لی۔ اس تفرقۂ ظاہری کے بعد اگرچہ نکہت اور ثاقب کو پھر کبھی زیادہ عرصے تک ساتھ رہنے اور گزشتہ صحبتوں کی یاد تازہ کرنے کا موقع نہیں ملا لیکن قلبی تعلق کی پائیداری اور محبت و اخلاص کی گرم جوشی بدستور قائم رہی اور گاہ بگاہ ملاقاتوں اور خطوط کے ذریعے تبادلہ

خیال کی صورت میں رابطۂ اخوت و اتحاد کی تجدید و استحکام کا سلسلہ ۱۹۲۶ء میں مرزا صاحب کے انتقال کے زمانے تک برابر جاری رہا۔ ۱۹۲۵ء کے آس پاس نکہت نے ثاقب صاحب سے اپنے دیرینہ اور روز افزوں مراسم کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ:

"میرے اور ان کے تعلقات محبت اگرچہ حقیقتاً روزِ ازل سے باہم مربوط تھے لیکن باعتبار ظاہر جس روز سے کہ انھوں نے بھوپال میں قدم رکھا تھا، قائم ہوئے اور اب تک صرف مستحکم ہی نہیں بلکہ بحمد اللہ یوماً فیوماً رو بترقی ہیں۔ خواہ اس کا سبب ظاہری ہم مذاقی فن ہو یا مرزا صاحب کے خاص اوصاف ...... زمانۂ قیام بھوپال میں تین آدمی تھے جن کو یک جان و سہ قالب کہا جاتا تھا اور جن میں سے ایک دوسرے پر نہ کسی کے حالات مخفی تھے اور نہ باہمی کسی قسم کی مغائرت بلکہ تقریباً وہی تعلقات تھے جو نہایت مخلص حقیقی بھائیوں میں ہونا چاہئیں ــــ مولوی عبداللہ خاں صاحب مرحوم مقبل، مرزا ذاکر حسین صاحب ثاقب اور شاکر حسین مقبل مرحوم تو اپنے فرزندانِ معنوی کو اپنے ساتھ لے کر ملکِ عدم میں جا بسے اور جس طرح وہ آنکھوں سے نہاں ہیں، اسی طرح ان کے زادہ ہائے طبع اب دو فرد باقی ہیں اور اپنے وقت کے منتظر لیکن بظاہر ان میں سے ایک یعنی ثاقب کی نسبت امید ہے کہ وہ دنیا میں اپنی عظیم الشان یادگار چھوڑ جائیں گے۔ رہا دوسرا، اول تو اس نے وہ راستہ ہی چھوڑ دیا، دوسرے جو کچھ اس کے پاس ہے ...... ملک میں پرکھنے والے ہی اس کے مفقود ہیں۔"

ثاقب مرحوم مزاجاً نہایت نفاست پسند، وضع دار اور با اصول واقع ہوئے تھے۔ خطوط نویسی کے سلسلے میں بھی ان کے کچھ ضابطے تھے جن کے وہ تا عمر پابند رہے۔ وہ جب کسی کو خط لکھتے تو آئندہ حوالے اور یادداشت کی غرض اس کی ضروری تفصیلات ایک رجسٹر میں درج کرایا کرتے تھے۔ اسی طرح خطوط کا ضائع کر دینا یا بے احتیاطی سے ادھر ادھر ڈال دینا ان کے نزدیک بد تہذیبی اور بے سلیقگی کی علامت تھا۔ چنانچہ وہ باہر سے اپنے نام موصول ہونے والے تمام خطوط ان کی آمد اور روانگیِ جواب کی تاریخوں کے انضباط کے ساتھ پوری باقاعدگی سے محفوظ رکھتے تھے۔ مرزا صاحب کے بھوپال سے ترکِ قیام کے بعد دونوں کے درمیان سلسلۂ مراسلت کی مدت تقریباً اڑتالیس سال کو محیط ہے۔ اس عرصے میں دونوں طرف سے صدہا خطوط کا تبادلہ ہوا۔ چنانچہ برسوں تک جمع ہوتے رہنے والے ذخیرہ خطوط میں سب سے زیادہ تعداد مرزا صاحب ہی کے مکتوبات کی تھی۔ یہ بیش قیمت ذخیرہ نکہت نے اپنے انتقال (۲۳ دسمبر ۱۹۵۶ء) سے سال ڈیڑھ سال قبل بعض مصلحتوں کی بنا پر خود ہی نذرِ آتش کر دیا۔ ان مصلحتوں میں غالباً بعض ایسے رازوں کے اخفا کی خواہش سرِ فہرست تھی جن کے انکشاف کو وہ وضعداری کے منافی تصور کرتے تھے۔

ان کے بعض قریبی اعزا اور ارادت مندوں کا خیال تھا کہ ثاقب اپنے کلام پر ان سے مستقلاً اصلاح لیتے ہیں، لیکن یہ بات اگر ان کی موجودگی میں برسبیلِ تذکرہ بھی کسی کی زبان پر آجاتی تو وہ یہ کہہ کر سختی کے ساتھ اس کی تردید کرتے تھے کہ ثاقب اہلِ زبان ہیں، نہ انھیں میرے مشورے کی ضرورت ہے اور نہ مجھ میں یہ صلاحیت کہ ان کے کلام پر اصلاح دوں۔ اگر خطوط کا یہ سرمایہ ضائع نہ ہوا ہوتا تو نہ صرف یہ کہ اس مسئلے کا تفصیل کے ساتھ جائزہ لیا جا سکتا تھا بلکہ ثاقب کی کتابِ زندگی کے بعض ابواب بھی زیادہ صحت کے ساتھ قلمبند کیے جا سکتے تھے۔ تاہم اب بھی اس ربطِ باہمی کی یادگار کے طور پر ثاقب صاحب اور نکہت مرحوم کی جو تحریریں باقی رہ گئی ہیں، ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نکہت کے ارادتمندوں کی متذکرہ قیاس آرائی یکسر بے بنیاد نہ تھی۔ اس سلسلے میں یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ ثاقب صاحب کی پختہ گوئی اور قادر الکلامی کے بارے میں خود لکھنؤ کے بعض ذی علم اور باذوق حضرات کے ذہنوں میں شبہات موجود تھے اور وہ ان کے اکثر اکتسابات کو ان کی رسائیِ طبع سے بالاتر تصور کرتے تھے۔ چنانچہ مرزا جعفر حسین صاحب اپنے ایک مضمون میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

"ثاقب مرحوم ..... کے بارے میں ایک مدت تک اسی شہر لکھنؤ کے بعض ممتاز حلقوں میں یہ کہا جاتا رہا کہ وہ خود کچھ نہیں کہہ پاتے اور مشاعروں میں جو غزلیں پڑھتے ہیں، وہ شمس العلماء مولانا سید سبط حسن کی کہی ہوئی ہوتی ہیں..... (حتیٰ کہ) ... ایک وقت

وہ آگیا تھا کہ ثاقب کے اس معرکہ آرا شعر کے بارے میں کہ:

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

بہت سے لوگ قسمیں کھا کھا کر یہ کہنے لگے تھے کہ یہ شعر مولانا سید سبط حسن صاحب کا ہے۔۔۔"

(بیسویں صدی کے بعض لکھنوی ادیب۔ اپنے تہذیبی پس منظر میں ۱۰۲ و ۱۰۳)

اوپر کی سطور میں جن باقی ماندہ تحریری شہادتوں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں نکہت کا متذکرہ روزنامچہ مراسلات، ثاقب صاحب کے حسب فرمائش ان کی طرف سے کہی ہوئی چند نظموں اور تاریخی قطعات کے مسودے اور ثاقب صاحب کے چھ خطوط اور پانچ متفرق تحریریں شامل ہیں جو محض اتفاقی طور پر یا کسی وقتی ضرورت و مصلحت کے تحت دوسرے کاغذات کے ساتھ رکھ دی گئی تھیں اور اس طرح ضائع ہونے سے محفوظ رہ گئیں۔ ان میں قدیم ترین تحریر ۵ اپریل ۱۹۱۲ء کی ہے۔ یہ ثاقب صاحب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ان کی ایک غزل ہے جو مطبوعہ دیوان کے صفحہ ۳ پر درج ہے اور اس مطلعے سے شروع ہوتی ہے ؎

دل کو تاکید وفا ہے کہ فنا ہو جانا
درد کو حکم قضا ہے کہ دوا ہو جانا

دیوان میں یہ غزل یکم اپریل ۱۹۱۲ء کے تحت درج کی گئی ہے اور ستائیس اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کے برخلاف نکہت کو بھیجی ہوئی نقل میں اشعار کی مجموعی تعداد صرف سترہ ہے۔ ان میں مطبوعہ اشعار میں سے تیسرا، چوتھا، چھٹا، ساتواں، آٹھواں، نواں، گیارہواں، چودھواں، پندرھواں، سولھواں اور اکیسواں شعر شامل نہیں اور مندرجہ ذیل ایک شعر زیادہ ہے ؎

ڈھونڈنے سے نہ ملا میں لحدوں میں تو کیا
مرنے والے اسے کہتے ہیں فنا ہو جانا

تعداد اشعار کے اس فرق سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مطبوعہ اشعار میں سے گیارہ شعر ۵ اپریل ۱۹۱۲ء کے بعد کہے گئے ہیں۔ جن اشعار میں ترمیم اصلاح کی گئی ہے ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

قلمی ۔ کم سمجھتا ہے دل الفت میں فنا ہو جانا — نہیں معلوم مقدر میں ہے کیا ہو جانا
مطبوعہ ۔ محبت — دل کی قسمت میں ہے کیا جانیے

قلمی ۔ طشت از بام ہوا راز وفا غم یہ ہے — ورنہ کچھ شاق نہ تھا سر کا جدا ہو جانا
مطبوعہ ۔ بات نہ تھی

قلمی ۔ ڈھونڈتا ہے چمن عشق میں کیوں فصل بہار — خون رلوائے گا زخموں کا ہرا ہو جانا
مطبوعہ ۔ کیا

قلمی ۔ جیلا صبر ہے آسان اگر یاد رہے — ہم کو دم توڑتے دیکھو تو خفا ہو جانا
مطبوعہ ۔ آساں جو نہیں

ان اصلاحوں اور اضافوں کے بارے میں یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کس کے نتائج فکر ہیں تاہم اس تحریر سے اختلاف متن اور زاید اشعار کے زمانۂ تصنیف کے بارے میں جو معلومات حاصل ہوتی ہے اس کے مفید و کار آمد ہونے میں شبہ نہیں کیا جا سکتا۔

ثاقب کی ایک اور تحریر جو نسبتاً زیادہ اہم ہے "شیخ حبیب اللہ صاحب کے فرزند شیخ علی بہادر کی شادی کے سہرے اور اس سے متعلق ایک مختصر وضاحتی نوٹ پر مشتمل ہے۔ رجسٹر مراسلات کے مطابق یہ سہرا مع ایک قطعہ تاریخ کے جو صفحہ ۲۰۳ پر درج دیوان ہے، چہار شنبہ ۲۴ ذی قعدہ ۱۳۵۱ھ مطابق ۲۲ مارچ ۱۹۳۳ء کو ثاقب صاحب کے نام ارسال کیا گیا تھا۔ سہرے کے اشعار کاغذ کے ایک طرف لکھے ہوئے ہیں، دوسری طرف یہ نوٹ تحریر ہے:

"مقطع خاص فرمائش سے کہا گیا ہے۔ اس بچہ کی شادی خالہ زاد بہن کے ساتھ ہونے والی ہے لڑکی کے متعلق مجھ سے بیان کیا گیا ہو کہ وہ اعلیٰ درجہ کی تعلیم یافتہ اور انگلستان کی بی۔ اے پاس ہے اور کسی طرح علمی قابلیت میں نوشاہ سے کم نہیں ہے۔۔ اس مقطعے پر خاص نظر ڈالیے گا"

ثاقب کی اس تاکیدی فرمائش سے قطع نظر کہ "مقطع پر خاص نظر ڈالیے گا" اس سہرے کا اصلاح شدہ مسودہ دونوں کے درمیان مشورۂ سخن کی نوعیت کو پوری طرح واضح کر دیتا ہے۔ ان اصلاحات کی روشنی میں نکہت اور ثاقب کے معیار فکر و نظر اور قدرت کلام کے فرق کا بھی بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ سطور ذیل میں یہ اشعار مجوزہ ترمیموں کے ساتھ نقل کیے جاتے ہیں۔ آخر کا ایک شعر اور مقطع نکہت کا اضافہ ہے:۔

ثاقب — یہ روح و جانِ مبارک ہو بیاہ کا سہرا | علی بہادر جانی کے گھر ترا سہرا

اصلاحِ نکہت — ہے از دیادِ احبا کے جان و دل کا ثمر

ثاقب — بہارِ حسن نمایاں ہے سر سے تا بقدم | چمن کی جان ہے پھولوں کا خوشنما سہرا

اصلاحِ نکہت — دکھا گیا ہے کیا ترا سہرا

ثاقب — نہ کیوں ہے زیب دہِ یمن و سعادت و اقبال | ہے سر پہ سایہ فگن صورتِ ہما سہرا

اصلاحِ نکہت — دلیل ہے یہ سعادت کی تیری نوشاہا

ثاقب — شگفتہ غنچۂ خاطر ہوئے مرادِ دلی | کہ والدین کا ہے عین مدعا سہرا

اصلاحِ نکہت — کھلیں جو دیکھ کے آنکھیں تو کیا تعجب ہے

ثاقب — عروس جو ہے قابل ہیں کہ ثاقب | شرف کا دیکھیے نوشہ کے سر بندھا سہرا

اصلاحِ نکہت — یگانہ ہیں نوشاد | دونوں

نہ کیوں ہو بزم طرب جلوہ گاہِ مہر و قمر | ہے جمع یہ زن جبیں نورِ صبح کا سہرا

جو لوگ سنتے ہیں کہتے ہیں وہ یہ سب آکر

کہا ہے حضرت ثاقب نے واہ کیا سہرا

۱۰ اکتوبر ۱۹۴۲ء کا مندرجہ ذیل خط جو ایک دوپٹے کی تیاری سے متعلق ہے اور بالکل نجی نوعیت کا ہے، اس اعتراف سے شروع ہوتا ہے کہ ثاقب اپنی غزلوں پر اصلاح کے معاملے میں نکہت کی رائے کا احترام کرتے تھے۔ لکھتے ہیں:

"برادرِ معظم و محترم دامت معالیکم۔ بعد تحیاتِ زاکیات آنکہ۔ غزل اب بالکل ٹھیک ہے۔ دوپٹے کا پارسل آج کی ڈاک سے روانہ کیا جا رہا ہے۔ آنچل پانچ انگل چوڑے ہیں اور یہی اس دوپٹے کے لیے زیب ہیں۔ دوپٹے پر کمر بنی ہیں مع پھولوں اور بیچوں کے بنائی گئی ہے۔ اگر چکا موجود ہوتا تو آنچل بھی منگوا دیے جاتے۔ اس کی تیاری میں کل ۱۱۲ صرف ہوئے ہیں۔ بچوں کو سلامتی کی دعا میں۔ والسلام

دوپٹے پر ساڑھے آٹھ تولہ مال ہے۔

نیاز کیش

میرزا ثاقب..."

ان تحریروں کے علاوہ روزنامچۂ مراسلات کے بعض اندراجات بھی جس حقیقت پر شاہد ہیں کہ ثاقب اکثر اپنا کلام اصلاح کی غرض سے نکہت کے پاس بھیجتے رہتے تھے اور وہ ان کی ایک ملک سنوا لینے پر مناسب توجہ صرف کرتے تھے۔ مثال کے طور پر اندراج نمبر ۲۸۳ کے تحت مکتوب مورخہ جون ۱۹۱۳ء کے خانۂ کیفیت میں "بجواب درباب تعویق ارسالِ غزل ہائے اصلاح طلب ایشاں" اور ۷ جون سنہ مذکور کے خط (اندراج نمبر ۲۸۵) سے متعلق اس خانے میں "بجواب مع غزلیات اصلاح شدہ" جیسی عبارتیں موجود ہیں۔ ان اندراجات اور ۱۰ اکتوبر ۱۹۴۲ء کے منقولہ بالا خط سے بظاہر ہے کہ ثاقب اور نکہت کے درمیان دوستانہ مشورۂ سخن کا سلسلہ عمر کے ہر دور میں قائم رہا۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا صحیح نہ ہوگا کہ ثاقب اچھے شعر کہنے پر قادر نہ تھے یا ان کی ہر غزل زبان و بیان کے اعتبار سے اصلاح کی محتاج ہوتی تھی۔ انھوں نے نکہت سے مشورے کی مہلت پائے بغیر بھی معرکے کے طرحی مشاعروں میں کامیاب غزلیں پڑھیں اور اہلِ نظر سے اپنے حسنِ کلام کی داد حاصل کی لیکن ایسے مواقع پر وہ بالعموم طویل غزلیں کہہ کر ان میں سے حسبِ ضرورت اشعار انتخاب کر لیا کرتے تھے اور مشاعرے کے بعد یہ غزلیں حسبِ دستور نکہت کے پاس اظہارِ رائے کے لیے بھیج دی جاتی تھیں۔ اس ضمن میں ان کی تین مشہور ہم طرح غزلوں کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ یہ غزلیں مختلف اوقات میں الہ آباد، لکھنؤ اور بڑھانہ ضلع مظفرنگر کے عظیم الشان اور یادگار مشاعروں میں پڑھی گئی تھیں۔ ان تینوں مشاعروں کے یکے بعد دیگرے انعقاد اور ان کے غیر معمولی اہتمام نیز ان میں ثاقب کی غزلوں کی بے پناہ مقبولیت کا تذکرہ کرتے ہوئے مرزا جعفر حسین صاحب لکھتے ہیں:

"اس زمانے میں ایک ہی طرح مختلف مقامات کے مشاعروں میں دی جاتی تھی۔ چنانچہ ایک ایسا ہی مشاعرہ ہمیشہ یادگار رہے گا۔ یہ مشاعرہ (لکھنؤ میں) حامد علی خاں بیرسٹر مرحوم کے یہاں ۱۹۱۳ء میں منعقد ہوا تھا جو تین شبانہ روز تک مسلسل چلتا رہا۔ یادگار نشست تھی۔ کہا جاتا تھا کہ تاجدارانِ اودھ کے زمانے میں بھی اتنا عظیم الشان مشاعرہ کبھی نہیں ہوا۔ دل سے، بسمل سے، قاتل سے ردیف و قوافی میں طرح تھی۔ اس مشاعرے کے صرف پانچ چھ مہینے پہلے اسی زمین اور انھیں قوافی اور ردیف میں ایک بڑا مشاعرہ مسلم ہوسٹل الہ آباد یونیورسٹی الہ آباد میں ہو چکا تھا اور اس مشاعرے میں بھی ثاقب مرحوم کی غزل تمام دوسرے شعرا کی غزلوں کے مقابلے میں زیادہ مقبول اور کامیاب

تھی۔ راقم الحروف اور شہر کے دوسرے بہت سے لوگ اس غزل کو سن چکے تھے اور متعدد اشعار ہر ایک کی زبان پر چڑھے ہوئے تھے۔ ہر ایک اس اشتیاق میں بے چین تھا کہ دیکھیں ثاقب اب اس کے علاوہ اور اس سے بہتر ساتھ ہی پرانے اشعار سے الگ ہوکر کیا کہتے ہیں۔ بیرسٹر صاحب کے یہاں کے مشاعرے کی پہلے ہی سے دھوم تھی۔ نہ صرف لکھنؤ کے چھوٹے بڑے بلکہ دور دور سے شعراء خود تھے اور ان سب کے آنے کی خبر تھی۔ وہ سب آئے بھی اس لیے دو شبانہ روز (کذا) مشاعرہ چلتا رہا۔ ثاقب مرحوم نے نئی اور تازہ غزل پڑھی۔ اس مشاعرے میں بھی انھیں کی غزل نے میدان جیتا۔ اب لکھنؤ کے سخن فہموں اور مذاق سلیم رکھنے والوں کے لیے دونوں غزلوں کے چیدہ چیدہ اشعار ورد زبان تھے .... ابھی تک یہ اشعار لوگوں کے حافظے میں محفوظ تھے کہ یہ خبر آگئی کہ ایک عالی شان مشاعرہ کسی انجمن کی طرف سے جانسٹھ ضلع مظفر نگر میں ہو رہا ہے اور اس مشاعرے میں بھی وہی طرح دی گئی ہے جس میں غزل کہہ کر دو مرتبہ ثاقب میدان جیت چکے تھے۔ یہ بھی سنا گیا کہ اس مشاعرے کی صدارت بھی ثاقب ہی فرمائیں گے۔ چنانچہ وہ مشاعرہ بھی ہوا۔ ثاقب مرحوم نے صدارت فرمائی اور اسی طرح میں تیسری غزل کہی۔"

(بیسویں صدی کے بعض لکھنوی ادیب ص، ۹ و ۹۸)

ان میں سے پہلی دو غزلیں دیوانِ مطبوعہ کے صفحات ۱۶۹ تا ۱۷۱ پر درج ہیں اور پندرہ پندرہ اشعار پر مشتمل ہیں۔ مرزا جعفر حسین صاحب نے بھی اپنے مضمون میں ان کے اشعار کی تعداد پندرہ پندرہ ہی بتائی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ پہلے مشاعرے کی غزل اصلاً بائیس اشعار پر مشتمل تھی اور دوسرے مشاعرے کے موقعے پر کل تیس اشعار کہہ کر انھیں پندرہ اور سترہ اشعار کی دو غزلوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ حسنِ اتفاق سے یہ تینوں غزلیں خود ثاقب صاحب کے قلم کی لکھی ہوئی راقم السطور کے ذخیرۂ نوادر میں محفوظ ہیں۔ مشاعرہ الہ آباد (منعقدہ ۱۴ نومبر ۱۹۱۴ء) کی غزل پر کوئی تاریخ درج نہیں ہے۔ اس میں مطبوعہ غزل کی بہ نسبت آٹھ شعر فاضل ہیں۔ ان میں سے پانچ شعر دیوان کی تیسری غزل مورخہ ۳ مئی ۱۹۲۳ء میں پہلے، تیسرے، آٹھویں، گیارھویں اور بارھویں نمبر پر درج ہیں، باقی تین شعر جو دیوانِ مطبوعہ میں موجود نہیں، درج ذیل ہیں ؎

ابھی ہوں دور، اچھا، حشر میں کچھ کر دکھاؤں گا
مرے ہاتھوں کو ملنا فرض ہے دامانِ قاتل سے

اسیری میں بھی حاصل ہے مرے نالوں کو آزادی
زبانِ حال دب سکتی نہیں شورِ سلاسل سے

ہے شرطِ زندگی زنداں میں رہنا اور مر جانا
گلا ہے طوق سے خوش پاؤں راضی ہیں سلاسل سے

غزل مطبوعہ کا ساتواں شعر ؎

مرے دل کا سفینہ ہے اس آفت خیز دریا میں
جہاں چلتی ہیں طوفانی ہوائیں ذکرِ ساحل سے

اس اولین مسودے سے غائب ہے۔ یہ غالباً ترتیب دیوان کے وقت لکھنؤ کے مشاعرے کی غزل منتخب سے نکال کر اس غزل میں شامل کیا گیا ہے۔ دیوان میں اس غزل کا پانچواں شعر اس طرح شائع ہوا ہے ؎

اسیری ہے مقدر میں تو کوئی غیر کیوں چھیڑے
قفس ہو اور میں بیٹھا ہوا باتیں کروں دل سے

ثاقب صاحب کی تحریر کے مطابق اس شعر کے مصرعِ اول کی ابتدائی شکل یہ تھی۔ ع

نصیبوں میں اسیری ہے تو کوئی اور کیوں چھیڑے

اس غزل کے بعض اشعار پر ثاقب نے مختصر وضاحتی نوٹ بھی لکھے ہیں جن سے ان شعروں کے بارے میں ان کی ذاتی پسند کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ تمام نوٹ متعلقہ اشعار کے ساتھ سطورِ ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں:۔

یہ شعر تو یقینی جناب کی سمجھ میں نہ آئے گا۔

نمایاں ہو بہت کچھ عشق کی منزل مری آسانی ‏ ‏ ‏ مرے دل کی تمنا جب نکل سکتی ہو محمل سے

یہ میں نے نیا کہا ہے، بالکل اچھوت۔ (کذا)

سوادِ ظلم مظلوموں کا ماتم آپ کر لے گا ‏ ‏ ‏ کبھی ہیں جب کبھی شمعیں دھواں اٹھا ہے محفل سے

یہ بھی غور طلب ہے۔

نہیں معلوم نقشِ بوریا بگڑا کہ باقی ہے ‏ ‏ ‏ اسی کو چھوڑ کر بستر اٹھاتا کوئے قاتل سے

یہ بھی نیا ہے۔

حدِ ہستی بہت کچھ نیستی تک کھینچ لایا ہوں ‏ ‏ ‏ ملا دوں گا کسی دن دیکھنا منزل کو منزل سے

یہ بھی غور طلب ہے۔

ہے شرط زندگی زنداں میں پہنا اور مر جانا ‏ گلا ہو طوق سے خوش پاؤں راضی ہیں سلاسل سے

یہ خیال بھی نادر ہے۔

دیا کرتے ہیں لو ہر وقت جن کی قبر کے پتھر ‏ یہ شمعیں گل ہوئیں کیوں کر ہوائے تیغ قاتل سے

یہ قول ہو اثر کا جواب ہے:

مرے چھوٹے ہوئے صحرا کی گرد ابتک نہیں بیٹھی ‏ ندا دیتا ہے ہر ذرہ کہ میں گزرا ہوں منزل سے

مشاعرۂ لکھنؤ کے لیے کہی گئی دونوں غزلیں ایک خط کے ساتھ منسلک ہیں۔ یہ خط ثاقب کی شخصیت اور شاعری سے متعلق ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے مطالعے سے ایک طرف تو لکھنؤ کے متذکرہ مشاعرے کی امتحانی نوعیت اور اس میں کامیابی کے لیے ان کی فکرمندی کا اندازہ ہوتا ہے اور دوسری طرف الہ آباد کی ہم طرح غزل کے سلسلے میں معاصر اساتذہ کے متضاد ردِ عمل کی کیفیت سامنے آتی ہے' اس لیے اسے تمام و کمال سطور ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:

کٹڑہ ابو تراب خاں لکھنؤ ‏ یکم اپریل ۱۹۱۵ء

برادر مکرم و معظم دامت معالیکم۔ تسلیم۔ رائے بریلی کا مشاعرہ مع الخیر کامیابی کے ساتھ ختم ہو گیا۔ غزل ان شاء اللہ بھیجوں گا۔ معرکہ کل در پیش ہے۔ خدا ہی آبرو رکھے۔ دماغ آج کل بہت پریشان ہے۔ طبیعت قابو میں نہیں آتی۔ ڈانواڈول ہے۔ اسی عالم میں جو کچھ کہا گیا حاضر خدمت ہے۔ کل ۲۲ شعر کہے ہیں جن میں سے ۱۵ شعر انتخاب کر لیے ہیں حالانکہ مشاعرہ میں کل ۱۳ شعر کی قید ہے۔ مگر میں نے بنظر احتیاط دو اور اضافہ کر لیے ہیں۔ انتشار حواس کے باعث اندازہ نہیں کر سکتا کہ میں نے انتخاب صحیح کیا ہے یا غلط۔ علیل کی رائے بھی علیل ہوتی ہے۔ بہر حال اب آپ تصفیہ فرمائیں۔ میں تو کل اوس ۱۵ شعر دل والی غزل میں سے ۱۳ شعر پڑھ ہی دونگا۔ رہی دوسری غزل وہ داشتہ آید بکار کی مصداق ہے۔ شاید پھر بھی مصرع طرح کیا جائے تو آئندہ محنت نہ کرنا پڑے گی۔ آپ براہِ عنایت بجمعیتِ حواس و ہوش۔ مذاق حال میں ڈوب کر میری غزل پر نظر ڈالیئے۔ جو شعر بالکل ڈھیلے ہوں اون کو تو قلم انداز فرمائے اور جو قابل ترمیم ہوں اوس سے مجھکو مطلع فرمائے تاکہ اون کو از سر نو درست کروں۔ افسوس ہے کہ مجھسے غزل کہی نہیں گئی۔ کیا کروں جی ہی نہیں لگتا۔ یہ جو کچھ شعر کہے ہیں، کھینچا تانی سے کہے ہیں۔ ہر ہر قدم پر فکر کو کوڑا لگانے کی ضرورت پڑی ہے۔ میرے دماغ میں جو کچھ سرمایہ تھا ختم ہو گیا۔ غالباً اس غزل نے جیبھ چھیننے کیلئے معطل اور بیکار کر دیا۔ یارانِ طریقت میری غزل کے جواب کی فکر میں مصروف

نصیبوں جل اسیری ہے تو کوئی اور کیوں چھیڑے
قفس ہو اور میں بیٹھا ہوا باتیں کروں دل سے

اس شعر کے جواب کی بیحد فکریں کی جا رہی ہیں۔ باقی، شعر غزل میں اور ہیں جو ناطقہ بند کیے ہوئے ہیں۔ صفی صاحب اور عزیز صاحب سے ملاقات ہوئی تھی کہتے تھے کہ بھائی تم نے تو ایسی غزل کہی ہے کہ حدیں کھینچ دی ہیں۔ بھلا اس غزل کا کیا جواب ہو سکتا ہے۔ الحمد ابھی تک تو جس سے ملاقات ہوئی اوسنے اپنا عجز ہی ظاہر کیا، لیکن در پردہ کیا ہے' اس کا علم خدا کو ہے۔ سنا ہے کہ پروفیسر مرزا محمد ہادی صاحب نے بھی غزل کہی ہے اور اونکا دعویٰ ہے کہ ۲ شعر اونہوں نے اپنی غزل میں ایسے کہے ہیں کہ جن کا جواب دنیا میں ممکن نہیں ہے۔ بھائی سب کی باتیں سنتا ہوں اور خاموش بیٹھا ہوں۔ جو خدا چاہیگا وہی ہوگا۔ بعض احباب کی یہ رائے ہے کہ غزل بہتر کے پڑ ہو یعنی کچھ شعر اس غزل کے اور کچھ اوسکے مگر میری ہمت اسکو گوارا نہیں کرتی۔ اگرچہ غزل ختم کر چکا ہوں بلکہ مشاعرے میں پڑھنے کے لئے لکھ بھی لی ہے پھر بھی اس خیال میں ہوں کہ شاید کوئی شعر اور نکل آئے، حالانکہ اب ایک مصرع سمجھ میں نہیں ہوتا (کذا)

گو نالہ نارسا ہو نہ ہو آہ میں اثر
میں نے تو کچھ کمی نہ کی جو جیسے ہو سکا

صاحبزادی سلمہا کو دعا کہئے اور اپنی خیریت مزاج سے مطلع فرمائیے اور جناب حفظ الکریم صاحب کو لکھئے کہ اب مجھکو فرصت ہے وہ ایفائے عہد فرمائیں تاکہ شرف نیاز حاصل کروں۔ میں اب بحمد اللہ کسی قدر اچھا ہوں۔ والسلام مع الاکرام
عقیدت کیش مرزا ثاقب

بتّیس اشعار کی ان دو غزلوں میں سے جو اس خط کے تیسرے اور چوتھے صفحے پر منقول ہیں، پندرہ شعروں والی پہلی منتخب غزل کے بارہ شعر دیوانِ مطبوعہ کی غزل مورخہ ۲ اپریل ۱۹۱۵ء (مندرجہ صفحہ ۱۰) میں موجود ہیں۔ باقی تین اشعار میں سے ایک ایک شعر پہلی اور تیسری غزل میں شامل کر دیا گیا ہے۔ مشاعرۂ الٰہ آباد کی غزل میں شامل کیا گیا شعر اوپر نقل کیا جا چکا ہے۔ دوسرا شعر جو تیسری غزل کی زینت ہے، یہ ہے ؎

نقط اک اہلِ زنداں کیا، انھوں نے بھی سنے ہوں گے
مرے نالے بہت اونچے گئے شورِ سلاسل سے

مطبوعہ غزل سے خارج کیا گیا تیسرا شعر "غزلِ منتخب" کا مطلعِ ثالث ہے۔ یہ مطلع جو دیوان کی کسی غزل میں موجود نہیں، درج ذیل ہے ؎

تمنّا کی شکایت کیا جو نکلے آہ مشکل سے
یہ کس نے پھیر لیں آنکھیں کہ دنیا پھر گئی دل سے

مطبوعہ غزل کا تیسرا مطلع اور نواں اور چودھواں شعر پہلے مشاعرے کے لیے منتخب اشعار میں شامل نہیں تھا۔ یہ تینوں اشعار بعد میں اسی سلسلے کی دوسری غزل سے انتخاب کر کے اس غزل میں داخل کیے گئے ہیں۔ موجودہ ترتیب کے مطابق اس غزل میں بارہویں نمبر پر مندرج شعر کا پہلا مصرع ابتدا میں اس طرح نظم کیا گیا تھا۔ ع

تڑپتا ہے شبِ غم یوں کہ میں چپ رہ نہیں سکتا

بعد میں "چپ رہ نہیں سکتا" کو "کچھ کہہ نہیں سکتا" سے بدل دیا گیا۔

سترہ اشعار کی دوسری غزل کے باقی چودہ شعروں میں سے چھ شعر تیسری مطبوعہ غزل میں جو ۳ مئی ۱۹۲۳ء کو جانسٹھ کے مشاعرے میں پڑھی گئی تھی، چوتھے، پانچویں، چھٹے، ساتویں، نویں اور تیرہویں نمبر پر درج ہیں۔ باقی آٹھ شعر جو غالباً نظرِ ثانی کے وقت قلمزد کر دیے گئے یہ ہیں ؎

نہیں کیا، اک جہاں برہم ہے اپنے سازِ محفل سے
نکلتی ہے صدا فریاد کی ٹوٹے ہوئے دل سے

تماشا قابلِ عبرت ہے، دیکھیں دیکھنے والے
کہ میرا ڈوبتا بیڑا نظر آتا ہے ساحل سے

میں اس وحشت سرائے بیکسی کا رہنے والا ہوں
جہاں انسان تو کیا وہم بھی جاتا ہے مشکل سے

بلا گردانِ الفت سر فروشِ بے نشانی ہیں
رہا برسوں مگر واقف نہیں ہوں نامِ منزل سے

کنارہ ہے مگر میرا سفینہ آ نہیں سکتا
ہوا کا ذکر کیا، دریا بھی منہ موڑے ہے ساحل سے

شبِ طولانی فرقت زیادہ ہوتی جاتی ہے
لحد والے تو باتیں بھی نہیں کرتے کبھی دل سے

شبِ غم یوں بسر کرنا، یوہیں جل کر فنا ہونا
یہی جلے سنے میں نے زبانِ شمعِ محفل سے

قدم رکھنا تھا زنداں میں کہ چپ سی لگ گئی مجھ کو
قیامت خیز نالے دب گئے شورِ سلاسل سے

ان تینوں ہم طرح غزلوں کے ان ابتدائی نقوش سے مجموعی طور پر بارہ نئے اشعار تک رسائی کے علاوہ تدوینِ کلام کے نقطۂ نظر سے کئی اہم امور کی دریافت میں بھی مدد ملتی ہے۔ مثلاً مشاعرہ الٰہ آباد کی غزل سے کئی اشعار کا اخراج اور ایک نئے شعر کی شمولیت یہ ظاہر کرتی ہے کہ تصنیف سے اشاعت کے زمانے تک غزلوں کے اشعار کی تعداد اور ترتیب میں وقتاً فوقتاً ردوبدل کیا جاتا رہا۔ یہ بات دیوانِ مطبوعہ میں غزلوں کی پیشانی پر جو تاریخیں درج ہیں، وہ قطعی اور یقینی نہیں۔ کیونکہ دوسری غزل جس پر ۲ اپریل ۱۹۱۵ء کی تاریخ درج ہے، اگرچہ اسی تاریخ کو پہلی بار پڑھی گئی لیکن اس سے کم از کم دو دن پہلے مکمل ہو چکی تھی اور تیسری غزل جس کے متعلق مرزا جعفر حسین صاحب اور جناب نہالِ رضوی صاحب (مقدمہ دیوانِ ثاقب ص ۸د) کا خیال ہے کہ یہ ۳ مئی ۱۹۲۳ء کو جانسٹھ میں ہونے والے مشاعرے کے لیے بطورِ خاص اور برِوقت کہی گئی تھی، مطلعِ ثانی کے علاوہ آٹھ سال قبل کہی ہوئی پہلی دو غزلوں سے انتخاب کیے ہوئے اشعار پر مشتمل ہے۔

نکہت کے بیان کے مطابق ثاقب کی طبیعت کو فنِ تاریخ گوئی سے مطلق لگاؤ نہ تھا (ص ۳۷۰) لیکن ان کے مطبوعہ دیوان کے آخر میں جو تاریخی قطعات اور نظمیں شامل ہیں، وہ اس فن میں ماہرانہ درک کی نشاندہی کرتے ہیں۔ یہ متضاد صورتِ حال اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ ان کا وجود ان کی رسائیِ فکر کی بجائے کسی اور کی طباعی کا رہینِ منت ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ ان میں سے دو ایک کے علاوہ باقی تمام

تاریخیں اور نظمیں بالیقین نکہت کے نتائج فکر ہیں۔ اس دعوے کی توثیق
کے بیشتر ثبوت اگرچہ ضائع ہو چکے ہیں تاہم بعض ایسے شواہد اب بھی
موجود ہیں جن سے فیصلہ کن نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر
روزنامچہ مراسلات سے معلوم ہوتا ہے کہ سید ظہیر حسن ہمشیرزادہ نواب
نصیر الممالک کی وفات کے قطعات تاریخ (مندرجہ ص ۲۵۳ و ۲۵۴)
۱۴ شعبان ۱۳۲۶ھ مطابق ۱۱ ستمبر ۱۹۰۸ء کو بمقام کلکتہ اور راجہ امیر احمد
خاں کی صاحبزادی کی ولادت کا تاریخی قطعہ (مندرجہ ص ۲۶۵ و ۲۶۶)
۲۴ ربیع الاول ۱۳۵۱ھ مطابق ۲۹ جولائی ۱۹۳۲ء کو بمقام لکھنؤ روانہ
کیا گیا تھا یا جمیل سہسوانی کے مجموعۂ کلام "طرۂ فصاحت" کی تاریخ طباعت
(مندرجہ ص ۲۵۲) اقبال منزل کی تاریخ تعمیر (مندرجہ ص ۲۶۱) اور
شیخ علی بہادر حبیب اللہ کی تاریخ کتخدائی (مندرجہ ص ۲۷۳) کے مسودات
بخط نکہت محفوظ ہیں۔ مطبوعہ قطعات تاریخ میں تین اہم قطعے شمس العلماء
مولانا سبط حسن صاحب کی وفات سے متعلق ہیں۔ تاریخ گوئی میں ثاقب
کی مہارت کے ثبوت پیش کرتے ہوئے جناب شہنشاہ حسین رضوی ان
قطعات کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ

"خطیب اعظم شمس العلماء مولانا مولوی سید سبط حسن
طاب ثراہ کی ذات والاصفات سے میرزا کو کمال خلوص اور حسن
عقیدت تھا۔ مولانا کی وفات پر جو قطعات تاریخ انھوں نے اپنی
حالت بیماری میں جبکہ وہ خود صاحب فراش تھے، نظم فرمائے ہیں،
ان کے مطالعہ سے نہ صرف میرزا کے قلبی اضطراب و کرب کا انعکاس
ہوتا ہے بلکہ دیرینہ تپاک و رسم محبت بھی مترشح ہے۔" (ص ۷۷، ۷۸)

حسن اتفاق سے ان قطعات سے متعلق ایک مسودہ بھی راقم السطور
کے ذخیرے میں موجود ہے۔ یہ مسودہ بہ تفصیل ذیل نو مادہ ہائے تاریخی
اور ان سے متعلق توضیحات پر مشتمل ہے:-

شد واصل حق چو در محرم — روح او در ادب اکبر بے نیاز (۶۸)
گو۔ قرب بشاہ کربلا یافت — داد اذن فادخلوہا خالدین
۱۳۵۴ — ۱۴۲۲ تخرجہ

شد تہی بزم علوم از جلوۂ انوار حق (۱ ۴ ۳ ۲)
۱۳۵۴
بزم جہاں تہی شد از زین صدر محفل (با ۶۸)
۱۳۵۴

درجوار قدس باد او لاحق اجداد خود (۱ ۲ ۳)
۱۳۵۴

بترتیب ہندسہ قافیہ یا دو داد
تہی از زیب بے تو بزم عالم شد
۱۳۵۴

عربی کی ایک مثل ہے موت العالم موت العالم
اس کا صحیح ترجمہ ہے
لکھ دو (لکھیے)۔ سچ ہے موت اک عالم کی اک عالم کی موت
کہیے ۱۳۵۴ھ

اس میں بھی کسر و فتح کی تقدیم و تاخیر کے ساتھ تبدیل
قافیہ کا امکان ہے

درجناں باد اقرین عیش و آرام و مرام — بھرے اللہ اس کی قبر کو جنت کے پھولوں سے
۱۳۵۴ — ۱۳۵۴

بعد صاد یہ پرچہ واپس آنا چاہیئے تاکہ مادہ ہائے بقیہ وقت
ضرورت فکر جدید سے پریشان نہ ہونے دیں۔

جیسا کہ آخری نوٹ سے ظاہر ہے، یہ مسودہ ثاقب صاحب کو اپنی
پسند کے مادے انتخاب کرنے کی غرض سے بھیجا گیا تھا۔ روزنامچۂ
مراسلات کے اندراج نمبر ۸۲۹۶ کے مطابق جس کے خانۂ کیفیت میں
"بجواب معہ مادہ ہائے تاریخ انتقال شمس العلماء سید سبط حسن
بتاریخ ۲۷ محرم" تحریر ہے، اس کی تاریخ ارسال پنجشنبہ ۶ صفر
۱۳۵۴ھ مطابق ۹ مئی ۱۹۳۵ء متعین ہوتی ہے۔ یہ پرچہ دوسرے،
چوتھے اور ساتویں مادے پر صاد کے بعد غالباً ۱۴ یا ۱۵ مئی کو واپس
ہوا اور اندراج نمبر ۸۲۹۷ کے بموجب پنجشنبہ ۱۳ صفر مطابق ۱۶ مئی کو
مندرجۂ دیوان قطعات روانہ کیے گئے۔ اس کے دسویں روز یعنی ۲۱ صفر
(۲۵ مئی) کو حسن گنج سے ثاقب صاحب کا مندرجہ ذیل خط موصول ہوا۔

حسن گنج ضلع اناؤ — ۲۱ ماہ مئی ۳۵ء

بہائی صاحب قبلہ سلامت بعد تحیات زاکیات آنکہ۔
عنایت نامہ رہین انتظار میں موصول ہو کر باعث امتنان ہوا۔

جسکے آخری فقرات بیحد تکلیف دہ تھے۔ بھائی صاحب دینا لینا کیسا میرا مال آپ کا مال ہے اور آپ کا مال میرا مال۔ اگر میں نے آپ کے مال میں سے وقتِ احتیاج کچھ لیلیا تو میں نے اپنا حصہ لیا۔ آپ کا حصہ نہیں لیا۔ جب آپ کو ضرورت پیش آئی آپ نے مجھسے لیلیا دونوں ایک ہی مال ہیں خواہ میرے پاس رہا یا آپ کے پاس۔ مہربانی سے آئندہ اس باب میں آپ اشارۃً یا کنایۃً کچھ تحریر نفرمائیں۔

یہ مصرع سمجھ میں نہیں آیا۔ بے تو ماند لاشۂ بے روح را شخص جہاں۔ (یہ اضافت کیسی ہے) غالباً بجائے اضافت کے اس مصرع میں اِیں کی لفظ رہ گئی ہے۔ یعنی

بے تو ماند، لاشۂ بے روح را شخص، ایں جہاں

تو زما گشتی جدا و شد جدا جاں از تن

امسال خربزوں کی فصل خراب ہوگئی۔ ابھی تک لکھنؤ کے بازار میں میٹھے پھل کھانے میں نہیں آئے۔ خربزے حسن گنج میں بھی ہر روز تحفۃً معقول تعداد میں کہیں نہ کہیں سے آہی جاتے ہیں۔ کیا اچھا ہو اگر جناب چند روز کیلئے حسن گنج تشریف لے آئیں اور اگر لکھنؤ میں کوئی خاص ضرورت ہے تو ہم اور آپ یہیں سے لکھنؤ چلے چلینگے۔ تشریف آوری سے دو چار روز قبل اطلاع دیجئے گا تاکہ سواری کا انتظام کردیا جائے۔ لکھنؤ سے اجگین اسٹیشن تک بذریعہ ریل گاڑی اور وہاں سے بسواری موٹر لاری یا یکہ تحصیل حسن گنج۔ اجگن سے حسن گنج پندرہ میل ہے۔ یکہ دو گھنٹے میں اور موٹر پون گھنٹے میں پہونچ جاتا ہے۔ جعفر حسین بھی متدعی ہیں کہ آپ چند روز کیلئے حسن گنج تشریف لائیں۔

ڈاکٹر عبد العلیم صاحب کی مرم توجہ سے آپ کا مسودہ گم ہوا کیونکہ ڈاکٹر عابد اس زمانے میں علی گڑھ میں تھے اور زوجہ کی علالت کے باعث انکے ہوش و حواس بجا نہیں تھے۔ باقی خیریت ہے۔ بچوں کو دعا۔

مرسلہ خاکسار

میرزا ثاقب

بیچارے عابد کی اہلیہ ہنوز بالکل صحیح و سالم نہیں ہیں علاج جاری ہے۔

گاؤں کا کام کاج چھوڑ کر جلدی حسن گنج تشریف لے آئیے اور شکر کے ساتھ خربزے کھائیے۔ اگر آپ نے تاخیر فرمائی تو خربزوں کی فصل رخصت ہو جائے گی۔

اس خط میں جس شعر کے متعلق استفسار کیا گیا ہے، وہ زیرِ بحث قطعات میں سے تیسرے قطعے کا پانچواں شعر ہے۔ اس سے جہاں یہ بات قطعی طور پر ثابت ہوجاتی ہے کہ یہ قطعات نکہت کے طبعزاد ہیں وہیں بعض حضرات کے اس حسنِ ظن کی بھی تردید ہوجاتی ہے کہ ثاقب بہت اچھی فارسی جانتے تھے یا انھیں فارسی میں طبع آزمائی پر بھی پوری قدرت حاصل تھی اور یہیں سے ہمارے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ دیوان کے آخری حصے کی بیشتر تہنیتی و تعزیتی نظمیں جن میں سے اکثر فارسی میں ہیں، نکہت کی کہی ہوئی ہیں۔ اس خط کی روشنی میں جناب شہنشاہ حسین رضوی کا یہ بیان بھی کہ جس زمانے میں مولانا سبط حسن کے انتقال کی تاریخیں نظم کی گئی ہیں، ثاقب بیمار اور صاحبِ فراش تھے، پایۂ اعتبار سے گر جاتا ہے کیونکہ اگر وہ بیمار ہوتے تو اس خط میں ضرور اس کا ذکر کرتے اور صاحبِ فراش ہونے کی صورت میں لکھنؤ سے حسن گنج تک کا سفر کرنا ان کے لیے ممکن نہ ہوتا۔

شاملِ دیوان منظومات کے علاوہ راقم السطور کی تحویل میں چند ایسے قطعات بھی ہیں جو یا تو ترتیبِ کلام کے وقت فراہم نہ ہوسکے یا دیوان کی اشاعت کے بعد کہے گئے تھے۔ ان میں راجہ امیر احمد خاں کی ولادت کا مندرجہ ذیل تہنیتی قطعہ باعتبار زمانہ سب سے قدیم ہے۔ اس کے آخری مصرعے "بارک اللہ قلب کا ہے نور آنکھوں کا سرور" سے ۱۳۳۲ھ برآمد ہوتا ہے۔ چونکہ راجہ صاحب موصوف ۱۵ ذی الحجہ مطابق ۵ نومبر ۱۹۱۴ء کو پیدا ہوئے تھے اس لیے یہ قطعہ ۱۳۳۳ھ کے اوائل میں کہا گیا ہوگا۔

یہ ولی عہدِ ریاست، نورِ چشم، آرامِ جاں ہو مبارک آپ کو فضلِ خدا سے اے حضور
کون ہے جس کو نہیں ہے اسکے آنے سے خوشی کون ہے جس کو نہیں ہے اس کے ہونیکا سرور
تہنیت کا ایک ہنگامہ بپا ہے ہر طرف ہر جگہ آراستہ ہے خلق میں اک بزمِ سور
کر رہی ہے عطر بیزی نکہتِ گل سو بسو ہو رہا ہے کو بکو سامانِ عشرت کا ظہور

اللہ اللہ یہ مہ تاباں ہو وہ یوسف جمال　　دیدۂ اعمیٰ بھی جن کی ضو سے آجاتا ہے نور

دیکھ کر بے قدری گل اس کے رخ کے سامنے　　بلبلوں پر کھبتیاں کیا کیا اڑاتے ہیں طیور

وہ سمانی اس کے عارض میں الٰہی کس طرح　　جس تجلی کی نہ لا پایا تاب ہم بھر کوہ طور

آگے نزدیک اس کی موزونی قامت کے ذرا　　سر اپنے آپ کو کیوں کھینچتا ہے اتنی دور

سایے میں ماں باپ کے یہ نونہال زندگی　　پھولتا پھلتا رہے یارب الیٰ یوم النشور

حضرت ثاقب کی از خود بستی پہ دیکھیے لوگ　　مادہ کیا ہاتھ آیا، ہو گئے نشے میں چور

کہتے تھے کچھ اور وہ لیکن خوشی میں کہہ گئے

بارک اللہ قلب کا ہے نور آنکھوں کا سُرُور

شمس العلماء مولانا سبط حسن کے انتقال کی تاریخوں پر مشتمل جس مسودے کی نقل گزشتہ سطور میں پیش کی گئی ہے۔ اس کے دوسری طرف نارائن پرشاد ورما مہر ہوانی ثم گوالیاری کے دیوان "شعاع مہر" کی طباعت کے چار قطعات تاریخ بطور مسودہ تحریر ہیں۔ ان میں سے پہلا قطعہ فارسی میں اور باقی تین قطعات اردو میں ہیں۔ پہلے تیسرے اور چوتھے قطعے میں نکہت کا خاص شامل ہے۔ دوسرا قطعہ جو درج ذیل ہے ثاقب کی طرف سے کہا گیا ہے :—

بہار فصل گل ہو کر کھپا ہوا ہے نظروں میں

جناب مہر کیا کہنا ہے اس رنگِ طبیعت کا

نگاہِ شوق پڑ کر پھر نہیں اٹھتی نہیں اٹھتی

حسینانِ معانی پر وہ جوبن ہے قیامت کا

عروس فکر الاسنہ دو بالا ہے زبانی میں

کیا تھا ملک جو تسخیر سحباں نے بلاغت کا

نظر پڑتی ہے جس کی آپ کے دیواں پہ کہتا ہے

کہ ہو اپیا زباں میں ہو اگر عالم نفاست کا

ہوا ثاقب کو یوں چھپتے فلک سے سال طبع القا

چمک اٹھا شعاع مہر سے میدان فصاحت کا

ایک قطعۂ تاریخ خود ثاقب صاحب کی صاحبزادی ممتاز جہاں بیگم کی وفات سے متعلق ہے۔ یہ کاغذ کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے پر خوشخط لکھا ہوا ہے۔ ملاحظہ ہو —

بیماری جنیں کا نہیں ملتا سراغ　　رحم کے قابل ہے ثاقب یا مجیب

چھوڑ کر بچے کو چل دی کس طرف　　میری ممتاز جہاں بیگم غریب

بعد چہلم دوسرا دن تھا کہ وہ　　کھوئی ہے شنبے کو مغرب قریب

اس کی فرقت اور اپنی بے بسی　　غم سے ہے گھر بھر کی حالت کچھ عجیب

ہے دعائے قلب محزوں سال غم　　قربت زہرا ادسے یارب نصیب

۱۳۵۸

ایک مسودہ خان بہادر سید علی احمد مہتمم بندوبست ضلع علی گڑھ کی صاحبزادی کے انتقال کی تین تاریخوں پر مشتمل ہے۔ اس مسودے کے ایک طرف اوپر کے حصے میں ثاقب کے ہاتھ کی پنسل سے لکھی ہوئی یہ عبارت ہے :—

"وفات دختر خان بہادر سید احمد علی صاحب مہتمم بندوبست ضلع علی گڑھ بتاریخ بستم ماہ مئی ۱۹۴۰ء وقت صبح بعمر ۱۸ سال"

اس کے نیچے نکہت کے قلم سے سرخ روشنائی اور باریک خط میں یہ دو قطعات تحریر ہیں :—

قیامت ہے یہ نو عمری میں بے دیکھے ہوئے دنیا

کنیز فاطمہ کا یک بیک دنیا سے اٹھ جانا

وہ تھی نور نگاہ سید احمد علی صاحب

کہ عالم اب نگاہوں میں ہے جن کی اک سیہ خانہ

نہ سمجھے تھے کہ یوں موت اس کی اک دم میں سکھا دے گی

لہو کے گھونٹ پینا عمر بھر، دن رات غم کھانا

نہ سمجھے تھے کہ دو شنبے کے دن گھر بھر پہ آ کے آفت

ربیع الثانی کی گیارہ کو وقت صبح ہے آنا

نکلی ثاقب نے حسب حال یہ تاریخ رحلت کی

ہے سچ اٹھنی جوانی میں بلا، پھولوں کا کملانا

۱۳۵۹ھ

مرگ کنیز فاطمہ پر سب ہیں سوگوار　　نامحرم بعید ہوں یا محرم قریب

اس کم سنی میں عفت و عصمت کے ماسوا　　ہر علم و فن میں دسترس اس کو تھی عجیب

ثاقب ہے سال ماتم حسرت دعائیہ

ہو عیش سازگار اسے فردوس میں نصیب　　۱۳۵۹ھ

کاغذ کی دوسری جانب پیشانی پر وسط میں "۱۱ ربیع الثانی وقت صبح دو شنبہ" لکھا ہوا ہے۔ اس کے نیچے پہلے قطعے کا اولین نا تمام

سودہ ہے۔ یہ دونوں تحریریں بھی اسی قلم اور روشنائی کی ہیں جس سے منقولہ بالا قطعات لکھے گئے ہیں۔ اس کے بعد نسبتاً جلی قلم اور سیاہ روشنائی سے یہ تیسرا قطعہ تحریر ہے ؎

دوشنبہ بود و یاز دہم از دوم ربیع — یارب چہ بد بلا کہ بہنگام بامداد
گردیدہ نور دسوئے مرکزِ صلاح — آں پیکرِ سعادت ازیں عالمِ فساد
نادیدہ نو بہارِ گلستانِ عمر و بخت — ناشاد ماندہ از سوئے دنیا و نامراد
خوش خو کنیز فاطمہ حورائے باغِ خلد — کو بہرہ ور ز تربتِ زہرا مدام باد
دخت جنابِ سید احمد علی کہ خاست — در ماتمش فغاں ز لبِ دردِ از نہاد
شد پاش پاش شیشۂ دل ہائے ناصبور — از چرخ ایں چہ سنگِ بلا یارب اوفتاد

تاریخِ رحلتش بتقاضائے دردِ دل

ثاقب نوشت "دختِ جوا مرگ ناگزاد" ۱۳۵۹ھ

یہ قطعات رجسٹر مراسلات کے اندراج نمبر ۸۴۶ کے بموجب دوشنبہ، ۷ رجب ۱۳۵۹ھ مطابق ۱۲ اگست ۱۹۴۰ء کو ثاقب صاحب کے نام روانہ کیے گئے تھے۔ اس زمانے میں وہ اپنے بڑے صاحبزادے مرزا جعفر حسین صاحب قزلباش کے پاس بجنور میں مقیم تھے۔ اندراجات نمبر ۸۴۶۵ و ۸۴۶۶ مورخہ ۳۰ جولائی و ۱۰ اگست کے مطابق نکہت بھی انہی ایام میں مرزا جعفر حسین صاحب کے حسبِ خواہش ایک مشاعرے میں شرکت کی غرض سے بجنور پہنچے تھے اور ۳۰ جولائی سے ۷ اگست تک ان کے مہمان رہے تھے۔ ثاقب صاحب نے کنیز فاطمہ کے انتقال سے متعلق تفصیلات اسی دوران میں سپردِ قلم کر کے ان کے حوالے کی ہوں گی۔

باعتبارِ زمانہ اس سلسلے کی آخری محفوظ تحریر راجہ امیر احمد خاں کے صاحبزادے کی ولادت کے دو قطعات تاریخ ہیں جو ثاقب صاحب ہی کے ایک خط مورخہ ۱۸ جنوری ۱۹۴۴ء کے حواشی پر لکھے ہوئے ہیں۔ یہ خط کلکتے میں خواجہ سر ناظم الدین کے زیرِ صدارت ۱۳ جنوری ۱۹۴۱ء کو منعقد ہونے والے ایک طرحی مشاعرے کے دعوت نامے کی پشت پر لکھا گیا ہے۔ متذکرہ قطعات میں سے ایک کا مادۂ تاریخ خود ثاقب صاحب کا نکالا ہوا ہے جو اسی خط کے ذریعے نکہت کو بھیجا گیا تھا۔ یہ مکمل خط جس کا بیشتر حصہ عبداللہ کی دوکان کے حلوا سوہن کی تعریف و توصیف پر مشتمل ہے، حسبِ ذیل میں نقل کیا جاتا ہے :-

عینِ مرادِ جان و دل و ذوالریاستین
۱۹۴۴ عیسوی
خاکسار
میرزا ثاقب

ثاقب کے ایک خط کا عکس جس کے حاشیوں پر نکہت نے راجہ امیر احمد کے صاحبزادے کی ولادت کے قطعات تاریخ بطور سودہ تحریر کیے ہیں

بھائی صاحب۔ تسلیمات عرض کرتا ہوں۔ انشاء اللہ کل کی ڈاک میں پارسل روانہ کیا جائے گا۔ حلوا سوہن عبداللہ کی دوکان کا خریدا ہوا ہے جو امین آباد میں واقع ہے۔ حلوا سوہن اس سے بہتر لکھنؤ میں دستیاب نہیں ہو سکتا۔ نوش فرمانے کے بعد آپ پھر مجھ سے خواہش کریں گے کہ تھوڑا حلوا سوہن عبداللہ کی دوکان سے خرید کر کے بھیج دو۔ دیکھئے بھائی صاحب میں نے کیسی لاجواب تاریخ نکالی ہے۔ یقین ہے کہ آپ پسند فرمائیں گے۔

عینِ مرادِ جان و دل و ذوالریاستین
۱۹۴۴ عیسوی

خاکسار میرزا ثاقب

نکہت کی تحریر کردہ یادداشت کے مطابق یہ خط ۲۵ محرم ۱۳۶۲ھ کو موصول ہوا تھا اور دوسرے دن یعنی ۲۶ محرم (۲۲ جنوری ۱۹۴۳ء) کو اس کا جواب لکھا گیا۔ خیال ہے کہ اسی خط کے ساتھ یہ قطعات بھی بھیجے گئے ہوں گے۔ پہلا قطعہ فارسی میں ہے۔ ثاقب کا مستخرجہ مادۂ تاریخ معمولی سی ترمیم کے ساتھ اسی میں نظم کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

عطا شود خدائے قدیر اے ثاقب ۔۔۔ براجہ صاحب من قدر حشم ہم جم جم
جناب راجہ امیر احمد ستودہ صفات ۔۔۔ ملک تمثال جہاں دادو سپہر حشم
بود مبارکش این نونہال گلشن جاہ ۔۔۔ ولی عہد ریاست عزیز مصر کرم
نہے کرشمۂ قدرت کہ بہر سال مسیح ۔۔۔ خود این خجستہ گہر خضر عمر عیسیٰ دم

بعہد شہ متکلم مسیح وار د بگفت
مراد جان و دل و ذوالریاستین منم ۱۹۴۳ء

دوسرا قطعہ اردو میں ہے۔ اس کے لیے نیا مادہ تلاش کیا گیا ہے ؎

ولی عہد کے دیدار رخ پر ورسے ۔۔۔ ہماری آنکھیں ہوں ٹھنڈی یہ خدائی کی دین ہے
مبارک اس کی ولادت ہو راجہ صاحب کو ۔۔۔ جو کھب گیا نظروں میں وہ نور عین ہے
ضیائے عارض تاباں یہ گر نظر کیجیے ۔۔۔ اجالا گھر کا ریاست کی زیب و زین ہے
ہو کیوں نہ جلوہ نشان حسن مردانہ ۔۔۔ ازل کے دن سے نظر کردہ حسین ہے

ترانہ سنج سن عیسوی ہے یوں ثاقب
کہ نور عین جہاں ذوالریاستین ہے یہ ۱۹۴۳ء

اس سلسلۂ گفتگو میں یہ انکشاف بھی بے محل نہ ہوگا کہ دیوان مطبوعہ میں "انتساب" اور "عرض حال" کی عبارات نیز راجگان محمود آباد اور خود ثاقب صاحب کی تصویروں کے نیچے لکھے ہوئے چاروں شعر بھی نکہت ہی کے زادۂ فکر ہیں۔ نثری عبارات کا اسلوب ثاقب صاحب کے انداز نگارش سے یکسر مختلف ہے اور اپنے مصنف کی عربی سے بہ کمال واقفیت کی غمازی کرتا ہے۔ اس کے برخلاف ثاقب صاحب کی تحریروں میں "تحفۃ الحبہ" اور "اساس البیت" جیسی مکرر غلطیاں ان کی عربی کی استعداد کے بارے میں کسی خوش گمانی کی اجازت نہیں دیتیں۔ متذکرہ اشعار کے بارے میں میں نے اپنے گھر میں سنا ہے کہ ثاقب صاحب نے پہلی تین تصویر کے لیے مناسب شعروں کی فرمائش کے ساتھ اپنی تصویر کے نیچے لکھنے کی غرض سے اپنا ہی یہ شعر انتخاب کر کے بھیجا تھا جسے نکہت نے موجودہ شعر سے بدل دیا ؎

پیش عاقل بولتا ہے عالم نقش و نگار
کہہ گئی سب کچھ خموشی پردۂ تصویر میں

ثاقب صاحب نے ایک زمانے میں جب کہ وہ داڑھی کے پابند نہیں ہوئے تھے، یہی شعر اپنے فوٹو کے ساتھ لیٹر پیڈ پر چھپوایا تھا۔ اس لیٹر پیڈ پر سے کاٹی ہوئی ایک تصویر میرے بچپن میں نانا مرحوم کے گھر میں آویزاں تھی۔

ثاقب صاحب سے قریبی تعلق رکھنے والے بعض حضرات کا بیان ہے کہ وہ اپنے کلام کی باقاعدہ ترتیب اور نگہداشت کے معاملے میں انتہائی غیر محتاط واقع ہوئے تھے چنانچہ شیخ بدر الزماں صاحب کے بقول ایک بسیط حصۂ کلام خود ان کی بے خودی کے ہاتھوں ضائع ہو گیا۔ ڈاکٹر جناب شہنشاہ حسین رضوی نے اپنے مقدمے میں ایسی ہی ایک ضائع شدہ غزل کے جو ۱۸۹۳ء میں بزمانۂ قیام بھوپال نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی کے چھوٹے بھائی نواب بہار الدین احمد خاں طالب کی فرمائش پر کہی گئی تھی، چار شعر نقل کیے ہیں۔ (ص ۵۴ و ۵۵) دراصل اسی زمانے میں نکہت کے والد محترم منشی صابر حسین صبا نے "داغ کف پا ہوں، چراغ کف پا ہوں" اور "تاب کف پا ہوں، حباب کف پا ہوں" ردیف و قوافی میں دو معرکہ آرا غزلیں کہی تھیں جو بہت پسند کی گئیں۔ اس کے بعد ہی طالب کی تحریک پر ثاقب اور مقبل نے ان میں سے ایک ایک زمین انتخاب کر کے اس میں طبع آزمائی کے جوہر دکھائے ہیں۔ نکہت اس زمانے میں سہسوان آئے ہوئے تھے اس لیے مقبل نے انھیں اپنی اور ثاقب کی اس فکر تازہ سے باخبر کرنے کے لیے یہ غزلیں ڈاک کے ذریعے ان کے پاس بھیجی تھیں۔ راقم السطور کو مقبل مرحوم کے اس دو ورقی مکتوب کے چند منتشر اور شکستہ و بوسیدہ ٹکڑے دستیاب ہوئے ہیں جنھیں بہ مشکل باہم جوڑ کر چند اشعار نقل کیے جا سکے ہیں۔ اس مکتوب کا اختتام مقبل کی اس تحریر پر ہوتا ہے :۔

" حضرت سلامت۔ بدایوں سے مذاق بدایونی کا نعتیہ کلام مع تمیر ہو تو ضرور لیتے آئیں۔ اور منشی امیر احمد صاحب یا مولوی وزیر احمد صاحب مل جائیں تو ان سے کہیے کہ حضرات مجھے خط لکھیں

اور اپنے تفصیلی حالات سے اطلاع دیجئے۔۔۔ صفر ۱۲۱۷ھ مقبل
از بھوپال"

اس سے قبل کی سطور میں مقبل کی غزل تمام ہوتی ہے جس کا مقطع اور آخری شعر کا مصرعِ اول باقی رہ گیا ہے۔ یہ دونوں شعر جس صورت میں پڑھے جاسکے ہیں، نیچے نقل کیے جاتے ہیں ؎

پتلی کی جگہ ہیں مری آنکھوں میں ترے پاؤں
ہر بہر دہ .... کفِ پا ہوں

رفتار سے کجرو کی سکھاتا ہوں رہِ راست
مقبل خضرِ راہِ صواب کفِ پا ہوں

اندازہ یہ ہوتا ہے کہ ثاقب نے اپنی انتخاب کردہ زمین میں کم از کم دو غزلیں کہی تھیں جو اس سے پہلے کے تین صفحات پر نقل کی گئی تھیں۔ ان غزلوں میں سے جو اشعار مکمل یا نامکمل صورت میں پڑھے جاسکے، وہ علیحدہ علیحدہ صفحات کی ترتیب کے مطابق سطور ذیل میں پیش کیے جارہے ہیں ؎

سہے میرے تن .... دھوکا .... کا تیر [د]اغِ کفِ پا ہو[ں]
اس بادیہ پیمائی سے رلعت کہیں مل جائے گا ایک ترا اے قحط فراغ کفِ پا ہوں
زیرِ قدمِ یار حباب است دریں فکر میں کاسۂ سر ہوں کہ ایاغ کفِ پا ہوں
خواہش ہے یہ اے گم رہی راہِ طلبِ یار جل کر ہمہ تن صورتِ داغ کفِ پا ہوں
ہر پھول تری کفش کا لے رشکِ گلستاں کرتا ہے یہ [دعوی] گل با[غ] کفِ پا ہو[ں]
ملتی نہیں سجدے کو جگہ اے قدمِ یار اک عمر سے [سرگشتہ د]اغ کفِ پا ہو[ں]

چوری سے قدم لیے کو داغ کفِ پا ہوں میں دزدِ حنا بن کے چراغ کفِ پا ہوں
روشن صفتِ شمع ہوں داغ کفِ پا ہوں میں شب روِ منزل کا چراغ کفِ پا ہوں
تل آپ کے تلوے کا حقیقت میں ہما ہے گو وہ یہی کہتا ہے کہ زاغ کفِ پا ہوں
رستے میں ترے صورتِ نقشِ قدم اے یار پامال تمنائے سراغ کفِ پا ہوں
[تلووں سے مرے خون] یہ کہتا ہے نکل کر میں بادۂ سرجوش ایاغ کفِ پا ہوں
............ل ترے کس غیرتِ گلشن کا دماغ کفِ پا ہوں
آنکھوں سے لگاتا ہوں ترے چاند سے تلوے گردوں پہ چڑھا تا میں دماغ کفِ پا ہوں

جو صاف کشِ میکدۂ نظم ہیں ثاقب
کہیں تو بھلا دہ کر ایاغ کفِ پا ہوں

صفحۂ اول کا چوتھا اور صفحۂ دوم کا پانچواں شعر جناب شہنشاہ حسین رضوی کے مقدمے میں بھی منقول ہے۔ ان کے نقل کیے ہوئے باقی دو شعر جو ہمارے یہاں موجود نہیں، ان نو دریافت اشعار میں شامل کر لینے کے بعد اس زمین میں ثاقب کے مکمل اشعار کی تعداد چودہ ہو جاتی ہے۔ دو نامکمل اشعار ان کے علاوہ ہیں۔

دیوانِ ثاقب کے صفحات ۱۵۲ تا ۱۵۶ پر ۶، ۹ اور ۱۲ اپریل ۱۹۱۵ء کی تاریخوں میں تین ہم طرح غزلیں درج ہیں۔ یہ غزلیں ثاقب نے ۱۵ اپریل ۱۹۱۵ء کو دو یا تین اوراق پر نقل کر کے نکہت کو بھیجی تھیں۔ ان میں سے ایک مکمل ورق کئی بوسیدہ ٹکڑوں کی صورت میں اور ایک ورق کا صرف ایک چوتھائی حصہ باقی ہے۔ مکمل ورق سلسلے کے اعتبار سے آخری معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس کے اختتام پر ثاقب کے دستخط بقیدِ تاریخ موجود ہیں۔ اس ورق پر ایک طرف بارہ اور دوسری طرف نو اشعار لکھے ہوئے ہیں۔ ان میں سے تیسرا، چوتھا، پانچواں، ساتواں، آٹھواں، نواں، دسواں، اٹھارہواں، انیسواں، بیسواں اور اکیسواں شعر پہلی غزل میں علی الترتیب دوسرے، تیسرے، چوتھے، بارہویں، چھٹے، ساتویں، نویں، دسویں، گیارہویں، تیرہویں اور چودھویں نمبر پر، دوسرا مطلع اور سولھواں شعر دوسری غزل میں تیسرے اور تیرہویں نمبر پر اور چھٹا، بارہواں، پندرہواں اور سترہواں شعر تیسری غزل میں پندرہویں، گیارہویں، تیرہویں اور بارہویں نمبر پر درج ہے۔ باقی چار شعر جو کسی غزل میں شامل نہیں، یہ ہیں ؎

محفل سنوار لی مرے دل نے خیال کی تصویر کھینچ کر ترے حسن و جمال کی
تم کو جواب دینے لگا کیوں خرامِ ناز سبزہ تھا یا کہ قبر کوئی پائمال کی
رہنے کو آشیانہ بنایا تو کیا ہوا تنکوں نے مل کے کھینچ دی تصویر جال کی
یکجا ہوئے ہیں دور دور سے آ آ کے اہلِ قبر دل ہو تو دیکھو آئیے محفل خیال کی

دوسرے ورق کے باقی ماندہ ٹکڑے پر دونوں طرف دو دو مکمل شعر اور دوسری طرف دو شعروں کے ابتدائی اور دو دو تین تین لفظ باقی رہ گئے ہیں۔ مکمل شعروں میں سے تیسرا پہلی غزل میں آٹھویں نمبر پر اور چوتھا دوسری غزل میں دسویں نمبر پر شامل ہے اور "برسوں سے صاف" اور "طے کر رہا" سے شروع ہونے والے اشعار علی الترتیب تیسری غزل میں ساتویں اور دوسری غزل میں گیارہویں نمبر پر درج ہیں۔ باقی دو شعر

جو دیوان سے خارج ہیں، یہ ہیں ؎

روک اپنی آہ گرم کو بس عندلیب بس ۔۔۔ اڑنے لگی ہے باغ سے سبزی نہال کی
برباد میرے بعد نہ ہو کائنات دل ۔۔۔ کوئی جگہ نکال دو میرے ملال کی

الہ آباد، لکھنؤ اور جانسٹھ کے مشاعروں کی ہم طرح ان غزلوں سے متعلق یہ تفصیلات بھی تدوین کلام کے نقطۂ نظر سے بعض اہم امور کی طرف رہبری کرتی ہیں۔

گزشتہ اوراق میں مرزا صاحب کی باقیماندہ تحریروں کے ضمن میں چھ خطوط کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے اب تک مختلف مباحث کے تحت چار خط نقل کیے جا چکے ہیں۔ باقی دو خطوں میں سے پہلا خط ۲ ستمبر سنہ ۱۹۲۵ء کا ہے۔ ادبی نقطۂ نظر سے اس کی اہمیت یہ ہے کہ مرزا صاحب نے اس میں اپنے شاعرانہ مزاج کی ایک خاص کیفیت کی جانب اشارہ کیا ہے۔ نکہت اس زمانے میں ان کی حیات و شخصیت اور شاعری کے بارے میں ایک مفصل مضمون لکھنے کا ارادہ کر رہے تھے جو تقریباً دو سال بعد ماہنامہ شمع آگرہ کے اکتوبر، نومبر، دسمبر سنہ ۱۹۲۷ء کے شماروں میں بالاقساط شائع ہوا۔ یہ بات اسی پس منظر میں کہی گئی ہے خط کا مکمل متن حسب ذیل ہے :۔

بھائی صاحب قبلہ تسلیم۔ سرفراز نامہ موصول ہو کر کاشفِ مندرجہ ہوا۔ جعفر حسین کا خط معہ جواب واپس جاتا ہے۔ تفصیلی حالات زبانی عرض کروں گا۔ بخار اب نہیں آتا مگر نزلہ اور کھانسی شدید ہے۔ جناب محترمہ بھابی جان صاحبہ کو تسلیم کہہ دیجیے گا۔ میری طرف سے اور والدہ جعفر حسین کی طرف سے بھی۔ صاحبزادیوں کو بھی طولِ عمر اور سلامتی کی دعائیں کہہ دیجیے گا۔ میری سوانح عمری میں اتنا ضرور لکھ دیجیے گا کہ میں راستہ چلنے میں شعر کہنے کا بہت زیادہ عادی ہوں۔ بھاپے وغیرہ سب چیزیں اپنے ہمراہ لاؤنگا۔ اور انشاءاللہ اگر طبیعت سنبھل جائے تو حاضر ہونے کی تاریخ مقرر کر دوں۔

والسلام خاکسار میرزا ثاقب

یہ خط دراصل ۹ × ۶ انچ سائز کے سولہ صفحات پر مشتمل ایک طویل تر مکتوب کا پیش نامہ ہے جس کی طرف "جعفر حسین کا خط معہ جواب واپس جاتا ہے" کہہ کر اشارہ کیا گیا ہے، اور جو اگلی ہی سطر سے "جوابِ خط" کے زیرِ عنوان شروع ہو جاتا ہے۔ مرزا جعفر حسین صاحب اس زمانے میں سہسوان میں بعہدۂ نائب تحصیلداری مامور تھے اور مرزا صاحب ان سے ناراض ہو کر کئی برس قبل (سنہ ۱۹۰۹ء میں) انھیں عاق کر چکے تھے۔ لیکن سنہ ۱۹۲۳ء یا سنہ ۱۹۲۴ء میں جب وہ سہسوان ہی میں غبن کے ایک مقدمے میں ماخوذ ہو کر معطل ہوئے شفقت پدری کے تحت ثاقب صاحب اس دوران میں نکہت کے واسطے سے خفیہ طور پر برابر ان کے خانگی مصارف اور مقدمے کے اخراجات کی کفالت کرتے رہے۔ مقدمے سے بری ہونے کے بعد نکہت باپ بیٹے کے درمیان تعلقات کی بحالی کے لیے کوشاں تھے۔ یہ خط اسی سلسلے کی طویل مراسلت کی ایک کڑی ہے۔ چونکہ اس میں بیشتر خانگی معاملات و مسائل کا تذکرہ ہے جن کا اظہار نہ تو مناسب اور نہ سود مند، اس لیے اسے نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ البتہ ایک جملہ جو لکھنؤ کی تہذیب و معاشرت کے ایک خاص پہلو کی عکاسی کرتا ہے، ملاحظہ طلب ہے۔ لکھتے ہیں :۔

"لکھنؤ میں رنڈی رکھنا تو مضائقہ کی بات نہیں ہے مگر رنڈی کو اپنے گھر میں ڈال لینا اور اس سے بچہ جنوانا بڑا عیب ہے"

دوسرا خط بست و یکم ماہ صفر سنہ ۱۳۶۲ھ (۲۶ فروری سنہ ۱۹۴۴ء) کا لکھا ہوا ہے، یہ محمود آباد، بریلی، رام پور، دہلی اور سہسوان کے ایک طویل سفر کے پروگرام سے متعلق ہے۔ یہ مرزا صاحب کی آخری تحریر ہے جو محفوظ رہ گئی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے :۔

بھائی صاحب قبلہ۔ تسلیمات عرض کرتا ہوں۔ جاڑے کی رت بدل گئی۔ سردی شام کی تو رخصت ہو گئی ہاں صبح کی البتہ باقی ہے لحاف ضرور اوڑھنا پڑتا ہے۔ فی الحال گو رکھپور نہ جا سکتا ہوں نہ آپ کی بھاوج کیونکہ ماہ مارچ کے لیے میرا پروگرام حسبِ ذیل ہے۔

میں یکم مارچ کو جناب مہاراج کمار کے ہمراہ محمود آباد جانے والا ہوں وہاں سے رخصت ہو کر بریلی پہونچونگا۔ میرے ایک مکرم دوست الیاس احمد صاحب اڈیشنل جج کا تبادلہ ابھی حال

میں گورکھپور سے بریلی کو ہوگیا ہے وہاں پہونچکر ایک یا دو دن
انکا مہمان رہونگا وہاں سے چلکر سہسوان حاضر ہونگا اور تین
دن آپکا مہمان رہونگا۔ آپ سے رخصت ہوکر رام پور میں
جناب ہاشمی صاحب سے ملاقات کرنا امر لازم اور ضروری
ہے اس کے بعد دلّی کا نمبر ہے وہاں پندرہ ویں مارچ کو ضرور
پہونچ ۱۰۔۱ ... آباد میں کب تک روکا جاؤں اور دلّی میں
کب ... ہے کے دن گذتا
... کے متعلق کچھ
کہا ... مارچ کو میرا
د ... میں زیادہ دن
یہ ... کا وہاں اگر زیادہ
دلی روانہ ہو
صاحب بتاکید
ے رہے ہیں۔ اب
ں حاضر سہسوان ہو
ے آپ کا مہمان ہوں
نی سے ملنے کے بعد
اور وقت ...
رام پور پہونچوں اور وہاں سے بریلی پہونچکر الیاس احمد صاحب
سے ملوں وہاں سے چلکر جناب کی خدمت میں حاضر ہوں اور اطمینان
کے ساتھ رہکر آپ سے رخصت حاصل کروں اور لکھنؤ روانہ ہو جاؤں۔

میری طبیعت اب اصلاح پذیر ہو چلی ہے۔ انصباب میں
بھی اور اس کے ساتھ کھانسی اور اخراجِ بلغم میں بھی یک گونہ تخفیف
محسوس ہو رہی ہے۔ البتہ قبض کی شکایت بدستور ہے اس مرض
میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوا۔ انڈرین ایک انگریزی دوا ہے جو
نتھنوں میں ڈالی جاتی ہے اس نے انصباب کی بڑی روک تھام
کی۔ آپ کے لئے حلوا سوہان اور صاحبزادیوں کے لئے کنگھیاں
لیتا آؤنگا۔ والسلام دونوں صاحبزادیوں کو سلامتی کی دعائیں

الراقم
میرزا ثاقب

اوپر کے دونوں خطوط میں ثاقب صاحب نے سہسوان کے سفر کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔ خاندانی روایات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ موصوف دو مرتبہ سہسوان تشریف لائے تھے، لیکن پہلا سفر کس سنہ میں ہوا یہ بات کسی مستند ذریعے سے دریافت نہیں ہو سکی۔ کہا جاتا ہے کہ علالت کی وجہ سے اس سفر کے ابتدائی پروگرام پر عمل درآمد نہیں ہو سکا تھا اور پھر یہ ارادہ کئی سال تک ملتوی رہا تھا۔ تاہم مختلف قیاسات کی روشنی میں اس سفر کا زمانہ ۱۹۲۵ء اور ۱۹۳۲ء کے درمیان محدود کیا جا سکتا ہے۔ دوسری بار مرزا صاحب نکہت کی تجویز کے مطابق دلّی، رام پور اور بریلی میں قیام کرتے ہوئے، ۶ اپریل ۱۹۳۴ء کو سہسوان پہنچے تھے اور ۱۴ اپریل تک مقیم رہے تھے۔ اسی زمانے میں راقم السطور کو دن میں بیشتر ان کے پاس رہنے اور شام کے وقت ان کی انگلی پکڑ کر دور تک ان کے ساتھ ٹہلنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ ثاقب صاحب کے قیام کے دوران وقتاً فوقتاً اور خاص طور پر بعد مغرب قصبے کے شعرا اور اربابِ ذوق ان کا نیاز حاصل کرنے اور ان کے کلام سے مستفیض ہونے کے لیے حاضر خدمت ہوتے رہتے تھے۔ ان صحبتوں میں ثاقب صاحب نے اپنا جو تازہ کلام سنایا تھا، اس میں سے ایک غزل کے یہ تین اشعار برادر مکرم سید تہذیب احمد صاحب نقوی کو اب بھی یاد ہیں ؎

صفائی کہاں خاکدانِ جہاں میں
یہ جو چھانتا کرکرا چھانتا ہے
اٹھاتا ہے دل ذلّتیں ذلّتوں پر
مگر میرا کہنا کہاں مانتا ہے
غنیمت ہے ثاقبؔ کا دم لکھنؤ میں
یہ جو کچھ بھلا یا بُرا جانتا ہے

نکہت کے روزنامچہ مراسلات سے ثاقب کی زندگی اور شخصیت یا نکہت کے اور ان کے باہمی روابط سے متعلق مزید جو معلومات حاصل ہوتی ہیں وہ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) بھوپال سے لکھنؤ پہنچنے کے بعد ثاقب صاحب نے شروع میں محلہ ترہی، حضرت گنج میں قیام کیا، بعد ازاں مئی ۱۹۰۹ء سے جولائی

۱۹۱۶ء تک کڑہ ابو تراب خاں میں، اگست ۱۹۱۶ء سے وسط اگست ۱۹۱۹ء تک بنجاری ٹولہ میں، وسط اگست ۱۹۱۹ء سے دسمبر ۱۹۲۰ء تک عقب تھانہ پولیس، وزیر گنج میں، جنوری ۱۹۲۸ء سے مئی ۱۹۳۱ء تک محلہ پاٹا نالہ میں، جون ۱۹۳۱ء سے جولائی ۱۹۳۲ء تک یادگار منزل، محلہ قاضی کا باغ میں اور اگست ۱۹۳۲ء سے فروری ۱۹۳۰ء تک مکان نمبر ۵۵، کڑہ حیدر حسین خاں میں مقیم رہے۔ مارچ ۱۹۳۰ء میں کڑہ ابو تراب خاں میں ان کے ذاتی مکان عسکری منزل کی تعمیر مکمل ہوئی۔ عمر کے باقی ایام مرزا صاحب نے اس مکان میں گزارے۔

(۲) دسمبر ۱۹۰۵ء کے آس پاس "قزلباش مینوفیکچرنگ کمپنی" کے نام سے حضرت گنج میں کاروبار شروع کیا۔

(۳) اکتوبر ۱۹۰۶ء کے اواخر میں ان کی والدہ اور ایک بچے کا انتقال ہوا۔ نکہت نے چہار شنبہ، ۲۷ ماہ صیام ۱۳۲۴ھ (۵ نومبر ۱۹۰۶ء) کو خط لکھ کر تعزیت کی۔

(۴) دسمبر ۱۹۰۷ء میں یا اس سے کچھ پہلے کلکتے میں ایرانی سفارت خانے میں ملازمت شروع کی۔ فروری ۱۹۰۹ء کے تیسرے ہفتے میں مستعفی ہو کر لکھنؤ چلے آئے۔ غالباً اسی زمانے میں ریاست محمود آباد سے باقاعدہ توسل کی ابتدا ہوئی۔ اس کے برخلاف شیخ بدرالزماں صاحب نے کلکتہ سے واپسی اور محمود آباد سے وابستگی کو ماہ اکتوبر ۱۹۰۸ء کا واقعہ بتایا ہے۔ (مقدمہ دیوان ص ۲۷) نکہت کے مضمون مطبوعہ ماہنامہ شمع آگرہ کے اقتباس مشمولہ دیوان (ص ۳۰۸) سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ثاقب نومبر ۱۹۰۸ء میں ریاست کے متوسلین میں شامل ہوئے لیکن پنجشنبہ ۹ ذی قعدہ ۱۳۲۵ھ مطابق ۱۵ دسمبر ۱۹۰۷ء سے ۲۵ محرم ۱۳۲۷ھ مطابق ۱۷ فروری ۱۹۰۹ء تک کی مسلسل مراسلت ان بیانات کے خلاف ثبوت فراہم کرتی ہے۔

(۵) مرزا یاس یگانہ چنگیزی نے ۱۹۱۵ء کے اوسط میں ایک نامانوس بحر میں چند شعر کہے تھے جو کسی شخص نے بغرض آزمائش صفی، عزیز اور ثاقب کے پاس تقطیع کرنے کے لئے بھیج دیے۔ یاس کے بقول صفی اور عزیز نے تو بالکل سوں کھینچی۔ باوجود تاکیدی خطوط روانہ کرنے کے کوئی جواب نہ دیا مگر میاں ثاقب نے بیدھڑک جو جی میں آیا لکھ مارا۔ ثاقب کے اس جواب (مورخہ ۲۴ اکتوبر ۱۹۱۵ء) کے ساتھ ان کے اور یاس کے درمیان ایک طویل معارضے کا آغاز ہوا اور تقریباً دو سال تک ماہنامہ خیال ہارڈ دمیر ٹھ کے صفحات پر یہ بحث چلتی رہی۔ یاس اور ثاقب کے علاوہ دوسرے لوگوں نے بھی اس میں حصہ لیا۔ نکہت نے اسی سلسلے میں ۲۹ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۴ھ مطابق ۳ مئی ۱۹۱۶ء کو یاس کا مسودہ کلام (مرسلۂ ثاقب) اپنے اعتراضات اور اصلاحات کے ساتھ ثاقب کو واپس ارسال کیا۔

(۶) مکتوب مورخہ سہ شنبہ ۲۹ ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ مطابق ۲۸ جنوری ۱۹۴۱ء کے خانۂ کیفیت کے اندراج سے معلوم ہوتا ہے کہ انہی ایام میں غالباً کسی اخبار نے ثاقب کے انتقال کی غلط خبر شائع کر دی تھی نکہت کا مندرجہ ذیل شعر جو اسی زمانے کی ایک غزل میں شامل ہے۔ بگمانِ غالب اسی پس منظر میں کہا گیا ہے ؎

بچائے حضرتِ ثاقب کو چشم بد سے خدا
کہ باقی اور کوئی اپنا ہم زباں نہ رہا

(۷) مارچ اور اپریل ۱۹۴۲ء میں لکھے گئے کئی خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ ثاقب نے اس زمانے میں منتخب کلام پر مشتمل اپنے دوسرے دیوان کا مسودہ مرتب کر لیا تھا، اور اس کی اشاعت کے لیے کوشاں تھے اس سلسلے میں ان کے اور نکہت کے درمیان جو مراسلت ہوئی اس کے تحت نکہت نے جمعہ ۱۸ صفر ۱۳۶۱ھ مطابق ۶ مارچ ۱۹۴۲ء "قلم بندی حالات برائے منتخبات" کے بارے میں ان کے خط کا جواب دیا، نو دن بعد ۱۵ مارچ کو ایک دوسرے خط کے جواب میں "روانگی مسودات" کی اطلاع دی، اسی دن "ملبندہ مسودات" بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک واپس کیا گیا اور ۸ ربیع الثانی ۱۳۶۱ھ مطابق ۲۵ اپریل ۱۹۴۲ء کو "عبارت تہدیۂ دیوان" لکھ کر بھیجی گئی۔

(۸) نکہت اور ثاقب کے درمیان مراسلت کا سلسلہ موخر الذکر کے انتقال سے تقریباً ڈیڑھ ماہ قبل تک جاری رہا۔ نکہت کی طرف سے آخری خط دوشنبہ ۱۷ ذی قعدہ ۱۳۶۸ھ مطابق ۱۲ اکتوبر ۱۹۴۲ء کو لکھا گیا۔ اس وقت ثاقب اپنے صاحبزادے مرزا جعفر حسین قزلباش ٹاؤن راشننگ افیسر، مراد آباد کے پاس مقیم تھے۔ اس خط کی

اہمیت یہ ہے کہ اس سے ثاقب صاحب کی تاریخ وفات سے متعلق عام طور پر تسلیم شدہ روایت کی تردید ہوتی ہے۔ جناب عرفان عباسی کے بہ قول اہل لکھنؤ ہر سال ۲۷ ستمبر کو ان کی برسی مناتے ہیں[۵] ڈاکٹر آصف زمانی نے بھی اپنے ایک مضمون میں ان کے انتقال کی تاریخ ۲۴ ستمبر ۱۹۴۶ء ہی بتائی ہے۔ نکہت کے تعزیتی مکتوب موسومہ مرزا صابر حسین قزلباش مورخہ ہفتم ماہ محرم ۱۳۶۶ھ مطابق ۲ دسمبر ۱۹۴۶ء سے متعلق خانہ کیفیت کے اندراج سے معلوم ہوتا ہے کہ صحیح تاریخ رحلت ۲۴ نومبر ۱۹۴۶ء روز یکشنبہ ہے۔ تقویم ہجری کے بموجب اس روز ذی الحجہ ۱۳۶۵ھ کی انتیسویں تاریخ تھی۔ یہی تاریخ مندرجہ ذیل قطعے میں بھی نظم کی گئی ہے جو مذکورہ بالا تعزیتی خط کے ساتھ ہی ارسال کیا گیا تھا ؎

ثاقبِ روشن بیاں ذاکرِ حسینِ کنزِ سخن   جانشینِ میر و غالب، صاحبِ بکر رسا
مجمعِ خلق و مروت، منبعِ لطف و کرم   مرجعِ اصنافِ خوبی، معدنِ صدق و صفا
جس کا ہر اک شعر تھا ڈوبا ہوا تاثیر میں   جس کا اندازِ غزل خوانی تھا دنیا سے جدا
نو بجے تھے صبح کے، انتیسویں ذی حج کی تھی   جب ہوا اتوار کے دن سوئے جنت راہ گرا
آ گیا یہ نکہتِ محزوں کے لب پر سالِ غم
ہائے اوجِ شاعری کا نجم ثاقب چھپ گیا ۱۳۶۵ھ

نکہت کی ان دو تحریروں کے علاوہ مرزا صاحب کے صاحبزادے مرزا جعفر حسین کے خط موسومہ نکہت مورخہ ۲۸ جنوری ۱۹۵۲ء سے بھی ستمبر کی بجائے نومبر کے مہینے میں انتقال کی تصدیق ہوتی ہے۔ لکھتے ہیں کہ :-

نومبر ۱۹۴۶ء میں جب والد ماجد کا انتقال ہوا ہے، میں مراد آباد میں سٹی مجسٹریٹ تھا۔

ثاقب صاحب کے انتقال کے بعد ان کے بیٹوں کے درمیان شدید نااتفاقی کا سلسلہ شروع ہو گیا، چنانچہ ان کی اہلیہ حالات کی ناسازگاری سے تنگ آ کر ۱۰ نومبر ۱۹۵۰ء کو کراچی ہجرت کر گئیں۔ ان کے دو بیٹے مرزا افضل حسین اور مرزا ارشاد حسین عرف مجن میاں کئی سال پہلے سے بسلسلۂ ملازمت مقیم تھے۔ اس افتراق و انتشار کے نتیجے میں مرزا صاحب کے کتب خانے اور سرمایۂ کلام کی بربادی کا ذکر کرتے ہوئے مرزا جعفر حسین صاحب مذکورۂ بالا خط میں بطور رئیس نوشت رقمطراز ہیں:

"والد ماجد مرحوم کی کتابوں کے ذخیرہ کا یہ حشر ہوا کہ کچھ تو میاں صابر لے گئے، کچھ کتابیں والدۂ ماجدہ نے لکھنؤ میں فروخت کر ڈالی تھیں، کچھ اپنے ہمراہ کراچی لے گئیں، وہاں بیچ ڈالی ہوں گی۔ غیر مطبوعہ کلام سنا ہے ہمارا انکسار کے قبضہ میں ہے۔"

ان نو دریافت حقائق و واقعات کی روشنی میں ثاقب صاحب کی زندگی اور شخصیت کے جو نئے گوشے سامنے آئے ہیں، یقین ہے ان کا مطالعہ اہل علم کے لیے دلچسپی کا باعث ہوگا۔ اگرچہ ثاقب اور نکہت کے باہمی روابط کی برادرانہ نوعیت اس کی متقاضی تھی کہ یہ معرضِ بحث میں نہ لائے جائیں اور ثاقب اپنی تمام تر شہرت و مقبولیت کے باوجود آخر تک جس ارادت اور اعتماد کے ساتھ نکہت سے مشورۂ سخن اور قلمی تعاون حاصل کرتے رہے نیز نکہت نے اس راز کی پردہ پوشی میں تاعمر جس بے نفسی اور انکسار کا ثبوت دیا۔ اس کا احترام کرتے ہوئے خطوط کے ذخیرے کی طرح یہ باقی ماندہ تحریریں بھی ضائع کر دی جائیں چنانچہ یہ اوراق کئی سال کے جذباتی تردد اور نفسیاتی پس و پیش کے بعد محض بتقاضائے تحقیق سپرد کیے گئے ہیں۔ امید ہے کہ ان کا مطالعہ بھی اسی زاویۂ نظر سے کیا جائے گا۔

حواشی

[۱] نکہت کی ابتدائی تعلیم رام پور میں ہوئی۔ بعد ازاں انھوں نے بھوپال میں مولانا محمد عمر ولایتی شاگردِ مولانا صہبائی، علامہ شیخ حسین عرب اور مولانا محمد بشیر محدث سہوانی جیسے نامور اور یگانۂ عصر اساتذہ سے کسبِ فیض کر کے تکمیلِ علم کے مراحل طے کیے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد ایک طویل مدت تک بحیثیت ملازم ریاست سے وابستہ رہ کر ستمبر ۱۹۰۶ء میں زمینداری کے انتظام کے خیال سے سہوان چلے آئے۔ عمر کے باقی تینتالیس سال انھوں نے یہیں بسر کیے۔ شروع میں وہ اردو، فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے لیکن فارسی کی طرف زیادہ توجہ تھی۔ سہوان آنے کے بعد اس میں بھی کمی آ گئی تھی اور آخر میں شعر کہنا تقریباً ترک کر دیا تھا۔ سال دو سال میں کسی خاص تحریک کے تحت فارسی یا اردو میں غزل کہہ لیتے تھے۔ فارسی میں آپ نے حمد، نعت، منقبت اور دوسرے مختلف مذہبی و تاریخی موضوعات پر متعدد لاجواب

قصیدے بھی ہیں جو قصیدہ گوئی کے تمام لوازم سے آراستہ ہیں۔ بعض علمی و ادبی موضوعات پر ان کے چند مضامین بھی ملک کے موقر رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے علامہ شمس الدین ابن قیم کی تصنیف "جلاء الافہام" کا "خیر الکلام" کے نام سے اردو میں ترجمہ کیا تھا جو ۱۹۱۵ء میں مدینہ پریس بجنور سے شائع ہو چکا ہے۔

۴؎ ہجر: ۱۲۹۴ھ (۱۸۷۷ء) میں سہسوان میں پیدا ہوئے۔ وطن میں ابتدائی تعلیم کے بعد بھوپال میں تکمیلِ علم کی۔ ۱۸۹۵ء میں نامی پریس لکھنؤ سے ملازمت کا آغاز کیا۔ ایک سال بعد ہی دو برس کے لیے سینٹ جانس کالج آگرہ میں عربی کے استاد کی حیثیت سے تقرر ہو گیا۔ اس عارضی ملازمت کے خاتمے پر آپ بسولی (ضلع بدایوں) چلے آئے اور کئی برس تک وہاں مطب کرتے رہے۔ بعد ازاں تقریباً ایک برس تک اسلامیہ ہائی اسکول بدایوں میں بحیثیت ہیڈ مولوی خدمات انجام دیں۔ ۱۹۱۹ء کے اواخر میں وثیقہ عربک کالج فیض آباد میں وائس پرنسپل کے عہدے پر آپ کا تقرر ہوا جہاں سے ۱۹۴۲ء میں سبکدوش ہوئے۔ عمر کے بقیہ ایام وطن میں گزار کر ۳ جنوری ۱۹۶۳ء کو وفات پائی۔ آپ کی تصانیف سے دو اخلاقی ناول "پردۂ راز" اور "جاذبۂ عرب" اردو کا ایک دیوان "معجز نما" ایک تنقیدی تصنیف "موازنہ مومن و غالب" اور تنقیدی مضامین کا ایک مجموعہ "نقد و انتقاد" شائع ہو چکا ہے۔ غیر مطبوعہ تصانیف میں "تاریخ سہسوان"، "تذکرۂ شعرائے سہسوان"، "شعر العرب" (بہ تقلید شعر العجم) اور اردو، فارسی اور عربی کلام کے مجموعے شامل ہیں۔ فیض آباد کے زمانۂ قیام میں وہاں کی محفلوں میں آپ کے قصیدے نہایت ذوق و شوق اور احترام کے ساتھ سنے جاتے تھے اور آپ کا شمار صفِ اساتذہ میں کیا جاتا تھا۔

۵؎ منشی صابر حسین صبا کی ولادت ۱۲۵۳ھ (۱۸۳۷ء) میں سہسوان میں ہوئی۔ یہیں فضلا و علمائے خاندان سے تحصیل علم کی۔ ۱۲۸۳ھ (۱۸۶۶ء) کے قریب ریاست رام پور سے وابستہ ہوئے اور تقریباً پندرہ برس تک میر اخبارِ ریاست اور سررشتہ دار عدالت مرافعہ کے عہدوں پر متمکن رہے۔ ۱۲۹۶ھ (۱۸۷۹ء) میں رام پور سے ترکِ ملازمت کر کے بھوپال پہنچے جہاں سولہ برس کے قریب نیابت محکمۂ دیوانی و فوجداری اور نظامت ضلع کے عہدوں پر فائز رہ کر، رمضان ۱۳۱۲ھ مطابق ۲۲ فروری ۱۸۹۵ء کو وہیں وفات پائی۔ زمانۂ قیام رام پور میں آپ نے ۱۲۸۳ھ (۱۸۶۶ء) میں مثنوی "شوکت خسروی" تصنیف کی اور ۱۲۸۵ھ (۱۸۶۸ء) میں "لسان العجم" کے نام سے ایک فارسی لغت مرتب کیا۔ یہ دونوں کتابیں علی الترتیب ۱۲۹۳ھ (۱۸۷۶ء) اور ۱۲۹۵ھ (۱۸۷۸ء) میں مطبع انوار محمدی لکھنؤ سے شائع ہو چکی ہیں۔ نواب کلب علی خاں نے مثنوی "شوکت خسروی" کے صلے میں آپ کو "نظامیٔ ہند" کے خطاب سے سرفراز کیا تھا۔ رام پور میں منیر، داغ، امیر، تسلیم اور دوسرے مشاہیر شعرائے اردو سے آپ کے نہایت مخلصانہ اور دوستانہ مراسم تھے۔ منیر نے اپنے ایک قصیدے کی تشبیب میں رام پور کے دوسرے نامور شعرا کے ساتھ مثنوی نگار کی حیثیت سے آپ کا ذکر کیا ہے۔ داغ اور تسلیم کے آپ کے نام خطوط ماہنامہ "آج کل" کے شمارۂ ماہ دسمبر ۱۹۵۵ء میں شائع ہو چکے ہیں۔

۶؎ یہ عبارت نکہت کے ایک آب رسیدہ مسودے سے ماخوذ ہے۔ دیوانِ ثاقب کے آخر میں ماہنامہ "شمع" آگرہ کے حوالے سے ثاقب کی حیات اور شخصیت سے متعلق ان کے ایک مضمون کا اقتباس شامل ہے۔ یہ مضمون ہمیں دستیاب نہ ہو سکا۔ ممکن ہے کہ پیش کردہ عبارت اسی مضمون کی تمہید سے متعلق ہو۔

۷؎ منشی حفیظ الکریم صاحب (ولادت ۱۲۹۵ھ / ۱۸۷۸ء) نکہت کے رشتے کے بھائی اور بہنوئی تھے۔ لکھنؤ میں محکمۂ ریلوے سے بحیثیت گارڈ وابستہ تھے۔ وہیں ۱۹۵۰ء کے قریب انتقال ہوا۔ آپ کو شعر و ادب سے غیر معمولی شغف تھا لیکن شعر گوئی سے دلچسپی نہ تھی البتہ آپ کے والد منشی عبد العزیز اعجاز مخاطب بہ اعجاز رقم (ولادت ۱۲۵۲ھ مطابق ۱۸۳۶ء، وفات بروز چہار شنبہ، ماہ جمادی الاول ۱۳۱۷ھ مطابق ۱۳ ستمبر ۱۸۹۹ء) فارسی و اردو کے پختہ مشق شاعر اور مظفر علی خاں اسیر کے شاگرد تھے۔ ابتدائے مشق میں مولوی الٰہی بخش نازش خیرآبادی ثم لکھنوی سے اور اسیر کے انتقال کے بعد کچھ دنوں تک امیر مینائی سے بھی اصلاح لی تھی۔

۸؎ ڈاکٹر عابد سے ڈاکٹر سید عابد حسین پروفیسر جامعہ ملیہ اسلامیہ مراد ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے والد سید حامد حسین صاحب غالباً بھوپال کے متوطن تھے اور نکہت اور ثاقب کے مخلص اور مشترک احباب میں سے تھے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم اسی رشتے کی بنا پر ان دونوں حضرات کا بیحد احترام کرتے تھے۔

۹؎ لطے کی یہ دونوں غلطیاں ثاقب کے طویل خط مورخہ ۳ ستمبر ۱۹۲۵ء میں دو دو جگہ موجود ہیں۔ ان الفاظ کے علاوہ انھوں نے "فاعتبروا یا اولی الابصار"

میں "فاعتبروا" کا املا بھی غلط (فاعتبرو) لکھا ہے جو عربی زبان کے مبادیات سے بے خبری کی دلیل ہے۔

۸ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو "چراغ سخن" از ... اس عظیم آبادی ثم لکھنوی مطبع مدنو (کشور پریس لکھنؤ) دسمبر ۱۹۲۱ء

۹ بحوالہ ضمیمہ قومی آواز لکھنؤ مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۸۰ء

۱۰ بحوالہ ماہنامہ نیا دور لکھنؤ شمارہ ماہ جنوری ۱۹۷۹ء

واحد پریمی
مکان نمبر ۲۴ گنوری
بھوپال ۱

غزل

(ذو قافیتین)

صہبائے الم پی کبھی صہبائے طرب پی
میخانۂ ہستی کی ہے یہ رسم عجب سی

جب تک وہ نہیں آئے تھے معلوم نہیں کیوں
ہر پھول فسردہ تھا کلی نوحہ بلب تھی

اے دوستو بے وجہ پریشاں تو نہیں ہوں
اس میری تباہی کا کوئی ہوگا سبب ہی

دنیائے محبت میں قیامت جو بپا ہے
اک ہلکی سی جنبش ہے تری چشم غضب کی

جاتے ہو تو جاؤ مگر اتنا تو بتا جاؤ
کس چیز سے بہلاؤں۔ پریشان ہو جب جی

تاریک ہے ہر جادۂ منزل یہ بجا ہے
اے راہ رو دل میں ہے کچھ سوز طلب بھی

یہ سمجھو کہ واحد ابھی آغاز سفر ہے
منزل تو بہت دور ہے اس راہ ادب کی

جعفر عسکری
۱- نور اللہ روڈ، الہ آباد -۳

بلبلِ خوش نوا

(محترمہ سروجنی نائیڈو کے صد سالہ جشن ولادت کے موقع پر)

مثال بلبل شیریں زباں کہیں تجھ کو
غلو نہ ہوگا جو سحر البیاں کہیں تجھ کو
سخن سخن سے ترے نغمگی برستی ہے
بلند تر ترا ذوق سخن پرستی ہے
ہر ایک حرف سے آتی ہے بوئے دلداری
نمود فن میں ہے تیرے ادائے سرشاری
ترا مقام ہے مرغان خوش نوا میں بلند
تمام بلبل و طاؤس ہیں ترے دلبند
وجود تیرا سراپا وطن کی زینت ہے
دلوں میں آج بھی تیرے لیے عقیدت ہے
چراغ تونے جلائے تھے مہربانی کے
پیام تونے دیے عزم و کامرانی کے
وطن میں آج بھی تیرا پیام ہے باقی
سخن وروں میں ترا احترام ہے باقی
یگانہ بلبل ہندوستاں کہیں تجھ کو
غلو نہ ہوگا جو سحر البیاں کہیں تجھ کو

باد اشرف گوپال مغموم

آہ پریم وار برٹنی

وہ اسپتال میں بیمار تھا کئی دن سے
شرابِ سرخ کی رنگت تھی دونوں آنکھوں میں
چڑھی ہوئی تھیں جو آنکھیں، پپوٹے بھاری تھے
رگوں میں خون کے بدلے شراب جاری تھی
کمی سے خون کی چہرے کا رنگ پیلا تھا
سکت نہ ٹانگوں میں باقی تھی چلنے پھرنے کی
تمام چہرے پہ سوجن سی ایک سوجن تھی
وہ سانس لینے میں دقت، وہ درد سینے کا
نظام جسم کا یکسر تھا درہم و برہم
رگوں میں خون کا دورہ تو تھا، مگر کم کم

وہ اپنی زیست سے بیزار تھا کئی دن سے
تپِ نہاں کی حدت تھی دونوں آنکھوں میں
رمق سے زیست کی اعضائے جسم عاری تھے
حواس و ہوش پہ اک بیہشی سی طاری تھی
قوا میں ایسی تھکن تھی کہ جسم ڈھیلا تھا
قدم اٹھانے میں الجھن تھی آہ! گرنے کی
عجیب مضطرب الحال دل کی دھڑکن تھی
نہ آس کوئی، نہ امکان کوئی جینے کا
اور اس پہ جملہ عوارض کی یورشِ پیہم
تھیں اکھڑی اکھڑی جو سانسیں، تو نبض تھی مدھم

یہی تھا موت کو موقع دراز دستی کا
بس ایک لمحے میں گل تھا چراغ ہستی کا

وہ پریم، شاعرِ جدت طراز و نکتہ نواز
وہ پریم، اچھوتے خیالوں کا جو پجاری تھا
وہ پریم، تازہ بہ تازہ تھیں جس کی تشبیہات
وہ پریم، درد کا سر تا پا جو پیکر تھا
وہ پریم، نغموں میں جس کے تھا سوزِ عالم گیر
وہ پریم، سحرِ قدامت کو توڑنے والا
وہ پریم، آگ کا دریا تھا جس کے گیتوں میں
وہ پریم، یاس کی پرچھائیوں کا دیوانہ
وہ پریم، زیست نہ جس کو ذرا بھی راس آئی
وہ پریم، اختر[1] و شاد[2] و مجاز[3] کا پیرو

عدم کی وادیٔ تیرہ میں کر گیا پرواز
وہ پریم، حسن کے دیوی کا جو بھکاری تھا
وہ پریم، زندہ و پائندہ جس کے محسوسات
وہ پریم، درد کی دنیا کا جو نواگر تھا
جنونِ دردِ بشر جس کے پاؤں کی زنجیر
ہر اک فسردہ روایت کو توڑنے والا
گداز روح کا پیدا تھا جس کے گیتوں میں
وہ پریم، شمعِ سرِ قبر ہی کا پروانہ
ہجومِ غم تھا کچھ ایسا، خوشی نہ پاس آئی
وہ پریم، پیرِ خراباتِ راز کا پیرو

وہ پریم ظاہری آنکھوں سے ہے نہاں یکسر
مگر وہ دیدۂ باطن پہ ہے عیاں یکسر

---

[1] حضرت اختر شیرانی مرحوم [2] حضرت نرلش کمار شاد مرحوم [3] حضرت اسرار الحق مجاز لکھنوی مرحوم

شباب للت
[illegible] شملہ ۳۰
([illegible])

جشنِ شادی

ڈر رہی ہے آج شادی کی ضیافت گاؤں میں
ہے سبھی کے واسطے یہ جشنِ عشرت گاؤں میں
محفلِ شادی میں بجتی ہیں مدھر شہنائیاں
چھائی ہیں ماحول پر رنگینیاں رعنائیاں
ایک دیہاتی کے گھر سج دھج کے اتری ہے برات
چند لمحوں میں بسے گی دو دلوں کی کائنات
تیرہ برسوں کا دولہا ہے گیارہ برسوں کی دُلہن
آج ہونے کو ہے دو نادان بچوں کا مِلن
ہیں ابھی ان کمسنوں کے کھیلنے کھانے کے دن
علم کی تنویر سے ذہنوں کے چمکانے کے دن
قہقہوں کے شور میں خوش ہے بہت دولہا میاں
کیسے بیٹھا ہے اکڑ کر دوستوں کے درمیاں
یہ اکڑ فوں تیری پیارے سب ہوا ہو جائے گی
زندگی کی ہر خوشی تجھ سے خفا ہو جائے گی
آج تو ہے جلوہ گر بیدی پہ تو اکڑا ہوا
چند برسوں میں ملے گا قرض میں جکڑا ہوا
گھیر لے گی چند سالوں میں تجھے بچوں کی فوج
دیکھنا تجھ کو بہت مہنگی پڑے گی من کی موج
تیس کے سن تک بنے گا آٹھ نو بچوں کا باپ
آج کا وردان ہی بن جائے گا کل کا شراپ

کس قدر نا عاقبت اندیش ہیں وہ والدین
چھین لیتے ہیں جو خود بچوں سے مستقبل کا چین
عقل کے اندھے ہیں اپنے فرض سے غافل ہیں یہ
ملک کے دشمن ہیں یہ قانون کے قاتل ہیں یہ
ملک کے قانون سے کھلواڑ خود کرتے ہیں لوگ
دوش لیکن جبر کا سرکار پہ دھرتے ہیں لوگ
عمرِ شادی کی جو ہے قانون میں لکھی ہوئی
اس کی پابندی میں ہے اہلِ وطن کی بہتری
کم سِنی کی شادیاں سامان بربادی کا ہیں
یہ سبب اصلی ہماری بڑھتی آبادی کا ہیں
ہم اگر قانونِ شادی ہی کی پابندی کریں
کیا ضرورت سرجنوں کو ہے کہ نس بندی کریں
بند ہو جائیں اگر یہ کم سِنی کی شادیاں
کثرتِ اولاد کا امکان پھر ہوگا کہاں
دیر سے شادی کریں تو دیر سے اولاد ہو
گرہست کی چنتاؤں سے من دیر تک آزاد ہو
کثرتِ اولاد سے گھر کا نہ سُکھ برباد ہو
دیش ہو خوش حال ہر اک دیش باسی شاد ہو
باپ کوئی اپنی قسمت پر نہ روئے ہند میں
کوئی بالک رات کو بھوکا نہ سوئے ہند میں

دور ہو سایہ خزاں کا ہند کے گلزار سے
مفلسی کی زردیاں ڈھل جائیں ہر رخسار سے

مرزا جعفر حسین
بدری ناتھ روڈ، گولہ گنج لکھنؤ

پنڈت دیا شنکر نسیم

اہل لکھنؤ نے اپنے مزاج و مذاق کے مطابق دلّی والوں کے طرز سخن سے علاحدہ ہو کر شاہراہ غزل میں ایک نیا اسلوب اختیار کیا جو دبستان لکھنؤ کے لقب سے ممتاز ہوا اور جس کی اٹھان کو ناسخ و آتش نے رعنائی و دلربائی کے درجہ تک پہنچا یا دیا تھا۔ اسی مکتب خیال کے اولین معماروں میں پنڈت دیا شنکر نسیم کی منبت کاریاں ہمیشہ یادگار رہیں گی۔ اردو زبان کو فصاحت، لطافت، شیرینی، چاشنی، صفائی اور پاکیزگی سے مالا مال کرنے میں نسیم کا بہت بڑا حصّہ تھا۔ کہنے کو وہ ایک عظیم مثنوی گو تھے لیکن حقیقتاً وہ ایک بلند پایہ شاعر اور ایک گراں قدر ادیب و زبان داں تھے۔ ایک قلیل مدت میں جتنے اعلا درجہ کے جواہر پارے وہ فراہم کر گئے ہیں اس کی مثال ہم کو انگریزی کے زبان کے شعرا سشیلی اور کیٹس کے علاوہ اور کہیں نہیں ملتی۔ ان کے کمال کا جائزہ ان کے سوانح حیات کے پس منظر میں ایک محیر العقول مطالعہ ثابت ہوتا ہے۔

پنڈت دیا شنکر کول خلف پنڈت گنگا پرشاد کول کشمیری برادری کے ایک فرد تھے۔ دوسرے مقامات کی طرح لکھنؤ میں بھی اس برادری کے لوگ اپنی تعداد کے لحاظ سے بہت کم مگر علمیت و قابلیت میں بلند مقام پر فائز تھے۔ اس زمانے میں ہمارے شہر کے در و دیوار شعریت میں سرشار تھے اور یہ کہنا بڑی حد تک صحیح ہوگا کہ بچہ بچہ موزوں طبیعت اور مشق سخن پر آمادہ رہتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ پنڈت گنگا پرشاد کول بھی طبع آزمائی کر لیتے ہوں لیکن ان کا کوئی مقام صفوف شعرا میں نہیں تھا۔ یہ منصب ان کے ہونہار فرزند کو ملنا تھا۔ دیا شنکر نسیم کی پیدائش ۱۸۱۱ء میں ہوئی۔ عہد طفولیت کھیل کود میں گزرا، ابتدائی تعلیم اردو اور فارسی زبانوں میں حاصل کی۔ ان کی علمی قابلیت کا صرف اسی بات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے حافظ شیرازی اور بعض دیگر فارسی اساتذہ کی غزلوں پر تخمیس کی تھی اور یہ مشق سخن بہت کامیاب ہے۔ دیا شنکر نسیم نے مشق سخن کب اور کس طرح شروع کی تھی اس میدان میں ان کو کون لایا تھا اور جولانی طبع کے محرکات کیا تھے۔ ان تمام واقعات و حالات کا کوئی پتہ کسی تذکرہ نگار کے یہاں نہیں ملتا۔ البتہ یہ ثابت ہے کہ تیس برس کی عمر میں وہ اچھے خاصے شاعر ہو گئے تھے اور "خواجہ حیدر علی آتش کی گرمیٔ سخن و آتش بیانی نے ایسا فریفتہ کر لیا کہ ان کی شاگردی اختیار کی۔" غالباً یہ وہی وقت ہوگا جب انھوں نے نسیم تخلص اختیار کیا اور یہ ۱۸۳۱ء کا زمانہ تھا۔

پنڈت دیا شنکر کول نے یقیناً اپنی شوخیٔ مزاج میں نسیم تخلص پسند کیا ہوگا۔ اسی طرح ان کی شگفتگی افتاد طبع کے تحت یہ شعر ان کے زبان و قلم سے نکل گیا ہوگا کہ ؎

روح رواں و جسم کی صورت میں کیا کہوں
جھونکا ہوا کا تھا ادھر آیا ادھر گیا

لیکن زمانہ کی یہ ستم ظریفی تھی کہ پنڈت دیا شنکر کول اس

ار فانی میں ہوا کے جھونکے کی طرح آئے اور چلے گئے۔ بیس برس کی سن میں شاعری کا آغاز ہوا اور گیارہ برس کی بعد تیس برس کی عمر میں انتقال فرمایا۔ اس طرح ان کی شاعری کی زندگی صرف گیارہ برس برقرار رہی تھی۔ اسی گیارہ برس میں انھوں نے مثنوی گلزار نسیم پیش کر کے دبستان لکھنؤ کی صف اول میں مقام حاصل کیا، بلند پایہ شعرا کے ہم پلہ منزلت حاصل کی لکھنؤ کے معاشرہ میں فضیلت پائی اور اردو شاعری کی دنیا میں آج ان کا نام زندۂ جاوید ہے۔

نسیم مبداء فیاض سے شاعری کے خصوصیات لے کر آئے تھے۔ فطری طور پر ان میں موزونیت اور بذلہ سنجی تھی۔ ان کی اس خصوصیت کے سلسلے میں صرف ایک واقعہ پیش کر دینا کافی ہوگا۔

ایک مرتبہ خواجہ آتش کے یہاں ان کے کچھ شاگرد جمع تھے۔ موسم بہت خوشگوار تھا۔ ہلکی ہلکی بارش اور مستانہ ہوائیں شاعروں کے دماغوں کو متاثر کر رہی تھیں۔ رند اور صبا بھی موجود تھے۔ انھوں نے استاد سے فرمائش کی کہ کوئی غزل کہہ ڈالیے۔ آتش آمادہ ہوئے اور شاگردوں نے قلم دان کھول لیے۔ آتش شعر کہتے جاتے اور شاگرد لکھنے پر متوجہ تھے۔ مگر نسیم کی توجہ شعر نقل کرنے پر قناعت نہیں کر سکی۔ انھوں نے استاد کے ہر شعر پر فی البدیہہ تخمیس کر ڈالی جو خود اپنی جگہ پر شاعری کے کمال کا ایک اعلا نمونہ ہے۔ مثالاً دو بند درج ذیل ہیں:

نہ خونیں کفن ہیں نہ گھائل ہوئے ہیں
نہ زخمی بدن ہیں نہ بسمل ہوئے ہیں
لہو مل کے کشتوں میں داخل ہوئے ہیں
تمھارے شہیدوں میں شامل ہوئے ہیں
گل و لالہ و ارغواں کیسے کیسے

وجود بشر کیا عدم ہی عدم ہے
کہ ہر آدمی جب تلک دم میں دم ہے
شکم پرور حرص ناز و نعم ہے
کرے جس قدر شکر نعمت وہ کم ہے
مزے لوٹتی ہے زباں کیسے کیسے

نسیم کے اس کمال کو دیکھ کر تمام حاضرین دم بخود ہو گئے ریختے دیا شنکر نسیم محض زود گو نہیں بلکہ فطرتاً بذلہ سنج طباع تھے۔ اس ذیل میں ان سے متعلق دو واقعات پیش کیے جاتے ہیں جو ادبیت و شعریت کی اعلا مثالیں ہیں اور ساتھ ہی ساتھ نسیم کی جودت طبع کے عظیم شاہکار ہیں۔

ناسخ بلند پایہ شاعر اور زبان و ادب کے ماہر کامل تھے۔ اس زمانہ میں ادبی موضوعات پر شاعروں ہی میں مکالمے ہو جاتے تھے۔ یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ انھیں مکالموں میں شعرا ایک دوسرے پر چوٹ کرتے یا ایک دوسرے کا امتحان لیا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ ایک مشاعرے میں ناسخ نے نسیم سے فرمایا کہ ایک مصرع ہوا ہے مگر دوسرا مصرع نہیں لگتا اور یہ مصرع پڑھا۔ ؎ "شیخ نے مسجد بنا مسمار بتخانہ کیا"

نسیم نے بلا تکلف دوسرا مصرع لگا کے فی الفور یہ شعر پڑھ دیا۔ ؎

شیخ نے مسجد بنا مسمار بت خانہ کیا
پہلے اک صورت بھی تھی اب صاف ویرانہ کیا

اس زمانے میں سر مشاعرہ ایک دوسرے پر سخن و اعتراض بھی وارد کر دیا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مشاعرہ میں کسی شاعر نے ایک شعر پڑھا جس کا دوسرا مصرع تھا۔

"جانب ظلمات ہرگز آفتاب آتا نہیں"

نسیم نے ٹوک دیا کہ پہلا مصرع کمزور ہے۔ انھوں نے برانگیختہ ہو کر فرمایا "تو پھر آپ ہی چست مصرع لگا دیں"۔ نسیم نے فوراً مصرع لگا کے ان کے شعر کو اس طرح بنا دیا:

تیرہ دل کی بزم میں جام شراب آتا نہیں
جانب ظلمات ہرگز آفتاب آتا نہیں

ظاہر ہے کہ جن مشاعروں میں نسیم شرکت کرتے ہوں گے وہاں ان کی موجودگی ہی بڑی حد تک گرمی محفل پیدا کرانے

کا باعث بن جاتی ہوتی۔ ان کے ہٹ سے جو شمع ہٹا وہ شعر کی جان ہوتا تھا۔ اس سلسلہ میں یہ واقعہ بہت پُرلطف ہے ان کی اس خصوصیت پر کہ وہ غزل لکھ کر نہیں بلکہ زبانی پڑھتے تھے۔ مزاحاً ظہور پذیر ہوا تھا۔ دستور یہ تھا کہ ہر شاعر غزل پڑھنے کے بعد اپنے سامنے کی شمع پہلو والے شاعر کی طرف بڑھا دیتا اور وہ دوسرا غزل پڑھنے کے لیے شمع کو اپنی طرف کھینچ لیتا تھا نسیم چونکہ زبانی غزل پڑھتے تھے اس لیے شمع اپنی طرف کھینچنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ ایک مشاعرہ میں کسی شاعر نے نسیم کو مخاطب کر کے مزاحاً کہا کہ "جناب شمع لیجیے"۔ انھوں نے برجستہ جواب دیا "نسیم کے سامنے شمع کیا ٹھہر سکتی ہے"۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی نازک مزاجی کو شمع کھینچنے کا دستور ناپسند تھا۔ اس لیے وہ غزل ہی زبانی پڑھا کرتے تھے۔

اس زمانے میں مصرع پر مصرع لگانے کا چلن عام تھا۔ اور اسی طرح شعرا ایک دوسرے کا امتحان لیتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک بار دلی والوں نے لکھنؤ کے شعرا کا اسی ترکیب سے ایک ایسا امتحان لیا تھا جس کو تاریخی حیثیت حاصل ہو گئی۔ یہ زمانہ وہی تھا جب دبستان لکھنؤ کو فروغ حاصل ہو چکا تھا اور ناسخ و آتش کے کمال کا شہرہ تھا۔ دلی والوں نے امتحاناً تین مصرعے لکھنؤ بھیجے۔ وہ تین مصرعے یہ تھے۔ ع

(۱) ناتواں ہوں کفن بھی ہو ہلکا

(۲) اس لیے قبر میں رکھا انھیں زنجیر سمیت

(۳) من میروم بکعبہ و دل میرود بدیر

لکھنؤ والوں کو اپنی سربلندی برقرار رکھنا تھی اس لیے بہتر سے بہتر مصرعے لگا کے بھیجنا ضروری تھا اور اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے بہترین اساتذہ درکار تھے۔ ناسخ و آتش اس وقت صدرنشینان بزم سخن تھے۔ ان کے ساتھ جس تیسرے شاعر پر نظر انتخاب پڑی وہ پنڈت دیا شنکر نسیم تھے۔ ان تینوں شعرا نے مصرعے لگا کر جو اشعار بھیجے وہ یہ تھے۔

ناسخ :- ڈال دے سایہ اپنے آنچل کا

ناتواں ہوں کفن بھی ہو ہلکا

آتش :- حشر میں حشر نہ برپا کریں یہ دیوانے

اس لیے قبر میں رکھا انھیں زنجیر سمیت

نسیم :- دارم نہ دین و کفر بہر یک قدم دو سیر

من می روم بہ کعبہ و دل می رود بہ دیر

ناسخ اور آتش کی علمی قابلیت میں کسی کو شک و شبہ کی گنجائش نہیں، لیکن پھر بھی یہ بات کہنے میں آتی ہے کہ فارسی مصرعے پر مصرع لگانے کا فریضہ نسیم کے سپرد کیا گیا تھا۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کو فارسی زبان میں بھی زود گو ہونے کا شرف حاصل تھا۔ یا یہ سمجھ لیجیے کہ وہ فارسی زبان میں تخمیس کہنے کی بدولت اتنی شہرت حاصل کر چکے تھے کہ یہ کام انھیں کے حوالے کیا گیا۔ صاحب بہار گلشن کشمیر نے اپنے تذکرہ میں نسیم کے دو مخمس پیش کیے ہیں ان میں سے ایک حافظ شیرازی کی ایک معرکۃ الآرا غزل کی تخمیس ہے۔ ذیل میں اسی مخمس کے دو بند مثالاً پیش کیے جاتے ہیں۔ سہ

فدائے حسن و جمال تو گلعذار انند

شہید تیغ نگاہ تو شہسوار انند

اسیر حلقۂ زلف تو پختہ کار انند

غلام نرگس مست تو تاجدار انند

خراب بادۂ لعل تو ہوشیار انند

ترا کہ ہست بجا ہوش وہم حواس برد

بزعم زہد خودمی ہم دریں قیاس برد

برو، برو، برو اے شیخ ناشناس برو

نصیب ماست بہشت اے خدا شناس بُرو

کہ مستحق کرامت گناہگار انند

نسیم نے فارسی میں کتنی طبع آزمائی کی تھی اس کے تفصیلات کسی تذکرہ میں نہیں ملتے اور نہ اردو میں کسی ضخیم مجموعہ کا پتہ چلتا ہے۔ "صاحب بہار گلشن کشمیر" نے فارسی میں صرف دو مخمس اور ایک مختصر دیوان اردو کا حوالہ دیا ہے اور اسی اردو دیوان کی

چند غزلیں پیش کی ہیں۔ انھیں غزلیات سے ہی مندرجہ ذیل اردو اشعار مثالاً پیش کیے جاتے ہیں۔

بتوں کو جو دیکھا گنہ کیا ہمارا — خدائی خدا کی تماشا ہمارا
کوچہ جاناں کی ملتی تھی نہ راہ — بند کیں آنکھیں تو رستہ کھل گیا
غم نہ بن کر خود غرض ہو جایئے — مثل شاعر اور کے کام آیئے
جوہر تیغ نگہ کھل جائے گا — منھ نہ میرے زخم کا کھلوایئے
جب نہ جیتے جی مرے کام آئے گی — کیا یہ دنیا عاقبت بخشائے گی
گر یہی ہے اس گلستاں کی ہوا — شاخ گل اک روز جھونکا کھائے گی
کیا ملا عرض مدعا کر کے — بات بھی کھوئی التجا کر کے
لائے اس بت کو التجا کر کے — کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے

جس قدر وصل بتاں کا تھیں رہتا ہے فراق
اے نسیم اتنی ہی یادِ خدا آتی ہے

فراق دیدہ ہوں وصلِ یار باقی ہے
خزاں رسیدہ چمن کی بہار باقی ہے
غبار راہ ہوں پر خاکساری کہتی ہے
ہوائے اوج و دماغ وقار باقی ہے

نیتِ شب احرام اے ساقی
آج پیتے ہیں کل سمجھ لیں گے

منت دلا کسی کی نہ اصلا اٹھایئے
مر جایئے نہ نازِ مسیحا اٹھایئے

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ دوسرا مصرع مشاعرہ کی طرح کا مصرع تھا۔

نسیم کے کلام میں شوخی و بذلہ سنجی، تصوف، صفائی زبان بندش الفاظ، مضمون آفرینی غرض کہ غزل کے خصوصیات اور خوبیوں کے تمام نمونے ملتے ہیں۔ ان کی زندگی نے وفا نہیں کی ورنہ اغلباً ان کا مقام اور زیادہ بلند ہوتا۔ چکبست نے ان کی غزل گوئی کے بارے میں بجا طور پر فرمایا ہے کہ "یہ ضرور ہے کہ نسیم کا کلام آتش، ناسخ، ذوق و غالب کے کلام کا ہم پلہ نہیں۔ یہ لوگ آسمان سخن کے تارے ہیں، ان کے برابر کسی کو عروج نہیں ہوا۔ مگر اس میں شک نہیں کہ نسیم، رند، صبا، و خواجہ وزیر کے ہم پلہ ضرور تھے۔"

چکبست نے بہار گلشن کشمیر میں مندرج اشعار کے علاوہ نسیم کا کچھ اور بھی کلام فراہم کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ تذکرہ نگاروں نے مثنوی گلزار نسیم پر زیادہ توجہ کی اور غزلیات کا کوئی بڑا ذخیرہ فراہم نہیں کیا۔ حقیقت امر بھی یہی ہے کہ نسیم کو صف اول کے اردو شعراء میں جگہ دینے کے لیے ان کی یہ مثنوی کافی ہے۔

اس دور میں شاعری کی دنیا غزل گوئی تک محدود تھی اور اسی ایک صنف سخن میں مقابلے ہوتے تھے۔ مثنوی کا ذوق میر حسن کی تخلیق سحر البیان نے پیدا کرایا تھا اور اسی تصنیف کے ہر طرف چرچے تھے۔ نسیم نے بھی غزل گوئی سے ابتدا کی تھی۔ مگر ان کے پیش نظر یقیناً اس صنف کلام میں بھی طبع آزمائی کا ارادہ تھا۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے سحر البیان کا پوری طرح مطالعہ کیا اور اس سے علیحدہ ہو کر ایک بلند پایہ تصنیف پیش کرنے کا منصوبہ بنایا۔ گل بکاؤلی کا قصہ نثر میں موجود تھا، اس کو نظم کے قالب میں اتارنے کی کوشش کی۔ پہلی مشق میں ایک ضخیم حجم میں تصنیف تیار کی اور اس کو اصلاح کے لیے اپنے استاد کی خدمت میں پیش کیا۔ خواجہ آتش نے فرمایا کہ "ارے بھائی! اتنی بڑی مثنوی کون پڑھے گا، تم پڑھو گے کہ تم نے تصنیف کی ہے۔ ہاں میں اصلاح کے خیال سے ایک بار دیکھ جاؤں گا۔" استاد کی بات دل میں لگ گئی۔ نظر ثانی کی اور جتنے بھرتی کے اشعار تھے نکال دیے۔ اور قدم قدم پر اختصار ملحوظ رکھتے ہوئے چار چار اشعار کا مطلب ایک ایک شعر میں ادا کیا۔ اس طرح گلزار نسیم کو باغ و بہار بنا کر جب دوبارہ استاد کے سامنے پیش کیا تو انھوں نے اپنے ہونہار شاگرد کی محنت پر دل کھول کر آفریں کی۔ انھوں نے ادھر ادھر کچھ اصلاحات بھی دیں۔ لیکن نسیم نے ہر اصلاح قبول نہیں کی۔ اور اپنے اشعار کو جنسہٖ برقرار رکھا۔

مثلاً مثنوی کا شعر تھا۔ ؎

تلیاں پے مشک بو دھواں دھار
بیڑے خچیے پان کے مزے دار

آتش نے دوسرا مصرع اس طرح بدلنا چاہا۔

"بیڑے چکھے بہت مزے دار"

لیکن نسیم کو ان کی یہ اصلاح پسند نہیں آئی۔

مثنوی گلزار نسیم حسن بیان، پاکیزگی زبان، تناسب الفاظ چستی بندش، پختگی کلام، تشبیہوں اور استعاروں کی بہتات اور اسی کے ساتھ اختصار میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی۔ وہ زمانہ شعرو ادب کے عروج کا تھا اس لئے چھپتے ہی ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گئی اور اس کا مصنف میر حسن کا ہم پلہ قرار پا گیا۔ راقم کی رائے میں مثنوی گلزار نسیم کو مثنوی سحر البیان پر فوقیت حاصل ہے۔ مولف آب حیات فرماتے ہیں "پنڈت دیا شنکر نے گلزار نسیم لکھی اور بہت خوب لکھی۔ . . . اس کی عام و خاص میں شہرت ہے۔ اس کے نکتے اور باریکیوں کو سمجھیں یا نہ سمجھیں مگر سب لیتے ہیں اور پڑھتے ہیں۔ جتنی سمجھ میں آتی ہے اسی پر خوش ہوتے ہیں اور لوٹے جاتے ہیں۔"

منشی احمد علی شوق گلزار نسیم کے متعلق تحریر فرماتے ہیں۔ (کشمیری درپن بابتہ ماہ اگست ۱۹۰۵ء) "گلزار نسیم کی خوبیوں کو میرا دل ہی جانتا ہے اور میں سچ کہتا ہوں کہ نسیم مرحوم نے جس فصاحت کے ساتھ گلزار نسیم کو نظم فرمایا ہے میں اس کو نہیں پہنچ سکا۔ میں نے اپنی قوت شاعرانہ ایک حد تک ترانۂ شوق میں صرف کی اور اس قدر صحیح ہے کہ ترانۂ شوق کی تصنیف کے وقت گلزار نسیم میری نگاہوں کے سامنے تھی۔ حاشا اس غرض سے نہیں کہ میں اس کا جواب لکھوں بلکہ اس غرض سے کہ بحر ایک ہی ہے مضامین لڑ نہ جائیں لیکن نسیم کی فصاحت بیانی نے میری یہ حالت کی کہ جا بجا پسینہ آ گیا اور پھر بھی کامیابی کی حد تک نہ پہنچ سکا۔ . . . میں نسیم مرحوم کی روح کو گلزار نسیم کی داد کہاں تک دوں۔ جس رنگ میں یہ مثنوی ہے اپنی مثال آپ ہی ہے۔"

اسی طرح نقاد لکھنوی لکھتے ہیں (رسالہ زمانہ بابت جون ۱۹۰۰ء) "گلزار نسیم بھی اسی قبیل کی ایک نظم ہے جسے جتنی مرتبہ پڑھیے اور جتنے غور سے پڑھیے ایک نیا لطف ملتا ہے اور جیب ذہن اس کے دقائق و نزاکت فن تک پہونچتا ہے تو ایک وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ درحقیقت اس میں ایسے نازک استعارے اور بلند خیالی کے نمونے ہیں جو اردو شاعری کی انتہائی ترقی کا پتہ دیتے ہیں اور مجموعی حیثیت سے اس میں اعلا شاعری کے اتنے ارکان جمع ہو گئے ہیں جو دوسری مثنویوں میں بلکہ اردو کی کل تصانیف میں کبریت احمر کا حکم رکھتے ہیں۔"

پنڈت دیا شنکر نسیم کی شاعری کا آغاز ان کی عمر کے بیسویں برس یعنی ۱۸۳۱ء میں ہوا تھا اور انھوں نے بتیس برس کی عمر میں بعارضہ ہیضہ ۱۸۴۲ء میں انتقال فرمایا تھا۔ مثنوی گلزار نسیم ۱۸۳۸ء میں منظر عام پر آ گئی تھی۔ اس کے بعد وہ صرف چار برس تک بقید حیات رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کو اپنے گلزار کی بھرپور بہار دیکھنا نصیب نہیں ہوئی اور وہ شعر و ادب کا یہ خزینہ آنے والی نسلوں کے حوالے کر کے دنیا سے رخصت ہوئے وقت آخر دنیا اور اپنے بارے میں ان کے تاثرات کیا تھے اس کا پتہ اس شعر سے ہوتا ہے جو انھوں نے مرنے کے دو تین گھنٹے قبل کہا تھا۔ فرماتے ہیں۔ ؎

پہنچی نہ راحت ہم سے کسی کو بلکہ اذیت کوش ہوئے
جان پڑی تب بار شکم تھے، مر کے وبال دوش ہوئے

کہا جاتا ہے کہ نسیم نے اپنے اکلوتے لڑکے کی موت پر بھی ایک شعر کہا تھا۔ اس کا انتقال سرشام ہوا تھا حسب ذیل شعر میں یہ رعایت بھی ملحوظ رکھی تھی۔ ؎

تڑپ کے دل ہوا ٹھنڈا جگر کے داغ جلے
چراغ گھر کا ہمارے بجھا چراغ جلے

یہ دونوں واقعات صحیح ہوں یا نہ ہوں لیکن ان کی گہرائیوں کا جائزہ لینے کے بعد نسیم کا کردار ہماری نظروں میں بہت بلند نظر آتا ہے۔

★

شوکت پردیسی
موضع و ڈاکخانہ: اجمدھاں
ضلع جونپور (یوپی)

غزل

بے خودیٔ شوق میں رازِ درونِ مست کھو لیے
بولیے تو! ان کی محفل میں سمجھ کر بولیے

ایک چھیڑ ہی تو تھا چھوٹی سی چنگاری کا کھیل
جب نشیمن جل بجھا، کچھ دیر کو ہم رو لیے

ہے وہ عالم، امتیازِ روز و شب باقی نہیں!
کب ڈھلا دن، رات کب آئی، کہاں ہم سو لیے

کیسے بتلائیں کہ کیوں تنہا کھڑے ہیں راہ میں
کوئی سایہ چل رہا تھا، ساتھ ہم بھی ہو لیے

آئیے سن لیجیے افسانۂ دردِ نہاں!!
اور پھر ہنس ہنس کے سب کے کان میں رس گھو لیے

کھل گیا بادل برس کر، ڈھل گئی ساون کی رات
منتظر ہوں پھر کسی کا، چاند تاروں کو لیے

زندگی کی دوڑ میں تنہا، سب سے آگے ہیں کبھی!
پھر رہی ہے حسرتِ ناکام اب مجھ کو لیے

ہم تو عرضِ مدعا کر کے ہوئے رسوا مگر
آپ کو آخر ہوا کیا، آپ ہنسیے بولیے

رات تو وہ بے کلی تھی جس کا عالم تھا جدا
بارے شوکتؔ! آپ اپنے دل کو سمجھا تو لیے

سید نام منظر
۴۶-لارڈ پاتم برق
گیا - بہار

غزل

کسی افسانے سے جینے کا جھوٹا آسرا دیں گی
مرے ہاتھوں کی یہ خالی لکیریں کیا دیں گی

حسیں خوابوں کے آنچل اور زلفوں کی ہوا دیں گی
یہ آنکھیں سائبانِ بے ستوں کا آسرا دیں گی

نزولِ شب سے پہلے کھڑکیوں کو بند کر لو کہ
ہوائیں قصہ بیداری کا صبحوں کو سنا دیں گی

بزرگوں کی زمانت ہم کو تپھر کر کے دم لیں گی
نہ مرنے کی دعا دیں گی نہ جینے کی سزا دیں گی

حقیقت گاؤں سے معصوم صورت لے کے نکلی ہے
مشینیں اس کے چہرے پہ کوئی چہرہ چڑھا دیں گی

دھواں نالہ، روایت رسم گہرا دھند مجبوری
یہ دیواریں مرے اندر سے مجھ کو چھڑا دیں گی

صدا و لفظ امانت رکھ رہا ہوں میں خلاؤں میں
ہوائیں اگلی نسلوں کو مری غزلیں سنا دیں گی

انیس لے ملم
ملکی محلہ آرہ - بہار

قطعہ

رضیہ سجاد ظہیر

کیسی اچھی تھیں کیسی پیاری تھیں
خواب آور وہ سرمگیں آنکھیں
مٹ گئے سب نشانِ رامش و رنگ
بام و در ہیں نہ دور ہیں آنکھیں
شور برپا ہے ہر طرف یہ انیسؔ
آج رضیہ نے موند لیں آنکھیں

غزلیں

جلیس حمیدی
صدر شعبہ بیالوجی
امیر الدولہ اسلامیہ کالج، لکھنؤ

بڑھے قدم سوئے حرم ضرور کوئی بات ہے
طوافِ کعبہ اور ہم ضرور کوئی بات ہے

ہمارے حالِ زار پر نہ تھی کسی کو کل
ہیں آج سب شریکِ غم ضرور کوئی بات ہے

ہمارا دکھ بھی ایک ہے ہمارا سکھ بھی ایک ہے
خلوص کیوں نہیں بہم ضرور کوئی بات ہے

یہ سوچنے کی بات ہے یہ بات آپ سوچیے
ہمیں ہیں کیوں اسیرِ غم ضرور کوئی بات ہے

وہ غم گساریاں نہیں وہ دلنوازیاں نہیں
کہاں گئے وہ اہلِ غم ضرور کوئی بات ہے

یہ مشکلیں یہ حادثے یہ مرحلے یہ مسئلے
یہ زندگی کے پیچ و خم ضرور کوئی بات ہے

جو مسکرا کے بخشتے تھے زندگی جہان کو
ہے آج ان کی آنکھ نم ضرور کوئی بات ہے

جلیس ہم کو دیکھ کر وہ اس طرح گزر گئے
کہ جیسے اجنبی تھے ہم ضرور کوئی بات ہے

ہمسر قادری
۵ لنگا پر شاد روڈ
مولوی گنج لکھنؤ

خلاف واقعہ کرم ضرور کوئی بات ہے
نگاہِ ناز اور ہم ضرور کوئی بات ہے

یگانگت سے آشنا مزاجِ دوست ہے مگر
کبھی کرم کبھی ستم ضرور کوئی بات ہے

کہاں وہ محفلِ حسیں کہاں میں بوریا نشیں
یہ امتزاجِ بیش و کم ضرور کوئی بات ہے

کتابِ زیست پر مری کیا جو اس نے تبصرہ
بنامِ اشتراکِ غم ضرور کوئی بات ہے

شبِ فراق کو مری جو دے گئی ہے نکہتیں
ہوائے زلفِ خم بہ خم ضرور کوئی بات ہے

صنم کدے کے پیشوا جو ہیں حرم کے پاسباں
یقین کیجیے محترم ضرور کوئی بات ہے

نظر نظر زباں زباں مسرتوں کی داستاں
حدیثِ غم قلم قلم ضرور کوئی بات ہے

یہ سرد سرد آہ اور یہ نبض ڈوبتی ہوئی
یہ گرم گرم اشکِ غم ضرور کوئی بات ہے

ہے پارساؤں میں شمار ہمسر آپ کا مگر
یہ لغزشِ قدم قدم ضرور کوئی بات ہے

شیو پرشاد وفا
۱۷۲/۹۳ بازار جھاؤ لال
لکھنؤ

تری قدرت کا جلوہ ہر طرف اے جلوہ گر دیکھا
ہمیں تو ہی نظر آیا جدھر بھر کر نظر دیکھا

تر و تازہ چمن میں یوں تو ہم نے ہر شجر دیکھا
تمناؤں کے گلشن ہی کو بے برگ و ثمر دیکھا

کماں میں جوڑ کر ناوک کو اس نے جب ادھر دیکھا
عجب حسرت سے دل دیکھا کبھی ہم نے جگر دیکھا

تن آسانی کی خواہش ہے تو ہو عزلت گزیں اے دل
صدف میں ہم نے بے سوراخ دیکھا جو گہر دیکھا

سوئے راہِ عدم وہ آج خالی ہاتھ جاتے ہیں
ہر اک منزل پہ جن کے ساتھ سامانِ سفر دیکھا

کہاں ہنگامۂ محشر کو کوئے یار سے نسبت
ادھر سے تو سوا عشاق کا مجمع ادھر دیکھا

قصرِ ظلم سے شعلے نکلتے ہیں گری ہے برق،
بہت ہنستے تھے نالوں پر جفا کے تم، اثر دیکھا

ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری
۲۳۱، زینگ گڑھ
سری نگر کشمیر۔

تذکرۂ ریختہ گویاں

از علی الحسینی الگردیزی

نسخۂ ندوہ ۔ مکتوبہ ۱۱۷۷ھ مطابق ۱۷۶۳ء

یہ تذکرہ سید فتح علی حسینی الرضوی الگردیزی کی تالیف ہے۔ سید فتح علی سادات گردیز میں سے تھے۔ ان کے والد سید عوض خاں محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں لشکر شاہی میں بخشی تھے۔ اور امیرانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ محمد شاہ کے انتقال کے بعد ان کے فرزند اور جانشین احمد شاہ بادشاہ کے زمانے میں کچھ عرصے کے لیے نیابت صوبہ دار لاہور کی خدمت پر سرفراز ہو گئے تھے۔ احمد شاہ ابدالی نے جب دلّی پر حملہ کیا تو شاہ صاحب مردانہ وار لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔

ان کے بڑے فرزند سید فتح علی حسینی اپنے وقت کے مشائخ و صوفیا میں شمار کیے جاتے تھے اور جو شجرہ ان کا تحریر کیا ہوا دستیاب ہوا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مخدوم میر جہاں (خلیفہ مخدوم شاہ عالم محمدی خلیفہ میر سید محمد کبیر خلیفہ شیخ محب اللہ الٰہ آبادی) سے بیعت تھے اور ان کے خلفاء میں سے تھے۔ اس امر کا ثبوت کہ ان کا شمار اپنے وقت کے بزرگان دین اور شیوخ میں تھا میر قدرت اللہ قاسم (صاحب تذکرۂ دیوان) کے کلام سے بھی ملتا ہے۔ وہ انھیں اپنا پیر و مرشد کہتا ہے اور اپنے کلام میں جگہ جگہ ان کی مدح و ثنا کرتا ہے۔ چنانچہ اپنی مثنوی "ذکر امانتِ پدران پیر" (کتاب خانہ نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی) میں یہ اشعار ان کی نسبت لکھتے ہیں:

گیا جب جہاں سے وہ ناصح کریم
ہوا اور برس آٹھویں یہ یتیم

پس از رحلتِ والدِ خویش یقیں
یہ ہے سال اے مردِ نیک دیں (کذا)
ہدایت سے ایک سید پاک کی
گزیں نخلِ باغِ لولاک کی
کہ ہے میر فتح علی خاں لقب
حسینی تخلص، حسینی نسب
حسب اور نسب اس کا ہے آفتاب
ہے مستغنی الذکر ذاتِ کتاب
نہایت ہی عالی نسب وہ بزرگ
بغایت سب والا حسب وہ بزرگ
وہ ہے آج شیخ المشائخ زماں
طریقِ شریعت میاں تا میاں
وہ توحید کا بحر اخضر ہے آج
وہ اس علم میں شیخ اکبر ہے آج
وہ سب بادئ رہروانِ خدا دلیل بزرگانِ صاحب صفا
وہ ہے آج میاں شیخ مردم تراش
فقیر اس سے لازم ہے سیکھیں معاش
لہ ہے آج وہ پیر روشن ضمیر
امیر و فقیر و فقیر و امیر
توکل ہے اس کا وہ چست و درست
کہ ابرِ سیہ دل جو ہو جہر سست

نہ یک سال بل سالہا ئے دراز
ملے اپنی جا سے نہ وہ سرفراز[۶]

قاسم نے اپنے تذکرۂ مجموعۂ نغز میں بھی متذکرہ تین بھائیوں گردیزی کا ذکر ایک مرشد و ہادی کی حیثیت سے کیا ہے۔ میاں غالب علی خاں تخلص عیاں برادر فتح علی حسینی کے ذکر میں لکھا ہے :

"ہمیں برادر سید غالب علی خاں عیاں سید فتح علی خاں حسینی سلمہم الرحمٰن علائق دنیا را خیر باد گفتہ بمسند ارشاد پائے تمکین استوار کردہ زہد و توکل را کار بستہ بر دستے نشستہ اند کہ تحریر عشر عشیر مقدور قلم حقائق رقم نیست کہ بر رشتہ تحریر کشد۔ حق تعالیٰ سلامت با کرامت داراد"[۷]

مرزا مسیح اللہ بیگ مسیح کے متعلق لکھا ہے! :

"تصحیح نسخۂ آدمیت از جناب فیض مآب ہادی سالکان میر فتح علی حسینی مد ظلہ می نمود و شعر خود ہم باصلاح حضرت ایشان درست می فرمود"[۸]۔

میر یوسف علی تخلص یوسف کے ترجمے میں لکھا ہے ! ۔

"دست بیعت بدست حق پرست آگاہ رموزات حقیقی وصیٰ سید فتح علی خان حسینی دادہ مد ظلہ و سلمہ ربہ واز خدمت سراپا برکت جناب ہدایت انتساب حضرات ایشان فیوضات دینوی و اخروی فی ربایند و کسب سعادات کونینی می نماید"[۹]

سید فتح علی خاں گردیزی کے حالات زندگی بہت کم ملتے ہیں۔ قاسم نے اوپر کے اشعار میں انھیں شاہ تسلیم کیا ہے اور ان کا تخلص حسینی بتایا ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ قاسم نے اپنے تذکرہ (مجموعہ نغز) میں ان کا ترجمہ درج نہیں کیا ہے اس لیے ان کا ایک شعر بھی دستیاب نہیں ہے۔

گردیزی کا انتقال ۱۲۲۴ ہجری مطابق ۱۸۰۹ء میں ہوا۔ ثناء اللہ خاں فراق نے تاریخ کہی: "انتخاب سلف" مادہ تاریخ ہے[۱۰]

تذکرۂ ریختہ گویاں پر سب سے پہلے ڈاکٹر اسپرنگر نے تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ ان کے پاس اس کے دو قلمی نسخے تھے پہلے نسخے کی کتابت ۱۱۸۰ھ مطابق ۱۷۶۶ء میں اور دوسرے کی ۱۲۱۶ھ مطابق ۱۸۰۲ء میں ہوئی تھی۔ یہ دونوں نسخے انھیں نطنزر ایڈورڈ ہال سے دستیاب ہوئے تھے۔ موخر الذکر نسخہ ٹیپو سلطان (متوفی ۱۷۹۹ء) کے کتاب خانے کی یادگار تھی۔ ٹیپو سلطان کے بعد یہ نسخہ پہلے حافظ احمد کبیر اور بعد میں مولوی رضا حسن خاں بہادر کے پاس رہا اور پھر فیٹز ایڈورڈ ہال کے ہاتھ کلکتہ میں ۲۲ اکتوبر ۱۸۴۸ء کو لگا دونوں نسخے شاہان اودھ کے کتاب خانوں کی زینت بنے رہے[۷] اور آجکل انڈیا آفس میں محفوظ ہیں[۸]

انڈیا آفس لندن کے علاوہ تذکرہ کے چند نسخے ایشیاٹک سوسائٹی بنگال[۹] حیدر آباد[۱۰] اور رامپور کے کتاب خانوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ نسخۂ رامپور ناقص ہے۔ اس میں دیباچہ اور چند شعرا ساقط ہیں۔ یہ غالباً سید محسن علی محسن مولف سراپا سخن کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے[۱۱]

انڈیا آفس کے نسخے بھی ناقص ہیں۔ دونوں میں "خاتمہ" اور مصنف کا ترقیمہ غائب ہے۔ اسی لیے ڈاکٹر اسپرنگر اور گارساں دتاسی[۱۲] نے تذکرے کی داخلی شہادت کی بنیاد پر اس کا سال تصنیف ۱۱۶۵ ہجری قرار دیا۔ دراصل تذکرہ ۵ محرم ۱۱۶۶ھ مطابق ۱۳ نومبر ۱۷۵۳ء کو اختتام پذیر ہوا تھا۔ گردیزی کی عبارت ذیل میں درج کی جاتی ہے :

"ختم اللہ بالحسنیٰ فی خامس محرم الحرام المنتظم فی ہمام سنہ وستین ومایۃ بعد الالف من الہجرۃ المبارکۃ النبویۃ حامداً للہ وحدہ حق حمدہ ومصلیاً علی الرسولہ وآلہ واصحاب من بعدہ محررہ عبد المفتاق الی رحمۃ ربہ الغنی فتح المدعو بہ علی الحسینی الگردیزی عفی عنہ!

جناب امتیاز علی خاں عرشی کی تحقیق کے مطابق گردیزی نے ۲۷ برس کی عمر میں تذکرے کا آغاز کیا اور تکمیل کے سنہ

کے بعد بھی اس میں کچھ اضافے ہوئے ہیں[12]

تذکرۂ گردیزی ابتدائی اور قدیم تذکروں میں دوسرے نمبر پر شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے سال تصنیف ۱۱۶۶ ہجری تک چند اور تذکرے لکھے گئے تھے۔ جن میں میر کا نکات الشعرا سرفہرست ہے۔ دراصل گردیزی نے اپنے تذکرہ میر کے جواب میں لکھا تھا۔ لیکن تعجب اس بات پر ہوتا ہے کہ انھوں نے میر کے تذکرے کا کہیں کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ غالباً یہ سکوت اس لیے برتا گیا کہ وہ اپنے تذکروں کی اہمیت بڑھانا اور نکات الشعرا کی گھٹانا چاہتے تھے۔ اور اس طرح تذکرہ نویسی کی اولیت کا سہرا اپنے سر رکھنے کے متمنی تھے۔ معاملہ اس کے برعکس ہوا مگر گردیزی سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ میر کے تذکرہ سے بیزار تھے اور اسی لئے انھوں نے کم درجے کے شعرا جیسے آبرو، بیان، حزیں، درد، سجاد، سودا، عزلت اور یقین وغیرہ کے بکثرت اشعار نمونے کے طور پر درج کئے ہیں لیکن خدائے سخن میر تقی میر کا صرف ایک شعر اور وہ بھی معمولی درجے کا پیش کر کے اپنے دل کا بخار نکالا۔ راقم کے اس بیان کی تائید گردیزی کے درج ذیل اقتباس سے بھی ہوتی ہے۔

"از ملاحظہ تذکرہائے اخوانِ زماں کہ مشتمل بر اسامی ریختہ گویاں و علت غائے تالیف شان خردہ گیری ہمسران و ستم ظریفی با معاصرانست در اظہار ما فی نفس الامر بایجاز پرداختہ بلکہ از عدم اعتنا و قلت ذکر اکثر احوال اعزہ اغلاط نامہ ہیچ بطالت بر دو دخطا ہائے نمایاں کردہ اند۔ بخاطر فاطر رسید کہ تذکرۂ مرقوم سازد بے ردیدگی از روئے انصاف خالیاً عن الاعتساف و اسامی نامی شعرا را بہ ترتیب حروف تہجی بنویسد تا جامع این تذکارے دعا گویان را یادگارے بود۔"

(نسخۂ ندوہ)

تذکرۂ گردیزی ڈاکٹر عبدالحق نے پہلی مرتبہ انجمن ترقی اردو سے تین مختلف نسخوں سے مرتب کر کے ۱۹۳۳ء میں شائع کیا ان میں سے ایک نسخہ بڑا اہم ہے جو سید عبدالنبی نے سید عبدالولی عزلت کی فرمائش سے ۱۱۷۲ھ میں حیدرآباد میں لکھا تھا۔ ڈاکٹر موصوف نے ان قلمی نسخوں سے متعلق کوئی نشان دہی نہیں کی ہے کہ وہ کہاں اور کن کے پاس تھے اور ان کی کیا کیفیت تھی۔ مطبوعہ نسخے کا ترقیمہ یہ ہے:

"تمت الکتاب بعنوان الملک الوہاب در بلدۂ فرخندہ بنیاد حیدرآباد بہ بنیاد حسب الفرمائش حضرت سید عبدالولی صاحب عزلت تخلص باتمام رسید۔ کاتب الحروف سید عبدالنبی ابن سید محمود ابن سید محمد رضا اصفہانی غفر اللہ تعالیٰ تحریر فی التاریخ ہژدہ شہر شعبان المعظم سن ۱۱۷۲ یک ہزار و یک صد و ہفتاد و دو من الہجرۃ النبوۃ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ۱۱۷۲"

کتاب خانۂ آصفیہ میں تذکرہ گردیزی کے دو قلمی نسخے محفوظ ہیں تفصیل یہ ہے:

نسخۂ اوّل: نمبر مخطوطہ ۹۹، سائز ۹×۵ انچ صفحہ ۱۲۳، سطر ۱۲ خط نستعلیق۔

نسخۂ دوم: نمبر مخطوطہ ۲۱۹، سائز ۹×۵ انچ صفحہ ۹۵، سطر ۱۵ خط نستعلیق۔

نسخۂ دوم کے خاتمہ کی ذیل کا ترقیمہ ہے:

"حسب الارشاد خواجہ غلام رازی خان رحیم سلمہ الرحمن در حیدرآباد فرخندہ بنیاد، در ماہ ذی الحجہ ۱۱۹۲ھ"

غالباً ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے حیدرآباد کے نسخوں سے ہی استفادہ کیا ہوگا۔ وہ مطبوعہ نسخے کے مقدمہ میں بار بار فرماتے ہیں کہ گردیزی نے کل ۹۸ شعرا کا تذکرہ لکھا ہے۔ مگر آصفیہ کے نسخوں میں شعرا کی کل تعداد ۹۷ ہے۔ دراصل ڈاکٹر صاحب کو یہ سہو ہوگیا ہے کہ انھوں نے پاکباز کے اشعار کو قزلباش خاں امید کی طرف منسوب کیا ہے۔ اور اس طرح جو پانچ شعر انھوں نے صفحہ ۲۶ میں قزلباش خاں کے نام کے تحت درج کئے ہیں وہ قدیم تذکروں جیسے "نکات الشعرا" صفحہ ۸۲، "مسرت افزا" صفحہ ۶۵ اور "گلستان سخن" صفحہ ۔۔ میں پاکباز کے ترجمے میں درج ہیں۔ یہ اشعار نسخۂ ندوہ میں بھی

یا کبآز کے ترجمے میں ہی درج ہیں اد۔ قزلباش خاں کا ذکر علیحدہ شاعر کی حیثیت سے کہیں نہیں ہے۔

راقم الحروف کو تذکرۂ ریختہ گویاں کا ایک مکمل، مستند اور خوشخط نسخہ ندوۃ العلماء لکھنؤ کے کتب خانے میں حال ہی میں دستیاب ہوا ہے۔ جواب ترتیب دے کر اردو پبلشرز لکھنؤ سے شائع کیا جا رہا ہے۔ یہ نسخہ ڈاکٹر عبدالحق اور جناب امتیاز علی خاں عرشی کی نظر سے نہیں گزرا ہے۔ دونوں بزرگواروں نے اس کا کہیں ذکر نہیں کیا ہے۔ جناب زمان فتح پوری نے بھی اس نسخے کا ذکر اپنی تحقیقی کتاب "اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری" میں نہیں کیا ہے۔ نسخۂ ندوہ کے سرورق پر ذیل کی عبارت درج ہے۔

"تذکرۂ ریختہ گویاں از علی الحسینی الگردیزی تالیف ۱۱۶۶ھ ستہ وستین مایۃ بعد الالف۔ غلام محمد"

تذکرہ کی تفصیل یہ ہے!

نمبر مخطوطہ ۴۸، اوراق ۵۷، سائز ۵×۹ انچ سطر ۱۷، مکتوبہ ۱۱۷۴ ہجری۔

پہلے چار صفحوں میں مقدمہ مصنف ہے اس کے بعد اسی صفحے میں تذکرہ کی ابتدا سراج الدین علی خاں آرزو سے ہوتی ہے۔ اور آخر میں تذکرہ ورق ۵۷ الف میں مبتلا و ہاب بیکرو پر ختم ہو جاتا ہے۔ پھر اس کے ساتھ ہی مصنف کا ترقیمہ بھی درج ہے۔ یہ نسخہ ۲۳ جمادی الثانی ۱۱۷۴ھ ہجری کا مکتوبہ ہے۔ ترقیمہ ذیل میں من وعن درج کیا جاتا ہے۔

"تمت ہذا التذکرہ کاتب الحروف اضعف من عباد اللہ الصمد حیدر ابن حیدری بن شیخ المشہدی بتاریخ بیست سیوم جمادی الثانی ۱۱۷۴ھ ہجری۔"

زیر نظر نسخے میں بھی شعرا کی کل تعداد ۹۷ ہے۔ اس میں اور مطبوعہ نسخے میں اختلاف بھی پایا جاتا ہے جس کی نشاندہی راقم نے حواشی میں کی ہے۔ مطبوعہ نسخے میں غلطیاں بھی ملتی ہیں۔ ذیل میں دونوں نسخوں کے مقدموں کے کچھ اقتباسات نقل کیے جاتے ہیں:۔

نسخہ ندوہ:۔

"از بے مہری سپہر نابکار چہ نالم، کہ مصرع مسرت در دل خوشی را مانند نقش بیت ما نکال از صفحۂ روزگار حک ساختہ و از نارسائی زمانہ ناہنجار چہ گویم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یعنی چیز لب بستن بخاطر می گزرد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر غزلے در مرثیہ ۔ ۔ ۔ ۔ فریاد اگر دہ آید"۔

نسخۂ مطبوعہ صفحہ ۳۔

"از بے مہری سپہر ناہنجار چہ نالم ۔ ۔ ۔ ۔ واز نارسائی زمانہ ناہنجار گویم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یعنی چیز لب بستن ۔ ۔ ۔ فریاد اگر آید"

نسخہ ندوہ۔

"از ملاحظۂ تذکرہائے اخوان زمان کہ مشتمل بر اسامی ریختہ گویاں وعلت نمائے تالیف شاں خردہ گیری ہمراں وستم ظریفی با معاصر انست در اظہار مافی نفس الامر بایجاز پرداختہ بلکہ از عدم اعتناد قلت ذکر اکثر احوال اعزہ اغلاط صریح بکار بردہ"۔

نسخۂ مطبوعہ صفحہ ۴۔

"از ملاحظۂ تذکرہائے اخوان زماں کہ مشتمل بر اسامی ریختہ گویان عہد محر ساختہ اند وعلت نمائے تالیف شاں خردہ گیری ہمراں وستم ظریفی با معاصر انست در اظہار مافی نفس الامر بایجاز پرداختہ بلکہ از جہت عدم اعتنا و قلت تتبع کرد۔ اکثر نازک خیالاں رنگین نگار را از قلم انداختہ معہذا در تصحیح اخبار تحقیق احوال اعزہ اغلاط صریح بکار بردہ"۔

نسخۂ ندوہ۔

"از ضعف تالیف وتنافر کلمات وتعقید لفظی ومعنوی وحذف تالیف عبارت از کلام غیر مطابق مشہورۂ نحویہ است مطابق کلام است"۔

نسخۂ مطبوعہ صفحہ ۵۔

"از ضعف تالیف عبارت از کلام غیر مطابق قواعد
مشہورۂ نحویہ است و تنافر کلمات ثقیلہ آنست بزبان بلاغت عبارت
از مطابقت کلام است۔"

نسخۂ ندوہ اس لیے بھی تمام نسخوں کے مقابلے میں اہم ہے
کہ یہ دکن کے مشہور و معروف شاعر عبدالولی عزلت اور
اسد علی خاں تمنا اورنگ آبادی کی نظر سے گزرا ہے۔ بعض
مقامات پر ان دونوں بزرگوں کی تحریریں بھی درج ہیں جن سے
صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نسخہ مستند اور معتبر ہے۔ حزیں کے
ترجمہ کے حاشیے میں اس شعر کی تشریح عزلت نے کی ہے۔

فرش ہو جاتا ہوں سنگ آستاں تیرے کو دیکھ
طور کا کرتے تھے جیسے حضرت موسیٰ ادب

تشریح کے ابتدائی الفاظ اس طرح درج ہیں:۔
" "فقیر عزلت می گوید کہ بعد ظہور تجلی موسیٰ علیہ السلام"۔

پیام کا شعر ہے:

بات منصور کی فضولی ہے
ورنہ عاشق کو آہ سولی ہے

مصرع ثانی کے بارے میں تمنا کی یہ تحریر حاشیے میں
درج ہے

"نزد فقیر تمنا مصرع دوم اگر چنیں بود، بہتر۔
حق تو یہ ہے کہ آہ سولی ہے"

مطبوعہ نسخے میں مصرع دوم اس طرح ہے۔
"ورنہ عاشق گواہ، سولی ہے"

نسخۂ ندوہ میں بعض شعرا کے ترجموں کی عبارت بھی
زائد ہے۔ مطبوعہ نسخے میں آشنا کا ترجمہ یوں ہے۔

"آشنا" بیگانہ از ریو و ریا، میر زین العابدین آشنا
بحسن سیرت و سلاست طبع مجلی۔ طبع سلیم و ذہن مستقیم دارد
بحکم من اہدا الی الہند گاہ گاہ بہ ملاقات می پردازد۔"

"کہتو صبا تو اتنا مرے تند خو کے تئیں
آخر کسی بھی وجہ دکھا دے گا رو کے تئیں

گر مجھ سے دوانے کو تم آزاد کرو گے
ویرانے جہاں کے سبھی آباد کرو گے"

نسخۂ ندوہ میں آشنا کا ترجمہ ان الفاظ میں درج ہے

آشنا۔ "بیگانہ از ریو و ریا، میر زین العابدین آشنا۔
بحسن سیرت و سلاست طبع تجلی پر آستی گفتار و درستی
افکار محلی۔ طبع سلیم و ذہن مستقیم دارد۔ و بحکم من اہدا الی
الہند گاہ گاہ بملاقات می پردازد"۔

"کہتو صبا تو اتنا مرے تند خو کے تئیں
آخر کسی بھی وجہ دکھا دے گا رو کے تئیں

اب کی جو درد دل سے تو بچ جاوے آشنا
زنہار پھر تو دینا ہو دل کو کسو کے تئیں

گر مجھ سے دوانے کو تم آزاد کرو گے
ویرانے جہاں کے سبھی آباد کرو گے

از آنجاں کہ از یک دیوانہ آبادی ویرانہا متصور نیست۔
اگر ایں مصرع بایں بند و بار باشد ہیچ عاید نمی شود۔

"گر ہم سے دوانوں کو تم آزاد کرو گے
ویرانے جہاں کے سبھی آباد کرو گے"

نسخۂ ندوہ اردو کے مشہور عالم مولوی عبدالحیٰ مصنف
گل رعنا کی ملکیت میں رہا تھا۔ انھوں نے یہ تذکرہ اپنے بیش بہا
کتاب خانہ کے ساتھ ندوۃ العلما لکھنؤ میں منتقل کیا ہے۔ تذکرے
میں مولوی صاحب کے ہاتھ کی تحریر بھی درج ہے۔ گردیزی
نے عزلت کے ترجمے میں لکھا ہے کہ:

"اصلش از معمورۂ بریلی است"

حاشیے میں مولانا نے لکھا ہے۔

"وطن اصلی میر عزلت قصبۂ سلون ضلع رائے بریلی
است۔ عبدالحیٰ۔"

مطبوعہ نسخہ میں کتابت و طباعت کی غلطیوں کے علاوہ
غلط اشعار بھی بکثرت درج ہیں۔ برعکس اس کے نسخہ ندوہ میں
درست اشعار درج ہیں۔ ذیل میں مقابلتاً چند شعر پیش کیے

جاتے ہیں۔ ن سے مراد نسخۂ اندوہ اور م سے مطلب نسخۂ مطبوعہ ہے۔

ن۔ آگاہؔ

پیری میں کروں سیر جہاں کی تو کیا ہے
ہوتا ہے ڈھلے دن سے تماشا گزری کا

م ۔ پیری میں کرو سیر جہاں کی تو مزا ہے
دن ڈھلتے ہی ہوتا ہے تماشا گزری کا

ن۔ بہارؔ

کبھی کرتے ہیں دعوے خون کا قسمت ہے تو دیکھیں گے
صفِ محشر میں کس کے ہاتھ دامن ہوگا قاتل کا

م ۔ کبھی کرتے ہیں دعویٰ عشق کا قسمت ہے تو دیکھیں
صفِ محشر میں جس کے ہاتھ دامن ہوگا قاتل کا

ن۔ دردؔ۔

دل بھی اے دردؔ قطرۂ خوں تھا۔
آنسوؤں میں کہیں گرا ہوگا

م ۔ دل تو اے دردؔ قطرۂ خوں تھا
آنسوؤں میں کبھی گرا ہوگا

ن۔ سجادؔ کوئی جا کے قاتل کو سمجھائے گا
کہ عاشق کا جی کھو کے کیا پائے گا

م ۔ کوئی جا کے عاشق کو سمجھائے گا
کہ عاشق کا جی کھو کے کیا پائے گا

ن۔ محسنؔ

اس کے کوچے میں ہے کچھ نالۂ شب کا چرچا
دیکھیو کوئی یہاں میرا تو مذکور نہیں

م ۔ اس کے کوچے میں ہے کچھ نالۂ شب گیر کا ذکر
دیکھیو کوئی میاں میرا تو مذکور نہیں

ن۔ محسنؔ

نہ روؤں میں تو بھلا کہہ کے کیا کروں
اک دل بساط میں تھا سو اس کو بھی کھو چکا

م ۔ محسنؔ نہ روؤں میں تو بھلا کہہ کے کیا کروں
تھا ایک دل بساط میں اس کو بھی کھو چکا

نسخۂ اندوہ کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں وافر تعداد میں اشعار درج ہیں اور اس طرح بہت سے اشعار پہلی مرتبہ منظرِ عام پر آ رہے ہیں۔ ذیل میں اس قسم کے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں۔

آبروؔ مجلسِ رنداں میں مت لے جا دلِ بے شوق کو
شیشہ خالی کو گیا عزت ہے میخواروں کے بیچ

اب دیں ہوا زمانہ سازی
آفاق تمام دہریا ہے

زندگانی تو ہر طرح کاٹی
مر کے پھر جینا قیامت ہے

ہم سے کیوں اڑتے ہیں ناحق بے گناہ
سر پھرا ہے کیا مگر افلاک کا

دراز اس زلف کی ہو عمر یارب
کبھو اس کا نہ ہووے بال بیکا

رہے ہیں تیس دن مژگاں کے سنمکھ
کلیجا آہنی ہے آرسی کا

احسنؔ تو قاصد وعدہ کون کرتا ہے برسوں کا کہ پھر آوے
مجھ تو تب بھی نہیں آوے گی اس کی سے برسوں

بہارؔ بنا گو عشق کی تسکین کیا ہے ہم نے عالم میں
جو ہوتا کوہکن یاں آج کرتا آ کے مزدوری

حبیب سے دیکھی اس لبِ رنگیں کے مسکانے کی طرح
خوں پڑا کھاتا ہے غنچہ مے کے پیمانے کی طرح

شمع حسن تمکین سے جلتی ہے یہی منظور ہے
معتبر رکھتی نہیں عشاق پروانے کی طرح

کیا بلا لاوے گا سر پہ اس کے حیراں ہوں بہار
لے گیا ہے شوخ میرے ہاتھ سے دل بے طرح

بیاں سہ
اس کا ادائے شکر بیاں کیونکہ کرسکوں
جن نے اٹھا کے خاک سے انساں بنادیا
ہمدم نہ فکر کر کہ میرا کام ہو چکا
جو دل لیے ہے تو سب مجھے آرام ہو چکا
آتا ہے مجھ کو ننگ مرے نام سے عبث
اے شوخ اب تو شہر میں بدنام ہو چکا
بیاں تیرے کوچے سے چلتا رہے گا
مری جان تو ہاتھ ملتا رہے گا
دیکھے تھا اپنے یار کو پہلو میں غیر کے
یہ طرفہ تر مزا ہے کہ خنجر بھی پاس تھا
جگا یا مجھ کو کس کم بخت نے ہائے
مری آنکھوں کے آگے وہ ابھی تھا
انوکھا سنگدل تو ہی نہیں ہے
ہمارا دل بھی پتھر سا کبھی تھا

تو تو ساقی جام ترسا کر پلاتا تھا مجھے
یار کی آنکھوں نے مجھکوں کردیا یکبار مست
وہ شوخ مجھ سے ہی تنہا نہیں ہوا گستاخ
ہمیشہ عشق کی خدمت میں حسن تھا گستاخ
اے مسیحا مجھ کو تو زندہ نہ کر
ان لبوں کے منھ سے شرمندہ نہ کر

دردؔ سہ
ذکر میرا وہ کرتا تھا صریحاً لیکن
میں نے پوچھا تو کہا خیر یہ مذکور نہ تھا

سیلاب اشکِ گرم نے اعضا مرے تمام
اے دردؔ کچھ بہا دیئے اور کچھ جلا دیئے

سوداؔ سہ
جرم ہے اس کی جفا کہ وفا کی تقصیر
کوئی تو بولو میاں منہ میں زباں ہے کہ نہیں
دل کے ٹکڑوں کو بغل بیچ لئے پھرتا ہوں
کچھ صلاح ان کا بھی اے شیشہ گراں ہے کہ نہیں

سراجؔ سہ
صف عشاق میں کوئی ثانی مجنوں مجھ سا
وحشیِ کوہ و بیاباں نہ ہوا تھا سو ہوا

عزلتؔ سہ
سوجھ بوجھ ان کی نہ ہو کیوں نہ وہی میخواری
چشم ہے جام و دل بادہ کشاں ہے شیشہ
ڈھا کے دیوار تجمل میں اڑا مثل غبار
اب تو گردِ رہ رفتار ہوں لیکن کا ان کا
جو راہ کعبۂ وحدت بگولے کی طرح سوجھے
تبا کثرت کے جادوں کو طواف اپنا کرے کوئی

مظہرؔ سہ
شاخِ گل ملتے نہیں یہ بلبلوں کو باغ میں
ہاتھ اپنے کے اشارت سے بلاتی ہے بہار

محسنؔ سہ
محسن تمام عمر مجھے روتے ہی کٹی
اس غمکدے میں آہ کہیں کبھی سرور ہے

یقینؔ سہ
جفائے بتاں پر صبر کرنا ہی مناسب ہے
یقینؔ دعویٰ وفا کے کر کے اب فریاد کیا کیجے
یقینؔ تقلید سے سرمت ٹک تیشے سے آنکر
یہ ممکن ہے کہو ہر سر چڑا فرہاد کو پہنچے

۱؎ اپنے والد سے مراد۔ ۲؎ مقدمہ تذکرہ ریختہ گویاں ص۳ مولوی عبدالحق، ۳؎ مجموعۂ نغز ص۲ جلد دوم۔ ۴؎ مجموعۂ نغز ص۱۹۲ جلد دوم، ۵؎ مجموعۂ نغز ص۲۶۹ جلد دوم، ۶؎ تذکرہ نشتر عشق قلمی، ۷؎ اودھ کیٹلاگ نشان ۳۴۲ ص۱۷۸ مطبوعہ ۱۸۵۴ء، ۸؎ فہرست ہندوستانی مخطوطات ص۲۸ بلوم ہارٹ، ۹؎ اودھ کیٹلاگ ص۱۷۸ ۱۰؎ فہرست اردو مخطوطات صفحہ ۲۴ کتب خانہ آصفیہ مرتبہ نصیر الدین ہاشمی، ۱۱؎ دستور الفصاحت صفحہ ۴۲ مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی۔ ۱۲؎ خطبات گارساں دتاسی صفحہ ۵۷ مرتبہ ڈاکٹر عبدالحق۔ ۱۳؎ دستور الفصاحت۔ مقدمہ صفحہ ۴۸-۴۹، ۱۴؎ تذکرہ ریختہ گویاں ص۱۶۸

(باقی ص۴۵ پر)

خورشید مجیب
معرفت محی الدین عادل
پرانی بستی روڈ جگ سلائی
جمشید پور۔

عطاء اللہ

اونٹ پہلی نظر میں بے حد بھدا، بست، بیڈول، بدصورت اور گھنونی بدبو والا جانور معلوم ہوتا ہے۔ آواز بھی عجیب بے تکی، جیسے بول نہیں رہا ہو۔ بلکہ بڑبڑا رہا ہو۔ تبھی تو یہ قول مشہور ہے کہ "کیا اونٹ کی طرح بلبلا رہے ہو؟" اونٹ دماغی طور پر بہت تیز ہوتا ہے۔ غصہ ور اس قدر کہ کھلانے والے کا ہاتھ بھی بعض وقت چبا جاتا ہے۔ اس کی سواری بھی کوئی آرام دہ نہیں ہوتی۔ پیپے جیسا پیٹ اور پہاڑ سی کوہان، لمبی ٹانگیں اور لمبی تھوتھن۔

لیکن اگر شکل و صورت اور رنگ پر غور نہ کریں تو اونٹ قدرت کی بیش قیمت دین ہے اور اس میں کئی خوبیاں ہیں۔ انھیں خوبیوں کے باعث عربی بدّو قبیلے کے لوگ اسے عطا اللہ" یعنی خدا کی دین کہا کرتے ہیں۔ ویران ریگستان میں رہنے والوں کے لیے تو یہ ہیرے جواہرات سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔

راجستھان اور دوسرے ریگستانی علاقوں میں جہاں دیکھتے ہی دیکھتے سطح جگہوں پر ریت کے ٹیلے بن جاتے ہیں۔ موٹر گاڑیاں اکثر بالو میں پھنس جاتی ہیں مگر ایسی جگہوں میں بھی اونٹ بغیر کسی پریشانی کے دوڑتا چلا جاتا ہے اسی لیے اونٹ کی فوج کو بھی کافی اہمیت حاصل ہے۔

گزشتہ ہند و پاک جنگ میں اس اونٹ کی فوج نے اچھا کام کیا تھا۔ آج بھی اونٹ سوار سرحد پر ہماری ریگستانی سرحدوں کی محافظ دستہ کی حیثیت سے حفاظت کرتا ہے۔

اونٹ کی اسی اہمیت کے باعث ہندستان نے بھی اپنی فوج میں پندرہ لاکھ سے زیادہ اونٹ رکھے ہیں۔ ہندستان میں ان کی تعداد پاکستان سے ڈیڑھ گنا ہے۔ یعنی پندرہ لاکھ ہے۔ ایتھوپیا میں دس لاکھ اونٹ ہیں۔ جبکہ صومالیا میں تیس لاکھ۔ افریقہ، افغانستان، منگولیا، روس، چین اور دنیا کے مختلف حصوں میں کل ملا کر اونٹوں کی تعداد ڈیڑھ کروڑ سے بھی زیادہ ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اونٹ چوتھی صدی میں دریائے نیل کو عبور کرکے عرب سے آئے تھے۔ پھر افریقہ میں پائے جانے لگے صحارا کے خطرناک ریگستان کو پار کرکے نیز افریقہ اور یورپ کے درمیان تجارت شروع کرنے میں اونٹوں نے کافی مدد پہنچائی تھی۔۔۔ صدیوں تک اونٹوں کے قافلے شمال سے ٹمبکٹو تک روئی لاتے رہے۔ فرانس سے ریشم اور وینس سے شیشے کی چیزیں ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچاتے رہے۔ تلواریں اور بارود بھی وینس سے ڈھوکر لے گئے اور اس کے بدلے افریقہ سے سونا اور غلام لادکر لاتے رہے۔

شروع میں اونٹ صرف بلّی کی طرح ہوتے تھے۔ دس لاکھ سال قبل ان کی اونچائی بڑھنی شروع ہوئی۔ رفتہ رفتہ وہ دنیا کے سبھی حصوں میں پھیلتے گئے۔

اونٹ بھی دو طرح کے ہوتے ہیں۔ بیکٹیریا میں دو کوہانوں والا اونٹ پایا جاتا ہے اس کے بدن پر بال بھی زیادہ ہوتے

ہیں۔ وہ سرد علاقوں کے لیے بھی مناسب ہے۔ سائبیریا کی بیکال جھیل سے لے کر چین کی کالی گھاس کے میدانوں میں اس نسل کے پچاس ہزار اونٹ اب بھی موجود ہیں۔

اونٹ کے جسم کا ہر حصہ گویا اس بات کو دھیان میں رکھ کر بنایا گیا ہے کہ گرم سے گرم تر آب و ہوا میں وہ رہ سکتا ہے۔ خواہ وہ اس کے لیے ناقابل برداشت ہی کیوں نہ ہو۔ اونٹ کی آنکھیں حقیقتاً کافی خوبصورت ہوتی ہیں۔ قدرت نے اسے بھاری کناروں والی دوہری پلکیں دی ہیں۔ اسی کے باعث بالو چھن کر زمین میں گر جاتی ہے۔ مگر وہ آنکھوں میں داخل نہیں ہو پاتی۔ اس طرح دھول بھری آندھیوں میں اس کی آنکھیں بالو سے محفوظ رہتی ہیں۔ اس کے کان اور نتھنے ایسے بنے ہوتے ہیں کہ بالو سے محفوظ رہنے کی خاطر انھیں اچھی طرح بند کیا جا سکتا ہے۔ جسم کے اعتبار سے اونٹ کی ٹانگیں ضرورت سے زیادہ لمبی ہوتی ہیں۔ ان پر پتلی پتلی نسیں بھی جھلکتی ہیں۔ اونٹ کی ٹانگیں ڈھلوان، تلوے گدی دار ہوتے ہیں جو چلتے وقت کچھ پھیل جاتے ہیں۔ اسی لئے وہ ریت میں آسانی سے چل سکتا ہے، ریت میں وہ اتنی تیزی سے چلتا ہے کہ لوگ اسے "ریگستان کا جہاز" کہتے ہیں۔

اونٹ کا ہونٹ ربر کی طرح لچیلا ہوتا ہے۔ ان ہونٹوں سے وہ نوکیلے کانٹوں کو بھی کتر سکتا ہے۔ کھاتے وقت اونٹ کی اپنی زبان باہر نہیں نکلتی۔ کھانے کو تو وہ ایسی چیزیں کھا جاتا ہے جن کی جانب دوسرے جانور دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے ریگستان کی نمکین جھاڑیاں، دھوپ میں سوکھی ببول کی پتیاں اور بالو کے ٹیلوں پر پیدا ہونے والی چیزیں وہ بڑے مزے سے کھاتا ہے۔ زیادہ بھوک لگنے پر تو وہ سامنے کی تمام چیزوں کو کھا سکتا ہے۔ خواہ وہ جھونپڑی کا چھپر ہو، یا پلاسٹک کا خیمہ، تانبے کا تار ہو یا چمڑا ہی کیوں نہ ہو؟

اس کی خوراک پیٹ میں آ کر چار خانوں میں پہنچتی ہے۔ اونٹ کی لید بالکل سوکھی ہوتی ہے۔ خانہ بدوش اسے آسانی سے جلا کر کھانا پکایا کرتے ہیں۔

پانی جمع کرنے کی اونٹ میں بڑی خاصیت ہوتی ہے۔ حالانکہ سانڈنیوں کے بارے میں مشہور ہے کہ انھیں گرمی میں "تیسرے چوتھے دن ہی پانی پلانے کی ضرورت ہوتی ہے اور لمبے سفر کے بعد انھیں غسل کرانا ضروری ہو جاتا ہے۔ لیکن اونٹ بغیر پانی کے اس سے بھی زیادہ دنوں تک رہ سکتا ہے اور اسے غسل کرانے کی ضرورت بھی نہیں پڑتی۔

یہ صلاحیت اونٹ میں کیوں ہے اس کا پتہ لگانے کے لئے ماہر علم حیات نٹ اسمتھ نلسن صحارا گئے۔ وہ امریکہ کی "ڈرہم" کے "ڈیوک یونیورسٹی" میں پروفیسر ہیں انھوں نے دیکھا کہ اونٹ کے جسم کی بناوٹ ایسی ہوتی ہے کہ جس سے وہ پانی کا زیادہ سے زیادہ استعمال کم پیمانے پر کرتا ہے اونٹ پیشاب بہت کم کرتا ہے۔ دوسرے جانور اگر کافی مقدار میں یوریا خارج نہ کریں تو ان کے جسم میں زہر پھیل جاتا ہے لیکن اونٹ کے ساتھ ایسی کوئی بات نہیں ہوتی۔

اونٹ کے کوہان میں اس کے جسم کی چربی کا پانچواں حصہ جمع رہتا ہے اور جب اسے کچھ کھانے کو نہیں ملتا تو کوہان میں جمع شدہ چربی اس کی غذا بنتی ہے اور جسم کی گرمی پسینے کی شکل میں برابر باہر نکلتی رہتی ہے۔ اونٹ کے جسم کا روئیں دار موٹا چمڑا بیرونی گرمی کو جسم میں سرایت کرنے سے روکتا ہے۔

اگر اونٹ کو ہرا چارہ چرنے کے لئے مل جاتا ہے تو وہ اپنے چارہ سے ہی ضرورت کے مطابق نمی کھینچ لیتا ہے۔ اسی لئے اسے پانی کی ضرورت نہیں پڑتی۔ چارے سے نمی کھینچ کر بغیر پانی پیئے وہ دس ہفتے تک رہ سکتا ہے۔ ضرورت پڑنے پر اپنے جسم سے ضرورت کے مطابق پانی کھینچ لیتا ہے۔ اس دوران اگر اسے اپنے جسم سے اتنا پانی کھینچنا پڑے کہ اس کے وزن کا چوتھائی حصہ کم ہو جائے تب بھی اسے زیادہ کمزوری محسوس نہیں ہوتی۔

دور کی دوڑ میں اونٹ گھوڑے کو بھی پیچھے چھوڑ سکتا ہے۔ وہ اس سے زیادہ دور تک جا سکتا ہے۔ اونٹ اتنا بوجھ لادتا ہے جسے ڈھونے میں ایک بیل کی موت ہو سکتی ہے۔ دو سو پچیس کیلوگرام وزن لے کر اونٹ تقریباً تین دن تک چالیس کیلومیٹر فی گھنٹے کی رفتار سے دوڑ سکتا ہے۔ جبکہ گھوڑوں میں اتنے وزن کو اٹھا کر مسلسل دوڑنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ آسٹریلیا میں ایک اونٹ ایک گھوڑے کو ۷۷ کیلومیٹر کی دوری تک دوڑا تا چلا گیا۔ اونٹ سے صرف چار سنٹی میٹر آگے ہو کر گھوڑے نے اس ریس کو جیت لیا۔ مگر اس کے فوراً بعد ہی گر کر مر گیا۔ اونٹ نے رات بھر آرام کیا پھر اتنے ہی وقت میں دوسرے دن اتنی ہی دوری طے کر کے واپس آگیا۔

جب یہ چلنا شروع کرتا ہے تو چلنے میں اس کے دائیں جانب کے دونوں پیر بڑھتے ہیں۔ پھر بائیں جانب کے۔ یہ چلتے وقت تو خاموشی سے اس کام کو انجام دیتا ہے لیکن جب آرام کرتا ہے تو اس کے نزدیک سونا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ خوب بلبلاتا ہے۔ گرجتا، ممیاتا اور چیختا ہے۔ جب اونٹنی حاملہ ہو جاتی ہے۔ اور بچہ دینے کو دو چار دن باقی رہتے ہیں تو وہ خاموشی سے ایک جگہ بیٹھ جاتی ہے اور اونٹ اس کی حفاظت کرتا ہے۔ اس کے بچہ دینے کے بعد بھی اونٹ تین چار مہینوں تک اس کی حفاظت کرتا رہتا ہے اس درمیان وہ لوگوں کو اکثر غصے میں کاٹ لیتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض وقت لوگوں کو جان سے بھی مار ڈالتا ہے۔

پہلے سال تک اونٹ اپنی ماں کے پاس رہتا ہے چار پانچ سال کا ہو جانے پر ہی اسے کام میں لایا جا سکتا ہے۔ کام سکھانے سے پہلے اونٹ کی ناک میں نکیل ڈالی جاتی ہے اگر نکیل کمزور ہو تو اس کا اثر اس پر کچھ بھی نہیں ہوگا۔ اگر زیادہ سخت ہوئی تو اس کے نازک نتھنے پھٹ جاتے ہیں۔ اونٹ کو اگر باندھ کر رکھا نہ جائے تو وہ دشمن کو تلاش کر کے مار ڈالتا ہے۔ اکثر وہ اپنے بھاری بھرکم جسم سے ہی دشمن کو کچل کر ختم کر دیتا ہے۔

اس کی عمر عام طور سے چالیس سال تک ہوتی ہے اس سے بہت سے کام لیے جاتے ہیں۔ وہ کھیت جوتتا ہے، زیادہ گہرائی والے کنوؤں سے پانی کھینچتا ہے۔ بھاری سامان ڈھو کر بازار لے جاتا ہے۔ اس کے علاوہ زمانۂ قدیم میں گاڑی میں بھی استعمال ہوتا رہا ہے۔ کچھ سال قبل عرب ممالک میں اونٹ ہی آمد و رفت کا ذریعہ تھا۔

اونٹنی ایک دن میں چار لیٹر تک دودھ دیتی ہے اس کا گاڑھا دودھ گائے کے دودھ سے کہیں زیادہ طاقتور ہوتا ہے کئی قبیلے تو صرف اونٹنی کے دودھ پر ہی زندگی بسر کرتے ہیں اس کا دودھ اتنا میٹھا ہوتا ہے کہ اس میں کیڑے بہت جلد پڑ جاتے ہیں۔ اونٹنی کی یہ بھی ایک بڑی خاصیت ہے کہ مسلسل تین چار سال تک جب تک کہ اس کا دوسرا بچہ پیدا نہیں ہو جاتا دودھ دیتی رہتی ہے۔

اونٹ کے بال ہر سال کاٹے جاتے ہیں ان سے برش رسی، کمبل اور دوسرے کپڑے تیار کیے جاتے ہیں۔ مردہ اونٹ کا گوشت بھی بعض قبیلے کے لوگ کھا جاتے ہیں۔ ریگستان میں خوراک نہ ملنے پر کئی مرتبہ لوگوں نے اونٹ کو ذبح کر کے پیٹ بھرا ہے اور اس کے پیٹ سے پانی کی تھیلی نکال کر پیاس بجھائی ہے۔ اونٹ کے چمڑے سے خیمہ وغیرہ بنتا ہے۔ یہ خیمہ اتنا بڑا ہوتا ہے کہ اس میں ایک پورا خاندان آسانی سے رہ سکتا ہے۔

بگڑے ہوئے ہاتھی کو بھی اونٹ ٹھیک کر سکتا ہے۔ اپنے نتھنے سے وہ ہاتھی کے کان کھینچ کر اس کے ہوش ٹھکانے لگا دیتا ہے۔

★

(افسانہ)

عشرت امید
کمپاؤنڈ شادی لال
جی۔ٹی روڈ ایٹہ (یوپی)

ٹوٹے خوابوں کا درد

بہت دن ہوگئے! ـــــ شاہینہ سے باتیں کیے۔ میں جانتا ہوں کہ ایک چنگاری دھیرے دھیرے سلگ رہی ہے ـــــ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ یہ چنگاری کسی بھی وقت شعلوں میں بدل سکتی ہے اور ... یہ آگ ہمارے سماجی اور ازدواجی رشتہ کو جلا کر راکھ کردے گی۔ کبھی بھی، کوئی بھی یہ نہیں جان پائے گا کہ رشتہ کا ایسا بندھن میرے اور اس کے درمیان رہا تھا۔

جو جانتے ہیں ـــــ وہ مذاق اڑائیں گے اور کہیں گے، "... دیکھا ہم نے کہا تھا نہ عرفان اور شاہینہ کے درمیان ایک دراڑ ہے ... جو کبھی بھر نہ سکے گی ... ایک دن تو یہ ہونا ہی تھا۔ سو ہوگیا"

زندگی میں پانچ سال کا وقفہ کچھ کم نہیں ہوتا۔ پانچ سال کی ازدواجی زندگی کچھ کم نہیں ہوتی۔ لیکن جہاں خیالات میں ہم آہنگی نہ ہو ... وہاں اس کا ٹوٹ جانا ہی بہتر ہے۔ ـــــ زندگی کے بارے میں شروع سے ہی میرا اپنا ایک نظریہ تھا۔ اور شاید شاہینہ کا بھی زندگی کے بارے میں اپنا ایک مخصوص نظریہ تھا۔ اور ہم دونوں کے درمیان دراڑ کا پیدا ہونا انھیں نظریات کے اختلاف کا نتیجہ تھا ـــــ دنیاوی ٹھاٹ باٹ، شان و شوکت، ... دکھاوا، ... احساس برتری ... یہ تھا شاہینہ کا نظریہ زندگی کے بارے میں۔

جب کہ میں ان چیزوں کے خلاف تھا۔ میں نے شروع سے ہی دکھاوے اور بناوٹی پن سے اپنے آپ کو دور رکھا ہے۔ شاہینہ ـــــ چاہتی تھی کہ میں ہر ماہ اس کے لیے قیمتی ساریاں زیورات اور تحفے لاؤں ـــــ میرے پاس کار نہ سہی تو کم سے کم اسکوٹر تو ضرور ہونا چاہیے ـــــ سینما کلب، شاپنگ اور تفریحات کی دلدادہ شاہینہ ـــــ اب بھی وہ اسی طرح آزاد پنچھی کی طرح رہنا چاہتی تھی جس طرح شادی سے پہلے اکثر دولت مند گھرانوں کی لڑکیاں رہتی ہیں۔

ڈھائی سو روپیہ کا دو کمروں کا فلیٹ اسے مرغی کا ڈربہ لگتا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ میرے پاس خوب وسیع بنگلہ ہو، جہاں بہت سے کمرے ہوں، لان ہو، لیکن یہ سب میں اپنی محدود آمدنی میں مہیا نہیں کر سکتا تھا۔ قرض لے کر زندگی میں ٹھاٹ باٹ سے رہنا میرے اصول کے خلاف تھا۔ بس یہی فرق تھا میرے اور شاہینہ کے خیالات و نظریات میں۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ دفتر میں دل نہیں لگا، چھٹی لے کر چلا آیا۔ بند دروازہ کھلوانے کے لیے جیسے ہی ہاتھ اٹھایا، اندر سے آنے والی آوازوں نے مجھے پتھر بنا دیا

"عرفان سے میں الگ ہونا چاہتی ہوں، میں بہت جلد اس سے بات کرنے والی ہوں، کچھ دن اور انتظار کرو، جلد ہی میں اس بندھن سے آزاد ہو جاؤں گی ... اور پھر تمہارے ساتھ ہی رہوں گی"

"تم یہ فیصلہ جلد ہی کرلو، اب میں زیادہ دن صبر نہیں کر سکتا"

"پلیز کچھ دن صبر کرو، میں جلد ہی عرفان کو اپنا فیصلہ سنا دوں گی ..."

مجھے لگا جیسے آسمان پھٹ پڑا ہے اور میں چکرا کر گرنے

والا ہوں" میں خاموشی سے پلٹ آیا اور سڑک پر آگیا ـــــ اُف
شاہینہ تم اس حد تک گر چکی ہو! یہ تو آج ہی پتہ چلا، کاش پہلے
پتہ لگ گیا ہوتا تو اتنے دن تم نے اور میں نے جو ذہنی اذیتیں برداشت
کی ہیں، ان کو سہنا نہ پڑتا۔

عجیب سے ہلکے پن کا احساس ہو رہا تھا مجھے، ہم دونوں کو
الگ ہو جانا چاہیے۔ اب ہم دونوں کا ساتھ رہنا ناممکن تھا۔

بہتر ہے کہ ہم دونوں اس مصنوعی اور بناوٹی زندگی کے دائرے
سے باہر نکل آئیں گھٹ گھٹ کر جینے سے زندگی کو نئے سرے سے
شروع کرنا میری نظر میں جرم نہیں۔ میں دوبارہ دفتر چلا گیا۔
مستقبل کے بارے میں ایک فیصلہ کرنے سے میں کچھ مطمئن ہو گیا
تھا۔ لیکن ... ایک پھانس سی تھی جو بار بار دل میں چبھ جاتی تھی۔

مقررہ وقت پر جب میں گھر آیا تو شاہینہ کچن میں تھی، اسے
معلوم ہے کہ دفتر سے واپس آتے ہی مجھے چائے چاہیے، تعلقات
کی اس تلخی میں بھی وہ دفتر سے آنے پر مجھے چائے بنا کر دے دیتی
تھی، سب کچھ ویسا ہی ہے، بس ہم دونوں کے درمیان بول چال بند
ہے ـــــ

ایزی چیئر پر بیٹھا میں اخبار دیکھ رہا تھا۔ چائے لے کر شاہینہ
اندر آئی، گول میز پر چائے رکھ کر وہ واپس لوٹنے لگی۔

"شاہینہ" ـــــ میں نے آواز دی ـــــ وہ ٹھٹک گئی ...

"یہاں آؤ شاہینہ" ـــــ میرے پاس بیٹھو" ...

وہ بیٹھ گئی!

"شاہینہ" ـــــ

"جی"!

"ایک بات کہنا چاہتا ہوں" ... برا تو نہیں مانو گی؟

حیرت زدہ نظروں سے وہ میری طرف دیکھنے لگی!

"دیکھو شاہینہ، انسان خواہ وہ عورت ہو یا مرد ایک مقررہ
وقت کے لیے اس دنیا میں آتا ہے، اور وقت پورا ہو جانے پر
وہ دوسری دنیا میں چلا جاتا ہے لیکن زندگی کے اس سفر کو
تنہا نہیں طے کیا جا سکتا اس لیے ہم سفر تلاش کیا جاتا ہے تم سمجھ
رہی ہو نہ میری بات؟"

"جی ہاں!" ـــــ

"پانچ برس تک ہم دونوں نے یہ سفر ساتھ ساتھ طے کیا۔
شاہینہ میں نے ہمیشہ اپنی بساط بھر کوشش کی کہ تمھیں خوش
رکھوں، تمھاری ہر خوشی کا خیال رکھوں، لیکن مجھے دکھ ہے کہ
تمھیں خوش نہیں رکھ سکا میں تمھیں یہ نہیں سمجھا سکا کہ زندگی کا
دل کے سکون اور اطمینان میں ہے، حرص و ہوس اور دنیاوی
شان و شوکت زندگی کو پریشانیوں اور الجھنوں کے سوا کچھ نہیں دے

"آخر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟" ـــــ کھڑے ہوتے ہوئے شاہینہ
بولی۔

"ناراض نہ ہو ـــــ شاہینہ ـــــ جذباتی مت بنو۔
اطمینان رکھو، آج کے بعد کبھی تمھارا وقت برباد نہیں کروں گا
مجھے صرف دس منٹ اور دے دو ..."

شاہینہ دوبارہ بیٹھ گئی۔

"آج ـــــ دفتر سے اچانک دوپہر کو گھر آگیا تھا۔"

"عرفان" ـــــ اچانک شاہینہ چیخ کر کھڑی ہو گئی!

"چلاؤ مت ـــــ میں تمھیں کچھ نہیں کہہ رہا ہوں، میں
اپنی بات کر رہا ہوں!"

"لیکن ... عرفان ... لیکن ...

"گھبراؤ مت شاہینہ۔ میرا یقین کرو۔ میں تمھیں کچھ بھی نہیں
کہوں گا۔ ہاں کچھ لمحوں کے لیے ضرور بے قابو ہو گیا تھا۔ لیکن جلد ہی
میں نے اپنے آپ پر قابو پا لیا تھا۔ میں نے سوچا ـــــ کیا ایک
مرد ہونے کے ناطے مجھے اپنے خیالات و نظریات تم پر مسلط
کر دینا چاہئیں اور اپنی مرضی کے مطابق تمھیں چلنے کے لیے مجبور
کر دینا چاہیے؟ ـــــ کیا تمھارا اپنا کوئی احساس نہیں ہے، ...
جذبات نہیں ہیں ... خواہشات نہیں ہیں؟ میں پھر دفتر واپس
چلا گیا تھا۔ وہاں میں نے سنجیدگی سے تجزیہ کیا۔ اور کافی سوچ
سمجھ کر میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ اس طرح گھٹ گھٹ کر جینے سے
بہتر ہے کہ ہم دونوں خوشی سے یہ مصنوعی رشتہ توڑ دیں اور نئے

سرے سے زندگی کی شروعات کریں"۔
"میری طرف سے آج کے بعد تم پوری طرح آزاد ہو"
"عرفان" — شاہینہ پھر اٹھ کھڑی ہوئی"
"ہاں — شاہینہ — اب تمہارے اور میرے حق میں یہی بہتر ہے کہ ہم حقیقت کو سمجھیں اور — اور — اپنے اپنے نئے رستوں کا تعین کر لیں'..."

کہتے کہتے میں اٹھ کھڑا ہوا — اور شاہینہ کے پاس پہنچ کر دھیرے سے اس کا چہرہ اوپر اٹھاتا ہوا بولا — "میں نے تمہیں کوئی خوشی نہیں دی... دکھ ہی دیے ہیں — میں بہت بدنصیب ہوں کہ تمہیں خوش نہ رکھ سکا... لیکن شاہینہ — اب تو تمہیں... خوشی کی راہ مل گئی ہے' امید ہے کہ تم اب کافی خوش اور سکھی رہو گی"

ایک لمحہ کے لیے شاہینہ کی پلکیں اوپر اٹھیں اس کی آنکھوں میں آنسو تھے... وہ زور سے عرفان کہہ کر مجھ سے لپٹ گئی... "عرفان... تم کتنے بلند ہو... میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم... اتنے بلند ہوگے میں نہیں جانتی تھی... مجھے معاف کر دو... میں غلطی پر تھی' بھٹک گئی تھی' مجھے معاف کر دو... عرفان" اس نے میرے قدموں پر اپنا سر رکھ دیا۔

میں نے فوراً اسے اٹھا کر اپنی باہوں میں سمیٹ لیا۔
"نہیں — شاہینہ — ایسا مت کہو... — تم نے کوئی غلطی نہیں کی... کون ہے جو دنیاوی عیش و آرام اور دکھاوے کے لیے نہیں بھٹکتا — شاہینہ ہم انسان ہیں اور — غلطیاں انسان سے ہی ہوتی ہیں' — بھلائی اسی میں ہے کہ ہم غلطیوں سے سبق حاصل کریں — مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے..." اور اس دن سے ہم دونوں نے نئی زندگی شروع کی — جس میں دکھاوے اور بناوٹ کا کوئی دخل نہیں تھا۔

★

تذکرۂ ریختہ گویاں: صفحہ ۳۹ کا بقیہ

صفحہ ۳۹ کا بقیہ

قزلباش خاں نام امید تخلص۔ فارسی کے زبردست شاعر تھے۔ ایران کے مداحوں میں تھے۔ فارسی میں صاحب دیوان تھے اور دیوان میں اشعار کی تعداد سات ہزار سے زیادہ تھی۔ میر شمس الدین فقیر ان کے دوستوں میں تھے اور انھوں نے ہی ان کے دیوان کا انتخاب کیا تھا۔ تفنن طبع کے لئے اردو میں بھی شعر کہتے تھے۔ ان کا انتقال ۱۱۵۹ھ ہجری میں ہوا۔ فقیر نے تاریخ کہی۔

گفتہ کر گشت بے آب — باغ جناں امید
۳ — ۱۱۶۲
۱۱۵۹ھ ہجری (نشتر عشق قلمی)

عزلت۔ سید عبدالولی نام عزلت تخلص، ان کے حالات قدیم تذکروں میں تفصیل سے ملتے ہیں۔ ۱۱۸۹ھ ہجری میں حیدرآباد میں انتقال کیا۔
(گل عجائب صفحہ ۹۹ اسد علی خاں تمنا مرتبہ مولوی عبدالحق)

تمنا۔ نام اسد علی خاں تخلص تمنا۔ عمدۂ منتخبہ، مجموعہ نغز اور گل عجائب میں ان کا ذکر درج ہے۔ تمنا کا انتقال ۱۲۰۴ھ ہجری ہوا۔ محمد علی خاں شوق اورنگ آبادی نے تاریخ کہی

لیا جب تمنا نے راہ قدم — ہوا موج زن بحر اندوہ و غم
کہا شوق نے سال تاریخ یہ — وفات بہشتی کرا اے دل رقم
۱۲۰۴ھ

تمنا شاعری میں آزاد بلگرامی کے شاگرد تھے۔ تذکرۂ گل عجائب انہی کی یادگار ہے۔

ڈاکٹر ولی الحق انصاری، صدر شعبۂ فارسی لکھنؤ یونیورسٹی

بچوں کے سال کے اختتام پر اس شمارہ کی ترتیب پر آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اس میں شائع ہونے والے تقریباً سبھی مضامین و منظومات معیاری اور مناسب ہیں۔ مرزا جعفر حسین صاحب کا مضمون لکھنوی تہذیب کے ایک خاص رخ کی عکاسی کرتا ہے جس پر روشنی ڈالنے والے اب کم ہی رہ گئے ہیں۔ نیز مسعود صاحب کا ڈرامہ بھی حسن و شگفتگی میں ایک امتیازی شان رکھتا ہے۔

ڈاکٹر اکبر حیدری۔ سری نگر کشمیر

بچوں کے بین الاقوامی سال کے موقع پر نیا دور لکھنؤ کے ادارے نے جو ضخیم شمارہ "اطفال نمبر" کے نام سے شائع کیا اس کے لیے وہ مبارکباد کا مستحق ہے۔ ادارے کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ جہاں وہ بڑی بڑی شخصیتوں کے اسپیشل نمبر شائع کرتا رہا ہے وہاں اس نے نونہال بچوں کا خصوصی شمارہ پیش کر کے اس بات کا ثبوت دیا کہ اس کی نظر میں بچہ اور بوڑھا (عالم و فاضل) انسان کی حیثیت سے مساوی درجہ رکھتا ہے۔

کوثر چاند پوری (دہلی)

اطفال نمبر بہت شاندار اور معیاری ہے۔ اس کی اشاعت پر مبارکباد قبول فرمائیں۔

عظیم امروہوی (امروہہ)

اطفال نمبر بہت خوب ہے۔ ابھی تک اردو میں اس موضوع پر اتنا عمدہ نمبر نہیں نکلا۔ آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ قبول فرمائیے۔

ایس۔ ایم عباس (جونپور)

بچوں کی سی حسین معصوم اور پاکیزہ مسکراہٹ لیے ہوئے "اطفال نمبر" نظر نواز ہوا۔ بچے ملک و قوم کی مقدس امانت ہیں۔ بین اقوامی "سال اطفال" پر نونہالان قوم کی خدمت میں نیا دور کی عظیم پیش کش نہ صرف بچوں کے لیے ایک یادگار تحفہ ہے۔ بلکہ بڑوں کے لیے بھی یقیناً قابل قدر ہے۔ اس کاوش کے لیے آپ لائق مبارکباد ہیں۔

امین الماس (مدراس)

آپ کے موقر ماہنامہ نیا دور کا "اطفال نمبر" نظر نواز ہوا۔ اس قدر جامع، دلکش اور خوبصورت نمبر نکالنے پر میری جانب سے دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔

پندرہ روزہ خیر و خبر، علی گڑھ (۱۶-۲۹ فروری ۸۰ء)

یہ بات مبالغہ نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ ہندستان میں بین الاقوامی اطفال سال کے موقع پر رسائل و جرائد کے جو خصوصی نمبر نکلے ہیں نیا دور کا "اطفال نمبر" ہر لحاظ سے بہترین ہے اور یہ اردو کے ادب اطفال میں ایک اضافہ ہے . . . نیا دور اردو کے چند ممتاز ادبی رسائل میں ایک ہے جس کے خاص شمارے اپنی انفرادیت برقرار رکھنے میں پوری طرح کامیاب ہوتے ہیں۔

خبرنامہ اتر پردیش اردو اکاڈمی (جنوری ۱۹۸۰ء)

ماہنامہ نیا دور لکھنؤ حکومت یو پی کا موقر علمی و ادبی جریدہ ہے جس کے عام شمارے بھی علمی و ادبی حلقوں میں اہمیت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ گاہے بگاہے اس رسالے کے خصوصی نمبروں نے علمی، ادبی اور تحقیقی حلقوں سے خراج تحسین وصول کیا ہے۔ نومبر دسمبر کا مشترکہ شمارہ "اطفال نمبر" کو منظر عام پر لا کر اس کے مدیران نے اپنی اعلا صلاحیتوں کا مکمل اظہار کیا ہے۔ رنگا رنگ مضامین، نظمیں، کہانیاں، ڈرامے اور بچوں سے متعلق دیگر پہلوؤں پر بھی مضامین کو سلیقہ اور حسن و خوبی کے ساتھ مختلف عنوانات کے تحت درجہ بندی کر کے اس طرح شائع کیا گیا ہے کہ یہ نمبر نیا دور کے پچھلے نمبروں کی بہ نسبت کچھ ممتاز اور منفرد حیثیتوں کا مالک ہے

نقد و تبصرہ

تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب: **ملک الشعرا۔ طالب آملی۔ فکر و فن**
مصنفہ: ڈاکٹر آصف زمانی ۱۱۰، نفیس منزل پیر جلیل گولہ گنج لکھنؤ
صفحات: ۱۷۶۔ قیمت: ۱۵ روپے

ڈاکٹر آصف زمانی نے ملک الشعراء طالب آملی کے دیوان غزلیات پر مختلف خطی نسخوں سے تقابل کر کے صحت و حواشی کے ساتھ ترتیب جدید کا کام کیا جس پر انھیں لکھنؤ یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری حاصل ہوئی اس کی ابتدا میں انھوں نے طالب آملی سے متعلق ایک مبسوط مقالہ بھی لکھا جو بعد کو کتابی صورت میں اردو اکیڈمی کی طرف سے شائع ہوا اور جس پر انھیں اردو اکیڈمی اتر پردیش کی طرف سے ایک ہزار روپیہ کا انعام بھی ملا یہ مقالہ طالب آملی کے حالات زندگی، خصوصیات کلام، اور دوسرے شعرا کے کلام سے تقابلی مطالعہ پر مشتمل ہے۔ اپنے موضوع کے اعتبار سے مقالہ نگار نے اس کو حسب ذیل پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے:-

۱۔ حالات زندگی (۲) ادبی پس منظر (۳) الف: عشقیہ شاعری (ب) اخلاق تصوف اور فلسفہ (ج) خالص شاعری (د) داخلی شاعری۔

(۴) طرز ادا (۵) طالب اور دوسرے شعرا کا تقابلی مطالعہ

ہر باب، انتہائی محنت و کاوش اور تلاش و تحقیق سے لکھا گیا ہے۔ جس سے طالب آملی کی حیات اور شاعری کا کوئی گوشہ تشنہ نہیں رہا!

طالب آملی کا شمار، فارسی کے صف اول کے شعرا میں کیا جاتا ہے شعر و شاعری کا ملکہ خداداد تھا، شباب کی منزل میں قدم رکھتے ہی اس کو وہ شہرت، مقبولیت اور عزت و عظمت نصیب ہوئی، جو بہت کم شاعروں کو ہوتی ہے، جہانگیر جیسے سخن فہم و نکتہ شناس شہنشاہ نے ۲۳ سال کی عمر میں اس کو ملک الشعراء کا خطاب عطا کیا، حالی نے جن دو ایرانی شاعروں کا غالب کے مرثیہ میں ذکر کیا ہے، ان میں طالب آملی بھی ہے۔

رشک عرفی و فخر طالب مرد۔ اسد اللہ خاں غالب مرد

سبک ہندی کا یہ نمائندہ اور عظیم شاعر ادبی دنیا کی عدم توجہی کا شکار رہا، چار سو برس سے زیادہ عرصہ گزر گیا اور اس کے کلام کی اشاعت صحیح متن کے ساتھ نہ ہو سکی۔ ڈاکٹر آصف زمانی، قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اس اہم کام کا بیڑا اٹھایا اور مختلف خطی نسخوں کا تقابل کر کے صحت و حواشی کے ساتھ اس کے دیوان غزلیات کی ترتیب جدید کی۔ آصف زمانی کے ذوق ادب و شعور اور جذبۂ تجسس و تلاش کو تحقیق کی پُر خار وادی سے خاص لگاؤ ہے انھوں نے یہ قول سچا ثابت کر دیا کہ مردوں کے مقابلے عورتوں میں نہ صرف ٹوہ لگانے کا مادہ زیادہ ہوتا ہے بلکہ بال کی کھال نکالنے میں بھی انھیں ید طولیٰ حاصل ہوتا ہے۔ وہ حسن و خوش اسلوبی اور صبر و تحمل کے ساتھ 'راز دروں پردہ' کا پتہ لگا لیتی ہیں اور اس سے کام کی بات معلوم کر لیتی ہیں۔ یہ مردوں کے بس کا نہیں! طالب آملی کے مطالعہ کے بعد یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ آصف زمانی صاحبہ نے اپنی ان صلاحیتوں سے بدرجہ اتم کام لیا ہے۔ طالب کی شاعری کا تجزیہ بھی انھوں نے نئے انداز سے کیا ہے، طالب اور دوسرے شعرا کے تقابلی مطالعے میں، انھوں نے تنقیدی اصول اور توازن کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ یہ مقالہ زبان و بیان، ترتیب، توضیح، تحقیق و تنقید کا دلکش و دلآویز مرقع ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ادبی دنیا، اس کی قدر و منزلت کرے گی۔ اور اسے تحقیقی سرمایہ میں اہم اور مفید اضافہ تسلیم کرے گی۔ اگر صحت متن و حواشی اور ترتیب جدید والا دیوان غزلیات طالب بھی اس مقالے میں شامل ہو جاتا تو کتاب کی اہمیت اور افادیت میں کہیں زیادہ اضافہ ہو جاتا۔

— ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی

نام کتاب: **بندوق**۔ نام مصنف: اشتیاق علی علوی کاکوری کوٹھی خیالی گنج لکھنؤ۔ صفحات: ۲۵۰۔ قیمت: بارہ روپے۔ ناشر: توحید پبلشرز، نظیر آباد لکھنؤ۔ ۲۲۶۰۰۱

اشتیاق علی علوی صاحب ایک مشہور ماہر شکاریات ہیں اور ایک عرصہ کافی عرصے سے شکاریات پر ان کے مضامین ملک کے مقتدر رسائل اور اخبارات میں برابر شائع ہو رہے ہیں۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ ان کی یہ تصنیف "بندوق" اردو زبان میں اپنے موضوع پر پہلی جامع کتاب ہے۔ آتشیں اسلحہ جات مثلاً بندوق، رائفل اور پستول کا استعمال

ہماری فوج، پولیس اور تعلیمی اداروں کی نیم فوجی تنظیموں کے ساتھ ساتھ ہمارے سماج میں بھی عام ہوتا جا رہا ہے اور وقت کا یہ ایک اہم تقاضا تھا کہ ان سے متعلق تعلیم و تربیت کی کوئی کتاب اردو زبان میں بھی اسی موضوع پہ ہوتی۔ مصنف نے یہ کتاب عام فہم زبان میں لکھ کر وقت کی اس اہم ضرورت کو پورا کر دیا اور اردو زبان کے خزانے میں ایک جواہر پارے کا اضافہ کر دیا جس کے لیے وہ داد و تحسین کے مستحق ہیں۔ جدید تکنیک کے بموجب اسلحہ کی پرکھ، ان کی پہچان اور استعمال کے آزمودہ طریقوں کے علاوہ بندوق و رائفل کی گولیوں اور چھروں کی رفتار اور طاقت کے معیاری حساب کے نقشے اور بیلسٹک تھیوری سے اردو داں طبقہ کو روشناس کرایا گیا ہے۔ جنگلی جانوروں کی بابت جو معلومات فراہم کر کے نیز ان کے شکار کے طریقوں کو بیان کر کے مصنف نے ہماری دلچسپی اور واقفیت میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ علاوہ ازیں مشہور اور تجربہ کار شکاریوں کے شکار کے سچے اور لرزہ خیز واقعات نے اس کتاب کو مزید دلچسپ بنا دیا ہے خطرناک درندوں کے بعض واقعات تو مصنف نے اتنے دلچسپ انداز میں بیان کیے ہیں کہ ایک عام قاری کا بھی یہی جی چاہے گا کہ ان کو پورا پڑھے بغیر ادھورا نہ چھوڑا جائے۔ زیرِ نظر کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف صرف "ماہرِ بندوق" ہی نہیں صاحبِ قلم بھی ہیں جن کو اپنے فن کے ساتھ موضوع پر بھی عبور حاصل ہے۔

توقع ہے کہ ان کی یہ کتاب فوج، پولیس اور تعلیمی اداروں میں ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی اور عوام بھی اس سے پوری طرح مستفید ہوں گے کتاب کا گیٹ اپ اور کتابت بھی معیاری ہے اور قیمت بھی زیادہ نہیں ہے۔

——— امیر احمد صدیقی

نام کتاب: **ساگر اور لہریں** (ڈرامہ) مصنف: سید ظہیر احسن صفحات: ۸۰
قیمت: ۹ روپے پچاس پیسے۔ ملنے کے پتے: اہل ظفر۔ لودی کٹرہ۔ پٹنہ - ۸
• ایوانِ اردو۔ بیت الوارث نیا ٹولہ۔ پٹنہ۔ ۴ • کتاب منزل۔ سبزی باغ پٹنہ ۴
• اب امپوریم۔ سبزی باغ پٹنہ ۴ • اقبال بک ڈپو۔ چوہٹہ۔ پٹنہ - ۴)

زیرِ تبصرہ کتاب سید ظہیر احسن صاحب کا تحریر کردہ ایک ڈرامہ ہے جس کی ابتدا میں "اظہارِ نظر" کے طور پر اردو کے ممتاز محقق ادیب اور فارسی کے فاضل دانشور پروفیسر سید حسن صاحب نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اردو ڈرامہ اور تراجم کی روایت اور تاریخ پر بھی خاصی گفتگو کی ہے۔

زیرِ نظر کتاب (THOMAS HARDY) کے ناول (MAYOR OF CASTER BRIDGE) "میئر آف کیسٹر برج" کا مختصر ترجمہ ہے جسے سید ظہیر احسن صاحب نے ڈرامہ بنا کر اردو حلقوں سے روشناس کرانے کا بہت ہی مفید اور نازک کام انجام دیا ہے۔

ٹامس ہارڈی (THOMAS HARDY) وکٹورین دور کا ایک مفکر، شاعر اور ناول نویس ہے جس نے میئر آف کیسٹر برج ناول میں انگلستان کے ایک خاص علاقے کے ایک قصبے کیسٹر برج کی معاشرتی، تہذیبی جغرافیائی، تمدنی، ثقافتی، کاروباری اور صنعتی زندگی کے پس منظر میں ایک عام انسان کی زندگی کے نشیب و فراز، دردو داغ، عروج و زوال رنج و راحت، ذہنی کشمکش، احساسات اور جذبات کو مختلف کرداروں کے روپ میں پیش کیا ہے۔

چونکہ اس ناول میں شروع سے آخر تک ایک کشمکش، تصادم اور ٹکراؤ کی فضا برقرار رہتی ہے۔ اسی فضا نے سید ظہیر احسن صاحب کو اسے ڈرامہ کی صورت میں منتقل کرنے کی تحریک دی ہے اور ایک دشوار اور صبر آزما مرحلے میں ڈال دیا ہے۔ پھر بھی وہ اس پل صراط سے لڑکھڑا کر گرے نہیں اور کسی حد تک افتاں و خیزاں گزر گئے۔ ان کے مطابق یہ انکی پہلی کوشش ہے اور واقعی لائقِ ستائش ہے۔ اکثر زبان میں بیان کا جھول گراں گزرتا ہے مثلاً پہلے ایکٹ کا پہلا سین۔ چوتھی لائن میں "گیسوئے شب کھلتی چلی جارہی ہے" وغیرہ وغیرہ۔

کاغذ، کتابت اور طباعت غنیمت ہے سرورق نہایت سادہ مگر قیمت زیادہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ سید ظہیر احسن صاحب کی یہ کاوش جو "ساگر اور لہریں" کے روپ میں منظرِ عام پر آئی ہے۔ پڑھے لکھے حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی اور سنجیدہ کتب خانوں کی رونق بڑھائے گی۔

——— ساغر مہدی

★

شام ہوتے ہی چراغوں کو بجھا دیتا ہوں
دل ہی کافی ہے تری یاد میں جلنے کے لیے

شام ہوتے ہی چراغوں کو بجھا دیتا ہوں
دل ہی کافی ہے تری یاد میں جلنے کے لیے

[illegible]

جلد ۳۴ نمبر ۱۲

مارچ سنہ ۱۹۸۰ء

ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

جوائنٹ ایڈیٹر: شاہنواز قریشی

★

پبلشر: ہمیندر کمار

ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اتر پردیش

پرنٹر: اشوک در

سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری یوپی
مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ

شایع کردہ محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اتر پردیش

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے
زر سالانہ: پانچ روپے

ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پرکاشن پربھاگ انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو۔پی۔ لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶۔ لکھنؤ

بذریعہ رجسٹری: ایڈیٹر نیا دور انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو پی لکھنؤ

عنوانات

اپنی بات

اتر پردیش کے نئے گورنر عزت مآب شری چندر یشور پرشاد نرائن سنگھ نے ۲۰ فروری کو راج بھون کے دربار ہال میں اپنے عہدے کا حلف لیا۔ ان کا تعلق بہار سے ہے۔ ان کا جنم ۱۰ اپریل ۱۹۰۱ میں پارس گڑھ بہار میں ہوا تھا۔ ایم۔ اے کا امتحان انھوں نے ۱۹۲۵ میں کلکتہ یونیورسٹی سے پاس کیا۔ اس امتحان میں وہ فرسٹ کلاس فرسٹ رہے جس کے لیے انھیں گولڈ میڈل بھی ملا۔ ۱۹۲۷ میں وہ بہار قانون ساز کونسل کے ممبر منتخب ہوئے۔ انھیں مظفر پور ضلع بورڈ کا چیرمین بھی منتخب کیا گیا۔ اس حیثیت سے انھوں نے بہار میں ۱۹۳۴ کے زبردست زلزلہ سے متاثرہ لوگوں کی بیش بہا خدمت انجام دی اور انھیں ہر ممکن راحت بہم پہنچائی۔ ان کی ان خدمات کو تمام ملک میں بے حد سراہا گیا۔ ۱۹۴۵ میں وہ متحدہ پٹنہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے۔ آزادی کے بعد وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے انھیں نیپال میں ہندستان کا سفیر مقرر کیا۔ سفیر کی حیثیت سے ان کی مدت کا ختم ہونے کے بعد ۱۹۵۳ میں انھیں غیر منقسم پنجاب کا گورنر مقرر کیا گیا۔ انھیں کے زمانہ میں وہاں شہر چنڈی گڑھ اور بھاکڑا ننگل باندھ کی تعمیر ہوئی۔ ۱۹۵۸ میں وہ جاپان میں ہندستان کے سفیر ہوئے، جہاں انھیں اوتھانی یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دی گئی۔ بعد میں خرابیٔ صحت کی بنا پر انھیں ہندستان واپس آنا پڑا۔ اس کے بعد وہ ریزرو بینک آف انڈیا کے ڈائرکٹر ہوئے۔

شری سی۔ پی۔ این سنگھ ایک ممتاز ماہر تعلیم ہونے کے ساتھ ایک تجربہ کار اور مستعد ایڈمنسٹریٹر بھی ہیں۔ وہ ہندستانی تہذیب و ثقافت کے زبردست علمبردار ہیں۔ ۱۹۷۰ میں ملک کے تئیں ان کی نمایاں خدمات کے صلہ میں انھیں پدم وبھوشن کا اعزاز بھی حاصل ہو چکا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ان کی نگرانی اور حاذق و چوبند قیادت میں اتر پردیش اپنے مسائل سے عہدہ برآ ہونے کی سمت میں اور تیزی سے آگے بڑھے گا، ریاست کو صاف ستھرا اور چوکس نظم و نسق ملے گا اور ترقی و خوشحالی کی راہیں روشن ہوں گی۔

وفیات

● اتر پردیش کے سابق وزیر اعلا اور عوام کے محبوب رہنما شری چندر بھان گپتا کے انتقال سے نہ صرف اتر پردیش بلکہ ہمارا ملک اپنے ایک عظیم سپوت سے محروم ہو گیا۔ وہ ملک کی جنگ آزادی کے ایک نڈر اور بہادر مجاہد بھی تھے۔ اس کے علاوہ سیاسی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ انھوں نے تعمیری نوعیت کے بہت سے سماجی کام بھی انجام دیے۔ سماجی کاموں سے انکی دلچسپی اور تعلق آخر تک قائم رہا۔ اپنے نظریات سے ان کی وابستگی بھی اٹل رہی۔ انھوں نے سیاسی زندگی میں جو راہ اختیار کی اس پر آخر دم تک گامزن رہے۔ اپنی ان خصوصیات کی بنا پر وہ ایک منفرد شخصیت اور ایک قابل تقلید مثال بن گئے تھے۔ وہ ایک اصول پرست انسان تھے جو اپنی آخر عمر تک اس پر سختی سے عمل کرتے رہے۔

گپتا جی نے غریبوں اور مستحق افراد کی ہمیشہ مدد کی۔ وہ اجنبیوں کی بھی مدد کرتے رہے۔ وہ ایک بہت اچھے اور سخت ایڈمنسٹریٹر بھی تھے۔ اتر پردیش کے وزیر اعلا کی حیثیت سے انھوں نے نظم و نسق پر سب سے زیادہ توجہ مرکوز رکھی۔ لکھنؤ جو ان کی تمام تر سماجی اور سیاسی سرگرمیوں کا مرکز رہا، ہمیشہ ان کا ممنون اور احسان مند رہے گا۔ کیونکہ انھوں نے لکھنؤ کو بہت کچھ دیا۔ یہاں انھوں نے بہت سے سماجی ادارے قائم کیے اور بعض اداروں کو اپنی لگن اور محنت سے مثالی بنا دیا۔ لکھنؤ میں اسٹیڈیم، رویندرالیہ اور میوزیم کی تعمیر انھیں کی مرہون منت ہے جو انھوں نے اپنی وزارت کے زمانے میں کرائی تھی۔ وزارت کے بعد انھوں نے رویندرالیہ کے قریب دو بڑے اسپتال بھی تعمیر کرائے۔ انھوں نے آچاریہ نریندر دیو لائبریری جیسا مثالی ادارہ بھی قائم کیا۔ ان تمام اداروں کے علاوہ بال سنگرالیہ، بال ودیا مندر جیسے ادارے ان کی یاد کو ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔ اتر پردیش کے ایک معمار کی حیثیت سے بھی گپتا جی ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔ اردو کے سلسلے میں ان کا ہمیشہ یہ نظریہ رہا کہ درجہ آٹھ تک ہندی پڑھنے والوں کے لیے اردو اور اردو پڑھنے والوں کے لیے ہندی لازمی ہونا چاہیے۔

ادارہ نیا دور اس نقصان عظیم پر انتہائی سوگوار ہے اور انھیں اپنا پرخلوص خراج عقیدت پیش کرتا ہے۔

● اتر پردیش قانون ساز کونسل کے چیرمین ڈاکٹر ویریندر سروپ بھی گزشتہ دنوں اس دار فانی سے رخصت ہو گئے۔ ڈاکٹر سروپ زمانہ طالب علمی میں بہت اچھے طالب علم رہے۔ انھوں نے ۱۹۲۰ میں آگرہ یونیورسٹی میں قانون کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کیا اور تمام طلبا میں سر فہرست رہے۔ اپنی عملی زندگی انھوں نے ایک صحافی کی حیثیت سے شروع کی تھی۔ پھر ۱۹۵۶ میں پہلی مرتبہ مغربی گریجویٹ حلقہ انتخاب سے اتر پردیش قانون ساز کونسل کیلیے منتخب ہوئے۔ ۱۹۶۲ میں کانپور جھانسی گریجویٹ حلقہ انتخاب سے کونسل کے دوبارہ ممبر منتخب ہوئے۔ وہ تب سے اب تک اسی حلقہ کے نمائندے رہے۔ انھیں اتفاق رائے سے ۱۹۶۵ میں کونسل کا ڈپٹی چیرمین اور پھر ۱۹۶۹ میں چیرمین منتخب کیا گیا۔ تعلیمی سرگرمیوں سے انھیں خصوصی دلچسپی تھی۔ چنانچہ بہت سے تعلیمی اداروں سے ان کا تعلق رہا۔ کونسل کے چیرمین کی حیثیت سے انھوں نے اپنے فرائض ہمیشہ بڑی غیر جانبداری کے ساتھ باوقار انداز میں انجام دیے اور اپنی کارکردگی سے ایک اعلا مثال قائم کر گئے۔ ادارہ نیا دور ان کے انتقال پر رنج و غم کا اظہار کرتا ہے اور ان کے پس ماندگان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

—— ایڈیٹر

فضا ابن فیضی
مئو ناتھ بھنجن ضلع اعظم گڑھ

غزل

کیا کہیں تجھ سے جو نفعِ رائگاں ہم کو ملا
آگ کی بستی میں تنکوں کا مکاں ہم کو ملا

خوش نما لگتی ہے ان آنکھوں میں کاجل کی لکیر
مطمئن ہیں ہم کہ خوابوں کا دھواں ہم کو ملا

لمحہ لمحہ ہو رہے ہیں خرچ کیا رکھیں حساب
سود کہہ کر، زندگی بھر کا زیاں ہم کو ملا

دوسروں کو کیا خبر، ہر سانس ہے گفتارِ درد
یعنی اک خاموش آہنگِ فغاں ہم کو ملا

کوچۂ رنگِ حنا ہو یا دیارِ بوئے گل
ہر جگہ اپنے بکھرنے کا نشاں ہم کو ملا

ہم ہیں سر سے پاؤں تک سوکھے ہوئے کھیتوں کی پیاس
کن سلگتے بادلوں کا سائباں ہم کو ملا

ہر نفس اک تیر پہلو میں ترازو ہی سہی
کم نہیں اتنا، نصیبِ آہواں ہم کو ملا

آئنے کے سامنے کیا آئنہ رکھتا کوئی
مصلحت اس کی، شعورِ ناتواں ہم کو ملا

اپنی پوری زندگی ہم نے لگا دی داؤ پر
فن کا یہ سودا نہ کچھ اتنا گراں ہم کو ملا

ہم سے پوچھو خاک بر سر آگہی کا ماجرا
کیا کہیں تم سے، زمیں پر آسماں ہم کو ملا

ہم فضاؔ سہتے رہے لفظ و معانی کا عذاب
نکتہ چیں ٹھہرا وہی جو نکتہ داں ہم کو ملا

ڈاکٹر محمد منصور عالم
شعبۂ اردو و فارسی
جین کالج، آرہ (بہار)

سید سلیمان ندوی کی اردو شاعری

پروفیسر عبدالمنان بیدل عظیم آبادی بہ حیثیت مدیر رسالہ معاصر پٹنہ کے شمارہ نومبر دسمبر ۱۹۴۵ء میں لکھتے ہیں :

"علامہ سید سلیمان ندوی کا اسم گرامی محتاج تعارف نہیں۔ سیرت نگار رسولؐ، اسلامی مورخ، دینی رہنما اور اردو ادیب کی حیثیت سے ان کا نام براعظم ہند اور اس سے باہر بھی ادب کے ساتھ لیا جاتا ہے لیکن علامہ کو ایک نکتہ سنج سخنور کی حیثیت سے دنیا میں متعارف کرانے کا فخر پہلی مرتبہ معاصر کو حاصل ہو رہا ہے۔"

معاصر مذکور میں سید صاحب کے یہ اشعار ہیں۔ سہ

مکیؐ، مدنی، ہاشمی و مطلبی ہے
آدم کے لیے فخر یہ عالی نسبی ہے

پاکیزہ تر از عرش و سما جنت و فردوس
آرام گہ پاک رسولؐ عربی ہے

کیا شان ہے اللہ رے محبوب نبی کی
محبوب خدا ہے وہ جو محبوب نبی ہے

بجھ جائے ترے چھینٹوں سے اے ابر کرم آج
جو آگ مرے سینے میں مدت سے دبی ہے

اے زائر بیت نبوی یاد رہے یہ
بے قاعدہ یاں جنبش لب بے ادبی ہے

آہستہ قدم نیچی نگہ پست صدا ہو
خوابیدہ یہاں روح رسول عربی ہے

یہ اشعار کیسے حاصل ہوئے، اس کے متعلق مدیر لکھتے ہیں :

"مجھ سے اور علامہ موصوف سے اس سال دربار رسولؐ میں شرف نیاز حاصل ہوا۔ علامہ نے روضۂ اطہر پر عقیدت و ارادت کے چند پھول چڑھائے تھے، جنھوں نے حروف کی شکل اختیار کر لی ہے۔ میری درخواست پر علامہ موصوف نے یہ پھول معاصر کے لیے بطور ہدیہ بخش دیے ہیں۔"

سید صاحب نے صرف یہی اشعار نہیں، دوسری نظمیں اور غزلیں بھی عنایت کی تھیں۔ لیکن مدیر "معاصر" کو انھیں محفوظ رکھنے میں کامیابی نہیں ہوئی۔ خود کہتے ہیں :

"میری درخواست پر اکثر سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی نظمیں اور غزلیں مجھے سنائیں۔ میں نے عرض کیا، اگر یہ اشعار لکھوا دیے جائیں تو میں انھیں اپنے رسالہ معاصر میں چھاپ دوں۔ پہلے تو مسکرا کر فرمایا "اس کی اجازت نہیں"۔ مگر جب میں نے بہت اصرار کیا تو فرمایا "سلمان سے کہیے۔ وہ یہ اشعار لکھ کر آپ کو دیدیں گے"۔ میں نے سلمان سے کہا۔ عزیز نے جو نظمیں مجھ کو دیں ان میں سے حسب ذیل نعت جس کا عنوان ہے "گلہائے عقیدت" معاصر بابت ماہ نومبر دسمبر ۱۹۴۹ء میں چھاپ دی (وہی نعت ہے جو اوپر درج کی گئی) یاد نہیں کہ ان کے علاوہ دوسرے اشعار کہاں رکھ دیئے۔" (معارف، سلیمان نمبر ۱۹۵۵ء ص ۵۱-۳۵)

جو اشعار گم ہو گئے ان کا تو افسوس ہے ہی تحقیقی غلط بیانی کا بھی افسوس ہے۔ سید صاحب دراصل اپنی طالب علمی کے زمانے سے ہی شعر گوئی کا لطف لیتے تھے۔ مولانا ابوظفر ندوی جو ان کے دوستوں میں تھے، دورِ طالب علمی کے ایک مشاعرے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں[1] کہ سید صاحب وقت کی تنگی کے باعث صرف ایک شعر کہہ پائے تھے۔ وہی انھوں نے اس مشاعرے میں سنایا۔ شعر امیر کے رنگ میں ہے۔ ؎

سر سے قدم تلک ہے ردائے حیا پڑی
حاجت ہی کیا ہے آپ کو صاحب نقاب کی

مولانا شبلی نعمانی کی وفات (۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء) پر سید سلیمان ندوی نے اپنے احساسِ غم کو لباسِ شعر عطا کیا تھا، وہ "نوحۂ استاد" کے عنوان سے شائع بھی ہوا۔ پھر حیاتِ شبلی میں جو ۱۹۴۳ء کی تصنیف ہے، شامل کیا گیا۔ سید صباح الدین عبدالرحمان لکھتے ہیں[2] کہ جب "نوحۂ استاد" اخبار میں شائع ہوا تو عزیز لکھنوی، مولانا حبیب اللہ خاں شروانی اور مولانا حمید الدین فراہی جیسی بڑی شخصیتوں نے سید صاحب کی سخنوری کی داد دی۔ "نوحۂ استاد" کا مطلع یہ ہے:

اے متاعِ عزت پیشیں کے پچھلے کارواں
آہ وہ بھی مٹ گیا باقی جو تھا تیرا نشاں

ڈاکٹر سر محمد اقبال ۱۲ر نومبر ۱۹۱۶ء کے خط میں سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں[3]:

"آپ کی غزل لاجواب ہے بالخصوص یہ شعر مجھے بڑا پسند آیا۔ ؎

ہزار بار مجھے لے گیا ہے مقتل میں
وہ ایک قطرۂ خوں جو رگِ گلو میں ہے

مولانا شبلی مرحوم و مغفور نے تاریخی واقعات کو نظم کرنا شروع کیا تھا، اور جو چند نظمیں انھوں نے لکھی تھیں، وہ نہایت مقبول ہوئیں۔ غزل کے ساتھ وہ سلسلہ بھی جاری رکھیے۔"

۱۹۱۷ء میں اپنی پہلی اہلیہ کی وفات پر سید صاحب نے ایک غم انگیز نظم فراقِ یار لکھی۔ سید صباح الدین عبدالرحمان لکھتے ہیں[4] کہ جب اکبر الہ آبادی کو اس کی خبر ہوئی تو خطوط میں اشعار لکھ کر تسلی دیتے رہے۔ یہ نظم اس وقت پیشِ نظر نہیں ہے۔

ان باتوں سے ظاہر ہے کہ سید سلیمان ندوی شاعر کی حیثیت سے بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں ہی اردو دنیا سے متعارف ہو چکے تھے، پروفیسر عبدالمنان بیدل کا پانچویں دہائی میں دعویٰ کرنا کہ سید صاحب کو ایک نکتہ سنج سخنور کی حیثیت سے اردو دنیا سے متعارف کرانے کا فخر پہلی مرتبہ معاصر کو حاصل ہو رہا ہے، غلط محض ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی اطلاع دیتے ہیں کہ سید صاحب تخلص رمزی کرتے تھے۔ لیکن راقم السطور کو ابھی ایک بھی ایسا شعر نہیں ملا ہے جس میں کوئی تخلص ہو۔ ممکن ہے ابتدائی زمانے کی غزلوں میں یہ تخلص برتتے ہوں۔ غلام محمد حیدر آبادی کا انکشاف ہے کہ سید صاحب نے اپنے مجموعۂ کلام کا نام، غزل الغزلات تجویز فرمایا تھا کہ یہ نام حضرت سلیمان کے مجموعۂ کلام کا تھا۔ میں نے ان باتوں کی تفصیل کے لیے معارف اعظم گڑھ کو خط لکھا ہے ـــــ سید صاحب کی اردو شاعری کے متعلق یہاں اجمالی ذکر ہوگا اور اس کی بنا، معارف کے سلیمان نمبر ۱۹۵۵ء میں مندرج اشعار پر ہے۔ تفصیلی بحث میں اپنی کتاب میں کر رہا ہوں جو سید صاحب سے متعلق ہے۔

سید سلیمان ندوی کا اردو کلام جو معارف کے سلیمان نمبر مذکور میں نظر سے گزرا، جناب سید حسین[5]، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا عبدالباری ندوی، غلام محمد حیدر آبادی،

---

[1] معارف، سلیمان نمبر ۱۹۵۵ء، ص ۵۳ [2] ایضاً ص ۱۰ [3] اقبال نامہ۔ [4] معارف سلیمان نمبر۔ ص ۹۱،
[5] اڈیشنل کمشنر بریلی ڈویژن سید سلیمان ندوی کی بیٹی کے شوہر تھے ـــ (منصور)

اور پروفیسر عبدالمنان بیدل عظیم آبادی کے مقالوں میں نمونتاً درج ہوا ہے۔ ان میں زیادہ تر اشعار شرف بیعت حاصل کرنے کے بعد کے ہیں۔ اس لیے ان میں اپنے پیر و مرشد سے والہانہ محبت کی کیفیتیں نقل ہوئی ہیں۔ میں ان کے مزید کلام کی تلاش میں ہوں۔ افسوس ہے کہ مصنف "حیات سلیمان" نے سید صاحب کی شاعری کے متعلق کچھ نہ لکھا۔ کلام موضوع کے متعلق یہ باتیں کہی جا سکتی ہیں۔

سید سلیمان ندوی کے مزاج میں شیرینی اور شعریت تھی۔ رنگ تغزل میں اچھے شعر نکال لیتے تھے۔ ؎

دل حریف نگہہ یار کہاں سے لاؤں
جو نہ بیخود ہو وہ میخوار کہاں سے لاؤں

ابھی تو مشق فغاں کنج میں ہزار کرے
اثر کے واسطے کچھ اور انتظار کرے

انکار تھا تجھ کو مری تاثیر دعا سے
اب میری طرف دیکھ تو تاثیر دعا دیکھ

گاہ دیکھا تھا مری چشم تصور نے تمھیں
اب وہی تصویر میری ہمدم و دمساز ہے

سنا تو دے اسے افسانۂ غم ہجراں
وہ اعتبار کرے یا نہ اعتبار کرے

اور رندانہ بیباکی سے بھی مصرف لیتے تھے۔ ؎

مدرسہ چھوڑا، خرابات میں آکر ٹھہرا
دوسرا سایۂ دیوار کہاں سے لاؤں

مگر دراصل وہ طریقت کے شاعر تھے۔ بات خرابات کی ہے اور مراد خانقاہ عشق و تصوف ہے۔ غالب نے کہا تھا۔ ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

یہی کیفیت سید سلیمان ندوی کی ہے کہتے ہیں۔ ؎

زاہد نے کہاں پائی زاہد نے کہاں پی لی
گفتار رہے رندانہ رفتار رہے مستانہ

یہ رفتار کی مستی اور گفتار میں رندی انھیں "تھانہ بھون" کے توسل سے نصیب ہوئی ہے اور عشق و تصوف کی سرشاری میں دل کی کیفیتیں کبھی حقیقت کبھی مجاز کے پردے سے جھانکتی ہیں بلکہ آئینہ مجاز ہی جلوۂ حقیقت ہوتا ہے۔ ؎

دیدۂ دل اگر ہو باز، راز رہے نہ راز میں
جھانکتی ہیں حقیقتیں آئینہ مجاز میں

تغزل سید سلیمان ندوی کے لیے ایک زینہ ہے جس سے وہ منزل تصوف پر پہنچتے ہیں۔ ان کی شاعری میں تغزل اپنی علاحدہ حیثیت نہیں رکھتا۔ شیخ طریقت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی ان کے معشوق ہیں۔ سید صاحب اصل میں دانا، دلِ بینا، دلِ شنوا کے آرزومند تھے۔ اعلیٰ علمی اور ... مقام پر ہوتے ہوئے بھی انھوں نے مولانا تھانوی سے رجوع کیا اپنے مزاج و معلومات پر بھی نظر ثانی کی۔ معارف میں "رجوع و اعتراف" کے عنوان سے اپنے خیالات ظاہر کئے۔ ان کے چند مداحوں کو یہ بات پسند نہ آئی، کچھ کو حیرت ہوئی اور اکثر دا... نے ان کے اقدام سے عبرت حاصل کی۔ سید صاحب "جامع المجددین" حضرت مولانا تھانوی کی تعریف یوں کرتے ہیں۔ ؎

اس سے پایا روئے ملت نے فروغ
ختم اس پر دورۂ تجدید ہے

سید صاحب عشق کے اس مقام پر پہنچ جاتے ہیں جہاں الطاف عمیم کے لیے مزاج یار بہانے ڈھونڈتا ہے۔

وہ چشم محبت جو یاس محبت ہے۔
دیکھیے تو ذرا کر کے اس کو کوئی یارانہ

اور یہ چشم محبت ایسی ہے جس میں دونوں خواص رکھے ہیں

وہ چاہے مست کرے چاہے ہوشیار کرے

اس لیے وہ بڑے شعور سے کام لیتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ معشوق یگانہ ہے۔ اس لیے عاشق کو بھی یگانہ ہونا چاہیے۔ وہ تمام جہاں سے بیگانہ ہو جائے۔ ؎

معشوق یگانہ ہے عاشق بھی یگانہ ہو
یعنی کہ جو اُن کا ہو وہ سب سے ہو بیگانہ

ر دہ تمام جہاں سے بیگانہ ہو جاتے ہیں۔ سہ

اب مسئلۂ کثرت و وحدت کو میں سمجھا
یا کہ تجھے سب تیرے سوا بھول گیا ہوں

ت وحدت میں بدل جاتی ہے۔ ہر سمت اور ہر وقت معشوق نظر آتا ہے۔ سید صاحب فنافی الشیخ ہو جاتے ہیں۔ اب ں کے فنافی الرسولؐ اور فنافی اللہ کی منزل بیش از یک ں نہیں ہے۔ وہ حریم ناز میں بار پا لیتے ہیں سہ

اس کے کرم کے ہیں نثار، اس کی عطا کا کیا شمار
دیدیا عاصیوں کو بار اپنے حریم ناز میں

ر بالآخر یہ کیفیت ہو جاتی ہے سہ

نام ان کا ہر نفس میں لب پہ یوں آیا کیا
تن سے جیسے روح بسمل مائل پرواز ہے

سید سلیمان ندوی کے شناساؤں نے لکھا ہے کہ وہ ید جوانی میں امیر مینائی اور داغ کا کلام اکثر زیر مطالعہ کھتے تھے۔ غالباً اسی وجہ سے ان کی غزلوں میں داغ کی بان اور امیر مینائی کے انداز خیال کا عکس ملتا ہے۔ مگر ندی سے شعر گوئی نہ کی۔ اس لیے بعد میں یہ عکس دھندلا گیا۔ غزلوں میں مجموعی طور پر انھوں نے کوئی خاص بات پیدا کی۔ یں عام خیالات کو عام انداز میں پیش کیا اور ہر ایک یزر کے ساتھ چلنے کی کوشش کرتے رہے۔ کبھی کبھی اقبال ! اثر بھی جھلکتا ہے۔ مثلاً :

اقبال سہ
موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

سلیمان سہ
ہر قطرۂ ندامت کا جو دیدۂ تر میں ہے
ہے دامن خالی کا وہ گوہر شاہانہ

اقبال سہ
کھول آنکھ زمیں دیکھ، فلک دیکھ فضا دیکھ
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ

سلیمان سہ
تشہیر کا باعث نہ ہو دامانِ قبا دیکھ
لائے نہ کہیں رنگ یہ خونِ شہداء دیکھ

انکار تھا تجھ کو مری تاثیر دعا سے
اب میری طرف دیکھ تو تاثیر دعا دیکھ

پہلی مثال میں خیال اقبال کی خام تقلید ہے۔ دوسری مثال میں پرتوِ خیال تو نہیں ہے لیکن قافیہ اور ردیف کے ساتھ بحر بھی ہے۔

سید سلیمان ندوی میں شاعری کا ملکہ تھا۔ وہ اس سے اور مصرف لیتے اور جو مشورہ اقبال نے دیا تھا[1] "مولانا شبلی مرحوم و مغفور نے تاریخی واقعات کو نظم کرنا شروع کیا تھا۔۔۔ غزل کے ساتھ وہ سلسلہ بھی جاری رکھئے" اس پر توجہ خاص دیتے تو "عدل[2] فاروقی"[3] اور "عدل جہانگیری" جیسی کئی نظموں کا اردو میں اضافہ ہوتا۔ سید صاحب میں ایک اور خوبی تھی۔ وہ جذبات غم کو شعر کے سانچے میں بڑے موثر انداز میں ڈھالتے تھے۔ "نوحۂ استاد" اور "فراق یار" ہمارے دعوے کی بیّن دلیل ہیں۔ اس جانب بھی مزید توجہ دیتے تو اردو میں اچھے اچھے مرثیے ان کے قلم سے ممکن تھے۔

★

---

[1] خط بنام سید سلیمان ندوی۔ مورخہ ۱۲ر نومبر ۱۹۱۶ء۔ [2] اور [3] مولانا شبلی نعمانی کی نظمیں ـــ (مقصود)

ڈاکٹر ساغر اعظمی
بارہ بنکی - یو پی

غزلیں

مجھے بدنام کرکے خوب چمکاتے ہیں نام اپنا
میرے احباب بھی اکثر دکھاتے ہیں کام اپنا

کبھی تھا میکدے میں بھی سرِ فہرست نام اپنا
مگر اب اپنے ہی اشکوں سے بھر لیتا ہوں جام اپنا

ہماری ساری بستی جیسے انسانوں سے خالی ہے
کیا کرتے ہیں ضایع پتھروں میں ہم سلام اپنا

مجھے تو اپنی رسوائی کا کوئی غم نہ تھا لیکن
تمہارے واسطے کرنا پڑا ہے احترام اپنا

کہیں بے حس نہ کردے اب یہ بے کیفی یہ سناٹا
اٹھاؤ تم بھی ساز اپنا اٹھاؤں میں بھی جام اپنا

تمہیں صہبا سمجھ کر نام میں نے رکھ لیا ساغر
مناسب ہے کوئی ایسا ہی رکھ لو تم بھی نام اپنا

راجندر بہادر موج (ایڈوکیٹ)
فتح گڑھ (یو-پی)

ان کے انتظار میں عمر مختصر گئی
اک حسیں فریب میں راہ یہ گزر گئی

عشق کے بغیر زیست جیسے پھول بے مہک
عشق ہی کا تھا کرم کہ زندگی سنور گئی

ان کے روبرو ہوئے ختم شکوہ ہائے جور
اک ندی چڑھی ہوئی دفعتاً اتر گئی

زندگی نے مقصدِ زندگی بھلا دیا
کیا حسین رات تھی نیند میں گزر گئی

اک نظر سے کھل گیا گلستانِ آرزو
صبح کی کرن کے ساتھ ہر کلی نکھر گئی

ورنہ میرا ظرف کیا اور کہاں وہ بزمِ ناز
کچھ نگاہِ حسن ہی کام اپنا کر گئی

حسن میں کہاں وفا عشق کو کہاں شعور
لذتِ رہِ وفا اب تو ہم سفر گئی

موج راس آگیا اب تموجِ حیات
فکرِ ناخدا گئی فکرِ راہبر گئی

ڈاکٹر سلام سندیلوی
پرانی امام باڑہ میاں بازار گورکھپور

غالب کی شاعری میں بے خوابی

دراصل بے خوابی کا تعلق دماغ اور اعصاب سے ہے دور جدید میں ماہرین نفسیات نے بے خوابی کے مسئلے پر غور کیا ہے اور اس کے اسباب کا پتا لگایا ہے۔ اس کے ساتھ اس کا علاج بھی تجویز کیا ہے۔ چنانچہ الفریڈ ایڈلر (ALFRED ADLER) نے ایک کتاب THE PRACTICE AND THEORY OF INDIVIDUAL PSYCHOLOGY تیار کی ہے جس کا ترجمہ انگریزی میں پی۔ ریڈن (P. RADIN) نے کیا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۲۳ء میں لندن میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں الفریڈ ایڈلر نے دو مضامین بے خوابی کے متعلق شامل کیے ہیں ایک مضمون کا عنوان ON SLEEP DISTURBANCE ہے۔ یہ مضمون اس نے ۱۹۱۲ء میں لکھا تھا۔ دوسرے مضمون کا عنوان (NERVOUS INSOMNIA) ہے یہ مضمون اس نے ۱۹۱۴ء میں لکھا تھا۔ اس کے یہ دونوں مضامین بے خوابی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔

بے خوابی کے مریض بے حد پریشان رہتے ہیں۔ وہ نیند لانے کے لیے مختلف تدابیر کام میں لاتے ہیں مگر بیشتر اوقات ناکام رہتے ہیں۔ کوئی مریض کہتا ہے کہ میں بارہ بجے رات تک اس لیے جاگتا رہتا تاکہ تھکاوٹ کے بعد نیند آجائے۔ کچھ لوگ سونے کے لیے مکمل خاموشی چاہتے ہیں۔ کچھ لوگ نیند نہ آنے سے ایک ہزار تک گنتی گنتے ہیں۔ کچھ لوگ دلچسپ خیالات میں کھو جاتے ہیں۔ ان کوششوں کے باوجود ان کو نیند نہیں آتی ہے۔

کچھ لوگ مختلف تدابیر کے ذریعہ سو جانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ کچھ لوگوں کو شراب پینے سے نیند آجاتی ہے۔ کبھی پیٹ بھر کھانے سے انسان سو جاتا ہے۔ کبھی کم کھانے سے بھی نیند آنے لگتی ہے۔ کچھ لوگوں کو تاش کھیلتے کھیلتے یا کوئی کتاب پڑھتے پڑھتے نیند آجاتی ہے۔ کچھ لوگوں کا یہ بھی قول ہے کہ مجامعت کے بعد بہت گہری نیند آتی ہے۔ کچھ لوگوں کا یہ بھی بیان ہے کہ مجامعت سے بے خوابی کے مرض میں اضافہ ہوتا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اگر سوتے وقت سر کو تکیے کی طرف جھکایا جائے تو دوران خون سر میں زیادہ ہو جاتا ہے اور نیند آجاتی ہے۔ کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ سر کو مسلسل جنبش دینے سے بھی غنودگی طاری ہو جاتی ہے۔ الفریڈ ایڈلر نے لکھا ہے کہ بقول بعض افراد سر کو دیوار سے ٹکرانے کے بعد نیند آجاتی ہے

الفریڈ ایڈلر کا قول ہے کہ نیند لانے میں وہ لوگ زیادہ کامیاب ہوتے ہیں جو طبیعتاً ہشاش بشاش اور خوش و خرم رہتے ہیں کیونکہ وہ زمانہ اور غم دوراں کا اثر کم لیتے ہیں مگر جو لوگ فطری طور پر الجھن اور شدید احساس ہوتے ہیں وہ سونے میں اکثر ناکام رہتے ہیں۔ راجر ڈبلیو ہینز (ROGER W. HEYNS) کے نقطۂ نظر سے ہم اس بات کو یوں کہہ سکتے ہیں کہ جن لوگوں کا تعلق (VISCEROTONIC GROUP) سے ہوتا ہے وہ بے خوابی کے شکار کم ہوتے ہیں لیکن جن کا تعلق CEREBROTONIC GROUP سے ہوتا ہے وہ شدت احساس کی بنا پر بے خوابی کے اکثر شکار رہتے ہیں۔

بے خوابی کے اسباب دو قسم کے ہوتے ہیں۔ پہلا سبب جسمانی (PHYSIOLOGICAL) ہے مثلاً انسان کے جسم میں ایسے اجزا جمع ہوتے ہیں جو آخر میں بے خوابی پیدا کر دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ دماغ کی رگوں میں خون کی خرابی سے بھی بے خوابی کا مرض ہو سکتا ہے۔ کبھی کبھی گردے کی خرابی کے مریض بھی بے خوابی میں مبتلا ہو جاتے ہیں مگر اس قسم کی بے خوابی کا علاج بہت آسان ہے۔ کیونکہ یہ سبب جسمانی خرابی دور ہو جائے گی تو اس مریض کو خود بخود نیند آنے لگے گی

بے خوابی کا دوسرا سبب نفسیاتی (PSYCHOLOGICAL) ہے۔ یہ سبب پیچیدہ ہے اس کا تعلق تحت الشعور کی خرابی اور دماغی پریشانی سے ہے۔ اس لیے اس کا علاج بھی بہت مشکل ہے۔

بے خوابی کے اثرات بہت مضر ہوتے ہیں۔ جب انسان رات بھر جاگتا ہے تو صبح کو وہ تھکا وٹ محسوس کرتا ہے اور دن میں کام کرنے کے لائق نہیں رہتا ہے۔ بے خوابی ایک قسم کا دماغی مرض ہے۔ یہی نہیں بلکہ ہر دماغی مرض میں بے خوابی کا ہونا ضروری ہے بے خوابی کی بنا پر مریض جبری (COMPULSION) اور بے بنیاد وہم (PHOBIA) میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ سخت قسم کی بے خوابی میں انسان میں اعصابی خلل (NEURODSIS) اور جنون (PSYCHOSIS) کا مرض پیدا ہو جاتا ہے۔

روز ازل سے انسان مصائب کا شکار رہا ہے۔ کیونکہ اس کو ہر قدم پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن ایک شاعر عام انسان کے مقابلے میں زیادہ حساس ہوتا ہے، اس لیے بہت سے شعرا بے خوابی کے مریض رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف شعرا کے دیوان میں بے خوابی کے اشعار بھی نظر آتے ہیں۔ مثلاً ولی گجراتی شاہ مبارک آبرو، خواجہ میر درد، سراج اورنگ آبادی، فغاں سودا، میر حسن، قائم چاندپوری، میر تقی میر، جرات، انشا، مصحفی نظیر اکبر آبادی، رنگین، ناسخ، آتش، مومن، ذوق، بہادر شاہ ظفر غالب، منیر شکوہ آبادی، امیر مینائی، داغ، اسیر لکھنوی، اکبر الہ آبادی، شاد عظیم آبادی، ریاض خیر آبادی، عزیز لکھنوی ثاقب، آرزو لکھنوی، حسرت موہانی اور فراق گورکھپوری وغیرہ

وغیرہ کے کلام میں بے خوابی کے اشعار موجود ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ زیادہ تر شعرا نے رسمی اور قیاسی طور پر بے خوابی کے اشعار کہے ہیں مگر چند شعرا کے یہاں بے خوابی کے اشعار اصلیت اور حقیقت پر مبنی ہیں۔ ایسے شعرا میں ہم میر تقی میر کا بھی نام لے سکتے ہیں جن کی بے خوابی اصلی اور حقیقی ہے۔

دراصل میر کی ساری شاعری سچائی اور صداقت کی امانت ہے میر کی شخصیت اور شاعری میں ایک گہرا ربط پایا جاتا ہے اردو کے کسی شاعر کے یہاں زندگی کی اتنی سچی اور اصلی تصویریں نظر نہیں آئیں گی۔ میر نے غم جاناں اور غم دوراں دونوں کی چوٹیں کھائی ہیں۔ اس لیے وہ ساری زندگی افسردہ اور کبیدہ رہے۔ اسی کی بنا پر وہ اعصابی خلل، دماغی خلل اور بے خوابی کے شکار رہے۔ میر کی حیات دراصل پریشانی افسردگی اور بے خودی کی ایک کھنکتی ہوئی زنجیر ہے۔

میر کے کلام میں غم جاناں کے نقوش واضح طور پر ملتے ہیں۔ اس کا ذکر احمد حسین سحر نے "تذکرہ بہار بے خزاں" میں واضح طور پر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"مشہور است کہ بہ شہر خویش با پری تمثالے کہ از عزیزانش بود در پردہ نقش طبع ذیل خاطر داشتہ۔ آخر عشق در خاصۂ مشک پیدا کردہ۔ فی خواست کہ بخیہ بر بار سوئے سوائی بشکند، حسن بے پردہ بہ جلوہ گری در آید۔ از ننگ افشائے راز و طعن اقربا بادلے بغل پرورد، حسرت و حرماں با خاطر ناشاد دست و گریباں قطع رشتۂ حب وطن ساختہ از اکبر آباد بعد از خانہ بر اندازی ہا بہ شہر لکھنؤ رسید و سنگ شکیبائی بہ رشتہ زدہ و از آوارہ گردی ہا آرمیدہ ہمیں جا بحسرت جاں کاہ جلا وطنی حرماں نصیبی از دیدار یار دو یار جان بہ جہاں آفرید داد تا بقید بہ رشتۂ حیات بود طوق محبت بہ گردن و سلسلۂ دیوانگی بہ پا داشت"[1]

[1] تذکرہ بہار بے خزاں - احمد حسین سحر - مرتبہ ڈاکٹر نعیم احمد - صفحہ ۹۹

احمد حسین سحرؔ کی اس عبارت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ میرؔ اکبر آباد میں اپنی ایک عزیز لڑکی پر عاشق تھے جو پری کی طرح خوبصورت تھی۔ میرؔ کو اس عشق میں رسوائی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس لیے انھوں نے ترک وطن کیا مگر وہ لکھنؤ نہیں آئے جیسا کہ احمد حسین سحرؔ نے لکھا ہے بلکہ وہ دہلی پہنچے۔ دہلی میں انھوں نے اپنے سوتیلے خالو سراج الدین علی خاں آرزوؔ کے یہاں قیام کیا۔ مگر ان کے بڑے بھائی حافظ محمد حسن، نے خان آرزوؔ کو لکھ دیا کہ "میر محمد تقی فتنۂ روزگار است۔ زنہار بہ تربیت او نہ باید پرداخت"۔ یہ خط پا کر خان آرزوؔ نے میرؔ پر جور و ستم کا آغاز کیا۔ اور بقول میرؔ "گلائی اور رسوائی" پر اتر آئے۔ اسی وجہ سے میرؔ پر افسردگی طاری ہو گئی۔ پھر بے خوابی اور جنون کا عارضہ ہو گیا۔ اس کا ذکر میرؔ نے اپنی مثنوی "خواب و خیال" میں کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

زمانے نے رکھا مجھے متصل / پراگندہ روزی، پراگندہ دل
وطن میں نہ اک صبح میں شام کی / نہ پہنچی خبر مجھ کو آرام کی
چلا اکبر آباد سے جس گھڑی / در و بام پر چشم حسرت پڑی
پس از قطع رہ لائے دلی میں بخت / بہت کھینچے یاں میں نے آزار سخت
جگر جور گردوں سے خوں ہو گیا / مجھے رکتے رکتے جنوں ہو گیا
ہوا خبط سے مجھ کو ربط تمام / لگی رہنے وحشت مجھے صبح و شام
کبھو کف بہ لب مست رہنے لگا / کبھو سنگ در دست رہنے لگا
کبھو غرق بحر تحیر رہوں / کبھو سر بہ جیب تفکر رہوں
نظر آئی اک شکل مہتاب میں / کمی جس سے آئی خور و خواب میں

میرؔ نے آخری شعر میں واضح طور پر کہہ دیا ہے کہ فرقت جاناں میں انھوں نے کھانا ترک کر دیا اور وہ نیند سے محروم ہو گئے۔ یہ نیند کی محرومی اردو کے اکثر و بیشتر شعرا کی طرح فرضی رسمی اور قیاسی نہیں ہے بلکہ اصلی حقیقی اور واقعاتی ہے۔ اس قسم کی بے خوابی کا سچا شعر اردو شاعری میں مشکل سے ملے گا۔

میرؔ نے ایک مثنوی "جوش عشق" کے عنوان سے کہی ہے۔ یہ مثنوی بھی آپ بیتی ہے۔ انھوں نے فراق یار میں جو صدمے برداشت

کیے ہیں ان کا ذکر موثر انداز میں کیا ہے۔ ان کا قول ہے:

صبر نے چاہی دل سے رخصت / تاب نے ڈھونڈھی اک دم فرصت
تاب و توان و شکیب و تحمل / رخصت اس سے ہو گئے بالکل
سینہ فگاری ساتھ آئی / بے تابی نے طاقت پائی
کرتے آئے داغ سیاہی / کام جگر کا کرنے تباہی
خون جگر سے بہنے لاگا / پلکوں ہی پہ رہنے لاگا
خواب و خورش کا نام نہ آیا / ایک گھڑی آرام نہ آیا

میرؔ کا قول ہے کہ ہجر محبوب میں وہ خواب و خورش سے محروم ہو گئے۔ اس موقع پر میرؔ کی بے خوابی رسمی اور روایتی نہیں ہے بلکہ اس میں حقیقت کا رنگ جھلکتا ہے۔

میرؔ کی مثنویوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ واقعی غم جاناں میں مبتلا تھے اور یہ غم جاناں اس قدر شدید تھا کہ وہ بے خوابی کے شکار ہو گئے تھے۔ مثنویوں کے علاوہ میرؔ کی غزلوں کے اشعار سے بھی ان کی بے خوابی کا پتا چلتا ہے۔ جو غم جاناں کی دین ہے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں۔

لگتی نہیں پلک سے پلک انتظار میں / آنکھیں لگی ہیں تیری تو پھر نیند سو چکا

یہ حقیقت ہے کہ بے خوابی کے عالم میں پلک سے پلک نہیں لگتی ہے۔ میرؔ نے اس شعر میں اپنا ذاتی تجربہ بیان کیا ہے۔

میرؔ ایک اور شعر میں فرماتے ہیں۔

کھلی رہتی ہے چشم آئینہ ساں
کہاں خواب مشتاق دیدار کو

میرؔ کا یہ ذاتی تجربہ بالکل صحیح ہے۔ فرقت میں آنکھ کھلی رہتی ہے اور ہزار کوشش کے باوجود نیند نہیں آتی ہے۔

میرؔ کا یہ شعر بھی ملاحظہ فرمایئے:

پہروں شبوں کو غم میں ترے جاگتے رہے
ہو آ نہ جگر سو کر کسے بے وفا کے پاس

بے خوابی کے مریض کو بہت کافی دیر کے بعد نیند آتی ہے۔ اس لیے میرؔ بھی رات کو پہروں تک جاگتے رہے۔

میرؔ کا قول ہے:

بلبل کی بے کلی نے شب بے دماغ رکھا
سونے دیا نہ ہم کو ظالم نے آپ سوئی

میر نے اس شعر میں اپنا ذاتی تجربہ بیان کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شور و غل میں نیند نہیں آتی ہے۔ اس کے علاوہ بلبل بذات خود گل پر عاشق ہے۔ اور وہ فرقت کی بنا پر تڑپ رہی ہے۔ اس کا نالہ میر کو اپنے محبوب کی یاد دلاتا ہے جو فطری بات ہے۔ اس شعر میں اصول اتصال ([illegible]) کا نکتہ پوشیدہ ہے۔

میر کی بے خوابی کا تجربہ اس شعر میں بھی ملاحظہ فرمایئے:

رات گزری ہے سب تڑپتے میر
آنکھ لگ جائے گر تو سو لیو تم

رات میں جب نیند نہیں آتی ہے تو انسان بہت بے چینی محسوس کرتا ہے۔

میر نے اس بے چینی کو تڑپنا کہا ہے۔ یہ میر کا ذاتی تجربہ ہے جو رسمی نہیں ہے۔ میر کا مندرجہ ذیل شعر بھی قابل توجہ ہے۔

فرصت خواب نہیں ذکر بتاں میں ہم کو
رات دن رام کہانی سی کہا کرتے ہیں

حساس آدمی کے دل و دماغ پر جب کوئی بات نقش ہو جاتی ہے پھر وہ دور نہیں ہوتی ہے اور وہی بات ہر وقت ستاتی رہتی ہے۔ میر یاد محبوب میں غرق ہیں۔ اس لیے ہر وقت ان کے دل میں محبوب کی یاد کھٹکتی رہتی ہے اور ہر وقت ان کی زبان پر اس کا ذکر رہتا ہے۔ اسی بنا پر وہ نیند سے محروم ہیں۔

میر محبوب کے انتظار میں رات بھر بیٹھے رہتے ہیں۔ وہ اس بات کا ذکر یوں کرتے ہیں:

بیٹھے ہی گزری وعدے کی شب وہ نہ آ پھرا
ایذا عجب طرح کی اٹھائی تمام شب

کسی کے انتظار میں رات بھر بیٹھا رہنا بالکل فطری بات ہے۔ میر کے اس شعر میں بھی صداقت موجود ہے۔ میر کے مندرجہ ذیل اشعار میں بھی بے خوابی کا ذکر غم جاناں کی بنا پر ہے:

دن کو نہیں ہے چین نہ ہے خواب شب مجھے
مرنا پڑا ضرور ترے غم میں اب مجھے

جب سے آنکھیں لگی ہیں ہماری نیند نہیں آتی ہے رات
تکتے راہ رہے ہیں دن کو آنکھوں میں جاتی ہے رات

رات کو جس میں چین سے سو ویں سو تو اس کی جدائی میں
شمع نمط جلتے رہتے ہیں اور رہیں کھاتی ہے رات

غرضکہ میر غم جاناں کے اسیر تھے۔ اس غم کی بنا پر وہ نیند سے محروم رہتے تھے اور بے خوابی کی اذیت برداشت کرتے تھے۔

میر کے یہاں بے خوابی غم دوراں کی بنا پر بھی وارد ہوئی ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں مسلسل زہر غم کے پیالے پیے ہیں۔ میر جب دس سال کے تھے تو ان کے والد علی متقی صاحب رحلت فرما گئے۔ اس کے بعد ان کے سوتیلے بھائی حافظ محمد حسن نے ساری جائداد پر قبضہ کر لیا۔ اسی لیے میر بے سر و سامان ہو گئے۔ وہ تلاش معاش میں دہلی پہنچے اور وہاں صمصام الدولہ امیر الامرا کے ملازم ہو گئے۔ مگر جب نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کیا تو صمصام الدولہ کا قتل ہو گیا۔ اس لیے میر صاحب کی ملازمت ختم ہو گئی۔ مجبوراً وہ دہلی واپس آ گئے۔

[illegible] دہلی پر ۱۷۴۸ء میں احمد شاہ درانی نے حملہ کیا۔ اس وقت میر کی عمر [illegible] سال کی تھی۔ اس کے بعد احمد شاہ ابدالی نے ۱۷۴۸ء سے ۱۷۵۹ء تک دہلی پر چار بار حملہ کیا۔ چوتھے حملہ میں میر کا کعبہ بھی تباہ ہو گیا۔ چنانچہ وہ "ذکر میر" میں لکھتے ہیں۔

"کمیہ کہ بر سر راہ داشتم بخاک برابر شد"

اس تباہی کے بعد میر برسانہ پہنچے اور راجہ جگل کشور کی ملازمت اختیار کی۔ ۱۷۶۱ء میں پانی پت کی تیسری جنگ ہوئی جس میں احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں کو زبردست شکست فاش دی۔

احمد شاہ ابدالی کے اس حملے سے دہلی پر مکمل تباہی آ گئی۔ اس لیے میر کو شہر ترک کرنا پڑا۔ چونکہ ان کے دوستوں کے حالات بہت ابتر تھے۔ اس لیے میر کو ملازمت مستقل طور سے کہیں نہیں ملتی تھی۔ صمصام الدولہ کے قتل کے بعد میر نے رعایت خاں کی ملازمت اختیار کی۔ رعایت خاں خود راجپوتانہ کی ریاست ناگور کے راجہ بخت سنگھ کے ملازم تھے۔ کچھ عرصے کے بعد بخت سنگھ نے رعایت خاں کو ملازمت سے برخاست کر دیا

(باقی ص ۳۱ پر)

جلیل فتحپوری
پتہ چمن گنج کانپور

غزل

گلوں کا رنگ غزل کا شباب مانگے ہے　　نگاہ تیرا رخِ بے نقاب مانگے ہے
تجھے مرا دلِ پر اضطراب مانگے ہے　　غضب ہے وسعتِ دریا حباب مانگے ہے
چمن میں پھول ہزاروں ہیں اس کو کیا کیجے　　ہمارا ذوق شگفتہ گلاب مانگے ہے
اسے بھی حسن کے صدقے میں کچھ عنایت کر　　تری نگاہ سے مستی شراب مانگے ہے
صدا تو ہوگی تری تلخ ہو کہ شیریں ہو　　سوال کر کے جو چپ ہے جواب مانگے ہے
کسی حسین کے چہرے پہ بھی نہیں رکتی　　نہ جانے کیا نگہِ انتخاب مانگے ہے
کہیں بھی ہم ہوں وہ گلشن ہو یا ہو ویرانہ　　اُن ہی کو یہ دلِ خانہ خراب مانگے ہے
تسلیاں نہ مجھے دے نگاہِ ناز تری　　مری خطا کرم بے حساب مانگے ہے
مری نگاہِ محبت مطالعہ کے لیے　　ترے جمال کی روشن کتاب مانگے ہے
دلِ تباہ کے بھی حوصلے کی حد ہے کوئی　　یہ ذرہ روشنیٔ آفتاب مانگے ہے
مزاجِ عشق تلون پسند ہے کتنا　　کبھی سکون کبھی اضطراب مانگے ہے

فضائے دشت ہے تنہائیاں ہیں میں ہوں جلیل
اب اور کیا دلِ خانہ خراب مانگے ہے

مسرور احمد (ریڈر)
شعبۂ اردو اسلامیہ کالج اٹاوہ
(یو پی)

اردو میں انشائیہ نگاری

اردو کے نثری ادب میں آج لفظ انشائیہ جس طرح کے خیال پاروں اور ادب پاروں کے لیے مخصوص ہے وہ ان مضمونوں مقالوں اور انشا پردازی کے نمونوں سے مختلف ہیں جن میں ہمارے انشا پردازوں نے تاریخ، سوانح نگاری، تنقید، مکتوب نگاری طنز و مزاح، فلسفیانہ موشگافی، علمی و ادبی مباحث، افسانوی و صحافتی ادب اور خاکہ نگاری کا قیمتی اور لازوال ذخیرہ اپنے پورے خلوص اور تخلیقی جوہر کے ساتھ سمویا ہے۔ ہمارے ادب میں انشائیہ انگریزی ادب کے (ESSAY) کی طرح اب ایک صنف کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے لکھنے والے انشائیہ نگار کہے جاتے ہیں لیکن اردو دنیا میں یہ ابھی گل نو دمیدہ ہے۔ بقول خلیل الرحمٰن اعظمی:

"انگریزی ادب میں جس چیز کو ایسے (ESSAY) کہتے ہیں اور کبھی کبھی اس کی صنفِ ادبی کے تعین کے لیے لائٹ ایسے (LIGHT ESSAY) یا پرسنل ایسے PERSONAL ESSAY کہا جاتا ہے، اس کی طرف ہمارے یہاں کم توجہ کی گئی ہے۔ ہمارے انشا پرداز عالم، فلسفی، سوانح نگار، مورخ مبلغ، مصلح، جمال پرست، ناقد، افسانہ نگار، طنز نگار، اور مزاح نگار وغیرہ کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں یہی سبب ہے کہ شخصی لہجے کے باوجود ESSAYIST نہیں کہے جا سکتے اور نہ ان کے مقالات اور مضامین کو ہم (ESSAY) کہہ سکتے ہیں۔ ایک باضابطہ کتاب کے مقابلے میں ایک مختصر تحریر کے لیے خواہ وہ علمی اور فلسفیانہ ہو یا تنقیدی اور دوا ہم اردو میں مقالہ یا مضمون کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور اگر جمالیاتی اور تاثراتی عنصر زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے تو ایسی تحریر کو "انشائے لطیف" کہا جاتا ہے مگر ہمارے یہاں ایسے (ESSAY) کی صنف کا اس طرح تعین نہ ہو سکا جس طرح انگریزی یا بعض دوسری مغربی زبانوں میں ہے حالانکہ سجاد حیدر خواجہ حسن نظامی اور رشید احمد صدیقی وغیرہ کے یہاں بعض ایسے مضامین مل جاتے ہیں جو ایسے (ESSAY) کی شرائط کو خاصی حد تک پورا کرتے ہیں۔"[1]

انشائیہ یا ایسے (ESSAY) کی امتیازی خصوصیات اور اس کی بنیادی شرائط کیا ہیں؟ اس کے جواب میں مشہور انشائیہ نگار ڈاکٹر وزیر آغا کے قلم سے نکلی ہوئی تعریف اور تحدید بہت اہم ہے۔ میں انہیں کے الفاظ یہاں دہرانا مناسب خیال کرتا ہوں:۔

"ایک چیز جو انشائیہ کو دوسری اصناف سخن سے تمیز کرتی ہے اس کا غیر رسمی طریق کار ہے۔ دراصل انشائیہ کے خالق کے پیش نظر کوئی ایسا مقصد نہیں ہوتا جس کی تکمیل کے لیے وہ دلائل و براہین سے کام لے اور ناظر کے ذہن میں پہلے سے موجود خیالات کو تحریک دینے کی سعی کرے۔ اس کا کام محض یہ

نہیں کیے جا سکتے ہیں جو مدلل اور عالمانہ انداز میں ابتدا،
درمیان اور خاتمہ یا دلائل اور نتائج کا خیال رکھ کر لکھے
جاتے ہیں کیونکہ ان میں لکھنے والے کے مزاج کی فطری
صلاحیتیں منطقی استدلال کی پابند ہو کر دوسروں کے
دلائل اور نتائج کو سامنے رکھ کر ایک خاص ہی شکل میں
ظاہر ہوتی ہیں۔ ان میں لکھنے والے کی ذہانت اُس
مستانہ روی کے لیے آزاد نہیں ہے جو انشائیوں میں
شگفتگی اور لطافت پیدا کرتی ہے"[۵]

عبدالحلیم شرر کے بعض مضامین (جیسے ایک ذرہ کی سرگزشت)
سجاد حیدر کا مضمون "مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ" خواجہ
حسن نظامی کے مضامین جیسے مچھر، دیا سلائی وغیرہ، رحمت
اللہ بیگ کی کاوشات" نذیر احمد کی کہانی" اور "پھول والوں
کی سیر"۔ (خارجی مسائل و واقعات کی موجودگی نظر انداز
کرتے ہوئے) اور مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط غبار خاطر
کے بعض حصے (جیسے چڑیوں کے سلسلے کا مضمون) مضامین
پطرس، مضامین رشید احمد صدیقی اور کنھیا لال کپور کی
تحریریں اردو انشائیہ کے ارتقا کی اہم کڑیاں ہیں۔

اردو میں انشائیہ کے رواج پانے کا زمانہ اقدار کے
تصادم اور زبردست ذہنی انقلاب کا زمانہ ہے۔ اس وقت
سرسید تحریک کے زیر اثر بنیادی ضرورت قوم کی اصلاح
تھی اور اس کے اندر خود اعتمادی، دور بینی، وسیع النظری
اور روشن خیالی عام کرنا ضروری تھا۔ اردو نثر کے اس
عہد زریں میں سب سے زیادہ زور اصلاحی کاموں اور قومی
و ملی مفاد کے تحت با مقصد ادب کی تیاری پر دیا گیا۔ ظاہر
ہے کہ اس طرح کے ادب کے دائرے میں "انشائیہ" کا وجود
اور عدم برابر تھا۔ غالباً اسی لیے سید احتشام حسین کا خیال
ہے کہ :۔

"اردو انشائیہ کی خوش قسمتی کہیے یا بدقسمتی اس کا وجود
اس وقت ہوا جب مقصدیت ادب اور شاعری کا جزو بن
چکی تھی اور پہلے سے اس کی کوئی روایت موجود نہیں تھی۔
اس لیے انشائیہ اپنے سارے امکانات کی نمائش نہیں کر سکا"[۶]

انشائیہ نگاری کی نشو و نما اور ترقی کا ذکر کرتے ہوئے
کرشن چندر کے تخلیقی ذہن کی یادگار "ہوائی قلعے" کو نظر انداز
نہیں کیا جا سکتا جس میں انشائیہ کے اچھے نمونے ملتے ہیں۔
"رونا" کے عنوان سے کرشن چندر کے ایک انشائیہ کا یہ اقتباس
ملاحظہ فرمائیے :۔

"رونا ایک فن ہے۔ رونا ایک ورزش ہے۔ رونا
ایک آرٹ ہے۔ موخر الذکر کو بچوں اور عورتوں نے خوب
سمجھا ہے اور اپنایا ہے ___ رونے کے آرٹ کو اگر دنیا
میں کسی نے بہترین صورت میں پیش کیا ہے تو وہ عورت ہے
عورت کے رونے نے ملکوں اور قوموں کی تاریخ میں انقلاب
پیدا کر دیے ہیں۔ ایک قلوپطرہ، ایک ہیلن، ایک مسز سمپسن
___ آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھوں سے تیکھی نگاہ! شاید
آج دنیا کی تاریخ مختلف ہوتی، اگر تاریخ کے ہر صفحہ پر
کسی عورت کے دو چار آنسو نہ ٹپک پڑتے۔ یوں بھی عورت
کے آنسوؤں کی بدولت کروڑوں گھروں میں ہر ساتویں دن
ایک معاشرتی انقلاب آ جاتا ہے"۔

ہندو پاک کے نئے لکھنے والوں میں جنھوں نے صنف انشائیہ
کو آگے بڑھانے میں قابل قدر حصہ لیا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا،
امجد حسین، مشتاق احمد کوثر چاندپوری، نریندر لوتھر، یوسف
ناظم، خواجہ عبدالغفور اور نظیر صدیقی وغیرہ کے نام شامل فہرست
ہیں۔ نظیر صدیقی کے انشائیوں کا مجموعہ "شہرت کی خاطر"
بہت مقبول ہوا ہے۔ ان کے چند انشائیے "پدرم فقیر بود"
شہرت کی خاطر، آزاد بحث اور شرافت، اور یہ انسان
انشائیوں کے سخت سے سخت انتخاب میں جگہ پا سکتے
ہیں۔ "یہ انسان" میں نظیر صدیقی کا انداز اور پیرایہ اظہار
ملاحظہ کیجیے :۔

"مجھے ٹھیک نہیں معلوم کہ انسان حضرت آدم کے

خاندان سے ہے یا بندر کی نسل سے، لیکن کچھ ایسا محسوس ہوتا کرتا ہوں کہ اگر انسان بندر کی نسل سے نہیں ہے تو شاید یہ بات انسان کے لیے اتنی باعثِ فخر نہیں جتنا بندر کے لیے ؟

ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیے اس صنفِ ادب کی تمام شرائط اور لوازمات کو پورا کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کے یہاں "غیر رسمی طریق کار" "عدم تکمیل کی خصوصیت" اور موضوع و نقطۂ نظر کا وہ "انوکھا پن" ملتا ہے جو کامیاب انشائیہ نگاری کے بنیادی پتھر ہیں۔ ان کے انشائیوں کا مجموعہ "خیال پارے" پر خلیل الرحمٰن اعظمی کا یہ تبصرہ بہت صحیح ہے کہ :۔

"خیال پارے اِن کا ایک ایسا کارنامہ ہے جس میں ان کی انفرادیت نمایاں طور پر ابھر کر سامنے آئی ہے ان کی شاعری اور تنقید معرضِ بحث میں آسکتی ہے لیکن انشائیہ نگاری کے باب میں ان کی خدمات کا منکر شاید ہی کوئی ہو"۔[8]

غرض کہ اردو میں انشائیہ نگاری کا مستقبل بہت روشن اور تابناک نظر آرہا ہے کیونکہ اسے ایک الگ صنفِ ادب کی حیثیت ملنے کی وجہ سے اس کی قدر و منزلت بڑھتی جارہی ہے۔

★

[1] مضامینِ نو۔ از خلیل الرحمٰن اعظمی۔ صفحہ ۱۶۴ و ۱۶۵

[2] انشائیہ کیا ہے ؟ نگارشاتِ ادب، مرتبہ تنویر الدین احمد علوی صفحہ ۲۰۳، ۲۰۴۔ (از وزیر آغا)

[3] نگارشاتِ ادب (انشائیہ کیا ہے ؟ از وزیر آغا) صفحہ ۲۰۵۔ ۲۰۶

[4] " " " " " ۲۰۸، ۲۰۹

[5] افکار و مسائل۔ از سید احتشام حسین۔ ۱۳۴ و ۱۳۵

[6] افکار و مسائل۔ از سید احتشام حسین۔ صفحہ ۱۳۶

[7] مضامینِ نو۔ از خلیل الرحمٰن اعظمی۔ صفحہ ۱۶۷

ڈاکٹر سلطانہ عباسی
۵، موتی لال بوس روڈ
نیا گاؤں۔ ویسٹ
لکھنؤ

رنگوں کا تیوہار

سکھی ری مت چھوڑو رنگ کی دھار
جب سے بسنتی رُت آئی ہے کیسر کی بھرمار
پیلا کرتا، پیلی ٹوپی اور پیلی شلوار
پریم سندیسہ لے کر آیا رنگوں کا تیوہار
سکھی ری مت چھوڑو رنگ کی دھار

اب کی ایسا رنگ چلا ہے رنگ گئے ارمان
پیار محبت کی پچکاری موسم کی مسکان
کرتا رنگ گیا، چولی رنگ گئی رنگ گئی دستار
سکھی ری مت چھوڑو رنگ کی دھار

ہر چہرے کی رنگت بدلی ہے آج اپنے آپ
کالے، پیلے، نیلے رنگوں کا ہے رنگ ملاپ
غول حسینوں کے نکلے ہیں آج سر بازار
سکھی ری مت چھوڑو رنگ کی دھار

جھرمٹ کے جھرمٹ نکلے ہیں گاتے ہولی گان
رنگ، عبیر، گلال، الاچی، خوشبو، عطر اور پان
جیسے دھرتی پر اترے ہوں رنگوں کے اوتار
سکھی ری مت چھوڑو رنگ کی دھار

شہروں شہروں پیار کے نغمے لہرے بستی بستی
ہولی ساتھ میں لے کر آئی سرشاری اور مستی
چھلک رہا ہے ہر نگری میں امن خلوص اور پیار
سکھی ری مت چھوڑو رنگ کی دھار

تجھ بن پیارے اپنی ہولی پھیکی اور بے رنگ
بالکل بے آواز ہیں ڈھولک، تاشے اور مردنگ
رنگ تجھ سے رنگ محل تک رنگوں کی بوچھار
سکھی ری مت چھوڑو رنگ کی دھار

اظہر علی فاروقی
۸۴۸ - دریا آباد
الہ آباد-۳

چندے والے حکیم

بات ۱۹۱۸ء کی ہے جب میں بارہ تیرہ برس کا ایک لڑکا گورنمنٹ ہائی اسکول ہردوئی میں چھٹے درجے میں پڑھتا تھا اور اشراف ٹولے میں رہتا تھا۔ اس وقت پہلے پہل یہ بول مجھے سنائی دیتے " چندے والے حکیم "۔

جب کبھی میں اسکول جاتا تو چھاپہ خانے کی گڑگڑاہٹ بھی سنائی دیتی اور ایک معمر شخص کو کبھی بیٹھے اور کبھی لیٹے ہوئے بھی دیکھتا۔ توانا، تندرست، گرانڈیل سفید داڑھی، صاف ستھرا رنگ، چہرہ اتنا رعب دار کہ بغیر ان کے بلائے ہوئے پاس جانے کی ہمت نہ ہوتی اور یہی تھے وہ چندے والے حکیم اور ان کا پریس مرقع عالم۔ جہاں کتابیں چھپتی تھیں۔

وہ بحثیں بھی کچھ کچھ یاد ہیں جب میں آٹھویں درجے میں تھا جو حافظ شفیق اللہ عطار کی دکان پر شام کے وقت دو یاروں میں ہوا کرتیں اور میں ذرا ہٹ کر دور سے سنا کرتا۔ بحثیں زیادہ تر مولانا عبدالحلیم شرر اور چندے والے حکیم کے ناولوں کی منظر نگاری پر ہوا کرتیں اور بحث کرنے والوں کے حافظے کی آج داد دینا پڑتی ہے کہ وہ اختر و حسینہ، رام پیاری اور جعفر و عباسہ اور جان ہنوریا۔ فردوس بریں اور دلچسپ وغیرہ کے پیراگراف فرفر زبانی بطور ثبوت پیش کرتے رہتے۔ وقت وہ تھا جب چندے والے حکیم کی شہرت اور ناموری کا شور تھا اور انھیں ہر لحاظ سے مولانا شرر کا ہم پلّہ اور ہم سر سمجھا جاتا تھا۔ مقلّد اور پیرو کار نہیں.....

پھر وہ وقت آیا جب میں پڑھ پڑھا کر بنارس میں اردو اور فارسی کا لکچرر ہو گیا۔ اس وقت اردو کی درسی کتابیں دیکھنے کا بغور اتفاق ہوا اور یہ دیکھ کر تعجب کے ساتھ ساتھ افسوس بھی ہوا کہ چندے والے حکیم کا کوئی مضمون یا ناول سے کوئی اقتباس کسی کتاب میں نہیں ہے۔ جب کہ کوئی ایسی درسی کتاب نہیں ہے جس میں مولانا شرر کا کوئی نہ کوئی مضمون موجود نہ ہو۔

اردو ادب کی تاریخوں میں ناول نگاری کے ضمن میں ان کا نام ضرور نظر آجاتا ہے اور وہ بھی محمد علی طبیب اور حالات محض پانچ سات سطروں سے زیادہ نہیں اور مولانا شرر کا مقلد۔ اب سمجھ لیجئے کہ محمد علی طبیب ہی چندے والے حکیم ہیں...

اتفاق کی بات کہ ۱۹۷۶ء میں ہردوئی میں قیام کے دوران ایک دن اس سڑک سے گزرا جہاں چھاپہ خانے کی گڑگڑاہٹ ہوا کرتی تھی۔ بیتے دنوں کی یاد نے ایک عجیب المناک جذبہ پیدا کر دیا اور سرراہ گزرنے والے ایک معمر دراز ریش پڑھے لکھے صاحب سے پوچھا "چندے والے حکیم کے وہاں کوئی ہے؟" انھوں نے بڑے غور سے گھورتے ہوئے مجھے جواب دیا۔ "سب کچھ فروخت ہو گیا۔ بجن بی بی سامنے والے مکان میں رہتی ہیں اور بس۔" یہ بھی ایک سوئے اتفاق ہے کہ اب ہردوئی میں ایسے لوگ شاذ و نادر ہی ملتے ہیں جو حکیم صاحب موصوف کے حالات تو کیا نام سے بھی واقف

ہوں۔ اتنی بات ضرور ہے کہ جو دو چار ملے وہ ان کے حسن اخلاق برادرانہ ہمدردی اور سماجی کاموں میں ان کے تعاون کے بے پناہ مداح ہیں۔

(۲)

میں بذات خود بدشواری تمام چندے والے حکیم کہیے یا محمد علی طبیب ان کی دوسری اہلیہ محترمہ سے مل سکا جن کی عمر تقریباً ستر سال کی ہوگی۔ قدیم وضع کی پابند ایک پردہ نشین خاتون، خاندانی روایات کا لحاظ پھر فریضہ حج بھی ادا کر چکی ہیں۔ بے حد خوش اخلاق اور متواضع خاتون ہیں۔ میرے بے حد اصرار (بلکہ خوشامد کہنا چاہیے) پر اپنا نام مشتری خاتون بتایا اور یہ کہ انکی شادی ۱۹۱۸ء میں ہوئی۔ جب حکیم صاحب سن کہولت سے بھی بہت آگے بڑھ چکے تھے اور ۱۹۲۱ء میں انتقال کے وقت ان کی عمر کوئی ساٹھ اکسٹھ سال کی ہوگی۔

اس حساب سے ان کا سن ولادت ۱۸۶۰ء کے لگ بھگ ٹھہرتا ہے اور یہی سن مولانا شرر کی ولادت کا ہے۔ وہ محلہ جلال نگر شاہجہانپور میں پیدا ہوئے۔ ان کے خاندان کا شمار ان معزز پٹھان خاندانوں میں سے ہے جن کا رشتہ براہ راست افغانستان کے شریف اور باوقار افغانوں سے رہا ہے۔

ان کے والد بزرگوار احمد علی خاں صاحب تحصیلدار تھے حکیم صاحب موصوف کی تعلیم و تربیت روایات وقت کے مطابق گھر سے عربی مدرسہ محلہ جنگلا شاہجہاں پور اور طب کی لکھنؤ تک ہوئی۔ تحصیلدار صاحب موصوف ریٹائر ہونے کے وقت تحصیل شاہ آباد ضلع ہردوئی میں تحصیلدار تھے۔ انھیں اس سرزمین میں کچھ ایسی کشش محسوس ہوئی کہ اسی کو اپنا وطن ثانی بنا لیا اور اور اشراف ٹولہ میں قیام پذیر ہو گئے۔ کچھ سال پرائیوٹ مطب کرنے کے بعد ۱۸۸۵ء میں حکیم صاحب موصوف سرکاری یونانی شفاخانے میں ایک طبیب کی حیثیت سے ملازم ہو گئے اور اسی وجہ سے رفتہ رفتہ عوام خصوصاً طبقہ نسواں میں چندے والے حکیم کے نام سے مشہور ہو گئے اور مورخین اردو زبان نے حکیم کے سابقے کی جگہ ان کے نام کے ساتھ طبیب کا لاحقہ لگا دیا۔ ۱۸۹۹ء میں برٹش گورنمنٹ کی طرف سے آنریری مجسٹریٹ مقرر ہوئے۔ اور یہ اعزاز مرتے دم تک قائم رہا۔

بتایا جاتا ہے کہ حکیم صاحب موصوف کثیرالاولاد تھے اور سب اولادیں پہلی بیوی سے تھیں۔ لڑکیاں زیادہ اور لڑکے کم چنانچہ بیٹوں میں مصطفیٰ علی خاں ایک کامیاب ایڈوکیٹ رہے ہیں جنکے نام پر ایک شاندار عمارت مصطفیٰ منزل بنوائی۔ یہ عمارت چوراہا صدر بازار سے پہانی جانے والی سڑک پر واقع ہے اور آج وہاں ریڈیو، ٹیلی ویژن بکر تیا کا سائن بورڈ لگا ہے۔ مصطفیٰ علی خاں حب وطن کے جذبے کے تحت تحریک عدم تعاون میں شریک ہو کر ۱۹۲۱۔ ۲۲ء میں ڈیڑھ سال جیل میں رہے۔ جہاں ان کی صحت خراب ہو گئی اور ۱۹۲۴ء میں تپ دق کے مرض میں عین عالم شباب میں انتقال کیا۔ دوسرے بیٹے مجتبیٰ علی خاں کے بارے میں بتایا گیا کہ وہ ایک بے پروا، لاابالی قسم کے تعلیم یافتہ جوان تھے۔ بیٹریں اور تیتریا لنے سے لے کر سانپ اور بچھوؤں تک کے پکڑنے اور رکھنے کی ساری لتیں ان میں موجود تھیں۔ ۱۹۲۶ء میں ان کا بھی انتقال بھر پور جوانی میں ہوا۔ ان کے ایک نواسے محمد فہیم اردو میں ایم۔ اے ہیں اور محلہ ملکانہ بسنڈیلہ میں قیام ہے۔ حکیم صاحب موصوف کو دمہ کا مرض ہو گیا تھا اور ۱۹۲۱ء میں مرض استسقا (جلندھر) میں انتقال فرمایا۔ چالیسویں کے دن دوسری بیوی سے ایک لڑکی پیدا ہوئی جو صرف چند روز زندہ رہ کر انتقال کر گئی۔

(۳)

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ آج سے پچپن ساٹھ سال پیشتر محمد علی طبیب کی ناولوں کی بڑی شہرت اور دھوم دھام تھی اور ان کو مولانا شرر کا مد مقابل اور ہمسر سمجھا جاتا رہا اور ان بحثوں کی طرف بھی اشارہ کر چکے ہیں جو ان کے مداح کیا کرتے تھے۔ اسی بات کو آپ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کے لفظوں میں پڑھیے:۔

"وہ (مولانا شرر) اپنے پرچہ "دلگداز" میں ناولوں

پر ناولیں قسط وار نکالتے گئے اور مسلمانوں میں مقبول ہوتے گئے ہردوئی میں ان کے ایک مد مقابل حکیم محمد علی طبیب پیدا ہو گئے۔ جنہوں نے دلگداز کے مقابلہ میں مرقع عالم نکالا اور شرر کی ہر ناول کے مقابلہ میں اپنی ایک ناول پیش کرتے گئے۔ اردو ادب میں اس قسم کی معرکہ بندی تو ہمیشہ سے سزاوار رہی ہے۔ لہٰذا دونوں کے الگ الگ گروہ ہو گئے اور چوٹیں چلتی رہیں ....."

حکیم صاحب موصوف نے جو ناولیں لکھیں ان کی تعداد مولانا شرر سے بہت کم ہے۔ پھر بھی حسب ذیل ناولیں بہت مشہور ہوئیں!۔

عبرت ۔ ۱۸۹۲ء تین حصوں پر مشتمل جان اور رہنوریا کی محبت کا ایک دلچسپ تاریخی قصہ جو ۱۸۹۰، ۱۸۹۱ء، اور ۱۸۹۲ء میں جستہ جستہ مرقع عالم میں شائع ہوتا رہا۔

اختر و حسینہ ۱۸۹۶ء۔ دو حصوں پر مشتمل قصبہ سنبھل ضلع مرادآباد کے کسی خاندان کے ایک سچے واقعہ پر مبنی ناول

گورا ۔ ۱۸۹۶ء۔ ریواڑی ضلع گوڑگاؤں کے ایک سچے واقعہ پر مبنی اور یجنل ناول۔

نیل کا سانپ ۔ ۱۸۹۷ء ۔ انتھونی اور کلوپیٹرا کی حسرت بھری محبت کی داستان کا اردو ایڈیشن سمجھئے۔

جعفر و عباسہ ۔ ۱۹۰۱ء ۔ کئی حصوں پر مشتمل ایک طویل اور بہت مشہور ناول۔ خلیفہ ہارون رشید کے زمانے کا ایک المناک واقعہ۔

دیول دیوی ۔ ۱۹۱۹ء۔ پہلا حصہ حکیم صاحب نے خود لکھا اور دوسرا حصہ ۱۹۲۲ء میں ان کے بیٹے مصطفےٰ علی خاں نے اپنی علالت کے باوجود مکمل کیا۔

رام پیاری اور حسن سرور بھی ان کے ناول ہیں جو بہت کمیاب ہیں۔ ان ناولوں کے علاوہ مسیحائے عالم، بستان المفردات کے مثل مختصر سی میٹرا میڈیکا سمجھیے۔ جس میں روزمرہ استعمال میں آنے والے پھلوں اور سبزیوں کے افعال و خواص، فوائد و نقصانات درج ہیں۔

موصوف کی یہ تمام کتابیں نہایت معمولی کتابت، معمولی کاغذ اور گیٹ اپ کے ساتھ لیتھوگرافی پر شائع ہوئیں اور ان کے انتقال کے بعد بھی اکرام اللہ خاں صاحب کے زیر اہتمام مرقع عالم اور رفیق عالم پریس بھی چلتے رہے اور کتابیں بھی چھپتی رہیں مگر اسی طرح معمولی طور پر تاجرانہ انداز میں۔

آج ان کی کتابوں کا ملنا نہ صرف دشوار بلکہ ناممکن سا ہے اور جہاں کہیں مل بھی جاتی ہیں تو یوں سمجھ لیجیے جیسے تپ دق کا تیسرے درجے تک پہنچا ہوا مریض ہو۔ بالکل خستہ حال اور کسی کسی کے تو شروع کے صفحات غائب یا آخر کے۔ بعض جگہ یہ ہدایت بھی لکھی ملی ہے۔:

" برائے مہربانی ورق نہ موڑیے۔"

(۴)

مرقع عالم ۔ مولانا شرر نے اپنا دلگداز ۱۸۸۷ء میں اس وقت نکالا جب وہ ایک انشاء نگار صحافی کی حیثیت سے نہ صرف تجربہ کار بن چکے تھے بلکہ آل انڈیا شہرت بھی حاصل کر چکے تھے۔ حکیم صاحب موصوف نے مرقع عالم ۱۸۸۹ء میں اس وقت نکالا جب وہ نبض اور قارورے کے جھمیلوں میں پھنسے ہوئے تھے اور ان کا یہ صحافی ملکہ حالات کی ناسازگاری سے دبا رہا جو قدرت نے انھیں ودیعت کیا تھا۔ اسی نام سے ایک پریس بھی قائم کیا۔

ہمیں اس کا ایک نسخہ محمڈن یونین کلب ہردوئی کی لائبریری سے دستیاب ہوا جس کا نمبر ۲۵۳ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف ۶۰۰ چھپتا تھا اور قیمت صرف دو آنے تھی۔ ڈیمائی سائز کے سولہ صفحات پر مشتمل صرف ایک تاریخی مضمون اہرام مصری ہے۔ اس پر نام کے ساتھ طبیب میونسپلٹی بھی لکھا ہے۔ مضمون قابل قدر اور معلوماتی ہے۔ ۱۸۹۸ء کے ایک شمارے میں حکیم صاحب موصوف کا لکھا ہوا ایک مضمون بیت المقدس

ہے جو ۲، تا ۵۰ صفحات پر مشتمل ایک طویل مضمون ہونے کے باوجود بیان مضامین کا ایک دلچسپ اور خوبصورت نمونہ ہے۔ مضمون کے سلسلے میں بیان کی ہوئی عمارتوں کے معمولی دستی خاکے بھی دیئے گئے ہیں، جو عصر حاضر میں بے وقعت سے نظر آتے ہیں مگر اس وقت کے لحاظ سے ضرور اچھے ثابت ہوئے ہوں گے۔ مضمون کافی معلوماتی مواد کا حامل ہے، جو اُس وقت کے صحافیوں کے پیش نظر ایک اصول سا بن چکا تھا کہ قارئین کو اسلامیت کے بارے میں معلومات بہم پہنچائی جائے۔

۱۸۹۶ء کے ایک شمارے سے معلوم ہوتا ہے کہ حکیم صاحب موصوف کا ناول "نیل کا سانپ" جستہ جستہ اسی سال چھپ رہا تھا اور ختم بھی اسی سال ہوا اور "گورا" شروع کر دی گئی۔ ناول کے ابواب سے جب کچھ حصہ بچ جاتا تو اس میں کوئی مضمون شامل کر دیا جاتا۔ اس طرح اس رسالے کو ناولوں کا رسالہ سمجھنا چاہیے۔ ناقدین ادب کا عام خیال ہے کہ یہ رسالہ "دلگداز" کی تقلید میں نکالا گیا اور یہ خیال غالبًا اس لیے وجود میں آیا کہ "مرقع عالم" "دلگداز" سے دو سال بعد نکالا گیا۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ انھوں نے اپنے ناولوں کی اشاعت کا ایک آلۂ کار بنانا چاہا۔ ویسے تو اس کے بارے میں منشی سید اکبر علی فیروز آباد ضلع آگرہ نے ۱۸۹۸ء کے ایک شمارے میں صفحہ ۸۶، ۸۷ پر اس طرح لکھا ہے:

.... اس میں سائنس اور جدیدہ علمی تحقیقات اس طرح کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے ہیں جس طرح حسینوں کی آنکھوں میں شوخی، شرارت، حیا، اور جادو۔ اس کے مضامین نگار بہت اعلیٰ درجے کے لائق و فائق لوگ ہیں شمس العلماء مولوی محمد ذکاء اللہ خاں بہادر کا "نیچر" کی سرخی سے جو مضمون ہے اپنے رنگ ڈھنگ میں نہایت ہی اچھا اور بے مثل ہے۔ گویا مولوی صاحب موصوف نے یہ مضمون لکھ کر آج کے جادو نگاروں کو اس امر کا سبق دیا ہے کہ اگر علمی مضامین لکھو (اور ضرور لکھو) تو اس طرح نمک مرچ لگا کر لکھو......"

اس میں شک نہیں کہ شمس العلماء موصوف ایک بلند مرتبت دانشور اور بلند پایہ ادیب تھے لیکن کسی رسالے کی اہمیت اور معیار کا اندازہ صرف ایک قلم کار کی اعلیٰ حیثیت سے نہیں لگایا جا سکتا اور اس میں بھی شک نہیں کہ اگر ہم "مرقع عالم" اور "دلگداز" کی فائلیں برابر برابر رکھیں تو اندازہ ہوگا کہ "مرقع عالم" کے مضامین خواہ وہ کسی قسم کے ہوں نہ صرف اعداد و شمار میں بلکہ پیرایۂ بیان اور دلفریبی میں اس معیار تک نہیں پہنچ پاتے جس حد تک "دلگداز" کے مضامین پہنچ چکے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی سمجھ لیجیے کہ خود حکیم صاحب موصوف کے وہ بیانی مضامین خصوصًا منظریہ اور فضائیہ بیانات جو انھوں نے خود لکھے ہیں مولانا شرر کے مضامین سے کسی طرح کم درجے کے نہیں ہیں اور اس درجہ مماثلت رکھتے ہیں کہ ایک پر دوسرے کا دھوکا ہونے لگتا ہے۔ "دلگداز" کے مضامین خود مولانا شرر لکھتے رہے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان میں بے پناہ تنوع ہے۔ جغرافیہ اور تاریخ سے لے کر فنون لطیفہ میں موسیقی، رقص، سنگ تراشی تک ایجادات اور اختراعات کی کہانیوں سے لے کر مذہبیات کے ادق موضوعات تک اتنی کثرت سے مضامین ہیں کہ گیارہ بارہ جلدوں میں الگ الگ موضوعات پر کتابی صورت میں دستیاب ہیں اور یہ بات حکیم صاحب موصوف کے یہاں نہیں پائی جاتی صرف اس لیے کہ مولانا شرر اور ان کے ماحول اور علمی اہلیت اور مطالعہ کی وسعت میں جو فرق تھا وہ صاف ظاہر ہے۔ جہاں تک اسلوب نگارش کا تعلق ہے، ہم دونوں کو ایک دوسرے کا ہمسر ضرور ٹھہرا سکتے ہیں اور اسی لیے حکیم صاحب موصوف کے جتنے کچھ بھی مضامین ملتے ہیں آج بھی ہمارے لیے قابل قدر ہیں اور قدیم تاریخ اسلام اور اسلامی مقامات پر کافی روشنی ڈالتے ہیں۔

(۵)

ان کے ناول پلاٹ کی تکنیکی ہیئت کے لحاظ سے سادہ ہیں اور واقعات میں وہ پیچیدگی نہیں ہے جو زِگ زیگ یا پیچیدہ پلاٹوں میں ہوا کرتی ہے۔ اس سادگی کے باوجود [illegible]ات کو ایکسپوزیشن یا انکشاف تک پہنچتے پہنچتے قاری کو چند الجھنوں سے دوچار ضرور ہونا پڑتا ہے جو ناول نگار افراد قصہ کی باہمی سازشوں اور غلط فہمیوں سے پیدا کرا دیتا ہے اور قاری کے لیے ایک استعجابی کیفیت

پیدا کرا دیتا ہے اگرچہ یہی کیفیت قاری کے دل میں یہ خواہش بھی پیدا کر دیتی ہے کہ دیکھیں آگے ہوتا کیا ہے اور وہ اسی جستجو میں ناول پڑھنے میں خاصی دلچسپی لینے لگتا ہے اور اکتاہٹ محسوس نہیں کرتا۔

اختر و حسینہ میں غلط فہمی اور سازش کی بدولت یہ کیفیت اس طرح پیدا ہوتی ہے کہ اختر اور حسینہ ایک دوسرے کی محبت میں بری طرح مبتلا ہیں اور محبت کی اس آگ سے بچانے کے لیے اختر کے والد میر جعفر حسین اس کی شادی کر دیتے ہیں (اگرچہ اختر کی مرضی کے خلاف) اب چاہیے تو یہ تھا کہ بات جہاں تھی وہیں ختم ہو جاتی مگر ہوا یہ کہ ایک دن حسینہ کے دو بھائی کرار اور انصار اختر سے ملنے آئے۔ خاطر و مدارت کے سلسلے میں اندر سے چائے بن کر آئی اور سوئے اتفاق کہ چائے پیتے ہی اختر کو قے پر قے ہونے لگی اور اسے یہ شبہ ہوا کہ اس کی بیوی کی شرارت ہے اور دو ایک لوگوں کے بہکانے سے اختر کو یقین ہو گیا کہ اس کی بیوی نے کوئی زہریلی چیز ملا دی ہے اب کیا تھا۔ اختر اس درجہ مغلوب الغضب ہو گیا کہ بیوی کو طلاق دے دی۔ اس طرح غلط فہمی کی بدولت پلاٹ آگے بڑھنے کو تیار ہو جاتا ہے اور ناول نگار قاری کی دلچسپی میں تیزی پیدا کر دیتا ہے۔

اسی قسم کی سازشیں کئی مقامات پر اپنا اپنا کام کرتی رہتی ہیں اور سب سے زیادہ کامیاب سازش وہ رہتی ہے جو مہدی حسن نے حسینہ پر بہتان لگا کر اختر کا دل اس کی طرف سے پھیر دیا اور وہ خود کلامی میں حسینہ کو نہ جانے کیا کیا کہہ جاتا ہے مگر اس آگ پر اختر و حسینہ کی ایک معتمد ہمراز عورت محمدی خانم پانی ڈالتی ہے اور معاملہ رفع دفع ہو جاتا ہے۔ ایسی ہی سازشی حالتیں "گورا" اور "دیول دیوی" میں بھی پیش آتی ہیں۔ غرضیکہ پلاٹ سادہ اور سپاٹ ہونے کے باوجود سازشوں اور غلط فہمیوں کی بدولت ہچکولے کھاتے ہوئے نشیب و فراز کی منزلیں طے کرتے انکشاف اور خاتمے تک پہنچتے ہیں۔

تکنیکی نقطۂ نظر سے پلاٹوں میں وہ تمام کمزوریاں پائی جاتی ہیں جو اس وقت کے اکثر ناول نگاروں کے یہاں ملتی ہیں اور اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اس حیثیت سے ان کے پلاٹ مولانا شرر کے ناولوں کے پلاٹ سے کچھ آگے نہ بڑھ سکے۔

نفسیاتی نقطۂ نظر سے بھی بعض کردار بہت کمزور اور غیر فطری سے نظر آتے ہیں۔ بارہ تیرہ سال کا لڑکا اختر حسین دس سال کی لڑکی حسینہ سے پہلی نظر میں محبت کرنے لگتا ہے اور لڑکی بھی اس پر فریفتہ ہو جاتی ہے اور واقعہ خواہ کتنا ہی حقیقی کیوں نہ ہو پھر بھی لائق قبول نظر نہیں آتا۔

(۶)

موضوع کے لحاظ سے ان کے ناول اس وقت کے روایاتی مسائل پر مشتمل ہیں، ان کا تعلق خواہ سماجی رسم و رواج سے ہو یا کسی مذہبیات سے یا تعلیمات سے ہو یا کسی دوسری اقدار حیات سے۔ ایک اور موضوع جو ان سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ ہے ماضی کی شاندار اسلامی روایات کا دہرانا: در کم سواد مسلمانوں میں خفتہ جوش کا بیدار کرنا۔

ان کے دو ناول "اختر و حسینہ" اور "گورا" متوسط طبقے کی گھریلو زندگیوں کے ترجمان ہیں۔ جن کے بارے میں ناول نگار کا فرمانا ہے کہ وہ علی الترتیب سنبھل ضلع مراد آباد کے ایک مسلمان خاندان اور ریواڑی ضلع گوڑگاؤں کے ایک ہندو خاندان کی معاشرت کے حقیقی واقعات پر مبنی ہیں۔

خاندانی زندگیوں اور معاشرت پر اس سے پیشتر دو ناول "بنات النعش" اور "مراۃ العروس" ڈاکٹر نذیر احمد لکھ چکے تھے۔ جو نہ صرف بلند پایہ قصے کہے جا سکتے ہیں بلکہ ان کی مقبولیت اور پسندیدگی کا یہ عالم رہا ہے کہ شاید ہی کوئی ایسا اردو داں خاندان ہو جو اصغری اور اکبری کے نام سے واقف نہ ہو۔ انگریزی میں رچرڈسن (RICHARDSON) کا ناول پامیلا (PAMELA) اور جین آسٹن (JANE AUSTEN) کے کئی ناول گھریلو زندگیوں کے بہترین نمونے ثابت ہو چکے تھے۔ ایسی حالت میں ناول نگار کسی ایک یا دو خاندانوں کی خانگی زندگیوں کی ترجمانی کرتا ہے۔ صاف ظاہر

ہے کہ خاندانوں کے معاشرتی حالات بہت کچھ غیر دلچسپ اور بے لطف سے ہوتے ہیں مگر ناول نگار اپنی فنکارانہ صلاحیت اور فہم و دانش کے سہارے انھیں دلچسپ اور پر لطف بنا دیتا ہے۔

حکیم محمد علی نے "اختر و حسینہ" میں میر جعفر حسین اور میر باقر حسین کے دو خاندانوں کی روزانہ زندگیوں کے حالات پیش کیے ہیں اور بلاشبہ کامیاب ترجمانی کی ہے۔ انھوں نے سن رسیدہ خواتین، اختر حسین، احمد علی، انصار، حسینہ، حسن بانو جیسے نوجوان افراد، مہدی حسن جیسے اوباش، سید محمد ایرانی جیسے صوفی اور درویش اشخاص کے ذریعے متوسط طبقے کے خاندانوں کے معمولات زندگی کی عکاسی بڑی خوبصورتی سے کی ہے ۔ میر ذاکر حسین اور میر باقر حسین کی بیویوں کی باہمی گفتگو سے لڑکیوں کی تعلیم، سید محمد ایرانی اختر حسین اور حسن بانو کی ماں کی بات چیت سے عام لوگوں کی توہم پرستی وغیرہ کی ترجمانی دلچسپ انداز میں کی ہے۔ پھر بھی خانگی زندگی کے وہ نقوش اس خوبی سے اجاگر نہ ہو سکے جیسے کچھ اصغری اور حسن آرا، حضرت بی اور علیم و مرزا ظاہر دار بیگ اور کلیم کی بات چیت سے مراۃ العروس، بنات النعش اور توبۃ النصوح میں اجاگر ہوئے ہیں اور نہ افراد اختر و حسینہ اور گورا کو وہ زندگی نصیب ہوئی جو اصغری، اکبری کلیم اور ظاہر دار بیگ کو نصیب ہوئی۔

ایسے ناولوں میں ناول نگار اس عہد کی سوسائٹی کے مختلف طبقوں کے حالات بھی قاری کو بتانا چاہتا ہے اور اس کے لیے وہ دو ایک افراد قصہ کے سہارے چلتا ہے فسانہ آزاد میں پنڈت رتن ناتھ سرشار نے یہ کام آزاد اور خوجی کے سہارے کیا ہے یہ دونوں فرد قصہ کبھی ایک طبقے میں پہنچ جاتے ہیں اور کبھی دوسرے طبقے میں یہ کام اس طرح ہوتا ہے کہ یہ سب حالات قصے کے پلاٹ کا تانا بانا بن جاتے ہیں اور قاری محسوس نہیں کر پاتا۔

حکیم صاحب موصوف نے بھی اپنے ناولوں میں مختلف طبقوں کے حالات خوب صورتی سے پیش کیے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہاں فرد قصہ لاشعوری طور پر ایسا کرتا ہے۔ اختر و حسینہ میں یہ کام اختر حسین سے لیا گیا ہے کہ وہ یاس و حرماں کا اس بری طرح شکار بن جاتا ہے کہ لاشعوری طور پر اپنی سنک میں کبھی وہ ایرانی درویش کی تلاش میں سرگرداں پھرتا رہتا ہے اور اسے رہزنوں سے دوچار ہو جانا پڑتا ہے اور ان کے مل جانے پر ناول نگار طبقہ نسواں کی توہم پرستیاں اور درویشوں سے عقیدت مندی وغیرہ قاری کے سامنے رکھتا ہے۔ کبھی وہ کوہستانی صحرا میں پہنچ جاتا ہے اور پہاڑیوں کی زندگی کا تعارف کراتا ہے۔ حسن بانو جیسی ایک حسین اور خوبصورت لڑکی اختر کی مدد کرتی ہے اور پھر ناول نگار نسوانی فطرت کی ایک کمزوری قاری کو بتاتا ہے کہ وہ اختر کی محبت میں اچانک پھنس جاتی ہے اور ایسی ہی کیفیتیں جا بجا گورا میں بھی پائی جاتی ہیں۔

(۷)

"عبرت"، "نیل کا سانپ"، "جعفر و عباسہ" اور "دیول دیوی" کو موضوع کے لحاظ سے تاریخی ناولوں کے ضمن میں رکھا جاتا ہے۔ "عبرت" اور "نیل کا سانپ" کو انگریزی کا اردو ایڈیشن کہئے "جعفر و عباسہ" اور "دیول دیوی" کو کلی طور پر تو طبع زاد نہیں کہا جا سکتا پھر بھی ان کے قصوں کے پلاٹوں کو حکیم صاحب موصوف کی ذہنی اور دماغی اپج اور سوجھ بوجھ کا نتیجہ سمجھنا چاہئے۔

تاریخی ناولوں کا شمار ناول نویسی کی ایک نمایاں معیاری قسم میں کیا جاتا ہے۔ اور ناول نگار گردش ایام کو پیچھے موڑتا ہے اور اپنے قاری کو اس دور اور ماحول میں پہنچانا چاہتا ہے اور معاشرت کی وہ فضائیں اس کے سامنے لانا چاہتا ہے جن سے قاری یا تو بالکل نابلد ہے یا پھر اس کی معلومات بہت معمولی اور سطحی ہوتی ہیں۔

ایسی حالت میں ناول نگار کے لیے بہت ضروری ہے کہ وہ اس دور کا ماحول اپنے قاری کے سامنے بڑی ہوشیاری اور احتیاط سے پیش کرے اور اس قسم کی عکاسی کرنے میں وہ ملبوسات، مشروبات، آداب صحبت، زبان اور طرز کلام وغیرہ

رالیتا ہے اتنی بات ضرور ہے کہ ناول نگار کو اپنے تخئیل
لینے کا پورا پورا حق حاصل ہے اور یہ بھی ضروری نہیں ہے
اریخی واقعات کو من وعن اسی طرح بیان کرے
نخ کی کتابوں کے صفحات پر ثبت ہیں، وہ تاریخی ماٰنوں
ا تھ رومانی باتیں شامل کر سکتا ہے مگر اتنی تحریف نہ
ہے کہ واقعات کی صورت مسخ ہو جائے اور ان پر دور
ں ہونے کا شبہ پیدا ہو جائے اس لیے یہ ضروری ہے کہ ناول
کو اس ملک، قوم اور اس دور کی معاشرتی زندگی کی تفصیلی
ت کافی ہوں جس ملک، قوم اور دور سے وابستہ وہ ناول
ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ناول نگار کامیاب ہوتے ہیں
، اصول کی کسوٹی پر پورے اترتے ہیں۔ مثال کے طور پر
ی زبان کے ناول نویس سر والٹر اسکاٹ کو لیجئے۔ انھوں نے
ی اپنے ملک اسکاٹ لینڈ کی تاریخ اور اپنے عہد سے سو سوا سو
بیشتر عہد کے لکھے ہیں نہایت کامیاب اور حقیقی نظر آتے
ر جو ناول دوسرے ملکوں کی تاریخ اور معاشرت سے وابستہ
ں وہ اتنے حقیقی اور کامیاب ثابت نہیں ہوئے ویورلی
(HEART ہارٹ آف مڈلوتھین (WAVERLE
OF MIDLOTHIA کے مقابلے میں ٹیلسمان
(TALISMA) کو وہ مقبولیت اور حقیقی کامیابی نہیں
ی کا تعلق عربوں کی زندگی سے تھا جس سے وہ نہ تو اس
اقف تھے اور نہ مانوس جیسا کچھ اسکاٹ لینڈ کی تاریخ اور
ت سے۔ انھوں نے اپنے عمیق مطالعے اور گہرے مشاہدے
لت کلیور ہاؤس (CLEVER HOUSE) کوئن میری
(QUEEN MA) وغیرہ میں ایسی تاریخی حقیقتیں
شرتی کیفیتیں بیان کی ہیں جو تاریخ کے طالب علموں کے
کار آمد ہیں۔

ہمارے یہاں اردو میں بھی تاریخی ناول لکھے گئے اور مولانا
ررنے اس کی ابتدا کی وقت وہ تھا جب علی گڑھ تحریک
م کر رہی تھی اور مولانا حالی مسدس مد و جزر اسلام لکھ چکے
تھے اور مسلمانوں کی عظمت پاستان بتا کر بیداری اور جوش پیدا
کرنا چاہتے تھے بنگال میں ڈی۔ ایل رائے اپنے ڈراموں میں یہی
نظریہ پیش کر رہا تھا۔ ہندوؤں کی شان و عظمت کی یاد دلا کر انھیں
بیدار کرنا چاہتا تھا۔ مولانا شررنے مسلمانوں کی عظمت پارینہ
یاد دلا کر مسلمانوں میں نئی زندگی پیدا کرنا چاہی اور خفتہ جذبات
کو جگانا چاہا اور مسلمانوں کی شوکت پارینہ سے مواد تلاش کیا مگر
ہوا یہ کہ وہ اپنے ملک سے بہت دور دیس پہنچ گئے اور اپنے
عہد سے سینکڑوں سال بیشتر کے تاریخی افراد کو اپنے ناولوں
میں شامل کیا اور ان کی زندگیوں اور کارناموں پر اپنے ناولوں کی
بنیاد قائم کی۔ انھوں نے وہ دور اور افراد لیے جن کا تعلق عرب اور
عراق سے رہا ہے اور زمانہ بھی ساتویں، آٹھویں صدی کا، جو
ان کے زمانے سے ہزار بارہ سو بیشتر کا اور عجیب بات یہ ہوئی
کہ وہ ہندستان میں بیٹھ کر مجمل تاریخی کتابوں کے سہارے
مواد فراہم کرنے لگے ان کتابوں سے جو معاشرت سے زیادہ صرف
جنگوں کی فہرستوں پر مشتمل تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے ناول
ایسے پڑھنے والوں میں مقبول تو بہت ہوئے اور ہاتھوں ہاتھ
فروخت بھی ہوئے ہوں گے اور جن کے بارے میں علی عباس حسینی
نے یہ رائے دی ہے:

"مولانا کے نام نہاد تاریخی ناولوں سے لطف اندوز ہونے
کے لیے جاہلوں کے سے اعتقاد کی ضرورت ہے....."

اگر ہم اس رائے کو مبالغہ پر مبنی ہی کیوں نہ سمجھ لیں پھر بھی
اس میں تو ذرا بھی شبہ نہیں کہ اس وقت ناولوں کے قارئین
ایسے ضرور تھے جو الفاظ کی شعبدہ گری، مناظر کی حسین الفاظ اور
بندشوں میں تصویر کشی، واقعات میں نشیب و فراز اور مسلمانوں کی
شجاعت اور زور آوری کے دلدادہ ضرور تھے۔ وہ یہ نہیں
دیکھتے تھے کہ مٹھی بھر مسلمان عسکری لاکھوں عیسائی فوجیوں
کا آناً فاناً کس طرح صفایا کر سکتے ہیں؟ ایسا ہو بھی سکتا ہے یا
نہیں؟ انھیں اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ وہ تو صرف داد شجاعت
دینا جانتے تھے۔

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی یوم جمہوریہ کے موقع پر انڈیا گیٹ نئی دہلی میں شہیدوں کی یادگار پر شہدائے وطن کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے ۲۲ر فروری ۱۹۸۰ء کو راشٹرپتی بھون نئی دہلی میں بھوٹان کے شاہ عزت مآب جگمی سنگیے وانگ چک سے ملاقات کی

وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی کا ۲۱ر فروری کو کانپور ہوائی اڈہ پر خیر مقدم کیا جا رہا ہے۔ یہ تصویر اسی موقع کی ہے۔

وزیراعظم شریمتی
اندرا گاندھی ۲۱ر
فروری کو رائے بریلی
بھی تشریف لے گئیں
جہاں عوام نے ان
کا پرتپاک خیر مقدم
کیا

اتر پردیش کے نئے گورنر شری چندریشور پرشاد نرائن سنگھ کو راج بھون لکھنؤ میں ۲۰ر فروری کو الہ آباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس شری ستیش چندر حلف دلاتے ہوئے

راج بھون لکھنؤ میں ہولی کا ایک منظر۔ تصویر میں گورنر شری چندریشور پرشاد نرائن سنگھ بھی نظر آرہے ہیں
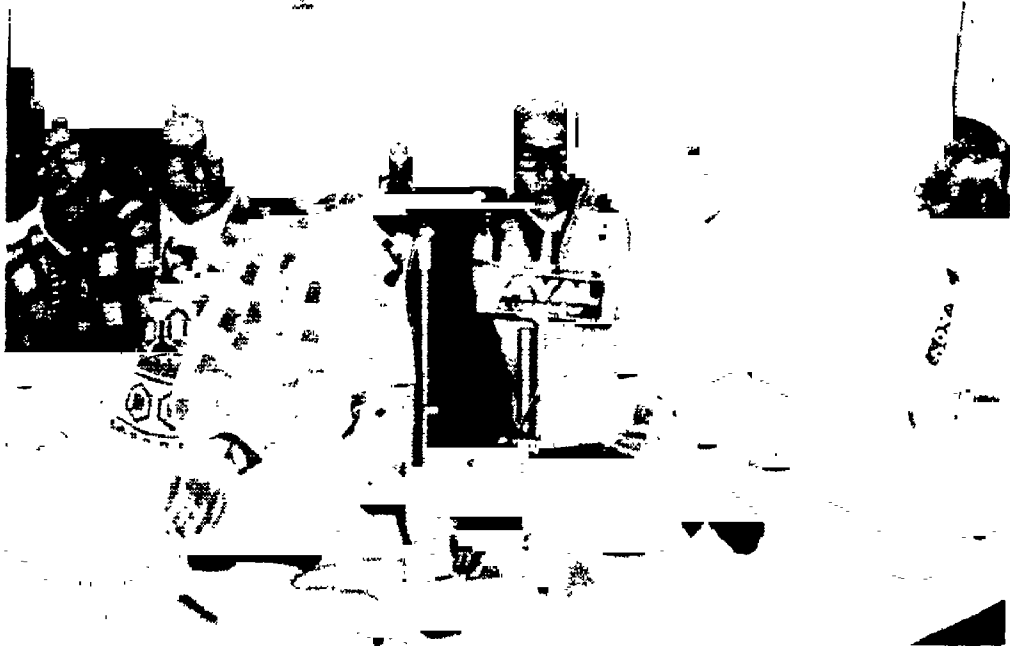
یوم جمہوریہ کی تقریبات کے موقع پر راج بھون لکھنؤ میں منعقدہ مشاعرہ/کوی سمیلن میں شرکت کرنیوالے بعض شعرا اور کوی۔ تصویر میں چندر پرکاش
ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد، شمشاد احمد خاں، ٹھاکر پرشاد سنگھ، خورشید افسر بسوانی اور کملا پتی سہائے ماہر بلگرامی وغیرہ نظر آرہے ہیں

سروجنی نائڈو کے صد سالہ جشن ولادت کے موقع پر ۱۲ فروری ۱۹۸۰ء کو محکمۂ قومی یک جہتی کی جانب سے محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش کے
زیر اہتمام راج بھون میں منعقدہ مشاعرے اور کوی سمیلن میں شریک بعض شعرا اور کچھ دیگر حضرات۔ اس تصویر میں (بائیں جانب سے)
راحت اندوری، ساحر لکھنوی، کرشن بہاری نور، خمار بارہ بنکوی، صباح الدین عمر، عمر انصاری اور محمد احمد خاں ادیب وغیرہ نظر آرہے
ہیں ــــ (تصویر بشکریہ شری عبد العزیز)

مولانا شررؔ نے سر والٹر اسکاٹ کے ناول طلسمان کے اثر قبول کیا اور "صلاح الدین" کے نام سے ایک ناول لکھا اور محمد علی طبیب نے "عبرت" کے نام سے دونوں کی اشاعت میں چند سال کا فرق ہے۔ یہ رائے بھی درست ہی معلوم ہوتی ہے کہ مولانا شررؔ اپنے ناولوں میں اُن افراد کو زندگی نہ بخش سکے۔ جن کے سہارے وہ مسلمانوں میں جوش و ولولہ پیدا کرنا چاہتے تھے اور اس معاشرتی ماحول کو زندہ کر دینا تو صرف اس لیے دشوار تھا کہ ہندستان میں بیٹھے بیٹھے ہزار بارہ سو سال پیچھے کے عرب ماحول کو نشاۃ ثانیہ عطا کرنا کس طرح ممکن تھا حکیم صاحب موصوف بھی جعفر و عباسہ میں یہ بات پیدا نہ کرسکے پھر بھی یہ بات تو مسلم ہے کہ ان کے ناول مستقبل کے ناولوں نگاروں میں تاریخی ناول لکھنے کا نہ صرف شدید جذبہ پیدا کرسکے بلکہ ان کے لیے رہنما بھی ثابت ہوئے۔ ایسے ہی تاریخی ناولوں نے عام مسلمانوں میں ناول پڑھنے کا رجحان پیدا کیا اور وہ ناول پڑھنے میں دلچسپی لینے لگے۔ حکیم صاحب موصوف کا یہ کمال کم نہ سمجھنا چاہیے کہ انھوں نے اپنے عہد کے اہم تقاضوں کو پورا کیا۔ انداز خواہ خود ان کا ہی کیوں نہ ہو جب کہ انداز کی یہ کمزوری تو ان کے بہت بعد تک کے ناول نگار دور نہ کرسکے اور ناول کو اس کا صحیح مقام نہ دے سکے۔ . . . .

ان کے ناول کے ضمنی موضوعات میں معاشرت، انگریزی تعلیم کی ضرورت، قدیم نصاب تعلیم میں ترمیم و اصلاح تعلیم نسواں اور اس کا معیار، بےپردگی، خانگی تربیت کی ضرورت اور اولاد پر اس کے اثرات عقد بیوگاں، روایاتی مذہبی رسومات اور معاشرتی مروجہ رسومات میں ترمیم اور اصلاح وغیرہ شمار کیے جاسکتے ہیں جو وقتاً فوقتاً افراد ناول کے مکالموں میں آتے رہے ہیں . . . .

کردار نگاری کے ضمن میں حکیم صاحب موصوف نے ان تمام روایاتی اصولوں سے کام لیا ہے جو عام طور پر برتے جاتے ہیں کلوپیٹرا، جان، ہنوریا، جعفر و عباسہ وغیرہ افراد غیر ملکی ہیں اور گوراحسینہ، دیول دیوی، اختر حسین مہدی حسن، وغیرہ ہندستانی ہیں جہاں متوسط طبقے کے سن رسیدہ مرد اور عورتیں، نوجوان لڑکے اور لڑکیاں، رازدارانہ طور پر تعلقات وابستہ کرنے والی محمدی خانم احمد علی جیسے ہمدرد دوست مہدی حسن جیسے فریب کار، اوباش، جاسوس، بہادر سپاہی وغیرہ سبھی موجود ہیں۔

بیانیہ طرز (DESCRIPTIVE METHOD) میں کردار نگاری کے چند نمونے ملاحظہ فرمایئے:

" . . . . . ایک حور وش لڑکی تخت کے شمالی گوشے پر بیٹھی ہوئی گلزار دبستاں پڑھ رہی ہے۔ سن نو دس برس سے زیادہ کا نہیں معلوم پڑتا۔ بہت کھلتا ہوا گیہواں رنگ رنگ میں بلا کا حسن، حسن میں غضب کی ملاحت سر سے پاؤں تک اعضا حسن کے سانچے میں ڈھلے ہوئے۔ بھولا بھالا منھ پیارا پیارا چہرہ، بھرے بھرے رخسار، نازک نازک ہونٹ اور دہن، حسینوں کی ہمت کی طرح تنگ، جس میں چھوٹے چھوٹے آبدار دانت ایسے معلوم ہوتے ہیں گویا موتیوں کی ایک لڑی بہت قاعدے کے ساتھ پھیلا کر رکھ دی گئی ہے . . . . . . آنکھیں بڑی بڑی ہیں جن میں دنبالہ دار سرمے کے ساتھ جادو بھی کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے آنکھوں کے ایک جگہ نہ ٹھہرنے والی نظر کی طرح نکلی ہوئی پلکوں کے ایک ایک بال پر ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر اتراتی ہوئی پھر رہی ہیں . . . ."

(اختر حسینہ حصہ اول صفحہ ۱۲، ۱۳)

"آنے والے شخص کی عمر تیس سال کے قریب تھی طرحدار جوان تھا اور سر سے پاؤں تک یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے اعضا قدرت نے حسن کے سانچے میں ڈھال دیئے ہیں اور اس کے متناسب اعضا نے ایک ایسی شکل و صورت عطا کر دی تھی کہ دیکھنے والے کی آنکھیں اس کو ایک بار دیکھ لینے کے بعد

ایک عرصے تک اس کے پھر دیکھنے کے لیے مشتاق رہتی ہیں۔ اس کی جلد بہت سرخ و سفید ہے۔ مگر آنکھوں میں وہ کرنجاپن نہیں جس نے مغربی حسن میں ایک عیب لگا دیا ہے اور نہ اس کے سر کے بالوں میں وہ بھوراپن ہی ہے جو گورے پنڈے پر اچھا نہیں کھلتا۔ وہ جولیس سیزر کا سچا دوست اور اس کا فوجی سپہ سالار انتونی تھا۔۔۔۔ (نیل کا سانپ باب ۱ صفحہ ۱۰-۱۱)

ملبوسات کے ذریعے کردار نگاری کے نمونے ملاحظہ فرمائیے:

"۔۔۔۔ ریشمی کپڑے کی سرخ کرتی پہنے ہوئے ہے جس کی آستینیں بھرے بھرے بازوؤں کو چھپائے ہوئے پہونچوں تک پہنچ گئی ہیں اور اس پر پیازی رنگ کی ایک باریک اوڑھنی اوڑھی گئی ہے جس کے چاروں طرف سنہرا لچکا اس کے گندمی رنگ کے لیے اور بھی سونے پر سہاگا ہو گیا ہے۔ نظر بد سے بچانے اور ننھے نازک دل کے کہیں نہ ڈر جانے کے لیے گلے میں لٹکے ہوئے تعویذ اس کے سینے پر پڑے لوٹ رہے ہیں اور سر کے گوندھے ہوئے لانبے لانبے بالوں کی چوٹی اوڑھنی کے اندر چھپی ہوئی نازک کمر کے سنبھالنے کے لئے کولھوں تک پہنچ گئی ہے۔ ناک میں سونے کی ایک ننھی سی نتھنی جس پر گنتی کا ایک ہی موتی پڑا ہوا ہے۔۔۔

(اختر و حسینہ حصہ اوّل صفحہ ۱۳)

ؔ — ؔ — ؔ

"۔۔۔۔ اختر کو جب ہم نے پہلے دیکھا تھا تو وہ کچھ کچھ انگریزی فیشن کا تھا مگر اس وقت ہم اس کو جس لباس میں دیکھ رہے ہیں وہ وہی ہے، جو پرانے خیالات کے آدمیوں کے جسم پر کچھ اچھا معلوم ہوتا ہے۔۔۔۔ سرخ اطلس کا پائجامہ ہے وہ بھی غرارے دار جس کے پائینچوں پر خیر سے لچکا بھی ٹکا ہوا ہے۔ زرد ساٹن کی اچکن زیب تن جس پر ہفت رنگی گوٹ اور گوٹ کے کنارے کنارے لچکا، اس کے شباب بھرے سن کے ساتھ کچھ عجیب عجیب شوخیاں کر رہا ہے۔۔۔۔ دیکھئے نا اس کے ہاتھوں میں رچی ہوئی مہندی اور حنائی ہاتھوں پر بندھا ہوا کنگنا بتا رہا ہے کہ یہ مانجھے کا جوڑا ہے۔"

(اختر و حسینہ حصہ اوّل صفحہ ۳۸-۳۹)

• ایک جاسوس سے ملئے جو جان اور ہنوریا کا پتہ لگانے بھیجا گیا تھا:

"۔۔۔۔ دیکھنے میں یہ شخص کسی قدر مسن معلوم ہوتا ہے لیکن نہ اس قدر کہ اعضا کی طاقت جوانی کا زمانہ بن کر نکل گئی ہو۔ اس کے سر کے سپید اور سیاہ کھچڑی بال بتا رہے ہیں کہ یہ دنیا کے گرم و سرد اچھی طرح دیکھے ہوئے ہے اور زمانے کے انقلابات نے اس کو بڑا تجربہ کار بنا دیا ہے۔

اس کے میلے اور گرد آلود چہرے اور لباس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دنیا کی نرم اور سخت زمینوں کو طے کرتا ہوا ابھی کہیں سے چلا آتا ہے۔ اسی کے ساتھ قیافہ بھی بتا رہا ہے کہ یقیناً یہ شخص بہت خبیث اور چالاک ہو گا۔۔۔"

(عبرت حصہ سوم باب ۵ صفحہ ۶)

کردار نگاری کے ضمن میں دو شخصوں کی بات چیت یعنی مکالمے اور خود کلامی (SOLOLACHY) بھی بڑی مدد کرتی ہے۔ حکیم صاحب موصوف نے ان سے بڑی احتیاط اور خوبصورتی سے کام لیا ہے۔ اختر و حسینہ میں بیگم میر جعفر حسین اور ان کے یہاں آئی ہوئی ایک قدامت پرست خاتون کا مکالمہ تعلیم نسواں کے مسئلے پر روشنی ڈالتا ہے۔ اسی طرح اختر اور اسکے خادم کی بات چیت اختر کے تجاہل عارفانہ اور خادموں کے ساتھ مزاحیہ چھیڑ چھاڑ کا برتاؤ، خادم کی تہذیب اور شائستگی کا ترجمان ہے۔ اختر کی بیوی اور گھر کی خادمہ کی بات چیت اس کی بیوی کے کردار کی چغلی کرتی ہے کہ وہ حسینہ سے کس درجہ بغض اور حسد رکھتی تھی۔

عبرت میں جان کی خود کلامی میکسمس کی فریب کاری اور مکاری قاری کے سامنے اس طرح رکھتی ہے:

"کمبخت! دوست بنا ہے۔ بھلا کوئی کسی کا کیا اعتبار کرے جب ایسے ایسے دوست بغلی گھونسے لگائیں اور ایسی ایسی

دغا بازیاں کریں ... خدا جانے ان کمبختوں نے میری طرف سے کیا کیا لکھ کر بھیج دیا ہوگا..."

کبھی کبھی ناول کا ایک فرد دوسرے فرد کا کردار قاری کو بتا تا ہے۔ مثل کا سانپ صفحہ ۹ پر انوٹنی جولیس سیزر کے بارے میں صفحہ ۱۳۶ پر اکیٹولیس کلوپیٹرا کے بارے میں اور جیمس اکیٹولیس کے بارے میں اس طرح بتاتا ہے:

"... اکیٹولیس ابھی کل کا لونڈا ہے، مگر اس کی چالیں غضب کی ہیں اس سے سب خوش ہیں اور جو نہیں بھی خوش وہ زبردستی خوش ہیں اس کی انتظامی قوت میں دق کا مرض چھپا ہوا ہے۔ اس نے پارلیمنٹ کے ممبروں کو تباہ کر دیا ہے۔ ان کی عقلیں انکی قوتوں کی طرح بیکار ہو گئی ہیں..."

ان نمونوں کو سامنے رکھنے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حکیم صاحب موصوف نے افراد ناول کا تعارف کرانے میں بڑی کامیاب کوشش کی ہے اور ان سبھی طریقوں کو بڑی خوبصورتی سے برتا ہے جو روایاتی طور پر استعمال کیے جاتے رہے ہیں۔ البتہ ملبوسات کے سلسلے میں کہیں کہیں کچھ باتیں کھٹکتی ہیں۔ مثلاً اختر حسینہ میں حسینہ کو جو کرتی پہنائی گئی ہے، اس میں آستینوں کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ ہمارا جہاں تک مشاہدہ کام کرتا ہے، اوّل تو کنواری لڑکیاں کرتی پہنتی ہی نہ تھیں اور کرتی میں آستینیں نہیں ہوا کرتی ہیں۔ اودھ اور پھر روہیل کھنڈ کے علاقے میں کرتی کا رواج رہا ہے وہ کنواری لڑکیاں، جو شادی کے سن سے آگے بڑھ جانے پر بھی شادی سے محروم رہتی ہیں وہ البتہ کرتی پہننے لگتی ہیں۔ دوسری بات یہ کھٹکتی ہے کہ حکیم صاحب موصوف افراد کا حسن بیان کرنے میں یکساں جملوں سے کام لیتے ہیں۔ مثلاً سر سے پاؤں تک اعضاء حسن کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں"۔ "جس نے ایک بار دیکھ لیا۔ اس کی یہ خواہش کہ اسے دیکھتا ہی رہے"۔ یہی جملے ... حسن بانو کے لیے اور یہی جملے اختر حسین اور انوٹنی کے لیے استعمال ہوتے رہے ہیں۔ یہ مماثلت اور تکرار سمجھدار قاری ... نے کچھ عجیب سی لگتی ہے ...

(۹)

اب آخر میں ہمیں حکیم صاحب موصوف کی زبان اور اسلوب نگارش کے بارے میں چند باتیں عرض کرنے کی اجازت دیجئے۔ اور پھر ان ناولوں اور تبصروں کے بارے میں سوچیے جو قریب قریب سب نقادوں نے ایک زبان ہو کر فرما دیئے ہیں کہ حکیم صاحب مولانا شرر کے مقلد ہیں اور ان کی دیکھا دیکھی ناول نویسی شروع کر دی۔

اِن سب سے پہلے اُن دونوں قلم کاروں کے اس ماحول کا جائزہ لیجیے جس میں دونوں کی نشو و نما ہوئی۔ مولانا شرر کے نانا شاہی طبیب تھے اور ان کے والد بزرگوار عربی اور فارسی زبانوں کے ایک بلند پایہ فاضل۔ ان کا خاندان دربار واجد علی شاہ کے یہاں کافی رسوخ اور وقار رکھتا تھا۔ چنانچہ جب جان عالم واجد علی شاہ لکھنؤ سے کلکتہ مٹیا برج جلاوطن کیے گئے تو مولانا شرر کا خاندان بھی مٹیا برج منتقل ہو گیا اور نو دس سال کی عمر تک مولانا شرر اپنے نانا اور والد بزرگوار کے زیر تعلیم و تربیت رہے۔ بعد میں لکھنؤ آ کر عربی، درسیات پڑھیں اور ۱۲ سال کی عمر میں تکمیل حدیث اور تفسیر کے لیے دہلی تشریف لے گئے۔ صرف انیس سال کی عمر میں وہ اردو کے مشہور اخبار "اودھ اخبار" کے ایڈیٹوریل اسٹاف سے منسلک ہو گئے۔

حکیم محمد علی صاحب کے والد بزرگوار تحصیلدار تھے اور صاف ظاہر ہے کہ برٹش سرکار کے دور میں حکام رس بھی رہے ہوں گے حکیم صاحب موصوف کی تعلیم و تربیت کے بارے میں ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں۔

مولانا شرر نے لکھنؤ کے قیام کے دوران اور کچھ سفر انگلستان کے سلسلے میں اپنی ذاتی جد و جہد اور ذکاوت و فراست کے سہارے انگریزی زبان پر بھی اتنی دسترس حاصل کر لی کہ وہ انگریزی کے مشہور ناول نگار سر والٹر اسکاٹ کے ناولوں کا مطالعہ کرنے لگے۔ یہ سب کچھ ۱۸۸۲ء تک کی باتیں ہیں۔

حکیم محمد علی فن طب کی تحصیل میں مشغول رہے اور ۱۸۸۲ء

سے ۱۸۸۵ء تک ذاتی مطب کرتے رہے اور ۱۸۸۵ء میں جب وہ سرکاری شفاخانے میں ملازم ہو گئے تو چند سے والے حکیم کے نام سے ہر دوئی میں مشہور ہو گئے اور مولانا شررؔ محشر اور اپنے ناول "دلچسپ" کی اشاعت سے ایک بلند پایۂ صحافی انشا پرداز کی حیثیت سے شہرت پا گئے۔ حکیم صاحب منبض اور قارورے کے جھمیلوں میں پھنسے رہنے کے سبب سے اپنے اُس تحریری ملکہ کو منظر عام پر نہ لا سکے۔ جو انھیں قدرت کی طرف سے ودیعت ہوا تھا اور وہ یوں ہی دبا پڑا رہا ہم وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ حکیم صاحب موصوف انگریزی جانتے تھے یا نہیں؟ اس لیے کہ مورخین ادب اردو نے ان کی طرف سے اس درجہ بے اعتنائی برتی کہ ان کے سوانح حیات تک کی پرواہ نہ کی۔ پھر یہ کیسے معلوم ہو کہ وہ انگریزی جانتے تھے یا نہیں؟ مگر اندازہ بتاتا ہے کہ وہ انگریزی ضرور جانتے ہوں گے۔ باپ تحصیلدار اور حکام رس، اس لیے حکیم صاحب نے ضرور اس طرف توجہ کی ہوگی اور انگریزی جانتے ہوں گے۔ جب کہ وہ آنریری مجسٹریٹ بھی تھے۔ یہ تھا دونوں کے خاندانی ماحول کا سرسری سا خاکہ۔

اب چند منٹ ان بیانات کی طرف متوجہ ہونے کی زحمت فرمائیے۔ جو مولانا عبدالحلیم شررؔ کے بارے میں رام بابو سکسینہ صاحب نے تاریخ ادب اردو میں دیئے ہیں:

"... مولانا شررؔ کے ناولوں میں شروع شروع میں سرشارؔ کا رنگ پایا جاتا ہے۔ بعد میں ساری حیثیت سے شررؔ کی متین عبارت محققانہ بلکہ فلسفیانہ ہے۔ شاعرانہ خیال آفرینی کی حیثیت میں شاعری کے رنگ میں انتہا سے زیادہ ڈوبی ہوئی ہے... مولانا شررؔ نے اپنے عہد کے نثر نگاروں سے الگ یہ کمال دکھایا کہ انگریزی انشا پردازی کی خوبصورت بندشوں کو اردو میں داخل کیا مگر تشبیہات اور استعارے وہی پرانے ایشیائی رکھے... سچ یہ ہے کہ شررؔ اردو لٹریچر میں ایک چابکدست مصوّر ہیں اور جذبات انسانی پر حکومت کرنے والے بادشاہ۔"

اب آپ حکیم صاحب موصوف کی طرف توجہ فرمائیے۔ وہ شاہجہان پور میں پیدا ہوئے۔ جہاں کی زبان پر روہیل کھنڈ کی لب ولہجہ کے ساتھ دلّی کا اثر زیادہ رہا ہے اور لکھنؤ کا کم وہ ہردوئی میں رہتے بستے اور لکھنؤ میں تعلیم پانے کے باوجود لکھنوی زبان اور لب ولہجے سے متاثر نہیں ہوئے۔ چنانچہ وہ اسمار کی تذکیر تانیث میں لکھنؤ کے بجائے دہلی کا اتباع کرتے ہیں مثلاً آواز حلق اور اور چند دوسرے اسماء۔

"دلگداز" سے دو سال بعد ۱۸۸۹ء میں انھوں نے "مرقع عالم" جاری کیا اور انداز بہت کچھ وہی رہا جو "دلگداز" کا۔ وہ بھی "مرقع عالم" کے ذریعے اپنے ناول جستہ جستہ منظر عام پر لاتے رہے۔ مولانا شررؔ کے ناول فلورا فلورنڈا کے ساتھ جان اور ہنوریا کی محبت کا قصہ حکیم صاحب موصوف نے "عبرت" کے نام سے شائع کیا اور دونوں کا پیرایہ بیان اس درجہ یکسانیت رکھتا ہے کہ یہ شبہ پیدا ہونے لگا کہ حکیم صاحب موصوف مولانا شررؔ کی تقلید کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر نذیر احمد کے علاوہ اواخر انیسویں صدی کے سبھی ناول نگاروں کی ایک فطرت ثانیہ سی بن گئی تھی کہ وہ ہر باب کی ابتدا کسی پھڑکتے ہوئے شعر سے کیا کرتے تھے جو براعت استہلال کے طور پر اس باب کے موضوع کی غمازی کر دیا کرتا تھا۔ محمد علی طبیب نے بھی اس انداز کو بڑی خوبصورتی سے برتا ہے۔

سنبھالا ہوش تو مرنے لگے حسینوں پر
ہمیں تو موت ہی آئی شباب کے بدلے

یہ شعر اختر حسین جو ابھی عنفوان شباب کی پہلی منزل تک بھی نہ پہنچ پایا تھا کہ محبت کے جال میں پھنس گیا کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

یہ شعر اس کیفیت کو بتاتا ہے جب کوئی اپنے مقصد میں ناکام رہ جائے چنانچہ یہ اس باب کے شروع میں ہے جب جان اور ہنوریا کی تلاش میں ایشیش کے فرستادہ جاسوس کو پتہ لگانے میں محرومی نصیب ہوئی۔ اسی طرح تمام ناولوں میں بہتیرے خوبصورت اور پھڑکتے ہوئے اشعار براعت استہلال کے طور پر ملیں گے۔

منظر نگاری دوسرا امتیازی وصف ہے جو اس صدی کے علاوہ بیسویں صدی تک کے ناول نگاروں کے پیش نظر رہا ہے۔ اور حکیم محمد علی کے ناول بھی اس وصف سے بھرپور ہیں۔ ایسے منظریہ بیانات لکھنے میں حکیم صاحب موصوف اور مولانا شرر دونوں میں بڑی مماثلت پائی جاتی ہے۔ ایسے بیانات میں بڑی دلفریبی اور دلکشی ہے۔ الفاظ کی شعبدہ گری، بندشوں کی خوبصورتی، تشبیہات اور استعارات کی رنگارنگی، صنائع لفظی اور معنوی کی بہار وغیرہ، قاری کے سامنے بے پناہ خوشگوار فضا پیدا کرتی ہے۔ صبح کا سماں ہو یا دوپہر کی کیفیت، تیسرے پہر کا حال ہو یا جھٹ پٹے وقت اور شام کا منظر۔ برساتی فضا ہو یا سرمائی، ماحول فوجی ترتیب ہو یا میدان کارزار کا سین، محفل طرب ہو یا مجلس عزا ہر جگہ ان کا قلم اس طرح رواں دواں نظر آتا ہے کہ ایک پر دوسرے کا دھوکا ہونے لگتا ہے اور تحریر پر بے پناہ قدرت کا یہ کرشمہ ہے کہ ان کو شرر کا پیروکار اور مقلد سمجھا جانے لگا اور تعجب ہے کہ سرشار کا طرز نگارش، رجب علی بیگ سرور سے اس درجہ مماثلت رکھتا ہے کہ سبب سرشار کوئی منظر دکھانا چاہتے تو اس میں وہی قافیہ پیمائی، وہی مبالغے، وہی پرانی تشبیہات اور استعارات پائے جاتے ہیں جن سے سرور نے کام لیا ہے یہاں تک کہ ضرورت اور بے ضرورت وہی اشعار کا بھرتی کرنا اور الفاظ بھی وہی پرانے فارسی نثر نگاروں کے مگر سرشار کو کسی نے سرور کا مقلد نہیں کہا اور نہ انکا پیروکار رہا یا خود مولانا شرر کے منظریہ بیانات کا طرز شرر سے مل جاتا تھا مگر اسکے یہ معنی نہیں کہ شرر انکے مقلد تھے۔

یہ بات مسلم ہے کہ حکیم صاحب موصوف کو منظر نگاری کا وہ ملکہ حاصل تھا کہ اپنے بیانات کے ذریعے وہ اُس ماحول کو زندہ کر دیتے ہیں اور بیر کہ انھوں نے اپنے سلیقہ ناول نویسی سے شعوری فنکاری کو بھی جلا بخشی ڈاکٹر وقار عظیم نے اس ضمن میں فرمایا ہے :

"... اس دور میں نذیر احمد، سرشار اور شرر کی شروع کی ہوئی روایت کی پیروی بھی ہوئی اور اسے جلا بھی ملی ... محمد علی طیب اسی روایت کے پیروکار اور علم بردار بھی ہیں اور اس روایت کو زیادہ مستحکم بنانے کی خدمت انجام دی" (داستان سے افسانے تک صفحہ ۲۲)

ان بیانات کی روشنی میں ہم دیکھ سکتے ہیں کہ قدرت نے چند سے والے حکیم محمد علی کو قوت بیان اور طرز ادا کا ایک اچھا سلیقہ عطا کیا تھا اور جہاں تک فن ناول کو اس چیز کی ضرورت ہے وہاں تک ان کی بھی بحیثیت ناول نگار اہمیت باقی رہے گی اور یہ ایک سوء اتفاق ہے کہ قدرت کا عطا کردہ یہ جذبہ مولانا شرر سے چند سال بعد ظہور پذیر ہوا۔ اس لحاظ سے الفضل للمتقدم کے تحت ہم مولانا شرر کو اولیت کی فضیلت تو با شبہ دے سکتے ہیں مگر محمد علی طبیب کو ان کا مقلد یا پیروکار رہنا مناسب نہیں سمجھتے۔ اور چند سال کے وقفے کی بنا پر ان کو تابعین کے خانے میں صرف اس لیے اور بھی نہیں رکھ سکتے کہ دونوں نہ صرف ہم عصر رہے ہیں بلکہ دونوں کا سنہ پیدائش بھی ایک ہے یعنی ۱۸۶۰ء ....

پریس رجسٹریشن آف بکس ایکٹ ۱۸۶۷ء (۱۹۵۶ء میں ترمیم شدہ) کی دفعہ ۱۹ ڈی کے قاعدہ ۸ کے مطابق ماہنامہ نیا دور کی ملکیت وغیرہ کے بارے میں مندرجہ ذیل تفصیلات شائع کیے جاتے ہیں:-

(۱) مقام اشاعت	لکھنؤ
(۲) وقفۂ اشاعت	ماہوار
(۳) پرنٹر کا نام، قومیت اور پتہ	شری اشوک در۔ ہندستانی۔ سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ اینڈ سٹیشنری۔ اترپردیش، الٰہ آباد۔
(۴) پبلشر کا نام، قومیت اور پتہ	ہمیندر کمار۔ ہندستانی۔ ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطہ عامہ اترپردیش لکھنؤ
(۵) اڈیٹر کا نام، قومیت اور پتہ	شری ابرار احمد صدیقی۔ ہندستانی۔ ایڈیٹر نیا دور محکمۂ اطلاعات و رابطہ عامہ اترپردیش لکھنؤ
(۶) ان اصحاب کے نام جو اس رسالے کے مالک یا حصہ دار ہیں یا اس کے تمام سرمایے کے ایک فی صدی سے زیادہ کے حصہ دار ہیں۔	نیا دور سرکاری جریدہ ہے۔ اس لیے اس کے بارے میں ان اصحاب کے نام و پتے کا جو اس جریدے کے مالک یا حصہ دار ہیں یا ساری پونجی کے ایک فیصدی سے زیادہ کے حصہ دار ہیں سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

میں ہمیندر کمار اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

(دستخط ہمیندر کمار، پبلشر)

شورش صدیقی
ڈی ۱۲/۱ پیپر مل کالونی ۔ لکھنؤ

بازگشت

جب صبح کا ہنگام ہو مٹ جائے سیاہی — اور روح کو تسکین ملے بادِ سحر سے
آزادی کے ناقوس کی جب آئیں صدائیں — اور ملک گزر جائے مرا راہِ خطر سے
مشاطۂ عالم کی سنواری ہوئی دنیا — کچھ اور حسیں لگنے لگے حسنِ نظر سے
اس طرح سبک سر ہوں یہ انسان کہ جیسے — سر پھولوں کے جھک جاتے ہیں شبنم کے اثر سے
کچلی ہوئی چٹانوں کو کر لینا ذرا یاد

جب سنبل و شمشاد کا ہو طرفہ نظارہ — اور نرگسِ شہلا کی نگاہوں میں نشہ ہو
جب غنچوں سے پیدا ہوں نگاوٹ کے اشارے — اور نغمۂ بلبل میں محبت کی صدا ہو
شبنم سے دمکنے لگیں جب پھولوں کے رخسار — اور سرخ گلابوں کا چمن جھوم رہا ہو
جب پھولوں سے لد جائے روِش باغِ وطن کی — خوشبوؤں سے مہکی ہوئی جب ساری فضا ہو
روندے ہوئے گلزاروں کو کر لینا ذرا یاد

خوش پوش و طرحدار مرے ملک کے لوگو! — بے خوف و خطر مل سکو جب یاروں سے اپنے
بر آئیں تمنائیں میسر ہوں نظارے! — اور لطف و محبت ملے دلداروں سے اپنے
بیباک ہوں آزاد ہوں جب عشق کی راہیں — خوش شاہدِ رعنا ہوں طرحداروں سے اپنے
گلشن کی ہر اک شے سے محبت کا چلن ہو — جب غیر بھی پیار سے لگیں پیاروں سے اپنے
ٹوٹے ہوئے پیمانوں کو کر لینا ذرا یاد

. کہنے کو جو انسان تھے انسان نہیں تھے! — دوبارہ جب انسان کی تحویل میں آئیں
جب پھر سے منظم ہو یہ انسانوں کی محفل — اور وقت کو پھر وقت کی رفتار پہ لائیں
دردِ دلِ بیتاب سمجھ لیتی ہوں نظریں — تسکینِ دلِ زار کریں دل نہ دکھائیں
کہتی ہوں یہی پیار سے معصوم نگاہیں — آ جاؤ تمھیں دل کے دریچوں میں بسائیں
پگھلے ہوئے انسانوں کو کر لینا ذرا یاد

پھر ہوگی کبھی پیار و محبت کی خدائی! — جس دور کی حسرت میں کوئی خاک نشیں ہے
بت پیار کے الفت کے صنم راج کریں گے — اس دورِ طلائی کا تصور بھی حسیں ہے
کل آئیں کہ سو سال گزر جانے پہ آئیں — آئیں گے بہرحال وہ دن دل کو یقیں ہے
جو خونِ جگر دے کے بھی دلدار نہیں تھے — جن کا کوئی دنیا میں نشاں ہے نہ کہیں ہے
گم نامی کے فنکاروں کو کر لینا ذرا یاد

میر کی شاعری میں بے خوابی: صفحہ ۱۲ کا بقیہ

اس لیے میر کو رعایت خاں نے ملازمت سے الگ کر دیا۔ اس کے بعد میر نے جاوید خاں خواجہ سرا کی ملازمت اختیار کی مگر ۱۷۵۲ء میں صفدر جنگ نے جاوید خاں کو قتل کرا دیا۔ اس لیے میر صاحب پھر بیکار ہو گئے۔ میر نے دیوان مہانرائن، راجہ جگل کشور اور راجہ ناگر مل کی بھی ملازمت اختیار کی مگر یہ ملازمتیں بھی عارضی تھیں۔

آخر میں میر نے لکھنؤ کی طرف رُخ کیا۔ وہ ۱۷۸۲ء میں لکھنؤ پہنچے اور نواب آصف الدولہ کے ملازم ہو گئے۔ مگر چونکہ وہ حد درجہ نازک مزاج تھے اس لیے نواب آصف الدولہ سے نباہ نہ کر سکے۔ اپنی نازک مزاجی اور خودداری کی بنا پر میر کو بہت مصائب برداشت کرنا پڑے اور آخر میں اسی خودداری کے ساتھ وہ زیر خاک سو گئے۔

چونکہ میر غم دوراں کے بھی اسیر رہے ہیں، اس لیے ان پر ہمیشہ افسردگی طاری رہی۔ مسلسل افسردگی نے ان کو بے خوابی کا مریض بنا دیا۔ ان کے کلام میں بے خوابی کے ایسے اشعار ملتے ہیں جن کا انحصار غم دوراں پر ہے۔ مثلاً میر کہتے ہیں

ان سختیوں میں کس کا میلان خواب یاں تھا
بالیں کی جائے ہر شب یاں سنگ زیر سر تھا

"سختیوں" کا لفظ یہ واضح کر رہا ہے کہ میر آلام روزگار کے اسیر تھے۔ ان کے زیر سر تکیہ کے بجائے سنگ تھا۔ یہ پریشانی اور مفلسی کی دلیل ہے جب سر کے نیچے پتھر ہے تو نیند کس کو آ سکتی ہے؟ بہرحال یہ شعر ثابت کر رہا ہے کہ میر کو غم دوراں کی بنا پر نیند نہیں آتی تھی۔

میر نے مندرجہ ذیل شعر میں اندوہ کا ذکر کیا ہے۔ اسی اندوہ کی بنا پر وہ رات بھر جاگتے رہے۔

اندوہ سے ہوئی نہ رہائی تمام شب   مجھ دل زدہ کو نیند نہ آئی تمام شب

ہمارا کارواں جاتا رہے تو صبح ہوتا ہے
بہت ڈرتا ہوں میں اے میر تیری دیر خوابی سے

اس شعر میں "دیر خوابی" کا ٹکڑا بہت حسین ہے۔ جو لوگ بے خوابی کے مریض ہوتے ہیں وہ دیر تک جاگتے رہتے ہیں۔ دیر تک جاگنے کا سبب یہ ہے کہ حساس لوگ اپنے مسائل پر غور و فکر کرتے رہتے ہیں۔ اور وہ جتنا غور کرتے ہیں اتنی ہی الجھنیں بڑھتی ہیں۔ اور نیند بھاگتی چلی جاتی ہے۔ میر بھی غم دوراں کی بنا پر اپنے مسائل پر غور کرتے ہیں، اس لیے ان کو نیند دیر میں آتی ہے۔

میر کے بعض اشعار میں بے خوابی کا ذکر واضح طور پر نہیں ہے مگر ان اشعار سے ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ رات میں نہیں سو سکے ہیں مثلاً وہ فرماتے ہیں:

تارے سے میری پلکوں پہ قطرے سرشک کے
دیتے رہے ہیں میر دکھائی تمام شب

میر کی پلکوں پر ساری رات آنسوؤں کے قطرے دکھائی دیتے رہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ رات بھر پریشانی کی بنا پر جاگتے رہے۔

میر نے مندرجہ ذیل شعر میں بھی ضمنی طور پر اپنی بے خوابی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

کہتے ہیں سب کہ خون ہی ہوتا ہے رنگ چشم
راتوں کو گر یہی ہے بکا تو جگر نہیں

یہ شعر اس بات کی دلیل ہے کہ میر رات بھر محو بکا رہتے ہیں۔ اس لیے سونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے۔

یہ سارے اشعار اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ میر غم دوراں کی بنا پر نیند سے محروم رہتے تھے۔ بہرحال میر کے کلام میں بے خوابی کے اشعار جا بجا نظر آتے ہیں۔ یہ بے خوابی غم جاناں اور غم دوراں دونوں کی بنا پر واقع ہوئی ہے۔ مگر یہ بے خوابی رسمی اور قیاسی نہیں ہے بلکہ اس میں صداقت اور حقیقت کا رنگ جھلکتا ہے۔ اس لیے میر کی شاعری میں بے خوابی کے تصور کی بہت اہمیت ہے۔

★

سعادت صدیقی
د اے، موتی تالاب لکھنؤ

جانوروں کا رنگ روپ اور ماحول

بعض جانور ایسے خوبصورت ہوتے ہیں کہ جی چاہتا ہے کہ بس انھیں دیکھا ہی کرو۔ شیر ہو یا بلی، مور ہو یا کبوتر، سیپ ہو یا مچھلی، تتلی ہو یا تینگا، قدرت کسی کو بنانے یا سنوارنے سے نہیں تھکتی۔ ہر جاندار کو ایسے ایسے دلکش رنگ روپ عطا کرتی ہے کہ بڑے سے بڑے ادیب کو کسی ایک کا ایسا بیان کرنے میں کہ آنکھوں کے سامنے تصویر آ جائے بار بار لکھنا اور کاٹنا پڑتا ہے۔ اور تب بھی اطمینان نہیں ہوتا اور مصوّر کو کسی ایک کی ایسی تصویر بنانے میں جو ہو بہو اصل کے مطابق ہو برسوں ریاض کرنا پڑتا ہے۔ آخر قدرت جانوروں کو یہ رنگ روپ کیوں عطا کرتی سہے؟ کیا آپ نے کبھی یہ سوچا ہے؟ آیئے آج قدرت کے اس راز کو جاننے کی کوشش کریں۔

جانوروں کی دنیا میں عام طور پر نر، مادہ سے خوبصورت ہوتا ہے۔ چڑیوں میں یہ بات آسانی سے دیکھی جا سکتی ہے۔ چڑا چڑیا سے، مرغ مرغی سے، مور، مورنی سے حسین ہوتا ہے۔ مور کے پروں کا حسن پوری طور پر تب نظر آتا ہے جب وہ مورنی کے سامنے ناچتا ہے، اسی طرح بعض دوسرے پرند بھی مادہ کے سامنے اپنے حسین پروں کی نمائش کرتے ہیں۔ اس کا مقصد مادہ کو لبھانا ہوتا ہے۔ لیکن جانوروں کے حسین ہونے کا یہی ایک مقصد نہیں ہے۔ ایک بڑا سبب ان کی حفاظت ہے۔ غالباً مادہ پرندوں کے رنگوں کو پھیکا ہونے کا خاص سبب یہ ہے کہ ان کے دشمن جانور انھیں آسانی سے پہچان نہ سکیں، خاص کر اس حالت میں جب وہ انڈے سیتے ہیں اور بالکل بے بس ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ چڑیاں جو زمین پر انڈے دیتی ہیں، ان کے انڈے چتکبرے ہوتے ہیں۔ ان پر اس طرح کے داغ دھبے یا چتیاں پائی جاتی ہیں کہ وہ جھاڑ جھنکاڑ میں نظر نہیں آتے۔

پرندوں میں حفاظتی رنگ کی ایک نمایاں مثال طوطا ہے۔ طوطے کا ہرا رنگ پتوں سے ایسا ملتا جلتا ہے کہ پتوں کی آڑ میں بیٹھا ہوا طوطا مشکل سے نظر آتا ہے اور اس کی سرخ چونچ پر پھول یا پھل کا دھوکا ہوتا ہے۔

اُلّو عام طور پر رات کو شکار کرتا ہے۔ دن میں وہ کسی پیڑ کے تنے یا موٹی شاخ کی آڑ میں چھپا رہتا ہے۔ اس کے پروں کا رنگ اور دھاریاں ایسی ہوتی ہیں کہ اس کا پتہ نہیں چلتا۔ خطرے کی صورت میں وہ سمٹ کر پتلا ہو جاتا ہے تاکہ نظر نہ آئے۔ اگر خطرہ برقرار رہتا ہے تو وہ اپنے جسم کو پھلا لیتا ہے، آنکھیں پوری کھول لیتا ہے اور اپنی چونچ سے ٹک ٹک کی آواز کرتا ہے۔ ایسی حالت میں وہ بڑا بھیانک لگتا ہے۔ بَنَه

جو مینڈک تالاب میں یا اس کے کنارے رہتے ہیں، و عام طور پر ہرے یا بھورے ہوتے ہیں ان کا رنگ مٹیالا یا پانی کی سطح پر اُگنے والی کائی کی طرح سبز ہوتا ہے۔ مینڈک کی جو قسمیں پیڑوں پر رہتی ہیں۔ ان کے جسم پر تنے کی چھال کے رنگ کے داغ دھبے ہوتے ہیں۔

عام طور پر مچھلی، کچھوے اور مینڈک کے پیٹ کا رنگ سفید یا ہلکا پیلا ہوتا ہے، جبکہ ان کی پیٹھ کا رنگ گہرا ہوتا ہے۔ یہ بھی حفاظت کا ایک طریقہ ہے۔ اوپر سے جو جاندار شکار کی تلاش میں نیچے دیکھتا ہے وہ سیاہی کی وجہ سے انھیں صاف طور پر دیکھ نہیں پاتا اور پانی میں رہنے والا جاندار جب شکار کی تلاش میں اپنے سے اوپر کی طرف دیکھتا ہے تو اسے مذکورہ بالا جانوروں کے پیٹ کی سفیدی سورج کی روشنی اور آسمان کی وجہ سے صاف نظر نہیں آتی۔

پائپ فش (PIPE FISH) کا جسم لمبا اور پتلا ہوتا ہے یہ مچھلی عام طور پر پانی کے پودوں کے درمیان رہتی ہے، جن کی شاخوں اور تنوں کے درمیان اس کی شناخت مشکل سے ہو سکتی ہے۔

دنیا کے گرم خطوں کے ساحلوں پر ایک قسم کے کیکڑے پائے جاتے ہیں، جنھیں بالو کے کیکڑے یا دوڑنے والے کیکڑے کہتے ہیں۔ ان کا رنگ بالو سے اتنا ملتا جلتا ہے کہ وہ مشکل سے نظر آتے ہیں۔ یہ اپنے سائے سے پہچانے جاتے ہیں۔ جب یہ دھوپ میں چلتے پھرتے ہیں تو بالو پر پڑنے والے ان کے سائے ان کے جسم کے مقابلے میں زیادہ نمایاں ہوتے ہیں۔ جب کوئی کیکڑا چلنا بند کر دیتا ہے اور اپنی ٹانگیں نیچی کر لیتا ہے تو اس کا سایہ غائب ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی کیکڑا بھی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ اسی لیے انھیں چھلاوا کیکڑا (GHOST CRAB) بھی کہتے ہیں۔

ہرن کا بچہ پیدا ہوتے پر بڑا بے بس ہوتا ہے وہ اپنے دشمنوں سے بچنے کے لئے بھاگ نہیں سکتا۔ اسی لیے اس کی بادامی کھال پر سفید چتیاں ہوتی ہیں۔ جب وہ لمبی گھاس یا پیڑ پودوں کے درمیان کھڑا یا بیٹھا ہوتا ہے تو وہ پتیوں کے درمیان سے چھن کر آنے والی روشنی سے پیدا ہونے والی دھوپ چھاؤں میں ایسا کھپ جاتا ہے کہ نظر نہیں آتا۔ اس کے علاوہ اس کے جسم میں کسی طرح کی بو بھی نہیں ہوتی جس کی وجہ سے لومڑیاں، جنگلی بلیاں اور دوسرے شکاری جانور جن کی ناک بڑی تیز ہوتی ہے۔ اس کا پتہ نہیں چلا پاتے۔

عام طور پر ٹڈے یا بوٹ، گھاس کے رنگ کے ہوتے ہیں۔ ان کا رنگ اور جسم کی ڈھنگ بناوٹ ماحول کے مطابق ہوتی ہے۔ اسی طرح بعض تتلیاں اور پتنگے اس حد تک اپنے ماحول کے مطابق ہوتے ہیں کہ نظر نہیں آتے۔

ماحول میں کھپ جانے کا ایک انوکھا طریقہ پروں کا شفاف ہونا ہے۔ خط استوا کے نزدیک پائی جانے والی بعض تتلیوں اور بھنبھیری (DRAGON FLY) کے پر ایسے شفاف ہوتے ہیں کہ آپ ان کے آر پار دیکھ سکتے ہیں۔ جب وہ اڑتی ہے تو ان کے پروں کے آر پار سے آسمان نظر آتا ہے اور جب وہ پیڑ پودوں پر بیٹھتی ہیں تو پتیوں کے رنگ نظر آتے ہیں۔ ان کا جسم بھی نہایت نازک اور پتلا ہوتا ہے۔

ایک کیڑا ہوتا ہے جسے اسٹک کیٹر پلر (STICK CATERPILLAR) کہتے ہیں[2]۔ یہ جس ڈال پر بیٹھا ہوتا ہے اس پر مشکل سے نظر آتا ہے۔ اس کا رنگ بھورا، کتھئی یا سبز ہوتا ہے۔ یہ چلنے کے لیے اپنے جسم میں محراب کا سا خم پیدا کرتا ہے پھر اپنے اگلے پیروں کو بڑھا کر ڈال پکڑ لیتا ہے۔ اس کے بعد پھر اپنے جسم میں خم پیدا کرتا ہے اور اپنی پچھلی ٹانگیں آگے بڑھاتا ہے۔ جب خطرہ محسوس ہوتا ہے تو یہ اپنے جسم کو شاخ

---

[1] یہاں میں نے الّو کی جس قسم کا ذکر کیا ہے اسے انگریزی میں اسکریچ اول (SCREECH OWL) کہتے ہیں۔
[2] اسے بعض لوگ میزرنگ ورم (MEASURING WORM) یعنی ناپنے والا کیڑا" اور بعض انچ ورم (INCH WORM) کہتے ہیں۔

سے دور بچا رکھنا کے سخت کر لیتا ہے اور اس طرح شاخ سے زاویہ بنا کر کھڑا رہتا ہے۔ کہ وہ خود شاخ کی شاخ معلوم ہوتا ہے۔ جب خطرہ دور ہو جاتا ہے تو پھر چلنے پھرنے لگتا ہے۔ برخلاف اس کے اسٹک انسیکٹ (STICK INSECT) کو یہ کرتب نہیں دکھانا پڑتا۔ اس کا جسم خود شاخ سے مشابہ ہوتا ہے۔ (اس کی لمبائی چند انچ سے لے کر ایک فٹ تک ہوتی ہے) اس کے جسم پر کانٹے یا ابھری دھاریاں ہوتی ہیں کہ وہ بوڑھے درخت کی شاخ معلوم ہوتا ہے۔ جس پر بیٹھا ہوتا ہے۔

اپنے ملک کی مشہور تتلی ڈیڈ لیف بٹر فلائی (DEAD LEAF BUTTERFLY) پر سوکھی ہوئی پتی کا گمان ہوتا ہے کیونکہ اس کے پروں کی ساخت اور ان کا رنگ سوکھی ہوئی پتیوں جیسا ہوتا ہے اور ان کے نیچے داغ دار ایسے نشانات ہوتے ہیں جیسے سوکھی ہوئی پتیوں میں رگیں اور داغ ہوتے ہیں۔ اسی لیے جب یہ اپنے پر سمیٹ کر بیٹھتی ہے تو باریک بین سے باریک بین انسان اسے پہچان نہیں سکتا۔

ایک مشہور کیڑا ہے تھارن بگ (THORN BUG) یا ٹری ہاپر (TREE HOPPER) اس کے سر کے پیچھے کانٹے کا سا ابھار ہوتا ہے جو سب اوقات خود اس کے جسم سے بڑا ہوتا ہے۔ جب یہ کانٹے دار شاخ پر چپ چاپ بیٹھا ہوتا ہے۔ تو کوئی بھی چڑیا اس کانٹے نما کیڑے کو کھانے کے لیے آگے نہیں بڑھتی۔

بعض بے ضرر کیڑے اپنی حفاظت کے لیے خطرناک جانوروں کی نقل کرتے ہیں تاکہ کوئی چڑیا انھیں کھانے کی ہمت نہ کر سکے۔ چنانچہ سوالو ٹیل کیٹر پلر (SWALLOW TAIL CATERPILLAR) کو جب کوئی بھوکی چڑیا کھانا چاہتی ہے تو دفعتاً اس کے چہرے پر دو بڑی بڑی آنکھیں ظاہر ہو جاتی ہیں جو سانپ کی آنکھوں سے مشابہ ہوتی ہیں۔ اس طرح اس کیڑے کا چہرہ سانپ کے چہرے جیسا لگنے لگتا ہے۔ جسے دیکھتے ہی چڑیا گھبرا کر بھاگ جاتی ہے۔ دراصل یہ آنکھیں آنکھیں نہیں ہوتیں بلکہ آنکھ کی شکل کے دو دھبے ہوتے ہیں جو اس کے سر کے اگلے حصے پر پائے جاتے ہیں سر کا یہ حصہ عام طور پر سمٹا ہوتا ہے۔ جب اس کیڑے کو خطرہ محسوس ہوتا ہے تو یہ اپنے سر کے پچھلے حصے کو جس پر اصل آنکھیں ہوتی ہیں سمیٹ کر چھپا لیتا ہے (جیسے کچھوا اپنا سر خول کے اندر کر لیتا ہے) اور سر کے اگلے حصے کو آگے بڑھا کر پھیلا لیتا ہے۔ اس طرح ان پر پائے جانے والے دھبے پھیل کر سانپ کی آنکھوں جیسے لگتے ہیں۔

[illegible] ایک قسم کی تتلی پائی جاتی ہے جسے کیلی گو بٹر فلائی (CALIGO BUTTERFLY) کہتے ہیں [illegible] ایسے نشانات ہوتے ہیں جو الّو کی آنکھوں سے مشابہ ہوتے ہیں۔ جب یہ تتلی کسی ڈال پر بیٹھی ہوتی ہے تو سامنے سے دیکھو تو ایسا لگتا ہے جیسے [illegible]

[illegible] کے جنگلوں میں پائی جانے والی لینٹرن فلائی (LANTERN FLY) کا چہرہ [illegible] مگر مچھ سے مشابہ ہوتا ہے۔ اس کے چہرے پر ایسے نشانات ہوتے ہیں جو مگر کی آنکھوں، پھیلے ہوئے نتھنوں اور دو طرفہ دانتوں کی قطاروں سے مشابہ ہوتے ہیں۔ سامنے سے دیکھو تو ایسا لگتا ہے جیسے وہ حملہ آور کو نگلنے والا ہو (اس کی اصل آنکھیں کافی پیچھے ہوتی ہیں اور نقلی آنکھوں کے نیچے اور پیچھے واقع ہوتی ہیں)۔ ہمبل بی ماتھ (BUMBLE BEE MOTH) ایک بے ضرر کیڑا ہے جو پھولوں کا رس چوستا ہے۔ اس کے ڈنک بھی نہیں ہوتا، لیکن دیکھنے میں یہ بمبل بی یعنی بھونرے جیسا لگتا ہے اور ویسی ہی گونج دار آواز بھی پیدا کرتا ہے۔ اسی لیے جو چڑیاں بھونرے کے ڈنک سے واقف ہوتی ہیں وہ اس پتنگے کو کھانے کی ہمت نہیں کرتیں۔

جنوبی امریکا کے دریاؤں میں ایک مچھلی پائی جاتی ہے جسے لیف فش (LEAF FISH) یعنی پتہ مچھلی کہتے ہیں۔

کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ جیسے چیتے اور تیندوے کی کھال پر
درختوں سے چھن کر آنے والی روشنی سے پیدا ہونے والی دھوپ
چھاؤں کا گمان ہوتا ہے جب یہ جانور درختوں پر چڑھ کر پتوں کی آڑ
میں بیٹھے ہیں یا درختوں کے نیچے سے دبے پاؤں گزرتے ہیں تو
مشکل سے نظر آتے ہیں۔ شیر جب گھنے جنگل میں چلتا ہے تو اپنی
زرد کھال اور سیاہ دھاریوں کی وجہ سے درختوں خاص کر بانس
کے تنوں اور لمبی گھاس کے درمیان بالکل چھپ جاتا ہے۔
برخلاف اس کے ببر شیر کا رنگ خود اس بات کا ثبوت ہے کہ
وہ کھلے میدانوں کا رہنے والا جانور ہے جہاں دور دور پیڑ پائے
جاتے ہوں۔ جن کے نیچے وہ آرام تو کر سکتا ہے لیکن ان کی آڑ
میں چھپ نہیں سکتا۔ اس کا رنگ اس پتھریلی زمین کے مطابق
ہوتا ہے جہاں وہ پایا جاتا ہے۔ دراصل یہ افریقہ کا جانور ہے۔
جہاں سے اس کی نسل پھیل کر ہندوستان تک پہنچ گئی۔

برفانی تیندوے کے جسم پر جو ہمالیہ میں پایا جاتا ہے،
بڑے بڑے بال ہوتے ہیں اور ان کا رنگ سفید یا سفیدی
مائل سرمئی ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ برف پوش ماحول کے عین
مطابق ہے۔ جن علاقوں میں مستقل برف باری ہوتی ہے، جیسے
دائرہ قطب شمالی میں، وہاں کے جانوروں کے بال عام
طور پر سفید ہوتے ہیں جیسے سفید بھالو، سفید لومڑی، اور
سفید الو وغیرہ۔

جانوروں کے ماحول کے مطابق ہونے کے عمل کو انگریزی
میں کاموفلاج (CAMOU FLAGE) کہتے ہیں، جسکے
اصل معنی ہیں دشمن سے بچنے کے لیے بھیس بدلنا، چھپنا۔ قدرت
میں اس کے کئی طریقے ہیں۔ اگر ماحول کے مطابق رنگ ہو تو اسے
جنرل کرپسس (GENERAL CRYPSIS) یعنی اخفائے عام
کہتے ہیں۔ اگر جانور کسی خاص چیز سے مشابہ ہو تو اسے اسپے
سی فک کرپسس (SPECIFIC CRYPSIS) یعنی
اخفائے خاص کہتے ہیں اور اگر وہ خطرناک جانوروں کی
نقل کرے تو اسے ممکری (MIMICRY) کہتے ہیں۔

جانوروں نے اپنے کو دشمنوں سے بچانے کے لیے یہ صلاحیت
لاکھوں سال میں پیدا کی ہے تاکہ وہ اپنی نسل جاری رکھ
سکیں۔ ایک نسل سے دوسری نسل میں یہ صلاحیت منتقل ہوتی
رہی اور رفتہ رفتہ درجۂ کمال تک پہنچ گئی۔ یہ عمل ہم اپنی آنکھوں
سے نہیں دیکھ سکتے اور نہ یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ خوبی
جانوروں کی اپنی کوشش سے پیدا ہوئی یا اس کے پیچھے خدا
کی دانائی اور ہدایت کارفرما رہی ہے۔ بہرحال انسان نے
میدان جنگ میں جانوروں کے اس طریقۂ عمل کو اپنایا ہے۔
سپاہی خاکی، ہرے یا دونوں رنگوں کے ملے جلے کپڑے
پہنتے ہیں اور اپنے ساز و سامان کو جال سے کس کر شاخوں اور
پتوں سے ڈھک لیتے ہیں تاکہ ان کی نقل و حرکت کا پتہ نہ چلے
اور دور سے جھاڑیوں کا گمان ہو۔ بسا اوقات جنگی جہازوں،
اور فوجی ساز و سامان پر ٹیڑھی میڑھی لکیریں اور الٹے
سیدھے داغ دھبے بنا دیے جاتے ہیں تاکہ ان کے صحیح
رنگ روپ کا پتہ نہ چل سکے۔

★

علم خواہ کتنا ہی حاصل کیا جائے لیکن عمل نہیں تو تم میں اور جاہل
میں کوئی فرق نہیں

—— شیخ سعدیؒ شیرازی

غزلیں

آثر عباسی امروہوی
لیکچرر جوبلی ہائر سیکنڈری اسکول
... لکھنؤ

کفر کو ایمان بنا دے بندگی ایسی تو ہو
مان لے جس کو خدا بھی بندگی ایسی تو ہو
جان و دل نشتر بار کریں ہم بیکسی ایسی تو ہو
رشکِ گلشن بن کے جو مہکے کلی ایسی تو ہو
اپنی نظروں سے پلا ساقی یہ ساغر توڑ دے
پارسا قرباں ہو جس پر مے کشی ایسی تو ہو
اعترافِ حسنِ جاناں حسن کی توہین ہے
جم کے رہ جائیں نگاہیں دلکشی ایسی تو ہو
عشق کی منزل میں کیسا ہوش اور کیسے حواس
دونوں عالم کو بھلا دے بیخودی ایسی تو ہو
آپ کو حق ہے مجھے نفرت سے دیکھیں بار بار
جس میں شامل ہو محبت برہمی ایسی تو ہو
کشتگانِ عشق کیا معلوم یہ کیا کہہ گئے
موت پر جو فتح پائے زندگی ایسی تو ہو
اس طرح ہوتی نہیں جوشِ جنوں کی انتہا
لوگ خود دیوانے ہو جائیں ہنسی ایسی تو ہو
دیکھ کر ان کو مجھے بے ساختہ کہنا پڑا
حسن کو دلکش بنا دے سادگی ایسی تو ہو
سجدہ کرنا ہی نہیں مقصود راہِ عشق میں
عرش خود ہی کھنچ کے آئے بندگی ایسی تو ہو
ہر غزل کوئی غزل ہے ناز ہو جس پر اثر
وجد میں آجائے دنیا شاعری ایسی تو ہو

نسیم شاہجہانپوری
تارن جوالی نگر
شاہجہانپور

وقارِ جذبۂ غیرت کو پائمال کریں
یہ ہم سے ہو نہیں سکتا کہ ہم سوال کریں

وہ اپنی بزم میں ممکن ہے کچھ خیال کریں
خموش رہنے سے بہتر ہے عرضِ حال کریں

اب اتنے تنگ نظر بھی نہیں ہم اہلِ جنوں
نشاطِ ابدی سے پہلے غمِ مآل کریں

دیا ہے جس نے زمانے کو بے طلب سب کچھ
وہ ہم کو کیا نہیں دے گا اگر سوال کریں

یہاں کہیں بھی تو کس سے کہیں فسانۂ دل
یہاں کہیں بھی تو کس کو شریکِ حال کریں

نسیم یہ تقاضا ہے دورِ حاضر کا
جو بات آج نہ کی ہم نے وہ سب حال کریں

نصیر ناطق
معرفت قومی آواز لکھنؤ

گردشِ وقت کے تیور جو بدل جاتے ہیں
قلبِ مضبوط سے مضبوط دہل جاتے ہیں
سخت دل حسنِ مروت سے بدل جاتے ہیں
سچ ہے، اخلاق سے پتھر بھی پگھل جاتے ہیں
ہم نے چڑھتے ہوئے دریا کو بہت دیکھا ہے
ظرف چھوٹے تو بہت جلد ابل جاتے ہیں
بات شکوے کی نہیں بات سمجھنے کی ہے یہ
کیوں اندھیرے یہ اجالوں کو نگل جاتے ہیں
وہ محل جن کا ہے آثارِ قدیمہ میں شمار
ان میں رسماً کبھی فانوس بھی جل جاتے ہیں
لمحے فرصت کے نہیں جب کبھی کاٹے کٹتے
ہم کتابوں کے سہارے سے بہل جاتے ہیں
زندگانی کے جو آداب سے نا واقف ہیں
چال بے راہ روی کی وہی چل جاتے ہیں
گرمیٔ فکر کا دیکھا یہ تاثر ہم نے
آج شیشے کے مکانات پگھل جاتے ہیں
بے وفائی کا نتیجہ تمہیں معلوم نہیں
راستے اہلِ محبت کے بدل جاتے ہیں
جن سے ہے پیاسوں کی امیدِ کرم وابستہ
شکل دکھلا کے وہ بادل بھی نکل جاتے ہیں
دل اسی وقت یہ مائل بہ سکوں ہوتا ہے
جب مری آنکھ سے کچھ اشک نکل جاتے ہیں
جن کی قیمت نہیں دنیا میں نصیر
کھوٹے سکّے بازار میں ایسے بھی تو چل جاتے ہیں

سید احمد قادری
شعبۂ اردو، مرزا غالب کالج
گیا (بہار)

علامہ اقبال اور ان کی عالمی مقبولیت

اگر علامہ اقبال کے متعلق کوئی یہ کہتا ہے کہ "وہ فلسفہ کا امام ہے، اقتصادیات پر اس کی گہری نگاہ ہے۔ علم الاقوام بھی اس کے ذہن و دماغ میں رچا بسا ہوا ہے وہ دنیا کے نئے رجحانات اور تصورات سے بھی واقف ہے۔ وہ قیصریت کا بھی اداشناس ہے اور فسطائیت کے رموز بھی جانتا ہے۔ وہ جمہوریت کے اسرار کا بھی ماہر ہے، وہ اشتراکیت کی گہرائیوں میں بھی غوطے لگا چکا ہے۔ غرض دنیا کی کوئی تحریک، کوئی رجحان، کوئی تصور ایسا نہیں ہے، جس سے اقبال واقف نہ ہو، جس کا اقبال نے مطالعہ نہ کیا ہو، جس کے محرکات پر اقبال کی نظر نہ ہو، وہ بیرونی اور مقامی نظریات جدید اور قدیم کو بھی جانتا ہے۔ اور انھیں پرکھ چکا ہے" تو غلط نہیں کہتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اپنی ان جملہ خصوصیات کے ساتھ ساتھ رفتہ رفتہ اقبال کی شاعری اس قدر مقبول ہوئی کہ دور حاضر میں مشکل سے کسی شاعر کو یہ فخر حاصل ہے۔ ان کا کلام نہ صرف ہندو پاک بلکہ ایران، افغانستان، امریکہ، انگلستان، جرمن، فرانس، روس، عرب وغیرہ جیسے ممالک میں بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

اقبال کی شخصیت اور ان کی شاعری کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ غیر منقسم ہندوستان کی بڑی بڑی ہستیوں۔ مثلاً جسٹس امیر علی، شمس العلماء مولوی سید علی بلگرامی، سر شیخ عبدالقادر، مولانا غلام رسول مہر، نواب بھوپال حمید اللہ خاں، سیٹھ محمد جمال، سر محمد اسماعیل، مہاراجہ کشن پرشاد، سر اکبر حیدری، نظام حیدر آباد، ڈاکٹر عبداللہ چغتائی، سر سید احمد خاں کے پوتے سر راس مسعود، سر سکندر حیات، لالہ لاجپت رائے، ڈاکٹر لمعہ حیدر آبادی، ہز ایکسی لنسی گورنر پنجاب، سر سندر سنگھ مجیٹھا، منوہر لال چودھری سر چھوٹو رام، میاں عبدالحئی، جسٹس عبدالرشید، جسٹس دین محمد، جسٹس بخشی ٹیک چند، جے۔ ڈی۔ پینی، رابندر ناتھ ٹیگور، سبھاش چندر بوس، ابوالکلام آزاد، محمد علی جناح، مہاتما گاندھی، اور پنڈت جواہر لال نہرو وغیرہ نے اقبال کی عظمت کا صدق دل سے اعتراف کیا۔ اس بات پر ان تمام حضرات کو فخر تھا کہ اقبال بھی ان کی طرح ہندوستانی ہیں۔ اقبال کی قدر و منزلت کا اندازہ ان کے انتقال کے بعد چند تعزیتی پیغامات سے بھی ہوتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

رابندر ناتھ ٹیگور لکھتے ہیں:۔

"ہمارے ادب میں، ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے جس کے پُر ہونے میں ایک جان لیوا زخم مندمل ہونے کی مانند بہت عرصہ لگے گا۔ ہندوستان جس کی آج دنیا میں کوئی وقعت نہیں ہے۔ ایسے شاعر کی وفات سے اور بھی قلاش ہو گیا ہے۔ جس کی شاعری عالمگیر اور آفاقی شہرت کی حامل تھی"۔

مولانا ابوالکلام آزاد کہتے ہیں:۔

"یہ سوچ کر ناقابل بیان صدمہ دل پر گزرتا ہے

کہ اب اقبال ہم میں موجود نہیں رہا۔ جدید ہندوستان اردو سالوں سے بڑا شاعر پیدا نہیں کر سکے گا۔ ان کی فارسی شاعری بھی جدید فارسی ادب میں اپنا ایک خاص مقام رکھتی ہے ان کی وفات سے تنہا ہندوستان کو نہیں بلکہ پورے مشرق کو نقصان پہونچا ہے۔ ذاتی طور پر مجھے اس بات کا انتہائی قلق ہے کہ میرا ایک دیرینہ دوست مجھ سے بچھڑ گیا۔"

نیتا جی سبھاش چندر بوس نے کہا :۔

" سر محمد اقبال کی رحلت کے یہ معنی ہیں کہ ہندوستانی ادب کے آسمان پر جو تارے روشن تھے ان میں سے درخشاں ستارہ ٹوٹ گیا۔ صف اوّل کے شاعر اور نقاد ہونے کے علاوہ سر محمد اقبال ایک منفرد کردار کے بھی حامل تھے۔ ان کی رحلت سے ہم سب کو جو عظیم نقصان پہنچا ہے اسے شدت کے ساتھ سارے ملک میں محسوس کیا جائے گا۔"

محمد علی جناح نے اقبال کی عظمت کا اعتراف ان لفظوں میں کیا تھا۔

" اگر میں ہندوستان میں اسلامی حکومت کو قائم ہوتا دیکھنے کے لیے زندہ رہوں اور اس وقت مجھ سے کہا جائے کہ ایک طرف اس اسلامی حکومت کے رئیس اعلیٰ کا عہدہ ہے اور دوسری طرف اقبال کی تصنیفات، تم دونوں میں سے ایک چیز کو چن سکتے ہو تو میں اقبال کی تصنیفات کو ترجیح دوں گا۔"

مہاتما گاندھی لکھتے ہیں ۔"

" ڈاکٹر اقبال کے بارے میں کیا لکھوں۔ میں تو اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ جب ان کی مشہور نظم "ہندوستاں ہمارا" پڑھی تو میرا دل بھر آیا، بڑودہ جیل میں تو سینکڑوں بار اس نظم کو گایا ہوگا۔ اس نظم کے الفاظ مجھے بہت ہی میٹھے لگے۔ اور یہ خط لکھتا ہوں تب بھی وہ نظم میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔"

یہ غیر منقسم ہندوستان کی چند شخصیات کے تعزیتی پیغامات کے اقتباسات ہیں۔ ممکن ہے کچھ لوگ یہ کہہ کر اسے درگزر کر دیں کہ ایک ہندوستانی کو ہندوستانی شاعر سے نسبت و محبت تو ہوگی ہی لیکن میں اس سے قبل بھی عرض کر چکا ہوں کہ اقبال کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف دنیا کے بہت سارے ممالک کے لوگوں نے کیا ہے۔ ان میں ازہر یونیورسٹی قاہرہ کے شیخ الجامعہ، مصر کے ڈاکٹر محمد حسنین ہیکل، محمد علی پاشا، ڈاکٹر عبدالحمید سعید، سید محمد قاضی ابوالعزائم، ترکی کے غازی رؤف پاشا، شہزادہ ولی عہد مانگرول، روم کے ڈاکٹر سکارپا پروفیسر جنٹلی، ڈاکٹر نکلسن، مسولینی، اٹلی کے پرنس کیتانی بیرن، فلسطین کے مفتی اعظم امین الحسینی، پیرس کے میگ نون، برگساں، اسپین کے پروفیسر آسین، افغانستان کے نادر شاہ سردار صلاح الدین سلجوقی وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ ان حضرات اور ان کے علاوہ دیگر عالموں مدبروں، فلسفیوں، مفکروں، شاعروں، ادیبوں اور ناقدین نے وقتاً فوقتاً اقبال کی پر بہار شخصیت اور ان کی پر اثر شاعری سے متاثر ہو کر اس کا اعتراف صدق دل سے کیا ہے۔ اس سلسلے میں چند شخصیتوں کے خیالات اس طرح ہیں :۔

" اقبال کے فلسفہ کے استاد پروفیسر تھامس آرنلڈ فرماتے ہیں " ایسا شاگرد استاد کو محقق اور محقق کو محقق تر بنا سکتا ہے "

روم کے ڈاکٹر سکارپا کہتے ہیں " ایسے اچھوتے نادر اور پر از حقائق خیالات کا آدمی میں نے کبھی نہیں دیکھا "

اقبال جب قاہرہ پہنچے تو ان کے قیام کے دوران مصر کے مشہور بزرگ سید محمد قاضی ابوالعزائم اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ ان سے ملنے آئے جس پر علامہ اقبال نے ان سے مخاطب ہو کر فرمایا " آپ نے کیوں تکلیف کی۔ میں خود آپ کی زیارت کے لیے آپ کے پاس چلا آتا " اقبال کی اس بات پر قاضی صاحب فرمانے لگے " خواجہ دو جہاں حضورؐ کا ارشاد ہے کہ جس نے دین سے تمسک حاصل کیا ہو، ان کی زیارت کو جاؤ گے تو مجھے خوشی ہوگی "

سولینی نے خاص طور پر ڈاکٹر سکارپا کے ذریعہ اقبال سے
ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی جسے اقبال نے قبول کر لیا تھا۔ اور
۲۷ نومبر ۱۹۳۲ء کو ملاقات کے دوران اقبال کی زبان سے ایک
پیام سنا تو وہ انگشت بدنداں ہو گیا اور کرسی چھوڑ کر کھڑے
ہو کر میز پر ہاتھ ٹیکتا ہوا چلانے لگا۔ !! ("WHAT AN — EXCELLENT IDEA! WHAT AN EXCELLENT IDEA"

دنیا کے مشہور فلسفی اور مفکر "برگساں" نے جب اقبال کی
زبانی یہ حدیث سنی کہ "لا تسبوا الدھر ان الدھر ھو اللّٰہ"
(زمانہ کو برا مت کہو کہ زمانہ خود خدا ہے) تو وہ جو گاؤٹ (GOUT)
گٹھیا کا مریض تھا اور کرسی کے بغیر ادھر ادھر ہل جل نہیں سکتا تھا۔
کرسی چھوڑ کر آگے بڑھا اور علامہ سے پوچھنے لگا۔ "کیا یہ واقعی حدیث
ہے" یہ امر خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ برگساں اپنی بیماری کی بناء
پر بالکل گوشہ نشین ہو گیا تھا اور کسی سے ملتا جلتا نہیں تھا۔ لیکن
اقبال سے ملنے کے لیے خاص طور پر اہتمام کیا تھا۔

یہ تمام باتیں ایسی ہیں جو علامہ اقبال کی بین الاقوامی شہرت و
مقبولیت کا پتہ دیتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اردو کے ایک
ناقد کلیم الدین احمد کا اقبال کے متعلق یہ خیال ہے کہ "اقبال کا
عالمی ادب میں کوئی مقام نہیں ہے۔" اور ان کے بعد اسی ہندستان
کے عظیم شاعر فراق گورکھپوری فرماتے ہیں کہ "اخلاقی یا روحانی
حیثیت سے اثر انداز ہونے والی شخصیت کی فہرستوں میں بھی ڈھونڈنے
سے ڈاکٹر اقبال کا نام نہیں ملے گا۔" مگر اسی کے ساتھ ساتھ انھوں
نے یہ بھی لکھا ہے کہ "دنیا کے بڑے بڑے شاعروں کے یہاں جو خوبیاں
ہیں وہ اقبال کے یہاں بھی موجود ہیں۔" لیکن کلیم الدین احمد کے
اس امر کو کہ "اقبال کا عالمی ادب میں کوئی مقام نہیں ہے"
تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ایسی بات ہوتی تو اقبال کے کلام کا عرب
کے ڈاکٹر عبدالوہاب عزام، عراق کے امیرہ نورالدین، شام کے
عمر الامیری، مصر کے صادی شعلان، یمن کے امین زبیری وغیرہ
اپنے اپنے ملک کی ترقی یافتہ زبانوں میں ترجمہ نہیں کرتے۔ یا پھر
دنیا کی بڑی زبانوں میں اقبال پر کتابیں نہ لکھی جاتیں۔

بقول ڈاکٹر عالم خوندمیری ـــــ "ان کی (اقبال کی)
پہلی قابل ذکر اور معرکہ آرا شعری فکری تخلیق "اسرار
خودی" منظر عام پر آئی تو اس نے اپنے دور کے
سب سے زیادہ مستند اور عظیم مغربی مستشرق کو اس
حد تک متاثر کیا کہ انھوں نے اس کی اشاعت کے دو برس کے بعد
اس کا انگریزی ترجمہ شائع کر دیا۔"

نکلسن فرماتے ہیں "اقبال صرف اپنے عصر کی آواز نہیں بلکہ
اپنے دور سے آگے بھی ہیں اور ساتھ ہی اپنے زمانے میں برسر جنگ
بھی۔"

اس کے بعد "نکلسن" کے شاگرد اور جانشین "آرتھر آربیری"
نے اقبال کی چند شعری تخلیقات کا انگریزی میں ترجمہ کیا جو ۱۹۲۰ء
میں شائع ہوا۔ اور بعد ازاں آربیری نے رموز بےخودی، زبور عجم، شکوہ اور
جواب شکوہ اور جاوید نامہ کے انگریزی ترجمے دنیا کے سامنے پیش
کیے۔ پھر براؤن نے بھی فارسی ادب پر کتاب لکھی۔ "بوزانی" نے
جاوید نامہ کو اطالوی قالب میں ڈھالا اور اقبال اور دانتے کا موازنہ
بھی کیا یورپ کی دوسری اہم زبان ولندیزی میں بھی "جاوید نامہ" کا
نثری ترجمہ MEYEVOVITCH نے کیا۔ انھوں نے اقبال کے
خطبات کا بھی فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا۔ فرانسیسی میں MEY-
EVOVITCH کے علاوہ LUCECLAUDE
نے بھی اقبال کو روشناس کرایا۔ فرانسیسی ترجمے کا پیش لفظ مشہور
و ممتاز مستشرق "میسنون" نے لکھا۔

بون یونیورسٹی کے ماہر اسلامیات پروفیسر اناماری شمل نے
اقبال کی بعض تخلیقات کا ترجمہ جرمن زبان میں کیا۔ اقبال پر پروفیسر
شمل کی بہترین تصنیف GABRIEL'S WING ہے۔

ان زبانوں کے علاوہ مشرقی یورپ اور سوویت یونین کی زبانوں
میں بھی مثلاً چیک زبان میں چیک عالم "یان مارک" اور روسی زبان
میں روسی عالم "انی کیار" نے بھی اقبال کی تخلیقات کا ترجمہ کیا۔

مختصر یہ کہ مندرجہ بالا حقائق اقبال کی شہرت، عظمت اور
مقبولیت کا واضح ثبوت ہیں۔!

★

فاطمہ حسنی
۲۵ گلستاں کالونی لکھنؤ

(افسانہ)

بھُجّا شکاری

فضا میں لوبان اور اگربتیوں کی تیز خوشبو پھیلی تھی۔ پیپل کے نیچے کھڑا "بھرّا" (جھاڑ پھونک کرنے والا) اونچی آواز میں منتر پڑھ رہا تھا۔ عمل شروع کرنے سے پہلے وہ دیوتاؤں سے خود اپنی سلامتی اور حفاظت کے لیے دعا مانگ رہا تھا۔ دن بڑا روشن اور چمکیلا تھا۔ لیکن سنّاٹے میں گونجتی بھرّا کی آواز نے عجب سا پُر ہول ماحول پیدا کر دیا تھا۔ منتر ختم کرکے بھرّا نے پھول کی چمکتی تھالی پر چند دانے جو کے ڈالے، گھی کا چراغ روشن کیا۔ نہا کر پہنی نئی دھوتی کو ایک ہاتھ سے سنبھالتا ہوا اور دوسرے ہاتھ میں پھول کی سجی تھالی لے کر بھرّا آہستہ آہستہ قدموں سے شانتی کے نزدیک آکر رُک گیا۔

سر کے کھلے بالوں اور بے ترتیب کپڑوں میں وحشت زدہ شانتی زمین پر بیٹھی تھی۔ بڑی سختی سے اس کے دونوں بازوؤں کو گاؤں کے مکھیا نے پکڑ رکھا تھا۔ بھرّا نے پھر منتر شروع کیے۔ پھر تھالی کو تین بار شانتی کے سر پر گھمایا۔ بڑی زوروں سے چیخ اٹھی شانتی۔ تھالی میں رکھا چراغ بجھ گیا تھا۔ بھرّا نے جو کے دانے شمار کیے جن کی تعداد کم ہو گئی تھی۔ ساری علامتیں آسیب کی موجودگی کا اظہار کر رہی تھیں۔ بھرّا نے سامنے جمع عورتوں، مردوں اور بچوں پر ایک نظر ڈالی، ہاتھ میں پکڑی ہوئی تھالی ایک طرف رکھ دی۔ پھر گاؤں کے پردھان کو مخاطب کرکے شانتی کے آسیب زدہ ہونے کا اعلان کر دیا تھا۔ بھوکسا قبائل کے عقیدے کے مطابق آسیب اتارنے کے لیے اب اسے سب سے پہلے شکار کے دیوتا "بھجّا شکاری" کی پوجا کرنا تھی۔

جنگلوں میں آباد ان قبائلی لوگوں کا ماضی شاندار رہا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جب دھارا نگری کے راجپوت راجہ جگت دیو کے خاندان کے تمام بہادروں کے ساتھ مغلوں کے ہاتھوں میدانِ جنگ میں مارے جا چکے تھے تو ان کی رانیاں اور دیگر شاہی خاندان کی عورتیں وفادار نوکروں کے ساتھ نینی تال کی ترائی کے جنگلوں میں بھاگ کر پناہ گزیں ہو گئی تھیں۔ رفتہ رفتہ جنگلوں کی زندگی نے اپنے قدم جما لیے تو رانیوں کے سامنے راج کماریوں کی شادی کا سوال ایک مسئلہ بن گیا۔ جنگلوں میں ساتھ آئے وفادار ملازموں کے سوا دوسرا کوئی متنفس نہ تھا۔ مصلحتِ وقت اور تقاضۂ زندگی کے تحت رانیوں نے راج کماریوں کا بیاہ نوکروں کے لڑکوں سے کر دیا مگر اس پہچان کے ساتھ کہ زن و شوہر ہونے کے باوجود رانی اور خادم کا لحاظ قائم رہے چنانچہ نینی تال کی ترائی میں اپنی الگ دنیا بسائے ہوئے ہندوستان کے قدیم باشندے "بھوکسا" آج بھی اپنے کو راجپوت اور راجہ جگت دیو کی اولاد بتاتے ہیں۔ اور بھوکسا سماج میں عورت کی وہی پوزیشن برقرار ہے۔ ان کی ذاتی زندگی میں شوہر دخل انداز نہیں ہوتا۔ ان کے پشتوں سے چلے آ رہے تمدن و تہذیب اور مذہبی عقیدہ پر مہذب دنیا کا کوئی اثر نہیں ہے۔ تعصب سے بے نیاز، سادہ لوح بھوکسا کی نظر میں مصیبت کی وجہ

نقد و تبصرہ

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا لازمی ہیں)

نام کتاب: **شہر غزل** مصنف: شاد فیض آبادی
صفحات: ۲۵۶ قیمت ۱۵ روپے
ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ دین و ادب امین الدولہ پارک لکھنؤ۔

شہر غزل، شاد فیض آبادی کا مجموعۂ کلام ہے۔ جو کتابت و طباعت اور تدوین و ترتیب کے اعتبار سے نہایت دیدہ زیب ہے۔ بقول شاد "مقدمہ۔ تعارف تقریظ اور تبصرہ کی بیساکھیوں کے بغیر" اتر پردیش اردو اکاڈمی کے جزوی مالی اشتراک سے پیش کیا گیا۔

شاد فیض آبادی حکیم ناطق لکھنوی جیسے مصلح زبان و ادب کہنہ مشق استاد کے شاگرد، ان کی صحبتوں کا فیض اٹھائے ہوئے اردو کے علمی و ادبی حلقوں میں متعارف خوش فکر شاعر ہیں۔۔۔۔۔ غزلیں خوب کہتے ہیں اور بجا طور پر یہ دعوا کرتے ہیں ؎

خون رگِ احساس تری مانگ میں بھر کر اے شہر غزل تجھ کو دلھن ہم نے بنایا

شہر غزل ان کی فکر و نظر کا آئینہ ہے ان کی غزلوں میں غم جاناں غم دوراں، گہرائی، تڑپ، معنی آفرینی۔ روانی و برجستگی اور تغزل کی پاکیزگی سب کچھ موجود ہے وہ فسانۂ درد دل بھی سناتے ہیں اور عوامی و انسانی مسائل سے بھی اچھی طرح واقف ہیں بڑی سے بڑی بات نہایت سادگی سے اشاروں میں کہہ جاتے ہیں جیسے ؎

اب تو ہمارے پاؤں کی زنجیر کاٹ دو
اب تو بہار آئے بہت دن گزر گئے

نئے دور کے چاند سورج سے پہلے
اندھیرے میں ہم لوگ مشعل رہے ہیں

شاد کی شاعری زبان و بیان کی خوبی، عمیق تجربات اور شدت احساس کی پختگی سے نسبتاً زیادہ قریب ہے۔ روایتی غزل گوئی کا انداز بھی ہے اور جدید تجربوں کی آمیزش بھی۔ وہ نازک خیالات اور قلبی واردات کے بیان پہ قدرت رکھتے ہیں۔ امید ہے یہ مجموعہ شرف قبولیت حاصل کرے گا

——— عرفانہ عباسی

نام کتاب: **تاریخ ادبیات تاجکستان** مصنف: میرزی بیچکا
مترجم: کبیر احمد جائسی: ناشر:۔ انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی
قیمت ۔ ۱۳ روپے ۔ صفحات ۔ ۲۷۶۔

زیر نظر کتاب "تاریخ ادبیات تاجکستان، یان ریپکا کی مشہور کتاب HISTORY OF PERSIAN LITERATURE کا ایک طویل باب ہے۔ اس مبسوط تاریخ کا یہ طویل باب میرزی بیچکا کا تحریر کردہ ہے۔ کبیر احمد جائسی نے اس کا اردو میں ترجمہ کر کے بڑی خدمت انجام دی ہے۔ اس کتاب میں تاجیک ادب کے ابتدائی دور سے لے کر دور حاضر تک کے سیاسی اور تہذیبی حالات کے پس منظر میں ترویج و ترقی کا جائزہ لیا گیا ہے۔ کتاب کے اہم ابواب میں تاجیکی ادب کا مطالعہ، سولہویں صدی عیسوی کے شعراء، روسی اقتدار کے اثرات، ۱۹۴۵ء سے آج تک ہیں۔ عالمی ادب اور خصوصاً فارسی شاعری سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے یہ کتاب دل چسپ اور معلومات افزا ہے۔

فاضل مترجم نے یہ ترجمہ بہت صاف اور سادہ زبان میں کیا ہے۔ کتابت معمولی اور طباعت و کاغذ اوسط درجے کے ہیں۔

نام کتاب: **مطالعہ انار کلی** ۔ مولف ۔ ایس نجم الحسن انجم۔
سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۴۶ ۔ قیمت: دو روپے پچاس پیسے۔
ناشر: نسیم بکڈپو۔ لاٹوش روڈ لکھنؤ۔

امتیاز علی تاج کا مشہور ڈرامہ انار کلی اردو کے کئی نصابات میں داخل ہے۔ زیر نظر کتابچہ مطالعہ انار کلی، انار کلی کا ایک تنقیدی جائزہ ہے۔ جس میں طلباء کی سہولت کے لئے اس موضوع پر ممکن سوالات کے مختصر جوابات کو قلم بند کر دیا گیا ہے۔ مولف نے شروع میں اردو ڈرامہ کی مختصر تاریخ بھی دی ہے جس سے کتاب کی افادیت میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔

——— ڈاکٹر ذکی کاکوروی۔

کتاب کا نام **لہر لہر پیاسی** مصنف ۔ اکرم الدین اکرم فاروقی
ضخامت ۔ ۱۰۵ صفحات ۔ قیمت: پندرہ روپے۔ پتہ
سینٹرل اسکول فتح گڑھ ۔ یوپی

اس دیوتا کے عذاب سے بہت ڈرتے ہیں۔ شکار کے ارادے جنگل کی طرف جانے سے پہلے بھجا شکاری کی پوجا کرنا ہر بھوکسا کے لیے لازم ہے۔

ہمیشہ کی طرح اس دن بھی بھجا شکاری کی پوجا ہوئی مگر اس میں راج سنگھ شامل نہیں ہوا وہ صبح سے پڑا سوتا رہا تھا۔ دن کافی چڑھ آیا تھا جھونپڑے کے چاروں طرف جیتی جاگتی زندگی روزمرہ کے معمول میں مصروف تھی۔ شانتی راج سنگھ کو کئی بار جگا چکی تھی۔ مگر راج سنگھ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ سر سے پیر تک چادر لپیٹے پڑا رہا لیکن اس بار جگانے کے ساتھ ہی شانتی نے راج سنگھ کے ساتھیوں کے شکار پر چلے جانے کی اطلاع بھی دی تھی۔ چادر پھینک کر راج سنگھ بڑی تیزی سے اٹھ گیا جھونپڑے میں رکھی بندوق اور بارود کی تھیلی لے کر جنگل کی طرف چل دیا تبھی شانتی نے پکار کر پوجا کی یاد بھی دلائی تھی مگر اپنے ساتھیوں سے بچھڑ جانے کے خوف سے وہ سنی ان سنی کر گیا تھا۔

اب گاؤں میں قدرے سناٹا ہو گیا تھا۔ بوڑھی عورتیں جنگل سے لکڑیاں، مچھلی اور کیکڑے اکٹھے کرنے جا چکی تھیں کھیتوں پر کام کرنے کے لیے کچھ عورتیں مردوں کے ساتھ چلی گئی تھیں۔ بچوں نے چرانے کے لیے مویشی کھول لیے تھے اس وقت گاؤں میں کچھ بزرگ بھوکسا، نوعمر لڑکیاں اور بہوئیں تھیں جو کہ چھوٹے بچوں کو بہلانے اور کھانا پکانے میں مصروف تھیں، شانتی راج سنگھ کے جانے کے بعد تھوڑی دیر تک سامنے رہنے والی بھابھیوں سے ہنستی بولتی رہی پھر اندر جھونپڑی میں جا کر کھانا پکانے کی تیاری میں مشغول ہو گئی۔

اچانک جھونپڑی کے باہر کئی لوگوں کے تیزی سے بولنے کی آواز سن کر شانتی باہر نکل آئی تھی۔ گھبرایا ہوا منگل سنگھ جلدی جلدی کہہ رہا تھا۔ بڑی زوروں کا دھماکا ہوا تھا جیسے بارود سے بھری بندوق کی نال پھٹنے پر ہوتا ہے۔ دھواں کم ہو جانے پر ہم سبھی ساتھی اس سمت گئے بہت تلاش کرنے پر بھی کچھ سمجھ نہیں سکے بس ایک پیڑ کی ڈال پر بارود کی بھری تھیلی اور ایک قمیص ملی جسے شاید راج سنگھ پہن کر گیا تھا۔ وہاں سبھی ساتھی راج سنگھ کو تلاش کر چکے ہیں مگر ابھی تک وہ کہیں بھی نظر نہیں آیا ہے۔

روکنے کے باوجود شانتی حادثہ کے مقام کی طرف بڑے تیز قدموں سے چل دی تھی۔ اس کے پیچھے گاؤں کے اور لوگ تھے عجیب خاموش سناٹا تھا۔ بارود کی تھیلی اور قمیص راج سنگھ کی تھی لیکن خود راج سنگھ کا کوئی نشان نہ تھا۔ اس کی تلاش میں سارا جنگل چھان ڈالا گیا مگر کچھ پتہ نہ چلا۔

شانتی پھٹی پھٹی آنکھوں سے راج سنگھ کی قمیص اور بارود کی تھیلی کو تکے جا رہی تھی۔ نہ تو وہ روئی نہ چلائی اور نہ ہی بیہوش ہوئی۔ عجیب سکتہ سا طاری ہو گیا تھا، بڑی مشکل سے اسے گاؤں واپس لایا گیا۔

کئی دن گزر جانے پر بھی نہ تو راج سنگھ واپس آیا اور نہ ہی شانتی کی حالت سنبھلی۔ بس اتنا ہی تغیر ہوا کہ تھوڑی تھوڑی دیر میں شانتی زوروں سے چیخ اٹھتی۔ اس کی بھوک پیاس اور نیند غائب تھی۔ موجودہ کیفیت کو دیکھتے ہوئے سارا گاؤں فکرمند تھا۔ گاؤں کے پردھان نے شانتی کے باپ اور پہلے شوہر کو خبر بھجوائی۔ بھوکسا قانون کے مطابق اب اس کا سابق شوہر ہی اس کا پاسبان تھا۔ ساتھ ہی پاس کے گاؤں سے شانتی کے علاج کے لیے بھوکسا ڈاکٹر بھی بلایا گیا جسے قبائلی "سیانے" کہتے ہیں لیکن "سیانے" نے آکر صاف صاف بتا دیا کہ علاج کی قطعاً ضرورت نہیں۔ بلکہ معاملہ کچھ اور ہے اس لیے "بھرا" کو بلایا گیا۔ "بھرا" قبیلے میں جھاڑ پھونک، بھوت پریت اتارنے اور بد روحوں کو بھگانے کا ہنر جانتے ہیں۔

"بھرا" نے عمل کے ذریعہ جب شانتی کے آسیب زدہ ہونے کا یقین کر لیا تو اس سلسلے میں حالات دیکھتے ہوئے اس نے سب سے پہلے بھجا شکاری یعنی شکار کے دیوتا کی پوجا کرنے کا اعلان کیا۔

پیپل کے گھنے پیڑ کے نیچے بنائے گئے دیوتا کے استھان

پر کئی چراغ روشن کیے لوبان اور اگر بتیاں جلا کر اس نے منتر دہرانے شروع کیے، ایک بار پھر وہ دیوتاؤں سے اپنی حفاظت کے لیے دعاگو تھا۔

دھوپ کافی تیز ہو چکی تھی بھرا کی صندل اور گیروی لگی پیشانی پر پسینہ کے قطرے پھوٹ پڑے تھے۔ منتر کی آواز بہت دور تک گونج رہی تھی۔ ظالم، جابر اور عذاب کے اس دیوتا سے قصور معاف کرانا آسان نہ تھا۔ پورا گاؤں ہی ڈرا سہما تھا۔

شانتی کے باپ اور سابق شوہر آ چکے تھے لیکن نہ تو وہ باپ سے مخاطب ہوئی اور نہ ہی شوہر کو پہچان سکی۔ گویا "بھرا" ابھی تک اپنے عمل میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ شانتی نے پھر ایک چیخ ماری اور اٹھ کر بھاگنا چاہا۔ مگر اسے پکڑ کر زبردستی روک لیا گیا۔

بھجا شکاری کو پھول اور بتاشے چڑھائے جا چکے۔ بھرا منتر ختم کر کے شانتی کی طرف بڑھا اب وہ اس پر تشدد کر رہا تھا۔ بھرا کے بھرپور کئی طمانچے شانتی کے گالوں پر پڑے تو تکلیف کے احساس کے بجائے شانتی کا چہرہ اور تن گیا ساتھ ہی شانتی حقارت سے بھری بڑی بھیانک ہنسی سے ہنس پڑی جسے سن کر عورتیں اور بچے تو کیا گاؤں کے بھوکسا نوجوانوں کے اندر بھی خوف کی لہر سی دوڑ گئی۔ بڑی متانت اور سنجیدگی سے بھرا نے زبانی طور سے سوال کر کے جاننا چاہا کہ بھجا شکاری آخر چاہتے کیا ہیں۔ تو جواب میں شانتی نے بڑی کراری آواز اور سخت لہجہ میں کسی جاندار کی قربانی طلب کی۔ اب بھرا کو راہِ نجات مل گئی تھی اس نے پھر سے لوبان اور اگر بتیاں جلائیں۔ نئے چراغ روشن کیے اور پھول بتاشوں کے ساتھ ہی ایک مرغ کی قربانی دی۔ ساتھ ہی بلند آواز میں منتر پڑھنے لگا۔ سب کی نگاہیں شانتی پر مرکوز تھیں۔ اس کے چہرہ کا تناؤ اب کم ہونا شروع ہو گیا تھا۔ بازو بھی اس نے ڈھیلے چھوڑ دیئے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک ٹوٹی ٹہنی کی طرح زمین پر گر گئی۔ بھرا کا چہرہ چمک اٹھا۔ یقیناً اب اسے کامیابی حاصل ہو چکی تھی۔ پھر پُر اعتماد اور اونچی آواز میں بھرا نے منتر دُہرایا۔

خورد موضع کی ہستی   کّے مدینے کی بستی
خدا کی خدائی کو مان کر   محمدؐ کی بادشاہی کو مان کر
فاطمہؓ بی بی کو مان کر   دُلدُل گھوڑے کو مان کر

ہر تیری جنبش تیرا   چلے چلے کون سے چلے
دریا میں خواہ چلے   منتروں سے پربھا تا چلے
میرے گرو کا دھین سانچا
دیکھے دنیا تماشہ تیرا

اور بھرا کے الفاظ ختم ہونے کے ساتھ ہی سچ مچ پورے گاؤں کے بھوکساؤں نے دیکھا ایک ہیولہ، ایک سایا یا دھوئیں کا مرغولہ سا شانتی کے اوپر سے اٹھ کر فضا میں غائب ہو گیا۔

شانتی نے آنکھیں کھولیں اس میں اٹھ کر بیٹھنے کی بھی سکت نہ تھی۔ بھرا نے شانتی کا سُتا ہوا چہرہ بغور دیکھا۔ "بھجا شکاری" کا آسیب شانتی پر سے اتر چکا تھا۔ فضا خاموش تھی۔ پورا گاؤں چپ تھا۔ شانتی کا باپ اور سابق شوہر نرائن سنگھ اس کے قریب آ گئے۔ شانتی باپ کی گود میں سر ڈال کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ خود اس کے باپ کی آنکھیں پُرنم تھیں۔ نرائن سنگھ اسے تسلّی دے رہا تھا اور ٹھیک ہو جانے پر اسے واپس اپنے گھر چلنے کو کہہ رہا تھا۔ تبھی سامنے سے راج سنگھ آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں بندوق کے ساتھ بارود سے بھری ہوئی وہی تھیلی تھی۔ اور اس نے وہی قمیص پہن رکھی تھی جسے جنگل کے ایک پیڑ پر رکھی ہوئی تقریباً سارا گاؤں دیکھ چکا تھا۔ شانتی کے آنسو رُک گئے۔ اس کے ساتھ سارا گاؤں حیران و ششدر راج سنگھ کو تک رہا تھا۔

اچانک بہت سے لوگ بولنے لگے۔ بہت سے سوال پوچھے جانے لگے۔ لیکن راج سنگھ خود بڑا حیران تھا۔ اس نے ہر سوال پر حیرت کا اظہار کیا۔ بڑے تعجب سے اس نے کہا۔

(باقی آئندہ)

قارئین کے تاثرات

اطفال نمبر

سید شبیہ الحسن نونہروی صدر شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی

نیا دور کا اطفال نمبر موصول ہوا اور میں نے نہایت اشتیاق سے اس کا مطالعہ کیا اور اسے آپ کے حسن ادارت کا شائستہ نمونہ ایک مدیر کی حیثیت سے آپ کی صلاحیت اور مہارت پر میرے یقین میں اضافہ ہوا۔ یہ نمبر اپنے گوناگوں خصوصیات اور متنوع معنویت کی بنا پر سے اطفال سے متعلق اردو کے تحریری ذخیرہ میں ایک گرانقدر اضافہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اردو کے حلقے قدر دانی کے ساتھ اس کا استقبال کریں گے۔

ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی (لکھنؤ)

نیا دور کا ادبی مرقع اطفال نمبر موصول ہوا عالمی سال اطفال کے موقع پر آپ نے یہ مفید اور اہم نمبر شائع کر کے ہماری زبان اور اتر پردیش کی اردو ... ہے۔ بچوں کی ہمہ جہت ترقی کے لیے ایسے اور اتنے مفید، عجیب اور معیاری مضامین اور کہانیاں فراہم کر دینا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ حسن ترتیب نے ان کی اہمیت اور افادیت میں اور اضافہ کر دیا ہے جس کے لیے آپ سب مبارکباد کے مستحق ہیں۔

اس نمبر میں بعض عنوانات اتنے اہم ہیں کہ اگر ان کا سلسلہ ... رہے تو نہ صرف بچوں کو بلکہ والدین، سرپرستوں اور اساتذہ کو بھی فائدہ ہوگا۔ مثلاً بچوں کی تعلیم و تربیت، صحت و نگہداشت، بچوں کے ادب وغیرہ۔ بہتر یہ ہے کہ نیا دور کے چند صفحات بچوں کے لیے مخصوص کر دیے جائیں۔ اس طرح بچوں کی اصلاح و فلاح اور تعمیر و ترقی میں نیا دور اہم رول ادا کر سکتا ہے۔

... قریشی الہ آباد

نیا دور کا اطفال نمبر موصول ہوا۔ ترتیب و تزئین اور اعلیٰ تخلیقات کا بہترین نمونہ ہے۔ اسے دستاویزی حیثیت دینے کے لیے آپ کو کافی محنت کرنی پڑی ہوگی۔ جانے پہچانے قلم کاروں کی تخلیقات نے بچوں کی نشوونما کے ہر پہلو کو روشن کیا ہے اور اردو زبان کی وسعت و گرفت کو نمایاں کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ میری جانب سے اتنے شاندار اور پر وقار نمبر نکالنے پر دلی مبارکباد قبول فرمائیں۔

محمد امین الدین مومن پورہ۔ (ناگپور)

اطفال نمبر باصرہ نواز ہوا۔

بچوں کے سال میں دیگر رسائل نے بھی نمبر نکالے۔ لیکن ان سب میں نیا دور کا نمبر اولیت رکھتا ہے۔ نمبر نکالنے کے لیے آپ نے جتنی کوششیں کی ہیں۔ اس کا اندازہ مضامین پڑھ کر لگایا جا سکتا ہے۔ اطفال نمبر میں اپنے جن گوشوں کو اجاگر کیا ہے۔ وہ وقت کی ضرورت ہے" بچوں کے ادیب اور شاعر" اس تعلق سے جو تخلیقات شامل اشاعت ہیں۔ خوب ہیں۔ میری جانب سے مبارک باد قبول کیجیے۔ مستقبل میں بھی ایسے نمبر نکالتے رہیے۔ جس سے ادب کی آبیاری ہو سکے۔

سعید کاملی بلرام پور، گونڈہ

ماہنامہ" نیا دور" کا اطفال نمبر موصول ہوا۔

بچوں کے لیے ایسا رسالہ بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے۔ ادارہ اس کاوش کے لیے قابل مبارک باد اور ستائش ہے۔ اچھا ہو کہ ہر شمارے میں کچھ نہ کچھ تخلیقات بچوں کے لیے اسی طرح شائع کی جائیں۔

ایس۔ ایم ہاشمی۔ کان پور

" اطفال نمبر" موصول ہوا۔ بچوں کی نفسیات اور تعلیمی مسائل وغیرہ سے متعلق مضامین بہت پسند آئے۔ خصوصاً بچوں کے ادیبوں اور شاعروں سے متعلق بھی مضامین بچوں کے لیے روشنی کا کام کریں گے۔ علاوہ ازیں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ایسے مضامین پڑھ کر بچوں میں کتب بینی کی عادت میں قطعی اضافہ ہوگا۔ مضامین کے علاوہ کہانیاں۔ ڈرامے اور نظمیں وغیرہ سب ہی صحت مند ہیں۔ خدا سے دعا گو ہوں کہ نیا دور دن دونی رات چوگنی ترقی کرتا رہے تاکہ اردو ادب کی بھی ترقی ہوتی رہے۔

★

لہر لہر پیاسی · اکرم فاروقی کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے جو
دیش اردو اکاڈمی کے مالی اشتراک سے شائع ہو کر منظر عام پر آیا
رم فاروقی کم لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں۔ ان کے افسانے زندگی
رجمانی اور معاشرے کی موثر عکاسی کرتے ہیں ان کے افسانوں میں
ل چسپی اور شگفتگی ہے وہ انسان کی جذباتی زندگی کی پیکر تراشی سے
ہونٹ۔ اکرم صاحب نے عورت کی جذباتیت کی بخوبی عکاسی
ہے۔ دل کے رشتے، ان کا بہترین جذباتی افسانہ ہے اور لہر لہر پیاسی
محبوبہ کے رومانی جذبات کی ہجر آلود کہانی ہے۔ ان کے افسانوں
مقصدیت کا پہلو اجاگر ہے۔ وہ مقصدیت اور حقیقت نگاری کے
بیان ایک مفید وہ کرتی ہیں انھوں نے پلاٹ نگاری کے سلسلے میں بڑی
یک دستی، فن کاری اور احتیاط کا ثبوت دیا ہے۔ ان کے یہاں
بیانیہ دل چسپی۔ تفکر کی بلندی۔ فن کارانہ بانکپن اور دلکش انداز نگارش
یک ساتھ آ کر مدغم ہو گئے ہیں۔ ان کی زبان میں سلاست تاثیر اور
لکشی ہے۔ ان کی بیانیہ صلاحیت، روزمرہ کا استعمال نئی تمثیلیں اور
بصورت تشبیہات نثر کو غزل بنا دیتی ہیں۔

وہ اپنے افسانوں کو اچھا موڑ دیتے ہیں۔ الفاظ تراشی ان کا پسندیدہ
شغل ہے۔ کبھی فریدہ سے 'فریدہ' بنا کر پورا افسانہ لکھ ڈالتے ہیں اور
کبھی ڈائری کے اوراق کو ہی افسانہ کا روپ دے دیتے ہیں۔

کتاب کے باطن کے ساتھ ظاہری صورت بھی اچھی ہے۔ کتابت
بیانی اور کاغذ وغیرہ بہترین ہے لیکن کچھ اوراق کورے رہ جانے کی
سبب چند افسانے نامکمل رہ گئے ہیں۔

——— ڈاکٹر خلیل اللہ خاں

نام کتاب: **ابر معنی** شعری مجموعہ شاعر: قادر صدیقی
پتہ: باغ مولوی انوار۔ سبھاش مارگ، لکھنؤ قیمت: ۲۰ روپے

جناب قادر صدیقی نے لکھنوی ادب کے روایتی اقدار کا زوال
اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ حضرت سراج لکھنوی کے حلقہ تلامذہ میں
شامل ہونے کی وجہ سے ان کی شاعری کی زبان تو بیسویں صدی کے
ابتدائی دور کی ہے لیکن یہ شاعری جن جذبات و احساسات پر مبنی ہے
اور انداز بیان میں جو جدت و ندرت ہے وہ صرف طور پر آنے والے زمانے کی
احاطہ بندی کرتی ہے۔

موجودہ دور کی شاعری داخلیت کی قید سے آزاد ہو کر خارجیت
کے حدود میں آ گئی ہے۔ اس دور میں وہی شاعر کامیاب کہا جا سکتا ہے جو
اپنی ذات کے خول سے باہر نکل کر گرد و پیش کا جائزہ لے اور حکایت جاناں
کے ساتھ حالات حاضرہ کو بھی پیش نظر رکھے۔ قادر صدیقی کی شاعری میں
ہمیں دونوں خصوصیات نظر آتی ہیں۔ ان کا محبوب واقعتاً غزل کا محبوب
ہے۔ وہ اسے علامت بنا کر حسن و عشق کی داستان بیان کرتے ہیں تو کہیں
شکایت کرتے ہیں اور اس کی بے نیازی سے متاثر ہو کر زمانے بھر کو خود سے
بدظن بھی تصور کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود اپنی خودداری اور ناموس
محبت کو اس کے قدموں پر قربان کر دینے کے لیے کسی قیمت پر تیار نظر نہیں
آتے۔ اس معاملے میں ان کی انفرادیت، طرز مزاجی اور نکتہ آفرینی پیش پیش
رہتی ہے وہ عاشقی میں عزت سادات گنوانے کے قائل نہیں ہیں۔

قادر صاحب غم جاناں کی طرح غم دوراں کا بار بھی خندہ پیشانی سے اپنے
کاندھوں پر اٹھانے کو تیار ہیں لیکن ان کا عجز اور انکسار "دریوزہ گری" کے
بجائے "شان استغنا" کا مرہون منت ہے۔ خوشگوار ادب میں ان کی تیوریوں
کے بل شکل سے کھلتے ہیں جس کی بارگاہ میں حاضری دینا ہو یا دنیائے ناخدا ؤں
سے سابقہ پڑے قادر صدیقی نہایت نپے تلے انداز میں لب کشائی کرتے ہیں۔
قادر صدیقی کا پہلا مجموعہ کلام "سنگم" اردو اور ہندی دونوں رسم خط میں
ایک ساتھ شائع ہو کر سند قبول حاصل کر چکا ہے۔ "ابر معنی" ان کا دوسرا
مجموعہ ہے جس پر "نقاش نقش ثانی بہتر کشد زاول" کی مہر تصدیق ثبت کی
جا سکتی ہے۔

ابر معنی جس میں ایک سو تین (۱۰۳) غزلیں اور ترانوے (۹۳) رباعیات
شامل ہیں حسن کلام کے علاوہ عمدہ کتابت و طباعت، بہترین کاغذ، چھپائی اور
جاذب نظر جلد بندی اور دلکش و دلآویز گرد پوش سے آراستہ ہے۔

اتر پردیش اردو اکاڈمی نے اس کی انھیں خوبیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے
تخلیق کار کو انعام سے نوازنے کے علاوہ اسے بہترین طباعت کے لیے بھی
گرانقدر انعام دیا ہے۔

——— ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید

پندرہ روزہ **خیر و خبر** دی ایسٹ ویسٹ کمیونیکیشن، شمیم منزل
جیل روڈ علی گڑھ (۲۰۲۰۰۱) ایڈیٹر: مہر عالم۔ ایسوسیئٹ ایڈیٹر: احمد ابراہیم
علوی۔ صفحات: ۴۴ قیمت: دو روپے۔

اردو میں اب تک کوئی ایسا جریدہ نہیں تھا جو مختلف النوع موضوعات
کا احاطہ کرتا ہو۔ "خیر و خبر" علی گڑھ کی اشاعت نے اس کمی کو بحسن و خوبی

دور کیا ہے۔ اس جریدے میں قومی اور بین الاقوامی سیاسی صورت حال کے تجزیہ اور شعر و ادب کے ساتھ ساتھ فلم، کھیل کود اور جرائم جیسے موضوعات پر مضامین بھی شائع ہوتے ہیں۔ اس طرح یہ جریدہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لیے دلچسپی کا حامل ہے۔ شاندار اور دلکش گیٹ اپ خوبصورت تصاویر اور آفسیٹ کی بہترین طباعت سے آراستہ یہ جریدہ بلاشبہ اردو کا عوامی اور مقبول ترین جریدہ بننے کی خصوصیات رکھتا ہے۔ ادھر اس میں کچھ اور نکھار آیا ہے۔ حسن ترتیب میں بھی اور مضامین کے انتخاب میں بھی۔ شہریار صاحب بھی اپنے صفحہ پر بڑی چبھتی باتیں کہتے ہوئے دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیتے ہیں۔ ان کا مختصر تجزیہ بڑا منطقی اور سائنٹفک ہوتا ہے۔ سائنسی اور منطقی مدارس کو عام کرنے کی ضرورت بھی ہے۔ تاکہ تنگ نظری، تعصب، عصبیت، فرسودہ اور ضرر رساں رسومات نیز روایت پرستی جیسی برائیوں کا خاتمہ کیا جا سکے وخیبر اس سلسلے میں ایک موثر رول انجام دے سکتا ہے اور اسے انجام دینا چاہیے۔ ——— شاہ نواز قریشی

نام کتاب: **خدابخش لائبریری جرنل** مجلس ادارت: قاضی عبدالودود، سید حسن عسکری، افسر الدولہ، فیاض الدین حیدر عابد رضا بیدار،

قیمت پندرہ روپے ——— دارالاشاعت: خدابخش لائبریری پٹنہ

سہ ماہی مجلے کی حیثیت سے خدابخش لائبریری کا جاری کردہ یہ چوتھا شمارہ نہایت ضخیم اور دستاویزی اہمیت کا مظہر ہے۔ ۶۰۰ صفحات سے بھی زیادہ پر اردو کا تاریخی اور ادبی مواد اس جریدے کی زینت ہے۔ اس میں وہی موضوعات ہیں جن کا علاقہ کسی نہ کسی طرح مذکورہ سے ہے۔ ابتدائی ۲۰ صفحات میں ایک پرمغز مضمون "میری تحریر بازدید" پروفیسر کلیم الدین احمد کا ہے۔ ان کا یہ مقالہ خود ان کے نظریات پر روشنی ڈالنے کے لیے ہی کافی نہیں ہے بلکہ نقد و نظر کے قوانین وضع کرنے کی ہم نشینوں کی آگاہی کے لیے بھی دقیع ہے۔ اردو کے عظیم مسائل و حل کے احاطے کے طور اس میگزین کے لیے مذکورہ مقالہ، تحقیق، تنقید اور تفکر کے اعلیٰ اقدار کا نمونہ۔

اسی طرح پورے جرنل میں اردو کے نایاب و منفرد بیش قیمت کتابوں کی خصوصیات پر بحث کی گئی ہے۔ فارسی کے آفاقی ادب سرمایے کی تفصیلات بھی اس رسالے کا نمایاں حصہ ہیں۔ قاضی عبدالودود اور عابد رضا بیدار کے قلمی کارنامے بھی قابل ذکر۔

انگریزی کے ۴۲ صفحات پر اسلامی تقویم کی بازیافت ڈاکٹر ہاشم امیر علی کے وسائل سے وہ تقریریں ہیں جو خدابخش لائبریری میں ہر سال فارسی، عربی، اور دروس اسلامی کے لیے کی گئی ہیں۔ یہ تقریریں بے حد مفید اور معلوماتی ہیں۔

مجموعی طور پر یہ جرنل لائبریریوں کے لیے معتبر حوالہ کی حیثیت رکھتا اور قابل قدر ہے۔ تسنیم فاروقی (لکھنؤ یونیورسٹی)

بھجا شکاری ——— صفحہ ۲۴ کا بقیہ

پتہ نہیں کیوں ایسے سوال اس سے پوچھے جا رہے ہیں۔ وہ غائب ہی کب ہوا تھا۔ وہ تو صبح کو شکار کے لیے گیا تھا۔ اور دن ڈھلنے سے پہلے ہی واپس آ گیا۔ شکار کے دیوتا کی پوجا کرکے نہیں گیا تھا۔ اس لیے کوئی شکار اسے نہ مل سکا۔ شکار کی تلاش کے ساتھ ہی اس نے گاؤں کے ساتھیوں کو بھی جنگل میں ڈھونڈھا تھا مگر اسے کوئی بھی نہ ملا۔ شکار کی جستجو میں اتنا تھک گیا کہ وہ اسی جنگل میں سو گیا۔ آنکھ کھلتے ہی اپنی قمیص پہن کر اور بارود کی تھیلی اور بندوق لے کر سیدھا گھر کی طرف چلا آ رہا ہے۔ رانج سنگھ کی بات سن کر بھرا مسکرا اٹھا مگر سارا گاؤں بھجا شکاری کے خوف سے ایک بار پھر لرز اٹھا۔

رانج سنگھ شانتی کے قریب آیا تو شانتی اسے ہاتھوں سے اس طرح چھو رہی تھی گویا آنکھوں پر اعتبار نہ ہو۔ شانتی کے باپ اور پہلے شوہر کی اب وہاں کوئی ضرورت نہ تھی۔ اس لیے وہ خاموشی سے اٹھ کر واپس لوٹ گئے۔

ترائی کے جنگلوں میں آباد قبائلی دنیا کے اس بے گاؤں میں زندگی پھر سے پیدا ہو چکی تھی۔ گویا غروب ہوتے سورج کے ساتھ ہی ہر کسی کے دل میں وقتی طور سے بھجا شکاری کی ہیبت بھی کم ہو گئی تھی۔

دیوتاؤں کی ناراضگی ہے اور ہر بلا اور آفت سے بچاؤ حاصل کرنے کے لیے ان کے پیر اور ان کے اپنے منتر ہوتے ہیں۔ ترائی میں بھوکسا قبیلے نے تھوڑی دور رہ کر گاؤں بسا رکھے ہیں۔ زراعت اور مویشی پالنا ہی ان کا ذریعہ معاش ہے۔ غلّہ کے عوض تمام تر ضروریات زندگی شہروں سے بنجارے تاجر انھیں بہم پہونچاتے رہتے ہیں۔

نینی تال کی تلہٹی میں آباد ایسے ہی ایک قبائلی گاؤں کے پردھان کی بڑی بیٹی شانتی تھی جس کی شادی کچھ برس پہلے پاس کے گاؤں میں نرائن سنگھ سے ہو چکی تھی۔ نرائن سنگھ کا شمار گاؤں کے خوشحال بھوکساؤں میں تھا۔ مگر چھوٹی بہن کی شادی کے موقعہ پر میکے آئی ہوئی شانتی کے دل میں راج سنگھ بس گیا۔ رسم کے مطابق شادی سے کئی روز قبل لڑکے والے غلّہ۔ گھی۔ اور دیگر اشیاءِ خوردنی لڑکی والوں کو بھیج دیتے ہیں۔ یوں ہی بیل گاڑیوں میں لدے پھندے کئی رشتہ دار کے ساتھ راج سنگھ بھی چھوٹی بہن کی سسرال سے آیا تھا۔ شادی میں ابھی کئی دن باقی تھے کہ شانتی اور راج سنگھ کے لاپتہ ہو جانے کی خبر صبح کے اجالے کے ساتھ سارے گاؤں میں پھیل گئی۔

بھوکسا قانون کے مطابق راج سنگھ شانتی کو لے کر اپنے گاؤں نہیں جا سکتا تھا نہ ہی شانتی کے سسرال اور میکے کے گاؤں میں۔ اس لیے وہ ایک الگ گاؤں میں جا بسا۔ جہاں گاؤں کے مکھیا کے ذریعہ شانتی کے شوہر نرائن سنگھ کو شادی کا خرچ ادا کر کے اور برادری کو بھات (دعوت) دے کر شانتی نے بھوکسا بیوی کی قانونی اور سماجی حیثیت پالی تھی۔ ایسی شادیوں کو بھوکسا بڑی وسیع النظری سے محض عین انسانی فطرت سمجھتے ہیں۔

شانتی اور راج سنگھ کو ساتھ رہتے کئی مہینے گذر چکے تھے۔ اس درمیان راج سنگھ والدین کے پاس سے دیسی بندوق لے آیا تھا۔ شکار تسکین شوق کے ساتھ اس علاقے کے باشندوں کی بھی ضرورت بھی پوری کرتا ہے۔ ٹولیوں میں اکٹھے ہو کر جانے والے شکاریوں کے ساتھ اکثر راج سنگھ بھی جاتا۔ شکار کے ارادہ سے جنگلوں کا رخ کرنے سے پہلے "بھجّا شکاری" کی پوجا ضرور کی جاتی۔

"بھجّا شکاری" تالاب میں نہاتی ہوئی اس جل پری کا بیٹا تھا جس کا کنارے رکھا لباس جنگل سے گھر آتے ہوئے آباو اجداد میں سے کسی ایک بھوکسا بزرگ نے اٹھا لیا تھا اور اپنے گھر میں لا کر چھپا دیا تھا۔ لباس کے بغیر وہ جل پری اپنے دیش واپس نہیں جا سکتی تھی اس لیے لباس کی تلاش میں آئی پری لباس واپس نہ ملنے کی صورت میں مجبوراً اس بھوکسا کی بیوی بن کر رہنے لگی تھی۔ کچھ عرصہ بعد پری کے ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام بھجّا رکھا گیا بھجّا بڑے ہو کر ماہر شکاری اور بڑا اچھا نشانہ باز نکلا۔ اس کے شوق کو دیکھتے ہوئے بھجّا کی پری ماں نے ایک جادوئی بندوق اپنے بیٹے کو دی۔ اس بندوق سے وہ ایک فائر میں کئی شکار کرتا۔ ار اس خوبی کی وجہ سے وہ اپنے قبیلہ میں بھجّا شکاری کے نام سے جانا جانے لگا۔ جہاں یہ خوبی تھی وہاں وہ اپنی بری عادتوں، ظالمانہ حرکتوں کی وجہ سے پورے قبیلہ کے لیے دردِ سر بھی بن گیا تھا۔ اسی درمیان بھجّا شکاری کی شادی کے موقعہ پر پورے قبیلے نے اس کی پری ماں کا ناچ دیکھنے کی خواہش کی تھی۔ پری نے بتایا کہ وہ تو صرف اپنا لباس پہن کر ہی ناچ سکتی ہے۔ بڑے جوش سے بھجّا کے باپ نے پری کا چھپایا ہوا لباس نکال کر پری کو دیدیا۔ جیسے ہی پہن کر پری نے ناچنا شروع کیا اور ناچتے ناچتے وہ اڑ کر اپنے دیس پرستان چلی گئی۔

اب بھجّا شکاری نے قبیلے کے لوگوں کو اور بری طرح ستانا شروع کیا۔ تنگ آکر ایک دن بھجّا شکاری کو قبیلے کے لوگوں نے جان سے مار ڈالا۔ اور اس کی بندوق کے ساتھ اس کو دفنا دیا گیا۔ لیکن مر کر بھی اس نے اپنے قبیلے کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ وقتاً فوقتاً سب کو تنگ کرتا رہتا۔ یوں وہ بھوکسا قبیلے کے لیے مستقل طور پر عذاب کا دیوتا بن کر رہ گیا تھا۔ بھوکسا شکاری